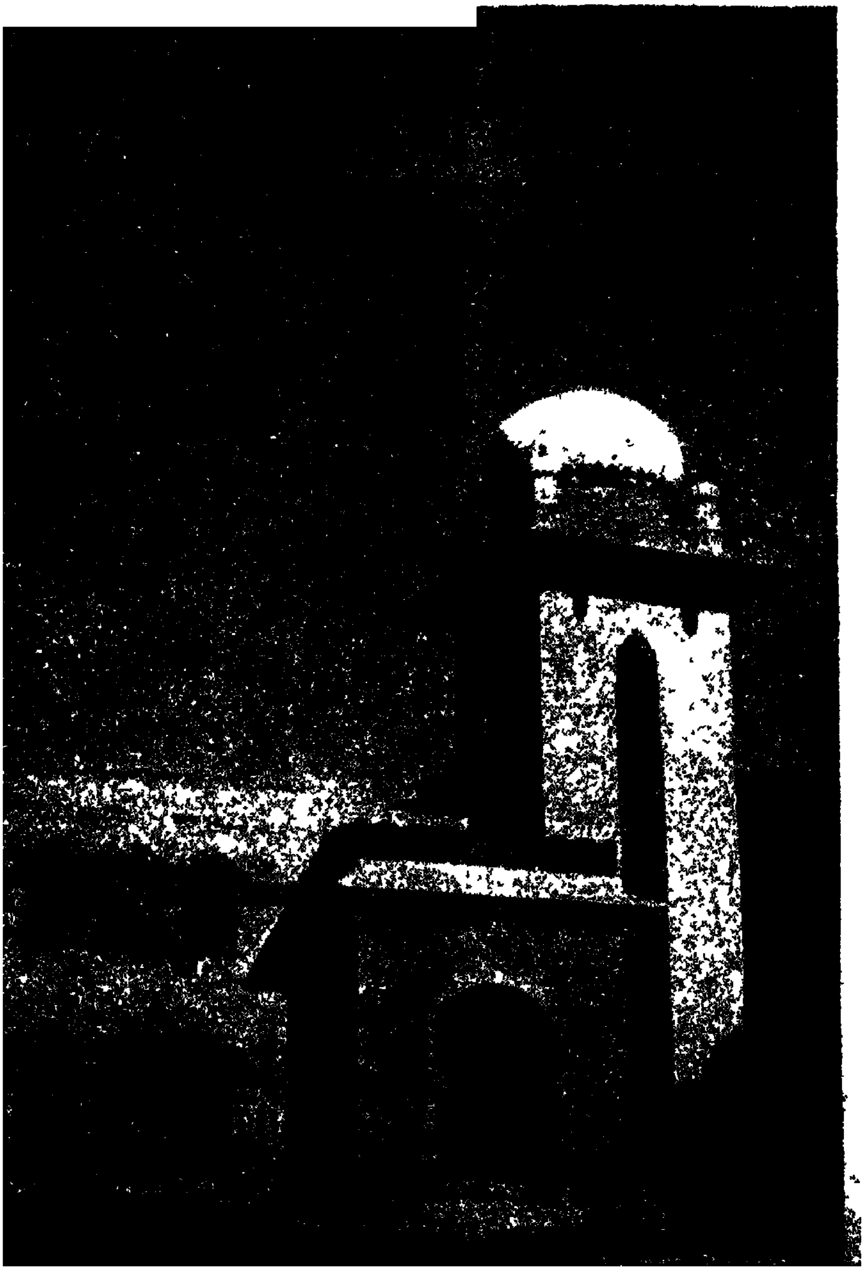
ـب س



TH

S
A
B
R
A
S

URI
Mon
HYDER

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

جاری شدہ: ۱۹۳۸ء ———— فون نمبر (۳۵۰۲۹)

ماہنامہ

سب رس

محمد قلی قطب شاہ نمبر

جلد نمبر: ۲۴
شمارہ نمبر: ۱

جنوری ۱۹۶۱ء

زرِ سالانہ ہندوپاک سے: چھ روپے
ششماہی: تین روپے
زرِ سالانہ بیرونِ ہند سے: دس روپے

قیمت فی پرچہ (۵۰) نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیاتِ اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر "ایوانِ اردو" خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ترتیب

مضامین

یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۰ء تقاریر و تاثرات

نظمیں

شہرِ غزل

طرحی محفلِ شعر

آغا حیدر حسن مرزا دہلوی

قطب شاہی تہذیب و تمدن

(یہ مضمون یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ جنوری ۱۹۶۰ء میں پڑھا گیا)

قطب شاہی خاندان۔ دو کم ڈیڑھ سو برس کل دار اور جن کو حالی کا حساب یاد ہے ان کے حساب سے دو اوپر ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں۔ سنہ ۹۲۴ھ میں بانی خاندان سلطان قلی قطب شاہ جو تلنگانہ کا طرفدار تھا گولکنڈہ میں خود مختار بن بیٹھا اور چھبیس برس حکومت کر کے محمود ہمدانی کے ہاتھوں نماز پڑھتے ہوئے شہید ہوا۔ اس کے بعد یار قلی جمشید قطب شاہ مسند نشین ہوا۔ اس کا نام باپ ہتیا کے کارن بدنام ہے۔ لگ بھگ سات برس اس نے بھی حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سبحان قلی قطب شاہ سات برس کی عمر میں حاکم ہوا اور کچھ دنوں بعد اللہ کو پیارا ہوا۔ جمشید قطب شاہ کا سلسلہ ختم ہوا اس کی نسل میں حکومت نہ چلی۔ "اے سکندر نہ رہی تیری بھی عالمگیری۔ کتنے دن آپ جیا جس نے دارا مارا" ریاست سلطان قلی قطب شاہ بانی قطب شاہی کے بیٹے ابراہیم قطب شاہ کو ملی۔ بیس برس کی عمر میں مسند سنبھالی۔ اور اکتیس برس حکومت کر کے اکیاون برس کی عمر میں جنت کو سدھارا۔ ابراہیم قطب شاہ کے سترہ بیٹے اور تیرہ بیٹیاں تھیں۔ اس کی ایک بیٹی ملکہ جہاں اس کے ہمنام ابراہیم عادل شاہ والئ بیجاپور سے بیاہی گئی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کی ایک حرم بھاگ رتی تھی۔ اس کے بطن سے محمد قلی قطب شاہ پیدا ہوا۔ سترہ برس کی عمر میں ریاست گولکنڈے کا مالک ہوا۔ اور بتیس برس حکومت کی۔ یہ بادشاہ عشق بازی اور عیش دوستی میں مشہور ہے۔ اس کی چودہ برس کے سن میں بھاگ متی سے عشق عاشقی شروع ہو چکی تھی اور اس کے مبارک نتیجے میں رعایا کو پرانے پل جیسی چیز آمد و رفت کی سہولت کیلئے مل گئی۔ بھاگ متی تو مشتری بن کے چمکی تھی۔ اور پھر حیدر محل خطاب پا کر بھاگ نگر کو حیدر شہر اور حیدرآباد کا نام دیا۔ لیکن ننھی۔ سانولی۔ کنولی۔ پیاری۔ گوری۔ چھبیلی۔ لالہ۔ لالن۔ موہن۔ بلقیس زمانی۔ حاتم۔ بہمنی۔ ہندو۔ پدمنی۔ سندر۔ سجن۔ رنگیلی۔ اور جانے کتنی ہونگی۔ جو سیندھی کا درخت ننھا سا تماشا جانے۔ تو اس کی کیا۔ بے تکے مل کر حالت ہوگی۔ تصویر دیکھو تو دبلا پتلا۔ دھان پان۔ منحنی سا۔ مگر دل و دماغ غضب کا پایا تھا۔ فارسی۔ اردو۔ تلنگی میں اتنے شعر کہے تھے کہ شاید ہی دنیا کے کسی بادشاہ نے بہادر شاہ ظفر کو چھوڑ کر۔ اس کے برابر کہے ہیں۔ وہ بادشاہ نہ بھی ہوتا۔ تو اس کا نام اپنے کلام کی بدولت رہتی دنیا تک رہتا۔ بیٹا اس کا کوئی نہ تھا۔ صرف ایک بیٹی حیات بخشی بیگم تھی۔ جو حیدرآباد میں ماں صاحبہ کے نام سے نیک نام ہے۔ اور آج تک اس کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ اس کی شادی محمد قلی قطب شاہ نے اپنے بھائی محمد امین کے فرزند محمد قطب شاہ سے کر دی۔ اور یہی محمد قطب شاہ جو چار سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ بیس برس کی عمر میں گولکنڈے کا

مالک ہوا۔ اور پندرہ برس حکومت کر کے راہی فردوس بریں ہوا۔ اس کی ایک بیوی ابراہیم عادل شاہ ثانی کی دختر نیک اختر تھی۔ جس کے بطن سے ابراہیم مرزا پیدا ہوا۔ ایک جرم بیمار دل تھی۔ جو دو بیٹوں علی مرزا اور مرزا الکمال کی ماں بنی۔ مرزا عبداللہ حیات بخشی بیگم بانفس کے بطن سے تھا اور محمد قطب شاہ کے بعد بارہ برس کی عمر میں حکومت ملی۔ سب سے زیادہ اسی نے قطب شاہی خاندان میں حکومت کی اور ساٹھ برس کی عمر میں دو کم پچاس برس حکومت کر کے وفات پائی۔ اس کی جگہ بھی اس کے داماد ابوالحسن تانا شاہ کو ملی۔ جو اپنی نازک دماغی کے لئے دوست دشمن۔ دور نزدیک مشہور ہے۔ یہ اٹھائیس برس کی عمر میں خسر کی گدی کا مالک بنا۔ اور پندرہ برس حکومت کر کے معزول ہوا اور تیرہ برس قید رہا۔ اور حضرت عالمگیر کی وفات سے سات برس پہلے ۱۱۱۱ھ میں خلد کو سدھارا۔ عوام میں مشہور ہے کہ چودہ برس کھیل کود میں گزارے اور چودہ برس اپنے پیر حضرت شاہ راجو قتال کی خدمت گزاری اور حصول علم میں صرف کئے۔ چودہ برس حکومت کی اور چودہ برس قید میں کٹے۔ موت کا باعث بھی ایک گوشن کا پاس سے گزرنا ہے۔ کہ وہ دہی کی بو کی تاب نہ لا کر اس دنیائے فانی نے عزیز جان جان آفریں کے سپرد کی۔ حکومت کا رقبہ موجودہ آندھرا پردیش سے دگنے سے زیادہ ہوگا۔ اڑیسہ، کچھ حصہ مدراس کا اور کچھ کرناٹک اور مرہٹواڑی کا ان کے زیر نگیں تھا۔ ملک آباد۔ رعایا خوشحال، مسافروں اور قافلوں کے لئے ساری حکومت میں سڑکیں بنی۔ جگہ جگہ سرائیں اور ان کے ساتھ باؤلیاں۔ باغ اور عبادت خانے۔ انتظام ایسا عمدہ کہ سونا اچھالتے چلے جاؤ اور کوئی یہ نہ پوچھے تمہارے منہ میں کے دانت ہیں۔ اس زمانے کا گولکنڈہ۔ اور حیدرآباد۔ دنیا کے بڑے اور رونق دار شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ ملک کی حفاظت کے لئے جگہ جگہ موقع سے مضبوط آسمان سے باتیں کرنے والے قلعے بنے ہوئے۔ عمارت کے فن میں قطب شاہیوں کا ایک الگ انداز ہے۔ ان کی عمارتیں اتنی رفیع الشان ہیں جو ان کی رفعت خیالی پہ دال ہیں۔ ان کی محرابیں۔ بڑے تناسب سے بنی ہیں۔ گنبدوں کی گولائی اور ان کے استوار بیٹھے ایک خاص وضع کی ہے۔ ان کی زیادہ تر عمارتیں۔ سنگ خارا کی ہیں۔ ان پر استر کاری کر کے سنگ بٹھا کر جو نے کی قلعی ہے۔ اور ایسی گھوٹائی کر کے جلا دی گئی ہے کہ سنگ مرمر کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کے محلوں کی منڈیریں جو ہیں جو ان میں گچ کاری کے کنگورے ایسے بنائے ہیں کہ قیمتوں کا کام ان کے سامنے شرمائے۔ فن کاشی گری کو بھی ان کے سائے میں بڑی ترقی ہوئی۔ ان کے گنبدوں اور شاہی عاشور خانے میں اس کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ سبز۔ زرد۔ فیروزی۔ نیلا اور سفید۔ یہ رنگ کاشی گری میں زیادہ نمایاں۔ افسوس کہ یہ صنعت اب ناپید ہوگئی۔ اور اب کوئی کاشی گر۔ یا کسی گر اس ریاست میں باقی نہیں۔ محلوں میں چھتیں اتنی اونچی ہیں کہ دیکھو تو پگڑی سر سے گر پڑے۔ دالان۔ در دالان۔ صحنچیاں۔ درے۔ سہ دریاں۔ حجرے۔ بڑے خوش قطع۔ پانی محلوں میں جگہ جگہ نلوں سے دوڑتا۔ حوض ہیں۔ فوارے ہیں۔ آبشار۔ جھرنے اور چادریں ہیں۔ آج بجلی کی قوت سے بھی اتنے اونچے پر ہم پانی نہیں پہنچا سکتے۔ جہاں انہوں نے بغیر بجلی کے پانی چڑھایا ہے۔ صحت خانے ان کے خود صفا ہیں۔ اس فلش پر ہم ناز کریں۔ قطب شاہی اس سے آگاہ تھے۔ حمام موجود ہیں۔ اب سے چار سو برس پہلے کا تصور کیجئے کہ یہ کیا ہوں گے اور کیسی چہل پہل رونق اور گرماگرمی ہوگی۔ باغ میں ان کی تختہ بندی۔ کیاریاں۔ حوض۔ نہریں۔ نشیمن۔ بارہ دریاں۔ پھر پھول پھل۔ زعفران اور نرگس۔ لالہ۔ گلنار۔ گلاب۔ گل مہندی۔ گل جعفری۔ گل داؤدی۔ موتیا۔ چنبیلی۔ جوہی۔ سوسن۔ چنپا۔ گل نیرو۔ گل بنفشہ۔ گل چاندنی میووں میں اکھروٹ۔ پستہ۔ بادام۔ ناریل۔ سیب۔ ناشپاتی۔ انگور۔ انجیر۔ میووں اور پھولوں کے نام گنائے جائیں جو ان کی دواسہ کی مثنویوں میں ملتے ہیں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ رعایا کی صحت کے شفا خانے۔ تعلیم کے لئے عبادت خانے۔ کثرت جہانی کے

ہاں نے کیسے شادو مر گئیں۔ وہ فرزند کا غم۔ یار دار کا کیا پوچھنا۔ بادشاہ کو جو عشق ہوتا ہے۔ رعایا اسی پر جان دیتی ہے۔ تقریباً سب ہی
بادشاہ سوائے قلی کو تھی سی جان ہی چل بسی۔ اور وہاں سلطان قلی قطب شاہ شعر کہتے یا ریاست قائم کرتے ان دو کو چھوڑ سب
سب شاعر تھے ابوالحسن تانا شاہ کے نام سے ایک شعر منسوب کر دیا گیا ہے۔ کس کس کہوں۔ جاؤں کہاں۔ محمود دل نکل بچھڑا اٹھے۔ ایک باٹ گئے
گئے سجن۔ یاں دل ہی بارہ باٹ ہے۔ کہتے ہیں جہانگیر کے زمانے میں کوئی شاعر افضل جھنجھانوی کا تھا۔ اس کا یہ شعر ہے۔ مگر منسوب تانا شاہ کے
نام ہی ہے۔ بارہ باٹ بہ جا پر اکثر غلط ہوتا۔ اس کے علاوہ میری نظر سے کسی دکنی نظم میں نہیں گزرا۔ گانے بجانے کا شوق عام تھا۔ جہاں
بھی تارا متی۔ پیما متی جیسی گانے والیاں اور رقاصائیں گزری ہوں وہاں کے تو جھاڑ پہاڑ تھرکتے ہوں گے۔ اور دریا سُر بھرتے اور تانیں
لیتے ہوں گے۔ فنونِ لطیفہ نے ان کے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ خطاطی۔ شبیہ کشی میں دلی۔ آگرے۔ ایران۔ راجستھان سے گولکنڈہ پیچھے
نہیں رہا۔ جو مصور قلمی کتابیں قطب شاہیوں کی مل جاتی ہیں ان میں کی تصویریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کھیل۔ چوگان۔ گھمنڈی۔
کبڈی اور سینکڑوں اندر خانہ یا باہر خانہ کھیل کھیلے جاتے تھے۔ میلے ٹھیلے رتج تہوار کسی معاشرے کی جان ہوتے ہیں۔ جتنا معاشرہ جی دار
ہوگا اتنی ہی رونق اور چہل پہل۔ شان شوکت تہواروں میں ہوگی۔ دربار تو روز کے ہی میلے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے دسہرہ کی عید
تبارک عید، سکھ پلاس عید کے تہوار بھی بڑے اہتمام سے منائے جاتے۔ عید سعدی۔ عید میلاد النبی۔ عید میلاد علی۔ عید منقبت ہوا
عید غدیر۔ شب برات۔ عید رمضان۔ بقرعید۔ نوروز۔ بسنت سالگرہ۔ شب معراج۔ عزاداری محرم۔ لنگر۔ بی بی کا علم۔ عرس
وہ شریف۔ قطب شاہی علم صنعت کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ آج تک لنگر۔ بی بی کا علم۔ مولا علی اور لنگر پلی کا میلہ قطب شاہیوں کی
یادگار باقی ہے۔ مردوں کا لباس ازار۔ نیمہ۔ جامہ۔ سر پر گوش پیچ کی دستار۔ یہ لباس محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے شروع ہوا۔ اس سے
پہلے حاکم ولایتی لباس۔ خفتان۔ قبا۔ عمامہ۔ کلاہ تاج پہنتے۔ اکبر کے زمانے میں میرا خیال ہے دکن سے یہ لباس شمالی ہند کے درباروں میں گیا۔
حضرت بہادر شاہ ظفر تک یہی رہا۔ ورنہ پہلے چہرے اور لٹ پٹی دستار کا رواج تھا۔ جمشید قطب شاہ کا لباس جو عام طور پر تصویروں
میں دکھایا گیا ہے۔ وہ تصویریں اٹھارویں۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی ہیں۔ جامے کے اوپر جا دوا۔ شال۔ دو شالہ بھی اوڑھا جاتا تھا۔
بند قرچی اور نیمہ آستین کا بھی رواج تھا۔ دستاروں میں کلغی ہوتی۔ گلے میں کنٹھے۔ بازوؤں پر بازو بند۔ جوشن۔ ہاتھوں میں سمرن۔ انگلیوں
میں انگوٹھیاں۔ پاؤں میں کفش۔ ہاتھوں میں ڈھونگ یا فرنگ۔ کمر میں پٹکا جس میں جمدھر یا کٹار اڑسی ہوئی۔ عورتیں عطر۔ تیل پھلیل میں بسی
ہر طرح کے بال بنے۔ چوٹیاں گندھی۔ یا جوڑے بندھے۔ زلفیں چھٹیں۔ مانگ میں موتیوں کی لڑ۔ ماتھے پر جڑاؤ ٹیکا۔ سر پر سیس پھول۔
چاند سورج۔ سیس جال۔ چوٹیوں پر جڑاؤ چوٹی۔ ہندو فرقوں کے قشقہ لگا۔ کانوں میں بالے۔ بالیاں۔ جھمکے۔ جھنکے۔ کرن پھول۔
ویرنے۔ در۔ گلے میں چمپا کلی۔ جگنی۔ گلوبند۔ طرح طرح کے کنٹھے۔ ہار۔ نوسر ہار۔ موہن مالا۔ حمائل۔ بدھی۔ تعویذ ناد علی۔ انگلیوں
میں انگوٹھیاں۔ چھلے۔ گھونگرو۔ ہاتھوں میں چوڑیاں۔ کنگن۔ کڑے۔ پہنچیاں۔ دست بند۔ سمرن۔ بازوؤں پر نورتن۔ بازو بند۔ جڑاؤ
بند۔ جوشن۔ انگے۔ کمر میں کمر سونے کا یا جڑاؤ کمر پٹکا۔ پاؤں میں کڑے۔ خلخال۔ پازیب۔ گھنگرو۔ پاؤں کی انگلیوں میں چٹکی۔
بچھے بہت سے گہنے تلنگانے کے ہیں۔ اور ان کے نام بھی تلنگی۔ پاؤں میں کفش۔ زربفت۔ کمخواب۔ مشروع۔ اطلس کے چست سینہ کا
پائنچے کے پاجامے۔ پاجامے پر بغیر کمر کا پشواز۔ ململ یا آب رواں کی۔ یا جامدانی کی یا موسم کے رنگوں میں رنگی۔ پشواز چالیس پچاس پاٹ سے
بنائی جاتی۔ پاشنے تک کی ہوتی۔ اور کمر تولی سے چنت شدہ کر پاٹوں کو جوڑ کر سی لی جاتی۔ کمر کی ناپ کے برابر کمر تولی ہوتی۔ جس کے دونوں سرے

پر مضبوط ریشم کی ڈوریاں۔ ساری کبھی زرآمیز ٹکی ہوتیں اس کو پاجامے کے نیفے پر باندھ کر اوپر ریشمی یا کارچوبی۔ یا جواہر نگار پٹکا باندھ لیا جاتا۔ پٹکا بارہ گز سے کر چھ گز تک ہوتا اور آدھ گز سے کچھ زیادہ عرض ہوتا اس کے دو پلو برابر گز گز بھر لمبے لٹکتے چھوڑ دیئے جاتے۔ اور باقی کمر میں چاروں طرف سے کس کر لپیٹ لیا جاتا۔ جسم میں چولی ہوتی۔ جس کی پشت کا پارچہ نابوت ہوتا۔ اور مونڈھے ہوتے آدھے بازو تک چسپت آستین اور جہاں ہندوستانی محرم کی چڑیا ہوتی ہے۔ وہاں گرہ دیکر چولی کے پاچے باندھ لئے جاتے۔ دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا جاتا۔ یہ چار ساڑھے چار گز لمبا ہوتا۔ کبھی اس کا ایک پلو نیفے میں اڑس کر اور گاتی مار کر اوڑھ لیا جاتا۔ جاڑوں میں سمور۔ سنجاب۔ قاقم کا بھی رواج تھا۔ عبداللہ قلی قطب شاہ کی چھ ہزار سہیلیاں تھیں۔ یوں کہو۔ یہ مامائیں۔ پیش خدمتیں۔ داروغنیں۔ چولنیاں۔ مخلانیاں تنبول خانے والیاں۔ عطر خانے والیاں۔ آبدار خانے والیاں۔ حمام کروانے والیاں۔ توشک خانے والیاں۔ خاصے والیاں۔ نعمت خانے والیاں پوشاک پہنانے والیاں۔ سواری اٹھانے والیاں ہوں گی۔ ہر صنعت کے کاریگر موجود تھے۔ تانبے۔ پیتل۔ سونے۔ چاندی۔ ہفت جوش۔ اور پتھر کے برتن بنتے۔ سونے چاندی کے اور جڑاؤ زیور بنتے تھے۔ سینے کا کام اچھا ہوتا تھا۔ علاوہ بتہ ڈورے اور ظروف ڈھالنے میں کمال دکھاتے تھے۔ کاغذ چین اور ایران سے آتا اور یہاں بھی بنتا۔ روشنائیاں یہاں تیار ہوتیں۔ ہتھیار بھی یہاں بہت عمدہ فولاد کے تیار ہوتے توپوں میں یہاں بہت ایجاد ہوئی اور ان کی طاقت میں ترقی ہوئی۔ پھٹنے والے گولے تیار ہوئے اور مشین گن کے طرح چلنے والی توپیں بنیں۔ زراعت اور باغبانی کے لئے تالابیں بنائے گئے۔ رسل رسائل کا بھی اچھا انتظام تھا۔ کہ بیویاں اپنے جنگجو شوہروں میں لڑائی کے میدانوں میں خط بھیج کر دشمن سے لڑنے کا اور ملک کی حفاظت کرنیکا جوش دلاتیں۔ فن پارچہ بافی اور طباعی نے بھی خوب ترقی کی۔ آداب محفل سے سب واقف تھے آئین دربار سب پر عیاں تھے۔ غرض۔ یورپ سے اس زمانے کی یہ دکن کی ریاستیں، تہذیب و شائستگی میں بہت بڑھی ہوئی تھیں امریکہ تو اس وقت کسی شمار قطار میں نہ تھا۔ چین جاپان تک کے

بقیہ: میئر بلدہ کا خراج عقیدت صلا سے آگے ۔

حیدرآباد کے ہندو اور مسلمان دونوں آندھرا کو اپنا ملک اور شہر حیدرآباد کو اپنی راجدھانی سمجھ کر اس سے دلی محبت کرتے ہیں اور یقین ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اس قدیمی کلچر اور فراخ دلی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور جس طرح ہمارے شہر کی صاف و پاک سڑکیں، عالی شان عمارتیں اور خوش گوار آب و ہوا پورے ہندوستان میں مشہور ہے۔ ہمارا یہ کلچر میل جول اور اخلاق و محبت بھی اپنے ملک کی عزت بڑھانے میں ہمارا بہت دور تک ساتھ دیگا۔

محمد قلی قطب شاہ کو اپنے شہر سے اتنی محبت تھی کہ وہ ہمیشہ خدا سے دعا کیا کرتا تھا کہ یہ شہر معمور رہے اسی طرح جس طرح سمندر میں مچھلیاں بھری رہتی ہیں اور چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لئے خدا نے اس کی یہ دعا قبول کی اور آج تک ہمارا شہر بھرپور رہا اور اب آندھرا پردیش کا یہ پایہ تخت بن جانے کی وجہ سے اس کی آبادی اور رونق میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اس شہر کا میئر بلدہ ہونے کی حیثیت سے میں بھی دعا کرتا ہوں کہ یہ شہر اسی طرح آباد اور یہاں کے بسنے والے ہمیشہ شاد رہیں اور اس کے بانی کی ان روایتوں کو زندہ رکھیں۔ جو اس نے شہر کی تعمیر کے وقت عوام کی سہولتوں اور آرام و اطمینان اور خوشی و خرمی کے لئے اس شہر میں جاری کی تھیں۔

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

آندھرا پردیش کا کلچر

جن محرکات سے تمدن کی تعمیر ہوتی ہے ان میں سب سے پہلے جغرافیہ اور طبعی ماحول سامنے آتا ہے۔ ملک کا موقع محل نشیب و فراز، گرم و سرد ہوائیں قوموں کی زندگی ڈھالتے ہیں۔ اس طبعی ماحول میں قوموں کی تہذیب اور بود و باش بنتی ہیں۔ دوسرا تصور حیات ہے جو ملک کے معلمِ اخلاق اور رہنمائے سیاست اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اسی سے زندگی کے سانچے بنتے ہیں یہاں سنورتی ہیں۔ تصورِ حیات کو ایک مشعلِ ہدایت سمجھنا چاہیئے۔ انہیں کے زور سے سیاسی اور معاشرتی آندھیاں اٹھتی ہیں۔ اور انقلابات ہوتے ہیں اور سماج کے نقشے بدلتے ہیں۔ اس تلاطم میں کبھی باہر کے اثرات بھی کام کرتے ہیں۔ یہ بیرونی اثرات کبھی حملہ آوروں کے ساتھ آتے کبھی تاجروں اور سیاحوں کے ہمراہ ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک قوم سے دوسری قوم کو اپنے خیالات اور تصورات بدلنے کا بڑا موقع ملا۔ اور دیے سے دیا روشن ہوا۔ آندھرا پردیش کا تمدن بھی کچھ ایسے ہی محرکات کا نتیجہ ہے۔

آندھرا پردیش دکن کا مشرقی خطہ ہے۔ جو چلکا لیک سے جنوب تک خلیج بنگال کے متوازی چلا گیا ہے۔ اس کے حدود مغرب میں برار اور کولار سے ملتے ہیں تو شمال میں اڑیسہ سے جڑتے ہیں اور جنوب میں چیتور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرقی گھاٹ کے سلسلے جو سمندر کے متوازی چلے گئے ہیں آندھرا کو دو حصوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ مشرق میں سمندر کے متوازی وہ زرخیز اضلاع ہیں جن کو شمالی سرکار کہا جاتا ہے اور مغرب میں اضلاع تلنگانہ واقع ہیں۔ اسی خطے میں کاکتیا خاندان نے راج کیا۔ اور یہیں قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی جو آج آندھرا پردیش ہے۔ اس خطے کی ریتیلی زمین جس میں پانی کے بڑے زرخیز ذخیرے جمع ہو سکتے ہیں اور سنگ خارا کی چٹانیں اس کو دکن کے دوسرے خطوں سے الگ کر دیتی ہیں۔ آندھرا کے پہاڑ اور اس کی چٹانیں جو ایک دوسرے پر جمی ہوئی نظر آتی ہیں اس ملک کا امتیازی نشان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان چٹانوں کو ایک دوسرے پر بڑی احتیاط اور تدبیر سے جما دیا ہے جنہیں دیکھ کر اس خطے کو دور سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ آندھرا ہے۔ اس ملک کی دولت اس کے دریاؤں میں چھپی ہوئی ہے۔ جو مغرب سے مشرق کی طرف بہتی ہیں۔ یہ ندیاں قدیم زمانے سے اس ملک کو سیراب کرتی اور ملک کی زرخیزی بڑھاتی رہی ہیں۔ گوداوری، کرشنا، تنگ بھدرا اور ان کا سفید شفاف پانی جو چٹانوں پر سے بہتا ہوا درختوں کے جھرمٹ سے گزرتا ہے، بڑی دلکشی پیدا کرتا ہے۔ ان دریاؤں کی شاداب وادیاں اور دھان کے لہلہاتے کھیت باہر کے سیاحوں اور ناکتوں کو یہاں کھینچتے رہے۔ مارکو پولو اور میگنیز نے اس کی شادابی کا ایسا دلکش مرقع کھینچا تھا کہ اب بھی وہ سننے والوں کے دل موہ لیتا ہے۔ مغل شہنشاہ بھی آندھرا پردیش کے گرویدہ۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب یہاں سے گزرے تو یہاں کے سرسبز اور لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر ششدر ہو گئے اور کہا کہ یک قطعہ زمین

سے مزروعہ نیست" اسی لیے سردی بہت کم اور گرمی مختلف مدارج میں پڑتی ہے۔ یوں تو مشرقی اضلاع میں جو کرشنا پر واقع ہیں گرمی زیادہ ہوتی ہے لیکن اس خطے کا سب سے زیادہ دلکش اور خوشگوار موسم برسات ہے جو مزاجوں میں شگفتگی اور کھلنے پینے میں لطافت پیدا کرتا ہے۔ جب کالی گھٹائیں جھوم جھوم کر برستی ہیں تو جنگل کے جنگل ہرے ہو جاتے ہیں۔ دریاؤں کی وادیوں میں طرح طرح کے پھول کھلتے اور خوشبوئیں اٹھتی ہیں کہ دیکھنے والے دنوں تک سیر نہیں ہوتے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے امرا و سلاطین کو جنگل اور باغوں کی سیر کیلئے کھینچ لاتے تھے۔ اس موسم کی رنگینیاں اس قدر متاثر کرتی تھیں کہ خوش حال لوگ گھروں میں نہیں بیٹھتے تھے بلکہ کھلے میدانوں میں نکل جاتے تھے۔ شاعر اس موسم میں گیت گاتے تھے کہ ان کے نغموں سے فضا بسیط گونج جاتی تھی۔ اور موسم کی رنگینیاں اور دلکشیاں، کوئل کی کوک دلوں میں چٹکیاں لیتی اور من چلے دلوں کو ابھارتی تھیں۔ ان ہی معتدل اور خوشگوار میں آندھرا قوم بنی اور اس کا تمدن اجاگر ہوا۔ اس ہواؤں کے طبعی ماحول اور معتدل ہواؤں کو دیکھکر فوراً یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس ملک کا تمدن بھی کس قدر معیاری اور خوشگوار ہو سکتا ہے۔

آندھرا ایک خاموش اور پرسکون خطہ ہے جس کی ٹھنڈی ہوائیں اہل آندھرا کو ایک متوازن زندگی سکھلاتی ہیں۔ اس میں بہت سے خاندان فلسفی اور معلم اخلاق پیدا ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ ذہنی توازن کا سبق دیا۔ ان کے نغمے تلاطم پیدا کرنے کی بجائے دلوں میں ٹھنڈک پیدا کرتے اور زندگی کو پرسکون اور معتدل بناتے۔ اسی وجہ سے آندھرا کے باشندے جنگ و جدل سے اپنا دامن چھڑاتے رہیں۔ آج صدیاں گزر گئیں کہ یہاں تلواروں کی جھنکار نہیں بلکہ امن و شانتی کا سبق پڑھا گیا۔ بلکہ کبھی کبھی بیرونی حملہ آوروں نے تو یہاں یورشیں کیں۔ اور اس کی خاموش فضا کو متلاطم کیا لیکن اہل آندھرا نے اپنے خطے سے باہر نکل کر کسی دوسری آبادی پر چڑھائی نہیں کی کیونکہ وہ ہمیشہ امن و شانتی کا سبق دیتے رہے۔ آندھرا کی پرسکون تاریخ ہے جس میں سیاسی اور معاشرتی الٹ پھیر نہیں ہوئی۔ اس میں آندھیاں نہیں لیکن ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو میں سکون اور ہر شعبۂ حیات میں ایک کیف آور توازن پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اور خطوں کی نسبت یہاں مذہبی رواداری اور بھائی چارہ زیادہ ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ملک کی فضا اس قدر پرسکون اور خاموش ہو وہ تمدن کی ترقی کا پورا سامان مہیا کرتا ہے۔ پر آشوب زندگی میں تمدنی ترقی کہاں ہو سکتی ہے۔ اہل آندھرا نے اپنی خاموش فضا میں تمدن و ثقافت کے جس قدر رنگ محل بنائے وہ دوسرے خطوں کو نصیب نہیں ہوئے۔ یہاں بلند پایہ کردار بنے تو ادب و فنون لطیفہ کی خاطر خون آبیاری بھی ہوئی اور ادیبوں شاعروں کے جواہر پارے جمع ہوئے تو سنگ تراشی کے نظر افروز نمونے سامنے آئے۔

بارھویں صدی سے آندھرا پردیش کا روشن زمانہ شروع ہوتا ہے۔ جبکہ کاکتیا خاندان یہاں راج کرنے لگا۔ کاکتیا راجگان چالوکیہ سلطنت کے صوبہ دار تھے جب کلیانی میں چالوکیہ سلطنت دم توڑنے لگی تو یہ صوبہ دار آندھرا میں خود مختار بن بیٹھے۔ یہ آندھرا پردیش کا ایسا زمانہ ہے جس میں یہ خطہ اپنی ملنگی زبان اور تمدن کے ساتھ نمایاں ہوا۔ کاکتیا راجگان جو راجہ بیلم کے اولاد میں ہیں ہنمکنڈہ کے رہنے والے اور تلنگی زبان اور تمدن کے پرستار تھے۔ یہ دو سو سال کی زرخیز تاریخ ہے۔ جس میں آندھرا قومیت، زبان اور تمدن کے خد و خال نمایاں ہوئے اور یہ خطہ دکن کے دوسرے خطوں سے الگ ہو گیا۔ کاکتیا خاندان کے تین راجگان پرتاب، واسدیو، رام گنپتی اور مادیو بڑے راجہ گزرے ہیں جنہوں نے تلنگی ادب و روایات کی دل سے آبیاری کی۔ تلنگی زبان اور ادب کو اسقدر سینچا کہ یہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔ ملک کے عام شعبۂ حیات میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہنمکنڈہ جو اس خاندان کا پایہ تخت تھا تلنگی تمدن سے جگمگا اٹھا۔ یہاں عمارتیں بنیں۔ بازار سجائے گئے۔ جن کی خرید و فروخت اس زمانے کی تمام تمدنی ضروریات پوری کرتی تھیں۔ اس زمانے کا مورخ

گولکنڈہ کے تمدنی زندگی کا بہت اچھا نقشہ کھینچے ہیں۔ بازاروں میں رونق تھی۔ شہر میں مسافروں کی پوری نگہداشت ہوتی تھی اور شہر میں مسافروں کے کھانے پینے کے لئے جگہ جگہ ہوٹل کھلے ہوئے تھے۔ جس میں اچھے کھانے مل جاتے تھے۔ شہری زندگی صاف ستھری تھی اور علمی و سماجی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ یہ اچھے خاصے تمدن کا نقشہ ہے اس کی تصدیق اس دور کے آثار باقیہ اور ادبی ذخیرے سے ہوتی ہے! ہنمکنڈہ میں ہزار ستون والا مندر اور پاکھال میں راجہ کادیول کاکتیا خاندان کی اچھی نشانیاں ہیں۔ ورنگل قلعہ میں سنگ تراشی کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ پتھر کی ایسی لطیف تراش جس میں باریک نقش و نگار اور پھول اور پھول کی پنکھڑیاں دکھائی گئی ہیں حیرت سے خالی نہیں ہیں۔ ادب و زبان کے معماروں میں کئی نام آتے ہیں جنھوں نے تلنگی زبان کو پروان چڑھایا اور ذہنی کد و کاوش سے مالا مال کیا۔ تلنگی زبان کی ترقی زیادہ تر اسی کاکتیا دور کی رہین منت ہے۔ تکنا شاعر کا نام سب جانتے ہیں جس نے "مہابھارت" کو تلنگی زبان میں منتقل کیا تھا۔ چنانچہ تلنگی زبان پڑھنے والے اسی شاعر کی بدولت شمال کی تاریخ اپنی زبان میں پڑھنے کے قابل ہو رہے تھے۔ جھکانیا اور مہرتا جو تکنا سومیاجی کے چیلے تھے۔ دو بڑے شاعر ہیں جنھوں نے نظم میں اس دیش کی تاریخ اور بزرگوں کی سوانح قلم بند کرکے اور اس طرح تلنگی زبان اور ادب کو سنوارا تھا۔ سوالیکا سچنا اور کرشنا جاری اس دور کے فلسفی اور معلم اخلاق گذرے ہیں جنھوں نے اپنی مذہبی نظموں سے عقائد میں جلا پیدا کی اور ملک کی دینی اور اخلاقی فضا کو شگفتہ بنایا۔ آندھرا کے رہنے والے ان معماران تہذیب و تمدن کو نہیں بھول سکتے۔

محمد قلی قطب شاہ جو شہر حیدرآباد کا بانی ہے آندھرا پردیش کا بڑا معمار ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اس نے اپنے بزرگوں سے زیادہ تلنگانے کی سیاسی اور سماجی خدمت کی۔ شہر بسائے، عمارتیں بنائیں۔ دینی اور اخلاقی ترقی کا انتظام کیا۔ خود تلنگی سیکھی اور اس میں اشعار کہے۔ محمد قلی نے اپنی دکھنی نظموں میں تلنگانہ کی تمام معاشرت اور روایات کا ایسا اچھا مرقع کھینچا ہے کہ گویا وہ اس کی اپنی روایتیں ہیں۔ اس نے ترکی اور ایرانی پرانی پوشاک اتار دی۔ تلنگانہ کا لباس پہنتا تھا کہ گویا وہ آندھرا کا سچا سپوت ہے۔ گولکنڈہ کا آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ اپنی قوم پرستی اور رواداری کی بدولت آج آندھرا پردیش کے ہر بچہ کی زبان پر ہے بھدرا چلم کا مندر جو دریائے کرشنا پر واقع ہے اور بھدرا چلم جو گوداوری کی وادی میں ہے اس کی رواداری کی زندہ مثالیں ہیں۔ اس کے بلند کردار میں رواداری اور رعایا پروری کی بھری ہوئی تھی۔ تاریخ گولکنڈہ کا قیمتی سرمایہ ہے۔ تاناشاہ نے ہر موقع پر اپنے بلند کردار کا مظاہرہ کیا۔

قطب شاہیوں کے تمام تمدنی کارناموں کا جائزہ لینا مشکل ہے۔ اس پر ایک ضخیم جلد لکھی جا سکتی ہے۔ قطب شاہیوں نے آندھرا پردیش کی اس قدر تمدنی خدمت کی کہ وہ ان کی وطن کی خدمت ہے۔ بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ نہایت دیانت داری کے ساتھ اہل ملک کی قسمتوں کے فیصلے کئے۔ علماء کی سرپرستی کی جس میں عربی، فارسی اور تلنگی ہر چیز شامل ہے۔ عربی اور فارسی میں کتابیں لکھوائی گئیں۔ تلنگی میں نظم و نثر کا ذخیرہ جمع ہوا۔ مدرسے اور مسجدیں بنائیں۔ زراعت، صنعت و حرفت کو اس قدر ترقی دی کہ گولکنڈہ ایک عصری حکومت معلوم ہوتی تھی۔ لکڑی اور لوہے کی صنعتیں ترقی پا گئیں۔ لوہے کے ہتھیار بیرون ہندوستان بھی جاتے تھے۔ کپڑوں میں تنزیب، چھینٹ اور قلم کار تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ مسولی پٹم کے قلم کار جو آج بڑے خاندانوں میں دستیاب ہیں وہ قطب شاہی زمانے کی یاد تازہ کرتے ہیں لیکن قطب شاہیوں کا سب سے بڑا کارنامہ شہر حیدرآباد کی تعمیر ہے۔ موسیٰ ندی کی وادی میں جہاں اس

شہر کی تعمیر کی گئی۔ چند جھونپڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں کبھی بنجاروں کے ٹانڈے گزرا کرتے تھے۔

سنہ ۱۶۸۷ء میں گولکنڈے کا خاتمہ ہوگیا اور یہ سلطنت مغل شہنشاہیت میں ضم ہوگئی جس میں آندھرا پردیش بھی تھا لیکن ابھی شہنشاہیت جنوب میں مضبوط ہونے نہیں پائی تھی کہ شہنشاہ اورنگ زیب کا سنہ ۱۷۰۷ء میں انتقال ہوگیا اور شہنشاہیت کے جلد جلد تار و پود بکھرنے لگے۔ ان مایوس کن حالات میں نظام الملک آصف جاہ نے سنہ ۱۷۲۴ء میں شکر کھیڑے کی جنگ کے بعد دکن میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرلی۔ یہ بہت وسیع سلطنت تھی جو دریائے تاپتی سے لے کر جنوب میں مدورا تک پھیلی ہوئی تھی جس میں آندھرا بھی ایک صوبہ تھا۔ نظام الملک اور ان کے جانشینوں نے دکن اور آندھرا کی تمام روایتیں باقی رکھیں۔ گولکنڈہ کی سرکار سے جن مندروں کو امداد ملتی تھی وہ برابر جاری رہی۔ ابھی تک بھدراچلم کی نذر کنگ کوٹھی سے جایا کرتی ہے لیکن نظام الملک کے جانشین صلابت جنگ کی کمزوری سے ایک تاریخی حادثہ ہوگیا۔ پہلے مشرقی آندھرا حکومت کے قبضہ سے نکل گیا۔ اور ان پر انگریز قابض ہوگئے۔ یہ ساحل کا زرخیز علاقہ ہے جس میں سکاکول، راجمندری، ایلور، گنٹور اور کنڈہ پلی شامل ہیں۔ اور ان کو شمالی سرکار کہتے ہیں۔ آصفجاہی سلطنت کو ان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ حیدرآباد کے ہاتھوں میں صرف تلنگانہ کے نو اضلاع رہ گئے اور مشرقی گھاٹ حد فاصل قرار پائی۔ شمالی سرکار پر پہلے فرانسیسی قابض ہوئے تو بعد میں انگریزوں نے ان سے چھین کر اپنا راج قائم کردیا۔ اس سے آندھرا پردیش میں خلیج حائل ہوگئی۔ مشرق میں انگریزی راج تو تلنگانے میں مغلائی عملداری میں جہاں نظم و نسق میں تفریق ہوجاتی ہے تو معاشرت، ذہنیت اور روایات میں بھی بہت فرق پڑجاتا ہے۔ اس پر آج دو سو سال گزر گئے۔ سنہ ۱۷۵۸ء میں شمالی سرکار حیدرآباد سے الگ ہوئے تھے۔ اور سنہ ۱۹۵۶ء تک یہ تفریق باقی رہی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ جدید سیاست میں یہ دونوں خطے آندھرا اور تلنگانہ جوڑ دیئے گئے ہیں اور ہم اس کو آندھرا پردیش کہہ رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس دیش میں ہماری قدیم پاکیزہ روایتیں باقی رہ جائیں گی۔

بقیہ :۔ آنکھوں دیکھا حال صفحہ ۲۳ سے آگے :۔

مشترکہ ورثہ بن چکے ہیں۔

اس جلسہ میں جناب جگناتھ آزاد نے بھی شرکت کی۔ اور اپنا کلام سنایا۔ تلگو داں حاضرین نے آپکے کلام کو خوب پسند کیا اور کھل کر داد دی۔

آخر میں جناب صدر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ”محمد قلی قطب شاہ آرٹ اور ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ وہ رہتی دنیا تک عوام کے دلوں میں زندہ رہے گا کیونکہ وہ ایک شاعر تھا اور محبت بھرا اور کشادہ دل اپنے سینے میں رکھتا تھا۔ وہ اردو اور تلگو کلچر کا عدیم المثال نمائندہ تھا۔ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے اس تقریب کا انعقاد بروقت اور قابل قدر جذبہ ہے جس کے لیئے اس کے مستعد اور قابل معتمد جناب ڈاکٹر زور مبارکباد کے قابل اور مستحق ہیں۔ گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی میں اس تقریب میں شرکت کیلئے بطور خاص دہلی سے حیدرآباد آیا ہوں اور اس وقت آپ حضرات کے درمیان میں ہوں۔ تلگو داں حضرات کے اس وسیع ادبی اجتماع میں شرکت کرنے والے اس مجمع اور انسانی سروں کو دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوتی ہے کہ اسقدر کثیر تعداد میں لوگ یہاں موجود ہیں اور بڑے پیار اور احترام کے ساتھ بانیٔ شہر کو خراج عقیدت پیش کرنے آئے ہیں۔ حیدرآباد وہ شہر ہے جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ اور جب بھی اس شہر کا نام آتا ہے اس کے بانی محمد قلی قطب شاہ کی یاد ذہن میں تازہ ہوجاتی ہے۔ اپنے دور کے ہم عصر حکمرانوں کے برخلاف محمد قلی قطب شاہ کی کامرانیاں میدان جنگ کی بجائے امن و امان اور خدمت خلق کے میدان میں رہی ہیں۔“

صدارتی تقریر کے بعد یہ اجلاس برخاست ہوا۔

زینت ساجدہ

محمد قلی اور اس کی شاعری

عام طور پر شاعری صرف انفرادی اور دلی جذبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جو اور بہت سے خارجی پہلوؤں اور تجربات کا اپنے کلام میں اظہار کرتے ہیں۔ اشاروں اور کنایوں سے بات کہہ جانا اور بات ہے لیکن اپنے عہد کی مفصل تاریخ کوئی نہیں لکھتا۔ اردو میں نظیر اکبر آبادی کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اپنے جیتے جاگتے نمونے اور معائب و محاسن کو پوری پوری ایمانداری سے پیش کیا ہو۔ لیکن ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ دکھنی زبان کا شاعر محمد قلی قطب شاہ کچھ کم چار سو سال پہلے جو لکھا ہے اس میں اس عہد کی جیتی جاگتی تصویریں جھلکتی ہیں۔ اس نے عاشقانہ شاعری بھی کی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی نظموں میں وہ تہذیب و تمدن کے مختلف نمونے پیش کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے عہد کا مستند مورخ بھی ہے مثلاً اپنے ایک محل کی تفصیلات لکھتا ہے ؎

خدا داد محل کوں محمد سنوارے ۔۔۔ تو اس میں جنت کے نگاراں نگارے
بلندی محل کا ہے اسمان جیسا ۔۔۔ سورج، چاند، تارے سو اس نے سنگارے
جو آٹھوں بہشت منے آٹھوں جھجے ہیں ۔۔۔ خضر چشمے بہتے ہیں تس میں سدا رے

عام طور پر اردو شاعری میں غزل کو جو مقبولیت نصیب ہوئی وہ اور کسی صنف شاعری کو حاصل نہ ہو سکی لیکن محمد قلی کی قادر الکلامی یہ ہے کہ وہ غزل کا سب سے کامیاب شاعر ہونے کے علاوہ تمام مروج اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتا ہے اور ہر ایک صنف کے معیار کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔ اس کے ہاں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور دوسری موضوعاتی نظموں کی کمی نہیں۔ جتنا حصہ کلام غزلوں پر مشتمل ہے اتنا ہی نظموں پر۔ اس سے اس کی مشق سخن کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پڑھنے والوں کو اس عہد کے محرم، بسنت، نوروز، شاہی سالگرہ، عید میلاد، ہولی، دیوالی، غرض ہر تقریب کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ موضوعات کا یہ تنوع اس کی مشق سخن پر دلالت کرتا ہے۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا ۔۔۔ تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں تارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور سا جناں یوں ۔۔۔ کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ ۔۔۔ رنگیلا ہور ہیا ترلوک سارا

عام طور پر بادشاہوں اور امراء سے جو علمی و ادبی خصوصیات منسوب کی جاتی ہیں ان میں شک و شبہ کی بہت گنجائش ہوتی ہے

کیوں کہ بادشاہوں کے جہاں اور مشغلے اور شوق ہوتے ہیں ان میں سے یہ بھی ایک شوق تھا کہ درباری شعراء سے کچھ لکھوا لیا اور اپنے نام سے منسوب کر دیا لیکن محمد قلی کی حیثیت اس معاملہ میں اور ہے۔ یقیناً وہ شعراء اور اہل علم و فن کا بڑا قدردان تھا، لیکن آپ اس کے معاصرین اور اہل دربار شاعروں کا کلام سامنے رکھ کر تقابلی مطالعہ کریں تو آسانی سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد قلی نے جو ضخیم کلیات چھوڑا ہے وہ خود اسی کے ذوق اور شاعری کا آئینہ دار ہے۔

چلے چندنی میں جب لٹک پیو ہارا   ادن عکس دیئے چندر تھے ابارا
جتے سائیں کے عشق کا پد پیا ہے   نہ کرے اسے ہور مستی اتارا

مسلماں ریت کافر ریت کیا ریت لے نہ جانوں میں   کہ جگ کے لوگ ریتاں چھوڑ بچھڑے ریت تج جیوا
ہزاروں منتاں کرتا تو ٹک منہ بولتی نہیں تھی   سو آج اترتا ہے باتاں یں کہ میں صد پی بلایا ہوں

محمد قلی پیدائشی فن کار ہے اور طبیعت کی یہ فن کاری کئی کئی ڈھنگ سے اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس کا ذوق اس قدر شائستہ اور آراستہ تھا کہ اس کے اظہار کے لئے اس نے شاعری اور تعمیر کاری دونوں کو چنا ہے۔ جب اینٹ اور پتھر کی تعمیر میں اس نے شاعری کی تو حیدرآباد قدیم کی وہ مرصّع عمارتیں تیار ہوئیں جنہیں دیکھ کر ایمان لانا پڑتا ہے کہ اس نقش و نگار اور ترتیب کار کا سوچنے والا یقیناً شاعر ہوگا اور اس کی نظموں کے حسن تناسب، الفاظ کے چناؤ اور ترکیبوں کی مناسبت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک تربیت یافتہ تعمیر کار ہے، موضوع کے ساتھ انصاف وہ اسی توجہ اور محنت سے کرتا ہے جس طرح سے کوئی معمار عمارت بناتے وقت طاق و محراب کی موزونیت کا خیال رکھے۔

سو خوشی تھی دیکھیا سب بن دیکھ بن یو عجب   اس کے سر کوئی نہیں سب باغ و گلشن میں عجب
سب پھلاں کی باس میں مہکار یوں پھول ناہیں   لذت اس جھلکار کا چھپیا ہے منج من عجب
جنے کامل کیا ہے یہ ایتا   غنی ہے وہ جگت میں نیں وہ محتاج

محمد قلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بیک وقت تین زبانوں کا شاعر تھا۔ تلنگی، فارسی اور دکھنی۔ تلنگی کلام کا اندازہ ہمیں نہیں۔ فارسی غزلوں کے جو تراجم اس کے ہاں ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خواجہ حافظ سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ زندگی کو عیش و نشاط میں گزارنے کا قائل ہے گویا سورۂ رحمٰن میں گنوائی ہوئی ساری نعمتوں سے لطف اندوز ہونے ہی کو عبادت سمجھتا ہے اس کی دکنی شاعری فارسی اور تلنگی شاعری کی پوری خصوصیات سے فائدہ اٹھاتی ہے۔

محبت پیالہ بھریا لے کھڑیا ہاں   دے لیوں انوں ہت میں جیوں سو جنیہ
سو لوکاں بھریا برہ کی کہانی   کہ بلیا ہے رنگ عاشقی کی نشانی
تمن عشق یہ سدیا ہے نبیج پانے اپنا   کہ ہوئی انکھاں متنا یم میں ہوں دوانی
محبت کی لذت فرشتیاں کو نہ سیا ہے   بہت سعی سوں میں سو لذت پچھانی
نبی صدقے قطبا جگت مول پایا   سواد عشق ہے اس تھے نیں خوش کہانی

شعر و شاعری میں بہار ذوق کی جو جھلک ہے اس میں محمد قلی کی محنت اور کوشش سے زیادہ اس کی قسمت کا دخل ہے اگر اور

ہوں کی طرح اس کا زمانہ بھی لڑائی، جھگڑوں میں گزرتا تو اتنی فرصت بھی اسے نہ ہوتی کہ وہ عشق و عاشقی کرتا، عمارتیں بنواتا، جشن منعقد کرتا اور محفل سرور کی رونق بنتا۔ قسمت سے اس کو اور اس کے ہم عصروں کو جو زمانہ ملا ہے وہ "دورِ قمر" تھا۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں جب قمر کا دور ہوتا ہے تو ہر طرف امن و سکون ہوتا ہے، فنون لطیفہ کو ترقی نصیب ہوتی ہے اور زندگی کی ساری نعمتوں سے لطف ہونے کے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ محمد قلی بچپن ہی سے ان تمام نعمتوں سے بہرہ ور تھا۔ کم سنی ہی میں اسے بادشاہت مل گئی حالانکہ بھائی علم و فضل میں اس سے کہیں آگے تھا۔ آسان زندگی بلا جد و جہد حاصل ہوئی۔ سہولتیں اسے خود بخود میسر آئیں۔ اس نے عشق ... میں آنکھیں کھولیں اور موقع پایا۔ عشق و عاشقی ظاہر ہے ایسے ہی فرصت کے لمحات کا مشغلہ ہے۔ اس نے دل کھول کر دادِ عشق دی ... جگہ جگہ کا انتخابِ حسن اس کے محلوں میں کھنچ آیا تھا۔ دل رکھتا تھا۔ حوصلہ فراخ تھا۔ اپنے اطراف وہ حسن و طرب چاہتا تھا۔ ... اس نے ذوق کی تکمیل کے لیے رنگ برنگے محل بنوائے۔ میلے رچائے۔ رعایا اس سے خوش اور وہ رعایا سے خوش رہا اور ... تک اسے زندگی میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

مرا قطب تارا ہے تاراں میں پھیلی — تو مجھ بر فلک رنگ کا چھت رچھایا
کرے مشتری رقص مجھ بزم میں نت — برن گانٹھ میں زہرہ کلیاں گگایا
مرا گلستان تا ... ہوا ہے — مجھے اس باغ تھے میوہ دم دم کھلایا
دندے دشمناں کوں سو یکجا ملا کر — سوا سینہ کے پاتر اں کر نچایا

اس کی شاعری سے آپ کو ان تمام باتوں کی شہادت مل جائے گی۔ عام طور پر یہ شاعر فراق کی شاعری کرتے ہیں۔ اس لیے اکثر لوگ ... بات کے قائل ہیں کہ جب تک زندگی میں کوئی تشنگی نہ ہو شعر کہنا ممکن نہیں لیکن محمد قلی کی شاعری اس نظریہ کی تردید کرتی ہے۔ اس نے ... ال کے شعر کہے، ایک بھرپور جذبات اور ان جذبات کی تسکین کے شعر کہے ہیں۔ سرمستی اور سرشاری اس کی بات بات سے ٹپکتی ہے۔ ... نہیں فراق ہے تو وہ ایسا ہے جیسے اس شخص کے آنسو جسے زندگی میں روز روز غم کھانے کا تجربہ نہ ہوا۔ وہ کھیل میں غمگین کردار ادا ... کے مصنوعی آنسو بہا کر خوش ہو کہ اداکاری کامیاب رہی اور جاہے تو غم سے بھی لطف اٹھا سکتا ہے۔ ہمارا تو یہی خیال ہے کہ زندگی ... فرصت ملتی ہے تو بھی انسان اپنے ذوق کو نکھار سکتا ہے ورنہ سب سے اچھے اہل ذوق کی شائستگی زمانہ چھین لیتا ہے۔

دعائے اماماں سے مجھ راج قائم — خدا زندگانی کا پانی پلایا
امرت گھڑی کا گھڑی میں خوشیاں طبل باجا — قطب نے مال دے تائیں گگن سیتی ملائے
روز مجھی معانی تجھ عیش کا پیالہ — بھر پیا ہر طرف لوم شوق کے مستاں

اس کے کلام میں آپ کو گہرائی نہیں ملے گی، سوز نہیں ملے گا۔ دل کو پگھلانے والی کیفیت نہیں ملے گی۔ خلوتِ غم اس کے ... نہیں اس کے پاس جلوت ہے، رعنائیاں ہیں، رنگینیاں ہیں، جوانی کا بانکپن ہے۔ اونچے سروں میں بجنے والے ساز ہیں اور ... جھوم کر گائے جانے والے گیت۔ لیکن یہی تو بہت کچھ ہے۔ مبارز کے تمام پہلو ... کے ساتھ اس کے یہاں موجود ... جہاں تک اس کے کلام کی شیرینی اور تاثر کا تعلق ہے اگر لفظی متروکات کو نظر انداز کر دیا جائے تو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ... کی شاعری ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آج ہم سارے خلاء محسوس کرتے ہیں کہ غزل کے علاوہ بھی اور باتیں خوش اسلوبی سے (بقیہ صفحہ ۱۶)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

خیر مقدمی تقریر "یوم محمد قلی قطب شاہ"

[گنبد محمد قلی قطب شاہ (قلعہ گولکنڈہ) پر تیسرے یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۰ء کے موقع پر پڑھی گئی تقریر]

خواتین و حضرات!

آج ہم سب تیسرا یوم محمد قلی قطب شاہ منانے اس پُر فضا چبوترے پر جمع ہیں اور حسن اتفاق سے آج ہی ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ بھی اپنا ایک ورق الٹ رہی ہے۔ عہد محمد قلی قطب شاہ سے آج تک اس تاریخ کے کئی ورق الٹ چکے ہیں جن میں سے بعض سیاہ تھے اور بعض سنہرے۔ جو ورق آج الٹ رہا ہے اس کو معلوم نہیں آئندہ کے مورخ کیا کہیں لیکن میں اپنی تھوڑی بہت تاریخ دانی کے بل بوتہ پر کہہ سکتا ہوں کہ حیدرآباد کی تاریخ کا ایک سنہرا ورق تھا۔

سنجیوا ریڈی کی چیف منسٹری کے دور میں حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی نقطۂ نظر سے کیا فائدہ اور کیا نقصان پہنچا اس کی سرگزشت تو میں بیان نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس تین سالہ دور میں اس ملک کے مختلف مذہب کے ماننے والوں اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے باہمی تعلقات بہت خوشگوار رہے اور یہاں کی لسانی اقلیتیں خوف و دہشت میں گرفتار نہیں رہیں جو ہندوستان کے دوسرے پردیشوں کے اردو والوں پر طاری ہے۔ یہاں اردو کو ریاست کی علاقائی زبان قرار دے کر ایک ایسی نظیر قائم کی گئی ہے جس کی آج تک کوئی دوسرا صوبہ تقلید بھی نہ کر سکا۔ اسی طرح ابھی ابھی کچھ روز قبل تاریخ و سائنس کی تلگو اکاڈیمی میں اردو کو بھی شریک کر کے اور آندھرا ساہتیہ اکاڈیمی کی طرف سے تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کی اشاعت اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو انعامات دے کر جس فراخ دلی کا ثبوت دیا گیا ہے وہ بھی اپنی آپ نظیر ہے۔

سب تاریخیں ظاہر کرتی ہیں کہ حیدرآباد کے بانی اور آندھرا کے اس عظیم الشان حکمران سلطان محمد قلی قطب شاہ نے فراخدلانہ روایات [illegible] اس کی آج تک پھول پھل لگ رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس بادشاہ کی یاد روز بروز تازہ تر ہوتی جا رہی ہے اور ملک کے [illegible] اس کے دور کی [illegible] ہو رہی ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ تیسرے یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر اس کی مجلس انتظامی نے نواب دین یار جنگ بہادر کی رہنمائی میں ایسے مفید کام شروع کئے ہیں جن سے اس ملک کے باشندوں کو دور رس فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ تاریخ و آثار گولکنڈہ سے متعلق ایک مفت تعلیمی کورس شروع کیا گیا تھا جس میں متعدد اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے شرکت کی۔ گولکنڈہ کے مشہور مورخ پروفیسر ہارون خاں شیروانی اور آثار قدیمہ کے نوجوان ماہر [illegible] نے گولکنڈہ کی تاریخ، آثار اور محلات و مقابر پر نہ صرف لکچر دیئے بلکہ گنبدوں میں [illegible] آخر میں تحریری امتحان بھی لیا گیا جس میں ۲۰ امیدوار کامیاب ہوئے جنہیں ان کی [illegible]

یم کی جائیں گی۔

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مختلف پیشوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب نے اس تربیتی نظام کی تکمیل کے لئے بڑے نیانی اور توجہ سے شرکت کی اور سعادت مند شاگردوں کی طرح ہر پہلو سے متعلق نہایت ادب سے سوالات کئے اور ہم سبھوں کو مجبور کر دیا کہ عمر بھر کی تحقیق و تلاش و جستجو کے ذخیرے ان کو خوشی خوشی سپرد کر دیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال بھی اس تربیتی کورس میں ایسے ہی مزید اب ذوق شرکت کریں گے۔ اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتا چلا جائے گا۔

اس سال ہائی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لئے اردو اور تلگو میں تحریری اور تقریری مقابلے بھی منعقد کئے گئے۔ ان میں بھی دو طلبہ نے حصہ لیا۔ اردو تقریری مقابلوں کی صدارت ہمارے پرجوش سیر بلدر روشن علی خاں صاحب نے اور تلگو کی صدارت آندھرا پردیش ہتیہ اکیڈمی کے پرخلوص معتمد ڈی راما سنجا راؤ صاحب نے کی۔ تحریری مقابلوں کے حکم کے فرائض علامہ علی اصغر بلگرامی۔ پروفیسر مجید صدیقی۔ ڈاکٹر شریف النساء انصاری اور پروفیسر ایم اے رحمٰن نے انجام دیئے۔ جن معیاری تحریریں اور تقریریں اس سلسلہ میں تیار کی گئیں ان سے ہر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان خواہ وہ اردو داں ہوں یا تلگو داں اپنے ملک کی تاریخ اور اپنے سابق حکمرانوں کی خصوصیات سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ایک ایسی علامت ہے جس کی بناء پر اس ملک کا مستقبل اور بھی تابناک نظر آتا ہے۔

ایک اور پائیدار کام یہ بھی شروع کیا گیا ہے کہ قطب شاہی عہد کی تاریخوں کو خواہ وہ کسی زبان میں ہوں چھپوا کر شائع کرنے کے لیے بورڈ بنایا گیا جس نے کام شروع کر دیا ہے۔ اس میں نواب عنایت جنگ بہادر۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی اور مولانا علی اصغر بلگرامی جیسے بلند مورخین اور آغا حیدر حسن مرزا ۔ آغا صمصام شیرازی۔ آغا حسین ضابط اور پروفیسر ایم اے رحمٰن جیسے پرجوش کارگزار شامل ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال تک از کم دو تاریخیں چھپ جائیں گی۔ سب سے پہلے ملا نظام الدین احمد کی تاریخ حدیقۃ السلاطین باتصویر چھپ رہی ہے اس تاریخ کا ایک حصہ صدی قبل خود علی اصغر بلگرامی صاحب نے اپنے ذاتی صرفہ سے چھپوا دیا تھا۔ مگر وہ بھی اب نایاب ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ کی لکھوائی ہوئی تاریخ حدائق السلاطین از علی ابن طیفور بسطامی کو ڈاکٹر شریف النساء نے نقل کر کے ایڈٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ گذشتہ سالوں سے طویل عرصہ میں ہمارے قطب شاہوں کی ایک تاریخ بھی شائع نہیں کی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو یہی ایک کام ہمیشہ یاد رہے گا کہ اس یوم کے سلسلے میں کم از کم قطب شاہی تاریخیں تو چھپ گئیں اور تاریخ ہندوستان کا ایک اور گوشہ جو تاریکی میں تھا روشن ہو گیا۔

آغا حسین ضابط کی تحریک پر قطب شاہی بادشاہوں کے پوسٹ کارڈ بھی اس سال چھاپ دیئے گئے ہیں اور اب عادل شاہی۔ [illegible] ہی بہمنی اور آصفجاہی سلاطین اور ان کے آثار کی تصویروں کے کارڈ بھی چھپ رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں بری اسلامک سلاطین کی [illegible] کے پوسٹ کارڈ بھی شائع کئے جائیں گے۔ تاریخ اور آثار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کارڈ ایک نادر تحفہ کا کام دیں گے اور [illegible] اپنے دوست احباب کے نام دور دور بطور تحفۂ عید و سال نو ان تاریخی تصویروں کو بھیج سکیں گے اور سیر و سیاحت کرنے والے ان کو [illegible] سوغات اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

[illegible] سال کے یوم محمد قلی قطب شاہ میں ایک اور اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ تلگو تقریروں اور نظموں کے لئے ایک مزید اجلاس منعقد [illegible] شام شری کرشنا دیوا رایا تلگو لائبریری سلطان بازار میں ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کی صدارت میں منعقد ہو گا۔ قطب شاہی

دور اور محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں اگرچہ تلگو زبان میں بھی اچھا ادب موجود ہے اور اہل آندھرا قطب شاہی سلسلہ کو بھی اپنے قابل فخر حکمرانوں شمار کرتے رہے ہیں مگر ضرورت تھی کہ ہماری ان تقریبات سے بھی ان کو واقف کرایا جائے۔ گذشتہ دو سالوں کے تجربے سے معلوم ہوا تلگو بولنے والوں اور خاص کر آندھرا علاقوں سے حیدرآباد منتقل ہونے والوں کی کافی تعداد اس تقریب میں شرکت نہیں کر رہی اس لئے طے کیا گیا کہ ایک جلسہ محض تلگو داں اصحاب کے لئے منعقد کیا جائے۔ مقام مسرت ہے کہ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر گوپال ریڈی نے قبول فرمائی ہے جو ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ میں شرکت کے لئے دلی سے تشریف لا رہے ہیں اور جو اصل میں اس یوم محمد قلی کے بانیوں میں شامل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہی اس تقریب کی اہمیت اور افادیت سے تلگو والوں کو بخوبی واقف کرا سکتے تھے۔ میں آپ صاحبین اور خواتین سے استدعا کرتا ہوں کہ کل کے جلسے میں بھی شرکت فرمانے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کی محفلوں کی رونق میں اضافہ کر سکیں گے۔ اور اہل اردو و اہل تلگو ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں گے۔

آج کی تقریب میں آندھرا پردیش کے چیف کارنیا اور اس کی اسمبلی کے اسپیکر جناب لے کالیشور راؤ صاحب نے نمائش کتب و تصاویر کا افتتاح فرما کر اور اپنے مصروف ترین اوقات میں سے بہت زیادہ وقت ہم کو دے کر ہمارے دلوں کو موہ لیا ہے ان کی برگزیدہ شخصیت ہم سب کے لئے ایک نمونے کا کام دیتی ہے۔ انہوں نے حیدرآباد آنے کے بعد اردو سیکھنی شروع کی۔ اور آج اس زبان کو نہ صرف سمجھتے بلکہ بولتے بھی ہیں۔ ہم سب اردو والوں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔ ایسی ہی ہستیوں کو دیکھنے کے بعد سلطان محمد قطب شاہ کے ان اشعار پر یقین کرنا پڑتا ہے جن میں اس نے لکھا ہے کہ اس کے خسر اور چچا یعنی محمد قلی اردو اور فارسی کے علاوہ تلگو میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔

میں آخر میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس اجلاس میں شرکت کرنے کی زحمت گوارا فرمائی اور ان سب دوستوں کا بھی جنہوں نے اس کے انتظامات میں ہاتھ بٹایا۔ ظاہر ہے کہ ایسے جلسے تعاون عمل اور ایثار و اخلاص کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتے۔

میں اپنے مہمان خصوصی شری سنجیویا نیز جیب مسٹر کا بھی ان کی تشریف آوری کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں اور ہم سب کی طرف سے اس توقع کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کا دور وزارت بھی آندھرا پردیش کی قدیم ترین روایات کے مطابق اپنی فیض رسانی کے باعث خوشگوار ثابت ہوگا اور اس ملک کی تاریخ کو مزید شاندار بنانے میں زیادہ حصہ لے گا۔

بقیہ محمد قلی اور اس کی شاعری۔

کہی جاتی ہیں۔ وہ ان تجربوں کو کبھی کا آزما چکا ہے۔ اس نے زندگی میں قسم قسم کے حسین تجربے کئے۔ بار بار وفاداری کی اداکاری کرتا رہا۔ اس لئے اس کے عاشقانہ کلام میں تنوع ہے۔ اس کی سراپا نگاری میں لذت اور زندگی کے خوش آئند پہلوؤں اپنی نعمتوں کی فراوانی کے ساتھ اس کے ہاں جھلکتے ہیں۔ بھاگ متی اس کے ہاں ایک نہیں کئی۔ ملے ایک سے۔ اس کے ہاں نہ بدنصیبی ہے نہ محرومی، نہ عاجزی کا ہے اور نہ ایسی باتوں کا گلہ و شکوہ جو وہ ہمت کی کوتاہی کی وجہ سے نہ کر سکا۔ اس نے جو چاہا وہ کیا۔ اس لئے اس کے ہاں سیرابی کی کیفیت ہے۔ اس کا یہی خوبصورت ہے، سرور ہے، نشاط انگیز ہے۔ یہ بھی ایک فن ہے۔ زندگی کو آنا چاہنا۔ اس کی شاعری تو بہار ہے خزاں کا گیت نہیں۔

خوشا وہ جام و شراب و خوشا وہ ذوق وصال ؎ کہ زندگی میں انہیں دو کی آرزو بس ہے

میر روشن علی خاں

محمد قلی قطب شاہ کو میئر بلدیہ کا خراجِ عقیدت

(میئر بلدیہ حیدرآباد نے یہ تقریر یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۱۰۔ جنوری ۱۹۶۰ء کے موقع پر پڑھی تھی)

شری سنجیوا ریڈی، شری کالیشور راؤ۔ خواتین و حضرات!

آج ہم سب شہر حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد منانے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ مجھے اس عظیم الشان بادشاہ کے بنائے ہوئے شہر کا میئر بلدیہ ہونے کی حیثیت سے آج اس شہر کے بانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی عزت حاصل ہو رہی ہے۔ شتہ سال شری کرشنا سوامی مدیراج نے اور گزشتہ سے پیوستہ سال شری کشن لال نے بھی جو مجھ سے پہلے میئر بلدیہ تھے یہ اعزاز حاصل یا ہے۔

میرے لئے یہ امر موجب فخر ہے کہ اس تقریب کے بانی اور معتمد ڈاکٹر زور نے آج یہ فریضہ ادا کرنے کے لئے مجھے مدعو کیا۔ ایک بلدیہ ہونے کی حیثیت سے میری روزمرہ کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ میں اس بادشاہ کے کارناموں اور شہر حیدرآباد پر اس کے احسانات بارے میں کچھ تفصیل سے اظہار خیال کرنے کے لئے اپنے آپ کو قابل نہ بنا سکا۔ تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جو کچھ میں نے تاریخ کا مطالعہ یا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ ایک بہت بڑا بادشاہ تھا۔ اور بادشاہ سے زیادہ ایک اعلیٰ پایہ کا انسان تھا۔ یہی وجہ ہے اس کی یاد منانے کے لئے تین سال سے شہر حیدرآباد کے باشندے جوق در جوق سردی کے موسم میں شہر سے اتنی دور چلے آتے ہیں۔

حضرات! یہ اس بادشاہ کی انسان دوستی ہی تھی کہ اس نے ہمارے شہر کی بنیاد رکھتے وقت رفاہ عام کے کاموں کو سب سے زیادہ یت دی۔ کسی انسان کے لئے سب سے پہلے ہوا اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حیدرآباد کی تعمیر کے وقت انہی دو چیزوں پر سب سے زیادہ زور یا تھا۔ چنانچہ اس شہر میں جگہ جگہ باغ تعمیر کئے تھے اور پانی کے چشمے اور حوض اور نہریں بنائی گئی تھیں جہاں اب وہاں وکٹوریہ زنانہ خانہ ہے وہاں ایک بہت بڑا باغ تھا جو اس بادشاہ کے وزیر محمد امین میر جملہ کے نام سے امین باغ کہلاتا تھا۔ جہاں اب ہائی کورٹ ٹی کالج کی عمارتیں ہیں وہاں ندی محل اور ندی باغ بنایا گیا تھا۔ اسی طرح جہاں اب سالار جنگ کی بارہ دری ہے اور سالار جنگ زیم بننے والا ہے وہاں خود بادشاہ کے نام کی مناسبت سے باغ محمد شاہی بنایا گیا تھا۔

دارالشفاء کی عمارت سے ندی تک ایک اور باغ لگایا گیا تھا۔ جس میں بیٹھ کر بیمار تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ یسے متعدد باغات شہر میں جگہ جگہ ہوا خوری کے لئے بنائے گئے تھے۔ اسی طرح جہاں اب چوک کی مسجد اور گھڑی ہے وہاں بھی ان دلکشائے داد محل تھا۔ جس کا ہر پہلو تین ہزار فیٹ عریض تھا۔ افسوس ہے کہ ان تمام باغات اور میدانوں میں بعد کے زمانے عمارتیں تعمیر کی گئیں اور ہمارا شہر ان ابتدائی سہولتوں سے محروم ہو گیا۔

اب پانی کے انتظام پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ شہر سے متصل بادشاہ کے نام پر میر جملہ تالاب بنایا گیا تھا۔

اور شہر کے جنوب میں تالاب جل پلی بہت بلندی پر واقع تھا جہاں سے چار مینار کی بلندی تک پانی لایا گیا تھا اور پھر چار مینار کے چاروں طرف جو سڑکیں تھیں ان کے دونوں طرف پانی کی نہریں بہتی تھیں۔ افسوس ہے کہ بعد کے زمانے میں بند کردی گئیں اور سڑکیں بھی چھوٹی کردی گئیں۔ کیونکہ نہروں پر دوکانات بنادیے گئے۔

ان نہروں کے علاوہ ہر چوراہے پر بڑے بڑے حوض پانی سے لبریز رہا کرتے تھے۔ جن میں چار سُو کا حوض اور دادمحل کے حوض بہت مشہور اور بہت بڑے تھے۔ جن کی بیرونی سیاحوں نے بھی بڑی تعریف کی ہے۔ ان مصنوعی ذریعوں کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ شہر کو ایک قدرتی ندی جس کو ہم موسیٰ ندی کہتے ہیں اس کے کنارے پر آباد کیا جائے۔ جس کی وجہ سے سال بھر قدرتی بہتا ہوا پانی دستیاب ہوسکتا تھا۔

پانی اور ہوا کے بعد شہری ضروریات کے تحت دواخانے۔ حمام۔ کارواں سرائیں اور بازارات کی طرف توجہ کی گئی۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حیدرآباد کی تعمیر کے وقت بارہ سو حمام پبلک کے استعمال کے لئے مختلف مقامات پر بنائے گئے تھے۔ اور چودہ ہزار دوکانیں قائم کی گئی تھیں۔ دواخانوں میں دارالشفاء کی عمارت اب تک موجود ہے جس میں بیماروں کے رہنے کا بھی انتظام تھا۔ اور باہر کے بیمار بھی آکر دوا لے جایا کرتے تھے۔ ان دواخانوں کے لئے دور دور سے بڑے بڑے حکیم اور طبیب بلائے گئے تھے۔ جن کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

شہر کے باہر چاروں طرف مسافروں اور تاجروں کے لئے کارواں سرائیں بنائی گئی تھیں جن میں سب سے بڑی سرائے پرانا پل اور قلعہ گولکنڈہ کے درمیان بنائی گئی جس کے کچھ حصے اب بھی موجود ہیں۔ ان کی بلندی اور وسعت دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کیسے بڑے دل و دماغ کا انسان تھا۔

میں نے یہ سب باتیں صرف شہری نقطۂ نظر سے بیان کی ہیں اور ان کے مادی ثبوت آج تک ہمارے شہر میں موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کے زمانے میں شہر کا وہ نقشہ منسوخ کردیا گیا۔ اور پبلک عمارتوں کو خودغرض لوگوں نے خانگی رہائشوں میں منتقل کرلیا۔

آندھرا اور تلنگانہ دونوں اس کی سلطنت میں شامل تھے اور اب جبکہ دو سو سال کی جدائی کے بعد یہ دونوں بھائی آپس میں مل گئے تو بہت جلد ان کے درمیان کے اختلافات دور ہوگئے۔ اس یگانگت کو دیکھ کر پھر سے ہم کو قدیم دور کا وہ آندھرا یاد آتا ہے جو محمد قلی قطب شاہ نے بنایا تھا۔ اس وقت اس نے تلگو اور اردو کی ساتھ ساتھ قدردانی کی۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے ملک کے انتظامات اور حکومت میں برابر کا حصہ دیا۔ وہ دونوں سے مساوی محبت اور خلوص کا برتاؤ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آندھرا کے ہندو اور مسلمان صدیوں سے برادرانہ تعلقات رکھتے رہے اور یہ تعلقات عہد حاضر میں روز افزوں قوت حاصل کررہے ہیں۔ آندھرا کی موجودہ حکومت اسی قدیم دکنی کلچر میں رنگی ہوئی ہے۔ اور اس کے پہلے چیف منسٹر شری سنجیوا ریڈی نے اپنی سادگی محنت اور فراغ دلی کاموں کے باعث ثابت کردکھایا ہے کہ آندھرا والے اب بھی پورے ہندوستان کی رہبری کرسکتے ہیں۔

اسی جگہ اقلیت کی زبان کے ساتھ سب سے پہلے مساویانہ سلوک کیا گیا۔ اور اردو کو ایک علاقائی زبان قرار دے کر پورے ہندوستان کو دکھا دیا گیا کہ رواداری، انسان دوستی اور اصلی بھائی چارہ کیسے ہوتا ہے۔ (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۶ پر)

مرتبہ: وقار خلیل

یوم محمد قلی قطب شاہ کا آنکھوں دیکھا حال

(منعقدہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۰ء)

اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر، سلطنتِ قطب شاہیہ کے پانچویں بادشاہ، آندھرا پردیش کے دارالسلطنت شہر حیدرآباد دکن کے سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی کی یاد میں گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی ۱۰ جنوری ۱۹۶۰ء کو حیدرآباد سے ۵ میل دور بمقام مقبرہ محمد قلی قطب شاہ واقع گولکنڈہ (حیدرآباد) میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام اس سلطان شاعر کی ۳۴۹ ویں برسی "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی صورت میں منائی گئی۔ اس موقع پر سال ہائے گزشتہ کی طرح ایک کتاب "نذرِ معانی" (مرتبہ وقار خلیل) شائع کی گئی اور سلاطین قطب شاہی کے پوسٹ کارڈ سائز رنگین تصاویر بھی اجرا ہوئے۔ ادارہ کے ماہانہ ترجمان "سب رس" کا خصوصی شمارہ "محمد قلی قطب شاہ نمبر" شائع کیا گیا۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کا آغاز جنوری کے پہلے ہفتے ہی سے ہوا۔ جس میں بین کلیاتی تقریری و تحریری انعامی مقابلے بیت بازی کے علاوہ محلات و آثار قطب شاہی کی ترتیبی کلاسس کے سلسلے میں متواتر ایک ہفتہ تک شہر حیدرآباد میں ادبی اور تہذیبی چہل پہل رہی۔ مدارس وسطانی، فوقانی اور جامعاتی درجوں تک کے طلباء و طالبات نے ان دلچسپ پروگراموں میں شرکت کر کے کامیاب بنایا۔ مقامی شعری محفلوں اور ان کی ذیلی انجمن "سفینۂ ادب" کی طرف سے بیت بازی کے مقابلے خوشگوار ادبی فضا میں شروع ہوئے اور کامیابی سے اختتام کو پہنچے۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۰ء کو گنبد محمد قلی قطب شاہ کے عریض و وسیع چبوترہ پر ایک کثیر اجتماع کی موجودگی میں ۱۲ بجے دوپہر سے پہلے بیت بازی کے فائنل مقابلہ کا اعلان ہوا جس کا افتتاح کچھ ہی دیر بذریعۂ طیارہ دہلی سے حیدرآباد پہنچنے والے اردو کے ممتاز شاعر جناب جگن ناتھ آزاد (انفارمیشن آفیسر حکومت ہند) نے اقبال کے شعر سے کیا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

سہ پہر تک بیت بازی کا دلچسپ مقابلہ ہوتا رہا۔

سوا چار بجے موٹروں کا ایک قافلہ اس تیزی سے گنبدان قطب شاہی کے شہر خموشاں میں داخل ہوا کہ گرد و غبار کے ہیولے میں ایک پرچم والی موٹر بھی نظر سے گزری۔ عین گنبد قلی قطب شاہ کے نزدیک جوں ہی موٹریں رک گئیں تو ڈاکٹر زور، نواب زین یار جنگ بہادر، مسٹر بدرو ڈاسٹری، آغائی حسین ضابط وغیرہ۔ ہم نے بڑھ کر شری ایم۔ کالیشور راؤ اسپیکر آندھرا پردیش اسمبلی کا خیر مقدم کیا۔ چار بجے گنبد کے وسیع و عریض سجے سجائے چبوترہ پر شری کالیشور راؤ نے قطب شاہی دور سے تعلق رکھنے والی کتابوں، تصاویر اور پینٹنگس [illegible]لیش کا افتتاح کیا۔ اس سے پہلے تاریخ و آثار گولکنڈہ کا ترتیبی کورس کے کامیاب افراد نے عوام کو محلات و ایوانات شاہی اور مقابر

گنبدان قطب شاہی کا تفصیلی معائنہ کروایا۔ اس موقع پر پروفیسر مجید صدیقی، پروفیسر رحمٰن، پروفیسر اکبرالدین صدیقی اور میر سراج علی خاں نے بھی رہبری کی۔

اسپیکر آندھرا پردیش نے اپنی طویل اور عالمانہ تقریر میں کہا کہ "اردو، تلگو اور حیدرآباد ہم آندھرائیوں کا ورثہ ہے۔ جو ہم کو بزرگوں اور قطب شاہی بادشاہوں سے ملا ہے۔ قطب شاہی دور میں اردو اور تلگو کو ترقی کے مساوی مواقع حاصل تھے۔ آج بھی حکومت آندھرا پردیش اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ اس موقع پر آندھرائیوں کی تاریخ کا جائزہ لینا بے سود نہ ہوگا۔ چالوکیہ دور میں تلگو کے موجودہ رسم الخط نے جنم لیا اور آندھرا کے مختلف راجاؤں نے آرٹ اور شاعری کو بے حد فروغ دیا۔ سب سے آخر میں شاہان گولکنڈہ آئے جنہوں نے تلگو زبان و ادب کی حفاظت اور اس کی سرپرستی کی۔ وہ مساجد اور مندر کو یکساں عطیے دیتے رہے۔ غرض مسلم بادشاہوں کے زمانے میں آندھرا والوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اس پر مسلمانوں یا غیر ملکیوں کا تسلط ہے۔ گولکنڈہ کی مملکت آندھرا تاریخ کا ایک روشن باب ہے جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ گولکنڈہ کے بادشاہوں نے آندھرا مفادات کی حفاظت کی۔ اور رعایا کو اپنے بچوں کی طرح سمجھا۔

مغل بادشاہوں کا دور بھی شاندار تھا۔ اکبر اس قدر عظیم حکمران تھا جس قدر کہ رام یا اشوک تھے۔ ہندوستان میں ہمیشہ مسلمہ رواداری پائی گئی۔ مختلف مذاہب اس طرح تھے جس طرح کے ایک باغ میں مختلف پھولوں کے پودے ہوتے ہیں۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی طرح یہاں کبھی مذہبی جنگ نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس ہندوؤں اور مسلمانوں نے متحدہ طور پر اپنے مخالفین کا مقابلہ کیا۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پہلی دفعہ آندھرا علاقہ راست اس کے تحت آیا۔ وہ تلنگی کا ایک زبردست شاعر تھا۔ اس نے تلنگی زبان و ادب کی سرپرستی کی۔ کیونکہ یہ عوام کی زبان تھی۔ اور وہ ان پر کوئی دوسری زبان مسلط کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ نے ۱۵۸۰ء۔ ۱۶۲۲ء تک گولکنڈہ پر حکومت کی اس کا دور حکمرانی مشہور رہا ہے۔ عوام خوشحال تھے۔ وہ بھی خود تلنگی کا شاعر تھا۔ اور اس زبان کا سرپرست و محسن بھی۔ اس کے دور حکومت ہی میں اردو اور تلنگی آندھرا علاقہ کی زبانیں بن گئیں اس لئے ان دونوں کو ترقی دی جانی چاہئے۔ قطب شاہوں کی مذہبی رواداری کا زندہ مثال چار مینار ہے جس کی بالائی منزل پر مندر اور مسجد دونوں موجود ہیں۔ آصفی دور حکومت میں بھی آخر تک اسی مذہبی رواداری کی مثال قائم رہی۔ نظام الملک آصف جاہ بلاشبہ "قومی شہنشاہ" تھے۔ جن کے زمانے میں آندھرا والوں نے خود کو مطمئن پایا اور انہیں اپنا حقیقی حکمران تسلیم کیا۔

اسپیکر آندھرا پردیش اسمبلی کی تقریر کے بعد محفل شعر و سخن کا اعلان کیا گیا۔ جس میں فیض الحسن خیال، سراج حیدرآبادی، باذوق سعید، صلاح الدین نیر، میر حسین علی خاں، مظہر کامل، خیرات ندیم، مگنا تھ آزاد، ناقد رزاقی اور راگھویندر راؤ جذب نے نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ مختصر سے وقفہ نماز کے بعد جبکہ شری سنجیوا ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش لا چکے تھے۔

ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ ادبیات اردو نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "حیدرآباد کی تاریخ کا موجودہ دور بالخصوص گذشتہ تین سال تاریخی کے ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اس عرصہ میں فراخدلانہ روایات کا وہ پودا جو آج سے کئی برس قبل حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ نے لگایا تھا مسلسل پھلتا پھولتا رہا ہے۔ حسن اتفاق سے آج ہی جبکہ ہم میر امراء محمد قلی قطب شاہ منانے اس پر فضا چبوترہ پر جمع ہیں ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ کا بھی ایک اہم ورق الٹ رہا ہے۔ عہد محمد قلی قطب شاہ کے بعد سے اب تک تاریخ کے کئی ورق الٹ چکے ہیں جن میں سے کچھ سیاہ تھے اور کچھ سنہرے۔ آج جو ورق الٹ رہا ہے اسے مستقبل کا مؤرخ

الفاظ میں یاد کریگا۔ اس کے قطع نظر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ حیدرآباد کی تاریخ کا ایک سنہرا دور تھا۔ ہمارے چیف منسٹر سنجیوا ریڈی صاحب جو صدر کانگریس کے عہدہ پر منتخب ہوئے ہیں۔ اپنے سہ سالہ دور چیف منسٹری میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے تعلقات انتہائی خوشگوار رہے یہاں کی لسانی اقلیتیں ملک کے دوسرے حصوں کی اردو داں اقلیتوں کی طرح خوف و دہشت کی فضا کا شکار نہیں رہیں۔ اردو کو ریاست کی علاقائی زبان قرار دیکر ایسی مثال قائم کیگئی جس کی اب تک بھی کوئی دوسری ریاست تقلید نہ کر سکی یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ نے فرخندہ روایات کا جو پودا لگایا تھا وہ آج بھی پھلتا پھولتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بادشاہ کی یاد روز بروز تازہ ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کے کارناموں کا جتنا گہرا مطالعہ کیا جا رہا ہے اتنی ہی اس کے دور کی خوبیاں واضح ہو رہی ہیں"۔

ڈاکٹر زور کی تقریر کے بعد شری سنجیوا ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش نے اپنی صدارتی اور حیدرآباد کی آخری تقریر میں فرمایا "ساڑھے تین سو سال قبل سلطنت گولکنڈہ کے تحت بھی تلگو بولنے والے تمام علاقے متحد تھے اور اب ایک طویل عرصے کے بعد عظیم جدوجہد کے نتیجہ میں یہ علاقے پھر ایک بار متحد ہو گئے ہیں۔ آندھرا پردیش کو حیدرآباد جیسا شہر دارالحکومت کے طور پر ملا ہے۔ یہ ترقی یافتہ اور خوشحال شہر ہے محمد قلی قطب شاہ نے اپنے دارالحکومت کی حیثیت سے شہر حیدرآباد کو بہترین منصوبہ کے تحت بسایا تھا۔ ان قدیم یادگاروں کو دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کس قدر شاندار دور تھا۔ یہ زمانہ بہت اچھا تھا۔ نہ معلوم وہ دن دوبارہ آئیں گے؟ اس وقت ہر طرف خوشحالی تھی اور غربت و افلاس کا نام و نشان نہ تھا۔ جنوبی ہند ہمیشہ مذہبی رواداری اور بھائی چارگی کے لئے مشہور رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے تمام مذاہب سے رواداری کا سلوک کیا۔ انہیں اپنی رعایا سے بلا لحاظ مذہب و ملت محبت تھی۔ تلگو اور اردو کی وہ مساویانہ سرپرستی کرتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ اپنے فرامین اردو اور تلگو دونوں زبانوں میں جاری کرتا تھا۔ اور وہ شاعری بھی ان دونوں زبانوں میں کرتا تھا۔ ہم آندھرا پردیش کی اس خصوصیت پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ہر زبان کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا ہے۔ حتی کہ مرہٹی اور کنڑی بولنے والوں کو بھی تمام سہولتیں حاصل ہیں۔ ریاست میں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف عقائد کے لوگ رہتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ زبان یا مذہب کی بنیاد پر ان میں باہمی بدخواہی نہیں ہے"۔

چیف منسٹر کی صدارتی تقریر کے بعد ادیبہ عثمانی اور ماجدہ سلطانہ نے ترنم کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی غزلیں سنائیں پھر چیف منسٹر نے تاریخ و آثار گولکنڈہ کا "تربیتی کورس" کامیاب کرنے والے حضرات اور بیت بازی کے مقابلوں میں جیتنے والے طلباء و طالبات کو انعامات اور اسناد تقسیم کئے۔ آتش بازی کے مظاہرہ کے بعد چیف منسٹر بنگلور جانے کے لئے گنبدان قطب شاہی سے طیارگاہ تشریف لے گئے۔ عکس کشی کے بعد معززین اور اراکین ادارہ و مجلس انتظامی یوم محمد قلی قطب شاہ نے موصوف کو رخصت کیا۔

شری نواب روشن علی خاں میئر بلدیہ حیدرآباد کی صدارت میں کلچرل پروگرام پیش کیا گیا۔ سراج حیدرآبادی نے ترنم کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی غزل پڑھی پھر اردو کے ممتاز انشاء پرداز اور دکنی زبان کے ماہر مولوی آغا سید حسن صاحب نے محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکومت کے تعلق سے منتخبہ قدیم دکنی زبان میں اپنا مقالہ پڑھا۔ (یہ مقالہ اسی اشاعت میں علیحدہ شائع کیا جا رہا ہے) پروفیسر

اشتیاق محمد خاں (استاد میوزک اسکول علی گڑھ) نے محمد قلی قطب شاہ کی ایک غزل ترنم سے سنائی پھر جناب سید رضی علی خاں نے حیدرآباد نے قطب شاہی تمدن کے زیر عنوان تقریر فرمائی (یہ تقریر بھی اسی اشاعت میں علیحدہ شائع کی جا رہی ہے) موضع اونچی کلاں کے اردو پڑھائی گھر کی طالبات نے سروجنی نائیڈو کی نظم "قلی قطب بادشاہ تھے رنگ رنگیلے" ڈھولک پر سنائی۔ ناقد رزاقی نے محمد قلی کی ایک نظم پڑھی۔ پھر ابن احمد تاب نے گولکنڈہ کے تعلق سے اپنی نظم سنائی۔ آخر میں نذیر احمد تاباں پوری نے محمد قلی کی مشہور غزل "سنو لوگ میری پریم کی کہانی" مخصوص ترنم میں سنائی۔

شری پی، ہنمنت راؤ (یم۔ پی) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ۔"قطب شاہی خاندان کے کارناموں اور حالات کا مطالعہ کریں تو یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ انہوں نے بہت نمایاں کام سرانجام دیئے ہیں۔ حیدرآباد کے حالیہ تہذیب و تمدن میں بڑی حد تک سلاطین قطب شاہی کے کارناموں کا عکس ملتا ہے اور تہذیب و تمدن پر اس عظیم دور کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ عہد قطب شاہی تہذیب و ادب کی سربلند قدروں کا سرچشمہ رہا ہے۔ ہمیں اسلاف کے کارناموں سے سبق لینا چاہیئے۔ ہم ماضی کو فراموش کرکے آج زندگی کے ہر شعبہ میں ناکام و نامراد سے نظر آرہے ہیں۔ اور آج ہمیں بار بار ہندو مسلم اتحاد اور لسانی ہم آہنگی کے مطالبوں کی تکرار کرنی پڑتی ہے۔ گذشتہ ادوار میں تو ایکتا کا دور دورہ تھا۔ قطب شاہی دور حکومت میں نہ صرف مواصلاتی نظام قابل قدر تھا بلکہ تہذیبی اور ثقافتی رشتے بھی مستحکم تھے مذہبی رواداری اور صلح پسندی کی اس سے بڑھکر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہد حکومت میں مطبخ کے منتظم برہمن تھے۔ اور جب ملازموں نے ہڑتال کر دی تو ایک برہمن منتظم نے خود ..... بادشاہ کا خاصہ تیار کیا۔ خود گوشت پکایا تھا۔ آج بھی ملک کی ترقی کے لئے اس روادارانہ مثال سے اہل ملک کو استفادہ کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔

شری ہنمنت راؤ کی تقریر کے بعد گنبد محمد قلی قطب شاہ کے اندر کرنل تاج احمد خاں کی قرات سے فاتحہ خوانی اور چادر گل چڑھانے کی تقریب انجام دی گئی۔ کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا مرثیہ سوز کے ساتھ سنایا۔ علی مرتضیٰ تاباں نے محمد قلی کی غزل پڑھی۔ اور پھر بادشاہ کی قبر پر چادر گل چڑھائی گئی۔

آخر میں حاضرین نے پہلے یوم محمد قلی قطب شاہ کا رنگین نیوز ریل دیکھا۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اس نیوز ریل کی کمنٹری دی اس کے علاوہ چند سرکاری نیوز ریل بھی دکھائے گئے۔ اس جشن کی کارروائی محترمہ عائشہ شادن نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ چلائی۔ ۱۱ بجے قریب یہ بلند وبہار تقریب اختتام کو پہنچی۔ دوسرے دن آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد ریڈیائی رپورٹ نشر کی۔ اس تقریب میں اردو دوستوں کے علاوہ ادیب، شاعر، نقاد، صحافی ہی نہیں اراکین اسمبلی، اراکین بلدیہ اور ممتاز سیاسی و سماجی اداروں کے نمائندہ افراد بھی کثیر تعداد میں شروع سے آخر تک شریک رہے۔

دوروزہ تقریب کا آخری اجلاس تلگو زبان میں مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۹۶۰ء کو مرکزی وزیر سیول دمعاہت شری ڈاکٹر پی۔ گوپال ریڈی کی صدارت میں ٹھیک ۵ بجے شام بمقام کرشنا دیورائے لائبریری واقع سلطان بازار منعقد ہوا۔ تلگو بولنے والے افراد سے جلسہ گاہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اولاً ڈاکٹر زور نے تعارفی اور خیر مقدمی تقریر فرمائی۔ اور کہا کہ ـــــ "ہم یہاں تیسرا یوم محمد قلی قطب شاہ منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ میں ڈاکٹر پی۔ گوپال ریڈی کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس تقریب کی صدارت کے لئے دلی سے بطور خاص یہاں آنے کی زحمت گوارا کی۔ وہ پچھلے سال (۱۹۵۹ء) بھی اس موقع پر حیدرآباد آئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس تقریب سے

گہری دلچسپی رکھتے ہیں محمود صاحب اس کلچر اس رواداری اور اس وسیع الخیالی کا مجسمہ ہیں جو محمد قلی قطب شاہ کے کردار کی خصوصیات
ڈاکٹر طریڈی ان اشخاص میں سے ایک ہیں جنہوں نے یہ دن منانے کی تحریک کی اور پچھلے دو سال ان میں اس تقریب کی کامیابی
بڑی حد تک انہی کے سر ہے۔ گذشتہ برسوں میں ہم یہ تقریب حضرت محمد قلی قطب شاہ کے مقبرے پر منایا کرتے تھے لیکن پھر بھی میں
کہ صرف تلگو جاننے والے بیشتر لوگ اس تقریب کی کارروائی سے پورا استفادہ نہیں کر پائے۔

آندھرا پردیش کے قیام کے بعد یوم محمد قلی قطب شاہ منانے کی اہمیت کس لئے بڑھ گئی ہے اس کی جانب اشارہ کر دینا بھی ضروری
نومبر ۱۹۵۰ء کا دن دکن کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ ریاستوں کی تنظیم کے باعث آندھرا
تلنگانہ کے علاقے یکجا ہو گئے اور نہ ہی صرف اس لئے کہ اس دن قطب شاہ کے وقت کے آندھرا کا نیا جنم ہوا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اس
کا کلچر از سر نو رائج ہوا۔ دکنی کلچر کی تین اہم خصوصیتیں ہیں۔ رواداری، بھائی چارہ اور اتحاد قطب شاہی خاندان کے تمام
ان میں سے محمد قلی قطب شاہ ان اوصاف کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ ان ہی کے عہد میں ایرانی اور مسلم خصوصیات کا
آندھرا اور تلنگانہ کی خصوصیات سے ربط ہوا۔ اور اس طرح وہ کلچر ظہور میں آیا جسے بعد میں دکنی کلچر کا نام ملا۔ حیدرآباد کا یہ خوبصورت
شہر ان ہی کی دین ہے۔ اور تاریخ میں دوسری مرتبہ یہ شہر قریب قریب اس علاقہ کا دارالخلافہ بنا ہے جس پر ان کی سلطنت مشتمل
تھی۔ ان زبانوں سے جو ہم بولتے ہیں اور مذاہب سے جنھیں ہم مانتے ہیں بالاتر محبت اور بھائی چارہ کی روایات بھی ہمیں انھیں سے ورثہ
میں ملی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ امن و اتحاد، شعر و شاعری، موسیقی، رومان اور ہم جوئی کے شیدائی تھے۔ ان کا اتحاد اختلاف پیدا کرنے کیلئے
اور ان کی ہم جوئی میں دوسروں پر کسی قسم کا جبر شامل نہیں تھا۔ وہ موسیقی، شاعری اور رومان کے ذریعے ثقافتی رشتہ
قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ دوسروں سے محبت کرتے تھے اور ان کے محبوب بھی تھے۔ انہوں نے گیت گا کر دوسروں میں امن اور خوشحالی
کی امنگ پیدا کی۔ ہم آج بھی کچھ کرنے کے لئے کوشاں ہیں جو محمد قلی قطب شاہ نے کئی صدیاں پہلے کیا۔ یہی ایک ایسی ریاست ہے
جہاں تلگو اور اردو کے ساتھ یکساں سلوک کیا جا رہا ہے۔ آندھرا اور تلنگانہ کے لوگ، ہندو اور مسلمان یہاں ایک ہیں۔ ہم سب حیدرآباد
کی عمارت کو چار مینار کی بلندیوں تک لے جانے کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو نیلور اور وجے واڑہ سے آکر حیدرآباد
جیسے شہر میں نہیں بس گئے ہیں اور ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو مغلپورہ اور حسینی علم سے اٹھ کر جیتور اور دوسرے مقامات میں جا آباد نہیں
ہوئے۔ یہ مہم جوئی نہیں ہے لیکن کس قدر پر امن اور رومان پرور ہے یہ مہم۔ آئیے ہم اپنے سبھی اعمال میں قطب شاہ کے نقش قدم
پر چلیں۔ آئیے ہم سب سے پیار کریں اور نفرت کسی سے نہ کریں۔ آئیے ہم امن اور خوشحالی کے لئے کام کریں۔ اور رواداری اور بھائی چارہ
کے منتہائے مقصود تک پہنچیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس ہستی کو بھی یاد رکھنا ہے جس نے پہلے پہل اس سرزمین میں ان تمام پہلوؤں
کو بوئے۔

ڈاکٹر ڈوور کی تقریر کے بعد ڈاکٹر ڈی وینکٹ رماڈا پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے خاندان قطب شاہی کے عہد میں عوام کی سماجی
حالات کا تلگو میں تفصیلی ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ "محمد قلی قطب شاہ پہلا حکمران تھا جس کے دور میں ہماری ثقافت
کا یہ پہلو اجاگر رہا۔ یہی سیکولرزم جو ہمیں محمد قلی قطب شاہ سے ملا ہے آج ہماری سماجی اور ثقافتی زندگی کا اہم جزو بن چکا ہے۔
انہوں نے خاص طور پر آندھرا پردیش کے ان سماجی تہواروں کا ذکر کیا جو محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۸۲)

خورشید احمد جامی

حیدرآباد

جگمگاتی ہوئی یادوں کے حسیں آنچل میں
آج پھر قافلۂ صبح و مسا ٹھہرا ہے

شہر کے دل کے دھڑکنے کی صدا تیز ہوئی
پیار کی چھاؤں میں اک گیت نے لی انگڑائی
دورِ تاریخ کی بیتاب گزرگاہوں سے
کتنے پھولوں کی مہک لیکے محبت آئی
ہر طرف اب بھی ہم آغوش ہے تعبیروں سے
ایک دلدار کے خوابوں کی جواں رعنائی
حسن کے نام سے باقی ہے چمک تاروں کی
عشق کے پاس ہے اندازِ چمن آرائی!

تیری تہذیب کی راہوں میں لٹائے ہونگے
دیدہ و دل کی امنگوں نے خزانے کتنے
ان فضاؤں میں ہے احساسِ وفا کی خوشبو
یہ در و بام سناتے ہیں فسانے کتنے
تیرے ماتھے پہ ہے الماس و گہر کی تابش
تیرے ہونٹوں پہ ہیں بیدار ترانے کتنے
تیری شاداب بہاروں سے گلے ملتے ہیں
زندگانی کے اجالوں میں زمانے کتنے

جگمگاتی ہوئی یادوں کے حسیں آنچل میں
آج پھر قافلۂ صبح و مسا ٹھہرا ہے

قمر ساحری

دکن کا ترانہ

مرا وطن عظیم ہے　　مرا دکن عظیم ہے

سانولی پہاڑیاں　　یہ گنگناتی ندیاں　　یہ جگمگاتی کھیتیاں

قطب کا یہ نگر　　یہ ارضِ نیلم و گہر　　مرا دکن مرا دکن　　عظیم ہے عظیم ہے

جواہرات کی زمیں　　نوادرات کی زمیں　　تغیّرات کی زمیں　　مرا وطن عظیم ہے

مرا دکن عظیم ہے

لی قطب کا یہ نگر　　یہ ارضِ نیلم و گہر　　مرا دکن مرا وطن　　عظیم ہے عظیم ہے

لعبتِ دل و نظر　　یہ خاک مہر و ماہ گر　　یہ ارض آسماں گذر　　مرا وطن عظیم ہے

مرا دکن عظیم ہے

شہرِ فکر و جستجو!　　یہ سرزمینِ مشک بُو　　زمیں کے دل کی آرزو　　مرا وطن عظیم ہے

مرا دکن عظیم ہے

قطب کا یہ نگر　　یہ ارضِ نیلم و گہر　　مرا دکن مرا وطن　　عظیم ہے عظیم ہے

بِ لالہ و سمن　　غزل کا گیت کا وطن　　جبینِ ہند کی شکن　　مرا وطن عظیم ہے

مرا دکن عظیم ہے

گی کا دیس ہے　　یہ زندگی کا دیس ہے　　یہ روشنی کا دیس ہے　　مرا وطن عظیم ہے

مرا دکن عظیم ہے

قطب کا یہ نگر　　یہ ارضِ نیلم و گہر　　مرا دکن، مرا وطن　　عظیم ہے عظیم ہے

یں دردِ مشترک　　نظر میں ایک سی چمک　　جبیں پہ ایک ہی دمک　　مرا وطن عظیم ہے

مرا دکن عظیم ہے

و سحر سے پوچھ لو　　دل و نظر سے پوچھ لو　　زمانے بھر سے پوچھ لو　　مرا وطن عظیم ہے

مرا دکن عظیم ہے

قطب کا یہ نگر　　یہ ارضِ نیلم و گہر　　عظیم ہے عظیم ہے　　مرا دکن عظیم ہے

سعادت نظیر (ایم اے)

نذرِ عقیدت

(اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی دل آویز شخصیت سے متاثر ہو کر)

گزرنے والے گزر جاتے ہیں جہاں سے مگر
دلوں پہ چھوڑتے ہیں مستقل نقوشِ ہنر
ہر ایک شعبے میں رہتا ہے زندگی کا اثر

تصورات جن کو کبھی مٹا نہ سکیں
انھیں بھلانا بھی چاہیں تو ہم بھلا نہ سکیں

ہمارے دعوے کی ہے یہ دلیلِ تاریخی
نشانِ راہ ہے فہرست کارناموں کی
دکن کی خاک میں ہے روحِ "قطب شاہ" رچی

جو اہلِ دل ہیں، محبت کے گیت گاتے ہیں
اسی کے قصے ابھی تک سنائے جاتے ہیں

سلام تجھ پہ ہو! اے شاعرِ بلند مقام!
ترا کلام ہے روحِ رواج و رسمِ عوام
ترے زمانے کا ایک آئینہ ہے تیرا کلام

مورخین، جو تاریخِ شعر جانتے ہیں
دکن کا شاعرِ اعظم تجھی کو مانتے ہیں

ترے اشارے پہ بستی وطن کی چلتی تھی
وہ بستی! جس کے لبوں پر تھی مسکراہٹ سی
وہ بستی! جس کا جواں تھا مذاقِ تعمیری

ترقیات کا عالم دکھا دیا جس نے
دکن کو مرکزِ صنعت بنا دیا جس نے

تری کہانی زباں پر ہے "رودِ موسیٰ" کی
کہ "ننھی سانولی" تیری نظر کا حاصل تھی
ترے سرور کا باعث تھا رقصِ "بھاگ متی"

فضائے حسن تھی رنگین تیری الفت سے
تری حیات عبارت تھی آدمیت سے

خیرات ندیم

سلطان محمد قلی قطب شاہ

نظر آتا ہے ہر ایک نقش، نقشِ جاوداں تیرا
جھلکتا ہے فضاؤں میں ابھی عزمِ جواں تیرا
رواں ہے وقت کی راہوں میں جیسے کارواں تیرا
تمدن اپنے سینے سے لگائے ہے نشاں تیرا

دکن کی سرزمیں پر آج بھی تیری بہاریں ہیں
عظیم الشان ورثہ تیری ساری یادگاریں ہیں

حیات افروز تھا کتنا ترا عہدِ جہاں بانی!
دیارِ آرزو میں تھی بہاروں کی فراوانی
چراغِ منزلِ امن و اماں اقبالِ سلطانی
ترے آگے جھکا دی وقت نے بھی اپنی پیشانی

ترے ہاتھوں میں تہذیب و تمدن کا پھریرا تھا
دکن کی بزم میں جیسے سویرا ہی سویرا تھا

جہاں کو یاد ہے تیرا حیات افروز افسانہ
عقیدت کو دیا کرتی تھی خود تاریخ نذرانہ
اُجالوں کا رہا مرکز ترا ہر ایک کاشانہ
چمن زارِ دکن کا پاسباں اندازِ شاہانہ

گلے اپنے ہر اک تہذیب کو تو نے لگایا ہے
جو بجھ سکتا نہیں ایسا دِیا تو نے جلایا ہے

ترے دربار میں علم و ہنر نے زندگی پائی
تری محفل میں تھا گیتوں کا رس نغموں کی رعنائی
دیارِ شوق میں صبحِ بہاراں جھومتی آئی
ہر اک اُمید جیسے جاگ اٹھی لے کے انگڑائی

زمانے بھر میں کہلاتا ہے تیرا عزم سلطانی
حسیں دکنی تمدن کا عظیم المرتبت بانی

زمانہ آج بھی تاریخ کے اوراق الٹائے
تو سچ مچ جگمگاتا اور ہی عالم نظر آئے
تصور، رہ گذارِ جلوۂ بیہم میں کھو جائے
کہانی یک بہ یک ماضی کی جیسے کوئی دہرائے

دکن میں ہر طرف گونجا ہوا پیغام ہے تیرا
لبِ تاریخ پر اب تک "قلی شہ" نام ہے تیرا

چمن زارِ دکن کو دے دیا خونِ جگر اپنا
محبت کو بنایا ہر قدم پر راہبر اپنا
اجالا کر دیا ہر سو بہ اندازِ سحر اپنا
سفر میں عظمتِ ہستی کو کر کے ہمسفر اپنا

جو بجھ سکتے نہیں ایسے دیے تو نے جلائے ہیں
بنامِ عشق تو نے سیکڑوں جادو جگائے ہیں

یہ سطوت گولکنڈے کی، تری عظمت کا افسانہ
عظیم الشان محلوں سے نمایاں عزم شاہانہ
شرابِ ناز سے لبریز تھا گیتوں کا پیمانہ
محبت سے رہا معمور تیرے دل کا کاشانہ

کمال و فن کو تیری قدر دانی کی پناہیں تھیں
ترے قدموں کے نیچے زندگی کی شاہراہیں تھیں

ادب سے نام لیتا ہے ہر اک اہلِ وطن تیرا
ترے نغموں سے ہے آباد اب بھی یہ چمن تیرا
فضاؤں میں ابھی ہے پیار تیرا بانکپن تیرا
محافظ ہے اسی تہذیب کا اب بھی دکن تیرا

عروج و ارتقاء کا بزمِ ہستی میں اجالا ہے
ترے پیغام کا سنگم ابھی تک بول بالا ہے

قلی قطب شاہ

وحید مرزا

ہواؤں میں یہاں کی آج بھی اک سنسناہٹ ہے — زمانہ کے لب خاموش پر اک گنگناہٹ ہے
اگرچہ کوئی رقاصہ نہیں پیشِ نظر لیکن — تخیل میں ابھی تک پائلوں کی جھنجھناہٹ ہے
مجھے کچھ یاد آتا ہے یہیں نغمہ سرا تھی وہ — تصور میں ابھی تک کنگنوں کی کھنکھناہٹ ہے
دیارِ دکن میں دھیرے سے، دبے قدموں کوئی آیا — زمیں پر نقشِ پا اس کے نہ قدموں کی ہی آہٹ ہے
کئی یادیں مٹا دیں صفحۂ دل سے زمانے نے — مگر اک نقشِ لافانی یہ کس کی مسکراہٹ ہے

سلونی سانوری حیدر محل بھی بخت والی تھی
دلوں کی سلطنت میں وہ بھی تاج و تخت والی تھی

چمکتی چاندنی میں پیار کی ماہِ تمام آیا: — کوئی درسِ وفا دیتا ہوا بالائے بام آیا
قلی کے ساتھ ہی فرہاد اور مجنوں کی یاد آئی — زباں پر پھر کسی شیریں، کسی لیلیٰ کا نام آیا
دکن کی سرزمیں پر ساغرِ جمشید چھلکانے — کسی حافظ، کسی خیام کے ہاتھوں میں جام آیا
زلیخا اور یوسف کی کہانی میں بھی جان آئی — کسی اک ہیر کا، رانجھا کو الفت کا پیام آیا
جھکا تاجِ قطب شاہی کسی پازیب کے اوپر — نگاہوں کی زباں بن کے محبت کا سلام آیا

دکن کی خاک سے اٹھا تھا وہ شاہ جہاں بن کے
جواں ہے بزمِ خاص و عام میں اک داستاں بن کے

وہ اک فنکار تھا اور اہلِ فن پر ناز تھا اس کو — وہ شمعِ انجمن تھا انجمن پر ناز تھا اس کو
اسے اپنے چمن کی آبیاری میں مزہ آیا! — اسی گلشن کے سب سرو سمن پر ناز تھا اس کو
رسیلی مدھ بھری اردو زباں سے پیار کرتا تھا — وہ اک شاعر تھا خود اپنے سخن پر ناز تھا اس کو
دل و جاں سے زبانِ یار پہ قربان تھا گویا — دیارِ دوست ہی کے پیرہن پر ناز تھا اس کو
تلنگانہ کی تہذیب و تمدن پر نچھاور تھا — دکن نازاں تھا اس پر اور دکن پر ناز تھا اس کو
رواداری میں جیسے اکبرِ اعظم کا ثانی تھا — محبت اور اخوت کے چلن پر ناز تھا اس کو

حرم کا دیر کا ہندو مسلماں یہ افسانہ نہ تھا کوئی
نظر میں اس کی سب اپنے تھے بیگانہ نہ تھا کوئی
وہ راجہ تھا مگر پرجا پہ اپنی جان دیتا تھا
وہ اک نباض تھا نبضِ دکن پہچان لیتا تھا

سید احمد علی احسان

داستانِ گولکنڈہ

اے مقامِ گولکنڈہ تیری عظمت کیا لکھوں
تیری شوکت کا ہے شاہد آسمانِ نیلگوں
خونِ جولاں ہے قطب شاہوں کا اس بنیاد میں
سرخ رو ہے آج بھی تو عالمِ ایجاد میں
پھر ورق تاریخ کا الٹا کتابِ دہر نے
بلبلوں کے لب پہ ہیں باغِ دکن کے تذکرے
تاجِ انگلستاں کی زینت تیرا کوہِ نور ہے
ذرہ ذرہ وادیِ موسیٰ کا رشکِ طور ہے
یہ کھنڈر ہیں یا گلستانِ محبت کے کنول
جلوہ گر ہے جن میں اب بھی جلوۂ حیدر محل

تاجدارِ گولکنڈہ اے قلی شاہِ دکن
تیری ہستی تھی جواہر ریزِ بحرِ علم و فن
علم پرور، عدل گستر، نکتہ رس، رنگیں بیاں
صاحبِ دیواں، وہ پہلا شاعرِ اردو زباں
قدردانِ علم و فن تھا عِلم میں کامل بھی تھا
ایک دریا تھا کہ جو دریا بھی تھا ساحل بھی تھا

گلشنِ فردوس تھی ملکِ دکن کی سرزمیں
حور تھی جس خلد کی حیدر محل سی نازنیں
نوبہار ایسی کہ جس سے تھا بہاروں پر شباب
حسنِ قامت جو قیامت تک رہے لاجواب
عشق کی دیوی، وفا کا دیوتا حسن و شباب
مل کے چمکے تھے جہاں میں ماہتاب و آفتاب

یاد ہے کیا گردشِ ایام تجھکو رات وہ
رودِ موسیٰ کا تموج وہ دلوں کی بات وہ
اک قیامت تھی بپا، طوفان تھا برسات تھی
روزِ محشر تھا کہ دنیا میں اندھیری رات تھی
عشق کا طوفاں کہ جوانی کا سمندر موجزن
آتشِ فرقت کا تھا آتش فشاں شعلہ فگن

گھوڑا ڈالے موجِ دریا سے وہ نکلا شہسوار
جا رہا ہے سوئے چچلم اب دکن کا تاجدار

یہ اندھیری رات، یہ برسات، طوفاں حشر زا
تیری ہمت، تیری جرات، مرحبا صد مرحبا

عزم نے تیرے جو توڑی رودِ موسیٰ کی کمر
لوٹتی ہے خاک پر وہ آج تک بھی دربدر

لاکھ تاریخیں لکھیں وہ بات اب آتی نہیں
دن ہزاروں ہوں مگر وہ رات اب آتی نہیں

تیسرے ماضی کا ہوا ہے آج پھر آغاز دیکھ
آ رہی ہے موضعِ چچلم سے پھر آواز دیکھ

رنگ پھر بھرنے لگا ہے عشق کی فریاد میں
خون روتا ہے زمانہ آج تیری یاد میں

جشن تیرے اور اس جمہوریت کے راج میں
عظمتوں کے چاند سورج ہیں یہ تیرے تاج میں

تو نے جو روشن کیا پہونچا ہے وہ معراج تک
موضعِ چچلم میں جلتا ہے دیا وہ آج تک

رودِ موسیٰ پر بسا باغِ ارم ہے آج بھی
گیسوئے حیدر محل کا پیچ و خم ہے آج بھی

عزم کا شاہد ہے تیرے رودِ موسیٰ کا شباب
پھوٹ کر روتے ہیں تیری یاد میں اب بھی حباب

ہے (صراطِ مستقیم ۱۰۹۸ھ) اب بھی پرانا پل ترا
وہ پرانا تیرا خادم اور پہلا رہنما

چار مینار آج بھی اس شہر کا سرتاج ہے
آ رہا ہے یوں نظر جیسے کہ تیرا راج ہے

پل، سرائیں، قصر، گلشن، شہر یہ جنت نشاں
مسجد و مینار، گنبد چار سو چاروں کماں

وہ کمانیں جن کے چاروں سمت ہے سارا جہاں
کہہ رہی ہیں جو لبِ خاموش سے یہ داستاں

دیکھ اپنے خوابِ رنگیں کی تو اب تعبیر دیکھ
شہر کی تیرے ہوئی ہے کس قدر تعمیر دیکھ

اے سخن سنج و سخن فہم و سخن کے تاجدار!
سن ذرا اہلِ سخن کا آج تو بھی حالِ زار

شاعرِ اردو زباں جس پر تجھے بھی ناز تھا
دیکھ اب انجام اس کا جس کا تو آغاز تھا

اب ترستی ہے زباں وہ بات کرنے کے لئے
جس نے اپنے دور میں دفتر کے دفتر بھر دیئے

نظم یہ اسحاقؔ مرصع ہے جو موتی کی لڑی
نذر کر دے سامنے ہے دیکھ وہ روحِ قلی

شہرِ غزل

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں تو دریا میں منِ یا سمیع

(معانی)

○

طرحی محفلِ شعر

"ہمارا سجن خوش نظر باز ہے"

○

محمد قلی قطب شاہ معانی

ہمارا سجن خوش نظر باز ہے
تو اُس دل میں سب عشق کا راز ہے

گلے باتہہ دے کھیلے ناریاں سوں کھیل
(گلے میں ہاتھ ڈال کر) (عورتوں کے ساتھ)
جسوں کھیلے پیو او سرافراز ہے
(جس کے ساتھ) (پیا) (وہ)

ادھر رنگ بھرے سیتے بانک ممن
(ہونٹ رنگین) (زیب دیتے موتیوں کی طرح)
کہ یاقوت رنگ اُن تھے ورساز ہے
(سے)

سکھیاں سامیں چھندسوں نبرا اپس
تمن حسن کے تیں سراو ناز ہے
(تمہارے) (وہ)

سنوارے ہیں مجلس پیا ادب سوں
(اپنے چہرے کو)
مدن مطرب اس میں خوش آواز ہے

سنوارا ہے من موہنیاں اپنے تیں
(سنوارا) (دلبر)
پیا کوں اینوسوں سے ترکناز ہے
(ان سے)

نبیؐ صدقے قطبا یہ آنند دار
(رحمتوں کا دروازہ)
علیؑ کی مہیا تھے سدا باز ہے
(محبت سے)

ڈاکٹر سید اختر احمد

غمِ جاوداں میرا دمساز ہے — مری زندگی کا یہی راز ہے
شبِ غم کسی نے پکارا مجھے — یہ کیا میرے ہی دل کی آواز ہے!
نہ مے ہے، نہ ساقی نہ رندوں کی بزم — درِ میکدہ کس لئے باز ہے!
فضاؤں کی حد بندیاں ہیں ابھی — یہیں تک زمانہ کی پرواز ہے!
کسی کی امانت سمجھتے ہیں ہم — غمِ دل پہ اختر ہمیں ناز ہے

اشرف رفیع

مرا دل جو ٹوٹا ہوا ساز ہے — بہر حال تیرا ہم آواز ہے
نمایاں ہے معیارِ عقل و خرد — مقامِ جنوں راز در راز ہے
قفس سے اڑو بوئے گل کی طرح — دلوں میں اگر شوقِ پرواز ہے
کسی بات کی فکر اشرف نہ کر — اگر تیرا دل، دل کی آواز ہے

عزیز جہاں بلقیس

"ستاروں کی دنیا" کا کیا راز ہے — "تخیل" کی اس سمت پرواز ہے
"سویرا" ہوا، تیرگی بڑھ گئی — عجب "چشمِ رہبر" کا اعجاز ہے
ترے ہی تبسم سے رنگِ چمن — بہاروں میں تیرا ہی انداز ہے
نئی صبح تیرا خیال جیسے! — مرے دل کا مونس ہے دمساز ہے
کلیسا ہے، مندر ہے، کعبہ ہے برق — وہ اک "دل" کہ جس پر مجھے ناز ہے

منوہر لعل بہار

محبت کی ہر سانس غماز ہے — تیرا غم مرے حق میں اعزاز ہے
مرے دل کی دھڑکن کا کہنا ہے یہ — اسی کے قدم کی یہ آواز ہے
مریضِ محبت شفا پا گیا — مسیحا کا سارا یہ اعجاز ہے
حقارت سے دیکھو نہ اہلِ چمن — ہر اک خار پھولوں کا دمساز ہے
بہار ہم کو ان کی ادا بھا گئی — تغافل میں پوشیدہ کچھ راز ہے

مقبول احمد صبا آسیمی

تبسم ترا اور ترنم مرا — وہ خاموش، یہ مضطرب ساز ہے
کوئی جا کے جبریل سے پوچھ لے — بہت دور تک میری پرواز ہے
فلک کے پرے اڑ کے جائیں نہ کیوں — ترِ واں نہیں جاتی باز ہے

سیدہ حفیظ

محبت کا یہ ساز کیا ساز ہے — نہ لَے ہے نہ دُھن ہے نہ آواز ہے
ابھی تو رہائی قفس سے ملی — ابھی دل میں کیوں شوقِ پرواز ہے
خدا جانے کس کی نظر لگ گئی — مزاجِ گرامی جو ناساز ہے
ذرا دل سے دل کو ملا کر سنو — محبت، محبت کی آواز ہے
ہر اک ذرہ ذرہ ہے جو رازداں — حفیظ اس کا یہ بھی اک اعجاز ہے

ریورنڈ ہیسن ریحانی

ہمیں گو خرد پر بہت ناز ہے — جو کل راز تھا آج بھی راز ہے
نہ جانے وہ ٹھہرے گا جا کر کہاں! — ابھی تو بشر محوِ پرواز ہے
ہے کتنا عجیب ارتقا کا سفر — نہ انجام ہے اور نہ آغاز ہے
جو ہمت ہے تو بڑھ کے ساغر اٹھا — درِ میکدہ ہر گھڑی باز ہے
سمجھتی ہے دنیا ترانہ جسے — کسی ٹوٹے دل کی وہ آواز ہے
نہیں ہے جو ریحانی اس گل کی بو — ہوائے چمن مجھ کو ناساز ہے

محمد علی زیرک

بلندی پہ منزل کہہ راز ہے — ہماری بہت پست پرواز ہے
ابھی سے نہ کر انتہا کے ستم — ابھی تو محبت کا آغاز ہے
ہوا کیسے توبہ کا دروازہ بند — درِ میکدہ تو ابھی باز ہے
صدا اس نے زیرک کی سن کر کہا — یہ کس دکھ بھرے دل کی آواز ہے

ابوالخیر صہبا

نہ اب سوز ہی ہے نہ اب ساز ہے — طبیعت کا کچھ اور انداز ہے
نگاہوں نگاہوں میں کیا کہہ گئے — یہ سربستہ اک راز ہی راز ہے
جھکاتے ہی سر آنسوؤں نے کہا — درِ توبہ ہر وقت ہی باز ہے
سلامت رہے آپ کا دردِ غم — یہی دردمندوں کی آواز ہے
نہ صہبا، نہ ساقی، نہ ساغر نہ جم — درِ میکدہ کس لئے باز ہے

عباس عابدی

کبھی بے رخی ہے کبھی ناز ہے — کہوں کیا عجب اس کا انداز ہے
محبت پہ الزام ہے کس لئے — تمہاری نظر خود ہی غماز ہے

نہیں بال و پر تو نہیں فکر کچھ — کہ باقی ابھی عزمِ پرواز ہے
ہے رسوا محبت بھی اور حسن بھی — نہ یہ راز ہے اب نہ وہ راز ہے
وہ بدلیں تو بدلا کریں عابدی — وہی اپنے ملنے کا انداز ہے

جمیل صالحہ قدسیہ

قفس کی یہ پابندیاں کچھ نہیں — پروں میں اگر زورِ پرواز ہے
نہ باغ و نشیمن نہ فصلِ بہار — قفس پھر بھی اک محشرِ راز ہے
عیاں ذرہ ذرہ سے ہے قدسیہ — مگر زندگی پھر بھی اک راز ہے

طرح دیگر

ع

"رین اندھیاری کٹھن بجھ بن کٹی جاتی نہیں"

ڈاکٹر سید اختر احمد

دل کی دھڑکن کیوں پیامِ جانفزا لاتی نہیں — زندگی کے ساز سے ان کی صدا آتی نہیں
قافلے کیوں جا رہے ہیں چاند تاروں کی طرف — روحِ انساں اس جہاں میں کیا سکوں پاتی نہیں
بے پیے ساقی یہ میکش مست رہتے تھے کبھی — اب تو یہ مے بھی تری محفل کو گرماتی نہیں
کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا یہ دنیا کا مزاج — ہم جب اس کے بن گئے وہ ہم کو اپناتی نہیں
اٹھ گیا ہے اس طرح دنیا سے سامانِ سکون — اب مسرت کی گھڑی بھی دل کو بہلاتی نہیں

ڈاکٹر اسد انصاری

زندگی جو راستوں کی ٹھوکریں کھاتی نہیں — منزلِ مقصودِ الفت کا پتہ پاتی نہیں
ہیں وہی اہلِ خرد جن کی بساطِ زندگی — وسعتِ چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلاتی نہیں
اب یہ میرا آئینۂ ہستی غبار آلود ہے — جلوے کیسے اپنی صورت بھی نظر آتی نہیں
ہے کشاکش زندگی کی موجبِ تسکینِ دل — پُرسکوں ماحول میں فطرت سکوں پاتی نہیں
کس قدر ہے مجرم بے باک انسانی شعور — آدمیت معصیت کر کے بھی شرماتی نہیں
کھلتے ہیں پھول آپ کے آنے کی پا کر اطلاع — آپ جب تک خود نہیں آتے بہار آتی نہیں
یہ میری معراجِ ذوقِ غم پسندی ہے اسد — یاد تک بھی اب کسی کی دل کو بہلاتی نہیں

روحی علی اصغر

پھول ہنستے ہیں مگر دل کی تڑپ جاتی نہیں — اک چمن ایسا بھی ہے جس میں بہار آتی نہیں

کوئی سیکھے میرے دل سے احتیاطِ دردِ عشق
ٹوٹ جاتا ہے یہ پیمانہ صدا آتی نہیں

ہم نے روشن کی ہے دل میں آگ سے شمعِ حیات
آندھیوں کے سامنے یہ شمع تھراتی نہیں

پہلے کچھ آنسو بہا لینے سے ملتا تھا سکوں
ان ستاروں کی چمک اب مجھ کو بہلاتی نہیں

ہم اسیرانِ قفس کیا جانیں انجامِ بہار!
اب ہوا بھی کوئی گلشن کی خبر لاتی نہیں

صحنِ گلشن میں جو آتی ہیں گھڑی بھر کے لئے
اُن بہاروں پر کبھی روحی نظر جاتی نہیں

میر حسین علی اختر

زندگی جب تک مجسم درد بن جاتی نہیں
آرزو کے خارزاروں میں بہار آتی نہیں!

بے خودیٔ شوق لے آئی ہے اس منزل پہ اب
ذکر کیا اس کا ہمیں اپنی بھی یاد آتی نہیں!

ہو گیا ہوں اس قدر شائستۂ ضبطِ الم
گریہ کا کیا ذکر لب تک آہ بھی آتی نہیں!

گریۂ شبنم پہ خنداں خندۂ گل پر ملول
کوئی عالم ہو مری دیوانگی جاتی نہیں!

ہر رہِ غم سے گذر جاتا ہوں اختر دیکھنا
کیا طبیعت ہے کسی مشکل سے گھبراتی نہیں!

سیدہ حفیظ

اس کے جلووں تک نظر اپنی کبھی جاتی نہیں
وہ نظر آئیں تو خیر اپنی نظر آتی نہیں

عمر کی گھڑیاں گذرتی جا رہی ہیں دمبدم
آنے والے تیرے آنے کی گھڑی آتی نہیں

دن کا اُجیارا تو کاٹا ہے کسی کی چھاؤں میں
"رین اندھیاری کٹھن تجھ بن کٹی جاتی نہیں"

پی کے نکلا ہوں کہاں سے پی کہاں کی رٹ لئے
او پپیہے دل سے تیرے کیوں یہ پی جاتی نہیں

منزلیں لاکھوں حفیظ آئی ہیں لیکن راہ میں
وہ ہے جس منزل پہ وہ منزل کبھی آتی نہیں

خاور نوری

شمع کیا تاریک گوشوں کا نشاں پاتی نہیں
ہم جہاں ہیں کیوں وہاں تک روشنی آتی نہیں

کیا سنا تا میں وہ کیا سنتے مرے دل کا پیام
اب تو کوئی سانس بھی آتی نہیں جاتی نہیں

فکرِ فردا لازمی ہے عشرتِ امروز میں
یہ نہ سمجھے کوئی دن کے بعد رات آتی نہیں

وجد کرتی ہیں نگاہیں جھوم جھوم اٹھتے ہیں دل
محفلِ اہلِ وفا میں کون مدھ ماتی نہیں

جائیں کیوں فصلِ جنوں کی سیر کو اہلِ خرد
طوق پہناتی ہے اکثر ہار پہناتی نہیں

دیکھتا رہتا ہوں شب بھر نیم باز آنکھیں مگر
تیری آنکھوں سے مری آنکھوں میں نیند آتی نہیں

جستجو لازم ہے خاور جستجو سے کام لے
ہر حقیقت بے تکلف سامنے آتی نہیں

زبیدہ سعدی عتنا

موت کے ڈر سے حیاتِ شوق تھراتی نہیں
شام کی تاریکیوں سے صبح گھبراتی نہیں

راستہ سیدھا ہے بالکل جلوہ گاہِ ناز تک — اک نگاہِ مضمحل بھی ٹھوکریں کھاتی نہیں
دل سے جب دل گفتگو کرتا ہے ازراہِ خلوص — پاس جو بیٹھے ہیں ان تک بھی صدا جاتی نہیں
آگ کی بارش سے رعنا سرخ رہتا ہے چمن — جو بہار آتی ہے اب وہ بجلی برساتی نہیں

محمد علی زیرک

بہتری کی کوئی صورت گو نظر آتی نہیں — فضلِ حق سے دل پہ مایوسی مگر چھاتی نہیں
کون کرتا ہے مصیبت میں مدد انسان کی — غیر کا ذکر کیا اپنی موت تک آتی نہیں
کالی کالی زلفیں کیوں ہیں خطۂ رخسار میں — دھوپ میں سنتے ہیں ہم کالی گھٹا چھاتی نہیں
ملتے ہیں سب سے مگر ہر اک سے دل ملتا نہیں — ہر حسیں صورت نگاہوں میں سما جاتی نہیں
ہوگیا ہے اس قدر دل خوگرِ رنج و الم — بیقراری بھی اگر آتی ہے تو تڑپاتی نہیں
ان کے اشکوں پر زباں زیرک میں کھولوں کس طرح — یہ تو میرا دل نہیں ہے۔ یہ میری سمجھ آتی نہیں

بانو طاہرہ سعید

کیا کروں مجھ تک تیری کوئی خبر آتی نہیں! — نکہتِ گیسو بھی اب بادِ صبا لاتی نہیں!
تو جو آجائے تو جیسے جل اٹھیں لاکھوں چراغ — "رین اندھیاری کٹھن تجھ بن کٹی جاتی نہیں"
میری چشمِ منتظر ہر رہگزر ہر موڑ پر — ڈھونڈھتی ہے تجھ کو لیکن تجھ کو پاتی نہیں!
بیوفائی پر بھی کیسے مان لوں میں بے وفا — سچ بتا کیا یاد میری تجھ کو تڑپاتی نہیں!
طاہرہ۔ ماضی کی تلخی یا کہ مستقبل کا غم — کوئی بھی تو کیف ساماں اب دل کو بہلاتی نہیں!

سید احسان علی عرشی

فکرِ شاعر دہر میں کوئی جگہ پاتی نہیں — [illegible]
آتشِ ہجراں کے شعلے بڑھ رہے ہیں دل کی سمت — آج چشمِ منتظر کیوں، اشک برساتی نہیں
فلسفۂ دوراں وہی۔ فکرِ زمانہ ہے وہی — ہر مصیبت سے طبیعت اب کبھی گھبراتی نہیں!
منتظر ہوں توبہ کی کیلئے عرشی مگر — کیا کروں کمبخت رُت برسات کی جاتی نہیں

جمیل صالحہ قدسیہ

تف ہے اس طوفاں پہ جو کشتی ڈبونے کو اٹھے — حیف اُس کشتی پہ جو طوفاں سے ٹکراتی نہیں
چلنے والو اب چراغِ راہِ مستقبل بنو — زندگی افسانۂ ماضی کو دہراتی نہیں
آخری قطرہ بھی خونِ دل کا آنکھوں میں ہے — اس سمندر کی مگر دریا دلی جاتی نہیں!
ڈگمگاتے لڑکھڑاتے آرہا ہوں تیرے پاس — تیری آنکھوں کا ہے نشہ میں خراباتی نہیں
گردشِ دوراں نے کس کس کو بھلایا ہے مگر — یاد تیری دل سے اے شاہ قلی جاتی نہیں

مظہر عاصل

اب تیری تصویر بھی دل میرا بہلاتی نہیں
بات جو تجھ میں ہے وہ اُس میں نظر آتی نہیں

صرف میرے آشیاں تک بجلیاں پہنچیں کبھی
کیا ہوا اب برق کیوں گلشن پہ لہراتی نہیں

ہوتے ہوتے ایسے طوفاں کے عادی ہو گئے
آج ساحل کی ہوا تک ہم کو راس آتی نہیں

کر دیا مانوس ہنگاموں سے تیرے عشق نے
اب طبیعت تو کسی عالم میں گھبراتی نہیں

آ گیا اک فتنہ زا، سحر ادا، محشر خرام
دل کے بچنے کی کوئی صورت نظر آتی نہیں

قلب میں کب چٹکیاں لیتا نہیں تیرا خیال
کس گھڑی کس وقت تیری یاد تڑپاتی نہیں

وہ بھی کوئی دل جو مظہر اُن سے دل لے مل جائے
وہ نظر کیا جو نظر سے اُن کی ٹکراتی نہیں

فرید متین

زندگی جب زندگی پر ناز فرماتی نہیں!
شام غم جاتی نہیں صبح نشاط آتی نہیں

چشم ساقی سے چرا لیتا ہوں صہبائے نشاط
غم میں جب تسکین کی صورت نظر آتی نہیں!

کشتیٔ ہمت نہ ہو جب تک تلاطم آشنا
زندگی بھولے سے لطفِ زندگی پاتی نہیں

کون سی ساعت نہیں غم سے عبارت اے متین
کونسا لمحہ ہے جس میں تیری یاد آتی نہیں

مہر النساء مہر

برق میں ان کی نظر کی بات آتی ہی نہیں
خود تڑپتی ہے ہمارے دل کو تڑپاتی نہیں

حسن نے تو سینکڑوں دنیا کے کھائے ہیں فریب
عشق کی فطرت فریب زندگی کھاتی نہیں

جز نگاہِ نازِ جاناں، جز خیالِ روئے دوست
اور کوئی چیز آڑے وقت کام آتی نہیں

کون سی منزل پہ جا پہنچے اسیرانِ قفس
اب تو ہم تک آپ کی آواز بھی آتی نہیں

مطمئن ہو دل تو ہم پیتے ہیں حسرت کا لطف
مضمحل ہو دل تو پھر فردوس بھی بھاتی نہیں

وحشتِ دل اور بڑھ جاتی ہے لیکن کیا کروں
دل میں تیری یاد آتی ہے تو پھر جاتی نہیں

کیف غم سے ہی مرے دل کو سکوں ملتا ہے مہر
میری فطرت انتہائے غم سے گھبراتی نہیں

یوسف نظر

حسرتِ منزل کبھی منزل پہ پہنچاتی نہیں
صرف امید سہارے تیرگی جاتی نہیں!

زندگی کی راہ میں چھوٹا ہے جب سے تیرا ساتھ
ذکر کیا غم کا خوشی بھی مجھکو راس آتی نہیں!

آدمی پا سکے نہ جب تک آدمیت کا مقام
روشنی پا کر بھی دنیا روشنی پاتی نہیں

ہے گوارا ہم کو تیرا ایسی فراست سے نظر
جو فراست پیار سے آداب سکھلاتی نہیں

صلاح الدین نیّر

شمع کے سینوں میں یوں ہی آگ لگ جاتی نہیں
جب تلک ٹوٹے نہ دل نغموں میں جان آتی نہیں

جن سے مستقبل پہ پڑ سکتی نہیں کچھ روشنی
ان فسانوں کو کبھی تاریخ دہراتی نہیں

ہر لب و لہجہ کشش رکھتا ہے اپنے میں مگر
میری شائستہ طبیعت اتنی جذباتی نہیں

صبحِ ہستی آرزوئے دل مانگتی ہے ہر نفس
گرمیٔ فکر و نظر سے جب پگھل جاتی نہیں

عنبریں زلفوں سے خوشبو آ تو جاتی ہے مگر
آپ کے لہجے سے کیوں بوئے وفا آتی نہیں

ایسی کہئے جو زندگی بھر کھٹکتی ہی رہے
بات جو گہری نہ ہو دل میں اتر جاتی نہیں

آپ کی ان مدبھری آنکھوں کا جب تک فیض ہے
شیشہ و ساغر پہ نیرّ کی نظر جاتی نہیں

ظہیر جعفری

جلوہ گر رہتے تھے تم ہر دم تصور میں مرے
اب یہ عالم ہے تمہاری یاد بھی آتی نہیں

انقلاباتِ زمانہ کا یہ عالم دیکھئے
روشنی ہوتی ہے لیکن تیرگی جاتی نہیں

کیا قیامت ہے محبت کی کرشمہ سازیاں
تم سے مل کر بھی مرے دل کی تڑپ جاتی نہیں

کتنی پُراسرار ہے دنیا محبت کی ظہیرؔ
بات کرتے ہیں وہ مجھ سے اور صدا آتی نہیں

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

...سنہ ۱۹۳۸ء فون نمبر (۳۵۲۰۹)

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

...: (۴۴) شمارہ: (۳)

مارچ ۱۹۶۱ء

...: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

...ادارت:

رین راج سکسینہ
نعیم الدین ہاشمی
رائے جانکی پرشاد
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
وقار خلیل

ہندوپاک سے: چھ روپے
...: تین روپے
...ہند سے: دس روپے
(۵۰) نئے پیسے
...نیشنل فائن پرنٹنگ پریس...
...حیدرآباد سے شائع کیا۔

ترتیب

اپنی بات

ملک کی آزادی کے بعد زبانوں کا مسئلہ جتنا نازک اور پہلودار بن گیا ہے اس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ملے۔ زبانیں ۔۔۔ یہ حصولِ علم، علاقائیت اور ذہنی التصغیری کی وابستگی کا زینہ ہوتی ہیں، جب وہ تنگ نظری اور وقتی تعصبات کی لپیٹ میں آجاتی ہیں تو اس سے ملک کا ناقابلِ تقسیم اور ناقابلِ تقلید تہذیبی ورثہ متاثر ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں یوں تو کئی زبانیں بولی، سمجھی اور لکھی جاتی ہیں مگر دستور کے سلسلات میں ۱۴ زبانیں ایسی ہیں جنہیں سرکار نے مان لیا ہے اور ان کی سرکاری طور پر سرپرستی کی جاتی ہے۔ ہندی کو بھارت کے آئین کی رو سے قومی اور سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور اس فیصلے سے انحراف وطن دشمنی کے منافی ہوگا۔

علاقائی زبانوں کی اشاعت اور بقاء کے لئے ہر طرح کی کوششیں ہو رہی ہیں، جامعات میں درس و تدریس کی سہولتیں مل رہی ہیں۔ اس طرح ہندوستان جو کئی زبانوں کا حسین و دلکش امتزاج ہے، ترقی کر رہا ہے۔ مگر اردو زبان کے ساتھ جو تعصب برتا جا رہا ہے اس کا عملی طور پر انسداد اور سدباب نہیں ہو رہا ہے۔ اردو والے کانفرنسوں کا انعقاد کر کے اور تجاویز کو منظور کر کے، دستخطی مہموں کا آغاز کر کے، لگاتار اردو کا واجبی حق حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں اور مسلسل کر رہے ہیں۔ یوپی جو اردو کا گہوارہ ہے اور جہاں کی نصف سے زیادہ آبادی اردو سے کما حقہٗ واقف ہے، وہیں یہ زبان بقول پروفیسر ہارون خاں شیروانی "ناخواندہ مہمان" بنی ہے۔ لسانی صوبے تشکیل پائے مگر اردو جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے کہیں بھی اپنا تسلط نہ جما سکی۔ تعلیمی، دفتری اور دیگر شعبہ جات میں ہر جگہ اردو مقبول مگر کہیں بھی سرکاری طور پر اس کو جائز حقوق نہیں ملے۔ ہاں آندھرا پردیش میں اس زبان کو ثانوی درجہ دیا گیا ہے اور تعلیمی و دفتری سہولتیں بھی ملی ہیں مگر صرف تلنگانہ کی حد تک۔ ہماری حکومت قرار واقعی اردو کے ساتھ کچھ ہمدردی رکھتی ہے تو اسے اس بات کا اعلان کر دینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہئے کہ جامعہ کو جو گذشتہ پچیس تیس سال کی ہندوستانی زبانوں میں قائم شدہ پہلی اردو یونیورسٹی تھی، اب بھی اسے اردو یونیورسٹی کے منصب پر باقی رکھے۔ اس سلسلہ میں مرکزی تعلیم ڈاکٹر [illegible] نے علاقائی زبانوں میں جامعاتی تعلیم کے فروغ اور احیاء کے تعلق سے ایک واضح بیان بھی جاری کیا تھا جس کا حوالہ دیتے ہوئے اردو زبان کے مشہور انشاء پرداز، ماہر لسانیات اور نقاد و محقق ڈاکٹر زور نے بھی حیدرآباد میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ایک جلسہ کرسی نشینی میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے مرکز سے مطالبہ کیا ہے کہ "مستقبل قریب میں جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعۂ تعلیم کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ مختلف جامعات میں دستورِ ہند کی مسلمہ زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے تو اردو کو بھی جامعہ عثمانیہ میں اس کا حق ملنا چاہئے۔ پونا یونیورسٹی مرہٹی کو ذریعۂ تعلیم بنا چکی ہے اور دوسری کئی جامعات نے علاقائی زبانوں اور ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا اعلان کیا ہے۔ آندھرا پردیش میں اس دو جامعات (سری وینکٹیشورا یونیورسٹی اور آندھرا یونیورسٹی) یقینی طور تلگو کی جامعات رہیں گی؛ ورنگل میں بھی ایک یونیورسٹی قائم ہونے والی ہے اس میں بھی تلگو ہی ذریعۂ تعلیم ہوگی۔ رہ گئی عثمانیہ یونیورسٹی، اسے اردو یونیورسٹی بنا دیا جائے تو اس سے علاقائی زبانوں اور پھر ان زبانوں سے حکومت کی جانبداری اور ترویج کے ایک صحت مند اور فراخدلانہ ثبوت کا مظاہرہ ہوگا۔ ہماری جامعہ نے اردو ذریعۂ تعلیم جو عظیم ریکارڈ سابق میں قائم کر رکھا ہے، اس کی شہرت چار دانگ عالم میں سنائی دیتی ہے۔ جامعہ کو اردو یونیورسٹی بنانے کے لئے آج کے پُر امید اور کشیدہ حالات میں زبردست جدوجہد اور اتحاد و یگانگت کی بیحد ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر زور کی اس پُر زور حقائق آمیز تقریر کا صحافت نے خوب خیر مقدم کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا تعلق چونکہ ریاست آندھرا پردیش سے ہے اور ریاستی حکومت نے اردو کے تعلق سے اپنی وسیع النظری کا اعلان کرتے ہوئے اسے ریاست کی علاقائی زبان قرار دیا ہے تو ایسی صورت میں توقع کی جاتی ہوگی کہ جامعہ کو اس کا سابقہ حق بحال کرنے میں ہماری ریاست پوری فراخدلی کا مظاہرہ کرے گی۔ اور ذوقِ نغمہ کی کم یابی کے لئے ضرورت پڑے تو "نوا را تلخ تر می زن" سے بھی کام لینا پڑے گا۔ امید ہے اردو دوست اس آواز کو صدا بصحرا نہ ہونے دیں گے (و۔ خ)

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی

کلام قطب شاہ پر ایک سرسری نظر

غزل میں داخلی اور خارجی پہلو کی اہمیت کا اظہار اس دور میں عام ہو گیا ہے ورنہ ابتدا میں غزل لکھی جاتی رہی ان میں داخلی اور خارجی پہلو نمایاں ہوتے رہے لیکن لکھنے اور پڑھنے والے دونوں ان اصطلاحوں سے نابلد تھے۔ اسی طرح غزل کی شان دوبالا کرنے میں جمالیاتی ذوق کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ آج جن شعراء کی عظمت کا سکہ عوام کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اس کا بڑا جز جمالیاتی پہلو کی وجہ سے ہے۔ اس لئے کہ غزل کی تمام نزاکتیں اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ غزل کی زمین، تشبیہ اور استعارہ، ترنم و تسلسل، انتخاب الفاظ یہ سب مل کر غزل کو ایک آن اور ایک بانکپن عطا کرتے ہیں۔ غزل کی مقبولیت کا راز اسی میں ہے ورنہ یہی کا قریب قریب صورتیں گیتوں میں بھی ہیں بلکہ گیت میں جذبات کا اظہار کھلے بندوں ہو جاتا ہے اور یہ راست اثر کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود قبولیت کا سہرا غزل ہی کے سر بندھا۔

محمد قلی قطب شاہ کا دور عیش و عشرت اور امن و سلامتی کا دور ہے۔ یہی کیا کم بات ہے کہ اس کی ۳۲ سالہ حکمرانی کے دور میں ایک لڑائی ہوئی اور نہ بادشاہ نے کسی کے قتل کا حکم دیا۔ خون کی ندی کہیں نہ بہی۔ خواہ وہ مزدوروں کا خون ہو یا ظالموں کا۔ اس لحاظ سے اس کو پہلا اشتراکی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی نگاہیں دور رس تھیں اور وہ جز میں کل کی تصویر دیکھنے کا عادی تھا۔ اس کی کشادہ دلی، وسیع النظری اور عمیق مطالعے نے اس کو ایک خاص انداز اور ایک خاص اسلوب عطا کیا۔ اسی لئے اس کے کلام میں ہر قسم کی تصویریں ملتی ہیں جو نظر کے راستے اتر کر دل میں جاگزیں ہو جاتی ہیں۔ ربع صدی پہلے اس کی ایک غزل سے "پیا باج پیالہ پیا جائے نا" منظر عام پر آئی اور زبان زد خاص و عام ہو گئی۔ اس غزل کے لوچ اور مٹھاس نے ادیبوں کو اس کے دیوان کے مطالعہ کی ترغیب دلائی اور کلیات منظر عام پر آگیا۔ اس طرح اس کی رنگین زندگی سہانے سپنوں کی طرح نگاہوں میں بس گئی۔ اس نے اپنے کلام میں بصیرت و بصارت کے جو ثبوت فراہم کئے ہیں وہ گراں پایہ ہیں۔ وہ دلوں میں اترنے کی راہیں جانتا تھا۔ اور انہیں راستوں سے اس نے عوام کے قلوب میں ایسی جگہ پائی کہ چار سو سال بعد آج بھی اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ عوام کے قلوب کو مذہبی عقائد سے قریب ہو کر متاثر کیا جا سکتا ہے اس لئے اس نے اپنی نعت میں لکھا ہے اور کتنی خوبی کے ساتھ یہ مضمون باندھا ہے کہ تو ابراہیم (قلی قطب شاہ) کا بیٹا ہے اور جس طرح اسمٰعیلؑ کی خدا نے حفاظت کی انہیں ذبح ہونے سے بچایا خدا تجھے بھی بچائے گا۔ کہتا ہے

توں ابراہیم کا فرزند تجھے تج دوستاں سوں مل۔ جوں اسمٰعیل کو حق پیار ہوں' دائم نگہبان ہے اور اتنے کے بعد کیسی لطافت کے ساتھ یہ مضمون پیش کرتا ہے کہ تیرے ساتھ اگر کسی نے دشمنی کا اظہار کیا تو گویا اس نے محمدؐ سے دشمنی کی اور محمدؐ سے دشمنی کرنیوالے دنیا میں ہمیشہ ذلیل و خوار رہے ہیں۔ کہتا ہے۔

جو کوئی تج سات یک حبث میں سو دشمن ہے محمدؐ کا　　　جو دشمن ہے محمدؐ کا سدا خوار ہور پریشاں ہے

محمد قلی یعنی غلام محمدؐ نے ایک مقتدر اور باجبروت بادشاہ ہوکر بھی اپنا سرِ نیاز بارگاہِ رسالت میں جھکایا ہے اس کی تشبیہیں' استعارے اور انوکھے مضامین اس کو بلند پایہ شاعر بناتے ہیں۔ اس نے حیدرآباد بسایا اور بہت سے بادشاہوں نے بھی شہر آباد کئے لیکن محمد قلی نے اپنا سرِ نیاز بارگاہِ رب العزت میں جھکا کر دعا کی۔

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر　　　رکھیا جوں توں دریا میں مِن یا سمیع

اے مجیب الدعوات' دریا میں تونے جس طرح مچھلیاں پیدا کی ہیں اسی طرح میرا شہر بھی آباد ہو جائے۔ آج اگر ہم غور کریں تو کیا کوئی انکار کرسکتا ہے کہ اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ ۴۰ لاکھ کی آبادی کئی گنا بڑھ گئی اور ۴۰۰ سال بعد ہی سلطنت آصفجاہی نے یہیں سے جنم لیا اور محمد قلی کے سہانے سپنے کی تعبیر ہم نے دیکھ لی۔

نعت میں ایک اور شعر کہا ہے۔

باتاں گھر سیاں نرملیاں واریا جو تیرے ناؤں　　　سو جائے گو اسماں پر ہر یک تارا ہوا

آپ آسمان میں تارے دیکھتے ہیں۔ درخشندہ اور تابندہ۔ یہ کیا ہیں۔ میں نے موتی جیسی صاف و شفاف باتیں آپ کے نام پر نثار کردیں۔ یا نبیؐ آپ کے صدقے میں آئے ہوئے موتی آسمان پر جاکر تاروں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

اسی مضمون کو ایک اور مقام پر کہتا ہے۔

چندر' غواص ہو آیا گگن سمدر بھیتر دھایا　　　نبی پر وارنے لیایا ڈھلک موتیاں سو تارے ہیں

چاند نے آسمان سے اتر کر سمندر میں غواصی کی۔ بڑی محنتوں اور تکالیف کے بعد اس نے چند منتخب موتی آنحضرتؐ پر نثار کرنے کے لئے حاصل کئے لیکن یہ سب موتی آسمان میں تارے بن گئے۔ یہ تشبیہیں بعد کے شعراء میں بھی نظر نہیں آتیں۔ پانی میں چاند کا عکس تو سبھوں نے دکھایا ہے لیکن چاند سے یہ سعادت حاصل کرنے کا موقع کسی نے فراہم نہیں کیا۔ اس سے محمد قلی کو آنحضرتؐ سے جو قلبی تعلق ہے اس کا اظہار ہوتا ہے۔

معشوق کے سراپا میں تو اس نے نئی نئی تشبیہیں تلاش کی ہیں اور اس سلسلہ میں جس جودت و ذکاوت اور جدتِ طبع ندرت کا ثبوت ملتا ہے اس پر بطلی الحسن بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شعر ہے

کھل نیناں سہیلیاں کے سو پر مل سام بادام　　　ٹھوڈی ہے سیب دنتاں جول کے چاروَلیاں ہیں چاریاں کی

معشوق اور اس کی سہیلیوں کی آنکھوں' ٹھوڑی اور دانتوں کو تشبیہ دی جا رہی ہے۔ معشوق کی اور اس کی سہیلیوں کی کھلائی ہوئی آنکھیں حسین نازک گہرے نیلے رنگ کے بادام ہیں۔ ان کی ٹھوڑیاں سیب کی طرح ہیں اور دانت چارہ کی چرونجی کے جیسے۔ چارہ دکن بلکہ آندھرا دیس کا خاص میوہ ہے اور گرمائیوں میں بہ افراط دستیاب ہوتا ہے۔ دیہات میں سیر بھر جوار کے معاوضہ میں

دوبہر چارہ مل جاتا ہے۔ بیر کی طرح اوپر کا حصہ کھانے والے کھاتے ہیں ورنہ ویسے ہی دھو دھو کے گٹھلیاں صاف کرتے جوتے اور جیرہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ داشتوں کو جیرو بیجی سے اس چار سو سال میں کسی نے تشبیہ نہیں دی اس لئے کہ دیگر شعراء نے فارسی شاعری کو مشق نظر رکھا اور محمد قلی نے اپنے دیس کو اپنے رسم ورواج کو اپنے دنیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کو صرف بھاگ متی ہی نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس میں اس نے دلکشی پائی' ان سے محبت ہی نہیں کیا بلکہ عشق کیا اور اپنے کلام میں جگہ دی۔ اس کے کلام میں مقامی رنگ کی جو مثالیں ملتی ہیں اتنی مثالیں نظیر اکبر آبادی کے سوا اور کہیں نہیں ملتیں۔

شاہی دربار میں گل رخوں کی کیفیت ملاحظہ ہو کہ ہاتھوں میں مہندی کی بوندیں ہیں اور رخسار کونپل کے پتے کی طرح سرخی لئے ہوئے۔ بات کرتی ہیں تو پھول جھڑتے ہیں سب اس رنگ میں سندر کھارے ہو گئے ہیں۔ شعر پڑھئے۔

بند مہندی کے ہاتاں منے گل لال جوں پاتاں منے   موتی جھڑیں باتاں منے جل سے سمندر کھارے ہیں

ایک جگہ معشوق کی زلفوں اور ابرو کی تعریف کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ میرا قلم سیدھا ہے۔ وہ تیری پیچ در پیچ زلف وہ زلفوں کی تعریف کیسے کرسکے گا۔ اور تیرے ابرو کے چاند سے ہلال کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ وہ اس سے بہت کم درجہ رکھتا ہے۔ شعر ہے:۔

کیوں لکھے رنگی تری لٹ کا صفت سیدا قلم   ہے نوا چاند بہوت تیرے بھواں چاند سے کم

ایک مضمون ہے کہ جہاں معشوق کا ساتھ ہو وہ جنت ہے اور جہاں نہ ہو وہی دوزخ ہے۔ کہتا ہے کہ جنت، دوزخ اور اعراف میرے لئے کچھ نہیں جہاں تو ہے وہی میرے لئے جنت ہے اور جہاں تو موجود نہ ہو وہ دوزخ۔

جنت ہور دوزخ ہور اعراف کچ نیں ہے میرے کیے   جدھر تو واں مرا جنت جدھر میں واں سقر مجکوں

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے یہ شعر کہا ہے:۔

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے   تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

چار سو سال پہلے محمد قلی قطب شاہ نے بھی اس کے قریب المعنی شعر کہا تھا۔

جو منج بسرتے ہیں تمیں تمنا بسرتے رہیں   ہمنا تمن بن ناگیں جاتا بہت دشوار ہوں

آپ ہمیں بھول جاتے ہیں تو ہمیں بھی چاہئے تھا کہ آپ کو بھول جاتے مگر باوجود انتہائی دشواری کے آپ کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔ غالب کے پاس رشک کے مضامین کی کمی نہیں لیکن یہ مضمون غالب کو بھی نہ سوجھا۔

پیا مورت رکھی ہوں نین میں   کہ آپ پتلیاں کوں رشک سوں خون کھائی

میں نے محبوب کی تصویر کو اپنی آنکھوں میں اس طرح رکھ لیا ہے کہ اپنی پتلیوں کو بھی خبر ہونے نہیں دی کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے محبوب کی صورت کو پتلیاں دیکھ پائیں (اور میری رقیب بن جائیں)

اچھوتے مضمون کے اور دو شعر ہیں۔ کہتا ہے کہ

ترے نین کا کاجلا دیکھ دلبن   ایسے کا جلا ہونے جلتا شمع

اے نازنین شمع نے تیری آنکھوں میں کاجل کی تحریر پائی اور یہ سمجھ رہی ہے کہ خود اگر جل کر کاجل بن جائے تو

تک رسائی حاصل کرسکے۔

دوسرا شعر ہے:۔

خدا کالے نانوں پیرت پھل کھلائیں ٭ تو تانے اپر تازے بھی بار لیا ئیں

قاعدہ ہے کہ پھول ایک بار آجانے اور پھل بن جانے کے بعد اگر اس پھول یا پھل کو توڑ دیا جائے تو اسی موسم میں پھل پھول دوبارہ نہیں آسکتے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ اگر خدا کا نام لے کر ہم محبت کے پھول کھلانے لگیں تو بار آجانے کے بعد پھر دوبارہ بار آجائے۔ محبت کی تر و تازگی میں کبھی کمی نہیں ہوسکتی۔

چار سو سال کی قدیم شاعری میں ایسی بہت سی تشبیہیں اور ایسے بہت سے نئے مضامین مل جاتے ہیں جو آج تک کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔

قلی قطب شاہ کے بارہ سو صفحات کے کلیات میں معنی آفرینی بھی ہے اور جدتِ خیال بھی۔ شیرینی بھی ہے اور جمال بھی، سطوتِ شاہانہ بھی ہے اور اندازِ فقیرانہ بھی۔ مقامی رنگ بھی ہے اور مے گل رنگ بھی۔ غرض یہ کلیات معانی "گنجینۂ سخن" ہے اور چار سو سال پہلے کی زندگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع۔ اس کے معاشرہ کی ایک زندہ تاریخ:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ٭ چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

حبیب ضیاء قادریہ
(ایم اے)

"دکنی میں اسم کی فاعلی حالت"

اسم کی حالت جملے کے معنی و مفہوم سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ جیسے "دل کہیا میں عاشق ہوں" (وجہی) اس جملہ میں دل اسم ہے مگر اس کے ساتھ کوئی ایسی علامت نہیں ہے جس سے اس کی فاعلی حالت کا پتہ چلتا ہے لیکن بعض وقت اسم کے ساتھ ایسی علامت لگائی جاتی ہے جس سے اسم کی حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے جیسے "رب نے بخشتا ہے"۔ "خضر نے دکھلایا"۔ ان جملوں میں "نے" علامتِ فاعل ہے اور رب اور خضر فاعلی حالت میں ہیں۔ یا "سمن بر اس کوں گند کر مار دی ایک!" اس مصرعہ میں "کوں" علامتِ مفعول ہے اور "اس" جو کہ ضمیر شخصی ہے مفعولی حالت میں ہے۔

دکنی میں اسم کی چھ حالتیں ملتی ہیں۔ خواہ اسم کی حالت کسی علامت سے ظاہر ہو یا محض جملے کے مفہوم سے۔
(۱) فاعلی (۲) مفعولی (۳) اضافی (۴) ندائی (۵) خبری (۶) طوری

فاعلی حالت:- دکنی میں اسم کی فاعلی حالت عموماً جملے کے مفہوم سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ "نے" علامتِ فاعل کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس علامت کا استعمال دکنی میں ضروری نہیں۔ جب کبھی یہ علامت استعمال ہوتی ہے تو:-
(۱) ماضی مطلق، ماضی قریب اور ماضی بعید کے ساتھ ہوتی ہے (۲) کبھی ماضی استمراری کے ساتھ نہیں ہوتی۔ (۳) نہ حال و مستقبل کے ساتھ ہوتی ہے۔ (۴) دکنی میں یہ علامت فعل متعدی اور فعل لازم دونوں کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ (۵) "نے" کے استعمال کے باوجود فعل، جنس و تعداد اور صفت میں فاعل ہی کے تابع رہتا ہے! اسی لیئے دکنی میں "نے" کے استعمال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر جملے سے یہ علامت حذف بھی کر دی جائے تو کوئی نحوی سقم پیدا نہیں ہوتا۔

) ماضی مطلق کے ساتھ "نے" کا استعمال:-

اس نے کھیل یوں کھیلیا — وجہی (ص۳ سب رس)۔ وہی بولیا جو کچھ خدا نے فرمایا — وجہی (ص۲۶ سب رس)
بالِلسان و تصدیق بالقلب، اقرار نے تصدیق اپنے پڑیا بولتے ہیں — خواجہ بندہ نوازؒ (ص۲۳ معراج العاشقین)

چنچل نے ہنس کے یوں بولی تیرا انجام ہوتا ہے — صبا پرسوں لگوں دیکھوں اگر آرام ہوتا ہے
(ہاشمی ص۲۰۱ دیوان)

لکھائی ملک آرا نے دونوں کے شاہ کوں کاغذ ـــــ ابن نشاطی (ص۱۴۴۔ پھولبن)

اُوپر کے اشعار اور جملوں میں "کھیایا" "فرمایا" "پایا" "انپڑایا" "بولی" اور "لکھائی" ماضی مطلق ہے۔

۲۔ ماضی قریب کے ساتھ "نے" کا استعمال :۔

دیکھت تجھ ناز کی ہمنا کہی لے ہاشمی تمنا　　　ازل تے رب نے بخشا ہے خوشی عشرت بکیند رخط

(ہاشمی (ص۱۰۔ دیوان)

"خدا کے دوستاں نے بولے ہیں" ـــ وجہی (ص۱۔ سب رس) "دنیا ایسی ہے جو اس دنیا خاطر لوکاں نے ماں باپ کوں مارے ہیں۔ سگے بھایاں نے سگے بھایاں سوں علاوت سارے ہیں" ـــ وجہی (ص۹۱۔ سب رس)

"خدا کا رسول خدا کا مقبول اسے یوں بھایا ہے۔ اُن نے بھی یوں فرمایا ہے" ـــ وجہی۔ (ص۱۵۔ سب رس)

شرمندگی سیں لالہ بد رنگ ہو پھرا تھا　　　ہو مہرباں اونے لب کی دیاں ہیں لالیاں۔ ہاشمی (ص۱۲۰۔ دیوان)

"بخشا ہے" "بولے ہیں" "مارے ہیں" "بھایا ہے" اور "دیاں ہیں" ماضی قریب ہے۔ ان سب کے ساتھ "نے" استعمال ہوا ہے۔

۳۔ ماضی بعید کے ساتھ "نے" کا استعمال :۔

"ہمت نے مکتوب لکھیا تھا سو قامت کے انگے کھولیا" ـــ وجہی (ص۱۸۔ سب رس) "لکھیا تھا" فعل متعدی ہے۔

۴۔ فعل متعدی کے ساتھ "نے" کا استعمال :۔

صفائی ترے دل کی دیکھا سو پاک　　　کیا صبح نے جھل سوں دامن کوں چاک

(نصرتی - ص۲۳۔ گلشن عشق)

اس شعر کے دوسرے مصرع میں "چاک کرنا" فعل متعدی ہے۔

اے عکس میں نے دیکھیا سنگ کر کے یار کا　　　پن نہ دیکھیا ہے سمج ہور سنگ دل تج سار کا

(بحری - ص۱۲۶۔ کلیات)

"دیکھنا" فعل متعدی ہے۔

فعل متعدی کے علاوہ فعلِ لازم کے ساتھ بھی "نے" استعمال ہوتا ہے جیسے :۔

وہ عاشق نے ہمت سوں تس در کوں ڈاٹ　　　چلیا پیش اندر دونوں کھول پاٹ

نصرتی (ص۱۵۶۔ گلشن عشق)

"چلنا" فعل لازم ہے اور اس کے ساتھ "نے" استعمال ہوا ہے۔

ذیل کے مصرعوں اور جملوں میں فعل لازم کے ساتھ "نے" استعمال کیا گیا ہے

یوں ہاشمی نے بولیا سن کر تو ہنس پڑی دلھن　　　یولی مراد ہوئیگی تیری میٹھی غزل سوں

(ہاشمی۔ ص۱۶۸۔ دیوان)

"رقیب نے، روسیاہ نے، بے نصیب نے بولیا توں کہاں کا ہے۔ اس جاگا تو کیوں آیا"۔ وجہی (ص۱۵۔ سب رس)

کاں آئے کے رہی تمہارے سیجار دوسری نے ٭ لاکر لگن سستی ہے گھر دوار دوسری نے

ہاشمی (ص۲۴۶۔ دیوان)

"آنا" "بولنا" اور "رہنا" فعل لازم ہیں۔

دکنی میں "نے" کے استعمال کے باوجود فعل جنس و تعداد اور صفت میں فاعل کے تابع ہوتا ہے۔ جیسے :۔

پریاں سنے اتاریاں سو کوت سنگل ٭ ہوں دست کر مار بیٹھا بغل

نصرتی (ص۔۔۔۔ گلشن عشق)

لفظ "پریاں" جمع مونث ہے۔ اس لیے فعل "اتاریاں" بھی جمع مونث ہے۔

"خضر نے بی انکھیاں سوں وو یچ اشارت دکھلایا"۔ وجہی (ص۲۹۹۔ سب رس)

"خضر" واحد مذکر ہے۔ اس لیے فعل بھی واحد مذکر ہے۔ حالانکہ مفعول "اشارت" واحد مونث ہے۔

"زہرہ نے جلوہ گائی"۔ وجہی (ص۲۹۶۔ سب رس)

مفعول "جلوہ" مذکر ہے۔ لیکن چونکہ فاعل "زہرہ" واحد مونث ہے اس لیے فعل "گائی" بھی واحد مونث استعمال ہوا ہے۔ جنس کی طرح تعداد میں بھی فعل فاعل کے تابع ہوتا ہے۔ جیسے :۔

"نازاں نے گھونگٹ کھولے"۔ وجہی (ص۲۹۶۔ سب رس)

مفعول "گھونگٹ" واحد ہے۔ لیکن فاعل "نازاں" جمع ہونے کی وجہ سے فعل بھی جمع استعمال ہوا ہے۔

سٹیا کوئی بوالہوس نے جیوں ہوس سوں لال نارنگیاں ٭ دسے گوری کے یوں گورے گلابی گال پانی میں

ہاشمی (ص۱۲۶۔ دیوان)

فاعل "بوالہوس" واحد مذکر ہے۔ اس لئے مفعول "نارنگیاں" جمع مونث ہونے کے باوجود فعل "سٹیا" واحد مذکر ہے۔

جنس و تعداد کی طرح دکنی میں فعل صفت میں بھی فاعل کے تابع ہوتا ہے۔ جیسے :۔

"خدائے تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرماتے ہیں"۔ خواجہ بندہ نوازؒ (ص۱۰۴۔ معراج العاشقین)

"خدائے تعالیٰ" واحد ہے لیکن اس کی بزرگی کے پیش نظر فعل "فرماتے ہیں" جمع مذکر استعمال کیا گیا ہے۔

"حضرت نے بولے اے اخی جبریل اللہ کے میرے درمیان ہستی پردا ہے"۔

خواجہ بندہ نوازؒ (ص۲۰۔ معراج العاشقین)

رسول مقبول صلعم کی عظمت کے پیش نظر فعل "بولے" جمع مذکر لایا گیا ہے۔

مرشد نے دیکھ مجھ کوں کئے توں سہتا ہوئے گا ٭ مرشد کوں یاد رکھ نبٹ دل رکھ توں سلسلے کا

ہاشمی (ص۔۔۔۔ دیوان)

("مرشد" چونکہ واجب التعظیم ہے اس لئے واحد مذکر ہونے کے باوجود فعل "کئے" جمع مذکر لایا گیا ہے)

جیسا کہ ابتدا میں وضح کر دیا گیا ہے کہ دکنی میں ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید کے ساتھ "نے" کا استعمال

ضروری نہیں ہے اسے حذف بھی کر دیا جائے تو جملے کے معنی یا مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جیسے :-

سہیلی یو سن بات ہنس بے حساب — دئی اُن بی سوگند کھا یوں جواب

نصرتی (صـ۱۵۹ گلشن عشق)

"دی" ماضی مطلق ہے اور متعدی بھی۔ اس کے باوجود "نے" کا استعمال نہیں کیا گیا ہے —

شجاعت کی جنے یو بات بولیا — زباں کے گوہراں اس دھات تولیا

ابن نشاطی (صـ۱۲۲۔ پھولبن)

راجنا کل جو خواب دیکھی میں — در شب ماہتاب دیکھی میں — غواصی (صـ۱۴۱ کلیات)

کہہ طور اُجالا شب رات اب دِ پائے — آب خیات سنکوں اب ہت خضر پلائے

محمد قلی (صـ۲۷۴ کلیات پہلا حصہ)

اُوپر کی مثالوں میں "بولیا" "دیکھی" "پلائے" اور "کہے" ماضی مطلق ہے۔

اسی طرح اکثر دفعہ ماضی قریب کے ساتھ بھی "نے" کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ جیسے :-

بزرگاں کہے ہیں نصیحت کی بات — نہ کہنا بچن جیو کے عورت سنگات

نصرتی (صـ۱۲۴۔ گلشن عشق)

سکی توں کجا لم پن سب سٹی ہے — دلیکن اولٹ اجنوں کج لئی ہے — بحری (صـ۲۱۹ کلیات)

"و لے بعضے خوباں اپنی خوبی کیسے نیں دکھائے ہیں۔ جتنا سکے اتنا چھپائے ہیں، حسن کوں نیں چھوڑے جو پھرے بازار لے بازار، حسن کوں قید کیے ہیں ٹھار لے ٹھار" — وجہی (صـ۸۳۔ سب رس)

"ایسے دھنیاراں کوں تو چہ لوگاں مارے ہیں" — وجہی (صـ۸۔ سب رس)

"کہے ہیں" "سٹی ہے" "دکھائے ہیں" "چھپائے ہیں" اور "مارے ہیں" ماضی قریب ہے۔ اس کے ساتھ "نے" استعمال نہیں ہوا ہے۔

ماضی مطلق اور ماضی قریب کی طرح ماضی بعید کے ساتھ بھی بعض وقت "نے" استعمال نہیں ہوتا۔ جیسے

دیا تھا خدا اس کوں سب کچھ مگر — ولے سخت محتاج تھا بِن پسر

نصرتی (صـ۶۲۔ گلشن عشق)

وو ایسے وقت ستے مجلس کیتا تھا — ارم کا زیب مجلس کوں دیا تھا

ابن نشاطی (صـ۳۹۔ پھولبن)

اُوپر کی مثالوں میں "دیا تھا" اور "کیا تھا" ماضی بعید ہے۔ مگر اس کے ساتھ "نے" استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس لیے دکنی میں ماضی مطلق، ماضی قریب اور ماضی بعید میں اسم کی فاعلی حالت، "نے" علامتِ فاعل استعمال ہو تو اس علامت سے معلوم ہوتی ہے۔ اور علامتِ فاعل استعمال نہ ہو تو جملے کے مفہوم سے اسم کی حالتِ فاعلی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سید مراد علی طالع

شیر محمد خاں ایمان

ان کا اصلی نام شیر محمد خاں تھا اور ایمان تخلص۔ ان کے والد محمد عاقل خاں سرکار نظام میں وقائع نگاری کی خدمت پر مامور تھے اور اخبار گوئی کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔ ایمان کے والد نے انہیں شہر کے بڑے بڑے عالموں سے تعلیم دلوائی چنانچہ عربی اور فارسی کی تحصیل کے بعد ایمان نے اردو میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ اور شاہ تجلی مؤلف تزک آصفیہ سے اصلاح لینے لگے۔ ایمان نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ اور شعراء کی دل کھول کر ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی طبعی مناسبت سے آگے چل کر اس فن میں وہ کمال اور کامیابی حاصل کی کہ ان کے استاد شاہ تجلی بھی اس شاگرد پر فخر کرنے لگے اور وہ ملک الشعراء کہلانے کے مستحق ہوئے۔

باپ کی وفات کے بعد ایمان ان کی خدمت وقائع نگاری پر مامور ہوئے اور آخر میں تمام وقائع نگاروں کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے معقول مشاہرہ ملنے لگا۔ وہ اعظم الامراء ارسطو جاہ جیسے علم پرست اور شاعر دوست وزیر اعظم کے مصاحب خاص اور نواب میر نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کے درباری شاعر تھے۔ دکن کے سارے واقعات ان کے دماغ کے خزانہ میں محفوظ رہتے تھے۔ ایمان دربار شاہی کے علاوہ عوام میں بھی معزز و ممتاز تھے۔ عوام ان کو دل سے چاہتے تھے۔ جدھر نکل جاتے لوگ بڑی آؤ بھگت سے پیش آتے۔ خوش سیرت اور خوش کلام تھے۔ مجمع احباب میں اپنی خوش گوئی کی وجہ سے بہت ہر دلعزیز تھے۔

شمالی ہند میں جس وقت میر، سودا اور درد شعر و سخن کے استاد مانے جاتے تھے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں حیدرآباد میں ایمان اپنی شاعری کا رنگ جمائے ہوئے تھے۔ حیدرآبادی شعراء میں ان کا درجہ سب سے بلند تھا اور یہ مسلم الثبوت استاد سخن مانے جاتے تھے۔ وہ ایک پرگو شاعر تھے۔ ان کے کلام میں شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ وہ پہلے حیدرآبادی شاعر ہیں جنھوں نے شمالی ہند کی زبان میں اپنا شاعرانہ کمال منوایا۔ اسی لئے ان کے اور کسی دلی کے شاعر کے کلام میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایمان کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا۔ ان کا زیادہ وقت شاگرد نوازی میں گزرتا تھا۔ دوسری طرف وہ ریاست کے ذمہ دار عہدہ دار اور ارسطو جاہ کے مصاحب خاص بھی تھے۔ اس لحاظ سے ایمان کی شاعری کچھ زیادہ محنت اور غور و فکر کی پیداوار نہیں ہے بلکہ وہ بہت آسانی سے شعر کہتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے استاد سخن اور ایک اہم ادبی دور کی پیداوار تھے۔ اس کے علاوہ ایمان نے اپنے بعد دو تین ایسے شاگرد چھوڑے مثلاً قیس اور چندا وغیرہ جن کا نام اس زمانہ کے حیدرآبادی شعراء میں سر فہرست رہیگا۔

ایمان ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی طبع رسا نے تقریباً جملہ اصناف سخن میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ مگر ان کی رباعیاں زبان اور اسلوب کے لحاظ سے اپنے وقت کی بہترین پیداوار اور اردو کی اچھی رباعیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور یہاں وہ ایک بلند پایہ

شاعر نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک رباعی پیش ہے۔

غیروں کی سنو مزے سے ساری باتیں　　اور تلخ لگیں تمہیں ہماری باتیں!
لڑتے ہو یہ کس سے باز آجاؤ صاحب　　ہم خوب سمجھتے ہیں تمہاری باتیں

غزل گوئی میں ایمان کی استادانہ شان نظر آتی ہے۔ جس زمین میں غزل کہی اُسے معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ مثلاً

ادھر تو ایک ہاتھ میں بسمل نے غش کیا　　اُدھر لہو کو دیکھ کے قاتل نے غش کیا
کس کی شمیم زلف یہ لائی ہے اب نسیم　　مہک سونگھتے ہی عاشقِ بیدل نے غش کیا
موجوں سے بحرِ غم کے بچا پر یوں نیم جاں　　جیسے نکل کے طالبِ ساحل نے غش کیا
تعریفِ دلربا کے سراپا کی کیا کہیں　　ایمان ہم کو ایک ہی نُب تل نے غش کیا!

شعر گوئی میں سادگی اور بے ساختہ پن اور اس میں جدت و ندرت پیدا کرنا ایمان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کا انداز ہمیشہ نیچرل اور اصلیت سے بہت قریب رہتا ہے اس کے باوجود کلام میں لطافت اور روانی، بندش زبان اور مضمون آفرینی ان ہی کا حصہ تھا۔ اسلوب اور زبان کے اعتبار سے ایمان اپنے ہم عصروں میں خاص مقام رکھتے تھے۔ جیسی زبان انہوں نے استعمال کی ہے دوسروں کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب میں پوچھا غلام کب آوے　　ہاتھ میں لے کے زلف بل کھایا

آدینہ گھر بھی عجب کم نصیب ہے　　پہنچا تھا اس کے کان تلک پر اٹک گیا

غمزہ، ادا، نگاہ، تبسم، خرام سے　　میں ایک اپنی جان بچاؤں کہاں تلک

میں اگر آپ کے نزدیک بُرا ہوں صاحب　　پھر میرا کاہے کو مذکور ہو تقصیر معاف!

ان دونوں نے ایمان کیا مجھ کو ہے تاراج　　اب حسن کا شکوہ میں کروں یا گلۂ دل

شور و فغاں دگریہ و اندوہ و درد و غم　　آخر ہمارے ساتھ یہ سب مشغلے چلے

ان کا اسلوب بیان اتنا نفیس اور شگفتہ ہے کہ اس زمانے میں اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تخیل کی سادگی اور ان کی روانی کو دیکھ کر ان کی استادی کو ماننا پڑتا ہے۔ منقبت جناب امیر علیہ السلام کا ایک بند ہے۔

تجھ آستاں پہ ہر دم دن رات جُھکتے ہیں جبیں　　ایمان صدق جان سے ہے کا غلام کمتریں
تیرے سوا، آسماں کا کوئی کو زمیں یہ ماقی نہیں　　ہر ایک دم صبح و مسا یہ ورد ہے یا شاہِ دیں
صاحب ادا مولا علیؑ مشکل کشا مولا علیؑ

ایمانؔ کے قصائد میں تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ زورِ بیان کو دیکھ کر ان کی قادر الکلامی میں شک و شبہ نہیں رہتا۔ الفاظ کا انتخاب، کلام کی سلاست اور روانی، مثال کے طور پر آصفجاہ ثانی کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے وہ زیادہ توجہ کے قابل ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

گرچہ شعر و شاعری میں کچھ نہیں مجھ کو شعور! ‏‏‏ پر ادا کرتا ہوں میں حق نمک کو اب یہاں
یعنی نواب کیا نقدر و آصف جاہ عصر! ‏‏‏ عادل و اکرم نظام الملک عالی خانداں
اسقدر ہے دبدبہ اس کا کہ شاہ روم و زنگ ‏‏‏ بھیجتے ہیں واسطے تیرے ہمیشہ ارمغاں

اور سالگرہ کی تقریب میں ایمانؔ نے یہ رباعی کہی تھی غور کیجئے دعا میں کتنی جدت اور لطافت ہے۔

ہر دم ہو شہنشاہ کو مولیٰ کی مدد ‏‏‏ اور زندگی خضر و نشاطِ سرمد
یوں سالگرہ سے ہووے بخت عمر فزا ‏‏‏ جوں صفر کے دینے سے ہو دہ چند عدد

ایمانؔ تاریخ گوئی میں خاص کمال رکھتے تھے۔ آصفجاہ ثانی کی وفات پر تاریخ کہی۔ دوسرے شاعروں نے بھی طبع آزمائی کی تھی مگر ایمانؔ کی تاریخ آصفجاہ ثانی کے مقبرہ پر کندہ کرائی گئی۔ اس قطعہ کے چوتھے مصرعہ سے دو مادہ تاریخ نکلتے ہیں۔ قطعہ یہ ہے :-

بر روح پاک میر نظام علی مدام ‏‏‏ ایں مصرعۂ عجیب دو تاریخ را بخواں
خوانند باد منو ہمہ اشخاص فاتحہ ‏‏‏ متوجب بہشت و باخلاص فاتحہ

۱۲۱۸ھ ۱۲۱۸ھ

حالانکہ اس زمانہ میں حیدرآباد کی زبان دلی اور لکھنؤ کی زبان سے مختلف ہوتی جا رہی تھی مگر ایمانؔ کی زبان دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ حیدرآبادی شاعر تھے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ حضرت ایمانؔ سرزمین دکن کے ان ممتاز شعراء میں سے ہیں جن کی رنگین نوائیوں اور شعلہ بیانیوں نے دکن کے حدود سے نکل کر ست پڑا اور وندھیاچل کی بھاری فصیلوں کو توڑ کر شمالی ہند میں فرخندہ بنیاد حیدرآباد کی بزم ادب کا نام روشن کیا اور جن کا کلام وہاں کے نازک خیالوں کے لئے رشک کا باعث بنا ہوا تھا۔ علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت میں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا بھی خاص مادہ تھا جو سونے پر سہاگہ کا کام دیتا تھا۔ ان کے کلام کے بہت کم نسخے ملتے ہیں البتہ ایمانؔ کا ایک ضخیم دیوان کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے اور ایک کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ میں ہے۔ وہ مر گئے مگر ان کا کلام اب تک زندہ ہے اور ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور ان کی یہ آرزو پوری ہوئی جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

ایمانؔ اور کچھ نہیں مقدور اگر تجھے ‏‏‏ عالم میں یادگار تو اپنے سخن کو چھوڑ

(اردو نامہ صفحہ ۲ سے آگے)

۲۵ فروری۔ بیگم میر احمد خان خیر وانی ایم ایل اے کے ہمراہ جناب غلام اکبر خان (حیدرآباد سندھ پاک) اور محترمہ اہلیہ خیر وانی نے انجمن اردو کا معائنہ کیا۔

۲۶ فروری۔ ایوان اردو میں ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے سال ۱۹۶۱ء کے لئے ریسرچ اسکالروں کا انٹرویو ہوا۔ جس میں حیدرآباد کے علاوہ کرناٹک اور [illegible] منتخب کئے گئے۔

گلِ نغمہ (گیتانجلی)

رابندر ناتھ ٹیگور
عبدالعزیز خالد

مجھے معلوم ہے جبار دہمین ہے تو
اس لیے آیا طرف ہٹ کے کھڑا ہوتا ہوں
آرزومند نہیں قربت کا
کہ سمجھتا ہوں تجھے بیگانہ
ان کر باپ تجھے، تیرے قدم چھوتا ہوں
ہے ستمگرانہ پکڑتا نہیں ہاتھوں کو ترے
اترتا ہے جہاں میں نہیں ہوتا موجود
بے تکلف جو پکاروں تجھ کو
اپنے سینے سے لگا کر کہوں اے یارِ عزیز

جشنِ اندوہ و طرب میں حصہ
کس طرح قرب ترا حاصل ہو

کتنا مشکل ہے گزرنا جاں سے
کون غواص بنے کون لگائے غوطہ
زیست کے قلزمِ بے پایاں میں!

مرا لہجہ نہ ہو پُرشور و بلند
کومل آہنگ ہو الفاظ سجل
میرے آقا کی یہ خواہش ہے یا مدِ پسند
ایسے میں بات کروں گا بھی تو سرگوشی میں

بھائیوں میں تو بڑا بھائی ہے
ان پہ لیکن مجھے وشواش نہیں
نہیں دیتا انہیں کچھ اپنی کمائی میں سے
اس لیے تو بھی الگ رہتا ہے
نہیں لیتا میں کبھی لوگوں کے

ترجمانِ تپشِ دل ہوگا
نغمۂ زیرِ لبی
شاہ بازار میں انبوہِ زن و مرد میں بھی

آنکھ جاتی ہے جدھر ہے وہ
کوئی بیچے، کوئی دیکھے، کو
لیے گھیلے کوئی بانکا ٹھیلے

عین ہنگامے میں لیکن افسو
ہاٹ جوبن پہ ہے جب وقت رحلت
مجھے رخصت کا ملا پروانہ
گرچہ موسم نہ بہی، باغ بہی
پھول کھلنے رہے گلشن میں
اور زنبور سے بھی بھن کی کرو
چھوڑ کر گوشۂ پُر خواب نوا

پہر دل آویزشِ خیر و شر میں
میں رہا غمزدہ و سرگرداں
مگر اب سرخوش و خنداں فر
سے بیکار دنوں کا ساتھی

مہرباں بن کے بلاتا ہے مجھے
اور میں سوچ میں گم سم حیراں
کہ اچانک یہ بلاوا کیسا
فائدہ جس کا نہ مقصد کوئی!

محمد علوی

بستیاں

جگمگاتی مسکراتی بستیاں
ہر طرف ہیں بستیاں ہی بستیاں
بستیاں بڑھتی ہوئی صحراؤں میں
جنگلوں میں پاؤں دھرتی بستیاں

برف کے تودوں کو گرماتی ہوئی
برف زاروں میں چمکتی بستیاں
پربتوں پر سر اٹھائے خندہ زن
آسماں سے چھیڑ کرتی بستیاں!

وادیوں میں دور تک پھیلی ہوئی
دھان کی خوشبو سے مہکی بستیاں
پانیوں میں عکس چمکاتی ہوئی
ساحلوں پر پیچ کھاتی بستیاں

بستیاں دریاؤں کے لب چومتی
جوہڑوں سے پیار کرتی بستیاں!
چیڑ کے اونچے درختوں میں گھری
جھیل کے پہلو میں بیٹھی بستیاں

رات کو بھی دن بنانے کے لیے
چاند کی جانب لپکتی بستیاں
آج بھی پھرتے ہیں کچھ خانہ بدوش
آج بھی ہیں پاؤں چلتی بستیاں

چار سو راہوں کو دوڑاتی ہوئی
بستیوں کی کھوج کرتی بستیاں
اب مکاں ہیں گاؤں ہیں اور شہر ہیں
تھی کبھی پیڑوں پہ اپنی بستیاں

آدمی غاروں میں تھا دبکا ہوا
اُن دنوں کیسی کہاں کی بستیاں
ہر قدم پر موت کا ڈر ساتھ تھا
موت کے ڈر نے بسائی بستیاں!

سو ثواب اور ایک جنت کا خیال!
اک گناہ اور بستیاں ہی بستیاں!
بستی بستی علوی اپنے گیت ہیں
آشنا ہیں ہم سے ساری بستیاں

ڈاکٹر عزیز عثمانی

نیا سال

(سانیٹ)

آج کی رات نیا سال جنم لیتا ہے
سالہا سال سے یہ سلسلۂ عمرِ رواں
رات دن گرمِ سفر ہے یونہی اُفتاں خیزاں
ہچکیاں لیتے، سسکتے ہوئے دم توڑا ہے
وقت کی گود میں اک سالِ گزشتہ نے ابھی
مسکراتی ہوئی، شرماتی ہوئی، نرم کلی!
رنگ و آہنگ کی نادیدہ فضاؤں میں پلی
جھانکتی ہے اُفقِ صبح کی چلمن سے لگی

ہم بھی اس محفلِ ہستی میں چلے آئے تھے
جانے کون اپنی جگہ کر کے گیا تھا خالی
جانے کس کس کو اُڑا لے گئی کہنہ سالی
چند سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے سائے تھے
کون اس گردشِ دوراں میں ٹھہر پایا ہے
ہوتی آئی ہے کہ اک آتا ہے اک جاتا ہے

تھامس کیاریو
ترجمہ :۔ اشرف رفیع

جمالیات

کسی کے لب پہ ہے تعریفِ غنچۂ مرجاں   کسی کی جان ہیں اجلے رخ
بجھانے کو ہوسِ دل کا شعلۂ لرزاں   کوئی ستاروں کی آنکھوں میں

مگر یہ حسن بہت جلد کھونے والا ہے
ہوس کا شعلہ تو سرد ہونے والا ہے

غلط کہے نہ کسی وقت بھی لبِ معصوم   مثالِ دامنِ مریم ہو پاک
رگوں میں دل کی ہو خاموش جوشِ گرم   ضمیر پہ ہوں نمایاں شعور

اسی میں صرف کرے گا جب اپنی فکر و نظر
رہے گا دل ترا ہر وقت ایک حالت پر

سمجھ نے خاک کے پتلے کی انتہا جو گیا   بڑا فریب ہے اس حسنِ ظاہر
دکھائی دیتے ہیں جس پر دوام کے آثار   وہ اس زمانے میں جذبات

یہ سرخ لب، یہ نگاہیں، یہ آتشیں رخسار
کیا جو غور تو ٹھہرے یہ سب کے سب بے کار

٭

علی جوّاد زیدی

غزل

رات اک ہوک اٹھی دل سے جگر تک پہنچی
کہتے ہیں میری نظر اُن کی نظر تک پہنچی

زندگی میں ترے جادو بھرے جلووں کے نثار!
عقل تیری ہی تمنّا میں قمر تک پہنچی

یہ اُبھرتے ہوئے سورج کو کہاں ہے معلوم
کچھ شبِ غم کی سیاہی بھی سحر تک پہنچی

منزلِ شوق سے گو دُور رہے دیوانے
پھر بھی صحرا سے اُڑی خاک تو در تک پہنچی

اے شبِ ہجر ذرا دل کو سہارا دیدے
زلفِ شب سیکڑوں بل کھاکے کمر تک پہنچی

رہروی ہی سے پریشان ہوئی راہزنی
میری ہی خاک اڑائی تھی جو سر تک پہنچی

اپنے آنچل سے ذرا پونچھئے اپنے آنسو
کس طرف آگ لگی آنچ کدھر تک پہنچی!

اور لہرا کے جلی شمعِ غزل اے زیدی
جب فراقؔ[1] و اثرؔ و یاسؔ و جگرؔ تک پہنچی

---

[1] فراقؔ گورکھپوری، اثرؔ لکھنوی، یاسؔ عظیم آبادی، جگرؔ مرادآبادی۔

سیم اسلم

غزل

تمہاری آنکھوں کی پتلیوں میں ہزارہا انقلاب دیکھے
اسی نظر کا کرم بھی دیکھا اسی نظر کے عتاب دیکھے

نہ تار ٹوٹے ہیں حادثوں کے نہ چین آیا ہے زندگی کو
کنارِ ساحل پہ آ کے ٹوٹے جو میں نے ابھرے حباب دیکھے

ہزار پردے پڑے ہوئے ہیں غرض کے دیکھو تو دوستی پر
غرض کے بندے نہ ان سے بڑھ کر کہیں بھی میں نے جناب دیکھے

عجیب منظر ہے اس جہاں کا خوشی جو ہوگی تو غم بھی ہوگا
کہیں پہ نغموں کی گونج دیکھی کہیں شکستہ رباب دیکھے

جمالِ رُخ کی تجلیوں سے جو آج جادو جگا ہے ہیں
حیا پہ جن کی تھا فخر ہم کو وہ چہرے اب بے نقاب دیکھے

ملا یہ انعام سادگی کا کہ ہر قدم پر فریب کھائے
سمجھ لیا رہزنوں کو رہبر کوئی مرا انتخاب دیکھے

مجھے بتائے گا کیا زمانہ ادا سے اس کی میں آشنا ہوں
وفا کے بدلے جفائیں دیکھیں عطا کے بدلے عتاب دیکھے

بنا لیا زندگی کو میں نے ہی اپنے ہاتھوں عذاب اسلم
مزے محبت کے لوٹنے کو بڑے بڑے ہی عذاب دیکھے

طالب رزاقی

غزل

کاتبِ وقت کا لکھا ہوا مٹتا بھی نہیں
غم پہ ہنسنے کے سوا اب کوئی چارا بھی نہیں

غم کے اظہار کو سمجھا ہے مداوا غم کا
ہائے کمبخت کو جینے کا سلیقا بھی نہیں

تم نے یوں چھوڑ دیا ساتھ وفا میں میرا
جیسے مجھکو غمِ دنیا کا سہارا بھی نہیں

ویسے بھی مجھ کو شکایت کی نہیں ہے عادت
اور پھر تم نے مرے درد کو سمجھا بھی نہیں

دل نوازی بھی اداؤں میں ہے جانسوزی بھی
تم سا قاتل بھی نہیں تم سا مسیحا بھی نہیں

موت و ہستی کے دوراہے پہ کھڑی تھی دنیا
تم نے اچھا ہی کیا مڑ کے جو دیکھا بھی نہیں

تم نہ آؤ گے نہ آؤ۔ نہ ملو گے نہ ملو؛
کیا مری رات کی قسمت میں سویرا بھی نہیں

نقشِ پا راہِ وفا میں ہیں فروزاں اب تک
کیا مرے بعد ادھر سے کوئی گزرا بھی نہیں

پیار کرنا تو کوئی جرم نہیں ہے طالب
ویسے میں تم سے کوئی بات چھپاتا بھی نہیں

غزل

فلاست کانپوری

قفس کی قید و بند سے ذرا نکل کے دیکھئے
سماں کبھی بہار کا چمن میں چل کے دیکھئے

بغیرِ غم اگرچہ ہو نفس نفس گراں مجھے
مری نوا ہائے زندگی کبھی بدل کے دیکھئے

چمن میں حسن چار سو لٹے ہے دامِ رنگ و بو
گلوں کی ہمت دیکھئے مگر سنبھل کے دیکھئے

محبت ایک راز ہے کہ سوز میں بھی ساز ہے
یہ آگ جب بھڑک اٹھے تو اس میں جل کے دیکھئے

حرم نہیں ہے بتکدا، مگر ہے جانِ مدعا
ذرا سی خاکِ آستاں جبیں پہ مل کے دیکھئے

یہ شام، شامِ ہجر ہے تو مجھ سے دور دور ہے
جو خود بلا رہا ہوں میں تو ناز اجل کے دیکھئے

مزاجِ فکر دیکھئے کہ ہے بھی ندرت آشنا
جو ہو سکے تو زاویئے کچھ اس غزل کے دیکھئے

★

غزل

نقشاعلی قادری

دل ہے بہارِ گلشنِ ارماں لئے ہوئے
صد عشرتِ حیات کا ساماں لئے ہوئے

غنچے کو ہم نے بخشی ہے رنگینیٔ حیات
ہر پھول ہے ہمارا ہی احساں لئے ہوئے

موجِ فنا مٹا نہ دے ہستی کا ہر نشاں
ہر اشک ہے کنار میں طوفاں لئے ہوئے

لَو دے رہے ہیں نقشِ قدم دل کی خیر ہو
وہ آ رہے ہیں حشر کا ساماں لئے ہوئے

ہم بے خودی میں منزلِ جاناں تک آ گئے
اک کاروانِ شوقِ فراواں لئے ہوئے

آئی بہار ہم نشیں اٹھنے لگے قدم
دل ہے ہوائے خارِ بیاباں لئے ہوئے

رحمت پہ ناز کیسے نہ ہو قادری ہمیں
ہم ہیں متاعِ جراتِ عصیاں لئے ہوئے

★

غزل

سیدہ مجیدہ

یاس کے دامن میں جذبوں کو سُلانا ہی پڑا
درد کی تیغوں کے آگے سر جھکانا ہی پڑا
ناز تھا دِل پر ہمیں لیکن ہوائے یاس میں
دِل کو مثلِ شمعِ مفلس جھلملانا ہی پڑا
روح کو جب کر چکے وابستۂ راہِ الم
ہر نئے زخمِ جگر پر مسکرانا ہی پڑا
آتشِ درد و الم سے ہر تمنا جل گئی
پھر بھی سازِ زندگی پر گیت گانا ہی پڑا
یوں تو ہر احساس سے بڑھ کر تھا احساسِ خودی
اک مقام آیا کہ جب خود کو بھلانا ہی پڑا
زندگی کی منزلیں جب تیرگی میں کھو گئیں
ہر قدم پر آنسوؤں کو جگمگانا ہی پڑا
مسکرا کر کب تلک دیتے خراجِ زندگی!
ہر نفس کو آہ کا پیکر بنانا ہی پڑا

رباعیات

اختر رضوانی

سِکّہ ہے رواں دہر میں عیاروں کا
سر عرش پہ ہے حاشیہ برداروں کا
اربابِ صفا کیش ہیں زندہ درگور
ایمان سلامت ہے ہوس کاروں کا

*

ہر آہِ شرر بار بھی اِک نغمہ ہے
اس ساز کا ہر تار بھی اک نغمہ ہے
پازیب کی جنبش سے بہلنے والو!
تلوار کی جھنکار بھی اِک نغمہ ہے

*

اندازِ فلک رنگِ زمانہ کیا ہو؟
اربابِ سیاست کا بہانہ کیا ہو؟
اِس فکر میں خم ہے سرِ آدم اختر
اب دیکھیے آئینِ زمانہ کیا ہو!

*

مرتب: قمر ساحری

انتخاب مشاعره های بزم سعدی

عبدالحق بیتاب

من شیدا گرفتار تو باشم — «زهی قسمت که بیمار تو باشم»
بمهر و مه نبیند ازم نگاهی — همین مشتاق دیدار تو باشم
سر و کاری باین و آن ندارم — صداقت کیش سرکار تو باشم
نواسنجی کنم دائم بکویت — غزلخوان، مرغ گلزار تو باشم
بمرهم به نه نگردد زخم بیتاب — که عمری شد دل افگار تو باشم

(آمده از کابل، افغانستان)

خسرو قادری

چو پروانه پرستار تو باشم — نثار شمع رخسار تو باشم
بسودایت فروشم دین و ایمان — بجان و دل خریدار تو باشم
چه نسبت خاک را با عالم پاک — چگونه من طلبگار تو باشم
بزرگی بایدت بخشندگی کن — وفا کن تا وفادار تو باشم
دگر خسرو نگو حال دل خویش! — که من واقف ز اشعار تو باشم

ناصح رضوی

الا ای دل گرفتار تو باشم — ز جان و دل نگهدار تو باشم
دمی آسودگی هرگز نه جستم — ز بس در بند افکار تو باشم
چرا از من گریزانی شب و روز — مگر نی من وفادار تو باشم
بود در خاطرم روزی بگفتی — که من تنها فقط یار تو باشم
تو در بزم سخن ناصح کجائی — که من شمع شب تار تو باشم

(آمده از کراچی۔ پاکستان)

بانو طاهره سعید

اگر گل نیستم خار تو باشم — بهر صورت بگلزار تو باشم
دوای درد دل هرگز نخواهم — «زهی قسمت که بیمار تو باشم»
مکن، نیا بمن چشم عنایت — نمیخواهم خریدار تو باشم
نقاب از رخ بکن ای ماه کامل — چرا محروم دیدار تو باشم
خدایم لطف تو بر عاصیانست — ازین خواهم گنهگار تو باشم

ڈاکٹر طاہر مسلم

در شگفتم که چها با دلِ شیدا کردی — جامِ جم کردی و آئینهٔ دلها کردی
پای بندِ هوسِ وصلِ تو زادیم همه — "صید کردی دلِ عالم چه تماشا کردی"
در دلِ ارض و سما زلزلهٔ انداخته — آنچه خوبان همه خواهند تو تنها کردی
دل ربودی و تمنای دلی شد معدوم — سر بُریدی و چه احسان بسرِ ما کردی
ما پرستارِ قدیمیم چرا تو از ما — مسلم و برهمن و گبر و نصاریٰ کردی

ڈاکٹر گل محمد گل بلوچ

خنجرِ ابرو چو از خشم تو بالا کردی — "صید کردی دلِ عالم چه تماشا کردی"
از پسِ پردهٔ خلوت چو نمائی رخِ خویش — دلِ دیوانهٔ ما را به تماشا کردی
طلبِ شوق نهادی بدرِ میکده چون — رند را مضطرب از ساغر و صهبا کردی
تا بدم زنده به فرقت نرسیدی بسرم — بعد از مردنِ من کارِ مسیحا کردی
بنهادی بدلِ بلبلِ بی چاره غمی — خنده بیجا چو گلِ گلشنِ لالا کردی (آمده از کراچی پاکستان)

نور محمد نور

مرحبا کارِ عجب جانِ تمنا کردی — "صید کردی دلِ عالم چه تماشا کردی"
ناوکِ نازِ تو بخشیده حیاتِ جاوید — خونِ ما ریختی و کارِ مسیحا کردی
چه کنی کارِ محبت چو با تمام رسد — حرفِ اُلفت زده بودیم که رسوا کردی
خود تماشا شدهٔ در نظرِ دیده دران — زان تماشا که تو در "بزمِ کبیرا" کردی
زشتِ رویان جهان غم نه رسانند چه طور — کج ادائی چو با این صورتِ زیبا کردی

برقی موسوی

برقیا معجزهٔ حضرتِ موسیٰ کردی — داغ تا بندهٔ دل را یدِ بیضا کردی
قطره ام قطره ولی جوششِ طوفان دادی — بند در کوزهٔ دل شورشِ دریا کردی
می چکد حسرتِ دنیا ز نگاهت ای شیخ — ترکِ دنیا بخدا از پیِ دنیا کردی
صبر تلخ است و لیکن برِ شیرینا دارد — نوش خواهد رسد ار نیش گوارا کردی
فارغ از هر دو جهان نیک گزشتی ای برق — فکرِ امروز نه اندیشهٔ فردا کردی

شفیق سنجر

منتشر بر رخِ خود زلفِ چلیپا کردی — رخنه در دینِ من ای بت کلیسا کردی
عشقِ بت، ذکرِ خدا این چه تماشا کردی — در دلِ من حرم و دیر تو یکجا کردی
آن توی زادهٔ خاک است که آدم نامند — راز سربستهٔ افلاک تو افشا کردی
حیدرآباد را فردوس چو گویم حق است — که فراموش ز دل یادِ مصلیٰ کردی
ای شه حسن ز کیفِ نظرِ هوش ربا — جنت را از کرمِ خویش منزه کردی

پنڈت تلوک چند محروم[1]

ای دل حریص لذت ذوق نظر مشو * زهر یکه اندرونست ازان بی خبر مشو
تقلید شاعران دهان و کمر مکن — دانسته سوی ملک عدم ره سپهر مشو
ای بی خبر ز حال زبون هنروران — در بزم غیر غره بعرض هنر مشو
نازد بخویش قطرهٔ آبی که اشک شد — رگوید بهر یکی که چنین خو گهر مشو
محروم هوشدار که از بزم آن نگار — یک بار چون بدر شوی بار دگر مشو (آمده از دہلی)

رئیس امروہوی

واماندهٔ ازگرانی بار سفر مشو — بال طلب کشا و گرفتار پر مشو
هم کفر بندگیست که آئین بندگیست — بر سجده ها منازد به سنگ در مشو
گفتم که چیست نسخهٔ آسودهٔ خاطری؟ — گفتند دل شکستهٔ بیم خطر مشو
گفتم که چیست مصلحت پیر می فروش؟ — گفتند می بنوش ولی جام زر مشو
گفتم رئیس ارزش اهل هنر چیست؟ — گفتند خود فروش بعرض هنر مشو (آمده از کراچی پاکستان)

حسنین کاظمی شاد

تو خوشه چین خرمن ارباب زر مشو — ای دل گلی ز گلبن زیر شجر مشو
خواهی اگر بچشم بصیران شوی عزیز — "نا آزموده منکر اهل نظر مشو"
هرگز محبتی ز بت بی وفا مخواه — دنبالهٔ ستارهٔ وقت سحر مشو
هان! سر بلند باش بسان شعاع مهر — خورشید سرنگنده ای دربا ختر مشو
هرگز مخالف دل زار و حزین شاد — گفتم هزار بار بتوای قمر مشو (آمده از کراچی پاک)

پروفیسر حمید الدین شاہد

گوی چرا که مائل ذوق نظر مشو — بی بهرهٔ ز سوز جگر چاره گر مشو
در کاروبار شوق خطرهاست هوشدار — غافل مشو، غرور مکن بی خبر مشو
تو بی خبر ز عالم صاحب دلان هنوز — "نا آموزه منکر اهل نظر مشو"
محروم نکته سنج درین روزگار ما — شائی سر مداست از و دور تر مشو
در کوی دوست گر نرسم طعنهٔ مزن — شوقم به بین و منکر ذوق سفر مشو (آمده از کراچی)

حامد بن شبیر

"نا آزموده منکر اهل نظر مشو" — اهل بصر تو آمدهٔ بی بصر مشو
اندیشه کن ز نازکی خاطر حبیب — رند حریم ناز تو بیباک تر مشو
غره مشو که طاقت پرواز رزوهد — اکا بی خبر اسیر غم بال و پر مشو
دور نیست پر ز شور فغان و هنگام فتنه خیز — خواهی اگر سلامتی تو بی خبر مشو
خوبان بجلوه آمده بسیار در جهان — حامد وفا همین که علام دگر مشو

(دو نہالہا)

[1] قمر ساحری ۔ [2] پنڈت تلوک چند محروم

وزیر حسن

پچلَم

(۱)

سیدھے لوگ، سادی باتیں، یہ تھا میں۔ ایک گاؤں۔ موسیٰ ندی کے کنارے آباد۔ بھاگ متی میرے ہی پاس پلی۔ بڑھی۔ یہی ایک بات بس ہے۔ میں ہزاروں میں ایک ہوں۔ مجھے کوئی نہیں بھلا سکتا آج جہاں چارمینار ہے ـــــ ہماری ملی جلی سنسکرتی کا مینار، کل وریں میں تھا۔ یہ بھی آپ کو میری یاد دلاتا ہوگا؟

ملا وجہی کو آپ بھی جانتے ہوں گے؟ انہیں کون نہیں جانتا: دکھنی بولی تو جیسے اُن کی باندی ہے۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے یہ بھاگ متی آخر کون ہے؟ میں نے کہا مُرشد! آپ یہ تو پوچھتے ہیں وہ کون ہے؟ یہ بھی تو پوچھیے وہ کیا ہے؟ بولے تم ہی جو بتادو؟ میں نے کہا سنگیت کا رتن دیپ! انہوں نے کہا وہ تو بنگالہ دیس کی راجکماری ہے! میں نے کہا ہوگی۔ وہ میرے ہاں رہی۔ بسی۔ ہنسی۔ بولی۔ سنگیت سا سنگیت سیکھا۔ میں تو یہ جانتا ہوں۔ وہ چُپکے ہوگئے۔ اتنا میں بھی کہوں کا آنکھ ناک، ہاتھ پیر، بات چیت سے وہ راجکماری تو دکھائی دیتی تھی!

ملا جی میرے پاس آیا جایا کرتے۔ میرے ہاں ایک رشی بابا تھے۔ اُن سے شعر شاعری بھی ہوتی۔ دین دھرم کی باتیں بھی ہوتیں۔ ایک ملّا۔ ایک رشی۔ بڑی باتیں ہوا کرتیں۔ دین دھرم کی باتوں میں کبھی ایسا بھی ہوتا رہا ہے بات کے بدلے مُنہ سے کف نکلتے ہیں۔ اُن کی باتوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ رشی بابا سنگیت کے پجاری تھے۔ گنی آدمی کہا کرتے ہمارے دیس کا سنگیت دنیا میں سب سے پہلا سنگیت ہے۔ ہندوستان سے یونان گیا۔ وہاں سے دیس دیس پھیلا۔ دُنیا کو سنگیت والا بنایا!

مجھ سے ذرا ہٹ کر سامنے ہی گھنا نیم تھا۔ پھول، پھل، پاتے سے کڑوا۔ پھر بھی سب کے کام آتا۔ اس پر بیسیوں ہی چڑیاں بولتی سنائی دیتیں۔ دکھائی ایک بھی نہ دیتی۔ گرمیوں میں تو اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر راستہ چلتا آتا۔ گھڑی دو گھڑی سستاتا۔ بیڑی چلّم پیتا۔ کچھ سو بھی جاتا۔ وہاں رشی بابا کی کٹیا تھی۔ اس میں رہا کرتے تھے۔ انہوں نے یہاں میرے ہاں کے لڑکے لڑکیوں کو سنگیت سکھایا۔ ان میں بھاگ متی بھی تھی۔ کچھ دن میں ایسا ناچنے گانے لگی کہ چاند اور دھرم ہی گئی۔ گانے سے بھی اچھا ناچتی۔ جو سہیری کی ایک کو بتا ہوتا۔

اس کو دیکھنے دور دور سے لوگ کھنچے آتے۔ ایک دن ایک مہلتے اس سے الجھ گئے۔ بولے تجھے سب کے سامنے ناچتے
گاتے لاج نہیں آتی، بھاگ متی؟ اس نے کہا جی نہیں! پوچھا کیوں؟ بولی مجھے دیکھئے! میری آنکھوں لاج ہے۔
جن کی آنکھ میں پانی نہیں۔ ان میں لاج بھی نہیں!
سنگیت کا یہ دیپ دکن دیس میں جب سے روشن ہوا، مجھے تو ذرے ذرے ناچتے گاتے سندر پرچھائیاں
سی دکھائی دیتیں۔ ایسا بھی دکھائی دیتا جیسے سارا سنسار ایک سر ساگر ہے۔ راگ راگنیوں سے بھرپور۔ ٹھاٹھیں الگ ہوں
تو ہوں۔ سُر، سُرتیاں ایک ہیں۔ ان کا پالن اپنا دھرم!

(۲)

نہ کھنکا۔ نہ دبدبا۔ نہ ٹھٹھا۔ چین سے دن گزرا کرتے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں بھاگ متی چپ چپ ہے
میں نے سوچا آدمی کبھی کچھ، کبھی کچھ رہتا ہی ہے۔ وہ روز ایسی رہنے لگی۔ اس سے میں بیکل ہوا۔ ایک نہیں کئی
سب بیکل ہو گئے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اتنی ہی انوکھی باتیں۔ ایک کہتا دھوپ لگی ہو گئی۔ دوسرا کہتا چاند
بھٹکی پڑ گئی۔ یہ تو وہی بات ہوئی دنیا کچھ نہیں، دل ہی دنیا ہے۔ دل ٹھیک نہیں تو دنیا بھی ٹھکانے نہیں
دیکھتے میں نے بھاگ متی کی سکھی کو بلایا۔ جس سے اس کی دانت کاٹی روٹی تھی۔ کہا دیکھو، کاملنی! میں تیرے بال
کہ کر تجھے چاندی کے کڑے، چھڑے، جو تو کہے منوا دوں گا۔ مجھے یہ بتا بھاگ متی چپ چپ کیوں رہا کرتی ہے!
تو وہ ایسی انجان بنی جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ ڈرایا، دھمکایا تو بڑے ہیر پھیر سے بتایا کہ کوئی بسنت کو دو
وقت تھا۔ ہم سب رشی بابا کے دوارے تہوار منا رہے تھے۔ ایک ایک کا ایک ایک بناؤ۔ ایک ایک میں ایک ایک
پھول پھول بسنت، کلی کلی بہار۔ کیا وہاں بسنت بہار راگنی کی انگڑائیاں۔ ادھر ادھر رنگ چنگ کی دھا[illegible]
آپ کو بھی یاد ہوگا اس دن بھاگ متی نے ایسا نرت کیا تھا کہ دھرتی آکاش تک نرت کرتے دکھائی دیتے تھے
وہ اور میں اپنے گھیلے وہاں سے چلے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک نوجوان سپاہی گھوڑے سے اترا پیپل کی اوٹ سے
دیکھ رہا ہے۔ بھاگ متی نے اسے دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ جبھی سے چپ چپ ہے۔ میں تو
اس نے آنکھوں آنکھوں اس پر کوئی جادو کر دیا! میں نے پوچھا یہ بھی کچھ پتہ چلا کہ وہ سپاہی ہے کون؟
نہیں! میں نے کہا تو پھر بتا؟ بولی یہاں کا شہزادہ! میں نے پوچھا محمد قلی؟ اس نے کہا ہاں! میں سن
یہ ساری رام کہانی میں نے رشی بابا کو سنائی۔ پوچھا اب کیا کروں؟ انہوں نے کہا تم کیا کوئی بھ[illegible]
کر سکتا! میں نے پوچھا کیوں؟ انہوں نے کہا جیون کا یہ وہ بندھن ہے جو پہلے دن سے ہوتا آیا ہے۔ یوں
تو جہاں ہو وہاں سے ملتے نہیں۔ کہیں جانے آتے۔ کبھی سے ملتے جلتے تو کچھ جانتے۔ اب میں تمہیں [illegible]
ان کے ماموں کو تو تم جانتے ہی ہو؟ کتنا بھلا مانس ہے! میں نے پوچھا کیا ہوا؟ اس کو تمہاری کا
[illegible] ان باتوں سے تسلی نہیں ہوئی۔
[illegible] بھاگ متی شہزادہ کو چاہتی ہے! [illegible] بالوں میں پھول [illegible]
[illegible] جو بہت پہنا کرتی [illegible]

لُوبلے قد، چمکتے چہرے، سڈول جسم کھنچ جاتی تھیں۔ اب تو ایک آہ، ایک آنسو بن گئی تھی۔ کھوئی کھوئی، بھولی بھولی، اُلجھے اُلجھے بال، سادے کپڑے، پُرانی چوڑیاں! آہستہ قدم آئی جھکی نظروں ہو بیٹھی۔ باتوں باتوں میں نے شہزادہ کا ذکر چھیڑا۔ بولی سو باتوں کی ایک بات یہ ہے میں اُنہیں نہیں چھوڑ سکتی! میں نے پوچھا کیوں؟ بولی کیسے بتاؤں! میں نے پوچھا آخر؟ اُس نے کہا دیپ پر پتنگا آیا، لو پر گرا، جل مرا۔ لوگ یہی دیکھتے۔ اتنا ہی جانتے ہیں۔ لو پہ آکر گرنے، جل مرنے تک اُس پہ کیا بیت گئی، کوئی کیا جانے!

اُس کے پریم کی بات خوشبو بن گئی تھی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ پھیل رہی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس کا دیکھو نرسما کچھ لوگوں کے ساتھ آرہا ہے۔ گھمنڈ یہ جیسے ساری جنتا کو ساتھ لا رہا ہے۔ کئی دن سے کچھ یہی ہو گیا ہے۔ جس کو دیکھو نیتا بنا پھرتا ہے۔ پہلے تو کبھی نہ ہوا۔ میں نے سوچا اچھا ہی ہوا جو وہ آگیا۔ آج اُسے جھٹک دوں۔ میں نے پوچھا کیا ہے؟ بولا آپ سمجھ گئے ہوں گے ہم کیا کہنے آئے ہیں! میں نے کہا میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ بھی سمجھ گیا ہوں پرسوں تم نے شنکر راج سے میری بُرائی کی کہ تم جو کہتے ہو وہ میں نہیں کرتا۔ اپنا سوچا کر کے ناکام ہوں۔ نرسما گھبرایا۔ بولا نہیں تو! میں نے کہا انہوں نے تمہاری ایک ایک بات مجھ سے کہلا بھجوائی ہے۔ تم اُن کی نظروں سے گر گئے! میری بُرائی کرنے سے تمہارا بھلا ہوتا ہے تو مجھے کچھ کہنا نہیں۔ نہیں تو یہ ٹھیا۔ نہیں۔ بُرائی بُرائی کرنے والے کو ہی پلٹ کر ڈس لیا کرتی ہے! تم کہتے ہو میں اپنے کہے کئے ناکام ہوں۔ میں تمہارا یہ کہا مان لیتا ہوں کہ تم خوش ہو جاؤ! پھر بھی مجھ سے جو بن پڑا وہ کیا۔ تم نے بھی کیا؟ اپنے کو نہ بھولو۔ وہ کرو جو تمہیں کرنا ہے۔ تمہارا یہ کام نہیں بات بات پر دو چار کو ساتھ لو۔ اپنے دل کی بُرائی سے اُن کا جیون بساؤ۔ دل کے بدلے اُن کے سینوں میں انگارے رکھ دو۔ اُن چراغوں کو بھڑکا کر بجھا دو! میں یہ بھی سمجھ گیا تم بھاگ متی کے لئے مجھ سے کہنے آئے ہو۔ میں تم سے تمہارے لئے کہتا ہوں۔ قطب شاہیوں کو بھاگ متی اتنی نہیں چاہئے جتنے تم! تم میں کوئی کسان ہے، کوئی مزدور ہے دیس کے ہاتھ پیر۔ تم سے اُن کے پیٹ کو روٹی، تن کو کپڑا، رہنے کو گھر ہے۔ اپنی فکر کرو! یہ سُنا تو اُن لوگوں کے سر جھک گئے۔ نرسما ایسا کہاں؟ اس کو اپنی سمجھ ہی پہ گھمنڈ رہا۔ بڑ بڑ ایا گیا! وہ لوگ گئے نہ گئے کہ ملا وجہی ہنستے مسکاتے، پان چباتے آتے دکھائی دئیے — سراپا مُلا، مگر شاعر! ہنستے کو دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ پوچھا خیریت؟ بولے بھاگ متی کی کچھ پریم کہانی لکھ لایا ہوں! میں نے بھی سُنا۔ کیا کہنے! شاعروں کے شاعر ہیں۔ جو لکھیں وہ تھوڑا۔ کہانی یوں کہنی شروع کی تھی کہ جمعہ کا دن تھا۔ رمضان کی چودھویں کہ دکن دیس شہزادے سے اُجیالا ہوا۔ آکاش نے چاند سورج کے پانسے ڈالے۔ نکلا شہزادہ بھاگوان ہے۔ جہاں اُس کا ہاتھ لگا وہاں کی مٹی سونا بن جائے گی۔ خوشی کے اِس جشن میں ترلوک سے بھی مہمان آئے۔ سلطان ابراہیم لکھ تھا۔ اس نے اتنا دیا اتنا دیا کہ انہوں نے سونے کا نیا آکاش بنا ڈالا۔ دھرتی کو بھی سلطان نے اتنا کچھ دی دولت کو رکھنے اُس نے آکاش سے جگہ مانگی! اس پریم کہانی کی ادا دیکھ کر میرا دل چاہا تھا متی کی کہانیاں لکھوں۔ اور جب سے لکھوں جب پہ ماتما کا اکیلے اکیلے جی نہ لگا تو سوچا تھا خوبصورتیاں بناؤں۔ پھر کیا نہیں بنایا، پیارا سے پیارا۔ بلکہ بھی بنائے، تارے بھی بنائے، بھاگ متی بھی

شہزادہ روز آتا۔ میں تو اُسی کو دیکھا کرتا۔ وہ بھاگ متی کا ناچ دیکھتا۔ گانا سُنتا۔ میں نے سنگیت کا ایسا سمجھنے والا، سکھانے والا، سراہنے والا نہیں دیکھا۔ تھا بھی بڑا طرحدار ـــــــ تلوار کا دھنی، شہسوار۔ شعر، شراب، شرافت، شباب کا ایک سایہ، ایک اُجالا! جی چاہتا اُسے دیکھا کیجیے۔ متوسط قد، چھریرا جسم، گورا گٹھا، کالے بال، چھوٹا دہانہ، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، ہنستا چہرا، قطب شاہی محل چراغ!

(۳)

ایک دن شام کی رنگینیاں اِلّی بن کے جھکتے پھولوں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہیں ایک جا کچھ بچیاں ہاتھ میں ہاتھ ملائے چکپھیریاں لے رہی تھیں، بھکڑا سی کھیل رہی تھیں۔ گھروں سے پکا نار بندھنے کا دھواں اونچا ہورہا تھا۔ نیم پر چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے، موٹے تازے، ننگ دھڑنگ بچوں کے کھیل کود کا غل جدا تھا۔ کالے ڈھور بھی چرائی سے لوٹے۔ اُن کے گلے کی گھنٹیاں کے باجے بجے۔ کسان مزدور بھی گھر آنے لگے۔ اونچے، پلوڑسے جیسے تاڑ کے جھاڑ! انہیں شام کی رنگینیوں نے پھولوں کی آڑ سے دیکھا۔ شفق کے رنگ پھینک پھینک کر انہیں چھیڑا۔ راتو نے بھی بانسری چھیڑی۔ جی سنسنا گئے!

اتنے میں کلیانی گھبرائی گھبرائی آئی۔ بولی میں نہ کہتی تھی سلطان نہیں چاہتا شہزادہ بھاگ متی سے ملے جُلے۔ باپ کی نہ چلے گی تو کس کی چلے گی؟ آخر اُس نے شہزادہ کو قید بند کر دیا!

یہ سُنا تو شفق کا رنگ بھی فق ہوگیا۔ چڑیاں بھی سہم کر چپ تھیں۔ ہماری دُنیا بھی اندھیر ہوگئی!

بھاگ متی پر کیا بیتی؟ وہ نہ کوئی جان سکتا ہے۔ نہ بیان کر سکتا ہے!

بقیہ اُردو نامہ صفحہ ۱۴ سے آگے

۱۳ فروری کو۔ بزم غالب کا طرحی مشاعرہ جناب مجاز وکیل ایڈوکیٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔

● مقامی روزنامہ ملاپ کی طرف سے ادیبوں شاعروں اور حسن کاروں کے اعزاز میں عصرانہ ترتیب دیا گیا اس غیر رسمی ادبی میلے میں ادیبوں، شاعروں، پروفیسروں اور صحافیوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

۱۵ فروری کو۔ نواب دوست محمد خاں جاگیردار اور صفی مرحوم کے دو ارشد تلامذہ جناب خورشید شرقی اور حبیب یاس صاحبان نے ادارہ کا معائنہ کیا۔ تلامذہ صفی نے صفی مرحوم کے دیوان کی اشاعت اور ترتیب کے بارے میں معتمد ادارہ سے بات چیت کی۔

● سائنس کالج کے ہندی اسوسی ایشن کی طرف سے اردو اور ہندی کا بڑا جلا مشاعرہ ڈاکٹر رام نرنجن پانڈے کی صدارت میں منعقد ہوا۔

۱۸ فروری کو جناب بیگم جوہر فاروقی ایڈیٹر ماہنامہ پاکیزہ مدراس نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

۱۹ فروری۔ آندھرا پردیش کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ ریاستی مرازنہ اُردو زبان میں اُردو داں اراکین اسمبلی کو جاری کیا گیا۔

۲۲ فروری کو مولانا ابوالکلام آزاد کی تیسری برسی چیف منسٹر آندھرا پردیش کی صدارت میں منائی گئی۔ وزراء، اراکین اسمبلی اور دیگر قائدین نے مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

● پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد رکن ترقی اردو بورڈ کراچی جو یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب میں شرکت کے لیے آئے تھے کراچی سے روانہ ہوئے۔

۲۳ فروری کو۔ بزم اردو ایوننگ کالج کا سالانہ جلسہ جناب میر عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست کی صدارت میں منعقد ہوا۔

● نواب مانور خاں منصورنی جاگیردار (قائد ملت مرحوم) نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا اس کے میوزیم کے لیے اپنے یہاں سے تاریخی نوادرات کا وعدہ فرمایا۔ (بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

محسن شمسی

وقت کی دیمک

سات مہینے پہلے ان دونوں میں کسی معمولی سی بات پر رنجش ہوئی اور بڑھ گئی۔ وہ دونوں لڑنے اور بے جلے جذبات لیے ان کی یاد کو بھلانے وہ شہر سے دور پورے ملک کے سفر پر نکل گیا ——— آج وہ لوٹ آیا تھا۔ پرانی جگہیں اور پرانی چیزیں دیکھ کر جذبات پر پڑی ہوئی راکھ ہٹ گئی اور اس کے نیچے دبی محبت کی چنگاریاں جیسے ہی دل کو جلانے لگیں۔ سوئے ہوئے جذبات جاگ اٹھے اور جذبات کے اس تلاطم میں ڈوبا وہ نئے خط لکھنے بیٹھ گیا۔

...... میرا سلام قبول کرو

آج بہت دن بعد [illegible] گیا تو بے اختیار تم یاد آگئیں۔ وہ دن یاد آگیا جس دن میں نے تم کو اپنا بنا لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور یہ خبر تمہیں سنائی تھی۔ میں اس دن کتنا خوش تھا۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہاری دلی مسرت بھی تمہاری سنجیدگی کے جالے سے پھوٹ پھوٹ کر تمہاری آنکھوں، تمہارے لبوں، تمہارے گالوں کے گلابی رنگ بلکہ تمہارے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی۔ اب تم سوچتی ہوگی کہ شاید تم نے غلطی کی تھی کہ اس دن مجھ کو اپنے تصورات میں اپنا لیا تھا مگر سوچو تو میری محبوب یہ کتنی پیاری غلطی تھی۔ ایسی ہی پیاری غلطی جیسے کوئی بچہ گھر والوں سے چھپ کر چاندنی رات میں گاؤں کے تالاب پر کھیلنے کی کرتا ہے۔ اگر یہ قدم غلط تھا تو بھی یہ سب کتنا خوب صورت تھا۔ اس میں اسکول سے بھاگ کر تتلیاں پکڑنے کی دوال جیسی معصومیت تھی۔ سگریٹ سے اجنبیت دور کرنے والے پہلے کش کی طرح کی ادا تھی۔ اور میں تو کھلے عام یہ کہتا ہوں کہ آج جب مجھے اس دن کی خوشی یاد آتی ہے تو دل چاہتا ہے کہ کاش ساری عمر ہی ایسی پیاری معصوم اور پُر ادا غلطیاں کرتے رہیے جائیے۔ تم وہاں سامنے کی سیٹ پر بیٹھی اپنی دلکش آنکھوں سے مجھے مسرور کرتی رہو اور میں تمہیں سناتا رہوں کہ ہم ایک ہونے کی خبر لوگوں کو کس کس طرح سے دیں گے ——— یہ تصور بہت پیارا ہے نا۔ تم اسے مانتی تو ہو نا اور پھر مجھے یاد آگئی جب ہم پکچر دیکھنے گئے تھے اور پکچر کے ایک سین پر میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم ایسا ہی گھر بنائیں گے اور تم نے کہہ دیا تھا کہ تم ایسی ہی بیوی بنو گی۔ اور جب چاندنی رات میں سنسان سڑک پر تم میرے سینے سے لگی واپس جا رہی تھی تو سسکیوں کے ساتھ تم نے کہا تھا۔

"میری دنیا بہت چھوٹی سی ہے امی ہیں اور تم ہو۔ مگر تم ہو تو ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔"

یہ جذبات کتنے پیارے تھے۔ ان کا حسن میں کیا بیان کروں اور نہ ہی میں اس دل کے حسن کے بارے میں کچھ کہہ سکوں گا جہاں یہ جذبات بسے تھے۔ شاید چاند کے حسن سے ان کا موازنہ ہو سکے جو اس محبت کی عظمت پر اپنی کرنوں کا نذرانہ گزار رہا تھا اور جذبات نے ایک مجھ کو جکڑ دیا۔ مجھ کو باندھ لیا۔ میرے دل میں ایک ایسی جگہ بنائی کہ اب وہ جگہ خالی کرنے کو میرا دل نہیں ——— کیا یہ غلط ہے؟ کیا میں غلطی کر رہا ہوں؟ کیا مجھے اپنے دل سے تمہاری یاد یا دیں نکال کر پھینک دینا

چاہئیں۔؟

اور پھر مجھے وہ رات یاد آ گئی جب تم نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں اور آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مجھے پگھلا کر رکھ دیا اور جب میں نے تڑپ کر ان آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر پی لیا تو تم نے مجھ سے معافی مانگی اور میرے سارے دلائل کو اپنے غمزدہ چہرے کے جادو سے ختم کرتے ہوئے مجھے اپنی امی کے پاس بھیج دیا یہ کہہ کر جب۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے تمہاری امی سے باقاعدہ طور پر شادی کے لئے کہہ دیا تو تمہارے چہرے پر جو رنگ آیا تھا وہ کتنا پیارا تھا۔ تمہارے دیکھتے ہی جو خواب ناچنے کو دستک باہر آ گئے تھے وہ کتنے سہانے تھے۔ تمہارے کانوں میں جو آوازیں گونج اٹھی تھیں وہ کتنی سنہری تھیں۔ اس دن تم نے اپنا دل نکال کر میرے قدموں پر رکھ دیا اور میں نے اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے سینے میں چھپا لیا (اور میرا دل تو تم بڑے چپکے سے پہلے ہی چرا چکی تھی) تم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں کے سپرد کر دیا۔ اپنا بوجھ میرے کندھوں کے سپرد کر دیا۔ تم نے اپنی محبت مجھے دے دی —— تم شاید اب سوچتی ہو کہ یہ سب خواب ہی تھے مگر ایسے خوب صورت خواب سے آنکھ کھل جانے پر بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے یہ خواب یوں ہی چلتا رہے۔ یہاں تک کہ یہ زندگی خود ایک جیتا جاگتا خواب بن جائے —— میں جھوٹ تو نہیں کہتا۔ ہوتا ہے نا ایسا ہی دیکھو؟

پھر مجھے وہ باتیں یاد آتی ہیں جو ہمارے درمیان بعد میں ہوئیں۔ تم نے کتنے صبر سے میرے برے سلوک کو برداشت کیا۔ جھڑکے جانے پر بھی اپنی باہوں کو میرے گلے کا ہار بنانا چاہا۔ اس کے بعد بھی تم نے چاہا کہ ہماری شادی ہو جائے۔ اب مجھے نادانی پر افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اس دن کہہ دیا کہ "ابھی نہیں" بھلا کسی نے اپنے اوپر کھلے جنت کے دروازے سے بھی کہا ہے کہ ابھی ٹھہر نا۔ میں تھوڑی دیر سے آؤں گا —— کاش ان الفاظ کی گونج سے میرے کان ایک دفعہ پھر سرفراز ہوں۔ مجھ سے کوئی ایک بار اور یہی کہے اور میں یہ مرضی پوری کرتے ہوئے وقت کی رفتار سے بھی تیز ہو جاؤں۔

یہ یادیں بڑی تکلیف دہ ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان یادوں سے دل اداس ہو جاتا ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے مگر پھر سوچتا ہوں کہ کیوں ان تکلیف دہ یادوں کو دل کے زخم بڑھانے دوں۔ کیوں انہیں سینے سے لگا رکھوں۔ تم نے ہمیشہ بڑے ظرف کا ثبوت دیا ہے اور تمہاری محبت پر یہ یقین ہی تھا جو یوں میں نے اپنے غصے کا کھلا اظہار کر دیا۔ اور شاید یہی یقین ہے کہ کوئی میرے دل میں بیٹھا چپکے چپکے کہتا رہتا ہے۔ وہ اپنی ہے۔ میری ہے۔ ارے اسے تو کبھی بھی منا لیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو وہ مان جائے گی۔ جب بھی اس سے کہیں گے وہ سب کچھ بھول جائے گی۔ جب بھی اسے یاد کریں گے وہ دنیا داری کی خاطر اور لوگوں کا خیال کئے بغیر میری یاد کا جواب بن کر چلی آئے گی۔ اور یہ کمبخت موہوم سی امید ہے جو مجھے سمجھنے نہیں دیتی کہ سات مہینے ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے۔ معلوم نہیں ان سات مہینوں میں تم کیا سے کیا ہو گئی —— معلوم نہیں تم میں کیا کیا تبدیلیاں آ گئی ہوں۔ تمہارا دل نہ معلوم اب کیسا ہو گیا ہو۔ مجھے بے حد ڈر ہونے لگا ہے۔ میری محبوب!!

میں اب بہت تھک گیا ہوں۔ دل چاہتا ہے کسی جانی پہچانی گود میں سر رکھ کر کچھ دیر سو لوں۔ سستا لوں اور جانی پہچانی انگلیوں کا گرم لمس میرے ماتھے پر محسوس ہو۔ میں کچھ دیر کے لئے اس بڑی ساری دنیا کو بھول کر اس چھوٹی سی دنیا ہی میں کھو جاؤں۔ کسی سے پیار کر سکوں۔ میرے دل میں محبت کا جو جوش ہے اس کا کسی پر اظہار کر سکوں۔ کوئی ایسا ہو جو مجھ سے ناز کرے۔ جو مجھ سے روٹھے اور میں اسے منا لوں۔ کوئی مجھ سے جان بوجھ کر چھپنا چاہے اور میں نقلی زبردستی سے اس کو اپنے سینے سے لگا لوں۔ اس کے ہونٹوں کو چوم لوں۔ کوئی چاہتے ہوئے بھی میری بات نہ مانے۔ بار بار کہلوائے اور پھر ایک دفعہ بڑا احسان رکھ کر مان لے۔ کوئی ایسا ہو کہ اسے میں زمانہ بھر کی آنسوؤں سے بچا کر اپنے اندر چھپا لوں۔ اور چاہے مجھے کتنی تکلیف پہنچے اس کو ذرا سا بھی اثر نہ ہونے دوں —— میری محبوب! مجھے اپنے

بچے کی ماں چاہئے ـــــ بڑی غیر رومانٹک بات ہو شاید۔ مگر کیا کروں ہے یہ خواہش میرے دل میں۔

اور پھر میں سوچتا ہوں کہ تم یہاں چلی گئی ہو۔ تم کیوں اداس ہو گئی ہو؟ بگلی ناراض ہو گئی ہو۔ آؤ اور آکر دیکھو میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ تمہارا دل بہت نازک تھا۔ تمہارے رخساروں کی طرح سے بھی نازک۔ میں جانتا ہوں میری بے احتیاطی ٹھیک نہ تھی ـــــ اسے بھول جاؤ۔ بھول جاؤ اسے ـــــ میری محبوب دل سے میری یادیں نکال دو۔ اچھی باتیں یاد کرو ـــــ محبت بڑا سخت امتحان چاہتی ہے تب جاکر مکمل ہوتی ہے۔ گزرے ہوئے یہ سات مہینے بڑے امتحان کے تھے۔ اب یہ امتحان ختم ہو گیا ہے ـــــ آؤ بے اختیار ہو کر آجاؤ۔ تڑپ کر آجاؤ۔ میری آنکھیں تمہارے راستے میں بچھی تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ جب سے تم روٹھی ہو ان سے نیند بھی روٹھ گئی ہے ـــــ کل شام چار بجے KWALITY ہی میں تمہارا انتظار کروں گا۔

ہمیشہ تمہارا اپنا

....

خط ختم کرنے کے بعد اس نے ایک دفعہ پڑھ کر اسے کل کی ڈاک میں ڈالنے کے لئے میز کی دراز میں رکھ دیا۔ رات ہو گئی تھی۔ وہ سونے کے لئے اٹھا اور بستر پر جاکر لیٹ گیا۔

جذبات میں جو طوفان برپا تھا اس کا زور ایک حد تک ختم ہو چکا تھا۔ یکے بعد دیگرے دل میں خیال آنے لگے۔

یہ سب کیسے ہو گیا۔ کیا ہو گیا۔ چند لمحوں میں ساری عمارت ڈھے کر رہ گئی۔ میں نے تو اپنی زندگی کے بہترین سال اس محبت کی بھینٹ چڑھائے تھے۔ کیا اس لئے کہ ہم جدا ہو جائیں۔ اور آخر میں وہ مجھے یوں چھوڑ دے ـــــ میں نے تو اسی کی محبت میں گہرائی کی تمنا کی تھی۔ سمجھا تھا کہ وہ میری طرح اپنا سب کچھ مجھ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ میرے آگے کسی کو بھی نہ سمجھے گی۔ میں نے تو اسے سچا جانا تھا ـــــ مگر یہ سب کیوں سمجھا تھا میں نے؟ کن حقائق پر بنیاد تھی ان کی؟ کیا اس کی طبیعت میں میں نے وہ جوہر پایا تھا جسے وفاداری کہتے ہیں؟ کیا میں نے اس کا لوگوں کے ساتھ وہ سلوک دیکھا تھا جسے نبھانا کہتے ہیں؟ نہیں ایسا تو نہیں تھا ـــــ میں تو کسی کے جھوٹے فریب میں آکر اپنے جذبات کے ہاتھوں آپ ہی دھوکا کھا گیا ـــــ ہاں میں نے دھوکا کھایا۔ مگر اب ان یادوں کو کیا کروں۔ ان سے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟

دل کی یادیں بوجھ بن کر سینے پر رکھی ہیں۔ دکھ، تکلیف، ذلت اور شرمندگی کا یہ بوجھ کس طرح میرے احساس بھرے سینے سے دور ہو، سمجھ میں نہیں آتا۔ آنکھوں اور آنسوؤں نے اس غم میں میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے اور یہ یادیں چنگاریاں بن کر میری روح میں گھس گئی ہیں۔ اور اب میں جل رہا ہوں۔ کسی نے لکھا ہے "یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی سل بن جاتی ہے" ـــــ مجھے نہیں معلوم کہ یہ آگ اس کے دل میں بھی لگی ہے یا نہیں۔ وہ بھی میری طرح اس آگ میں جل رہی ہے یا نہیں۔ اگر وہ جل رہی ہے تو کیوں نہیں اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرتی۔ کیوں نہیں اس نے ایسی کوشش کی ـــــ اف یہ میں نے کیا کیا۔ یہ کس کو اپنے جذبات کے تخت پر رونق افروز کر لیا۔ یہ جگہ تو بہت اونچی تھی۔ یہ جگہ میں نے ایک بے وفا کو دے ڈالی۔ اس جیتی قیمت ہیرے کو میں نے کسی ایسی کو سونپ دیا۔ جو اس کی قدر کرنا بھی نہیں جانتی۔ یہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی اور اب میں اس آگ میں پھینکا جا رہا ہوں۔ یہ کیسی آگ ہے۔ میں کیوں جلا جا رہا ہوں؟

یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرے جذبات کیوں مجھ سے بگڑنے لگے ہیں۔ کہیں میں گر نہ جاؤں۔ کہیں میں اپنے مقام سے ہٹ کر وہاں چلا نہ جاؤں۔ جہاں میں انسانیت کے درجہ سے نیچے پہنچ جاؤں۔ میں اپنے آپ کو ذلیل نہ کر دوں ـــــ کمبخت نے مجھے دوپہر کی دھوپ کی طرح گرما دیا

اور جون کا سورج بن کر مجھے جھلسا دیا۔ اس سانپ کو میں نے سینے میں دل کا خون پلا پلا کر بڑا کیا۔ اور آخر میں اس نے مجھے ڈس ہی لیا۔ اب میں زہر اتارنے کی سوچ رہا ہوں۔" کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ اپنے ہٹیلے دماغ کی ساری کھڑکیاں بند کرلوں اور سب کچھ اپنے جذبات ہی پر چھوڑ دوں ——— مگر اس سے بھی کیا ہوگا۔ جذبات مجھے کہاں لے جائیں گے، ان کی منزل ہی کون سی اونچی منزل ہے!!

وہ خیالات جو تنہائیوں کا سہارا پاکر دماغ کے پچھلے کونوں سے سر اٹھانے لگتے ہیں۔ وہ خوشبوئیں جو کبھی کبھی موجود ہوتے ہوئے بھی معلوم ہوتی ہیں کہ اڑ رہی ہیں۔ وہ لمس جو اب بھی جسم کے روئیں روئیں کو محسوس ہوتا ہے ——— بس یہی منزل ہے ان جذبات کی جو دماغ کو ہرا دینا چاہتے ہیں اور بار بار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادھر چل کر اپنی خودداری کی قربانی دے کر اس بازی کو جیت لے۔"

"تو کیا میں ایسا کر لونگا؟ کیا میں اپنے آپ کو اس قربانی کے لئے تیار کرلوں گا؟ اگر ایسا ہو بھی جائے اور یہ بازی کا یوں ہی رہے تو وہ ذلت کتنی بڑی ہوگی۔ یہ غرور بھرا سر جھک کر بھی کچھ نہ کرسکا تو پھر کونسا ٹھکانہ رہ جائے گا پناہ کے لئے ——— کیا میں ڈرپوک ہوں کہ مقابلے سے پہلے ہی پیچھے ہٹنے کے راستے ڈھونڈھ رہا ہوں؟ نہیں ——— میرے جذبات مجھے دھوکا مت دو۔ میں بہادر ہوں اور نتیجے سے بے پروا ہو کر اقدام کرنا جانتا ہوں۔ مگر حقیقت سے ٹکرانے سے کیا حاصل۔ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے۔ ایک بے وفا کو اپنے جذبات کی دنیا کی ملکہ بنانے کی غلطی تو کرچکے ہو۔ اب جب وہ اس مقدس اور اونچی جگہ سے گر کر (دیا) پستیوں میں اپنی صحیح جگہ چلی گئی ہے تو اس کے پیچھے نیچے اترنا کیا معنی ——— نہیں میرے جذبات میرے دماغ کے قابو سے باہر مت ہو۔"

اور سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ خط وہیں دراز میں رکھا رہا۔

دوسرے دن صبح وہ اپنے کام پر چلا گیا۔ خط وہیں دراز میں رکھا رہا۔

شام کو وہ کام سے واپس آیا۔ خط وہیں دراز میں رکھا رہا۔

اور خط وہیں دراز میں رکھا رہا۔ یہاں تک کہ ایک عرصہ گزر گیا۔ اور آہستہ آہستہ اُسے دیمک نے چاٹ کر ختم کر دیا۔

فارم (۴) بیان متعلق حقوق مالکانہ سب رس حیدرآباد

۱۔ مقام اشاعت :۔ حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔

۲۔ نوعیت اشاعت :۔ ماہنامہ۔

۳۔ پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ :۔ احمد علی۔ ہندوستانی۔ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چار مینار۔ حیدرآباد۔

۴۔ پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ :۔ محمد جمال الدین۔ ہندوستانی۔ خیرت آباد (حیدرآباد)

۵۔ اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ :۔ (ڈاکٹر) ایس۔ ایم۔ قادری زورؔ۔ ہندوستانی، رفعت منزل۔ خیرت آباد۔ حیدرآباد۔

۶۔ حقوق مالکانہ۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

میں محمد جمال الدین، مہتمم ادارۂ ادبیات اردو، اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیل میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہے۔

محمد جمال الدین (دستخط پبلشر)

سب رنگ

(اس عنوان کے تحت اردو کے معیاری رسالوں سے ہر ماہ بہترین تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ "ادارہ")

دیوانِ مفتوں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مفتوں تخلص کے حسب ذیل اردو شاعروں کے نام اور حالات کا پتہ چلتا ہے:-

(۱) شیخ صفی الدین عرف غلام مصطفیٰ مفتوں۔ (تذکرہ ریاض الفصحا مصحفی)۔ (۲) کاظم علی مفتوں الہ آبادی (تذکرہ گلزار ابراہیم و گلشن ہند)۔ (۳) شیخ عبدالرحیم مفتوں لکھنوی (تذکرہ قاسم)۔ (۴) میاں علی بخش مفتوں پٹنوی (تذکرہ شورش)
(۵) میاں بدرالدین مفتوں دہلوی شاگرد میر فرزند علی موزوں (تذکرہ قاسم)۔ (۶) شاہزادہ کریم بخش مفتوں (گلستان بے خار)
(۷) پنڈت موتی رام مفتوں کشمیری شاگرد ممنون (تذکرہ سرور)
(۸) سید امیر مفتوں گجراتی (تذکرہ مخزن الشعراء)

لیکن اورنگ آباد کے اس بلند پایہ شاعر محمد شریف مفتوں کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ تعجب ہے کہ خود اورنگ آبادی شعراء کے لکھے ہوئے تذکروں میں بھی ان کا نام و تخلص درج نہیں ہے۔ اسی وجہ سے جب اُن کا ایک ناقص دیوان سالار جنگ مرحوم کے کتب خانے میں ملا تو مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اس کے بارے میں لکھا کہ ـــــ "مفتوں تخلص ایک شاعر کا تذکرہ گلشن ہند میں ہوا ہے جس کا نام کاظم علی اور وطن الہ آباد ظاہر کیا ہے' ممکن ہے اسی کا دیوان ہو یا دکن میں کوئی شاعر مفتوں تخلص کا نہیں گزرا ہے" ـــــ (وضاحتی فہرست صفحہ ۴۳۴)

کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کے قلمی نسخوں میں جب یہ دیوان میری نظر میں آیا اور میں نے اس کا تفصیلی مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک اورنگ آبادی شاعر تھے اور اسد علی خاں تمنا (متوفی ۱۲۰۴ھ) کے دوست۔ انہی کی طرح آخر عمر میں حیدرآباد آگئے تھے اور لچھمی نارائن شفیق (۱۱۵۷ - ۱۲۱۵ھ) کے ساتھ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے بڑے فرزند میر احمد خاں عالی جاہ امیر الامراء اسد الملک اسد الدولہ نصرت جنگ (۱۱۹۱ - ۱۲۱۰ھ) کے متوسلین میں شامل ہوگئے۔ عالی جاہ بڑے علم دوست اور فنون لطیفہ کے قدردان تھے۔ اُن کے ہاں نادر کتابوں اور تصویروں کا ایک بڑا خزانہ تھا۔ انہوں نے لچھمی نارائن شفیق سے خواہش کی تھی کہ تمام تصویروں کے بارے میں اشعار اور نظمیں لکھیں۔ چنانچہ ان کے دیوان خانے کی ہر تصویر کے ساتھ شفیق کا کلام بھی آویزاں کیا گیا تھا۔ چونکہ ان کی طبیعت میں غیر معمولی جودت اور امنگ تھی اور ان کا کوٹلہ (یعنی کوٹلہ عالیجاہ جو چار مینار کی مشرقی سڑک کی آخری حد پر واقع تھا اور جس کے آثار اور کھنڈر کچھ عرصہ پہلے تک موجود تھے اس کی جگہ اب ایک محلہ اسی کے نام سے مشہور ہے) بڑے بڑے شاعروں عالموں اور صاحبانِ کمال کا مرکز تھا اور جن کو اعظم الامراء ارسطو جاہ کا ان کے والد آصف جاہ ثانی پر غیر معمولی اثر و اقتدار ناپسند تھا ارسطو جاہ یہ چاہتے تھے کہ آصف جاہ ثانی کے دوسرے فرزند سکندر علی سے اپنی پوتی جہاں پرور بیگم کی شادی کریں۔ اور ان کو آصف جاہ ثانی کا جانشین بنائیں۔ چنانچہ آخر کار وہ اپنے اس منصوبے

میں کامیاب ہوگئے اور ۱۲۰۷ھ میں یہ شادی ہوگئی۔ تو عالی جاہ کو اُن کے مصاحبوں اور دوستوں اور خاص کر بدیع اللہ خاں ناظم الملک اور سلاسیہ ریڈی زمیندار میدک نے مشورہ دیا کہ نظام علی خاں کے بعد تو ان کو تخت ملنا مشکل ہے۔ مناسب یہ ہے کہ زندگی ہی میں بغاوت کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ ۱۲۰۹ھ میں انہوں نے باپ کے خلاف بغاوت کی مگر شکست پائی اور گرفتار ہوگئے۔ آخر کار ۱۲۱۰ھ میں اُن کو زہر دے کر مار دیا گیا۔ اور یہ مشہور کر دیا گیا کہ انہوں نے خود ندامت سے زہر کھا لیا۔ عالی جاہ کی بغاوت اور وفات اور اُن کے اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے اُن کا کتب خانہ، تصویر خانہ اور فنون لطیفہ کے ذخیرے پراگندہ اور ان کے متوسل شعراء معتوب اور تباہ ہوگئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مفتوں بھی جو ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر ہونے کے باوجود مشہور نہ ہو سکے اس کی ایک اہم وجہ عالی جاہ کا یہ توسل ہی تھا ورنہ سکندر جاہ اور ناصر الدولہ کے عہد میں جو تاریخیں اور تذکرے لکھے گئے ان میں ضرور ان کا ذکر رہتا اور کلام کی تعریف کی جاتی۔ تعجب ہے کہ گلزار آصفیہ میں ان کا نام تک نہیں دیا گیا۔ حالانکہ اس عہد کے اکثر شاعروں کا تذکرہ ہے۔ غرض افسوس ہے کہ مفتوں جیسا بلند پایہ اُردو شاعر اب تک گمنام ہی رہا۔

مفتوں، عالی جاہ کے خاص مداحوں اور ارسطو جاہ کے مخالفوں میں تھے۔ اور شاید اسی لئے انہوں نے ارسطو جاہ کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ جیسا کہ میں نے "داستانِ ادب حیدرآباد" میں لکھا ہے کہ بہت سے شاعر محض ارسطو جاہ کی مداحی کی وجہ سے مشہور ہوئے ——— "عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی وجہ سے ممدوحوں کی یاد محفوظ ہو جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔ ارسطو جاہ ایسے ممدوح ثابت ہوئے جن کی وجہ سے بہت سے شعراء کا نام اور کلام باقی رہ گیا۔" (ص)

حسن اتفاق سے ادارۂ ادبیاتِ اردو میں مفتوں کا مکمل دیوان محفوظ ہے اور قیاس غالب یہ ہے کہ شاید یہ انھیں کا مکتوبہ بھی ہو۔ اس میں بعض جگہ حاشیوں پر اضافہ ہے۔ اور بعض جگہ سادہ صفحات بھی درمیان میں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

عبدالجبار خاں ملکاپوری نے تذکرہ محبوب الزمن جلد دوم میں اُن کی نسبت چند سطریں لکھی ہیں اور فارسی کے ۵ شعر نقل کئے ہیں۔ اُن کو غالباً تذکرہ بہار و خزاں سے اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔ تذکرہ آج کل کمیاب ہے۔ اس کی رو سے مفتوں ۱۱۷۵ھ میں زندہ تھے۔ اور میر بلیغ کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اردو دونوں کے شاعر تھے۔ لیکن اُردو کلام ان کو نہیں ملا۔ خود اس کلیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتوں، تمنا کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے اور اورنگ آباد میں یہ لوگ اکثر ایک جگہ مل بیٹھتے تھے۔ چنانچہ ایسی ہی ایک صحبت سے متعلق ایک غزل میں مفتوں نے قطعہ بند شعر لکھے ہیں، جو یہ ہیں:۔

ہوا تھا مجمع احباب شام کو لب بام
کہ دیکھی چوک میں اک نو شباب کی صورت
سفید پوش نزاکت خرام، بحر حسن،
برنگ موج سبک پیچ و تاب کی صورت
زمیں پر آنکھ، فلک پر دماغ، منہ پہ نقاب
کہاں چلا ہے بشرم و حجاب کی صورت
مثال ماہ بہ ابر سیاہ نکلتے ہوا
کبھو تو ہم بھی بھلا دیکھیں آپ کی صورت
دیا جواب کہ ہم بے حجاب ہوئیں ابھی
اگر تو دیکھ سکے آفتاب کی صورت
سبھی کی آنکھیں بھر آئیں یہ سنتے ہی مفتوںؔ
دبی نگہ میں سوال و جواب کی صورت

مفتوں اگرچہ متعدد اورنگ آبادی شعراء اور ارباب کمال کی تقلید میں حیدرآباد کے پایہ تخت بننے کے بعد یہاں چلے آئے تھے۔ مگر یہ شہر شفیق اور تمنا کی طرح اُن کو بھی پسند نہ آیا اور وہ بھی ان کے وطن کو ہمیشہ یاد کرتے رہے۔ چنانچہ اس دیوان میں اکثر اشعار میں اس کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اس قسم کے بعض شعر یہ ہیں:۔

ہے مجھے راحتِ دل ، بُعدِ مشترقین کی راہ !
میں تجھ سے دور ہوں اور دور ہے وطن مجھ سے

مفتوں کہاں کہاں سے کہاں آ چھپے ہیں دیکھ
ہے یہ بھی مثلِ آئینہ اک آب و ناں کی بات

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پایۂ تخت باقی نہ رہنے کی وجہ سے اورنگ آباد کی صحبتوں اور لوگوں میں بڑا فرق پیدا ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں :۔

مفتوں وطن عزیز اگر ہے تو کیا کروں
صحبت کا اختلاف زمانے کا اختلاف

مفتوں کی تاریخ وفات کا علم نہ ہو سکا۔ اگر وہ عالی جاہ کی بغاوت اور وفات تک زندہ تھے تو یہ شعر غالباً اسی کے بعد لکھے گئے ہیں :۔

نہ سمجھے اب تئیں مفتوں جہان و ما فیہا
کدھر کا عزم کریں آہ ہم کہیں کے کہیں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا کیا تماشے ہوگئے
کیا کہوں میں تجھ سے مفتوں آہ دنیا کچھ نہیں

اس رباعی میں اپنے کئی ہم عصر شعراء سودا ، حشمت ، جاہ ، عشق اور تمنا کے تخلص بھی خوبی سے لے آئے ہیں۔ مفتوں نے اپنے کلام میں سرزمین دکن کا بھی کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ انہیں اپنے دکنی ہونے پر فخر ہے اور اس کا احساس ہے کہ دکن میں بھی اب اعلیٰ پایہ کے شاعر نمودار ہیں ، ان کے چند شعر یہ ہیں :۔

یہ سبزہ خط سخن میں ہیں لیسے شکر فشاں
طوطی دکن کو آئی ہے ہندوستاں سمجھ
ہوائے زلف پہ ہے گو کہ دکن کا کوچہ
یہ حلقۂ دکھن اب مار کھائیے اور بس
کوئی نور محلہ ہے چھوٹا سا دکن مفتوں
اس کوچہ سے اب کیا کیا انسان نکلتے ہیں

مرزا سودا کی غزل پر ایک مخمس لکھا ہے جس میں کہتے ہیں :۔

ہے بندگی کی راہ تو ملک دکن میں اب
صورت پرست بھی، ہیں تو معنی کے ان میں ڈھب
پتھر سے دل لگائے کوئی ورنہ کیا سبب
بت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد ہوتے ہیں ہندوستاں کے لوگ

مفتوں کے اس دیوان میں نعت و منقبت کے قصائد کے بعد آصف جاہ ثانی کی مدح میں ایک قصیدہ ہے جس میں جشن نوروز کا مبارکباد دی گئی ہے اور دوسرا قصیدہ خود نواب عالی جاہ کی شادی پر لکھا گیا تھا۔ یہ شادی میر محمد شریف شجاع الملک شجاع الدولہ بسالت جنگ فرزند نجمی آصف جاہ نظام الملک اول کی لڑکی ، صاحب جی النسا طیب بیگم سے ۱۱۸۹ھ میں بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اس قصیدے میں ۵۰ شعر اور ۳ مطلعے ہیں۔ مطلع اول ہے :۔

تو دیکھ آئینے کو اور چرخ کی ٹک کارفرمائی
کہ یہ پتھر کی دیتا ہے بتاں کے ساتھ ہمتائی

اٹھارہ شعر لکھنے کے بعد دوسرا مطلع لکھا ہے کہ :۔

نہ ٹھہرے ایک کے گھر میں جو ہو وے یار ہرجائی
کرے ہے آئینہ بے وجہ اپنی آپ رسوائی

اس شعر سے گریز نہایت عمدہ کیا ہے :۔

طلوع سیر سے صبح سعادت ہو جہاں آرار
اسد کے برج میں سعدین کی ہوتی ہے یکجائی

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کو شہنشاہ دہلی نے اسد جنگ خطاب دیا تھا۔ اور عالی جاہ کا خطاب اسد الدولہ تھا۔ اس مناسبت سے اس کے برج یا گھر میں مبارک دُلہا دلہن کی یکجائی بیان کی ہے۔ پھر جشن چراغاں ، آتش بازی اور بہار کا ذکر ہے۔ عالی جاہ کی مدح نہیں کی اور نہ کسی انعام و اکرام کی خواہش ظاہر کی بلکہ التماس یہ لکھا ہے کہ :۔

کرلی ہے طرز ترتیب سخن ہے کچھ زباں دانی
کہ تا منظور خاطر جس سے ہو تحسین ہرجائی

اور اس پر بھی ہے کیا موقوف بر تقدیر کوئی سن لے
تو دادِ شعر اب کیا پائیں گے اور آگے کیا پائی

بس اس صورت میں کیا لازم سمجھ کر اس بات کو پیارے
کسی کے سامنے کیجے گر اپنی نظم تم آرائی

خدا جیتا رکھے تجھ کو کہ اُٹھ کے تجھ سے اُلفت ہے
سناتے ہیں تجھے کوئی بات اگر اپنے بن آئی

میاں مفتوں کو کچھ درکار نہیں اک تو ہی مجھ کو بس
کہی جاتی ہے تجھ سے بات اپنے جی کی آشنائی

معلوم ہوتا ہے کہ مفتوںؔ میر تقی میر کی طرح ایک قلندر مزاج بے باک اور نازک دماغ شاعر تھے۔ غالباً ذہنی مفلس بھی ہو گئے تھے۔ دربارداری اور نام و نمود کے خواہاں نہیں تھے۔ نہ ہر جائی تحسین و آفریں کے خواہش مند تھے۔ اس قصیدے کے مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ متعدد غزلوں میں بھی انہوں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اس قسم کے چند شعر یہ ہیں :-

نسبت نہیں سخن کو میرے سیم و زر کے ساتھ
اس پارۂ خزف کو جواہر ملا تو لیے

صلہ قصیدہ کا میرے لے موافق عرض
نہ چاہیے ہے دکن نے دوآبہ و پنجاب

مفتوں یہ شوقِ شعر کا اور یہ مشقِ گفتگو
شاعری و تمیزِ فہم اور یہ ڈھنگ کیا کیا

کیا ہم کو خدا نے صاحبِ سیفِ سخن مفتوں
دوات اب طبل ہے، واقفِ علم ہے قلم محرم

دنور گریہ سے اجرائے کار ہے مفتوں
ہمارے پاس اگر سیم و زر نہ ہو تو نہ ہو

ممکن ہے کہ جاہ و مال و منال سے یہ بے پروائی افتادِ طبع کے علاوہ تصوف اور فقر کے باعث بھی ہو، اس لیے کہ ان کے بعض شعروں سے یہ سراغ ملتا ہے کہ وہ چشتی سلسلے میں کسی پیر کے مرید تھے۔ ان کا ایک شعر ہے :-

مفتوں مرا تو حال یہ کچھ ہے کہ ہے عیاں
کس منہ سے بارے قافیہ باندھوں میں چشت کا

ان کی غزلیں بہت اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ یہ دراصل غزل گو شاعر تھے۔ متعدد غزلیں قطعہ بند بھی ہیں۔ یہ جملہ ردیفوں میں اور مشکل ردیفوں میں ہیں۔ چھوٹی بحروں کی بعض غزلیں تو اردو کے ادب عالیہ میں شمار پا سکتی ہیں۔ (اقتباس اردو نامہ۔ کراچی)

(جوش ملیح آبادی)

رُباعیات

اس دُھن میں کہ ہو بخیر میرا انجام
مجھ پر ہو جائے آنچ دوزخ کی حرام
تا خیر سے، دُھل جائیں سبھی جملہ گناہ
تم کو اے پیچھو، سُناتا ہوں کلام

*

چھانی ہیں مہ و مہر کی راہیں میں نے
پہنی ہیں صنم کدوں کی باہیں میں نے
ہاں بھولوں اے مکھڑوں کے سجل کانٹوں کو
تولی ہیں جوانی کی نگاہیں میں نے

دنیا کا عجب دور نظر آتا ہے
بدلا ہوا ہر طور نظر آتا ہے
حیراں ہوں کہ جب آئینہ میں دیکھتا ہوں
بوڑھا سا کوئی اور نظر آتا ہے

*

افسانہ میری نظر میں

غلام عباس

میں افسانہ نگاری کو ادب کی سہل ترین صنف سمجھتا ہوں۔ جس کے لئے کم سے کم علمیت کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں جو شخص بھی لکھ سکتا ہے وہ ذرا سی کاوش سے ایک کامیاب افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ میں تفنن کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ذرا اس خیال کا تجزیہ کر کے دیکھئے۔

سب سے پہلے شاعری کو لیجئے کہ یہ ادب کی سب سے ممتاز صنف ہے۔ شعر کہنے کے لئے آپ کو علم عروض سے تھوڑی بہت واقفیت ہونی ضروری ہے۔ یا پھر آپ فطرتاً طبع موزوں رکھتے ہوں۔ ڈراما لکھنے کے لئے سٹیج کے فن سے آپ کا واقف ہونا ضروری ہے۔ مضمون یا مقالہ لکھنے کے لئے آپ متعلقہ موضوع کے بارے میں معلومات فراہم کرنے پر مجبور ہیں۔ یہی حال تاریخ، تنقید و سیر اور سفرنامہ لکھنے کا ہے اور آخر میں ناول کو لیجئے۔ اور باتوں کے قطع نظر آپ کو مہینوں بلکہ برسوں مسلسل لکھتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر افسانہ ایک ایسی چیز ہے کہ بس قلم اٹھایا اور لکھ ڈالا۔

آپ پوچھیں گے کہ افسانے میں کیا ہو، اس میں لکھا کیا جائے؟ اس کے جواب میں میں عرض کروں گا کہ ہر وہ بات جو آپ کے مشاہدے میں آئی ہو۔ اور آپ نے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا ہو۔ یا زندگی سے کوئی ایسا رخ جو آپ نے دیکھ لیا ہو مگر جو عام طور پر لوگوں کی نظروں سے پنہاں رہتا ہو۔ اس کو بس اسی طرح لکھ ڈالئے جس طرح آپ نے دیکھا یا محسوس کیا ہو۔ اور افسانہ مکمل ہے۔

اس خیال کی وضاحت کے لئے میں ایک واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں بچوں کے اخبار "پھول" کا اڈیٹر تھا۔ ایک دن ایک لڑکا جس کی عمر تقریباً آٹھ برس ہوگی، میرے پاس ایک کہانی لے کر آیا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ اسے "پھول" میں چھاپ دیا جائے۔ کہانی کا عنوان تھا "کھوٹا پیسہ"۔ یہ کہانی اس لڑکے کی اپنی زبانی تھی۔ اور کچھ اس طرح شروع ہوتی تھی:۔

"ایک دن میں اسکول جا رہا تھا۔ راستہ میں میں نے ایک اندھے فقیر کو دیکھا جو ایک پتھر پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے ہو رہے تھے۔ اس نے خیرات کے لئے ہاتھ پھیلا رکھا تھا:

"مجھے اس پر ترس آیا۔ مجھے امی اکنی ہر روز اسکول میں خرچ کرنے کے لئے دیا کرتی تھیں۔ وہ اکنی میرے کوٹ کے جیب میں پڑی تھی اور اس کے ساتھ ایک کھوٹا پیسہ جو بہت دنوں سے میرے جیب میں یونہی پڑا تھا۔ میں نے سوچا اکنی فقیر کو دوں گا تو خود آدھی چھٹی کے وقت بھوکا رہوں گا۔ بس اس کو کھوٹا پیسہ دے دوں جو میرے لئے بے کار ہے"۔

"یہ سوچ کر میں نے پیسہ جیب سے نکالا اور فقیر کے ہاتھ میں تھما دیا فقیر نے اپنی سوکھی میلی انگلیوں سے پیسے کو ٹٹولا۔ دعا دی اور پھر اپنی جھولی میں ڈال لیا۔

"میں اسکول پہنچا۔ اس دن ماسٹر صاحب نے ہماری کتاب میں سے ایک سبق پڑھایا جو ایمانداری پر تھا۔ ماسٹر صاحب نے سبق کے علاوہ بھی ہمیں بہت سی باتیں بتلائیں۔ انہوں نے کہا۔ نیکی ہمیشہ نیکی ہی ہوتی ہے۔ مگر سب سے اچھی نیکی وہ ہے جس میں نیکی کرنے والے کو خود تکلیف اٹھانی پڑے یا قربانی کرنی پڑے۔ اور سب سے بڑھ کر بے ایمانی وہ ہے کہ جس سے کی جائے اسے معلوم کرنے سے وہ لاچار ہو۔ یہ بے ایمانی کے ساتھ ساتھ ایک کمینہ حرکت بھی ہے۔

ماسٹر صاحب کی زبان سے "کمینہ" کا لفظ سن کر میں گم سم رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اچانک کسی نے چانٹا مار دیا ہو۔ مجھے افسوس ہوا کہ یہ حرکت میں نے کیوں کی۔ جب تک سبق جاری رہا میں اسی بات کو سوچتا رہا۔ جب آدھی چھٹی ہوئی تو میں جلدی سے اسکول سے نکلا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں خود بھوکا رہوں گا اور اکنی فقیر کو دے دوں گا۔ وہ جگہ جہاں میں نے فقیر کو دیکھا تھا۔ اسکول سے خاصی دور تھی۔ میں دوڑنے لگا تاکہ چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی واپس اسکول پہنچ سکوں۔

آخر جب ہانپتا ہوا اس جگہ پہنچا۔ تو وہ فقیر مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ اور وہ پتھر جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا، خالی پڑا تھا..........“

کہانی لکھنے کے اب تک جو اصول و قواعد متعین کئے جا چکے ہیں ان پر نظر رکھئے۔ اور پھر اس ننھی سی کہانی کو پرکھئے۔ بلاشبہ آپ اسے ہر لحاظ سے مکمل پائیں گے۔ اس میں ایک تجربہ ہے۔ ایک مشاہدہ ہے۔ ایک کش مکش ہے۔ اس کہانی کا آغاز ہے، وسط ہے، انجام ہے۔

اگر اس بچہ نے فقیر کی شکل و صورت، اس کا لباس، اس کی مخصوص عادات کے بارے میں چند فقرے اور لکھ دیئے ہوتے یا کہیں کہیں منظر کشی کر دی ہوتی تو شاید اس سے کہانی میں کچھ اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی۔ ہر چند اس سے کہانی کے نفس مضمون میں فرق نہ آتا۔ یہ محض گھما گھمی کی چیزیں ہیں۔ ہوں تو اچھی بات ہے۔ نہ ہوں تو کچھ ایسا ہرج بھی نہیں۔

اس کہانی کی سب سے اہم چیز اس لڑکے کا مشاہدہ ہے۔ جسے میں افسانہ نگاری کے لئے سب سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے یہی وہ امر ہے جسے افسانہ نویس عام طور سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ فلسفیانہ نکتے بیان کرتے ہیں۔ ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کی کش مکش دکھلاتے ہیں لیکن یہ باتیں یا تو انہوں نے کتابوں میں پڑھی ہوتی ہیں۔ یا وہ سنی سنائی ہوتی ہیں۔ ان کے اپنے مشاہدے کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے افسانے اثر سے خالی رہتے ہیں۔

اکثر اوقات نچلے یا درمیانہ طبقہ کے لوگ اونچے طبقہ کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ وہ ڈرائنگ روم، بر فوف پارٹیز، ناچ گھر، کلب، ہوٹل، ہوائی جہاز کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں امیر زادے اور امیر زادیاں، غریب کے جھونپڑے، مٹی کے دیئے، راکھ بھرے چولھے، غربت، بیماری اور محنت مشقت کی زندگی پر اپنے افسانوں میں آنسو بہاتی ہیں نتیجہ ظاہر ہے۔

اسی طرح افسانہ نویس اگر عورت ہے تو مرد کے، اور مرد ہے تو عورت کے ان رازوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو دل کی عمیق گہرائیوں میں چھپے ہوتے ہیں، اور جن کا اکثر صاحب راز کو بھی علم نہیں ہوتا۔ حسد، رقابت، احساس گناہ، ارتکاب جرم، پشیمانی یہ ایسے انسانی جذبات ہیں کہ جب تک خود اس پر وارد نہ ہوں، ان کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قاتل کی کردار نگاری کے لئے مصنف کو خود قتل کا مرتکب ہونا پڑے۔ تجربہ، مشاہدہ اور انسانوں کا مطالعہ رفتہ رفتہ افسانہ نویس میں یہ استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خود کو ہر قسم کے حالات میں فرض کر کے اپنے پر ہر قسم کی واردات گزرتی ہوئی محسوس کرنے لگے۔

جہاں تک میری اپنی افسانہ نویسی کا تعلق ہے میں خام مواد بڑی حد تک زندگی ہی سے لیتا ہوں۔ کہانی لکھنے کے لئے سب سے پہلے مجھے ایک کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کردار سچ مچ کا یعنی گوشت اور پوست کا بنا ہوا ہونا چاہئے۔ میں اسے اپنے ذہن میں تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ وہ مجھے زندگی ہی میں مل جاتا ہے۔ میرا اس پر کچھ قابو نہیں ہوتا۔ اور نہ میں اپنے نظریات اس کی زبان سے کہلواتا ہوں۔ میں تو خود چپکے چپکے اس کی باتیں سنتا، اور اس کے اعمال و افعال کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اور یوں رفتہ رفتہ میں اس کے مزاج کو کچھ کچھ پہچاننے لگتا ہوں۔ کردار سے افسانہ نگار کی اسی جان پہچان کو میں دراصل کردار نگاری سمجھتا ہوں۔

کردار نگاری کے ساتھ ساتھ ایک بہت ضروری چیز ہے جزئیات نگاری۔ ان جزئیات کو براہ راست زندگی کے مشاہدے اور تجربے کا

حاصل ہونا چاہئے۔ بعض اوقات ایک معمولی سی بات فرض کر کے لکھ دی جاتی ہے، اگر وہ تجربہ کے خلاف ہو، تو وہ افسانے کے سارے تاثر کو اسی طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح ایک غلط سُر پورے راگ کو غارت کر کے رکھ دیتا ہے۔

اگر میں کسی افسانے میں کسی مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ پیش کر سکوں تو میں اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھتا ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے پڑھنے والے بلکہ بعض اوقات نقاد بھی مجھ سے اُس کے حل کی بھی توقع کرنے لگتے ہیں اور یوں وہ ایک فنکار اور ایک مصلح کی کوششوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔

میری کوشش رہی ہے کہ میں اپنے افسانہ میں وہی باتیں لکھوں جن کا تعلق براہ راست نفس مضمون سے ہو، غیر متعلقہ باتیں محض ہیئت یا جاذبیت پیدا کرنے کے لئے لکھنے سے میں پرہیز کرتا ہوں۔ یہی باعث ہے کہ میرے افسانے عموماً ادھورے سے معلوم ہوتے ہیں اور پھر افسانوں میں جو جو باتیں یا نکتے پڑھنے والے آپ سمجھ سکتے ہیں انہیں بھی میں نہیں لکھتا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے افسانے ادھورے ہونے کے علاوہ کچھ اور کھردرے سے بھی نظر آتے ہیں۔ مگر یہ ادھورا پن ارادی ہوتا ہے۔ آخر کچھ تو قاری کو بھی دماغ پر زور ڈالنا چاہئے۔ شاعر غزل کے دو مصرعوں میں دنیا جہان کی باتیں سمو دیتا ہے۔ اور شعر کے رسیا آپ ہی سارے خانے پُر کر لیتے ہیں۔ کیا افسانے کے قاری کو اتنی بھی توفیق نہیں کہ وہ یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کرے کہ آگے کیا ہوا؟ یا کیا ہو سکتا ہے؟

ویسے میں افسانے کو یوں بھی ختم کر سکتا ہوں کہ پھر ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہو گئی۔ پھر اُن کے بچے پیدا ہوئے۔ وہ بچے بڑے ہو گئے۔ مدرسے جانے لگے۔ پھر ان کی شادیاں ہو گئیں۔ پھر ہیرو اور ہیروئن دادا دادی، نانا نانی کہلانے لگے۔ اور آخر ایک دن آیا کہ اجل نے باری باری دونوں کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور اُن کی قبریں ان کی وصیت کے مطابق پہلو بہ پہلو فلاں قبرستان میں واقع ہیں اور مٹی کا ایک پیالہ اُن کی قبر کے سرہانے نصب ہے جس سے چڑیاں پانی پیتی ہیں۔

لیکن اس طرح بچوں کی طرح سمجھانا میں سمجھتا ہوں کہ قاری کی توہین ہے۔ البتہ اگر قاری کو میرے کسی افسانے کے انجام سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ مختار ہے کہ اپنے ذہن میں جس طرح چاہے اُسے مکمل کر لے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ چکا۔

(ہم قلم۔ کراچی)

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

دوستو تم بھی اُدھر کو دیکھو
میری معراجِ نظر کو دیکھو

سر اٹھایا تھا کس انداز کے ساتھ
شعلۂ خاک بسر کو دیکھو

ہاتھ اٹھاتے ہیں دعا کو ناداں
ان گدایانِ اثر کو دیکھو

میری [illegible]
میری [illegible] کو دیکھو

ظلمتِ شب کے فسانے سن کر
نورِ شب زادِ سحر کو دیکھو!

پھر کہاں سیرِ جہانِ گذراں
جلوۂ راہ گذر کو دیکھو

ہمہ افسوں ہمہ افسانہ حفیظ
[illegible] علم و ہنر کو دیکھو

(اقتباس ہم قلم کراچی)

اردو نامہ

ایڈیٹر:۔ وقار خلیل

حیدرآباد کی ادبی و تہذیبی خبریں

(فروری ۱۹۶۱ء)

یکم فروری۔ اردو ہال میں جہانوں کے لئے دو رکٹ شام "شمیر کے جیالے" کا خیر مقدم ارتشائع ہوا۔

● مردم شماری کے سلسلے میں پروفیسر ہارون خان شیروانی صدر ادارہ مردم شماری کمیٹی نے اردو ہال میں منعقدہ ایک پریس کانفرنس کو مخاطب کیا۔

۲۔ فروری ایوانِ اردو میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے خیر مقدم میں ایک شاندار محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی۔ جس میں کئی مقامی شعراء نے شرکت کی۔ ڈاکٹر زور نے شکریہ پر تقریب اختتام کو پہنچی۔

● بزمِ اردو ایوننگ کالج کے زیر اہتمام جناب شاہد صدیقی کی صدارت میں "شبِ مخدوم" منائی گئی۔ پروفیسر عالم خوندمیری اور جناب صدر نے مخدوم کی شاعری اور شخصیت کے تعلق سے تاثرات پیش کئے۔ مخدوم کی نظم "انتظار" پر ٹیبلو پیش کیا گیا۔ اور فائن آرٹس اکیڈیمی کے فنکاروں نے غزلیں اور نظمیں سازوں پر سنائیں۔

● جناب اختر سیابی (احمد نگر) کی استدعا پر ادارہ کی طرف سے اُن کی امداد کے لئے حکومت مہاراشٹرا کو توجہ دلائی گئی۔

● کمیونسٹ پارٹی کی حیدرآباد سٹی کاؤنسل نے مردم شماری کے سلسلے میں شہریوں سے اپنی زبان اردو لکھوانے کی اپیل کی ۔۔ ۔۔ یہی اپیل جمعیت العلماء آندھرا پردیش نے بھی جاری کی تھی۔

۵۔ فروری۔ بزمِ اردو کی طرف سے منعقدہ جشنِ سلور جوبلی فیسٹول میں "اردو ادب آزادی کے بعد" کے زیرِ عنوان سمپوزیم میں پروفیسر سید محمد، عالم خوندمیری، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، رشید سلطانہ اور مغنی تبسم نے حصہ لیا۔ پروفیسر سروری سمپوزیم کے صدر تھے۔

۷۔ فروری۔ بھارتیہ کلا کیندر کی طرف سے سائنس ٹیمپل میں واجد علی شاہ کے دور اور اودھ کی تہذیب پر مشتمل ایک کتھک بیلے "نشانِ اودھ" پیش کیا گیا۔

۸۔ فروری۔ اردو، فارسی اور پنجابی کے شاعر منشی علاء علی دیوانہ ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ مرحوم گزشتہ دو سال سے علیل اور گولکنڈہ ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔

۹ فروری۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے مزاحیہ مشاعرہ زندہ دلانِ حیدرآباد جناب مرزا شکور بیگ کی صدارت میں نشر ہوا تھا اور بیرونی مزاح نگار شعراء نے شرکت کی۔

● ڈاکٹر زور معتمد ادارہ نے چادر گھاٹ کالج کے جلسہ کرسی نشینی کی صدارت کرتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے برقرار رکھنے پر زور دیا۔ جناب باقر فریدی پرنسپل اور اسٹوڈنٹس یونین کے صدر نے ڈاکٹر زور کی گلپوشی کی۔ آپ کی ادبی اور تعلیمی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

۱۱ فروری۔ جناب ابن فرید اڈیٹر ادیب علی گڑھ اور جناب انور ظہوری کراچی کو علی الترتیب حالی مطالعہ نمبر اور نیا راہی کے سلیمان ندوی نمبر" دکجلہ مجلس سبرس" ذر نمبر کے سلسلہ میں مطلوبہ استفسارات کا جواب ادارے کی طرف سے دیا گیا۔

● بزم سعدی کا طرحی مشاعرہ پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد پرنسپل اردو کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر عالم خوندمیری نے "قرۃ العین طاہرہ" پر مقالہ پڑھا۔ اور شعراء صاحبان نے فارسی طرحی کلام سنایا۔ قمر ساحری معتمد بزم نے شکریہ ادا کیا۔

● جناب نریندر لوتھر ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ آندھرا پردیش نے بزمِ اردو سائنس کالج کے سالانہ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل انتہائی تابناک اور درخشاں ہے۔

۱۲۔ فروری۔ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس رائے جانکی پرشاد صاحب کی صدارت میں بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ ڈاکٹر شریف النساء انصاری اور جناب سری نواس لاہوٹی نے علی الترتیب کلیم اور اس کی شاعری اور آزادی کے بعد اردو افسانہ کے زیرِ عنوان مقالے سنائے۔ شعراء صاحبان کے کلام کے بعد محمد منظور احمد صاحب معتمد اعزازی کے شکریہ کے بعد اجلاس برخواست ہوا۔

● دکنی زبان کے شاعر جناب سلیمان خطیب گلبرگہ اور جناب فضل الرحمن شمشاہ اینا ہ مہمانِ ایوانِ اردو سماع ئنہ کیا۔

● دبستانِ مصحفی کا سالانہ مشاعرہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ(؟) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تلامذۂ مصحفی کے علاوہ دیگر شعراء نے کلام سنایا۔

(بقیہ ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۴۳ پر)

ادارۂ ادبیات اُردو کا ترجمان

جاری شدہ ۱۹۳۸ء ——— فون نمبر (۳۵۰۲۹)

ماہنامہ

سب رس

ادارہ سن ۱۹۶۰ء نمبر

جلد نمبر (۲۴)، شمارہ نمبر (۴) — اپریل ۱۹۶۱ء

نگران:-

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلس ادارت:-

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

رائے جانکی پرشاد

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

وقار خلیل

زرسالانہ ہند و پاک سے: چھ روپے

ششماہی " ": تین روپے

" سالانہ بیرون ہند سے: دس روپے

قیمت فی پرچہ: (۵۰) نئے پیسے

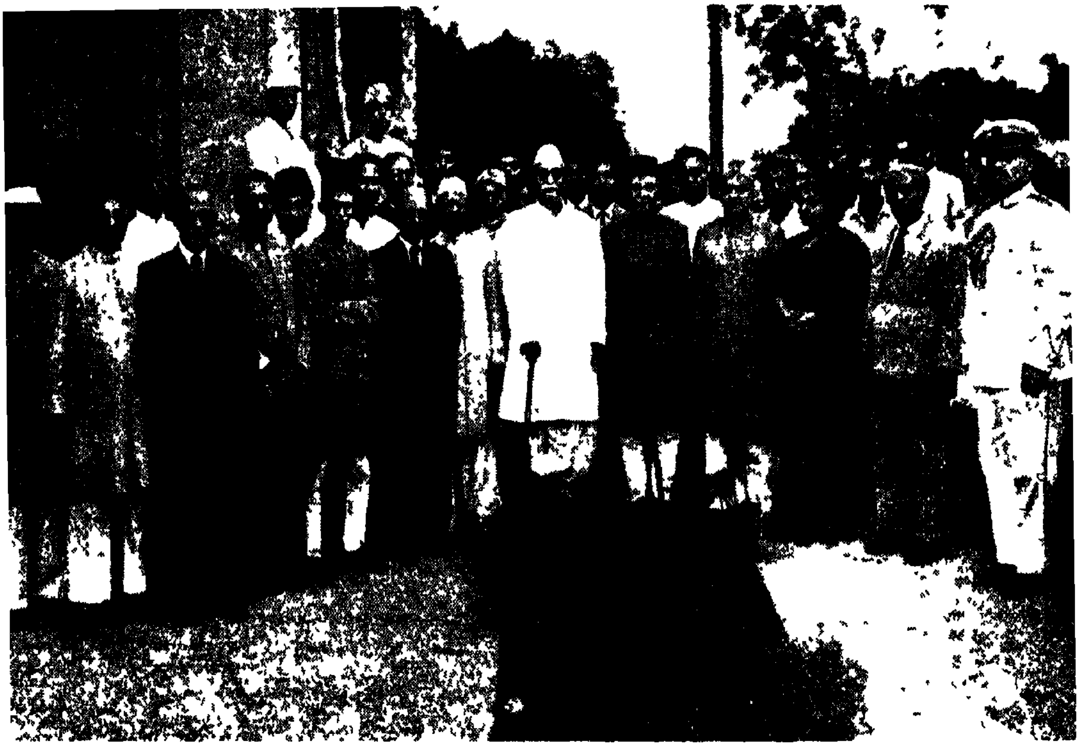
مہتمم ادارۂ ادبیات اُردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر "ایوان اردو" خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

ادارۂ ادبیات اردو سے متعلق دوسرے معلوماتی کتابچے

۱۔ سرگزشت ادارہ (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء)
۲۔ ادارہ ۱۹۴۱ء
۳۔ ۱۹۴۲ء
۴۔ ۱۹۴۳ء
۵۔ ۱۹۴۴ء
۶۔ ۱۹۴۵ء و ۱۹۴۶ء
۷۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء
۸۔ ادارۂ ادبیات اردو کے گذشتہ ۲۳ سال [illegible]
۹۔ [illegible] زبان انگریزی میں
۱۰۔ ادارہ [illegible] کے قواعد اور ضروریات
۱۱۔ [illegible] مطبوعات
۱۲۔ [illegible] اردو امتحانات
۱۳۔ موجودہ [illegible] طلباء
۱۴۔ تبصرہ ۱۹۴۳ء کی مصروفیات ادارہ پر از معتمد عمومی۔
۱۵۔ روداد امتحانات بابتہ ۱۹۴۰ء از معتمد امتحانات اردو
۱۶۔ ۱۹۴۱ء
۱۷۔ ۱۹۴۲ء
۱۸۔ ۱۹۴۴ء
۱۹۔ ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۴۴ء میں
۲۰۔ ۱۹۵۰ء
۲۱۔ [illegible]
۲۲۔ [illegible]
۲۳۔ [illegible]
۲۴۔ ادارہ [illegible] مطبوعات اور اردو تراجم (انگریزی میں)
۲۵۔ افتتاح ایوان اردو [illegible] انگریزی [illegible]
۲۶۔ [illegible] ایوان اردو
۲۷۔ ادارۂ ادبیات اردو [illegible] (انگریزی میں)
۲۸۔ [illegible] ادارۂ ادبیات اردو

ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر، ایوان اردو، خیریت آباد، حیدرآباد دکن

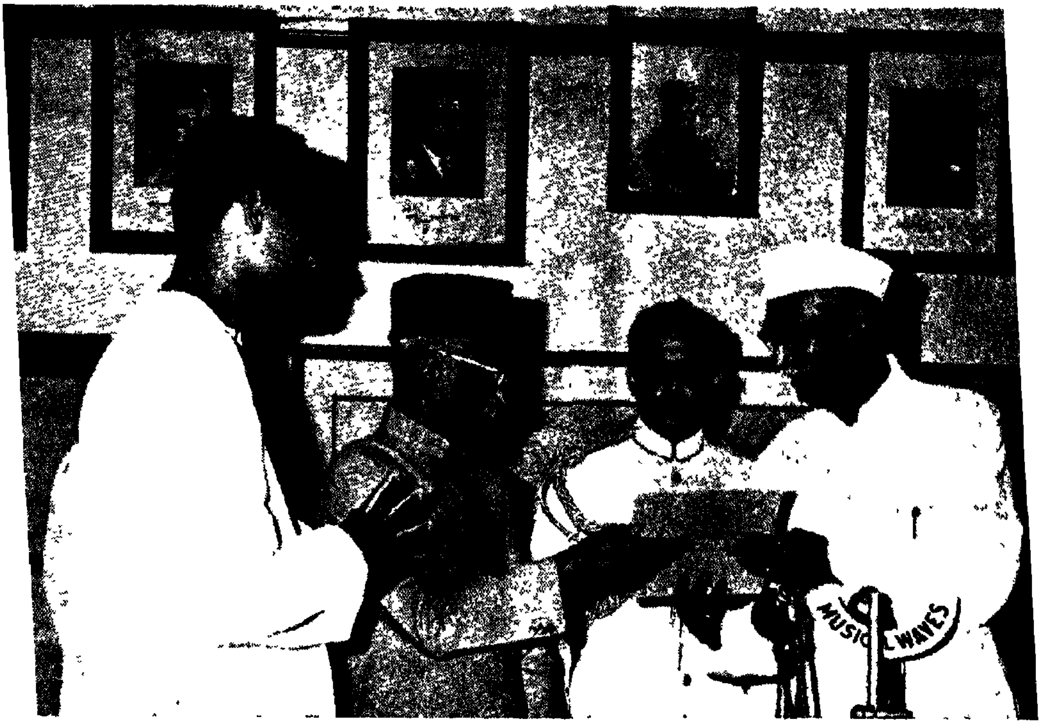
فہرست



راشٹر پتی ڈاکٹر راجندر پرشاد ایوان اردو میں
غیاث الدین نظامی، روڈا مستری، ڈاکٹر زور، نواب زین یار جنگ بہادر، راشٹر پتی، پروفیسر سروری،
دلدار حسین انجنیر، نصیر الدین ہاشمی، ایل۔ این۔ گپتا، پروفیسر سید علی اکبر،
رائے جانکی پرشاد، ڈاکٹر رام نرنجن پانڈے



جناب بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم جموں و کشمیر،
ارکان مجلس انتظامی افتتاح ایوان اردو کے ساتھ



شری نارائن کرن ریڈی نے ادارہ کو زمین عطیہ دی ، راشٹرپتی عطیۂ زمین کا دستاویز بعد ملاحظہ
صدر ادارہ نواب رین یار جنگ بہادر کو دے رہے ہیں ۔



ڈاکٹر زور ، ایوان اردو کے تعمیر کی رپورٹ سنا ر



جناب بخشی غلام محمد ایوان اردو کی
قفل کشائی کی رسم انجام دے رہے ہیں

تاثرات

[دوران سال ۱۹۶۰ء میں ادارۂ ادبیات اردو کے بارے میں جن اصحاب نے اپنے تاثرات تقریر یا تحریر میں ظاہر کئے یا شائع فرمائے ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔]

ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی (وزیر حکومت ہند)

مجھے خوشی ہے کہ میں نے ادارے کی عمارت دیکھی۔ بیرونی شکل سے زیادہ مجھے اندر کا حصہ پسند آیا جو بہت خوبصورت ہے۔ یہ صحیح معنوں میں مشرقی (اسلامی) وضع کا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کو ہونا چاہئے تھا۔

آپ کے تحقیقی کام کو اب ایک ٹھکانہ مل گیا اور یہ اب بغیر خلل کے جاری رہنا چاہئے

(ترجمہ مکتوب ۲ جون ۱۹۶۰ء)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی)

اردو کا کارواں نئے ہندوستان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ادب کا چونکہ زندگی سے گہرا تعلق ہے اس کے میلانات اور رجحانات بھی نئے سماجی اور تاریخی تقاضوں سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اردو زبان صدیوں سے مشترک ہندوستانی تہذیب کی ترجمان رہی ہے اور نئے ہندوستان میں اسے یہ خدمت نسبتاً وسیع پیمانے پر انجام دینا ہے۔ اس سلسلے میں جو کام ہونے چاہئیں ان کے نقوش آہستہ آہستہ واضح ہوتے گئے ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی ذمہ داریاں آزادی کے بعد کئی گنا بڑھ گئی ہیں۔ چند ماہ پہلے اس کی نئی عمارت ایوان اردو کا افتتاح جموں و کشمیر کے وزیر اعظم عالی جناب بخشی غلام محمد صاحب فرما چکے ہیں۔ یہ ادارہ جہاں اردو کے قدیم ادب کو منظر عام پر لانے میں معروف ہے وہاں اردو کا رشتہ ہندی، تلگو، مرہٹی وغیرہ زبانوں سے بنانا چاہتا ہے۔

۸ جولائی کو اس ادارے کا معائنہ کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند عزت مآب جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب نے فرمایا کہ وہ صدق دل سے اردو کی ترقی کے آرزو مند ہیں کیونکہ ایک زبان کی ترقی سے دوسری زبانیں بھی مالا مال ہوتی ہیں۔ اس ادارے میں اردو کی نایاب و نادر قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب ہوتی ہے اس کا پانچواں حصہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کا اصل کارنامہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کا ہے۔ عرصہ ہوا یہ کام مالی دشواریوں کے باعث رک گیا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ

اسے اسی طرح سندھی سے شروع کیا جا رہا ہے۔ مختلف مضامین کی جانچ کے لئے کمیٹیاں بنا دی گئی ہیں اور پہلی جلد جو سائنسی موضوعات پر ہوگی اکتوبر تک مرتب ہو جائے گی۔ فیصلہ یہ ہے کہ اسے ٹائپ کے حروف میں یا تصویری شائع کیا جائے۔
(اقتباس سہ ماہی "ادبی جائزہ" آل انڈیا ریڈیو دہلی)

سید سجاد ظہیر۔ (نئی دہلی)

حیدرآباد کے علمی اداروں میں ادارہ ادبیات اردو کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دکنی اردو ادب کی تحقیق، تفتیش اور اشاعت کا کام بحسن و خوبی انجام دیا ہے اور دیتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی کوششوں کے نتیجہ کے طور پر جہاں اس ادارہ میں اور بہت سے اعلیٰ پیمانوں کے علمی کام ہوئے ہیں وہاں یہ بھی ہوا ہے کہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی تصنیفات، عہد قطب شاہ کے حالات اور قطب شاہی دور کی تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کو مختلف طریقوں سے ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ (اقتباس "عوامی دور" ہفتہ وار نئی دہلی۔ بابتہ مارچ ۱۹۶۰ء)

پروفیسر نجیب اشرف ندوی (بمبئی)

جنوبی ہندوستان میں بھی اردو کی ترقی سے متعلق علمی کام ہو رہا ہے۔ حیدرآباد میں ۱۹۳۱ء سے ادارہ ادبیات اردو قائم ہے۔ اس کے کتب خانے میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ہزاروں مخطوطات موجود ہیں۔ یہاں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی قائم ہے اور اس نے اپنے تیس سالہ عہد میں تقریباً دو سو پچاس چھوٹی بڑی کتابیں شائع کی ہیں۔ اس وقت تک اس ادارہ اور کتب خانے کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی لیکن گذشتہ اپریل میں اس کی عمارت بھی مکمل ہوگئی ہے۔ امید ہے کہ اب ادارہ میں تحقیقات کی جو سہولتیں ہیں ان کی موجودگی میں وہاں کام کی رفتار اور تیز ہو جائے گی۔
(اقتباس شذرہ سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی بابتہ اپریل ۱۹۶۱ء)

حضرت ایم۔ اسلم (لاہور)

میری طرف سے آپ اور آپ کے رفقائے کار صد ہزار مبارکباد قبول فرمائیں۔ الحمد للہ آپ کے خواب کی تعبیر پوری ہوگئی۔ سرزمین بھارت سے اگر کبھی اردو کے متعلق ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا آتا ہے تو دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ بھارت میں اردو کا مستقبل آپ کی ذات گرامی کا ہمیشہ ممنون منت رہے گا۔ یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ اردو کے لئے آپ کا دم دم مسیحا سے کم نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ارادوں میں برکت دے۔
۹ ستمبر ۱۹۶۰ء

اختر رضوانی (جالندھر)

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات کے لحاظ سے برصغیر ہند و پاک میں سب سے عظیم اور شاندار ادارہ ہے

ادارے کے بانی اور روحِ رواں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے مسلسل اور انتھک کوششوں سے یہاں سرزمینِ حیدرآباد کے مشاہیر علما اور شعرا کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں کو یکجا کرکے علم و فن سے تئیں گہرے ذوق و فن کا ثبوت دیا ہے وہاں ملک کے دوسرے حصوں کے نامور ادیبوں کی زندگی اور ان کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان نوبہاروں میں مختلف ادوار کے مورخین اور مصنفین بھی شامل ہیں جہاں متقدمین کے شاہکاروں کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے وہاں متاخرین کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی۔ ادارہ میں کم و بیش [illegible] قلمی کتب [illegible] ہوگا۔

ان میں علمی اور عکسی سرمایہ جات اور مختلف ادوار کی سرکردہ ہستیوں کی آرا اور ان کے مخطوطات اپنی نظیر آپ ہیں۔ قطب شاہی دور کے نامور شعرا [illegible] محمد قلی قطب شاہ اور اس کے خاندان کے دوسرے تاجداروں کی زندگی اور ادبی کارناموں پر ادارے نے اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے زیرِ اہتمام سب رس کے نام سے ایک علمی اور ادبی ماہنامہ سالہا سال سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اپنی وفات سے قبل [illegible] ڈاکٹر زور صاحب کی خواہش [illegible] سرگرمیوں سے ایوانِ اردو کے نام سے ایک شاندار عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اردو دوستی کا یہ ایک نمایاں ثبوت ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جہاں زور صاحب نے [illegible] کا خواب دیکھا تھا وہاں ان کی فاضل اور روشن دماغ اہلیہ نے بھی ان کا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ آج جس سرزمین پر ایوانِ اردو کی عمارت دکھائی دے رہی ہے وہ اراضی بیگم زور صاحبہ کی ملکیت ہے اور اسے عطیہ کے طور پر انہوں نے ادارہ کے سپرد کر دیا ہے۔

(روزنامہ "سندیش" جموں ۱۱ اگست ۱۹۶۰ء)

ڈاکٹر عبادت بریلوی (پنجاب یونیورسٹی لاہور)

آپ نے کیسے کیسے اہم اور عظیم کام اپنے ذمے لے رکھے ہیں اور یہ سب کے سب کیسی خوش اسلوبی سے چل رہے ہیں۔ دیکھ کر حیران ہوں۔ ایسی لگن میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ اردو زبان اور ادب پر واقعی آپ کا بڑا احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے اور آپ مدت دراز تک اردو کی خدمت کرتے رہیں۔ آمین

۱۲ فروری ۱۹۶۰ء

مولانا تمکین کاظمی صاحب (اردو اکیڈمی حیدرآباد)

اردو کے تعلق سے زور اردو کی نشر و اشاعت کے لئے سب سے پہلے انجمن ترقی اردو قائم ہوئی جس کی ۵۵ سالہ کاوش سال کا عرصہ ہوا۔ انجمن ترقی اردو کے قیام کو [illegible]۔ چالیس سال کے بعد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ادارہ ادبیات اردو قائم کیا۔ اب یہ جشن منعقد ہو رہا ہے کہ انجمن ترقی اردو نے کیا کیا اور ادارہ ادبیات اردو نے کیا کیا بلکہ ہم صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو نے جو داغ بیل ڈالی تھی اس پر ادارہ ادبیات اردو نے عمارت کھڑی کر دی۔ انجمن نے جس پودے کو لگایا تھا ادارے نے اسے سرسبز و شاداب کیا اور انجمن ہی کے لائحہ عمل پر گامزن ہو کر اردو کی خدمت کی۔

تقسیمِ ہند کے بعد انجمن ترقی اردو بھی گویا تقسیم ہو گئی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق پاکستان منتقل ہو گئے اور یہاں کی انجمن قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم کی نگرانی میں آگئی۔

انجمن ترقی [illegible] کی ابتدا ویسے کہیں سے ہوئی ہو وہ پروان چڑھی دکن میں اور ڈاکٹر عبدالحق نے اسے حیدرآباد ہی میں ترقی دی اور اورنگ آباد ہی میں اس کی نشو و نما ہوئی [illegible] کے لحاظ سے مولوی صاحب کو اس کو مجبوراً دہلی منتقل کرنا پڑا جہاں سے

قاضی صاحب نے اسے علیگڈھ پہنچایا اور سرور صاحب نے اس کے قالب بے جان میں جان ڈال دی۔

یوں تو شروع ہی سے ڈاکٹر زور ادارۂ ادبیات اردو کو بڑی عمدگی سے آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہے تھے مگر دکن کے پی منتقل ہونے کے بعد انھوں نے دکن کی مرکزیت کو فنا ہونے نہیں دیا اور ادارۂ ادبیات اردو کو صحیح معنی میں مرکز بنا دیا۔ تقسیم ہند، پولس ایکشن اور تقسیم حیدرآباد نے اردو زبان پہ ایسی کاری ضرب پہنچائی تھی کہ اردو سنبھل نہیں سکتی تھی۔ تقسیم کے بعد سے افراتفری رہی، پولس ایکشن کے بعد سے ہندی اور مرہٹی کا دور دورہ شروع ہوا اور مرہٹہ بھائیوں نے سخت انتقام اردو سے لیا۔ ابھی مرہٹہ انتقام ختم نہیں ہوا تھا کہ ریاست حیدرآباد تقسیم ہو گئی اور تلنگانہ والوں نے اپنی چالاکی شروع کر دی مگر خدا کا فضل یہ ہوا کہ تلنگانہ کو اردو سے بغض، نفرت یا عناد نہ تھا، اس لئے تلنگانہ والوں نے تلنگی کو ملکی زبان بنانے کی تحریک ضرور کی مگر اردو کی بیخ کنی اور اردو دانوں کا قتل عام انھوں نے نہیں کیا۔ پھر آندھرا ریاست بنی تو آندھرا والوں نے وہ رواداری دکھائی اور اس فراخدلی سے اردو کا خیر مقدم کیا جو خوش ہو گیا۔ اس طرح قدرت نے بھی اردو کے لئے وسائل پیدا کر دیئے اور اس کی بقا کی صورتیں نکال دیں۔ مگر گذشتہ پینتیس سال سے ڈاکٹر زور نے جو خدمات اردو کی کی ہیں وہ بھلائی نہیں جا سکتیں۔

پچیس چھبیس سال کے عرصے میں ڈھائی سو سے زیادہ کتابیں ڈاکٹر زور نے شائع کیں۔ پندرہ بیس ہزار کتابیں ادارے میں موجود ہیں، چھ سات ہزار قلمی نایاب کتابوں کو محفوظ کیا اور ان کی پانچ تفصیلی فہرستیں بھی شائع کر دیں اور سب پر طرہ یہ کہ ایک نہایت ہی نفیس ہال اور کتب خانہ "ایوان اردو" بنا ڈالا جو اپنی نظیر آپ ہے۔

اب برصغیر ہند و پاکستان میں تین ادارے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ پاکستان میں انجمن ترقی اردو پاکستان ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی قیادت میں، ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ہند پروفیسر آل احمد سرور کی رہبری میں اور حیدرآباد میں ادارۂ ادبیات اردو ڈاکٹر زور کی سیادت میں۔ ان تینوں کا نعرہ ایک، لائحہ عمل ایک اور نظریہ ایک ہی ہے۔ میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ پروردگار عالم ان تینوں اداروں کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے ان کے اغراض و مقاصد پورے ہوں اور ان تینوں اداروں کی مساعی جمیلہ سے اردو اپنا کھویا ہوا موقف حاصل کرے۔ آمین (اقتباس "قومی زبان" پاکستان ۱۶ مئی ۱۹۶۰ء)

ایوان اردو

عجیب ہے امتزاج حسن تعمیر — ہر اک تہذیب کی ہے اس میں تفسیر
قطب شاہی کی عکاسی کہیں ہے — کہیں مغلوں کا اس میں فن تعمیر
کہیں ترکی عمارت کی جھلک ہے — کہیں ایران کے خوابوں کی تعبیر
کہیں ہندی تمدن کا نمونہ — کہیں عربی ثقافت کی ہے تشہیر
کہیں اسپین و غرناطہ کا نقشہ — کہیں اجنتہ ایلورہ کی تصویر
کہیں ہے اپنی طرز عمارت — کھٹکتے ہیں کہیں ارکان کے تیر
ہے باب الداخلہ جوں طاق کسریٰ — تو دروازہ ہے مثل قلعہ آدم گیر
کہیں ابھرا ہوا ہے ناگ کا پھن — کہیں ہے شیو کی دیوی کتبوں گیر
کہیں کتبات ہیں ایسے ہے جن پر — شفیعا، ثلث اور طغرا کی تحریر
نمائش بھی کتب خانہ بھی اس میں — جہاں پر ہو سکے تحریر و تقریر
محقق کے لئے نایاب نسخے — مصور کے لئے "ایوان تصویر"

مصنف کے لئے قلمی کتابیں — مولف کے لئے مطبوعہ تحریر
نقل کرنے کو مخطوطات کی اک — بنا ہے کمرۂ تاریک تصویر
وہ زرین آلکرین، دلدکار اور فنائن — جو ہیں تعمیر کے فن میں جہانگیر
انہی کے نقشوں پر ایوان بنا ہے — ہے گویا یہ عمارت شش جہت گیر
نرالا سب سے ہے ایوان اردو — انوکھی سب سے اس کی طرز تعمیر
ہیں اس ایوان کے بانی ڈاکٹر زور — خدا دے ان کو عز و جاہ و توقیر
پھلے گی یوں ہی پھولے گی ثقافت — بنے گی اردو یوں ہی آسماں گیر
اسی ایوان سے پھیلے گی اردو — اسی ایوان سے ہوگی جہاں گیر
ولی اور میر نے دیکھے تھے جو خواب — یہی ایواں ہے ان خوابوں کی تعبیر
قیامت تک رہے "ایوان اردو" — قیامت تک رہے "اردو" جہانگیر

تمکین کاظمی (غیر مطبوعہ)

مولوی محمد امیر مرحوم (بی۔اے۔ بی ٹی۔ پرنسپل گلبرگہ ہائی اسکول)

دکن کی تاریخ میں بیسویں صدی کا نصف اول جن کارناموں سے روشن ہے ان میں جامعہ عثمانیہ کا قیام سب سے زیادہ اہم ہے جس کی قسمت میں انگریزی (بحیثیت ذریعہ تعلیم) کے تابوت میں پہلی کیل جڑنے کی سعادت لکھی تھی جس یقین اور بے باکی سے یہ قدم اٹھایا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پھر اس تجربہ کی کامیابی نے ساری دنیا کے ماہران تعلیم کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اُردو جیسی ادبی زبان میں سائنس اور دیگر علوم کی تعلیم قیام جامعہ سے دو تین سال کے اندر کس طرح ممکن ہو سکے گی۔

دوسرا کارنامہ ادارۂ ادبیات اُردو کی مساعی سے حاصل ہونے والا وہ گنج گراں مایہ ہے جس کا پالینا اس قدر جلد ہرگز ممکن نہ تھا اگر بانی ادارہ اور اُن کے رفقائے کار تبلیغی جوش کے ساتھ ادبی کھدائی [illegible] نہ لیتے تو اس عظیم الشان کام کا [illegible] کم مائیگی بے سامانی [illegible] پا جانا بھی معجزہ سے کم نہیں۔

حصولِ آزادی کے ساتھ ملک بھی دو حصوں میں بٹ گیا۔ دلوں [illegible] سے جذبات میں ابال آئے اور اپنے سامنے جو چیز آئی اُسے بہا لے گئے۔ اُردو پر سے بھی یہ طوفان گذر گیا۔ مگر وہ بساطِ زندگی پر جمی رہی۔ البتہ کچھ مدت کے لیے بے زور سی رہی اور قریب تھا کہ پٹ جاتی اگر اسے ادارۂ ادبیات اُردو کا زور وقت پر نہ پہنچ جاتا۔ اُردو کی پسپائی اس وجہ سے زیادہ خطرناک ہو گئی تھی کہ مرکز اورنگ آباد ہی برخاست ہو چکا تھا اور شمال سے بھی سارے بزرگ اپنے پس ماندگان کو چھوڑ کر رخصت ہو چکے تھے۔

یہ ہے وہ عقبی منظر جس میں ایوان اُردو کی بنیاد رکھی گئی اور اسے پروان چڑھایا گیا۔ ایوان اُردو کسی دوشیزۂ حرم کا تاج اولین معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس کے مینار پر نظر ڈالیے اس کی رعنائی اور بانکپن کو دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ اس میں کس چابکدستی کے ساتھ پیوند کاری کی گئی ہے۔ آرٹسٹ کی تلاش کی داد دیجیے کہ اس نے نکھار، کہاں سے رنگ و نور کو سمیٹ کر سنگ و خشت کے [illegible] میں سمو دیے۔ ظاہر میں آنکھ تو اسے سنگ و خشت کا مجموعہ ہی کہے گی۔ اس اعتبار سے یہ ایک مادی حقیقت ضرور ہے مگر اس حقیقت کو [illegible] کتنے [illegible] فریب کی توفیق نصیب نہ ہو وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ [illegible] ذوق و فطرت کی یادگار بھی نہیں۔ وہ اگر کچھ ہے تو آزاد قوم کا جوشِ نمو ہے۔ اُبھرنے کی ایک اُمنگ ہے جو [illegible] میں سر اٹھا کر [illegible] پرواز ہے۔ یہاں ہم سب ایمان لانے پر مجبور ہیں۔

ایسی ہی معنوی دلفریبی ایوان اُردو کے بام و در میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا نشان منزل ہے جہاں ماضی و حال ہاتھ میں ہاتھ ملائے کھڑے ہیں گویا مختلف تہذیبوں نے وقت کے خلاف اتحاد کر کے جینے کا بہانہ ڈھونڈ لیا ہے۔ نہ معلوم کتنی سلطنتوں کے [illegible] کر دیے گئے، کتنے دفینے کھود دیے گئے اور کتنے بجھے ہوئے چراغ جلائے گئے، تب کہیں اس [illegible] نصیب ہو سکے۔

دورِ عظمت و بزرگی کے راستے پر اسی دن سے چل پڑے تھے جب کہ انہوں نے ادارۂ ادبیات اُردو کی نیو ڈالی تھی۔ گو یہ وہ بالکل نہتے اپنے چند ہمنواؤں کے ساتھ اس میدان میں اتر پڑے تھے [illegible] راستوں سے گذرے اور جس پامردی سے انہوں نے مایوسیوں کا مقابلہ کیا وہ حیرت انگیز ہے۔ اب تو یہ ادارہ [illegible] پامردگی اور قسمت رسائی کے لحاظ سے ضرب المثل بن گیا ہے۔

اگر یہ ادارہ ہماری توقع کے مطابق اُردو انسائیکلوپیڈیا کی جلد [illegible] اور سائنسی ادب اور علمی اصطلاحات سے اُردو کو گراں بہا بنا دے تو اس کا یہ کارنامہ ملک عنبر کی نہر جاریہ اور محمد قلی قطب شاہ کے چار مینار سے زیادہ درخشاں ہو گا۔

ماہنامہ پاکیزہ (مدراس)

"جنوبی ہند میں اس وقت کوئی ادارہ اُردو کے تحفظ و بقا کی خاطر اس دور میں کام کر رہا ہے تو صرف "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد ہے۔ اُردو ادب کو زندۂ جاوید بنانے کے لیئے اِس دور میں یہ ادارہ بے مثال شاندار کارنامے انجام دے رہا ہے۔ اگر اس قسم کے چند اور مثالی ادارے ہندوستان میں خاص کر جنوبی ہند یعنی بنگلور، میسور، اور مدراس میں قایم کئے جائیں تو وہ دن دور نہیں کہ اُردو کی مخالفت کرنے والوں کے دانت کھٹے پڑ جائیں۔"

(مسز جوہر فاروقی ۔ اقتباس اداریہ ۔ ماہِ اگست ۱۹۶۰ء)

ماہنامہ آجکل (دہلی)

"کشمیر کے وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد صاحب نے حیدرآباد میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی نئی عمارت (ایوانِ اُردو) کا افتتاح فرمایا۔ یہ ادارہ گزشتہ تیس ۳۰ برس سے اُردو کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ بخشی صاحب نے ادارہ کو پانچ ہزار نادر مسودات' اور پچیس ہزار قیمتی کتابوں کی فراہمی پر مبارکباد دی۔ آپ نے فرمایا کہ اُردو سارے ہندوستان کی زبان ہے اور اُردو کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ ثقافت کی نشانی ہے اور دونوں نے صدیوں مل کر اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ اُردو ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کی جاچکی ہے اس لیئے ہم سب کو اسے سیکھنا چاہیئے جب ہم ایک غیر ملکی زبان انگریزی کو برقرار رکھ سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قومی زبان کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔"

(ملاحظات "آجکل" مئی ۱۹۶۰ء)

روزنامہ "رہنمائے دکن" (حیدرآباد دکن)

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی نشاۃِ ثانیہ ۔۔ ایوانِ اُردو کی تعمیر و افتتاح کو ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی نشاۃِ ثانیہ سے تعبیر کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ آج سے کم و بیش (۳۱) سال پہلے کی بات ہے جب حیدرآباد کے چند مخلصین اُردو نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی بنا ڈالی جس کی ہمت افزائی اس وقت کی حکومت نے دل کھول کے کی۔ یہ ادارہ اپنے ارتقائی منازل بڑی تیزی اور سرگرمی سے طے کر رہا تھا کہ گردشِ فلک نے ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ وہ اُردو جو حیدرآباد کے در و دیوار پر چھائی ہوئی تھی چشم زدن میں بے خانماں ہو کر رہ گئی اور نقطۂ عروج سے ایک دم نقطۂ انحطاط کو پہنچ گئی۔ حکومت کی تبدیلی نے اُردو کو ایوانِ حکومت سے نکال باہر کیا جامعہ عثمانیہ سے اُردو کو چھین لیا گیا اور دارالترجمہ کا وجود ہی ختم کر دیا گیا اور سالہا سال کے سرمایۂ اُردو کو آگ لگا دی گئی۔ وہ لوگ جو آج اُردو کے گُن گا رہے ہیں اور اُردو کے محاذِ ترقی پر اپنی آواز بلند کر رہے ہیں زمانہ کا رنگ دیکھ کر اس وقت یہ کہہ رہے تھے کہ حیدرآباد میں اُردو کا کوئی مقام نہیں ہے۔ زبردستی اسے یہاں کے عوام پر مسلّط کیا گیا۔ ایسے وقت میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو جو حکومت اور اپنے قدردانوں کی سرپرستی میں آگے بڑھ رہا تھا ایک خشک دریا کے کنارے ٹھٹھرے ہوئے درخت کی طرح ہو کے رہ گیا۔ یہ حالات بہت ہی کٹھن اور حوصلہ فرسا تھے۔ کارکنانِ ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے ہمت نہیں ہاری اور ان نامساعد حالات اور ناموافق زمانے میں بھی اس ادارہ کو زندہ رکھا، اور افتاں و خیزاں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ بدلی ہوئی فضا چھٹتی گئی۔ لسانی عناد و تنفر گھٹتا گیا، حالات زمانہ سازگار

ہوتے گئے اور جو لوگ اس ادارہ کو شک و بدگمانی سے دیکھتے گئے اس کی حقیقت سے روشناس ہوتے اور اس کی کما حقہٗ قدر و منزلت ترکی کرتے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا یہی ان کا بڑا کرم تھا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ادارۂ ادبیات اُردو کو انقلابِ زمانہ کے منجدھار سے باہر نکالا اور اسکی بقا، و ترقی کی راہیں تلاش کیں اور بالآخر آج اس کو اس منزل پر پہونچا دیا جو اس کے حفظ و بقا کا منتہا ہے۔ اس تیس سال کے طویل زمانہ میں اگر دس بارہ سال اس ادارہ کی کشمکشِ حیات کے نذر نہ ہوتے اور وہ بدستور ترقی کرتا جاتا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اُردو کی بہت ٹھوس خدمت انجام دیتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دوران میں تاریخ، فلسفہ، ادب، شاعری، سوانح، تنقید سائنس وغیرہ، مختلف علوم کی چھوٹی بڑی ڈھائی سو کتابیں شایع کیں، لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین ہوتا اگر اسکی تکمیل کی جاتی۔ ایوانِ اُردو کی تعمیر کے ساتھ اس کی رفتارِ ترقی پھر تیز ہو رہی ہے جسے دیکھتے ہوئے یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ ادارہ بہت جلد اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تدوین کی طرف رجوع ہوگا کہ اس کی تکمیل اسکا ایک جاوِدانی کارنامہ ہوگا۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو اپنی نوعیت و خصوصیات میں منفرد ہے۔ اس کے کتاب خانے میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ جس سے اہلِ علم و تحقیق پوری طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیس ہزار سے زیادہ مختلف نوعیت کے قدیم و نادر دستاویز اور علماء و مشاہیر کے قابلِ دید و معلومات انگیز قلمی خطوط جو خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ادارہ کا قابلِ فخر سرمایہ ہے۔ ایوانِ اُردو کی تعمیر نے اس ادارہ کے علمی و تحقیقاتی کام میں بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔ یہاں علماء و محققین اُردو کے قیام کی سہولتیں بھی بہم پہونچائی گئی ہیں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی بقا و ترقی کا سارا دارومدار اُردو کی اشاعت و ترقی پر موقوف ہے۔ حیدرآباد میں خود اُردو کی اشاعت و تعلیم کا کام بہت زیادہ توجہ طلب بن گیا ہے۔ آندھرا کا جو عنصر حیدرآباد کی آبادی کا جزوِ اعظم بن گیا ہے اس کو اُردو زبان سے بہرہ ور کرنے کا اہتمام ضروری ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے اُردو داں عوام کے استفادہ و تحقیقِ علمی کے لیئے اپنے وجود اور اپنی خدمت سے ایک بڑا میدان فراہم کر دیا ہے۔

(اقتباس اداریہ۔ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء)

روزنامہ "صداقت" (حیدرآباد)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا نام اُردو زبان کی خدمت کی وجہ سے نہ صرف سابق ریاست حیدرآباد اور موجودہ آندھرا پردیش میں کافی شہرت رکھتا ہے بلکہ ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت اور خدمات سے اندرون ملک و بیرون ملک بھی بہت سارے لوگ واقف ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں زبانِ اُردو کو پناہ دینے اور اسے ایک نئی زندگی بخشنے میں سرزمینِ دکن کا بڑا حصہ رہا ہے تو اس سے کچھ کم صداقت اس قول میں نہیں ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے زبانِ اُردو کے لیئے جو کچھ کیا ہے وہ ایک ایسا قیمتی کام ہے جس پر دکن بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو جو گوناگوں طریقوں سے اُردو ادب و شاعری کی خدمات اور مخطوطات اور متقدمین کے قلمی نسخوں کی حفاظت وغیرہ کا کام انجام دیتا آرہا تھا اسکے پیشِ نظر شدید ضرورت محسوس کی گئی کہ اس ادارے کے پاس کوئی ایک عمارت موجود ہو۔ ڈاکٹر زورؔ اور ان کے رفقائے کار کی مسلسل کوششوں نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ "ایوانِ اُردو" جیسی عمارت تعمیر کر سکیں جو ادارۂ مذکور کی [illegible]

(اقتباس تبصرہ۔ [illegible])

(بقیہ [illegible] پر)

مصروفیاتِ ادارہ

(علمی و ادبی و کلچرل)

۱۹۶۰ء

ادارے کی ڈائری سے :

جنوری ۱۹۶۰ء

جمعہ یکم ۔۔۔ تاریخ و آثار گولکنڈہ کے ہفتہ واری کورس کے تحت زیر ٹریننگ مرد خواتین امیدواروں کو عمارات ایوانات و [illegible] شاہی [illegible] ادارہ کی طرف سے معائنہ کرایا گیا۔ ڈاکٹر زور، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، پروفیسر ایم۔ اے [illegible] اور سراج الدین [illegible] صاحب اس موقع پر موجود تھے۔

اتوار ۳ر ۔ مجلس انتظامی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس [illegible] نواب زین یار جنگ بہادر کی زیر صدارت ادارہ میں منعقد ہوا [illegible] جنوری کو منائے جانے والے محمد قلی کے پروگرام کو قطعیت دی گئی۔

● [illegible] درگاہ کے کالج میں تاریخ و آثار قطب شاہی کے [illegible] درس میں شریک امیدواروں کا تحریری امتحان لیا گیا۔

منگل ۵ر ۔۔۔ تاریخ و آثار قطب شاہی کے رسمی درس میں شریک افراد کا تجربہ اور یوم محمد [illegible] میں شائع ہوا۔

چہارشنبہ ۶ر ۔۔۔ ۱۱ بجے جناب محمد احمد محی الدین انصاری لکچرار آرٹس کالج (راجمندری) نے ادارے کے شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادارے کے مطبوعات کی خریدی اور دیگر ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔

جمعہ ۸ر ۔۔۔ ساڑھے نو بجے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے محمد قلی قطب شاہ سے متعلق جناب نذیر محمد خاں کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ نشر کیا۔

ہفتہ ۹ر ۔۔۔ "یوم محمد قلی" [illegible] کے موقع پر ادارے کی طرف سے نئی کتاب "[illegible] معانی [illegible]" شائع ہوئی۔

● اردو کے ممتاز شاعر جناب جگن ناتھ آزاد (انفارمیشن آفیسر ۔ پریس انفارمیشن بیورو ۔ دہلی) تقریبات یوم محمد قلی قطب شاہ میں شرکت کے لیے سرکاری طور پر تشریف لائے۔

اتوار ۱۰ر ۔۔۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد [illegible] پر جناب مرزا ظفر افسر [illegible] نشر کی۔

● ۱۲ بجے۔ گنبدان قطب شاہی واقع گولکنڈہ پر یوم محمد قلی قطب شاہ [illegible] شری سنجیوا ریڈی چیف منسٹر آندھرا منتخب صدر کل ہند کانگریس نے اجلاس کی صدارت کی۔ شری [illegible] اسپیکر آندھرا پردیش دستور [illegible] نے قطب شاہی دور سے تعلق [illegible] کتابوں، تصاویر، اور پینٹنگ نمائش کا افتتاح کیا۔ ڈاکٹر زور خیر مقدمی تقریر کی۔ میر بلدیہ شری [illegible] شری پی ہنمنت راؤ (ایم۔ پی) اور جناب حیدر حسن مرزا دہلوی نے محمد قلی کو منظوم عقیدت پیش کیا۔ فاتحہ خوانی اور چادر چڑھانے کے بعد آتش بازی کا [illegible] قطب شاہی سے متعلق نیوز ریل بھی رکھ [illegible]

● رات کے ۹ بجے آل انڈیا ریڈیو سے خبروں میں یوم محمد قلی قطب شاہ [illegible] تفصیلات سنائی گئیں اور اردو [illegible] صاحب [illegible]



یوم محمد قلی قطب شاہ کی پریس کانفرنس

نواب زین یار جنگ کی دائیں طرف ۔ صمصام شیرازی ایڈیٹر شیراز ، نواب عنایت جنگ ، سراج الدین علی خاں ، سرینواس لاہوٹی ، اعجاز قریشی (بھارت نیوز) منظور احمد (مجلس) ، اکبر الدین صدیقی ، مظہر کامل اور ملک محمد علی خاں ، اور بائیں طرف ڈاکٹر زور (پریس کانفرنس سے مخاطب) خواجہ محمد احمد ، وید پرکاش دوساح میر بلد ، عابد علی خاں (سیاست) ، نارائن کرن ریڈی ، نجم اصدی ، کنول پرشاد (محکمہ اطلاعات) نظر آرہے ہیں ۔



یوم محمد قلی قطب شاہ سنہ ۱۹۶۰ء شری سنجیوا ریڈی کی صدارتی تقریر



یوم محمد قلی قطب شاہ ۔ جگن ناتھ آزاد کلام سنا رہے ہیں





حیات اور شاعری پر معلومات نشر کی گئیں۔

پیر۔ ۱۱ ر ——— ۱/۲ ۵ بجے کرشنا دیورائے لائبریری سلطان بازار میں یوم محمد قلی قطب شاہ کا تلگو اجلاس ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی مرکزی وزیر برائے آمدنی و تعمیری مصارف کی صدارت میں منعقد ہوا لوگوں نے ممتاز شاعر اس بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

● ۱/۲ ۸ بجے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے تقاریب یوم محمد قلی قطب شاہ کی ریڈیائی رپورٹ نشر کی۔

منگل۔ ۱۲ ر ——— "تذکرہ مخطوطات" جلد پنجم مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب ادارے سے شایع ہوا۔

● روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں یوم محمد قلی قطب شاہ پر اداریہ شایع ہوا۔

چہارشنبہ۔ ۱۳ ر ——— ادارہ میں ایک خیر مقدمی محفل شعر و سخن مسٹر جگن ناتھ آزاد اور جناب امرت رائے (صاحبزادہ انجہانی منشی پریم چند) کی آمد کے موقعہ پر منعقد ہوئی۔ جناب جگن ناتھ آزاد نے ایک مقالہ بعنوان "اقبال کی شاعری میں قومی تاثرات" سنایا۔ جناب حیرت بدایونی نے محفل شعر و سخن کی صدارت کی۔ ڈاکٹر زور معتمد عمومی ادارہ نے ہر دو معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ممتاز مقامی شعراء نے اپنے کلام سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اور بہت پروفیسروں اور کئی قابل قدر اصحاب نے اس تقریب میں شرکت کی۔

● سب رس بابت ماہ جنوری (محمد قلی قطب شاہ نمبر) شایع ہوا۔

جمعرات۔ ۱۴ ر ——— ۱۱ بجے بچوں کے

مشہور ادیب و شاعر پروفیسر محمد شفیع الدین نیّر (جامعہ ملیہ۔ دہلی) ادارہ تشریف لائے ادارہ کے تمام شعبہ جات کا معائنہ کیا ادارہ کے شعبۂ اطفال کی مطبوعہ کتب کا مطالعہ فرما کر آپ نے اچھے اثرات ظاہر کیے۔ اس موقع پر سینیولی ہوٹی امرت رائے، سراج الدین علی خاں معتمد مال اور قاری خلیل صاحبان بھی موجود تھے امیر عارفی صاحب اور احمد اللہ خاں صاحب ادارے میں تشریف لائے۔

جمعہ۔ ۱۵ ر ——— جناب سید محمد قادری معتمد درگاہ خواجہ بندہ نواز گلبرگہ نے ادارے کا معائنہ کیا اور ماہنامہ شہباز کی اجرائی کے سلسلہ میں ڈاکٹر زور کا پیغام حاصل کیا۔

● ۳ بجے بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر سے ادارے کا ایک وفد ایروڈرام پر ملا جس میں دلدار حسین صاحب ڈاکٹر زور صاحب، اکبر الدین صدیقی صاحب اور سراج الدین علی خاں صاحب شامل تھے افتتان حمایت ادارہ کے پروگرام کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔

ہفتہ۔ ۱۶ ر ——— پاکستان کے نوجوان شاعر مخیت یرآبادی نے ادارہ کے کتب خانہ اور نو تعمیر شدہ عمارت ایوان اردو کا معائنہ کیا اور ڈاکٹر زور سے مختلف امور پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کی ستائش کی۔

اتوار۔ ۱۷ ر ——— صابر ملتانی (ایم۔ اے) ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو جالندھر اور صاحب صابر کوسگوی

دبنگلور نے ادارہ کا معائنہ کیا اور مختلف علمی مسائل پر معتمد عمومی ادارہ سے تبادلۂ خیال ہوا۔

منگل۔ ۲۰ ر ——— روزنامہ خلافت بمبئی میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی رپورٹ مرتبہ ملک محمد علی خاں صاحب جرنلسٹ شایع ہوئی۔

جمعرات۔ ۲۲ ر ——— حیدرآباد کی ادبی انجمنوں کے تعاون سے ادارے نے آندھرا پردیش اسمبلی کے اسپیکر شری کالیشور راؤ کا اشٹی سالا جشن منایا۔ جس میں معتمد ادارہ نے افتتاحی تقریر کی۔

پیر۔ ۲۵ ر ——— کل ہند ادارۂ ادبیات اردو نصیر آباد ضلع لاڑکانہ (سندھ، پاکستان) کی طرف سے آدونی کے جلسے میں دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد منائی گئی۔ جلسۂ عام میں جناب رانا بھگوانداس گپتا صدر مجلس ادارہ اور دیگر اہل دوستوں نے اس بادشاہ ... پر تقریریں کیں۔ مشاعرہ میں منعقدہ مشاعرے میں محمد قلی کا کلام سنایا گیا اور مقامی شاعروں نے نظمیں اور غزلیں پیش کیں۔

منگل۔ ۲۶ ر ——— ادارہ کی نو تعمیر شدہ عمارت ایوان اردو پر صبح ۱/۲ ۶ بجے قومی پرچم لہرایا گیا اور اسٹاف میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔

● ادارہ کی طرف سے قائم کئے گئے اردو ثقافتی گروپ، ڈیل کلاس اور کاروان ساہو کے ڈراما تریم بیچ کمپنی کے بعد قومی ترانہ اور نظم خوانی و شاعری کے پروگرام ہوئے اور

بچوں میں شیرینی تقسیم کی گئی۔

ہفتہ - ۳۰ ر ـــ "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی رپورٹ مرتبہ ملک محمد علی خاں صاحب جرنلسٹ مندرجہ ذیل اخبارات و رسائل میں شایع ہوئی۔

(۱) ہفتہ وار پیام مشرق (دہلی) ۲۸ر جنوری
(۲) " پاکیزہ (مدراس) ۲۶ ر "
(۳) " فنکار (بمبئی) ۲۹ ر "
(۴) ماہنامہ ممکاس (") فبروری

اتوار - ۳۱ ر ـــ اُردو پڑھائی گھر اوپل گوڑہ کے طلبہ و طالبات نے مولانا آزاد کا یوم وفات منایا۔ ملک محمد علی خاں صاحب نے مولانا آزاد کی زندگی سے متعلق تقریر کی۔

فبروری سنہ ۱۹۶۰ء

بدھ - یکم ـــ آندھرا پردیش کے اسپیکر الیتو ردرا صاحب کو پدما بھوشن کا خطاب ملنے پر یوتھ ویلفیر آرگنائزیشن کے ساتھ ایک تہنیتی تقریب میں ادارہ کی طرف سے بھی نمائندگی ہوئی۔ پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند دہلی نے اپنے ایک سرکلر کے ذریعہ سارے ملک کے اُردو اخبارات کو "یوم محمد قلی قطب شاہ" کے موقع پر ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے موسومی مضامین لکھوا کر بغرض اشاعت جاری کئے۔

جمعہ - ۵ ر ـــ ہفتہ وار "ہماری زبان" علیگڑھ میں ادارے کی کلچرل سرگرمیوں کی تفصیلات شایع ہوئیں۔

اتوار - ۷ ر ـــ پانچ بجے ادارے کی مجلس انتظامی کا اجلاس نواب زین یار جنگ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نئے سال کا موازنہ منظور کیا گیا اور کتابوں کی اشاعت کے بارے میں فیصلے کئے گئے۔

● ۱۱ بجے مجلس اشاعت ادبیات قطب شاہی کا اجلاس مولانا سید علی اصغر بلگرامی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور قطب شاہی تاریخ حدیقۃ السلاطین کی اشاعت کے پروگرام کو منظور کیا گیا۔

جمعہ - ۱۲ ر ـــ ادارے کے امتحانات اُردو دانی و زبان دانی کے نتایج برائے اشاعت پریس کے حوالے کئے گئے۔

جمعہ - ۱۹ ر ـــ "سب رس" ماہ فبروری شایع ہوا۔

منگل - ۲۳ ر ـــ پروفیسر رام شرما لکچرار ہندی سیف آباد سائنس کالج نے پروفیسر اکبرالدین صدیقی کی ہمراہی میں ادارہ کا معائنہ کیا۔

جمعرات - ۲۵ ر ـــ جناب وزیر حسن دہلوی کا ڈرامہ "راہی" ادارے کی طرف سے شایع ہوئی۔

جمعہ - ۲۶ ر ـــ ۴ بجے ڈاکٹر ایتو رناتھ ٹوپا سابق رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی اور جناب تصدق حسین تاج نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔

● کتاب "فہرست مطبوعات کتب خانہ" کی دوسری جلد مرتبہ پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی ادارے کی طرف سے شایع ہوئی۔

● کتاب "ادارہ سنہ ۵۹ء" مرتبہ محمد جمال الدین صاحب شایع ہو کر ملک کے ادیبوں اور دانشوروں کو برائے اظہار رائے ارسال کی گئی۔

مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

جمعہ - ۴ ر ـــ جناب فیاض الدین نظامی چیف آرکیٹکٹ آندھرا پردیش کی ہمراہی میں ڈنمارک کے ایک ممتاز آرکیٹکٹ نے ادارہ کی عمارت ایوان اُردو کا معائنہ کیا اور ادارے کے فن تعمیر کے مضمرات کی ستایش کی اور کئی زاویوں سے ایوان اُردو کی تصاویر بھی اُتاریں۔

ہفتہ - ۵ ر ـــ ماہنامہ خیال کامٹی (مارچ) اور ہفتہ وار عوامی دور دہلی (مارچ) میں ادارے کی کتاب "نذر معانی" (مرتبہ وقار خلیل) پر تبصرے شایع ہوئے۔ ماہنامہ نوری کرن بریلی (مارچ) میں ادارے کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کے محمد قلی قطب شاہ نمبر پر تبصرہ چھپا۔

● ۴ بجے۔ جناب قمر ساحری معتمد "بزم سعدی" نے سب رس میں بزم سعدی کے فارسی طرحی مشاعروں کی اشاعت کے باب میں ڈاکٹر زور اور وقار خلیل سے بات چیت کی۔

اتوار - ۶ ر ـــ ڈاکٹر یان مارک اُردو ریسرچ اسکالر چیکوسلواکیہ نے پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی ہمراہی میں ادارہ کے جملہ شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا اور اُردو کے تعلق سے معتمد عمومی ادارہ سے تبادلۂ خیالات ہوا۔

جمعہ ۔ ۱۱ ر ـــــ قانون ساز کونسل آندھرا پردیش میں ریاستی بجٹ پر عام مباحث میں حصہ لیتے ہوئے جناب پروفیسر ہارون خاں شیروانی (ایم۔ ایل۔ سی) نے اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے رقم مختص کئے جانے کا مطالبہ کرتے ہوئے اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں ادارے کی طرف سے شروع کئے گئے کام کی تفصیلات سے ایوانِ بالا کے اراکین کو واقف کراتے ہوئے وزیر فینانس اور ریاستی کابینہ سے اپیل کی کہ ادارہ کو اس کام کی تکمیل کے لیے حکومت معقول امداد دے۔

ہفتہ ۔ ۱۲ ر ـــــ مجلس انتظامی افتتاح عمارت ادارہ کا اجلاس نواب زین یار جنگ بہادر کی صدارت میں ۵½ بجے منعقد ہوا جس میں افتتاحی انتظامات کے پروگرام کو قطعیت دے دی گئی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر زور، ڈاکٹر ہندراج سکسینہ، ڈاکٹر شریف النساء انصاری، پروفیسر نارائن کرن ریڈی، پروفیسر ایم۔ اے۔ رحمان، پروفیسر نظر حسین، دلدار حسین انجینئر، رمن راج سکسینہ (ایڈوکیٹ)، فیاض الدین نظامی (چیف آرکٹکٹ) صاحبان نے شرکت کی۔

پیر ۔ ۱۴ ر ـــــ روزنامہ سیاست حیدرآباد میں جناب وزیر حسن دہلوی کی کتاب "دہلی" مطبوعہ ادارہ پر تبصرہ شایع ہوا۔

منگل ۔ ۱۵ ر ـــــ "سب رس" (ادارہ نمبر بابتہ مارچ) شایع ہوا۔

جمعرات ۔ ۱۷ ر ـــــ افتتاح "ایوانِ اُردو" کی مجلس انتظامی کے اراکین مسٹر ڈاکٹر زور، ڈاکٹر سکسینہ، فیاض الدین نظامی، دلدار حسین انجینئر وغیرہ نے انتظامات کی تفصیلات طے کیں۔

ہفتہ ۔ ۱۹ ر ـــــ بسلسلہ افتتاح ایوانِ اُردو ۵½ بجے ایک پریس کانفرنس ادارے میں منعقد ہوئی جسے ڈاکٹر زور معتمد ادارہ، جناب دلدار حسین انجینئر، صدر عمارت کمیٹی اور شری نارائن کرن ریڈی معتمد نے مخاطب کیا۔

● ۵ بجے مسٹر و مسز مانٹ رستاوف نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

اتوار ۔ ۲۰ ر ـــــ جناب اختر حسن (ایم۔ اے) سابق ایڈیٹر "پیام" کا ایوانِ اُردو کے تعلق سے ایک معلوماتی مضمون روزنامہ سیاست میں باتصویر شایع ہوا۔

● ۱۰ بجے نواب زین یار جنگ بہادر صدر ادارہ نے ایوانِ اُردو کے افتتاحی انتظامات کا مکمل طور پر معائنہ کیا۔

پیر ۔ ۲۱ ر ـــــ عالیجناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر ایوانِ اُردو کی افتتاحی تقریب میں حصہ لینے کیلئے ۲ بجے بذریعہ طیارہ حیدرآباد تشریف لائے۔ طیران گاہ پر مجلس انتظامی ادارہ و عمارت نے موصوف کا خیر مقدم کیا۔ اسی طیارہ میں دہلی سے سرکاری طور پر اس تقریب میں شرکت کے لیے اُردو کے ممتاز شاعر جناب جگن ناتھ آزاد (انفارمیشن آفیسر) بھی پہنچے۔

● ۴ بجے عالی جناب بخشی غلام محمد نے نواب زین یار جنگ اور مجلس انتظامی عمارت و ادارہ کی موجودگی میں ایوانِ اُردو کا پری ویو (معائنہ) کیا۔

● روزنامہ ملاپ و انگارے میں "ادارہ تاسیس سے تعمیر تک" کے زیر عنوان وقار خلیل کا مضمون شایع ہوا۔

منگل ۔ ۲۲ ر ـــــ جناب علی جواد زیدی انفارمیشن آفیسر حکومتِ کشمیر تقریب افتتاح ایوانِ اُردو میں شرکت کے لیے دو بجے دن ذریعہ طیارہ حیدرآباد تشریف لائے اور ادارے کے مہمان خانے میں قیام کیا۔

● جناب سید محمد مورخ، بیدر سے اس تقریب میں شرکت کیلئے تشریف لائے۔

● ۴½ بجے عالی جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش کی صدارت میں افتتاحی تقریب ایوانِ اُردو کا آغاز ہوا۔ عالیجناب بخشی غلام محمد صاحب نے قفل کشائی فرمائی اس موقع پر کلچرل پروگرام، مشاعرہ اور قوالی کے علاوہ پُر تکلف افطاری کا اہتمام کیا گیا تھا اور ایوانِ اُردو کو برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنایا گیا تھا۔ اس تقریب کی تفصیلات ادارے کی کتاب "سوغات" میں شامل و شایع کردی گئی ہے۔

چہارشنبہ ۔ ۲۳ ر ـــــ مقامی اخبارات میں افتتاح ایوانِ اُردو کی باتصویر تفصیلات شایع ہوئیں۔ روزنامہ رہنمائے دکن نے اداریہ لکھتے ہوئے ادارہ کی تیس سالہ خدمات کی ستایش کی۔

● ۲ بجے ۔ عالی جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر بذریعہ ہوائی جہاز براہ دہلی

کشمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ طیران گاہ، بیگم پیٹھ پر اراکین مجلس انتظامیہ ادارہ نے وداع کیا۔

● ۱/۲ ۵ بجے۔ ایوانِ اردو میں پہلی علمی محفل جناب علی جواد زیدی کے خیر مقدم میں منعقد ہوئی۔ اردو ادب کے ساتھ میں ... ادیبوں اور شاعروں سے اس نمایندہ اجتماع میں تبادلۂ خیال ہوا۔

● ۹ بجے آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اپنی خبروں میں ایوانِ اردو کے افتتاح کی تفصیلات نشر کیں اور ادارہ کے بارے میں ایک علمی تبصرہ بھی نشر ہوا۔

جمعرات۔ ۲۴ر — روزنامہ سیاست، حیدرآباد نے ادارہ کے ادبی خدمات اور ایوانِ اردو کے تعلق سے اداریہ شایع کیا

● ۲ بجے جناب جگن ناتھ آزاد اور جناب علی جواد زیدی جو ایوانِ اردو کے مہمان خانے پر مقیم تھے اور افتتاحی تقریب میں شرکت کیلئے خصوصی طور پر مدعو تھے، بذریعہ طیارہ دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔

● ۳ بجے جناب ٹی۔ ایچ۔ ...ران جنہوں نے مولانا آزاد کی تفسیر ... کا تلگو ترجمہ کیا ہے گنٹکل سے حیدرآباد آئے اور ایوانِ اردو کا معائنہ کیا

● ۱/۲ ۷ بجے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ایوانِ اردو کی افتتاحی تقریب کی ریڈیائی رپورٹ نشر کی۔

جمعہ۔ ۲۵ر — ۴ بجے جناب نور... لکچرار جغرافیہ عثمانیہ یونیورسٹی اور جناب انور منظور عالم نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

ہفتہ۔ ۲۶ر — ۱۱ بجے ڈاکٹر ناظر یار جنگ اور ان کے افراد خاندان، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، مولوی کرم اللہ خان اور سلمی کمال الدین ... صاحبہ نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

اتوار۔ ۲۷ر — نواب کاظم نواز جنگ (... رالنظام) کرنل حامداللہ، مولوی محمد عبدالوہاب، شوکت علی اور ... علی صاحبان نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

● روزنامہ ملاپ میں ادارہ کے تعلق سے ڈاکٹر زورؔ معتمد ادارہ کا معلوماتی مضمون دو اقساط میں شایع ہوا۔

پیر۔ ۲۸ر — ڈاکٹر عبداللہ صاحب (پاکستان) نے ایوانِ اردو کے تمام شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادارہ کی علمی خدمات پر دیر تک تبادلۂ خیال ہوا۔

منگل۔ ۲۹ر — اردو پڑھائی گھر (قایم شدہ ادارہ) کی طرف سے ملک محمد علی خاں صاحب کی زیرِ نگرانی عید ملاپ کی تقریب منائی گئی اور بچوں نے کلچرل پروگرام پیش کیا۔

چہارشنبہ۔ ۳۰ر — شری ڈی۔ راما نجا... سکریٹری آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈیمی نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

جمعرات۔ ۳۱ر — ہفتہ وار نیا یگ دہلی (۲۰ر مارچ) میں ادارہ کی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ شایع ہوا۔

● غلام نبی اللہ صاحب افسر ایمپلائمنٹ کھمم نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

جمعہ۔ یکم — حیدرآباد کے مشہور شاعر جناب اوج یعقوبی نے ادارہ کے صیغہ مطبوعات کے نگران کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔

اتوار۔ ۳ر — جناب قمر ساحری معتمد بزم سعدی نے فارسی ادبیات اور دکن میں فارسی شعر و ادب کے ارتقاء کے موضوع پر تبادلۂ خیالات کیا۔

پیر۔ ۴ر — روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد میں ادارہ کے تعلق سے وقار خلیل کا محررہ مضمون شایع ہوا۔

منگل۔ ۵ر — ماہنامہ "فاران" کراچی (اپریل) میں ادارے کی کتاب "کلیاتِ غواصی" پر تبصرہ شایع ہوا۔

● ہفتہ وار "نیا یگ" دہلی (۳ر اپریل) اور ہفتہ وار سویرا دہلی (یکم اپریل) میں ایوانِ اردو کی افتتاحی تقریب کی رپورٹ مرتبہ ملک محمد علی خاں صاحب شایع ہوئی۔

چہارشنبہ۔ ۶ر — ہفتہ وار "ہماری زبان" علیگڈھ (یکم اپریل) میں تقریبِ افتتاح ایوانِ اردو کی تفصیلات شایع ہوئیں۔

جمعرات۔ ۷ر — جناب زہرا بیگم لکچرار ناظم آباد (کراچی) نے جناب حبیب ضیا رقادریہ (ایم۔ اے ریسرچ اسکالر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کی ہمراہی میں ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

جمعہ۔ ۸ر — بارہ بجے ڈاکٹر تاراچند (ایم۔ پی، سابق سفیر ایران) نے ایوانِ اردو

کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر نظام الدین اور شری پی۔ ہنمنت راؤ (ایم پی) بھی موجود تھے۔

ہفتہ - ۹ ر ـــــ ½ ۵ بجے مجلسِ انتظامی اُردو انسائیکلوپیڈیا کا اجلاس ایوانِ اُردو میں منعقد ہوا۔

اتوار - ۱۰ ر ـــــ ۱۱ بجے اُردو دوستوں ممتاز تاجروں اور بلند پایہ شاعروں کے ایک وفد نے ایوانِ اُردو کے تمام شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا۔

● عرشی صاحب ایڈیٹر "حیاتِ سخن" نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

پیر - ۱۱ ر ـــــ سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی (اپریل) میں ادارہ کے ادبی خدمات کے تعلق سے اداریتی تبصرہ شایع ہوا۔

منگل - ۱۲ ر ـــــ ½ ۱۱ بجے، مسٹر جے والٹمن (نمائندہ بی بی سی ریڈیو لندن) نے جناب ضیاءُ انصاری اُردو پروگرام انچارج آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی ہمراہی میں ایوانِ اُردو کے تمام شعبہ جات کا معائنہ کیا۔

● ۳ بجے شری جے۔ وی نرسنگھ راؤ سابق وزیر آبپاشی آندھرا پردیش اور ۴ بجے جناب سید محمد مورخ (بیدر) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

چہارشنبہ - ۱۳ ر ـــــ ماہنامہ "انشاء" کراچی (اپریل) میں ادارے کی کتاب "نذرِ معانی" پر تبصرہ شایع ہوا۔

جمعرات - ۱۴ ر ـــــ ماہنامہ "منادی" دہلی (اپریل) میں ایوانِ اُردو کی افتتاحی تقریب کے تعلق سے جناب حسن ثانی نظامی نے تبصرہ شایع کیا۔

جمعہ - ۱۵ ر ـــــ جناب فقیر پاشاہ قادری ایم۔اے لکچرار عثمانیہ کالج کرنول، جناب میر عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" اور ناصر کرنولی صاحب (ایم۔اے) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔ مخطوطات اور فرامین (جن کا ادارہ میں وافر ذخیرہ ہے) سے متعلق ڈاکٹر زورؔ سے فنی بات چیت رہی۔

ہفتہ - ۱۶ ر ـــــ ماہنامہ "تاج" ناگپور (اپریل) میں ادارہ کے ترجمان سب رس پر تبصرہ شایع ہوا۔

اتوار - ۱۷ ر ـــــ جناب انور معظم ایم۔اے (علی گڑھ) مشہور افسانہ نگار خاتون جناب جیلانی بانو اور خفیفہ شکیلہ بانو بھوپالی نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا اس موقع پر جناب شاہد صدیقی، جناب اختر حسن سابق ایڈیٹر پیام، ڈاکٹر حفیظ قتیل، جناب جلال الدین صدیقی دوم تعلقدار بھی موجود تھے۔

چہارشنبہ - ۲۰ ر ـــــ ۱۱ بجے پروفیسر مبارز الدین رفعت (گلبرگہ) اور جناب سید مجیب الرحمٰن سروے ریجنل آفیسر محکمۂ آثارِ قدیمہ حکومتِ میسور (گلبرگہ) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

پروفیسر رفعت نے رسالہ "نقوش" لاہور سے چند تحریروں کی نقول بھی حاصل کیں۔ گلبرگہ میں اُردو کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں کئے جانے والے کاموں کا ذکر اور دیگر علمی مسائل موضوعِ گفتگو رہے۔

جمعرات - ۲۱ ر ـــــ ہفتہ وار "پیامِ مشرق" دہلی میں تقریب افتتاح ایوانِ اُردو کی تفصیلی رپورٹ مرتبہ وقار خلیل شایع ہوئی۔

● "سب رس" ماہِ اپریل شایع ہوا۔

جمعہ - ۲۲ ر ـــــ جناب ہاشم حسن سعید (ایم۔اے) ایڈیٹر مجلہ عثمانیہ نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا اور مجلہ کے "جامعہ نمبر" کی ترتیب و تیاری کے سلسلہ میں ادارے کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔

ہفتہ - ۲۳ ر ـــــ بزمِ تلامذہ صفی کی طرف سے منعقدہ سالانہ مشاعرہ میں ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کو ایک قرارداد کے ذریعہ خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔ اس مشاعرہ کی صدارت مولوی محمد منظور احمد ایم۔اے معتمد اعزازی اُردو مجلس نے کی۔

اتوار - ۲۴ ر ـــــ گجرات کے نامزد گورنر نواب مہدی نواز جنگ بہادر کا ایوانِ اُردو میں ادارہ اور ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایک نمائندہ اجتماع میں خیر مقدم کیا گیا۔

پیر - ۲۵ ر ـــــ ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی (اپریل) میں ادارے کی کتاب "کلیاتِ غواصی" پر تبصرہ شایع ہوا۔

جمعرات - ۲۸ ر ـــــ جناب خلیق انجم (ایم۔اے) لکچرار کروڑی مل کالج دہلی تحقیقاتی کاموں کے سلسلہ میں ایوانِ اُردو کے مہمان خانے میں مقیم ہوئے

● ½ ۵ بجے۔ ایوانِ اُردو میں جناب زبیر رضوی (دہلی) اور جناب خلیق انجم کے خیر مقدم

میں محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی۔ جس میں ان شعرا صاحبان نے اپنا کلام سنایا۔ صادق نقوی، سید نجفی، مدیر نیّر، زاہد، مہرالنسا رہبر، ابنِ احمد تاب، حیدر شمسی، سراج سیّد، خورشید نذیر، عزیز قیسبالی، کلیم قریشی، وقار خلیل، طالب رزاقی، قمر ساجدی، اختر حسن، اوج یعقوبی، سلیمان اریب، زبیر صوفی، شاہد صدیقی، جذب عالمپوری اور حیرت بدایونی۔ ڈاکٹر زور نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

مئی سنہ ۱۹۶۰ء

جمعرات۔ ۵ر — مولوی غلام رسول صاحب کی کتاب اُردو املا ادارے کی طرف سے شایع ہوئی۔

ہفتہ۔ ۷ر — جناب کرشنا کرپلانی (معتمد ساہتیہ اکاڈیمی حکومت ہند دہلی) اور جناب خواجہ حسن نظامی مدیر ماہنامہ منادی (دہلی) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر شری ڈی راماراؤ سکریٹری آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈیمی اور جناب قیام الدین نظامی چیف آرکیٹکٹ حکومت آندھرا پردیش بھی موجود تھے۔

اتوار۔ ۸ر — جناب خلیق انجم (ایم۔ اے) ریسرچ اسکالر، مہمان خانہ ایوانِ اُردو میں قیام کے بعد دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ وقار خلیل صاحب نے ادارے کی طرف سے آپ کو نامپلی اسٹیشن پر وداع کیا۔

● ماہنامہ "صبحِ امید" بمبئی (مئی) اور ماہنامہ "سورلجیہ" (مئی) کی اشاعتوں میں سب رسالوں کے "ایوانِ اُردو نمبر" پر تبصرے شایع ہوئے۔

چہارشنبہ۔ ۱۱ر — ادارے کی طرف سے کتاب "دیوانِ عشق" مرتبہ پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی شایع ہوئی۔

اتوار۔ ۱۵ر — ۱۰ بجے۔ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی مرکزی وزیر سیولائے سارت (دہلی) نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

● ۱۱ بجے۔ اُردو کے ترقی پسند فلمی شاعر جناب وشوامتر عادل (بمبئی) نے اپنی اہلیہ اور مسٹر اختر حسن کے ہمراہ ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

● مجلس اشاعت اُردو انسائیکلوپیڈیا کی گورننگ باڈی کا اجلاس ایوانِ اُردو میں منعقد ہوا۔ جس میں ڈاکٹر زور، پروفیسر مجید صدیقی، پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر محشر عابدی، ڈاکٹر شور، ڈاکٹر حفیظ قتیل، پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی اور پروفیسر مبارز الدین رفعت (گلبرگہ) نے شرکت کی۔

منگل۔ ۱۷ر — ماہنامہ "منادی" دہلی کی اشاعت ماہِ مئی میں ایوانِ اُردو کی افتتاحی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال مرتبہ وقار خلیل شایع ہوا۔

جمعرات۔ ۱۹ر — روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد کی اشاعت مورخہ ۱۸ر مئی میں ادارے کی طرف سے انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کے بارے میں آغاز کئے گئے اقدام کی تائید میں اداری مضمون شایع ہوا۔

● ماہنامہ "آجکل" دہلی بابتہ ماہ سنہ ۶۰ء میں "ایوانِ اُردو" کے افتتاح پر ادارتی نوٹ شایع ہوا۔

جمعہ۔ ۲۰ر — روزنامہ "رہنمائے حیدرآباد" میں ادارے کی مطبوعہ کتاب "نذرِ معانی" (مرتبہ وقار خلیل صاحب) پر تبصرہ شایع ہوا۔

● ۵ بجے۔ ڈاکٹر گیان چند شعبۂ اُردو حمیدیہ کالج بھوپال نے اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادارے کے نادر مخطوطات و نایاب ذخیرہ کی۔

ہفتہ۔ ۲۱ر — ماہنامہ "علیگڈھ" بابتہ مئی سنہ ۶۰ء میں سب رس کے "محمد قلی قطب شاہ نمبر" پر تبصرہ شا

اتوار۔ ۲۲ر — ۱½ بجے: رہنما راجہ مہندر پرتاپ (ایم۔ پی) "اتحادِ دنیا" دہلی نے "مغربی ممالک" کے موضوع پر ایوانِ اُردو میں تقریر۔ راجہ صاحب کے خیر مقدم میں منعقدہ تقریب کی صدارت نواب زین یار جنگ نے کی۔ ڈاکٹر زور نے معزز مہمان اُردو کی میزبانی کی۔ اس موقع پر محفلِ شعر و سخن میں حیرت بدایونی، عبد الرزاق (؟) اوج یعقوبی، وقار خلیل، مظہر عارفی اور صلاح الدین نیّر نے اپنے

● پندرہ روزہ "قومی زبان" (جو کُل پاکستان انجمن ترقی اُردو کا) اپنی اشاعت مورخہ ۱۶ر مئی

کے تعلق سے مولوی تمکین کاظمی کا مضمون شایع کیا۔

پیر۔ ۲۳ر ــــــ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد نے ادارہ کی کتاب "اُردو املا" پر تبصرہ شایع کیا۔

● ۵ بجے ایوانِ اُردو میں مجلسِ اشاعت اُردو انسائیکلوپیڈیا کا اجلاس منعقد ہوا۔

● ۵½ بجے نواب زین یار جنگ بہادر صدر ادارہ کی صدارت میں "ایوانِ اُردو" میں مجلسِ انتظامی ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا۔

چہارشنبہ۔ ۲۵ر ــــــ ۱۱ بجے ڈاکٹر غلام دستگیر رشید صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

ہفتہ ۲۸ر ــــــ "سب رس" بابتہ ماہ مئی (ایوانِ اُردو نمبر) شایع ہوا۔

جُون سنہ ۱۹۶۰ء

جمعرات۔ ۲ر ــــــ ماہنامہ "التعمیر" سری نگر کی اشاعت ماہ مارچ و اپریل سنہ ۶۰ء میں ایوانِ اُردو کے افتتاحی تقریب کی تفصیلی رپورٹ شایع کی۔

ہفتہ۔ ۴ر ــــــ ماہنامہ "سوراجیہ" دہلی بابتہ جون سنہ ۶۰ء میں "ایوانِ اُردو" سے متعلق شری پریم ناتھ مشرا پنجابی (جرنلسٹ) اور شری منوہر پرساد ماتھر (بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی) کے مضامین شایع ہوئے۔

منگل۔ ۷ر ــــــ ہفتہ وار "نیا کیمپ" دہلی (مورخہ ۷ر جون) میں "ایوانِ اُردو کی سیر" کے زیرِ عنوان ملک محمد علی خان صاحب جرنلسٹ کا مضمون شایع ہوا۔

چہارشنبہ۔ ۸ر ــــــ ادارے کی مطبوعات "کلیاتِ غواصی" اور "تذکرہ مخطوطات جلد پنجم" پر ماہنامہ "فروغِ اُردو" لکھنؤ بابتہ ماہ جون سنہ ۶۰ء میں تبصرے شایع ہوئے۔

● ۸½ بجے۔ ڈاکٹر روز ارپو جائنٹ سکریٹری وزارت ثقافتی امور و سائنسی تحقیقات حکومتِ ہند (دہلی) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا اور ادبی نوادرات کی سلیقے سے ترتیب، اور مخطوطات و مطبوعات کے قابلِ قدر ذخیرہ، نیز ادارہ کی علمی سرگرمیوں کی ستایش کی۔

ہفتہ۔ ۱۱ر ــــــ روزنامہ "سندیش" جموں و کشمیر نے اپنی اشاعت میں ادارہ کی مجریہ ماہِ رپورٹ مئی شایع کی۔

اتوار۔ ۱۲ر ــــــ ۱۰ بجے جناب محمد اسحاق ایوبی انفارمیشن آفیسر، پریس انفارمیشن بیورو حیدرآباد نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور حیدرآباد کے علمی ادبی موضوعات پر ڈاکٹر زور معتمد ادارہ سے تبادلۂ خیال فرمایا۔

پیر۔ ۱۳ر ــــــ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں ادارہ کی کتاب "دیوانِ عشق" مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی صاحب پر تبصرہ شایع ہوا۔

چہارشنبہ۔ ۱۴ر ــــــ ماہنامہ "الشاہ" کراچی بابتہ جون سنہ ۶۰ء میں ادارے کی "دیہی" از وزیر حسن دہلوی پر تبصرہ شایع کیا۔

● ۴½ بجے۔ پروفیسر سید محمد فضل اللہ پرنسپل گورنمنٹ کالج اڈونی ضلع کرنول مدراس نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا اور کتب خانے سے استفادہ فرمایا۔

جمعہ۔ ۱۷ر ــــــ ماہنامہ "پگڈنڈی" امرتسر بابتہ ماہ جون میں ادارے کی کتاب "اُردو املا" پر تبصرہ شایع ہوا۔

ہفتہ۔ ۱۸ر ــــــ ڈاکٹر زور معتمد ادارہ نے اُردو داں اصحاب کو خطوط اور بیان کے ذریعے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ وہ شادی بیاہ دیگر تقریبات کے دعوت ناموں کی اجرائی کے موقعوں پر اُردو زبان میں دعوت نامے چھپوائیں۔ اُردو داں حضرات کے انگریزی دعوت نامے چھپانے کے رجحان کی مذمت کی گئی۔

چہارشنبہ۔ ۲۲ر ــــــ ماہنامہ "اتحادِ دنیا" دہلی بابتہ ماہ جون میں راجہ مہندر پرتاپ (ایم۔ پی) کے ایوانِ اُردو میں خیرمقدم کی تفصیلات کے علاوہ راجہ صاحب کے ادارے کے متعلق تاثرات بھی شایع ہوئے۔

جمعرات۔ ۲۳ر ــــــ "سب رس" ماہ جون شایع ہوا۔

● ۶ بجے جناب سید محمد یونس (ایم۔ اے) استاد فارسی دہلی کالج نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ "بارھویں صدی ہجری میں فارسی نظم و نثر" کے موضوع پر فراہمی مواد کے لیے ایوانِ اُردو کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔

منگل۔ ۲۸ر ـــــ ہفتہ وار رسالہ "بے داغ" دہلی مورخہ ۲۸ر جون میں ادارہ کی سرگرمیاں ماہ مئی شایع ہوئیں۔

چہارشنبہ۔ ۲۹ر ـــــ ۵ بجے۔ شری کے۔ وی رنگا ریڈی ڈپٹی چیف منسٹر آندھرا پردیش نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس موقعہ پر شری پی۔ ہنمنت راؤ (ایم۔ پی) بھی موجود تھے۔ جناب اوج یعقوبی نے منسٹر صاحب کے خدمات کے تعلق سے فی البدیہہ نظم پڑھی۔

● ۵½ بجے۔ جناب عبدالحمید خاں بوہیرے ایڈیٹر ماہنامہ "صبحِ امید" بمبئی نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا اس موقعہ پر جناب محمد اسحاق یو پی انفارمیشن آفیسر اور جناب اکرام جاوید (بی۔ اے) بھی موجود تھے۔

جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

جمعہ۔ یکم ـــــ ۴ بجے۔ جناب ڈاکٹر حبیب الرحمٰن (علی گڑھ) نے اپنی بیگم صاحبہ کے ہمراہ ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

ہفتہ۔ ۲ر ـــــ ۵ بجے۔ حضرت علام دستگیر ابر مرحوم کے صاحبزادے جناب نصیر الدین احمد صاحب نصیر (مقیم کراچی) اور جناب مصلح الدین احمد (سفارت خانہ پاکستان دہلی) نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

اتوار۔ ۳ر ـــــ ۱۱ بجے۔ اردو کے صفِ اول کے شاعر جسٹس پنڈت آنند نرائن ملا (لکھنؤ) نے ایوانِ اردو کا معائنہ فرمایا۔

ہفتہ۔ ۹ر ـــــ ۵½ بجے۔ مجلس انتظامی اشاعت اردو انسائیکلوپیڈیا کا اجلاس ایوانِ اردو میں بصدارت ڈاکٹر زور منعقد ہوا۔ جس میں سائنس کے موضوع پر پہلی جلد کی اشاعت کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا اور ایک ایڈوائزری بورڈ بھی تشکیل دیا گیا۔

چہارشنبہ۔ ۱۳ر ـــــ ۴½ بجے عثمان آباد کے شعرا جناب عبدالقادر ساجد اور زبیدہ تحسین صاحبہ نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

● ۵½ بجے۔ جناب فیض احمد (ایم۔ اے) ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی اور جناب صالح محمد سیٹھ (ایم۔ اے) نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

جمعہ۔ ۱۵ر ـــــ ۵ بجے۔ جناب فیض احمد (ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی) نے تحقیقاتی کاموں کے سلسلے میں ایوانِ اردو کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔

اتوار۔ ۱۷ر ـــــ اردو کے ممتاز افسانہ نگار جناب ابراہیم جلیس (روزنامہ جنگ۔ کراچی) نے مجتبیٰ حسین (بی۔ اے ایل ایل۔ بی) کی ہمراہی میں ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایوانِ اردو میں آویزاں دکن کی تعریف میں لکھے گئے اشعار اور دیگر نوادرات کی نقلیں حاصل کیں۔

چہارشنبہ۔ ۲۰ر ـــــ ۸ بجے۔ جناب فیض احمد ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی چھ روزہ قیام مہمان خانہ ایوانِ اردو کے بعد میسور کے لیے روانہ ہوئے۔ وقار خلیل نے موصوف کو اسٹیشن پر الوداع کہا۔

جمعرات۔ ۲۱ر ـــــ ماہنامہ "ادیب" (علی گڑھ) بابتہ ماہ جولائی میں ادارہ کی کتاب "اردو املا" پر تبصرہ شایع ہوا۔

منگل۔ ۲۶ر ـــــ ۴½ بجے پروفیسر ہارون خان شیروانی (ایم۔ ایل۔ سی) اور جناب شیث خان شیروانی (علی گڑھ) نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ میوزیم صوفیائے کرام کے قدیم شجروں کے ذخیرہ کے بارے میں پروفیسر شیروانی نے تبادلۂ خیال کیا اور ان ذخیروں کو بڑی دلچسپی سے ملاحظہ فرمایا۔

چہارشنبہ۔ ۲۷ر ـــــ مقامی اخباروں میں ادارہ کی طرف سے منعقدہ اردو امتحانات کے نتائج شایع ہوئے۔

جمعرات۔ ۲۸ر ـــــ کریم نگر کے علم دوست حضرات کے اجتماع میں ادارہ کی شاخ قایم کی گئی جس کے صدر شیخ ... صاحب جنیدی، شری ... ریڈی ... نائب صدر اور حکیم ناصر صدیقی صاحب معتمد منتخب ہوئے۔ دیگر ۱۶ ارکان پر مشتمل انتظامی کمیٹی تشکیل دی گئی۔

جمعہ۔ ۲۹ر ـــــ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اردو ادیبوں اور شاعروں کے نمایندہ اجتماع میں ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا اور ادارہ کے بارے میں اپنے اہم خیالات کا اظہار کیا۔ تفصیلات علیحدہ شایع کی جا رہی ہیں۔

اگست سنہ ۱۹۶۰ء

چہارشنبہ - ۳ر ـــــ "سب رس" ماہ جولائی سنہ ۶۰ء شایع ہوا۔

جمعہ - ۵ر ـــــ ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی بابتہ جولائی سنہ ۶۰ء میں ادارہ کی کتاب "دیوانِ عشق" پر تبصرہ شایع ہوا۔

اتوار - ۷ر ـــــ ۱۱ بجے ـ جناب شلندر معتمد ہندوستانی پرچار سبھا بمبئی، حکیم عبدالوہاب صاحب ظہوری، پرنسپل نظامیہ طبی کالج، احسان علی صاحب عرشی سابق سب رجسٹرار اور سید محمود صاحب مورخ بیدری نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

جمعرات - ۱۱ر ـــــ روزنامہ "سندیش" جموں میں "سب رس" کے "ایوانِ اُردو نمبر" پر تبصرہ شایع ہوا۔

ہفتہ - ۱۳ر ـــــ ۱ بجے ـ جناب ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ (بمبئی) اور نواب میر یٰسین علی خاں صاحب نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

● ماہنامہ "ادیب" علی گڈھ بابتہ ماہ اگست سنہ ۶۰ء میں "سب رس" کے "ادارہ نمبر اور ایوانِ اُردو نمبر" پر تبصرے شایع ہوئے۔

پیر - ۱۵ر ـــــ ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڈھ میں ادارے کے اُردو امتحانات کے نتایج شایع ہوئے۔

● ماہنامہ "پگڈنڈی" (امرتسر) اور ماہنامہ "کتاب نما" (دہلی) بابتہ ماہ اگست میں ادارہ کی ماہانہ رپورٹ کے علاوہ اُردو انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کی تفصیلات شایع ہوئیں۔

جمعرات ۱۹ر ـــــ جناب حفظ الکبیر قریشی منتخب صدر شعبۂ اُردو شکاگو یونیورسٹی اور جناب حافظ محمد ابراہیم صدیقی، بمبئی سے حیدرآباد آئے اور ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

جمعرات - ۲۵ر ـــــ تقریبِ افتتاحِ "ایوانِ اُردو" کی تفصیلات انگریزی اور اُردو کتابوں کی صورت میں "سوغات" اور "Sovenir" ادارے کی طرف سے شایع ہوئے۔

جمعہ - ۲۶ر ـــــ ۵ بجے ـ جناب کا۔پی۔ تارا پور والا، ملیافس سکریٹری حضور نظام نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔ جناب اوج یعقوبی نے فی البدیہہ تہنیتی نظم سُنائی۔ عبدالرزاق رضا صاحب، اور سراج حیدرآبادی نے بھی کلام سُنایا۔

منگل - ۳۰ر ـــــ دوماہی رسالہ "نگجر" لاہور بابتہ ماہ ستمبر، اکتوبر سنہ ۶۰ء میں "سب رس" اور ادارے کی کتاب "اُردو اطلا" پر تبصرے شایع ہوئے۔

چہارشنبہ - ۳۱ر ـــــ "سب رس" بابتہ ماہ اگست شایع ہوا۔

ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

جمعرات - یکم ـــــ ۱۱ بجے ـ جناب شہزادہ ترنم، صدر انڈو جرمن کلچرل سوسائٹی شاخ حیدرآباد نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

جمعہ - ۹ر ـــــ ۴½ بجے ـ ایوانِ اُردو میں اُردو کے جواں سال شاعر جناب قاضی سلیم ایڈوکیٹ اورنگ آباد کے خیر مقدم میں ایک محفلِ شعر و سخن محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ وزیر سماجی خدمات آندھرا پردیش کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اولاً ڈاکٹر زور صاحب نے محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ کا خیر مقدم کیا اور اُن کے وزیر بننے پر مبارکباد دیتے ہوئے اُن کے علم دوست خاندان کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ ہر دو معززین نے ایوانِ اُردو کا معائنہ فرمایا۔ اس محفلِ شعر و سخن میں ممتاز قدیم و جدید مکتبِ فکر کے پچیس سے زیادہ شعرا نے کلام سُنایا۔

ہفتہ - ۱۰ر ـــــ ایوانِ اُردو میں حضرت جگر مرادآبادی کی رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ کارکنانِ ادارہ کی طرف سے منعقد ہوا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ نے صدارت فرمائی۔ ڈاکٹر زور صاحب نے مختصر تقریر کے ذریعہ حضرت جگر کی شعری خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ آخر میں ایک قراردادِ تعزیت منظور کی گئی۔ حاضرین نے ایستادہ ہو کر دو منٹ کی خاموشی منائی۔

اتوار - ۱۱ر ـــــ ماہنامہ "صبحِ اُمید" بمبئی بابتہ ستمبر میں ادارہ کی سالانہ رپورٹ "ادارہ سن ۱۹۵۹ء" پر تبصرہ شایع ہوا۔

منگل - ۱۳ر ـــــ ۹ بجے ـ جناب سید بادشاہ حسین سابق معتمد شعبۂ انسائیکلوپیڈیا و حال ایڈیٹر "پاکستان ٹائمز" (کراچی) نے جناب نظام الدین احمد ناظم معدنیات کے ہمراہ ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

چہارشنبہ - ۱۴ر ـــــ ۵ بجے ـ جناب ڈاکٹر ہری چند گپتا، سکریٹری یونیورسٹی گرانٹس کمیشن حکومتِ ہند (دہلی) نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور بعض مفید مشورے دیئے۔

منگل - ۲۸ ر ——— ہفتہ وار رسالہ "بے داغ" دہلی مورخہ ۲۸ ر جون میں ادارہ کی سرگرمیاں ماہ مئی شایع ہوئیں۔

چہارشنبہ - ۲۹ ر ——— ۵ بجے - شری کے - وی رنگا ریڈی، ڈپٹی چیف منسٹر آندھرا پردیش نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس موقعہ پر شری پی - ہنمنت راؤ، (ایم - پی) بھی موجود تھے۔ جناب اوج یعقوبی نے منسٹر صاحب کے خدمات کے تعلق سے فی البدیہہ نظم پڑھی۔

● ۵½ بجے - جناب عبدالحمید خاں بوہیرے ایڈیٹر ماہنامہ "صبحِ اُمید" بمبئی نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا اس موقعہ پر جناب محمد اسحاق یو بی انفارمیشن آفیسر اور جناب اکرام جاوید (بی - اے) بھی موجود تھے۔

جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

جمعہ - یکم ——— ۴ بجے - جناب ڈاکٹر منیب الرحمن (علی گڑھ) نے اپنی بیگم صاحبہ کے ہمراہ ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

ہفتہ - ۲ ر ——— ۵ بجے - حضرت علام دستگیر ابر مرحوم کے صاحبزادے جناب نصیرالدین احمد صاحب نصیر (مقیم کراچی) اور جناب مصلح الدین احمد (سفارت خانہ پاکستان دہلی) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

اتوار - ۳ ر ——— ۱۱ بجے - اُردو کے صف اول کے شاعر جسٹس پنڈت آنند نرائن مُلّا (لکھنؤ) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ فرمایا۔

ہفتہ - ۹ ر ——— ۵½ بجے - مجلسِ انتظامی اشاعتِ اُردو انسائیکلوپیڈیا کا اجلاس ایوانِ اُردو میں بصدارت ڈاکٹر زورؔ منعقد ہوا - جس میں سائنس کے موضوع پر پہلی جلد کی اشاعت کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا اور ایک ایڈوائزری بورڈ بھی تشکیل دیا گیا۔

چہارشنبہ - ۱۳ ر ——— ۴½ بجے عثمان آباد کے شعراء جناب عبدالقادر سلیم اور زبیدہ تحسین صاحبہ نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

● ۵½ بجے - جناب فیض احمد (ایم - اے) ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی اور جناب صالح محمد سیٹھ (ایم - اے) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

جمعہ - ۱۵ ر ——— ۵ بجے - جناب فیض احمد (ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی) نے تحقیقاتی کاموں کے سلسلے میں ایوانِ اُردو کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔

اتوار - ۱۷ ر ——— اُردو کے ممتاز افسانہ نگار جناب ابراہیم جلیس (روزنامہ جنگ - کراچی) نے مجتبیٰ حسین (بی - اے ایل ایل - بی) کی ہمراہی میں ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایوانِ اُردو میں آویزاں دکن کی تعریف میں لکھے گئے اشعار اور دیگر نوادرات کی نقلیں حاصل کیں۔

چہارشنبہ - ۲۰ ر ——— ۸ بجے - جناب فیض احمد ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی چھ روزہ قیام مہمان خانہ ایوانِ اُردو کے بعد میسور کے لیے روانہ ہوئے - وقار خلیل صاحب نے موصوف کو اسٹیشن پر الوداع کہا۔

جمعرات - ۲۱ ر ——— ماہنامہ "ادیب" (علی گڑھ) بابتہ ماہ جولائی میں ادارہ کی کتاب "اُردو املا" پر تبصرہ شایع ہوا۔

منگل - ۲۶ ر ——— ۴½ بجے - پروفیسر ہارون خان شیروانی (ایم - ایل - سی) اور جناب شیث خان شیروانی (علی گڑھ) نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا - میوزیم میں صوفیائے کرام کے قدیم شجروں کے کثیر اثاثے کے بارے میں پروفیسر شیروانی نے تبادلۂ خیال کیا اور ان ذخیروں کو بڑی دلچسپی سے ملاحظہ فرمایا۔

چہارشنبہ - ۲۷ ر ——— مقامی اخبارات میں ادارہ کی طرف سے منعقدہ اُردو امتحانات کے نتائج شایع ہوئے۔

جمعرات - ۲۸ ر ——— کریم نگر میں علم دوست حضرات کے اجتماع میں ادارہ کی شاخ قایم کی گئی جس کے صدر شیخ صالح صاحب جنیدی، شری یلا ریڈی میونسپل کونسلر نائب صدر، اور حکیم ناصر صدیقی صاحب شمسی معتمد منتخب ہوئے - دیگر ۱۶ اراکین پر مشتمل انتظامی کمیٹی تشکیل دی گئی۔

جمعہ - ۲۹ ر ——— صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے نمایندہ اجتماع میں ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا اور اُردو، ہندی کے بارے میں اپنے اہم خیالات کا اظہار فرمایا (تفصیلات علیحدہ شایع کی جا رہی ہیں)

اگست ۱۹۶۰ء

چہارشنبہ - ۳ر —— "سب رس" ماہ جولائی ۶۰ء شایع ہوا۔

جمعہ - ۵ر —— ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی بابتہ جولائی ۶۰ء میں ادارہ کی کتاب "دیوانِ عشق" پر تبصرہ شایع ہوا۔

اتوار - ۷ر —— ۱۱ بجے۔ جناب شلندر معتمد ہندوستانی پرچار سبھا بمبئی، حکیم عبدالوہاب صاحب ظہوری، پروفیسر نظامیہ طبی کالج، احسان علی صاحب عرشی سابق سب رجسٹرار اور سید محمد صاحب مورخ بیدری نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

جمعرات - ۱۱ر —— روزنامہ "سندیش" جموں میں "سب رس" کے "ایوانِ اردو نمبر" پر تبصرہ شایع ہوا۔

ہفتہ - ۱۳ر —— ۱ بجے۔ جناب ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ (بمبئی) اور نواب میر یوسف علی خاں صاحب نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

● ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ بابتہ ماہ اگست ۶۰ء میں "سب رس" کے "ادارہ نمبر اور ایوانِ اردو نمبر" پر تبصرے شایع ہوئے۔

پیر - ۱۵ر —— ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڑھ میں ادارے کے اردو امتحانات کے نتائج شایع ہوئے۔

● ماہنامہ "پگڈنڈی" (امرتسر) اور ماہنامہ "کتاب نما" (دہلی) بابتہ ماہ اگست میں ادارہ کی ماہانہ رپورٹ کے علاوہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کی تفصیلات شایع ہوئیں۔

جمعرات ۱۹ر —— جناب حفظ الکبیر قریشی منتخب صدر شعبۂ اردو شکاگو یونیورسٹی اور جناب حافظ محمد ابراہیم صدیقی، بمبئی سے حیدرآباد آئے اور ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

جمعرات - ۲۵ر —— تقریب افتتاح "ایوانِ اردو" کی تفصیلات انگریزی اور اردو کتابوں کی صورت میں سوغات اور "Sovenir" ادارے کی طرف سے شایع ہوئے۔

جمعہ - ۲۶ر —— ۵ بجے۔ جناب کا، پی، تارا پور والا، فینانس سکریٹری حضور نظام نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔ جناب اوج یعقوبی نے فی البدیہہ تہنیتی نظم سنائی۔ عبدالرزاق رضا صاحب، اور سراج حیدرآبادی نے بھی کلام سنایا۔

منگل - ۳۰ر —— دوماہی رسالہ "گجر" لاہور بابتہ ماہ ستمبر، اکتوبر ۶۰ء میں "سب رس" اور ادارے کی کتاب "اردو املا" پر تبصرے شایع ہوئے۔

چہارشنبہ - ۳۱ر —— "سب رس" بابتہ ماہ اگست شایع ہوا۔

ستمبر ۱۹۶۰ء

جمعرات - یکم —— ۱۱ بجے۔ جناب شہزادہ ترنم، صدر انڈو جرمن کلچرل سوسائٹی شاخ حیدرآباد نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

جمعہ - ۹ر —— ۲½ بجے۔ ایوانِ اردو میں اردو کے جواں سال نامور جناب قاضی سلیم ایڈوکیٹ اورنگ آباد کے خیر مقدم میں ایک محفلِ شعر و سخن محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ وزیر سماجی خدمات آندھرا پردیش کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اولاً ڈاکٹر زور صاحب نے محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ کا خیر مقدم کیا اور اُن کے وزیر بننے پر مبارکباد دیتے ہوئے اُن کے علم دوست خاندان کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ ہر دو معززین نے ایوانِ اردو کا معائنہ فرمایا۔ اس محفلِ شعر و سخن میں ممتاز قدیم و جدید مکتبِ فکر کے پچیس سے زیادہ شعراء نے کلام سنایا۔

ہفتہ - ۱۰ر —— ایوانِ اردو میں حضرت جگر مرادآبادی کی رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ کارکنانِ ادارہ کی طرف سے منعقد ہوا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ نے صدارت فرمائی۔ ڈاکٹر زور صاحب نے مختصر تقریر کے ذریعہ حضرت جگر کی شعری خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ آخر میں ایک قراردادِ تعزیت منظور کی گئی۔ حاضرین نے ایستادہ ہو کر دو منٹ کی خاموشی منائی۔

اتوار - ۱۱ر —— ماہنامہ "صبحِ امید" بمبئی بابتہ ستمبر میں ادارہ کی سالانہ رپورٹ "ادارہ سن ۱۹۵۹ء" پر تبصرہ شایع ہوا۔

منگل - ۱۳ر —— ۹ بجے۔ جناب سید بادشاہ حسین سابق معتمد شعبۂ انسائیکلوپیڈیا و حال ایڈیٹر "پاکستان ٹائمز" (کراچی) نے جناب نظام الدین احمد ناظم معدنیات کے ہمراہ ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

چہارشنبہ - ۱۴ر —— ۵ بجے۔ جناب ڈاکٹر ہری چند گپتا، سکریٹری یونیورسٹی گرانٹس کمیشن حکومتِ ہند (دہلی) نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور بعض مفید مشورے دیئے۔

جمعرات ۔ ۱۵ر ـــ ۵ بجے ۔ حیدرآباد کے مشہور سرجن ڈاکٹر جی ۔ راماینے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا اور ادارہ کے نادر ذخیروں کی ستایش کی ۔

چہارشنبہ ۔ ۲۱ر ـــ ۳ بجے ۔ اُردو کے مشہور شاعر جناب برق موسوی نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا ۔ اس موقع پر جناب قمر ساحری معتمد اعزازی بزمِ سعدی بھی ہمراہ تھے ۔

جمعہ ۔ ۲۳ر ـــ ۴½ بجے ۔ ادارہ کی مجلسِ انتظامی کا اجلاس بہ مکان نواب زین یار جنگ بہادر (صدرِ ادارہ) کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ اشاعتی اور انتظامی اُمور کے علاوہ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلہ میں تفصیلات طے ہوئیں ۔

● ۵ بجے ۔ جناب بیرسٹر میر اکبر علی خاں (ایم ۔ پی) نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا ۔

اتوار ۔ ۲۵ر ـــ ۲ بجے جناب جہاندار افسر میونسپل کونسلر ، صدر صفی سوسائٹی نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا اور ادارہ کے کتب خانے سے استفادہ کیا ۔

منگل ۔ ۲۷ر ـــ ادارہ کی طرف سے جناب رشید الحسن لکچرار جیادر گھاٹ کالج کی کتاب " تماشائے اہلِ ہنر " ڈراموں کا مجموعہ ، شایع ہوئی ۔

● " سب رس " ماہ ستمبر شایع ہوا ۔

جمعرات ۔ ۲۹ر ـــ ۳ بجے ۔ ریورنڈ ڈبلیو جے ، کلشا ، ڈائرکٹر بائبل سوسائٹی بنگلور اور مس کے ۔ ایچ کلشا (دبلی چرچ ، حیدرآباد) اور عارف سیابانی صاحب نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا ۔

اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء

جمعرات ۶ر ـــ ساپ نظر بارہ بنکوی دکھنو نے جاوید لطیفی صاحب کے ہمراہ ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا ۔ اس موقع پر چند شعراء سامعین بھی موجود تھے ۔ مہمان شاعر کا مقامی شعراء سے تعارف کرایا گیا اور محفلِ شعر منعقد ہوئی ۔

جمعہ ۔ ۷ر ـــ جناب کیلاش ماہر (ایم ۔ اے ، ڈپٹی ڈائرکٹر اسمال انڈسٹریز دہلی) نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا ۔ اس موقع پر منعقدہ محفلِ شعر و سخن میں کیلاش ماہر ، اوج یعقوبی ، منوہر لال شارب ، وقار خلیل ، مظہر کامل ، منوہر لال بہار ، صلاح الدین نیر ، ساجد زیدی ، فیض الحسن خیال ، اور نذیر منیر صاحبان نے اپنا کلام سُنایا ۔ جناب ہاشم علی سکریٹری گورنر آندھرا پردیش بھی اس موقع پر موجود تھے ۔

اتوار ۔ ۱۲ر ـــ مجلسِ انتظامی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس نواب زین یار جنگ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا جس کے بعد مجلسِ اشاعت ، تاریخ دکن کا اجلاس ہوا جس میں پروفیسر شیام لال نے " گولکنڈہ کے ہیرے " کے زیرِ عنوان مقالہ سُنایا ۔ ڈاکٹر زور صاحب نے مجلسِ اشاعت تاریخ کے پروگرام سے واقف کراتے ہوئے یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں تفصیلات سے ایوان کو واقف کرایا ۔ آخر میں جناب نجم آفندی کی صدارت میں ایک محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی ۔

جمعرات ۔ ۱۳ر ـــ روزنامہ " نگار " حیدرآباد نے اپنے اداریہ میں ادارہ کی تحریک محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر خصوصی پوسٹل ٹکٹ کی اجرائی کے بارے میں حکومتِ ہند کو توجہ دلائی ۔

جمعہ ۔ ۱۴ر ـــ ماہنامہ " آجکل " دہلی (بابتہ ماہِ اکتوبر) میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب " دیوانِ شوق " پر تبصرہ شایع ہوا ۔

اتوار ۔ ۱۶ر ـــ مقامی اخبارات روزنامہ " سیاست " اور " رہنمائے دکن " میں " یوم محمد قلی قطب شاہ " کے موقع پر خصوصی پوسٹل ٹکٹوں کی اجرائی کے بارے میں علی الترتیب تحسین سروری صاحب اور وقار خلیل صاحب کے مراسلے شایع ہوئے ۔

● روزنامہ " نظام گزٹ " حیدرآباد نے بھی اس خصوص میں ایک سب ایڈیٹوریل کے ذریعہ حکومت کو توجہ دلائی ۔

چہارشنبہ ۔ ۱۹ر ـــ ماہنامہ " پاکیزہ " مدراس (بابتہ اکتوبر) میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب " سوغات " پر تبصرہ شایع ہوا ۔

جمعرات ۔ ۲۰ر ـــ ½۱۱ بجے پرنس نجف علی خاں صاحب ثاقب نظامی نے ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا ۔

جمعہ ۔ ۲۱ر ـــ ½۵ بجے ڈاکٹر تاراچند صاحب سابق سفیر ایران و حال ممبر پارلیمنٹ نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادارہ کے میوزیم کے بعض نوادر دیکھے ۔ ڈاکٹر زور صاحب سے مختلف ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا ۔

ہفتہ ۔ ۲۲ر ـــ ایوانِ اُردو میں ½۵ بجے مجلسِ انتظامی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس نواب زین یار جنگ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا ۔

● "سب رس" ماہِ اکتوبر شایع ہوا۔

اتوار۔ ۲۳ / ۔۔۔ ۱۱ بجے۔ نواب تراب یار جنگ بہادر سے حیثیت ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

● ۵ بجے۔ پرنس مکرم جاہ بہادر اور شہزادی اسریٰ برجن نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر علم دوستوں اور ادارے کے اراکین کی نمایندہ تعداد ایوانِ اردو میں موجود تھی۔ ڈاکٹر زور صاحب نے پرنس کا خیر مقدم کیا۔ نواب زین یار جنگ بہادر نے پرنس اور شہزادی کی گلپوشی کی۔ محفلِ شعر و سخن میں مقامی شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

نومبر ۱۹۶۰ء

منگل۔ یکم ۔۔۔ ۴/۱ ۵ بجے۔ عالیجناب پی۔ وی سنہا چیف جسٹس سپریم کورٹ (دہلی) اور پاکستان کے مشہور شاعر جناب نظر حیدرآبادی نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر منعقدہ محفلِ شعر و سخن میں شعرا صاحبان نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ نے جسٹس سنہا کا خیر مقدم کیا۔

● ادارے کی طرف سے دو کتابیں سمندری عجائبات از احمد حسین نقوی اور تاریخ ادبِ اردو (اشاعت چہارم) شایع ہوئیں۔

جمعرات۔ ۱۶ / ۔۔۔ ادارے کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کا شمارہ بابتہ نومبر شایع ہوا۔

جمعہ۔ ۱۷ / ۔۔۔ ۴/۱ ۴ بجے۔ جناب علاؤ الدین حبیب ایم اے ، سب ایڈیٹر روزنامہ "ملاپ" نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا اور ملاپ کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن کے سلسلہ میں ہم ادارے سے معاونت کی درخواست کی۔

اتوار۔ ۲۰ / ۔۔۔ ماہنامہ "بگڈنڈی" (امرتسر) بابتہ نومبر ۱۹۶۰ء میں "سب رس" کے "محمد قلی قطب شاہ نمبر" پر تبصرہ شایع ہوا۔

منگل۔ ۲۲ / ۔ ۵ بجے۔ پنڈت وِشنی دھر ودیالنکار پرنسپل ماتک رام بھگوانداس کالج نے اپنے افرادِ خاندان کے ہمراہ ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

پیر۔ ۲۸ / ۔۔۔ ۵ بجے۔ ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

دسمبر ۱۹۶۰ء

جمعہ۔ ۲ / ۔۔۔ ماہنامہ "شبستان" (دکا مٹی) اشاعت ماہِ دسمبر میں "یومِ محمد قلی قطب شاہ" کے موقع پر حکومتِ ہند کے یادگاری پوسٹل ٹکٹوں کے بارے میں ادارہ شایع ہوا۔

اتوار۔ ۱۱ / ۔۔۔ ۱۱ بجے۔ جلوسِ سلطانی یومِ محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس ۔۔۔ ادارہ نواب زین یار جنگ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں اس تقریب سے متعلق کئی امور کا تصفیہ ہوا۔

● ۵ بجے۔ ایوانِ اردو میں ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی مجلسِ انتظامی کا اجلاس ڈاکٹر غلام یزدانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

منگل۔ ۲۰ / ۔۔۔ ۴/۱ ۵ بجے۔ پروفیسر خواجہ منیر الدین شاہد رکن ترقی اردو بورڈ کراچی کے خیر مقدم میں جناب جانکی پرشاد کی زیر صدارت ایک جلسہ ایوانِ اردو میں منعقد ہوا۔ جناب فرح لیغوری نے ممدوح کی خدمات اور سب رس اور ادارے اور سب رس سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کلماتِ خوش آمدید پڑھے۔ جناب احمد جلیس نے خیر مقدمی تقریر کی۔ محفلِ شعر و سخن میں حیدرآباد کے قدیم و جدید مکتبِ فکر کے پچیس شعرا نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر زور صاحب کے شکریہ پر رات کے آٹھ بجے یہ دلچسپ محفل اختتام کو پہونچی۔

تقریر عالیجناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریۂ ہند

میں نے آج ادارۂ ادبیات اردو کو دیکھ کر اور اس کے کاموں سے واقف ہو کر بڑی مسرت حاصل کی اس ادارے نے گذشتہ ۲۹ سالوں میں اردو کے لئے اچھے کام کئے ہیں۔

اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا لفظی خزانہ بہت ہی وسیع ہے اور ہمارے روزمرہ کے کاموں کیلئے بہت کافی ہے۔ پہلے جو کچھ ہوا ہوا۔ اب ہم کو چاہئیے کہ اردو اور ہندی دونوں کو زیادہ مشکل نہ بنائیں۔ اس طرح جو لوگ ایک زبان بولتے ہیں وہ دوسری زبان آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ ان میں البتہ حسب ضرورت سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی کے ایسے الفاظ لئے جاسکتے ہیں جو سائنس کی اصطلاحات کے لئے ضروری سمجھے۔

ہندوستان کی تمام زبانوں کو ترقی دینا ضروری ہے اور یہی حکومت کی پالیسی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو یقین ہے کہ اردو اور ہندی جدا نہیں ہیں۔ اگر ایک میں سے چند الفاظ نکال لیں اور چند دوسرے الفاظ شامل کردیں تو وہ ایک ہی زبان بن جاتی ہے۔ گرامر ہی سے کسی زبان کا تعین ہوتا ہے اور ان دونوں زبانوں کی گرامر ایک ہی ہے۔

میرا خیال ہے کہ الفاظ کی کثرت ہی سے جدید خیالات کے اظہار میں مدد ملے گی۔ ایک ہی لفظ اگر بہت سے معنی دیتا ہو تو کوئی بات نہیں کیونکہ انگریزی میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی ایک ہی ہیں۔ اس لئے ہونا یہ چاہیے کہ اردو اور ہندی میں ایک دوسرے کے الفاظ زیادہ سے زیادہ رائج ہوں۔

میری خواہش ہے کہ اردو خوب پھلے پھولے۔ میرا خیال ہے کہ کسی ایک زبان کی خدمت تمام دوسری زبانوں کی خدمت ہے۔ اگر ایک زبان ترقی کرے گی تو اس سے دوسری زبانوں کی ترقی میں مدد ملے گی۔ اس لئے جب کبھی میں مختلف زبانوں کے خطوں میں جاتا ہوں تو ایک زبان کو زبردستی دوسری زبان پر مسلط کرنے سے روکتا ہوں۔ لوگوں کو چاہیئے کہ زبان کے تعلق سے وسیع خیالات رکھیں۔ ہندی کو چونکہ کل ہند زبان تسلیم کیا گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں جاذبیت پیدا کی جائے۔

ہندوستان مختلف زبانوں کا ملک ہے۔ نہ صرف زبانوں کا بلکہ اس کے طور طریق اور رسم و رواج بھی مختلف ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک ملک ہے۔ گو قدیم زمانے میں ہندوستان مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا لیکن وہ آج ایک متحدہ مملکت ہے

ہندوستان کنیاکماری سے لے کر ہمالیہ تک ایک ہے اور خدا کا ایک انمول عطیہ ہے جس کی حفاظت نوجوانوں پر عائد ہوتی ہے تمام دنیا کی نظریں ہمارے ملک پر لگی ہوئی ہیں اس لئے ہمیں چاہیئے کہ متحد و متفق رہیں۔

بارانی کرن ریڈی نے جو ایک تخمینی ادارے کو عطا کیا ہے میں اس پر مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ کرن ریڈی کے بھائی راجندر ریڈی ہی نے پوچم پلی میں عطیہ دے کر بھودان تحریک کی ابتدا کی تھی۔

تقریب تہنیت

شری اے کالیشور راؤ اسپیکر آندھرا پردیش

مجلس دستور ساز اسمبلی کی سالگرہ۔

(ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ نے ۲۴ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء کو پدما بھوشن اے۔ کالیشور راؤ صاحب اسپیکر آندھرا پردیش اسمبلی کی (۸۰) سالہ سالگرہ کی تقریب میں ادارہ اور اہل اردو کی طرف سے یہ تقریر کی۔)

حضرات و خواتین!

آج ہم سب آندھرا پردیش کے ایک برگزیدہ بزرگ جناب اے۔ کالیشور راؤ صاحب کا (۸۰) سالہ جشن حیات منانے جمع ہوئے ہیں۔ یہ جلسہ حیدرآباد کی اردو انجمنوں انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیات اردو اور اردو مجلس کی طرف سے منعقد ہو رہا ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ آندھرا کی اردو دنیا بھی کالیشور راؤ صاحب کو کتنا عزیز رکھتی ہے اور ان کی ذات کو عہد حاضر میں منتنات سے دیکھتی ہے۔

کالیشور راؤ صاحب کی ملکی خدمات ... ... کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے لئے انھوں نے کیسے ایثار کئے اور کس طرح گزشتہ (۶۰) سال سے وہ اس ملک کی ہمہ جہتی ترقی میں تن، من، دھن سے منہمک ہیں۔ ملک کی حکمران جماعت کانگریس میں وہ غالباً سب سے زیادہ معمر ہیں اور گاندھی جی کے خاص رفقائے کار میں سے ہیں اور اپنی فراخدلی، اصول پسندی، علم و فضل اور محنت و جستجو کے لحاظ سے بھی شاید ہی کوئی اور موجودہ لیڈر ان پر بازی لے جاسکتا ہے۔

آندھرا پردیش کے قیام سے قبل ہی وہ کئی بار حیدرآباد آچکے ہیں اور اہل حیدرآباد اور خاص کر یہاں کی اردو دنیا کو معلوم ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں اپنی تقریروں میں جو وعدے کئے تھے ان کو پورا کرنے کی اپنی حد تک پوری کوشش کی ہے۔

حالانکہ عام طور پر سیاست داں لوگ وعدہ کرکے اکثر بھول جایا کرتے ہیں مگر شری اے۔ کالیشور راؤ نے اپنی بات کی لاج رکھی۔ اور آج تک کوشاں ہیں کہ آندھرا پردیش میں مختلف مذہبوں کے ماننے والوں اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان اتحاد واتفاق قائم رہے اور ان میں سے کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ جتنے سیاستداں ہیں اس سے زیادہ ایک ادیب اور مورخ اور انسان بھی ہیں۔ انھوں نے جو کتابیں لکھی اور شائع کی ہیں ان میں ان کے علم وفضل اور انسان دوستی کے جوہر نمایاں ہیں اور ضرورت ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ ہندستان کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے ترجمے شائع ہوں۔

ہم اہل اردو بطور خاص ان کے عقیدت مند ہیں۔ انھوں نے اسمبلی کے اندر اور باہر بھی ہر وقت اردو کے ساتھ انصاف کیا اور اس کے حق کو تسلیم کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ پورے ہندوستان میں یہی ایک پردیش ایسا ہے جہاں سرکاری طور پر اردو کو ایک علاقائی زبان قرار دیا گیا ہے۔ یہی ایک شہر ایسا ہے جہاں اردو، تلگو، ہندی اور مرہٹی کے ادیب اور شاعر اور ادارے مل جل کر کام کرتے اور اپنی تقریبات مناتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں کی ساہتیہ اکاڈمی تلگو کتابوں کے ساتھ اردو کتابیں بھی شائع کرتی اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو انعامات تقسیم کرتی ہے کیونکہ اردو یہاں کی سب سے زیادہ بولی جانے والی علاقائی زبان ہے۔ شری کالیشور راؤ جیسے دیانت دار، انصاف پسند اور باعمل اصحاب کی ہم میں موجودگی کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ ہمیں خالی خولی وعدوں یا ایسی سرکاری کمیٹیوں سے بہلایا نہیں جا سکتا جنھیں پورا کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ ہم لوگ عمل کے قائل ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی صاف اور صریح عمل کی ایک تازہ مثال یہ ہے کہ شری کالیشور راؤ نے اپنی تلگو اکاڈمی کا نام اور دائرہ عمل بدل دیا اور اس کو اب تلگو اردو اکاڈمی آف سائنس اینڈ ہسٹری قرار دے کر اہل اردو کو بھی اسے اپنے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیا۔

شری کالیشور راؤ ـــــ ہم سب آپ کو اس سالگرہ کی دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں دعا کرتے ہیں کہ آپ اسی طرح متعدد سالگرہیں منائیں اور اپنے ذاتی اثر سے اردو والوں کی باقی گتھیاں بھی سلجھا سکیں۔ ملازمتوں میں ان کو ان کا واجبی حق دلا سکیں اور ان کے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم پانے کی پورے آندھرا پردیش میں عملی سہولتیں بہم پہنچا سکیں۔ آپ خوش وخرم رہیں اور اپنے حوصلے اور اصولوں کے مطابق کامران اور شادماں زندگی بسر کریں۔

جمہوریہ ہند کے چیف جسٹس کا ایوانِ اردو میں خیر مقدم

ہندوستان کے چیف جسٹس جناب سنہا صاحب نے بتاریخ یکم نومبر ۱۹۶۰ء شام میں ۵½ بجے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔ چونکہ ان کو شعر و سخن سے دلچسپی ہے اس لئے اس موقع پر "ایوانِ اردو" میں ایک محفلِ شعر و سخن بھی ترتیب دی گئی تھی جس میں حیدرآباد کے مشاہیر شعراء اور پاکستان کے مہمان شاعر نظر حیدرآبادی نے اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر زور معتمد اعزازی ادارہ نے جو خیر مقدمی تقریر کی اس کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔

عالی جناب چیف جسٹس صاحب جمہوریہ ہند ــــ خواتین و حضرات!

آج ہم اس ایوانِ اردو میں ہندوستان کی ایک ایسی رفیع المرتبت ہستی کے خیر مقدم کیلئے جمع ہوئے ہیں جس کو ہمارے وطن کے انصاف و قانون کی پاسبان ہونے کا شرف حاصل ہے اور جو ایشیاء کی ایک ایسی عظیم جمہوریہ کے محکمہ عدالت کی افسرِ اعلیٰ ہے جس کا بے لاگ عدل و انصاف دس بارہ سال کے قلیل عرصے ہی میں مشہور ہوچکا ہے۔ ہمارے لئے یہی ایک فخر کافی تھا لیکن جب ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جناب والا کا مرزبوم ایک ایسا پربہار صوبہ ہے جو اردو ادب اور شعر و سخن کا عظیم الشان مرکز رہا ہے اور جہاں کے اساتذۂ سخن شاد اور راسخ وغیرہ اردو کی تاریخ میں اپنے غیر فانی نام چھوڑ گئے ہیں۔ اور جہاں اب بھی اردو کے بڑے بڑے محقق، ادیب اور شاعر موجود ہیں تو جناب کے خیر مقدم کے لئے ہمارے اشتیاق میں اور بھی اضافہ ہوا۔ پھر جب یہ بھی معلوم ہوا کہ خود جناب والا اردو اور فارسی میں مہارت اور دلچسپی رکھتے ہیں تو ہماری مسرت و امتنان کی کوئی انتہا نہ رہی۔ چنانچہ ہم آج انتہائی خلوص اور جذبۂ یگانگت کے ساتھ جناب کے خیر مقدم کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں اور جناب کی آمد کے اعزاز میں ایک محفلِ شعر و سخن بھی منعقد کر رہے ہیں۔

یہ ایوانِ اردو حیدرآباد کے ایک قدیم ادارے "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی گذشتہ تیس سالہ مصروفیات کا آئینہ دار ہے اور جناب نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ اس ادارے نے اردو زبان و ادب کی ترقی و تحفظ اور اردو بولنے والوں کی سماجی اور سیاسی زندگی اور ان کے آثار کے محفوظ کرنے میں اپنی حد تک پوری کوشش کی اور کر رہا ہے۔ دکن کی اردو خدمات کو اجاگر کرنے میں اس نے بڑا کام کیا ہے اور قدیم و جدید ادیبوں اور شاعروں کی (۲۷۰) کے قریب کتابیں شائع کی ہیں جو مختلف موضوعوں اور اصنافِ سخن پر مشتمل ہیں ۱۹۳۸ء میں اس کا ایک ماہوار ترجمان "سب رس" جاری کیا گیا تھا جو اب تک جاری ہے۔

سے ادارے نے اردو امتحانات کا سلسلہ شروع کیا جس کے پئے رفتہ رفتہ تقریباً ۵۵ پڑھائی گھر اور مرکز ریاست حیدرآباد اور اس کے ہمسایہ علاقوں میں قائم کئے گئے جن کی وجہ سے دور دور کے دیہات میں بھی ہزاروں نان و مرد خواندہ بن گئے اور سیکڑوں اصحاب اردو کے اعلیٰ ذوق سے بہرہ مند ہوئے۔

۱۹۴۴ء میں ادارے نے اردو انسائیکلوپیڈیا کی تیاری و ترتیب و اشاعت کا کام بھی شروع کیا تھا' جو انقلاب حیدرآباد کے بعد ۱۹۴۸ء میں رک گیا تھا مگر اس سال پھر اس کی جانب توجہ کی جا رہی ہے۔ ادارے کے کتب خانے میں تقریباً ۲۵ ہزار مطبوعات اور ۵ ہزار مخطوطات جمع ہو چکے ہیں جن کی توضیحی فہرستیں بھی چھپ رہی ہیں۔ چنانچہ اب تک مطبوعہ کتب کی دو اور مخطوطات کی توضیحی فہرستوں کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب اس کی چھٹی جلد کے علاوہ "نوادر ایوان اردو" کی پہلی جلد بھی زیر طبع ہے جس میں ان نوادرات ادب و تاریخ کی تفصیلات درج ہیں جو اس ایوان کے میوزیم اور تصویر گیلری میں محفوظ ہیں۔

اسی ایوان میں ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی عارضی طور پر کام کر رہا ہے اور ہمارا یہ مہمان انسٹی ٹیوٹ مولانائے مرحوم کی یاد اور ان کے خیالات کو زندہ رکھنے میں منہمک ہے۔ اس کے تحت مشرقی علوم و فنون پر تحقیقی کام ہو رہا ہے اور ایسی تالیفات و تصنیفات مرتب اور شائع کی جا رہی ہیں جو ہندوستان کی سالمیت اور ہندوستانی کلچر کی بقا کے لئے مولانا آزاد کا مطمح نظر تھے۔

جناب والا نے ہمارے اس ایوان اردو میں تشریف فرما ہو کر ہماری جو عزت افزائی فرمائی ہے اس کے لئے ہم جناب کے اور چیف جسٹس صاحب آندھرا پردیش ہائی کورٹ کے شکر گزار ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے ملاحظہ سے اور حیدرآباد کے چند شعرائے کرام کا کلام سن کر جناب والا ضرور محظوظ ہوں گے۔

"اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی"

سید محی الدین قادری زور

بقیہ سلسلہ صہ ۲۴

جناب راحت علی بیگ ظفر نوحی بریلوی (ڈی۔ اے۔ وی کالج ہوسٹل لاہور) کو زیر ترتیب منشی تذکرے کے بارے میں مہاراجہ سر کشن پرشاد کی حیات اور شاعری کے متعلق استفسارات کا جواب بھیجا گیا۔

جناب محمد مسعود (ایم۔ اے۔ حیدرآباد سندھ) کو ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے "اردو میں قرآنی تراجم اور تفاسیر" کے زیر عنوان معلومات بھجوائی گئیں۔

جناب منظر نقوی لکچرار شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کو ان کے پی ایچ ڈی کے موضوع - وحید الدین سلیم کے ادبی کارنامے اور خدمات - کے تعلق سے مولوی سلیم مرحوم کے محررہ خطوط کی نقلیں اور دیگر مشورے دیئے۔

ادارے کی چند اور تقریبیں

جلسۂ تعزیت حضرت جگر مراد آبادی

۱۰ ستمبر شام کے پانچ بجے ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی صدارت میں کارکنان ادارۂ ادبیات اردو اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایوان اردو کے آڈیٹوریم میں حضرت جگر کی وفات پر ایک جلسۂ تعزیت ہوا جس میں ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی، صادق حسین نقشبندی، مولوی میر سراج الدین علی خاں اور رکارڈ آفس کے علم دوست حضرات اور آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔ ڈاکٹر زور نے حضرت جگر کی خدمات اور شخصیت پر ایک تقریر کی۔ صدر جلسہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی نے حسب ذیل قرارداد عقیدت پیش کی۔ دو منٹ تک استادہ ہوکر اظہار احترام و دعا کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

"کارکنان ادارۂ ادبیات اردو کا یہ اجتماع ملک کے منفرد غزل گو شاعر کی اچانک موت پر اپنے دلی حزن و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ اردو زبان کے اس دور میں حضرت جگر کی رحلت سے اردو ادب ایک عظیم الشان شاعر محسن اور سرچشمہ قوت سے محروم ہو گیا۔ یہ اجتماع اس غیر معمولی سانحہ پر مرحوم کے پس ماندگان سے گہرے تعلق خاطر کا اظہار کرتے ہوئے دست بدعا ہے کہ مرحوم کی کمی محسوس کرنے والے دلوں کو صبر جمیل اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ ملے ——— آمین۔

اورنگ آباد کے شاعر قاضی سلیم کی خیر مقدمی محفل شعر و سخن

۱۰ ستمبر کو ایوان اردو، ادارۂ ادبیات اردو میں کل شام کے چھ بجے ایک نمائندہ محفل شعر و سخن میں اورنگ آباد کے مشہور شاعر قاضی سلیم کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ وزیر سماجی خدمات آندھرا پردیش نے کی۔ آپ نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ فرما کر خوشنودی کا اظہار کیا۔ محفل شعر کے آغاز سے قبل مسز فیروز گاندھی کے انتقال پر دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔ ڈاکٹر زور صاحب معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں محترمہ معصومہ بیگم کی خدمات کی ستائش کی اور ان کے شوہر پروفیسر حسین علی خاں مرحوم کی ادارہ سے وابستگی اور اعانتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ رہیں کہ ہم آج اردو کا اس قدر شاندار ایوان بنا سکے۔ آخر میں آپ نے حیدرآباد کی قدیم روایات کے مطابق نوجوان شاعر قاضی سلیم صاحب کے خیر مقدم میں منعقدہ اس محفل شعر کے کامیاب اختتام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ کی طرف سے کوشش کی جائے گی کہ اس طرح کے شائستہ اور سنجیدہ مشاعرے ایوان اردو میں منعقد ہوتے رہیں۔ اس محفل شعر میں چوبیس شعراء نے اپنا کلام سنایا جن میں علامہ حیرت، انور معظم، قاضی سلیم، اوج یعقوبی، وحید اختر، ابن احمد تاب، راشد سید، راز جذب، اسد انصاری، بزمی، نیر، بانو طاہرہ سعیدہ اور وقار خلیل قابل ذکر ہیں۔ ۱/۲ ۸ بجے شب ایوان اردو کے سجے سجائے آڈیٹوریم میں یہ دلچسپ اور یادگاری نوعیت کی محفل شعر و سخن اختتام کو پہنچی۔

شہزادہ مکرم جاہ اور شہزادی برجن اسری ایوانِ اردو میں

۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو شام کے ۴½ بجے پرنس مکرم جاہ بہادر اور شہزادی برجن اسری نے ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر ادارے کی طرف سے ایک خیر مقدمی تقریب منعقد کی گئی تھی جس میں ادارہ کے جملہ ارباب کار اور حیدرآباد کے مشاہیرِ علم و ادب شریک تھے۔

شہزادہ اور شہزادی نے تقریباً آدھے گھنٹے تک ایوان اردو کے تمام شعبہ جات کا معائنہ کیا۔ صدر ادارہ نواب زین یار جنگ بہادر اور معتمد اعزازی ڈاکٹر زور نے ادارہ کی مصروفیات سے ان کو واقف کرایا۔ جس کے بعد ایوانِ اردو کے آڈیٹوریم میں شہزادہ اور شہزادی کو نواب زین یار جنگ بہادر نے پھول پہنائے اور ڈاکٹر زور نے ایک خیر مقدمی تقریر کی۔ جس میں شہزادہ کے آبا و اجداد کی اردو خدمات اور دکن کی قطب شاہی تہذیب و تمدن کی روایات کی حفاظت کا ذکر کیا۔ اور توقع ظاہر کی کہ شہزادہ مکرم جاہ دکن کی ان قدیم روایاتِ شائستگی کو نہ صرف برقرار رکھیں گے بلکہ یورپی تہذیب و تربیت سے فائدہ اٹھا کر اس میں خوشگوار اضافہ کریں گے۔

شہزادہ مکرم جاہ نے جوابی تقریر میں اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ وہ اردو میں شائستہ طریقے پر تقریر کرنے کے ابھی قابل نہیں ہوئے ہیں اس لئے انگریزی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے پر معذرت چاہی۔ انہوں نے کہا کہ "ادارۂ ادبیات اردو، اردو کی بقاء اور اردو بولنے والوں کی تاریخ کی حفاظت کا جو کام انجام دے رہا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس زبان کی تاریخ اور اس کی بقاء کے لئے اسی طرح کام کرنا ضروری ہے تاکہ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں۔ اور اردو زبان پھلے پھولے اور ترقی کرے۔"

اوج یعقوبی صاحب نے شہزادہ مکرم جاہ کی آمدِ ادارہ پر ایک فی البدیہہ نظم سنائی۔ آخر میں نواب زین یار جنگ بہادر نے شہزادہ کی طرف سے اعلان کیا کہ اردو سے متعلق اور دکن کی تاریخ پر تحقیقی کام کرانے کے لئے شہزادہ نے نظام چیریٹی ٹرسٹ فنڈ کی طرف سے دس ہزار روپئے کے عطیہ کا اعلان کرنے کی خواہش کی ہے۔

ادارے کے تحقیقاتی وظائف

حضور نظام کے چیریٹی ٹرسٹ فنڈ سے ادارۂ ادبیات اردو نے حسب ذیل موضوعوں پر تحقیقاتی کام کرنے کے لئے ۱۰۰ روپے ماہانہ کے چھ وظائف جاری کئے ہیں۔

(۱) گولکنڈہ کا تاریخی جغرافیہ (۲) حیدرآباد کی عبادت گاہیں (ہندو، جین، سکھ، پارسی، اسلامی) (۳) حیدرآباد کی ثقافتی تاریخ (۴) محمد قلی قطب شاہ کا لفظی خزانہ (۵) حیدرآباد کے صوفیائے کرام اور ان کی درگاہیں۔ (۶) تذکرۂ اردوئے دکن (حیدرآباد کے ان شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ جو باہر سے آکر حیدرآباد میں مقیم ہو گئے)

ان موضوعوں پر علی الترتیب حسب ذیل خواتین و حضرات۔ باضابطہ قواعد و ضوابط کے تحت تحقیقاتی کام سر انجام دے رہے ہیں

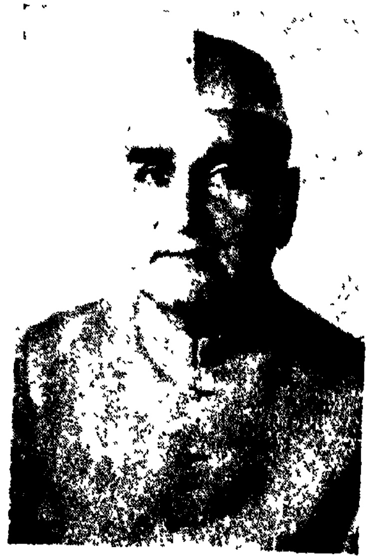
۱۔ مس لیاقت بیگم (ایم۔ اے)
۲۔ مسٹر راجندر ریڈی (بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)
۳۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
۴۔ مس طاہرہ نقی (ایم۔ اے، ایم۔ ایڈ)
۵۔ مولوی مراد علی صاحب طالع
۶۔ مولانا تمکین کاظمی صاحب



شہزادہ مکرم جاہ اور شہزادی اسریٰ رحمن ادارے کے میوزیم میں



ادارے کے دارالمطالعہ کی میز پر



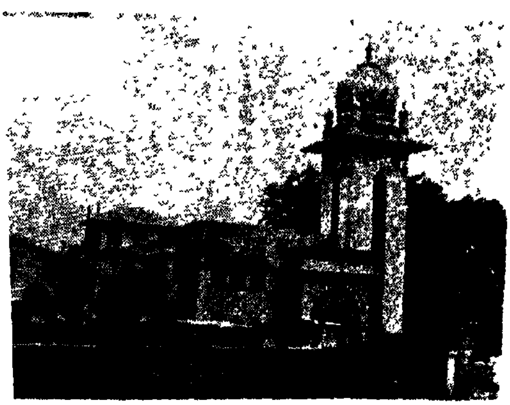
شری بھیم سین سچر، گورنر آندھرا پردیش
نے ایوان اردو کے افتتاحی تقریب کی
صدارت کی



نواب زین یار جنگ بہادر، صدر
ادارۂ ادبیات اردو جن کے مساعی سے
ایوان اردو تعمیر ہوا



ڈاکٹر زور، معتمد عمومی ادارہ جن کی
شبانہ روز نگرانی اور دلچسپی سے
ایوان اردو تعمیر ہوا



« ایوان اردو » کا شمالی روکار

مجلسِ اشاعتِ تاریخ و تمدنِ دکن

یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں اس کی مجلس انتظامی منعقدہ ۲ جنوری ۱۹۶۰ء میں نواب عنایت جنگ بہادر کی تحریک پر طے پایا کہ ادبیاتِ عہد قطب شاہی کی اشاعت کے لیے ایک مستقل کمیٹی بنادی جائے جس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں:-

۱۔ دورِ قطب شاہی سے متعلق کتابیں اور کاغذات اور وثائق کسی زبان میں بھی شائع کرنا۔

۲۔ تاریخ و تمدنِ دکن سے متعلق ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے تقریروں، نمائشوں اور جلسوں کا انعقاد اور ان کی روئیدادوں اور تقریروں کو رسالوں یا مجموعوں کی شکل میں شائع کرنا۔

۳۔ مجلس انتظامی یوم محمد قلی قطب شاہ کے صدر و معتمد ہی اس مجلس کے صدر و معتمد رہیں گے۔

۴۔ اس کی مجلس انتظامی فی الحال حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہوگی اور اس میں حسب ضرورت اضافہ کیا جائے گا۔

(۱) نواب زین یار جنگ بہادر　(۲) نواب عنایت جنگ بہادر　(۳) مولانا سید علی اصغر بلگرامی صاحب
(۴) پروفیسر محمد عبدالحق صاحب　(۵) مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب　(۶) نواب طاہر علی خاں صاحب
(۷) آغا صمصام شیرازی صاحب　(۸) آغا حسین ضابط صاحب　(۹) مولوی سراج الدین علی خاں صاحب
(۱۰) پروفیسر ایم۔ اے رحمٰن　(۱۱) ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ صاحب　(۱۲) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — معتمد

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مجلسِ انتظامی منعقدہ ۷ فروری ۱۹۶۰ء میں ادارے کے تحت اس مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن کے قیام اور اس کے کاموں کے آغاز کی اجازت دی گئی جس کے بعد سے اس مجلس کے کاموں کا آغاز کیا گیا اور حسب ذیل اصحاب سے خواہش کی گئی کہ وہ عہد قطب شاہی سے متعلق مختلف موضوعوں پر تحقیقی اور معلوماتی مضامین مرتب کریں۔

(۱) ڈاکٹر وینکٹ اودھانی ریڈر تلگو عثمانیہ یونیورسٹی　—　قطب شاہوں کی تلگو خدمات
(۲) مولوی دلدار حسین صاحب انجینیر　—　گولکنڈے کی عظمت
(۳) مسٹر محمد ابراہیم صاحب انجینیر　—　قطب شاہوں کی آب رسانی
(۴) مسٹر شاہ منظور عالم صاحب　—　مسولی پٹم قطب شاہی بندرگاہ

خوشی کی بات ہے کہ یہ سب مضمون تیار کیے گئے اور اب تک ادارے کے انگریزی اور تلگو سوغات میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی تقریروں کی تیاری کا سلسلہ بھی جاری ہے جن میں سے پہلی تقریر ڈسمبر ۱۹۶۰ء کو شام لال صاحب نے گولکنڈے کے ہیروں پر کی۔ اس کی افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر زور صاحب نے توقع ظاہر کی کہ انجینیر دلدار حسین صاحب، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب اور پروفیسر ایم اے رحمٰن کی تقریریں یوم محمد قلی ۱۹۶۱ء کے سلسلے میں ہو سکیں گی۔

قطب شاہی تاریخوں کی ایڈیٹنگ اور اشاعت کے سلسلے میں ایسی دو تاریخوں کی ترتیب و تدوین مکمل ہو رہی ہے۔ حدیقۃ السلاطین از نظام الدین احمد شیرازی مرتبہ علامہ علی اصغر بلگرامی اور حدائق السلاطین از علی ابن طیفور بسطامی مرتبہ ڈاکٹر سید شریف النساء انصاری۔ ان میں پہلی تاریخ ۱۹۶۱ء میں چھپ کر شائع بھی ہو سکے گی۔

علمی و ادبی و کلچرل تعاون

۱۹۶۰ء

ادارے کی ڈائری سے

جناب محمد طفیل ایڈیٹر نقوش لاہور اور جناب ڈائیرکٹر ایس
علی معتمد ادارہ مرکز طلوع علم و ادب چٹاگانگ (مشرقی پاکستان)
کو علی الترتیب فصاحت جنگ جلیل مرحوم اور دکن کے ممتاز
ادیبوں اور شاعروں کے تعلق سے استفسارات کا جواب دیا گیا اور
مزید معلومات تحریر کی گئیں۔

●

جناب محمد معروف (صدر بازار گلی ستارام راولپنڈی پاک)
کو فصاحت جنگ جلیل کی حیات اور تصانیف کے بارے میں
استفسارات کا جواب بھجوایا گیا۔

●

جناب سید محمد قادری ایڈیٹر ماہنامہ شہباز گلبرگہ نے ادارے
سے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور رسالوں کے پتوں کی فہرست
حاصل کی۔

●

تذکرۂ مخطوطات جلد پنجم کی ایک ایک جلد ملک کے
ممتاز اہلِ قلم حضرات اور کتب خانوں اور رسالوں کو برائے تبصرہ
و اظہار رائے ارسال کی گئی۔

●

جناب نظر حیدرآبادی (حیدرآباد کالونی۔ کراچی) کو حیدرآباد
کی ادبی و تہذیبی تاریخ کے تعلق سے ادارے کی مطبوعات تحفۃً ارسال
کی گئیں اور ان کے استفسارات کا جواب دیا گیا۔

●

جناب خورشید احسن صدیقی (صفیہ منزل میور روڈ۔ کراچی)
اور جناب شعیب راہی (پٹنہ کالج) کو علی الترتیب "شبلی کی اردو
شاعری" اور "خواجہ حیدر علی آتش" کے تعلق سے مطلوبہ معلومات
ارسال کی گئیں۔

●

پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی (سندھ یونیورسٹی حیدرآباد پاک)
کو "شبلی کا ذہنی ارتقاء" کے موضوع سے متعلق ادارہ کے کتب خانہ
سے معلومات تحریر کی گئیں

●

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (شعبۂ اردو ایونگ کالج دہلی یونیورسٹی)
کو طوطی نامہ غواصی کے بارے میں معلومات تحریر کی گئیں۔

●

پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن (پٹنہ کالج) کو راسخ عظیم آبادی کے
تلامذہ کے باب میں استفسارات کا جواب تحریر کیا گیا۔

●

جناب ظہیر کشمیری (راولپنڈی پاکستان) کو اردو صحافت سے
متعلق استفسارات کا جواب بھجوایا گیا۔

●

جناب جنس راج رتن ایم اے (ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی)
کو "آندھرا میں اردو" کے تعلق سے رہنمائی کی گئی۔

●

جناب شاہ منظور عالم لکچرار جغرافیہ جامعہ عثمانیہ نے ایوان
اردو میں نصب شدہ حیدرآباد کے نقشے (۱۱۸۷ھ) کے بعض حصوں

کی نقلیں حاصل کیں۔

•

جناب سید محمد فضل اللہ پرنسپل گورنمنٹ آرٹس کالج اوٹاکمنڈ (میسور) کو قاضی بدرالدولہ کی تصانیف اور اردو کے سب سے پہلے حج کے بارے میں تفصیلی معلومات بھجوائی گئیں۔

•

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی یونیورسٹی دہلی) کو تذکرہ یادگار ضیغم (مخطوطہ) سے مطلوبہ معلومات نقل کر کے بھجوائی گئیں۔

•

جناب ظہیر کنجاہی (راولپنڈی پاکستان) کو حیات خسرواز شبلی نعمانی سے متعلق تفصیلات تحریر کی گئیں۔

•

اقبال اکیڈمی کی طرف سے منعقدہ یوم اقبال کے سلسلے کی نمائش اقبالیات کے لئے اکیڈمی کی درخواست پر اقبال کی اصل تحریریں، مکاتب اور اقبال پر لکھی گئی کتابوں اور رسائل کے خاص نمبر دیئے گئے۔

•

سردار دلیپ سنگھ صاحب ایڈوکیٹ (اورنگ آباد) کو ان کی صاحبزادی مس اندرا کولہار، اے کیلئے " عہد نظام شاہی " پر لکھے جانے والے مقالے کے سلسلے میں مطلوبہ استفسارات بھجوائے گئے۔

•

جناب عبدالاحد لکچرار اردو اننتاپور (اے، پی) کو پی ایچ ڈی کے سلسلے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

•

جناب سید امتیاز علی صاحب صدر مجلس ترقی ادب (۲، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ لاہور) کو اردو کی ۲۵ کلاسیکل کتابوں کی اشاعت کے بارے میں معلومات ارسال کی گئیں۔

•

جناب خواجہ محمد حامد (۵، اطہاری ٹاؤن، ناگپور) کو دکنی اردو لغت اور تاریخ گوئی کی کتاب "غرائب الجمل" کے بارے میں مطلوبہ استفسارات کا جواب دیا گیا۔

پروفیسر ا۔ د۔ ارشد (اسلامک کالج لاہور) اور جناب ہربنس لال نانگ (دہلی) کو علی "التر تیب" فیضی کی شخصیت اور تصانیف (مقالہ پی، ایچ، ڈی) اور "عہد وجہی کی سوشیل اور کلچرل خصوصیات" کے بارے میں استفسار کا جواب دیا گیا۔

•

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی (لکچرار حمیدیہ کالج بھوپال) کو ان کے ڈی لٹ کے مقالہ "اردو شاعری میں سماجی وسیاسی شعور" کے موضوع پر استفسارات کا جواب بھیجا گیا۔

•

جناب علی بن عمر آرٹسٹ نے ایوان اردو کے میوزیم سے عظیم بیگ چغتائی اور قاضی عبدالغفار کی تصویروں کے اسکیچس حاصل کئے۔

•

مسٹری چندر بھوشن سنگھ (تلک دھاری انٹر کالج جونپور) کو پریم چند کی تصانیف اور دیگر موضوعات پر استفسار کے جواب بھیجے گئے۔

•

آندھرا پردیش تلگو بھاشا سمیتی کے شعبۂ انسائیکلو پیڈیا کی خواہش پر اردو کا ممتاز خاتون قلمکاروں کے بارے میں مواد بھیجا گیا

•

ہندی کے مشہور شاعر اور ناٹک رام بھگوانداس سائنس کالج کے پرنسپال پنڈت ونشی دھر ودیالنکار کی ساٹھ سالہ جوبلی کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے تعاون کیا گیا۔ اور گلپوشی کی گئی۔

•

ڈاکٹر اسلام سندیلوی صدر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی کو حیات قلی خاں حسرت کے بارے میں علمی استفسارات کا جواب بھجوایا گیا۔

•

جناب مراد علی صاحب طالع کو امرائی وظیفہ کیلئے ادارہ کی طرف سے وزارت تعلیم امور حکومت ہند کو سفارش کی گئی۔

•

علامہ حیرت بدایونی کو امرائی وظیفہ کے لئے ادارہ کی طرف سے ساہتیہ اکیڈیمی دہلی کو توجہ دلائی گئی۔

جناب صباح الدین علی ایم اے ریسرچ اسکالر لکھنؤ کو "اردو ادب میں تلمیحات" کے موضوع پر استفسارات کے جوابات بھجوائے گئے۔

●

پنڈت راگھو بیندر راؤ جذب عالپوری کو ساہتیہ اکیڈیمی کے ادبی وظیفہ کے بارے میں ادارے کی طرف سے سفارش کی گئی۔ اور اکتوبر سے ان ہیں ادبی وظیفہ کے اجرا ہونے کی اطلاع دی گئی۔

●

جناب ڈاکٹر انعام احسن (۱۰۹ آرام باغ روڈ۔ کراچی) کو حضرت احسن مارہروی کے نوشتہ خطوط جو ادارہ کے میوزیم میں فریم کئے ہوئے ہیں ان کی نقلیں ارسال کی گئیں۔

●

جناب اعزاز نقوی (لاہور) کو پی ایچ ڈی کے مقالہ "رتن ناتھ سرشار بحیثیت ناول نگار" کے موضوع پر چند استفسارات کا جواب تحریر کیا گیا۔

●

جناب منظر نقوی (شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو اُن کے پی ایچ ڈی کے موضوع "وحیدالدین سلیم کی حیات اور کارناموں" کے سلسلے میں رہنمائی کی گئی۔

●

جناب حکیم ولیانے وتہی کی امداد کے لئے ادارہ کی طرف سے وزارت سائنسی تحقیقات و ثقافتی امور حکومت ہند (دہلی) کو توجہ دلائی گئی۔

●

ملک محمد علی خاں صاحب اپل کلاں کو اُن کے والد جناب محبوب علی محبوب کی امداد کے بارے میں مشورے دیئے گئے۔

●

عثمانیہ یونیورسٹی اسوسی ایشن کی سالانہ کانفرنس کے سلسلے میں منعقدہ کتابوں کی نمائش کے لئے ادارہ کی طرف سے حیدرآباد کے ادیبوں کی تصویریں دی گئیں۔

●

جناب محمد جمال شریف صاحب (ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی درخواست پر ادارہ کی مطبوعات تذکرۂ مخطوطات کی چار جلدیں تحفتہً دی گئیں۔

●

جناب مرتق موسوی کو تذکرہ مخطوطات جلد چہارم ادارہ کی طرف سے دی گئی۔ کیونکہ اس میں ان کے عطیہ مخطوطات کا ذکر ہے۔

●

سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل حیدرآباد کی درخواست پر قیدیوں کی تعلیم کے لئے ادارہ کی مطبوعات اردو دانی حصۂ اول ۱۵ عدد اور اردو دانی حصۂ دوم ۲۰ عدد تحفتہً دیئے گئے۔

●

جناب فضل احمد (ریسرچ اسکالر ڈھاکہ یونیورسٹی) کو "مرزا محمد ہادی رسوا" کے بارے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

●

جناب سید زوار حسین زیدی (ناشر غالب بکڈپو لاہور) کو مصنفینِ اردو کے بارے میں معلومات بھجوائی گئیں۔

●

اردو مجلس حیدرآباد کی طرف سے منعقدہ اخبارات و رسائل کی نمائش کے لئے ادارہ کے کتب خانہ سے قدیم رسائل اور اخبارات کی جلدیں دی گئیں اور ادارے کے کتب خانہ کے معتمد پروفیسر محمد اکبرالدین صاحب صدیقی اور زما خلیل صاحب نے اس موقع پر نمائش میں ادارہ کی نمائندگی کی۔

●

اردو کالج کی طرف سے منعقدہ "یوم حالی" کے لئے ادارہ کی طرف سے بطور تعاون ایک رقمی عطیہ دیا گیا۔

●

جناب کل بھوشن جین (ایم اے ریسرچ اسکالر پٹنہ یونیورسٹی ڈالمیا نگر بہار) کو دکنی ادب کے بارے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

●

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۰)

اردو امتحانات

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں دو بار امتحانات لئے گئے۔ پہلی بار ۱۹ جون ۱۹۶۰ء کو حیدرآباد اور نرل کے مراکز ذکور و اناث میں ایک ساتھ اردو دانی اور زباندانی کے امتحانات اور ماہ ڈسمبر ۱۹۶۰ء میں اردو دانی۔ زباندانی۔ اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات منعقد ہوئے۔ اسی سال ڈسمبر کے امتحانات میں بلدہ اور نرل کے علاوہ سنٹرل جیل حیدرآباد میں بھی مرکز قائم کیا گیا تھا۔ اگرچہ جیل کا مرکز پہلی مرتبہ قائم ہوا لیکن اس کے نتائج بہت اچھے رہے۔ ادارے کی طرف سے جیل کے پڑھائی کے گھر کو اردو دانی کی کتابیں بلاقیمت دی گئی تھیں اور امیدواروں سے فیس شرکت نہیں لی گئی تھی۔

ادارے کی جانب سے تین پڑھائی گھروں کو ماہانہ پندرہ روپے کی امداد بھی دوران سال جاری رہی۔

جن امیدواروں نے ان امتحانات میں کامیابی حاصل کی ان کے نتائج حسب ذیل ہیں۔

نتائج امتحانات اردو دانی و اردو زباندانی منعقدہ ۱۹ جون ۱۹۶۰ء

اردو دانی (مرکز نرل اناث)

رول نمبر — نام

- ۵ ساجدہ بیگم (کامیاب امتیاز)
- ۸ اختر جہاں "

کامیاب۔

- ۱ ابرالنساء بیگم
- ۲ سنجیدہ سلطانہ
- ۳ اقبال ثریا
- ۴ فہمیدہ شمیم
- ۶ نجمہ سلطانہ
- ۷ سعیدہ بیگم

(مرکز نرل ذکور)

- ۱۴ محمد عبدالقادر (امتیاز)

کامیاب۔

- ۱۲ محمد عبدالرفیق
- ۱۳ ظہیرالدین بابر
- ۱۵ ماہر احمد
- ۱۶ سید اسدالرحمن

(مرکز بلدہ ذکور)

- ۱۸ محمد حبیب علی (امتیاز)
- ۱۹ خواجہ علی "
- ۲۵ محمد قاسم "
- ۲۷ غلام مصطفیٰ "
- ۳۱ مرزا انوراللہ بیگ "

کامیاب۔

- ۱۷ اے کے بھاشیم
- ۲۱ این ڈی ٹھل راؤ
- ۲۶ محمد یوسف
- ۲۸ مقبول احمد
- ۲۹ محمد خواجہ

(مرکز بلدہ اناث)

- ۳۶ سلطانہ بیگم (امتیاز)

کامیاب۔

- ۲۳ صابرہ سلطانہ
- ۲۴ محمودالنساء بیگم
- ۲۵ قیصرالنساء بیگم

اردو زباندانی

(مرکز نرل اناث)

- ۱ دردانہ نسیم (دوم)

(مرکز نرل ذکور)

- ۲ محمد عبدالمجید (سوم)
- ۳ سید انور حسین (دوم)
- ۴ سید [illegible] احمد (سوم)
- ۵ حبیب محمد "

(مرکز بلدہ ذکور)

- ۶ کے [illegible] (دوم)
- ۹ سید محی الدین (اول)

(مرکز بلدہ اناث)

- ۱۰ شمیم اختر (دوم)

نتائج امتحانات اُردو دانی، زباندانی، اردو عالم، اردو فاضل منعقدہ ۲۴، ۲۵، ۲۶ دسمبر ۱۹۶۰ء

اُردو دانی ۔

کامیاب بہ امتیاز ۔

۱ عبدالنساء بیگم
۳ عبدالنساء بیگم (ثانی)
۶ سید رشید
۹ سید یوسف

کامیاب ۔

۲ زیب سلطانہ
۸ محمد جمال الدین
۱۰ محمد عبدالحمید خاں
۱۱ محمد رفیع الدین
۱۲ محمد موسیٰ
۱۳ محمد انور حسن
۱۴ نعمت اللہ خاں
۱۹ ناگیا
۲۰ شیخ امام
۲۲ سنیالو
۲۶ جنے بہادر
۲۷ بی۔ ویرا ریڈی
۲۸ محبوب علی
۲۹ امتیاز الدین
۳۰ محمد ابراہیم
۳۱ حسن خاں
۳۳ عبدالحفیظ
۳۵ شنکریا
۳۹ نظام الدین

(مرکز بلدہ ذکور واناث)

کامیاب بہ امتیاز ۔

۴۰ سید الیاس الدین

(مرکز سنٹرل جیل)

کامیاب بہ امتیاز ۔

: حمزہ۔ یادگیری
۲۳ شن احمد
۲۵ ایشور بھگت
۲۷ احمد خاں
۴۸ سید علی الدین
۴۲ عبدالحمید

کامیاب ۔

۴۳ سید عنایت علی
۴۴ عباس بی
۴۵ انیسہ بی
۴۶ نیر النساء
۴۸ طاہرہ سلطانہ
۵۳ شبیر بی
۵۹ امام النساء عرف عارف
۶۱ حیدر بن محمد یمانی
۶۲ سید کلیم الدین

کامیاب ۔

۱۲ وینکٹ ریڈی
۱۷ رام کرشنا راؤ

اُردو زباندانی

(مرکز نرمل)

۱ سید توحید احمد حسینی (دوم)
۲ عبدالباسط (دوم)
۳ محمد ستان (دوم)
۴ محمد عبدالمجید (دوم)
۵ بدرالنساء بیگم (اول)

(بلدہ ذکور و اناث)

۹ ۔ اطہر النساء بیگم (دوم)
۱۰ کلیم النساء بیگم (دوم)
۱۱ سلطانہ بیگم (سوم)
۱۲ شمس النساء بیگم (دوم)
۱۳ این ۔ دی۔ مثل راؤ (سوم)
۱۴ محمد قاسم (سوم)
۱۵ غلام مصطفےٰ (دوم)
۱۶ محمد احسن الدین اقبال (اول)
۱۷ محمد یوسف (اول)
۹ ایم۔ اے۔ صدیقی (اول)
۱۵ محمد ریاست علی صدیقی آج (اول)

(مرکز نرمل ذکور واناث)

۷ سید امیر علی احسان (دوم)
۱۴ اپال نرسیا (سوم)

اُردو فاضل

(مرکز نرمل ذکور واناث)

۲ اے۔ راجیشور ریڈی (دوم)

(مرکز بلدہ ذکور واناث)

۶ سید وارث حسین (سوم)
۷ دسر تھ راج سکسینہ (اول)
۸ محمد ادریس صدیقی قرنی (اول)

اُردو عالم

(مرکز بلدہ ذکور واناث)

۳ محمد ہدایت اللہ (سوم)
۴ سید ممتاز علی (دوم)
۵ محمد فیض الحسن خیال (دوم)
۶ سکینہ بیگم (دوم)
۸ محمد معین الدین (اول)

ادارے کا ترجمان ماہنامہ سب رس

سب رس ۱۹۳۸ء سے جاری ہے اور خدا کے فضل سے اب تک پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور صاحب مرحوم اس کے نگرانِ اعلیٰ رہے۔ مجلسِ ادارت میں جناب جانکی پرشاد، جناب رمن راج سکسینہ، جناب نصیر الدین ہاشمی اور جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اسماء شریک تھے۔ ادارت کے فرائض جناب وقار خلیل گزشتہ دو سالوں (بیس برس) انجام دے رہے ہیں۔

سن ۱۹۶۰ء میں سب رس کے پورے بارہ شمارے شائع ہوئے۔ جن میں محمد قلی قطب شاہ نمبر "ادارہ نمبر" اور "ایوانِ اردو نمبر" بھی شامل ہیں۔ سال بھر میں سب رس کے مطبوعہ صفحات کی تعداد (۵۳۶) رہی۔ اس عرصہ میں مضامین، نظمیں، غزلیں، فارسی شعراء کی طرحی غزلیں، افسانے، ڈرامے، مشاہیر کے خطوط، رپورتاژ، فکاہیات، ہیومرزم، سب رنگ کے صفحات، اردو نامہ اور تبصرے بھی شامل ہیں۔

ذیل میں باب وار تعداد اور لکھنے والوں کے نام بلحاظ حروف تہجی پیش کئے جا رہے ہیں جن کے بھرپور تعاون سے سب رس نے ایک سال بحسن و خوبی زبان و ادب کی مقدور بھر خدمت انجام دی!

مضامین سب رس میں علمی و ادبی اور تہذیبی موضوعات پر محیط جملہ ۳۹ مضامین شائع ہوئے مضمون نگاروں کے نام مندرج ہیں۔ اعجاز نقوی، اکبر الدین صدیقی، حسین کاظمی، زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری، سلیم ترابی، شاہد، خواجہ حمید الدین۔ طالع، امداد علی، علی اصغر بلگرامی۔ علی عباس حسینی، غلام رسول۔ فاضل زیدی۔ قاضی عبدالودود۔ کرشنا سوامی ایم ایس، گوپال ریڈی، بی ڈاکٹر۔ مبارز الدین رفعت۔ مغنی تبسم۔ منظر نقوی۔ منظور احمد، محمد۔ نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند۔ نثار احمد فاروقی، نیاز فتح پوری، وحید اختر۔ وقار خلیل۔ یوسف احمد، محمد۔

نظمیں ۴۳ شائع ہوئیں جن میں درج ذیل شعرائے کرام کی تخلیقات شامل ہیں

آزاد، جگن ناتھ۔ امکان، سید احمد علی۔ اوج یعقوبی۔ بانو طاہرہ سعید۔ برق یوسفی۔ بقیۃ الصالحات، بیگم بشیر۔ جذاز شفقی تاب، ابن احمد۔ تاباں، شمس الدین۔ جامی، خورشید احمد۔ جاوید، سلیمان اطہر۔ جہاندار افسر۔ حامد ندیم۔ حید ہمی۔ دانش فرازی۔ رئیس امروہوی۔ سراج حیدر آبادی۔ سراج منیر۔ سروش عسکری طباطبائی، سیدہ حفیظ۔ عزیز تمنائی۔ عظمت عبدالقیوم علی جواد زیدی۔ کیلاش ماہر۔ لمعہ، عباس علی خان۔ محشر عابدی، محمود ایاز۔ مخدوم محی الدین۔ منظر کاظمی۔ نادر رزاقی۔ وحید مرزا۔ یٰسین علی خاں

اس سال (۴۳) غزلیں شائع ہوئیں جن میں مندرجہ ذیل شعراء کے اسماء گرامی شامل ہیں

غزلیں آزاد، جگن ناتھ۔ اثر لکھنوی۔ اختر احمد۔ اختر حسن انی۔ اسد انصاری۔ اقبال، اعجاز احمد۔ الطاف شاہد۔ اوج یعقوبی۔ بانو طاہرہ سعید۔ بلقیس رحیم۔ تاباں، غلام ربانی۔ ثاقب نظامی۔ شاقہ کانپوری۔ جامی، شبیر احمد۔ جاوید، حیدر آبادی۔ جذبی عالم پوری۔ جگر بریلوی۔ حفیظ کورانگلی۔ حیدر شمسی۔ خاور باز کوٹی۔ خواجہ شوق۔ دور آریاٹی۔ دیوانہ، موہن سنگھ۔ راج زاہد

رفیق حیدرآبادی، روشن، رونقی، ریحانی، رئوف ہاشمی، سرشار بلند شہری، سعادت نظیر، سیدہ مجیدہ، شاد، نریش کمار شاد، شعلہ، دوارکا داس
شعلہ، ... عشرت ... عظمت عبدالقیوم، علی جواد زیدی، عمر انصاری، فدا، امام الدین، فرقت بھلواری، فراق گورکھپوری،
کیلاش ماہر، سلیم ... سما، وزارت ... محروم، تلوک چند محروم، محمد علوی، محسن زیدی، مظہر ... معانی، محمد قلی قطب شاہ۔
منو لکھنوی، ... نادرت کانپوری، نشتر خانقاہی، نظر حیدرآبادی، نقش ... ۔

فارسی غزلیں — ... نے بزم سعدی کے نام سے فارسی گو شاعروں اور ادیبوں کی ایک تنظیم قائم کی ہے جس کے ماہانہ طرحی مشاعرے ... پابندی سے ہوتے ہیں۔ قمر ساحری صاحب کی درخواست پر سب رس میں فروری ۱۹۶۰ء سے ہر ماہ ان طرحی مشاعروں کا منتخب کلام چھپتا ہے۔ اب تک سب رس میں (۵۶) ایسی فارسی طرحی غزلیں چھپ چکی ہیں۔ شعراء کے نام بلحاظ حروف تہجی یہ ہیں۔ بانو طاہرہ سعید، برق موسوی، تاباں، شمس الدین، حیرت بدایونی، حیدر شمسی، خسرو قادری، رضی، محمود اکبر، ... حسنین کاظمی، شفیق سنجر، صمصام شیرازی، ضیاء احمد بدایونی، عثمان علی خاں (نواب میر عثمان علی خاں سابع)، قدر عریضی، قمر ساحری، کمال، ڈاکٹر ... ، مخدوم ... چند مسلم، ڈاکٹر ... خاں، موسیٰ ... ، سید ناصح رضوی، نور محمد نور، یسین علی خاں، یوسف سلیم۔

افسانے — جملہ ۱۱ افسانے شائع ہوئے۔ افسانہ نگاروں کے نام یہ ہیں۔ اکرام جاوید، پشکر ناتھ، ثریا بانو مارہروی، حامدی کاشمیری، حسنین کاظمی، رام لال، رفعت الجبار، کشور زیدی، نصیر اختر صدیقی، محسن زیدی، ایم اسلم۔

ڈرامے — چار عدد ڈرامے سب رس میں شائع ہوئے جن کے تخلیق کار ہیں احمد سلطان، فضل محمد، رشید قریشی، مصطفیٰ الدین صدیقی۔

ٹکا ہیا بت — اس موضوع پر دکن کے مشہور انشائیہ نگار یوسف ناظم کے ایک انشائیہ مضمون "گفتگو" کی تین قسطیں سب رس میں شائع ہوئیں۔

رپورتاژ — ایک ہی ... رپورتاژ ... جو سب رس ماہ جنوری میں شائع ہوا۔

خطوط — ... جگر مرادآبادی کے تحریرہ خطوط شائع ہوئے۔
۲ عدد ... ماہ جنوری میں بعنوان "دکنی ادب کی ترقی میں حیدرآباد کا حصہ" اور ... "اردو کا مستقبل" کے

سمپوزیم — زیر عنوان سمپوزیم ... ماہ اگست میں شائع ہوئے۔ ان میں راشٹرپتی راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ... ڈاکٹر ... الدین، ڈاکٹر ... ، پروفیسر حبیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی کی تحریریں، تقریریں اور ... شائع کیے گئے تھے۔

اردو نامہ — اس عنوان سے ماہ جون سے ہر ماہ سب رس میں حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کی باضابطہ ڈائری مرتبہ ... سلسلہ وار شائع ہو رہی ہے۔

سب رس کا نشانہ — اس عنوان کے تحت ... ممتاز رسائل سے نقل اور تلخیص کیے جانے والے اردو کے معیاری تحقیقات سے تعلق رکھنے ... اس عنوان کے تحت ۱۳ مضامین، ۳ نظموں اور پانچ غزلوں کو معیاری رسائل سے ڈائجسٹ ... لکھنے والوں میں ڈاکٹر ... ، آل احمد سرور، خورشید احسن صدیقی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر ... زیر آگا، ... ، مظفر علی سید، محمد اجمل خاں، آنند نرائن ملا، حمید احمد ... ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، قاضی سلیم، وقار عظیم، ... مصطفیٰ زیدی، رشید احمد صدیقی، مجتبیٰ حسین، انور خواجہ، جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی شامل ہیں۔

تبصرے ۔ سب رس سیر حاصل اور معیاری تبصروں کے لئے مشہور رہا ہے ۔ سن ۱۹۶۰ء میں جملہ (۴۶) تبصرے شائع ہوئے جن میں ۳۵ کتب اور کتابچوں کے علاوہ گیارہ رسائل و جرائد شامل ہیں جن کے نام مندرج ہیں۔

کتابیں :- امام ابن تیمیہ، مسئلہ تعدد ازدواج، سرگزشت غزالی، شعر و حکمت، راگ رنگ، سحر غزل، شکست جام، خدو خال، نبض حیات، تذکرۂ یورو پین، اور انڈو یورو پین شعرائے اردو۔ ۳۶۵ دن، رہنمائے انتخابات، ارمغان، سیر مطالعہ، گلدستۂ سخن، خدا کا پیغام بندوں کے نام، سلسلۂ مطبوعات حیدرآباد اکیڈیمی، آئینہ سخن فہمی، تہذیب و تحریر، انوار ابوالکلام، سرسید احمد خاں، انتخاب فتنہ، آمنہ کا لال، شمع ہدایت۔ آتش خنداں، حرف جنوں، نیا انسان، خالق کائنات، ایران، زنجیر رم آہو، شبنم شبنم، اسلام پوتھی، معراج نامہ، میراثِ انیس میں ڈرامائی عناصر، ذہن اور انقلاب۔

رسائل و جرائد :- سلور جوبلی نمبر صبح امید بمبئی، سالنامہ کامران سرگودھا۔ ماہنامہ سوراجیہ دہلی، روزنامہ نئی دنیا دموئی نمبر) دہلی، سالنامہ پیغام ادھر پرتاب گڑھ، دو ماہی نگارش امرت سر، ماہنامہ پاکیزہ مدراس، مجلۂ شب تاب، مجلۂ مشعل، ادب علی گڑھ شبلی نمبر، نورس کراچی عبدالحق نمبر۔

"سب رس" کے بارے میں سن ۱۹۶۰ء میں مختلف رسائل و جرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے اُن کے چیدہ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

●

"سب رس" ڈاکٹر زورؔ کی نگرانی میں ربع صدی سے زیادہ ہوتا رہا ہے اس کے ذریعہ اردو ادب کی متواتر خدمت نہایت سلیقہ اور سنجیدگی سے کی جاتی رہی ہے۔ اس رسالے کے ذریعہ خصوصاً دکنی ادب کے بارے میں جو تحقیقی مقالے شائع ہوتے رہے اور ادب کی دیگر تصانیف پر جو کلاسیکی زاویہ نظر سے تنقید و تبصرہ کیا جاتا رہا وہ قابل تحسین ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو کے ایسے سنجیدہ رسالے نکلتے رہیں۔

زیر نظر شمارہ (فبروری سنہ ۶۰ء) تبصرے کے لئے موصول ہوا ہے۔ مضامین کے حصے میں، روایتی طور پر موضوعات نہایت سنجیدہ ہیں اور تحقیق کی عرق ریزی کو ظاہر کرتے ہیں۔ نثار احمد فاروقی نے قائم کی مثنوی کے بارے میں خوب لکھا ہے۔

نظموں اور غزلوں میں معیار کا خیال رکھا گیا ہے۔

"سندیش" ہفتہ وار رائچور۔ مورخہ ۲۵ر مارچ ۶۰ء

●

سب رس "سب رس" حیدرآباد کا قدیم ترین ماہنامہ ہے جو پچھلے ۲۴ سال سے ڈاکٹر زورؔ کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ اس ماہنامہ کی مجلس ادارت میں ڈاکٹر ... جانکی پرشاد، رمن راج سکسینہ، نصیر الدین ہاشمی اور وقار خلیل شامل ہیں۔ اس رسالہ کا دور اول تو انتہائی شاندار رہا اور یہ ۹۴ تا ۱۰۰ صفحات کی ضخامت کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ لیکن درمیانی عرصے میں اس کی اشاعتوں کے تسلسل میں کچھ وقفہ آیا۔ بہر حال خوشی آئند ہے کہ پھر سے یہ رسالہ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

اس کے زیر نظر تازہ شماروں میں نامور مقامی اور غیر مقامی فنکاروں کی ادبی تخلیقات شامل ہیں۔ "سب رنگ" کے زیر عنوان ملک کے ادبی رسائل کے اچھے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع کیا جاتا ہے اور "پچھلے چند ماہ سے "بزم سعدی" کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں کا انتخاب بھی شائع ہو رہا ہے۔ اس سے قارئین کو فارسی زبان کے مقامی شعراء کا تازہ کلام پڑھنے کو مل رہا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہم ایک بات ضرور

لکھیں گے کہ یہ رسالہ چونکہ ادارۂ ادبیاتِ اردو جیسے بڑے ادبی ادارے کا ترجمان ہے اس لئے اسے صوری اور معنوی اعتبار سے اور زیادہ بہتر اور ضخیم ہونا چاہئے۔

روزنامہ "**ملاپ**" ادبی ایڈیشن حیدرآباد م ۱۲ر دسمبر ۱۹۶۰ء

●

سب رس اس ماہنامہ کی مجلس ادارت میں اردو کی مشہور شخصیتیں شامل ہیں۔ پرچے بھی عام رسالوں کی طرح سطحی مضامین نہیں بلکہ اس میں ٹھوس اور علمی فضا برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اپریل کے پیش نظر شمارہ میں ڈاکٹر زورؔ کا ایک مضمون "قصہ پنجۂ آفتاب و مہرشاہ" اور مولانا سید علی اصغر بلگرامی کا ایک مقالہ "بردہ فروشی" بھی شامل ہے۔ سلسلۂ دکن میں اردو غزل ۳۴ کے تحت داؤد اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب مع مرتب کے نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ "تقریب افتتاح ایوانِ اردو کا آنکھوں دیکھا حال" اور "بادۂ دکن" کے عنوان سے (فارسی) شاعرہ سعدی کا انتخاب بھی مزے کی چیزیں ہیں۔

دوماہی "**گجر**" لاہور (بابتہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۰ء)

●

سب رس کے خاص نمبر

محمد قلی قطب شاہ نمبر سب رس ایک زمانہ سے ادب کی خدمت بڑے خاموش انداز سے کر رہا ہے۔ اس کی توجہ بالخصوص دکنی ادب کی طرف ہے چنانچہ جب کبھی اس کا کوئی خاص نمبر شائع ہوتا ہے تو دکنی ادب کے لئے ایک دستاویز ثابت ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ نمبر بھی اس لحاظ سے کم اہم نہیں ہے۔ "اردو کی ترقی میں دکنی ادب کا حصہ" کے عنوان کے تحت سمپوزیم بہت وقیع ہے۔ اس سے بہت سے مسائل پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ مقالات میں سید علی اصغر بلگرامی، ڈاکٹر زورؔ، مبارز الدین رفعت اور محمد یوسف احمد کے مقالات معلومات افزا اور معیاری ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ اور نذیر گوپال ریڈی کی تقاریر دکن میں اردو کی مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔ ہم کارپردازانِ سب رس کو اس قدر معیاری نمبر شائع کرنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

اردو کے لئے جو ادارے خون پسینہ ایک کر رہے ہیں، ان میں سے ایک ادارۂ ادبیاتِ اردو بھی ہے۔ اور اس کا مناسب و موزوں ترجمان سب رس کر رہا ہے۔ ہم اردو کے بہی خواہوں سے پُرزور اپیل کریں گے کہ وہ مذکورہ ادارہ کی طرف مزید توجہ دیں اور سب رس کے خریدار بن کر اس کے لئے دستِ تعاون دراز کریں۔

"**ادیب**" ماہوار علی گڑھ۔ مئی ۱۹۶۰ء

● ______ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ترجمان ماہنامہ سب رس کا محمد قلی قطب شاہ نمبر (جنوری ۶۰ء) بادشاہ شاعر کی زندگی اور اس کے مذاقِ ادب پر بیس (۲۰) مقالوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ نثر کے علاوہ حصۂ نظم بھی معیاری ہے۔ اس نمبر پر ادارہ اور مجلس ادارت سب رس کو ہم مبارکباد دیتے ہیں اور اردو داں حضرات سے جنھیں دکنی ادب کے نشیب و فراز کے مطالعہ کا شوق ہے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس نمبر کو خرید کر اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

معمول ماہنامہ "**صبح امید**" بمبئی۔ مئی ۱۹۶۰ء

● ——— محمد قلی قطب شاہ حیدرآباد دکن کا اردو نواز بادشاہ گزرا ہے۔ جس کے دور حکومت میں اردو کا ابتدائی دور ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ دکن کے اکثر و بیشتر مشاہیر شعرا اسی کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ خود بھی فارسی اور اردو کا صاحب دیوان شاعر تھا۔ جس کا مبسوط دیوان آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔ جدید تحقیقات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ ولی ہی پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ یہ نمبر اسی محسن اردو بادشاہ کی یادگار میں شائع ہوا ہے جو معلوماتی و افادی مضامین کا حامل ہے۔ بالخصوص سمپوزیم جس میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور نجیب اشرف ندوی وغیرہ نے حصہ لیا ہے۔ اجتماعی طور پر سب رس کا یہ نمبر بہت زیادہ قابل قدر ہے جس کے لئے کارکنانِ ادارہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ماہنامہ **"نوری کرن"** بریلی۔ مارچ ۱۹۶۰ء

● ——— ماہنامہ سب رس ادارہ نمبر (ایوان اردو نمبر) پانچ ماہ کے مختصر عرصے میں ماہنامہ سب رس نے تین خاص نمبر شائع کرائے ہیں۔ یہ ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ہے، یہ ادارہ دکن میں اردو کے تحفظ، فروغ اور اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس کی اپنی عمارت ہے اپنی لائبریری ہے اور اردو کے مخطوطات کا ایک میوزیم ہے۔ اس ادارے سے استفادہ کے لئے ملک کے گوشے گوشے سے مشاہیر ادب پہنچتے رہتے ہیں۔ "ادارہ نمبر" کا مطالعہ کرنے کے بعد صحیح طور پر اندازہ ہوسکتا ہے کہ ممتاز اہلِ ادب اور ملکی رہنماؤں کی نظروں میں اس کی کیا قدر و منزلت ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کس خوش اسلوبی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

ابھی حال ہی میں اس ادارہ کی ذاتی عمارت تیار ہوئی ہے۔ جس کا افتتاح بخشی غلام محمد چیف منسٹر کشمیر نے کیا ہے۔ اس عمارت کا نام "ایوان اردو" رکھا گیا ہے۔ "ایوان اردو نمبر" اس عمارت کے افتتاح کے سلسلے ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ ایوانِ اردو کے سلسلہ میں مضامین معلومات کے ساتھ کچھ غزلیں اور نظمیں بھی شائع کی گئی ہیں جن میں جگن ناتھ آزاد، منور لکھنوی اور طاہرہ بانو سعید وغیرہ کا کلام بہت اچھا ہے۔ دونوں خاص نمبروں میں متعدد معلوماتی تصاویر بھی شامل ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو کی خدمات کے سلسلے میں سیر حاصل معلومات حاصل کرنے کیلئے ان نمبروں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ماہنامہ **"ادیب"** علی گڑھ ابتہ اگست ۶۰ء

● ——— سب رس کا ایوان اردو نمبر ایک بے نظیر ادبی شاہکار ہے۔ ایوانِ اردو کی عمارت کی رسم افتتاح آنریبل بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے انجام فرمائی۔ اور اس اجلاس کی صدارت کے فرائض آنریبل جناب عثمان سیٹھ گورنر آندھرا پردیش نے ادا کئے۔ ایوان اردو نمبر میں ادارہ اس کے معزز مہمان اور معاونین کی مخلصانہ کوششوں اور آندھرا پردیش کی سرکردہ ہستیوں کے حالات جن کو مستند مسلم حضرات شامل میں درج ہیں۔ بہر صورت یہ نمبر ایک امتیازی اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نمبر کو کامیاب بنانے میں جہاں زور صاحب کی مساعی کو دخل حاصل ہے وہاں بلند فکر ادیب دینار ملیلی نے بھی اپنی ذہانت سے اسے چار چاند لگائے ہیں۔

سندیش جموں۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء

● ——— سب رس کا ایک خاص نمبر ایوان اردو نمبر کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ایوان اردو کی تکمیل کے لئے ڈاکٹر صاحب کو کن کن مبر آزما اور مشکل مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ایوانِ اردو کی عمارت کی رسم افتتاح آنریبل جناب بخشی غلام محمد

وزیر اعظم جموں و کشمیر اور صدارت آنریبل جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش نے فرمائی ہے۔ ایوانِ اردو نمبر جہاں علم و ادب کا آئینہ دار ہے وہاں علم اور ادب پروری کے سلسلے میں ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کا ترجمان بھی ہے۔ بلاشبہ یہ نمبر ایک بیش قیمت ادبی کارنامہ ہے جسے کامیاب بنانے میں جناب زورؔ صاحب کے ساتھ ساتھ روشن دماغ ادیب وقار خلیل صاحب نے بھی پوری پوری سرگرمی اور کاوش محنت کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ " ہند سماچار " جالندھر۔ ۲۵ ؍ اگست ۱۹۶۰ء

● ——— سب رس کے خاص نمبر میں ایوانِ اردو کے افتتاح کے موقع پر مشاہیرِ ہند سے جو پیامات وصول ہوئے، جو تقریریں کی گئیں اور جو روداویں سنائی گئیں ان سب کو ایک جا مرتب کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایوانِ اردو سے متعلق کہی گئی نظمیں اور قطعات بھی شائع کئے گئے ہیں جن میں ادارہ کی کاوشوں اور خاص طور پر ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ دیگر موضوعات پر کچھ مضامین بھی موجود ہیں۔

ٹائیٹل آرٹ پیپر پر ہے لیکن تعجب ہے کہ حصۂ اردو کے لئے آرٹ پیپر استعمال نہیں کیا گیا جبکہ انگریزی اور تلنگی کا حصہ آرٹ پیپر پہ شائع ہوا ہے۔ حصہ انگریزی کی طباعت بھی بہتر ہے بمقابلہ حصہ اردو کے۔

روزنامہ " صداقت " حیدرآباد۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۰ء

● ——— ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے ماہ مارچ میں خود اپنے ادارہ کو ایک عالم سے روشناس کرانے کے لئے ایک خوبصورت جامع " ادارہ نمبر " شائع کیا ہے جس میں ادارۂ ادبیات اردو کے متعلق تمام ضروری معلومات کو یکجائی طور پر پیش ناظرین کر کے اس کی عالمگیر اہمیت کو روشناس کرایا ہے۔ یہ ادارہ ڈاکٹر زورؔ کی نگرانی میں پینتیس سال سے قائم ہے۔ اور قابلِ ستائش خدمات اردو علم و ادب کے سلسلہ میں ادا کر رہا ہے جس پر ہم کارپردازان کو تہہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔ " سب رس " ماہنامہ رسالہ کی صورت میں ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ اعلیٰ پایہ کے مضامین کا خاص مجموعہ ہے جو مستند ہستیوں کے قلم سے نکلے ہیں، زبان اردو کی خدمات خاص طور پہ قابل تعریف و توصیف ہیں۔

منقول از سوراجیہ دہلی۔ یکم مئی ۶۰ء

سب رس کے تبادلے میں آنے والے رسائل وجرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل وجرائد ایوانِ اردو کے دارالمطالعہ میں قارئین کے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک رسائل کو چھوڑ کر باقی سب جرائد سب رس کے تبادلہ میں آتے ہیں۔ ہم ان تمام ہندوپاک اور بیرونِ ہند کے مدیرانِ جرائد کے ممنون ہیں جو سب رس کے تبادلہ میں پابندی کے ساتھ اپنے رسائل بھجواتے ہیں۔

روزنامے

۱۔ امرجارت، بشیر باغ روڈ، حیدرآباد دکن۔ ایڈیٹر: پورن چند شاکر۔ صفحات اوسطاً ہر روز ۶ — قیمت: ۱۰ نئے پیسے
۲۔ رہنمائے دکن، افضل گنج " محمد منظور حسن " " " ۶ " ۱۳ "
۳۔ سندیش، ریذیڈنسی روڈ جموں (کشمیر) " سید نذیر حسین سمنانی " " " ۴ " ۱۰ "
۴۔ سیاست، جواہرلال نہرو روڈ۔ حیدرآباد دکن " میر عابد علی خاں " " " ۸ " ۱۳ "
۵۔ ملاپ، مکرم جاہی روڈ " یدھ ویر " " " ۸ " ۱۳ "

دوروزہ

۱۔ آج کا امریکہ (اردو)۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس، بہاولپور ہاؤس، سکندرا روڈ، نئی دہلی (صرف اخبارات کو ارسال کیا جاتا ہے)
۲۔ پریس انفارمیشن بیورو کا خبرنامہ (اردو)۔ پریس انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ ہند، دہلی (" " ")
۳۔ سوویت یونین کی خبریں اور رائیں (اردو)۔ روسی سفارت پوسٹ بکس ۲۴۱، نئی دہلی۔ سالانہ چندہ ۴ روپے۔

ہفتہ وار

۱۔ امریکن رپورٹر (انگریزی)۔ بہاولپور ہاؤس، سکندرا روڈ، نئی دہلی — ۸ صفحات — سالانہ قیمت: ایک روپیہ
۲۔ " " (تلگو)۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس، ماؤنٹ روڈ، مدراس۔ ۸ صفحات — "
۳۔ ایشیا، اردو بازار دہلی۔ ایڈیٹر: میر مشتاق احمد — صفحات: ۱۲ — فی پرچہ: ۲۰ نئے پیسے۔ سالانہ ۱۰ روپے
۴۔ بلٹز (انگریزی)۔ کاؤس جی پٹیل اسٹریٹ بمبئی ۱۔ صفحات: ۲۰ — فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے۔ (عطیہ جناب اقبال مرتضیٰ کلکتہ)
۵۔ پیامِ اسلام، فیض آباد، لکھنؤ۔ ایڈیٹر: مرزا احمد حسین حیدر۔ صفحات: ۸ — فی پرچہ: ۱۳ نئے پیسے۔ سالانہ: ۶ روپے
۶۔ ترجمانِ سرحد، پشاور (پاکستان)۔ " : امیر عالم اعوان " : ۸ — سالانہ: دس روپے۔ طلبا سے ۶ روپے
۷۔ ترجمانِ وقت، ۱۰۹ مرادنگر، حیدرآباد دکن۔ " : سید رحمت علی " ۸ — فی پرچہ: ۱۳ نئے پیسے۔
۸۔ خبرنامہ یونائیٹڈ عرب ری پبلک، پبلسٹی بیورو (اردو) دہلی۔ " : ۸ — (صرف اخبارات کو ارسال کیا جاتا ہے)
۹۔ ذوالقرنین، نظامی پریس، بدایوں۔ ایڈیٹر: احمد الدین نظامی۔ " : ۸ — فی پرچہ ۱۳ نئے پیسے۔ سالانہ: ۶ روپے

۴۰۔ خیال۔ نعیم الدین اسٹریٹ، کامٹی (ناگپور)۔ ایڈیٹر: فیض انصاری۔ صفحات: ۵۶۔ فی پرچہ: ۵۰ نئے پیسے۔ سالانہ: ۲ روپے

۴۱۔ دلدار۔ پوین پلی، حیدرآباد دکن۔ ״ : محمد افضل شریف۔ ״ : ۳۲۔ ״ : ۳۱ ״ ״ ۔ ״ : حسب استطاعت

۴۲۔ روش۔ جیلانی منزل، کشیدہ گری، حیدرآباد دکن۔ ״ : ضیاء رودسی۔ ״ : ۲۴۔ ״ ״ ״ ۔ ״ : ۱/۵۰ مجلد

۴۳۔ سات رنگ۔ پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی ۵۔ ״ : اطہر صدیقی۔ ״ : ۴۸۔ ״ : ۶۴ ״ ۔ ״ : ۸ ״

۴۴۔ ساقی۔ ساقی بک ڈپو، کراچی ۵۔ ״ : شاہد احمد دہلوی۔ ״ : ۴۸۔ ״ : ۵۰ ״ ۔ ״ : ۱۰ ״

۴۵۔ سنگم۔ ریذیڈنسی روڈ، جموں (کشمیر) ״ : موہن یاور۔ ״ : ۹۴۔ ״ : ۶۵ ״ ۔ ״ : ۸ ״

۴۶۔ سوراجیہ۔ چاوڑی بازار، دہلی ״ : کشمیر ناتھ چوپڑہ۔ ״ : ۴۸۔ ״ : ۲۵ ״ ۔ ״ : ۳ ״

۴۷۔ سہیل۔ باری روڈ، گیا (بہار) ״ : ادریس سنبھاروی۔ ״ : ۴۴۔ ״ : ۳۷ ״ ۔ ״ : ۶ ״

۴۸۔ شاعر۔ اپنی روڈ، بمبئی ۴۔ ״ : اعجاز صدیقی۔ ״ : ۷۴۔ ״ : ۶۲ ״ ۔ ״ : ۷ ״

۴۹۔ شان ہند۔ آزاد ہند ہوٹل، اردو بازار، دہلی۔ ״ : سرور تونسوی۔ ״ : ۴۰۔ ״ : ۵۰ ״ ۔ ״ : ۵ ״

۵۰۔ شاہراہ۔ اردو بازار، دہلی۔ ״ : محمد یوسف جامی۔ ״ : ۹۴۔ ״ : ۹۲ ״ ۔ ״ : ۱۰ ״

۵۱۔ شمع۔ آصف علی روڈ، نئی دہلی۔ ״ : یونس دہلوی۔ ״ : ۱۲۶۔ ״ : ۷۵ ״ ۔ ״ : ۸ ״

۵۲۔ شہباز۔ روضہ بزرگ، منگلور (میسور) ״ : سفیر اللہ حسینی۔ ״ : ۷۲۔ ״ : ۷۵ ״ ۔ ״ : ۵ ״

۵۳۔ شہناز۔ عیدگاہ روڈ، کراچی۔ ״ : شمس النساء بیگم خالد۔ ״ : ۵۲۔ ״ : ۵۰ ״ ۔ ״ : ۶ ״

۵۴۔ صبا۔ ۱۷، مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن۔ ״ : سلیمان اریب۔ ״ : ۸۰۔ ״ : ۸۸ ״ ۔ ״ : ۱۰ ״

۵۵۔ صبح امید۔ بلاسس روڈ، بمبئی ۸۔ ״ : عبدالحمید بوہیرے۔ ״ : ۵۸۔ ״ : ۵۰ ״ ۔ ״ : ۶ ״

۵۶۔ عارف۔ مل روڈ، لاہور۔ ״ : عبدالرحمان شوق۔ ״ : ۱۰۰۔ ״ : ۲۵ ״ ۔ ״ : ۳ ״

۵۷۔ عصمت۔ بندر روڈ، کراچی ۳۔ ״ : رازق الخیری۔ ״ : ۱۱۲۔ ״ : ۵۰ ״ ۔ ״ : ۶ ״

۵۸۔ فاران۔ کیمبل اسٹریٹ، کراچی ״ : ماہر القادری۔ ״ : ۴۴۔ ״ : ۵۰ ״ ۔ ״ : ۶ ״

۵۹۔ فروغ اردو۔ امین آباد پارک، لکھنؤ۔ ״ : ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ״ : ۸۰۔ ״ : ۲۵ ״ ۔ ״ : ۲ ״

۶۰۔ قلم سنسار۔ لولین، بمبئی ۲۲۔ ״ : ایم عالم۔ ״ : ۵۰۔ ״ : ۲۵ ״ ۔ ״ : ۳ ״

۶۱۔ فنکار۔ محمد پور اسٹیٹ، ڈھاکہ۔ ״ : اختر (لکھنوی)۔ ״ : ۸۸۔ ״ : ۲۵ ״ ۔ ״ : ۳ ״

۶۲۔ فیض۔ خلد آباد، بمبئی ״ : حکیم سید عیسیٰ محی الدین ״ : ۴۴۔ ״ : ۲۵ ״ ۔ ״ : ۴ ״

۶۳۔ قند۔ پریمیر شوگر ملز لمیٹڈ، مردان، پاکستان۔ ״ : تاج سعید (ماہنامہ) ״ : ۴۰۰۔ ״ : ۷۵/۱ ״ : ۶

۶۴۔ کاروان۔ بہاولپور۔ (پاکستان) ״ : سید محمود جعفری ״ : ۵۸۔ ״ : ۵۰ نئے پیسے۔ ״ : ۶ ״

۶۵۔ کتاب نما۔ جامعہ نگر، دہلی۔ ״ : ریحان احمد عباسی ״ : ۳۲۔ ״ : ۱۰ ״ ۔ ״ : ۱ ״

۶۶۔ کتابی دنیا۔ گیروں مکھراج روڈ، کراچی ״ : ضیاء الدین احمد برنی ״ : ۲۰۔ ״ : ۱۹ ״ ۔ ״ : ۲ ״

۶۷۔ ماہِ نو۔ پوسٹ بکس ۱۴۳، کراچی ״ : رفیق خاور ״ : ۴۴۔ ״ : ۵۰ ״ ۔ ״ : ۱/۵۰

۶۸۔ معارف۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ (یو۔ پی) ״ : شاہ معین الدین احمد ندوی ״ : ۶۴۔ ״ : ۷۵ ״ ۔ ״ : ۸ ״

۶۹۔ منادی۔ درگاہ نظام الدین اولیاء، نئی دہلی ״ : حسن ثانی نظامی ״ : ۴۰۔ ״ : ۲۵ ״ ۔ ״ : ۴ ״

۷۰۔ مہر نیمروز۔ کریم روڈ، صدر، کراچی ۳ ״ : حسن مثنیٰ ندوی ״ : ۶۴۔ ״ : ۵۰ ״ ۔ ״ : ۶ ״

۷۱۔ نوم ۔ ۳۹۔ جوانا لیٹنی، ڈھاکہ ایڈیٹر: ارشد کاکوی صفحات: ۶۴ ۔ فی پرچہ: ۵۰ نئے پیسے ۔ سالانہ: ۶ روپے

۷۲۔ نقش ۔ کاشانۂ اردو پوسٹ بکس ۱۲۷ کراچی ۳ " : شمس زبیری " : ۱۳۰ " : ۱ روپیہ ۔ " : ۱۲ "

۷۳۔ نقوش ۔ ادارہ فروغ اردو، انارکلی، لاہور " : محمد طفیل " : ۳۱۲ " : ۳ " ۔ " : ۲۰ "

(عطیہ ڈاکٹر زور صاحب)

۷۴۔ نگارش ۔ پوسٹ بکس ۳۶۰، کراچی ۱۹ " : ناصر محمود " : ۶۴ " : ۵۰ نئے پیسے ۔ سالانہ: ۶ روپے

۷۵۔ ننھا ۔ تالاب میر جملہ ۔ حیدرآباد دکن " : مسعود انصاری " : ۴۲ " : ۴۰ " ۔ " : ۵۰/۴ "

۷۶۔ {نوری کرن ۔ بازار صندل خاں، بریلی (ہمہ بہشر نمبر) " : اقبال احمد نوری " : ۹۶ " : ۵۰ " ۔ " : ۴ "

۷۷۔ نیا دور ۔ محکمۂ اطلاعات، اترپردیش، لکھنؤ " : صباح الدین عمر " : ۵۶ " : ۲۵ " ۔ " : ۳ "

۷۸۔ نیا راہی ۔ نیپیر روڈ، کراچی ۲ " : ع، س، مسلم " : ۵۸ " : ۵۰ " ۔ " : ۶ "

۷۹۔ نئے چراغ ۔ کھاسپورہ کھنڈوا (یم ۔ پی) " : حسن لبشیر " : ۸۸ " : ۵۰ " ۔ " : ۶ "

۸۰۔ نیرنگ خیال ۔ ۴۰ نلنگ روڈ ۔ لاہور ۔ " : حکیم محمد یوسف حسن " : ۴۴ " : ۵۰ " ۔ " : ۸ "

۸۱۔ ہمدرد صحت ۔ لال کنواں، دہلی " : حکیم عبد الحمید " : ۴۸ " : ۳۷ " ۔ " : ۴ "

۸۲۔ ہم قلم ۔ پاکستان رائٹرس گلڈ، صدر کراچی ۳ " : شمیم احمد " : ۸۸ " : ۶۲ " ۔ " : ۶ "

۸۳۔ ہندوستانی ادب ۔ اعظم پورہ ۔ حیدرآباد دکن ۲۴ " : جی، ایم، خاں " : ۶۴ " : ۱ روپیہ ۔ " : ۸ "

دو ماہی

۱۔ صحیفہ ۔ ۲، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ ۔ لاہور ایڈیٹر: عابد علی عابد صفحات: ۱۶۰ فی پرچہ: ۲/۲۵ روپے ۔ سالانہ: ۱۲ روپے

۲۔ گنجر ۔ اللہ بخش روڈ، مصری شاہ، لاہور " : تاب اسلیم " : ۸۲ " : ۷۵ نئے پیسے ۔ " : ۵ "

۳۔ نگارش ۔ کٹڑہ باگھ سنگھ، امرتسر " : مہندر باوا (جگر نمبر) " : ۳۱۰ " : ۳ روپے ۔ " : ۱۰ "

سہ ماہی

۱۔ آب و گل ۔ ۱۲، نارتھ بروک ہال روڈ ۔ ڈھاکہ ایڈیٹر: سردار بانکوی صفحات: ۸۰ فی پرچہ: ۵۰ نئے پیسے ۔ —

۲۔ ادبی دنیا ۔ مال روڈ، لاہور " : صلاح الدین احمد " : ۲۰۰ " : ۲ روپے ۔ سالانہ: ۶ روپے

۳۔ اردو ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ، کراچی " : عبد الحق " : ۱۴۴ " : ۲ " ۔ " :

۴۔ اردو ادب ۔ " " علیگڑھ (مولانا آزاد نمبر) " : آل احمد سرور " : — " : — ۔ " : ۶ روپے

۵۔ اردو نامہ ۔ ترقی اردو بورڈ، ڈرگ روڈ، کراچی " : شان الحق حقی " : ۸۴ " : ۷۵ پیسے ۔ " : ۳ "

۶۔ اسلامک کلچر (انگریزی) ۔ پوسٹ بکس ۱۷۱، حیدرآباد دکن " : ڈاکٹر عبد المعید خاں " : ۹۸ (عطیہ ڈاکٹر زور صاحب)

۷۔ العلم ۔ دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ناظم آباد کراچی سالانہ ۲ روپے

۸۔ اورینٹل کالج میگزین ۔ اورینٹل کالج لاہور " : ڈاکٹر سید عبد اللہ " : ۲۱۶ — سالانہ: ۴ روپے

۹۔ سوغات ۔ کلاین روڈ، بنگلور " : محمود ایاز " : ۱۸۴ فی پرچہ: ۲ روپے سالانہ: ۸ "

۱۰۔ فکر و نظر ۔ بزم دانش جانسن لاج، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ " : ڈاکٹر یوسف حسین خاں " : ۱۸۸ " : ۲ " ۔ " : ۷ "

۱۱۔ کامران ۔ کچہری بازار سرگودھا (پاکستان) ایڈیٹر: انور گوبندی صفحات: ۱۲۰ فی پرچہ: ۵۰/ پیسے سالانہ: ۶ روپے
۱۲۔ مجلس ۔ اردو مجلس، اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد ،، محمد منظور احمد ،، ۱۱۲ ،، : ۔ ،، : ۵۰/۳ ،،
۱۳۔ نوائے ادب ۔ ادبی پبلشرز، انجمن اسلام، بمبئی ،، نجیب اشرف ندوی ،، ۷۶ ،، : ایک روپیہ ،، : ۴ ،،

ششماہی

۱۔ قلمکار ۔ ۴۔ نارتھ بروک ہال روڈ، ڈھاکہ ایڈیٹر: سرور بارہ بنکوی صفحات: ۲۸۴ قیمت: ۳ روپے

سالنامے

۱۔ مجلہ عثمانیہ ۔ آرٹس کالج، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد ایڈیٹر: ہاشم حسن سعید صفحات: ۲۲۲ قیمت: ۵ روپے

ادارے کا مہمان خانہ

ادارے کی اپنی تعمیر شدہ عمارت "ایوان اردو" میں دو کمروں اور ایک ورانڈے پر مشتمل مہمان خانہ بھی ہے جس میں دستور کی مسلمہ ۱۴ زبانوں میں تحقیقاتی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر، ادیب، شاعر اور صحافی ایک ہفتہ قبل معتمد ادارہ کو مطلع کر کے قیام کر سکتے ہیں۔ ریسرچ اسکالروں کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ وہ اپنے شعبہ کے صدر کی توثیقی تحریر کے ساتھ قیام کے لئے درخواست بھجوائیں۔

ایوانِ اردو کا مہمان خانہ ہندو پاک کے ادبی اور تہذیبی اداروں کی تاریخ میں اپنے وجود کے صحت مند پس منظر کے تعلق سے ادبی اور اہمیت کا حامل ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں ادارے کے مہمان خانے کو تو اولین اہمیت حاصل ہے۔ مہمان خانے میں صرف قیام کی تمام سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ یہ مقام ادارے کے پرسکون عقبی حصے میں واقع ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں حسب ذیل شاعروں، ادیبوں اور ریسرچ اسکالروں نے "ایوان اردو" کے مہمان خانے میں قیام کیا۔

۱۔ جناب جگن ناتھ آزاد صاحب (دہلی) ۲۱ مارچ تا ۲۴ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء
۲۔ ،، علی جواد زیدی صاحب (کشمیر) ۲۴ ،، تا ۲۴ ،، ،،
۳۔ ،، خلیق انجم صاحب لکچرار کروڑی مل کالج دہلی ۲۸ اپریل تا ۱۸ مئی سنہ ۱۹۶۰ء
۴۔ ،، سید محمد یونس صاحب (دہلی کالج دہلی) ۲۳ و ۲۴ جون ،،
۵۔ ،، فیض احمد صاحب ریسرچ اسکالر مدراس یونیورسٹی مدراس ۲۵ جولائی تا ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء
۶۔ ،، عبدالرؤف صدیقی صاحب ایڈیٹر عوام و کرانیکل کراچی ۲۳ و ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء

امداد و اعانت

(ادارے کو ۱۹۶۰ء میں حسب ذیل اصحاب نے مختلف قسم کی امداد فرمائی جس کے لئے ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔)

نواب عنایت جنگ بہادر نے حیدرآباد کا ایک قدیم نقشہ جو دو سو سال قبل کپڑے پر اتارا گیا تھا، ادارے کے میوزیم کے لئے عطا کیا۔

جناب احمد اللہ خاں صاحب (ایم۔ اے) استاد اردو مدرسہ فوقانیہ گولکنڈہ نے (۲۲) فارسی اور اردو قلمی کتابیں ادارہ کے کتب خانہ شعبہ مخطوطات کے لئے عطا فرمائیں۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ انوار اللہ نے (۱۱۲) کتابیں اور (۹۷) رسالے ادارے کو عطا فرمائے۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے ادارے کو (۱۸) تاریخی اور نادر مخطوطات تحفۃً عنایت فرمائے۔

جناب رمن راج سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ نے حکومت گیتا کا فارسی قلمی نسخہ عطا کیا جو ابوالفضل (نصف اول) اور انجمار ام ولد فین سکھ (نصف دوم) کا ترجمہ ہے۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے دو عدد قلمی کتابیں ادارہ کے کتب خانہ مخطوطات کے لئے تحفۃً ارسال فرمائیں۔

جناب رمن راج سکسینہ صاحب نے ایک قدیم مطبوعہ گلدستہ سخن گدہ بابتہ ماہ نومبر ۱۸۸۳ء ادارے کو عطا فرمایا

نواب عنایت جنگ بہادر نے مشہور خطاطوں کے لکھے ہوئے نادر و نایاب نمونوں اور متعدد شاہی فرامین اور اسناد کا ذخیرہ ادارے کے حوالے کیا۔

جناب مظہر کامل نے ایوان اردو ادارہ کے تعلق سے اپنی نظم فریم کروا کر ایوان اردو کے آڈیٹوریم کے لئے تحفۃً مرحمت فرمائی۔

نواب میر سعادت علی رضوی صاحب ایم۔ اے نے چند قطعات خوشنویسی اور آب حیات کا پہلا ایڈیشن عطا کیا۔

مولوی سید مراد علی صاحب طالع نے خواجہ فیاض الدین جمال بندہ کا دیوان جو خود ان کا مکتوبہ ہے اور دو بیاضیں عطا کیں۔

مسز مریم نقی بلگرامی صاحبہ نے ایوان اردو کے لئے روشنی کا ایک فانوسی جھاڑ عطا کیا۔

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے مرزا جان طپش کی کتاب شمس البیان مطبوعہ ۱۸۴۸ء جو اردو ٹائپ کے حروف میں مطبع آفتاب مرشد آباد میں چھپی تھی ادارے میں بطور تحفہ عطا کی۔

جناب رائے برکت رائے صاحب نے اپنی مرحومہ اہلیہ کی کئی مطبوعہ کتابیں اور ایک قلمی مجموعہ کلام ادارے کے کتب خانے

کے لئے عطا فرمایا۔

نواب فطرت جنگ بہادر نے (۵۰،۰) عدد شادی، جمگی، روزہ کشائی اور چوتھی وغیرہ جیسی تقاریب کے قدیم رقعہ جات بتوسط نواب عنایت جنگ ادارے کو تحفۃً عطا فرمائے جنھیں ایک البم کی صورت میں ایوان اردو کے میوزیم میں رکھا گیا۔

جناب مرزا حبیب علی صاحب حبیب نے اپنے مطبوعہ شعری مجموعے "گلزار حبیب" اور "فغان حبیب" ادارہ کو تحفۃً عطا فرمائے۔

جناب شہزادہ ترنم۔ صدر انڈو جرمن کلچرل سوسائٹی شاخ حیدرآباد نے دس انگریزی کتابچے جو جرمن ادب اور کلچر سے متعلق ہیں ادارہ کو تحفۃً عطا فرمائے۔

جناب ایس۔ ایم۔ اقبال کرشن (کلکتہ ۱۴) نے ادارہ کے دارالمطالعہ کے لئے انگریزی "سنڈے اسٹیٹسمین کلکتہ" اور روزنامہ "ملاپ" دہلی کا سنڈے ایڈیشن جاری کیا۔ اس کے علاوہ ادارہ کے کتب خانے کے لئے کلکتہ کی جامعات کے قدیم اردو امتحانات کے پرچے ارسال کئے اور ایک قدیم شعری گلدستہ "الشمس کلکتہ" بھی ادارے کے کتب خانے کے لئے تحفۃً ارسال کیا۔ اس کے علاوہ ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ ایک سال کے لئے اور "قومی آواز" لکھنؤ تین ماہ کے لئے تحفۃً جاری کرایا۔

(بقیہ سلسلہ "تاثرات" ص۱۱)

روزنامہ "ہند سماچار" (جالندھر)

ہندوستان کے مشہور ادبی، علمی اور فنی ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے زیر اہتمام سالہا سال سے "سب رس" کے نام سے ایک ماہنامہ باقاعدگی کے ساتھ منظر عام پر آرہا ہے۔ اس ادارہ کے بانی ہندو پاک کے مسلمہ محقق، نقاد اور ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کسی تعریف و تعارف کے محتاج نہیں۔ علم و فن کی خدمت جس گہرے انہماک اور انتہائی خلوص سے زور صاحب نے سر انجام دی ہے، اس کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتی۔ ادارہ میں کم سے کم تین ہزار کتب مختلف موضوعات پر ملیں گی جن میں سرکردہ ہستیوں کے مطبوعات اردو کے علاوہ بیش قیمت عکسی تحریریں اور قلمی نسخے بھی شامل ہیں۔ زور صاحب، ان کے رفقاء کار اور معاونین کی جد و جہد سے ادارہ کے ساتھ ایوان اردو کے نام سے ایک چار پانچ منزلہ شاندار عمارت تعمیر ہوئی۔ اس عمارت کے قیام میں بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور کے ایثار کو خاص دخل حاصل ہے۔ وہ اس لئے کہ انھوں نے از راہ علم دوستی اور ادب پروری یہ زمین جس پر آج یہ عمارت کھڑی دکھائی دیتی ہے عطیہ کے طور پر ادارے کے سپرد کر دی۔

مجیب خیرآبادی (لاہور)

ہندوستان کی کسی بھی زبان کو ایسی عمارت رکھنے کا فخر حاصل نہیں ہے۔ یہ محض ڈاکٹر زور کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اردو زبان کو یہ قیمتی سرمایہ حاصل ہے۔

(مطبوعہ ملاپ۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۱ء)

۱۹۶۰ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

		موضوع	صفحات	سائز	قیمت
۱۔ ادارہ ۱۹۵۹ء میں	از۔ محمد جمال الدین	تذکرہ	۶۴	۱/۸ کراؤن	۵۰ پیسے
۲۔ دیوان عشق	" پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی	کلام	۱۳۶	۱/۱۶ "	۱ روپیہ ۵۰ پیسے
۳۔ نذر معانی (متعلق محمد قلی قطب شاہ)	" وقار خلیل	تذکرہ	۴۴	۱/۸ "	ایک روپیہ
۴۔ اردو املا	" غلام رسول	—	۵۶	۱/۱۶ "	۵۰ پیسے
۵۔ تاریخ ادب اردو (اشاعت چہارم)	" ادارہ	تذکرہ	۱۶۰	" "	۲ روپے
۶۔ تماشائے اہل ہنر (ڈرامے)	" سید رشید الحسن ایم۔اے	ڈرامہ	۸۰	" "	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
۷۔ سمندری عجائبات	" احمد حسین نقوی	سائنس	۸۰	" "	"
۸۔ سوغات	" مجلس انتظامی عمارت	تذکرہ	۵۶	۱/۸ "	"
۹۔ سووے نیر (انگریزی)	" دلدار حسین انجنیر	"	—	" "	"
۱۰۔ مقام غالب	" پروفیسر مبارز الدین رفعت	"	۱۶۰	۱/۱۶ "	دو روپے
۱۱۔ تذکرہ نوادر ایوان اردو	" ڈاکٹر زور	"	۲۲۰	۱/۸ "	سات "
۱۲۔ تعارف ایوان اردو (انگریزی)	" ادارہ	"	۲۴	—	بلا قیمت
۱۳۔ راشٹرپتی ایوان اردو میں (با تصویر)	" "	"	۱۲	—	"
۱۴۔ تصاویر سلاطین قطب شاہی (۸ تصویروں کا پوسٹ کارڈ سائز کا مکمل سٹ)					ایک روپیہ ۵۰ پیسے

زیر طبع کتب

۱۔ دیوان ہاشمی (ریختی)	از۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل	کلام	۱/۱۶ کراؤن	
۲۔ تحفۃ الشعراء (افضل بیگ قاقشال)	" پروفیسر سید محمد	تذکرہ	" "	
۳۔ حدیقۃ السلاطین (مرزا نظام الدین احمد)	" علی اصغر بلگرامی	تاریخ	۱/۸ رائل	
۴۔ تاریخ ناندیڑ	" مرزا احمد علی بیگ جہانی	"	۱/۸ کراؤن	۲ روپے
۵۔ تذکرۂ مخطوطات (جلد ششم)	" ڈاکٹر زور	تذکرہ	" "	
۶۔ غزل در غزل	" آوج یعقوبی	انتخاب کلام	۱/۱۶ "	
۷۔ ؟	" کنول پرشاد کنول	"	" "	
۸۔ پلکی پرچھائیاں	" بھارت چند کھنہ	افسانوں کا مجموعہ	" "	

۱۹۶۰ء میں تاریخ ادب اردو کی مانگ زیادہ رہی۔ چنانچہ وسط سال ہی میں اس کا تیسرا ایڈیشن قریب الختم ہوگیا تھا لہٰذا اہلِ طلب کے علمی ذوق کی تسکین کے لئے ادارے سے فوری طور پر اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن چھاپا گیا۔

تذکرۂ مخطوطات مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب کی جلد اول اس سال آوٹ آف اسٹاک ہوگئی۔ دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں جلدوں کے لئے ہندو پاکستان کے مختلف علمی و تحقیقی اداروں سے مانگ برابر جاری ہے۔

یوم محمد قلی قطب شاہؒ کے موقع پر کتاب "یادگار یوم محمد قلی" کی کافی نکاسی ہوئی اور سلاطین قطب شاہیہ کے فوٹو کارڈ بھی زیادہ تعداد میں فروخت ہوئے۔ اس کے علاوہ

کلیاتِ غواصی	مرتبہ	پروفیسر محمد بن عمر مرحوم
مولانا ابوالکلام آزاد	از	وقار خلیل
اردو دانی کی کتابیں	"	اظہر الدین
اشوکِ اعظم	"	سیدہ مہدی جیفری
تاریخ ادبیاتِ عربی	مصنفہ	ابوالفضل صاحب ایم۔اے
رفیقِ اردو	"	مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم
اردو املا	"	غلام رسول
سیرِ گولکنڈہ	"	ڈاکٹر زور
میر محمد مومن	"	"

کی مانگ اس سال زیادہ رہی۔

ادارہ کی مطبوعات کے ملنے کے پتے:

۱۔ سب رس کتاب گھر۔ "ایوانِ اردو" پنجہ گٹہ روڈ۔ حیدرآباد ۸۲ (اے پی)

۲۔ رائٹرس امپوریم پرائیوٹ لمیٹیڈ۔ سر فیروز شاہ مہتا روڈ۔ بمبئی ۱

۳۔ آزاد کتاب گھر۔ جامع مسجد۔ دہلی۔



جلوس محمد قلی قطب شاہ (ایوان اُردو کے شہ نشین کے اوپر)



محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی حیدر محل کی پہلی ملاقات چچلم کے مندر کے سامنے

اِدارے کی مطبُوعات

معاصرین کی نظر میں

سنہ ۱۹۶۰ء میں ادارے کی مختلف مطبوعات پر ہندوستان اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں جن کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ ادارے کی مطبوعات اردو دنیا میں کس نظر سے دیکھی جا رہی ہیں۔

نذرِ معانی

عوامی دور۔ نئی دہلی
بابتہ ۱۷ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

رسالۂ نذرِ معانی ادارے کی اشاعتوں کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو دو سال سے حیدرآباد میں یومِ محمد قلی قطب شاہ منعقد کر رہا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ ہماری تاریخ کی ان محبوب شخصیتوں میں سے ہے جس نے ہماری موجودہ تہذیب کو سنوارا اور سجایا ہے۔ بھاگ متی یا حیدر محل سے اس کی عشق کی داستان ایک افسانہ بن گئی ہے۔ جس سے متاثر ہو کر مخدوم محی الدین نے ایک بڑی حسین نظم لکھی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ بہت بڑا عاشق، ایک اچھا شاعر۔ عالم۔ علم پرور اور ادب نواز۔ عمدہ اور شاندار عمارتوں کا بنانے والا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عوام کا دوست تھا۔ اور اپنی ہندو مسلم رعایا کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے ہماری قوم کو تہذیبی اعتبار سے متحد کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

وہ صرف فارسی اور اردو زبان ہی کا شاعر نہ تھا اس نے تلگو میں بھی شاعری کی ہے۔ اور تلگو زبان کی بھی سرپرستی کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا نام آج بھی زندہ ہے اور ہر خیال اور ہر مذہب کے لوگ اس کا جشن مناتے ہیں گو کہ آج وفات پائے ہوئے تین سو سال ہو گئے ہیں۔ معانی محمد قلی قطب شاہ کا تخلص تھا اور زیرِ نظر رسالے میں اس کے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات ملتی ہیں۔

ہم ادارہ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زورؔ صاحب کو اس پر مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے یہ رسالہ شائع کیا ہے۔ گو کہ اس میں حیدرآباد کے موجودہ گورنر اور وزراء کی مدح سرائی ہمیں غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ سرورق پر محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ ملکہ بھاگ متی کی خوبصورت تصویر نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ (سید سجاد ظہیر)

ماہنامہ انشاء۔ کراچی
اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

نذرِ معانی، وقار خلیل صاحب مدیرِ سب رس کے مرتب کردہ مضامین و منظومات کا مجموعہ ہے جس میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دکن کی تاریخ میں محمد قلی کی شخصیت ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اس کی زندگی دکنی ہندوؤں میں ہندو مسلم تمدن کا صحیح و متوازن امتزاج پیش کرتی ہے۔ قلی شاہ اردو کا ایک بلند فکر اور بلند پایہ شاعر تھا۔ اس نے تلگو زبان کی بڑی سرپرستی کی۔ اس کی بنائی ہوئی عمارات ہندو مسلم فنِ تعمیر کی مختلف

خصوصیات کا مجموعہ ہیں۔ ان سے اس کی مذہبی رواداری کا اظہار ہوتا ہے جو در اصل اسے اپنے باپ ابراہیم شاہ سے ورثے میں ملی تھی۔ "نذر معانی" کے مضامین اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

محمد قلی شاہ کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی اور اردو کے عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کی متعدد نظموں کے موضوعات مشترک ہیں۔ بہتر تھا کہ موضوعات کے اس اشتراک پر کوئی تحقیقی مقالہ اس رسالہ میں شامل کیا جاتا۔

حصۂ نظم میں مختلف شعراء نے محمد قلی سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ "میری کہانی" اور "آج کا شہر" کافی اثر انگیز نظمیں ہیں۔

روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد
۲۰ مئی سنہ ۱۹۶۰ء

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ معانی کے حالاتِ زندگی، ان کی شاعری اور اس دور کے تہذیب و تمدن کے بارے میں لکھے گئے مضامین اور نظموں کا (جنہیں یوم محمد قلی قطب شاہ کی ۱۹۶۰ء کے سالانہ تقریب میں پڑھا گیا) یہ ایک مختصر سا خوبصورت مجموعہ ہے۔ اسے وقار خلیل نے مرتب کیا ہے جو ادارۂ ادبیات اردو کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کے ایڈیٹر ہیں۔

ابتداء میں ڈاکٹر زورؔ کی خیر مقدمی تقریر اور ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کی صدارتی تقریر درج ہے۔ اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ اور قطب شاہی دور کے بارے میں علی اصغر بلگرامی، کرشنا سوامی مدیراج، ڈاکٹر زورؔ، مبارز الدین رفعت اور محمود یوسف احمد کے مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر زور کا مضمون "محلات قطب شاہی" ایک دلچسپ معلوماتی مضمون ہے۔ حصۂ نظم میں مخدومؔ اور ڈاکٹر محشر عابدی کی نظموں کے علاوہ عظمت عبدالقیوم کی نظم اور راجکشور راہبؔ کی رباعیاں عمدہ ہیں۔ طرحی محفل شعر کے عنوان سے فراق گورکھپوری، ثاقب نظامی، ڈاکٹر اختر احمد، منظر کمال اور انور یعقوبی وغیرہ کی طرحی غزلیں دی گئی ہیں۔ "اردو کی ترقی میں دکنی ادب کا حصہ" والے سمپوزیم میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر

رفیع الدین نے حصہ لیا ہے۔

غرض بہت ہی قلیل عرصہ میں کارآمد اور مفید مضامین اور رسالہ میں جمع کئے گئے ہیں۔ اس اشاعت کے محرک ڈاکٹر زور صاحب اور ان کی یہ مساعی قابل مبارکباد ہیں۔

رسالہ "خیال" کاٹی
مارچ سنہ ۱۹۶۱ء

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اور ڈاکٹر زورؔ، اردو زبان و ادب کے دو ایسے نام ہیں جنہیں تاریخ اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس ادارہ کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان و ادب کے بہت سے لازوال کام انجام دیئے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے اس ادارہ کے زیر اہتمام اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی نگرانی میں بانی حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ معانی کا ہر سال ماہ جنوری میں عظیم الشان یادگار دن منایا جاتا ہے۔ گزشتہ سال اس جلسے کی صدارت بی گوپال ریڈی وزیر آمدنی و سیول مصارف حکومت ہند نے کی تھی۔ اور اس سال بھی موصوف اس فرض کی ادائیگی کے لئے دہلی سے حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ شری گوپال ریڈی کی شخصیت اردو والوں کے لئے اب کافی محبوب بن گئی ہے۔ یہ فرض شناس اور حساس انسان ان بلند انسانوں میں سے ایک ہے جن کی نگاہ میں سب برابر ہوتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی یوم محمد قلی قطب شاہ کی یادگار ہے جسے سب رس کے لائق مدیر جناب وقار خلیل صاحب نے محنت اور سلیقہ سے مرتب فرمایا ہے۔ اس میں ڈاکٹر زورؔ صاحب کے خطبۂ استقبالیہ اور شری گوپال ریڈی صاحب کے خطبۂ صدارت کے علاوہ سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی پر سید علی اصغر بلگرامی، کرشنا سوامی مدیراج، ڈاکٹر زورؔ، مبارز الدین رفعت اور محمد یوسف احمد کے تحقیقی اور علمی مضامین ہیں۔ سمپوزیم کے حصے میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر نارنگ، پروفیسر نجیب اشرف اور اکبر الدین صدیقی صاحب کے نام ہیں۔ "گولکنڈے کی رات" کے عنوان سے اکرام جاوید کا ایک اچھا افسانہ اور "محمد قلی قطب شاہ" کے نام سے افضل محمد کا ڈرامہ بھی شریک ہے۔ حصۂ نظم اور طرحی محفل شعر میں بہت سی نظمیں اور غزلیں شریک

تصویروں میں بھاگ متی، محمد قلی اور یوم محمد قلی کے جلسے کی تصاویر بھی شامل ہیں۔

روزنامہ "سیاست" حیدرآباد
۱۸ر جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور صاحب کی تحریک و تجویز سے ہر سال ۱۱۔ جنوری کو گولکنڈے میں "یوم قلی قطب شاہ" کا انعقاد اب ایک سلسلہ بن گیا ہے چنانچہ تیسرا یوم قلی قطب شاہ ۱۱ر جنوری سنہ ۶۰ء کو بڑے اہتمام سے منایا گیا اور اس موقع پر ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے ایک کتاب بنذرِ معانی شائع کی گئی جسے جناب وقار خلیل صاحب نے مرتب کیا ہے اور جس میں اپنے مضامین نثر و نظم شریک کئے گئے ہیں جو دوسرے یوم قلی قطب شاہ کے موقع پر لکھے گئے اور سنائے گئے تھے۔ اس کتاب کو ہر اعتبار سے جامع بنانے کے لئے قطب شاہی عہد پر ایک افسانہ اور ایک ڈرامہ بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ۱۴۴ صفحات ہیں۔ سرورق بھاگ متی کی حسین و دلکش تصویر سے مزین ہے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ یہ کتاب ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

کلیاتِ غواصی

کتابی دنیا، کراچی
اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

اس کتاب کے مؤلف حکومت دکن کی نذر سے ترکی زبان سیکھنے کے لئے ترکی بھیجے گئے تھے او وہیں ان کا انتقال ہو گیا جب ان کا سامان وغیرہ واپس حیدرآباد آیا تو ان کی بیگم نے کلیات غواصی کا مسودہ ادارۂ ادبیات اردو کے حوالے کیا تاکہ وہ اس کی طباعت کا انتظام کرے۔ چنانچہ وہی مسودہ اب کتابی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ مؤلف نے متعدد قلمی نسخوں [illegible] مدد سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ کچھ کلام جسے انھوں نے [illegible] قرار دیا تھا اس ایڈیشن میں نہیں ہے۔ غواصی کا سن وفات

۹ء ۱۰ صفحے ہے۔ اس حساب سے ان کی زبان تین سو سال پرانی ہے اگرچہ کہیں کہیں وہ بہت صاف ہو گئی ہے اور بالکل موجودہ اردو جیسی ہے۔

کتاب ہذا میں غواصی کے قصیدے، غزلیں، رباعیاں، مثنویاں، مرثیے وغیرہ سبھی کچھ درج ہیں۔ یہ سب دکنی زبان میں ہیں۔ کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ غواصی کس درجہ قادر الکلام شاعر تھا۔ اردو زبان کے ارتقاء میں دکنی شاعروں نے جو حصہ لیا ہے اسے کسی نوع نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مقدمہ ڈاکٹر زور مرحوم کا تحریر کردہ ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو اس کتاب کی اشاعت پر قابلِ مبارکباد ہے۔

فاران کراچی
اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

ادارۂ ادبیاتِ اردو جس استقامت اور خلوص کے ساتھ اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے وہ قابلِ رشک بھی ہے اور مستحقِ تبریک و تحسین بھی۔ اس کتاب پر اس سلسلۂ مطبوعات کا ۲۴۲ نمبر درج ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اتنی بہت سی کتابیں شاید کسی علمی ادارہ نے شائع نہیں کیں۔ اور وہ بھی اتنی کم مدت میں۔

ملا غواصی گولکنڈے کے ملک الشعراء سمجھے جاتے تھے اور عہد محمد قلی میں آج سے تقریباً چار سو سال قبل ان کا عالم شباب تھا۔ ایسا باکمال شاعر کے کلام کو پروفیسر محمد بن عمر نے مرتب فرما کر اس پر بڑی تحقیق و کاوش کے ساتھ دیباچے میں لکھا ہے۔ اور غواصی کے ہمعصر مثنوی گو شعراء وجہی اور ابن نشاطی کے شعروں سے مقابلہ کیا ہے۔ مقدمہ ڈاکٹر زور نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کلیاتِ غواصی کے قصیدے، غزلیں، رباعیات، نظمیں، مثنویاں، ترکیب بند اور مرثیے درج ہیں۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ سب سے چار سو سال پہلے غواصی نے اتنے صاف شعر کہے ہیں۔

قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، ابن نشاطی، محمد نادر، شفیق، ولی وغیرہ یہ وہ شعراء ہیں جو اردو زبان اور اردو شاعری کے نقاشِ اول اور محسن ہیں۔ انہیں کی لگائی ہوئی بیج ہمارے زمانے میں پھلی پھولی اور برگ و بار لائی۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو

نے یہ کتاب چھاپ کر اردو کے سلسلۃ الذہب کو اب تک استوار کر دیا ہے۔ اردو زبان کے محققین کو ان کتابوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ
جون ۱۹۶۰ء

"ملا غواصی" محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعراء تھے۔ ان کا دیوان نایاب تھا۔ پروفیسر محمد بن عمر مرحوم ان کا دیوان مرتب کر رہے تھے۔ لیکن بدقسمتی یہ کہ وہ قبل از تکمیل وفات پا گئے۔ اب ان کے مرتب شدہ مسودہ پر نظر ثانی کر کے ڈاکٹر زور صاحب نے اسے شائع کر دیا ہے یہ بہت اچھا کام ہوا ہے اس لیے کہ غواصی کا کلام ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے اور دکنی ادب میں اس کا کلام بڑا پایہ رکھتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد
۱۶ ستمبر ۱۹۶۰ء

ادارہ کی کتاب "کلیات غواصی" ہے جس کو محمد بن عمر مرحوم ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی مرتب کر چکے تھے اور مقدمے کی تکمیل نہ کرنے پائے تھے کہ غریب الوطنی میں انہیں پیام اجل آ پہنچا اور ترکی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

غواصی دکن کا بہت بڑا شاعر ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں اس نے اپنی آخری زندگی گزاری۔ باوجود اس کے کہ محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعراء وجہی نے شعر و شاعری میں کافی نام پایا وہ زندہ تھا لیکن غواصی کے سامنے اس کی شہرت ماند پڑ گئی۔ غواصی نے عبداللہ قطب شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی اپنی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور ملک الشعراء بن گیا۔ وجہی اور غواصی میں شاعرانہ نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میدان شاعری کے یہ دو ہی شہسوار تھے اور غواصی سب میں ممتاز تھا۔ اس نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد، غزلیں، رباعیاں، نظمیں، مثنویاں، ترکیب بند، مرثیے وغیرہ سب ہی لکھے ہیں اور اپنی استادانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے قصائد بہت شاندار اور طمطراق کے ہیں۔ غزلیں انتہائی سبک اور دلآویز ہیں۔ دیگر اصناف کا بھی یہی حال ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کا مخزونہ دیوان جس سے یہ کلیات مرتب کیا گیا ہے بہت ناقص ہے پھر بھی اس میں تین سو سے زائد صفحات ہیں۔ اس کلیات میں بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جو اصل کلیات میں موجود ہیں۔ کرم خوردگی کی وجہ سے جو اشعار حذف کر دیے گئے ہیں انہیں اگر باقی رکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی دوسرا نسخہ مل جائے اور آئندہ کبھی اس کی تکمیل ہو سکے۔

آج کی زبان اور گیارھویں صدی ہجری کی زبان میں بہت بڑا فرق ہے اس لیے مناسب ہوتا کہ کتابت واضح اور روشن ہوتی اور دکنی الفاظ کی فرہنگ دے دی جاتی۔ کلیات کی اشاعت سے تحقیقات کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔ ابھی تک معانی یعنی قطب شاہ اور ولی کی شاعری کے چرچے رہے۔ اور متنوع مضامین اور قوافی و ردیف میں اس کے پاس غزلیں ملتی ہیں۔ لیکن تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولی نے غواصی ہی کے دیئے سے اپنی شمع جلائی۔ اس سلسلے میں مرتب مرحوم نے بھی کچھ کام کیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ مسودہ بھی نہ مل سکا

غواصی کی شاعری ایک پہاڑی ندی یا ایک طوفانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ ہر قسم کے جذبات بے تکان نظم ہوتے جاتے ہیں۔ اس پر غواصی کو بھی بجا طور پر ناز ہے۔ ایک ڈرامہ "وہمی" بھی ادارہ سے شائع ہوا ہے جس کو وزیر حسن دہلوی نے لکھا ہے۔ اس میں مولیئر کے ایک ڈرامے کو اردو میں ہندوستانی خدوخال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے نہایت چابکدستی اور فنکاری سے مولیئر کے مزاحیہ انداز کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈرامے میں ایک لکھ پتی محض اپنے وہم کی بنا پر زندگی کو اجیرن بنا لیتا ہے۔ تحریر میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ نہیں۔ زبان و بیان کی خوبیاں وزیر حسن صاحب کی تحریر کی جان ہیں۔ ہمارے ادب میں ایسے ڈراموں کا فقدان ہے اور مزاحیہ ڈرامے تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ادارہ نے اس ڈرامہ کو شائع کر کے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

تذکرۂ مخطوطات جلد پنجم

ماہنامۂ فروغ اردو لکھنو
ماہ جون ۱۹۶۰ء

ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطات کی یہ پانچویں جلد ہے۔ اس میں ڈھائی سو مخطوطات پر بحث کی گئی ہے۔ پچھلی جلدوں کی طرح یہ جلد بھی انہیں خصوصیات کی حامل ہے جن کا ذکر پیشتر کی جلدوں کی تنقید کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ مخطوطات کی اطلاع توضیحی اور تحقیقی فہرستیں تیار کرنا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ اور ادارے کا نام یقیناً تذکروں کے باعث یادگار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد باقر
۔ فروری ۱۹۶۰ء

آپ نہایت مبارک کام کی تکمیل میں مشغول ہیں۔ آپ کے ہاتھ کی تالیفات تمام دنیا کے علم میں صرف اضافہ کرتی ہیں اور طالبان شوق کی راہنمائی اور تسکین کا باعث بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق بیشتر عطا فرمائے۔ آمین

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد
۱۷۔ ستمبر ۱۹۶۰ء

ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ کی اہمیت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ چنانچہ اس کتب خانہ کی مخطوطات کی چار اور مطبوعات کی دو فہرستیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر تبصرہ تذکرہ مخطوطات کی پانچویں جلد ہے۔ جس میں نشانات سلسلہ ۹۰۱ تا ۱۱۵۰ یعنی ڈھائی سو کتابوں کا تذکرہ ہے۔ تذکرہ کی اہمیت کا اندازہ وہی اصحاب زیادہ بہتر کر سکتے ہیں جو تحقیقاتی کام انجام دے رہے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے مرتبہ تذکرے ایک عام آدمی کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں صرف کتابوں کا ہی ذکر نہیں ہوتا بلکہ مصنف، کاتب اور متعلقہ اشخاص و مقامات کی بھی تفصیلات ملتی ہیں۔ کئی شعرا کے کلیات اور دیوان صوفیوں کے مسائل اور مذہبی کتابیں، مورخوں کی تاریخیں اور تذکرے صاحبان ذوق کی بیاضیں، یادداشتیں اور خطوط کا حال درج ہے۔ یہاں ان کا تفصیلی ذکر ناممکن ہے۔ تذکرہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنی محنتِ شاقہ، دیدہ ریزی اور جگر کاوی کے بعد منتشر کتاب کے اوراق کو ایک جگہ جمع کیا اور اس کو کتاب کی شکل دی اس کی حفاظت کا اہتمام کیا اور پھر اس پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ مرتب کے علاوہ وہ اصحاب بھی قابلِ مبارک باد ہیں جنہوں نے مخطوطات کی اہمیت کو سمجھا۔ ان کو ضائع ہونے سے بچایا اور عوام کی استفادہ کے لئے کتب خانہ کو بطورِ عطیہ عنایت فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے اصحاب کی فہرست ابتدا میں دے دی ہے

اُردو اِملا

اُردو نامہ سہ ماہی
نومبر ۱۹۶۰ء کراچی

زیرِ نظر کتاب ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ لائق مؤلف نے اردو املا کے قاعدوں کو باضابطہ طریقہ پر کتابی صورت میں یکجا کردیا ہے۔

غلام رسول صاحب نے اردو املا پر جو کچھ سوچا تھا اُسے کتابی صورت میں ترتیب دیکر اس موضوع پر کتب نویسی میں پہل کی ہے۔ کتاب کے شروع میں ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد اعزازی اور ہندوستانی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر زور صاحب کا پیش لفظ ہے جس میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کے املا کی مدون صورت پر اس طرح اظہار رائے کیا گیا ہے۔

" اردو اب ہندوستان اور پاکستان کی حدوں کو توڑ کر بہت دور دور پھیل چکی ہے۔ اور روس اور امریکہ جیسے دور دراز اور اہم ممالک میں بھی اس کی تعلیم و تعلم کا انتظام کیا جارہا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری تھا کہ اُردو املا کے بارے میں ایک سائنٹفک کتاب مرتب کی جاتی۔"

اس کے بعد مؤلف نے "چند اشارے" کا عنوان قائم کرکے اردو املا کے لئے باضابطہ قواعد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ چونکہ اردو میں غیر زبانوں کے بعض لفظوں کے صحیح تلفظ کے لئے اعراب

موجود نہیں ہیں اعراب ان کو تحریر کرتے وقت بڑی دقت ہوتی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے چار نئے اعراب دریافت کئے ہیں۔

اس کتاب میں اردو اعراب، حرفوں کی ملاوٹ، املا کے قاعدے، لفظوں کے جوڑ اور جملے، طوال اور طبق حلقی آواز حروف کے جملے، رموز اوقاف اور ان کا استعمال جیسے ابواب کی وضاحت کے ساتھ مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔ مؤلف نے اپنے دیرینہ تجربے سے فائدہ اٹھا کر ضروری اور کام کی باتیں یکجا کر دی ہیں۔ تمام اردو داں اصحاب بالخصوص اساتذہ، طلبہ اور انشا پردازوں کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ
بابت جولائی ۱۹۶۰ء

اردو زبان کی تعلیم اس دور میں جس قدر غیر ذمہ داری کے ساتھ ہو رہی ہے شاید کسی دور میں کسی زبان کی تعلیم اس انداز سے نہ دی جاتی رہی ہو۔ ہمیں اس وقت اور بھی زیادہ مایوسی ہو جاتی ہے جب اردو کے محققین غلط املا لکھتے ہیں اور غلط اصطلاحات پر اصرار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کی اساسی تعلیم سے وہ تقریباً نابلد ہوتے ہیں اور محض قیاس آرائی پر دلائل کے قلعے استوار کرتے ہیں۔ ضرورت ہے اسباب کی کہ وہ نہ صرف اپنی زبان کو سمجھیں بلکہ اس کے مزاج سے آشنا بھی ہوں۔

"اردو املا" غلام رسول صاحب نے طالب علموں کے لیے لکھی ہے لیکن ہم اردو کے ڈاکٹروں سے گزارش کریں گے کہ وہ بالخصوص اس کا مطالعہ کریں اور صحتِ زبان کے اصول و قوانین سے آگاہی حاصل کریں۔ یہ مختصر سی کتاب ان کے لئے بیحد مفید رہے گی۔

ماہنامہ "پگڈنڈی" امرتسر
جون ۱۹۶۰ء

ادارہ ادبیات اردو، ہندوستان کے ان چند علمی و ادبی اداروں میں سے ایک ہے جو خاموشی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور اہم علمی موضوعات پر اچھی کتابیں چھاپ کر اردو کو سربلند کرتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب جسے جناب غلام رسول صاحب سابق لائبریرین سٹی کالج حیدرآباد نے لکھا ہے، اسی ادارہ سے شائع ہوئی ہے جو نہایت اہم موضوع سے بحث کرتی ہے۔

مثال کے طور پر انگریزی ہی بار بار سامنے آتی ہے۔ آپ کوئی کتاب انگریزی کی اٹھا کر دیکھ لیجئے، سارا املا، اسٹاپ، کولن، سیمی کولن، ڈیش سب اپنی اپنی جگہ ملیں گے۔ املا میں کبھی فرق نہیں ہوگا۔ یہ نہیں کہ ایک لفظ G سے لکھ دیا اور دوسری جگہ وہی لفظ J سے لکھا ہوا ملے۔ لارڈ میکالے نے ایک بار لکھا تھا کہ دس ہزار میں ایک لندن کا باشندہ بھی WILL اور SHALL کے محل استعمال کا یقین نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود دس لاکھ میں ایک لفظ مشکل سے نکلے گا جو ان کا غلط استعمال کر جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی قاعدہ و املا کے ضابطے بنے ہوئے ہیں اور کوئی شخص ان سے تجاوز کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اپنی اپنی سمجھ سے سب بحث کرتے ہیں لیکن وہ بھی بہر حال میں لازماً قابلِ قبول نہیں ہو گیا۔ اردو کے لئے یہ بڑی شرمناک بات ہے کہ نہ اب تک اس کی تحریروں میں رموزِ اوقاف کا احترام ہے نہ املا میں صحت کو سختی سے مدنظر رکھا جاتا ہے۔ نہ اس سلسلے میں کوئی تجویز سامنے آتی ہے اور آتی ہے تو اس پر سنجیدگی سے غور بھی نہیں کیا جاتا۔

جناب غلام رسول نے بہت ہی اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بعض مفید مشورے اور تجویزیں بھی دی ہیں۔ اگر انہیں قبول کر لیا جائے تو نہ صرف اردو زبان کی تعلیم و تدریس میں آسانی ہو سکتی ہے بلکہ رسم الخط میں یکسانی اور یک رنگی بھی پیدا ہوگی۔

دو ماہی "گجر" لاہور
بابت ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۰ء

اردو اپنی مقبولیت اور تعلیم و تعلم کے اعتبار سے پاکستان اور بھارت کے علاوہ اور بھی کئی ممالک کی جغرافیائی حدود پھاند چکی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس کی املا کی درستگی کی طرف توجہ دی جائے۔ تاکہ ہر کوئی من مانے طریق پر لکھنے کے بجائے ایک باضابطہ اور سائنٹفک انداز تحریر کو اپنائے۔ اس سے اس زبان کا وقار بھی بڑھے گا اور نئے سیکھنے والوں (خاص طور پر غیر ملکوں) کو اس کے سمجھنے، پڑھنے اور لکھنے میں زیادہ سے زیادہ سہولت ہوگی۔ اردو کی یہ بڑی ٹھوس اور پائیدار خدمت ہے جس کی طرف (مولوی) غلام رسول صاحب نے توجہ دلائی ہے اور کئی قابلِ غور تجویزیں پیش کی ہیں۔

چونکہ اردو کا رسم الخط "اعرابی" ہے۔ اور اس میں کئی زبانوں کے

ماظ داخل ہیں۔ اس لئے بعض اوقات ان کے صحیح لکھنے اور پڑھنے میں
ی دقت ہوتی ہے۔ مؤلف نے بعض جدید اعراب علامتیں بھی تجویز
ا ہیں۔ یہ کتابچہ، ماہرینِ لسانیات، اساتذہ اور طلبا کے لئے
یساں جاذبیت رکھتا ہے۔

دیوان عشق

ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی
بابت جولائی ۱۹۶۰ء

محمد جمال اللہ عشقؔ اورنگ آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ مرتب کے قول کے مطابق "عشقؔ کی شاعری کل عاشقانہ ہے۔ اس میں مضامین کا تنوع نہیں، فلسفیانہ خیالات ہیں، پند و نصائح کا دفتر نہیں۔ پورا دیوان مطالعہ کر جایئے ایسا وہی ا گل و بلبل اور عشق و عاشقی سے مملو نظر آئے گا۔ اس لئے گمان ہوتا ہے کہ ایسے فرسودہ اور پامال مضمون میں عشقؔ نے یا تیر مارا ہوگا۔ لیکن عشقؔ نے ایسی فرسودگی میں بھی اپنے لئے نئی نکالی" تبصرہ نگار مرتب کے اس خیال سے پورے طور پر متفق ہے۔

سارا دیوان پڑھنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عر دنیائے عشق کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ وہ عاشقانہ جذبات بسا اوقات ایسے انداز سے باندھتا ہے کہ لطف آ جاتا ہے۔ ان کی ن قدر پرانی ہے اس لئے کہ ان کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ مگر زبان صاف ہے، کہیں بھی ژولیدگی نظر نہیں آتی۔ بعض الفاظ کے زمانے میں مذکر تھے مگر آج کل وہ مونث ہیں مثلاً حمد، جان وغیرہ دیوان کے آخر میں ایک مثنوی ہے جو خاصی دلچسپ ہے۔
علاوہ حمد جہاں شاعر نے قسمیں کھائی ہیں بہت زور دار ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اردو زبان پر کس قدر قدرت حاصل ی۔ مومن کی طرح شاعر نے متعدد جگہ اپنے تخلص کو بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ شروع میں مرتب نے جو عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار ہیں، ایک جامع مقدمہ لکھا ہے۔

ماہنامہ آج کل دہلی
اکتوبر ۱۹۶۰ء

کتاب مقدمہ، غزلیات، رباعیات، مثنوی اور تضمینوں پر مشتمل ہے۔ مرزا جمال اللہ عشقؔ اورنگ آبادی داؤدؔ کے بیٹے تھے۔ داؤدؔ سراج کے ہمعصر ہوئے ہیں۔ داؤدؔ، ولیؔ کا تتبع بڑے احترام سے کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض تذکرہ نگار انہیں ولیؔ کا شاگرد بھی بتاتے ہیں۔ جو مشتبہ ہے۔ فاضل مرتب نے مقدمے میں عشقؔ کے حالات اور کلام کا جائزہ لیا ہے۔ (عرش ملسیانی)

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد
۲۸ جون ۱۹۶۰ء

دیوان عشق۔ مرتبہ جناب محمد اکبر الدین صدیقی۔ نہ جانے دکن میں کتنے ایسے شاعر گزرے ہوں گے جو اپنے وقت کے مسلّم الثبوت استاد ہونے کے باوجود دستبرد زمانہ کا شکار ہوگئے اور ان کی وفات کے بعد یا تو ان کا لائق قدر سرمایہ شعر و شاعری برباد ہوگیا یا پھر اس پر گمنامی کے پردے پڑے رہے نتیجتاً انہیں وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جس کے وہ اپنے مرتبۂ شاعری کے لحاظ سے مستحق تھے۔

اگر ایسے تمام شاعروں کے دیوان تلاش و جستجو کے بعد شائع کئے جائیں تو آج کی اردو دنیا ان کی اعلیٰ شعری صلاحیتوں سے کماحقہٗ واقف ہوسکے گی۔ اس کے علاوہ ایسی صورت میں قابلِ مطالعہ ذخیرۂ شعر و سخن میں بھی معتدبہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

حیدرآباد دکن میں ادارۂ ادبیاتِ اردو نے چند ہفتے پیشتر مرزا جمال اللہ عشقؔ اورنگ آبادی کے دیوان کو شائع کیا ہے جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی لکچرر اردو سیف آباد کالج حیدرآباد دکن نے بڑی تحقیق و کاوش اور دیدہ ریزی سے اسے مرتب کیا ہے دیوان عشقؔ کے مقدمہ میں جناب صدیقی صاحب نے عشقؔ کی زندگی کے حالات اور ان کی شاعری پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں اور ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں عشقؔ کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے۔ البتہ چند سال پیشتر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع شدہ کتاب "مرقع سخن جلد اول" میں عشقؔ اورنگ آبادی پر ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں نصیر الدین ہاشمی صاحب کے کتب خانہ میں عشقؔ کے ایک دیوان کا ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔

عشقؔ کی زندگی کے حالات جسقدر معلوم ہوسکے اس کی بنا پر بیکہا جاتا ہے کہ وہ دلو داود نگ آبادی کے فرزند تھے۔ اور اسد علی خاں تمناؔ کے ہم عصر۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ عشقؔ نے کہیں کہیں اپنے اشعار میں احسانؔ تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن زیر نظر دیوان کی غزلوں میں ان کا تخلص صرف عشقؔ ہی ملتا ہے۔

عشقؔ کا کلام دلی واردات و کیفیات کا آئینہ دار ہے ان کی محبت پاکیزہ ہے۔ انہوں نے اگرچہ عاشقانہ مضامین کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پھر بھی ان کے اشعار میں عامیانہ پن نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ان اشعار کی صورت میں عشقؔ نے انسان کے لطیف جذبات کی بخوبی ترجمانی کی ہے۔

قدیم شاعروں کے کلام کی اشاعت سے اردو زبان کے تدریجی ارتقاء اور لسانی تغیرات کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ مختلف ادوار کے شعراء کے تقابلی مطالعے سے لسانیاتی نقطۂ نظر سے الفاظ کی تراش خراش اور ان میں پیدا ہونے والے بتدریج نکھار کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جناب اکبرالدین صدیقی نے اردو زبان و ادب کی لائق تحسین خدمت انجام دی ہے۔ کیونکہ مکمل دیوان عشقؔ شائع کرکے انہوں نے ایک خاص دور کی زبان کو محفوظ کردیا ہے۔

وہمی

| منقول از رسالہ "انشاء" کراچی
بابتہ ماہ جون ۱۹۶۰ء |

زیر نظر ڈرامہ فرانس کے نامور مزاح نگار مولیر کے مقبول و مشہور آخری ڈرامہ کا آزاد ترجمہ ہے۔ جسے وزیر حسن دہلوی نے پیش کیا ہے۔ مولیر کے ڈرامہ کا ماحول اور کردار خالصاً فرانسیسی تھا وزیر حسن صاحب نے حیدرآباد کی فضاء پیش کی ہے۔ دہلوی صاحب کا یہ تجربہ یقیناً کامیاب اور قابل داد تجربہ ہے۔ اردو میں بے شمار انگریزی ڈراموں اور ناولوں کے ترجمے کئے گئے ہیں۔ لیکن ان کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو انہیں ان ممالک میں حاصل تھی۔ اس کی ایک اہم وجہ ماحول اور فضاء کا اختلاف ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہمارے مترجم یورپ کے اعلیٰ ڈرامے اور ناول ماحول اور کردار کی تبدیلی کے ساتھ اردو میں منتقل کردیں۔

وزیر حسن نے وہمی کو حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور ڈرامے کا اہم جزو تین وحدتیں خیال کی جارہی ہیں۔ اور یورپ کے تقریباً تمام نقاد اور ڈرامہ نویس ان تینوں وحدتوں کا احترام کرتے آئے ہیں۔ دہلوی صاحب نے بھی ان وحدتوں کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ موصوف نے مکالموں میں بڑی سلیس اور رواں زبان استعمال کی ہے۔

کتابچہ

ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۵۹ء

| روزنامہ سیاست حیدرآباد
۱۱۔ مارچ ۱۹۶۰ء |

حیدرآباد کا ادارہ ادبیات اردو علم و ادب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دے رہا ہے اس کا احساس اب عام ہوتا جارہا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس ادبی ادارے نے اپنی مختلف سرگرمیوں کے ذریعہ سے اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دیں ان کا مجمل تذکرہ مہتمم ادارہ جناب محمد جلال الدین نے مرتب کرکے شائع کردیا ہے۔ اس میں اکابر علم و ادب اور رسائل و جرائد کے تاثرات پیش کئے گئے ہیں۔ علمی، ادبی اور کلچرل مصروفیات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اور ادارے کی مطبوعات پر ملک کے رسائل اور اخبارات نے جو تبصرے شائع کئے ہیں ان کے اقتباسات شائع کردیئے گئے ہیں۔ بعض غیر ضروری تفصیلات اور غیر اہم باتیں بھی شائع کی گئی ہیں جو نہ شائع کی جاتیں تو بہتر ہوتا۔ آئندہ اس قسم کی کتابوں کی اڈیٹنگ میں احتیاط اور قوت امتیاز سے کام لیا جائے تو مناسب ہوگا۔ جو حضرات ادارۂ ادبیات اردو کے پچھلے سال کی سرگرمیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں وہ یہ کتاب بچاس نئے پیسے میں سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدرآباد سے طلب کریں۔ اس کتاب میں تصاویر

بھی شائع کی گئی ہیں۔ کتابت وطباعت بھی اچھی ہے۔

ہفتہ وار نیا یگ نئی دہلی
مورخہ ۲۰۔ مارچ ۱۹۶۰ء

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی سرگرمیاں۔
ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن ملک کے ان گنے چنے اداروں میں سے ہے جو اردو کی ترقی کے لئے بہترین کام کر رہا ہے۔ یہ ادارہ ڈاکٹر زورؔ کی نگرانی اور سرپرستی میں پچھلے تین سال سے اردو دان طبقے کی خدمت کر رہا ہے۔ اس ادارے کے مختلف شعبوں میں اردو ادب کے متعلق ریسرچ، تالیف وتصنیف۔ اور ترجمے وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی سنہ ۱۹۵۹ء میں سرگرمیوں کے متعلق ایک کتابچہ ہمیں برائے ریویو موصول ہوا ہے اس کتابچہ میں ادارے کی مختلف النوع سرگرمیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ادارے کے زیر اہتمام ادبی جلسے، مشاعرے اور نمائشیں وغیرہ بھی ہوتے ہیں جن سے اردو ادب کی ترقی کے لئے نئی راہیں کھلتی رہتی ہیں۔ بچوں کے لئے بھی مفید لٹریچر شائع کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ اردو ادب کی ایک نمایاں خدمت سرانجام دے رہا ہے جو قابلِ تعریف ہے۔ اردو دان طبقہ کو چاہئے کہ ادارے کی جہاں تک ہو سکے مالی و دوسرے طریقوں سے مدد کی جائے۔

سندیش ویکلی۔ رائچور
۲۵ مارچ ۱۹۶۰ء

ادارۂ ادبیات اردو نے جنوبی ہند کے ایک تحقیقی اور علمی مرکز کی حیثیت سے پچھلے تائیس سالوں سے جو خدمات انجام دی ہیں ان کے متعلق کچھ کہنا اس لئے فضول ہے کہ یہ بات اب عام ہو گئی اور سارے ہندوستان کے اردو جاننے والے یہ بات جانتے ہیں۔ لیکن اس ادارے نے جناب سید محی الدین قادری زورؔ کی نگرانی میں جو سائنٹفک تحقیقاتی کام انجام دیا ہے اور جو مخطوطات واسناد یہاں محفوظ رکھے گئے ہیں وہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں اور ظاہر ہے کہ عوام سے زیادہ اسی لئے دانشور حضرات ہی ادارے کی مدح سرائی کرتے ہیں۔

ہر سال ادارے کی سالانہ رپورٹ تصاویر اور ڈائری کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔ جس سے ہمیں نہ صرف ادارے کی کارگزاری معلوم ہوتی ہے بلکہ اردو ادب کی ترقی کی رفتار کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اور جمود والی باتیں محض کسی قنوطیت پسند کا اہل نقاد کی کوتاہی کہی جا سکتی ہیں۔ ادارے نے اس سال چودہ علمی وادبی کتابیں شائع کی ہیں جو اس دور کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں۔ توقع ہے کہ ہر سال اشاعتی پروگرام ترقی کرتا جائے گا۔

ہندوستان کا ہر اردو داں ایسے اداروں کی ترقی کے لئے یقیناً دست بدعا ہے۔

(مولوی) احترام الدین احمد شاغلؔ
صدر انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور
۲۱۔ اپریل ۱۹۶۰ء

"ادارۂ ادبیات اردو سنہ ۵۹ء میں" موصول ہوئی۔ یاد آوری کا شکریہ۔
دورِ جدید میں صالح ادب کا ارتقاء ہمارے معاشرے کی اہم ترین ضرورت ہے اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ ادارۂ مذکور نے اپنی وسائل کی تخصیص کے بغیر نشرواشاعت کے ذریعے اس کی تکمیل کے لئے انتھک جدوجہد کی ہے اور کر رہا ہے۔ اس ضمن میں ادارے نے نئی کتابیں بھی شائع کیں اور پرانی کتابوں کو فرہنگ ودیباچے سے آراستہ کر کے زیورِ طبع سے سجایا۔ اور حیاتِ جاوید بخشی۔ قدیم وجدید کا یہ حسین امتزاج ہماری گنگا جمنی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ خصوصاً قطب شاہی دور کے متعلق جو تحقیقات کی ہیں اور ان کو جس حسن اور سلیقے کے ساتھ منظرِ عام پر پیش کیا ہے وہ لائق صد ستائش ہے کیونکہ اسلاف کے کارہائے نمایاں سے اخلاف کو روشناس کرانا صرف زبان وادب ہی کی خدمت نہیں بلکہ روح کو روحانی آسودگی پہنچانے کا ایک موثر ذریعہ بھی ہے۔

زیر نظر کتابچے کے مطالعہ سے جس میں مشاہیر کے تاثرات، ادارے کی علمی وادبی وکلچرل مصروفیات نیز تعاون وامداد واعانت ادارے کی مطبوعات پر معاصرین کے تبصرے کتب خانہ اور دار المطالعہ اور اس سے استفادہ۔ اردو امتحانات اور موازنہ وغیرہ شامل ہیں۔

ادارے کا کتب خانہ

اس سال کتب خانہ میں کافی اضافہ ہوا۔ معطیین حضرات نے اپنی علم دوستی اور علم نوازی کا ثبوت دیا اور بڑی تعداد میں کتب خانہ ادارہ کو قلمی و مطبوعہ کتابیں عنایت فرمائیں۔ ان میں بڑا حصہ تو جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ہی کا ہے۔ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ (مسز انوار اللہ) نے تقریباً (۳۰) اور جناب لسینین علی خاں صاحب لسینین نے ڈیڑھ سو سے زاید کتابیں عنایت فرمائیں۔ اول الذکر عطایا میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جو پہلے ایڈیشن میں اور مصنفین کی زندگی میں طبع ہوئی ہیں اور موخر الذکر کے عطایا میں مطبع حیدری بمبئی کی بعض مطبوعہ مثنویاں ہیں جن کا اب صرف نام ہی سنا جاتا تھا اور کہیں کہیں تحقیقی مضامین میں ان کی طباعت کے اشارے مل جاتے تھے۔ مرزا حبیب علی صاحب حبیب، رلسے برکت رائے صاحب اور حضرت نجم آفندی نے اپنی تالیفات ادارے کو عنایت فرمائیں۔ جناب ہارون خاں صاحب شروانی (ایم ایل سی) نے بھی اپنے مضمون کے آف پرنٹس اور ایک قدیم مطبوعہ کتاب عطا کی۔ جناب احمد عبدالقادر حسینی صاحب، ملک محمد علی خاں صاحب، خالد کشمیری، وقار خلیل صاحب اور اقبال کرشن صاحب کلکتہ نے متعدد کتابیں عنایت کر کے اپنی علم نوازی کا ثبوت دیا۔ ہز اکسیلینسی سفرائے پاکستان و روس نے بھی اپنی مطبوعات ارسال فرمائیں۔ اسٹیٹ لائبریری کانگریس واشنگٹن، مجلس شرقی مطبوعات ماسکو اور انڈو جرمن کلچرل سوسائٹی نے بھی اپنی مطبوعات ادارے کو عطا کیں۔

اضافہ کتب کے سلسلے میں ایک اور قدم یہ اٹھایا گیا کہ مطبوعات ادارہ کا بیرونی پبلیشروں کی کتابوں سے تبادلہ کیا گیا جس میں مکتبہ شاہراہ اور آزاد کتاب گھر نے ہمارے ساتھ کافی تعاون کیا اور ہماری کتابوں کے معاوضے میں اپنی مطبوعات کے نسخے ہماری منتخبہ فہرست کے مطابق ارسال کر دیئے۔ اس کے علاوہ متعدد کتب خریدی گئیں اور اس طرح سال سنہ ٦٢ء میں صرف مطبوعات کے کتب خانے میں (۱۰۴۶) کتابوں کا اضافہ ہوا اور کتب خانہ مخطوطات میں (۲۴۴) قلمی کتابیں داخل ہوئیں۔

ایوان اردو کی عمارت میں منتقلی کے بعد قارئین کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ مخطوطات کے علاوہ مطبوعات کا بھی مطالبہ ہوتا ہے اور کتب خانے کا عملہ قارئین کی فرمائش کی تکمیل میں کوشاں ہے۔ دارالمطالعے میں بھی روزانہ مطالعہ کنندگان کی تعداد اوسطاً (۲۵) رہی ہے دارالمطالعے میں ادارے کے ترجمان سب رس کے تبادلے میں اور ادارے کے لئے جو رسائل آتے ہیں ان کی تعداد اور رنگارنگی اس فہرست سے واضح ہو گی جو علیحدہ عنوان کے تحت درج ہے۔ (دیکھو صفحہ ۴۵)

ان تمام رسائل اور اخبارات کو فائل کی شکل میں محفوظ رکھا جاتا ہے اور ختم سال پر جلد بندی کے بعد انھیں کتب خانے میں داخل کر دیا جاتا ہے اس طرح ان رسائل اور اخبارات کے فائل کتب خانے میں محفوظ ہوتے جا رہے ہیں۔ وقت گذرنے پر ان کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

محمد اکبر الدین صدیقی (ایم۔اے)
معتمد اعزازی کتب خانہ اردو

استفادۂ کتب خانہ

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (واقع "ایوان اردو") کو ادارے کے کتب خانے کی طرف سے (۴۷) حوالے کی انگریزی کتابیں جن میں مختلف فنون کے انسائیکلوپیڈیا بھی شامل ہیں، عاریتاً استفادہ کے لئے دیئے گئے۔

جناب محمد جال شریف ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر علیگڈھ یونیورسٹی) نے قدیم دکنی ادب سے متعلق ادارے کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

ادارے کے دار المطالعہ اور کتب خانے سے ماہ جنوری میں (۳۰۴) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب عطا حسین (بیدر) نے اپنے مقالے "قطب شاہی فن تعمیر" کے موضوع پر ا ا ر ے کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔

جناب محی الدین احمد صاحب نے "حکیم مومن خاں مومن کی فارسی شاعری" کے موضوع پر ادارے کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

مولوی غلام رسول صاحب (مصنف اردو املا)، جناب سعادت نظیر صاحب (ایم۔ اے) اور جناب نصیر اختر صدیقی صاحب (بی۔ اے) نے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر ادارے کے کتب خانہ اور دار المطالعہ سے استفادہ کیا۔

جناب متین احمد صاحب صبا (ریسرچ اسکالر پٹنہ)

نے اپنے مقالہ "مرزا فطرت موسوی خاں" کے تحت ادار ے کے مخطوطات اور مطبوعات سے استفادہ کیا۔

ادارے کے دار المطالعہ اور کتب خانے سے ماہ فبروری میں (۹۳۴) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب قمر ساحری صاحب معتمد بزم سعدی اور مولوی حیدر شمسی صاحب نے ادارے کے دار المطالعہ اور کتب خانہ سے فارسی شاعری سے متعلق استفادہ کیا

ڈاکٹر حفیظ قتیل، پروفیسر سید محمد ریڈر جامعہ عثمانیہ، جناب غلام رسول صاحب، جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد اعزازی اردو مجلس نے مختلف موضوعات کے تعلق سے ادارہ کے دار المطالعہ اور کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

وقار خلیل صاحب شاہ پور کالے نے "مومن نما" کی ترتیب کے سلسلے میں ادارے کے کتب خانہ سے قدیم و جدید شعراء کے تذکرے اور رسائل و کتب سے استفادہ کیا۔

جناب محمد منظور احمد صاحب ایڈیٹر سہ ماہی "مجلس" نے اپنے جریدہ کے "مومن نمبر" کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ اور دار المطالعہ سے استفادہ کیا اور کئی اخبارات اور رسائل کے مثل سے حاصل کئے۔

وقار خلیل صاحب نے "مومن نما" کی ترتیب کے سلسلے

میں کتب خانہ اور دارالمطالعہ سے استفادہ کیا۔

جناب ظہیر الحق صاحب (ایم۔ اے) طنزیہ کالم نگار روزنامہ "رہنمائے دکن" نے دارالمطالعہ اور کتب خانہ سے طنز و مزاح کے موضوع پر کئی رسائل و کتب سے نوٹس لئے۔

ادارے کے کتب خانہ اور دارالمطالعہ سے ماہ مارچ میں (۴۸۰) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب محمد جمال شریف صاحب ریسرچ اسکالر علیگڈھ یونیورسٹی نے ادارے کے مخطوطات اور دارالمطالعہ کے رسائل سے استفادہ کیا۔

جناب ناصر صاحب کرنولی (ایم۔ اے) نے ادارہ کے دارالمطالعہ اور کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب خلیق انجم (ایم۔ اے) لکچرار کروڑی مل کالج دہلی نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

ادارے کے دارالمطالعہ اور کتب خانہ سے ماہ اپریل میں (۴۴۲) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب خلیق انجم صاحب ایم۔ اے (دہلی یونیورسٹی) نے "مرزا مظہر جان جاناں کی شاعری" کے موضوع پر ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

سراج منیر صاحب نے اقبالیات کے سلسلے میں ادارے کے کتب خانہ سے کتب اور رسائل کے اقبال نمبر کا مطالعہ کیا اور ضروری نقول حاصل کئے۔

جناب قادر جاوید (بی۔ اے) نے "ہماری زبان" علیگڈھ اور نقوش لاہور کے کئی سالوں کے فائیل دیکھے اور ضروری نوٹس لئے۔

جناب رشید موسوی صاحبہ (ایم۔ اے) نے دکن میں اردو مرثیے کے موضوع پر ادارہ کے مخطوطات لو کتب خانے سے استفادہ کیا۔

مس رشید موسوی (ایم۔ اے) نے مخطوطہ "تذکرہ یادگار فہیم" سے استفادہ کیا۔

جناب اختر حسن صاحب (ایم۔ اے) ریسرچ اسکالر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے رسالہ اردو کے قدیم فائیلوں سے استفادہ کیا۔

جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب نے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

ڈاکٹر محشر عابدی، مولوی غلام رسول صاحب اور پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے ادارے کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔

ادارے کے کتب خانہ اور دارالمطالعہ سے ماہ مئی میں (۴۳۲) افراد نے استفادہ کیا۔

حیدرآباد کے مقبول شاعر جناب سلیمان اریب صاحب ایڈیٹر "صبا" نے اپنی مطبوعہ نظموں اور غزلوں کی نقولات کے لئے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب سید محمد فضل اللہ صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج اونکمنڈ نیلگری مدراس نے ادارے کے مخطوطات اور مطبوعات سے استفادہ کیا۔

ادارے کے کتب خانے اور دارالمطالعہ سے ماہ جون میں (۳۴۴) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب سید محمد یونس صاحب لکچرار و ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی نے
ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا

جناب فیض احمد صاحب (ایم۔اے) ریسرچ اسکالر میسور
یونیورسٹی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ "مرثیات اور ان کی تصانیف"
کے موضوع پر ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا

جناب ہاشم حسن سعید ایڈیٹر جلہ فشامیہ نے جامعہ نمبر کی اشاعت
کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا

ادارے کے دار المطالعے اور کتب خانے سے ماہ جولائی
(٥٦٠) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب محمد جمال شریف صاحب ریسرچ اسکالر نے اپنے
پی ایچ ڈی کے مقالے "دکن میں اردو شاعری کا ارتقاء ولی سے پہلے"
کے زیر عنوان ادارے کے مخطوطات و مطبوعات سے استفادہ کیا

ادارے کے دار المطالعہ اور کتب خانے ۔ ۔ ۔ اگست
میں (١١٥٨) افراد نے استفادہ کیا۔

ادارے کے دار المطالعے اور کتب خانے سے ماہ ستمبر
میں (٥٠٦) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب قمر ساحری اور جناب نصیر اختر صدیقی صاحبان نے
ادارے کے کتب خانے سے علی الترتیب فارسی ادبیات اور
اردو افسانہ نگاری کے سلسلے میں استفادہ کیا۔

ادارے کے دار المطالعہ اور کتب خانے سے ماہ اکتوبر
میں (٢٢٣) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب حبیب ضیاء قادریہ (ایم۔اے) ریسرچ اسکالر
ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے دکنی ادب کی قواعد
کے سلسلے میں ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

جناب ہادی رحیل (جواں سال افسانہ نگار) اور جناب
محمد منظور احمد معتمد اردو مجلس نے ادارہ کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔

ایوان اردو کے دار المطالعے سے ماہ نومبر میں (٣٠٤)
افراد نے استفادہ کیا۔

جناب وقار خلیل صاحب نے "حیدرآباد میں اردو غزل"
کے زیر عنوان ادارے کے کتب خانے سے مختلف تذکروں، گلدستوں
اور رسالوں سے استفادہ کیا۔

جناب رشید الحسن (ایم۔اے) لکچرار چادر گھاٹ کالج،
جناب ابو محمود صاحب استاد مدرسہ عالیہ اور جناب محمد منظور احمد
صاحب ایڈیٹر "مجلس" سہ ماہی نے علی الترتیب "مولوی عبدالحق کے
علمی کارنامے" "دکنی اور اورنگ آبادی کی شاعری" اور "اردو کے
رسائل و جرائد" کے زیر عنوان ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

آوج یعقوبی صاحب نے اپنے زیر ترتیب مضمون "سیرۃ العد ملی"
کے سلسلے میں ادارے کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔

ایوان اردو کے دار المطالعہ اور کتب خانے سے ماہ ڈسمبر
میں (١٩٨) افراد نے استفادہ کیا۔

تنقیح شدہ حسابات ادارۂ ادبیات ـــــ اردو

تختہ آمد و خرچ سالانہ تا ختم مارچ ۱۹۶۰ء

آمد

سلک انضمامی اور بنک کی رقمیں	
نقد	۸۶-۵۶
اسپیشل اکاونٹ رگھوناتھ رائو بنک	۱۲۷-۳۱
" " " سب رس	۳۶-۹۲
فکسڈ ڈپازٹ اسٹیٹ بنک حیدرآباد	۱۰۰۰۰-۰۰
کرنٹ اکاونٹ " "	۴۶۶۶-۴۵
آمد مطبوعات	۲۰۹۰-۹۰
آمد سب رس	۱۲۳۳-۸۷
کار باغ	۱۰۷-۱۴
امداد حکومت آندھرا پردیش	۶۰۰۰-۰۰
" " ہند	۲۵۰۰-۰۰
" " کشمیر	۶۰۰-۰۰
تعلیم بالغان و امتحانات	۱۳۰-۲۸
چندہ اور عطیے ـ نظام ٹرسٹ فنڈ	۵۰۰۰-۰۰
یوم محمد قلی قطب شاہ، حکومت آندھرا	۱۰۰۰-۰۰
دیگر چندے اور عطیے	۱۱۵۴-۵۵
آمد برائے عمارت ـ نظام ٹرسٹ فنڈ	۵۰۰۰-۰۰
حکومت جموں و کشمیر	۵۰۰۰-۰۰
دیگر عطیے	۲۶۸۵-۰۰
منافع بنک	۱۵۰-۰۳
برائے افتتاح ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	۴۹۸-۰۰
واپسی قرضہ جات " " "	۲۲۳-۶۹
صدر جملہ آمد	۴۸۲۶۶-۴۱

خرچ

کتابت و طباعت	۲۵۰۰-۶۱
معاوضہ مصنفین	۴۶۵-۰۰
کتب خانہ ـ خریدی کتب و مخطوطات، جلد بندی، فرنیچر و اسٹیشنری وغیرہ	۲۹۳۲-۵۹
حفاظت آثار	۲-۷۵
سب رس	۱۱۰۱-۹۱
کلچرل مصروفیات بشمول یوم محمد قلی قطب شاہ	۹۲۶-۷۹
کار باغ	۸۲-۸۷
اخراجات دفتر، اسٹیشنری، اسٹامپ، کرایہ وغیرہ	۱۴۲۳-۴۱
تنخواہ و مشاہرہ دفتر	۲۱۸۵-۲۰
تعلیم بالغان و اردو امتحانات و پڑھائی گھر	۵۸۹-۸۲
تعمیر و افتتاح اضافہ عمارت	۲۰۷۷۷-۹۱
تنقیح حسابات	۱۰۰-۰۰
ڈاک اور وی پی کتب	۱۹۵-۱۴
متفرق	۵-۰۰
بنک کمیشن	۴-۷۰
برائے افتتاح ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	۷۰۶-۱۷
سلک اختتامی ـــــ	
اسپیشل اکاونٹ رگھوناتھ رائو بنک	۱۳۴-۲۴
" " " سب رس	۱۵۶-۶۲
کرنٹ اکاونٹ، اسٹیٹ بنک حیدرآباد	۳۴۶۳-۹۰
نقد	۵۱۲-۱۴
	۴۸۲۶۶-۴۱

تنقیح کی گئی اور حسابات صحیح پائے گئے ـــــ دستخط ایس۔ جی دستگیر اینڈ کمپنی، چارٹرڈ اکاونٹنٹس
حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔ مورخہ ۱۴ جون ۱۹۶۰ء

مجلس انتظامی ادارہ

صدر:-
پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر

نائب صدور:-
پروفیسر سید علی اکبر صاحب پرنسپل انوار العلوم کالج
" عبد المجید صدیقی صاحب

معتمد:-
ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

نائب معتمد:-
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ صاحب

نمائندہ حکومت:-
شری ایل۔ این گپتا (آئی۔اے۔ایس)

اراکین:

۱۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب
۲۔ پروفیسر عبد القادر سروری صاحب
۳۔ شری پی۔ ہنمنت راؤ (ایم۔پی)
۴۔ " جانکی پرشاد (صدر اردو مجلس)
۵۔ مولوی دلدار حسین صاحب شیر ملکھنڈ

مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو

(ہماری قدر آور کتابیں بلا شبہ ادب کی آبرو ہیں)

کوئی لائبریری ان کتابوں کے بغیر مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔

ادبی تاریخ

تاریخ ادب اردو	مرتبہ ادارہ	۱۰۶	۲/-
تاریخ ادب عربی	ڈاکٹر سید ابوالفضل	۳۰۴	۴/-
سرگذشت غالب	ڈاکٹر زور	-	۲/-
سرگذشت حاتم	"	۱۲۸	۲/-
گارساں دتاسی	"	۱۲۸	۱/۵۰
محمد حسین آزاد	جہاں بانو نقوی	۲۰۰	۲/۵۰
داستان ادب حیدرآباد	ڈاکٹر زور	۲۲۴	۲/۵۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	پروفیسر عبدالقادر سروری	۱۴۴	۲/-
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن (ایم اے)	۸۴	۱/۵۰
مقام غالب	مبارز الدین رفعت	-	۲/-
آریائی زبانیں	ڈاکٹر سدھیشور پرشاد ورما	۸۲	۱/۵۰
مدراس میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	۲	۲/-
مشاہیر قندھار دکن	محمد اکبر الدین صدیقی	۱۸۴	۱/۵۰
نذر ولی	مرتبہ خواتین جامعہ عثمانیہ	۲۴۸	۳/۵۰
راہ رو اور کارواں	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲۴۴	۲/-
دار العلوم کے سپوت	محمد مظہر	۹۶	۱/-
یادگار جشن سیمیں	مرتبہ ادارہ	۷۴	۱/-
میاں داد خاں سیاح	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	۹۶	۲/-
دکنی ہندو اور اردو	نصیر الدین ہاشمی	۲۹۰	۳/۵۰
ارمغان امجد	حمید الدین شاہد	۸۸	۱/۵۰
یادگار صفی	"	۶۴	۱/-
نذر معانی	وقار خلیل	۶۴	۱/-
سر سید احمد خاں	ظہیر الدین احمد	۱۶	-/۲۵
سوغات ایوان اردو	ڈاکٹر زور	-	۱/۵۰

تذکرے اور تنقید

تذکرۂ مخطوطات جلد دوم	ڈاکٹر زور	۱۸۰	۵/-
" " سوم	"	۳۹۸	۶/-
" " چہارم	"	۳۰۰	۶/-
" " پنجم	"	۳۴۵	۶/-
" نوادرات ایوان اردو	"		۶/-
تذکرہ محمد قلی قطب شاہ	"	۲۲۴	۵/-
مرقع سخن جلد دوم	"	۴۳۱	۶/-
شعرائے عثمانیہ	مسیح قریشی و باقی	۲۴۲	۴/-

عام معلومات اور تعلیم بالغان

تعلیم کا مسئلہ	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۹۶	۱/-
معلم بالغان	زاہد حسین (ایم۔ایڈ)	۵۶	۱/-
رفیق اردو داں	مرزا عصمت اللہ بیگ	۲۲۴	۲/۲۵
اردو دانی کی پہلی	اظہر الدین	۵۶	-/۲۵
" کی دوسری	"	۵۲	-/۳۷
فن تقریر	مرتبہ ادارہ	۹۶	۱/۵۰
خطابیات	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	۱۱۲	۱/۷۵
دفتری معلومات	ظہیر الدین احمد	۵۰	-/۳۷
مروش	سید کلیم اللہ حسینی	۵۶	-/۷۵

ملافت	سید کلیم اللہ حسینی	۵۶	-/۷۵
فہرست کتب خانہ ادارہ جلد اول	غلام رسول	۳۰۰	۳/-
" " " جلد دوم	اکبر الدین صدیقی	۳۴۸	۲/۷۵
اردو املا	غلام رسول	۴۸	-/۵۰
اردو انسائیکلوپیڈیا	مرتبہ ادارہ	۷۰	۱/-
علم خانہ داری	محمودہ بیگم صدیقی	۱۵۰	۱/۵۰

تاریخ وسیاسیات

مقدمہ تاریخ دکن	پروفیسر مجید صدیقی	۱۴۴	۱/۷۵
میر محمد مومن	ڈاکٹر زور	۳۰۰	۳/-
مال والوں کی تاریخ	مراد علی طالع	۸۰	۱/۲۵
حیدرآباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	-	-/۶۲
سوانح سلاطین آصفی (با تصویر تحفہ کتابیں)	مراد علی طالع	ایک سیٹ	۲/-
مختار الملک	فیض محمد صدیقی	۴۸	-/۵۰
کار الملک		۴۰	-/۵۰
ہندوستانی قومیت کا مسئلہ	ڈاکٹر ایشور ناتھ توپا	۵۲	۱/۲۵
اشوک اعظم	ڈاکٹر سیدہ جعفر	۵۶	-/۵۰
یورپ جنگ سے پہلے	پروفیسر ہارون خاں شروانی	۲۱۸	۲/۵۰
تاریخ سیاسیات	پروفیسر مجید صدیقی	۲۴۲	۲/۵۰
اسلامی عدل گستری	عبدالحفیظ صدیقی	۹۲	۱/۶۲
مسلمان شاہی خاندان	پروفیسر عبدالرحمن خاں	۳۱۲	۵/-
دادا بھائی نوروجی	ظہیر الدین احمد	۱۶	-/۱۵
بلقان	حفیظ صدیقی	-	-/۲۵
ریاض مختاریہ	دلاور علی دانش	۴۰۲	۵/-
تاریخ بالکنڈہ	منشی فیض الدین	۱۲۰	۲/۵۰
تاریخ ناندیڑ دکن	احمد علی بیگ چغتائی	-	۲/-
سیر گولکنڈہ	ڈاکٹر زور	۱۱۲	۱/-
بہمنی سلطنت	پروفیسر مجید صدیقی	۱۹۲	۲/۵۰
حیدرآباد فرخندہ بنیاد	ڈاکٹر زور	۲۲۲	۲/۵۰
حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	۴۸	-/۷۵

بن کلی	مبارز الدین رفعت	۴۰	۱/-
ارمغان محمد قلی	مرتبہ ادارہ	۴۰	-/۵۰
حیدرآباد کے بڑے لوگ	غلام پنجتن شمشاد	۱۵۲	۲/-
سروجنی نائیڈو	وزیر حسن دہلوی	۱۰۴	۲/-

شعری مجموعے

انوار	علی اختر	۱۶۸	۲/-
نمود زندگی	علی منظور	۲۱۲	۲/-
ترجمان زندگی	"	۲۲۴	۲/۵۰
ارمغان جذب	راگھویندر راؤ جذب	۱۲۰	۱/-
رباعیات الہام	ڈاکٹر راگھونندن راج سکسینہ	۱۱۵	۲/-
مجموعہ نظم حالی	حالی	۱۳۶	-/۷۵
ماہ لقا	عزیز احمد	۱۰۰	۱/۵۰
تیر تخیل	نجم الدین الجمی	۳۰۰	۲/۵۰
آبگینہ شعر	بشیر النساء بیگم بشیر	۲۳۲	۶/-
گنج طلسم	مرتبہ ڈاکٹر حفیظ سید	۴۰	۱/-
طالب و موہنی	" ڈاکٹر زور	۸۰	۱/۵۰
دیوان عشق	" اکبر الدین صدیقی	-	۱/۵۰
معانی سخن	" ڈاکٹر زور	۱۱۲	۱/۵۰
کلیات غواصی	" پروفیسر محمد بن عمر	۲۰۸	۴/-
دیوان داؤد	" ڈاکٹر خالدہ یوسف	۱۰۴	۱/۵۰
سراج سخن	" پروفیسر سروری	-	۱/-
رمز سخن	" ڈاکٹر زور	۹۶	۱/-
بادۂ سخن	"	۹۶	۱/-
کیف سخن	"	۹۶	۱/-
متاع سخن	"	-	-

خطوط اور مجموعہ مضامین

روح غالب	ڈاکٹر زور	-	۳/-
شاد اقبال	"	۱۶۷	۳/-
مکتوبات شاد عظیم آبادی	"	۳۰۰	۳/-

رسائل طیبہ	طیبہ بیگم	۳۱۲	۳/-
تذکرۂ دکن	سکینہ بیگم	۱۰۴	۱/۵۰

ادب اطفال

پانی کی کہانی	فیض محمد صدیقی	۵۶	-/۷۵
کشمش نانی	شجاع احمد قائد	۸۰	-/۷۵
باتیں	"	۸۸	۱/-
عرب اور عربستان	جہاں بانو نقوی	۵۶	-/۷۵
گاندھی جی	خورشید احمد جامی	۳۲	-/۷۵
مولانا ابوالکلام آزاد	وقار خلیل	۳۲	-/۵۰
محمد علی کی جیون کہانی	"	۳۲	-/۵۰
جب میں طالب علم تھا	شاہ غیاث	۲۴	-/۲۵
سمندری عجائبات	احمد حسین نقوی	-	۱/۲۵

سائنسی ادب

سائنس کے کرشمے	میر حسن	۱۱۲	۱/-
آبدوز اور سرنگ	فیض محمد صدیقی	۴۸	-/۷۵
زہریلے پودے	ڈاکٹر عبدالسلام	۴۴	-/۷۵
ہمارے پھول	پروفیسر سعید الدین	۴۲	۱/-
طبیعیاتی کائنات	" محمد علی خان	۹۸	-/۷۵
اردو میں سائنسی ادب	خواجہ حمید الدین شاہد	۴۰	-/۵۰
پودوں کی کہانی	فیض محمد صدیقی	-	-/۷۵

افسانے، ڈرامے اور ناول

من کی دنیا	رشید قریشی	۶۰	۱/-
محبت کی چھاؤں	مرزا ظفر الحسن	۱۲۴	۱/۵۰
رم جھم	سری کرشن سنہا	۱۱۴	۱/۵۰
کاغذ کی ناؤ	صاحبزادہ میکش	۱۲۰	۱/۵۰
چھلیا	فضل الرحمن	۸۰	۱/-

دہلی	وزیر حسن دہلوی		۱/۵۰
تماشائے اہل ہنر	سید رشید الحسن		۱/۵۰
سنگ گوہریں	جلال الدین اشک		-/۵۰
سچ کا جادو	حبیب المظفری	۴۸	-/۵۰
لیلیٰ	عظیم النساء بیگم	۱۱۲	۱/۵۰
رادھا اور رنگ محل	وزیر حسن دہلوی	۸۸	۱/۵۰
ٹھنڈی بجلیاں	بھارت چند کھنہ	۱۲۸	۲/۵۰

سب رس کے خاص نمبر

ترقی پسند ادب نمبر	مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد	۹۲	-/۷۵
ریڈیو نمبر	—	۲۱۰	۱/۲۵
صفی نمبر	مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد	۶۲	۱/-
امجد نمبر	"	۸۸	۱/۵۰
محمد قلی قطب شاہ نمبر ۱۹۵۹ء	" وقار خلیل	۶۴	۱/-
خاص نمبر ۱۹۵۶ء	" سلیمان اریب	۲۰۰	۲/-
سکسینہ نمبر	" خواجہ حمید الدین شاہد	-	-/-
سالگرہ نمبر ۱۹۵۶ء	—	۸۸	۱/-
محرم نمبر	—	-	۱/۵۰

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

جاری شدہ: ۱۹۳۸ء — فون نمبر (۳۵۲۰۹)

ماہنامہ

سب رس

اگست ۱۹۶۱ء

جلد نمبر (۲۴) شمارہ (۸)

نگران:- ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلسِ ادارت:-

رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
رائے جانکی پرشاد
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
وقار خلیل

زرِ سالانہ ہند و پاک سے۔ چھ روپے، ششماہی تین روپے

زرِ سالانہ بیرونِ ہند سے۔ دس روپے

قیمت۔ (۵۰) نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیاتِ اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر دفترِ ایوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

گزشتہ دنوں کی بات ہے، ملک کا تیسرا پنج سالہ پلان" اخبارات میں شائع ہوا، ہندوستان کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے اس منصوبے میں کئی امور قابل ہیں، کمی صرف اردو زبان کو ترقی دینے کے وسائل و مسائل کی بُری طرح محسوس ہوتی ہے۔ ریاستی اساس پر حکومت پنجاب نے اپنے جاریہ منصوبے میں اردو کی ترقی کے نام پر ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم مختص کی ہے۔ دیگر لسانی ریاستوں کو بھی اس فیصلے کی روشنی میں فراخدلانہ جذبہ سے کام لینا چاہئے۔ یو۔ پی اور آندھرا پردیش کی حکومتوں کی طرف سے اردو کی ترقی کے باب میں تیسرے منصوبے کے مدات میں کافی تیقنات دینا ضروری ہے۔ ویسے بھی آندھرا پردیش میں اردو کو پہلی ریاستی زبان کا درجہ حاصل ہے ایسے حالات میں تلگو زبان و ادب کے دوش بدوش اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے اگر سرکاری سطح پر ایک مناسب رقم مختص کی جائے اور اردو کے مسلمہ اداروں، انجمن ترقی اردو اور ادارۂ ادبیات اردو کی مشاورت سے دکنی ادب اور ادب عالیہ کے تحفظ اور تحقیق و تصنیف، ترتیب و تالیف کے نام پر مفید اور عمدہ پروگرام مرتب کئے جائیں تو پھر اردو والوں کے تعاون سے نہ صرف ملک کی تہذیب اور اس کے کلچر کو فائدہ پہنچے گا بلکہ آنے والی نسلیں بھی ریاستی حکومت کی اس روشن خیالی اور وسیع النظری کی قدر کریں گے۔

ملک کے ریاستی وزراء کی ایک کانفرنس میں اس تجویز پر اتفاق رائے ہوا ہے کہ ملک کی تمام زبانوں کے لئے ایک "رسم الخط" ہی کارآمد ہوگا۔ اگر یہ فیصلہ تمام زبانوں کے ماہرین لسانیات کے غور و فکر کے بعد ہوتا تو شاید اس پر مستند چھاپ ثبت ہوتی۔ زبانوں کے رسم الخط اپنے دامن میں کئی تہذیبی، ادبی اور تمدنی قدریں رکھتے ہیں لیکن ان پر کسی دوسری زبان کے رسم الخط کو اس طرح کے فیصلوں کے ساتھ لاد دیا جائے تو پھر ملک کا تہذیبی اثاثہ بجائے طاقتور ہونے کے کمزور پڑ جاتا ہے۔ لسانیاتی ہم آہنگی کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے کہ ہر زبان اپنے ادب کو اپنے ہی رسم الخط میں پیش کرے۔

زیر نظر سب رس اپنے دامن میں گلہائے رنگ رنگ کی جلوہ سامانیوں کو لئے ہے، مضمونوں، نظموں، غزلوں اور افسانوں کے لکھنے والے جانے پہچانے فنکار ہیں۔ ان میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مثال رضوی، نجیب رامش، جمیل کلیمی، بال کرشن اشک، بشیر النساء بیگم، تابش دہلوی اور علی بن ایاز بالکل پہلی بار سب رس میں چھپ رہے ہیں۔ ہم اپنے ان رفیقوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ سب رس کو اپنا ہی پرچہ سمجھیں، ویسے بھی سب رس اہل قلم حضرات کا پرچہ رہا ہے۔ شخصیت پرستی، گروہ بندی اور ایسی ہی دیگر لعنتوں سے "سب رس" کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے اور انشاء اللہ کبھی ایسے جراثیم اس میں راہ پا سکیں گے۔

احراز نقوی کا تحقیقی مقالہ، بشیر النساء بیگم کا مضمون اور پھر بھارت چند کھنہ کا مزاحیہ یقین ہے آپ پسند کریں گے۔ نظمیں اور غزلیں تیور اور اسلوب کے لحاظ سے قرار واقعی خوب ہیں۔ والسلام

(د۔خ)

احراز نقوی

اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ

صحافت ہماری قومی زندگی اور ثقافتی قدروں کا روزنامچہ ہے۔ جس میں ہمارے قومی شعور کا منطقی تسلسل، سیاسی بیداری کے رجحانات، انسانی نشوونما کی تاریخ، ارتقا اور فروغ کی داستان ملتی ہے۔ اردو صحافت ہماری نئی تہذیب کا ایک نیا باب ہے۔ جہاں سے ہماری تہذیبی، سماجی، معاشی اور ادبی سرگرمیوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ گویا یوں کہئے کہ صحافت ہمارے ترقی پسند ذہن اور نئے شعور کی ایک دستاویز ہے۔ نئی قدروں کا سب سے مقدم اور براہِ راست ماخذ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صحافت ہی ہو سکتی ہے۔ اس معقول تصور کے بعد جب ہم صحافت کے سرمائے پر نظر کرتے ہیں تو اشد محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ صحافتی نعمتیں ہمارے علم کا ماخذ نہ بن سکیں۔ صحافت کی طرف ہمارے محققوں نے کبھی توجہ ہی نہیں کی اور نہ ہی ہمارے اخباروں کو محفوظ رکھا گیا بلکہ اس کو تو ادب کے حدیقے کی چیز ہی نہ سمجھا گیا۔ یہی بات ہے کہ زیادہ تر اردو کی مستند اور معتبر تاریخیں ہمارے شعری اور نثری کارناموں سے مرتب ملیں گی مگر اردو صحافت کا تذکرہ ان کے بحث و بیان سے خارج ہے۔ صحافت کے میدان میں محققوں کے قلم گم اور گنگ ہو جاتے ہیں۔ نامساعد حالات اور علمی بے توجہی نے ہمارے صحافتی ذخیرے نیست و نابود کر دیے ہیں۔ اب جو کچھ نقوش پارینہ حیات میں گراں سے بھی اغماض برتا جائے تو بہت سے علمی، ادبی اور تہذیبی مسائل ہمیشہ کے لیے کنجِ خمول کی نظر ہو جائیں گے۔

اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ اسی گم شدہ سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اولیت کی تحقیق خواہ کسی امر یا شے کی ہو وہ اپنی جگہ ایک منطقی وجہ ہوتا ہے۔ اردو ماہناموں کی تاریخ میں پہلا اردو ماہنامہ ہماری تحقیق کا ایک قابلِ توجہ موضوع ہے۔

ہماری صحافت کی تاریخ ۱۹ویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی صدی میں اردو ماہناموں کا بھی سراغ ملتا ہے۔ ۱۹ویں صدی کے دو ہی (تشنہ اور ادھورے) تحقیقی ماخذ ہمارے پاس ہیں۔ مقالات گارساں دتاسی اور اختر شاہنشاہی۔

اختر شاہنشاہی کی وساطت سے اردو کا پہلا ماہنامہ کلکتہ میں "خیر خواہ ہند" کے نام سے ۱۸۲۷ء میں نکلا۔ جب اردو صحافت کا ارتقائی دور تھا۔ مالک اس کے پادری شرمن صاحب اور مہتمم پادری تھامس تھے اور بیپٹسٹ مشن پریس سے نکلتا تھا۔ قیمت سالانہ دو روپے چار آنے تھی۔ چھاپہ خانہ بھی مختصر تھا۔ پرچہ چار ورق کا تھا۔ بس اس سے زیادہ اس ماہنامہ کے بارے میں ہمارا علم نہیں ہے۔ محض قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسالہ پادریوں کا تو ضرور تھا اور جس پریس سے طبع ہوتا تھا وہ عیسائیوں کی اشاعت اور تبلیغ کا مرجع تھا۔ اس تبلیغی مشن نے مذہب کی اشاعت کے خاطر کافی روپیہ خرچ کر ڈالا۔ بیپٹسٹ مشن کا نصب العین عیسائیوں کے مذہب کو ہندوستان کی زبان میں عام کرنا اور ہند میں عیسائی معاشرہ بنانا اور ہندوستانی عیسائیوں کو فروغ دینا تھا۔ اس مدعا اور مقصد کے پیش نظر خیر خواہ ہند کے

چار ورقوں میں چھوٹے چھوٹے پروپگنڈے کے مضامین ضرور ہوتے ہوں گے اور باقی خبریں ہوتی ہوں گی۔ بس اسی طرح "خیر خواہ ہند" کے سلسلے کا قیاسی تعارف ہو سکتا ہے اور اسی روشنی میں یہ انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ماہنامہ کم اخبار زیادہ تھا۔ پھر چار ورق کا ماہنامہ یوں بھی ماہنامہ کی فہرست میں نہیں آتا۔ اگرچہ میعادی حیثیت سے یہ ماہوار پرچہ تھا۔ اگر سہولت کے طور پر ہم اس کو اردو کا بے قاعدہ ماہنامہ کہیں تو بہتر ہوگا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کا باقاعدہ ماہنامہ کون ہے؟ اس کی نوعیت اور حیثیت کیا ہے؟

ڈاکٹر گارساں دتاسی کی تحقیق کے مطابق اردو کے پہلے ماہنامے کا تعین ایک اور دوسرے "خیر خواہ ہند" سے ہوتا ہے اس کا نام بھی خیر خواہ ہند[۱] تھا اور یہ پرچہ بھی ماہواری تھا۔ ڈاکٹر گارساں کا اس پرچہ کے سلسلے میں اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"یہ پروفیسر (یعنی رام چندر داس معلم دہلی کالج) دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں ان میں سے ایک خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کا نام "محبوب ہند" ہے۔ یہ ایک ماہنامہ پرچہ ہے جس میں اہم معاملات رسائل وقت پر اہل ہند کی تعلیمی حالت پر اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔"

(مقالات گارساں دتاسی)

اسی تحقیق اس پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے کتابچے میں ڈاکٹر گارساں دتاسی کے ایک تسامح کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

"یہی پروفیسر رام چندر ایک اور رسالہ "محب ہند" کے نام سے نکالا کرتے تھے ڈاکٹر گارساں نے اپنے مقالات میں اس کا نام کسی غلط فہمی کی وجہ سے "محبوب ہند"[۲] لکھا۔"

ڈاکٹر ابواللیث نے "محبوب ہند" کی غلطی کو رسالہ "ہندوستانی" جنوری ۱۹۳۳ء کے ایک مضمون کے استفادے سے درست کر دیا ہے۔ کیونکہ تحقیق میں براہ راست ماخذ کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر اصل ماخذ ان کو مل جاتا تو ڈاکٹر گارساں کی ایک اور غلطی کو بھی پکڑ پاسکتے تھے۔ کیونکہ "محب ہند" اور "خیر خواہ ہند" ایک ہی پرچے کے دو نام ہیں۔ یہ الگ الگ پرچے نہیں ہیں۔ یہ دو نام مختلف اوقات میں کسی مصلحت کی غرض سے رکھے گئے ہیں۔ جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

خیر خواہ ہند کا اجراء ۱۸۴۷ء میں ہوا۔ انعام الحق حقی نے اپنے مضمون میں شمس العلماء[۳] مولوی ذکاء اللہ کی وساطت سے اس کا ذکر کیا ہے مگر اس سے بھی واضح ثبوت اس کے اجراء کے سلسلے میں ہم کو فوائد الناظرین کے ایک اشتہار سے ملتا ہے۔ فوائد الناظرین ماسٹر رام چندر ہی کا ہفتہ وار اخبار تھا۔ جو دہلی سے ۱۸۴۶ء میں نکلا[۴]۔

اشتہار فوائد الناظرین - سابق میں جو کچھ ہم نے لکھا تھا ایک رسالہ مسمی "خیر خواہ ہند" ہر ماہ ایک بار بزبان اردو اس عاصی (ماسٹر رام چند) کے اہتمام سے عنقریب میں اجرا ہوگا۔ اب وہ عنایت ایزدی سے بتاریخ اول ستمبر ۱۸۴۷ء کو جاری ہو گیا۔ اہل ہند نے اس کی بڑی قدر کی۔ انشاء اللہ

۱۔ اخبار اور رسالوں کا ہم نام ہونا کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک ہی وقت میں مختلف شہروں سے اور مختلف اوقات میں ہم نام اخبار کئی کئی نکلتے رہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کا مضمون سب رس (حیدرآباد) جولائی ۱۹۹۰ء میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ ملاحظہ ہو "انیسویں صدی میں اردو صحافت" صفحہ ۳

۳۔ مخزن مئی ۱۹۰۹ء

۴۔ اشرف علی واصلی بھی معاون کی حیثیت رکھتے مگر اس بات کو لوگ اب بھولتے جا رہے ہیں۔

اس میں مضامین مدام لیے چھپیں گے کہ جو خلقت ہند کو مفید ہوں گے اور تواریخ ہر دیار کی مثل ہندوستان، فرنگستان، ایران، افغانستان وغیرہ کے اور مضمون پند و نصائح درج ہوں گے اور باتیں علم اخلاق اور علم ہیئت کی مفصل بیان کی جائیں گی۔ تاکہ ہر ایک شخص کے فہمید میں آ سکیں اور حال پارلیمنٹ کا اور تجویزیں اور معاملتیں حکام انگلستان کی اور عجیب اور غریب حالات اور اشعار آبدار بڑے بڑے استادوں کے حتی المقدور مع تصویرات ان کی لکھی جائیں گی۔ اس رسالے میں تصویرات بادشاہوں کے اور نقشہ جات مکانات وغیرہ کے جہاں کہیں جیسی تصویر ضرور ہوں گی مندرج ہوں گے۔ صفحے اس رسالہ کے پچاس ہوتے ہیں اور قیمت اس کی ایک روپیہ ماہوار یعنی فی جلد ایک روپیہ۔"

اس اشتہار سے پرچے کے مزاج اور مسلک، ہیئت اور مواد کے سلسلے میں چند نکات واضح طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں مثلاً:-

(۱) خیر خواہ ہند کا اجرا سنہ ۱۸۳۷ء میں ہوا۔

(۲) یہ ماہنامہ اخلاقی، علمی، تاریخی اور سیاسی مضامین پر مبنی ہوگا۔

(۳) پرچہ کا مقصد علمی شعور کو بیدار کرنا اور معلومات کو عوام تک آسان زبان میں عام کرنا۔

(۴) یہ رسالہ مصور بھی تھا۔

(۵) رسالے کی ضخامت پچاس صفحات کی تھی اور قیمت ایک روپیہ (جو اس زمانے میں کافی گراں ہوگا)۔

خیر خواہ ہند (دہلی) میں ایک ماہنامے کی ساری علامتیں اور پوری سج دھج ملتی ہے۔ اس میں اخباریت نہیں ملتی اور نہ ہم اسے پرچے کو ادبی کہہ سکتے ہیں اگر کچھ ادبی تھا تو بس اس حد تک کہ اپنے زمانہ کے شعرا کا کچھ کلام چھپ جایا کرتا تھا۔ ادبی مباحث، عروض، زبان، محاورے، تراکیب یا محاسن و تنقیص شعری جو اس زمانے کے خاص ادبی مسائل تھے وہ قطعی اس پرچے میں نہ ہوتے تھے۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اڈیٹر موصوف کا میلان طبع ادبی نہ تھا اور نہ ہی یہ مقصد اس وقت ان کے پیش نظر تھا اور یوں بھی اگر تحقیقی نظر سے ہم ۱۹ ویں صدی کی صحافت کا جائزہ لیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ادبی مسائل پر مضامین لکھنے کا چلن نہیں تھا۔ اس عہد کی ادبی متاع محض شاعری تھی جو درباروں اور خانقاہوں تک محدود تھی اور اخباروں میں بھی شعرا کا کلام چھپنے لگا تھا۔ نثری اصناف کا فروغ و عروج نہیں ہوا تھا اسی لئے صحافت کی توجہ علمی معلومات اور واقفیت عامہ، مقامی اور غیر مقامی اطلاعات تک تھی۔ سنہ ۱۸۳۶ء کے بعد ہماری صحافتی نشو و نما میں (بالخصوص شمالی ہندوستان میں) خبروں کے ساتھ نثر میں معلوماتی مضامین لکھنے کا رجحان بہت بڑھنے لگا۔ بعض اخباروں میں خبروں سے زیادہ مضامین کا غلبہ ہوتا تھا۔ رام چندر کا فوائد الناظرین اسی قبیل کا ہفتہ وار اخبار ہے جس میں خبروں سے زیادہ مضامین ہوا کرتے تھے۔ قارئین کو سخت شکایت تھی کہ اس میں خبریں بہت کم ہوتی تھیں۔[۱] ماسٹر رام چندر نے ۱۵ر جنوری سنہ ۱۸۴۷ء میں فوائد الناظرین پہلے سے دوگنا کر دیا اور خبروں کی طرف بھی توجہ کی۔ مگر اس کے باوجود ماسٹر رام چندر کی توجہ مضامین نگاری کی طرف زیادہ رہی۔ کچھ لوگوں نے اس کو پسند بھی خوب کیا۔ غالباً اسی رجحان نے مضامین کے ایک الگ ماہنامے کی طرف مائل کیا اور خیر خواہ ہند بڑے طمطراق سے ستمبر سنہ ۱۸۴۷ء میں منظر عام پر آ گیا۔ یہ خاص مضامین کا پرچہ تھا اسی لئے ہم اس کو اردو کا پہلا باقاعدہ ماہنامہ قرار دے سکتے ہیں۔ انعام الحق حقی مولوی ذکاء اللہ کی وساطت سے لکھتے ہیں۔

"ان کی عادت (ماسٹر رام چندر) تھی۔ وہ خود کوئی مضمون اپنے قلم سے نہیں لکھتے تھے مگر ان کے طلبا جو عربی کی اول جماعت

---

[۱] فوائد الناظرین ۱۹ر ستمبر سنہ ۱۸۴۷ء نمبر ۱۷۔

کے تھے۔ "جو کہتے جاتے تھے اس کو لکھتے جاتے تھے۔ اس رسالے میں اکثر مضامین ان کے اسی طرح کے لکھوائے ہوئے ہیں۔"[1]

اردو کے پہلے ماہنامے کی فہرست مضامین ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) پہلے صفحہ پر دہلی کا نقشہ ہے۔ اس کے بعد نواب آصف الدولہ اور شجاع الدولہ کی تصویریں ہیں۔

(۲) تاریخ اودھ پر ایک مضمون ہے جو ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۳) تربیت اہل ہند کے بیان میں۔

(۴) بیان سادھوؤں کے طریقوں کا۔

(۵) ہیئت اور ستاروں سے متعلق۔

(۶) سب سے آخر میں ذوق کا ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے

سریر آرائے گردوں جب ملک سلطان خاور ہو ⁂ قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو

صرف ایک شمارہ رام چندر نے ستمبر ۱۸۴۷ء کا "خیر خواہ ہند" کے نام کا نکالا۔ پھر اس کا نام بدل کر "محب ہند" رکھ دیا۔
"خیر خواہ ہند" کا نام کیوں بدلا؟ یہ تحقیق کا بڑا توجہ طلب نکتہ ہے۔ اس ضمن میں قاسم لال سجن[2] کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

"ایک مہینے کے بعد پروفیسر رام چندر نے خیر خواہ ہند کا نام بدل کر "محب" (محب ہند) رکھ دیا۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ مرزا پور سے ایک اخبار اسی نام کا نکلتا تھا اور اس سے لوگوں کو دھوکا ہوتا تھا۔"[3]

اس تحقیق کی توثیق کے لئے پروفیسر رام چندر کا اقتباس ذیل میں حرف آخر کا حکم رکھتا ہے۔ دیکھئے:-

"تبدیلی نام رسالہ خیر خواہ ہند کے چونکہ ہم کو اس سے بالکل اطلاع نہ تھی کہ کوئی اخبار "خیر خواہ ہند" ہندوستان میں اجراء ہوتا ہے تو اس واسطے ہم نے اپنے رسالے کا نام "خیر خواہ ہند" رکھا تھا۔ اب ہم کو معلوم ہوا کہ اخبار مسمی خیر خواہ ہند مرزا پور میں جاری ہوتا ہے تو ہم کو مناسب نہیں کہ ہم اپنے رسالے کا نام بھی خیر خواہ ہند رکھیں گے اس واسطے ہم نے اس رسالے کا نام تبدیل کیا اور بجائے خیر خواہ ہند کے "محب ہند" رکھا۔"[4]

مرزا پور کا خیر خواہ ہند بھی سنہ ۱۸۴۴ء میں نکلا۔ یہ اخبار بھی ماہواری تھا۔ مؤلف اختر شاہنشاہی اپنی تاریخ میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:[5]

"مرزا پور ماہواری ۲ ورق اوسط سالانہ ہے۔ مالک پادری ایف جی برایت صاحب اڈیٹر پادری میر صاحب مہتمم ڈاکٹر مبدر صاحب سپرنٹنڈنٹ از مطبع ارفن اسکول اجرائے یکم اگست سنہ ۱۸۴۶ء"[6]

---

[1] مخزن مئی سنہ ۱۹۰۱ء۔ [2] قاسم علی سجن لال (د. ع)
[3] قدیم دہلی کالج نمبر زیر ادارت خواجہ احمد فاروقی۔
[4] قدیم دہلی کالج نمبر مضمون قاسم لال سجن
[5] مؤلف اختر شاہنشاہی اپنی تاریخ میں اسی نام کے ایک پرچے کا اور بھی ذکر کرتے ہیں جو دہلی سے ہفتہ وار سنہ ۱۸۵۰ء میں نکلا۔
[6] اختر شاہنشاہی مؤلفہ اشرف نقوی صفحہ (۱۰۱) اس اخبار کے اڈیٹر کے سلسلے میں ڈاکٹر لیث اپنی کتاب پادری سید صاحب کے بجائے پادری ماتھر صاحب کا نام لکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے مختلف وقتوں میں یہ دونوں رہے ہوں کیونکہ یہ اخبار سات سال تک نکلا۔

دونوں شہروں کے خیر خواہ ہند ماہنامے کی حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں کے اجراء کا سال بھی ایک ہی ہے۔ دونوں میں صرف ایک ماہ کا فصل ہے۔ مرزا پور سے یکم اگست ۱۸۴۷ء میں نکلا اور دہلی سے رام چندر کا پرچہ ستمبر ۱۸۴۷ء میں نکلا۔ ....
...... یعنی مرزا پور کے ماہنامے کو تقدم حاصل ہے تاریخی منطق اور تحقیقات کے اعتبار سے پہلا ماہنامہ مرزا پور ہی کا خیر خواہ ہند ہوا اگر اس کی حیثیت رسالے کی نہیں ہے۔ چھ ورقہ پرچہ اخبار ہی کے ذیل میں آسکتا ہے اظہر ہے مضامین کی جامعیت، ماہواری رسالے کی تکنیک کے اعتبار سے اس کا قطعی شمار رسالے کی حیثیت سے نہیں ہو سکتا۔ مدت کے اعتبار سے ماہنامہ دونوں کو کہہ سکتے ہیں مگر رسالہ کی حیثیت دہلی ہی کے خیر خواہ ہند کو ہے۔ اور سب سے واضح نکتہ ہم کو ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر گارساں کے اقتباسات سے مل جاتا ہے۔ وہ اس پرچے کو "رسالہ" کہتے ہیں اور مرزا پور کے خیر خواہ ہند کو "اخبار" کہتے۔ خود رام چندر نے لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہوا انھوں نے باقاعدہ اس پرچہ کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد اس کو اخبار لکھا۔ اس طرح رسالے کی فہرست سے اس کا نام الگ ہو جاتا ہے۔

مرزا پور کا خیر خواہ ہند ہماری تمام تحقیق و تجسس کے بعد بھی کہیں دریافت نہ ہو سکا۔ جو کچھ ہماری تحقیق ہے وہ ثانوی ماخذ کی اساس پر ہے کہ یہ پرچہ لندن کی مشنری سوسائٹی نکالتی تھی۔

رسالہ خیر خواہ ہند (دہلی) مطبع اردو اخبار سے نکلتا تھا۔ اس کے بعد محب ہند جب نکلا تو اس کا مطبع بھی بدل گیا۔ اور مطبع العلوم دہلی سے نکلا۔ پرچے کے ٹائیٹل کے نیچے ایک جدول میں یہ تحریر لکھی ہوتی تھی۔

"رام چندر مدرس علوم انگریزی مدرسہ دہلی کی اہتمام سے مطبع العلوم دہلی میں مطبوع ہوا"

راقم الحروف کو "محب ہند" کا ایک پرچہ دستیاب ہو سکا جو نجی کتب خانے میں محفوظ ہے۔

رسالہ محب ہند حلیہ کے اعتبار سے کافی دیدہ زیب تھا۔ مضامین کی فہرست اسی پر ہوتی تھی۔ پیشانی پر دو چھوٹے خانے ہوا کرتے تھے جس پر جلد نمبر، تاریخ، مہینہ اور سنہ ہوتا تھا۔ اس کے نیچے دوسرے خانہ میں یہ عبارت درج ہوتی تھی ـــــ

"قیمت اس رسالہ کی ایک روپیہ جاری ہوتا ہے مہینہ میں ایک بار محصول ڈاک معہ خریدار۔"

ٹائیٹل کا تیسرا خانہ ـــــ کافی چوڑا ہوتا تھا۔ بیچ میں ایک بڑا پھول ہوتا تھا۔ پھول کے اندر زیرے کی جگہ پر "محب ہند" لکھا ہوتا تھا۔ اور پھول کے ادھر ادھر محب ہند متعلق اردو میگزین بائی۔ (دوسری طرف) ـــــ رام چندر ٹیچر آف فیلڈ ویٹی سائنسز ان دی دہلی کالج لکھا ہوتا تھا۔

اس خانے کے بعد ایک چوڑا خانہ ہوتا تھا جو بیچ سے اس حسن سے نصف کیا گیا تھا کہ اوپر کے پھول سے ایک ڈال کی شکل میں اسی چوتھے خانے کے اول نصف میں فہرست مضامین اور مصنف کا نام درج ہوتا تھا۔ نصف دوم میں TABLE OF CONTENTS کے عنوان سے انگریزی میں فہرست ہوا کرتی تھی۔

پانچواں خانہ ـــــ بہت ہی چھوٹا ہوتا تھا جو بالکل خالی رہتا تھا۔ آخری خانے میں یہ لکھا رہتا تھا۔

"رام چندر مدرس علوم انگریزی مدرسہ دہلی کی اہتمام سے مطبع العلوم دہلی میں مطبوع ہوا"

رسالہ محب ہند ہمارے ماہناموں کی تاریخ میں ہر اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے اور بھی کہ جب قومی، ملی اور علمی شعور کو پیدا کرنے میں مختلف تحریکیں اور رجحانات پیدا ہو رہے تھے تو ان کے اظہار اور ابلاغ کا سب سے نمایاں ذریعہ صحافت ثابت ہوئی اسی لئے قومی اور سیاسی رہبروں اور پیشواؤں کے ساتھ ماسٹر رام چندر جیسے مدیروں کا نام بھی زندہ جاوید رہنے والا ہے۔

سیدہ بشیر النساء بیگم (ایم اے)

ایران کی جدید شاعری

سرزمین ایران آغاز تمدن ہی سے مشرق و مغرب کے خیالات کی آماجگاہ اور ایشیائی اقوام کے لیے تختۂ مشق بنی رہی ہے۔ اس پانچ ہزار سال کی طویل مدت میں عیلامی۔ آشوری۔ میدی۔ یونانی، اشکانی۔ ساسانی۔ عرب۔ سلاجقہ۔ مغل۔ افغان۔ ترک اور ایرانی نسل کے لوگ یکے بعد دیگرے حکمراں رہے اور انہی فرمانرواؤں کی سرپرستی میں ایرانی زبان و ادب کی ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ انہی صنادید کے زرین کارنامے ہیں جن کے گہرے نقوش جریدۂ عالم پر ثبت ہیں۔

۲۰ویں صدی عیسوی جہاں ایران کی تاریخ میں تجدید نشاۃ ثانیہ کا دور مسلم ہے جبکہ ایران صفویہ کے زیر اثر بین الاقوامی شہرت کا حامل بنا، وہیں اس کا تاریک پہلو یہ ہے کہ سلاجقہ کے عہد تک شعر و ادب کی جو بلند بام عمارت قائم ہو چکی تھی وہ گویا منہدم ہو گئی اور شاعری کا بازار سرد پڑ گیا۔ یہی وہ چند در چند وجوہات تھیں جن کی بنا پر ایرانی شعرا ہندوستان کا رخ کرتے ہیں اور ہندوستان عملک ایران بن جاتا ہے جس کا اظہار خود ایک ایرانی شاعر نے اس طرح کیا ہے ؎

نیست در ایران زمین سامان تحصیل و کمال
تا نیامد سوئے ہندوستان حنا رنگین نہ شد

اس کے بعد قاچاریوں کے عہد میں ایران، یورپ کی استعماری سیاست کا شکار اور برطانیہ کے لیے تختۂ مشق بنا رہا۔

جنگِ عظیم کے دوران میں ایران کا ستارہ تنزل میں پہنچ چکا تھا اور قریب تھا کہ غروب ہو جائے لیکن رضا شاہ پہلوی آفتاب کی مانند ایران کے افق پر طلوع ہوا۔ اس طرح ایران دوبارہ مشرق و مغرب کا محور اور جدید تمدن کا طرفدار بن گیا۔

مشرقی ممالک کی ترقی میں سیاسیات کے ساتھ ادبیات کو بھی بڑا دخل ہے۔ عربوں کی ترقی کا راز ان کی زبان میں مضمر ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں عربی زبان نے عام دنیا کے تہذیب، تمدن، مذہب، فلسفہ اور ثقافت کی جو خدمات انجام دی ہیں آج تک مورخین عالم رطب اللسان ہیں۔ اس کے بعد کا درجہ فارسی کا ہے۔ سوائے چند جدید فنون اور ڈراموں کے کوئی علم یا فن ایسا نہیں ہے جس کے بیش بہا خزانے، لازوال شاہکار اور موثر ترین نمونے فارسی پیش نہ کر سکتی ہو۔

نوعِ بشر کی جمالیاتی ترقی۔ روحِ انسانی کی اصلاح، فلسفہ کی ترویج و تعلیم، میزانِ حیات اور معیارِ فکر کو بلند کرنے میں اس زبان نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال شاید و باید ہی کوئی مشرقی زبان پیش کر سکے۔

فارسی زبان کی اہمیت کا ثبوت اس کی تاریخ کے ہر دور میں مل سکتا ہے لیکن فارسی شاعری بہترین ترجمان بنی رہی۔ اصناف کی رنگ بدلے مگر اس کا اصلی جوہر ہر دور میں باقی رہا۔ اس طرح فارسی شاعری نے ۹ویں صدی سے ۱۹ویں صدی تک جتنے بڑے اصنافِ سخن قصیدہ

غزل۔ رباعی۔ مثنوی۔ قطعہ۔ ترجیع بند۔ مستزاد اور مسمط وغیرہ کے ذریعے مدحیہ۔ ہجویہ۔ اخلاقی۔ فلسفہ۔ رزمیہ۔ بزمیہ۔ مراثی۔ حکایات۔ افسانہ نگاری۔ تاریخ نویسی اور حسن کاری کے جو بے مثل نمونے پیش کئے وہ ادبیات عالیہ کے شاہکار ہیں۔

فارسی شاعری میں دو مضامین ایسے رہ گئے تھے جن پر سابقہ شعراء نے طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ ایک تمثیل نگاری اور دوسرے سیاسی و قومی شاعری۔ طربیہ اور حزنیہ کی مثالیں تعزیہ اور تصنیف میں مل سکتی ہیں، مگر ایک مولیر۔ ایک شکسپیر اور ایک گوئٹے کی جگہ ابھی ایران میں باقی ہے۔

قاچاریوں کے عہد میں ایران خواب غفلت سے جاگا اور متمدن ممالک کے ساتھ ہمدوش ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں ایرانی شعراء نے ملک و قوم کے احساسات اور جذبات کو ابھارنے اور جمود و غفلت کو دور کرنے میں جو نمایاں حصہ لیا وہ تاریخ عالم میں زرین حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ موجودہ صدی کے ۲۰ سال میں سیاسیات کا جو طوفان ایران میں برپا ہوا اس نے حساس دلوں پر نشتر کا کام کیا اور خصوصاً شعراء جو قومیت کے معمار اور جدید تحریکات کے علمبردار ہوتے ہیں۔ اس غیر متوقع انقلاب سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اس پرآشوب زمانے کی سرگذشت سے شعر و سخن کو مالامال کر دیا۔ اس مدت میں کئی ایک ایسی بے شمار نظمیں لکھی گئیں جو تاثرات قلبی کی جیتی جاگتی تصویر اور ایرانی قومی بیداری، وطن پرستی اور آزادی کی بے نظیر مرقع ہیں۔ اس عبوری دور کی شاعری زبان حال سے ایرانیوں کے متضاد جذبات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ امید و بیم۔ شکوہ و شکایت۔ استبدادیت و جمہوریت۔ قوم کی پستی و بلندی۔ فتح و شکست۔ ترقی و تنزل کی مختلف کیفیات جو وقتاً فوقتاً قوم پر طاری ہوتی رہیں وہ اس زمانے کی شاعری کی اصلی موضوع بنی ہوئی ہیں۔

"نسیم شمال" "نو کنگاش" "صدائے وحشت" "صور اسرافیل" "بہار" اور "ایران نو" کے صفحات اس درد کی کہانی اور ایران کے ذکر سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ نظمیں اکثر سیاسیات حاضرہ کے وقتیہ مسائل اور ماحول کے جذبات سے معمور ہیں مگر ان میں بھی ادبیت کی روح اور معنویت کا جوہر ملتا ہے۔ اعلیٰ نظموں کے باعث ایران میں ہیجان پیدا ہوا اور یہی نظمیں انقلابی ادب کا سرمایہ سمجھی جانے لگیں۔

اس دور کے ممتاز شعراء ادیب پشاوری۔ شوریدہ۔ ادیب الممالک۔ فراہانی یحییٰ دولت آبادی۔ ادیب نشاپوری۔ کمال اصفہانی۔ اشرف گیلانی۔ ایرج مرزا۔ وحید دستگردی۔ نادری مشہدی۔ عارف قزوینی۔ فرہنگ۔ سالار شیرازی۔ پور داؤد۔ بہار مشہدی۔ فرخی یزدی اور پروین اعتصامی ہیں جنھوں نے اپنے شرر انگیز نغموں سے استبدادیت کو فنا کر دیا۔ اور ملک و قوم کو نئے دورۂ حیات اور ادبی، معاشرتی، سیاسی اور وطنی نشات کے لئے تیار کیا۔

جب ہم ان سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تمدنی تحریکات اور ایران کی بین الاقوامی حیثیت، قومی اقتدار کی سربلندی، سیاسی عظمت۔ حکومت کی آزادانہ روش۔ فوجی قوت کی برتری۔ بیرونی تعلقات کی استواری۔ اعلیٰ نظم و نسق مملکت۔ نئے نئے محکموں کی تنظیم و تشکیل۔ قانون و عدالت کی اصلاح۔ علم و ہنر کی شاہانہ سرپرستی۔ آثار قدیمہ کی حفاظت۔ جدید لوازم زندگی کی فراہمی حمل و نقل کی سہولت۔ امن و امان کی ضمانت۔ صنعت و حرفت کی حمایت۔ ورزش جسمانی اور حفظ صحت کی اہمیت۔ جہالت و تعصب کی بیخ کنی سوسائٹی کی مادی اور معنوی اصلاح۔ قومی جشنوں کا انعقاد۔ آزادی و تعلیم نسواں اور ایرانیت جدید کی تعمیری نظام العمل پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں تو عصر پہلوی کو ایران کی تاریخ کا ایک زرین دور اور رضا شاہ کو مشرق کا ایک زبردست نجات دہندہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی قائد کے سایۂ عاطفت میں گلزار ادب کو نئے نئے گلہائے مضامین سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ اور شعر و سخن کا میدان وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ تخیل میں بلندی۔ زبان میں دلآویزی۔ اسلوب بیان میں جدت۔ جذبات میں جوش۔ حقائق و معارف

کی جستجو کے علاوہ ماحول سے قربت اور اس کی فطری ترجمانی اور معیار کی تبدیلی یہ چند عناصر ہیں جو جدید ادبیات کی روح رواں ہیں ۔

جس نفسیاتی ماحول میں اس وقت ایران کی قومیت پرورش پا رہی ہے وہ ان اثرات کو قبول کرنے تیار نہیں جو قدامت پسند داویوں کی نظر میں شعر و سخن کا زیور سمجھے جاتے ہیں۔

نہ وہ باریک بینی ہے، نہ وہ خیال آفرینی، نہ وہ موشگافی ہے، نہ وہ بلند پردازی و مبالغہ آرائی اور نہ وہ طرب انگیزی و صنعت گری۔ موجودہ شاعری افادیت اور قومیت کا مظہر بنی ہوئی ہے۔ اس دور کی شاعری کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں تک وزن شعر اور بحروں کا تعلق ہے، وہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بس اس دور کے اکثر شعراء کی تخلیقیں، نظم النثر کی صنف میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ مغربی اور خصوصاً فرینچ کے اثرات ہیں جو تیزی کے ساتھ زبان و بیان کا جزو بنتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ قزوینی "بیست مقالے" میں جدید شاعری کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں ۔

"اگر حال بدین منوال بگذرد، یقین است کہ زبان شیرین سعدی و حافظ کہ یک ثمرہ زحمت ہائے دراز می باشد از بین خواہد رفت "

بقیہ ۔ تین مکاتیب (ص ۱۱ سے آگے)

(۳)

ماہرہ۔ ضلع ایٹہ (یوپی)
یکم جون سنہ ۱۹۴۰ء

لطف فرمائم۔ تسلیم

نوازش نامہ مورخہ ۲۰ مئی پہنچا۔ شکر کرم۔ میں ایک مدت سے علیل ہوں اور اس قابل نہیں کہ دماغی کام کر سکوں۔ پھر آج کل کا موسم جہنمی موسم ہے۔ دن چڑھے کے بعد سے یہ عالم ہو جاتا ہے کہ باہر نہیں بیٹھا جاتا۔ تاریک کوٹھری میں گھس جاتا ہوں اور ۵، ۶ بجے نکلتا ہوں غرض کہ یہ موسم میرے لئے مصیبت کا موسم ہے۔ کسی پہاڑ پر جانے کا نہ موقع نہ مقدرت آپکی فرمائش بسر و چشم پوری کرتا۔ مگر اس وقت معذور ہوں۔

آپ قواعد العروض مولفہ سید غلام حسنین قدر بلگرامی دیکھئے۔ اس میں آپکے مطلوبہ اشعار اکثر مل جائیں گے۔ اور وہ سب اساتذہ کے ہوں گے۔ اس صورت میں مزید فکر تحصیل حاصل ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے اور مجھے فی الحال معذور سمجھیں گے۔
والعذر عند کرام الناس مقبول

والسلام
دعاگو۔ احسن مارہروی

مرسلہ: رئیس مینائی بنگلوری

تین مکاتیب

احسن مارہروی ــــ بنام ــــ نفیس بنگلوری

(۱)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۲ء

لطف فرمائم! سلام خلت انضمام

کرم نامہ (۱۹ ۱۰/۳۲) پہنچا۔ کرم فرمائی کا شکریہ اور اپنی غفلت و معذوری کا عذر دونوں قبول فرمائیے ابتداءً آپ کی فرمائش پر بحور مخلوعہ میں فکر کا خیال کیا تھا اور غالباً دو چار شعر بھی لکھے تھے مگر تعطیل کے زمانہ میں ایسی پریشانیاں اور بیماریاں عائد حال رہیں کہ کوئی کام تمام نہ کرسکا حتیٰ کہ اکثر مسودات تشتت حال کی وجہ سے منتشر و مفقود ہو گئے۔

اب کہ یونیورسٹی کے فرائض سے بہت کم فرصت ملتی ہے اور بسا اوقات ذاتی تفکرات کوئی کام نہیں کرنے دیتے امید نہیں کہ تعمیل ارشاد کرسکوں، نہایت حسرت و ندامت کے ساتھ اپنی کوتاہی کا اظہار کرتا ہوں اور اس کو بغیر مبالغہ و تصنع سے خالی سمجھئے۔ زیادہ زیادہ

والسلام، عاصی
احسن مارہروی

(۲)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

مہربانم و لطف فرمائم: السّلام علیکم

آپ کے ۱۳ر اگست کے محبت نامہ کا جواب ڈیڑھ مہینہ کے بعد لکھ رہا ہوں۔ اس توقف کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے بااتفاق کم فرصتی کے سب احباب سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ اس کا علاج تا بمرگ ممکن نہیں۔ اس وقت بھی وہی عالم ہے۔ یہ سطریں لکھ نہیں رہا ہوں بلکہ گھسیٹ رہا ہوں۔ اگر آئندہ سلسلۂ رسل و رسائل جاری رہا تو میرا مقصد حال معلوم ہوتا رہے گا۔

آپ کی مرسلہ غزل ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ خواہ مخواہ اصلاح کے لئے قلم اٹھانا حماقت ہے۔ دو جگہ خفیف سی ترمیم کردی ہے یکتا کی بار بار تکرار ناگوار تھی اس لئے ایک جگہ چاک چاک بنادیا۔ دوم یہ کہ مطلع میں آپ کا مصرع دوم نویں شعر کے مصرع سے معنیً و لفظاً ملتبس تھا اس لئے قافیہ بدل دیا۔ یہ دونوں ترمیمیں اس لئے نہیں کی گئیں کہ آپ کا ارشاد غلط تھا۔ بلکہ معمولی سلامتی کے خیال سے ایسا کیا گیا۔ میرا دیوان تو طبع نہیں ہوا۔ دوسری تصنیفوں میں ایک تاریخ نثر اردو عرف نمونہ منثورات ہے اور ایک کلیات ولی مع سوانح جن کی قیمت پانچ پانچ روپے ہیں۔ باقی باقی۔

والسلام، دعاگوئے انام
احسن بنام　　صدر انجمن حدیقۃ الشعر

تیسرا مکتوب صفحہ [illegible] پر ملاحظہ ہو

نصیر اختر صدیقی

البرٹ کامیو اور اس کی ناول نگاری

فرانس کے مشہور ناول نگار اور نوبل انعام یافتہ ادیب البرٹ کامیو نے موٹر کے ایک حادثہ میں ۴ جنوری ۱۹۶۰ء کو انتقال کیا۔ اس کی عمر پچاس برس سے کچھ زائد تھی لیکن جنگ عظیم کے بعد سے سارے یورپ میں اس کی شہرت انتہائی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ کامیو نے اپنی ناولوں میں جنگ عظیم کے بعد کے انسان کے تجربے، اس کی ناکامیوں اور اس کے احساسات پیش کئے ہیں۔ کامیو کی تحریر نہایت ہی دلکش و رنگین نہیں تھی لیکن وہ جو کچھ بھی لکھتا تھا اس کے نہایت دور رس اور گہرے اثرات پڑتے تھے۔ اس نے ناولیں، ڈرامے، کہانیاں اور مقالے لکھے انگریزی زبان میں اس کی جو ناولیں ترجمہ کی گئی ہیں ان میں THE OUTSIDER اور THE PLAGUE AND THE FALL شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی کہانیوں کا مجموعہ EXILE AND THE KINGDOM کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ڈراموں اور فلسفیانہ مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کامیو سماجی تحریکوں سے علیحدہ رہنا پسند نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اپنے ہم عصر فرانسیسی ادیبوں ژاں پال سارتر، لوئی اراگاں کی طرح سماجی تحریکوں میں سرگرم حصہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک روزنامہ اخبار COMBAT کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۱۹۵۷ء میں اسے نوبل انعام عطا کیا گیا۔ کامیو کی زندگی عظیم کارناموں سے بھری پڑی ہے اور ابھی اس سے دنیائے ادب کو کافی توقعات تھیں لیکن اچانک وہ ہم سے دور ہو گیا۔

کامیو اصل فرانسیسی الجیریائی باشندہ تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی طرح سادہ، وسیع النظر اور قدیم اعتقادات کا حامل انسان تھا۔ اس نے نہایت سیدھی سادھی کہانیاں لکھی ہیں جو انجیل مقدس کی طرح پاک و صاف ہیں اور اپنی تہہ میں زندگی کی گہرائی اور سچائی چھپائے ہوئے ہیں۔ ژاں پال سارتر کی کہانیوں میں جو شعور کی پیچیدگیاں اور احساس کی جولانی معلوم ہوتی ہے وہ کامیو کے پاس نہیں ہے۔ کامیو سیدھے سادھے انسانی جذبات کو پیش کرتا ہے۔ انسان کے دکھ اور غم، اس کے احساسات اور اس کی خوشیاں یہ ساری باتیں اس کی کہانیوں میں ملتی ہیں۔ اس کے کردار بڑے صابر، رنج و مصیبت جھیلنے والے اور یونانی ٹریجڈی میں پیش کئے گئے کرداروں کی طرح مایوس اور مصیبت زدہ ہوتے ہیں۔ کامیو نے کلیت پسندی اور Sophistication کو اپنی زندگی میں کبھی پسند نہیں کیا، حالانکہ اس کے ہم عصر اکثر فرانسیسی ادیب جنگ عظیم کے بعد مایوسی کا شکار ہو کر اس راہ پر گامزن ہو گئے تھے۔ کامیو کے اکثر کردار رنج و مصیبت کے مارے ہیں لیکن وہ اپنی تقدیر کو بدل دینے کا عزم و ارادہ نہیں رکھتے۔ کامیو نے الجیریا اور اس کے باشندوں کے بارے میں خلوص سے لکھا ہے۔ اس نے شمالی افریقہ کے چمکتے سمندر اور آسمان کے بارے میں ناولیں لکھی ہیں۔ اس نے اپنی ناولیں واقعی کلاسیکی حقیقت نگاری اور اس کی روایتوں کے مطابق لکھی ہیں۔ وہ بالزاک یا ٹالسٹائی کی طرح صرف انہی واقعات کو پیش کرتا تھا جن میں زندگی کی عظیم سچائی و

حقیقت پنہاں ہوتی ہے۔ وہ سادے سیدھے طرز بیان میں ایک کہانی بیان کرتا ہے جس میں کسی قسم کا تصنع دکھائی نہیں دیتا، لیکن انسانی زندگی اور اس کے کردار کی اہم باتوں کو وہ بیان کر دیتا ہے۔ اس کی ناولوں میں پیچیدہ اور دلچسپ کرداروں کی بہتات نہیں ہوتی۔ وہ ناول لکھنے کی بجائے ایک طویل کہانی لکھتا ہے اور اس میں انسانیت کی ساری بنیادی باتوں کو بیان کر دیتا ہے۔ اس کی کہانیاں قدیم داستانوں کی طرح جذبات، طنز، معنی و مطالب اور ڈرامائی طرز کا بہترین مرقع ہوتی ہیں۔ کامیو نے اپنی ناول پردیسی (THE OUT SIDER) میں شمالی آفریقہ کے حسن و رعنائی کو پیش کیا ہے۔ اس نے ایک مضمون "الجیریا کا موسم گرما" لکھا تھا جو اگرچہ کہ نثر میں ہے لیکن شاعری اور تخیل کی خوبصورتی کے سبب ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

البرٹ کامیو کی ناولوں اور افسانوں کے کردار عجیب طرح کے جمود کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہے انہیں اپنے رنج و غم کی وجوہات معلوم ہیں لیکن وہ ان پر فتح پانے کا احساس نہیں رکھتے۔ وہ اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیتے ہیں اور خود کچھ کام نہیں کرتے ان میں زندگی کی حرارت نہیں ہے۔ ان میں تقدیر سے لڑ جانے کا جذبہ مفقود ہے۔ اس کی ناول کا مشہور کردار مورسالت ہے جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ساری زندگی کو بغیر کسی دلچسپی اور جوش و خروش کے گزار دیتا ہے۔ وہ کسی چیز کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ماں، اپنے محبوب اور اپنے خوابوں کے شہر پیرس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اور وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سارے جذبات مر چکے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ایک معلوم ہوتا ہے جو کسی تہذیب کے زوال کے وقت زندہ رہتے ہوئے بھی مردہ معلوم ہوتے ہیں۔

مشہور انگریزی نقاد سانوکی نے کامیو پر تنقید کی ہے کہ اس نے مورسالت کی کردار نگاری کرتے ہوئے جانبداری برتی ہے اور عرب باشندوں کی زندگی کو پیش کرنے سے گریز کیا ہے۔ مورسالت امریکہ کے غریب سفید فام باشندوں کی طرح ہے جو موت کے غار پر بیٹھا ہے اور جس نے زندگی سے اپنے سارے رشتے توڑ لئے ہیں۔ تقدیر نے اس پر کافی ظلم و ستم کئے ہیں اور وہ عجیب طرح سے متحیر اور پریشان ہے۔ کامیو نے اس کردار کو نہایت فن کاری سے پیش کیا ہے۔ سانوکی نے لکھا ہے: "یہ کامیو کے احساس کی کمی ہے کہ اس نے کہانی کے دوسرے مصیبت زدہ لوگوں کو بھلا دیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ عرب لڑکی جس کا محبوب اسے مار کرتا ہے، اور جس کا بھائی اس کی جان بچاتے ہوئے مارا جا چکا ہے، اس لڑکی کو بھی زندگی سے پیار کرنے کا حق ہے۔ اگرچہ وہ نوآبادیاتی نظام کی نظروں میں اجنبی ہے۔" سانوکی نے کامیو پر تنقید کی ہے کہ اس نے عرب عوام کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔

کامیو نے کئی ایک غم زدہ کردار پیش کئے جو تقدیر کے ہاتھوں بری طرح شکار ہوئیں۔ انہیں یہ دنیا سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ کامیو کی ایک مختصر کہانی "مہمان" میں ایک عرب مسلمان کا کردار پیش کیا گیا ہے جو خوشی اور آزادی کو چھوڑ کر رنج و نا کامی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ اس میں یہ جذبہ پنہاں ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے دل میں ظلم اور برائیوں کے خلاف کوئی جذبہ نہیں رکھنا چاہئے۔ چنانچہ عرب مسلمان اپنے آپ کو ظلم کے حوالے کر دیتا ہے۔ THE PLAGUE میں فساد زدہ شہر اور اس کے حالات پیش کئے گئے ہیں جہاں کے لوگ اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کا عزم رکھتے ہیں لیکن وہ کچھ اقدام نہیں کر پاتے۔ خود ڈاکٹر ریو اپنے آپ کو مجبور و لاچار پاتے ہیں۔ کامیو نے ڈاکٹر ریو کے کردار کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ غمگین آنکھوں والا ڈاکٹر گوگاں کی تصاویر کے مغموم افراد سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے۔ کامیو ایک ادیب اور مفکر کی حیثیت سے موت کے تصور پر کبھی فتح نہ پا سکا۔ اگرچہ وہ ایک فلسفیانہ خیال موت کے بارے میں پیش کرتا ہے لیکن وہ اس سے لڑنے اور اس پر فتح پانے کا دل اور جذبہ نہیں رکھتا۔

کامیو کی ناولیں اور کہانیاں یورپ کے تمدن پر گہرا طنز ہیں۔ اس نے ایک کہانی میں نوآبادیاتی فرانس کی تصویر اس طرح

کھینچی ہے کہ یہاں کے شہری سخت محنت کرتے ہیں لیکن ان کا نصب العین صرف زیادہ سے زیادہ دولت مند بننا ہوتا ہے۔ زندگی میں ان کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے "تجارت کرنا"۔ وہ محبت کرنے، سینما دیکھنے اور سمندر میں نہانے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

کامیو نے ایک کہانی THE FALL میں جدید تہذیب و تمدن پر بڑے گہرے طنز کئے ہیں۔ اس کہانی کا ممتاز کردار ژاں باپتست کلامیں، ایک زمانہ میں پیرس میں بیرسٹری کرتا تھا اور اب وہ امسٹرڈام کے کیفوں اور آبناروں کے چکر لگایا کرتا ہے۔ اس کردار کے ذریعہ کامیو نے جدید زمانے کے انسان کی کمزوریوں اور برائیوں کو بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نے جنگِ عظیم کے بعد کی نوجوان نسل پر الزام لگایا ہے کہ وہ زندگی سے نہیں، موت سے محبت کرتے ہیں۔" ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی سے بہتر طور پر محبت نہ کر سکیں، لیکن کیا آپ نے دیکھا ہے کہ موت سے ہمارے احساسات بیدار ہوتے ہیں؟ ہم ان دوستوں سے کیسے محبت کر سکتے ہیں جو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں؟ ہم اپنے ان اساتذہ کا کس طرح عزت و احترام کر سکتے ہیں جنہوں نے نصیحت کرنا اور تنقید کرنا ختم کر دیا ہے۔

کامیو کا طرزِ بیان نہایت سیدھا سادا ہوتا ہے۔ اس نے طرزِ بیان کے بارے میں ایک جگہ بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ "وہ ملائم ریشمی کپڑے کی طرح ہے، جس کے اندر جسم کے داغ چھپ جاتے ہیں۔" اس نے ہالینڈ کے بارے میں لکھا ہے: "ہالینڈ ایک خواب ہے۔ موسیو، ایک خواب — سونے اور دھوئیں کا خواب۔" کامیو سارے یورپ اور یورپ کے شہروں سے بیزار تھا۔ وہ آفریقہ واپس چلا گیا تھا جہاں کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ یہاں زندگی کی تازگی اور رعنائی ہے لیکن اس نے یورپ میں جو تلخیاں اور غم سہے تھے انہیں وہ اپنے ساتھ آفریقہ لے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انقلاب کے معنی زندگی کے ہیں لیکن وہ زندگی اور اس کے حالات کے خلاف کسی مابعد الطبیعاتی انقلاب کا آرزومند تھا۔ وہ حکومت اور اقتدار اعلیٰ کی ضرورت پر ایمان رکھتا تھا لیکن وہ اس میں ادیبوں یا شاعروں کو کسی قسم کی مداخلت کرنے کی ضرورت سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ادیبوں کو "حسن، خوبصورتی اور زندگی کے دکھ درد کی خدمت کرنی چاہئے"۔

کامیو کی صفِ اول کی ادیبوں میں ممکن ہو کہ شمار نہ کیا جا سکے لیکن بالزاک، ڈکنس، ٹالسٹائی، ایمیل زولا، فلابیر، میلول اور پروست نے جس روایت کی بنا ڈالی تھی کامیو نے اسے بہتر طور پر آگے بڑھایا ہے۔ اس کی کہانیوں کا کینوس محدود ہے لیکن زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر نہایت وسیع اور گہرا ہے۔ وہ ترقی پسند خیالات کا حامل نہیں تھا۔ اس نے بعض نہایت رجعت پسند اور فضول قسم کے افکار پیش کئے ہیں لیکن ناول نگاری اور کردار نگاری میں کامیو نے جس فنکارانہ رچاؤ سے کام لیا ہے اور اس نے دنیائے افسانہ میں جو نئے نئے تجربے کئے ہیں وہ مستقبل کے ادیبوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

تحسین سروری

زنداں کی ایک رات

پھول کھلتے ہیں کہیں دور، مہکتے ہیں چمن
دور، انگڑائی سی لیتی ہے کہیں دل کی لگن
ناچتی کودتی پھرتی ہے کہیں دور شمیم!
عشق کی آگ میں جلتے ہیں کہیں شعلہ بدن
کوئی بھی پاس نہیں، کوئی بھی دمساز نہیں
صرف احساسِ گراں بارئ غم ہے، میں ہوں

دل میں حسرت کی جگہ ایک خلش نے لے لی
شور ارمانوں کا برپا، نہ خیالوں کا ہجوم!
مستقل ایک سکوت، ایک عجب خاموشی
کوئی مہتابِ غزلخواں نہ کوئی رقصِ نجوم
حال یہ ہے کہ سنی جائے نہ دھڑکن دل کی
صبح کا نور نہ شام اور نہ سلونے منظر
ایک خاموش تماشائے الم ہے، میں ہوں

سر میں سودا ہے نہ نظروں میں بیاباں کوئی
کوئی وحشت بھی نہیں، چاکِ گریباں بھی نہیں
جلوہ آرا ہے یہاں کوئی نہ حیراں ہے کوئی
مگر آزار کا یہ مرحلہ آساں بھی نہیں
دلستاں کوئی نہ سوزِ غمِ پنہاں کوئی
نہ امنگیں، نہ ترنگیں نہ طرب افزائی
سر پہ چھایا ہوا اک ابرِ ستم ہے، میں ہوں

(جیل میں لکھی گئی)

تجرید ماورا

وہ رات

تمہارا خط ہے کہ پیغامِ بہاراں ہے
تمہارے لفظ ہیں یا نکہتوں میں ڈوبے پھول
زمیں سے تا بفلک زمزمے ہیں گرمیں ہیں
تمہارا وعدہ ہے یا رنگ و روشنی کا رسول

حکایتِ دلِ بیتاب، داستانِ شوق
حقیقتوں میں سما جائے گی یقیں نہ تھا
ہزار فاصلے جس رات کے حصول میں تھے
وہ اتنی پاس بھی آ جائے گی یقیں نہ تھا

تصورات نے جب سے نوید پائی ہے
نفس نفس میں بجے ہیں ہزار شادیانے
قدم قدم پہ ہیں شہکارِ مانی و بہزاد
ہر ایک گوشے میں ہیں آذری صنم خانے

کہیں پہ سلمیٰ و عذرا کے مرمریں اجسام
کہیں پہ انیتا و واتی کے آرزو بھرے گیت
ادھر تجملِ شیریں اُدھر عنایتِ ہیر
کہیں تغافلِ حسن اور کہیں وفا کی جیت

جگر کی آگ سے حسنِ آتشیں میں غرق
نظر تبسمِ جاں سوز کی تمنائی!
جبینِ شوق سجودِ نیاز کو بے چین
سلگتے لب شفقِ خام کے تقاضائی

گداز بازو سمٹ کر جو سامنے آئے
جوان آرزوئیں کیسی کیسی مچلی ہیں
نشیلی آنکھوں میں کتنی کہانیاں دیکھیں
دراز گیسوؤں سے داستانیں برسی ہیں

غرض عجیب خیالوں میں گھر گیا ہے ذہن
تمہارے دل کی ہے کیا کیفیت خدا جانے
تمہاری فکر میں بھی ہے وہ رات جلوہ کناں
کہ صرف میری ہی تخلیق ہیں یہ افسانے

یہ انتظار کی لذت، یہ ناشکیبائی
انہی فضاؤں میں تھک ہار کر نہ سو جائے
نگاہِ ناز کا نغمہ لب و کنار کا راگ
خیال و خواب ہی میں منتشر نہ ہو جائے

شبِ سیاہ نے مسلی ہیں یوں تمنائیں
نمودِ صبح پہ بھی اب نہیں مجالِ یقیں
پیامِ وصل بھی آئے تو دل یہ کہتا ہے
پیام ہی تو ہے کیا جانے سچ بھی ہے کہ نہیں

اُمید و بیم میں کھویا ہوا حسیں منظر
کہیں تصورِ وارفتۂ جنوں ہی نہ ہو
یہ سوچ بھی نہ ہو اندازِ خود فریبی کا
"وہ رات" بھی کہیں تخیل کا فسوں ہی نہ ہو

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

دکن

جہاں فرد اپنی جگہ انجمن ہے
جہاں ہر کلی اک مہکتا چمن ہے
جہاں کی زمیں رشکِ چرخِ کہن ہے
جہاں شوخیاں ہیں ادا بےپھبن ہے
جہاں سادگی میں بھی اک بانکپن ہے
جہاں رقص فرما ہوا موجزن ہے
جہاں شعریت ہے جہاں قدرِ فن ہے
جہاں علم و فن کے لئے اک لگن ہے
جہاں حیرت[۱] و زور[۲] کا بھی وطن ہے
جہاں انجمن واقعی انجمن ہے
جو سچ پوچھتے ہو سحرؔ تو وہ خطّہ
دکن ہے، دکن ہے، دکن ہے، دکن ہے

---

۱ جناب حیرت بدایونی
۲ ڈاکٹر زور

مثالؔ رضوی

موسمِ گل

بہار آئی ہے گاؤ کہ موسمِ گل ہے
چمن میں پھول کھلاؤ کہ موسمِ گل ہے
کہاں ہو کالی گھٹاؤ کہ موسمِ گل ہے
فلک پہ جھوم کے آؤ کہ موسمِ گل ہے
رہو گے تابکے تاریکیوں میں دیوانو!
دلوں کی جوت جگاؤ کہ موسمِ گل ہے
چہک رہے ہیں بشاخ قمری و بلبل
سرود تم بھی اٹھاؤ کہ موسمِ گل ہے
نہ آؤ کہنے میں شبنم کہ یہ ہے دیوانی
گلو نہ اشک بہاؤ کہ موسمِ گل ہے
سمن بر، یہ جوانی ہے پھر نہ آئیگی
شرابِ ناب پلاؤ کہ موسمِ گل ہے
ابھر رہا ہے نیا آفتاب مشرق سے!
اٹھو فضاؤں پہ چھاؤ کہ موسمِ گل ہے۔

*

خواجہ شوقؔ

دو غزلیں

شمیمِ گل میں وہ خوشبو نہیں ہے
ترا پرتو ہے لیکن تو نہیں ہے

جو دل محدود رنگ و بو نہیں ہے
وہ منزل گر ہے منزل جو نہیں ہے

رہائی کی تڑپ دل سے نہ جائے
نہو گر قوتِ بازو نہیں ہے

کبھی آنسو ہی آنسو تھیں یہ آنکھیں
فقط آنکھیں ہیں اب آنسو نہیں ہیں

ترقی کتنی ہی کر لے زمانہ
جو آئے عقل میں وہ تو نہیں ہے

کسی پہلو سے دیکھو زندگی کو
سکونِ دل کسی پہلو نہیں ہے

ترا نظارہ ممکن ہے جبھی تک
نظر کے آگے جب تک تو نہیں ہے

وہاں تک شوقؔ چلئے وقت کے ساتھ
جہاں تک وقت پر قابو نہیں ہے

مزاج ان کی نظر کا۔ وقت کے تیور سے ملتا ہے
سکونِ دل ہو یا صدمہ اسی نشتر سے ملتا ہے

ہر اک انداز ماضی خود نظر بنتی ہے فردا کی
عمل کی راہ میں ہر تجربہ ٹھوکر سے ملتا ہے

خدا سے مانگنے والوں کی محرومی کو کیا کہیے:
طلب صادق رہے تو مدعا پتھر سے ملتا ہے

گذر جاتی ہیں عمریں اور پتہ تک بھی نہیں چلتا
نشانِ منزلِ مقصد بڑے چکر سے ملتا ہے

کسی کو ٹھیک ٹھیک اندازہ بھی کیا ہو سکے تیرا
ترا ہر ملنے والا اک نئے تیور سے ملتا ہے

نہیں معلوم کس دھوکے میں ہیں دیر و حرم والے
خدا تو پھر خدا ہے آدمی چکر سے ملتا ہے

بفیضِ درد بھی اے شوقؔ ہے رنگینیٔ معنیٰ
سخن کا سلسلہ داغِ سخن پرور سے ملتا ہے

*

تابش دہلوی

غزل

واقف ہوں میں، وجود مرا بے ثبات ہے
اس پر بھی مجھ کو حوصلۂ صد حیات ہے

لازم ہے پاسداریٔ آدابِ ضبطِ غم
نالہ بھی احتیاط سے کرنے کی بات ہے

اُس کو بھی صرف کشمکشِ شوق جانیے
اک آہِ زیر لب کہ مری کائنات ہے

میں جاں بلب ہوں اور غمِ فرقت بیاں طلب
سن لیجے حالِ دل کہ ابھی تھوڑی رات ہے

پھر بھی نہیں ہے قیمتِ دیدارِ حسنِ دوست
گو ہر نگاہ، جلوہ گہہِ کائنات ہے

تابش غمِ حیات گوارا ہے اس طرح
گویا غمِ حیات ہی، میری حیات ہے

★

(بشکریہ اردو مجلس، حیدرآباد)

نور محمد نور

غزل

لٹ گئی کائنات گلشن کی
فکر کیا کیجیے نشیمن کی

آبلے خارِ رہ گزر سے کبھی
پوچھ لیتے ہیں بات گلشن کی

پھر گریباں کسی نے چاک کیا
کوئی زنجیر پھر کہیں چھنکی

بالمقابل ہیں خالق و مخلوق!
جنگ ٹھہری ہے عزم و آہن کی

آدمی اب بھی کر گزرتا ہے
بات انسانیت کے بچپن کی

ہے کسی فن کا شاہکار وہی
دے جو آواز دل کی دھڑکن کی

ہے وہی نورؔ محسنِ عالم
مشعلِ فکر جس نے روشن کی

غزل

بل کرشن اشک

تجھے خبر ہو کہ ٹہنی پہ تھا تو تجھ سا تھا
وہ ایک پھول جو بالوں میں تو نے ٹانک لیا
وہ آگ آگ شفق یہ دھواں دھواں سنبل
الاؤ دل کا یہ بجھتا سا وہ سلگتا سا
اگر یہ جسم نہ جلتے تو داغ بھی نہ لگے
وہاں نہ جا کے میں تیرے ہی در پہ مر نہ گیا
وہی سا رنگ، وہی سا بدن، وہی سا لباس
اے اجنبی یہ تجھے کیا ہوا کہ وہ نہ ہوا
کوئی کہے تو یہی "تو وہی نہیں کہ جو تھی
وہی قمیص وہی رنگ تری چنری کا
ترا حجاب گیا بھی تو بے رخی نہ گئی!
یہ کیا کیا کہ تجھے پاس آ کے دیکھ لیا
ہوا ہے تند دھکتے ہیں در، رواں ہی چاند
تجھے ملے تو یہ پچھلا پہر ٹھہر نہ گیا
یہ دل میں ہے کہ ہر اک راہ گزر میں جا بیٹھوں
مگر یہ غم کہ تصور کا پیرہن نہ ملا
کھلی فضا میں اڑوں بھی تو اشک اڑوں کیسے
ہے میرے تن پہ منوں بوجھ لاکھ صدیوں کا

غزل

وحید مرزا

تذکرہ ہے کبھی گیسو کا کبھی شانے کا
ایک ساماں ہے غمِ دل کو یہ بہلانے کا

شمع جلتی رہی ہنستے ہوئے آنسو لیکر
خوب انداز سے ماتم ہوا پروانے کا

آج بھی صورتِ حالات وہی ہے لیکن
صرف عنوان بدلتا رہا افسانے کا

بے شعوری کا یہ عالم تھا سب ہی چلتے رہے
کس کو احساس تھا منزل کے گزر جانے کا

آپ کیا سمجھیں گے آوازِ شکستِ دل کو
یہ بھی کیا ساز ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے کا

عشق بے مذہب و بے دین ہوا کرتا ہے
کوئی بھی نام نہیں ہوتا ہے دیوانے کا

نجیبؔ راہش

غزل

کب تلک دل کو ترے درد کی آنچوں میں تپائیں
اور آئینۂ ماحول کو پگھلا بھی نہ پائیں

کچھ تو کرنا ہے بہر حال نئی صبح تلک
آؤ ماضی ہی کی آواز میں آواز ملائیں

اب کہیں شورِ سلاسل ہے نہ پازیب کی دھن
یہ گزرتے ہوئے ہنگامے ہی کچھ گرد اڑائیں

تم جو ہنس دو تو برسنے لگیں گردوں سے نجوم
ہم جو روئیں بھی تو آنسو فقط آنسو کہلائیں

دل حریفِ لب و رخسار سہی پھر بھی نجیبؔ
وہ جو خود دل پہ لکھا ہے اُسے کس طرح مٹائیں

جمیلؔ کلیمی

غزل

گلرنگ گوشہ گوشہ ہے در ہے لہو لہو
میرا بھری بہار میں گھر ہے لہو لہو

کچھ تو نئی سحر کے نقیبو جواب دو
کیوں اس شبِ الم کی سحر ہے لہو لہو

یہ کس کے غم میں آخرِ شب اے مسافرو!
تارے ہیں نیم جاں تو قمر ہے لہو لہو

صیاد کچھ تو کہہ ترے کنجِ قفس میں پھر
شوریدگانِ عشق کا سر ہے لہو لہو!

کس حادثاتِ نو کی بدولت جمیلؔ پھر
یہ میرے دل کا چاند نگر ہے لہو لہو

غزل

صلاح الدین نیّر

ہم مطمئن کبھی کسی عالم نہ ہو سکے
پھر بھی ہم آپ سے کبھی برہم نہ ہو سکے

موتی بنے، شرر بنے، شبنم بنے کبھی
آنسو ہمارے وقفِ شبِ غم نہ ہو سکے

وہ لوگ زندہ رہتے ہیں مرنے کے بعد بھی
ہنگامۂ حیات میں جو ضم نہ ہو سکے

یوں تو دیارِ شوق میں کچھ بھی کمی نہیں
ایامِ رفتہ پھر بھی فراہم نہ ہو سکے

گو زندگی نے کتنے ہی دھوکے دیے مگر
مایوس زندگی سے کبھی ہم نہ ہو سکے

بھیگی شبوں میں ہم نے جلائے تھے جو چراغ
وہ آندھیوں کی زد میں بھی مدھم نہ ہو سکے

نیّر اک ان کا غم ہی نہیں حاصلِ حیات
کچھ اور غم بھی ہیں جو فراہم نہ ہو سکے

★

غزل

اسد احسن جعفری

تحفۂ جاں ہو یا دل کی سوغات ہو
کچھ بھی ہو عظمتِ عشق کی بات ہو

سیرِ صحنِ چمن ہو ترا ساتھ ہو
چاندنی میں نہائی ہوئی رات ہو

آؤ تازہ کریں رسمِ دار و رسن
گیسو و قد کی پھر سے کہیں بات ہو

مے کدہ جاگ اٹھا، شب نے انگڑائی لی
رقص و رم، کیف و کم کی شروعات ہو

یادِ دل کوئی عنوان ہو جاری رہے
دار کی ہو کہ دلدار کی بات ہو

مرتب ـ قمر ساحری

انتخاب مشاعره های بزم سعدی

پروفسور شور (علیگ)

همه نور صبح بینم همه ز آفتاب گویم
"نه بشبم نه شب پرستم که حدیث خواب گویم"

سر بزم نغمه سنجان غم عشق و عاشقی را
دم چنگ و تار خوانم نفس رباب گویم

بسواد کعبه گویم نه بدیر راز مستی
سر لاله زار گویم لب جوئی آب گویم

تو ز موج گنگ نالی گله سنج ساحلم من
اگرم دهند رخصت غم "یخ آب" گویم

تو ز شور چاک دامان خبری مگر نداری
به پیاله زهر دارم سخن از شراب گویم

حیدر شمسی (آمده از لائل پور پاکستان)

سزوار چشم مستش قدح شراب گویم
که ز فرط کیف و مستی بدلم خراب گویم

مدنور تو ندانم تو معاف کن خطایم
ز قصور کم نگاهی اگر آفتاب گویم

ز حدیث دین و دنیا چو به میکده نه گنجد
به هجوم می پرستان ز شراب ناب گویم

برُبود هوش از من بدو چشم نرگسینش
چه شود به پیش مستان اگر این شراب گویم

شب غم ز دیده من که ربود خواب حیدر
چو تمام شب نخفتم چه حدیث خواب گویم

یٰسین علی خان یٰسین

چو ز حسن تو سوالی برسد جواب گویم
به تنگ اندر اندیاران که حدیث خواب گویم

گهی مستم و خروشم گهی راز خود فروشم
چه بمستی و بهوشم همه زان حباب گویم

به تقدسی که زاهد ورق کتاب خواند
ز گل و شراب و نشاط بدف و رباب گویم

دلم آئینه که پیشش شب و روز می نشینی
همه نازها که بینم ز تو بی حجاب گویم

بحضور نیستین سحرم شبی ندارد!
"نه بشبم نه شب پرستم که حدیث خواب گویم"

بانو طاهره سعید

نه قمر نه شمع هستم که ز آفتاب گویم
گل گلشن زمینم که ز بو تراب گویم

چه وجاهت و شجاعت چه ثرافت و سخاوت
بخدا نمی توانم که ز آنجناب گویم

همه شب فغان و زاری همه روز اشکباری
نه بچشم خواب دارم که حدیث خواب گویم

ز جبین او منوّر رخ مهر و ماه و انجم
چه بیان کنم ز حسنش چه ز لاجواب گویم

دکتر طاهر مسلم[1]

اندازه قیمت سحر و شام ندارد
رندی گله گردش ایام ندارد!

[1] پنجاب

١

دُردی کش میخانہ به از زاهدِ سالوس — کز بادۀ اطهر طمعِ خام ندارد
در نرگسِ مستش اثرِ مستیِ صهباست — گو ساقیِ مہ پارہ بکف جام ندارد
معذور بدارند ز اعمال و عقائد — دیوانۂ او جامۂ احرام ندارد
ای جت همه کذب است چو گویند حریفان — این مسلم تو کار باسلام ندارد

اکبر حیدرآبادی

آن شوخ ستمگر روشِ عام ندارد — خون دو جہان ریزد و الزام ندارد
بی لذت و بی کیف بود در نگہِ ما — شامی کہ جمالش بہ لبِ بام ندارد
شاید کہ منِ آتش نفَس برق غمیرم — آسودہ مرا گردشِ ایام ندارد
این سعیِ مدام از پیِ آسودگیِ دل — مانندِ یک آغاز کہ انجام ندارد
هر بیتِ غزل مخزنِ اسرارِ جنون است — اکبر سخنم فلسفۂ خام ندارد (آمده از لندن)

ناصح رضوی

چون پیچ و خمِ زلفِ سیه دام ندارد — دیوانہ شد آوارہ و آرام ندارد
در چشم زدن سیرِ فلک کردم و دیدم — "عرضِ دو جہان وسعتِ یک گام ندارد"
این اوج طلب مرغِ تمنا است کہ با هم — در رفعتِ پروانہ خود آلام ندارد
در کوی تو جان داد غریبی کہ تو گوی — این کشتۂ عشق است کہ احرام ندارد
آن شمعِ شبستانِ حرم گفت بہ ناصح — دیوانہ ما شورشِ اوہام ندارد (آمده از کراچی پاکستان)

پروفیسور سید احمد وحشی

ای رنگِ رخت بادۀ گلفام ندارد — دی سنگ دلت گردشِ ایام ندارد
ما را غمِ امروز نہ اندیشۂ فردا — کاین سلسلہ ای هست کہ انجام ندارد
تو شاهی کہ بر برگِ گل آسودہ نجسپی — بر خار فقیریست کہ یک جام ندارد
آن کیست کہ از فیضِ تو انعام نیابد — این مجلسِ ما هست کہ یک جام ندارد
این خلق همہ در پیِ دنیا بشتابد — وحشی ست کہ فکرِ سحر و شام ندارد (آمده از کراچی پاکستان)

خسرو قادری

آغازِ غمِ زیست چو انجام ندارد — شاد است جہان کو غمِ ایام ندارد
فهمد ز نظر آنچہ در آید بخیالت — هر چند دلم قوتِ الهام ندارد
هم چشمِ تو بی شک کہ همچشم ندیده — هم نامِ تو یکتا ست کہ همنام ندارد
با عزمِ قوی گر ببرد مرغِ تصور — "عرضِ دو جہان وسعتِ یک گام ندارد"
بی نام و نشان دید همہ ناموران را — زان ست کہ خسرو هوسِ نام ندارد

علی بن امتیاز

خلاف ورزی

خوب! دکان ابھی کھلی تھی۔ میں جلد جلد اندر پہنچ گیا۔

"کیا آپ پاس افیون ہے؟" میں نے بہ مشکل اپنا سانس روکتے ہوئے کہا۔ سوال تو لغو تھا ہی، کیوں کہ میں افیون کی دکان سمجھ کر ہی آیا تھا اور سامنے ہی کاؤنٹر سے ٹنگا ہوا "لائیسنس" حروف و الفاظ کی شکل میں بہ بانگ بلند افیون کی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا لیکن مجھے جو جواب ملا وہ لغو تر تھا۔

"افسوس جناب" دکاندار نے کہا۔ "دکان بند ہو گئی ہے۔"

عام طور پر کسی دکان کو بند اسی وقت کہا جاتا ہے جبکہ اس میں داخل ہونے کا راستہ بند ہو لیکن شاید تجارتی نقطۂ نظر سے یہ تعریف ٹھیک نہیں۔ کسی دکان کا دروازہ کھلا ہو سکتا ہے، اور پھر بھی دکان بند ہو سکتی ہے۔

"ابھی ابھی آٹھ بجے ہیں۔" میں نے نرمی کے ساتھ احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے جناب" دکاندار نے سڑک کی جانب نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

اب بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے اس کی نظروں کی متابعت کرتے ہوئے دیکھا کہ ایک کانسٹبل ڈیوٹی پر موجود ہے اس کی ایک آنکھ آنے والی موٹر پر اور دوسری ہماری جانب نگراں۔ وہ بیک وقت شہر کے شہریوں اور شہر کی افیون۔ ہر دو کی حفاظت کر رہا تھا۔

"صرف آج، ایک بار دید تیجئے۔" میں نے دبی آواز میں لجاجت سے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ وہ ہمیں دیکھ لے گا"

میں نے پہلے بھی "صرف آج۔ ایک بار" پر عمل کیا تھا اور اس نے دیکھ لیا۔" دکاندار نے کہا۔

ڈرائیور نے سفید لکیر کا لحاظ نہیں کیا اور کانسٹبل نے اسے للکارا۔

میں نے کہا۔ "ہاں اب"

لیکن موٹر یکایک رک گئی اور اسی طرح ہم بھی۔ ہوشیار کانسٹبل پھر ہمیں تاک رہا تھا۔

"ادھر دیکھئے۔" میں نے قانون کو صرف نظر کرتے اور ہمدردیٔ نسواں کا واسطہ دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے صرف نصف [illegible] ماسہ چاہئے۔ میری اہلیہ کو سخت قسم کی پیچش ہو گئی ہے۔ دوا کے طور پر استعمال کرنا ہے۔"

دکاندار اب مجھ سے بیزار سا ہو چلا تھا لیکن عورتوں سے ہمدردی کی آڑ میں اس کے جذبات سے اپیل کرنا اسے [illegible]لانہ لگا۔ شاید وہ اس معاملہ کو اس زاویہ سے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"فرمائیے!" میں نے بے رحمانہ انداز میں استفسار کیا۔
دکان دار میری بیوی کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے کچھ پس و پیش کرنے لگا۔
"یہی ایک دوا آزمانی رہ گئی ہے۔" میں نے کامیابی کے خیال سے زور دیتے ہوئے کہا۔
خدا اس کانسٹبل کا بھلا کرے، معاملہ کو بگاڑنے کے لئے اب وہ صرف ہمیں ہی تاک رہا تھا۔

"مجھے معاف فرمائیے۔" دکان دار نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
میں پوچھتا ہوں کیا یہ ایک واہیات بات نہ تھی کہ ادھر ایک عورت بیماری کی شدت سے تڑپ رہی ہو اور ادھر اس کی دوا دھری ہے جو صرف اس وجہ سے اسے نہیں مل سکتی کہ شہر کے چند نمائندوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ۸ بجے کے بعد رات میں افیون فروخت نہ کی جائے اور صرف اسی وجہ سے بیمار عورت کو رات بھر تکلیف میں مبتلا رہنا پڑے۔ کیا اس فیصلہ کو مرض پیچش سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟
"اچھا اب آپ یہ فرمائیں" میں کہنے لگا، "کہ اگر آپ کے سامنے رکھی ہوئی پڑیوں میں سے ایک پڑیا اٹھا لیجاؤں تو کیا آپ میرا پیچھا کریں گے؟"

دکاندار نے اس پر ایک عجیب انداز سے مجھے گھورنا شروع کیا۔ یہ انداز خوشگوار نہ تھا، تاہم میں کہتا گیا۔
"میرا مطلب یہ ہے کہ" میں نے تفہیم مطلب کی خاطر کہا "اگر آپ میرا تعاقب نہ کریں تو کیا یہ قانون شکنی ہوگی؟ کیا قانوناً یہ حکم ہے کہ اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہر شخص کا تعاقب کرنا چاہیئے؟"
دکاندار مسکرا دیا۔ میں نے افیون نہ سہی اس کا دل تو موہ لیا۔
"تب تو مجھے افیون نہ چرانا چاہئے۔" میں نے کہا۔
وہ پھر مسکرا دیا، اور میں کہتا گیا۔
ہم کو بہرحال یہ دیکھنا ہے کہ حصول مقصد کے لئے کون سی تدبیر مفید ہوگی۔ یہ ظاہر ہے کہ میں افیون نہ چراؤں گا، اور یہ بھی جانتا ہے کہ مجھے افیون مل جائے تو آپ کو ناگوار خاطر بھی نہ ہوگا۔
اب اس کی مسکراہٹ مبہم سی ہو گئی تھی، اور میں کہتا گیا۔
"میں جس نتیجہ پر پہنچنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کو کوئی اعتراض ہوگا اگر مجھے مطلوبہ مقدار میں افیون مل جائے کیونکہ مجھے نہ تو آپ سے اور نہ آپ کو مجھ سے کوئی نفرت ہے۔ اور نہ آپ یہ گمان کر سکتے ہیں کہ میں افیون کا کوئی ناجائز استعمال کروں گا۔"
"نہیں جناب" اس نے زیر لب کہا۔
"اچھا تو آپ تحفتاً مجھے آدھا ماشہ افیون دے دیجئے۔" میں نے ایک تجویز پیش کی۔ "اگلے ہفتہ میری سالگرہ ہے۔ قانوناً آپ مجبور نہیں کہ کسی کو پیشگی تحفہ نہ دیں؟"
"مجھے افسوس ہے جناب" اس نے جواب دیا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا ہماری دوستی ناپائیدار ہے۔ "ایسا نہیں ہو سکتا" مجھے رنجیدگی کا احساس ہونے لگا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسا ہو سکتا۔ چنانچہ میں نے کہا۔
"تو کیا آپ سنجیدگی سے کہنا چاہتے ہیں کہ" میں نے ذرا بلند آواز سے کہا "کل دکان کھلنے تک ساری افیون گودام میں ہے اور مریض ہلاک ہوتا ہو تو ہو جائے۔ کیا اور طریقہ حصول مطلب کا نہیں؟ کیا آپ ایک آدھا ماشہ افیون گھر نہیں لے جا سکتے لے جا سکتا ہوں"۔ اس نے برافروختگی کے ساتھ کہا۔ "دکان میری اپنی جو ہے۔" (باقی ملاحظہ ہو صفحہ پر)

ایک فکاہیہ

بھارت چند کھنہ

من ترا حاجی بگویم

ادیبوں میں

پنجابی کی ایک مثل مشہور ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ کمہارن اپنے ہی برتن کو سراہتی ہے۔ قانون فطرت بھی یہی ہے کہ آدمی اپنی ہر صنعت اور اپنے ہر فعل کو اچھا سمجھتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اول تو انسان کو اپنی چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اس کے بعد وہ چیزیں جو اپنی ذات سے کوئی نہ کوئی تعلق رکھتی ہوں جہاں اپنے سے کوئی نسبت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ خیال قائم ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارا ہے وہیں سے ایک غیر محسوس دلچسپی اور ایک بہتری لگاؤ ضرور ہو جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسی "ہمارا" ہی کی نسبت سے ساری گھما گھمی ہے مثلاً ہمارا دوست۔ دوست اسکلئے دوست ہے کہ ہمارا ہے۔ ہمارا باپ، ہماری ماں، ہمارا بھائی، ہماری بہن ہمارا بچہ اور یہاں تک کہ ہماری بیوی وغیرہ وغیرہ۔ اب ان رشتوں میں آپ جہاں سے "ہمارا" کو نظر انداز کریں گے وہیں قصہ تمام ہو جائے گا۔ ماں باپ اگر اولاد سے بے توجہی برتیں اور ذرا سی بھی اجنبیت کا ثبوت دیں وہیں سے بیگانگی کا ثبوت پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح اولاد اگر نافرمان نکلے تو اس کے لئے ہماری کا لفظ استعمال کرتے ہوئے شرم آنے لگے گی۔ بیوی کے پاک رشتہ میں تو "ہماری" ہی کے تصور پر تعلقات کی ساری بنیادیں ہیں۔ "ہمارا" کا یہ تخیل صرف یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ وطنیت اور مذہب کے شعبے بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔

"ہمارا وطن سب سے پیارا وطن"

کا بنیادی خیال یہی جذبہ ہے۔ اور تو اور خدا یا ایشور سے عقیدت بھی اسی جذبہ کی بناء پر ہوتی ہے۔ انسان اس سے کیوں لو لگاتا ہے اسی لئے کہ وہ ہمارا خدا ہے۔

انسان کی طبیعت کی یہ خاصیت آدم سے لے کر اب تک چلی آرہی ہے جب انسان محض ایک وحشی تھا تو اس کا فرض اولین تھا کہ اپنے بچاؤ کی صورتیں مہیا کرے۔ غرض اس نے اپنے بچاؤ کے لئے دھوپ اور سردی کی شدت، جانوروں اور دشمنوں کے حملے وغیرہ سے پہاڑوں میں غار بنائے۔ پھر اس کو اپنے کنبہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس موقعہ پر غالباً وہ اپنی جان کے بعد اپنے کنبہ ہی کو عزیز سمجھتا تھا۔ کنبہ سے خاندان بنا اور خاندان سے قبیلہ۔ پھر گاؤں، قصبے اور شہر بسے۔ حکومتیں قائم ہوئیں اور ملک کا تصور پیدا ہوا۔ انسانی زندگی کے نشو و نما کے ہر مختلف دور میں طبع انسانی کی یہ خصوصیت کہ اسے اپنی اپنے سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہی اچھی معلوم ہوں، برقرار رہی۔ اور اب جبکہ ارتقاء انسانی نے ایک قدم اور بڑھا لیا ہے یعنی متحدہ قوموں کا ادارہ قائم کر دیا ہے۔ اب بھی انسان کی فطرت نہیں بدلی اگر اس کا تعلق متحدہ قوموں سے ہے تو وہ اس کے اداروں کے

طرزِ عمل اپناتے ہیں اور سچ پوچھئے تو ہونا بھی ایسا ہی چاہئے کیونکہ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں اور بیگانے بیگانے۔ اس لئے اگر کمہار اپنے ہی برتن کی تعریفوں کے پل باندھتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے اور پھر اگر آپ پنجابی مثل کی کمہارن کو چھوڑ کر اور دوسرے لوگوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو یہی کیفیت نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر کسی اکھاڑے کے پہلوانوں کو لے لیجئے۔ یہ تمام دنیا کے ہاتھی سوائے اپنے اکھاڑے والوں کے اور کسی دوسرے اکھاڑے والوں کو کسی قابل نہ سمجھیں گے۔ اور اگر کشتی میں ان کا کوئی پہلوان کسی دوسرے اکھاڑے کے پہلوان سے پچھڑ جائے تو بھی وہ اپنے ہی آدمی کی تعریف کریں گے۔ باقی رہا ہارنے والا معاملہ تو اس کے لئے ہزار بہانے تلاش کئے جا سکتے ہیں مثلاً یہ کہ ہمارے پہلوان کا پاؤں پھسل گیا تھا یا دوسرے پہلوان نے کشتی کے قواعد کی پابندی نہیں کی اور اگر یہ عذرداریاں بروقت یاد نہ آئیں تو بہرحال ہم ہندوستانیوں کو اپنی ناکامیوں کی وجہ کے دریردہ مجرب نسخہ یعنی بدقسمتی کا عذر معقول بتلانے میں کہیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ یعنی نوکری کیوں نہیں ملی۔ بچوں کی تعداد کیوں بڑھی۔ گھوڑا کیوں اڑا۔ روٹی کیوں جلی۔ پان کیوں سڑا۔ امتحان میں فیل کیوں ہوئے۔ ان سب کا ایک ہی جواب ہے کہ بدقسمتی ہے۔

اس لمبی چوڑی تشریح کا مطلب صرف یہ تھا کہ آپ پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ انسان کی فطرت کیا ہے۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اب تو ایسا ہو گیا ہے کہ تہذیب کی پابندیوں میں جکڑے جانے کے باعث کبھی زمرہ، کسی پارٹی، کسی جماعت سے تعلق پیدا کر لینے کے بعد وہ بعض مرتبہ اپنی مرضی کے خلاف اپنی جماعت کے گن گانے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب عام رفتارِ زمانہ یہ ہو تو پھر ادیبوں کو کیا کہئے۔ یہ لوگ اپنے زمرہ سے تعلق رکھنے والے کے متعلق ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والوں کے لئے اس بات کا اندازہ اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جس شخص کی تعریف کی جا رہی ہے کیا اس سے اچھا ادیب کہیں اس دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا۔

ادیب اپنے زمرہ والوں کی تعریف مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ ایک تو کسی کتاب کا مقدمہ لکھتے ہوئے۔ اس موقع پر وہ زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مثلاً لیکھک جس کی کتاب کے لئے مقدمہ لکھا جا رہا ہے محض ہذیان بکنے کا عادی ہو اور اس قسم کی نثر یا نظم لکھتا ہو کہ پڑھنے اور سننے والوں کی سمجھ سے باہر ہو جس کو وہ شاید خود بھی نہ سمجھ سکتا ہو اور جس کی محض خوبی یہ ہو کہ اس کا تعلق اس خاص قسم کے لکھنے والوں میں سے ہو گیا ہو جس کا کوئی رکن اس کی کتاب کا مقدمہ لکھ رہا ہو تو صاحب ایسی صورت میں بھی آپ کو یہ باور کرایا جائے گا کہ فلاں صاحب کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ پڑھنے والے کو لطف آ جاتا ہے۔ ہمارے حاجی صاحب الفاظ کو چھوٹے چھوٹے یا بڑے بڑے جملوں میں نگینوں کی طرح جڑ دیتے ہیں۔ ان کی عبارت ایسی برجستہ ہے کہ زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح "چنے جور گرم" چبانے کے بعد۔ اور پھر خوبیٔ بیان کا یہ عالم ہے کہ اگر بچہ بھی کتاب پڑھنے لگے تو مطلب ایسا صاف سمجھ میں آ جاتا ہے جیسے شفاف آئینہ میں عکس۔ پھر فلاں صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان کی کتاب زیرِ بحث مقدمہ لکھنے کی خاطر دیکھنی شروع کی۔ میری عادت ہے کہ میں کسی بھی کتاب کو ایک ہی مرتبہ ختم نہیں کر سکتا۔ جس طرح انسان لکھنے کے لئے کسی خاص کیفیت کسی خاص دماغی حالت میں پہنچنے کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح میں صرف خاص خاص حالتوں ہی میں پڑھ سکتا ہوں۔ مگر صاحب ان حاجی صاحب کی تحریر میں نہ جانے کیا جادو ہے اور کون سا طلسم بھرا ہوا ہے کہ ایک مرتبہ کتاب شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکا اور جب تک میں کتاب پڑھتا رہا مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی خوبصورت چمن میں رنگا رنگ پھولوں سے بھری ہوئی کیاریوں میں بیٹھا ہوں جھکتے پھولوں اور ہر قسم کی خوشبوؤں سے مسعود ہو رہا تھا

ہوں۔ حاجی صاحب لکھتے نہیں سحر کرتے ہیں۔

یہ تو انداز بیان کی خوبیاں بتلائی گئی ہیں اس کے بعد ملا صاحب نفسِ مضمون پر اتر آتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ حاجی صاحب کے ناول یا افسانے یا مضامین ہمیشہ اچھوتے ہوتے ہیں ان کا ہر خیال نیا۔ ان کی ہر بات انوکھی۔ ان کے ہیرو جوانمرد اور ہیروئن پیاری۔ افسانہ افسانہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ جیتی جاگتی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ پلاٹ ایسے ہوتے ہیں کہ عام روزمرہ کی زندگی کے سچے پہلو کی عکاسی کرتے ہیں۔ پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود افسانے کا کوئی کردار ہے اور ایسا محسوس کرنے کے لئے اس کو قیاسات کے گھوڑے نہیں دوڑانے پڑتے بلکہ جب وہ افسانے کے پلاٹ کے متعلق غور کرتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر روز ہونے والی بات ہے۔ یہ حیرت ہے کہ اس پر اب تک کسی نے بھی نظر نہ ڈالی تھی۔ پھر بتلایا جاتا ہے کہ یہی حاجی صاحب کے افسانوں کی خوبی ہے اور یہی خوبی ان کو زمانۂ ماضی اور حال کے لکھنے والوں سے کہیں بالاتر مقام پر پہنچا دیتی ہے۔

یہ سب کچھ بتلا دینے کے بعد یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پڑھیے اور پڑھ کر خود اندازہ لگائیے ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کی کتاب پر ملا صاحب کا مقدمہ پڑھنے کے بعد آپ خواہ کسی حالت میں بھی ہوں کتاب پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ صفحے پڑھنے کے بعد آپ حیران ہوتے ہیں۔ اس برجستہ عبارت کو ڈھونڈتے ہیں جو آپ کو نہیں نظر نہیں آتی۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی زبان ملا صاحب کی زبان کی طرح چٹخارے بھرنے لگے۔ مگر کتاب میں اس کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ آپ کچھ صفحے اور پڑھ جاتے ہیں بالکل اسی کڑوی دوائی کی طرح جس کو مریض اس لئے پی جاتا ہے کہ جس عارضہ میں وہ مبتلا ہے شاید اس سے چھٹکارا مل جائے۔ مگر نہ تو آپ کو روزمرہ کی زندگی کی عکاسی کہیں نظر نہیں آتی اور نہ جیتی جاگتی تصویریں آپ کے سامنے آکر ناچنے لگتی ہیں۔ اگر کوئی حرکت اس کتاب کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے تو وہ آپ کی اپنی حرکتیں ہوتی ہیں۔ آرام کرسی میں یا کھاٹ پر آپ بے چین ہوئے جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ پھولوں کی کیاریاں اور عطر بیز ہوائیں کدھر چلی گئیں۔ آپ اپنے جی پر جبر کر کے کچھ اور ورق گردانی کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حاجی صاحب کے افسانے عام انسان کے بس کے نہیں اور ملا صاحب کی تعریف لاکھ خوبصورت سہی مگر سراسر جھوٹ تھی۔ آپ حاجی اور ملا دونوں حضرات کو کوستے ہیں۔ ان کو بھی کوستے ہیں جنہوں نے یہ کتاب چھاپی لیکن اس حاجی ملا کی سازش میں آپ سب سے زیادہ اپنے آپ کو کوستے ہیں کہ آپ نے گاڑھا پسینہ بہا کر کمایا ہوا پیسہ اس کتاب کے خریدنے میں کیوں گنوایا۔ اس بے بسی کے عالم میں آپ سوائے اس کے اور کیا کرسکتے ہیں کہ کتاب کو نہایت پرجوش انداز سے کسی چیز پر دے ماریں اور اس حرکت سے اگر کوئی آئینہ، کوئی گلدان یا کوئی اور چیز ٹوٹ جائے تو گھر والی کی صلواتیں سن کر گھر کے کسی کونے میں دبکے پڑے رہیں۔

ادیبوں کا ایک دوسرے کو حاجی اور ملا کہنے کا موقع مشاعروں میں بھی ملتا ہے۔ ان موقعوں پر تعریفیں زبان سے کی جاتی ہیں۔ داد ایسے دی جاتی ہے کہ جوشِ داد دہی میں حاجی یا ملا صاحب یکایک اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سر دھننے لگتے ہیں۔ واہ واہ کیا کہنے کے نعرے بلند کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو پرزور طریقہ پر ہلاتے ہوئے ایسے نظر آتے ہیں جیسے کوئی گھٹیا قسم کا مقرر تقریر کرنے کی کوشش میں الفاظ کو نہ پا کر مطلب ادا کرنے کی غرض سے ہاتھوں کو ہلا رہا ہو۔ بس یوں سمجھئے کہ حاجی صاحب ملا کی تعریف کرنے میں یا ملا صاحب حاجی کی غزل پر وجد میں آجاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ظالم نے قلم توڑ دیا۔ ذوق اور غالب کا منہ پھیر دیا۔ حقیقت آشکارا کر دی اور کیا مضمون جوڑ ڈالا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ آج

غالب غزل سرا ہو" ورنہ صاحب سورج کی روشنی میں چراغ کی روشنی کی کیا وقعت رہتی ۔ اچھا صاحب مکرر فرمائیے مکرر فرمائیے اور میں تو یہ کہوں گا کہ اس شعر کے بعد کوئی اور شعر پڑھنے دیا جانا۔ شاعر کا خون کرنا ہوگا ۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ حاجی صاحب اپنی غزل کا یہ شعر پڑھتے جائیں تاکہ شاعری کی مشعل ہمیشہ روشن رہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اور ملا صاحب اپنی تعریفوں کا طوفان اس وقت تک اٹھائے رکھتے ہیں جب تک کہ مشاعرہ کے منتظمان یا تو ان کے جوشِ گویائی پر قابو نہیں پا لیتے یا ان کو نامعقول و خلل اندازی کے جرم میں دھکے دے کر محفل سے باہر نہیں کر دیتے ۔

یہ سب کچھ کیوں اور کس لیے؟ اس لیے اور صرف اس لیے کہ جب ہمارے کلام سنانے کی باری آئے تو شائستگیٔ ادب کے پردہ پر وہی طوفانِ بدتمیزی پھر اٹھے ۔ اور سیدھے سادھے بھولے بھالے عوام سے

"من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو"

کی اس رسہ کشی میں شاید ہمیں کو سنسار کا مہا کوی سمجھنے لگیں ۔ (زیر طبع کتاب "ٹھنڈی ہملیاں" سے)

(بقیہ نقد و نظر صفحہ ۳۹ سے آگے)

کتاب میں قطب شاہ کے کلام کو عصر حاضر کی زبان میں لکھا گیا ہے ۔ شاید اکیڈیمی نے خواہش کی ہو ۔ شعراء کے حالات بتلاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے تمام سنین عیسوی کا دیئے ہیں ایک لحاظ سے ٹھیک تو ہے لیکن ہمارے اکثر شعراء کی وفات کے تاریخی قطعات اور مادے کہیں مکمل اور کہیں تعمیہ اور تخرجہ کے ساتھ موجود ہیں ۔ مثلاً نصرتی کا "نصرتی شہید است" ۱۰۸۵ ۔ ولی کا سر الہام سے "بادشاہ ولی سالی گزرگاہ" ۱۱۱۹ = ۱۱۴۴ سراج کا "شعلہ" کا سر حرف خارج کرکے "سراج بزم ارم را نمود نورانی" ۱۱۷۷ = ۱۰۴۲ ۱۰۰ مظہر جان جاناں کا رونے دوسے "ہائے جان جاناں مظلوم" میر کا "واویلا مرد شہ شاعران" ۱۲۲۵ ۔

غرض ایسے کئی شعراء کی صحیح تاریخ وفات تو معلوم ہو سکتی تھی ۔ عیسوی سن سے مطابقت کر دینے میں غلطی کا امکان باقی رہتا ہے ۔ کتابت، طباعت اور جلدسازی وغیرہ نہایت معیاری ۔ دیدہ زیب اور اکیڈیمی کے شایانِ شان ہے لیکن قیمت بہت زیادہ ہے ۔ ساہتیہ اکیڈیمی نے کتاب کی قیمت تجارتی اصول کے پیشِ نظر رکھی ہے جس سے کتاب کا عوام کے ہاتھوں تک پہنچنا مشکل ہے ۔ (ڈ ص)

بقیہ خلاف ورزی صفحہ ۲۶ سے آگے ۔

اس اعتراف نے میری مشکل کو حل کر دیا ۔

"دیکھئے" میں نے کہا "میں شرط کئے دیتا ہوں کہ آپ اپنی دوکان مجھے بعد ہی فروخت کرنے کے مجاز ہیں" دکاندار حیران حیران میری صورت دیکھنے لگا ۔

"آپ وہ مارفین فروخت نہیں کر سکتے لیکن دکان کی فروختگی پر کوئی پابندی نہیں ۔ ہر شخص جب چاہے بڑا معاملہ کر سکتا ہے ۔ اچھا تو اب آپ اپنی دکان دس روپے میں بیچ دیجئے ۔ (میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھا) اب یہ ساری اترن میری ہے ۔ دکان میری ہے ۔ میں صرف وہ مارفین گھر لیجاؤں گا (میں نے جھک کر الماری میں سے چھوٹی بڑیا اٹھا کر جیب میں رکھ لی) اور اب مجھے دکان سے کوئی سروکار نہیں ۔ آپ یہ دکان مجھ سے پانچ روپے میں خرید لیجئے"۔

میں نے اس کی ہتھیلی میں سے ۵ نوٹ اٹھا لئے اور سلام کر کے اپنا راستہ لیا ۔ مگر گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ باس صاحب نے کوئی اور دوا دیدی ہے ۔

(ماخوذ)

* محمد اکبرالدین صدیقی
* وقار خلیل
* غلام رسول
* نصیرالدین ہاشمی
* ابنِ نامی

نقد و نظر

تنقید و تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے (ادارہ)

غالب کی نادر تحریریں

مرتبہ۔ خلیق انجم۔ ناشر مکتبہ شاہراہ دہلی۔ سائز پونیہ۔ مجلد صفحات ۱۸۴۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت چار روپے۔

خلیق انجم صاحب کی یہ کوشش نہایت مستحسن ہے کہ انہوں نے غالب کی تحریروں کے متعلق ایسا مواد ایک جگہ جمع کردیا جو مختلف رسائل میں پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ خود مقدمہ میں فرماتے ہیں:۔

"میں نے کوشش کی ہے کہ ان تمام موتیوں کو جو تقریباً سو سال کے جریدوں میں بکھرے پڑے ہیں ایک لڑی میں پرو دوں۔"

اس کے ساتھ ہی غالب کے خطوط کے مجموعوں کی فہرست اور ان کا تعارف بھی کرا لیا ہے لیکن ڈاکٹر زور صاحب کی کتاب روحِ غالب کا ذکر نہیں کیا۔ یہ خطوط کا انتخاب تو ہے لیکن خاصے کی چیز اس کا مقدمہ ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اس کو علیحدہ بھی سرگزشت غالب کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ ادبی خطوط غالب مرتبہ عسکری صاحب، سرگزشت غالب مرتبہ مرزا محمد بشیر، اور مکاتیب الغالب مرتبہ احسن مارہروی کا ذکر کیا گیا ہے تو روحِ غالب کا بھی ذکر ضروری تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیق صاحب نے اس کی ترتیب میں بڑی محنت اٹھائی ہے۔ جن رسالوں کے مختلف شماروں سے انہوں نے مواد حاصل کیا یہاں ہم چند کا ذکر کرتے ہیں۔ آجکل، اردو، اردوئے معلیٰ اخبار، اورینٹل کالج میگزین، تصویرِ جذبات، دبدبہ سکندری، زمانہ، سراج سخن، شاعر مشرب، معارف، ندیم، نگار اور ہندوستانی۔ اردو کے رسائل سمندر کی شکل اختیار کر گئے ہیں اور ان سے مواد حاصل کرنا غواصی سے کم نہیں۔ خلیق صاحب اس کوشش پر قابلِ مبارک باد ہیں۔ (ا ۔ م)

اردو غزل ولی تک

مرتب ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی۔ ناشر بزمِ اشاعت اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی نمبر ۶۰ ڈیمی سائز۔ صفحات ۱۲۸۔ مجلد مع گردپوش قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی نمبر ۳۔

یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے ولی تک کی غزل کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ ایک میں تنقیدی جائزہ ہے۔ اس میں ولی تک تین دور کئے گئے ہیں۔ پہلے دور میں حضرت امیر خسرو، حسن سنجری، بہاءالدین باجن، بلبل حسینی، شہباز، شیخ جمالی، نامعلوم (ایک شاعر)، رحمت اور عجیب شامل ہیں۔

ان کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ یہ دور سنہ ۔۔۔ھ سے ۹۰۰ھ تک ہے۔ دوسرا ۹۰۰ھ تا ۱۱۰۰ھ ہے جس میں چار قطب شاہی بادشاہ ہیں اور ایک علی عادل شاہ شاہی ہے۔ ان کے علاوہ سلطان، غواصی، وجہی، نصرتی، شوقی، طبعی، مشتاق، لطفی اور ہاشمی کے کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ تیسرا دور ولی سے شروع ہوتا ہے اور اس دور میں اشرف، رضی، فراقی، راجہ رام، بحری، آبرو، حاتم اور بیدار کا کلام شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کا عنوان ہے غزل ولی تک، ولی سنہ ۱۱۱۹ھ میں وفات پاتے ہیں۔ اس طرح تیسرا دور سنہ ۱۱۱۹ھ یا ۱۱۲۵ھ پر ختم ہونا چاہئے تھا لیکن پون سو سال اور آگے کے شعراء کو بھی شامل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ابو الحسن تانا شاہ اور ولی معاصر ہیں ابوالحسن کو دوسرے دور میں اور ولی کو تیسرے دور کے آغاز میں رکھا گیا ہے۔ ولی نے غواصی سے کتنا اکتساب کیا ہے اس کی جا بجا شہادتیں ہیں لیکن اس کے باوجود ولی کو گجراتی تسلیم کیا گیا ہے۔ غواصی کے کلام یا خود اس کے وہاں تک پہنچنے کی کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی تاہم ڈاکٹر صاحب نے ایک نئے انداز میں غزل گو شعراء پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب ہر آئینہ قابل قدر ہے۔

کتابت اور طباعت نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ ابتہ حصۂ کلام میں کتابت کی چند غلطیاں ہیں جس سے نہ تو تنقیح مفید ہے اور نہ ٹائپ میں۔ اس لئے قابل نظر انداز ہیں۔

(ا، ص)

۱۹۵۸ء کے منتخب افسانے

مرتبہ ایم، حبیب خاں۔ لائبریرین انجمن ترقی اردو علی گڈھ قیمت ۲/۲۵۔

حبیب خاں صاحب نے افسانوں کا یہ انتخاب شائع کیا ہے اور انتخاب خواہ وہ افسانوں کا ہو یا مضامین کا غزلوں کا ہو یا نظموں کا ہر ایک کو پسند آنا مشکل ہے۔ انتخاب کو منتخب کرنے والے کی نظر سے دیکھئے تو ظاہر ہے کہ اس سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا۔ اور اپنی نظر سے دیکھئے تو کمی بیشی اور حسن و قبح نکل ہی آتے ہیں لیکن حبیب خاں صاحب کا یہ انتخاب پڑھنے والے کو مایوس نہیں کرتا اور اس انتخاب کی تیاری میں خاں صاحب نے جس ہفت خوان کو طے کیا ہے اس کے علم میں آنے کے بعد تو کوئی ان کی محنت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ملک کے مشہور افسانہ نگاروں کے افسانے اس میں موجود ہیں جو چھوٹ گئے یا تو افسانہ نگاروں نے اشاعت کی اجازت نہ دی یا پھر کوئی جواب ہی نہ دیا۔ جو افسانے شامل ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ (۱) اپنے دکھ مجھے دیدو، راجندر سنگھ بیدی (۲) پرتیوا کرشن چندر (۳) ٹوٹنے پل، علی عباس حسینی (۴) ماتم، احمد ندیم قاسمی (۵) پھرتے ہیں میر خوار ۔۔۔۔۔۔، شوکت صدیقی۔ (۶) زہر، عصمت چغتائی۔ ان کے علاوہ واجدہ تبسم، جیلانی بانو، قدسیہ، پریم ناتھ در اور رام لعل کے افسانے شامل ہیں۔ اس طرح یہ افسانوں کا ایک اچھا انتخاب ہے۔

لیکن ایک بات بہت کھٹکی۔ اگر ان پر ۳۲ سطری سطر یعنی جس کی بینائی اچھی بھی ہو تو ایک نشست میں نہ پڑھ سکے۔ اور آنکھیں متاثر ہو جائیں۔ طباعت، پھر علی گڈھ کی۔ ظاہر ہے کہ اتنی باریک کتابت پر خراب ہونا ہی چاہئے لیکن حبیب خاں صاحب بھی مجبور ہیں اور خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِل کوزہ کی مثل صادق آتی ہے۔ مرتب بھی تجھے چھاپے بھی اور پھر فروخت کے لئے خود ہی لے کے نکلئے۔ ان کی ہمت کی بھی داد دینی چاہئے۔

(ا، ص)

تلبیس ابلیس

علامہ ابن جوزی کی تصنیف کا اردو ترجمہ مترجم علامہ ابو محمد عبدالحق اعظم گڈھی۔ ناشر نذیر

نگارخانہ تجارت کراچی۔ صفحات ۷۶۴۔ رائل سائز۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۱۲/۸ ۔

علامہ ابن جوزی چھٹی صدی ہجری کے بہت بڑے عالم، امام وقت اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ ابتدا میں علامہ جوزی کے حالات پیش کرتے ہوئے فاضل مترجم نے علامہ کی (۲۶۳) تصانیف کی فہرست دی ہے۔ ان میں بعض کے مخطوطات حیدرآباد میں کتب خانۂ آصفیہ میں بھی موجود ہیں۔

خلفا کے دور کے ساتھ ہی لوگوں میں مکر و فریب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور رفتہ رفتہ حصول منفعت کے لئے مختلف طریقوں سے جواز کی صورتیں پیدا کرتے رہے ہیں۔ چھٹی صدی ہجری تک اسلام میں پچاسوں فرقے پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے سیدھے سادے اور واضح دین میں پُر پیچ راہیں نکالیں اور اپنے مفاد کے پیش نظر بدعتوں کے لئے جواز پیدا کر لیا۔

علامہ ابن جوزی کی گہری نظر سے یہ باتیں مخفی نہ رہیں اور انہوں نے اسلام کے تمام فرقوں، ان کے پیشواؤں اور عام مسلمانوں کا جائزہ لیا۔ اور جہاں جہاں بدعتوں کی صورتیں پیدا ہو گئی تھیں انھیں واضح کیا۔ اس طرح اسلام کے کئی فرقوں یعنی حروریہ، قدریہ، جہمیہ، مرجیہ، رافضہ، جبریہ میں ہر ایک کی بارہ بارہ شاخوں کا بیان واضح طور پر کیا گیا ہے۔ اور ان میں جو بدعتیں اور اسلام سے دوری کی صورتیں پیدا ہوئیں انھیں سمجھایا ہے۔ ایک باب میں دوسرے ادیان میں شیطان نے جو کارگزاریاں دکھائیں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ فلسفیوں، نحریوں، دہریوں، زردشتیوں، مجوسیوں وغیرہ میں بھی کس طرح شیطان نے گمراہی کے طریقے ایجاد کیے، ان کا اظہار کیا ہے۔ غرض اس طرح کتاب کل تیرہ ابواب پر منقسم ہے اور مذہب و شریعت اسلامی سے ہٹ کر جواز کی جو صورتیں خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لئے پیدا کر لی جاتی ہیں اور جو اشارے اس میں ملتے ہیں وہ نیک نفس انسان کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔

بلحاظ ترجمہ کتاب میں روانی اور سلاست کم ہے۔ نصف صدی پہلے کا اسلوب بیان آج پسندیدہ نہیں۔ ترجمہ لفظی ہونے کی بجائے مفہوم کو ادا کرنے والا ہوتا تو اس کی افادیت میں بہت بڑا اضافہ ہوتا۔ تاہم نور محمد ناشر قابل مبارکباد ہیں کہ ایسی ضخیم کتابیں جو عربی کی شاہکار ہیں اردو میں منتقل کر کے اس کے سرمائے کو وزنی بنا رہے ہیں۔

(ر۔ ا۔ ص)

خدائی وعدہ

ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ مترجم معراج محمد بارق۔ ناشر نور محمد کتاب خانہ تجارت آرام باغ کراچی۔ کتاب کی سائز ۱/۱۶ کراؤن کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین عصر حاضر کے ممتاز عربی ادیب ہیں جو ترقی پسند ادیبوں کے سربراہ پیشوا اور روح رواں ہیں۔ انہوں نے تحقیق کے مغربی انداز کو اپنایا اور قدیم واقعات کو نئے رنگ ڈھنگ اور نئی آن بان سے پیش کیا۔ قدامت پرستوں میں ان کی پہلی کتاب "الادب الجاہلی" جب منظر عام پر آئی تو اپنی قدیم روایات اور فرسودہ سماج کی بنیادیں متزلزل ہوتی دیکھ کر عوام نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ حکومت نے کتاب ضبط کر لی۔ لیکن ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس سے پست ہمت نہیں ہوئے بلکہ اپنے انداز تحریر سے عوام کے قلوب کو گرمانے اور ملی جذبہ کو بیدار کرتے رہے۔ خدائی وعدہ (الوعد الحق) بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدا نے وعد اللہ الذین آمنو منکم الخ (سورۃ النور ۲۴ : ۵۵) مومنوں سے جو وعدہ کیا تھا اس کی کس طرح تکمیل کی۔ ان مومنین میں حضرت عمار بن یاسر، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال، حضرت خباب بن ارت، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سالم، حضرت عبداللہ بن سہیل شامل ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات۔ قبول اسلام کے بعد مظالم، کفار کے دست تظلم سے رہائی اور وفات تک کے حالات نہایت انوکھے اثر انگیز اور دل گداز پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ جگہ جگہ ایسے فقرے ملیں گے جہاں قسی القلب بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ آنسو اس کے شمع ایمان کے لئے موم کا کام دیں گے۔ بارق صاحب کے طرز تحریر کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے کتاب کو بالکل اپنا لیا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے عربی میں جو تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہی تاثر انہوں نے ہماری زبان میں جاری و ساری کر دیا ہے۔ کتاب ہر شخص کے لئے لائق مطالعہ ہے۔ مترجم اور ناشر قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے عربی ادب کے ایک اچھا شاہکار اردو کو دیا۔

(ر۔ ا۔ ص)

احوال جنگ بھاؤ و احمد شاہ درانی - از کاشی راج پنڈت۔ فارسی سے انگریزی میں ترجمہ از ڈاکٹر بی ایم مگھائے۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی ناشر بزم اشاعت اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی ۶۰۔

یہ کتاب بزم اشاعت کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ کاشی راج کی اصل کتاب کا متن اور اس کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے پیش لفظ سیتو مادھوراؤ صاحب نے لکھا ہے اور مقدمہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے۔

یہ بزم ظہیر الدین مدنی صاحب کے زیرنگرانی کام کررہی ہے اور ہمیں توقع ہے کہ ان کی رہنمائی میں جلد اچھی کتابیں منظر عام پر آئیں گی۔ خصوصاً ایسی جو اب تک گوشہ گمنامی میں پڑی ہیں۔ مورخین کی بی دور میں بھی کمی نہیں رہی یہاں بعض وقت ایک مورخ نے کئی کئی کتابیں لکھیں چنانچہ منشی قادر خاں بیدری نے ساتھ تاریخیں لکھیں اور غالباً کسی کو منظر عام پر آنے کا موقع نہ ملا۔ سیتو مادھوراؤ صاحب نے "منازل فتوح" مصنفہ محمد جعفر شاملو۔ تاریخ فیض بخش مصنفہ شیو پرشاد، گلستان رحمت مصنفہ مستجاب خاں۔ سوانح نجیب الدولہ مصنفہ نورالدین، دھار رالال کا ذکر کیا ہے پھر نظام الدین عشرت سیالکوٹی کے شاہنامۂ احمدیہ کا بھی ذکر کیا ہے لیکن نادر نامہ اعظمی کی دوسری تاریخی کتاب ہے جس کا ذکر نہیں کیا۔

شاہنامۂ احمدیہ یا ظفرنامہ کا ایک نسخہ یہاں سٹیٹ لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ) میں موجود ہے۔ اس میں ۲۹۰ صفحات ہیں اور ہر صفحہ پر بالعموم ۱۵ سطر بعض پر ۱۳ سطر ہیں اس طرح یہ ساڑھے دس ہزار اشعار کی منظوم تاریخ ہے۔ اسی طرح اسی ملک الشعراء کی دوسری تصنیف نادرنامہ ہے جو ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اور (۱۰) سطری مسطر پر لکھی گئی ہے۔ اس طرح اس میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔

تاریخ فیض بخش، گلستان رحمت اور سوانح نجیب الدولہ اور تاریخ حسین شاہی کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔

سیتو مادھوراؤ صاحب نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ ہزاروں شائع شدہ مرہٹی دستاویزوں اور پیشوا کے دفتر کے مخزونہ ریکارڈ کے باوجود مرہٹہ تاریخ اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک کہ فارسی ماخذوں کا مطالعہ نہ کیا جائے اور یہ ماخذ تعداد میں کم نہیں ہیں۔ اور ہندوستان بھر کے تمام کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مگھائے کا ترجمہ نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ اس سے ان کی فارسی اور انگریزی زبان پر قدرت تامہ کا اظہار ہوتا ہے۔ کیا اچھا ہوگا اگر اسی طرح غیر مطبوعہ تاریخی ذخائر جو گوشۂ گمنامی میں ہیں منظر عام پر آجائیں۔ (ا ، ص)

عالمی شاعر (ٹیگور) مرتبہ عبدالسلام دکنی وظیفہ یاب صدر مدرس۔ ناشر نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد۔ سائز ۱/۱۶ کراؤن۔ صفحات ۱۵۵۔ قیمت پانچ روپیے

یہ شاعر اعظم ٹیگور کی جیون کہانی ہے جو ان کے جشن صد سالہ کی تقریب کے موقع پر لکھی گئی۔ دکنی صاحب حیدرآباد کے بہت پرانے ادیبوں میں ہیں بچوں کے لیے اب تک کئی کتابیں لکھ چکے ہیں اور ان کی نظموں کے مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کتاب میں بھی دکنی صاحب نے ان کی سلیس اور بچوں کی سمجھ میں آنے کے قابل انداز بیان اختیار کیا ہے۔ گرودیو کی شخصیت کیا بحیثیت شاعر، ادیب اور فنکار اور کیا بلحاظ انسان ہر طرح واضح کرنے کی کوشش کی۔ امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی۔ اور ملک کے نونہال شاعر اعظم کی جیون کہانی پڑھ کر اپنے آپ کو ان سا بننے کی کوشش کریں گے۔

(ا ، ص)

چین کے مسلمان .... مترجم گوپال متل۔ ناشر نیشنل اکاڈمی (انصاری) مارکٹ دریا گنج دہلی۔ صفحات ۶۴۔ قیمت ۲/

یہ ایک برس سال ہے جس کو محمد مان فا تولنگ نے مقدمہ لکھا ہے اور اس کو گوپال متل نے ترجمہ کیا۔ اس میں چین کے مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس رسالے کے مطالعے سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ چین میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے لیکن یہ کوئی ادبی ادب نہیں بلکہ تشہیری ہے اس لیے مترجم صاحب

اگر اپنی صلاحیتیں تحریری اور تخلیقی کارناموں پر صرف فرمائیں تو مناسب ہوگا۔ (ر ، ص)

فکر و نظر – اثر بھارتی۔ اردو اکاڈمی بیم نگر۔ گوردا سپور۔ سائز ۱/۲۲ کراؤن۔ صفحات ۱۰۵۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

یہ اثر بھارتی کے قطعات، رباعیات اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ شاید ان کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ۱/۳۲ کراؤن پر چھاپا تاکہ ضخامت زیادہ معلوم ہو کتب خانوں کے لیے یہ سائز موزوں نہیں سمجھی جاتی۔ یہ مواد سو صفحات میں بھی چھپ جاتا تو برا نہ تھا۔ لیکن اپنا اپنی پسند ہے۔

اثر بھارتی رجائی شاعر ہیں اس لئے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ شاعر حیات کا لقب بھی استعمال کیا ہے اور کلام سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اثر صاحب اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جو خیال باندھا ہے اس کو ضرور ہی باندھا جائے۔ مثلاً انجن انسانی ، منبع قوت کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں ؎

جسم انسانی کے انجن سے نکلتی ہے وہ بھاپ اُڑ کے جو بادلِ بنے افلاک و سماوی کو بھی ناپے
وقت کی رفتار لے جاتی ہے انساں کو وہاں روح اور تخیل کا ہوتا جہاں پر ہے ملاپ

اس قسم کے کئی قطعات ملیں گے اور بعض ان میں ایسے بھی ہیں جن کا وزن محل نظر ہے۔ ان پر نظر ثانی ہوتی تو مناسب تھا۔
(۱ ، ص)

شام و شفق – ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی ناشر ادبی دنیا امین آباد لکھنو۔ صفحات ۱۵۰۔ مجلد مع گرد پوش قیمت ۵ روپے

یہ ڈاکٹر سلام صاحب کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ نیاز صاحب کے مختصر تعارف سے یہ مجموعہ شروع ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :-

" ڈاکٹر صاحب رباعیاں کہنے لگے اور عام شعرائی و متصوفانہ رنگ سے ہٹ کر انہوں نے صرف تلمیحات کو لیا یعنی اس طرح انہوں نے ایک ایسی چیز پیش کی جو بیک وقت نغمہ و شعر بھی ہے اور آہنگ و تاریخ بھی"

وہ اس مجموعہ کے دو حصے ہیں۔ ایک حکم تلمیحات کی رباعیوں کا ، دوسرا غیر حکمی تلمیحات کا۔ انہیں منظوم کرتے وقت انہیں کہیں کہیں بڑے تکلف سے کام لینا پڑا ہے اور فن کا نظر انداز کر دینا ان کے لئے ناگزیر سا ہو گیا ہے۔"

لیکن نیاز صاحب معاف فرمائیں جہاں شاعری ہی نہ ملا۔ مقصد شامل ہو جائے تو پھر اس میں تغزل اور تاثیر کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ "شام و شفق" تلمیحات کی ایک حسن لغت تو ہے لیکن بلحاظ شعر سلام صاحب کے درجہ کو نہیں پہنچتی۔ مثال دو رباعیاں ملاحظہ ہوں

یہ جنگ ہوئی تھی سمرکا یہ نکھار اک بے جوڑی گوتے کے اڑی باد بہار
قنوج میں سنجوگتا کو پرتھوی راج گھوڑے پہ بٹھا کے جیسے ہو جائے فرار

بیجاپور سارے پرشب تکمیل کا راج ہے نور ہرا آئینہ میں قمر کا پکھراج
احمد نگر کے لشکریوں سے سمابین ناہید ہو جیسے چاند کی بی کا تاج

یہ رباعی نصف صفحہ پر ہے اور باقی نصف میں تلمیح بیان کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ جدت قابل داد ہے۔ چونکہ تمام رباعیاں ستایا آورد ہیں اس لئے اس میں قاری کو وہ سوز و اثر نہیں ملتا جس کا شعر میں متلاشی رہتا ہے خود ڈاکٹر سلام صاحب بھی اس کے معترف ہیں۔
(ر ، ص)

رنگِ شباب – (ناول) از میاں ایم اسلم۔ صفحات ۲۷۰۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۱۰ روپیہ ۷۵ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ۔ شیخ شوکت علی اینڈ سنس۔ بندر روڈ کراچی۔

زیر تبصرہ ضخیم ناول "رنگِ شباب" میں م۔ اسلم صاحب نے ایک مصور کی المناک داستانِ حیات کو بیان کیا ہے۔ مصور جو اپنے فن میں نہ صرف ممتاز بلکہ اس کی تصویریں دنیا بھر میں شہرت رکھتی ہیں وہ ایک عرصہ دراز تک یہ سمجھتا ہے کہ شادی کرنے سے اس کے فن کو نقصان ہوگا اور وہ شادی اس لئے نہیں کرنا چاہتا ہے کہ وہ عورت سے حقیقی محبت نہیں کر سکے گا۔ اس کے خیال میں عورت جنسی تعلق کے بغیر مرد سے محبت کر سکتی ہے اور اس خیال کے تحت اس کو کوئی عورت ایسی نہیں ملتی جو اس کے تصور کے عین مطابق ہو اسی لئے وہ شادی سے گریز کرتا رہتا ہے۔

ویسے تو اس کے پاس فنِ مصوری سیکھنے کے لئے کئی حسین و جمیل لڑکیاں آتی رہتی ہیں مگر وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔ ایک حسین مصورہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے مگر اپنی محبت کا جواب نہ ملنے سے وہ مایوس ہو جاتی ہے اور خود مصور کی تحریک سے اس کی شادی مصور کے ایک دلی دوست سے ہو جاتی ہے۔

مصور تبدیلِ آب و ہوا کے لئے کوہ مری جاتا ہے اور وہاں کی ایک دوشیزہ کے حسن سے متاثر ہو جاتا ہے۔ حسینہ کو مصور کی ماں اپنے ساتھ لاہور لاتی ہے اور یہاں نامعلوم طور پر مصور کے دل میں اس کی محبت اثر کرتی جاتی ہے مگر وہ اس محبت کو محبت تصور نہیں کرتا۔ ایک رات حسینہ نادانستہ مصور کے بستر پر سو جاتی ہے۔ اور مصور اس کو سوتا دیکھ کر اپنے خیال میں شکست کھا جاتا ہے۔ اور وصل کی دولت سے لذت گیر ہو کر اس حسینہ سے شادی کرنے کا ارادہ کرتا ہے مگر اپنے ارادہ کو عملی صورت نہیں دے سکتا۔ حسینہ اپنے وطن میں ایک جوان پر عاشق ہے اس لئے مصور سے شادی کرنے کا خیال اپنے دل میں نہیں لاتی۔ مصور کی ماں اس حسینہ کو اس کے وطن روانہ کر رہی ہے، جہاں اس کا عاشق باوجود مصور کی غلطی سے واقف ہو جانے کے شادی کر لیتا ہے۔ مگر جو غلطی ہوئی اس کا نتیجہ دیکھ یا رسوائی کو برداشت کرنے زندہ نہیں رہ سکا بلکہ خودکشی کر لیتا ہے۔ حسینہ کو اس کا شدید غم ہوتا ہے اور وہ بھی کچھ عرصہ بعد مر جاتی ہے جس وقت اس کا جنازہ دفن کے لئے قبرستان لے جایا جاتا ہے تو مصور اس کو دیکھنے کے لئے آتا ہے مگر جنازہ میں شریک ہو کر اوں کو دفن کر کے اپنے سوگوار دل کو ماتم کدہ بنا کر واپس آتا اور حسینہ کی تصویر اپنے خون سے بناتا ہے اور خون زیادہ بہہ جانے سے مصور کی حیات واقع ہو جاتی ہے۔

میاں صاحب کا یہ ناول ایک سبق آموز ناول ہی نہیں ہے بلکہ اس میں جا بجا عورتوں کو بیجا آزادی سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور نہایت عمدہ پیرائے میں اسلامی زندگی بسر کرنے اور حقیقی مسلمان عورت بننے کی نصیحت کی ہے۔

اسلم صاحب کے دوسرے ناولوں کی طرح "رنگِ شباب" بھی دلکش اور دلچسپ ہے۔ اس میں انسانی جذبات کو نہایت عمدہ پیرائے میں واضح کیا گیا ہے۔ غیرت کا تقاضا، حسنِ معصوم، مجبوریاں، لاچاریاں، ڈھٹائی یا ندامت۔ قدرت کی نیرنگیوں کو جس طرح افسانہ کی صورت دے کر الفاظ کا جامہ پہنایا گیا۔

میاں صاحب اردو ناول کی تاریخ میں اپنے اسلوب اور طرزِ نگارش کے سبب "زندہ و پائندہ" رہیں گے اور ان کے ہر نئے ناول کو اسی طرح قدر و منزلت کی معراج حاصل ہوگی۔

(نصیر الدین ہاشمی)

مجلسِ اقوامِ متحدہ اور اُس کے رکن ممالک

مرتبہ حبیب زین العابدین۔ صلاح کار ولی اللہ سنجاری۔ صفحات ۱۰۶، قیمت ۱.۵۰، ناشر آزاد کلچرل سوسائٹی حیدرآباد۔ ملنے کا پتہ محمد یونس اینڈ سنس۔ عابد روڈ حیدرآباد

زیر تبصرہ کتاب "آزاد کلچرل سوسائٹی" کی اولین پیشکش کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ سوسائٹی کے صدر محمود عبد القدیر، اڈیٹر روزنامہ جدید صدیقی نے علی الترتیب سوسائٹی کے مقاصد، اشاعتی پروگرام اور پھر اس کتاب کے حسن و قبح پر روشنی ڈالتے ہوئے چند سطریں تحریر کی ہیں۔

مجلسِ اقوامِ متحدہ اور اس کے رکن ۸۲ ممالک سے متعلق اس کتاب میں ضروری تفصیلات لائق مرتب نے بڑے سلیقے سے یکجا کی ہیں۔ اردو دانوں کے لئے چونکہ یہ کتاب اپنے موضوع کی ہرگز یکتا ہے سبب انفرادیت رکھتی ہے، اس لئے اس کا مطالعہ ایک طالبِ علم، ایک پروفیسر اور ایک انشا پرداز سے لیکر عام سیاسی امور سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یکساں مفید ہوگا۔ مرتب نے چارٹر کے ذریعہ بھی اقوامِ متحدہ سے متعلق امور کی صراحت کر دی ہے اور رکن ممالک کے جغرافیائی، سیاسی اور سماجی حالات و احوال کو بھی مختصراً ہی سہی مگر جامعیت کے ساتھ رقم کیا ہے۔ [illegible] کی اہمیت اور افادیت کے

مد نظر جیسا کہ سوسائٹی نے طے کیا ہے اس کے ترجمے چند علاقائی زبانوں میں بھی ہوں گے۔ ہم اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور متوقع ہیں کہ اس قسم کی کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور نکاسی ہو۔ (ش۔ خ)

ہزار آہنگ (انتخاب کلام) از خاور قریشی۔ صفحات ۱۱۲، قیمت ۳ روپے، مجلد معہ گرد پوش، کتابت طباعت مناسب، ملنے کا پتہ ٹائمز پریس۔ مینفیلڈ پریس صدر کراچی (پاکستان)۔

"ہزار آہنگ" خاور قریشی کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے جس میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۹ء تک کا کلام شامل ہے۔ شاعر کا مطالعہ اگر اس کے کلام سے کیا جائے تو تدریجی طور پر نہ صرف اس کے ذہنی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے بلکہ صحت مند طرزِ فکر کی علامتیں بھی قاری کے سامنے واضح ہو جاتی ہیں۔ خاور قریشی کی زندگی حزن و الم اور یاس و حسرت سے عبارت معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کی قدروں سے شیفتگی اور اس کی راہ کے پیچ و خم سے شناسائی خود اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ شاعر زمانہ کے سرد و گرم سے ہنوز نبرد آزما ہے اور زندگی کے عوامل سے خود کو وابستہ کئے ہوئے ہے۔ کلام میں کہیں کہیں رجعائیت کا پہلو بھی ملتا ہے مگر جدید حیات کی جھلکیاں گزشتہ دو تین سال کے کلام میں واضح ہوتی گئی ہیں۔ طرزِ ادا میں ندرت، لب و لہجہ سادہ جیسا کہ خیال و فکر کی ہم آہنگی اور لفظوں کے برتنے کے سلیقے کا فن خاور کو خوب آتا ہے۔ غزل کی زبان سے یہ آگاہ تو ہیں مگر اسلوب کا نکھرا ستھرا انداز ابھی پیدا نہ کر سکے۔ مجموعی حیثیت سے یہ انتخاب قرار واقعی مطالعہ کے قابل ہے۔ چند شعر نمونتہً پیش ہیں:

دور ہے منزل، سفر ہے سمت، بہرِ محوِ خواب ؛ تو کہئے سب کہ کارواں سے دھوپ سر پر آگئی

فلک سے جھانک رہا ہے پھر انقلاب اُدھر ؛ غمِ زمانہ کہیں مجھ پہ مہرباں تو نہیں
بہار آئی، کھلے پھول، چھلکے پیمانے ؛ یہ لب بستوں کو کہیں دعوتِ فغاں تو نہیں

دوستوں نے وہ ستم ڈھائے کہ جی جانتا ہے ؛ ہائے کس منہ سے کہوں دشمنوں کو میں دشمن

کرتا ہوں نذرِ شورشِ دوراں کو اپنی جاں ؛ دل ہے زمانۂ ستم ایجاد کے لئے

یوں نیم نگاہی سے مجھے دیکھنے والے ؛ تجھ پر کہیں دل ٹوٹ کے آجائے تو کیا ہو

پائے ہمت تھکے اب اتنا سہارا دیدے ؛ منزل آپہنچی ہے دو چار قدم اور سہی

(د۔ خ)

جامِ نو۔ (مجموعۂ کلام) عبدالرشید صفوی بارہ بنکوی۔ حجم ۱۱۲ صفحات۔ سائز [illegible]، مجلد معہ گرد پوش۔ قیمت [illegible] ناشر صفوی ہاؤس ۴۔۶۸۲، قانون گویاں۔ بارہ بنکی (یو۔ پی)۔

زیرِ تبصرہ کتاب عبدالرشید صفوی کا شعری مجموعہ ہے۔ جس پر ملک کے شاعروں کے علاوہ [illegible] جرائد و استادانِ ادبیاتِ اردو نے (۴۴) صفحات پر محیط تاثرات 'مقدمہ'، 'تقریظ'، [illegible] کئے ہیں۔ صفوی صاحب کی شاعری میں کوئی خاص بات ایسی نہیں ملتی جو [illegible] ندرت، شگفتگی اور بانکپن سے یکسر عاری۔ ہاں شاعر کے [illegible]

بالیدگی اور گہرائی و گیرائی کے عناصر کا فقدان ملتا ہے۔ غزلیں یکسر رواں اور پامال بحروں میں لکھی گئی ہیں۔ بہ تلاش بسیار چونکا دینے والا کوئی شعر نہ مل سکا۔ ناظم کی مطبوعہ تصویر ان کے ذہانت کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہے۔ کاش وہ مطالعہ، اکتساب اور ریاض سے فکر و سخن کرتے۔ اس انتخاب کی اشاعت سے اردو شاعری کے انبار خانے میں ایک کتاب کا اضافہ تو ضرور ہوا مگر اس سے آج کے عہد سخن کو وہ چیز نہیں ملی جس کی اس زمانہ ضرورت ہے۔ تین شعر مشتے از نمونہ پیش ہیں۔

جو نہیں جانتے کرم کرنا ؛ ان سے امید دوستی کیا ہے

بالائے بام آ ہی گیا آفتاب زیست ؛ مجھ سے نمود صبح رہی بدگماں تو کیا

بہار آئی مگر اندیشۂ دورِ خزاں بھی ہے ؛ شگفتہ پھول ہیں اور چاک دامانی نہیں جاتی

اس مجموعہ میں ۱۳۲ شعری تخلیقات ہیں جن میں حمد و نعت، سلام، شجرہ، تراجم، غزل، آزاد نظم، گیت، غزل فارسی کلام شامل ہے (ابن ناقی)

اردو نامہ - سالانہ چندہ تین روپیہ (۱) ۔ زیر تحریر شان الحق حقی و جوش ملیح آبادی۔ پتہ اردو بورڈ، شاہراہ نیشنل پارک، ڈرگ روڈ کراچی (۲۹)۔

موجودہ حکومت پاکستان نے اپنے دور انقلاب میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لئے ایک ادارہ ترقی اردو بورڈ کے نام سے قائم کیا ہے۔ اردو نامہ اسی کا سہ ماہی ترجمان ہے۔ یہ بورڈ وزارت تعلیم پاکستان کی سرپرستی میں حسب ذیل (۱۲) اصحاب پر مشتمل ہے۔

ممتاز حسن (صدر)، بیگم شائستہ اکرام اللہ (نائب صدر)، اے۔ ایس۔ ایم۔ شریف مشیر تعلیم پاکستان، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، قدرت اللہ شہاب، افضال احمد کریم فضلی، رازق الخیری، پیر حسام الدین راشدی، جوش ملیح آبادی، شان الحق حقی ارکان ہیں۔ ان میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق مشیر اعلا اعزازی، جوش ملیح آبادی مشیر ادبی، شان الحق حقی معتمد اعزازی کی حیثیت سے علاوہ رکنیت کے ہیں۔ مذکورہ بورڈ کے مقاصد و اغراض میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں۔

(۱) اردو کی جامع لغت نیو انگلش آکسفورڈ ڈکشنری کے طرز پر تالیف و تدوین کرنا۔

(۲) نایاب کتابوں کی اشاعت یا باز اشاعت کرنا اور عورتوں اور بچوں کے مذاق کی کتابیں شائع کرنا۔

(۳) اردو زبان سے متعلق لسانی مسائل کو حل کرنا یعنی اردو ٹائپ رائٹر تیار کرنا۔ اردو اور غیر زبانوں کے الفاظ کے اردو املا کی تدوین کرنا۔ اور اردو الفاظ کے رومن املا کی اصلاح کرنا۔

اردو زبان کی خدمت کے لحاظ سے مذکورہ بالا مقاصد اعلا ہیں۔ اگر ان امور کی تکمیل ہو جائے تو ترقی اردو بورڈ کے لئے بڑا علمی کارنامہ ہوگا۔ اردو نامہ کے اب تک چار شمارے نکل چکے ہیں۔ چاروں رسالے ہمارے پیش نظر ہیں۔ جن موضوعات .. اپنا نصب العین بنایا ہے ان کی نسبت اس رسالے میں معلومات آفریں مضامین بھی شائع ہوئے ہیں ان میں قابل ذکر اردو املا کے مسائل، ٹائپ مشین کا معیار کلیدی بورڈ، ٹائپ اور رسم الخط کے طریقہ میعاد مشورے، اردو الفاظ کی رومن املا، بچوں کے لئے اچھا ادب کار آمد اور مفید تحریکیں ہیں۔ رسالہ کی طباعت ٹائپ میں ہے۔ ادارہ مذکور اسی کو آئندہ مطبوعات کے لئے فروغ دینا چاہتا ہے اچھی تجویز ہے۔ آج کل دنیائے اسلام میں نسخ ٹائپ ہی مقبول ہے۔ لیتھو کی چھپائی صرف ہندوستان اور پاکستان ہی میں پسند آتی ہے۔ رسالے کی اٹھان اچھی ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو اس کے ذریعے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت ہو سکے گی۔

(غلام رسول)

رسالہ پگڈنڈی کا یلدرم نمبر - ضخامت تین سو صفحے قیمت للعہ۔ رسالہ پگڈنڈی امرتسر کا ماہنامہ ہے جو ادارہ ادبستان اردو کا آرگن

اور جناب امریک آنند صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ پیش نظر نمبر جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت لکچرار گلبرگہ کا مرتبہ ہے۔ ملک کے مشہور ادیب نثار احمد فاروقی نے جو یگ ڈنڈی کے ادارہ میں شامل رہے ہیں، رفعت صاحب سے خواہش کی ہے کہ یلدرم نمبر کی ترتیب کا کام کریں تاکہ یلدرم کے متعلق ایک دستاویزی کتاب شائع کی جائے۔ نثار احمد صاحب نے جس خلوص کے ساتھ خواہش کی اس سے زیادہ خلوص و محبت اور محنت کے ساتھ رفعت صاحب نے اس کو ترتیب دیا اور یلدرم کے متعلق ایک مستند اور معیاری کتاب کی شکل میں یہ نمبر منظر عام پر آیا۔ تمام مضامین کو رفعت صاحب نے چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) یادیں (۲) تنقید و تجزیہ (۳) مضامین یلدرم (۴) مکاتیب یلدرم (۵) کلام یلدرم (۶) انشائیہ۔

پہلے عنوان کے تحت بلند پایہ کے مضامین جمع کئے ہیں مثلاً نذر سجاد حیدر، جلیل قدوائی۔ قرۃ العین حیدر، مشتاق احمد زاہدی، خواجہ غلام السیدین، علامہ سلیمان ندوی، سر رضا علی، قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی اور خود رفعت صاحب کے دو مضامین شامل ہیں۔ دوسرے عنوان تنقید و تجزیہ کے تحت امتیاز علی تاج، غلام بھیک نیرنگ، صلاح الدین احمد، نیاز فتحپوری اور پروفیسر احتشام حسین، مشتاق احمد زاہدی، اسلوب احمد، ڈاکٹر سیدہ جعفر اور خود رفعت صاحب کے مضامین ہیں یلدرم صاحب کے مضامین، مکاتیب اور کلام کے بعد انشائیہ کے تحت یلدرم صاحب کی صاحبزادی قرۃ العین حیدر کا بھیجا ہوا مواد انشائیہ کے تحت ۵۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ رفعت صاحب نے جس لگن کاوش اور جس محنت کے ساتھ یلدرم نمبر کو ترتیب دیا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ فاروقی صاحب نے یہ بھی اچھا کیا کہ رفعت صاحب کا تعارف کرا دیا اور جواں سال ادیب کی خدمات کو منظر عام پر پیش کیا۔ جس ادیب نے تھوڑی سی مدت میں (۲۵) گراں مایہ کتابیں اردو ادب میں اضافہ کی ہوں اس کی جیسی قدر کی جانی چاہئے نہ ہو سکی۔ یلدرم نمبر بھی ہمارے ادب میں ایک دستاویز ہے۔ ادارہ یگ ڈنڈی قابل مبارکباد ہے کہ اس کی دور رس نگاہیں سجاد حیدر یلدرم پر پڑیں اور اس ضخیم نمبر کی ترتیب کے لئے رفعت صاحب جیسے فاضل کو منتخب کیا۔

(ا۔ ص)

اُردو شاعری کا انتخاب

مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔ ناشر ساہتیہ اکیڈیمی دہلی۔ صفحات (۳۰۶)۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ نہایت عمدہ مجلد۔ قیمت سات روپے پچاس نئے پیسے۔

کلام کا انتخاب شائع کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چند شعراء کے کلام کے مجموعے لے بیٹھے۔ اشعار پر خیل سے نشان لگایا اور کاتب کے حوالے کر دیا۔ لیجئے ایک ہفتہ میں انتخاب تیار ہے۔ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایسا شعر منتخب کیا جائے جو ہر لحاظ سے بہتر ہو۔ کافی غور و فکر کے بعد ایک شعر منتخب کیا جائے۔ غالب نے اپنے دیوان کا انتخاب اسی طرح کیا اور پھر کہا تو یہ کہا کہ ؎ شعر دلکے انتخاب نے رسوا کیا مجھے اتنی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کرنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ غالب سے پہلے حاتم نے دیوان زادہ ترتیب دیا اور سراج نے منتخب دیوان کے نام سے دوسروں کے اشعار کا انتخاب مرتب کیا۔ اس سے پہلے بھی صاحب ذوق حضرات بیاضیں لکھتے تھے جو آج مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں کی زینت ہیں۔ بعد کے دور میں ماجور نجیب آبادی نے تصویر جذبات اور روح تغزل کی دو دو اور تصویر مناظر کی تین جلدیں شائع کیں۔ سر راس مسعود نے انتخاب زریں پیش کیا اور سرور نے گلدستۂ سخن۔ محمد الیاس برنی نے مناظر قدرت، جذبات فطرت اور معارف ملت کے نام سے ہر ایک کی چار چار جلدیں شائع کیں۔ محمد مبین کیفی چریا کوٹی کی جواہر سخن کی تین جلدیں ہندوستانی اکیڈیمی نے چھاپیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی اردو غزل، نقوش کا غزل نمبر، عزیز احمد کا انتخاب جدید اور محمد ابراہیم یوسفی کا "چمن بےنظیر" ایسے کتنے ہی انتخاب کے مجموعے منظر عام پر آئے۔ اب رہیں نصابی کتابیں فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی نصابی کتابوں سے لے کر مولوی عبدالحق کی نصاب اردو تک کئی کتابیں تیار ہوئیں جن میں نثر کے علاوہ شاعری کی ہر صنف کا انتخاب شامل رہا۔ نصاب اردو کے نصاب سے خارج ہونے کے بعد نقوش ادب (سلیم گڈھ)، ہمارا ادب (آل احمد سرور)، منتخبات نظم (محمد عزیز) کیف ادب اور سرور ادب (نظام الدین و مالی جعفری) جوہر ادب (آغا حیدر حسن) اور راقم کی کتاب جواہر ادب جیسی بیسیوں کتابیں چھپیں۔ ہر مرتب نے اپنا انتخاب اچھا سمجھا اس لئے ڈاکٹر زور صاحب کا انتخاب بھی اچھا ہے۔ کتاب کے آخر میں جو (۴۴) نام دئے گئے ہیں کہ بعض قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے ان کا کلام نہ آ سکا۔ اس کا ہمیں رنج ہے۔ (بقیہ صفحہ پر)

**

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

جاری شدہ ۱۹۳۸ء ـــــ فون نمبر ۳۵۲۰۹

ماہنامہ

سب رس

ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۱ء

جلد نمبر (۲۴) شمارہ ۸، ۹، ۱۰

نگران:

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت:

رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
رائے جانکی پرشاد
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
وقار خلیل

زر سالانہ ہند و پاک سے: چھ روپے، ششماہی: تین روپے

زر سالانہ بیرون ہند سے: دس روپے

قیمت ۱/۷۵ نئے پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات کے اہتمام سے شفیق خان پرنٹنگ پریس میں چھپا کر دفتر ایوان اردو، خیریت آباد، حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۶ اگست کو ۹۲ سال کی عمر پا کر انتقال کر گئے۔ سرسید، حالی اور شبلی کی آنکھیں دیکھنے والی شمع اب گل ہو گئی، وہ اردو کی انجمن کے سب سے روشن، سب سے تابندہ اور سب سے منور چراغ تھے۔ یہ شمع گل ہو کر اردو والوں کے دلوں میں تاریکی پیدا کر دی ہے۔

مولوی صاحب مرحوم جنھیں ہم اردو والے "بابائے اردو" کہتے تھے اور بڑے چاؤ سے کہتے تھے، اپنی وضع کے یکے تھے، اونچے درجے کے مولف تھے، باکمال انشا پرداز تھے، منفرد مقدمہ نگار تھے، دیدہ ور محقق تھے، بالغ نظر نقاد تھے اور ان سب سے بڑھ کر مولوی عبدالحق اردو کے مجاہد اور سپاہی تھے۔ پون صدی سے زیادہ اپنی تحریر کے ذریعے، اپنے عمل کے ذریعے، اپنے کردار و گفتار اور رفتار کے ذریعہ مولوی صاحب نے اردو زبان و ادب کی بے لوث اور مردانہ وار خدمت انجام دی۔ اسی سبب وہ مخدوم ہوئے، محترم ہوئے، سربلند ہوئے اور پھر زندۂ جاوید ہو گئے۔ آخری وقت تک تصنیف و تالیف میں منہمک رہے۔ قدیم و نایاب کتابوں کو ایڈٹ کیا، ان پر حواشی و مقدمے لکھے، ناساعد اور مخالف حالات میں اردو زبان کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ گوشے گوشے میں اسے متعارف کرایا۔ بلاشبہ وہ اردو کے حق میں "مسیحا نفس" فردِ فرید تھے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے بانیوں میں سے ایک تھے، ترقی پسند دانشوروں میں وہ اگلے وقتوں کے ہوتے ہوئے بھی وسیع النظر اور روشن خیال رہنما رہے۔ مادہ پرست رجحانات کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی مولوی عبدالحق نے اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کو منظرِ عام پر لانے میں بڑی خدمت انجام دی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد چنے گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ عملاً اس کے صدر اور ناخدا بن گئے تھے۔ اپنی اولوالعزمی اور ایثار پسندی کے سبب آپ نے اردو کو متمدن اور ترقی یافتہ زبان بننے میں جس لگن سے خدمات انجام دیں اس کا اعتراف ہر اردو دوست کو ہے۔ اردو قواعد کی تدوین اور انگریزی اردو لغت کی اشاعت ہی نہیں بلکہ انجمن کا قیام اور احیاء بھی آپ کی اور ہم اردو والوں کی بخشش کیلئے کافی سرمایۂ فخر و مباہات ہے۔ اس قدر جامع کمال شخصیت کی زندگی میں عیب بھی تھے اور عیب ہر انسان میں ہوتے ہیں مگر بقول ڈاکٹر زور "ان کے ہنر، عیب پر بھاری ہیں اور اگر ان کا دسواں حصہ بھی آج کسی اور کو مل جائے تو اردو کے دن پلٹ جائیں"۔

جناب ڈاکٹر زور نے مولوی صاحب کی رحلت پر تعزیتی بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ "مولوی صاحب اردو کی نہ صرف ایک تاریخ تھے۔ بلکہ تاریخ بنانے والوں میں وہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ سرسید کو آنکھوں سے دیکھنے والوں اور ان کی طرح قوم کی خدمت کا تڑپ رکھنے والوں میں وہ شاید آخری شخص تھے، وہ کیا اٹھے کہ قدیم تہذیب و سیاست کی بساط ہی اٹھ گئی۔ "دبستانِ حالی" انہی کی بنائی ہوئی تھی اور وہی اس کے آخری رکن تھے۔ ان کی وفات سے اب یہ دبستان بھی ختم ہو گیا"۔

سب رس اور ادارۂ ادبیاتِ اردو، مولوی صاحب کی زندگی اور ان کے کاموں کے راستے پر رواں دواں ہے۔ ہم اپنے اس محسنِ عظیم کی رحلت پر کس کو پرسہ دیں، کس کے آنسو پونچھیں۔ یہ غم اردو کا ہے۔ اور اس غم میں ہم سب ہی دیدۂ گریاں شامل ہیں۔ سب رس کے بیرونی معاون ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جو اللہ کے حوالے سال نقاد ادب انشا پرداز ہیں گزشتہ دنوں دہلی یونیورسٹی نے شعبۂ اردو میں ریڈر کے عہدہ پر ترقی دی ہے۔ نارنگ صاحب کی اس ترقی پر ادارہ سب رس ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے اور متوقع ہے کہ وہ پوری لگن اور کاوش سے اردو کی خدمت سرانجام دیتے رہیں گے۔

زیرِ نظر شمارہ، ستمبر اور اکتوبر کی مشترکہ اشاعت پر مشتمل ہے جو بعض وجوہ کی تاخیر کے سبب ایسا کرنے پر ہم مجبور تھے، انشاءاللہ آئندہ ہر شمارہ مہینے کے پہلے ہفتے تک شائع ہوا کرے گا۔

(ہ ۔ خ)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

انشائے فضائل خانی۔ کرنول کی ایک قدیم تاریخ

دکن کے ایک مشہور تاریخی شہر اور صوبہ آندھرا کے سابق پایہ تخت قمرنگر کرنول کی تاریخ سے متعلق یہ کتاب ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ کرنول کے علاوہ عام طور پر ہندوستان اور بطور خاص دکن اور آصفی سلطنت کے بارے میں اس سے اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

یہ دراصل حافظ وجیہ الدین صاحب صاحب الخطاب بہ فضائل خاں متوفی ۱۲۱۶ھ کے خطوط اور تحریروں کا مجموعہ ہے جس کو ان کے ایک شاگرد محمد معمور خاں بیجی نے ۱۲۱۹ھ میں جمع کر کے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس مقدمے کے سبب تالیف میں معمور خاں نے اپنے استاد فضائل خاں کے جو حالات لکھے ان کا خلاصہ یہ ہے :-

"نواب کرنول رن مست خاں غفران مآب (متوفی ۱۱۹۲ھ) کے عہد میں حافظ وجیہ الدین المعروف بہ میاں صاحب علم و فضل میں ممتاز تھے۔ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ خوش الحان قاری بھی تھے اور ایک ہی نشست میں قرآن ختم کرتے تھے۔ ایسے اعلیٰ پایہ کے خطاط اور انشاء پرداز تھے کہ سرکاری تحریروں کے مسودے اور مبیضے ان ہی سے لکھائے جاتے تھے۔ علم دین اور فقہ کے ایسے ماہر تھے کہ ریاست کرنول میں منصب صدارت کے عہدے پر مامور تھے۔ تدبر و سیاست میں ایسا درک رکھتے تھے کہ رن مست خاں کے جانشین نواب الف خاں کے عہد میں ریاست کرنول کے سفیر بنا کر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے دربار میں حیدرآباد روانہ کئے گئے۔ مدار المہام دکن اعظم الامرا ارسطو جاہ نے ان کو اتنا پسند کیا کہ دربار آصفی سے محمد فضائل خاں کا خطاب دلایا اور آصفی منصب دار بنالیا۔ آخر کار حیدرآباد ہی میں ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۱۶ھ میں فوت ہوئے۔"

ان کے انتقال کے بعد ان کی جملہ تحریریں ان کے شاگرد معمور خاں بیجی نے جمع کیں اور ان کو ایک مقدمہ اور تین ابواب میں تقسیم کر کے ۱۲۱۹ھ میں مرتب کیا۔

مقدمے میں انشاء پردازی کے قواعد اور انشاء پردازوں کے فرائض اور ضروریات اور انشاء کی اصطلاح سے متعلق بڑے عمدہ انداز میں بحث کی ہے اور قدیم انشاء پردازوں مثلاً ابوالفضل، مقیم قطب شاہی، نعمت خاں عالی، شہامت خاں حیالی، موسیٰ خاں فطرت اور رضی خاں ندرت کی خصوصیات اور ان کے نام اور کام کی تفصیلات لکھی ہیں۔

فصل اول میں وہ تمام عرضیاں اور خطوط شریک ہیں جو نواب رن مست خاں کی طرف سے شاہان دہلی، امرائے عالی تبار اور مشائخ عظام کو بھیجے گئے تھے۔

دوسری فصل میں وہ خطوط ہیں جو کرنول کے امراء اور دربار رن مست خاں کے ارکان نے مختلف اصحاب کو لکھے تھے۔

تیسری فصل میں وہ خطوط ہیں جو خود فضائل خاں نے مختلف دوستوں اور امیروں کو لکھے تھے۔

ان تمام عنوانات سے قبل اس مجموعے کے مرتب معمور خاں بیجی نے اپنے وطن کرنول اور وہاں کے نوابوں کے حالات لکھے ہیں۔

یعنی کرنول کی ایک مستند تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے اور آصفی تاریخوں میں نواب ناصر جنگ، نواب مظفر جنگ وغیرہ کی شہادتوں کی جو تفصیلات لکھی گئی ہیں ان کے بارے میں اہل کرنول کے نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آصفی عہد کے اس دور کی تاریخ اس وقت تک صحیح طور پر نہیں لکھی جا سکتی جب تک کہ اہل کرنول کے نقطۂ نظر کو معلوم نہ کیا جائے اور وہ باتیں ظاہر نہ ہوں جن کی بنا پر نواب ناصر جنگ اور مظفر جنگ کو اہل کرنول نے قتل کیا تھا۔

اس کتاب میں پہلے اس کے مولف نے شہر کرنول اور ریاست کرنول کی آب و ہوا اور خوبیوں کی بڑی تعریف لکھی ہے اور اپنے ایک سچے محب وطن ہونے کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔ اس کے بعد نواب رمضت خاں کے خاندان کی اور ان کی ذاتی خوبیوں اور خصوصیتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے عہد حکومت کے حالات اور اس دور کے اکابرین کی تفصیلات بطور تذکرہ قلمبند کی ہیں۔ اس طرح اس مخطوطے کے یہ ابتدائی اوراق بطور تاریخ کرنول لکھے گئے ہیں اور بہت اہمیت رکھتے ہیں اور دکن کے ہر مورخ کیلئے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔

اس کتاب میں مقدمے کے بعد فصل اول میں نواب رمضت خاں اور نواب الف خاں کی طرف سے حسب ذیل اصحاب کے نام مراسلے اور خطوط موجود ہیں:۔

شاہ عالم بادشاہ غازی، عبد الاحد خاں مجد الدولہ وزیر اعظم دہلی، امیر الامراء شجاع الملک فرزند نظام الملک آصفجاہ۔ اعظم الامراء ارسطو جاہ، عمدۃ الملک فرزند والاجاہ، عمدۃ العلماء مولوی نور العلاء، پیر بادشاہ صاحب میدک (ان کے نام متعدد خطوط ہیں)، موسیٰ صاحب، شاہ خلیفہ اسمٰعیل دیوانہ، شاہ رضا صاحب، شاہ حفیظ اللہ صاحب، بادشاہ صاحب مدنی۔

فصل دوم میں حسب ذیل خطوط ہیں:۔

رندولہ خاں برادر عمو ی رمضت خاں بنام بہلول خاں مخاطب بہ محمد جعفر خاں۔
" " " بادشاہ صاحب مدنی (کئی خطوط ہیں)۔
احمد علی خاں فرزند رندولہ خاں " پیر بادشاہ صاحب۔
رندولہ خاں بنام خواجہ لطف اللہ، میرزا عوض بیگ خاں، خواجہ عالم خاں۔
راجہ دھرم چاک " خورشید محمد خاں خویش نواب عبد النبی خاں، سید محمد خاں۔
شاہ اکمل قادری " اہلیہ میر امام صاحب۔
[illegible] " " رمضت خاں۔
شاہ صبغت اللہ " عبد السعید خاں برادر عبد النبی خاں۔
مرزا عوض بیگ خاں " سید غالب بیگ خاں، قاسم علی خاں۔

فصل سوم میں خود حافظ وجیہ الدین فضائل خاں کے خطوط حسب ذیل افراد کے نام موجود ہیں۔

نواب رمضت خاں (متعدد)، محمد رندولہ خاں، عوض بیگ خاں، محمد حبیب اللہ منشی عبد النبی خاں، حافظ محمد حبیب اللہ، کریم الدین خاں پسر حافظ شیر خاں، حکیم منعم عرف منا صاحب، نور محمد خاں لوہانی، رفیق عبد النبی خاں، مسرور خاں نیچی (کئی خطوط)، محمد اکبر خاں نوایت، خواجہ احمد صاحب وغیرہ۔

ان میں سے اکثر تاریخی شخصیتیں ہیں اور [illegible] سے قبل کی تاریخ دکن کی تحقیقات میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔

اس کتاب کے مرتب معمور خاں بنی کو کتاب کی ترتیب و تبویب اور انشاء پردازی کا بھی اچھا ذوق حاصل تھا معلوم نہیں کہ ان کی اور کوئی کتاب کہیں موجود ہے یا نہیں۔

ابتداء :- اجتماع گلدستہ کلام بیان ثنائے جامعیت کہ اولاً رقوم رقم سخن را از صفحۂ ضمیر منیا لنسیان عالم سخن پروری انتخاب کردہ رنگین مجموعہ جہان معانی می سازد۔

اختتام :- الٰہی پیکر شاہد این مجموعہ دل افروز را از ہفت جواہر قبولیت طبائع نکتہ پسند مزین و چشم زیب و آراستگی ملی اشتہار جلوہ افروز روشن محل توجہ مطالعہ صاحب طبعان عالی مزاج کناد۔

ترقیمہ :- انشاء فضائل خانی بتاریخ دہم رجب المرجب روز پنجشنبہ ۱۲۶۶ ہجری۔

یہ مخطوطہ باریک دیسی کاغذ پر نہایت عمدہ خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی میں ہیں۔ نواب عنایت جنگ بہادر نے دوسری متعدد قلمی کتابوں کے ساتھ ادارۂ ادبیات اردو میں بطور عطیہ داخل کیا ہے۔ دوسرے ورق پر ان کی مہر عنایت جنگ ۱۳۴۲ ثبت ہے۔ بہت کرم خوردہ ہو گیا ہے مگر عبارتیں محفوظ ہیں۔

بقیہ سلسلہ "آہٹ" ص ۴۲

ہوتا تھا کہ کوئی سو رہا ہے۔

پسینے کی ننھی ننھی بوندیں میرے ماتھے پر پھوٹ چکی تھیں اور ہاتھوں اور پیروں پر فالج گر چکا تھا۔ میرے ذہن پر صرف ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا۔ کہیں تصویر والے نے تصویر بناتے بناتے اس معصوم لڑکی کا گلا تو نہیں گھونٹ دیا؟

تصویر والا شاید میرے دل کے اندر اٹھتے ہوئے اندیشوں کو پڑھ چکا تھا۔ اس نے خاموشی کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ اور چادر سرکا دی۔

"لو تمہارے پاس لڑکی کو لے آیا۔ لو سنبھالو۔ اب یہ زندہ ہے یا مردہ آپ تم جانو۔" اس کی آواز سنائی دی۔

—— اور جو میں نے بڑھ کر تھرتھراتے ہاتھوں اور کپکپاتی آنکھوں سے دیکھا تو وہ بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مگر اب بھی اس کا جسم بے حد ملائم تھا اور گداز تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے حواس درست کر پاتا اور پھر بھاگتا کسی نے میرے دونوں بازوؤں کو زور سے پکڑ لیا۔ جیسے قاتل میں ہی ہوں۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ تصویر والا اور وہی لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی —— اور سامنے سورج کی تمازت بڑھ جانے کی وجہ سے موم کا جسم پگھل رہا تھا۔

سخاوت مرزا

میاں سید محمود منور مہدوی حیدرآبادی[1]

سید محمود المتخلص بہ منور المعروف بہ منور میاں، متوطن حیدرآباد۔ مہدوی المذہب تلمیذ بڑے میاں مصدق و میر شمس الدین فیض حیدرآبادی، طبقہ مہدویہ کے سرآوردہ لوگوں میں سے تھے۔ مگر ابھی تک یہ پردۂ گمنامی میں ہیں۔ ہم یہاں ان کے مختصر حالات تذکرہ . . . عروس الاذکار مؤلفہ نقش حیدرآبادی وغیرہ سے درج ذیل کرتے ہیں۔

نقش حیدرآبادی نے اس طرح تعارف کرایا ہے۔

"منور، سید منور، عرف منور میاں تلمیذ بڑے میاں مصدق، و حضرت فیض، ساکن چنچل گوڑہ من کلامہ ؎

سوزِ دل یوں دوڑتا ہے آنسوؤں کے تار پر ٭ آب جو میں جس طرح چڑھتی ہے مچھلی دھار پر

اور ان کے استاد کے متعلق مؤلف مذکور رقمطراز ہے ؎

مصدق تخلص، بڑے میاں صاحب کرنولی در بلدہ مدت ماندہ، ہم دریں جا وفات کرد۔ از وظیفہ خواران مایدہ نوال یوسف خاں جمعدار متخلص بہ یوسف وہم استادش بود، صاحب دیوان است، ملاحظہ اش میسر شدہ، و کان ذالک فی سنہ ! ازاوست ؎

کنیا ہوں مصرعۂ ابرو کو بسم اللہ کا دیوان ٭ بندھا شیرازہ محکم ترے زلف پریشاں کا

یوسف خاں جمعدار المتخلص بہ یوسف، منور کے استاد بھائی تھے۔ ان کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

آنکھیں کہتی رہیں میری واشد انگور رہیں ہم ٭ نگہ ساقی بدست کر مخمور رہیں ہم

سید منور نے اپنی خود نوشتہ سوانح لکھی ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ نیز ان کے دیوان سے بعض امور پر روشنی پڑتی ہے۔ جس کا مختصر ذکر سطور ذیل میں کیا جاتا ہے۔

میاں منور حیدرآبادی ۱۹ر جمادی الاول سنہ ۱۲۳۰ھ میں بمقام میسی میاں بلارہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ اور دنیا میں قدم رکھتے ہی ان کی والدہ ماجدہ جنت کو سدھاریں۔ چنانچہ ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

چوں منور بزاد مادر وے ٭ گفت با داعی اجل لبیک

وقت رحلت بگفت عزرائیل ٭ اَیُّهَا الضَّیف السّلام علیک

۱۲۳۰ھ

ان کا بیان ہے کہ بعض بزرگان کو بچپن میں دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ "تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ"۔

---

[1] دیوان منور کتب خانہ آصفیہ تا

یعنی بچپن میں کمزور اور نحیف تھے اس لئے ان کا دوسرا مادۂ ولادت "لا غر علی" ۱۲۳۱ھ بھی بعض منچلوں نے نکالا تھا۔

جب یہ آٹھ سال کے تھے تو حیدرآباد میں فرقہ واری فساد واقع ہوا۔ اور اس سلسلہ میں مہدوی طبقہ خارج البلد کیا گیا تو ۱۲۳۹ھ میں معہ اپنے والد ماجد کے کرنول آگئے۔ نو سال کی عمر میں ایک قصیدہ نواب شاہ عالم خاں کی مدح میں لکھا تھا جس کے صلہ میں پانچ روپیہ ماہوار یوسف خاں جمعدار کے تحت مقرر ہوگئی۔ گویا آج کے پچاس اس زمانہ کے پانچ برابر تھے۔ کرنول میں منجھلے میاں صاحب نواب غلام رسول خاں کرنول کا ان پر بے حد شفقت تھی۔

جب یوسف خاں جمعدار کا تبادلہ بنگن پلی ہوگیا تو یہ جانے لگے اور ۱۲۴۶ھ میں اپنی والدہ ماجدہ (علاتی) کے ساتھ حیدرآباد آگئے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب چادر گھاٹ پل کی بنا پڑی تھی۔

اساتذہ: مولوی نظام الدین لکھنوی المتخلص بہ اوباش سے انوار سہیلی پڑھی اور مولوی شہباز خاں سے متداول درسی کتابیں پڑھیں۔

۱۲۵۲ھ میں شادی ہوئی۔ ۱۲۵۳ھ میں منور خاں جمعدار کا قتل ہوا۔ اور نواب مبارز الدولہ بسلسلہ تحریک جہاد مولوی سید احمد بریلوی قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند ہوگئے۔ اور کرنول کی ریاست انگریزوں کے قبضہ میں آگئی۔ جس کو میاں منور "آہ غربا" کا اشعر سمجھتے ہیں وہ کرزہ بال آہ غربا" تاریخی مادہ کہلاتا ہے

حیدرآباد میں میاں منور، باز خاں جمعدار کے ملازم تھے۔ نواب مند و خاں جمعدار کی صحبت میں رہتے تھے جنہوں نے ان سے عیار دانش پڑھی تھی۔ ۱۲۶۱ھ میں رزیڈنسی کے ایک چپراسی کو کسی مہدوی پٹھان نے قتل کر دیا تھا۔ قاتل فرار تھے۔ مسٹر مالکم ریذیڈنٹ نے دھمکی دی کہ اگر قاتل کا پتہ نہیں چلایا جائے گا تو مہدوی خارج البلد کر دیئے جائیں گے، نواب ناصر الدولہ نے یوسف خاں جمعدار کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ یہ بھی ہمراہ ہو گئے، اور بدقت تمام پیدل دشت و بیاباں طے کرتے ہوئے راجپوتانہ پہنچے اور وہاں بمقام چاندبول قاتل کا پتہ لگا اور اوس کو گرفتار کر کے حیدرآباد لائے۔ غرض اس طرح یہ بلا ٹلی۔ اور باعث خوشنودی آصفجاہ وقت حکام انگریز ہوئے۔ بزمانۂ وزارت نواب سراج الملک ایک مدحیہ قصیدہ سنایا تھا۔ تو نواب صاحب نے بسفارش یوسف خاں جمعدار ان کی ۵۰ روپیہ تنخواہ کر دی۔ نواب مختار الملک سالار جنگ اول کے زمانہ میں عام تخفیف ہوگئی تو یہ بھی اس کی زد میں آگئے مگر تنخواہ بجائے ۵۰ کے پچاس ہوگئی۔ ۱۲۹۲ھ میں تعصبناک حادثہ مولوی زمان خاں شہید پیش آیا جس سے بڑی شورش برپا ہوگئی۔ اور مہدوی قوم خارج البلد کر دی گئی۔ تو مولوی منور سے بھی جواب طلب ہوا، علماء اہل سنت سے مباحثہ ہوا۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ مہدویہ بمصالح سیاسی خارج البلد کر دیا گیا۔ تو ان کو بھی حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔

ان کی ملازمت کا سلسلہ ۱۲۶۳ھ سے ۱۲۹۱ھ تک جاری رہا۔ ۱۲۹۱ھ میں بلحاظ عقائد دنیا ترک کر دی۔ اپنی ملازمت اپنے دونوں صاحبزادوں پر منتقل کروائی اور اپنے فرزند کے پاس بمقام دولت آباد، والور، کانداپور، اورنگ آباد میں ۱۲۹۴ھ تک رہے پھر حیدرآباد آگئے۔ ان کو مولانا اللہ بخش صاحب سے بیعت تھی۔ ان کی وفات کے بعد میاں سید عبدالحی عرف شاہ صاحب میاں سے رشتہ روحانی حاصل کر لیا تھا۔ بیس سال ضیق النفس وغیرہ میں مبتلا رہے۔ فرماتے ہیں:

چھوٹا جو زلف سے تو پھنسا دام خط کے بیچ ٭ یہ مرغ دل ہمیشہ گرفتار ہی رہا

عمر ناکارہ گئی چونسٹھ برس ٭ گر کوئی پوچھے تو یوں کہتا ہوں دس

---

۱ سوانح منور قلمی کتب خانہ سالار جنگ بہادر ۲ سوانح خود نوشتہ سید محمود منور قلمی سالار جنگ۔

ایک مرتبہ بچھو کاٹا، سخت تکلیف میں کہا ؎

تو دوش رفتی و جانم بغم لبالب بود　　　ز درد دل ہمہ شب ذکر "یا رب" بود

وداع دولت خوشتر خلید وارگ جاں　　　گمان سادہ دلاں ایں کہ نیش عقرب بود

معاصرین شعراء میں منور میاں نے مولوی تفضل حسین علی یاسمیؔ اور اعظم علی اشیدؔ مصنف مجموعۂ اعظمی اشیدؔ کا ذکر کیا ہے۔ نیز امراء حیدرآباد کی ستائش میں قصائد کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ رباعی مدح نواب افضل الدولہ آصفجاہ پنجم ؎

جسم است جہان و افضل الدولہ جان　　　مختار الملک قوت جان جہاں

از روئے چرا روئے زمیں پرنشود　　　ایں آصف عہد و آں سلیمان زماں

(بخط نستعلیق کتبہ سید منور)

ایک رباعی فارسی بعنوان سراقمہ ؎

درجہاں کارت اگر بستہ شود　　　غیر خدا کامروائے مطلب

چوں فلک تیغ حوادث بکشد　　　سپرے بہ زدعائے مطلب

۱۲۸۴ھ

(کتبہ سید منور عفی عنہ)

مخمس (فارسی) در مدح مختار الملک ؎

بتو دنیا ولادست تمنا ہر کہ پیش آرد　　　صدف وار از در تو گوہر مقصود بردارد

بکشت خلق دایم ابر احسان تو می بارد　　　منورؔ نیز از درگاہ تو امید ہا دارد

خداوندا، خدیوا، جرم بخشا، مرحمت فرما

(۱۲۸۴ھ۔ کاتبہ منور۔ بخط نستعلیق)

قطعۂ تاریخ بسم اللہ خوانی صبیہ نواب مختار الملک ؎

منورؔ مصرع تاریخ دریافت　　　"طراز بسملہ خوانی مبارک"

۱۲۸۴ھ

مخمس مدح مختار الملک ؎

رعیت خورسند، سپاہ آسودہ، ملک آباد، حکم اجرا　　　عدالت، خانقاہ و مدرسہ در ہر مکاں، ہر جا

رفاہ خلق برتر بود در علم قدیم اخفا　　　بقدرت داد ایزد خوبی عالم ترا تنہا

دل رستم، کف حاتم، رخ یوسف، لب عیسیٰ

قصیدہ ۱۶ بیت جلوس افضل الدولہ و تولد فرزند ؎

درجلوس نوشہی اہل جہاں شد شادماں　　　واز جمال شاہزادہ بزم جنت شد جہاں

۱۲۷۳ھ　　　۱۲۷۶ھ

قصیدہ فارسی (۲۶ بیت) مدحت نواب مختار الملک جس کے ہر مصرعہ سے ۱۲۷۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

مقدم سلطان ہمایوں بامہار رہبری　　　حسن گلشن شد بحمد اللہ جلوس اکبری

۱۲۷۴ھ　　　۱۲۷۴ھ

اور بھی بعض تاریخی قطعات مثلاً میاں سید یعقوب (۱۲۷۹ھ) تاریخ جاہ والاجاہ (۱۳۰۴ھ) اور سید محبوب خاں (۱۳۰۶ھ) وغیرہ ہیں۔ نیز سید منور میاں کا سجع یہ ہے۔ "بنور مصطفیٰ عالم منور"۔

میاں سید منور نے بعمر ۸۰ سال سنہ ۱۳۰۹ھ میں وفات پائی (۱۲۶۲)۔ تسبیط پورہ میں مدفون ہیں۔

تصانیف:- ۱۔ دو اردو دیوان چھوڑے، جو دفتر اسٹیٹ لائبریری میں ہیں وہ ناتمام معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ پہلے دیوان میں ردیف الف کی آٹھ غزلیں اور ردیف ت میں صرف ایک غزل ہے۔

دیوان دوم میں بلحاظ حروف تہجی ردیف وار جملہ ۱۴۱ غزلیں اور بعض فارسی قطعات و قصائد اس کے علاوہ ہیں۔ ۲۔ سوانح ابو الفضل علامی۔ ۳۔ سوانح منوری (خود نوشتہ سوانح) ۴۔ مثنوی ناظم عشق ۵۔ دو مرثیے الموسوم بہ مرج البحرین و سحر حلال۔ ۶۔ سوانح الفقرا مہدویہ وغیرہ۔ ترتیب دیوان اور اپنی شاعری کے متعلق لکھے ہیں کہ "کچھ دنوں عشق مجازی میں مبتلا رہا اور اسکے فراق میں دیوان غزلیات تیار ہوا۔ یوسف خاں جمعدار المتخلص بہ یوسف اپنے استاد بھائی سے رات رات بھر محفل شعر و سخن گرم رہا کرتی چنانچہ لکھتے ہیں:-

ضیا بین اشیاں گرفتاری زلف شاہد سخن بود و اکثر و اغلب اوقات در سفر و حضر بہ صحبت آں مجمع کمالات صوری و معنوی بسر می شد و بسا شبہا، بتذکرہ سخن و ذوق ہم کلامی سحر می نمود بر خاست کردم ؎

شب آخر شد، حدیث زلف جاناں ہمچناں باقی

انکا سلسلۂ شاعری بتوسط حضرت فیض حیدرآبادی و حافظ مشتاق میرٹھی، خواجہ میر درد دہلوی تک پہنچتا ہے۔ کلام میں سلاست، معنی آفرینی، شوخی و ظرافت ہے۔

انتخاب کلام منور ہدیۂ ناظرین ہے ؎

مطلع دیوان اول:- مثل غنچہ دانہ یک عقدہ ہوا تقدیر کا　　پشت خنجر بن گیا منہ ناخن تدبیر کا

مطلع دیوان دوم ؎ کروں میں حمد کیا پروردگار پاک سبحاں کا　　کہ لا احصی ثنا ہے قول صاحب وحی قرآں کا

تعلی ؎

گو فکر سر بلند ہے منور تری ہنوز　　تڑپے ہے سن کے زیر زمیں انوری ہنوز
گر کوہ ہے تو ہم کو اٹھاتا نہیں ہے بار　　پر دل پری رخوں سے اٹھایا نہ جائیگا

تکبر چھوڑ گیا نمرود کا، جو ایک مچھر سے　　خلیل اللہ نے مچھر کو پڑھایا کچھ نہ کچھ ہوگا
خدا دشمن کسی کا مفت کیوں ہوگا مگر تو نے　　خدا کے دوستوں کا دل دکھایا کچھ نہ کچھ ہوگا
نہ آئے تا قیامت ہوش میں مست الست ایسے　　مگر ساقی نے صہبا میں ملایا کچھ نہ کچھ ہوگا

پھونک دینا تھا نہ یکبار ہوا پر ایسا　　نامہ درویش کا تھا صور سرافیل نہ تھا

تیغ شعاع تول کے بھاگا ہے غرب میں
ہے اُس کے حکم پر سر افگندہ آفتاب

طرح میر درد دہلوی سے
عمر بھر پیچھے بتوں کے دل مرا دیوانہ تھا
اپنی پیشانی تھی اور سنگ در بتخانہ تھا
دام سے اے ہم صفیرو تم کہاں تک بھاگتے
خانۂ صیاد میں قسمت کا آب و دانہ تھا
اے منور تھا بقول درد ہر جا اس کا ذکر
مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا

دہان تنگ سے اُس کے سخن میں پھول جھڑتے ہیں
لب غنچہ میں یہ عالم کہاں ہے گل فشانی کا

چھٹ گیا آہ مرے زخم جگر کا پھاہا
آستیں ہو گئی اب دیدۂ تر کا پھاہا
چھوڑ دے زخم کو عاشق کے خدا پر جراح
کس کا ٹانکا ہے مرے یار کدھر کا پھاہا

سنہرے رنگ پر ہم ہو چکے تھے قتل کیوں تم نے
یہ آب زر سے انا فتحنا شمشیر پر لکھا؟

لب جاناں کے آگے ہو گیا بلور کا ٹکڑا
یہاں تک رنگ رو فق ہو گیا لعل یمانی کا

نہ حظ فغاں نے کیا اور نہ چشم و ابرو نے
نہ ایک آن میں ہم کو تری ادا نے کیا
فراق میں مری آنکھوں نے جو کیا طوفاں
وہ شور و زور نہ گنگا نہ ماجرا نے کیا
مس وجود اگر زر ہو کیمیا یہ ہے
نہ وہ کہ خاک میں قاروں کو کیمیا نے کیا
مہر سے مہر زدہ ہے فلک قرطاس بھی
اس کے آگے تو کوئی کاغذ ممہور نہ تھا
عشقبازوں میں ابھی شہرۂ آفاق ہوا
شاعروں میں تو منور کبھو مشہور نہ تھا

غزل ہذا میں چھ مطلع کہے ہے

خوبرویان چمن شیدا ہیں روئے یار پر
چشم نرگس، دہن پر غنچہ، گل رخسار پر
کھو پڑی کھپریل بنتی ہے مکان یار پر
استخواں جب جل گئی چونا لگا دیوار پر
عکس مژگاں کا پڑا ہے ابروئے خمدار پر
دیکھتا ہوں باڑھ کانٹوں کی میں اس تلوار پر
سخت دل ہیں دوڑ جاتا ہے آنسوؤں کے تار پر
آب جو میں جس طرح چڑھتی ہے مچھلی دھار پر
تلملے واری جاتی ہیں معشوقوں زلف یار پر
مرتے ہیں آہو تصدق چشم کے بیمار پر
بڑھ گیا زخم جگر ابرو کے ہر یک وار پر
کاٹ میں غالب ہوا ہے نیمچہ تلوار پر

خاک پہنچی باغ تک صیاد کا خانہ خراب — کاٹ ڈالے مرغ گلشن کی تری کی چاڑ پر
بارش گریہ سے میری خلق کو از بس ہے خوف — جس مکان کو دیکھئے ہے پرچھٹی دیوار پر
ناک کٹوائے تھے آگے بات پر جا کس کے — اب سنا ہے کان رکھتے ہیں میرے اخبار پر
آبلوں نے کر دیا سیراب میرے دشت میں — آ گئے تھے پیاس سے کانٹے زبانِ خار پر
حق تو یہ ہے ہم کو بھی منصور کا رتبہ ملا — قامتِ دلدار نے کھینچا منور دار پر

دکنی محاورہ باڑ دینا (بڑھاوے دینا) :۔

کیا جانے رقیبوں نے کیا باڑ دیا اوس کو — اب بات وہ مجھ سے جز شمشیر نہیں کرتا

اور بھی بعض دکنی محاورے خوب باندھے ہیں۔ مثلاً انگار پکڑنا۔ زنار پکڑنا ؎

اب ہم بھی قسم کھاتے ہیں انگار پکڑ کے۔ زنار پکڑ کے وغیرہ۔

بعض دکھنی محاورے خوب ہیں۔ غزل ؎

آمادہ ہے چشم، ابروئے خمدار پکڑ کے — جیوں ترک صف جنگ پہ تلوار پکڑ کے
یوں ضعف کی حالت ہے سدا گھر میں ہمارے — چڑھتے ہیں جو دہلیز تو دیوار پکڑ کے
پروانے کی خوں کا جو قصاص اوس سے طلب ہے — اب شمع قسم کھاتی ہے انگار پکڑ کے
کیوں غیر سے ملنے کی قسم کھاتے ہو صاحب! — ہم چھوڑ دیئے آپ کو سو بار پکڑ کے
ہر تار سر زلف ہے ایمان ہمارا — ہندو بھی قسم کھاتا ہے زنار پکڑ کے
امارگی نفس نہیں ہوتی ہے زائل — گر راہ پر لاتے ہیں اوسے مار پکڑ کے
کب شعر اچھوتے ہیں یہ سرقہ سے منور — بولو تو ابھی دیویں ہم اشعار پکڑ کے

دکنی لہجہ ؎ تقلید محض چھوڑ کے تخلیق کو پکڑ لو — لے جا کے بلند طاق میں تقلید رکھو رے

اخلاقی مضامین :۔

درویش کو لازم ہے کبھی جھوٹ نہ بولے — سچ کہنے کا ہر وقت میں تاکید رکھو رے
حاسد کو عطائے اللہ کی کیا قدر منور — خفاش کے مت سامنے خورشید رکھو رے
جو ترک کیا ہات قلم کیجئے اوس کا — اللہ کے یک لام پہ تشدید رکھو رے
یہاں نہ اندیشہ کا ہے کام نہ تدبیر ہو پیش — سونپ دے آپ کو اللہ پہ تو اے درویش
دفعہ سیف کا مت رکھو نہ شتا کی ہیبت — پھونک لے پڑھ کے تو سینہ پہ لا یلاف قریش

طنسزیہ ؎

بندہ میں اور خدا میں ہے روئی بڑا حجاب — ایمان اوس کا نان ہے جیسے شکم پرست
ظرافت ؎ بوسے کی گر ہوس ہے تو گرد اوس کے باڑ باندھ — لب اوس کو سرد کہتے ہیں تو اوس کو تاڑ بند (درخت تاڑ)

فضیل جعفری

شاہد صدیقی کی شاعری

نقاد کی دوربین نگاہیں فنی شعر پاروں کے اُن تہ در تہ گوشوں تک پہنچتی ہیں جن کا علم بعض اوقات خود فنکار کو بھی نہیں ہوتا۔

(والٹر پیٹر)

دورِ عباسیہ کے مشہور وزیر یحیٰی برمکی نے اپنے اقوالِ زریں میں جن چار چیزوں کو شخصی خوش نصیبی کی علامتیں قرار دی ہیں اُن میں پہلی چیز کسی شاعر کی زندگی میں اس کے کلام کا مقبول ہونا ہے۔ اگر یحیٰی برمکی کے اس قول کو تسلیم کر لیا جائے تو یقیناً شاہد صدیقی ہندوپاک کے اُن معدودے چند شعراء میں سے ایک ہیں جن کا کلام پڑھے لکھے ذہین طبقہ میں قابلِ قدر نگاہوں سے دیکھا، پڑھا اور سمجھا جاتا ہے۔

شاہد صدیقی کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وجدان و جمال کے جن نرم و نازک گوشوں تک عام شعرا کی رسائی نہیں ہوتی شاہد نے انہیں محسوس کیا ہے اور اُن احساسات کو الفاظ کا خوبصورت جامہ عطا کر کے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کے سامنے شاعر کے احساسات کی جیتی جاگتی تصویر اپنی پوری توانائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ اُجاگر ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک اُن کی شاعری کا دوسرا اہم تر پہلو یہ ہے کہ اُن کے یہاں توانا زندگی کے حسن کے فروغ کے ساتھ ساتھ نمایاں طور پر ماضی کی خوبصورت قدروں کا احترام بھی ملتا ہے۔ اس جملہ سے میری مراد وہ محاسنِ شاعری ہیں جنہیں تنقیدی زبان میں جمالیاتی شعور، تخیل کی صورت آفرینی، جذبات کی دنیا، زبان کے حسن اور موسیقی وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے معاشرتی، سماجی اور سیاسی حقیقتوں کو رنگ، ولولہ اور کیف و کم کی چاشنی دے کر یوں پیش کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں اِن مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے اور نتائج اخذ کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشکل کام اسی خوش اسلوبی اور حسنِ خوبی سے ایک بڑا فنکار ہی انجام دے سکتا ہے۔

شاعری کے تعلق سے شاہد نے اپنا نظریہ یوں بیان کیا ہے ؎

کوئی افسانہ ہو یا مثنوی ہو نظم و غزل
حدیثِ عظمتِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ شعر ایک ایسا سیڑھی ہے جو ہمیں اُن کے نفسیاتی نہ خانوں تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ اُن کی پوری شاعری اسی ایک شعر کی عملی تفسیر ہے۔ شاہد صدیقی حقیقی معنوں میں ایک ترقی پسند شاعر ہیں یعنی انھوں نے ترقی پسندی کو اشتعال انگیز انقلابی شاعری تک ہی محدود نہیں کیا بلکہ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ قدیم تہذیبی، ثقافتی اور ادبی ورثہ کو سینے سے لگائے ہوئے بلند تر اور رفیع ترین انسانی قدروں کو پانے کے لئے انسانی عظمت کی شاہراہ پہ قدم بڑھاتے رہے ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ واقف ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں پہلی بار عوامی بنیادوں پر ہندوستانیوں نے جنگِ آزادی کا آغاز کیا اور پھر اُس کے نوّے سالہ مدیدِ غلامی میں آزادی کی خاطر سینہ سپر رہے یہاں تک ۱۹۴۷ء میں بہت مجبور ہو کر انگریزوں نے ہندوستان خالی تو کیا لیکن جاتے

جاتے کچھ ایسی چالیں چل گئے جن کے نتیجہ میں عوام کی ایک بڑی تعداد ناساعد حالات کی بنا پر آزادی کا صحیح لطف اٹھانے سے محروم ہوگئی۔ موجودہ حکومت کی تمام تر کوششوں کے باوجود جو کل دکھی تھے وہ آج بھی دکھی ہیں۔ انسانی زندگی پر کل جو تاریک بادل چھائے تھے وہ آج بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار میں انہیں جذبات کی ترجمانی مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔

صیاد نے کس ہشیاری سے اک رنگیں پھندا ڈالا ہے ؎ کچھ لوگ یہی کہہ کر خوش ہیں اب کوئی اسیرِ دام نہیں

شب گذارنے والو حاصلِ سحر کیا تھا ؎ اک پیام بیداری وہ بھی نا تمام آیا

تم سحر کی گن گاؤ میں تو یہ سمجھتا ہوں ؎ مجھ کو نیند میں پاکر رات پھر سے لوٹ آئی

کلیاں ہیں زرد زرد فضائیں ہیں سرد سرد ؎ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں یہ فصلِ بہار ہے

لیکن ساتھ ہی ساتھ شاہد اپنی قوت مشاہدہ اور ادراک کے سہارے آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اگر سماج دشمن عناصر سرمایہ دارانہ نظام کو بچانے کے لئے پوری قوت صرف کر رہے ہیں لیکن آج کا ہندوستان ایک نئے سماجی انقلاب سے دوچار ہونے کے لئے پر تول رہا ہے۔ عام انسانوں کی بھلائی کے لئے اقتصادی نظام میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ناگزیر ہے اور ان حالات میں شاہد صدیقی کی گہری فنکارانہ نظریں یہ دیکھ رہی ہیں کہ آدمی کی نظروں میں ایک نیا اجالا ہے۔ آدمی اندھیروں پر فتح پانے والا ہے۔ شاہد صدیقی دوسرے کئی شاعروں کی طرح موجودہ سیاسی اور سماجی بحران سے پریشان ہو کر مایوسی، نا امیدی یا قنوطیت کے شکار نہیں ہوتے۔ انہیں آج بھی اس بات کا یقین کامل ہے۔

ظلمتیں اجالوں پر فتح پا نہیں سکتیں ؎ اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں
تاریکیٔ شب میں اشکِ الم پیغامِ تجلی لائیں گے ؎ جتنے بھی ستارے ٹوٹیں گے سب سورج بنتے جائیں گے
مری آرزو نئے روپ بھر کے ہزار پھول کھلائے گی ؎ مجھے اپنے باغ سے پیار ہے تو کبھی بہار بھی آئے گی

شاہد صدیقی نے متذکرہ سماجی اور سیاسی تقاضوں کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی صحت مند روایتوں کو بھی بڑے اچھے ڈھنگ سے اپنایا اور برتا ہے۔ لفظ "روایت" سے جو لوگ مردہ پرستی یا ماضی پرستی کا جو مطلب نکالتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ روایتیں دراصل قیمتی اقدار کا وہ عظیم ورثہ ہیں جو گذشتہ نسلیں ہمارے لئے چھوڑ گئی ہیں۔ لینن کے خیال کے مطابق "ہمیں چاہئے کہ حسین چیزوں کو قائم رکھیں۔ ان کو اپنے لئے مثال سمجھیں، اور چاہے وہ پرانی ہی کیوں نہ ہوں انہیں نہ چھوڑیں ہمیں ماضی کے حقیقی حسن کو اپنے لئے مزید ترقی کا نقطۂ آغاز تصور کرنا چاہئے۔ کسی چیز کو صرف اس لئے چھوڑ دینا کہ وہ قدیم ہے، انتہائی مہمل خیال ہے۔" شاہد نے بھی غزل کی مروجہ ہیئت اور مخصوص موضوعات کو برقرار رکھتے ہوئے خیالات، تصورات اور مضامین آفرینی کے اعتبار سے نت نئے تجربے کئے ہیں۔ حسن و عشق اور وصل و فراق، مادی شکلوں میں نہ ہونے کے باوجود پچھلے کئی ہزار برسوں سے انسانی زندگی کے پردے پر زبردست حقیقتوں کے روپ میں اجاگر ہوتے رہے ہیں۔ تمام فنونِ لطیفہ میں، خاص طور پر شاعری کا جمالیات سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور حسن و عشق جیسی کیفیتیں جمالیات کے ہی مظاہر ہیں۔ چنانچہ اسے بہت پہلے اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

عشق کو دل میں دو جگہ اکبر — شاعری علم سے نہیں آتی

شاہد نے اسی بنیادی خیال کو زیادہ دلکش اور نکھری ہوئی شکل میں یوں بیان کیا ہے ۔

شوقِ سخن فضول ہے شاہد بغیرِ عشق — دل میں کوئی خلش ہو تو منہ میں زباں رہے

عقل کی روشنی میں طے نہ ہوئے — عشق کی راہ کے نشیب و فراز

عشق ایک ایسا مغنی ہے جو دل کی وادی میں داخل ہوتے ہی سوز و گداز سے بھرپور ابدی نغمے بکھیر دیتا ہے جو فنکار کے دل اور ذہن کو پگھلا کر لازوال فنی شہ پارے تخلیق کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں ۔ اسی خیال کی روشنی میں شاہد صدیقی کا یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

مٹایا عشق نے جس دل کو سوزِ بے اثر ہو کر — رہا وہ زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر ہو کر

عشق کی دنیا میں غم کا عنصر اپنے فطری بانکپن کی وجہ سے بڑی اہم خصوصیتوں کا حامل رہا ہے۔ غم انسانی زندگی کے سوز و گداز کے لمحات عطا کر کے شعور کی ایسی فروزاں شمع عطا بخشتا ہے جو اسے دشوار گزار راستوں میں ثابت قدم رہ کر منزلِ مقصود تک پہنچنے میں مدد اور سہارا دیتی ہے۔ کوئی زمانے تک اردو کے تمام تر چھوٹے بڑے شعرا کے نزدیک غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا واحد علاج موت تھی۔ چنانچہ فانی جیسا عظیم صلاحیتوں کا مالک شاعر غم کے اسی تاریک پہلو کا شکار ہو کر رہ گیا اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے زندگی کا کوئی صحت مند نظریہ یا معاشرہ کیلئے کوئی مسرت آفریں اور جمال افزا ادبی ورثہ نہیں چھوڑ سکا۔ شاہد صدیقی کے یہاں تصورِ غم کی بنیاد قنوطیت پر نہیں بلکہ رجائیت پر ہے ان کے غم میں شعلوں کی لپک کے ساتھ شبنم کی خنکی بھی ہے۔ ان کا غم موجِ گل کی طرح نازک اور لطیف ہے جو ہمارے دلوں کی گہرائیوں تک اترتا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ ایک طرف فراقِ یار کی کربناک ساعتوں کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں ۔

ستم زدہ کہا ہے دنیا تمہارے جانے سے — کہیں تو کس سے کہیں ہم پہ کیا ستم گزرے
ہیں فراق کی راتیں ایک طلسمِ محرومی — چاند جگمگاتا ہے روشنی نہیں ہوتی
آپ سے جدا ہو کر میرا تجربہ یہ ہے — زندگی کی ہر ساعت زندگی نہیں ہوتی

تو دوسری طرف وہ نہایت پختہ لہجہ میں یہ بھی اعلان کرتے ہیں ۔

فضائے یاس میں ناکامیوں کی ظلمت میں — چراغِ شوق فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
غمِ عشق نے غمِ کائنات میں ایک روح سی پھونک دی — میرے راگ اور سنور گئے میرے گیت اور نکھر گئے
سازِ دل تشنۂ مضراب ہے، مایوس نہ ہو — ایک دن نغمۂ امید بھی پیدا ہوگا

میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ حسن و عشق حیاتِ انسانی کی دو بڑی صداقتیں ہیں۔ شاہد صدیقی نے فنِ شاعری کے ان بنیادی محرکات کو کافی وسیع معنوں میں سمجھا اور برتا ہے اور ان پر ایمان لائے ہیں کیونکہ یقیناً شاعری صرف اشیا کی نقالی یا ترجمانی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک تخلیقی عمل ہے اور تخلیق کے لئے خوبصورت چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ شخصی واردات اور ادراکِ حسن کی ہم آہنگی کے نتیجہ میں شاہد کا کلام لطافتِ بیان، رفعتِ خیال، جدتِ اظہار اور موزونیتِ اسلوب کا ایک اچھا نمونہ بن گیا ہے۔ وہ ہر قسم کے جذبات کا بے لاگ اور بے جھجک اظہار کرتے ہیں ۔ ان کے کلام سے لی ہوئی مختلف مثالیں بلاشبہ ان باتوں کی تہہ تک پہنچنے میں قارئین کی مددگار و معاون ثابت ہوں گی۔ سب سے پہلے محبت کے متعلق سے تین شعر ملاحظہ ہوں۔ "محبت کیا ہے؟" یہ ایک متنازعہ

مسئلہ ہے۔ اس کی صحیح تعریف نہ تو کوئی شاعر کر سکا ہے نہ فلسفی۔ اردو شاعری میں امیر خسرو، قلی قطب شاہ، خان آرزو سے لے کر موجودہ دور کے بڑے غزل گو شعراء حسرت، جگر اور فراق تک سب کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو سیکڑوں ایسے اشعار مل جائیں گے جن میں براہِ راست اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی قبیل کے اشعار میں مصطفےٰ خاں شیفتہ کا یہ شعر کافی مشہور اور زبان زدِ خاص و عام ہوا ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اب شاہد صدیقی کے یہ اشعار دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ انہوں نے واقعی اردو شاعری کی قابلِ قدر اور دیرینہ روایتوں میں کس حد تک خوشگوار اضافے کئے ہیں ؎

جوانی عمر کی پہلی مسرت　　محبت زندگی کا آخری غم

کسی کو یاد کرنا زندگی کا عہدِ طفلی تھا　　کسی کی یاد میں مرنا محبت کی جوانی ہے

نہ میرا شوق فانی ہے نہ اُن کا ناز فانی ہے　　محبت اک حیاتِ نو ہے لیکن جاودانی ہے

محبت کے بعد "ذاتی واردات" اور شخصی غم کے تعلق سے مندرجۂ ذیل اشعار قابلِ توجہ ہیں۔ ان میں ایک طرح کی پُر خلوص جذبۂ خود سپردگی کے علاوہ شیرینی، گھلاوٹ، بانکپن اور کسی کسی جگہ بے نیازی اور خودسری وغیرہ ایسی خصوصیتیں ہیں جو دلوں میں گھر کر لیتی ہیں اور جب ہماری نظروں سے دوسرے اچھے شعراء کا کلام بھی گزرتا ہے تو ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ذاتی غم کا جس قدر شدید احساس شاہد کے یہاں ملتا ہے اور اسی کی وجہ سے ان کے کلام میں جو محاسن پیدا ہو جاتے ہیں بیک وقت سارے کے سارے کسی دوسرے اچھے شاعر کے یہاں عام طور پر نظر نہیں آتے۔ اب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پورا تقاضۂ خلشِ مدعا ہوا　　جب جان دی تو قرضِ محبت ادا ہوا

پہلے مجھے زنداں سے پابندِ جنوں کر دو　　پھر وسعتِ عالم کو ویرانہ بنا دینا

شبِ غم آہ یہ اندوہ، یہ الجھن، یہ تڑپ　　سوچتا ہوں کہ مآلِ شبِ غم کیا ہوگا

وہ دمِ رخصت کسی کی خامشی　　وہ نگاہیں، وہ محبت کے سلام

تم اہلِ دل نہیں ہو پھر وفا کا لطف کیا جانو　　وفا کی انتہا دل ہے وفا کی ابتدا دل ہے

وہ رخصت ہو رہے ہیں دل کی محفل کا خدا حافظ　　اندھیرا بڑھ رہا ہے روشنی کم ہوتی جاتی ہے

پچھلی ربع صدی میں اردو کے جن شعراء نے غزل کے مروجہ مضامین اور ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے خیال آفرینی کے اعتبار سے نئے نئے تجربے کئے ہیں ان میں شاہد صدیقی کا نام ایک خاص اہمیت کا مالک ہے۔ مثال کے طور پر جذبات و احساسات کے اس سرچشمہ کو جسے غمِ دل کہتے ہیں۔ ہمیشہ نہ صرف اردو بلکہ عالمی شاعری میں بھی موضوعِ بحث رہا ہے۔ ایک طرف اگر مشہور عربی شاعر ابو ذر بصری اور پھر اردو کے مستند اور مسلم الثبوت استاد خواجہ حیدر علی آتش نے دل کو "خدا کا گھر" کہہ کر انتہائی پاکیزہ اور قابلِ پرستش چیز بنا دی ہے تو دوسری طرف انگریزی کے فلسفی شاعر سیمول بٹلر (SAMUEL BUTLER) نے اسے فاسد جذبات، خیالات کا مخزن اور انسانی زندگی کو بے راہ رو کرنے والے شیطان کا خطاب دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں نظریے گہری جذباتیت اور انتہا پسندی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دل بذاتِ خود کسی بھی طرح کے جذبہ کو جنم نہیں دیتا لیکن اس کے اندر ہر قسم کے داخلی اور خارجی وجوہات کی بنا پر پیدا شدہ اچھے برے اثرات قبول کرنے کی غیر معمولی اور بے مثال

صلاحیت ہوتی ہے۔ وہی دل جو وصلِ محبوب سے چمن اندر چمن رہتا ہے، محبوب کے جاتے ہی صحراؤں سے زیادہ ویران بن جاتا ہے۔ اسی خیال کو شاہد نے بڑے خوبصورت اور تغزل سے بھرپور انداز میں یوں پیش کیا ہے:۔

دل ہے ایک ہی لیکن نام دل بدلتا ہے ؎ سج گیا تو گلشن ہے لُٹ گیا تو صحرا ہے

دل کے ساتھ روزِ ازل سے ہی متاعِ فطرت نے جو وجدانی کیفیتیں وابستہ کردی ہیں ان میں ایک ایسی بھی کیفیت ہے جس کا شاعر کی ذات اور تخلیق سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور جسے ہم "یاد" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یادیں، زمانۂ ماضی کے ان خارجی، داخلی واقعات، حادثات اور تجربات کے عکس ہیں جن سے کوئی انسان انفرادی حیثیت سے دوچار ہوتا ہے اور جو اس کے لاشعور یا تحت الشعور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں زمانۂ قدیم سے موجودہ دور تک یادوں کے تعلق سے نہایت ہی بیمار ذہنیت کا مظاہرہ ہوا ہے۔ شعراء کی عمروں کا زیادہ تر حصہ یادِ محبوب میں گریہ و زاری کرتے، آہیں بھرتے اور روتے بسورتے گزرا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب ؎ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

شاہد صدیقی کے لئے 'یادیں' مایوسی، بیزارگی اور قنوطیت کی محرک نہیں بلکہ انہوں نے یادوں کا نہایت صحتمند اور مثبت پہلو اپنایا ہے۔ وہ غمِ جاناں اور غمِ دنیا میں ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ وہ محبوب کی یاد میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر انسانی فرائض سے منہ نہیں موڑتے بلکہ محبوب کی یاد ان کی خارجی زندگی میں گھل مل جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں

رفتہ رفتہ یاد اُن کی بن گئی غمِ دنیا ؎ زندگی کا سرمایہ تو زندگی کے کام آیا
وہ بے خبر ہیں محبت سے جو یہ کہتے ہیں ؎ کسی کی یاد میں دنیا کو بھول جاتے ہیں

آخر آخر میں، میں شاہد صدیقی کی شاعری کی ایک اور اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔ جو انہیں دوسرے بہت سے ہمعصر شعراء سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ جس طرح اردو کے عظیم غزل گو شاعر فراق گورکھپوری نے محبوب کے اعضاء اور رنگ رانگیوں میں ایک قسم کی [illegible] بہت محسوس کیا۔ اور اردو شاعری میں پہلی بار اس نئے رجحان کو رائج کیا۔ اسی طرح شاہد صدیقی محبوب کی مختلف اداؤں اور حسنِ فطرت میں گہری ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے اس احساسِ جمیل کی ترجمانی مندرجۂ ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔

تیرا انداز تبسم ہے کہ عنوانِ بہار ؎ جب کوئی پھول کھلا میں نے تجھے یاد کیا
شام اُن کی اک ادا ہے سحر اُن کا ایک نور ؎ یعنی کہ وہ عیاں نہ ہوئے اور عیاں رہے

مندرجۂ بالا سطور میں شاہد صدیقی کے کلام پر صرف ایک اجمالی تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح اُن کے محاسنِ شاعری پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ خود اپنی شاعری میں مواد، اسلوب اور اظہارِ بیان کے اعتبار سے ابھی کافی قابلِ قدر اضافے کر سکتے ہیں اور اپنی قائم کردہ روایات کو آگے لے جا سکتے ہیں۔ اور ہمیں شاہد صدیقی سے اُمید بھی یہی ہے۔ کیونکہ مسلسل آگے بڑھنے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہنے کی خود انہوں نے جابجا تلقین کی ہے۔ خصوصاً اس شعر میں انہوں نے جو فلسفیانہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ قابلِ داد بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ میں ان کے اس شعر پر مضمون ختم کرتا ہوں

ایک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل ؎ صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

شریف احمد (ایم۔ اے)

گل کرسٹ اور اس کا عہد

ایک تبصرہ

"گل کرائسٹ اور اس کا عہد"، "ہندوستانی اخبار نویسی ۔۔ کمپنی کے عہد میں" کے مولف کی دوسری تالیف ہے، جو کئی حیثیتوں سے نہایت اہم اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔

گل کرسٹ کا نام ہماری ادبی تاریخ میں بڑا محترم نام ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع کا یہ اسکاچ اہلِ قلم، عالم اور مستشرق بڑے دیر اور دور رس اثرات کا حامل ہوا ہے ۔۔۔ ایسا نہیں ہے کہ محمد عتیق صدیقی سے پہلے ہمارے ادبی مورخوں نے گل کرسٹ کی عظمت اور تاریخی رول کا اعتراف نہ کیا ہو۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب سے نہ صرف یہ خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ گل کرسٹ کی عظمت اور تاریخی رول کی اہمیت حقیقتاً اس سے کہیں زیادہ ہے جو آج تک سمجھی جاتی رہی ہے بلکہ یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب تک جو اس کی برگزیدگی کا اعتراف کیا گیا اس کی بنیاد علم سے زیادہ عقیدت وارادت پر تھی۔ مثلاً اب تک ہمارے یہاں یہ خیال عام رہا ہے کہ اپنے زمانے میں گل کرسٹ نے ہندی سے زیادہ اردو کی خدمت اور حمایت کی۔ لیکن پیشِ نظر کتاب کے اوراق یہ بتاتے ہیں کہ گل کرسٹ ہندی اور اردو میں کوئی امتیاز نہیں کرتا تھا۔ اسے تو ہندوستانی زبان کی خدمت کرنا مقصود تھا۔ اس زبان کی ہندوستان گیری، پھیلاؤ اور مقبولیت کا احساس اسے بمبئی کے ساحل پر قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا۔ ہندستانی اس کے نزدیک ایک "مستقل زبان" تھی جو دونوں رسمِ خط ۔۔۔ دیوناگری اور فارسی ۔۔۔ میں لکھی جاتی تھی۔ ایک چھوٹا سا ثبوت اس امر کا یہ ہے کہ دیوناگری رسمِ خط میں جو پہلے چند کتابیں اس کی نگرانی میں چھپیں ان میں سکین کا استی ید پر مشتمل ایک مرثیہ بھی تھا۔

عتیق صدیقی نے گلکرسٹ، اس کی طبعی اور علمی زندگی کے متعلق ایسے بہت سے واقعات و خیالات کو جھٹلا دیا ہے جو ہماری ادبی دنیا میں اب تک مستند سمجھے جاتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے انھوں نے کہیں بھی ظن و قیاس سے مدد نہیں لی اور نہ ہی کہیں شک و شبہ کی گنجائش باقی رکھی۔ انھوں نے ہر قدم پر ٹھوس اور معتبر ثبوت فراہم کئے ہیں ۔۔۔ یہ ثبوت انھیں نزدیک و دور لائبریریوں کے بے پناہ کتابوں اور رسالوں کے انبار میں ملے ہیں۔ اس انبار سے مفید مطلب چیزوں کی تلاش کا سلیقہ انھیں خوب آتا ہے۔ اس کام میں انھیں کس قدر دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کرنی ہوئی ہوگی۔ حوالہ جات کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وہ کہتے ہیں (اور بجا کہتے ہیں) "تحقیق کے سلسلے میں ہمارے ادبی مورخین نے ثانوی ماخذ کا سہارا لیا ہے اور اصل ماخذ تک جن میں مصنف کی کتابیں بھی شامل ہوتی ہیں کسی نے رسائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلطیاں ایک کتاب سے دوسری کتاب اور ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتی رہیں" (ص۳) عتیق صدیقی نے چونکہ ان اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرلی ہے۔ اس لئے ان کے لہجے میں زیادہ اعتبار کی شان ہے۔ انھوں نے نہ صرف بہت سے خیالات و واقعات اور سنین کو غلط قرار دیا ہے بلکہ ان کی کتاب کا بیشتر حصہ ہمارے لئے بالکل نئی حقیقتیں بھی رکھتا ہے۔ انھوں نے خود گلکرسٹ کی تحریروں اور اس کے زمانے

کی مستند دستاویزوں کے حوالے دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ "گلکرسٹ ۱۷۸۳ء میں نہیں بلکہ ۱۷۸۲ء میں ہندوستان آیا اور کلکتہ نہیں بلکہ بمبئی کے ساحل پر اترا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہو کر نہیں آیا تھا بلکہ یہاں آنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی میں داخل ہوا۔ (ص ۳۰) "پرنسپل ہونا تو ایک طرف گلکرسٹ غریب کالج کا وائس پرنسپل یا کالج کونسل کا ممبر بھی نہیں تھا۔" (ص ۳۱) اس وقت کالج کے پرووسٹ یا پرنسپل کے لئے انگلستان کے چرچ کا کلرجی مین ہونا لازمی تھا اور گلکرسٹ یہ شرط پوری نہ کرتا تھا اس لئے اسے ہندوستانی زبان کا پروفیسر بنایا گیا۔ اپنے وطن لوٹنے کے بعد اڈنبرا یونیورسٹی نے اس کی علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر ایل ایل ڈی کی ڈگری دی۔ ہندوستان میں رہتے اس نے "ڈاکٹر" اپنے نام کے ساتھ کبھی نہیں لکھا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا۔

ان عام غلطیوں کے علاوہ وہ "ناخدم سیتاپوری مولف" فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کرتے کہ اردو کا پہلا چھاپہ خانہ "ہندوستانی پریس" یا "ہندوستانی چھاپہ" تھا جس کے مالک اکرام علی تھے اور انھوں نے ہی اسے ۱۸۰۱ء میں جاری کیا تھا۔ پر زور دلائل سے وہ اس بات کو پایۂ تحقیق تک یہ کہہ کر پہنچاتے ہیں کہ "گلکرسٹ نے ۱۸۰۰ء میں یہ چھاپہ قائم کیا تھا اور یہ گلکرسٹ ہی کی ملکیت تھا۔ (ص ۳۲)

اگرچہ عتیق صدیقی بھی یہ پتہ نہ چلا سکے کہ گلکرسٹ ہندوستان میں آنے سے پہلے اپنے وطن اڈنبرا میں کس طرح زندگی بسر کرتا تھا یا یہ کہ ہندوستان سے واپسی سے لے کر انتقال تک وہ کیونکر جیتا رہا؟ تاہم گلکرسٹ کے قیام ہندوستان کے متعلق جو مواد تحقیق و تلاش کے بعد انھوں نے بہم پہنچایا ہے، وہ بڑی حد تک عالم گلکرسٹ اور انسان گلکرسٹ کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ عتیق صدیقی کی اس تالیف سے گلکرسٹ کی تصویر اب کچھ یوں ابھرتی ہے:۔

جان بارتھ وک گلکرسٹ ۱۷۵۹ء میں اسکاٹلینڈ کے شہر اڈنبرا میں پیدا ہوا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقے سے اس کا تعلق رہا ہوگا۔ اڈنبرا ہی کے ہسپتال میں اس نے تعلیم حاصل کی لیکن اس تعلیم کی کیا نوعیت تھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مہم جوئی اور قسمت آزمائی نے اسے ویسٹ انڈیز پہنچا دیا، جہاں وہ چند سال رہ کر نامراد گھر واپس آ گیا۔ معمولی استعداد رکھنے والے انگریز اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں چند سال رہ کر قابل رشک (بلکہ حسد کی) حد تک خوش حال ہو کر انگلستان واپس جاتے تھے۔ گلکرسٹ نے ان میں سے بہتوں کے متعلق سنا اور کچھ کو دیکھا بھی ہوگا۔ چنانچہ اس بار وہ قسمت آزمانے ہندوستان کی طرف چل پڑا اور ۱۷۸۲ء میں وہ بمبئی کے ساحل پر اترا۔ متوسط طبقے سے اس کا تعلق یوں بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ ہندوستان پہنچا تو اس کے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارش نہ تھی۔ اور نہ ہی وہ کسی ایسے آدمی کو جانتا تھا جس کی وساطت سے وہ ملازمت تلاش کر سکتا۔ بہرحال ہسپتال کی تعلیم کام آ گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ وہ نہایت دور اندیش اور ذکی الفہم واقع ہوا تھا۔ اس نے بمبئی ہی میں تاڑ لیا کہ اگر پورے ہندوستان میں کوئی ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے تو وہ "ہندوستانی" ہے۔ اس لئے اگر انگریز حکومت کو یہاں طویل عرصے تک حکومت کرنا ہے تو عوام سے ربط ضبط پیدا کرنا ہوگا اور اس کا واحد ذریعہ ان کی زبان سیکھنا ہوگا۔ اس زبان ہی کی تحصیل کو اس نے اپنا مقصد بلکہ مقدر بنا لیا۔ وہ شب و روز اسی دھن میں رہنے لگا۔ پرخلوص کوشش اور لگن نے یقین پیدا کر دیا اور تین سال کی مختصر مدت میں اس نے اس نئی، بالکل مختلف اور غیر زبان پر عبور حاصل کر لیا۔ یہ بات شاید آج اتنی عجیب نہ معلوم ہو کہ تعلیم کے حصول کے بہت سے ذرائع اور آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں، لیکن گلکرسٹ کے زمانے میں قدم قدم پر مشکلیں اور مصیبتیں تھیں۔ انگریزی زبان میں لے دے کر ایک لغت تھا جو کپتان ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں مرتب کیا تھا۔ گلکرسٹ نے اس لغت کو اپنا رہنما بنایا۔ بعد میں جب ایک منشی سے اس نے مدد لینی چاہی تو اس نے کہا کہ پہلے ہیڈلے کا لغت بالکل بھلا دیجئے۔ آگے چل کر ہیڈلے نے اپنی کتاب کے ایک ایڈیشن کے لئے گلکرسٹ کے لغت

سے کچھ الفاظ اور معنی" چرائے"۔ غرض اب جلد ہی گلکرسٹ نے ملازمت سے علمی کام کرنے کے لئے چھٹی لے لی اور ۱۷۸۶ء سے ۱۷۹۸ء کے درمیان اس نے چار کتابیں شائع کیں۔ ہندوستانی زبان سے متعلق لغت، قواعد اور لسانیات کے بارے میں چوں کہ یہ کتابیں نہایت اعلیٰ پایہ کی تھیں اس لئے ہندوستان اور انگلستان کی علمی دنیا میں اب گلکرسٹ کا نام اجنبی اور غیر معروف نہ رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اور دوسری کتابیں گلکرسٹ نے اس لئے بھی لکھیں کہ انگلستان سے آنے والے نئے انگریز ملازمین ہندوستانیوں کی عام زبان سیکھ کر زیادہ آسانی سے حکومت کر سکیں یا بالفاظ دیگر انگریزی سامراج کے ہاتھ مضبوط کریں۔ لیکن علمی اور ادبی کام کرنے والے جانتے ہیں کہ سنجیدہ اور باوقار علمی کام کرنے کے لئے ایسی خواہش کوئی خاص معنی نہیں رکھتی جب تک ایک خاص انہماک اور موضوع سے خلوص کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ اس لئے پہلی بات اگرچہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن گلکرسٹ کے علمی کارناموں کے پھیلاؤ کے آگے کوئی وزن نہیں رکھتی۔ پھر اگر ایک طرف گلکرسٹ کی شخصیت اپنے قومی اور ملکی تعصبات سے یکسر پاک بھی نظر نہیں آتی تو دوسری طرف مشکل ہی سے اس وقت کے برطانوی ہند اور انگلستان میں کوئی انگریز ملے گا جو ہندوستانی زبان کے لئے اس قدر سرگرم رہا ہو اور مستعدی سے کام کرتا ہو اور جس نے ہندوستانیوں کی روحوں میں اس طرح جھانک کر دیکھا ہو ——

اپنی کتاب "مشرقی زبان داں" (Oriental Linguist) کے چوتھے باب میں وہ ایک جگہ حاشیہ پر لکھتا ہے "پہلے انگریز قصے کو اور اس کے بعد آنے والی ہندوستانی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد یورپین عورتوں کی سادگی اور ذکاوت اور ہندوستانی عورت کی بھیانک عیاری و مکاری کا تضاد بھی بے نقاب ہو جائیگا" (ص ۱۰۲) —— یہ یقیناً اس زمانے کے انگریز ذہن کے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق سوچ و چار کا ایک پرتو ہے جس سے گلکرسٹ جیسا عالم متبحر اور وسیع النظر اہل قلم بھی مبرا نہ رہ سکا —— لیکن دوسری طرف ایسی بہت سی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ گلکرسٹ پہلے بے لوث و بے غرض عالم تھا اور بعد میں کچھ اور۔ اس میں میکالے جیسے انگریز حکام کی سی بو بھی نہیں پائی جاتی۔ میکالے کے برعکس وہ مشرقی زبانوں اور ان کے ادب کو احترام سے دیکھتا ہے۔ البتہ اسے ہندوستان کی جدید زبانوں اور خاص کر ہندوستانی زبان کی تہی مائیگی کا احساس ہے لیکن یہ احساس حقیقت اور ہمدردی پر مبنی ہے۔ ایک جگہ وہ فورٹ ولیم کالج کی کونسل سے پرزور درخواست کرتا ہے —— "ہندوستانی ادب ابھی حقیقتاً طفولیت کے دور سے گزر رہا ہے۔ اگر اس وقت شدید کفایت شعاری اور قاعدے قانون کی پابندی برتی گئی تو وہ کبھی پروان نہ چڑھ سکے گا" (ص ۱۴۰)

ہندوستانی زبان سیکھنے اور اس پر فاضلانہ عبور حاصل کرنے اور اپنی کتابوں کا مواد جمع کرنے کے لئے اس نے دور دراز کے سفر کئے۔ وہ لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد اور جونپور جیسے شہروں میں جا کر رہا جہاں اس نے ہندوستانی زبان کے عالموں، شاعروں اور ادیبوں سے تعلقات پیدا کئے —— ایسا بھی نہیں ہے کہ حصول جاہ و ثروت کا جذبہ گلکرسٹ میں بالکل مردہ ہو گیا ہو۔ اسے بھرپور احساس تھا کہ تصنیف و تالیف کا جو کام وہ کر رہا ہے اگرچہ کچھ دن بعد اس کی شہرت و عزت کا ضامن ہوگا لیکن دولت کا نہیں۔ شاید اسے انگریز حکام جیسی فارغ البالی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اپنی کتابوں کی اشاعت و فروخت کے لئے مہینوں اور سالوں اسے طلومت سے خط و کتابت کرنی پڑی ہے۔ ایک طرف اس کے سامنے معمولی معمولی انگریز حکام و تاجر تھے جو جائز و ناجائز ہندوستان کی زرخیز مٹی سے دونوں ہاتھوں سے سونا کما رہے تھے اور دوسری طرف اپنے جیسے لوگوں کی ایک بہت محدود اقلیت جسے قلم چلا کر، خون جگر کھا کر اور دماغ سوزی کر کے باعزت زندگی گزارنی پڑ رہی تھی۔ ایسی ہی کشمکش رہی ہوگی جب اپنے کام کی ابتدا میں وہ غازی پور جا پہنچا اور وہاں ایک انگریز دوست کے اشتراک میں نیل کی کاشت شروع کر دی۔ لیکن باوجود سخت کوششوں اور محنتوں کے وہ کامیاب تاجر نہ بن سکا۔ سات سال کے لمبے قیام کے بعد بھی وہ جب غازی پور سے کلکتہ آیا تو اس کے پاس علم کی وہی دولت تھی جو شروع میں وہ وہاں

لے گیا تھا۔ ہاں اس دولت میں اب بے اندازہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اب یہ حقیقت اس پر آشکار ہوئی کہ اس کے مقسوم میں عالم ہونا ہے، تاجر ہونا نہیں۔

گلکرسٹ، باوجود اپنی کشادہ قلبی اور روشن خیالی کے معاصرانہ چشمکوں اور ہم پیشہ لوگوں سے شہرت کی دوڑ میں بازی لے جانے کی خواہشوں سے بھی خالی نہیں رہا ہے۔ ہیڈلے کا لغت خود بقول اس کے "دو کوڑی" کا صحیح لیکن (عتیق صدیقی کے مطابق) گلکرسٹ کے لغت کی اشاعت (۱۷۹۰ء) کے بعد، ہیڈلے کے لغت کا جو ایڈیشن ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا تھا، اس میں ...... ہیڈلے نے اس کے لغت کے کچھ الفاظ اور معانی "چرا" کر شامل کر لئے تھے اور صرف دو جگہ ان کا حوالہ دیا تھا .... اتنی سی بات پر گلکرسٹ نے جو ہیڈلے کے خلاف انتہا پسندانہ روش اختیار کی تھی اس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ گلکرسٹ نے اس تاریخی عظمت کا اظہار یا اعتراف بھی غیر ضروری سمجھا کہ .... ہیڈلے پہلا انگریز تھا جس نے ہندوستانی زبان کے مبادیات پر انگریزی زبان میں پہلی کتاب شائع کی اور جس کے متعدد ایڈیشن بھی نکلے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ گلکرسٹ کے دوست کرک پیٹرک (Kirk patrick) کے الفاظ میں ہیڈلے کی یہ کتاب "بے حد مفید" تھی۔ (ص۵۳)

خود کرک پیٹرک سے گلکرسٹ کی یہ دوستی ایک تکلیف دہ، جاں گسل مگر خوش انجام ڈرامے کے بعد ہوئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ فیض آباد کے قیام کے دوران میں گلکرسٹ کو ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اس کے میدان میں ایک اور حریف اتر آیا ہے ——— اور وہ ہے کپتان پیٹرک! جو نہایت با اثر آدمی ہے۔ اس کے لغت کا بیشتر حصہ چھپ چکا ہے اور باقی ماندہ چھپنے والا ہے۔ یہ پڑھ کر اس پر فطرتاً وہی اثر ہوا جو ایک ذہین مصنف پر اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ کسی بڑے اور مہتم بالشان کام میں ہاتھ ڈالنے کے قابل تو ہو گیا ہو لیکن جس کے "دعوے پر ابھی" مشہور نہ ہونے کی تہمت ہو۔" چنانچہ گلکرسٹ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بیمار ہو گیا اور ایسا کہ جان کے لالے پڑ گئے اور بالکل لب گور ہو گیا۔ لیکن غالب کو "وبائے عام میں مرنا گوارا نہ تھا" گلکرسٹ کو "اجنبیوں کے دیس میں" لہٰذا پھر جی اٹھا اور بھری برسات میں فیض آباد سے بنارس گیا اور وہاں سے صحت یاب ہو کر کلکتہ پہنچا۔ کپتان مذکور سے ملا۔ دونوں نے کام کے لئے علیحدہ علیحدہ راہیں مقرر کر لیں۔

لیکن اس قسم کی سیاہ لکیریں، اس کے کردار اور شخصیت کی سفید اور پر نور لکیروں میں اس طرح غائب ہو جاتی ہیں کہ صرف تلاش کرنے سے ہی نظر آ سکتی ہیں۔ ورنہ گلکرسٹ کی زندگی جو زیر نظر کتاب کی مدد سے ہمارے سامنے آئی ہے، مستقل کوشش اور پیہم جد و جہد کی زندگی ہے۔ اس کی تحریروں میں جہاں "برطانوی حکومت کی فلاح و بہبود" کا خیال ہر جگہ نظر آتا ہے، وہاں علم کی سچی لگن اور اس سے پیدا ہونے والا گداز اور گہرائی بھی سائے کی طرح اس کی شخصیت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ہندوستانی زبان کے طالب علم کی حیثیت سے وہ فیض آباد میں نہ صرف اس زبان کے بولنے والوں سے گھلتا ملتا ہے بلکہ زبان کی تحصیل کیلئے وہ انہیں کا لباس بھی اختیار کر لیتا ہے اور سیاہ داڑھی بھی بڑھا لیتا ہے۔ جب وقت سازگار ہوتا ہے تو وہ ہندوستانی منشیوں کو نہ صرف روزی دلواتا ہے بلکہ انہیں مختلف ذرائع سے انعام و اکرام بھی دلواتا ہے۔ ان سے اعلیٰ معیار کی کتابیں تصنیف یا ترجمہ تالیف کراتا ہے اور وقت پڑنے پر ان کی طرف سے کبھی ترقی کے لئے کبھی جائز حق دلانے کے لئے ان حکام سے لڑتا ہے جو ہندوستان کو جدید مغربی علوم کی روشنی سے دور، ایک تاریک مال گودام رکھنا چاہتے تھے کہ اس کی تاریکی میں وہ اس ملک سے جتنا اور جیسا کچھ لے جانا چاہیں لے جا سکیں۔

شروع میں اسے امید دلائی گئی تھی کہ لارڈ ویلزلی ایک شریف النفس اور علم دوست گورنر جنرل ہے، تمہارے کام

کی قدر کرے گا — متکبر اور جاہ پسند گورنر جنرلوں کی لمبی قطار میں ویلزلی کے متعلق یہ رائے بڑی حد تک صحیح ثابت بھی ہوئی۔ اسی کے اشارے پر گل کرسٹ نے اپنا مدرسہ (Oriental Seminary) جاری کیا۔ یہ مدرسہ جلد ہی بند کر دیا گیا۔ لیکن اس کا بند ہونا ایک بہت بڑے اور تاریخی کالج کا کھلنا بھی تھا۔ ویلزلی اصل میں ایک یونیورسٹی قائم کرنا چاہتا تھا لیکن حالات نے یہ کالج بھی نصف صدی سے کچھ زیادہ مدت کے بعد بند کرا دیا۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۰۴ء تک گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کا پروفیسر رہا۔ کالج کے اساتذہ میں اہلیت اور صلاحیت کے اعتبار سے وہ کسی سے نچلا نہ تھا، بلکہ کسی شعبے میں تصنیف و تالیف اور ترجمے کا اتنا بھرپور، مفید اور انقلابی کام نہ ہو سکا جتنا گلکرسٹ کے زیرِ نگرانی شعبۂ ہندوستانی میں۔ اس کے باوجود اس کی تنخواہ اور دوسرے پروفیسروں کی تنخواہ اور آمدنی کے ذرائع میں قابلِ لحاظ تفاوت رہا۔ پھر کالج کونسل اس پر بہت مہربان بھی نہ تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر کونسل کے ساتھ اسے لمبی چوڑی خط و کتابت کرنی ہوتی تھی۔ اس ماحول میں رہ کر چار سال کی مختصر مدت میں گلکرسٹ نے جو کچھ کیا، پڑھے لکھے طبقے اس پر ہمیشہ رشک کرتے رہیں گے۔ شاید اسے یہاں آزادانہ کام کرنے کا موقع ملتا تو وہ یکایک "علالت کی وجہ" سے استعفا دے کر وطن لوٹ گیا نہ ہوتا۔ جو ہندوستان میں بائیس سال اپنی زندگی کا بہترین حصہ اس طرح گزارے کہ ہندوستانی زبان کی تحصیل اور پھر تصنیف کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لے، اپنے خواب پورے ہوتے دیکھ کر دفعتاً استعفا دے بیٹھے؟ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے — عین ممکن ہے کہ یہ کالج کونسل سے تعلقات کے کھنچاؤ کا نتیجہ ہو۔

عتیق صدیقی کی اس تالیف سے فورٹ ولیم کالج، اس کے اربابِ حل و عقد، کارپردازوں اور اس وقت کی علمی و ادبی زندگی کے متعلق بہت سی نئی اور چونکا دینے والی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ مرزا محمد فطرت معنوی (مترجم انجیل) سے متعلق عتیق صدیقی کی تحقیق اردو میں اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ اور اس سے علیحدہ ادیب جو اس وقت "منشی" کہے جاتے تھے زیرِ نظر تالیف میں پہلے سے زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ "ضمیمے" کے تحت میں مولف نے ایسے ادیبوں کے خود نوشت حالات (ان کی تصنیفوں اور تالیفوں سے اقتباس کر کے) پیش کئے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جنھیں گذشتہ محققین متعارف کرا چکے ہیں اور کچھ ایسے کہ جن کا نام تو کسی نہ کسی طور سے معلوم ہو چکا تھا لیکن ان کی تصنیف یا تالیف سامنے نہ آ سکی تھی اور کچھ کو مولف نے پہلی بار روشناس کیا ہے۔ انھوں نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی کے بعد کچھ نہایت اہم فوٹو بھی حاصل کئے ہیں جو کتاب کے آخر میں شامل کر دئیے گئے ہیں۔ گلکرسٹ کی تصویر، اس کی مختلف تصنیف و تالیف کے سرورق کے فوٹو اس قسم کی چیزیں ہیں۔ پھر ایک انوکھی اور حیرت ناک مسرت کی بات یہ کہ آخری اوراق میں گلکرسٹ کا انگریزی سے اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ عتیق صدیقی کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو کے مختلف شاہکار تو ترجمے کے ذریعہ انگریزی میں اس وقت تک آ چکے تھے لیکن انگریزی سے اردو میں ترجمہ (اور شیکسپیر کا ترجمہ) گلکرسٹ کی اولیات میں داخل ہے۔ یہاں نمونتاً بلکہ تبرکاً چند سطروں کا اعادہ بے محل نہ ہوگا۔

"To be or not to be, —— that is the question;	جینا خواہ نہ جینا؟ سوال یہی ہے کہ
Whether 'tis nobler in the mind to suffer	بہتر ہے دل میں برداشت کرنا
The slings and arrows of outrageous fortune	قہر آلود قسمت کے فلاخن و تیر باراں کو
Or to take arms against a sea of Trouble	یا سینہ دست بہ شمشیر دریا مصیبتوں کے
And by opposing end them — To die? To sleep, —	دفاع کرنا ان کو — مرنا کیا ہے؟ سونا ہے
No more; and by a sleep to say we end.	کچھ اور نہیں۔ یہ کہنا کہ ایک نیند سے ہم ان کا نپٹ کرتے ہیں

"گلکرسٹ اور اس کا عہد" اردو تحقیق کی دنیا میں ایک اہم اور فکر انگیز کتاب ہے۔ عتیق صدیقی اردو کے سنجیدہ طبقوں سے یقیناً دادِ تحقیق اور خراجِ تحسین حاصل کریں۔ ان کے یہاں جو معروضی نقطۂ نظر، ضبط و احتیاط، مطالعہ کی وسعت اور موضوع کے ساتھ خلوص پایا جاتا ہے وہ تحقیق کی نئی پود کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہو سکتا ہے — وہ فورٹ ولیم کالج پر ایک اور معتبر و تحقیقی کتاب تالیف کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب کے پڑھنے والے ان کی موعودہ کتاب کا انتظار کریں گے۔

رائے جانکی پرشاد

بابائے اُردو

۱۶ / اگست کو میں نے ریڈیو سے جب یہ اندوہناک خبر سنی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق انتقال فرما گئے تو دل و دماغ پر ایک سناٹا چھا گیا اور معاً مدتوں پہلے پڑھا ہوا کسی شاعر کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ مولوی عبدالحق اردو کے دیوانے، عاشق اور فریفتہ تھے۔ ان کے دل و دماغ اور ان کے احساسات پر اردو اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اگر کوئی ان سے کراچی کے موسم کے بارے میں گفتگو کرتا اور کہتا کہ مولوی صاحب یہاں کا موسم آجکل خوشگوار نہیں ہے تو یقین مانئے کہ جواب میں مولوی صاحب یوں گویا ہوتے کہ بھئی موسم تو اسی وقت خوشگوار ہوگا جب کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے اور پاکستان میں اردو کی پوزیشن مزید مضبوط ہو جائے۔

میں نے مولوی صاحب کو حیدرآباد کے سررشتہ دار الترجمہ میں کام کرتے دیکھا ہے اور برسوں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں ان دنوں دار الترجمہ میں اصطلاحات کے تعلق سے روئیداد میں لکھا کرتا تھا۔ (Concise Oxford Dictionary) کے مرتب کرنے میں بھی میرا حقیر حصہ رہا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ مولوی صاحب نوجوانوں کی ہمیشہ بڑی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ اس تعلق سے وہ بڑے وسیع النظر اور کشادہ دل واقع ہوئے تھے۔ میں نے اردو سے مولوی صاحب کے والہانہ عشق کے اثر انگیز مناظر بھی زیادہ تر یہیں دیکھے۔ وہ دیوانہ وار کام کیا کرتے تھے تھکن کا لفظ تو جیسے مولوی عبدالحق کی ڈکشنری میں تھا ہی نہیں۔ شاید وہ جانتے ہی نہ تھے کہ تھکن کسے کہتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اردو کے لئے عرق ریزی اور لگن کے ساتھ جانسوز محبت، ان میں نئی طاقت و توانائی پیدا کرتی تھی۔ عمر کا لحاظ کرتے وہ جیسے جیسے بوڑھے ہوتے جا رہے تھے اردو کی خدمت کے لئے ان میں نوجوانوں کا سا جوش پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اردو کی خدمت کا ان کے دل میں وہ ولولہ تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو بقول سروجنی نائیڈو اردو کو ساری دنیا کی زبان بنا دیتے۔ اسی بات کو دیکھئے کہ جب اردو کا پیام گھر گھر پہنچاتے کا ان کے سر میں سودا سمایا تو ملک بھر کے دورے شروع کئے اور وہ بھی اس مستعدی اور تیز رفتاری کے ساتھ کہ منزلیں گرد کے مانند اڑنے لگیں۔ اس جذبۂ بے اختیار شوق میں سینکڑوں ہزاروں میل کا سفر پیرانہ سالی کے باوجود ان کے لئے جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہوئے تو کتابوں کا جنگل کھڑا کر دیا۔ مقدمات لکھنے بیٹھے تو اتنے لکھے اور اس پایہ کے لکھے کہ بعض منچلوں نے انھیں مقدمہ باز کا نام دے دیا۔ مرقع نگاری کی طرف توجہ کی تو صریر قلم سے مسیحائی کا کام کیا اور کتنے ہی مرے ہوؤں کو نئی زندگی عطا کی۔ تنقید کی راہ پر گامزن ہوئے تو ایسے پھونک پھونک کر اور بچ بچ کر جیسے کوئی مینا بردوش ہو اور اس خارزار کو اس حزم و احتیاط سے طے کیا کہ مدح و ذم کے کانٹوں سے اپنے دامن کو کبھی الجھنے نہیں دیا اور اس راہ کے نازک مرحلوں سے بڑی آسانی اور کامیابی سے گذر گئے۔ تنقید کے ان نازک مرحلوں میں یہ کامیابی دراصل ان کی سنجیدگی، دیانت اور موضوع سے انصاف کرنے کی خصوصیات کا نتیجہ تھی۔ تحقیق کے رسیا ہوئے تو ہماری زبان و ادب کے سرمایہ میں اپنے

لی معیاری کام سے گراں بہا اضافہ کیا۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا خیال آیا تو جامعہ عثمانیہ جیسی شاندار یونیورسٹی کی تاسیس کے کام کو پورا کئے بغیر نچلا
بیٹھے۔ غرض اپنی لائق قدر انشا، تنقید، تحقیق اور فن تعلیم میں مہارت سے مولوی صاحب نے زمین اردو کو سچ مچ آسمان کر دیا۔ اگر آپ اسے
بالغہ نہ سمجھیں تو سعدی شیرازی کی زبان میں عرض کردوں کہ عبدالحق کی نگہ التفات سے "کلاہ گوشۂ اردو بہ آفتاب رسید"۔

اردو کی ترویج و اشاعت کے مقصد میں بڑی سے بڑی شخصیت بھی اگر کبھی رکاوٹ بن کر سامنے آئی تو اس کا انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ
کیا۔ جسے زندگی کی پروا نہ ہو وہ کب کسی اور چیز کی پروا کرتا ہے۔ در اصل اردو کے دوستوں کو مولوی صاحب نے ہمیشہ اپنا دوست سمجھا اور
اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن۔

اردو سے انھوں نے جو کچھ کمایا اسے اسی دلیری کے ساتھ اسی کی خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا۔ لیکن عمر بھر کمانے کے باوجود خود مولوی صاحب
کے گرہ میں کیا رہا؟ ان کے حصے میں کیا آیا؟ سرسید اور مولانا حالی کے جانشین کو کیا ملا۔ سرسید کے جانشین کو بجز گالیوں، نفرت، حقارت اور
روحانی کوفت کے اور مل ہی کیا سکتا تھا؟ تنگ نظر، خود غرض اور اپاہج قوموں میں پیدا ہونے والے سرسیدوں کا ہمیشہ یہی حشر ہوا ہے۔ وہ
سیکئے کہ اردو ہی کی طرح مولوی عبدالحق بھی سخت جان تھے کہ ہزاروں تلخیوں اور ناخوشگواریوں کے باوجود (۹۱) سال تک زندہ رہے۔ اردو نے
بھی اپنی حفاظت کے لئے ایسا جانباز اور سخت جان سپاہی اپنی زندگی کے کسی دور میں کب پایا ہوگا۔ سخت افسوس ہے کہ (۹۱) سال تک زندہ
رہنے کے باوجود بابائے اردو کے خلوص اور ان کے دل کی پوشیدہ بے تابی کو دنیا نے نہیں پہچانا۔

کم نظر بے تابی جانش ندید   آشکارش دید و پنہانش ندید

آخر وہ کب تک اور کہاں تک اپنے دل کی بات زمانے بھر کو سمجھاتے۔ بالآخر ۱۶ اگست کو انھوں نے چپ سادھ لی۔ آج عبدالحق خاموش
ہیں۔ ان کی زبان بند ہے۔ موت نے آج ان کی زبان پر مہر خاموشی لگا دی۔ دیکھئے ان کا چہرہ کیسا پرسکون ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ
کہہ رہے ہوں اب ہم نہیں بولیں گے۔ قیامت تک نہیں بولیں گے۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے متلاطم سمندر نے یکلخت پہاڑ جیسا سکوت اختیار
کر لیا ہو۔ اچھا ہی ہوا عبدالحق خاموش ہو گئے۔ بہروں کی دنیا کو وہ کب تک اردو کی بپتا سناتے۔ ایک سچے عاشق کے سے شوق اور انہماک سے
عبدالحق نے زندگی بھر اردو کی خدمت اس لئے بھی کی کہ ان کا خیال تھا کہ اردو کی خدمت درحقیقت ملک کی خدمت ہے۔ اپنے اس خیال
کا اظہار بابائے اردو نے اردو مجلس کے نام "یوم مولوی عبدالحق" کے سلسلے میں اپنے ایک بصیرت افروز پیام میں کیا تھا۔ بابائے اردو نے فرمایا تھا کہ
اردو کی خدمت درحقیقت ملک کی خدمت ہے۔ اس نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ رواداری اور ملنساری اس کی فطرت میں ہے۔ اس نے اس برعظیم
کے مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کیا اور سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا۔ اس لئے اردو کو اور اس کی پیدا کردہ تہذیب کو بچانا اور ترقی دینا ہم سب کا
فرض ہے۔ در اصل خلوص و بے غرضی کے ساتھ کام کرنے والوں پر ظلم و ستم دنیا میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ اپنوں ہی نے ہمیشہ حوصلہ شکن فضا پیدا
کی۔ ایسے مجنونوں کی راہ میں روڑے اٹکائے اور وہ ظلم ڈھائے کہ

رہا نہ طرز ستم کوئی آسماں کیلئے

خدا کا شکر ہے کہ اردو مجلس کو اس بات کا اعزاز حاصل ہوا کہ اس نے بابائے اردو کی زندگی ہی میں ان کی شاندار ادبی خدمات کا بجا طور پر
اعتراف کیا اور ماہ مئی ۱۹۶۱ء میں "یوم مولوی عبدالحق" منایا اور اپنے سہ ماہی ترجمان "مجلس" کا "مولوی عبدالحق نمبر" بھی شائع کیا تھا جس پر
بابائے اردو نے اظہار خوشنودی فرمایا تھا اور جس کا ادبی حلقوں نے بڑا حوصلہ افزا خیر مقدم کیا

صاحبو! بے شک بابائے اردو دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن انھوں نے جو تحریک چلائی تھی اردو کی تحریک — اسے زندہ رہنا اور زندہ رکھنا چاہیے کیونکہ
تحریکوں کی موت ہی در اصل قوم کی موت ہوتی ہے۔ اگر اردو والوں میں صحیح احساس فرض اور جذبہ عمل ہے تو یہ تحریک آئندہ بھی زندہ رہے گی بلکہ میرا یہ خیال ہے کہ
جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اس میں اور تقویت پیدا ہوگی۔ خدا کرے کہ ہمارا شعور بیدار ہو اور ہمارے دلوں میں اردو کی پرخلوص خدمت کا حقیقی جذبہ پیدا ہو۔

پائندہ باد اردو

محی الدین احمد

مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں

ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی مہذب، شائستہ، بااخلاق اور صاحب کردار کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ کمزوریاں اس میں ضرور ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کمزوریاں انسان ہی میں ہوتی ہیں۔ اگر کمزوریاں نہ ہوں تو انسان، انسان نہ رہے، فرشتہ ہو جائے۔ یہی حال مولوی عبدالحق کا بھی تھا۔ یہ بھی انسان ہیں اور ان میں بھی کمزوریاں ہیں۔

مجھے یہ تسلیم ہے کہ میں نہ مولوی صاحب کا شاگرد رہا ہوں اور نہ ماتحت۔ لیکن مولوی صاحب کی اردو خدمات کی وجہ ایک خاص عقیدت میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی جو آج بھی ویسی ہی ہے جیسی برسوں پہلے تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مولوی صاحب کو دیکھا ہے اور خوب دیکھا ہے۔ گو دور ہی سے دیکھا ہے لیکن دوربین لگا کر دیکھا ہے اور اس طرح دیکھا ہے جس طرح کوئی نزدیک سے دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ جہاں میں نے ان کی خوبیاں دیکھی ہیں وہیں ان کی بعض کمزوریاں بھی دیکھی ہیں۔

ہم ہندوستانیوں کی قومی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہم وقت کی قدر بالکل نہیں جانتے اور پابندیٔ وقت کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف مولوی صاحب وقت کی پابندی خود بھی سختی سے کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس پر مجبور کراتے تھے۔ دوسروں کو پابند بنانے کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ سر اکبر حیدری گورنمنٹ نظام میں صدر اعظم باب حکومت تھے۔ ایک بار کسی سرکاری کام سے وہ اورنگ آباد کے دورے پر گئے۔ اسی زمانے میں مولوی عبدالحق نے اردو باغ کے افتتاح کی تقریب رکھی اور اس سلسلے میں ایک عصرانہ ترتیب دیا اور ساڑھے پانچ بجے کا وقت مقرر کیا، لیکن حیدری صاحب کسی وجہ سے وقتِ مقررہ پر نہ آسکے۔ مولوی صاحب نے وقتِ مقررہ پر عصرانہ شروع کروا دیا۔ حاضرین میں سے بعض لوگوں نے اصرار بھی کیا کہ مہمانِ خصوصی کا انتظار کر لینا چاہیئے۔ لیکن مولوی صاحب نے ایک نہ مانی۔ بالآخر حیدری صاحب کچھ تاخیر سے پہنچے تو مولوی صاحب نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا کہ وقتِ مقررہ گذر جانے کے بعد میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ حیدری صاحب نے مولوی صاحب سے معافی مانگی۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ جناب آپ بڑے آدمی ہیں اور وقت آپ کا ہے۔ آپ کو ہمارے وقت کی کوئی قدر نہیں۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے ہم ہندوستانیوں کی پسندیدہ روش کی اتنی سخت خلاف ورزی مولوی صاحب کی کیا بڑی کمزوری نہیں۔

وہ ماتحتین کی غلطیوں کو بھی اپنے سر لے کر ان کو بے قصور قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک بڑی کمزوری تھی۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ مولوی صاحب کے ایک ماتحت (محمد علی صاحب) ان کے دفتر میں اہلکار تھے۔ اتفاق سے اسی دفتر میں ایک جائیداد سررشتہ داری کی تقرر طلب تھی۔ مولوی صاحب نے اس پر ان کا تقرر کر دیا۔ چونکہ سررشتہ دار کے تقرر کا اختیار مولوی صاحب کو حاصل نہ تھا اس لئے توثیق کے لئے مسل کارروائی نظامت تعلیمات کو روانہ کی گئی۔ وہاں سے مولوی صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ لکھا گیا کہ چونکہ محمد علی صاحب کی نسبت سی۔آئی۔ڈی کی رپورٹ ٹھیک نہیں ہے اس لئے ان کو ترقی نہیں دی جا سکتی۔ اس کا جواب مولوی صاحب نے یہ دیا کہ اگر سی۔آئی۔ڈی کی رپورٹ پر ترقی کا انحصار ہے تو میں شاید ملازمت تو کیا ملک میں رہنے کے قابل نہیں ہوں کیونکہ سی۔آئی۔ڈی میں میری رپورٹ

اس سے بھی زیادہ خراب ہوگی۔ پس جب میں ملازمت پر برقرار رکھا جاسکتا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ بیچارے محمد علی کو ترقی سے محروم رکھا جائے۔ چنانچہ لٹریٹمگڈ کر مولوی صاحب نے اپنی تحریک منظور کروالی۔

مولوی صاحب کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ ہر شخص کی سفارش کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ ایک بار کوئی تانگہ والا ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں ایک مقدمہ میں پھنس گیا ہوں۔ پیروی کا انتظام نہیں کرسکتا۔ آپ کسی وکیل کے نام سفارشی چٹھی لکھ دیجئے تاکہ وہ میرے مقدمے کی بلاحصول محنتانہ پیروی کرے۔ مولوی صاحب نے بے تکلف ایک خط اورنگ آباد کے مشہور وکیل ساجد علی صاحب کے نام لکھ دیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے مجھے اور آپ کو ایک مرتبہ اورنگ کے بازار میں پہنچ دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مولوی صاحب کے منشاء کے مطابق بلاحصول محنتانہ پیروی کی۔

مولوی صاحب اگر کسی کو بلاقصور ڈانٹ دیتے یا بگڑ جاتے تو اس کے بعد اس شخص کے ساتھ کچھ ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ اس ڈانٹ ڈپٹ زجر و توبیخ کو بالکل بھول جاتا اور یہ عمل معافی طلب کرنے کے معادل و مترادف بن جاتا حالانکہ معافی مانگنا ان کو قطعاً نہیں آتا۔

ایک بار یوں ہوا کہ مولوی صاحب ایک خوش منظر پہاڑی پر بنگلہ بنوانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے لکڑی اور چند ضروری چیزیں خریدی گئیں اور ایک بھٹی اینٹوں کی لگوائی گئی۔ بعد میں وہ بھٹی خراب ہوگئی۔ مولوی صاحب نے بھٹی کے نگران عبدالرحیم خاں کو ذمہ دار قرار دے کر ڈانٹنا شروع کیا اور اس قدر سخت سست کہا کہ بیچارہ تاب نہ لاسکا اور بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کو اٹھا کر ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں اور جب اس کے ہوش و حواس ٹھکانے آئے تو گھر چلا گیا اور نوکری پر حاضر نہیں ہوا۔ مولوی صاحب کو ان کے ایک دوست نہال احمد نے توجہ دلائی کہ آپ نے عبدالرحیم خاں کو بلاوجہ ڈانٹ و پھٹکار کی۔ آج آپ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے تو کل میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے میں بھی اپنا سامان بندھوائے لیتا ہوں۔ یہ سن کر مولوی صاحب خاموش ہوگئے۔ دوسرے دن علی الصبح محمد علی صاحب کو ساتھ لے کر صبح کی سیر کی بجائے محلہ عثمان پورہ میں منشی صاحب کے مکان جا پہنچے اور فرمانے لگے بھئی عبدالرحیم میں نے تمہارے ہاتھ کی چائے دو تین دن سے نہیں پی ہے اور آج صرف تمہاری بنائی ہوئی چائے پینے کے لئے آیا ہوں۔ کیا مجھے چائے نہیں پلاؤ گے۔ بیچارے عبدالرحیم نے جلدی جلدی چائے تیار کر کے مولوی صاحب کو پلائی۔ جب واپس ہونے لگے تو مولوی صاحب کے اس طرز عمل کا عبدالرحیم خاں پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا اور واپس آکر حسب سابق اپنے مفوضہ کام پر لگ گیا۔

اب ذرا کوئی مجھے یہ بتلادے کہ کیا کوئی ایسا شخص جو حکومت کے اعتبار سے ایک بڑے معزز اور جلیل القدر عہدہ پر فائز ہو اور اپنے علم و فضل کی وجہ ملک بھر میں خاص شہرت اور عزت و وقعت رکھتا ہو اپنے ایک غریب ماتحت کے گھر جاکر اس قدر بے تکلفی کے ساتھ چاء پی سکتا ہے۔ یہ اگر مولوی صاحب کی کمزوری نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان
اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

مکاتیب ڈاکٹر مولوی عبدالحق

مورخہ:- ۱۱ر جنوری ۱۹۵۵ء

جنابِ مکرم

میں آپ کو ادارۂ ادبیات اردو کی سلور جوبلی پر تہِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اس ادارے نے اردو زبان کی جو خدمت انجام دی ہے وہ بلاشبہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ اس نے نہ صرف بہت بڑی تعداد میں مفید اور کارآمد ادبی، علمی، تاریخی، تنقیدی کتابیں شائع کیں۔ بلکہ مختلف ذرائع سے عام لوگوں کو اردو سکھانے اور ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک اچھے کتب خانے کی بنا ڈالی جس میں کئی ہزار مطبوعات و مخطوطات جمع کئے گئے ہیں جن (کے) مطالعہ سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے۔

موجودہ ناسازگار حالات اور ہمت شکن ماحول میں ایسا شاندار کام انجام دینا ہر اعتبار سے لائقِ تحسین ہے۔ یہ کامیابی زیادہ تر ادارے کے قابل معتمد اعزازی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے حسنِ سعی کا نتیجہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اس ادارے کو برعظیم پاک و ہند کی مقبول ترین زبان اردو کی اشاعت میں اس سے زیادہ کامیابی ہو۔

عبدالحق

مرزا سرفراز علی[1] صاحب بی۔ اے میرے طالب علم رہے ہیں۔ یہ بہت ذہین اور مستعد نوجوان ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں صرف امتحانات ہی میں امتیاز حاصل نہیں کیا بلکہ ادبی تحریکوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ مجلہ عثمانیہ کے مدیر تھے۔ لٹریری سرکل کے معتمد رہے۔ جامعہ عثمانیہ (کے) اکثر تقریری مقابلوں میں نام ہو گیا۔ اردو کے بعض مشہور رسالوں میں مضمون لکھتے رہے۔ اب ان کا تعلق سٹی کالج سے ہے۔ وہاں بھی وہ ادبی تحریکوں میں مصروف ہیں۔ المرسی کے ایڈیٹر ہیں اور بزم ادب کے معتمد وغیرہ۔

میں ان کے ادبی کاموں اور خصائل و عادات کو بہت پسند کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر انھیں مناسب موقع ملا تو اپنے کام میں امتیاز پیدا کریں گے۔

عبدالحق (صدر شعبہ اردو۔ جامعہ عثمانیہ)
۲۸ر ستمبر ۱۹۳۶ء

[1] نائب ناظم محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام ڈاکٹر سید سجاد

بخدمت ڈاکٹر سید سجاد صاحب

آپ نے اورنٹیل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ میسور میں شریک ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کے متعلق یہ دریافت طلب ہے کہ آیا آپ اس کانفرنس میں کوئی مقالہ پڑھیں گے۔

عبدالحق ۔ ۲۰ روے ۵۴ف

ڈاکٹر سید سجاد بنام ڈاکٹر مولوی عبدالحق

مخدومی! میرا قطعی طور پر ارادہ تھا کہ اگر میرا انتخاب ہو گیا تو میں کانفرنس میں مقالہ پڑھوں۔ لیکن یہ استفسار مجھ سے بہت دیر میں کیا گیا ہے۔ میں ایک اور سفر کا تہیہ کر چکا ہوں اور افسوس ہے کہ اب میسور نہیں جا سکتا۔

سید سجاد ۔ ۱۲ روے ۵۴ف

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام پروفیسر حسین علی خاں منتظم معین امیر جامعہ

ڈاکٹر سید سجاد صاحب کی درخواست مرسل ہے۔ دس یوم کی رخصت اتفاقی منظور فرمائی جائے۔ لیکن ان کی حالت ایسی ہے کہ کامل صحت کے لئے کئی مہینے درکار ہوں گے۔ میری رائے میں عثمانیہ ہاسپٹل کے کسی ڈاکٹر سے (جہاں وہ زیر علاج ہیں) دریافت کر لیا جائے کہ صحت کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی تاکہ فی الحال متفرانہ انتظام کر لیا جائے، ورنہ تعلیم کا سخت ہرج ہوگا۔

عبدالحق ۔ پروفیسر اردو
۲۴ر شہریور ۴۴ف

مناظر احسن گیلانی بنام ڈاکٹر مولوی عبدالحق

مخدوم و مکرم جناب مولوی صاحب قبلہ!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ

جناب کی خدمت میں خاکسار اپنے ایک قابل رحم طالب العلم مولوی محفوظ شریف صاحب متعلم ایم۔ اے (سال آخر) کے متعلق خصوصیت کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ یہ بیچارے اس سال سخت مصیبتوں کا شکار رہے۔ ان کی اہلیہ اور ان کے بچے کا حال میں انتقال ہوا ہے اور ان کے علاج و معالجہ میں یہ بہت زیر بار ہوئے ہیں۔ ان کی تعلیمی حالت بھی اچھی ہے اور اب صرف ایک سال فراغت کے لئے باقی ہے۔ اگر ان کو وظیفہ سرکار عالی سے مدد نہ کی گئی تو ان کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ اگر کوئی نہیں تو اس قابل رحم طالب العلم پر آپ کا دردمند دل ضرور رحم کرے گا۔ امید ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان کے وظیفہ کے لئے آپ سعی فرمائیں گے۔ فقط

نیازمند ــــ مناظر احسن گیلانی
۱۴ر دیے ۱۲؁

شمیم کرہانی

پتھر کے مجسمے

(رُباعیات)

ماحول پہ چھایا ہے متانت کا جمود
محفل ہے کہ زاہد ہے کوئی سربسجود
بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے گردن چپ چاپ
ان بندوں سے کیا خطا ہوئی ہے معبود

یہ اہلِ خرد جن میں کوئی رنگ نہ بُو
لٹکے ہوئے یہ ہونٹ یہ بوجھل ابرو
سُنسان پہاڑوں کی گپھا میں جیسے
بیٹھے ہوں سفید ریش بوڑھے سادھو

تعریف کے جوہر نہ ستائش کی نگاہ
خود آہ میں کرتا ہوں تو کہہ لیتا ہوں آہ
انسان کے جذبات سمجھتے ہی نہیں
انسان، ملک ہو گئے ماشاء اللہ

لمحہ کوئی جذبات کے تجنے کا ہے
لمحہ تو گلوں کی سیج سجنے کا ہے
یہ رات، یہ بزم درس خوانی، توبہ
یہ وقت تو گھنگھروں کے بجنے کا ہے

احساس کے شعلے کو بجھا دیتا ہے
جذبات پہ مہر سی لگا دیتا ہے
انساں کو غرورِ علم و حکمت شاید
پتھر کا مجسمہ بنا دیتا ہے

واعظ ہیں کہ بیٹھے ہیں کنارے گم سم
محفل میں پُھنکے ہیں سارے مردم
اُٹھو کہ فضا میں ہے بڑھاپے کا جمود
کیوں اپنی جواں رات گنوائیں ہم تم

نجم آفندی

سادہ دلوں کو کیا خبر جی گئے وہ کہ مر گئے
جان سے ہاتھ دھو کے جو ہاتھ لہو میں بھر گئے
کیسی روش پہ ڈال کر وقت کے راہبر گئے
اور خیالِ خام کی عمر دراز کر گئے
ایک گناہ کم نہ تھا اور گناہ کر گئے
واہ ری سہل ممتنع بات کہی مکر گئے
کام کی دھن رہی جنھیں کچھ تو وہ کام کر گئے
وقت گزر سکا نہ جب وقت سے خود گزر گئے
عزم و عمل نہ بن سکا ہائے فریب زندگی
ایسا بھی دن اک آئے گا کہتے ہی کہتے مر گئے
کتنے مسافرِ عدم دل کو نہ دل بنا سکے
حُسن شریکِ راہ تھا حُسن سے بے خبر گئے
اہلِ نظر نے دیکھ لی اہلِ ستم کی مردمی
آپ ہی آپ چونک اٹھے آپ ہی آپ ڈر گئے
راہ نئی بنا سکیں اتنا شعور ہی نہ تھا
مجھ سے نظر بچا کے وہ میری ہی راہ پر گئے
میں نے خدا کے فضل سے کلمۂ عشق پڑھ لیا
ایسے بھی کم نصیب تھے کفر کی موت مر گئے
نعرۂ انقلاب تھی آہِ دلِ ستم زدہ
وقت کے منہ چڑھے جو تھے ان کے بھی منہ اتر گئے
نجم وہ محفلِ سخن جانِ بہار بن گئی
میرے تخیلات کے پھول جہاں بکھر گئے

خورشید احمد جامی

نیا جمال نئی آب و تاب دیتا ہوں
ہر ایک گیت کو تیرا شباب دیتا ہوں
مرے لئے ہیں اندھیروں کی پھانسیاں لیکن!
تری سحر کے لئے آفتاب دیتا ہوں
غم حیات کے بے کیف و خشک موسم کو
خیالِ یار کے تازہ گلاب دیتا ہوں
خلوصِ چارہ گراں وہ سوال ہے جس کا
دہانِ زخم سے اے دل جواب دیتا ہوں
اداس دیکھ کے تعبیر کی نگاہوں کو
پھر ایک بار تمنا کے خواب دیتا ہوں
مری شبوں نے جسے خونِ دل سے لکھا ہے
سحر کے ہاتھ میں اب وہ کتاب دیتا ہوں
نشاطِ غم کے چراغوں کی لَو بڑھا دینا
کہ شامِ ہجر کو جامِ شراب دیتا ہوں
رہِ حیات میں جامیؔ نئی امنگوں کو
نیا خیال نیا ماہتاب دیتا ہوں

احسان دانش

غزل

ذرہ بہ ذرہ ہے نہاں رازِ حقیقتِ چمن — نکہتِ گل سے کام رکھ! چھیڑ نہ گل کا پیرہن!

چپ ہیں ابھی تو لالہ و سنبل و سوسن و سمن — سعیٔ فضول و جذبِ خام چاک ابھی ہے پیرہن؟

جرأتِ آدمی ہے آج اس رہِ نو پہ گامزن — بامِ فلک دھواں دھواں، فرشِ زمیں شکن شکن

طرزِ حیاتِ عصرِ نو بے غم و فکر کر قبول — چرخ نیا، نئی زمیں، لوگ نئے، نیا چلن

وقت کے قافلے کے ساتھ جانے کدھر نکل گیا — عشق کا خاص ولولہ، حسن کا خاص بانکپن

اب یہاں کاروبارِ مے کون چلائے کیا چلے — ہوگئی خود زمانہ ساز شیشہ گروں کی انجمن

صحبتِ زندگاں کی یاد دادِ حیات بن گئی — حسن ہے آج بے ردا، عشق ہے آج بے کفن

حسن کا آستانِ ناز رہ گیا اب روایتی — اور ہی کچھ ہے آجکل اہلِ نیاز کا چلن

قیمتِ عشوہ و ادا اہلِ نظر کی بات ہے — عظمتِ گل کہیں کہیں، شہرتِ گل چمن چمن!!

دانشؔ بے نوا تجھے اُن سے کوئی گلہ نہیں

دیکھ ہے کس عروج پر حسن کی دوستی کا فن

*

روشؔ صدیقی

دو غزلیں

مرکزِ نور ترے خاک نشیں کو دیکھا
چشمِ حیرت سے ستاروں نے زمیں کو دیکھا

وہ گماں دل پہ گزرتے ہیں رہِ اُلفت میں
لڑکھڑاتے ہوئے اربابِ یقیں کو دیکھا

حیرتِ دید کی معراج اسے کہتے ہیں
کہیں دیکھا ہے کسی کو تو اُنہی کو دیکھا

تھی کہاں صبحِ قیامت سے یہ اُمید مگر
آنکھ کھلتے ہی اُسی دشمنِ دیں کو دیکھا

درِ کعبہ سے جو نکلے تو روشؔ کیا دیکھا
منتظر اک صنمِ دیر نشیں کو دیکھا

★

ہاں جاں نواز وعدۂ فردا ضرور تھا
لیکن یہ خواب تیرے تغافل سے دور تھا

اے رہروانِ وادیٔ ایمن کہاں چلے
ہم سے بھی کچھ معاملۂ برقِ طور تھا

بے اختیار آ گئی حسنِ ازل کی یاد
کیا وقتِ صبح شمع کے چہرے پہ نور تھا

کونین کو مرقعِ رنگیں بنا دیا
نقاشِ انتظارِ دلِ ناصبور تھا

ہم میکدے تک آئیں یہ ہرگز نہ تھا خیال
ہاں رسم و راہِ ہوش سے بچنا ضرور تھا

ہر رنگ میں وہ شوخ کرم آمیز تھا مگر
سادا سا اک خلوص شریکِ غرور تھا

بچتے جو خوفِ کوئے ملامت سے ہم روشؔ
یہ بھی تو وضعِ اہلِ محبت سے دور تھا

علی جواد زیدی

غزل

اہلِ ظاہر کو نمودِ جلوہ گری نے مارا
مجھ کو تو میری ہی بالغ نظری نے مارا

تلخ تھی موت مگر زیست سے شیریں تر تھی
اُس سے پوچھو جسے بے بال و پری نے مارا

چھاؤں ملتی ہے تو زخم اور ہرے ہوتے ہیں
اے غمِ دربدری! تری ہمسفری نے مارا

دشتِ غربت کے شب و روز کی دولت نہ ملی
سرِ وطن میں بھی بہت دربدری نے مارا

عشق اور دستِ طلب! ایسی بھی کیا مجبوری؟
تجھ کو، اے دل، تری دریوزہ گری نے مارا

زخمِ دل بھرنے لگا تھا کہ اُسی زخم کے پاس
اور اک تیر تری بخیہ گری نے مارا

وارِ شمشیر بڑھے جوشِ جنوں روکنے کو
قہقہہ شوق کی شوریدہ سری نے مارا

صلح کرنا تو زمانے سے بہت آساں تھا
مجھ کو زیدیؔ مری صاحب نظری نے مارا

نجیب رامش

غزل

راکھ ہی راکھ نظر آتی ہے ارمانوں کی
قسمتیں آج بھی محکوم ہیں انسانوں کی

ہم جسے آج تری قوسِ بدن کہتے ہیں
یہی بن جائے گی محراب بھی زندانوں کی

بستیاں چھوڑ کے جائے تو کہاں جائے جنوں
خود تراشیدہ ہی تصویر ہے ویرانوں کی

سوزِ غم وہ ہے جو دنیا کو اُجالے بخشے
شمع خود شمع نہیں "آگ" ہے پروانوں کی

آج شاید تری زلفوں میں چھپے گا سورج
دھوپ اُڑتی سی نظر آتی ہے میدانوں کی

پھر ترے بندِ قبا ٹوٹ گئے ہیں شاید
آہٹیں آنے لگی ہیں کبھی طوفانوں کی

ڈھونڈھ لیتی ہے اُسے گردشِ حالات نجیبؔ
یعنی آزاد نہیں خاک بھی دیوانوں کی

★

غزل

منظر اتوجی

نہ کسی نگاہ نے لوٹ لی، نہ کسی نگاہ نے چھین لی
مری زندگی کی ہر اک خوشی ترے اعتبار نے چھین لی

رہِ زندگی میں لٹا چکا میں شگفتگیٔ دل و نظر
جو بچی بھی تھی غمِ دوست سے غمِ روزگار نے چھین لی

مری زندگی کے تمام دن ترے اجتناب میں کٹ گئے
مری زندگی کی ہر ایک شب ترے انتظار نے چھین لی

نہ وہ آرزو، نہ وہ زمزمے، نہ وہ سرکشی، نہ وہ محفلیں
یہ اسی حیات کا ذکر ہے جو خیالِ یار نے چھین لی

مجھے اپنی جراءتِ عرضِ غم پہ نہ جانے کتنا غرور تھا
مگر آج وہ بھی کسی کے دیدۂ اشکبار نے چھین لی

میں چمن میں ایک بھی گل سے لب پہ ہنسی کا نام نہ پا سکا
مجھے آج اس کا یقین ہے یہ ہنسی بہار نے چھین لی

غزل

رگھو بنسی بنسل

ہوتے ہیں روز دِل پہ زمانے کے یوں ستم
جیسے تیری نگاہ کو بھولے ہوئے ہیں ہم

دِل نے جلا لئے ہیں ہر اِک زخم کے چراغ
جب سے لگی ہے بزمِ نگاراں میں شرطِ غم

اُبھرے ہیں اِس طرح تیری یادوں کے سلسلے
جیسے سفر میں اجنبی راہوں کے پیچ و خم

کچھ یاد کر کے ہم نے لگا لی لبوں پہ مہر
کچھ سوچ کر خموش رہی ہے وہ چشمِ نم

منزلِ شکستِ عہدِ محبت کے بعد بھی
جیتا ہوں اس لئے کہ یہ ہے زیست کا بھرم

(مرتب) قمر ساحری

انتخاب مشاعرہ بزم سعدی

پروفیسور شور (ملتان)

در دیار ما غریبان ای غم جانانہ باش — تو چراغ خانہ باشی رونق کاشانہ باش
بی خلوص بندگی ہر بندگی باشد حرام — کافر کعبہ گرگشتی مومن بتخانہ باش
ہوش می گوید تمیز کافر و دیندار کن — عشق می گوید کہ ہم از خویشتن بیگانہ باش
تا کجا ذوق طلب مرہون لطف دیگران — خود ہمی و میخانہ شو خود شیشہ و پیمانہ باش
شور تا کی بشنوی از دیگران افسانہا — خود فسانہ ساز کن خود حاصل افسانہ باش (آمدہ از لائل پور)

حنین کاظمی شاد

زیرک و فرزانہ ہستی، باز ہم فرزانہ باش — آشنا با آشنا بیگانہ با بیگانہ باش
چون تلاطم خیز دریای است این دنیای دون — اندرین دریا بسان گوہر یکدانہ باش
ساقیا! آخر چرا رفتی ز میخانہ، بیا — "اول از میخانہ بودی آخر از میخانہ باش"
چیست دنیا، در رہ سیل فنا ویرانہ ای — زاہدا، با میگسار و شیشہ و پیمانہ باش
دوش میگفت این سخن سعدی بہ شاد رادمرد — تکیہ بر ہستی مکن، در نیستی مردانہ باش (آمدہ از کراچی)

ناصح رضوی

چشم پوش از نیک و بد آزادہ مستانہ باش — لب بنوش می دہ و در گردش پیمانہ باش
کو بکو گر گردی و خاک بیابان بیختی — آبروی ریختی نادان بیا فرزانہ باش
با حریم دل اگر تو آشنا ہستی، برو — خواہ در صحرا نوردی خواہ در کاشانہ باش
مدعا گر باز ہم حاصل نہ ای عقل رسا — صورت چشم صدر، در حیرت افسانہ باش
ساتگین خویشتن بر زن بجام زندگی — "اول از میخانہ بودی آخر از میخانہ باش" (آمدہ از کراچی)

اصغر حسین سجادی

چون شریک بزم نادانان شوی فرزانہ باش — در ہجوم عاقلان از مصلحت دیوانہ باش
تا دمی راحت شود حاصل دل شوریدہ را — فارغ از غم شو شریک محفل رندانہ باش
گر نمی خواہی کہ آلودہ شود دامان تو — بی تعلق در جہان چون سبزہ بیگانہ باش

مسلکش من خدمت آفاق و کار تو دگر　　من چراغ رهگزارم تو چراغ خانه باش
سرزمین "لاله و گل" پُر ز انوار جمال　　بیند من مثنوی گر اکبر عاشق مستانه باش (آمده از لندن)

پروفیسر سید احمد وحشی

از ازل مستانه بودی تا ابد مستانه باش　　"در اول از میخانه بودی آخر از میخانه باش"
دل بباز و جان بباز و سر بباز و هوش باز　　آشنا خواهی شدن از خویشتن بیگانه باش
بی تعلق زیستن کار خرد مندانه نیست　　راه کعبه گر نیابی بر در بتخانه باش
صورت پروانه خود را بر سر شمعی بزن　　یا چو شمع بزم تسکین دل پروانه باش
راز گیتی حل نخواهد شد ز کاوشهای تو　　خواه تو دیوانه باش و خواه تو فرزانه باش (آمده از کراچی)

حیرت بدایونی

رو کش از پروانه‌ها دلدار یک پروانه باش　　شمع محفل بوده‌ای اکنون چراغ خانه باش
تا به کی باشی اسیر ملک و گنج و تاج و تخت　　پادشاهی کن غلام نرگس مستانه باش
ای که شام بی طرب داری و صبح بی بهار　　می پرستی کن، مرید ساقی میخانه باش
شاعری خواهد شعور و میکشی خواهد سرور　　شاعری کن یا حریف باده و پیمانه باش
دور این و آن گذشت امروز حیرت عهد تست　　بر سریر عالم دنی با شوکت شاهانه باش

برق موسوی

ناتوانی برق از وضع جهان بیگانه باش　　با کمال علم و دانش اندکی دیوانه باش
هر دو عالم را بیک جا خواستن دیوانگی است　　یا ز حق بیگانه شو یا از جهان بیگانه باش
آبرو از درگهش با چشم گوهر بار خواه　　غوطه زن در قلزم دل گوهر یکدانه باش
کاهش دنیا بقدر خواهش دل می دهند　　گر سکون قلب خواهی از هوس بیگانه باش
گر اماں خواهی ز گلچینها، گوشه عزلت بگیر　　دور از صحن گلستان چون گل ویرانه باش

عبد الرحمن ذکائی

در طواف شمع ارمان صورت پروانه باش　　هر چه بادا باد لیکن در طلب مردانه باش
کاروان در کاروان غمهاست دنبال خرد　　عافیت خواهی اگر خود ساخته دیوانه باش
اشتیاق یار کی گنجد به قلب پُر هوس　　گر ز ساقی چشم می داری تهی پیمانه باش
شوق شهرت مرد را بی مغز و رسوائی کند　　در جهان گمنام یا نسیان زده افسانه باش
گر ذکائی توده اکسیر احمر بایدت　　پایمال ناز ساقی بر در میخانه باش

عاتق شاہ

کالی رات

وہ جیسے ایک چیخ تھی جو مجھے رات کے سینے کو چھیدتی ہوئی سنائی دی یا پھر وہ ایک بم تھا جو میرے سرہانے پھٹ پڑا۔ یا پھر وہ عجیب و غریب منتر تھا جس نے میرے دل کے پنڈولم کو ایک ثانئے کے لئے ٹھہرا دیا۔ لیکن دوسرے ثانئے وہ حسب معمول ٹِک ٹِک کرنے لگا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ ٹِک ٹِک ——

اور سچ تو یہ ہے کہ بہت کچھ ہوا تھا۔ ملیسے نہ بم پھٹا تھا۔ نہ کوئی چیخا تھا اور نہ کسی نے مجھ پر جادو کیا تھا۔ وہ رات پچھلی اور راتوں کی طرح بڑی پُرسکون تھی اور میں بڑے اطمینان سے سو رہا تھا۔ لیکن کسی نے رات کے دو بجے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ میں نے دیکھا ذکیہ پاس ہے اور میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی ہے۔

"اوہو تم کتنا مدہوش سوتے ہو۔ سنو تو باہر دروازے پر کوئی کب سے کھٹکا دے رہا ہے۔"

میں چونک کر اٹھ بیٹھا اور اپنے دل کو پکڑے ہوئے اس آواز کو سنتا رہا جو زنجیر کے بجنے سے پیدا ہو رہی تھی۔ پھر میں کمرے کا دروازہ کھول کر انگنائی میں آیا۔ رات برفیلی اور کالی تھی۔

"سنو تو ——"

یہ کہتے ہوئے ذکیہ میرے پیچھے آئی اور پھر مجھ سے پوچھنے لگی ——

"بھلا بتاؤ تو کون ہوگا اتنی رات گئے!"

مسکراتے ہوئے میں نے اس سے کہا ——

"تم گھبراؤ نہیں۔ کوئی آدمی ہی ہوگا۔ شیطان نہیں ——"

اس بار ذکیہ کھل کھلا کر ہنس دی اور میں نے محسوس کیا جیسے دور دور تک چاندنی پھیل گئی ہے اور رات کے سرد جسم میں کھولتا ہوا گرم گرم خون تیز دوڑنے لگا ہے۔ ذکیہ نے ایک ایسے لہجے میں جس میں کچھ ہنسی اور کچھ حیرانی تھی مجھ سے کہا ——

"واہ میں گھبراتی کہاں ہوں۔ میں تو حضور کی گھبراہٹ سے فکرمند ہوں کہ آخر بات کیا ہے۔ دیکھئے نا صرف ایک کھٹکے سے آپ کے چہرے کا رنگ کیسے اڑ گیا۔"

پھر ذرا توقف کے بعد وہ ہنس کر بولی ——

"جیسا چوہا بلی کی آواز سن کر اور چور پولیس کا نام سن کر کانپ جاتا ہے ویسے ہی میرے سرکار آپ کا حال ہے۔"

ذکیہ نے میری حیرانی کی پھڑکتی ہوئی رگ پر بڑے نفسیاتی انداز میں انگلی رکھ کر اسے اور بھڑکا دیا تھا۔ اس بار پھر میرا دل بجتی ہوئی زنجیر کے شور میں ڈوب ڈوب گیا اور میں جیسے اسے ٹٹولتے ہوئے زبردستی مسکرایا اور دل ہی دل اس سے کہا ——

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں دنیا میں صرف ایک چیز سے ڈرتا ہوں اور وہ ہے رات کے وقت دروازے پر

کسی کا کھٹکا دینا شاید تم نہیں جانتیں کہ کھٹکے کے ساتھ ہی میرے دل کی رفتار کئی سو گنا تیز ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کھٹکے کے ساتھ میری زندگی کی کئی ناخوشگوار یادیں وابستہ ہیں:

"سنو ایک ایسی ہی کالی رات جب کہ کسی نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے اطلاع دی تھی کہ میری بہن بیوہ ہو چکی ہے اور وہ اپنے شوہر کی لاش کو لئے میرا انتظار کر رہی ہے۔ ایک ایسی ہی رات تھی جب کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے بتایا تھا کہ میرے عزیز دوست محسن کا انتقال ہو گیا۔ ایک ایسی ہی سرد اور کالی رات تھی جب مجھے معلوم ہوا چپ چپ رہنے والی آپا بیگم اپنی زندگی اور کنوارے پن کی تمام محرومیوں کو لئے ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئیں ——

سوچتا ہوں تو کئی چہرے آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں اور ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان سب کی موت کی اطلاع میں نے رات ہی میں سنی۔ اس وقت بھی رات ہے۔ اور کھٹکا اسی انداز سے ہو رہا ہے۔ ضرور کوئی مرا ہے۔ مگر کون مرا ہے۔ اے خدا تو رحم کر۔ ہوائیں چپ تھیں۔ رات کے کالے اور سرد ہاتھ صرف میرے جسم تک نہیں بلکہ روح تک پہنچ چکے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے پاس ہی اب کوئی بم پھٹ پڑے گا —— اور میں ——

میں عجیب و غریب خوف کو لئے دروازے کے پاس گئی۔ زنجیر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دروازے پر جھولتے ہوئے کراہنے لگی۔

آخر بڑا دل کر کے میں دروازہ کھول ہی دیا

میں نے دیکھا، نہیں پہلی نظر میں، میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ شاید دوسری یا تیسری نظر میں، میں نے دیکھا چھوٹے بھائی مسکراتے ہوئے میرے سامنے کھڑے ہیں ——

چھوٹے بھائی تو نام کے چھوٹے بھائی تھے۔ ورنہ وہ ہم سے بڑے تھے۔ انھوں نے ہمارے بچپن کو دیکھا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ چاکلیٹس اور لاسینجرس تقسیم کر کے بچوں کو فوراً اپنا دوست بنا لیتے تھے۔ یہی نہیں ان کے پاس ایک بہت خوبصورت البم تھا جس میں دنیا بھر کے جانوروں کی تصویریں تھیں۔ میری ان کی دوستی کی وجہ نہ چاکلیٹس تھے اور نہ رنگ برنگی لاسینجرس اور نہ وہ البم، بلکہ ان کی ایک چھوٹی انگلی تھی جو انگوٹھے کے بازو سے نکل آئی تھی۔ میں اس انگلی کو غور سے دیکھتا، اسے چھوتا اور پھر اسے مروڑتے ہوئے پوچھتا ——

"کیا تکلیف ہوتی ہے چھوٹے بھائی"

چھوٹے بھائی مسکراتے اور ایک قہقہہ لگا کر کہتے ——

"نہیں! بالکل نہیں ——"

لیکن میرے لئے یہ بڑی حیران کن بات تھی اور بچپن میں چھوٹے بھائی سے جو محبت اور ایک خاص قسم کی دلچسپی تھی اس میں اس انگلی کو بڑا دخل تھا اور میرے نزدیک یہی ان کی بڑائی کی نشانی تھی۔ اس وقت تو میری آرزو تھی کاش میری بھی چھ انگلیاں ہو جاتیں۔ آخر کوئی تو خاص بات ہو جو دوسروں سے الگ کرے ——

وقت کی ٹرین ہفتوں، مہینوں اور برسوں کے اسٹیشنوں پر رکتی رکاتی دور دور تک چلی گئی۔ چھوٹے بھائی اب بیوی بچے والے ہو گئے لیکن پھر بھی میرے لئے وہ وہی چھوٹے بھائی تھے اور میرے ذہن پر اب تک ان کی بڑائی کی چھاپ تھی۔

بجائے اس چھوٹی انگلی کے اب ان کا پورا ہاتھ میری توجہ کا مرکز تھا۔
میں اکثر ان کے ہاتھ کے بارے میں سوچا کرتا۔ آخر اس گندمی رنگ کے گوشت سے ابھری ہوئی ہتھیلی والے ملائم ہاتھ میں حرارت کہاں سے آگئی جو اپنے ملنے والوں میں یقین کی قوت پیدا کرتا تھا۔ وہ ہاتھ جو لوگوں کے آنسو پونچھتا تھا، چھوٹوں کے سر پر شفقت بن کر مسکاتا، بیواؤں کی دستگیری کرتا، یتیموں کی مدد کرتا اور غریبوں کی اس طرح دستگیری کرتا تاکہ دوسرے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہونے پاتی۔ وہ ہاتھ کوئی پیغمبر کا نہیں تھا، کسی ولی کا یا فرشتہ کا نہیں تھا اور نہ وہ ہاتھ اس صدی کے کسی حاتم طائی کا تھا۔ وہ ہاتھ آپ کی، میری طرح، ایک آدمی کا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ وہ ہاتھ بولتا تھا، باتیں کرتا تھا اور دوسروں کی خاموش زبان کو سمجھتا تھا ـــــ

ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں بیٹھا چھوٹے بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب آئے۔ وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا زندگی کے میدان کے بری طرح پچھڑے ہوئے مہرے ہیں، جنھوں نے اپنی ساری چالیں ایک ایک کر کے کھو دی ہیں۔ چھوٹے بھائی ان سے بڑے تپاک سے ملے اور مجھ سے معافی مانگ کر ایک لمحہ کے لئے اندر گئے۔ واپس آنے پر میں نے دیکھا نئی قمیص ان کے جسم پر نہیں جیسے وہ ابھی ابھی پہنے ہوئے تھے۔ پھر چھوٹے بھائی ان صاحب کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ میں سمجھا شاید باتیں کرنے کے لئے۔ لیکن جیسے ہی ان دونوں نے کمرے میں قدم رکھا ویسے ہی وہ الٹے پاؤں باہر نکل آئے جیسے انھیں باتیں کرنا نہیں تھا بلکہ کمرے کو چھو کر آنا تھا یا میری نظروں کی زد سے بچنا تھا۔ غرض پھر میں نے دیکھا چھوٹے بھائی مسکراتے ہوئے انھیں چھوڑنے کے لئے پھاٹک تک جا رہے ہیں ـــــ

"کون تھے وہ صاحب؟ ـــــ چھوٹے بھائی کے آتے ہی میں پوچھ بیٹھا۔
"میرے ایک دوست" ـــــ مسکراتے ہوئے انھوں نے جواب دیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ دوسرے یا تیسرے ہی روز میں نے ان کے دوست کو شراب کے نشے میں دھت سڑک پر جھگڑا کرتے دیکھا۔ ان کے جسم پر وہی قمیص تھی جسے میں چھوٹے بھائی کو پہنے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اب وہ برسوں پرانی معلوم ہو رہی تھی۔
ان کے دوستوں میں اچھے، برے، بڑے چھوٹے، بچے جوان اور بوڑھے غرض ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ میں نہیں جانتا وہ دوستوں کے اس جمگھٹ سے کبھی گھبرائے یا نہیں لیکن تنہائی میں انھوں نے کبھی نہ کبھی دوستوں کی اس لمبی فہرست پر ضرور نظر ڈالی ہوگی اور مجھے یقین ہے انھیں سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملا ہوگا۔ وہ جانتے تھے لوگ ان سے نہیں بلکہ ان کے ہاتھ سے پیار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا ہاتھ ہر ایک کے لئے کھلا تھا۔ چھوٹے بھائی کے اس کرشش ہاتھ میں میں نے ہمیشہ پیسہ دیکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مالدار آدمی تھے یا ان کے نام پر بزرگوں کا چھوڑا ہوا کچھ بنک بیلنس تھا ـــــ یا انھوں نے بلیک مارکٹ سے اتنا کما لیا تھا کہ انھیں پیسے کی کچھ پرواہ نہیں تھی بلکہ خاندان والوں کے خیال میں ان کے ہاتھ میں برکت تھی اور ہاتھ میں برکت اس لئے تھی کہ وہ اپنے پاس کچھ رکھنے کے قائل نہ تھے۔ دے کر خوش ہونا اور لٹا کر مسکراتے رہنا شاید ان کی ہابی تھا۔ وجہ کچھ ہو لیکن ان کے ہاتھ میں کوئی ایسی خاص بات ضرور تھی جو دوسروں کو نصیب نہ ہو سکی۔ ان کے تمام دوست اور قریب سے جاننے والے اس بات پر پوری طرح متفق تھے کہ ایسا کھلا ہاتھ انھوں نے زندگی میں کم دیکھا ہے۔
دوست کیا دشمن بھی، اگر واقعی ان کا کوئی دشمن تھا تو وہ اس خصوصیت کا معترف ہوگا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا ان کا کوئی دشمن

بھی ہوگا — کیونکہ وہ اتنے نیک تھے کہ ان سے صرف محبت ہی کی جاسکتی تھی — نفرت نہیں —

جب کبھی میں نے چھوٹے بھائی کا تصور کیا ہے۔ مجھے ان کے وجود کے اطراف پھیلی ہوئی ٹھنڈی چھاؤں ہی نظر آئی جو زندگی کے تھکے ہارے مسافروں کو کچھ دیر سستانے کا موقع فراہم کرتی تھی۔ وہ اتنے بے ضرر تھے کہ میں نے انھیں کبھی ایک بچے کو بھی مارتے نہیں دیکھا اور نہ کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ اگر اتفاق سے وہ کسی کو ڈانٹ دیتے یا وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتے کہ انھوں نے کسی کا دل دکھایا ہے تو وہ فوراً اس سے معافی چاہ لیتے —

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک صبح جب میں ان سے ملنے گیا تو میں نے دیکھا چھوٹے بھائی اسمٰعیل سے معافی چاہ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں —

"بھائی میں دل کا مریض ہوں۔ کبھی کبھی طبیعت آپے سے باہر ہوجاتی ہے۔ اگر اس جھنجھلاہٹ میں میں نے تم سے کچھ کہا ہو تو مجھے معاف کردو — اچھا کہو تم نے مجھے معاف کردیا —"

اس کے بعد میں نے دیکھا چھوٹے بھائی، اسمٰعیل سے گلے مل رہے ہیں اور اسمٰعیل نہ ان کا کوئی دوست تھا نہ رشتہ دار، اسمٰعیل ان کا صرف ملازم تھا —

رات سرد تھی۔ دائیں بائیں اندھیرا تھا۔ پیچھے ذکیہ تھی اور سامنے چھوٹے بھائی کھڑے مسکرا رہے تھے —

میں اس مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ گیا۔ آج ہی شام کو میں چھوٹے بھائی کے یہاں کھانے پر مدعو تھا۔ لیکن کسی بات پر میں ناراض ہو کر چلا آیا اور اب وہ مسکراہٹ مجھے منانے آئی تھی۔ مجھے سمجھانے آئی تھی — اور مجھ سے کہہ رہی تھی —

"تم خواہ مخواہ دعوت سے روٹھ کر چلے آئے، اگر کسی بدتمیز نے تم سے کچھ کہا تھا تو تم مجھ سے کہتے اور دیکھتے کہ میں اسے ایک مجرم کی طرح تمہارے سامنے لاکر کھڑا کردیتا۔ تم چاہتے تو اسے بخش دیتے یا سزا دیتے۔ لیکن میرے اچھے بھائی تم مجھ سے ناراض ہو کر میرے گھر سے کیوں چلے آئے — چلو میں اب تک تمہارے انتظار میں بھوکا پیاسا بیٹھا ہوا ہوں —"

مسکراہٹ جو مجھ سے کہہ رہی تھی!

"چھوٹے بھائی —"

میں جیسے بڑبڑایا — اور پھر ان سے ملنے کے لئے آگے بڑھا — لیکن وہاں چھوٹے بھائی کہاں تھے۔ وہاں کوئی اور تھا۔ ان کا قاصد، ان کا بھائی، ان کا ملازم —

"کہو اسمٰعیل کیا بات ہے؟"

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ لیکن اسمٰعیل اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس کا ایک پیر زمین پر اور دوسرا ہوا میں تھا اور وہ یوں کانپ رہا تھا جیسے درخت کا کوئی پتہ۔ پھر اس کے ہونٹ کانپے، اس کا دل کانپا اور پھر اس نے بھرائے ہوئے گلے سے کہا۔

"چھوٹے صاحب مرگئے —"

ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پاس ہی کڑکڑاتے ہوئے کہیں بجلی گری ہے۔ کوئی زور سے چیخا ہے اور پورے محلے کے، شہر کے گھروں پر کوئی ایک ساتھ کھٹکا دے رہا ہے، حالانکہ اس وقت چاروں طرف سناٹا تھا — اور آسمان پر بادل چلتے چلتے رک گئے تھے!

حسن عسکری کاظمی

آرٹ

اس قتل سے میرا صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ قاتل کو میں نے ہی قتل کرنے کے لئے اُکسایا تھا اور بس۔

مگر میں نہیں جانتا تھا کہ قتل ہو ہی جائے گا اور دوسرے دن صبح سڑک کے کنارے دور کھیتوں میں جہاں ابتدا ہے مجھے لاش دیکھنی نصیب ہوگی۔

کبھی کبھی باتیں کس طرح شروع ہوتی ہیں اور خدا نہ کرے کتنا خطرناک ہوجاتا ہے۔ مذاق سنجیدہ ہوتا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک دن تصویر والے سے بات بڑھتے بڑھتے مرنے مارنے پر ختم ہوگئی۔

تصویر والا میرا بہت گہرا دوست ہے۔ اس کی دوستی کو میں لفظوں کی گرفت میں نہیں لاسکتا۔ بس جیسے پھول سے خوشبو نہیں جدا کی جاسکتی۔ وہی کچھ رشتہ ہمارے درمیان بھی قائم تھا۔ یعنی ہم نے بھی جینے کی قسم کھائی تھی کہ کبھی جدا نہ ہوں گے۔

یہی تصویر والا بہت اچھا آرٹسٹ ہے۔ اس کے آرٹ میں زندگی ہے۔ اور دھنک کے دھنکتے ہوئے رنگوں کی سی رنگینی ہے موسم بہار میں جھرنوں اور پرندوں اور بیل بوٹوں کے چہکنے کی سی موسیقی ہے سیپ کی گود میں پلتے ہوئے موتی کی سی حرارت موجود ہے۔ حسن ہے سادگی ہے۔ اور وہ سب کچھ ہے جو کچھ زندگی میں ہے۔ اسی لئے اس کی تصویروں سے میں اکثر تنہائی میں بات کرتا رہتا ہوں۔ اپنا دل بہلاتا رہتا ہوں۔ اور اپنا دل دے آتا ہوں۔ مسکراتی۔ گنگناتی۔ اداس اور خاموش تصویریں میرا دل لے لیتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان بیجان تصویروں کے سہارے یہ دل تصویر والا کر لے جائے گا۔

اس دوستی کو نہ جانے کتنے برس ہو چکے ہیں۔ کنچن جنگا کی سفید۔ نیلی چٹانوں کی طرح آج بھی یہ دوستی ویسی ہی قائم ہے۔ میں نے اس کا ہر جگہ ساتھ دیا ہے۔ وہ رویا ہے تو میں بھی رویا ہوں۔ وہ ہنسا ہے تو مجھے بھی بے ساختہ ہنسی آگئی ہے۔ جیسے نسیم سحری کے چلتے ہی پھول خود بخود مسکرا اٹھتے ہیں۔ ماضی کی ان تصویروں میں۔ بہت سے ایسے لمحے ملتے ہیں جہاں ہم اپنا دل تھام لیتے ہیں۔ انھیں لمحوں میں ایک لمحہ ایسا ہی ہے جو کبھی بھولا نہیں جاسکتا۔

شام کا وقت تھا۔ آسمان پر سرخ، اودے انار پھوٹ رہے تھے اور چاروں طرف خوش رنگ رنگوں کی بارش ہو رہی تھی۔ جیسے فضا کو خلعت پہنائی جا رہی ہو۔ اور دریا کے کنارے کنارے سبزہ سرخ پانی میں اس طرح ہچکولے کھا رہا تھا کہ جیسے روح کی گہرائیوں میں اتر جائے گا۔ نہ جانے دور کہیں ہلکے ہلکے سروں میں کوئی لڑکی ایک گیت گا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے مانند قافلے ہم اس آواز کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ تصویر والا پر نہ جیسے مدہوشی کے لئے ساغر لوٹ پڑے ہوں۔ گم سم اس نے تو

جیسے اپنے آپ کو اس مدہوش کن فضا کے سپرد کر دیا ہو ۔ میں نے اسی کا شانہ جھنجھوڑا ۔ مگر اس کی آنکھیں دور اس لڑکی پر ٹکی ہوئی تھیں جو گھنٹوں تک ہنگے کو اٹھائے جھلملاتے پانی میں اپنی خوبصورت پنڈلیوں کو تیرا رہی تھی ۔ گورے گورے پیر وینس جیسے نازک اور حسین ۔ اور ان پہ آسمان سے اترا ہوا شفق رنگ ۔ جیسے امرد حسن کی ملکہ ۔ اور گلے سے نکلتی ہوئی کوئل کی سی چہک ۔ رہ رہ کے یہی خیال ہوتا ۔ کاش ایک انسان کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ وہ بیک وقت رنگ روپ، آواز، موسیقی اور سماں میں گھلی ہوئی حرارت پہونک کو قابو کر سکتا ۔ میں نے تصویر والا سے شانوں کو دوبارہ جھنجھوڑا ۔ مگر وہ تو ماحول میں پھیلے ہوئے ہنر، دوں درختوں کی طرح خود بھی بے حس و حرکت کھڑا تھا ۔ اور اس لڑکی کو جیسے کچھ خبر نہ ہو ۔ ساری دنیا سے بے پرواہ وہ گائے جا رہی تھی ۔

اے مرے ساتھی آ ۔

اور اس پار جہاں

نیلے دریا کا پانی ۔ بے بس ۔

آکاش کے سرخ رخساروں کو چوم رہا ہے ۔

مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں لے چل ۔

اس لئے کہ وہاں میری دھڑکنیں

اور میری روح

اور میرا بانکپن

قید ہے ـــــــــ

اور پھر تصویر والا کو میں نے جھنجھوڑ دیا ۔ جیسے خواب سے کسی نے بیدار کر دیا ہو ۔ وہ چونک پڑا ۔ شرمندہ شرمندہ سا میری طرف دیکھتا رہا ۔

منظر کی گوناگوں لطافتوں میں وہ کھو گیا تھا اور ملکوتی حسن کا جادو اس پر چل چکا تھا ۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ۔

" کہو تو اس لڑکی کو لاکر تمہارے قدموں پر ڈال دوں "۔

اور وہ اداس ہو گیا ۔ اس نے میری درخواست کو ٹھکرا دیا ۔

" نہیں ۔ میں اسے خود ایک دن تمہارے پاس لے آؤں گا "۔

اور پھر ہم گھر لوٹ آئے ۔ تصویر والا کچھ اتنا اداس اور کھو گیا تھا کہ پھر کوئی بات نہ ہو سکی ۔

اس کے بعد بھی کئی روز تک اس سے ملاقات نہ ہوئی ۔

اور پھر آج سویرے، سورج کی کرنیں ابھی پھوٹ رہی تھیں وہ کسی قدر پریشان، بال بکھرائے، اور داڑھی کے بال پھینکے ہوئے دیوانی تیر کی طرح آئے اور ہونٹ سیئے ہوئے میرے یہاں آ گئے ۔

میں نے اس کی ایسی حالت کبھی اور نہیں دیکھی تھی ۔ میں سہم گیا ۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا ۔ اور گھسیٹتا ہوا نہر سے دور، دریا کی طرف لے چلا ۔ دریا آچکا تھا اور اس کے کنارے کنارے ہم خاموشی بڑھتے چلے جا رہے تھے ۔ ایک جگہ پہونچ کر میں سہم اٹھا ۔ لاتعداد تصویریں ۔ کینوس پر اور سوکھی تصویریں اور رنگ بکھرے پڑے تھے ۔ اور ان کے پاس گھاس پر سفید چادر پڑی تھی ۔ ایسا معلوم

(بقیہ صفحہ پر)

سب رنگ

(اس عنوان کے تحت اردو کے معیاری رسالوں سے بہترین تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے ——— ادارہ)

مولوی عبدالحق ——— زندگی کے سات دور

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز حیدرآباد ہی میں ہوا۔ وہ علی گڈھ سے گریجویٹ ہو کر نکلے تھے کہ حیدرآباد کی افواج باقاعدہ میں ان کو ملازمت مل گئی۔ اور ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو دیکھ کر سر افسر الملک مرحوم نے بجائے فوجی کام پر مامور کرنے کے ایک ادبی رسالہ "افسر" نکلوا کر اس کی ادارت کا کام مولوی صاحب کے سپرد کیا۔ یہ گویا پہلی تربیت گاہ تھی جہاں مولوی صاحب نے انشا پردازی اور صحافت کے گر سیکھے اور اس کے بعد رسالہ "حسن"، "دکن ریویو" اور "مخزن" وغیرہ میں انھوں نے مضامین لکھنے شروع کئے۔

حیدرآباد میں مولوی عبدالحق صاحب کی زندگی کا دوسرا دور دفتر معتمدی امور عامہ میں بہ حیثیت مترجم شروع ہوا۔ یہاں ان کو مولانا ظفر علی خاں کے نقش قدم پر چلنے کا موقع ملا اور یہیں سے انھوں نے دفتری کارروائیوں کے وہ طور بھی سیکھے جن سے واقفیت کے باعث ان کی زندگی نواب مسعود جنگ اور سر اکبر حیدری کے عروج کے زمانے میں ملازمت اور اقتدار کی ترقیوں کی انتہا پر پہنچ گئی۔

دکن میں مولوی عبدالحق کی زندگی کا تیسرا دور اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ ان کے انتہائی عروج اور اطمینان کا تھا۔ بی بی کے روضہ کی عظیم الشان شاہی عمارت اور باغ اور اس سے متصل چھوٹے سے محل نما بنگلے میں ان کی بادشاہت تھی۔ یہیں انجمن ترقی اردو کا پریس چلتا تھا اور یہیں سے مولوی عبدالحق کی علمی اور تنظیمی قابلیتوں کا سکہ پورے ہندوستان میں رائج ہو گیا۔

یہیں انھوں نے مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں وہ عالیشان تقریب منائی جس میں شرکت کے لئے ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے مشاہیر علم و ادب جمع ہوئے اور حیدرآباد سے سر اکبر حیدری صدر اعظم اور ریاست کے اکثر و بیشتر عہدہ دار اور مشاہیر علم و ادب سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں اورنگ آباد پہنچیں اور وہیں ان کی ملازمت میں پے بہ پے ترمیمیں کی گئیں جو حیدرآباد میں شاید ہی چند اور لازمین محکمۂ تعلیمات کو نصیب ہوئی ہوں۔

مولوی صاحب کی زندگی کا چوتھا اور حیدرآباد کا آخری دور مولانا وحید الدین سلیم کی وفات کے بعد حیدرآباد میں دوبارہ آمد اور بہ حیثیت صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ مامور ہونے سے شروع ہوا۔ بہ حیثیت پروفیسر جامعہ عثمانیہ ان کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی اور اسی کی بنا پر انھوں نے حیدرآباد کی دنیا کو اپنے لئے بہت تنگ محسوس کیا اور اس کوشش میں کامیاب ہو گئے کہ انجمن ترقی اردو کا دفتر اور خود ان کا مستقر ہندوستان کا پایہ تخت دہلی قرار پائے۔ حیدرآباد کے کم دوست حلقے مولوی صاحب کے دہلی منتقل ہونے کی مسلسل مخالفت کرتے رہے لیکن مولوی صاحب کے ہندوستان کے مرکز سے اردو کی خدمت کرنے کا خیال مستحکم ہو چکا تھا اور آخر کار وہ اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔

ان کی زندگی کا پانچواں دور کوٹھی نمبر (۱) دریا گنج دہلی میں بسر ہوا مگر وہاں ان کو حیدرآباد جیسا اطمینان نصیب نہ ہو سکا۔ ابھی انجمن ترقی اردو کا دفتر اور کتب خانہ پوری طرح جمنے بھی نہ پایا تھا کیونکہ مولوی صاحب کو انجمن کی عمارت بنانے کے لئے دہلی کے ایک عمدہ علاقے میں بہت بڑی زمین حاصل ہو گئی تھی

اور اس کے لئے وہ کافی سرمایہ بھی جمع کر چکے تھے) کہ آزادیٔ ہند اور اس کے پیدا کردہ نتیجوں نے مولوی صاحب کو دہلی چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں تمام عمر حیدرآباد کا جمع کیا ہوا بیش بہا ادبی ذخیرہ یا تو جل گیا یا لوٹ لیا گیا۔ جو کچھ بچ سکا تھا اس میں سے نایاب قلمی کتابیں مولوی صاحب اپنے ساتھ کراچی لے جا سکے۔

کراچی میں ان کو ہندوؤں کا چھوڑا ہوا ایک بہت بڑا دارالاقامہ ان کے اور انجمن ترقی اردو کے لئے حاصل ہو گیا جس میں انھوں نے پھر سے انجمن کا دفتر اور کتب خانہ قائم کر لیا اور ایک اردو کالج کی بھی بنا ڈالی۔ یہ ان کی زندگی کا چھٹا دور تھا لیکن یہ دور بہت مختصر ثابت ہوا۔ مولوی صاحب کے بعض خود غرض اور خراب ساتھیوں کی وجہ سے ان کو وہاں بڑی بدنامیاں اور بے عزتیاں سہنی پڑیں یہاں تک کہ انجمن کا کتب خانہ اور دفتر ان کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ وہ صرف ایک کمرے میں سیاسی قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے کہ ان کی اور اردو زبان و ادب کی خوش قسمتی سے پاکستان میں ایک فوجی انقلاب نمودار ہوا۔

اس فوجی انقلاب اور مارشل ایوب خاں کی ملاقات کے بعد مولوی صاحب کی زندگی کا ساتواں دور شروع ہوتا ہے۔ ایوب خاں کے سامنے مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے کاموں سے اس شعر کے ساتھ دست برداری پیش کر دی کہ ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

ایوب خاں پر مولوی صاحب کی ضعیفی، دیرینہ خدمات اور پریشان حالی کا بڑا اثر ہوا اور انھوں نے فوراً ان صاحبوں کو انجمن کی عمارت سے نکلوا دیا جنھوں نے مولوی صاحب کی زندگی دشوار کر دی تھی اس کے علاوہ پاکستان کے اعلیٰ ترین اعزازات اور نقد انعامات عطا کر کے مولوی عبدالحق کو دوبارہ جوان بنا دیا۔ حکومت کے اس رنگ کو دیکھ کر پاکستان کی وہی صحافت جو مولوی صاحب پر ہر روز حملے کیا کرتی تھی اور شائستگی سے گرے ہوئے الزامات لگایا کرتی تھی اب ان کی مداح پیرائی پر اتر آئی ——— (اقتباس)
از ڈاکٹر زور ——— (منقول از مجلس حیدرآباد)

یہ ستارے

دن تو آلام کا میلا ہے سو کٹ جاتا ہے
چھپ کے رو لیتا ہوں، محفل میں چہک لیتا ہوں
(کتنی صدیوں سے یہی ہے مِری دنیا کا چلن)
شب کو لیکن یہ ستارے نہیں سونے دیتے
سوچتا ہوں مرے دل میں تری یادوں کی طرح
سینۂ شب پہ ستارے ہیں کہ زخموں کے چمن
کون جانے کہ پس پردۂ ظلمات ہے کیا
اور پس پردۂ ظلمات ستارے ہی تو ہیں
یہ ستارے غم پنہاں کے اشارے ہی تو ہیں

از۔ احمد ندیم قاسمی (نقوش)

ترکیبی ادب

ظاہر ہے یہ ترکیبی ادب کی ترکیب آپ کو کچھ انوکھی سی معلوم ہو گی۔ آئیے پہلے اس کے معنی سمجھ لیں، پھر آگے قدم بڑھائیں ترکیبی کا لفظ کیمسٹری کی زبان میں اس چیز کے لئے آتا ہے جو قدرتی طور پر حاصل کرنے کی جگہ مصنوعی طور پر پیدا کی جائے۔ جیسے ہم ربڑ کو انڈیا ربڑ نام کے پودے سے نکالنے کی جگہ مصنوعی طریقے سے لیبوریٹری میں تیار کریں تو وہ ترکیبی ربڑ کہلاتی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ دوسری عالمی لڑائی کے زمانے میں جرمنی کے سائنسداں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ صاحب انھوں نے تو جادوگروں کے بھی کان کاٹے۔ جس چیز کی چاہیں الٹ پلٹ کر کچھ سے کچھ کر دیں، حد ہو گئی کہ آدمی کے بالوں سے غذا بنا ڈالا۔

سچ پوچھئے تو ہمارے دیس کے ادیب اور شاعر بھی ایسا

میدان میں جرمنی کے سائنسدانوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہمارا اشارہ یہاں رسی کا سانپ، میل کا بیل، رائی کا پربت بنانے یا اتنی سی بات کو افسانہ کر دینے کی طرف نہیں ہے جو ہمارے پرانے سخنوروں اور سخن سازوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جس چیز کا ہم یہاں ذکر کرنا چاہتے ہیں وہ نئے شاعروں اور ادیبوں کا کمال ہے جنھوں نے سوکھے سے میں قدرتی ادب کی ایج گھٹتی دیکھ کر نہ جانے کتنا ترکیبی ادب بنا کر تیار کر دیا اور منوں کے حساب سے بازار میں بھیجنے لگے۔

قدرتی ادب اور ترکیبی ادب کے فرق کو یوں سمجھئے کہ ایک خون پسینے کی کھیتی ہے اور دوسرے میں ہتھیلی پر سرسوں جمتی ہے۔ قدرتی ادب پیدا ہونے میں دنیا بھر کے بکھیڑے ہیں۔ زرخیز طبیعت کی زمین ہو۔ ریاضت کے ہل سے جوتی جائے۔ اس میں خیال کا بیج پڑے۔ زندگی کے مشاہدے سے کھاد پڑا اور روشنی پہنچے۔ آرٹ کے اپنے ہوئے سوتوں سے سینچائی ہو۔ تب جاکر کہیں شعر و ادب کی کھیتی اگے اور اس سے وہ غذا حاصل ہو جس کی ہماری روح کو ضرورت ہے۔ ترکیبی ادب کا بڑا سہل نسخہ ہے۔ ولایت سے انگریزی، فرانسیسی جرمن، روسی ادب کے رنگ برنگ اور مزے مزے کے ست منگا کر رکھ لئے۔ جب جی چاہا انھیں الگ الگ یا ملا جلا کر اپنی زبان کے عرق میں گھولا اور ذرا آنچ دکھائی، لیجئے ترکیبی ادب تیار ہو گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ ہمارے دیس کے پڑھنے والوں کے گلا تلے یا نہ اترے۔

کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں ادب میں لین دین کو ایک سرے سے برا سمجھتا ہوں۔ یہ سلسلہ تو دنیا کی تاریخ میں شروع سے چلا آرہا ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا کہ ایک قوم دوسری قوم کے ادبی خزانوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس کے ادبی تجربوں سے سبق لیتی ہے۔ رومیوں نے یونانیوں سے علم اور حکمت کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی بہت کچھ پایا۔ اسی طرح نئے زمانے کی یورپی قوموں نے رومیوں اور یونانیوں سے اور ایک دوسرے سے بہت سی کام کی چیزیں حاصل کیں۔ ہماری ہندوستانی زبانوں نے بھی یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ قوموں کے ادب سے جو علم روشن خیالی اور خوشحالی کی فضا میں پلا اور بڑھا ہے، بہت کچھ لیا ہے اور ابھی انھیں بہت کچھ لینا ہے۔ لیکن لینے لینے میں فرق ہوتا ہے۔ لینے کا ایک طریقہ اپنانا ہے دوسرا نقل کرنا۔ فرض کیجئے ہم دوسری زبانوں کے ادب سے زندگی کے نئے تصور، خیال کے نئے دھارے، مشاہدے کے نئے ڈھنگ لیتے ہیں۔ اچھوتے موضوع اور اچھوتے مضمون، نرالے انداز بیان اور انوکھے طرز ادا اخذ کرتے ہیں۔ انھیں اس طرح تراشتے گڑھتے یا ڈھالتے ہیں کہ وہ ہمارے ذہن میں بیٹھ جائیں، ہمارے دل میں اتر جائیں، ہمارے خون میں مل کر ہماری رگوں میں دوڑنے لگیں۔ اب یہ پرائی چیزیں نہیں رہیں ہماری ہو گئیں۔ ہماری ذات کا جزو بن گئیں۔ جب ہم لکھنے بیٹھتے ہیں تو ہمارے قلم سے بے ساختہ ٹپکنے لگتی ہیں۔ اس طرح لینے کو اپنانا کہتے ہیں۔ اس سے ہمارا ادب بڑھتا ہے پھیلتا ہے اور اس میں نئی آن اور شان پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ حرکت جو ہم میں سے بہت لوگ آجکل کرتے ہیں کہ مغربی ادب اور خاص کر انگریزی ادب کی جو عبارت، جو خیال، جو موضوع، جو رنگ، جو انداز غرض جو چیز پسند آئی جوں کی توں جھپٹ کر حافظہ کی جیب میں ڈال لی اور موقع بے موقع نکال کر رکھ دی۔ اس کو نقل کہتے ہیں اور اسی سے وہ بے جان اور بے کیف ادب پیدا ہوتا ہے جو ترکیبی ادب کہلاتا ہے۔ ترکیبی ادب کے عجیب و غریب نمونے وہ ہیں جو ہیئت اور تکنیک کے نئے تجربوں کے نام سے ہمارے ادب میں نظر آتے ہیں۔ ہیئت جسے انگریزی میں "فارم" کہتے ہیں وہ سانچا ہے جس میں خیال یا مضمون ڈھالا جاتا ہے اور تکنیک وہ گر ہیں جن سے اس عمل میں کام لیا جاتا ہے۔ دنیا کا دستور ہے کہ ادیب یا شاعر کے ذہن میں کوئی مضمون، کوئی خیال آتا ہے پھر یہ فکر پیدا ہوتی ہے کہ اسے اچھی طرح ادا کرنے کے لئے کونسی ہیئت اور تکنیک سے کام لیا جائے۔ ہمارے یہاں معاملہ بالکل الٹا ہے۔ ہم نئی ہیئت اور تکنیک سے کام لینے کے شوق میں بے چین رہتے ہیں کہ کہیں سے کوئی مضمون کوئی خیال لے کر اس کے سانچے میں ڈھال دیں۔ ہماری مشکل یہ نہیں ہوتی کہ بیل کسی طرح منڈھے چڑھے بلکہ یہ ہوتی ہے کہ منڈھے پر چڑھانے کے لئے کسی طرح کوئی بیل ہاتھ آجائے۔

ہم اس بات کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔ کلچر کے ہر شعبے میں خاص کر ادب میں، ایک دیس کو دوسرے دیسوں سے، ایک زبان کو دوسری زبانوں سے، کچھ لے کر اپنانے کے لئے شہد کی مکھی کا نمونہ سامنے رکھنا چاہیئے جو چمن چمن، بوٹے بوٹے، ڈالی ڈالی پھرتی ہے۔ طرح طرح کے پھولوں کے رس لے کر اس طرح پچاتی ہے کہ وہ اس کے دل کے خون میں حل ہو جاتا ہے اور پھر اس خونِ دل سے وہ چھتہ بناتی ہے جس کا نچوڑ شہد بن کر زبان کو حلاوت اور دل کو سرور اور جس کا موم شمع بن کر آنکھوں کو نور بخشتا ہے۔ اگر کوئی بھانت بھانت کے پھول اکٹھے کر کے اور ان کا رس نچوڑ کر ترکیبی شہد بنا لے تو اس میں اور اصلی شہد میں وہی فرق ہوگا جو قدرتی اور ترکیبی ادب میں ہوتا ہے۔ (اقتباس)

از:۔ ڈاکٹر عابد حسین (منقول از "جامعہ" دہلی)

غزل

جان جاتی نہیں دم نکلتا نہیں یعنی ملنحاب غم کام کرتا نہیں
یہ گراں جانیاں ہیں کسی کی نہیں اور یاروں کو شکوہ کہ مرتا نہیں
تہ بہ تہ دل کے پردوں پہ ہے نقش گر تیرے گیسوئی شب نہ تیرہ کی کرن کا سحر
درد فزوں ہے ہوا اب روشن ہوئے، داغ جاتا نہیں زخم بھرتا نہیں
سب پریشان رہ کارواں کارواں، کشمکش خوش دلی کی ہوس میں رواں
یہ گزرگاہ دشت وفا ہے یہاں کوئی مجھ سے بھی پاؤں دھرتا نہیں
اس جگہ زندگی کو کھلی مات ہے، یہ فسونِ خرد کا طلسمات ہے
سانس لیتے ہیں سب ہی یہاں کاٹھ کے، کوئی جیتا نہیں کوئی مرتا نہیں
شہر غم سے بلاوا جنھیں آ گیا ہے مگر کیں ان کے پاؤں میں کیا بڑ پڑا
شاد و آباد ہے ساحل آرزو کیا تماشا ہے کوئی اترتا نہیں
روزن نور سے ایک کالو ہے دل جس سے عابد ہے نظم تماشا بھی
یوں ابد تا ابد بحر ظلمات ہے، کوئی سورج یہاں سے ابھرتا نہیں

از:۔ سید عابد علی عابد (منقول از صحیفہ لاہور)

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ سے ایک ملاقات

س۔ آپ کی زندگی کے ابتدائی حالات اور تعلیم و ملازمت کے کوائف مطلوب ہیں۔

ج۔ ؎ از نام چہ پرسی کہ مرا ننگ ز نام است
دو ز ننگ چہ پرسی کہ مرا نام ز ننگ است

ایک زمانے میں اس قسم کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے میں کہا کرتا تھا

سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بر دوشم

زندگی کی روداد مختصر طور پر شعروں ہی میں بیان ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کو شعر سے دلچسپی ہو تو یوں کہوں ؎

عاشق ہوئے اور مر گئے ہم
اپنی تو یہ مختصر ہے روداد

مگر ان شاعرانہ رموز سے زیادہ آپ کو اس وجود بے سود کے متعلق چند ٹھوس کوائف کی ضرورت ہوگی ـــ تو سنئے میں ۱۹۰۶ء میں ضلع ہزارہ تحصیل مانسہرہ کے ایک خوبصورت پہاڑی کی چوٹی پر آباد گاؤں (منگلور) میں پیدا ہوا۔ ایک زمانے میں یہاں سکھوں نے ایک گڑھی تعمیر کر رکھی تھی۔ کیونکہ یہ مقام اتنی بلند جگہ پر واقع ہے کہ یہاں سے ہزارہ کے تینوں تحصیلوں کے راستے اور رقبے پیش نظر رہتے ہیں۔ چاروں طرف نالے اور چشمے اور مرغزار اور وادیاں اور آبشاریں ہیں۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو ان کے تذکرے میرے روزنامچے (صحیفہ زندگی) میں کبھی ملاحظہ فرمالیجئے گا۔

میرے والد حکیم سید نور احمد شاہ صاحب علم اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ اپنے زمانے کے خوبصورت اور ذہین لوگوں میں سے تھے۔ بڑے ضابطہ پسند، صابر اور جابر، مگر اس فولادی کردار کے اندر نرمی و ملائمت کے انداز بھی رکھتے تھے۔ ابھی چھٹی جماعت ہی کا طالب علم تھا کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وجہ سے میری طبیعت زندگی بھر محبت کی پیاسی رہی اور اندر کا زخم کسی اور محبت سے بھر نہ سکا۔

پرائمری اپنے گاؤں میں، مڈل مانسہرہ میں، نویں جماعت ایبٹ آباد میں پاس کی۔ پھر جب کہ ابھی ٹریکشن کا آغاز ہی تھا میں

زمانے کی سب سے بڑی سیاسی تحریک "خلافت" میں شریک ہو گیا اور اسی کے سلسلے میں تعلیم کو ترک کر کے جامعہ ملیہ علیگڑھ میں پہنچا۔ ہرچند بوجوہ کچھ زیادہ دن نہ ٹھہر سکا مگر محمد علی، ذاکر حسین، عبدالمجید خواجہ، مولانا سورتی، مولانا اسلم جیراجپوری وغیرہ کو دیکھا اور سنا۔ اس سے طبیعت میں سیاست، آزادی اور علم کی لگن جاگ اٹھی۔ تحریک خلافت کے سرد پڑ جانے پر جب شیرازۂ احوال بکھر چکا تھا بے سروسامانی کے عالم میں لاہور کی مسجدوں میں عربی تعلیم پائی اور اسی ضمن میں مولانا احمد علی، مولانا غلام مرشد، حافظ محمد حسین، مولانا عبدالواحد غزنوی سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد اورینٹل کالج میں مولوی عالم میں داخل ہو کر مولانا عبدالعزیز میمن کے علم و فضل سے سیراب ہوا۔ اس کے بعد منشی فاضل اور اسی سلسلے سے صرف انگریزی کے سب امتحان پاس کر کے ۲۵ء میں ایم۔ اے فارسی کا، ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے عربی کا، ۳۵ء میں ڈپلومہ جرمن انٹرمیڈیٹ اور لائبریری سائنس کا امتحان پاس کیا۔

اورینٹل کالج سے میرا تعلق ۱۹۲۴ء سے ہے اور اسی زمانے سے پروفیسر اقبال، پروفیسر شیرانی اور پروفیسر شفیع سے یکے بعد دیگرے متعارف ہو کر بقدر استطاعت فیض یاب ہوا۔ ان سب اساتذہ کا ممنون احسان ہوں۔

میری ملازمت سب ایک ہی سلسلے کی ہے۔ قلمی کتابوں کی فہرست سازی (۲۶-۲۷)، ریسرچ اسکالرشپ (۲۷ تا ۳۴)، لائبریرین (۳۵ تا ۳۹)، لکچرار فارسی (۴۰ تا ۴۸)، لکچرار اردو (۴۸ تا ۵۰)، ریڈر اردو (تا ۵۲)، پروفیسر اردو (از ۵۳ تا حال)، پرنسپل اورینٹل کالج (از ۵۸ تا حال)۔ اس وقت میں صدر شعبہ عربی بھی ہوں اور صدر شعبہ اردو بھی ——— اور عربی فارسی اردو تینوں زبانوں کا استاد ہوں اور تینوں اداروں کا خادم۔ تینوں زبانوں کے ادب کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا بھی ہے۔

س۔ آپ ادب کا کیا تصور رکھتے ہیں۔ زندگی کے سلسلے میں اس کی کیا اہمیت ہے۔

ج۔ مناسب یہ ہوگا کہ پہلے فن پر کچھ گفتگو ہو جائے کیونکہ ادب بھی ایک فن ہے۔ یہ اس لئے کہ آج کل اس کے متعلق بہت سی پریشان خیالی پائی جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو فن، انسانی طبیعت کے ایک ناگزیر داخلی تقاضے کو پورا کرتا ہے اور اپنی اصل میں بڑی آزاد، بے ساختہ اور معصوم چیز ہے۔ یہ دراصل ان جذبوں اور خیالوں سے متعلق ہے جن کی کڑی تنظیم ممکن نہیں۔ یہ جذبے اور خیال طبع انسانی میں کچھ اس طرح اگ آتے ہیں جس طرح مرغزاروں میں خود رو پھول اگ آتے ہیں۔ شاعر یا فن کار ان پھولوں کے اگانے میں آزاد مگر مجبور سا ہوتا ہے اور بڑی حد تک خارجی جبر و قید سے بے نیاز، اندر کی تحریک سے اظہار پر مائل ہوتا ہے ——— ایسی صورت میں اس کے ارادے پر کسی خارجی مقصد کا دباؤ نہیں ہوتا۔ نہ اس کے ارادے میں خیر و شر کا کوئی جھگڑا، اچھائی برائی کی کوئی نشانی ہوتی ہے ——— وہ تو مرغزار کے اس پھول کے اندر سے خود بخود ابھرا چلا آتا ہے یا یوں کہئے شاعر کی مخصوص فطرت بے ساختہ اس کو بروئے کار لاتی رہتی ہے اور اس کے زیر اثر فن اور ادب کے پھول کھلتے رہتے ہیں۔

س ——— تو آپ کا مطلب یہ ہوا کہ فن اور ادب بلا ارادہ اور بے مقصد ظہور میں آتے ہیں؟

ج ——— جی ہاں، مگر ایک چیز کو نہ بھولئے کہ ادبی یا فنی اظہار کسی داخلی یا خارجی تحریک کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ تحریک زندگی کے شعور اور حسن کے احساس سے پیدا ہوتی ہے ——— مگر زندگی کا شعور یا حسن کا احساس، یہ دونوں چیزیں ناقابل تعریف ہیں اور ان کو عقلی تعریفوں اور تشریحوں میں مقید کرنا ممکن نہیں تو میں نے یہ کہہ دیا کہ فن اور شاعری ایک لحاظ سے وجدان و الہام کی طرح کی چیزیں ہیں جو کسی کے تابع نہیں۔ حافظ نے اسی لئے کہا تھا ؎

بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم
کہ من دل شدہ این رہ نہ بخود می پویم
در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
ہرچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

اور میں تو نظیری کی اس بات کو بھی کچھ اہمیت نہیں دیتا جس نے حافظ کی نقالی کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا ؎

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

یعنی خارج سے کوئی وجود یا شخص شاعری کرا رہا ہے — شاعری اور فن (لاکھ خارجی رنگ کے حامل ہوں) ان کی اصل داخلی، شدید داخلی ہے، وہ فطرت کی ان اتھاہ گہرائیوں سے نمودار ہوتا ہے جن کا راز خدا نے کائنات کے سوا کوئی نہیں جانتا ؎

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانڑے

س — ڈاکٹر صاحب! آپ نے فن کو بہت ہی مجرد شئے بنا دیا ہے۔ اس صورت میں اس کا خارجی زندگی سے گویا کچھ تعلق نہ ہوا۔

ج — میں عرض کرتا ہوں کہ فن کی اصل مجرد، منزہ، پاکیزہ ہے، معصوم ہے جس طرح سرچشمے کا پانی اپنے منبع میں ہر غل و غش سے پاک ہوتا ہے۔ ادب کا بنیادی سرچشمہ تحریک بھی بے لوث ہوتا ہے نیکی، حسن اور معصومیت اس کی صفات خاص ہیں۔ وہ ایک معنی میں بے نام عبودیت کے جذبے سے ابھرتا ہے، بے نام گداز سے، بے نام خودی سے، البتہ اظہار کے مراحل میں فن کار خارجی وسائل اور خارجی مواد سے کام لیتا ہے — یہ مواد ایسا ہوتا ہے جو ماحول اور سوسائٹی کے احوال سے اسے ملتا ہے۔ اس معنی میں فن یا ادب ایک شعوری، سماجی عمل بھی بن جاتا ہے اور یہیں پہنچ کر فن کار پر اخلاقی اور سوشل ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں۔ مگر اصل تحریک بے ساختہ آزاد اور معصوم ہوتی ہے۔

س — ڈاکٹر صاحب! آپ کا موسیقی، مصوری وغیرہ کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج — میرا خیال ہے کہ اگر یہ فنون اس ذوقِ عبودیت سے ابھریں یا اس بے نام اور معصوم بے خودی کا نتیجہ ہوں جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے تو فن ایک غیر جانبدار اور معصوم بلکہ پاکیزہ فعل ہے۔ موسیقی تو درکنار، مصوری کا عمل بھی ایک روحانی لگن کا نتیجہ ہے اور ذاتِ مطلق کی دریافت اور رسائی کا ایک وسیلہ ہے — یہ دراصل جستجو ہے اس ذاتِ مطلق کی جس کی تجرید، ذہنِ انسانی کے لئے معمہ بن جاتی ہے۔ اسی معمہ کی کشود، ایک مصور کی آرزو ہوتی ہے —! ذاتِ مطلق کو دیکھنے کی کوشش ہر چند کہ آپ اسے کوشش ناتمام ہی کہہ سکتے ہیں۔

" س — آپ اپنے ذاتی ذوق، مسلک اور مشرب کے متعلق کچھ بتا سکتے ہیں؟

ج — یہ سوال آپ کی طرف سے مجھ پر زیادتی ہے۔ اس سے اس لڑائی کا راز آشکار ہو جائے گا۔ جو مسلسل بیس برس سے میرے اور میرے نفس کے درمیان جاری ہے۔ میں ایک نظم پسند آدمی ہوں۔ اس کے زیر اثر میں نے اپنا ایک فلسفہ مرتب کیا تھا جسے کبھی کبھی میں میر تقی میر کے تتبع میں فلسفۂ دردمندی کہہ لیا کرتا ہوں، مگر میرا یہ فلسفہ بار بار بکھرتا رہتا ہے اور میں اسے پھر جمع کر لیا کرتا ہوں۔ دردمندی کے اس تصور میں ضمیرداری، ہمدردی، قربانی، درگزر، محبت، جام اور ذوقِ بے خودی سبھی چیزیں شامل ہیں۔ مگر کس کی محبت اور کیسی ضمیرداری! آزمائش کی دنیا بڑی آزمائش میں مبتلا رکھتی ہے اور من کی دنیا میں تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ زندگی میں میرا سب سے بڑا رفیق شعر ہے۔ میرا گنگنانا ہر جاگتے لمحے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد سب سے بڑا ندیم آسمانی دوست ہے جس کی ہمکلامی (دعا) سے بڑی تسکین ملتی ہے۔ مگر اس ایسے لمحے بھی آتے رہتے ہیں جب یہ دونوں رفیق میرا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور میں ایلی ایلی لما سبقتنی کہتا ہوا ٹہلتا پھرتا ہوں۔

س — زندگی کا کوئی دلچسپ اور سبق آموز واقعہ؟

ج — جب میری زندگی ہی بے نتیجہ ہے تو بڑا واقعہ کہاں سے آئے گا۔ البتہ چند واقعات نے گہرا اثر کیا۔ اس موقع پر صرف ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔

میں ایف۔ اے کا امتحان دے رہا تھا کہ لاہور کے بڑے کالجوں کے پرنسپلوں میں سے کوئی شخص پرائیویٹ طلباء کے فارموں پر دستخط کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مجھ سے کسی نے کہا لالہ رگھبیر دیال پرنسپل سناتن دھرم کالج سے ملو، میں گیا۔ اپنی باری پر بلایا گیا۔ کرسی پر سے ایک شخص اٹھا۔ وہ دست بستہ ہنستے کہا بیٹھایا، فارم لیا۔ دستخط کئے اور کہا کاکا جی! جب بھی کوئی کام ہو

بے تکلف آجایا کرو۔ پھر بڑے انکسار سے دوبارہ شکریہ کہا اور رخصت کیا۔ — ! میں جو کہ پندرہ روز سے بڑے بڑے پرنسپلوں کے دفتروں کے سامنے دھکّے کھاتا رہا تھا۔ حیرت زدہ ہوا اور سوچنے لگا۔ شائستگی ہو تو منصب اور انکسار کا اجتماع ممکن ہے۔ واقعہ معمولی ہے مگر مجھ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔

س ۔ ڈاکٹر صاحب! زندگی کی کوئی آرزو؟

ج — بھئی آرزوئیں تو بہت ہیں مگر ایک آرزو ہے جو اکثر جان و دل میں بسی رہتی ہے اور وہ یہ کہ کاش میں اپنی زندگی میں دس پندرہ سطریں ایسی لازوال لکھ جاؤں جو انسانی دکھ درد میں کسی مورِ ناتواں کے لئے سفینۂ برگِ گل بن سکے — میں اس قسم کی ایک سطر بھی ابھی تک لکھ نہیں سکا۔ سقراط، دانش کی ایک جھلک کے لئے پہاڑیوں کے گرد دیوانہ وار گھومتا ہے یا پیاسا کے ایک قطرے کا آرزومند ہوں جو تحریر میں ڈھل کر مریم بن جائے۔

از :۔ الطاف حسین قریشی (اقتباس از اردو ڈائجسٹ لاہور)

خورشید احمد جامی

○

یہ درد و غم کا اداس موسم یہ وقت کے اجنبی قرینے
نہ یادِ محبوب کی گھٹا ہے نہ مست و سا غرِ بکف مہینے
گلے میں کرنوں کا ہار پہنے یہ کون آیا یہ کون اترا
بکھر گیا درد کا اندھیرا، چمک اٹھے آرزو کے زینے
ملا ہے جب کوئی زخم تازہ تو جگمگا اٹھے ہیں ارادے
جلا دیا راستے میں جیسے چراغِ عہدِ وفا کسی نے
نشاط کا دے چکی ہیں دھوکہ کبھی کبھی میکدے کی شامیں
کہیں کہیں تشنگی رکی ہے نئی امیدوں کا زہر پینے
شعورِ فن کے نئے سویروں کی زر فشانی سے رو رہے کر
تلاش کرتے رہے اندھیرے نقوشِ روایات کے دفینے
حیاتِ نو کی حسین صبحوں کا آئینہ بن گئے ہیں جامی
روایتِ لوح و قلم میں الفاظ کے یہ ترشے ہوئے نگینے

(ملاپ ۔ حیدرآباد)

خاصہ کاظمی

دفعتاً دل میں کسی یاد نے لی انگڑائی
اس خرابے میں یہ دیوار کہاں سے آئی
آج کھلنے ہی کو تھا درِ محبت کا بھرم
وہ تو کہئے کہ تری یاد اچانک آئی
یہ تو سچ ہے کہ تمہیں مجھ سے کوئی کام نہیں
یہ بھی سچ ہے کہ مقدر ہے مرا تنہائی
نشۂ تلخیٔ ایام اتر تا ہی نہیں
تری نظروں نے پلا دی تو بہت چھلکائی
ڈوبتے چاند پہ روتی ہیں ہزاروں آنکھیں
میں تو رویا بھی نہیں تم کو ہنسی کیوں آئی
یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی
رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

(صحیفہ ۔ لاہور)

قلمی کتابوں کی سرگذشت

قلمی کتابوں کے پاس شعور اور زبان دونوں ہوتے تو وہ اپنی سرگذشت سنا کر ہمیں حیرت میں ڈال دیتیں۔ تاہم "رویم ببینیم عالم برہم" کی دعوت ان کی زبانِ حال اب بھی دیتی رہتی ہے اور جو اہلِ ذوق اس دعوت پر توجہ کرتے ہیں وہ ان کے سروپا (اول و آخر کتاب) سے بہت کچھ جان لیتے ہیں۔

عموماً قلمی کتاب کے اول و آخر میں مختلف اشخاص کے قلم کی عبارتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ ہمیں بتاتی ہیں کہ کتاب کب لکھی گئی، کس کیلئے لکھی گئی، کس نے لکھی، کس کس کے پاس رہی اور کہاں کہاں پہنچی —

چنانچہ ایسا بھی ہوا۔ کہ دمشق کی کسی تنگ و تاریک گلی میں ایک کتاب لکھی گئی، عراق کی گرم و خشک سرزمین کی علمی مجلسوں میں رہی، ... ایران کی مجلسوں میں رونق افروز رہی اور وہاں سے ... کی ... اور ... پہاڑیوں

کی سیر کرتی ہوئی دلی کے شاہی کتاب خانے کی زینت بڑھاتی، لکھنؤ پہنچی، اور وہاں سے لٹ پٹ کر رامپور آئی اور یہاں کے سرکاری کتاب خانے میں روپوش ہوگئی یا لندن و برلن کے کتاب خانوں میں جلوہ گری کرنے جا پہنچی۔ یہ بھی بارہا پیش آیا کہ کتاب لکھی تو گئی ایک بوریا نشین کے لئے لیکن اس کی قسمت نے یاوری کی اور آن کی آن میں کسی جلیل القدر فرماں روا کے فلک بوس محل میں جا پہنچی۔ یا کسی عظیم الشان بادشاہ نے کسی بہت ہی نامور خطاط سے اپنے مطالعہ کے لئے لکھوائی اور گردش فلک نے چند دن بعد اس شاہی اعلام ہنر کو ایک معمولی حیثیت کے صاحب علم کی خدمت میں پہنچا دیا۔

چھاپے کے عام ہونے سے پہلے کتاب کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی، حتیٰ کہ یہاں تک کہ یونان کے ایک فلسفی نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو کسی کو کتاب مستعار دے، وہ احمق اور جو شخص کسی سے کتاب مستعار لے کر واپس کر دے، وہ گدھا۔ کتابوں کے مالک اپنی ملکیت کے اظہار کے لئے کتاب کے اول و آخر میں عموماً اور کبھی کبھی درمیان کے ورقوں پر بھی اپنی نشانی لگاتے اور دستخط کرتے تھے۔ بعض اوقات دستخطوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا کرتے کہ کتاب ہم تک کس ذریعے سے پہنچی اور ہم اس کے مالک جائز طور پر ہیں یا نہیں۔ اول تو ہر شخص اتنا باضابطہ نہیں ہوتا کہ ان ضروریات کی تکمیل کر دے۔ دوسرے قلمی کتاب کے سروپا کی تنگ دامانی بھی مجبور کرتی تھی کہ ان یادداشتوں میں کفایت شعاری سے کام لیا جائے۔ اس لئے کتاب کے سفر کی ہر ہر منزل کے متعلق ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے مالکوں اور رفیقوں کے بارے میں پوری طرح ہم باخبر ہو سکتے۔ تاہم جتنی تحریریں اور یادداشتیں کتابوں پر ثبت ہیں اس سے بھی بڑی دلچسپ اور مفید باتیں علم میں آجاتی ہیں، اتنی دلچسپ اور مفید کہ اگر ان سب کو کسی ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو پڑھنے والے کو قصے کہانیوں کا سا مزا آنے لگے —— (اقتباس)

از:- امتیاز علی عرشی (ماہنامہ ہم قلم کراچی)

بابائے اردو

(یوم مولوی عبدالحق کے موقع پر فرستادہ قطعہ)

صفحات ہر اک دور میں تاریخ ادب کے
تیرے ابدی کام سے تابندہ رہیں گے
اہل قلم اردو کے رواں آج ہیں جن پر
جادے وہ سر شام سے تابندہ رہیں گے
وہ ہند ہو یا پاک ہو اے محسن اردو
دونوں یہ تیرے نام سے تابندہ رہیں گے

از:- جگن ناتھ آزاد (مجلس۔ حیدرآباد)

شاعر

نشان ملتے ہیں راہوں کو نظر ملتی ہے جلوؤں کو
مگر شمعوں کو اپنی روشنی سے کچھ نہیں ملتا

سفینے ان کی قوت سے پہنچتے ہیں کناروں تک
مگر موجوں کو اپنی برہمی سے کچھ نہیں ملتا

وہاں شرح رموز بے خودی بھی کرنی پڑتی ہے
جہاں شاعر کو اسرار خودی سے کچھ نہیں ملتا

اجالے مجھ کو لے جاتے ہیں نادیدہ اندھیروں تک
سوائے جہل تازہ آگہی سے کچھ نہیں ملتا

مری محرومیوں کی منزل آخر ہے یہ شاید
جو سب کچھ دینے والا ہے اسی سے کچھ نہیں ملتا

از:- شاہد صدیقی (افکار۔ کراچی)

• محمد اکبر الدین صدیقی

• غلام رسول

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے ——— (ادارہ))

مرتبہ:۔ ترقی اردو بورڈ۔ کراچی ——

نمونہ لغات اردو عرصہ دراز سے ایک مستند اور مکمل اردو لغت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی لیکن اتنا بڑا کام کرنے کی کسی نے حامی نہیں بھری۔ حکومت پاکستان قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ترقی اردو بورڈ کے ذریعہ اس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اب بورڈ نے اردو لغت کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس میں دو جز کا نمونہ ہے۔ ایک "اب" تا "اشفاق"۔ دوسرا "اصابت" تا "اصیل"۔ پہلے جزو میں منتخب الفاظ لئے گئے ہیں اور دوسرا جزو مکمل ہے۔

ابتدا میں ممتاز حسین صدر ترقی اردو بورڈ کا پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد ترتیب لغت کے سلسلے میں جو اصول اختیار کئے ہیں ان کا اظہار ہے۔ پھر علامات و تلفیظات کی فہرست ہے جو اتنی طویل ہے کہ اس کا ذہن نشین رکھنا کارے دارد۔

لفظ "اب" سے الفاظ کے معنی دینے کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور اس کے بعد لفظ "ابد" ہے جس کے معنی دیئے گئے ہیں۔ درمیان میں کوئی لفظ نہیں۔ "اب" کے صرف وہی معنی دیئے گئے ہیں جو ظرف زماں کے طور پر مستعمل ہیں۔ حالانکہ لفظ "اب" باپ کے معنوں میں بھی مستعمل ہے اور "اب و جد" کا استعمال عام ہے۔ اسی سے "ابا" بنا ہے لیکن "ابا" لغت میں نہیں۔ "ابا بمعنی انکار"، "اباحت"، "ابابیل"، "ابالنا"، "ابال"، "ابالا"، "ابتدار"، "ابتلا"، "ابٹنا"، "ابجد"، "ابجد خواں"، "ابجرہ" یہ سب الفاظ "اب" اور "ابد" کے درمیان آنا چاہیئے۔ اگر انتخاب میں انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہر لفظ کے معنی کے اظہار کے لئے مثالوں سے زیادہ الفاظ کی اہمیت ہے۔ ہم یہاں صرف ایک لفظ پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

نمونہ بجنسہ وہی ہونا چاہیئے جیسا کہ اس کی اصل آئندہ ہوگی۔ ٹائپ کی کیا شکل ہوگی اسی وقت نمونہ میں پیش کر دی جاتی تو بہتر تھا۔ موجودہ ٹائپ تو بالکل ناموزوں اور بہت جگہ گھیرنے والا ہے اور دیدہ زیب نہیں۔ اگر اردو انسائیکلوپیڈیا (مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو) کے نمونہ کا ٹائپ استعمال ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ہمیں بہرصورت کاغذ کی کفایت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلے ہوئے معنے لکھنے کے لئے جلی نشانات ڈال دینا کافی ہے۔ نئی سطر خود اس امر کی شاہد ہوگی کہ نئے معنے بتلائے جا رہے ہیں اس سے جگہ کم لگے گی، کاغذ کی بچت ہوگی اور کتاب کی قیمت بھی کم رہ سکے گی۔ ترقی اردو بورڈ اتنا شاندار کارنامہ انجام دے رہا ہے تو اتنا تو ضرور ہونا چاہیئے کہ کوئی لفظ چھوٹنے نہ پائے۔ کوئی محاورہ رہ نہ جائے۔ ہمارے ادب میں سب سے زیادہ ذخیرہ الفاظ استعمال کرنے والا شاعر نظیر اکبرآبادی ہے اور اس کے بعد سودا۔ محاوروں کے لئے نذیر احمد اور سرشار۔ ان کی کوئی تصنیف بھی چھوٹنے نہ پائے۔ اسی طرح دکنی شاعری میں نصرتی اور قطب شاہ معانی کا ذخیرہ الفاظ بہت بڑا ہوا ہے لیکن جانم کا ارشاد نامہ کچھ کم اہمیت

کا حامل نہیں۔ ارکان کے پیش نظر ان سب کتابوں کا رہنا ضروری ہے۔ اگر لغت میں کوئی لفظ نہ ملے تو پھر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسی طرح امیر اللغات اور نور اللغات تو پیش نظر رہے لیکن فرہنگ آصفیہ کا ذکر نہیں۔ کسی انگریزی کی لغت کا کتابیات میں ذکر نہیں۔ حالانکہ شکسپیر، فیلن وغیرہ اس سلسلے میں کافی اہم ہیں۔

بہرحال لغت کو ہر پہلو سے اہم اور حامل افادیت ہونا چاہئیے۔ جو نمونہ ہمارے سامنے ہے اس سے ہمیں توقع کم ہے۔ لیکن امید ہے کہ تمام تبصروں کو پیش نظر رکھ کر اس کو مکمل بنایا جائے گا۔ (ا۔ص)

بہارِ طفلی حضرت تلوک چند محروم کی ایسی نظموں کا مجموعہ ہے جو صرف بچوں اور لڑکوں کیلئے لکھی گئی ہیں۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ ڈیمی سائز مصور۔ مجلد گرد پوش۔ قیمت ۵۰/۲ روپے

اس کا دیباچہ ڈاکٹر زور صاحب نے اور مقدمہ شفیع الدین صاحب نیر نے لکھا ہے۔ شفیع الدین صاحب نیر نے بچوں کیلئے نظمیں لکھ کر اردو دنیا میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ حضرت محروم نے بچوں کیلئے حسین دلکش انداز میں میٹھی میٹھی باتیں بیان کی ہیں اور حسین دلآویز زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے معمولی نوشت و خواند سے واقفیت رکھنے والے کے دل کو موہ لینے کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب نے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے:—

"بچوں کی ذہنی تربیت میں "بہار طفلی" صحیح معنوں میں نوید بہار ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ اہل اردو اس مجموعے کا شایان شان خیر مقدم کریں گے اور یقین ہے کہ بچے اسے شوق سے پڑھیں گے۔ نہ صرف ہر مدرسے کے کتب خانے میں اس کا موجود ہونا ضروری ہے بلکہ میری رائے ہے کہ اچھے بچوں کو مدارس کی طرف سے جو انعامات دئیے جاتے ہیں ان میں اس کتاب کو شامل رکھنا چاہئیے۔"

ہم بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمنوا ہیں۔ (ا۔ص)

ماسٹر رامچندر اور اردو نثر کی ارتقاء میں ان کا حصہ ماسٹر رامچندر مرحوم دہلی کالج کے ریاضی کے مشہور استاد تھے۔ جن کے آگے محمد حسین آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ جیسے ادبا نے زانوے تلمذ تہ کیا۔ آپ نے ریاضی کی ایک ناتج جبر و مقابلہ میں اپنی کتاب "تفرقی احصا" کے نئے نظریوں کے ذریعے یورپ کے علمائے ریاضی سے داد تحسین حاصل کی ہے۔ آپ اردو کے پہلے انشائیہ نویس ہیں جن کے رشحات قلم سے علمی، تاریخی، اخلاقی اور سماجی مضامین نکلے اور ان کی بدولت اردو نثر کی ارتقاء میں آپ کا خاص مقام رہا ہے۔ ادارۂ ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے دہلی کالج کے ایک لائق اور خدمت گزار شخص کے حالات شائع کر کے ان کو گوشۂ گمنامی سے منظر عام پر لایا اور ہونہار ادیبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ایک اچھی حیات لکھ کر اردو ادب کی خدمت انجام دی۔ لکھائی چھپائی ٹائپ زدہ اور دیدہ زیب۔ ضخامت ۲۱۴ صفحات۔ قیمت ۵۰/۳ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد ملک۔ آندھرا پردیش۔ (غ۔س)

اُردو نامہ

ایڈیٹر:۔ وقار خلیل

حیدرآباد کی تہذیبی اور ادبی خبریں

اگست و ستمبر ۱۹۶۱ء

یکم اگست ـــ کتب خانہ و دارالمطالعہ ادارہ ادبیات اردو سے ماہ جولائی کے ختم تک ۳۹۳ افراد نے استفادہ کیا۔

۲ اگست ـــ جناب فیض احمد (ایم۔اے ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی) بسلسلہ ریسرچ کرنول سے حیدرآباد پہنچے اور ایوان اردو کے مہمان خانے میں مقیم رہے۔

۳ اگست ـــ نواب مہدی نواز جنگ گورنر گجرات نے ایوان اردو اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ شریک معتمد ادارہ نے نواب صاحب کا خیر مقدم کیا۔

۴ اگست ـــ پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور فیض احمد نے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

۵ اگست ـــ "بزم نو" کا طرحی مشاعرہ دل حیدرآبادی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

۶ اگست ـــ بزم سخنستان کا ماہانہ طرحی مشاعرہ ایڈیٹر صاحب روزنامہ رہنمائے دکن کے مکان پر منعقد ہوا۔

۹ اگست ـــ مسز تفضل جعفری الہ آبادی اور جوش محمد آبادی نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

۱۱ اگست ـــ اثر بھارتی معتمد اردو اکیڈیمی امبالہ کو حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ادارے کی طرف سے معلومات بھیجی گئیں۔

۱۲ اگست ـــ ڈاکٹر زور معتمد ادارہ بنگلور سے حیدرآباد پہنچے۔

● عبدالناصر (کراچی) نے پاکستان کے مختلف رسائل کے فائل کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کو تحفتہً عطا کئے۔

● بزم اردو نیلخنہ ریفیوجی کیمپ میں ٹھاکر بجرنگ سنگھ کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔

۱۳ اگست ـــ جناب سری کشن ستھا دہلی نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ ادارہ کی تازہ مطبوعات بسلسلہ تبادلہ لائبریری آف کانگریس واشنگٹن (امریکہ) اور سوویت سوشلسٹ ری پبلک کلچرل سکریٹریٹ ایمباسی آف ماسکو (نئی دہلی) کو ارسال کی گئیں۔

۱۶ اگست ـــ ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر (صدر ادارہ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انتظامی اور اشاعتی امور کے علاوہ طے کیا گیا کہ مرحوم تمکین کاظمی کی بیوہ کی درخواست پر مرحوم کے محررہ مخطوطہ "تلامذہ شمس الدین فیض" کی اشاعت ادارہ کی طرف سے ہو اور مناسب حق تصنیف بھی بیگم تمکین کاظمی کو دیا گیا۔

● نواب عالم یار جنگ، محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر اور نواب فاروق علی خاں صفوی نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

۱۷ اگست ـــ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (متوفی ۱۶ اگست) کے سانحہ ارتحال کے سلسلے میں ایوان اردو بند رہا۔ ڈاکٹر زور معتمد ادارہ نے مولوی صاحب کے انتقال پر تعزیتی بیان جاری کیا۔

● شہر ادب کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جہاندار افسر رکن بلدیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ بابائے اردو کی رحلت پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

● آرٹس کالج شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج میں منعقدہ جلسہ تعزیت کو علی الترتیب ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر غلام عمر خاں، ہادی القادری اور ڈاکٹر ظلکرنی ریڈر شعبہ مراٹھی نے مخاطب کیا۔ اور مولوی عبدالحق کی وفات پر تعزیتی قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔

۱۸ اگست ـــ اردو کالج اور انوار العلوم کالج میں بابائے اردو کی یاد منائی گئی۔ مسز زیب پروفیسر سید محمد، پروفیسر سید علی اکبر، پروفیسر حبیب الرحمن، اور اختر حسن نے مولوی صاحب کی شخصیت اور فن پر تقریریں کیں۔

● پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے اور عارضی طور پر اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے

موصوف کا دوبارہ تقرر عمل میں آیا۔

● ڈاکٹر میر ولی الدین کے استعفا کے باعث ڈاکٹر عبدالمعید خاں کا دائرۃ المعارف کی صدارت پر انتخاب عمل میں آیا۔

● آندھرا پردیش اسمبلی میں کالیشور راؤ اسپیکر نے کہا کہ اردو آندھرا پردیش کی دوسری علاقائی زبان ہے۔ چیف منسٹر نے کہا کہ تلگو داں ریاستی ملازمین کے لئے اردو یا ہندی کا امتحان کامیاب کرنا ضروری ہے۔

۱۹ اگست ـــ ڈاکٹر زور براہ الہ آباد دہرہ نگر کے لئے روانہ ہوئے۔

۲۰ اگست ـــ ڈاکٹر غلام یزدانی کی صدارت میں بمقام ایوانِ اردو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انتقال پر ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو اور اردو مجلس کی طرف سے مشترکہ جلسۂ تعزیت منعقد ہوا اور قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی۔ ادارے کی طرف سے پروفیسر سید محمد (پرنسپل اردو کالج) انجمن کی طرف سے پروفیسر حبیب الرحمن اور اردو مجلس کی طرف سے رائے جانکی پرشاد کے علاوہ پنڈت ونشی دھر ودیالنکار، پروفیسر ہارون خاں شروانی اور غلام ربانی نے تقریریں کیں۔

● یو۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے ریسلے ویمنس کالج کی طرف سے مس امۃ العزیز وائس پرنسپل کی صدارت میں بابائے اردو کی یاد منائی گئی۔ اختر حسن لکچرار اردو اور مس حور عرشی معتمد بزم اردو نے تقریریں کیں۔

● بزم سعدی کا ۲۰۰ واں ادبی اجلاس محامد علی عباسی معتمد فینانس کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی نے مقالہ سنایا۔ فارسی میں مقامی شعراء نے طرحی کلام پیش کیا اور ڈاکٹر عبدالحق کے انتقال پر قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی۔

● اسٹیٹ کا سرکل مرکزی بزم تعمیرات کے زیر اہتمام منعقدہ جلسہ میں بابائے اردو کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ پروفیسر عالم خوندمیری نے جلسہ کی صدارت کی۔

۲۱ اگست ـــ بزم حیوان کا ماہانہ طرحی مشاعرہ آوج یعقوبی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اسعد اللہ حسینی صاحب کوہیری نے جلال الدین توفیق کی شاعری پر مضمون سنایا۔

● اردو مدیران جرائد کا اجتماع غوث محی الدین جاوید کی صدارت میں منعقد ہوا اور بابائے اردو کے انتقال پر قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

● چادر گھاٹ کالج اسٹوڈنٹس یونین کے جلسہ عام میں بابائے اردو کو خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ پرنسپل باقر فریدی نے صدارت کی اور رشید الحسن لکچرار نے حالات زندگی سنائے۔

۲۳ اگست ـــ شفیع احمد ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی میسور روانہ ہوئے۔

● صورت جہاں بیگم (پیارا منزل چیچل پلی) عطیہ فاطمہ اور مولوی محمد خاں (دبئی) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

● بزم سعدی کی طرف سے کتبۂ بزم سعدی کے قیام کا اعلان کیا گیا جس کے بموجب "یادگار ولا" (مرتبہ برق موسوی) "ذکر آدم" (فارسی مثنوی) ڈاکٹر طاہر مسلم اور باز طاہرہ سعید کا منتخب اردو کلام "برگ سبز" کے علاوہ "حیدرآباد کے فارسی گو شعراء کا تذکرہ" مرتبہ قمر ساحری شائع ہوں گے۔

۲۵ اگست ـــ حیدرآباد کی ایک قدیم علم دوست شخصیت مولوی عمر یافعی نے ۸۵ سال کی عمر میں بعارضہ فالج انتقال کیا۔ مرحوم رضی الدین حسن کیفی کے شاگرد تھے۔

۲۷ اگست ـــ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس شری ایل۔ این گپتا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسز ونشی دھر ودیالنکار اور محی الدین احمد نے رحیم الدین خانخاناں کی ہندی اور فارسی شاعری پر مقالے پڑھے۔ اس اجتماع میں محترمہ روحی علی اصغر کے مجموعۂ کلام "نیرنگِ نظر" کی رسم اجرائی عمل میں آئی اور شاعرہ کو مسز رجا جانکی پرشاد اور حبیب الرحمن نے خراج تحسین ادا کیا۔

● اقبال اکیڈیمی کی طرف سے منعقدہ جلسہ میں سعید احمد اکبرآبادی صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے "اقبال اور مرد مومن" کے زیر عنوان مخاطب کیا۔

۲۹ اگست ـــ حیدرآباد کے مشہور شاعر حضرت محمد حسین آزاد نے بعمر ۸۴ سال کراچی میں انتقال کیا۔

۳۰ اگست ـــ ہندی کے شاعر نگن داس داس ناگیش بعارضہ قلب انتقال کر گئے۔ ناگیش اردو کے ادبی حلقوں میں کافی مقبول تھے۔

۳۱ اگست ـــ انجمن امداد باہمی اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کی جانب سے بیگم اختری کی صدارت میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔

● بزم دیار ادب کا طرحی مشاعرہ آوج یعقوبی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

★

یکم ستمبر ـــ کتب خانہ و دار المطالعہ ادارۂ ادبیات اردو سے ماہ اگست کے ختم تک (۲۵۰۰) افراد نے استفادہ کیا۔

● مسٹر غالب حیدرآبادی ایڈیٹر روزنامہ "جوہر" اور شری گنپت لال ورما ایڈیٹر اردو ماہنامہ "دیال" حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال کر گئے۔

۳ ستمبر ـــ پریس انفارمیشن بیورو دہلی کے زیر اہتمام ۴۷ء کے بعد کی اردو مطبوعات کی نمائش کے سلسلے میں ادارہ کی ۳۰ کتابیں ارسال کی گئیں۔

● ادارۂ ادبیات اردو شاخ نانڈیڑ کی طرف سے "یوم مولوی عبدالحق" حافظ عبداللہ ایڈوکیٹ (صدر ادارہ) کی صدارت میں منایا گیا۔

۵ ستمبر ـــ اردو ہال میں شری اے۔ رکالیشور راؤ کی صدارت میں مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کے کلام کے مجموعوں "بساط رقص"، "گل تر" اور "پاس گریباں" کی رسم اجرائی عمل میں آئی۔ مسرز شاہد صدیقی، عالم خوندمیری، حبیب الرحمٰن اور اختر حسن نے شعرا صاحبان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کے فن کو خراج تحسین ادا کیا۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے فنکاروں نے سازوں پر شاعروں کا کلام پیش کیا۔

● دی سنٹرل ٹیچنگ مینس اسوسی ایشن آف حیدرآباد نے ایک اعلان کے ذریعہ اردو آرٹس کالج کے قیام کا فیصلہ کیا۔

۶ ستمبر ـــ مولوی عارف الدین حسن معتمد شعبۂ اردو امتحانات ادارہ نے ایک جلسۂ عام میں جو شری کیواتی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل کی صدارت میں منعقد ہوا تھا ادارہ کے امتحان میں کامیاب ہونے والے قیدیوں کو اسناد تقسیم کئے۔ قیدیوں کے مدرسہ کے صدر مدرس مسٹر گنیش پرشاد کوان کی اردو تدریسی خدمات کے اعتراف میں ادارہ کی چند کتابیں بطور تحفہ دیں۔

● بزم جگر کی جانب سے ایک غیر طرحی مشاعرہ مسٹر محمد منظور احمد معتمد اردو مجلس کی صدارت میں منعقد ہوا۔ عالم حیدری بنیرہ مشیر کلکتوی اس مشاعرہ میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔

۷ ستمبر ـــ تمکین کاظمی مرحوم کی بیوہ کے نام وزارت ثقافتی امور و سائنسی تحقیقات نے ماہانہ سو روپے وظیفہ منظور کیا گیا۔

۸ ستمبر ـــ مسٹر عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے بزم اردو نانک رام جگدیش داس کالج کا افتتاح کیا۔

● ٹاٹر معتمدین آندھرا پردیش کے ادیب دوستوں کی جانب سے سہ زبانی مشاعرہ راجہ کنج لال بہاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریاستی چیف منسٹر نے اس مشاعرہ کا افتتاح کیا اور کالیداس کے کلام کا تلگو ترجمہ سنایا۔

۹ ستمبر ـــ شری لیس۔ راما سابق اکاونٹنٹ جنرل حیدرآباد (فینانشیل ایڈوائزر ناگرجنا پراجیکٹ) اور جلال الدین یحییٰ لال نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

۱۱ ستمبر ـــ اسٹیٹ سرکل مرکزی مجلس تعمیر ملت نے مرکزی اور ریاستی سرکار سے جعفر امجد کی بیوہ کے نام ماہانہ وظیفہ کی اجرائی کا مطالبہ کیا۔

۱۷ ستمبر ـــ نواب میر عثمان علی خاں (حضور نظام) نے ایک اعلان کے ذریعہ ستاسی برس کے قائم شدہ جامعہ نظامیہ (بانی انوار اللہ خاں فضیلت جنگ) کا مکمل انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی نگرانی کے لئے جناب عبدالستار معتمد فنڑ پیشی کو حضور نظام نے جامعہ کے نظم و نسق کے صدر کی حیثیت سے نامزد کیا۔

۱۹ ستمبر ـــ بزم سعدی کے ایک جلسہ میں افغانستان کے جلا وطن شاعر یعقوب یوسفی کے خیر مقدم میں محفل شعر و سخن منعقد ہوئی۔ فارسی اور اردو کے شعراء نے کلام سنایا۔

● حیدرآباد کے قدیم استاد فن الجناب حکیم نجم الدین انجم نے طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔

۲۲ ستمبر ـــ انجمن ترقی اردو شاخ حیدرآباد نے تلگو دانوں کیلئے اردو جماعتوں کا انتظام کیا۔

۲۴ ستمبر ـــ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس راجہ جانکی پرشاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر مغنی تبسم لکچرار سکندرآباد کالج نے حیدرآباد کے ممتاز غزل گو شاعر جناب خورشید احمد جامی کی غزل پر مضمون سنایا۔ بھارت چند کھنہ اور نریندر لوتھر صاحبان نے مزاحیہ مضامین سنائے۔ محفل شعر و سخن کے بعد یہ دلچسپ اجلاس ختم ہوا۔

● بزم سعدی کے ماہانہ ادبی اجلاس میں امیر یوسف زئی نے "روس میں فارسی" کے زیر عنوان مضمون سنایا۔ آخر میں شعرا صاحبان نے فارسی میں طرحی کلام پیش کیا۔

۲۷ ستمبر ـــ بزم حیون کے ماہانہ ادبی اجلاس اور مشاعرہ میں اوج یعقوبی نے سلیمان اریب کی شاعری پر مضمون سنایا۔ پروفیسر عالم خوندمیری نے صدارت کی۔ محفل شعر خورشید احمد جامی کی صدارت میں جاری رہی۔

آپ بھارت کی
کسی بھی زبان میں
تار بھیج سکتے ہیں



بشرطیکہ پیغام
دیوناگری رسم الخط میں ہو

انگریزی میں تار بھیجنے کے لئے جو سہولیات دستیاب ہیں، اب وہ دیوناگری رسم الخط میں تار بھیجنے کے لئے بھی حاصل ہیں ـــ مبارک باد کے تار (مبارک باد کے جملے ہندی میں) ڈی لکس تار، اخباری تار، بیماری و حادثے کے ترجیحی تار، (پرائرٹی ہیومن لائف ٹیلی گرام) ٹیلی فون پر تار (فونوگرام) تار کے مختصر پتوں کی رجسٹریشن ـــ یہ سروس اب قریب قریب ۱۵۰۰ تار گھروں میں دستیاب ہے۔

بھارتی زبان میں تار بھیجنے کی
سروس سے فائدہ اٹھائیے



ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے
پوسٹس اینڈ ٹیلی گرافس ڈپارٹمنٹ

DA60/381

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

جاری شدہ ۱۹۳۸ء ——— فون نمبر (۳۵۲۰۹)

ماہنامہ

سب رس

نومبر ۱۹۶۱ء

جلد نمبر (۲۴) شمارہ (۱۱)

نگران:- ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلسِ ادارت:-

رتن راج سکسینہ
نعیم الدین ہاشمی
رائے جانکی پرشاد
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
وقار خلیل

زرِ سالانہ:- ہندوپاک سے چھ روپے، ششماہی تین روپے
" بیرونِ ہند سے دس روپے

قیمت۔ (۵۰) نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات کے اہتمام سے عقیل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر "ایوانِ اردو" خیرت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ترتیب

مضامین

غزلیں

افسانہ

طنز و مزاح

تبصرے

اردو نامہ

اونچے نصب العین ——— بڑھتی چڑھتی کامیابیاں

پانچ سالہ منصوبے قوم کی ترقی اور خوشحالی کے ضامن ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ عوام کے تمام طبقے ان کی قدر و اہمیت کو سمجھیں۔ ان کی عمل آوری میں حصہ لیں اور ان عظیم نصب العینوں کو حاصل کریں جو ترقیات کے مختلف شعبوں میں مقرر کر لئے گئے ہیں۔

آندھرا پردیش میں دو منصوبوں کے تحت کیا کیا کام انجام پائے ہیں:

- ریاست کا طرۂ امتیاز، ناگ ارجن ساگر بند تیزی کے ساتھ تعمیر ہو رہا ہے۔ پختہ بند کی تقریباً ایک تہائی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ آبپاشی کے بڑے، اوسط اور چھوٹے پیمانے کی بہت سی دوسری اسکیمیں یا تو مکمل ہو گئی ہیں یا تکمیل کے قریب پہنچ گئی ہیں۔
- غذائی اجناس کی پیداوار جو دوسرے منصوبے کے آغاز پر (۲۱ء۵۴) لاکھ ٹن تھی اب (۶۵ء۱۳) لاکھ ٹن سے زائد ہے۔
- برقی قوت کی پیدائش میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے دوسرے منصوبے کے آغاز پر برقی قوت سے مستفید ہونے والے گاؤں کی تعداد صرف (۱۷۰۰) تھی اب (۳۲۰۱) گاؤں کو برقی قوت فراہم کی جا چکی ہے۔

اپر سیلیرو پروجکٹ اور سری سیلم ہائیڈرو الکٹرک پروجکٹ کی تکمیل کے بعد برقی قوت کی پیدائش میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

- کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام اب (۳۷۶) بلاکوں میں پوری قوت کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ پنچائتی راج مستحکم طریقے پر قائم ہو چکا ہے۔ (۳۰۱) بلاکوں میں پنچایت سمیتیاں اور ریاست کے پورے (۲۰) ضلعوں میں ضلع پریشد کام کر رہے ہیں جو اقتدار کی جمہوری تقسیم کے معاملے میں نہایت اہم ترقی ہے۔
- ہر نوعیت کے تعلیمی اداروں کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس سال یکم جولائی سے ۶ تا ۱۱ سال کی عمر والے بچوں کے لیے مفت لازمی تحتانی تعلیم کی اسکیم نافذ کی گئی ہے۔

آندھرا پردیش میں پچھلے دو پانچ سالہ منصوبوں کے تحت حاصل کی ہوئی کامیابیوں کی یہ صرف چند اہم مثالیں ہیں تیسرے منصوبے کے لئے اس سے بھی زیادہ شاندار پروگرام تجویز کر لیا گیا ہے جس کے خرچ کا رقمی تخمینہ (۳۰۵) کروڑ روپئے کا ہے۔

جاری کردہ:- ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ۔ آندھرا پردیش۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

پریم چند کا ایک افسانہ

(ایک کردار کا مطالعہ)

"مس پدما" ایک دلچسپ نفسیاتی مطالعہ ہے، جنسی زندگی کی پیچیدگیوں کا بھی ایک مکمل جائزہ ہے۔ رتنا اور پدما دو بہنیں ہیں، رتنا بڑی ہے، اس کی شادی مسٹر جھلا سے ہو چکی ہے لیکن وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ ایک ہی سال میں اس کا شگفتہ چہرہ مرجھا گیا ہے، اس کی زندگی تلخ ہو گئی ہے، پدما جب اسے دیکھتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے تصویر مٹ گئی ہے صرف اس کا خاکہ باقی ہے۔

پدما نے وکالت شروع کر دی ہے، اس کی ذہانت، فطانت اور حسن نے ججوں کو متاثر کیا ہے، عدالت میں اس کی رعنائی اور شیریں بیانیوں سے لوگ متاثر ہیں۔ پدما شکستوں سے ناآشنا ہے، نفسیاتی خواہشات کی تکمیل ہی اس کی حیات کا مقصد ہے، سگمنڈ فرائیڈ اس کا "معبود" ہے، فرائیڈ کے نظریے اس کی زندگی کیلئے مشعل ہدایت ہیں۔

"کسی عضو کو باندھ دو، تو تھوڑے ہی دنوں میں دوران خون بند ہو جانے کے باعث بیکار ہو جائے گا۔ فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو موت کے غار میں ڈال دیگا، یہ جنون اور مراق اور اختلال دماغ کی آتی کثرت ہے تو محض اسلئے کہ خواہشات میں رکاوٹ ڈالا گیا ہے۔ نفسیات کی یہ نئی تشخیص پدما کی زندگی کا اصول تھی۔" (درا… ص ۱۵۱)

اس عورت کے سامنے رتنا اور اس کے شوہر مسٹر جھلا کے اختلافات ایک دلچسپ مسئلہ سے کم نہیں۔ جنسی زندگی اور ازدواجی زندگی میں یہ اختلافات کیوں ہیں؟ پدما کیلئے یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے وہ ایسی باتیں جاننا چاہتی ہے، ان باتوں کے پوشیدہ رازوں سے واقف ہونا چاہتی ہے لہٰذا رتنا سے ملنے کے بعد اس کی بھوک غائب ہو جاتی ہے، اس لئے کہ دوسری بھوک بیدار ہو گئی ہے، وہ اپنی تسکین اور لذت کیلئے سینے میں رتنا کے دل کی باتیں جان لینا چاہتی ہے۔ اس کے سوالات پر غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ وہ کتنی سنجیدگی سے باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے، اسے ان سوالوں کو پیش کرنے میں کتنی لذت مل رہی ہے۔ رتنا کی باتوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ گویا دونوں کے درمیان "نفسیاتی تصادم" ہے۔ رتنا اپنے شوہر سے لینا تو سب کچھ چاہتی ہے لیکن دینا کچھ بھی نہیں چاہتی، صرف اپنی نسائیت کے بوتے پر، اپنے انداز کے بل پر چاہتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی توجہ کا مرکز بن جائے گی۔ پریم چند نے "لوٹیا دے کر جواہر پاسہ لینا چاہتی ہے" کہہ کر اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نفسیات میں اس موضوع کا مطالعہ کم دلچسپ نہیں۔ رتنا کی نفسیاتی کشمکش پر پریم چند نے اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے اندر جو منفی ردعمل پیدا ہوا ہے اس کا جائزہ لیا ہے، اس کی داخلی کیفیتوں کو خارجی علامتوں کے سہارے پیش کیا ہے۔ رتنا کی جذباتی زندگی کی تکمیل رک گئی ہے، وہ اپنی ازدواجی مشکلات اور نفسیاتی مجبوری کو اس طرح پیش کرتی ہے:—

"ہم نے گھڑے کو خوب ٹھونک بجا کر اپنا اطمینان کر لیا تھا، ظرف میں کہیں شگاف یا درز تو نہیں، آواز اس کی سچی تھی، ٹھوس دھات کی آواز کی طرح مترنم لیکن ظرف میں پانی پڑتے ہی نہ جانے کدھر سے بال نکل آئے اور سارا پانی بہہ گیا اور اب گھڑا ایسا ہی

ٹھنٹھ کی طرح خشک ٹھنڈا ہوا ہے۔"

اور۔ "اگر ان کی طبیعت مجھ سے سیر ہوگئی تو میری طبیعت بھی ان سے کچھ کم سیر نہیں ہوئی۔ کیوں، دل کی یہ حالت ہے کہہ نہیں سکتی" لیکن اب میں ان کے ساتھ ایک دن بھی رہنا نہیں چاہتی، وہ ہنستے ہیں تو مجھے ان کی ہنسی میں چھچھورے پن کی بو آتی ہے، باتیں کرتے ہیں تو ان میں بناوٹ کا رنگ جھلکتا ہے، اچکن اور پائجامہ پہنتے ہیں تو میراثیوں جیسے لگتے ہیں، کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں تو جیسے کرنٹا ہو، ان کے ساتھ جتنی دیر رہتی ہوں دل پر بہت جبر کرکے رہتی ہوں۔"

رتنا نے اپنے شوہر کے جو "کارٹون" پیش کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں کیسی کشمکش ہے، اس کے ہیجانات اسے کیا کچھ کہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ وہ مسٹر جمیلا کو شادی کے قبل سے جانتی تھی، دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان کر قریب آئے تھے لیکن اب جب کہ اس کی نفسیاتی پیچیدگیاں اسے پریشان کر رہی ہیں مسٹر جمیلا کی شخصیت اس کے احساسات کی بناوٹ پر اثر ڈال رہی ہے وہ شادی کو ایک بڑا خطرہ سمجھتے ہوئے اپنی عزیز ملامت کو بھدے اور بھونڈے رنگ میں سامنے لا رہی ہے۔ اس کے نفسیاتی دباؤ اور جنسی خوف کا تجزیہ مشکل نہیں ہے۔

پدما اپنی بہن کی باتوں سے متاثر ہوتی ہے، وہ اس واقعہ کے ہر پہلو پر سوچتی ہے اس کے بنیادی خیالات کے پیش نظر یہ بھی سوچئے کہ رتنا کی ان باتوں کا اس پر کیا نفسیاتی اثر ہوا ہوگا۔ یہ دونوں لڑکیاں بیسویں صدی کی زندگی میں پروان چڑھتی ہیں نئے خیالات سے متاثر ہیں اس لئے اپنی بیوہ ماں کی شوہر پرستی کا بھی مذاق اڑاتی ہیں۔ ان کے والد آنا نانتھ کول کے انتقال کو بیس سال ہو چکے ہیں لیکن دونوں کی ماں اب تک اپنے شوہر کی یاد میں کھوئی ہوئی ہے اور مانا تھ شوقین، آزاد مشرب اور رنگین مزاج آدمی تھے اس لئے بدمزگیاں پیدا ہوتی تھیں اور یہ دونوں لڑکیاں اپنی ماں کا مضحکہ اڑاتی تھیں، اور سادہ لوح، بےزبان اور فرسودہ خیال پر رحم کھاتی تھیں۔ ان میں سے کسی کو ایسا نفس پرور، بے وفا، مرد بہرشوہر ملتا ہوا سے ٹھوکر مارتیں اور اس کی صورت نہ دیکھتیں اور اسے دکھا دیتیں کہ اگر تم کجروی کر سکتے ہو تو ہم بھی تم سے کم نہیں ہیں۔ باپ کو وحشی، بےدرد اور ناشناس سمجھتی تھیں۔ اس پس منظر میں خصوصاً پدما کے ذہنی نشوونما کو دیکھنا چاہیئے اس لئے کہ وہ تعلیم یافتہ ہے فرائیڈازم کا مطالعہ کر چکی ہے اور نفسیاتی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد سمجھتی ہے پریم چند نے پدما کے کردار کو پیش کرتے ہوئے نفسیاتی الجھنوں کو بھی نمایاں کیا ہے، ایک طرف وہ اپنے باپ کی حرکتوں کو دیکھ کر اسے وحشی اور بے درد سمجھتی ہے اور پھر اپنی بہن کی برباد زندگی سے متاثر ہو کر یہ سمجھتی ہے کہ شادی ایک خطرہ ہے لیکن دوسری طرف وہ خود مسٹر جمیلا کو قریب کرکے اپنے آپ کو اس کی ذات میں جذب کر دیتی ہے۔ رتنا شوہر سے علیحدہ ہو جاتی ہے، پدما عدالت میں اپنی بہن کی وکالت کرتی ہے اور اس کی ڈگری ہوتی ہے۔

پدما آزاد رہ کر اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا چاہتی ہے، اپنی جذباتی زندگی کی تکمیل آزادی کے بغیر ممکن نظر نہیں آتی ماں اور بہن سے علیحدہ رہ کر اسے آزادی ملتی ہے۔ "بڑی آزادی سے اپنی پرسنالٹی کی تکمیل کر رہی تھی" نفسیاتی طور پر اس کی ہر تنہائی ایک وجود کی تلاش کرتی ہے "ایسے وجود کی تلاش جس میں درد، وفا اور گہرائی ہو۔ جس پر وہ تکیہ کر سکے" اس کی ہر تلاش بالکل فطری اور نفسیاتی ہے۔ حیاتی تسلسل (VITAL CONTINUITY) کی واحد جبلت جو دو جبلتوں یعنی "تحفظ خودی" اور "اشاعت خودی" پر ٹکی ہے یہاں نمایاں ہے اس تنہائی کو دور کرنے کیلئے وہ مسٹر جمیلا کا انتخاب کرتی ہے، یہی بات اس افسانہ کی روح ہے۔ آپ اس

عمل کو "عقلی الجھاؤ" (INTELLIGENCE COMPLEX) کہئے یا معکوسی ہیٹریا میں اسے ایک قسم کا "آتش مانیا" (PY-ROMANIA) سمجھتا ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عقلی الجھاؤ کی بھی صورت موجود ہے یعنی اپنی ذہنیت اور عقلیت کی نمائش اور کسی حد تک معکوسی ہیٹریا کا رنگ بھی ہے یعنی ایک ناخوشگوار واقعہ کو شعور سے الگ کرنے کی کوشش اور ماحول اور واقعات کی وجہ سے خارجی اشاریت کی کھوٹس سے گریز لیکن جس طرح "آتش مانیا" (PYAOMANIA) کا مریض آگ کو دیکھتے ہی اس کے قریب بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں آگ کی طرف بڑھتے ہیں اسی طرح پدما بھی بے قرار نظر آتی ہے، وہ مسٹر جھلا کی ذات سے دلچسپی لیتی ہے اور اپنی آزادی کو قربان کرنا چاہتی ہے وہ جانتی ہے کہ مسٹر جھلا مزاج کے جھلے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر بڑا نگیختہ ہو جاتے ہیں پھر بھی وہ ان کے قریب آتی ہے، جھلا کے جبر اور پدما کے صبر کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پدما کے لاشعور کا تقاضہ پورا ہو رہا ہے۔ خارجیت کا جادو ٹوٹ چکا ہے، ناخوشگواریوں کو شعور سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے، رتنا جب غصہ اور تنبیہہ سے بھرا ہوا خط لکھتی ہے تو پدما شوخی سے کہتی ہے "میں تو لکھ دوں گی، میں ان سے شادی کر رہی ہوں اور کبھی طلاق نہ دوں گا"

اب یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی تبدیلی لاشعوری نہیں بلکہ شعوری ہے، اس تبدیلی (CONVERSION) کو سمجھنا اب مشکل نہیں۔

دو سال گزر جاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان ہی برسوں میں بھری ہوئی پدما کی جذباتی اور جنسی تکمیل ہو جائے گی وہ آگ کے قریب جاتے ہی جھلس گئی ہے، چونکہ اس کا اندیشہ اس کا امتحان ہی کے وقت ہو گیا تھا اس لئے ہم اس کے جذبات کو ایسی روشنی میں دیکھتے ہیں، پریم چند نے بھی اس کی تصویر اس طرح پیش کی ہے۔

"چہرہ زرد، رخسار بے رنگ، آنکھوں میں تکان، جسم میں ڈھیلا پن، فکر مغموم، اس پر ایک ہیبت سی طاری رہتی متوحش خواب دیکھتی، آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا اور آہ کھینچ کر رہ جاتی، ساری دنیا کے رنگ و روغن اور بہترین مقویات اور عجائبات فطرت کے اس تغیر کے سامنے ہیچ تھے، آنکھوں کے گرد حلقے، غذا کی اشتہا غائب۔۔"

لیکن اس تصویر کے پیچھے پدما کی جذباتی اور نفسیاتی زندگی کی تکمیل نہیں ہوئی ہے، پریم چند بتاتے ہیں:۔

"غذا کی اشتہا غائب مگر اسی تناسب سے پیار کی بھوک تیز۔ اب وہ ناز برداری چاہتی تھی۔ کوئی اسے پان کس طرح پھیرے، اسے سینے سے لگائے رکھے، کبھی علیحدہ نہ کرے۔"

یہ سب کچھ صرف اس لئے کہ پدما کو اب اپنے اوپر اعتماد نہ تھا، اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس طرح پدما کا کردار ایک بھرپور نمائندہ کردار بن جاتا ہے، پریم چند اس لاش کی تمناؤں کو پیش کر کے اس کی جذباتی اور جنسی زندگی کے وسیع حلقے کو نمایاں کر رہے ہیں، وہ ابھی تک پیاسی ہو یا نہ ہو پیاس کی شدت کا احساس رکھنا چاہتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر مسٹر جھلا کی تلاش ہے، وہ لاش بن جائے لیکن احساسات کسی نہ کسی طرح تکلا تے ضرور رہیں۔ مسٹر جھلا کو اب اس لاش سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اس سے دور رہتے ہیں، وہ ان کی ہمدردی چاہتی ہے، زندگی میں کشیدگی اور بدمزگی نہیں چاہتی، اس کے عقلی الجھاؤ کی گرہیں کھل گئی ہیں، اس کے شعور میں پھر کشمکش شروع ہو گئی ہے، وہ آگ کو ٹھنڈی آگ سمجھنا نہیں چاہتی، اپنی بہن رتنا کا بت سامنے ہے، وہ اس بت کے سامنے رقص کرتے کرتے تھک جانا نہیں چاہتی، رتنا کیا کہے گی؟ اس کے سامنے اس لڑکی کی کیا حیثیت ہو گی وہ دیکھے گی کہ اس کے گھنگھرو ٹوٹ گئے۔ اس کے پاؤں تھک گئے۔ موسیقی کا آہنگ ختم ہو گیا، اس کا پاؤں کس آواز کی لہر پہ اٹھے گا۔

یہ باتیں اس کے شعور اور لاشعور کو پریشان کرتی ہیں اور وہ بے شمار الجھنوں کی شکار ہو جاتی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اور مسٹر جھلا اس کی نگاہوں سے تمام روپے پیکر غائب ہو جاتے ہیں تو قوتِ خواہش اور دباؤ کی کشمکش اچھی طرح نمایاں ہوتی ہے، دبے ہوئے احساسات سامنے آتے ہیں اور وہ ایک ہسٹیریا کی مریضہ کی طرح ابھرتی ہے۔

"پدما اسی طیش سے جھلا کر کمرے میں گئی اور اس کی قدِ آدم تصویر جو ایک ہزار میں بنوائی تھی اٹھا کر اتنے زور سے پٹکا کر شیشہ چور چور ہو گیا، پھر اس تصویر کو دونوں ہاتھوں سے پھاڑا اور پلنگ سے پیروں سے خوب کچلا، اور دیا سلائی لگا دی اور پھر جھلا کے کپڑے، کتابیں، صندوق، جوتے، سگریٹ بکس اور صدہا سامان جو وہاں رکھے ہوئے تھے سب کو ایک جگہ جمع کر کے اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی اور بلند آواز میں بولی "شہدا، بدمعاش، حرام خور، خود دماغ، خود نفس....." (زادِ راہ ص ۱۵۹)

ترغیبِ خود (AUTOSUGGESTION) اور لاشعوری مخالف ارادہ (COUNTER-WILL) کی یہ ایک مکمل تصویر ہے۔ اسے اپنے وجود سے نفرت کا اظہار بھی سمجھنا چاہئے، وہ جھلا کی علامت کو توڑ کر جو ذہنی سکون حاصل کرنا چاہتی تھی وہ سکون نہیں ملا۔ اس لئے کہ جھلا اسی وقت آ جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وہ اسے آزما رہے تھے۔ اگر مسٹر جھلا نے آزمانے کیلئے یا جان بوجھ کر بیت خراب کر کے بھی ایسی حرکت نہ کرتے تو پدما کے کسمساتے ہوئے جذبات کا یہ بہاؤ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ پدما نے جھلا کے لئے روپے پیسے کی کبھی پرواہ نہ کی لیکن اس وقت اس نے اپنے لیٹے ہوئے نفسیاتی، جنسی اور جذباتی ہیجانات کے لئے ایسی خارجی شے کو ذریعہ اور سہارا بنایا۔ دبا ہوا مواد جس شدت سے ابل آتا ہے اس کا احساس اس کے شعور کو بھی اچھی طرح نہیں ہوتا شعور کو یہ پہچان لینا مشکل ہے کہ کیوں ہوا اور کیا ہوا؟ یہی وجہ ہے کہ پریم چند آخر میں پدما کو ایک بت کی طرح خاموش کھڑا کر دیتے ہیں۔ مسٹر جھلا کی تقریر سے پدما کے جذباتی المیہ کو سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔ شاید پدما وہ نہیں ہے جو مسٹر جھلا بتاتے ہیں ان کی واپسی کے متعلق بھی پدما کچھ نہیں سوچتی! اس لئے کہ مسٹر جھلا نے غور کر دیکھا تو وہ پتھر بن جائیں گے اور پدما کی جذباتی زندگی کی تکمیل کیلئے انسان چاہئے پتھر نہیں!

پریم چند نے عورتوں کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ذہن پر نظر رکھی ہے، شعور اور لاشعور کی کشمکش، مختلف خواہشات اور قوتِ نفسی، نرگسیت، جبری اعصابی خلل، خارجی واقعات کے اثرات، داخلی ہیجانات کا ابال اور ان کے لئے خارجی علامتوں کی تلاش، مہر پرستی، دوسری عورتوں کی زندگی کو نمونہ بنانے کی تمنا، نفسیاتی دباؤ، مختلف جذبات کا اظہار، اپنی ذات کو توجہ کا مرکز بنانے کی تمنا، نرگسی چہرے، فکری اور عقلی الجھاؤ اور احساسِ کمتری، واہمے اور خواب، جنسی جبلت کی روانی اور دل فریبی، نفسیاتی تعصب، فریبِ نظر (HALLACI NATIONS.) تحفظِ خود، اشاعتِ ذات (Self Propapagation) احساسِ شکست اور شکست کے بعد پہلی حالت میں لوٹنے کی خواہش، مراجعت (Regression) اور اپنی محبوب علامتوں سے نفرت کے بعد اسے بگاڑ کر پیش کرنے کی خواہش یہ تمام باتیں ان کے مختلف افسانوں میں ملتی ہیں۔ پریم چند کے فن کار دانوی کردار کتنا بڑا چیلنج ہے! کیا ہم اپنے مخصوص سماجی فارمولوں سے پریم چند کے فن کو سمجھ سکتے ہیں؟ یہ سوال اہم ہے۔

اُدیے نارائن تیواری
بہ۔ غلام رسول

ہندی (ہندی / اردو) کی ماہیئت و حقیقت
ایک ہندی عالم لسانیات کی نظر میں

(ڈاکٹر اُدیے نارائن تیواری ڈی فل ایم اے ہیں۔ آج کل الہ آباد یونیورسٹی میں ہندی کے صدر شعبہ ہیں۔ آپ نے اپنی ہندی کی لسانیاتی کتاب "ہندی بھاشا کا اُدگم اور اس کا وِکاس" (ہندی زبان کا ماخذ اور اس کا ارتقا) میں مذکورہ بالا لفظ پر لسانیاتی اور تحقیقاتی جو نظر ڈالی ہے وہ اردو علما کے لائق نقد و نظر ہے۔) (غ۔ ر)

ہندی لفظ کس طرح زبان زد ہوگیا؟ اس کی لمبی تاریخ ہے۔ زمانۂ قدیم میں شمالی بھارت کو بھارت کھنڈ اور جمبو جزیرے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بودھ مت کی پالی کتابوں میں بھی شمالی ہند کو "جمبو دیپ" ہی کہا گیا ہے۔

ہمارے ملک کا ہند نام اصل میں سندھو کا اِبدال ہے۔ ایران اور فارس کے باشندے دریائے سندھ کے کنارے والے صوبے کو ہند اور وہاں کے رہنے والوں کو "ہندو" کہتے تھے۔ (فارسی میں س 'ہ' سے تبدیل ہو جاتا ہے)۔ یونانیوں نے دریائے سندھ کو "اِنڈوس" ...اں کے باشندوں کو "اِنڈی ای" اور صوبے کو "اِنڈکے" اور "اِنڈکا" کے نام سے موسوم کیا۔ یہی آگے چل کر لاطینی شکل میں "انڈیا" بن گیا۔ ...ندا میں "انڈکا اور انڈیا" کا لفظ شمال مغربی صوبے کے لئے بولا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کے معنی میں وسعت پیدا ہوئی۔ بعد میں وہ سارے ...ک کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ادھر ملک کے معنی میں ہند کا لفظ فارس سے عرب پہنچا۔ جب عربوں نے سندھ فتح کیا تو ہند کے بجائے سندھ کہنے لگے۔ اس کی وجہ ...ی کہ "سندھ" صوبہ دراصل "ہند" ملک کا ایک حصہ تھا۔ اس "ہند" سے ہی "ہندی" لفظ بنا۔ ہندی کے ایک معنی ہندوستان کا رہنے والا (دیکھو اقبال کا ترانہ ــــ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا) لیکن امیر خسرو کے زمانے میں اس سے مراد بھارتی مسلمان تھا۔ امیر خسرو "ہندو اور ہندی" میں فرق ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے "بادشاہ نے ہندوؤں کو ہاتھی سے کچلوا ڈالا لیکن مسلمان جو ہندی تھے محفوظ رہے"[1] ...طرح غیر ملکی مسلمانوں نے ہندی مسلمانوں کو ہندی کہا اور آگے چل کر ان کی زبان کا نام بھی ہندی ہی پڑ گیا۔ یہ وہاں زبان تھی جسے کہ ہندو اور ہندی ...ان یکساں طور پر استعمال کرتے تھے۔ آخرکار زبان کے معنی میں ہندی کا لفظ مسلمانوں ہی کا دیا ہوا ہے جو قدیم ترین ہے۔

ہندی کے مختلف نام ــــ زبان کے معنی میں ہندی کے علاوہ "ہندوی"، "ہندوی"، "ہندوی"۔ دکھنی، دکھنی، دکنی یا دکنی ...ستانی، ہندوستانی، کھڑی بولی، ریختہ، ریختی، اردو وغیرہ ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ لہٰذا زبان کا مطالعہ کرنے والوں کو انھیں ...طرح سمجھ لینا چاہیے۔

ہندی ہماری زبان کا یہ نام اہم ترین ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ ارتقائی نظر سے اس کے نشو و نما کا حال مختصراً بیان ...کیا ہے۔

---

[1] امیر خسرو از الیٹ حصہ سوم ص ۵۳۹ ۔ ہابسن جابسن ص ۳۱۵

بھارت کی تاریخ میں دوآبہ گنگم (گنگا-جمنا کا درمیانی خطّہ) مقدس مانا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانے ہی سے ہمالیہ اور وندھیاچل کی درمیانی سرزمین آریہ ورت کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے درمیان مدھیا پردیش واقع ہے جو بھارتی علم و تہذیب کا مرکز ہے۔ سنسکرت، پالی، شورسینی، پراکرتیں مختلف زبانوں میں اس خطے کی زبانیں تھیں۔ زمانے کے بموجب اس پچھمی میں شورسینی اپبھرنش کی اشاعت ہوئی۔ یہ کھڑی (بول چال کی زبان) شورسینی-اپبھرنش ایک زمانے کے بعد ہندی کی شکل اختیار کی۔ اس پر پنجابی کا بھی بڑا اثر ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یکساں ورثہ ہے۔ چونکہ ہندی کا مرکز آریہ ورت ہے۔ اس لیئے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی نے اس کا آریہ بھاشا بھی نام رکھا ہے۔

<u>ہنڈوئی، ہنڈوی اور ہندوی</u> ـــــ بعض حضرات کے بیانات کے بموجب ہندوئی، ہندوی اور ہنڈوی دلی کے قرب و جوار کی وہ بولی اور زبان ہے جو ہندوؤں کے لیے رائج تھی اور جس میں فارسی-عربی لفظوں کی کمی تھی، مگر پنڈت چندر بلی پانڈے نے صریح طور پر ثابت کیا ہے کہ یہ بھی ہندی کے مانند تعلیم یافتہ ہندو مسلم حضرات کی زبان تھی۔ سید انشا کی تصنیف "رانی کیتکی کی کہانی" کی زبان ہندی چھٹ ہے اور اس میں کسی بولی کی پٹ نہیں ہے۔ اس کی زبان حسب ذیل خصوصیات کی حامل ہے:-

(۱) اس میں ہندی پن کی بڑی پابندی کی گئی ہے۔ (۲) اس میں بھاکا پن کو ترک کیا گیا ہے۔ (۳) اس کی زبان ایسی ہے جیسے شرفاء آپس میں اچھی طرح بات چیت کرتے ہیں (۴) اس پر کسی دوسری زبان کا پرتو نہیں پڑا ہے۔ دوسری زبان سے انشا کا مدعا بیرونی بولی ہے جن کا مطلب ہے ہندی کی بیرونی بولیاں یعنی عربی-فارسی، ترکی وغیرہ ہیں۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انشا اپنے نصب العین میں پورے کامیاب ہوئے ہیں اور آپ نے دوسری زبان کے لفظ کو کلیتہً متروک کیا ہے۔ اسی طرح بھاکا پن سے انشا کی مراد وہ گنوارو بولیاں ہیں جو اس زمانے میں محدود مرکز میں مروج تھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ شرفاء کون تھے؟ جو اس زبان کو استعمال کرتے تھے اور جن کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی۔ پانڈے جی نے دریائے لطافت کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ انشا کے قول کے مطابق دلی کے چیدہ لوگوں کی زبان ہی مستند ہے اور یہ منتخب لوگ بھی اکثر مسلمان ہی ہیں۔ اسی طرح سید انشا جس ہندوی-چھٹ میں کہانی لکھنے کا خیال ظاہر کرتے ہیں، اس کے بولنے والے دراصل وہ شرفاء ہیں جنھیں انشا زبان کے لحاظ سے مستند مانتے ہیں۔ اس تحقیق کے بعد ہندوئی، ہندوی اور ہنڈوی کو محض ہندوؤں ہی کی زبان قرار دینا کوئی قرین عقل بات نہیں ہے۔

<u>دَکھنی، دکھنی یا دکنی</u> ـــــ اس کا استعمال بھی ہندی کے مانند دو معنوں میں ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں دکن کا مسلمان باشندہ اور دوسرے معنی ہیں دکھنی یا دکنی زبان۔ ۱۸۸۶ء کی شائع شدہ ہابسن-جابسن لغت کے مطابق دکنی ہندستانی کی ایک انوکھی بولی ہے جسے دکن کے مسلمان بولتے ہیں۔ (۱) اسی لغت میں آگے چل کر ۱۵۱۶ء کی ایک مثال موجود ہے جس کی رو سے دکنی صوبے کی عام زبان ہے۔ (۲) اب سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں ملک کی عام زبان کون سی تھی؟ اس کا صاف جواب ہندی اور ہندوی ہے۔ اسی طرح دکھنی، ہندی ہی کا ایک اسلوب ہے۔ اس کا یہ نام ملک کے نام پر دیا گیا ہے اور اس میں بدیسی لفظوں (عربی-فارسی) کی تعداد نسبتہً کم ہوتی ہے۔

<u>ہندستھانی</u> ـــــ بنگال خاص کر کے کلکتے کے بنگالی، شمالی ہند کے باشندوں کو "پشچما" (ہندستھانی) اور ان کی زبان کو ہندستھانی کہتے ہیں۔ کلکتہ کے بالی گنج کا نام ہندستھان پارک ہے۔ ہندستان-پارک نہیں۔ اسی طرح زبان کے معنی میں ہندستھانی سے کلکتے میں ہندی ہی مراد ہے۔

<u>ہندوستانی یا ہندُستانی</u> ـــــ ہندستانی کی تحقیق ہندی سے بھی زیادہ دشوار ہے؟ کیونکہ زمانہ اور عوام کے حالات کے بموجب اس کی اصطلاح و تعریف میں ردوبدل ہو چکا ہے۔ اسی کے سبب شک و شبہ بھی کافی ہے۔ لہٰذا ذرا تفصیل کے ساتھ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔

---

(۱) دکنی (صفت) اسم کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے جو خاص کر دکن سے نکلی ہے۔ دکن کا مسلمان باشندہ ہے اور نیز ہندستانی کا نمونہ انوکھی بولی ہے ان لوگوں کے ذریعے بولی جاتی ہے۔ (۲) ابرلوبیا ص ۶۷، ہابسن-جابسن ص ۳۳-۳۴۔

عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ ہماری زبان کے لیے یہ نام یورپ کے لوگوں کی دین ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندی، ہندوی، ہندوی اور ہندوی کی طرح اس نام کے رکھنے والے بھی ترک فاتح تھے، البتہ اس کے عام رواج دینے میں یورپ والوں کا خاص ہاتھ رہا ہے۔

پنڈت للتا پرشاد شکل نے "یہ بدنام ہندستانی" عنوان والے مضمون میں واضح کیا ہے کہ جب بابر نے دولت خاں لودی کے مقابلے میں فتح حاصل کی اور جب وہ اس کے سامنے لایا گیا تو ایک ترجمان کے ذریعے بابر نے اس کو ہندستانی میں سمجھایا۔ بابر نے خود تو سوانح حیات یعنی تزک بابری سے نیچے کی مثال پیش کی ہے:—

"میں نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور اسے یقین دلانے کے لیے ایک شخص کے ذریعے جو ہندستانی زبان جانتا تھا ایک ایک جملے کا مطلب واضح کرایا۔" (۳)

شکل جی کا خیال ہے کہ زبان کے معنی میں ہندستانی کا نام پندرھویں صدی ہی میں یہاں ایرانیوں اور ترکوں کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔ اس کا ثبوت ہابسن جابسن کے ۱۶۱۶ء کی مثال سے بھی ملتا ہے۔

۱۶۱۶ء — اس کے بعد انھوں نے (مسٹر ٹام کوریٹ نے) اِن ہندوستانی اور گنواری زبان میں کمال مہارت حاصل کر لی۔ سفیر موصوف (مسٹر کوریٹ) کے رہائشی مقام پر ایک ایسی زبان دراز عورت تھی جو صبح سے لے کر شام تک ڈانٹ ڈپٹ، بحث تکرار اور گالی گلوچ کیا کرتی تھی۔ ایک دن انھوں نے اسے اسی کی زبان میں ڈانٹا اور آٹھ بجے تک اس کی ایسی درگت بنائی کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔" (۴)

اوپر کی دونوں مثالوں سے واضح ہے کہ ہندستانی سے صاف مطلب ہندی ہی ہے۔ بابر کے زمانے میں تو اردو نام کا ذکر بھی نہ تھا۔ ۱۶۱۶ء کی مثال میں ہندستانی کو صاف طور پر گنواری زبان کہا گیا ہے، لہٰذا یہاں ہندستانی سے کسی طرح بھی اردو مراد نہیں ہو سکتی۔

ہندستانی کی حقیقت کا حال ہابسن جابسن (۱۸۸۶) میں حسب ذیل بیان کیا گیا ہے۔ (۵)

لفظ ہندستانی اصل میں صفت ہے مگر اسم کی حالت میں اس کے دو معنے ہوتے ہیں (ا) ہندستان کا باشندہ (ب) ہندستانی زیادہ تر ہندوستانی کی وہ زبان جو اصل میں شمالی ہند کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہی دکنی مسلمانوں کی بھی زبان ہے۔ آگرہ اور دلی کے آس پاس کی ہندی فارسی اور دوسرے غیر ملکی لفظوں سے مل جل کر نشو و نما پائی ہے۔ اس کا دوسرا نام اردو بھی ہے۔ اسلامی حکومت کے دور میں یہ صوبائی کاروبار کی زبان تھی۔ یہ ملک کے بڑے حصے میں اور کمتر درجے کے لوگوں میں اسی طور پر مستعمل تھی۔ مدراس میں اگرچہ اس کا ایہ کم چلن ہے۔ تاہم وہاں بھی دیسی سپاہی اپنے افسروں سے اسی میں بات چیت کرتے ہیں۔ پرانے انگلو انڈین اسے مُور (Moors) کہا کرتے تھے۔

اوپر کی مثال سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۶ ویں صدی میں ہندستانی کا لفظ اردو کے لیے بولا جاتا تھا۔ اسی کو انگلو انڈین بھی مُور ہی بولتے ہیں۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ مُور کون تھے اور ان کی زبان کی شکل صورت کیا تھی؟ اسپین اور پرتگال کے لحاظ سے مُور مسلمان تھے۔ ۱۶۹۹ء کی ایک مثال کی رو سے مُور سے مسلمان ہی مراد ہے۔ (۶)

---

(۳) مے مائرس آف بابر، بیوریج اس، کنگ ایڈیشن جلد دوم ص ۱۷۰۔
(۴) ہابسن جابسن ص ۴۱۷
(۵) ہابسن جابسن ص ۴۱۷
(۶) " " ص ۵۹۲

بھارت کی تاریخ میں وہ آبہ گنجم (گنگا و جمنا کا درمیانی خطّہ) مقدس مانا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانے ہی سے ہمالیا اور وندھیاچل کی درمیانی سرزمین آریہ ورت کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے درمیان مدھیا پردیش واقع ہے جو بھارتی علم و تہذیب کا مرکز ہے۔ سنسکرت، پالی، شورسینی، پراکرتین مختلف زبانوں میں اس خطے کی زبانیں تھیں۔ زمانے کے بموجب اسی صوبے میں شورسینی اپبھرنش کی اشاعت ہوئی۔ یہ بھی (بول چال کی زبان) شورسینی و اپبھرنش ایک زمانے کے بعد ہندی کی شکل اختیار کی۔ اس پر پنجابی کا بھی بڑا اثر ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یکساں ورثہ ہے۔ چونکہ ہندی کا مرکز آریہ ورت ہے۔ اس لیئے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی نے اس کا آریہ بھاشا بھی نام رکھا ہے۔

ہنڈوی، ہندوی اور ہندوی ــــ بعض حضرات کے بیانات کے بموجب ہندوی، ہندوی اور ہندوی دلی کے قریب وجوار کی وہ بولی اور زبان ہے جو ہندوؤں کے توسط سے رائج تھی اور جس میں فارسی و عربی لفظوں کی کمی تھی، مگر پنڈت چندربلی پانڈے نے صریح طور پر ثابت کیا ہے کہ یہ بھی ہندی کے مانند تعلیم یافتہ ہندو مسلم حضرات کی زبان تھی۔ سید انشا کی تصنیف "رانی کیتکی کی کہانی" کی زبان ہندی چھٹ ہے اور اس میں کسی بولی کی ٹپ نہیں ہے۔ اس کی زبان حسب ذیل خصوصیات کی حامل ہے :-

(۱) اس میں ہندی پن کی بڑی پابندی کی گئی ہے۔ (۲) اس میں بھاکا پن کو ترک کیا گیا ہے۔ (۳) اس کی زبان ایسی ہے جیسے شرفاء آپس میں اچھی طرح بات چیت کرتے ہیں (۴) اس پر کسی دوسری زبان کا پرتو نہیں پڑا ہے۔ دوسری زبان سے انشا کا مدعا بیرونی بولی ہے جن کا مطلب ہے ہندی کی بیرونی بولیاں یعنی عربی و فارسی، ترکی وغیرہ ہیں۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انشا اپنے نصب العین میں پورے کامیاب ہوئے ہیں اور آپ نے دوسری زبان کے لفظ کو کلیتہً متروک کیا ہے۔ اسی طرح بھاکا پن سے انشا کی مراد وہ گنوارو بولیاں ہیں جو اس زمانے میں محدود مرکز میں مروج تھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ شرفاء کون تھے؟ جو اس زبان کو استعمال کرتے تھے اور جن کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی۔ پانڈے جی نے دریائے لطافت کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ انشاء کے قول کے مطابق دلی کے چیدہ لوگوں کی زبان ہی مستند ہے اور یہ منتخب لوگ بھی اکثر مسلمان ہی ہیں۔ اسی طرح سید انشا جس ہندوی و چھٹ میں کہانی لکھنے کا خیال ظاہر کرتے ہیں، اس کے بولنے والے دراصل وہ شرفاء ہیں جنھیں انشاء زبان کے لحاظ سے مستند مانتے ہیں۔ اس تحقیق کے بعد ہندوی، ہندوی اور ہندوی کو محض ہندوؤں ہی کی زبان قرار دینا کوئی قرین عقل بات نہیں ہے۔

دکھنی، دکھنی یا دکنی ــــ اس کا استعمال بھی ہندی کے مانند دو معنوں میں ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں دکن کا مسلمان باشندہ اور دوسرے معنی ہیں دکھنی یا دکنی زبان۔ ۱۸۸۶ء کی شائع شدہ ہابسن جابسن لغت کے مطابق دکنی ہندستانی کی ایک اوکھی بولی ہے جسے دکن کے مسلمان بولتے ہیں۔ (۱) اسی لغت میں آگے چل کر ۱۵۱۶ء کی ایک مثال موجود ہے جس کی رو سے دکنی صوبے کی عام زبان ہے۔ (۲) اب سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں ملک کی عام زبان کون سی تھی؟ اس کا صاف جواب ہندی اور ہندوی ہے۔ اسی طرح دکھنی، ہندی ہی کا ایک اسلوب ہے۔ اس کا یہ نام ملک کے نام پر دیا گیا ہے اور اس میں بدیسی لفظوں (عربی و فارسی) کی تعداد نسبتہً کم ہوتی ہے۔

ہندستھانی ــــ بنگال خاص کر کے کلکتے کے بنگالی، شمالی ہند کے باشندوں کو "لیش چا" (ہندستھانی) اور ان کی زبان کو ہندستھانی کہتے ہیں۔ کلکتے کے بالی گنج کا نام ہندستھان پارک ہے۔ ہندستان پارک نہیں۔ اسی طرح زبان کے معنی میں ہندستھانی سے کلکتے میں ہندی ہی مراد ہے۔

ہندوستانی یا ہندستانی ــــ ہندستانی کی تحقیق ہندی سے بھی زیادہ دشوار ہے؟ کیونکہ زمانہ اور عوام کے حالات کے بموجب اس کی اصطلاح و تعریف میں رد و بدل ہو چکا ہے۔ اسی کے سبب شک و شبہ بھی کافی ہے۔ لہٰذا ذرا تفصیل کے ساتھ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔

---

(۱) دکنی (صفت) اسم کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے جو خاص کر دکن سے تعلق ہے۔ دکن کا مسلمان باشندہ ہے اور نیز ہندستانی کی وہ اوکھی بولی ہے جو ان لوگوں کے ذریعے بولی جاتی ہے۔　(۲) ہابسن جابسن صـ۳۰۲ ، ہابسن و جابسن صـ۳۲-۳۳۔

عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ ہماری زبان کے لیئے یہ نام یورپ کے لوگوں کی دین ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندی، ہندوی، ہندوی اور ہندوی کی طرح اس نام کے رکھنے والے بھی ترک فاتح تھے، البتہ اس کے عام رواج دینے میں یورپ والوں کا خاص ہاتھ رہا ہے۔

پنڈت للتا پرشاد شکل نے "یہ بدنام ہندستانی" عنوان والے مضمون میں واضح کیا ہے کہ جب بابر نے دولت خاں لودی کے مقابلے میں فتح حاصل کی اور جب وہ اس کے سامنے لایا گیا تو ایک ترجمان کے ذریعے بابر نے اس کو ہندستانی میں سمجھایا۔ بابر نے خود نوشتہ سوانح حیات یعنی تزک بابری سے نیچے کی مثال پیش کی ہے :۔

"میں نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور اسے یقین دلانے کے لیے ایک شخص کے ذریعے جو ہندستانی زبان جانتا تھا ایک ایک جملے کا مطلب واضح کرایا۔" (۳)

شکل جی کا خیال ہے کہ زبان کے معنی میں ہندستانی کا نام پندرھویں صدی ہی میں یہاں ایرانیوں اور ترکوں کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔ اس کا ثبوت ہابسن جابسن کے ۱۶۱۶ء کی مثال سے بھی ملتا ہے۔

۱۶۱۶ء — اس کے بعد انھوں نے (مسٹر ٹام کوریٹ نے) اٹالین، ہندستانی اور گنواری زبان میں کمال مہارت حاصل کر لی۔ سفیر موصوف (مسٹر کوریٹ) کے رہائشی مقام پر ایک ایسی زبان دراز عورت تھی جو صبح سے لے کر شام تک ڈانٹ ڈپٹ، بحث تکرار اور گالی گلوچ کیا کرتی تھی۔ ایک دن انھوں نے اسے اسی کی زبان میں ڈانٹا اور رات تک اس کی ایسی درگت بنائی کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ (۴)

اوپر کی دونوں مثالوں سے واضح ہے کہ ہندستانی سے صاف مطلب ہندی ہی ہے۔ بابر کے زمانے میں تو اردو نام کا ذکر بھی نہ تھا بلکہ ۱۶۱۶ء کی مثال میں ہندستانی کو صاف طور پر گنواری زبان کہا گیا ہے! لہٰذا یہاں ہندستانی سے کسی طرح بھی اردو مراد نہیں ہو سکتی!

ہندستانی کی حقیقت کا حال ہابسن جابسن (۱۸۸۶ء) میں حسب ذیل بیان کیا گیا ہے۔ (۵)

لفظ ہندستانی اصل میں صفت ہے مگر اسم کی حالت میں اس کے دو معنے ہوتے ہیں (ا) ہندستان کا باشندہ (ب) ہندستانی زیادہ تر ہندوستانی کی وہ زبان جو اصل میں شمالی ہند کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہی دکنی مسلمانوں کی بھی زبان ہے آگرہ اور دلی کے آس پاس کی ہندی فارسی اور دوسرے غیر ملکی لفظوں سے مل جل کر نشو و نما پائی ہے۔ اس کا دوسرا نام اردو بھی ہے۔ اسلامی حکومت کے دور میں یہ بیرونی صوبائی کاروبار کی زبان تھی۔ یہ ملک کے بڑے حصے میں اور کمتر درجے کے لوگوں میں اسی طور پر مستعمل تھی۔ مدراس میں اگرچہ اس کا بہت کم چلن ہے۔ تاہم وہاں بھی دیسی سپاہی اپنے افسروں سے اسی میں بات چیت کرتے ہیں۔ پرانے اینگلو انڈین اسے مُور (Moors) کہا کرتے تھے۔

اوپر کی مثال سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۶ ویں صدی میں ہندستانی کا لفظ اردو کے لیے بولا جاتا تھا۔ اسی کو اینگلو انڈین بھی مُور کہا کرتے ہیں۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ مُور کون تھے اور ان کی زبان کی شکل صورت کیا تھی؟ اسپین اور پرتگال کے لحاظ سے مُور مسلمان تھے۔ ۱۵۹۹ء کی ایک مثال کی رو سے مُور سے مسلمان ہی مراد ہے۔ (۶)

---

(۳) میمائرس آف بابر، لیڈن ارسکن کنگ ایڈیشن جلد دوم ص۱۷۰۔

(۴) ہابسن جابسن ص۳۱۷　　　(۵) ہابسن جابسن ص۳۱۷

(۶) " " ص۴۱۵

آگے چل کر اسی لغت میں مورزبان کی اصل صورت حسب ذیل درج کی گئی ہے (۷)

مورزبان کا رسم خط سنسکرت اور بنگلہ سے جدا ہے اسے ناگری کہتے ہیں۔ (۸)

اس طرح مسلمانوں کی مورزبان کی صورت کیا تھی وہ واضح ہو جاتی ہے۔ یہ ہندی کا کے سوائے کوئی زبان نہیں تھی اور اس کا رسم خط بھی ناگری ہی تھا۔

مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ابتداء میں کس طرح ہندوستانی لفظ بھی ہندی ہی کا مترادف تھا۔ بعد ازاں ۱۹ویں صدی میں یہ لفظ اردو سے موسوم ہو گیا۔ اردو کے معنے میں اس کے استعمال کرنے میں انگلو انڈین اور یورپ کے لوگوں کا خاص ہاتھ تھا۔ آگے چل کر ہندوستانی کی آڑ میں اردو کو اتنا فروغ دیا گیا اور اردو و ہندی کے جھگڑے کو اس قدر بڑھایا گیا کہ ایک ہی زبان کے ان دو اسلوبوں کے امتزاج کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ اس میں گہری سامراجیت کی چال تھی۔ اگرچہ کانگریس کا جنم ۱۸۸۵ء میں ہوا، تاہم اس کے پہلے ہی دور اندیش انگریزوں نے ہندوستان کی بیداری کو ٹھیک طور پر محسوس کر لیا اور اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے کہ مستقبل میں قومیت کی باڑھ کو روکنا ناممکن ہوگا اور ان کا یہ بھی تصور رہا کہ اس کا علاج بجز ہندو مسلم نفاق کے کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں رہنے والے یوروپین کے اسکولوں اور کالجوں میں اردو ہی کو منظور و قبول کیا گیا۔ زیادہ تر مشنریوں اور انگلو انڈین لوگوں نے بھی اردو کی حوصلہ افزائی کی اور اسی طرح اردو و ہندی کا جھگڑا ۱۹ویں صدی کے وسط میں شدید ہو گیا۔ اس کے بارے میں ۱۸۷۴ء کے ہریش چندر میگزین بنارس میں بنگال میگزین سے "کامن ہندوستانی" کے عنوان کے تحت جو مضمون ماخوذ ہے وہ لائق ملاحظہ ہے۔ "اردو لشکری زبان جس کی ساخت میں پہلے کافی حوصلہ افزائی ہوئی وہ اس جدید اردو سے جس کی سرپرستی انگریزوں اور ان کے مقلدوں یعنی دفتری کارکنوں کے ہاتھوں ہوئی کہیں زیادہ مختلف تھی۔" آگے چل کر اسی مضمون میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مغل شہنشاہیت کے زوال کے بعد سے اردو اور ہندی زبانیں دو نہایت ہی مختلف سمتوں میں بڑھ رہی تھیں۔ (۹)

لنگوسٹک سروے کے زمانے (جلد ۹ حصہ ۱ مغربی ہندی کی اشاعت ۱۹۱۶ء میں ہوئی) میں ہندی اور اردو میں کافی فرق آ گیا تھا۔ ادھر یورپ کے صاحب لوگ اور اکثر اردو کے مربی بنے ہوئے تھے۔ لہٰذا ہندی، اردو اور ہندوستانی کے مفہوم کے بارے میں کافی تاریخی مواد دستیاب ہونے کے باوجود، گریرسن جیسے عالم لسانیات نے بھی اس کی نسبت اس زمانے کے شائع شدہ خیالات و آرا ہی پر محض اکتفا کیا۔ گریرسن نے ہندوستانی، اردو اور ہندی کے متعلق مسٹر گراوس کی مندرجہ ذیل تعریف قبول کر لی۔

"ہندوستانی خاص شکل کے لحاظ سے گنگا کے دوآبے کی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کے بین صوبائی کاروبار کا ذریعہ ہے۔ یہ فارسی اور دیوناگری دونوں حصوں میں لکھی جا سکتی ہے اور اس کے ادبی اسلوب میں زیادہ تر فارسی اور سنسکرت لفظوں کا تفاوت رہتا ہے۔ پس اردو، ہندوستانی کا وہ اسلوب ہے جس میں فارسی لفظ زیادہ تعداد میں شامل ہوتے ہیں اور جو صرف فارسی خط میں لکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ہندی، ہندوستانی کا وہ اسلوب ہے جس میں سنسکرت لفظوں کی آمیزش ہوتی ہے اور جو فقط دیوناگری خط میں لکھی جا سکتی ہے۔" (۱۰)

گریرسن کی رائے کے مطابق ادبی زبان کی شکل میں ہندوستانی کے قدیم ترین نمونے اردو یا ریختہ میں ملتے ہیں۔ ادب میں اس کا سب سے پہلے

---

(۷) ہابسن و جابسن صفحہ ۴۲۶

(۸) ہابسن و جابسن صفحہ ۴۲۳

(۹) ہریش چندر میگزین ۱۸۷۴ء صفحہ ۱۲۹

(۱۰) لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد (۹) حصہ اول صفحہ ۴۷

استعمال ۱۶ ویں صدی میں دکن میں آغاز ہوا تھا۔ اس کے سو برس بعد ریختے کے بابا ولی اورنگ آبادی نے اسے مستند شکل میں پیش کیا۔ ولی کے طرز پر دلی میں بھی اس میں شعر و شاعری ہونے لگی، جہاں کئی شعرا گزرے۔ ان میں سودا (وفات ۱۷۸۰ء) اور میر تقی (وفات ۱۸۱۰ء) وغیرہ قابل ذکر تھے۔ گریرسن کے بموجب ہندستانی کا لفظ یورپ والوں کی دین ہے۔ :

جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، گو یہ سچ نہیں ہے، تاہم تھوڑی دیر کے لئے یہ بات مان بھی لی جائے تو پھر فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ یورپ کے باشندوں کی آمد سے پہلے ہماری زبان کا نام کیا تھا؟ اس کے علاوہ گریرسن کے قول کے مطابق غور و خوض کرنے پر بھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندستانی، ریختہ، اردو، دکھنی وغیرہ مترادفات ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ گریرسن کے ذریعہ اگر اس کی ہندستانی کی تعریف مان لینے کی وجہ سے بھی لوگوں کو زبان کے بارے میں کئی ایک شبہات پیدا ہوئے۔ اس تعریف میں کافی کشش ہے اور وقتاً فوقتاً ملک کے قائدین نے زبان کے مسئلے کے سلجھانے میں اس کی تقلید بھی کی ہے۔ مگر اس بات پر بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہے کہ یہ تعریف کلیتہً فرضی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ شمالی ہند میں ہندستانی کی شکل میں کبھی کوئی ایسی عام زبان وجود میں نہیں آئی جس کو ہندو مسلم یکسانیت کے ساتھ استعمال کرتے تھے اور جو ناگری اور فارسی خطوں میں بھی جاتی تھی۔ پادری کے۔ ایس۔ لاگ نے شمالی ہند کی زبان کی نسبت اس کی حیثیت ظاہر کرتے ہوئے اپنی گرامر کے دیباچہ (۱۸۷۵ء) میں لکھا ہے:-

"بھارت کی ۲۵ کروڑ مختلف زبانوں والی جنتا میں سے چھ سات کروڑ ہندی زباں داں ہیں۔ شمالی ہند میں ہندی، بنارس، الہ آباد، متھرا سے لے کر ہمالیہ کے گنگوتری، کدار ناتھ اور بدری ناتھ تک بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مہاراجہ سندھیا، جے پور اور کئی راجپوت راجاؤں کی حکومتوں میں بھی رائج ہے۔ مختصراً اس کا پھیلاؤ چوبیس لاکھ مربع میل کے رقبے میں ہے۔ صرف بڑے بڑے شہروں میں مسلمان اور سرکاری دفتروں کی بدولت فارسی آمیز ہندی کا (جسے اردو بھی کہتے ہیں) استعمال ہوتا ہے۔"

اوپر کی مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کی اشاعت محض شہری مسلمانوں اور سرکاری دفتروں سے تعلق رکھنے والوں کی حد تک محدود ہے۔ باقی ہندو اور مسلمان عوام ہی ہندی داں ہیں۔ ایک بات اور گریرسن نے ہندی کو ہندستانی کا ایک اسلوب ضرور مانا مگر انھوں نے نہ تو ہندی لفظ کی حقیقت ہی بیان کی اور نہ ہی ہماری زبان کے قدیم نام کے بارے ہی میں اپنا کوئی خیال ظاہر کیا۔ اردو کے خد و خال اور اس کے نام وغیرہ کی بابت بھی انھوں نے پورے طور پر تحقیق نہیں کی اور فورٹ ولیم کالج کے منشی میر امن کی باغ و بہار کی تعریف کو مان لیا اور اردو کی نسبت آئندہ بھی خیال ظاہر کیا جانے لگا۔ اب یہاں سب سے پہلے گریرسن کی ہندستانی کی نسبت روشنی ڈالی جاتی ہے۔

گریرسن کے بموجب ہندستانی اور ورناکیولر ہندستانی ہی اصل زبان ہے۔ جغرافیائی نقطۂ نظر سے اس کی حد گنگا کا بالائی دوآبہ اور مغربی روہیلکھنڈ ہے۔ اسی ورناکیولر ہندستانی ہی سے ایک جانب ادبی ہندستانی (اردو) اور دوسری طرف ادبی ہندی کا نشو و نما ہوا ہے۔ ادبی ہندستانی کے قدیم نمونے دکھنی میں ملتے ہیں اور بعد میں دلی اور اورنگ آبادی نے اسی میں شاعری کی ہے۔ آخر میں اس کی تبدیل شدہ شکل اردو میں نمودار ہوئی۔ ہندستانی کا خد و خال تعین کرتے ہوئے گریرسن پھر لکھتے ہیں " ہندستانی کے ہر ایک اسلوب میں فارسی لفظوں کو جگہ دی گئی ہے۔ ہندی کی گنوارو بولیوں تک میں بھی یہ موجود ہیں اور بنارس کے ہریش چندر جیسے اہل قلم نے بھی ان کا استعمال کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب کوئی لفظ ہندستانی میں جگہ پا لیتا ہے۔ چاہے وہ جہاں سے بھی آیا ہو۔ اس کے استعمال کی نسبت اعتراض کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ ذاتی یہ سوال قابل غور و بحث ہے کہ کس لفظ کو شہری کا حق حاصل ہونا چاہیئے اور کس کو نہیں ؟ ؟ حاصل کلام یہ اسلوب کا سوال ہے اور انگریزی کی طرح ہندستانی کے بھی کئی اسلوب ہیں ؟ (۱۱) موضوع کی نسبت جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان سب لفظوں کو جن کے شہری ہونے میں شبہ ہو ہندستانی سے الگ رکھنا ہی پسند کرتا ہوں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ مانتا ہوں کہ یہ بھی اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔

(۱۱) لنگوسٹک سروے آف انڈیا۔ جلد ۹، حصہ اول، ص ۴۳

اوپر کی مثال میں گریرسن نے ہندستانی کی جو صورت گری پیش کی ہے وہ آسان ہندی کے سوا کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔ آپ ہندستانی کے اندر ان ہی غیر ملکی لفظوں کے داخل کرنے کے حامی ہیں جو ٹھیٹھ دیہاتی بولیوں میں تک گھل مل گئی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ہندستانی میں ان ہماری معمول لفظوں کے اشتراک کے بھی طرف دار نہیں جو عام چلن سے خارج ہیں۔ گریرسن کی ہندستانی میں عربی و فارسی لفظ بھی شامل ہیں۔ مگر یہ الفاظ ضرورت کے لحاظ سے اکثر جدید حاضر کی تمام آریائی زبانوں میں آئے ہیں۔ چنانچہ بنگلے میں عربی و فارسی کے کل مستعار لفظوں کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب ہے۔ ہندی میں اس کے بارے میں خاص تحقیق نہیں ہوئی ہے لیکن قیاساً اس قسم کے لفظوں کی تعداد ایک لاکھ میں تین ساڑھے ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ڈاکٹر گریرسن نے اپنی لنگوسٹک سروے میں شمالی ہند کی مختلف بولیوں کی جو مثالیں دی ہیں ان میں عربی فارسی لفظوں کی تعداد اکثر ناقابل شمار ہے۔

<u>کانگریس کی ہندستانی</u> — کانگریس نے ہندستانی کو کب اور کیسے قبول کیا؟ اسے سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا پڑے گا۔ کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں عمل میں آیا۔ اس نے بانی مسٹر ہیوم کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہندستانی قانونی طور پر حکومت میں جگہ حاصل کریں مگر پندرہ برس کے بعد پنڈت بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور وپن چندر پال جیسے قائدین کی جدوجہد کی بدولت کانگریس انقلابی ادارے میں منتقل ہونے لگی۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک کا درمیانی تاریخ حقیقۃً بھارتیوں کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ ہے۔ اسی زمانے میں لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کیا۔ اس کے باعث بنگال میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوا۔ اسی اثنا میں سورت کے کانگریس کے اجلاس میں انقلاب پسند جماعت کو فتح حاصل ہوئی اور ہندستان کی اعتدال پسند جماعت (Moderate party) کا کانگریس سے ہمیشہ کے لیے اخراج ہوگیا۔ ادھر غیر ملکی حالات کے مدنظر ہندستانی انقلابیوں کی ایک جماعت منظم ہوئی جس میں مہاراشٹر، بنگالی، پنجابی، گجراتی وغیرہ سبھی صوبوں کے نوجوان شامل تھے۔ اسی زمانے میں قومیت کی جو لہر اٹھی اس نے قومی زبان کی طرف بھارتی نوجوانوں کی توجہ مبذول کرائی اور نتیجۃً قومی زبان کی تشکیل یا ہندوستانی قومیت کی غیر منقسم عنصر بنتی گئی۔ ادھر شمالی ہند میں بھی ہندی کو فروغ دینے اور اسے قومی زبان کے درجے پر پہنچانے کی تحریک چل پڑی اور یہ سراسر فطری بات تھی۔ ہندی، شمالی ہند کے عوام کی قومی زبان تھی مگر اسے دفتروں اور سرکاری اداروں میں موزوں مقام حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس تحریک کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ تھے۔ ان کا ادعا تھا کہ اُتر پردیش (اس وقت کا صوبہ متحدہ) کے دفتروں میں تبدیل شدہ شکل کی ہندی میں لکھی ہوئی عرضیاں اور درخواستیں بھی لی جایا کریں۔ اس کے لیے لاکھوں آدمیوں کے دستخط کرا کے اس وقت کے گورنر مسٹر انتھونی میکڈانل کے پاس عرضداشت بھیجی گئی۔ اس کام میں الہ آباد کے ایک نوجوان قومی کارکن بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے بھی مالویہ جی کا ساتھ دیا۔ ۱۸۹۳ء میں قائم شدہ ناگری پرچارسبھا کاشی نے بھی اس تحریک میں مالویہ جی کا ہاتھ بٹایا۔ آگے چل کر ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو ہندی ساہتیہ سمیلن قائم ہوئی۔ اس کا پہلا اجلاس ناگری پرچارسبھا کی نگرانی میں بنارس ہی میں ہوا اور اس کے پہلے معتمد پرشوتم داس ٹنڈن نامزد ہوئے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے پہلے قواعد وضوابط ہی میں ہندی کو قومی زبان اور دیوناگری کو قومی رسم خط قرار دیا۔

<u>ہندی ساہتیہ سمیلن کے ساتھ گاندھی جی کا تعاون</u> — ۱۹۱۵ء میں گاندھی جی جنوبی آفریقہ سے ہندستان آئے۔ ایک مرتبہ انھوں نے بابو پرشوتم داس ٹنڈن کو اپنے ایک خط میں لکھا "میرے لیے ہندی کا سوال تو سوراج کا سوال ہے"۔ ٹھیک یہی بات ٹنڈن جی کے دل میں بھی تھی۔ لہٰذا یہ دونوں ہم مقصدی ایک دوسرے سے آملے۔ ۱۹۱۷ء میں ٹنڈن جی کی تحریک پر گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن کے اندور کے اجلاس میں سمیلن کے صدر ہوئے۔ بعد ازاں دوسری دفعہ بھی ۱۹۲۴ء میں اندور ہی میں آپ سمیلن کے صدر بنے۔ سمیلن میں گاندھی جی کی شرکت سے ہندی و قومی زبان کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مہاتما جی کی ترغیب سے سمیلن کی نگرانی میں

دکن میں ہندی کا پرچار شروع ہوا اور دکن بھارت پرچار سبھا کی بنیاد پڑی۔ ۱۹۲۳ء کے بعد رفتہ رفتہ گاندھی جی کل ہند کے قابل احترام بابائے قوم اور کرتا دھرتا بن گئے۔

دوسرے سیاسی کاروبار کے ساتھ ہی ساتھ قومی زبان ہندی کا بھی تصور ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہا۔ کانپور کانگریس میں ہندستانی کی تجویز ۱۹۲۵ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کانپور ہی میں منظور ہوئی۔ اگرچہ کانگریس کے منچ (اسٹیج) سے چند ہی قائدین ہندی میں تقریر کرتے تھے تاہم کانگریس کی ساری کارروائی میں انگریزی ہی چھائی ہوئی تھی۔ اسے قومیت کے خلاف سمجھ کر بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے یہ تجویز پیش کی کہ کانگریس کی کارروائی آئندہ سے ہندستانی میں ہو۔ ہندستانی سے ٹنڈن جی کی مراد مصنوعی زبان نہ تھی بلکہ انھوں نے اس لفظ کو ہندی اور اردو کے مقام پر ہی استعمال کیا تھا۔ اس وقت کی حالت کو دیکھتے ہوئے کوئی دوسری بات ممکن بھی نہ تھی۔ ٹنڈن جی کا خاص مقصد یہ تھا کہ کسی طرح کانگریس جیسی قومی ادارے کو انگریزی سے مستقلاً چھٹکارا ملے۔ تجویز منظور ہو گئی مگر اس کے بعد بھی شمالی ہند اور بنگال اور کانگریس والوں پر پورے طور پر انگریزی ہی کا عمل دخل رہا۔

<u>گاندھی جی ہندستانی کے طرفدار</u> — یہ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ گاندھی جی ۱۹۳۵ء میں اندور ہندی ساہتیہ سمیلن کے دوبارہ صدر ہوئے۔ تاریخ ہند میں ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ جس طرح سیاسی نقطۂ نظر سے اہم سمجھا جاتا ہے اسی طرح وہ قومی زبان کی نظر سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ مہاتما جی کی ترغیب سے ۱۹۳۶ء میں مدراس کو چھوڑ کر باقی غیر ہندی صوبوں (سندھ، گجرات، مہاراشٹرا، اتکل، بنگال اور آسام وغیرہ) میں ہندی کی اشاعت کے لئے قومی زبان کی پرچار سمیتیوں کے قیام کی تجویز منظور کی گئی۔ ناگپور کے سمیلن کے جس ۲۵ ویں اجلاس میں یہ تجویز پاس ہوئی اس کے صدر بابو راجندر پرشاد جی تھے۔ اس کی تشکیل سمیلن کے اجلاس کے اندر ہی عمل میں آئی اور اس کا ادارہ وردھا میں قائم کیا گیا۔ ان سمیتیوں کی جدوجہد سے امتحانات اور دوسرے کاروبار کے ذریعے قومی زبان کی نشر و اشاعت کا کام غیر ہندی صوبوں میں خوب زوروں پر چلنے لگا۔ ادھر اسی زمانے میں فرقہ واریت اور پاکستان کے خیالات کے حامل ایک خاص طبقے نے بھی اردو ملک گیر تبلیغ و اشاعت کے لئے دلی میں انجمن ترقی اردو قائم کی۔ بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی بنگلہ زبان میں کوئی فرق نہ تھا مگر وہاں بھی بنگلے میں عربی و فارسی لفظوں کی آمیزش کر کے مسلمانوں کی زبان کو الگ کرنے کی کوشش کی جانے لگی جس کی رابندر ناتھ ٹیگور جیسی شخصیت کو بھی مخالفت کرنی پڑی۔ پاکستانی خیالات کے حامی ہندی کی نشر و اشاعت سے زیادہ ناراض تھے۔ انھیں ابھی تک یہ یقین ہونے نہ پایا تھا کہ پاکستان بن بھی جاسکے گا، مگر ان لوگوں میں اچھی طرح ذہن نشین تھا کہ گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد اور اکھنڈ بھارت کے لیے بے چین اور مضطرب ہیں۔ پھر کیا تھا موزوں موقع دیکھ کر ان لوگوں نے گاندھی جی کے ہندی پرچار کے کام پر کڑی تنقید کرنی شروع کر دی۔ اس کا گاندھی جی پر کافی اثر ہوا۔ انھوں نے قومی زبان کے لئے ہندی و ہندستانی نام کی تجویز پسند کی۔ فرقہ واریت کے خیالات والوں کو ہندستانی (= اردو) کے ساتھ ہندی کی شمولیت پسند نہ آئی۔ انھوں نے گاندھی جی کے خلاف اپنی تحریک کو جاری رکھا۔ آخر کار ان کی خواہش پوری ہوئی۔ گاندھی جی نے آگے چل کر قومی زبان کے نام سے ہندی لفظ کو نکال دیا اور صرف ہندستانی کو باقی رکھا۔ صاحب موصوف نے قومی زبان کے لئے ناگری اور فارسی دونوں خطوں کا سیکھنا لازم قرار دیا۔ گو گاندھی جی کے ممتاز معتقدوں نے بھی قومی زبان کی نسبت ان کے اس اصول کی برملا مخالفت کی تاہم گاندھی جی اپنی بات پر اڑے رہے۔ آگے چل کر باپو جی کی زندگی ہی میں ملک آزاد ہو گیا۔ مگر ملک کے بٹوارے کے بعد ہی اس کام کی تکمیل ہوئی۔ جب بھارت کا دستور بننے لگا تب قومی زبان کا سوال دوبارہ پیش ہوا اور اہل ملک نے متفق الرائے ہو کر ناگری ہندی لپی کو قومی زبان کا اعزاز بخشا۔ گاندھی جی نے قومی زبان کے لئے ہندستانی نام تو پسند کیا تھا مگر ہندستانی کی تعریف ان کی لمحہ فکریہ تھا۔ ان کی ہندستانی، اردو و ہندی سے جداگانہ اور ان دونوں کے بیچ بیچ آسان اسلوب تھا۔ گاندھی جی کے علاوہ انجمن ترقی اردو کے معتمد مولوی عبدالحق اور شبلی اکیڈیمی اعظم گڈھ کے سید سلیمان ندوی بھی زبان کے معنی میں ہندستانی لفظ کا استعمال کیا مگر ان حضرات کے

نزدیک ہندوستانی سے مراد اردوئے معلیٰ کے سوا کوئی اسلوب نہ تھا۔

<u>ریختہ ، ریختی</u> ـــ ریختہ ہندی کا وہ اسلوب ہے جس میں فارسی لفظوں کی آمیزش ہو۔ اکثر لوگوں نے ریختہ اور اردو کو غلط فہمی سے ایک دوسرے کی مترادف زبان سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ اردو کی نسبت ریختہ کا چلن بہت زیادہ ہے۔ اردو کو ریختہ کا ایک خاص اسلوب کہہ سکتے ہیں لیکن ریختہ کو اردو کہنا غلط ہوگا۔ ریختہ دراصل مردوں کی زبان ہے اور عورتوں کی بولی ریختی کہلاتی ہے۔ اس بارے میں ایک اور قابلِ اظہار امر یہ ہے کہ زبان کے معنی میں ریختہ کا استعمال اردو سے قدیم ہے۔

<u>اردو</u> ـــ ہنری یول اور آرتھر کوک برنیل نے ۱۸۸۶ء کی شائع شدہ اپنی مشہور لغت ہابسن جابسن کے صفحہ ۹۴۸ میں اردو کے بارے میں حسبِ ذیل بیان کیا ہے۔

"اسم ہندستانی زبان اردو (ترکی) لفظ سے مراد تاتار خان کے پڑاؤ اور خیمے سے ہے۔ درحقیقت انگریزی ہورڈ (Horde) اور روسی اورڈا (Orda) لفظ اسی سے نکلا ہے۔ اولگا کے کنارے واقع شدہ گولڈن ہورڈ (Orda) سے اکثر لوگ تاتار کے ایک خاص قبیلے کے معنی لیتے ہیں مگر اس سے اصل چیز مراد ہے۔ سرائے واقع شدہ باتو خاندان کے خان کا شاہی پڑاؤ اور محل ہے۔ ...... ترکستان واقع شدہ تاشقند اور کھوکند میں اردو کے معنی ہیں قلعہ اور شاہی پڑاؤ۔ اردو کا لفظ ہندستان میں دراصل بابر کے ساتھ آیا اور دلی کا شاہی محل اردوئے معلّیٰ (بڑا خیمہ) کہلانے لگا۔ دربار اور خیمے میں ایک مخلوط زبان کی تخلیق عمل میں آئی اور زبان اردو کہلائی۔ آخر میں اس عدد خال اختیار کی۔ پشاور کی سرحد میں آج بھی اردو لفظ میدان جنگ کے سپاہیوں کے خیمے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔" (۱۲)

اوپر کی مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو اصل میں درباری زبان ہے اور عوام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا ثبوت اور توثیق مختلف اسناد اور مثالوں سے بھی ہو جاتی ہے جن کا پنڈت چندر بلی پانڈے نے "اپنے اردو کے دریشے" (اپنے اردو کے نظریے) "اردو کا ماخذ اور اردو کی زبان وغیرہ کتابوں اور تحریروں میں تذکرہ کیا ہے۔ حقیقت میں اس کی نسبت پنڈت جی کی تحقیقات اپنی نوعیت کی واحد ہے۔ آپ کی کتاب "اردو کی حقیقت" (اردو کی زبان) صفحہ ۳ تا ۱۵ سے وہ مثال نیچے دی جاتی ہے۔ اس کے متعلق آپ نے انشاء اللہ کی "دریائے لطافت" سے اقتباس پیش کیا ہے ـــ

"بہر حال اپنی سمجھ اور سلیقے کے بموجب بہت غور و تامل کے بعد اس ہیچمدان کو یہ معلوم ہوتا ہے اور غالب ہے کہ یہ رائے ناقص درست ہو کہ شاہجہاں آباد کی زبان وہ ہے جو درباری اور مصاحبت پیشہ قابل اشخاص، خوبصورت معشوق، مسلمان اہلِ حرفہ، شہدوں اور امرا کے شاگرد پیشہ اور مزدوروں حتیٰ کہ ان خاک روبوں کی زبان ہے۔ یہ لوگ جہاں کہیں پہنچتے ہیں ان کی اولاد دلی والی کہلاتی ہے اور ان کا محلہ دلی والوں کا محلہ کہا جاتا ہے اور اگر تمام شہر میں پھیل جائیں تو اس شہر کو اردو کہتے ہیں لیکن ان حضرات کا جگھٹا سوائے لکھنؤ کے اور کہیں خاکسار کی رائے میں غربت کو نہیں پہنچتا اگرچہ مرشد آباد اور عظیم آباد کے باشندے اپنے زعم میں خود کو اردو داں اور اپنے شہر کو اردو کہتے ہیں کیونکہ عظیم آباد (پٹنہ) میں دلی والے ایک محلے کے اندازے کے ہوتے ہوں گے اور نواب صادق علی خاں عرف میرن اور نواب قاسم علی خاں عالیجاہ کے زمانے میں اسی قدر یا اس سے کچھ زیادہ مرشد آباد میں ہوں گے۔" دریائے لطافت، انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۲۱ اور ۱۲۲۔

پانڈے جی نے اپنی کتاب "مجالسِ نامحرم" صفحہ ۱۲ میں دریائے لطافت کا اقتباس دے کر حسبِ ذیل خیال کا اظہار کیا ہے:-

---

(۱۲) ہابسن جابسن صفحہ ۹۴۸

شفیع منصور

رومن اور عربی خط کا تجزیہ

صوتیات اور صوت نگاری کی روشنی میں

تاریخ تمدن کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صوتی رسم الخط کے موجد عرب تھے، جنہیں مورخین یورپ نے اہلِ فنیشیا کا نام دے رکھا ہے۔ عربوں سے یہ رسم الخط اہلِ یونان نے سیکھا اور رومنوں کو سکھایا پھر رومنوں کے ذریعہ یہ خط رفتہ رفتہ پورے یورپ میں پھیل گیا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر مشہور مورخ حتی نے لکھا ہے کہ عربی خط تمام یورپین خطوں کی ماں ہے" (تاریخ عرب صفحہ ۷۱)

تمدن یورپ کی یہ بدقسمتی تھی کہ عربی خط کی اس ابتدائی شکل کو رومن کیتھولک کلیسا نے اپنا کر تقدس کا درجہ دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی زندگی کے ہر گوشے تو ترمیم و تبدیلی اور نشوونما کے مراحل سے گزرے لیکن رومن خط ارتقائی تبدیلیوں سے بیشتر محروم رہا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ رومن حروف میں زمانے کے ساتھ ساتھ بہت سے تصرفات اور اضافے ہوئے لیکن رومن رسم الخط کی فنی ساخت قریب قریب وہی رہی جو عربی خط کی ابتدائی دور میں تھی۔ یعنی تحریر میں رومن حروف کی سالمیت اب تک قائم ہے۔

اس کے برعکس حقیقت پسند عرب اپنے رسم الخط کو بتدریج آگے بڑھاتے رہے۔ انہوں نے اپنے خط میں حسن اشاریت اور اختصار پیدا کرنے کے لئے اس کی ہیئت ترکیبی میں تاریخ کے مختلف ادوار میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ یہ انہی فکری کاوش اور فنی ریاضت کا نتیجہ ہے کہ عربی رسم الخط بالآخر رومن رسم الخط سے اتنا مختلف ہو گیا کہ آج ان دونوں میں بظاہر کوئی مماثلت نظر نہیں آتی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ رومن خط قدیم عربی خط کی ایک جامد شکل ہے۔

یورپ میں رومن کیتھولک کلیسا کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو انیسویں صدی کے وسط میں وہاں کے ارباب علم و فن نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ رومن خط ایک غیر ترقی یافتہ اور غیر متمدن طرز تحریر ہے۔ ۱۸۳۷ء میں سر آئزک پٹ مین نے رومن خط کی بھدے پن، طوالت اور غیر صوتیت کے خلاف کھلم کھلا علم بغاوت بلند کیا، اور اس سے لوگوں کو نجات دلانے کے لئے مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کی بنیاد رکھی۔

۱۸۸۶ء میں فرانس کے چند اساتذہ فن نے رومن حروف کی اصلاح کے لئے "دی فونیٹک ٹیچرز ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک انجمن قائم کی جو بعد میں انٹرنیشنل فونیٹک ایسوسی ایشن کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس انجمن نے اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے ایک نئی طرز کا رسالہ جاری کیا جس میں تمام مضامین صوتی عبارت میں شائع ہوتے تھے۔ لسانیات و صوتیات کے مشہور ماہر پال پاسی اس رسالے کے مدیر تھے اور مضمون نگاروں میں آٹو جیسپرسن، ہنری سویٹ اور جے۔ لے لنڈل جیسے مقتدر زباندان شامل تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مشہور و آفاقی تمثیل نگار جارج برنارڈ شا نے مخالف رومن تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک نے آخر ۱۹۵۰ء میں شا کی موت کے بعد شا وصیت کمیٹی کی شکل اختیار کر لی۔ اس کمیٹی کا مقصد اصلاحی نہیں بلکہ انقلابی ہے۔ کیونکہ یہ رومن حروف کو مٹا کر ایسے حروف رائج کرنا چاہتی ہے جن کے لکھنے میں وقت، محنت اور روپے کی کفایت ہو یعنی عربی رسم الخط میں جو اختصار پایا جاتا ہے۔ انگریزی زبان کی تحریر

میں اس کا حصول شا اور ابجد کمیٹی کا اولین مقصد ہے۔

علمی حلقوں میں جارج برنرڈ شا کے خیالات کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ شا الفابٹ کمیٹی نے جو نئے حرف منتخب کئے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نئی تراش کے ان حروف کو ملانے سے جو شکل بنے گی اس کا رومن تحریر سے بہت دور ہی کا رشتہ ہوگا۔ اس کے برعکس پٹ مین کی صوت نگاری سے یہ خط قریب تر ہوگا۔

رومن تحریر کی طوالت سے ذہنی بغاوت کا ایک ثبوت وہ مخففات اور نامکمل الفاظ ہیں جن کا روز افزوں استعمال مغربی زبانوں میں شدید الجھنیں پیدا کر رہا ہے۔ ایک اخبار نویس اپنے اخبار میں جب (COMON WEALTH.) کی بجائے صرف C'wealth لکھ کر اپنا پیچھا چھڑاتا ہے تو وہ درحقیقت یہ اعتراف کرتا ہے کہ رومن خط میں الفاظ کا طول آج کل کی دنیا میں برداشت کرنا مشکل ہے۔

اس سلسلے میں سر آئزک پٹ مین کے نظریات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ موصوف نے صوتیات کی روشنی میں دنیا کے معروف خطوں کا سالہا سال تک مطالعہ کیا۔ بالآخر انہوں نے رومن خط کی سست رفتاری اور طوالت سے بچنے کے لئے صوت نگاری یعنی آواز کے مطابق لکھنے کا وہ طریقہ رائج کیا جو اس وقت دنیا کے تقریباً ہر مہذب ملک میں استعمال ہو رہا ہے۔ سر آئزک نے لسانی آوازوں کے سائنٹفک تجزیئے کے بعد صوت نگاری کے چار اصول مقرر کئے ہیں، جن سے کسی خط کی عنصری ساخت یا فنی صلاحیت کو جانچا جا سکتا ہے۔ ہم ان اصولوں کی روشنی میں رومن اور عربی خط کا موازنہ کر کے دیکھتے ہیں کہ ان میں کون سا خط فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ واضح ہو کہ عربی خط میں نستعلیق اور نسخ دونوں شامل ہیں۔ کیونکہ نستعلیق کوئی الگ رسم الخط نہیں ہے بلکہ ایک طرز کتابت ہے۔

صوت نگاری کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر حرف کا نام ایسا ہونا چاہیئے جو اس حرف کی مطلوبہ آواز کو ظاہر کرے یعنی مکتوبی آواز اس حرف کی داخلی آواز ہونی چاہیئے۔ اگر حرفوں کے ناموں اور ان کی مکتوبی آوازوں میں صوتی مناسبت ہے تو ایسے صوتی نظام کو سر آئزک نے فطری ابجد ALPHABET (NATURE) کا نام دیا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اگر رومن حروف کا جائزہ لیا جائے تو ان کی بیشتر تعداد غیر صوتی نظر آئے گی۔ رومن کے ۲۶ حروف میں سے کل ۱۰ حروف کے نام صوتی ہیں۔ اور ان صوتی حروف کے بھی بعض استعمالات غیر صوتی ہیں۔ اس کے برعکس عربی یا اردو کا ہر حرف ہمیشہ اپنی داخلی صوتی قدر ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کسی حرف کے غیر صوتی استعمال کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ البتہ یہ اعتراض کا بعض صورتوں میں اردو کے دو دو تین تین حروف ایک ہی صوتی قدر کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ بس اس حد تک درست ہے کہ اردو لکھتے وقت عربی کے چند حروف کی صحیح صوتی اقدار کو عام طور پر قائم نہیں رکھا جاتا۔ لیکن خیال رہے کہ عربی زبان میں ان حروف کی صوتی اقدار منفرد ہیں۔ مثال کے طور پر انٹرنیشنل فونیٹک ایسوسی ایشن نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "ع" اور "غ" کی آوازوں کو دنیا کے کسی دوسرے حرف سے صحیح طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے مذکورہ ایسوسی ایشن نے ان حروف کو ذرا سے تصرف کے ساتھ اپنے بین قومی ابجد میں شامل کر لیا ہے۔

انٹرنیشنل فونیٹک ایسوسی ایشن صوتی ابجد کی تدوین میں جن اصولوں پر عمل کر رہی ہے۔ ان میں اولیں حیثیت اس اصول کو دی گئی ہے کہ ہر اس آواز کے لئے ایک علیحدہ حرف ہونا چاہئے جس کے استعمال سے کسی دوسرے لفظ کے معنی بدل جائیں۔ اس اصول کا سیمنٹکس (SEMAN-TICS) کے تحت تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ الفاظ کے معنوی فرق کو ان کی صوتی حیثیت سے متمیز کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ سیفر اور صفر یا ہیں اور ہیں کے صوتی اور معنوی امتیاز کو نظر انداز کرنے کی حمایت کر رہے ہیں وہ فی الواقعہ صوتیات کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں اور نہ ان اصولوں کو صوتیات کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل بیان ہے کہ سر آئزک نے فونوگرافی کے لئے جو فطری ابجد وضع کیا ہے اس میں متعدد نامِ روشن کی بجائے عربی و انگریزی حروف کے رکھے ہیں مثلاً "H" کو "ح" اور "ا" کو "د" کا کام دیا ہے۔ اس سے ایک تو رومن حروف کی غیر صوتیت اور دوسرے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سر آئزک نے صوت نگاری کے اصول وضع کرتے وقت عربی رسم الخط کو پیش نظر رکھا ہے۔ باقی اصولوں سے جو آگے بیان کئے گئے ہیں، اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

صوت نگاری کا دوسرا اصول یہ ہے کہ الفاظ میں حروفِ علت صرف اس صورت میں ظاہر کئے جائیں جب کہ پڑھنے والے کو ان کی ضرورت ہو۔ بے ضرورت حروفِ علت کا تحریری اظہار تضیعِ اوقات اور اسرافِ زر کا موجب ہے۔

سر آئزک کا یہ خیال درحقیقت مرکب آوازوں (اصوات) کی فطری تشکیل پر مبنی ہے۔ اصوات کی ساخت میں صحیح آوازوں (CONSONANTS) کا عمل علتی آوازوں (VOWELS) سے مختلف ہے۔ اصوات کے امتیازی اجزا صحیح آوازیں ہیں اور علتی آوازیں ان اجزا کو ملانے کا عمل سرانجام دیتی ہیں۔ گویا الفاظ میں حروفِ علت پڑھنے والے کو یہ اشارہ دیتے ہیں کہ حروفِ صحیح کو ملاتے وقت لب اور زبان کو کس طرح جنبش دینی ہے۔ جو شخص ان اصوات سے آشنا ہے۔ اس کو اس قسم کے اشارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو صرف ان اصوات کے امتیازی اجزا (حروفِ صحیح) بتانے کی ضرورت ہے۔ جن کے دیکھنے سے مطلوبہ اصوات خود بخود اس کی زبان سے ادا ہوں گی

ان حقائق پر نظر رکھی جائے تو سر آئزک یہ کہنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ کسی زبان کی کتابت اور قرأت کا دار و مدار اس زبان کی صحیح آوازوں پر ہے۔ علتی آوازوں پر نہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر سر آئزک نے فونوگرافی میں علتی آوازوں کا اظہار کاتب کے اختیار پر موقوف رکھا ہے۔ فونوگرافی میں حروفِ علت کے نشان اصل الفاظ سے علیحدہ ہوتے ہیں جیسا کہ عربی خط میں ہے۔ لیکن فونوگرافی اور عربی خط میں ایک نازک فرق ہے فونوگرافی میں تمام حروفِ علت کو اعراب کے طور پر رکھا گیا ہے، لیکن عربی خط میں صرف خفیف حروفِ علت SHORT VOWELS ہی کو اعراب کا درجہ دیا گیا ہے۔ جو حروفِ علت حروفِ صحیح کی طرح مکمل طور پر ادا ہوتے ہیں ان کو الفاظ کا مستقل جزو بنا دیا گیا ہے۔ حروفِ علت کی تحریر میں یہ فنی باریکی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ عربوں نے لسانی امتیاز کی تشکیل کا کتنا غائر مطالعہ کیا ہے۔ اسی دقیقہ رسی نے انہوں نے فنِ تجوید کی بنیاد رکھی جو موجودہ صوتیات کا ماخذ ہے۔

اس طرزِ تحریر پر بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حروفِ علت کو قاری پر چھوڑ دینے سے الفاظ کے غلط پڑھے جانے کا امکان ہے اس سلسلے میں یہ نکتہ توجہ طلب ہے کہ عربی خط میں صرف خفی حروف ہی کو قاری پر چھوڑ دینے کی گنجائش ہے اور یہ حروف اصوات کے امتیازی اجزا نہیں ہوتے اور پھر یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ اگر ان حروف کو ظاہر کرنا لازمی ہی سمجھا جائے تو ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ عربی خط ان حروف کے اظہار پر بھی قادر ہے۔ آخر اعراب بھی تو عربی خط کی فنی ساخت کا ایک جز ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ رومن تحریر میں علتی آوازوں کے اشارے اتنے غیر مستقیم، غیر فطری اور ناکافی ہیں کہ قاری ان اشاروں کا مطلب [illegible] حافظہ ہی سے سمجھ سکتا ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ دونوں صورتوں میں پڑھنے کا عمل قاری کی یادداشت پر موقوف ہے۔ اصل صورت یہ ہے تو تحریری علامات کو طول دینے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اور اس کا جو نقصان ہے وہ بالکل واضح ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو مرکب آوازوں میں اتنے نازک امتیازات نظر آتے ہیں کہ ان سب کو مرئی علامات کی شکل میں مقید کرنا نہ صرف یہ کہ مسلّمہ ناممکن ہے بلکہ ایسا کرنے کی کوشش کرنا غیر مفید بھی ہے۔ پُر تکلف رسم الخط پڑھنے اور لکھنے میں وبالِ جان ہوتا ہے۔ صوتیات کا جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ کسی صوت کی تحریری علامت میں صرف جوہرِ صوت (PHONEME) کا اظہار ہونا چاہیئے اور اس جوہر کے تحت جو اعراض یا فروعات ہیں وہ محذوف و مقدر رکھی جائیں۔ اس نظریہ کا مقصد تحریری علامات میں سادگی اور اختصار پیدا کرنا ہے۔ عربی خط مطلوبہ [illegible] ہے۔

صورت نگاری کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جب حرفوں کو ملا کر الفاظ بنائے جائیں تو حرفوں میں اختصار کیا جائے تاکہ کاغذ پر خیال کی علامت مختصر سے مختصر بنے۔ اس اصول کے تحت فونوگرافی میں بنیادی نقوش کو مختلف اور بعض صورتوں میں حذف کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی اصول ہے جو عربی خط میں کارفرما ہے۔ عربی خط اور فونوگرافی کے ماسوا اس اصول پر کسی دوسرے خط میں عمل نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے دنیا کا کوئی اور خط زود نویسی اور پرکاری میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فونوگرافی میں یہ خامی ہے کہ اس میں صرف اختصار ہے۔ لیکن عربی میں اختصار کے ساتھ ساتھ اور جمالیاتی اپیل بھی ہے۔

صورت نگاری کا چوتھا اصول یہ ہے کہ مفرد آوازوں کے تحریری اشارے سادہ ترین ہندسی شکلوں پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ تاکہ ان کے سیکھنے میں آسانی اور لکھنے میں اختصار اور کفایت ہو۔ اس معیار پر پرکھتے ہوئے بھی عربی یا اردو کا درجہ رومن حروف سے بالاتر ہے۔ مثال کے طور پر آپ 'ا' اور 'ب' کا مقابلہ 'A' اور 'B' سے کیجئے۔ عربی حروف نسبتاً بہت سادہ شکل کے نظر آئیں گے۔ معروف خطوں میں دیوناگری کا حروف کا ہیر پھیر سیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے دیوناگری خط اور رومن خط و... سے بھی زیادہ غیر متوازن ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ عربی حروف الفاظ میں اپنی شکلیں بدل دیتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ حروف کی شکلیں رومن رسم الخط میں بھی بدلتی ہیں۔ ہر رومن حرف کی چار شکلیں ہیں اور ۲۶ حروف کی ۱۰۴ شکلیں بنتی ہیں۔ رومن اردو میں تحریری نقوش کی تعداد اس سے کم از کم دو چند ہوگی۔ ان کے مقابل اردو میں اس وقت مکمل اور محقق حروف کی کل تعداد ۵۰ ہے۔ پھر عربی اور حروف میں یہ آسانی ہے کہ مختلف شکلوں میں یہ آسانی ہے کہ مختلف شکلوں میں ان کے امتیازی حصے برقرار رہتے ہیں اور گیارہ حروف ایسے ہیں جو اپنی شکل قطعاً نہیں بدلتے۔ مثلاً 'ا' 'و' 'ز' وغیرہ۔ رومن میں سوائے O کے باقی سب حروف اپنی صورت بدل لیتے ہیں۔

اس الزامی جواب سے قطع نظر عربی و اردو حروف میں تضعیف و تخفیف ایک فنی ضرورت کے تحت ہوتی ہے اور وہ ضرورت تحریری علامات کا اختصار ہے جس کو مسٹر آئزک نے تحریر الفاظ کا اصل الاصول قرار دیا ہے۔ اور انگلینڈ کے ایک ماہر فن مسٹر جولین۔ آر۔ کے۔ ایس گولڈ نے مستقبل کے رسم الخط کا ایک بنیادی وصف ٹھہرایا ہے اور اس کو سمٹی ہوئی تحریر (CONDENSED WRIIING) کے لفظ سے موسوم کیا ہے۔ یہ بجا ہے کہ حروف کی مختلف شکلوں کے سیکھنے میں کچھ وقت زیادہ لگتا ہے لیکن اس سے جو مجموعی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اس تھوڑے سے نقصان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اس مختصر موازنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربی خط صورت نگاری کے ان چاروں اصولوں پر پورا اترتا ہے جو خود اہل مغرب نے وضع کئے ہیں اور رومن خط ہر اصول کو توڑتا ہے۔ اصل میں عربی خط ایک سائنٹفک صورت نگاری ہے اور رومن خط ایک غیر فطری تحریر ہے جس کی بنیاد صوتیات کی بجائے مفروضات پر قائم ہے۔

مسٹر آئزک پٹ مین کے یہ چار اصول عربی حروف کے واضعین کے ذہن میں اس وضاحت کے ساتھ یقیناً نہیں تھے جو سائنسی تجزیے اور تجربے کا ماحصل ہے۔ لیکن یہ حسن اتفاق ہے کہ عرب کے سادہ فطرت کے قریب اور علمی مزاج نے ان اصولوں کو پا لیا تھا، جو صدیوں کی فکر و جستجو کے بعد مسٹر آئزک اور دوسرے ماہرین فن کے ذہن رسا پر منکشف ہوئے ہیں۔ اس شعبے میں بھی اگر پیروی مغرب لازم ہے تو ہمیں اس نیک مقصد کے لئے وہاں کے علم کا دامن پکڑنا چاہئے نہ کہ جہل کا۔

مغرب میں رسم الخط کی اصلاح کی جتنی تحریکیں اس وقت پائی جاتی ہیں۔ ان سب کی منزل مقصود تحریری علامات کا اختصار ہے۔ یعنی عربی خط جن ارتقائی مرحلوں سے گزر چکا ہے۔ رومن خط کو ابھی وہ مرحلے طے کرنے ہیں۔ اس لئے دنیا میں کسی بھی زبان کے لئے عربی خط کو بجائے رومن خط اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انوار کو چھوڑ کر ظلمات اختیار کی جائے۔ وقت کا تقاضا اختصار ہے۔ (بقیہ …)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

غزل

انقلابِ زمانہ ہے شاید یہی دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گئے
ہم جو بن بن کے بگڑے تو بنتے بنے وہ بگڑتے بگڑتے خدا بن گئے

ہم جو تھے اک تہی مایہ و بے نوا، ہم نے الفت جو کی تو بفیضِ وفا
سازِ آہنگ ایسے ہویدا ہوئے جو دھڑکتے دلوں کی صدا بن گئے

جن کو اپنا سمجھتے رہے عمر بھر، ان کی بیگانگی اور بڑھتی رہی
میری دیوانگی کا اثر یہ ہوا جو تھے نا آشنا آشنا بن گئے

یہ زمیں و زماں، یہ مکیں و مکاں، آدمِ نو کی ضو سے ہوئے پھر جواں
زندگی کروٹیں پھر سے لینے لگی ولولے حاصلِ مدعا بن گئے

یہ ہجومِ گل و لالہ، یہ رنگ و بو، جوشِ موج و خروشِ لبِ آبجو
میرے ہاتھوں سے ایسے سنورتے گئے نازشِ ارض و فخرِ سما بن گئے

غزل

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

لہو آہن سے ٹپکا اور چمن سے آگ بھی برسی
ابھی تک مالکِ ہر دو جہاں محوِ نظارا ہے

خرامِ ناز ہے یا چاندنی کروٹ بدلتی ہے
یہ دھڑکن دل کی ہے یا رقص خود محوِ تماشا ہے

محبت میں اک ایسا وقت بھی آیا ہے اے ہمدم
نہیں معلوم کیوں اپنے کو میں نے خود پکارا ہے

جو ممکن ہو تو مڑ کر یہ بھی منظر دیکھتے جاؤ
کہ ہر آنسو میری پلکوں پہ اک روشن ستارا ہے

صدائے زندہ باد آئی فرازِ دار سے ہمدم
مجھے جانے دے مدت بعد اس نے پھر پکارا ہے

چمک بجلی کی ہے یا انقلابِ دہر کی ہلچل
نہ سمجھے کیا تری کافر اداؤں کا اشارا ہے

ہمیں وہ ناخدا خود باعثِ طوفان ہو جائے
جو ہر سیلاب کو کہتا ہے دریا کا کنارا ہے

محبت نے مجھے اس سرکشی پر پھر ابھارا ہے
کہ دنیا بن کے جس نے زندگی کو یوں سنوارا ہے

کہاں کا حسن کیسا عشق، اعجاز اب وہ عالم ہے
جسے دیکھو اسے کافر غمِ دوراں نے مارا ہے

اختر لکھنوی

غزل

شہر کا شہر صلیبوں سے سجا ہے اب کے
اُن کی آمد کا ہر انداز نیا ہے اب کے

قافلہ قافلہ مقتل کی طرف جائیں گے لوگ
شوخ پہلے سے بہت رنگِ حنا ہے اب کے

یہ تو سچ ہے وہ اسی راہ سے گزریں گے مگر
کوئی دیکھے نہ انھیں حکم ہوا ہے اب کے

آؤ جی بھر کے گلے مل لیں رفیقو ہم آج
قتل کی شکل میں انعامِ وفا ہے اب کے

موسمِ گل ترے صدقے، تری آمد کے نثار
دیکھ مجھ سے مرا سایہ بھی جدا ہے اب کے

ایک قطرہ نہیں دیتی ہے گزر جاتی ہے
جو بھی اُٹھتی ہے گھٹا ایسی گھٹا ہے اب کے

دوستو ذکرِ رخِ یار سے غافل نہ رہو
دشتِ ظلمات میں مہتاب اُگا ہے اب کے

★

خاور نوری

دو غزلیں

میں جو رہنمائی کی منزلوں سے ہٹ جاتا
بھول کر روش اپنی قافلہ پلٹ جاتا
دیر تک اگر تم سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہم
اختلاط بڑھ جاتا اعتبار گھٹ جاتا
ہاں مرے تحمل کی کچھ تو داد مل جاتی
غم مرا کسی صورت دوستوں میں بٹ جاتا
تم اگر گلستاں میں لیتے ایک انگڑائی
جھومتی بہاروں کا زور و شور گھٹ جاتا
صرف تیری حد تک ہی اپنی بات رہ جاتی
کاش میرا افسانہ اس قدر سمٹ جاتا
چاہتے تو ہم بازی جیت کر دکھا دیتے
آپ کی قسم پانسہ خود بخود پلٹ جاتا
آئینہ سامنے آتا تیرے حسن کے آگے
کاش یوں نہ بڑھ بڑھ کر کہتا گھٹ جاتا
سوچتا ہوں یہ مجھ سے تم اگر بچھڑ جاتے
رات کس طرح کٹتی! دن تو خیر کٹ جاتا
مجھ کو اپنے بیتے دن یاد ہیں ابھی خاور
اس کو زیر کر لیتا جس کے آگے ڈٹ جاتا

ہم نے کیا شئے روایتی مانگی
موت چاہی نہ زندگی مانگی
منہ چھپانے لگے مہ و اختر
جب شب غم نے روشنی مانگی
نکہت برہم مری مدد کرنا
ان کی زلفوں نے برہمی مانگی
خود بجھا لیجیے اپنی آتش غم
میرے اشکوں سے کیوں نمی مانگی
کیا ستم خیز ہے کرم ان کا
زندگی دے کے زندگی مانگی
مسکراہٹ، شباب، ہوش، سکوں
ہم نے ہر چیز عارضی مانگی
جب بھی ہنسنے کو میرا جی چاہا
ایک اک دوست سے ہنسی مانگی
آئینہ جب نہ ان کے ہاتھ آیا
مسکرا کر غزل مری مانگی
زلف و رخ سے کسی کے خاور نے
شام بھی مانگی صبح بھی مانگی

نسرین تبسم (ایم۔ اے)

ابنِ مریم

وکٹوریہ جوبلی ہسپتال کے جنرل سرجیکل وارڈ میں داخل ہوتے وقت مجھے بڑی کوفت ہوئی، فضا میں ایک ناخوشگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی، ماحول میں حد درجہ گھٹن تھی اور درو دیوار سے یاسیت ٹپک رہی تھی۔

"یہ ہے آپ کا بیڈ" ایک نرس نے چار نمبر کے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مگر اُس کی چادر تو میلی ہے اور سرہانے کا غلاف بھی" اُس بستر پر بیٹھنے سے میرے دل و دماغ بغاوت کر رہے تھے۔

"چادر تو کوئی خاص میلی نہیں البتہ سرہانے کا غلاف ضرور بدلوا دیتی ہوں"۔

اپنے حواس پر بے حسی طاری کرتے ہوئے میں بستر پر لیٹ گیا۔ اور کسی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میں یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیوں کر ہوں۔ ذہن میں کئی طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک پتلی، گوری اور نوجوان سی لڑکی جو سفید شلوار اور پرنٹ قمیص پہنی ہوئی تھی میرے قریب آئی۔ مجھے اُس کی آمد پر کچھ تعجب سا ہوا۔ غالباً وہ غلطی سے اِدھر آ گئی تھی یا پھر اپنے کسی رشتہ دار مریض سے ملنے آئی ہوگی۔ جو پہلے اسی بیڈ پر رہ چکا ہوگا اور اُس کے ڈسچارج ہو جانے کی اُسے خبر نہ ہوگی۔ میں اُس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ آپ کو کس سے ملنا ہے کہ اُس نے پوچھا ———

"آپ کا نام؟"

"جی ——— ؟"

"اپنا نام بتائیے"

میرا نام اُس نے ایک فارم پر لکھ لیا اور اپنی غلافی پلکوں کو جھپکتے ہوئے پھر پوچھا۔

"عمر ——— ؟"

"عمر؟ یہی کوئی ———" میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی اپنی عمر کوئی سترہ اٹھارہ سال کی لگ رہی تھی۔ اُسی حساب سے میں نے کہہ دیا۔

"یہی کوئی بیس سال" اُس کی متحیر نگاہوں کو دیکھ کر میں جھینپ سا گیا۔

"میرا مطلب ہے آٹھ اوپر بیس سال"۔

"اوہ ——— !" اور وہ فارم کو دیوار پر لٹکے ہوئے لوہے کے چوکٹے میں لگا کر آگے بڑھ گئی۔

مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اگر نرس ہے تو اُس کا لباس نرسوں جیسا کیوں نہیں؟ اور اگر نرس نہیں تو کوئی لیڈی ڈاکٹر تو وہ ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ میل وارڈ میں لیڈی ڈاکٹر کا کیا کام اور پھر یہ فارم بھرنے کا کام تو نرسوں کے سپرد ہی ہوتا ہے۔ جو کچھ بھی وہ تھی بہرحال حسین تھی اور اُس ماحول میں اُس کا وجود ——— جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے ___ کے مصداق تھا۔

شام کے وقت ٹمپریچر لینے کے لئے وہ میرے بیڈ کے قریب آئی۔ تھرمامیٹر منہ میں رکھ کر اُس نے اپنی پتلی پتلی انگلیاں میری نبض پر رکھ دیں اور نظریں اپنی رسٹ واچ پر جما دیں۔ اُس کی انگلیوں تلے مجھے اپنی نبض کی حرکت کا احساس ہوا اور میں کمالِ دلچسپی سے اُس کی انگلیوں کو جو میری نبض کے زیر و بم کے مطابق بہت معمولی طور پر اوپر نیچے ہو رہی تھیں، دیکھنے لگا۔

"او ہو ——— !"

"؟ ؟ ؟ ———"

"پھر رُک گئی ———" اُس نے میری نبض چھوڑ دی اور گھڑی کو ہلا کر اپنے کان کے پاس لے گئی۔ میں نے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر کہا۔

"میری گھڑی لے لیجئے ———"

اُس نے ایک نظر میری دیکھا اور مسکرا کر کہا ———

"چلتی تو ہے۔ اگر چلتی رہے تو ———" اور دوبارہ میری نبض پکڑ لی۔ ٹمپریچر اور پلس بیٹ میرے چارٹ پر لکھ کر وہ دوسرے مریض کے پاس چلی گئی۔ پھر تیسرے کے پاس اور پھر میرے پاس پلٹ آئی۔

"اپنی ہی گھڑی دے دیجئے ——— یہ تو شاید خراب ہو گئی ہے۔"

میں نے اپنی رسٹ واچ اُسے دے دی اور نہ جانے کیوں اُس نے اپنی رسٹ واچ مجھے پکڑا دی اور کہا ———

"نہ جانے کیا نقص ہے اس میں۔"

اُس کی گھڑی کو میں نے دو ایک بار ہلایا مگر سکینڈ کی سوئی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ لڑکی دوسرے مریضوں کا ٹمپریچر لیتے ہوئے دور چلی گئی۔ میں سوچنے لگا کہ بھلا وہ مجھے اپنی گھڑی کیوں دے گئی۔ اُس کے اس غیر متوقع التفات پر مجھے بہت مسرت ہوئی۔ میں نے اُس خوبصورت سی گھڑی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور خیالوں میں کھو گیا۔ نہ جانے میرے ذہن میں یہ خیال کیونکر آیا کہ دراصل اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اُس گھڑی کو ٹھیک کرا دوں۔ میں نے نرسوں کی زندگی کے بارے میں بیسیوں افسانے پڑھ رکھے تھے اور چند ایک نظمیں بھی میری نظر سے گزری تھیں۔ میں غائبانہ طور پر اُن کی طرزِ معاشرت سے آشنا تھا۔ میں نے اُس کی اس ادا کو محبت کی پہلی کڑی سے منسوب کیا اور بستر سے نکل کر باہر چلا گیا۔

ہال بازار کے ایک گھڑی ساز کو میں نے وہ گھڑی دکھائی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اس کا سپرنگ ٹوٹ گیا ہے اور صفائی بھی ہونی ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ آدھ پون گھنٹہ میں گھڑی ٹھیک کر دے۔ گھڑی اُسے دے کر میں تھوڑی دیر ہال بازار میں گھومتا رہا۔ مجھے جہاں کی ہر چیز حسین نظر آ رہی تھی۔ فرطِ مسرت سے میرے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ اپنی اس والہانہ کیفیت پر قابو پانے کے لئے میں ایک ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ اپنے سامنے پڑے چائے کے پیالے کو تھوڑی دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ——— چائے کے پیالے میں اُٹھ رہے سفید لطیف دھوئیں میں کوئی نسائی ہیئت بنتی رہی اور تحلیل ہوتی رہی۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب میں گھڑی کو جیب میں ٹھونستا ہوا اپنے وارڈ میں داخل ہوا تو وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ مجھے یہ خیال گزرا کہ

ہوئی کہ اُس کی ڈیوٹی بدل چکی تھی ۔۔۔۔

صبح جب میری نیند کھلی تو وارڈ میں ہلچل تھی۔ بوائے مریضوں کے بستر ٹھیک کر رہے تھے۔ فاکروب جھاڑو لگا رہا تھا۔ نرسوں کی ڈیوٹی بدل رہی تھی۔ وہ ایک چھناکے کے ساتھ وارڈ میں داخل ہوئی۔ اُس روز اُس نے قمیص شلوار کی بجائے سفید سکرٹ پہنا ہوا تھا۔ اُس کا یہ لباس مجھے عجیب سا لگا۔ ایک روز پہلے وہ کتنی مانوس سی لگ رہی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک نرس تھی بلکہ یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی کسی کالج سے آ رہی ہو۔ لیکن اب ۔۔۔۔ سفید براق لباس میں وہ کوئی اَن دیکھی، اَن جانی صورت نظر آ رہی تھی۔ اِس لباس میں کتنی قدامت تھی اور اِس میں کس قدر خنکی۔ یہ تغیر آنکھوں کو کچھ ناپسند سا لگا لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب وہ میری طرف آئی تو ۔۔۔۔ وہی شبیہ، وہی خدوخال، وہی غلافی پلکیں اور وہی متبسم ہونٹ۔

"یہ لیجئے آپ کی گھڑی، رات کو آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

"یونہی گھومنے چلا گیا تھا تھوڑی دور تک۔"

"میری گھڑی ۔۔۔۔؟"

"۔۔۔۔ یہ لیجئے۔"

اُس نے گھڑی کو ایک نظر دیکھا تو اُس کا چہرہ مسرت سے کھل اُٹھا۔

"ٹھیک کروا دی آپ نے۔"

"۔۔۔۔" میں نے صرف سر ہلا دیا۔

"خواہ مخواہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔"

"تکلیف کس بات کی۔"

"کتنے پیسے لگے؟"

"کچھ نہ لگا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"ایسے نہیں، آپ بتائیے ورنہ ۔۔۔۔"

"ورنہ کیا ۔۔۔۔؟"

"ورنہ یہ گھڑی بھی اپنے پاس رکھ لیجئے۔"

"اوہ ۔۔۔! اچھا آپ رہنے دیجئے۔ میں بتا دوں گا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بادلِ ناخواستہ گھڑی لے گئی ہو۔ مجھے حیرانی ہوئی اُس بات پر کہ بجائے "تھینک یو" کہہ کر، مسکرا کر اور نگاہِ غلط انداز پھینک کر چل دینے کے اُس نے یہ دریافت کرنے کے لئے ضد کیوں کی۔ یہ آزاد منش افسانوں میں تو اس قسم کی باتوں کا ذکر نہیں ہوتا ۔۔۔۔ مگر افسانے پوری باتیں کہاں بتاتے ہیں۔

ٹمپریچر لیتے وقت اُس نے گھڑی کے بارے میں کوئی بات نہ کی، میں مطمئن تھا کہ اب شاید دوبارہ ذکر نہ ہو۔ اس خیال نے میرا حوصلہ بڑھا دیا اور میں نے پوچھا ۔۔۔۔

"کل والا لباس کیوں بدل دیا آپ نے؟"

:

"پہلے میں ٹریننگ پر تھی، آج سے میں باقاعدہ نرس بن گئی ہوں۔"

"باقاعدہ ——" یہ لفظ ایک ہتھوڑے کی طرح میرے ذہن پر پڑا۔

"مگر اُس لباس میں بھی تو باقاعدگی آسکتی تھی۔" غالباً میرا مطلب پوری طرح اُس پر واضح نہ ہوا اور وہ صرف مُسکرا کر آگے چلی گئی۔

دوپہر کے کھانے کی بریک سے پہلے وہ پھر میرے پاس آئی، تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اُس نے پوچھا ——

"گھڑی پر کتنے روپے خرچ ہوئے؟"

"پھر وُہی بات ——"

"آپ بتاتے کیوں نہیں ——" اُس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"دو روپے ——"

"جھوٹ —— ٹھیک ٹھیک بتائیے نا۔"

"ٹھیک ہی تو بتا رہا ہوں۔"

"کھائیے میری قسم ——"

مجھے اپنا سارا خون کنپٹیوں میں جمع ہوتا ہُوا محسوس ہوا۔ اُس کے یہ الفاظ میرے دل میں اُتر گئے۔ میں نے نظر بھر کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹ نیم وا تھے۔ اُس کی آنکھوں میں سمندر کی اتھاہ گہرائیاں تھیں اور اُس کی غلافی پلکیں نظروں سے اوجھل تھیں۔

"پانچ روپے ——" بمشکل تمام یہ الفاظ میں کہہ سکا۔

اس کے اگلے روز میرا اپریشن تھا۔ جب مجھے اپریشن تھیٹر میں لے جایا جا رہا تھا تو وہ مجھے حوصلہ دینے کے لئے آئی۔ اُس کا ایک ایک بول میرے لئے فرحت جان تھا۔ شام کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو عزیز و اقارب میرے بستر کے ارد گرد کھڑے تھے۔ اُن کے چہرے فکرمند تھے اور آنکھیں نم آلود۔ میں نے ایک لحظہ اُن کو دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ کمر کی بائیں جانب جہاں آپریشن ہوا تھا حد درجہ درد ہو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اُس جگہ سے گوشت کا بہت سا حصہ کاٹ دیا ہو اور وہاں کسی اور گوشت کا ٹکڑا لگا دیا ہو۔ سارے اعصاب پر کرب طاری تھا، وہ رات آنکھوں میں کٹی۔ علی الصبح تھوڑی دیر کے لئے میری آنکھ لگ گئی، دن چڑھے جب میں جاگا تو حسب معمول وارڈ میں چہل پہل تھی، میں نے اپنے تیماردار سے پانی مانگا تو اُس نے گلوکوز ملے پانی کے چند چمچے میرے مُنہ میں ڈال دیئے۔ دل و دماغ کو راحت محسوس ہوئی۔ میں نے مُسکرا کر اپنے ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میری حالت بہتر دیکھ کر میرے تیماردار نے کوئی بات کرنے کے سے انداز میں مجھے بتایا کہ ایک نرس میری چیزیں جو میں نے اپریشن روم میں جانے سے پہلے اُسے دی تھیں، اُنھیں لوٹا گئی تھی۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ اُن چیزوں کے ساتھ پانچ روپے کا ایک نوٹ بھی تھا۔ اُس نرس کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اُس کے روپے دے دینے کی یہ حرکت میری رومانی حِس کو بھلی نہ لگی مگر بایں ہمہ اُس کا چہرہ جب میرے ذہن کے پردے پر اُترا تو بہت بھلا لگا۔ میں متجسس نگاہوں سے نرسوں کا جائزہ لینے لگا۔ ڈیوٹی بدل چکی تھی مگر وہ اُن میں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ ڈاکٹر کے راؤنڈ کا وقت ہو رہا تھا۔ اس لئے میرے تیماردار تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے گئے۔ اسی

اتنا میں وہ بیڈ نمبر ایک، دو، تین سے ہوتی ہوئی میرے قریب آئی۔

"کیسی طبیعت ہے، نیند آئی رات کو؟"

"نیند تو خیر نہیں آئی، البتہ طبیعت قدرے بہتر ہے۔"

"ویری گڈ۔"

"تھینک یو۔"

"آپ کی چیزیں مل گئیں نا؟"

"مگر آپ نے ——"

"چھوڑئیے اس بات کو —— آپ نے منہ دھلوایا کہ نہیں۔"

"نہیں تو ——"

وہ جلدی سے ایک چلمچی میں گرم پانی، صابن، تولیہ اور دوسری چیزیں لے آئی۔ اُس نے تولیہ کے ایک کونے کو گرم پانی میں بھگو کر صابن پر رگڑا اور میرے چہرے پر پھیرنے لگی۔ اس کے بعد تولیہ کے ایک اور کونے کو پانی میں بھگو کر میرے چہرے پر سے صابن کو اتارا۔ اسی طرح اُس نے میرے ہاتھوں اور بازوؤں کو صاف کیا۔ جب وہ میرا ہاتھ منہ دھلوا رہی تھی تو مجھے اپنی بے بسی کا بڑی طرح احساس ہوا۔ میں اپنے آپ پہلو بدل نہ سکتا تھا۔ کندھوں کو ذرا اُٹھا کر سرہانہ ٹھیک نہ کر سکتا تھا۔ ایسی حالت میں وہ مجھے فرشتۂ رحمت نظر آئی۔ وہ کمالِ انہماک سے اپنا کام کر رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر محبت، خلوص اور ایثار کے جذبات کا دلفریب امتزاج تھا۔ اُس کی پتلی پتلی اُنگلیاں میری نس نس میں حلاوت گھول رہی تھیں۔ ایک روز پہلے میں اُس سے عشق کی پینگ بڑھانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اُس کے چہرے، آنکھوں اور قد و قامت پر دل و جان سے فدا تھا، وہ مجھے میرے جذبات کی ڈانوا ڈول کشتی کی کھیون یا نظر آ رہی تھی —— مگر وہ تو سب پہلے کی باتیں تھیں۔ اپنی یہ باتیں یاد کر کے مجھے بہت خفت ہوئی۔ میں ایک مٹی کا پتلا اور وہ غیر مرئی کرنوں کا ایک ہیولا —— اچھوتا، نرالا اور دلفریب۔

"سسٹر آپ کا نام کیا ہے؟"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"یونہی ——" میں نے ملتجی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"سبینہ"

"مگر ——"

"کہئے ——"

"میں آپ کو اپنا پریم کہہ لیا کروں؟" میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں کھنچ آئی تھیں۔ اُس کی اُنگلیاں بدستور میرے جسم پر تولیہ پھیر رہی تھی۔ اُس کی غلافی پلکیں زور زور سے جھپکنے لگی تھیں۔ اُس کے لب کچھ کہنے کے لئے ایک دو بار کھلے۔ ایک ارادی کوشش کے ساتھ اُس نے پوچھا ——

"مگر کیوں؟ ——

"اس لیے کہ تمہارے ہاتھوں میں مسیحائی ہے"۔ میری آنکھیں شاید نم ناک ہو چلی تھیں اور یہ چیز اس نے بھی دیکھ لی تھی۔

اُس نے صرف اتنا کہا ——

"مگر میں تو ——" نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اپنے چہرے کو دوسری طرف پھیر لیا اور دو سلگتے ہوئے آنسو میری آنکھوں سے ڈھلک کر سرہانے میں جذب ہو گئے۔

اس کے بعد ہفتہ بھر میری حالت غیر یقینی رہی۔ وہ روز صبح میرا منہ ہاتھ دھلا جاتی، سر کے بالوں میں کنگھی کر جاتی اور ٹمپریچر اور بلڈ پریشر اور پلز ریٹ بیڈ ٹکٹ پر درج کر جاتی۔ اُس کی صورت میرے پژمردہ احساسات کے لیے نسیم صبحگاہی سے کم نہ تھی۔ جتنی دیر وہ وارڈ میں رہتی، خواہ وہ مجھ سے کتنی ہی دُور کیوں نہ ہو، میں اُس کی قربت کے لمس سے آشنا رہتا۔ میرے خیالات میں اب کسی قسم کا الجھاؤ نہیں تھا۔ کئی بار میں اُسے زیرِ لب 'ابنِ مریم' کہہ دیتا۔ صبح جب آتے ہی وہ مسکرا کر پوچھتی ——

"کہئے کیسی ہے طبیعت" —— تو میرے دل میں کنول کھل جاتے۔

جوں جوں میری طبیعت سنبھلنے لگی مجھے ابنِ مریم سے حد درجہ لگاؤ ہوتا گیا۔ جب وہ میرا ٹمپریچر دیکھنے کے لیے آتی تو میں کہہ دیتا ——

"ٹمپریچر ۹۷ اور پلس ۸۰"۔

وہ ایک لمحے کے لیے مسکرا کر میری طرف دیکھتی۔ اُس کی آنکھوں میں بچپن کی معصومیت عود کر آتی اور وہ اپنی فلائنگ کو زور زور سے جھٹکتے ہوئے کہتی ——

"ملوہان لیا ——" اور چارٹ پر نقطے بنا کر چلی جاتی۔ دو ہفتے کے بعد خود بخود اُٹھ کر بیٹھنے لگا۔ کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ میرے پاس ضرور رہتا، تھوڑا سا پڑھتا اور بہت سا سوچتا۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب وارڈ تقریباً خالی تھا کیونکہ نرسیں لنچ کے لیے گئی ہوئی تھیں اور مریض باہر دھوپ میں تھے تو میرے بیڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ رک گئی۔

"آپ اپنے سامنے کتاب رکھ کر خلا میں کیوں گھورتے رہتے ہیں"۔

"میں ایک لمحے کے لیے چونکا، اُس نے واقعی مجھے بے خودی کے عالم میں پکڑ لیا تھا۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ——

"کئی بار میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ یہ زندگی جس سے ہم ڈھیٹ کر چمٹے ہوئے ہیں دراصل کتنی بے معنی اور کتنی بے رس ہے۔ اگر ذاتی تحفظ کا احساس بنی نوع انسان میں ختم ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں بہت سی بیماریوں کی دوا مل جائے یعنی کوئی بیماری بھی لادوا نہ رہے۔

"آپ کی فلسفیانہ باتیں تو میں سمجھ نہیں سکتی۔ اتنا ضرور کہوں گی کہ ہر انسان اس دنیا میں کوئی نہ کوئی فریضہ سرانجام دینے کے لیے آیا ہے جب تک وہ اپنے فرض کو پہچان نہیں لیتا اُسے اپنی زندگی بے معنی اور بے رس ہی نظر آئے گی"۔

"لیکن کئی انسان اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر ہی فرض پورا کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں"۔

"فرض کا تعین بھی تو انسان کے اپنے احساسات، جذبات اور خیالات ہی کرتے ہیں۔ تو پھر ان میں تضاد کی گنجائش

ہی کہاں رہتا ہے۔"

"کیوں نہیں ـــــــ کئی بار آپ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں آپ کا فرض یہ کام کرنا ہے مگر جب آپ کا شعور بلند ہوتا ہے تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ نہیں یہ کام نہیں، آپ تو اس سے بہتر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، مگر آپ کو مجبوراً وہی کام کرنا پڑتا ہے۔"

"تو پھر اس میں تضاد کہاں ہے۔ آپ کے شعور کی پختگی آپ کے فرض کے راستے میں حائل نہیں ہوتی وہ تو بلکہ اُسے نکھارتی ہے، سنوارتی ہے اور بالیدگی دیتی رہتی ہے۔"

ابنِ مریم کی اس بات کا جواب میں دے سکتا تھا بلکہ دینا چاہتا تھا مگر اچانک میں پھر اپنے ہی خیالات میں کھو گیا۔ اس بار خیالات کا مرکز زندگی نہیں بلکہ ابنِ مریم کی ذات تھی۔ یہ گوری، پتلی اور نوجوان سی لڑکی جس کی عمر ۱۸ سال سے ایک دن بھی اوپر نہ ہوگی اس انداز سے اور اس رکھ رکھاؤ سے زندگی کے بارے میں باتیں کر رہی تھی کہ مجھے اپنی چھاری بھرکم کتابیں حقیر نظر آنے لگیں۔ زندگی سے اُس نے کتنا خوشگوار سمجھوتہ کر رکھا تھا اور یہ سمجھوتہ زندگی کو سمجھنے، حقائق سے دوچار ہونے اور انسانی فطرت سے روشناس ہونے کا ماحصل تھا ـــــــ کوئی جذباتی لگاؤ نہ تھا۔

ایک روز صبح کے وقت جب وہ میرا بستر ٹھیک کر رہی تھی تو کہنے لگی ـــ

"کل سے میری ڈیوٹی ٹی آئی ہسپتال میں ہو گئی ہے۔"

"بڑی جلدی آپ کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے، ابھی پندرہ بیس روز ہی ہوئے ہیں آپ کو یہاں۔"

"مگر میں آپ کے آنے سے پہلے بھی تو اسی وارڈ میں تھی۔"

"اوہ ـــــــ!"

"ـــــــ"

"تو گویا آپ کی ڈیوٹی ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ کی بجائے ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال میں بھی ہو جاتی ہے۔"

"ٹی آئی ہسپتال اسی ہسپتال سے ملحق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس کی بلڈنگ یہاں سے کچھ دوری پر ہے۔"

"اُس ہسپتال میں آپ کتنے روز رہیں گی۔"

"دو ماہ ـــــــ ایک ماہ ڈے ڈیوٹی اور دوسرے ماہ نائٹ ڈیوٹی۔"

"نائٹ ڈیوٹی تو بہت مشکل ہوتی ہوگی۔"

"مشکل ـــــــ کیا اپنی ڈیوٹی مشکل بھی ہوتی ہے۔"

"ـــــــ ابنِ مریم"

میرے آخری الفاظ پر اُس نے اپنی غلافی پلکوں کو اوپر اُٹھایا، ماتھے پر معمولی سی تیوری بنائی اور غصے سے میری طرف دیکھا ـــــــ

"ابنِ مریم" ـــــــ میں نے دوبارہ کہا اور ہم دونوں مسکرا دیئے۔

اُس کے جانے کے بعد میں کوئی ہفتہ بھر اور وہاں رہا۔ مگر وہ ہفتہ مجھے پہلے تین ہفتوں سے بھی طویل معلوم ہوا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ سبھی نرسیں ایک سی نہیں تھیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں جو مریضوں کو بات بات پر- - - - - - - -

جھاڑ دیتی تھیں، ہر وقت تنہا رہتی تھیں۔ اپنی زندگی کی تلخی کو ماحول میں گھولتی رہتی تھیں۔ وہاں کی جو شافت نرس تھی وہ تو ہر وقت بڑبڑاتی رہتی تھی۔ ہر ایک سے الجھتی رہتی تھی، میں نے ایک دوست سے اُس کی اس عادت کا ذکر کیا تو اس نے فوراً کہا ــــــــ

"اس کی انا (ایغو) زخم خوردہ ہے۔"

"کیا علاج تو ہوگا ــــــ"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں ــــــ"

"کیا ــــــ؟"

"کوئی مردِ مومن اُس سے عشق فرمانے لگ جائے۔"

عشق..... عشق..... عشق، یہ لفظ بار بار میرے ذہن میں اُبھرنے اور محو ہونے لگا۔ معاً دو لمبی لمبی انگلیاں میری دائیں کلائی پر جم گئیں۔ ہلکے سے دل پسند بوجھ تلے میری نفس کی حرکت تیز ہو گئی۔

مسکراتے ہوئے دو ہونٹوں نے پوچھا ــــــ "کیسی ہے طبیعت"، جواب دینے کے بجائے میں نے تشکر آمیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ دو غلافی پلکیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں کسی نے آہستہ سے کہا "دوسری طرف کروٹ بدلیئے"۔ ایک نرم اور نازک ہاتھ میری پیٹھ پر سیرٹ اور پاؤڈر لگانے لگا۔ "آپ کے بال کس قدر بکھرے ہوئے ہیں"۔ اسی نسائی آواز نے فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کیا اور گوری گوری لانبی انگلیاں میرے بالوں میں اُلجھنے لگیں۔ مجھے اپنا سارا وجود کسی مہربان موج کی آغوش میں ہلکورے لیتا ہوا محسوس ہوا۔

"آج کل وہ نظر نہیں آئی"۔ میرے دوست کے ان الفاظ نے مجھے چونکا دیا ــــ

"کون ــــــ؟"

"وہی نازک بدن، سیمیں تن"۔

"ابنِ مریم ــــــ؟"

"کیا ــــــ؟" میرے دوست کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان سا بنا۔ جو پھیلتے پھیلتے سارے ماحول پر محیط ہو گیا۔

بقیہ:۔ رومن اور عربی خط کا تجزیہ (صفحہ ۲۰ سے آگے)

یا طوالت؟ اس میں شک نہیں کہ علم و فن کے بے شمار گوشے ایسے ہیں جن میں ہم اس وقت پسماندہ ہیں اور ان گوشوں میں ہمیں مغرب سے بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن یہ ایک گوشہ ایسا ضرور ہے جس میں مشرق کی فوقیت ہمیشہ مسلم رہی ہے۔ یہ کیسی لاعلمی ہے کہ بعض اہلِ مشرق اپنی اس فوقیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں! (ادبی دنیا۔ لاہور)

طنز و مزاح

رشید الدین

دوستوں کی دُنیا

جناب دوستوں کی ان دنوں کمی نہیں۔ کیا گھر کیا باہر کیا اڈرس کیا پڑوس کیا گلی کیا کوچے جدھر جائیے منہ اٹھائے دوست چلے آتے ہیں۔ اور ہوٹلوں کا کیا کہنا یہ تو دوستوں کے اصل مرکز ہی ہیں۔ جہاں دوست یوں ڈھلے جاتے ہیں جیسے ٹکسال میں سکے۔ مختصر کہ فی زمانہ وہ کونسی جگہ ہے جہاں خدا کی یہ مخلوق نہ پائی جاتی ہو۔ اس طرح وہ لوگ جو ہمارے اس دور کو "خلا کا دور" سمجھتے ہیں سخت غلطی پر ہیں۔ اس دور کو تو اصل میں "دوستوں کا دور" کہنا چاہئے۔ اور کیوں نہ ہو زمانہ بھی تو آج کل عالمی بھائی چارگی اور دوستی کا ہے۔ آج کے اس پُرآشوب دور میں کوئی ملک یا قوم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر نہیں کرسکتے تو پھر فرد کی کیا بساط ہے۔ فرد تو بہرحال فرد ہوتا ہے۔ جو مفکرِ اعظم ارسطو کے الفاظ میں "سماجی جانور" ہے۔ بھلا یہ سماج سے کیونکر الگ رہ سکتا ہے یا اپنے حرکات و سکنات کس طرح صرف اپنی حد محدود رکھ سکتا ہے۔ اسے ایک سماجی جانور ہونے کے ناطے اپنے دوسرے انسانی بھائیوں کو بور کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا ایک فلسفے کے لکچرار کو اپنے شاگردوں کو۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ دوستوں کا دور ہے اور کیونکہ دور بہرحال دور ہوتا ہے اس لئے اس کے آگے ہم مجبور ہیں۔ کیونکہ اگر جدھر کی ہوا ہو اُدھر چلنے کی کوشش نہ کی گئی تو ٹوپی اُڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور اگر کسی کی ٹوپی اتنی قیمتی نہ ہو کہ اُسے اس کے اُڑ جانے کا ملال ہو تو آخر میں خود اُسے بھی اُڑ جانا پڑتا ہے۔ اس لئے خیریت اسی میں ہے کہ شاعر کے اسی فرمان پر چپ چاپ عمل کیا جائے ؎

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

کہتے ہیں دنیا میں بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ اور کیونکہ دوست بھی دنیا کے ان ہی لوگوں میں سے ہوتے ہیں اس لئے ان کا بھی بھانت بھانت کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح جہاں نفسیات دانوں نے لوگوں کی درجہ بندی کی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ دوستوں کی بھی درجہ بندی کی جائے۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی کا دوست ہے اور جب یہ ثابت ہو جائے تو یہ بھی ماننا ہی پڑے گا کہ کسی نہ کسی کیٹیگری یا قسم میں ہمارا بھی ہونا ضروری ہے تو آئیے اس درجہ بندی میں ہم ایک دوسرے کو تلاش کریں۔ مگر صاحب صرف تلاش کرلینا ہی کافی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور ان عادتوں کو ترک کرنے کی کوشش کریں جن سے دوسروں کی زندگی دوبھر ہو رہی ہے۔

پہلے زمانہ میں غم گساری، چارہ سازی اور دوستی ایک ہی مثلث کے تین زاویے تھے۔ مگر اب زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ مثلث ایک خطِ مستقیم میں تبدیل ہو گیا ہے اور اس طرح ان تینوں کا مل جانا محال ہی نظر آتا ہے۔ اس بات کا رونا ایک بار شاعرِ اعظم غالب اپنے ایک شعر میں یوں رو چکے ہیں ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ٭ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

لیکن غالب کچھ نہیں یا چاہے کوئی اور، اب یہ خطِ مستقیم کبھی مثلث نہیں بن سکتا اور دوستی، غم گساری اور چارہ سازی کبھی ایک نقطہ پر نہیں مل سکتیں۔ بلکہ یہ چیزیں متضاد ہی رہیں گی۔ تو دوستی کی درجہ بندی یا اقسام میں سب سے پہلے ایسے دوستوں کا نمبر آتا ہے جو ناصح ہیں اور اپنی شخصیت میں پند و نصیحت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا رکھتے ہیں۔ غم گساری، چارہ سازی اور ہمدردی سے ایسے ہی دور بھاگتے ہیں جیسے شیطان لاحول سے۔ یہ چیزیں ان کی سرشت میں کبھی داخل ہی نہیں رہیں۔ مثلاً آپ سے کوئی ایسا واقعہ نادانستہ یا دانستہ طور پر سرزد ہو گیا ہے جس کی وجہ سے آپ کا ضمیر مسلسل آپ کو ملامت کر رہا ہے تو آپ دل کا بوجھ ہلکا کرنے اس واقعہ کا تذکرہ اپنے اسی قسم کے کسی دوسرے دوست سے کرتے ہیں تاکہ وہ آپ کو کچھ تسلی دے۔ اور آپ کا دل ذرا اوپر لائے۔ لیکن جوں ہی آپ اس واقعہ کا تذکرہ اپنے کسی اس قسم کے دوست سے کرتے ہیں وہ فوراً گلا کھنکار کر ایک لکچر جھاڑ دیتے ہیں۔ اس اثناء میں چاہے آپ ان کی طرف کتنی ہی ترحم طلب نگاہوں سے کیوں نہ دیکھیں وہ اپنی مولانا حالی قسم کی نصیحت بند نہیں کریں گے۔ اور آپ کا دل ڈوبتے ڈوبتے تہہ تک پہنچ جائے گا۔ ان کے مکالمے عام طور پر کچھ اس قسم کے ہوں گے۔

"ارے آپ نے ایسا کیوں کیا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ بہت ہی بری بات ہے۔ ہمیں اخلاقی حدود کو نہیں پھلانگنا چاہئے۔ اگر پڑھے لکھے لوگ ہی ایسا کرنے لگیں تو جاہلوں کا کیا کہنا۔" وغیرہ وغیرہ۔ غرض وہ ایک لمبی چوڑی تقریر ہوگی۔

دوستوں کی اقسام کے سلسلے میں دوسرا نمبر ان دوستوں کا آتا ہے جو اس پہلی قسم کے بالکل الٹ ہوتے ہیں۔ یہ بہت زیادہ با تکلف اور باوضع ہوتے ہیں۔ دل رکھنے والی بات اور بجھ بجھ جانے والی ادا ان میں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے۔ ان کی ہمدردی اکثر نادان کی دوستی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً آپ میں بہت ساری خراب عادتیں ہیں۔ آپ بات کرتے ہوئے سامنے والے کے جذبات کا قطعی خیال نہیں رکھتے۔ اپنی ہی اوٹ پٹانگ ہانکتے رہتے ہیں۔ دوسرے کو کچھ بولنے کا موقع نہیں دیتے۔ مگر یہ خدا کے بندے کبھی آپ کو نہیں ٹوکیں گے اور نہیں کہیں گے کہ جناب آپ اپنی اس عادتِ مبارک کو ترک کیجئے۔ شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے خاقانیٔ ہند استاد ذوق مرحوم نے لکھا تھا ؎

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

آپ کسی کام سے جا رہے ہیں اور یہ (میرا مطلب اس قسم کے کسی دوست سے ہے) آپ کو راستے میں دھر لیتے ہیں۔ خواہ مخواہ کی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں جن کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر۔ اور کیونکہ معاملہ تکلف کا ہے اس لئے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ کسی محفل میں مل جائیں گے تو بات شروع کرنے سے پہلے یوں لمبی چوڑی تمہید باندھیں گے کہ توبہ ہی بھلی۔ "اہاہ! آپ ہیں۔ آج کدھر بھٹک گئے جناب۔ تو کبھی نظر ہی نہیں آتے۔ چشم بددور حضور کے دشمنوں کی طبیعت تو خراب نہیں تھی؟" وغیرہ وغیرہ۔

دوستوں کی تیسری قسم ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو اونچی ہانکنے کے عادی ہوتے ہیں اور کیونکہ ہانکتے رہنے کے لئے موضوعِ بحث کا ہونا ضروری ہے اس لئے اکثر بے پر کی اڑاتے ہیں۔ مثلاً آپ ایسے کسی دوست سے ملئے۔ بس ملتے ہی وہ پچھلی ملاقات سے اب تک جو کچھ ان کی ذاتِ ناتواں پر گذری بلا کم و کاست بیان فرما دیں گے۔ بھلا اس سے آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن کیونکہ دوستی ہے اس لئے دوستی میں سب کچھ روا ہوتا ہے۔ پھر ہر بار یہ جب بھی آپ سے ملتے ہیں ایک نئی اور سنسنی خیز خبر ضرور اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور کسی وقت اتفاق سے کوئی خبر نہ ملے تو اپنی طرف سے گھڑنے میں بھی کمی نہیں کرتے۔ کیونکہ خبر انہیں بہر حال سنانی ہوتی ہے ورنہ ان کے معمول میں فرق جو آ جائے گا۔ اکثر یہ خبریں کسی بڑے ادیب یا شاعر کے انتقال، شادی یا جھگڑے کے متعلق ہوتی ہے یا پھر کسی نئی کتاب کے چھپنے یا کسی نئے مضمون کی اشاعت کے بابت ہوتی ہے۔ اکثر دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کتاب ابھی پریس میں ہی ہوتی ہے مگر یہ اطلاع دیتے ہیں کہ چھپ گئی اور نہ صرف یہ بلکہ وہ اسے پڑھ بھی چکے ہیں اور جو تفہیم کی بابت پوچھا جائے تو کہہ دیتے ہیں میں نے پوری نہیں پڑھی۔ چلئے اب کیا کہتے ہیں آپ۔ لیکن ناولیں یا کتابیں روز نہیں چھپتیں اور ادیبوں اور شاعروں کا انتقال

شادی یا جھگڑا روز نہیں ہوتا۔ اس لیے تان آکر فلموں پر ٹوٹتی ہے کیونکہ فلم تو بہرحال روز ریلیز ہوتے ہیں۔ پھر صرف یہی نہیں۔ ذاتی حالات بھی زیر بحث آتے ہیں جو کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں:۔

"کل میری ایک عزیزہ کی شادی ہے۔ تیاریاں انتہائی زور و شور سے جاری ہیں۔ ایک لاکھ تو رقعے تقسیم ہوئے۔ دس پلنے کا کھانا پک رہا ہے۔ دولھا بی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ چار لاکھ کا جہیز مل رہا ہے (اور جو جہیز مل پاس ہو گیا اس کی حضرت کو خبر نہیں)۔ ہمارے ایک عزیز نے ہم پر مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے ہماری جائداد میں ان کا بھی حصہ ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ شہر کا سب سے بڑا وکیل ہماری پیروی کر رہا ہے۔" غرض وہ ایک ہی ملاقات میں آپ کا سارا دماغ چاٹ جائیں گے اور یہ نہیں دیکھیں گے کہ آپ کو "ان" باتوں سے کوئی دلچسپی بھی ہے یا نہیں اور یہ کہ آپ سنتے سنتے اونگھنے لگے ہیں اور صبر کے کڑوے کسیلے گھونٹ یکے بعد دیگرے پیتے جا رہے ہیں۔ ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا اور جوں ہی وہ اپنی باتوں کا اسٹاک ختم کر چکے ہیں فوراً آپ سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ چاہے پھر آپ کو ان سے کوئی اہم بات ہی کہنا کیوں نہ ہو۔

دوستوں کی آخری قسم بے تکلف دوستوں کی ہے۔ آپ چاہے سنجیدہ موڈ میں رہیں یا کچھ پڑھنے کے 'خاموش رہنے کے موڈ میں رہیں یا کچھ سوچنے کے یہ بلا تکلف آپ کے کمرے میں آ دھمکتے ہیں اور قہقہے بکھیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دوستی کی یہ قسم کافی عام ہے۔ ایسے ہی دوستوں کے متعلق سجاد حیدر یلدرم نے کہا تھا کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"! اور شہنشاہ غزل میرؔ نے ان سے بچنے کے لئے اپنے ہی ہاتھوں اپنے گھر کو آگ لگائی تھی۔ اس لئے اس پر مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔

تو یہ ہے دوستوں کی دنیا۔ اب اگر ایسے حالات میں غالبؔ نے یہ کہا تھا تو کیا غلط کہا تھا ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو!

بقیہ:۔ ہندی (ہندی v اردو) کی ماہیت و حقیقت ایک ہندی عالم لسانیات کی نظر میں

(صفحہ ۱۴ سے آگے)

سید انشاء صاف صاف کہتے ہیں کہ لاہور، ملتان، آگرہ، الہ آباد کو وہ امتیاز حاصل نہیں ہے، جو شاہجہاں آباد یا دلی کو ہے۔ یہی شاہجہاں آباد میں اردو کا جنم ہوا ہے۔ کچھ ملتان، لاہور، آگرے میں نہیں۔ اردو کی پیدائش کی کہانی یہ ہے کہ "شاہجہاں آباد میں خوش بیان لوگوں نے متفق ہو کر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے لفظ نکالے اور بعض عبارتوں اور الفاظ میں تصرف کر کے اور زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی، جس کا نام اردو رکھا"

اوپر کی مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ اردو کی نشو و نما کہاں اور کیسے ہوئی؟ اور در اصل یہ کس کی زبان تھی؟ ادھر جب سے ملک میں نظام جمہوریت کا آغاز ہوا ہے تب سے اردو کے بارے میں سید انشاء اور ان کے ہم خیال اصحاب کے خیالات کو غیر محقق قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش جاری ہے کہ اردو عوام کی زبان ہے اور اس کی تخلیق میں سادھوؤں، سنیاسیوں، ولیش بھگتوں کا ہاتھ رہا ہے۔

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں ـــــ (ادارہ)

مولانا ابوالکلام آزاد کتاب التذکرہ

یہ اصل میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگاری کتاب ہے جو آپ کی سنتروین سالگرہ کے موقع پر ۱۱ نومبر ۱۹۵۸ء کو ایک عام تقریب کے ذریعے مولانا کی خدمت میں پیش کی جانے والی تھی۔ مولانا کے اچانک انتقال کے سبب بجائے کتاب المیلاد کے کتاب التذکرہ کے نام سے متعاقب ادارۂ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس گلدستۂ مضامین کو پروفیسر ہمایوں کبیر نے انگریزی میں مرتب کیا ہے اور ڈاکٹر میر ولی الدین (جامعہ عثمانیہ) نے اسے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں ۱۶ ہندستانی، ۳ انگریز، ایک فرانسیسی، ایک عرب اور ایک ایرانی جملہ ۲۲ اصحاب (جو اہل علم، ادیب، فلسفی، مورخ اور سیاست داں ہیں) نے مولانا موصوف کے علم و فضل، تدبر و سیاست، شخصیت و کردار، اسلام و اجتہاد اور دل پسند مشغلے سے متعلق اپنے اپنے خیالات و تاثرات کا مختلف نقاط نظر سے اظہار کیا ہے۔ ترجمہ عمدہ اور علمی ہے جس میں اصل کا سا دھوکا ہوتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے ادارۂ مذکور قابل مبارکباد ہے۔ لکھائی چھپائی ٹائپ زدہ اور دیدہ زیب۔ ضخامت ص ۲۹۲، قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، خیریت آباد، حیدرآباد ۴، آندھرا پردیش۔

(غلام رسول)

تیسری آنکھ

مصنف: موہن یاور۔ پبلیشر: کلدیپ بک سنٹر، لکا دنگہ، جموں (توی)۔ قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے۔

تیسری آنکھ، جموں کے شہر کے مشہور افسانہ نگار موہن یاور کے بارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ میرے ان دوستوں میں سے ہیں جن سے ملنے اور جن کو دیکھنے کا مجھے آج تک موقع نہ مل سکا۔ موہن یاور جدید نسل کے ذہین اور باصلاحیت افسانہ نگاروں کی صف اول کا ایک ممتاز نمائندہ ہے۔ اس کے زیر نظر تمام افسانوں کا ماخذ زندگی ہے اور زندگی کے تعلق سے اس کا طریق فکر حقیقت پسندانہ اور جذباتی ہوتے ہوئے بھی انتہائی صحت مند ہے۔ موہن یاور نے تجربات، مشاہدات اور حادثات کے روپ میں جو دیکھا، سنا اور محسوس کیا اسے بے کم و کاست افسانوں میں قلمبند کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس کے افسانوں میں وجدان اور احساس جمال کی کمی کا احساس ہو اور یہ کمی محض اسی وجہ سے نظر آئے گی کہ موہن یاور حقیقت کو راست حقیقت کی شکل میں دیکھنے اور دکھانے کا قائل ہے۔ زیر نظر افسانوں میں "شکست"، "دھرتی کا بوجھ"، "سپنے لوریم"، "یہ آنکھیں یہ راستے"، "آخری ستون" اور "تیسری آنکھ" خوبصورت افسانے ہیں۔ موہن یاور کو اپنے فن، اپنے خیالات اور احساسات کے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اظہار پر قدرت حاصل ہے۔ اس کے افسانے پڑھ کر چمن میں پھولوں اور پودوں پر منڈلانے والے بیقرار بھونروں اور تتلیوں کا خیال آتا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے افسانوں کا مجموعہ نہیں پڑھا ہے بلکہ ایک مسائلی غزل پڑھی ہے.... اختصار، سادگی اور پرکاری موہن یاور کی تحریر کا نمایاں وصف ہے۔

(اکرام جاوید)

نیرنگ نظر

روحی علی اصغر۔ ضخامت ص ۱۶۰۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب اور اعلیٰ معیار کی۔ مجلد خوبصورت گرد پوش۔ قیمت ۴ روپے۔
حیدرآباد کی خواتین میں شعر و شاعری کا ذوق ضرور ہے لیکن شاعر خواتین بہت کم ہیں اور ان کے کلام کے مجموعے

تو بہت ہی کم منظر عام پر آئے ہیں۔ آبگینۂ شعر (بشیر) کے بعد تہنیت النساء بیگم صاحبہ کے کلام کے مجموعے شائع ہوئے اور اب روحی علی اصغر کا کلام منظر عام پر آیا ہے۔ روحی حیدرآباد کے شعراء میں کافی مقبول ہیں اور کوئی محفل شعر ایسی نہیں ہوتی جہاں وہ اپنا کلام نہ پیش کرتی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی قادر الکلامی کے ساتھ شعر کہتی ہیں اور انداز فکر بھی نیا ہے۔ اس مجموعے میں موقتی نظمیں بھی ہیں اور شخصی نظمیں بھی۔ موقتی نظموں کا تاثر زیادہ تر بر موقع ہی ہوتا ہے۔ وقت گذرنے پر ان میں دلکشی کی وہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ شخصی نظمیں بھی موقتی کے بعد آتی ہیں۔ غزل پر قلب کی آواز ہے اور سب کی ترجمانی کرتی ہے۔ روحی نے بہا بھی اچھے شعر کہے ہیں۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہم خزاں میں بھی سنائیں گے ترانے روحی — کیا ضروری ہے بہاروں میں غزل خواں ہونا

آنسوؤں سے بھڑکتے ہیں شعلے — آگ لگتی ہے دل میں پانی سے

ساری دنیا مری مخالف ہے — آپ کی ایک مہربانی سے

کل جو ہوگا اسے خدا جانے — آج دیکھیں گے زندگی کا مآل

یہاں کتنا گراں ہے مسکرانا — کلی کا کوئی دل لائے کہاں سے

میری حالت نہ دیکھ اے ساقی! — جام لینے کا ہاتھ میں دم ہے

غرض ایسے کئی شعر ہیں جو قابل انتخاب ہیں۔ لیکن ہم انتخاب کیوں دیں؟ کتاب خریدیئے، پڑھیئے، داد دیجئے اور ابھرتی ہوئی شاعرہ کی حوصلہ افزائی کیجئے۔

(محمد اکبر الدین صدیقی)

کیف و عرفان (نعتیہ کلام کا مجموعہ)

از:۔ یوسف اجمیری

اردو کا ایسا کون شاعر ہوگا جس نے حمد و نعت میں کچھ نہ کچھ طبع آزمائی نہ کی ہو۔ بعض شعراء نے تو صرف نعت گوئی کو ہی اپنی شاعری کے لئے مختص کر لیا ہے۔ اس خصوص میں محسن کاکوروی نے نعت گوئی میں ایسا مقام پیدا کیا ہے ڈاکٹر سید رفیع الدین صاحب صدر شعبہ فارسی ناگپور یونیورسٹی نے ایک مقالہ اردو کی نعتیہ شاعری پر بھی مرتب کیا ہے۔ بہرحال اردو میں نعتیہ شاعری کا ذخیرہ کافی ہے۔ اس میں اب "کیف و عرفان" کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ "کیف و عرفان" یوسف اجمیری صاحب کا نعتیہ کلام ہے جسے وقار راشدی نے مرتب کیا ہے۔ چھوٹی سائز کے (۶۴) صفحات پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ "کیف و عرفان" سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں محبت رسول کی چنگاری موجود ہے۔ ہر مسلمان کے لئے یہ محبت نہایت ضروری ہے۔ کوئی اس کو ظاہر کر سکتا ہے اور کوئی ظاہر نہیں کرتا۔ یوسف صاحب نے اپنے کلام کو نعت گوئی کے لئے گویا مختص کر لیا ہے۔ یہ کتاب حیدرآباد (سندھ) پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت صرف (۷۵) نئے پیسے ہے۔

(نصیر الدین ہاشمی)

ادبی دنیا

ادبی دنیا کا زیر نظر شمارہ خاص نمبر ہے۔ شعری اور نثری دونوں تخلیقات معیاری ہیں۔ مقالات میں سب سے زیادہ فکر انگیز اور اہم مقالہ علی عباس جلال پوری کا ہے جس میں انھوں نے روایتی انداز نظر سے ہٹ کر تاریخی حقائق کی روشنی میں علم الکلام کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ علم الکلام کی ابتداء اور اس کے تدریجی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے نو اشراقیت یا نو فلاطونیت کی اہمیت، تجلی یا اشراق کے نظریات کی ماہیت اور معتزلہ عقائد کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ علی عباس جلالپوری نے جبریہ اور قدریہ نظریوں سے بحث کرتے ہوئے ان تاریخی اور سیاسی محرکات کا بھی تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے جو ان نظریات کے پیچھے کام کر رہے تھے۔ جدید اسلامی تحریکوں کے پس منظر میں علی محمد باب، مرزا حسین علی بہاء اللہ اور محمد بن عبد الوہاب کے تصورات کی وضاحت کی

بڑے عالمانہ انداز میں کی گئی ہے۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے دیار فرنگ سے ادبی دنیا کے لئے اپنا دلچسپ مضمون "انڈیا آفس لائبریری" بھیجا ہے جس میں انھوں نے اس کتب خانے کی تقسیم کے مسئلے پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ شہاب جعفری کا مضمون "جذبی" ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا ترجمان ہے۔ انھوں نے جذبی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ان عمرانی عوامل اور سماجی میلانات کی اہمیت بھی پیش نظر رکھی ہے جو حسن کار کے شعور کی تہوں پر اپنا نقش ثبت کر دیتے ہیں۔ اس شمارے کے دوسرے دلچسپ مقالات "ایران کے عوامی گیت" "آسمان کی بادشاہت" اور کتب خانۂ آزاد ہیں۔ آغا باقر نے اپنے مضمون کے آخر میں یادگار آزاد قائم کرنے کے سلسلے میں جو تجویز پیش کی ہے وہ اہل پاکستان کیلئے قابل غور ہے۔ قابل ایڈیٹر کا وقیع مقالہ "آزاد کا کلچر" بھی اس شمارے میں شامل ہے جو انھوں نے محمد حسین آزاد کی اکاونویں برسی کے موقع پر لکھا تھا۔ اس مضمون کے مطالعے سے محمد حسین آزاد کے تہذیبی اور ثقافتی نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ وزیر آغا کا مضمون "اردو نظم میں مسرت و بہجت کی ایک مثال" بہت دلچسپ ہے اور اسلوب بیان بھی شگفتہ اور دلکش ہے۔ "ادبی دنیا" میں اسی طرح کسی خاص شاعر یا ادیب پر تفصیلی مضامین شائع ہوتے رہیں تو یہ ادب کی مستحسن خدمت ہوگی۔

نظم کا حصہ بھی خاصہ جاندار ہے۔ نظموں میں وزیر آغا کی نظم "بلاوا"، جگن ناتھ آزاد کی نظم "نظر میں نہ خبر میں"، شہاب جعفری کی نظم "پس پردہ" اور بشیر نواز کی نظم "مضطرب" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اشک رامپوری، ضیا اکبرآبادی، شاذ تمکنت اور اختر صہبائی کی غزلیں بھی اپنی معنویت اور انداز بیان کے اعتبار سے اس شمارے کی اچھی غزلیں کہی جا سکتی ہیں۔

(ڈاکٹر سیدہ جعفر)

نیا شعور

شعبہ اردو جامعہ جموں و کشمیر، سرینگر کا ترجمان

یہ جامعہ کے شعبہ اردو کا پہلا شمارہ ہے اور ٹیگور کے متعلق اس میں نظمیں اور مقالے شامل ہیں۔ انگریزی کے پروفیسر ایس، ایل، پنڈت کا مضمون "ٹیگور بحیثیت ڈرامہ نگار"، شکیل الرحمن صاحب کا مضمون "ٹیگور کا رومانوی ذہن" قابل مطالعہ ہیں۔ شریف احمد نے "ٹیگور اور نیا ہندوستان" پر اور اسد اللہ کامل نے "گیتا نجلی" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اجیت کمار اور جنی لال پنڈت نے "نوکا ڈوبی" (ناول) اور "جیون پربھات" پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں طلبا جتنا زیادہ حصہ لیں بہتر ہے۔ امید ہے کہ فاضل اساتذہ کی رہنمائی میں نیا شعور ترقی کرے گا۔

(محمد اکبرالدین صدیقی)

فروغ اردو کا جگر نمبر

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس سے قبل فروغ اردو کا ایک شمارہ جگر نمبر کی شکل میں آکر دستاویزی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یہ مضامین اسی کا تکملہ سمجھئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا مضمون شعلۂ طور۔ تعارف۔ نوردار وشاعر، جگر کا فارسی کلام، پروفیسر سید حسن پٹنہ، حضرت جگر مرادآبادی، خواجہ احمد فاروقی، شعلہ طور، شاہ معین الدین ندوی کے گراں مایہ مقالوں کے علاوہ نثار احمد فاروقی اور سعادت نظیر نے بھی حضرت جگر کے تعلق سے دلکش انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح اس شمارہ کی اہمیت کم نہیں۔

(محمد اکبرالدین صدیقی)

ماہنامہ "قند" مردان (ڈرامہ نمبر)

زیر نظر شمارہ مردان (پاکستان) کی پریمیر شوگر ملز اینڈ ڈسٹلری کمپنی لمیٹڈ سے شائع ہونے والے ماہنامہ "قند" کا ڈرامہ نمبر ہے جس کو اس کے ایڈیٹر تاج سعید نے بڑی لگن، جستجو اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ شاندار نمبر ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، ترتیب اور ٹائیٹل بہت عمدہ ہے جس میں متعدد تصاویر بھی شامل ہیں۔ اس نمبر میں ہندوستان اور پاکستان میں ڈرامے کے تعلق سے ہر چیز کو جگہ دی گئی ہے۔ ہندوستان سے تاج سعید کو نوجوان افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار رہبنس سنگھ دوست نے (جو بمبئی میں مقیم ہیں) مواد اور بہت ساری چیزیں فراہم کی ہیں۔ اس طرح

یہ ہندوستان اور پاکستان کے فنکاروں کا مشترکہ نمبر ہے۔

اس نمبر میں ہندوستان سے کرشن چندر، پرتھوی راج کپور، رمیش سہگل، اندرراج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، بلونت گارگی، راجندر سنگھ بیدی، آئی۔ ایس جوہر، ریوتی سرن شرما، کرتار سنگھ دگل، بلراج ساہنی، سجن، شمس کنول اور ہربنس سنگھ دوست وغیرہ اور پاکستان سے ڈاکٹر وزیر آغا، آغا بابر، انور عنایت اللہ، خادم محی الدین، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، وقار بن الہیٰ، انور خواجہ، رضیہ فصیح احمد اور تاج سعید وغیرہ جیسے لکھنے والوں نے حصہ لیا ہے۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سارے مصنفین کے ڈرامے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے کے فن اور اس کی ترویج و اشاعت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ بہت سارے مصنفین کے اسٹیج ڈراموں کے تعلق سے اپنے مشاہدات اور تاثرات کی روشنی میں مشورے شامل ہیں۔ انڈین شیکسپیر آغا حشر کاشمیری کے ایک غیر مطبوعہ ڈرامے "ترکی فرشتہ" کا بھی کچھ حصہ شائع کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ہربنس سنگھ دوست نے "قند" کے مستقل عنوان "روپ بہروپ" کے تحت ہندوستانی لکھنے والوں کا بڑا تفصیلی اور اچھا تعارف کروایا ہے۔ اس نمبر میں متعدد ملکی اور غیر ملکی اسٹیج کے فنکاروں کی اصلی تصاویر، اور اس کے ساتھ ہی ڈرامائی تصویریں بھی دی گئیں ہیں۔ بعض ڈراموں کے مناظر کی تصاویر بھی دی گئیں ہیں۔ اس کے علاوہ لکھنے والوں کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ منشی پریم چند کے ہندی ڈرامے "سنگرام" کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ پشتو اور فارسی ڈراموں کے تراجم بھی دیئے گئے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی دیگر ریاستی زبانوں کے ڈراموں کے تراجم بھی دینے چاہیئے تھے مگر اس سلسلے میں خود مرتب نے ان کی عدم دستیابی کا اعتراف کر لیا ہے۔

"قند" کا یہ ڈرامہ نمبر بڑے معرکے کی چیز ہے اور اپنے موضوع پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مرتب تاج سعید اور پریمیر شوگر کمپنی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اتنا ضخیم، بھاری اور عمدہ ڈراما نمبر شائع کیا ہے۔ ہندوستان میں یہ نمبر ساڑھے چھ روپے میں ہند تاج آفس دہلی سے خریدا جا سکتا ہے۔

(رشید الدین)

ماہنامہ "اودھ پنچ" لکھنؤ (کنھیالال کپور نمبر)

آج سے دو تین سال قبل ہندوستان اور پاکستان سے اردو کا کوئی مزاحیہ رسالہ نہیں نکلتا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اردو کے نوجوان مزاح نگار احمد جمال پاشا نے آج سے دو ڈھائی سال قبل لکھنؤ سے "اودھ پنچ" نکالنا شروع کیا جو قدیم تاریخی مزاحیہ رسالے "اودھ پنچ" ہی کی کڑی ہے اور اس کا تیسرا دور ہے۔ بعد میں پاکستان (کراچی) سے بھی "پھلجھڑی" اور "پاک پنچ" دو مزاحیہ رسالے نکلنے شروع ہوئے۔ اس طرح اس وقت ہندوستان اور پاکستان سے اردو کے صرف تین مزاحیہ رسالے نکل رہے ہیں۔

"اودھ پنچ" کا زیر نظر شمارہ "کنھیالال کپور نمبر" ہے جو اردو کے کہنہ مشق طنز نگار کنھیالال کپور کی خدمات کے اعتراف کے طور پر نکالا گیا ہے۔ کپور اردو کے قدیم اور منجھے ہوئے طنز نگار ہیں جن کے اب تک چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور عوام و خواص سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ کپور ان دنوں نسبتاً کم لکھ رہے ہیں مگر انھوں نے بالکل میدان نہیں چھوڑ دیا ہے۔

ہم اردو والے ہمیشہ روایت پرست رہے ہیں۔ چنانچہ یہ روایت بھی جو ہمارے آباو اجداد کے زمانے سے چلی آ رہی تھی کہ کسی ادیب یا شاعر کے مرنے کے بعد ہی اس پر کوئی نمبر نکلے، چلتی ہی رہی مگر ادھر کچھ دنوں سے چند لوگوں نے اس ڈگر سے ہٹ کر زندہ شاعروں اور ادیبوں پر بھی خاص نمبر نکالنا اور انھیں جیتے جی خراج تحسین پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ یقیناً ہمارے ادب میں یہ ایک نیک فال ہے اور اسے جاری رہنا چاہیئے۔ "اودھ پنچ" کا زیر نظر نمبر بھی اسی زمرے میں شامل ہے اور احمد جمال پاشا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کنھیالال کپور کی ادبی خدمات کو ان کی زندگی ہی میں خراج پیش کر دیا اور ان کے تعلق سے بہت ساری چیزیں اکٹھا کر دیں۔

اس میں کپور کے فکر و فن، شخصیت و کردار، عادات و اطوار، اور شخصی و اجتماعی زندگی پر متعدد مضامین شامل ہیں اور سب سے بڑی

خوبی یہ ہے کہ کوئی بھی مضمون سنجیدہ اور روایتی انداز میں نہیں لکھا گیا ہے بلکہ بڑا رواں دواں اور شگفتہ ہے۔ خود کپور کا اپنے متعلق ایک بہت دلچسپ مضمون بعنوان "تعارف" موجود ہے۔ گو یہ مضمون مطبوعہ ہے مگر اس نمبر میں اس کی شدید ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ کپور کے آٹھ مطبوعہ شاہکار مضامین اور کچھ تصویریں و خطوط بھی دئیے گئے ہیں۔ کپور کے فکر و فن پر ڈاکٹر وزیر آغا اور مختار ردولوی کے مضامین اچھے ہیں۔ تاثرات میں فکر تونسوی، مخلص بھوپالی اور تمنا مظفر پوری کے مضامین بے حد دلچسپ ہیں۔ فرقت کاکوروی کا مضمون "غالب کا خط کپور کے نام" بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ احتشام حسین کا طویل خط (جو اس نمبر کے سلسلے میں احمد جمال پاشا کے نام ہے) از خود ایک مضمون اور اچھے مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ جن لوگوں نے صرف موصوف کی سنجیدہ تنقیدی تحریریں پڑھی ہیں وہ اس شگفتہ طرز تحریر کا مزہ ضرور مطالعہ کریں۔

مگر ان ساری چیزوں کے باوجود اتنا اچھا نمبر جس احتیاط اور توجہ سے نکالنا چاہئیے تھا نہیں نکالا گیا۔ کتابت معلوم ہوتا ہے بہت جلدی میں کرائی گئی ہے۔ سارے رسالے میں کتابت اور ترتیب کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ خود میرے دونوں مضامین میں کتابت اور ترتیب کی بہت ساری غلطیاں رہ گئی ہیں۔ پھر بھی یہ ایک نوجوان طنز و مزاح نگار اور ایڈیٹر کا ایک کہنہ مشق طنز و مزاح نگار کی خدمت میں اچھا نذرانہ ہے اور فی الحال کپور پر حوالے کی واحد چیز ہے۔ یہ نمبر پنج پبلشرز، سرور منزل، امین آباد لکھنؤ سے ایک روپیہ میں مل سکتا ہے۔

(رشید الدین)

ہفتہ وار "ایشیاء" اردو بازار۔ دہلی

میر مشتاق احمد صاحب کی ادارت میں راجدھانی دہلی سے زیر تبصرہ رسالہ گزشتہ چند سالوں سے شائع ہو رہا ہے۔ ۱۵ اگست کی خاص اشاعت "انسانیت نمبر" کے نام سے موسوم ہے جو ۱/۴ کراؤن کے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مضامین اور نظموں کے ذریعہ انسانیت کی صحت مند اور آفاقی قدروں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انسانیت کے بلند و بالا اور بسیط موضوع پر اس خاص نمبر میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ کچھ بھی نمائندہ تخلیقات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ اس مادی ترقی کے ساتھ روحانی پستی کا کیا سبب ہے اور فی زمانہ اخلاقی قدروں کا فقدان کیوں ہے؟ اردو دوستوں سے ہم پر زور سفارش کریں گے کہ وہ اس خاص نمبر کو جس کی قیمت برائے نام پچاس نئے پیسے ہے منگوا کر پڑھیں اور انسانیت کے اس مبارک و مسعود پیام کو گھر گھر پہنچائیں۔ "ایشیا" کا شمار بلا شبہ اردو کے سنجیدہ رسالوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف ہر ہفتہ وقت پر چھپتا ہے بلکہ مواد کے اعتبار سے بھی صحت مند قدروں کا حامل ہوتا ہے۔ اس نمبر کی اشاعت پر مشتاق احمد مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(وقار خلیل)

ماہنامہ "جمال" مالیگاؤں

رئیس مالیگانوی کی ادارت میں گزشتہ تین برسوں سے ماہنامہ "جمال" پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ اسّی صفحات کے اس صحیفہ میں ہر ماہ دو ایک مضامین، چند کہانیاں اور بہت سی غزلیں چھپتی ہیں۔ چونکہ یہ پرچہ ایک ایسے حصے سے نکلتا ہے جہاں نہ صرف کتابت و طباعت کی دشواریاں ہیں بلکہ مضامین اور وہ بھی معیاری فراہم ہونے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی رئیس صاحب اسے خوب سے خوب تر بنانے میں سرگرداں معلوم ہوتے ہیں۔ ستمبر کا زیر نظر "جمال" صوری اعتبار سے پچھلے پرچوں سے کہیں اچھا ہے۔ مضامین، نظموں اور غزلوں کے باب میں ابھی سخت انتخاب کی ضرورت ہے۔ سیدہ زہرہ نے اقبال کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ موصوفہ اقبالیات کا گہرائی سے مطالعہ کرتیں تو یہ مضمون بہت عمدہ ہوتا۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا افسانہ قابل مطالعہ ہے۔

(وقار خلیل)

ضروری بات: — ناشرین سے التماس ہے کہ تبصرہ کے لئے اپنی مطبوعات کی دو دو جلدیں رجسٹرڈ پوسٹ سے ارسال فرمائیں اور تبصرہ کے لئے تقاضہ نہ کریں۔ وقت پر تبصرہ کیا جائے گا۔

(ادارہ)

اردو نامہ

حیدرآباد کی تہذیبی اور ادبی خبریں

اکتوبر ۱۹۶۱ء

ایڈیٹر۔ وقار خلیل

یکم اکتوبر ــــ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو سے ماہ ستمبر کے ختم تک ۲۲۶ افراد نے استفادہ کیا۔

● ڈاکٹر حفیظ قتیل، پروفیسر اکبر صدیقی اور ریسرچ اسکالر محمد جمال شریف نے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

● نشاط کلچرل سوسائٹی نامپلی کا خدیجہ عالم خوندمیری کے ہاتھوں افتتاح ہوا اور محفل شعروسخن کی صدارت شاہد صدیقی نے کی۔

● آزاد میموریل لائبریری اینڈ ریڈنگ روم پرانی حویلی کی ادبی محفل عزت محی الدین جاوید کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مضامین اور غزلیں سنائی گئیں۔

● کشمیر سے موصولہ اطلاع کے مطابق ادارہ کے معتمد ڈاکٹر زور جوان دنوں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کشمیر یونیورسٹی میں کارگزار ہیں موصوف کو ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور یونیورسٹی سنڈیکیٹ کا رکن بھی نامزد کیا گیا ہے۔

۳ر اکتوبر ــــ پروفیسر سید محمد پرنسپل اردو کالج اور پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی نے ادارہ کے کتب خانہ اور مخطوطات سے استفادہ کیا۔

۴ر اکتوبر ــــ ادارہ کی مطبوعہ کتاب "کلمۃ الحقائق" پر روزنامہ ملاپ کے ادبی ایڈیشن میں تبصرہ شائع ہوا۔

● بزم ادب اردو کالج کا افتتاحی جلسہ پرنسپل پروفیسر سید محمد کی صدارت میں ہوا۔ زینت ساجدہ لکچرار زنانہ کالج نے رسم افتتاح انجام دی۔

● دانی پرشید سماجی گروہ کے زیر اہتمام اردو اور ہندی کا ملا جلا مشاعرہ شاہد صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

۵ر اکتوبر ــــ اردو دوستوں کے اجتماع میں آمجد اکاڈیمی کے زیر اہتمام قائم کردہ امجد مطالعہ گھر کا افتتاح عمل میں آیا۔

۶ر اکتوبر ــــ سٹی کالج (شعبۂ ہائی اسکول) کے ۲۵ طلبہ نے محمد منظور احمد، ضیاء الحسن جعفری اور محمد اسحاق صاحبان اساتذہ کی سرگردگی میں تعلیمی تفریح کے پروگرام کے تحت ایوانِ اردو کے تمام شعبہ جات کا معائنہ کیا۔

● خلیق انجم لکچرار کروڑی مل کالج (دہلی یونیورسٹی) ریسرچ کے سلسلہ میں حیدرآباد آئے اور ایوان اردو کے مہمان خانہ میں مقیم ہوئے۔

۷ر اکتوبر ــــ سید احمد اللہ قادری ایڈیٹر سلطنت نے مرکزی حکومت کے جاری کردہ علمی وظیفہ سالانہ روپیہ ماہانہ کے پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے پروفیسر ہمایوں کبیر کو تلگرام نیچے ہوئے اس وظیفہ کو ارباب علم کی توہین کے مترادف قرار دیا۔

● صفی لکھنوی کی یاد میں ایک طرحی مشاعرہ عالم حیدری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ آدوج یعقوبی نے صفی مرحوم کی شاعری پر مضمون سنایا اور مقامی شعراء نے کلام پیش کیا۔

● انور حسین زیدی (لاہور) نے خواجہ بندہ نواز کے شجروں (ملک ادارہ) سے استفادہ کیا۔

۸ر اکتوبر ــــ اقبال اکیڈیمی کی طرف سے اردو اور پنجابی کے شاعر ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا خیر مقدم کیا گیا اور رضیہ بیگم لکچرار کلیہ اناث نے فردوسی پر مقالہ سنایا۔

● بزم ہر مرکز کا طرحی مشاعرہ شیخ احمد علی شاکر کی صدارت میں منعقد ہوا۔

۱۱ر اکتوبر ــــ اردو کے دس معتبر حضرات جن میں پروفیسر سروری، حبیب الرحمن، پروفیسر سید محمد، حسینی شاہد اور عابد علی خاں شامل ہیں، ایک مشترکہ بیان میں دسمبر میں ہونے والی اردو کانفرنس کا خیر مقدم کیا۔

۱۳ر اکتوبر ــــ خلیق انجم (دہلی یونیورسٹی) نے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

۱۴ر اکتوبر ــــ ادارہ کی دو نئی مطبوعات دیوان ہاشمی بیجاپوری اور تحفۃ الشعراء (تذکرہ افضل بیگ قاقشال) جسے ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب کیا ہے، شائع ہو چکیں۔ وقار خلیل نے اردو تذکرے سوانح اور مثنویات کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ اور مخطوطات سے استفادہ کیا۔

● تعمیرات کی ادبی محفل میں یوسف سرمست نے امیر کی شاعری پر مضمون سنایا طیب انصاری اور صابر منظور نے افسانے پیش کئے۔

۱۵ر اکتوبر ــــ خلیق انجم لکچرار کروڑی مل کالج دہلی سات روزہ قیام مہمان خانہ ایوان اردو کے بعد دہلی روانہ ہوئے۔ ادارے کی طرف سے وقار خلیل نے موصوف کو خدا حافظ کہا۔ محمد جمال شریف ریسرچ اسکالر علی گڈھ یونیورسٹی نے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

● اصغر خانم کو جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دی۔ موصوفہ نے "جنگ کا نظریہ، شخصیات اور اس کے بعض کلاسیکل اردو شعراء پر اثرات" کے زیر عنوان مقالہ داخل کیا تھا۔

● حلقۂ ارباب ذوق بیگم بازار کے پندرہ روزہ اجلاس میں سلیمان اریب کے مجموعہ کلام "پاس گریباں" پر مضامین پڑھے گئے۔

۱۴ر اکتوبر ـــــ بزم تلگو انوار العلوم کالج کے زیر اہتمام جلسہ میں تلگو شاعر دسرتھی نے غالب پر تقریر کی۔

۲۱ر اکتوبر ـــــ عبدالقادر معتمد یونائیٹڈ لائبریری میر کمال الدین علی خاں اور سید مرتضیٰ خازن و معتمد آزاد میموریل لائبریری نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ دارالمطالعہ اور اردو پڑھائی گھروں کے قیام کے تعلق سے وقار خلیل سے تبادلہ خیال ہوا۔

● ڈاکٹر سیدہ جعفر لکچرار نظام کالج اور عزیز احمد (بی۔ اے) نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

● حلقۂ ارباب فکر کی طرف سے دسہرہ ملاپ کے سلسلے میں بدری وشال پتی کی صدارت میں محفل شعر و سخن منعقد ہوئی۔ احسن علی مرزا نے مشاعرہ کی اہمیت پر تقریر کی اور شعراء نے کلام سنایا۔

● بزم شہر ادب کا ماہانہ غیر طرحی مشاعرہ حیدر علی حسرت زیدی کی صدارت میں ہوا۔ طالب رزاقی نے اردو شاعری اور غزل کے تعلق سے مضمون سنایا۔

۲۲ر اکتوبر ـــــ دسہرہ ملاپ کے سلسلے میں بزم ارباب ذوق کا مشاعرہ نواب میر احمد علی خاں (ایم۔ ایل۔ اے) کی صدارت میں منعقد ہوا۔

۲۳ر اکتوبر ـــــ شمس الدین رکن علیہ گیر کشدہ تیغ

ایوان اردو کا معائنہ کیا اور دارالمطالعہ کے قیام کے تعلق سے تبادلۂ خیال کیا۔

۲۵ر اکتوبر ـــــ علامہ سید علی اصغر بلگرامی سابق صوبہ دار و رکن مجلس تاریخ و تمدن ادارہ نے بمارضہ کینسر اپنی کوٹھی میں انتقال کیا۔

● مقامی شاعر تراب علی خاں باز ۵۸ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔

۲۶ر اکتوبر ـــــ آندھرا پردیش اردو کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ماڈپتی ہنمنت راؤ صدر ریاستی قانون ساز کونسل نے اعلان کیا ہے کہ آندھرا پردیش اردو کانفرنس کا افتتاح ریاستی چیف منسٹر ڈی سنجیویا ۲۳ر دسمبر کو کریں گے۔

۲۸ر اکتوبر ـــــ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے سید علی اصغر بلگرامی کے سانحہ ارتحال پر جلسہ تعزیت پروفیسر ہارون خاں شروانی میر قانون ساز کونسل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر اکبر الدین صدیقی، قمر ساحری معتمد بزم سعدی اور نواب ماندور خاں کے علاوہ جناب صدر نے تقریر کی اور مرحوم کے ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔ کرسی صدارت سے قرارداد تعزیت منظور کی گئی اور دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔

● سعادت علی خاں منتخب سفیر عراق نے بزم اردو الوننگ کالج کا افتتاح کرتے ہوئے اردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اردو زبان کا رسم الخط بدلا نہیں جا سکتا۔

● بزم جبران کا ماہانہ ادبی اجلاس اور طرحی مشاعرہ پروفیسر حسینی شاہد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ طالب رزاقی نے اردو غزل پر مقالہ سنایا۔

۲۹ر اکتوبر ـــــ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر راج کشور پانڈے ریڈر شعبہ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حضرت نجم آفندی نے "کبیر کے دوہے" کے زیر عنوان مقالہ سنایا۔ موسیقار ایم۔ اے رؤف نے بھجن اور غزلیں سازوں پر سنائیں اور شعراء نے کلام پیش کیا۔ محمد منظور احمد معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

● بزم سعدی کا ۳۲ واں اجلاس اور طرحی مشاعرہ حبیب قرحسی کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر امیر حسن عابدی (دہلی یونیورسٹی) کے فرستادہ مقالہ "صائب تبریزی" کو ڈاکٹر شریف النساء انصاری نے سنایا۔ فارسی طرحی کلام اور قمر ساحری معتمد بزم سعدی کے شکریہ پر یہ اجلاس برخاست ہوا۔

۳۰ر اکتوبر ـــــ نریندر لوتھر ناظم اطلاعات نے بزم اردو آرٹس کالج کا افتتاح کیا۔

۳۱ر اکتوبر ـــــ بزم ادب بازار نور الامراء کا غیر طرحی مشاعرہ حسن عابدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

ترتیب

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

جاری شدہ ۱۹۳۸ء ـــــ فون نمبر (۳۵۲۰۹)

ماہنامہ

سب رس

ڈسمبر ۱۹۶۱ء

جلد نمبر (۲۴) شمارہ (۱۲)

نگراں :-

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلسِ ادارت :-

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

رائے جانکی پرشاد

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

وقار خلیل

زرِ سالانہ :- ہندو پاک سے ، چھ روپے ششماہی تین روپے

" بیرونِ ہند سے : دس روپے

قیمت :- (۵۰) نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر دفتر "ایوانِ اردو" خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

اپنی بات

سب رس ماہ دسمبر پیش ہے۔

● ہمارے ادب میں "نقد و نظر" کے نام سے آئے دن جس قسم کے تبصرے اور تنقیدیں اشاعت پذیر ہو رہی ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف رسائل و جرائد میں "چند حضرات" ادب میں تنقید کے نام پر کیچڑ سا اچھالنے لگے ہیں، عفونت سی پیدا کرنے لگے ہیں، تنقیدیں اور تبصرے ذاتی تعلقات و روابط کو ملحوظ رکھ کر کئے جا رہے ہیں۔ پگڑیاں اچھالنے والوں کی ایک منظم ٹولی یہ کام جس اوچھے پن سے سرانجام دے رہی ہے اس سے ادب پر حرف آنے لگا ہے اور بادہ خواران ادب کا ظرف بھی ظاہر ہونے لگا ہے۔

اردو زبان و ادب جس تہذیب کا علم بردار ہے اس کے گیسو سنوارنے والوں کو یہ قطعی زیب نہیں دیتا کہ نقد و نظر کے بہانے سطحی باتیں احاطۂ تحریر میں لائیں اور اپنے بے لوث محسنوں کو سر بازار رسوا کریں؟ ایسی تحریریں لکھنے سے قبل کاش یہ طبقہ اپنے "ادبی قد" کو کسی آئینہ خانے میں دیکھتا؟ اور پھر عبارتوں کی بوقلمونی اور تضادات کو محسوس کرتا۔

اردو زبان و ادب آج دوراہے پر ہے اور جو سیاسی و سماجی محرکات اس کے پس پردہ نشو و نما پا رہے ہیں اس کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ادب کی لازوال اور بے کراں قدروں کی صیانت کی جائے۔ فروغ ادب کے نام پر جو کارنامے انجام دیئے جا رہے ہیں انھیں خوش آمدید کہا جائے اور اردو زبان و ادب کے چراغ کی جوت کو بجھنے سے بچایا جائے۔

پگڑیاں اچھالنے والے، تنگ نظر اور سطحی مطالعہ کے حامل افراد زبانوں اور ادب کی تاریخ کے بنانے والے نہیں ہوتے۔ یہ کام تو زمانۂ مستقبل اور آنے والا مورخ ہی سرانجام دیتا ہے۔

● سب رس کی گزشتہ اشاعت میں ہم نے ایک مضمون "ہندی (ہندی ۱۷ اردو) کی ماہیت اور حقیقت" کے زیر عنوان ہندی کے مشہور عالم ادیب نارائن تیواری کا شائع کیا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کا مقصد محض یہی تھا کہ ہم اردو والے اس مسئلہ پر غور کریں اور سنجیدگی سے اس موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کریں۔ اس سلسلے میں ہم صحت مند نقطۂ نظر کے حامل مضامین کی اشاعت پر غور کر سکیں گے۔

● اس شمارہ کے حصۂ مضامین کے متعلق کیا کہا جائے۔ اردو کے ممتاز اہل قلم حضرات نے اپنی معیاری، گرانقدر اور پُرخلوص تخلیقات سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر زور، عتیق احمد صدیقی، دیریندر پرشاد سکسینہ اور اسحاق الوّبی صاحبان کی تحریریں علمیت اور مہارت فن کا مظہر ہیں۔

حصۂ نظم دو آتشہ ہے۔ حسن کمال کی نظم اور دکنی کے شاعر سلیمان خطیب کی نظم، یقین ہے آپ کے فکر و وجدان کو گرمائے گی۔

اس بار غزلوں کی روشن قندیل سے سب رس کا ایوان سخن جگمگا رہا ہے۔ رجائی، زبیر، طالب، فضیں اور محمد علوی کے علاوہ دیگر شعراء کے کلام میں بھی فن اور زندگی کا تیر آرنج اور تیور کی رعنائی آشکارہ ہے۔

ڈرامے اردو ادب میں کم لکھے جاتے ہیں اور اظہر افسر کا ڈرامہ اس کمی کو بہت حد تک دور کرتا ہے۔ اظہر افسر ڈرامہ نویسی میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے چند ڈرامے اس سے پہلے بھی سب رس میں چھپ چکے ہیں۔

شبیر حسین جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کے ذہین و فطین ادیب ہیں۔ انھیں ترجمہ کا فن خوب آتا ہے۔ موپاساں کے افسانے "گہنے" کے یوں تو کئی ترجمے ہوئے مگر یہ ترجمہ جو ہم پیش کر رہے ہیں، اب تک کئے گئے ترجموں میں اول نمبر پاتا ہے۔

تبصرے اور اردو نامہ کے صفحات اپنے دامن میں ادب کی رفتار کے صحت مند نقوش لئے ہوئے ہیں۔

(ر ۔ خ)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

دیوانِ محشری

محشری حیدرآباد کے ایک اچھے شاعر تھے مگر ان کا حال کسی تذکرے میں درج نہیں ہے۔ ان کا نام غالباً میر مہدی علی تھا۔ ان کا ایک دیوان ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں جو قطعات تاریخ درج ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد کا نام میر چراغ علی تھا جو ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں فوت ہوئے تھے۔ خود محشری کی بیوی نے ۱۳۱۷ھ میں وفات پائی اور ان کے ہمشیرزادے میر مقبول علی کی تاریخ ولادت ۱۳۱۲ھ ایک قطعہ میں لکھی ہے۔ یہ میر مقبول علی غالباً مشہور ڈاکٹر میر مقبول علی ہیں جو جامعہ عثمانیہ کے اولین فیض یافتوں میں سے ہیں انھیں بعد ختم تعلیم انگلستان جا کر طب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے وظیفہ ملا تھا۔ چنانچہ وہیں ایک جرمن خاتون سے شادی کی جو ڈاکٹر ہیں اور شاید اس وقت تک ملازم ہیں۔ ڈاکٹر مقبول علی وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہو کر خانگی مطب کر رہے ہیں۔

زیر نظر مخطوطہ خود محشری کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے بہت کانٹ چھانٹ کی ہے اور ۱۳۱۶ھ تک اضافہ کرتے رہے ہیں۔ وہ حضرت میر امداد علی صاحب علوی کے مرید اور شاگرد تھے۔ چنانچہ اس دیوان میں ان کی اور ان کے مرشد مرزا امرداد بیگ صاحب کی شان میں متعدد نظمیں موجود ہیں۔ یہ دیوان بلا ترتیب ردیف لکھا گیا ہے۔ اردو فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں کلام موجود ہے۔

دیوان کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام محشری نے "فتنۂ محشر" رکھا تھا اور اس سرورق پر میر کاظم علی اور میر مہدی علی سے متعلق تاریخیں درج ہیں۔ کتاب انگریزی سے مگر ٹوٹ رہا ہے اور دیمک نے متعدد اوراق زخمی کر دیئے ہیں۔ غزلیں، قصیدے، رباعیاں اور قطعات تاریخی غالباً زمانہ تصنیف کے لحاظ سے یکے بعد دیگرے مسلسل درج ہیں۔ کوئی ترتیب قائم نہیں ہے۔ اس کا وہ حصہ حیدرآباد کی سماجی اور سیاسی تاریخ کی نسبت مفید معلومات فراہم کرتا ہے جس میں مختلف واقعات کے قطعات تاریخی لکھے گئے ہیں۔ اس حصے کے مطالعے سے تاریخ حیدرآباد کے بارے میں متعدد معلومات حاصل ہوتی ہیں اور آئندہ تحقیق کرنے والوں کو مختلف اصحاب کے بارے میں مستند معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

۱۔ قطعۂ تاریخ صحت حضرت قبلہ و کعبہ سلمہ اللہ تعالیٰ (میر امداد علی علوی)۔ ۱۳۱۷ھ

محشری تصیہ عرض کی تاریخ ۔۔۔ شاہ شاہاں شفا مبارک ہو
۱۳۱۸

۲۔ قصیدۂ مبارکباد عید صیام و مدح حضرت علوی۔ اس میں (۳۶) شعر ہیں۔ آخری شعر یہ ہیں ؎

میر امداد علی ابن علی آل علی ۔۔۔ رونق عالم علوی جدا کون کہ آپ
با خبر اپنی حقیقت سے بھلا کون کہ کیا ۔۔۔ اپنے بندوں کے ہیں اللہ نما کون کہ آپ

محشری کی یہی مانگ ہے دعا سبحان
[illegible]

اس کا خمسہ شعر کو حضرت علوی کی وفات کے بعد بدل کر حاشیہ پر یہ لکھا ہے ؎

محشری حشر میں کہتا ہے یہ علوی کو ۔۔۔ تجھ نام خدا میرے خدا کون کہ آپ

۳۔ قصیدہ در مدح نواب جعفر حسین خاں صف شکن جنگ بہادر۔ یہ تاڑبن (قریب تالاب میر عالم) کے نواب تھے۔ حسب اندازے ان کی مدح لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محشری کو ان کی سرکار سے تعلق تھا۔ یہ قصیدہ بہ شکل مسدس لکھا ہے جس میں ۱۲ بند ہیں۔ نواب تاڑبن ایک وجیہ و شکیل انسان تھے اور ان کی خوش روئی مشہور تھی۔ محشری نے ایک بند میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

بیکس نواز بھی ہے ہر اک کا کفیل بھی　　ایسا سخی کہ جس میں ہے قاصر دلیل بھی
اس کے سوا جری و فہیم و عدیل بھی　　یہ اور حسن ہے کہ حسین بھی جمیل بھی
ایسا حسین کہ دیکھیں اگر اس جری کا حسن
آنکھوں سے گر ہی جائے شہ خاوری کا حسن

۴۔ در شان حضرت مرشد قبلہ و کعبہ استاد منشی میر امداد علی صاحب علوی سلمہ اللہ تعالیٰ
۵۔ قطعۂ تاریخ حصول زیارت درگاہ حضرت غالب شہید صاحب۔ سنہ ۱۳۱۴ھ۔ اس کے ساتھ نوٹ ہے کہ "چلتے چلتے راستہ میں کہا گیا تھا"

زہے حرف منقوطہ تاریخ طرفش　　نوشتم بدرگاہ غالب شہید
۱۳۱۴

۶۔ قطعۂ تاریخ تہنیت کتخدائی محمد عثمان عرف منو میاں فرزند سید محمد سلطان۔ سنہ ۱۳۱۴ھ
۷۔ " " " " میر امداد علی صاحب رعد فرزند استاد شعلہ۔ "
۸۔ " " " " مولوی محی الدین احمد فرزند محمد فخر الدین مہتمم مدرسہ فخریہ آسمان جاہی۔ سنہ ۱۳۱۴ھ۔
۹۔ " انتقال حضرت قبلہ گاہم میر چراغ علی مرحوم۔ سنہ ۱۸۹۲ء۔
۱۰۔ " " " " " " " سنہ ۱۳۱۲ھ۔
۱۱۔ " " نواب میر فیاض علی خاں آثر مرحوم۔ سنہ ۱۳۱۴ھ۔
۱۲۔ " رسالہ تحقیقات من تصنیف عالیجناب ترک علی شاہ صاحب ترک امیر الشعرائے ہند۔

ترکی کا رسالہ خضر راہ نما ہے۔ سنہ ۱۸۹۶ء

۱۳۔ " دوسری تاریخ ؎

تاریخ یہ لکھی ہے سر جاہل کو اڑا کر　　استاد سے شاگرد کبھی بڑھ نہیں سکتا

۱۵۔ " ملازمت ترک علی شاہ صاحب ترکی امیر الشعرائے ہند خطاب یافتہ از گورنر جنرل ہند لارڈ میو صاحب بہادر۔

محشری فکر کردہ سال آں　　گفت ترکی بجاہ منصب یافت
۱۳۱۴ھ

۱۶۔ " در شان قبلہ و کعبہ دادا پیر مرزا سردار بیگ صاحب
۱۷۔ " تولد سردار علی پسر وزیر علی صفدری مہتمم و مالک مطبع فخر نظامی۔
۱۸۔ " " عبد المجید خاں و عبد الحمید خاں فرزندان قوام احمدی۔ سنہ ۱۳۱۸ھ
۱۹۔ " مراجعت اعلیٰحضرت از سفر کلکتہ۔ سنہ ۱۳۱۵ھ
۲۰۔ " تحصیلداری مولوی عبد الرحمن تجلی۔ سنہ ۱۳۱۵ھ
۲۱۔ " در شان حضرت قبلہ و کعبہ پیر و مرشد مرزا سردار بیگ صاحب
۲۲۔ " تولد میر مقبول علی ہمشیر زادہ مصنف۔ سنہ ۱۳۱۳ھ

۲۳۔ قطعہ تاریخ وفات اہلیہ مصنف۔ ۱۳۱۶ھ

اس دیوان کا آغاز اس غزل سے ہوتا ہے ؎

کب کسی کی کہیں سن سکتے ہیں غیرت والے — جان اک بات پہ دیدیتے ہیں غیرت والے

اختتام — ہے پیش چشم عاشق کیا چیز اشک تعزیہ — ہے اک یہاں کا آنسو واں عمر بھر کے آنسو

کب تک لہو کے قطرے جو خوں بہائیں کے — لاشے پہ میرے نکلے تیغ و تبر کے آنسو

محشری کا ایک دوسرا دیوان بھی ادارے میں نمبر ۱۳۰۱ پر موجود ہے جس میں زیادہ غزلیں ہیں۔ مگر یہ غزلیں بھی حضرت میر امداد علی علوی اور حضرت مرزا سردار بیگ کی مدح و منقبت میں لکھی گئی ہیں۔ اس میں قطعات تاریخ کم ہیں اور جو ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ محشری محلہ منغلپورہ کے باشندے تھے۔ نواب مظفر جنگ (داماد حضور نظام خامس) اور اللہ رکھی بیگم صاحبہ (والدہ نظام خامس) کی سرکاروں سے بھی تعلق تھا۔ چنانچہ اللہ رکھی بیگم صاحبہ کی وفات پر ایک طویل اور پُر اثر مرثیہ بھی لکھا ہے۔ اس طرح کی ایک چھوٹی نظم اپنے چچا اور بھتیجے کے جل کر مرجانے پر بھی لکھی ہے۔ اس دیوان میں ان کے نوحے اور سلام بھی موجود ہیں اور تسیم دہلوی اور مرزا غالب کی غزلوں کے تضمینے بھی۔

ابتدا — بیاں کیا ہو سکے جسم مبارک کیا ہے علوی کا — جسے سب نور کہتے ہیں وہ اک سایہ ہے علوی کا

وہ رعب حیدری جس سے جگر پر شیر و ناکے ہیں — وہ خلق احمدی جس سے ہر اک شیدا ہے علوی کا

اختتام — اگر کچھ وصل کی رکھتا ہے دل میں آرزو غالب — کہو اے محشری اچھی نہیں یہ گفتگو غالب

چلے فقرے ترے وہ کہیں سے گا تند خو غالب — نکالا جاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

بقیہ "منشی حیات بخش رسا" ص ۱۲

ذکرِ وفا یہ آپ کو شرم حیا ہے کیوں — اک بات تھی کہ میری زبان سے نکل گئی

بے نقاب آئے اگر وہ تو یہ صورت ہوگی — بزم کی بزم اک آئینہ حیرت ہوگی

گو نہ دے لینا دلِ عشاق نہ تم ارون میں — پھول تکتے ہوئے رہ جائیں گے گلزار میں کیا

آگرے ساقی کا کرم تو کوئی دیکھے — زاہد سے بھی کہتا ہے کہ تھوڑی سی پیے جا

ہم سے تو مسیحا کی خوشامد نہیں ہوتی — اے خضر! مبارک ہو تجھے تو ہی جئے جا

اس بیت سے شب غم کے غم کھانے کو کیا کہئے — بہتر ہے مصیبت کے افسانے کو کیا کہئے

بلبل کی فغاں سن کر جب گل نہ ہوا اپنا — انیرو تو ہے بیگانہ بیگانے کو کیا کہئے

عتیق احمد صدیقی

اردو ناول ــــ زندگی کا ترجمان

کوئی بھی ادب یا ادب کا کوئی بھی شعبہ کسی بھی حالت میں زندگی سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ ادب کی تشکیل خلا میں نہیں ہوتی۔ نہ ادیب کسی خلائی فضا میں سانس لیتا ہے۔ ادیب اپنی تخلیقات کے موضوعات اور مواد اپنے گرد و پیش کے ماحول، اپنے ارد گرد کی زندگی اور اس زندگی اور ماحول میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات سے ہی اخذ کرتا ہے۔ ناول خاص طور پر زندگی کی نقاب کشائی کا فن ہے۔ ناول نگار اپنے زمانے اور ماحول کی زندگی کو ایک اکائی کی صورت میں دیکھتا ہے۔ وہ تہذیب و تمدن کے مختلف شعبوں کو اس طرح دیکھتا ہے کہ ان کا ہر گوشہ اور تمام جزئیات روشن ہو جاتی ہیں لیکن اردو ادب میں زندگی اور ادب کا یہ آہنگ مفقود تو نہیں، ہاں کمیاب ضرور ہے۔ پھر بھی کسی دور، زمانے کا ادب زندگی سے گریزاں نہیں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس مخصوص زندگی ہی خود فراریت پر مبنی ہو۔

ناول اردو میں ایک جدید صنف ادب ہے جو مغربی اثرات سے ہمارے ادب میں شامل ہوئی۔ اس سے پیشتر ناول کے اجزا ترکیبی منتشر ملتے تھے۔ مثلاً قصہ داستانوں میں، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری مثنویوں میں ملتی ہے۔ لیکن اجزا کی وہ ترکیب و ترتیب جو ناول کے فن کو درکار ہے نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ مثنویاں یا داستانیں بھی بڑی حد تک اپنے زمانے کی زندگی کی عکاسی کرتی رہی ہیں۔ ان میں خواہ قصہ کو ایران و توران کا بتایا گیا ہو، مقامات کے نام چین و ختن کے ظاہر کئے گئے ہوں، افراد کے نام ایرانی نژاد معلوم ہوتے ہوں لیکن قصہ کی فضا، اس کا پس منظر، ماحول وہی رہا جس میں رہ کر مصنف نے اس کی تکمیل و تشکیل کی۔ معاشرت، اخلاق، رسومات، عقاید و تصورات، لباس، اوضاع و اطوار، واقعات و حادثات کا نفسیاتی ردعمل یہ سب ان ہی انسانوں سے متعلق ہے جن سے مصنف اپنی روزمرہ زندگی میں دوچار ہوتا تھا۔

اردو ادب میں ناول کی ابتدا اس وقت ہوئی جب قدیم تہذیبی اقدار دم توڑ چکی تھیں۔ جب حکومت کی بساط الٹ جانے سے معاشرت میں عظیم تغیرات رونما ہو رہے تھے۔ زندگی کا وہ جمود جو پورے معاشرے کی نیم خمار آلودگی کی سی کیفیت کا پروردہ تھا اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ مغربی تعلیم اور اس تعلیم کی بدولت مغربی تہذیب اور رسم و رواج کا معاشرہ میں اثر و رسوخ بڑھ رہا تھا۔ لوگ پرانے عقاید کی اندھی تقلید سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ مذہب سے بیگانگی بڑھ رہی تھی۔ جہالت کا ہر طرف دور دورہ تھا لیکن نئی روشنی کی بدولت تعلیم کا چرچا ہونے لگا تھا۔ بعض دوربین اور عاقبت اندیش لوگ سماج کی بیماریوں کی تشخیص کرنے لگے تھے۔ وہ سماج کی اصلاح چاہتے تھے۔ انگریزی اقتدار کا تسلط ایک مسلمہ امر ہو چکا تھا۔ اس غیر ملکی بالادستی کو قبول کر لینے کے بعد عافیت اور ترقی کی جو صورتیں ممکن ہو سکتی تھیں ان کو بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ جہالت [illegible] کی ذمہ دار تھی۔ لہٰذا اس کی بیخ کنی ان کا مطمح نظر تھا۔ مسلمانوں میں سرسید ان اصلاحی تحریکات کے سرخیل تھے۔ ان کو بہ حیثیت مصنف نہ صرف خود ان اصلاحی مساعی میں شہرت تھی بلکہ اس نے اپنے گرد ایک حلقہ بنا لیا تھا جس کے سب افراد زندگی کے مختلف شعبوں کی جانچ پرکھ کر کے ان کے نقائص اور مناسب اصلاحات کی نشاندہی کر رہے تھے۔

اشاعت تعلیم کی اس جدوجہد میں [illegible] سرسید کے رفقا میں ڈپٹی نذیر احمد بھی ہیں۔ اپنے [illegible] کی تکمیل کے لئے انھوں نے اس کو

ذریعہ بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ نصیحت کی کوئی بات براہ راست کہہ دینے سے کس قدر کڑوی کسیلی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے قصہ کے پردے میں اصلاحِ رسوم کی بہت سی باتیں پیش کر دیں۔ اس زوال پذیر معاشرہ کی اصلاح کے لئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو لے کر ناول لکھے۔ ہم ان کے ناولوں میں جابجا اس معاشرت کے نمونے دیکھتے ہیں۔ ان کے ناول نصائح کے سرچشمے ہیں۔ انھوں نے زندگی میں روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو چنا۔ ان پر بحث کی۔ ان کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی اور ایک جچا تلا راستہ پیش کیا۔ چونکہ کا مقصد اصلاح تھا۔ وہ زندگی کے معمولی واقعات پر نظر رکھتے ہیں اور ایسی تمام تفصیلات سے بحث کرتے ہیں جو انسان کی تعلیم و تربیت اور اخلاق و عادات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کے حالات پر جب بحث کرتے ہیں تو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی کوئی سیڑھی نہیں چھوڑتے۔ ماں باپ کی تربیت، بہن بھائی کے تعلقات، شادی، غم و رنج و مصیبت، آرام و آسائش، مرض و صحت، امیری و فقیری، غرض کہ سب ہی حالات ان کے زیر بحث ہوتے ہیں۔

مرأۃ العروس، بنات النعش، ایامی وغیرہ ناول خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان میں مذہب کی پابندی، والدین کی فرمانبرداری، دوسروں پر مہربانی کرنے، پڑوسیوں سے اچھے برتاؤ، امور خانہ داری، بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ کے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔ توبۃ النصوح، ابن الوقت اور محصنات وغیرہ ناولوں میں مذہبی معتقدات، اخلاقی حالت، غیر ملکی تہذیب کو اپنانے کے مضر اثرات، نکاح بیوگاں، تربیت اولاد وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ محصنات ان کا نمائندہ ناول کہا جا سکتا ہے۔ اس کا محرک کیا تھا، خود نذیر احمد لکھتے ہیں:۔

"مجھے خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں مردوں کی آزادی دو بہت بڑے نقص ہیں۔ میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں کوشش کی ہے تو دوسرے نقص کے رفع کرنے میں بھی کچھ کرنا ضرور ہے۔"

اور اس پورے ناول کا نتیجہ جو اخذ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ع دو بیاہ نہ کیجیو زنہار بھول کر۔ لیکن ضمناً اس ناول میں اس زمانے اور اس معاشرے کے بہت سے مسائل زیر بحث آ گئے ہیں۔ اس زمانے کی تعلیم اور اس کے اثرات بد، عورتوں کی جہالت اور بدسلیقگی، جاگیردارانہ نظام اور اس کی خرابیاں، دولت و جائداد کے حصول میں مکاری و ریاکاری، عدالتی نظام کی اندھیر گردی اور محکمہ پولیس کی بدعنوانیاں وغیرہ موضوعات پر ناول مشتمل ہے۔ اس معاشرہ میں پھیلے ہوئے معتقدات، توہمات، خاندانی رشتے اور جھگڑے، عورتوں کی نفسیات کے بہت سے پہلو، سوتیا ڈاہ اور اس کے اثرات بد وغیرہ موضوعات ناول میں اول سے آخر تک پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب موضوعات ناول کو ہماری زندگی سے قریب تر لے آتے ہیں۔ اس کے افراد، اس کے قصے اور قصوں میں رونما ہونے والے واقعات ہمیں اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ روزمرہ کے نظر آنے والے افراد اور ہونے والے واقعات ہمیں اس ناول میں ملتے ہیں جن سے خود ہماری زندگی عبارت ہوتی ہے۔

اس ناول کی اس روایت کو سرشار نے آگے بڑھایا۔ نذیر احمد نے ناول کو فوق الفطرت عناصر سے تو آزاد کر لیا تھا لیکن ان کا مطمح نظر اخلاق اور مذہب کی تبلیغ رہا۔ اس غایتی میلان اور مقصدیت کے تابع ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں ان کے ناولوں کی فنی لطافتیں مجروح ہو گئی ہیں۔ سرشار نے ایک غیر مذہبی وسیع المشرب اور رواداری ادب کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنے ناولوں کی بنیاد کسی غایت اور مقصد پر نہیں رکھی۔ اس طرح اس میں وسعت پیدا ہوئی۔ سرشار نے نذیر احمد کے برخلاف ہر مذہب، ہر پیشہ اور ہر طبقے کے کردار اپنے ناول میں پیش کئے۔ نذیر احمد اپنے محدود دائرہ عمل، بعض معاشرتی امور، اپنی قدامت پسندی اور مذہب سے گہری وابستگی کی وجہ سے ان نئی قوتوں کو نہ دیکھ سکے اور نئی تہذیب کے ان مظاہر کا استقبال نہ کر سکے جو ملک کی اجتماعی زندگی میں حرکت، بیداری اور روشن خیالی کا ایک نیا احساس پیدا کر رہے تھے۔ سرشار کے ناولوں میں ایک حد تک ان تبدیلیوں کے ادراک کا احساس ملتا ہے اور وہ ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

سرشار کا سب سے پہلا ناول فسانۂ آزاد ہے۔ یہ ان کا نمائندہ اور شاہکار ناول ہے۔ ان کے دوسرے ناول جام سرشار، سیر کہسار،

ہشو کی کہانی، کرم دھرم وغیرہ ہیں لیکن سرشار فسانۂ آزاد کی وجہ سے متعارف ہیں۔ سرشار نے فسانۂ آزاد اپنی معاشی ضرورتوں کے تحت لکھنا شروع کیا۔ جیسے قارئین کی پسندیدگی کے پیش نظر طول دیا گیا۔ فسانۂ آزاد کا سب سے ممتاز وصف اس کی ظرافت اور مزاح ہے۔ یہ ظرافت بڑی حد تک واقعات کی ستم ظریفی، بعض کرداروں کی عجیب اور مضحکہ خیز حرکات اور کہیں کہیں سرشار کی شگفتہ بیانی یا اشخاص قصہ کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی سے پیدا ہوتی ہے۔ سرشار کے ناولوں میں اگرچہ واقفیت لکھنؤ کی زندگی تک محدود ہے لیکن چونکہ سرشار کا مشاہدہ تیز، وسیع اور گہرا تھا اس لئے زندگی کا کوئی گوشہ اوجھل نہ رہ سکا۔ پہلی ہی جلد میں سرشار ہمیں لکھنؤ کے چپے چپے اور کوچے کوچے کی زندگی کے مناظر اس طرح دکھاتے ہیں کہ اس دور کے اودھ کی انحطاطی تہذیب کی ایک متحرک تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ کہیں نوابوں اور مصاحبین کی صحبتیں ہیں، کہیں محلوں کے اندر کے چہلیں، کہیں بیگمات ہیں کہیں بھٹیارنیں، کہیں تیوہاروں اور میلوں کی ہما ہمی ہے۔ کہیں یاران بے تکلف کی رنگ رلیاں، کہیں شاہ جی جیسے رنگیلے سیار ہیں اور کہیں مکتب کے مولوی، کہیں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہیں اور کہیں دریا کی سیر اور تھیٹر کے تماشے، کہیں شادی بیاہ کی تقریبات ہیں اور کہیں محرم کی تعزیہ داریاں، غرض لکھنؤ کی تہذیبی اور مجلسی زندگی کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہتا اور ہر پہلو کو خوب تفصیل کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ لکھنؤ سے باہر کی فضا میں جب وہ کہانی قصے کا آغاز کرتے ہیں تو قصہ پر داستانیت طاری ہو جاتی ہے اور قصہ زندگی سے دور ہو جاتا ہے۔

فنی اعتبار سے فسانۂ آزاد تنقید کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ اس کو واقعات کا جنگل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے قصوں کو بے ربط کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے لکھنؤ کی تہذیبی اور سماجی حالت کے جو نقشے اس میں ملتے ہیں اور زندگی کی جو بھرپور عکاسی اس میں کی گئی ہے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ سرشار اپنی زندگی میں کتنے ہی لاابالی رہے ہوں لیکن ان کا ادراک دوررس، ان کی نگاہیں دوربیں اور مشاہدہ گہرا اور تیز تھا۔ انھوں نے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیا تھا۔ جدید اور قدیم اداروں، قدروں اور عقائد میں جو تصادم شروع ہو چکا تھا اس کا ان کو شدید احساس تھا۔ اس تصادم کی عکاسی ان کے اس ناول میں جابجا نظر آتی ہے۔

زمانے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ مرزا رسوا انیسویں صدی کے اختتام پر ایک اعلیٰ فن کار کی حیثیت سے رونما ہوئے۔ ان کی شخصیت میں بہ یک وقت ایک فلسفی کی گہرائی، ایک سائنسداں کی مشاہدۂ نظر، ایک شاعر کی تخیل پیمائی اور ایک فن کار کی حسن دوستی سموئی ہوئی تھی۔ وہ مغربی علوم سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اس واقفیت نے ان کے ذہن کو جلا بخشی تھی۔ انھوں نے اپنے زمانے کی زندگی کو ایک بالغ نظر، روشن خیال فن کار کی طرح دیکھا تھا۔ ان کی زندگی کے تجربات رنگا رنگ تھے۔ انھوں نے امراؤ جان ادا، ذات شریف اور شریف زادہ وغیرہ ناول لکھے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے خود لکھتے ہیں۔

"اصل منشا ہمارا اس افسانہ نویسی سے نظام معاشرت کے واقعات کی فراہمی ہے۔ ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی۔ ہمارے ناولوں کو موجودہ دور کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔"

ان کا نمائندہ ناول امراؤ جان ادا ہے۔ اس کی روشنی میں جب ہم ان کے اس قول کو پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی زندگی اور معاشرت کو اس کے خصائص کے ساتھ ایک غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے سماجی شعور سے کام لے کر اپنے کرداروں کی خصوصیت کو ابھارا ہے۔ ان کے اس ناول میں مختلف طبقات کے نمائندہ کردار ملتے ہیں۔ نواب اس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنی بے راہ روی اور بے عملی کے باعث روبہ زوال تھا اور اپنے وجود کی آخری سانس لے رہا تھا۔ ان کرداروں میں بہت سی خوبیاں ہونے کے باوجود ہمیں ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف جیسی

ڈاکوؤں اور طوائفوں سے گہری ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ جو اپنی ضرورت سے ہار مان کر وہ سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں جو بہتر حالات میں وہ کبھی گوارا نہ کرتے۔

رسوا نے اس ناول میں خانگی زندگی کی جزئیات کو پلاٹ میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ کہانی کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ امراؤ جان ادا کی زندگی، خانم کا گھر، بوا حسینی کے کمرے کی حالت اور اکبر علی خاں کے گھر کی کیفیت یہ سب روزانہ کی زندگی کے ادنیٰ واقعات ہیں۔ اس طرح خانم کی نوچیوں اور رنڈیوں کی تفصیل، ان کے معمولات، ان کی آرائش، لباس، گفتگو، رہن سہن، عشوے اور ادائیں، مجرے اور دیگر مشغلے، سب کے بارے میں رسوا نے مختصر لیکن واضح اشارے کئے ہیں۔ طوائف کی زندگی اور اس کی نفسیات کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہا۔

رسوا نے ایک طوائف اور اس کے ماحول کو اس ناول کا موضوع بنایا ہے لیکن دراصل یہ پورے معاشرے پر حاوی ہے بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام طوائفیں اس دور میں مکتب بھی تھیں، محفل بھی اور سے خانے بھی۔ "ہر طبقے اور ہر مذاق کے لوگ اپنی حیثیت کے مطابق ان سے لطف اندوز ہوتے۔ گھروں اور محلوں میں ہر تقریب پر ان کے مجرے ہوتے تھے۔ میلوں، بازاروں اور عرسوں میں ان کے دم سے رونق ہوتی تھی۔ اسی لئے اس سوسائٹی کے ہر طبقے اور ہر مذاق کے لوگ جس کثرت اور جس ذوق و شوق سے طوائفوں کے گھر یکجا ہوتے ہیں کسی اور جگہ مشکل ہے اور اسی باعث طوائفوں کی زندگی میں جیسے اور جتنے رنگا رنگ رومانی اور ڈرامائی واقعات رونما ہوتے ہیں اور اپنے زمانے کے جیسے نوع بہ نوع کرداروں سے ان کو واسطہ پڑتا ہے ویسے کسی اور پیشے کی زندگی میں پیش نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کا محور بازار حسن ہونے کے باوجود یہ ناول اس زمانے کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے ناول نگاروں میں پریم چند ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی چند سال گاؤں میں گزرے۔ وہ ایک درد مند دل کے مالک تھے۔ ہندوستانی عوام خصوصاً دیہاتی لوگ اپنی سادگی، معصومیت اور غربت و افلاس کے ساتھ ان کی تمام ہمدردیوں کے مستحق تھے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر دیہات اور ان کے باشندوں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ جاگیردارانہ نظام ـــــ جس میں ظلم تھا، تشدد تھا، غریبوں کے خون چوسنے کی ہوس تھی، غریب کسانوں کے خون پسینے سے پیدا کی ہوئی دولت سے عیش کرنے کی دھن تھی ـــــ ان کے طنز و تضحیک کا ہدف بنا رہا۔ پریم چند نے ہندوستانی دیہات کے نقشے اور یہاں کے کسانوں کے سچے سچے واقعات بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کئے ہیں۔ انھوں نے ناول کو زندگی، خصوصاً عوام کی زندگی کا آئینہ دار بنا دیا۔ عوام کے دلوں کی دھڑکنیں، ان کے احساسات کی گرمی، ان کی نفسیات کی پیچیدگیاں، کسانوں کی معصوم تمنائیں، ان کی مجبوریاں اور بے چارگیاں، افلاس و تمول کی کشمکش، سرمایہ داروں کی چالاکیاں اور فریب کاریاں، زمینداروں کے ظلم اور ظلم کرنے کی سازشیں، عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کی مشغولیتیں بھی ان کے ناولوں میں جاری و ساری نظر آتی ہیں۔ وہ عملاً اس زمانے کی سیاست اور تحریک آزادی میں شریک تھے۔ ان کے ناولوں میں ان کے سیاسی احساس و شعور کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ غبن، جلوۂ ایثار، بازار حسن، چوگان ہستی، گئو دان وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔ ان سب ہی میں انھوں نے اپنی درد مندی اور دل کے سوز و گداز کے ساتھ عوام کی ... کو سمویا ہے۔ گئو دان ان کا شاہکار ہے۔ اس میں کسانوں کی بے کسی و بے چارگی ان کا موضوع رہا ہے۔ ہوری گاؤں کا ایک معمولی کسان ہے۔ افلاس و غربت کا ... افلاس نے اس کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس کی توانائی ... پیش آنے والے غم اور تفکرات کی نذر ہو گئی ہے۔ اس کی خستہ حالیوں نے اس کی خودداری کو بے دلی میں تبدیل کر دیا ہے۔ حالانکہ ...

گرفت نے اس کے جسم سے خون کی ایک ایک بوند چوس لی ہے۔ اس نے حالات کے مقابلے کی تاب نہ لاکر اپنے کو ان کے حوالے کر دیا ہے۔
اس کسان کی زندگی اس ناول کا محور ہے۔ اپنے دوار ایک گائے باندھنے کی آرزو میں اس کسان، اس کی بیوی، اس کے بیٹے اور بہو کی زندگیاں بیت جاتی ہیں۔ اسی ضمن میں گاؤں کے لوگوں کی مخاصمتیں، ان کی معصوم محبتیں، ان کے اختلافات اور ان کے اتفاق و اتحاد، زمینداروں کی زندگیوں کے بہت سے پہلو ـــ ان کی عیش کوشی، ان کا ظلم و جور، ان کی بے عملی، حالات کے ہاتھوں ان کی بے بسی، مذہب کے نام پر ان کا غریب طبقہ کا خون چوسنا ـــ پھر پیشہ ور سیاستدانوں کی چالاکیاں، تجارت پیشہ لوگوں کی فریب کاریاں، حکومت کے کارندوں کی عیاریاں اور ان عیاریوں سے گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنا کر لوٹنا، ان کی زمینوں کی قرقیاں، عشق کی پرکاریاں، گھر گھرستی کے حالات، عورتوں اور مردوں کی جنسی نفسیات کے مسائل، غرض زندگی کے متعدد پہلو زیر بحث آجاتے ہیں ـــ
پریم چند نے بڑی فن کاری کے ساتھ مختلف طبقات کی زندگی، ان کے مزاج، ان کے فکری رجحانات پر روشنی ڈالی ہے۔ مرزا خورشید، مسز مہتا، مسز کھنہ، رائے صاحب، مس مالتی، پنڈت اونکار ناتھ اور سیٹھ مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے کردار ان طبقات کے گوناگوں حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مصنف کا یہ کمال ہے کہ اس نے ان کرداروں کو ایسے رنگوں میں رنگا ہے کہ اصلیت ان کی جان ہو کر رہ گئی ہے۔ کہیں بھی ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ قصہ برائے قصہ کہا گیا ہے بلکہ واقعیت کا رنگ ہر جگہ غالب ہے۔
شہر اور دیہاتی زندگی کے مختلف افراد کے عمل سے پریم چند نے اس ناول میں جو خاکہ تیار کیا ہے وہ زندگی کے بہت سے مسائل پر حاوی ہے۔ اس میں ان کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں گاؤں کے غریب اور سادہ لوح کسانوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور اسی لئے انھوں نے دیہاتی زندگی کی عکاسی جس بھرپور انداز میں کی ہے وہ اپنا جواب آپ ہی ہے۔
ترقی پسند ادب کی تحریک کے ساتھ "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس سے اردو ادب کی تمام ہی اصناف متاثر ہوئیں اور کہیں کہیں تو زندگی کی یہ لے اس قدر بڑھی کہ ادب غائب ہوگیا اور تصنیفات محض پروپگنڈہ ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اس اثر سے عمدہ و اعلیٰ ادب بھی وجود میں آیا۔ صحت مند رجحانات واضح ہوتے چلے گئے۔ "ادب برائے ادب" کے مقابلے میں "ادب برائے زندگی" کا نظریہ زیادہ مقبول ہوا۔ ان اثرات کے تحت بعض اچھے لکھنے والے سامنے آئے۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، سدرشن، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے ناولوں نے اردو ناول کو ایک نیا معیار بخشا۔ کرشن چندر اس نئی امت کے سرخیل ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری دونوں ہی اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے صنعتی دور اور اس سے پیدا شدہ پیچیدگیوں، اخلاقی انحطاط، اقدار کی شکست اور ذہنی بے چینی و بے اطمینانی کی عکاسی بھرپور طور پر کی ہے۔ ان کے ناولوں میں فرد بمقابلہ سوسائٹی نظر آتا ہے۔ اسی کشمکش میں موجودہ زندگی کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ "گدھے کی سرگزشت" موجودہ سیاسی نظام اور سیاست کی صاحب اقتدار مگر نا اہل ہستیوں پر بہترین طنز ہے۔ "باون پتے" اور "شکست" ان کے عمدہ ناول ہیں۔ اس (ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہونے والے) دور کے ناولوں کے سیاسی و سماجی شعور کا جائزہ الگ سے ایک مفصل مضمون کی وسعت چاہتا ہے۔
غرض کہ اردو ادب کی روایات ـــ جیسا کہ کسی بھی ادب کی روایات ہو سکتی ہیں ـــ اپنے ماحول زندگی اور گرد و پیش کی فضا کی عکاسی کرتی رہی ہیں۔ ابتدائی دور کے ادب پر زندگی سے فراریت کا الزام اس لئے نہیں لگایا جاسکتا کہ ادب نے جو کچھ پیش کیا اس زمانے کا رجحان ہی وہ تھا۔ آج ہمارے رجحانات بدل چکے ہیں، لیکن ہمیں کسی بھی زمانے کے ادب کو اسی زمانے کے رجحانات کی روشنی میں پرکھنا ہوگا اور پھر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا اس زمانے کا ادب اس زمانے کے مخصوص میلانات سے ہم آہنگ ہے یا نہیں اور یہ مسلمہ امر ہے کہ کوئی ادیب، کوئی مصنف اور کوئی شاعر ایسی بات نہیں کہہ سکتا جس کے محرکات اس کو اپنے ماحول میں نہ ملتے ہوں۔ اس کے جذبات، اس کے تخیل کی پرواز، اس کا انداز فکر یہ سب ماحول کے اثرات ہی کے رہین منت ہوتے ہیں اور جب ہم اردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہر زمانے کی عکاسی اس میں نظر آتی ہے۔ اردو ناول نے بھی یہ روایت کو برقرار رکھا ہے ـــ اور دیگر اصناف ادب سے کہیں زیادہ!

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

منشی حیات بخش رسا

منشی حیات بخش رسا کے بزرگوں کا وطن موضع کاہنہ ضلع بلند شہر تھا۔ یہیں رسا پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ استعداد علمی رسمی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازمت کر لی۔ ۱۸۸۵ء میں تحصیل مصطفےٰ آباد ضلع مین پوری میں تعینات رہے اور ۱۸۸۹ء میں شکوہ آباد میں محرر جوڈیشل رہے۔ ۱۹۰۰ء میں آپ رامپور آئے اور سرکاری مشاعروں میں جو شہر کے اہتمام سے منعقد ہوتے تھے شریک ہوئے۔ یکم دسمبر ۱۹۰۰ء کے مشاعرے میں حضرت رسا نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع ملاحظہ ہو ــ

آئے دن تکرار شب ہے آئے دن تکرار صبح　　اب تو یا اقرار شب ہو ہم سے یا اقرار صبح

یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو نواب رامپور کی طرف سے ایک تاریخی مشاعرہ ہوا تھا جس میں ہندوستان کے بہت سے باکمال اور ممتاز شعراء شریک مشاعرہ تھے۔ رسا بھی اس مشاعرے میں اپنے شاگردوں کے ساتھ شامل ہوئے۔ آپ نے نہایت کامیاب طرحی غزل سنائی۔ مضطر خیرآبادی نے اس شعر کی بہت تعریف کی ــ

تم عرض مدعا پر میری زباں نہ کھینچو　　ہاتھوں میں چبھ نہ جائیں کانٹے زباں پر ہیں

مضطر خیرآبادی ان کے کلام سے کافی متاثر ہوئے اور ان کی سفارش سے رسا کو سرکاری ملازمت مل گئی اور نواب حامد علی خاں نے بمشاہرہ ۶۰ روپے اپنے یہاں درباری شعرا میں ملازم رکھ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کو دربار رامپور میں وکالت کرنے کی اجازت دے دی۔ آخری زندگی تک یہیں رہے۔ مرض فالج میں کئی سال تک مبتلا رہے۔ بالآخر ۲۲ نومبر ۱۹۱۳ء کو علم و ادب کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ ایک لڑکی اپنی یادگار میں چھوڑی جو غالباً بقید حیات ہے اور کراچی میں مقیم ہے۔ ناصل زیدی نے نگار ہند امرتسر اگست ۱۹۶۰ء میں رسا پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں وفات کی تاریخ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء تحریر کی ہے جو غلط ہے۔ شفیق عمادپوری اور تاجور نجیب آبادی کی قطعات تاریخ وفات ملاحظہ فرمائیے۔

شفیق رضوی عمادپوری ــــ

جنت نصیب شاعر دربار رام پور　　شاگرد داغ بلبل ہندوستاں رسا
منشی حیات بخش نوا سنج نکتہ رس　　خوش فکر و خوش طبیعت و شیوا زباں رسا
برجستہ کہہ دوں مصرعہ تاریخ انتقال　　تھا ذہن نارسا شفیق ایسا کہاں رسا
بے ساختہ زبان سے لیکن نکل پڑا　　اچھا تھا آہ شاعر جادو بیاں رسا
۱۳۳۱ھ

تاجور نجیب آبادی ــــ

غضب ہو گیا ہو گئی عمر بھر کو　　حیات رسا کی رسا سے جدائی
بجھا ہے چراغ حیات رسا اب　　کہ یوں ہر طرف ایک ظلمت ہے چھائی
۱۹۱۳ء

رسا بھی گئے داغ کی جستجو میں — اٹھا داغ کا جب نہ داغ جدائی
نکل کر کہا یہ دلِ تاجور نے — ہوئی خلد میں بھی رسا کی رسائی

رسا کا حلقہ تلامذہ بیخود مرحوم کی طرح کافی وسیع تھا۔ آپ کے شاگردوں میں جگر مرادآبادی، تاجور نجیب آبادی، حامد اللہ افسر اور عبدالمجید سالک زیادہ مشہور ہوئے۔ منشی محبوب لال زمرد شاگرد مرزا داغ نے بھی آپ سے مشورۂ سخن کیا تھا۔ جگر مرادآبادی سے میری ملاقات ۱۹۵۶ء میں شگفتہ سورنوی کے دولت کدہ پر میرٹھ میں ہوئی۔ اس وقت میں نے حضرت جگر سے برسبیل تذکرہ دریافت کیا کہ انھوں نے کبھی حیات بخش رسا سے بھی مشورۂ سخن کیا یا نہیں۔ جگر صاحب نے فرمایا کہ انھوں نے چند غزلیں حضرت رسا کو دکھائی تھیں۔ رسا کی غزلیات کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ "کلام رسا" کے نام سے الناظر پریس سے ایک چھوٹا سا انتخاب شائع ہو گیا تھا جو اب نایاب ہے۔ حسرت موہانی نے بھی ایک مختصر سا دیوان ان کا شائع کیا تھا وہ بھی اب کمیاب ہے۔ اردو کے پرانے گلدستوں میں رسا کے کلام کی زیارت ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی اہلِ ذوق ان کے کلام کا انتخاب رسالوں اور گلدستوں کی مدد سے شائع کر دے تو یہ اردو کی بڑی خدمت ہوگی۔ "جلوۂ یار" میرٹھ سے آپ کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔ اردو کے ممتاز اساتذہ میں رسا کا شمار ہوتا ہے۔ آپ نے مرزا داغ کے رنگ کی پوری طرح پیروی کی ہے لیکن اس عریانیت سے بچے رہے جس کی وجہ سے داغ اور ان کا اسکول بدنام ہے۔ زبان کی جادوگری کے علاوہ فنی حیثیت سے ان کا کلام معیاری ہے۔ رسا کے بارے میں چند ادیبوں کی رائے ملاحظہ ہو۔

تاجور نجیب آبادی "جلوۂ یار" میرٹھ ماہ دسمبر ۱۹۱۲ء میں رقمطراز ہیں:

"ادبی دنیا غالباً یہ سن کر حیرت کر چونک جائے گی کہ علم ادب کا ایک روشن آفتاب یعنی مولوی حیات بخش صاحب رسا جانشین داغ آج فروب ہو کر بزم سخن میں ایک مہیب اندھیرا چھوڑ گیا۔ ادبی دنیا اپنے اس محسن کا مدتوں تک ماتم کرے گی۔ سچ یہ ہے کہ زمانہ سیکڑوں کروٹیں بدلے گا مگر صدیوں میں بھی ایسا کامل استاد اہلِ دنیا پر نہ پیش کر سکے گا۔ حضرت مرحوم کے کلام بلاغت نظام میں جو برجستگی، متانت بندش مضمون کے ساتھ سادگی نظر آتی ہے۔ بلاخوف تردید و بااعتراف اہلِ فن کہا جا سکتا ہے کہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔"

مولانا عبدالمجید سالک نے ڈاکٹر اقبال مرحوم سے مشورۂ سخن کرنا چاہا تو ڈاکٹر اقبال نے لکھا۔

"اگر آپ ذوقِ شاعری کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں تو منشی حیات بخش رسا یا مولانا احسن مارہروی سے رجوع کیجیے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال مولانا احسن اور منشی حیات بخش رسا کو بہت ممتاز سمجھتے تھے۔

حسرت موہانی کے رسالہ اردوئے معلی میں رسا پر ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں داغ مرحوم کے چھوٹے بھائی خورشید عالم بہادر کی یہ رائے درج تھی کہ "رسا داغ کے شاگردوں میں سب سے بہتر ہیں۔"

انتخاب کلام ملاحظہ فرمائیے۔

رسا نا روا کو یا بتوں کے دل میں گھر کر لو — یہ دو دن زندگی کے جس طرح چاہے بسر کر لو
نصیب ان کا بہانے ہیں جو زلفیں رُخ روشن پہ — سحر کو چپکے چپکے منہ تمہارا دیکھنے والے
نہ دیر میں ہیں راحت نہ چین کعبے میں — خبر نہ دیگا نہ اس دل کا اضطراب کہیں
میرا نہیں ہے کوئی کسی کا نہیں ہوں میں — اس طرح ہوں جہاں میں گویا نہیں ہوں میں
ترے وعدے کا ہے مجھ کو یقیں لیکن یہ کھٹکا ہے — کہیں دھوکا نہ دے جائے مجھے عمرِ رواں میری

بقیہ ص پر

محمد اسحاق ایوبی

طنزیہ

فلمی صنعت

ہندوستان میں پنڈت نہرو اور پاکستان میں جنرل ایوب کے بعد سب سے زیادہ عزت، شہرت اور مقبولیت اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ فلمی دنیا کی شخصیتیں ہیں۔ کیا شہری، کیا دیہاتی؟ کیا مرد کیا عورت؟ کیا بچے، کیا جوان کیا بوڑھے ۔۔۔ سبھی فلمی ستاروں کے رسیا، قدردان اور پرستار ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ بوڑھوں سے زیادہ جوانوں کو اور جوانوں سے زیادہ بچوں کو فلمی پریوں اور پری زادوں کے نام اور گانے ازبر ہیں۔ یہ دراصل الٹی گنگا نہیں بہہ رہی ہے بلکہ ع قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ ۔۔۔ جب تک نیو مضبوط اور گہری نہیں ہوگی تب تک عمارت بہت زیادہ پختہ نہیں بن سکتی۔ راس و اساس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فن تعمیر کا یہ بنیادی اصول بھی ہے۔

بہت سے لوگ فلموں کی غیر معمولی ہر دلعزیزی پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اس سے سینما کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ع جلنے والے جلا کریں قسمت ہمارے ساتھ ہے ۔۔۔ یہ طے ہے کہ فلموں کی ہر دلعزیزی کا یہی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ ایسے حضرات فلموں کی جانب سحر انگیزی اور طلسماتی کشش کو محسوس نہیں کر پاتے۔ سچ پوچھئے تو انھیں ہر جاذب نظر چیز سے بے طرح پیدائشی نفرت ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ہر رعنائی خیال گناہ ہے اور جب یہ رعنائیاں محسوس شکل میں چلتی پھرتی حالت میں دکھائی دیتی ہیں تو غضب ہی ہو جاتا ہے ؎

کی ہے زاہد نے آپ دنیا ترک یا مقدر میں اس کے تھی ہی نہیں

سینما ایک جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ بڑے بڑے خدا رسیدہ بزرگوں نے ایسی کرامتیں کاہے کو دکھائی ہوں گی۔ ہمارے آباؤ اجداد "منہ بولتی تصویریں" تو بولتے آئے تھے لیکن ان کو پردہ اسکرین پر جیتے جاگتے پیش کرنا سینما کی ساحری ہے۔

ایک وہ دور بھی تھا جب صرف امراء و روساء، طائفہ کی تھیلی کے ناچ سے محظوظ ہو سکتا تھا۔ یہی طبقہ تھا جو طوائفوں کی سرپرستی کرتا تھا اور رقص و سرود سے لطف اندوز ہونے کی پوری پوری اجارہ داری اسی کو حاصل تھی۔ موسیقی کے بڑے بڑے استاد اور ان کے گھرانے بھی انھیں درباروں سے وابستہ تھے۔ قسام ازل نے "جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا" کے اصول پر عوام کی قسمت میں عوامی موسیقی اور عوامی ناچ لکھ رکھا تھا۔ جب جاگیرداری دور کا انحطاط شروع ہوا تو "رنگ رلیاں" "مال غنیمت" کے طور پر عوام کے حصے میں بھی آئیں۔ جگہ جگہ "تھیٹر" ڈرامے کھیلے جانے لگے۔ نوٹنکی عام ہوئی۔ طوائفوں کے کوٹھے پر عوام کا آنا جانا بھی ہونے لگا۔ سرکس انگریزی عہد کی پیداوار تھی جو عامۃ الناس کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچا دیتی تھی۔ لیکن جب فلموں کا آغاز ہوا تو اسٹیج ڈرامے اور سرکس کی بساط الٹ گئی۔ کوٹھوں کی اہمیت گھٹتی گئی اور کلاسیکی سنگیت کے گھرانے کس مپرسی کا شکار ہونے لگے ؎

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

دراصل فلمی دور عوامی دور کی آمد آمد کا پتہ دیتا ہے۔ اب "ایرے غیرے نتھو خیرے" بھی آنے کے چند سکوں کے عوض فلموں سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو فلموں سے بہتر، پرکشش اور سستا تفریح کا سامان اس سے پہلے کبھی دنیا میں ایجاد نہ ہوا تھا۔ اس لئے سینما کی ہر دلعزیزی بڑھتی جانے کی کچھ حد ہی نہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فلموں میں اچھائیاں ہی اچھائیاں ہیں۔ اس میں جہاں خوبیاں ہیں وہیں خرابیاں بھی ہیں۔ شراب کی طرح فلمیں اپنے اندر اچھائیاں کم اور برائیاں زیادہ رکھتی ہیں کیونکہ فلمیں زیادہ تر روپیہ کمانے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ سود خوار ساہوکاروں کی چکنی چپڑی باتوں میں خلوص، انسانیت اور ہمدردی کا جتنا عنصر ہوتا ہے۔ اسی تناسب سے فلموں میں سماج کی اصلاح اور آرٹ کی ترقی کی باتیں شامل ہوتی ہیں۔ فلمیں تیار کرتے وقت زیادہ تر پروڈیوسروں، فائنانسروں، ڈسٹری بیوٹروں اور ڈائرکٹروں کی تمام تر توجہ "باکس آفس" پر ہوتی ہے۔ اسی طرح جس طرح نماز پڑھتے وقت مصلیان خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی نگاہیں سجدے کی جگہ پر رکھتے ہیں۔ فلموں کی تخلیق کے وقت کوئی سماجی مسئلے کو چھیڑا جاتا ہے۔ کوئی تاریخی واقعات کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ کہیں مذہبی شخصیتیں دکھائی جاتی ہیں۔ کہیں عشقیہ داستانیں پردۂ فلم پر پیش کی جاتی ہیں۔ عام طور پر تاریخی فلموں میں تاریخ کی نفی ہوتی ہے۔ سماجی فلموں میں غیر سماجی عناصر کی سرگرمیوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جاتا ہے اور مذہبی فلموں میں مذہب کی حیثیت بلیک میوزک کی رہ جاتی ہے۔ ہر فلم میں خواہ مذہبی ہو، خواہ تاریخی، خواہ سماجی، حسن و عشق کے مناظر کی ٹھونس ٹھانس ضرور بالضرور کی جاتی ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ وَيُحِبُّ الْجَمَالَ۔ اس سلسلہ میں رائی کو پہاڑ کے روپ میں پیش کرنے، غیر ممکن کو ممکن بنا دینے اور سماجی روایات اور اخلاقی بندھنوں کو بالائے طاق رکھ دینے سے مطلق دریغ نہیں کیا جاتا۔ بشرط ضرورت پریم کی آگ میں جلنے والے دو دلوں کی آزادانہ اچھل کود، ہاتھاپائی اور ڈرل ٹریننگ کے لئے پبلک پارک اور دیگر عام تفریح گاہیں "آدم اور آدم زاد" سے خالی کرالی جاتی ہیں ؎

کبھو وادیٔ عشق دکھلائیے　　　بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے

ہمارے ثانوی اسکولوں کے اساتذہ ہمیں بتایا کرتے تھے کہ جب تم تقریر کرنے اسٹیج پر پہنچو تو یوں سمجھو کہ تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے سامعین نرے احمق ہیں۔ اس طرح تم پر سامعین کا رعب غالب نہ آسکے گا۔ تقریر کا یہ گر بہت سے فلم سازوں نے بھی اپنا رکھا ہے۔ وہ فلم بین طبقے کو بیوقوف محض سمجھتے ہیں اور دنیا بھر کی طفلانہ باتیں فلموں میں شامل کر لیتے ہیں۔ کئی فلموں میں ہیرو یا ویلن ڈبل رول بھی ادا کرتا ہے۔ چونکہ اسٹوڈیو میں داڑھی مونچھ لگانے اور عورتوں، نوابوں یا پٹھانوں کا لباس پہننے کی ہوس ہوتی ہے اسی لئے ہیرو یا ویلن گھنٹوں میک اپ روم میں داڑھی مونچھ لگانے یا لباس تبدیل کرنے میں صرف کرسکتا ہے مگر فلم میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ چٹکی بجاتے اس نے حلیہ بدل لیا ہے۔ فلم دیکھنے والے اس قسم کی باتوں سے بہت خوش ہوتے ہیں اور تالیاں پیٹتے ہیں۔ اس طرح جب ہیرو اور ہیروئین ویلن کے جنگل میں پھنس جاتے ہیں تو انھیں رسی سے باندھ کر پورے جنگل میں آگ لگا دی جاتی ہے ؎

کشتیٔ جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است　　　ڈبکوں ڈبکوں می کند دریک توجہ یار کن

تب ہیروئین نہایت دردناک لہجے میں گانے لگتی ہے اور بدریا سے بنتی کرتی ہے کہ وہ برس پڑے۔ پہلے تو بدریا سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ اس طرح تذبذب کی کیفیت باقی رہتی ہے۔ فلم دیکھنے والوں کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے..... مگر..... مگر کچھ دیر بعد ایسی زوردار بارش ہوتی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ پھر ہیرو اور ہیروئین ہنستے مسکراتے "آتش نمرود" سے بالکل نکل آتے ہیں۔

فلموں میں اہم کردار چار ہوتے ہیں۔ باقی کردار ان ہی چاروں کے اردگرد گھومتے ہیں۔ یہ عناصر اربعہ ہیرو، ہیروئین، ویلن اور کامیڈین ہیں۔ متعلقہ فلم میں ہیرو اور ہیروئین دونوں کا سب سے زیادہ خوبصورت ہونا ضروری ہے۔ ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ انھیں باطنی حسن کی دولت سے بھی مالا مال کیا جاتا ہے۔ ان میں زمانے بھر کی خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھر دی جاتی ہیں۔ اس طرح صورت اور سیرت کے امتیازات بیک جنبش قلم حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اب یہ شعر بے معنی ہو کر رہ گیا ہے ؎

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا　　　سرخ و سفید مٹی کی صورت ہوئی تو کیا

ویلن لازمی طور پر بد ہئیت اور بد چلن ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اتنی رعایت ضرور برتی جاتی ہے کہ اسے عموماً شہ زور بتایا جاتا ہے۔ اگر اس میں جسمانی نقائص ہوں تو اسے بلا کا ذہین، سازشی اور شر پسند بنا دیا جاتا ہے۔ ویلن عام طور پر دولت مند بھی ہوتا ہے۔ یہ دولت حرام کی کمائی ہوتی ہے۔ ہیرو اگر امیر ہو تو اس کی دولت حلال کمائی کی ہوتی ہے۔ ویسے اکثر صورتوں میں ہیرو بذات خود کچھ نہیں کماتا، اس طرح حرام اور حلال کمائی کا مسئلہ بھی آسانی سے حل کر دیا جاتا ہے۔

اَلْحَقُّ يَعْلُو کے اصول پر ہر حال میں فتح ہیرو اور ہیروئن کی ہوتی ہے اور ویلن اور اس کے بدکردار ساتھی یا تو موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں یا باقی عمر قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے لئے چھوڑ دیئے جاتے ہیں ؎

جو ستم گر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں   سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا

فلمیں بنانے والے حشر و نشر پر کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے۔ وہ دنیا ہی میں سزا و جزا کے قائل معلوم ہوتے ہیں ؎

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو   کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائیگا

کامیڈین ہر حال میں ہنستا اور ہنساتا ہے۔ اس کے نزدیک شادی و غم، ہیرو اور ہیروئن اور شاہ و گدا کا فرق کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ ہر جگہ، ہر موقع پر اور ہر کسی سے مذاق کرنے کا مجاز ہے۔ اگر وہ زبان و الفاظ سے مذاق نہیں کر سکتا تو بیچارے کو حرکات و سکنات سے مزاح کی کیفیت پیدا کرنا پڑتی ہے۔ کامیڈین کی بھی ایک ہیروئن ہوتی ہے جو معمولی ناک نقشے کی مالک ہوتی ہے۔ لیکن اس کے شوخ و شنگ ہونے سے فلم میں جان سی آجاتی ہے۔ کامیڈین یا تو موٹا تگڑا ہوگا یا دبلا پتلا۔ اس کی ہیروئن کے لئے یہ قید لازمی نہیں۔

جس فلم میں زیادہ سے زیادہ ناچ گانے ہوں گے وہ زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوگی۔ آج کل مار دھاڑ کی فلمیں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوتیں۔ فلم بین طبقے کا مذاق بدل رہا ہے۔ اب عوام مار دھاڑ کی بجائے عریاں ناچ اور گندے گیت زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔ یہ ترقی کی علامت ہے۔ اب وہ جنگلی تہذیب کے جھاڑ جھنکاڑوں سے نکل کر شہری کلچر کی ہموار راہ پر گامزن ہو چکے ہیں۔

پہلے زمانے میں حرم سرائیں فیشن کا منبع سمجھی جاتی تھیں۔ انگریزوں کے دور میں یہ بار امانت " کالج کی لڑکیوں کے سپرد ہوا تھا۔ فی الحال فیشن کا سوتا فلمی دنیا سے پھوٹتا ہے۔

فلمیں مختلف علاقوں کے کلچر کو "کھچڑی پلاؤ" کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔ تامل علاقے کے پس منظر میں تامل زبان کے بورڈ تو دکھائے جاتے ہیں لیکن ہندی یا اردو فلموں کی ہیروئن کا لباس پنجابی ہوگا۔ اس طرح ہماری فلمیں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا کر قومی یکجہتی و ثقافتی اتحاد کے لئے انتھک کوششیں کر رہی ہیں۔

فلموں کی کامیابی میں گیتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ فلمی گیتوں میں غزل، قوالی، بھجن ۔۔۔ سبھی چیزیں شامل ہیں۔ دکھ سکھ کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ جنگل، پہاڑ اور دریا میں بھی ساز کے ساتھ گانے گائے جاتے ہیں۔ یہ سب ہی گیت بہت برمحل ہوتے ہیں۔ جب ہیرو ہجر کی رات اختر شماری کرتے کرتے غزل گانے لگتا ہے تو ادھر سے ہیروئن بھی "در جواب آں غزل" بیقراری کا اظہار کرتی ہے۔ اس ضمن میں فاصلہ کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے سے میلوں دور بیٹھے ہیرو اور ہیروئن ایک ہی ردیف قافیے کی برجستہ اور فی البدیہہ غزلیں سوال و جواب کی شکل میں گاتے ہیں۔ یہ بیت بازی بڑا مزہ دیتی ہے۔ رات کے سناٹوں میں بھی گیتوں کے ساتھ ساز بجتے ہیں اور اڑوس پڑوس کے لوگوں کی نیند میں کسی قسم کا خلل نہیں ہوتا۔

فلمی گیت سینما گھروں کے علاوہ ریڈیو پر گرام اور ریکارڈ کی شکل میں ہر گھر، ہر تقریب میں سنے جا سکتے ہیں ؎

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ بلبل نے کچھ گل نے   چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

حسن کمال

احساس

ایسی بے کیف فضاؤں میں گزارا کیسا
زندگی جن میں فقط مول کا سودا بن جائے
ہمنشیں! وہ بھی کوئی زیست ہے انساں جس میں
اجنبی ہاتھوں میں بے جان کھلونا بن جائے

ہر نفس پر یہاں پہرے سے لگے ہوتے ہیں
ہر نظر بستۂ زنجیرِ و رسن ہوتی ہے
اپنی آواز بھی انجان سی لگتی ہے یہاں
دل دھڑکتا ہے تو پہلو میں چبھن ہوتی ہے

دوستی، عاشقی، دلبستگی و ذکرِ وفا
چند افسانوں کے عنواں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان کے پیچھے ہے حقائق کا بھیانک پہلو
جن میں تخریب کے ساماں کے سوا کچھ بھی نہیں

رسم و اخلاق شعار اور یہ آداب و لحاظ
کتنے مزور رواجوں کا یہ مسکن ہے جہاں
اصلیت جن کی نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
لوگ یہ بھول گئے گل میں بھلا نقش کہاں

ترکِ الفت کا نظریہ تو غلط ہے لیکن
کیا ضروری ہے کہ جذبات کو کچلا جائے
اس محبت سے بھلا فائدہ کیا ہے اے دوست!
جس سے خودداری و احساس کو بیچا جائے

کس سے جا کر یہ بتاؤں کہ مجھے دکھ کیا ہے
کون جانے مری بربادی کا ساماں کیا ہے
کوئی دامن بھی نہیں میرے سہارے کے لئے
کس سے پوچھوں کہ مرے درد کا درماں کیا ہے

بول اپنوں کے ہوں غیروں کے ہوں جس کے بھی ہوں
قلب میں اتریں تو نشتر کی طرح لگتے ہیں
دوستی اور قرابت کے سنہرے پردے
چاک ہو جائیں تو کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں

میرا احساسِ خودی اب تو گراں ہے مجھ پر
چھین لے کاش کوئی مجھ سے مرا ذوقِ جمال
زیست کی ذلت و رسوائی کے اس دور میں آج
میں تو انساں ہوں یزداں کا گزر بھی ہے محال

کاش دو روز زمانے کے مزے لینے کو
میرا احساسِ حمیت ہی کہیں سو جاتا
اور دو روز یہ احساسِ لطافت لے کر
موت کی پیار بھری گود میں میں سو جاتا

مجھ سے بس اتنا بتا دے کوئی خضرِ حاضر
اتنی بپھری ہوئی کیوں چشمِ جہاں ہے مجھ پر
میرے کچلے ہوئے جذبات کی تسکیں کے لئے
چند الفاظِ محبت بھی گراں ہیں مجھ پر

سلیمان خطیب

دکنی رس

پگڈنڈی

ایک نوری جا رہی کے سر کا جھومرا کو شرم سے
گوں کے بازو سے نکل کو گھاٹ کو جاتی ہوں میں
جن کے اگے چاند سورج بھیک کے سائک ہیں وہ
ایسے ویسے آفتاباں کو اُٹھالاتی ہوں میں
منہ اندھارے آکو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں میں تو ریت جاتی ہوں میں

❖

یاں پہنچتی، واں نکلتی، کھیلتی آتی ہوں میں
دھان کے کھیتاں میں جا کو مانگ بن جاتی ہوں میں
پیلے پیلے لے کو گاگر، جیسے سونے کی لکیر
لک لکاتی، ڈولتی، گاتی ہوئی جاتی ہوں میں

❖

میں کنواری چھوریوں کی ایک لمبی سانس ہوں
دو دلاں میں چبھنے والی ایک ننگی پھانس ہوں
ہاتھ میں جنگل کے ہوں تقدیر کی ٹیڑھی لکیر
کچا پکا دھرہ ہوں میں مٹتی مٹتی آنس ہوں

❖

یہ اماراں یہ چبوتراں، بانسری کا راگ ہوں
من چلے گبرو جواناں کے دلاں کی آگ ہوں
گوری گوری گوپیاں ہیں رنگ برنگی ساریاں
وہ دھنک بھی کیا دھنک جی میں دھنک کا بھاگ ہوں

❖

ایک چنیدری ہوں کسی کی کھیت میں کھڑی ہوئی
ایک ناگن ہوں اکیلی گھانس میں سوئی ہوئی
کاں کے پاداں مل کنول پڑتے میں جاتی لو مری
میں تو گنگا کی لہر ہوں نور میں ڈوبی ہوئی

❖

دستیار کے وہ پاپی پاداں مجھ لو آ سکتے نئیں
میں تو میں، میری گرد کو بھی وہ پا سکتے نئیں
ان کے مڑکاں لیسے دھوکے سخت پتھر کے دلاں
میری نرمی، شرماشرمی، مرکو لاسکتے نئیں

❖

نیک ہو کو بد کی ساتھی کیسے ہو سکتی ہوں میں؟
پاپ کے بھرپور منکے کیسے ڈھو سکتی ہوں میں؟

خورشید احمد جامی

○

نیم تاریک سی گلیوں میں کہیں ٹھہر کر
چھپ گئی گردِ کشاکش میں اُمیدوں کی سحر
وہی راتیں ہیں وہی زخم وہی راہگذر
ختم ہوگا کہ نہیں تیرہ نصیبوں کا سفر
غم کے آنگن میں۔ شبِ تار کی دیواروں سے
جھانکتے ہیں تری یادوں کے ستارے اکثر
کچھ دئیے اور جلاؤں گا سرِ راہِ بہار
میں نے کچھ سوچ کے رکھا ہے قدم کانٹوں پر
چاند نکلا ہے صلیبوں کی فصیلوں سے پرے
یا گذرتا ہے کوئی قافلۂ فکر و نظر
میرے ماحول کی بھیگی ہوئی پلکوں نے دیا
میرے گیتوں کے لئے شعلۂ رخسارِ سحر
غم کی آہٹ بھی نہیں پیار کا دھوکہ بھی نہیں
رات آئی ہے مگر رات کٹے گی کیوں کر
ہائے وہ دور کی بچھڑی ہوئی یادیں جامیؔ
جاگ اٹھتا ہے تخیل کا حسیں پس منظر

زبیر رضوی

دو غزلیں

باہمہ ذوقِ بہاراں کبھی رسوا نہ ہوئے
شکر اے سازِ طرب ہم ترا نغمہ نہ ہوئے

زندگی آئینہ خانوں میں بسر کی برسوں
کتنے سادہ ہیں کہ ہم پھر بھی خود آرا نہ ہوئے

حاصلِ زیست جنھیں مان لیا ہی ہم نے
کیا ہو، وہ ترے اگر نقشِ کفِ پا نہ ہوئے

چارہ فرمائی خوباں کو دعا دیتے ہیں
ہم کسی راہ کسی موڑ پہ تنہا نہ ہوئے

حسن و رعنائی اوراقِ مصوّر مت پوچھ
تیرے ہوتے کسی تصویر پہ شیدا نہ ہوئے

مہرباں ہو کے کئی بار ملا تھا کوئی
ہم ہی آمادۂ اظہارِ تمنا نہ ہوئے

سنتے ہیں کوچۂ دلدار بہت سونا ہے
ہم سے دیوانے ترے شہر میں پیدا نہ ہوئے

دل گیا، چین گیا، عزتِ سادات گئی
پھر بھی جی بھر کے ترے شہر میں رسوا نہ ہوئے

یہ بھی اک صبح کہ مصروفِ دعا دیکھا ہے
وہ بھی اک شام کہ ان ہاتھوں سے پیمانے بنے

ہم وہ آوارۂ منزل کہ جہاں سے گذرے
انگلیاں اٹھی ہیں، چرچے ہوئے، افسانے بنے

یہ بھی کیا رسمِ ملاقات کہ ملنے والے
بے تکلف نہ ہوئے اور نہ بیگانے بنے

کتنی دلچسپ تھی وہ ساعتِ تعمیر کہ جب
حرم و دیر کے پہلو میں پری خانے بنے

ان کو سونپی گئی تنظیم چمن بندی دہر
شہرِ دل جن کی عنایات سے ویرانے بنے

کوئی لیلیٰ ہے یہاں اور نہ کوئی وادیٔ نجد
ہائے ہم لوگ کہ اس دور میں دیوانے بنے

طالبؔ رزّاقی

لب ترستے رہے جام مے کے لئے، دل تڑپتا رہا بے خودی کے لئے
ہائے کیا وقت ہے ظلمتوں سے ہمیں، ربط رکھنا پڑا روشنی کے لئے

رقص و رم بھی نہیں، کیف و کم بھی نہیں، پیچ و خم بھی نہیں، درد و غم بھی نہیں
موت کی سی فضا، تا بہ کے تا کجا، آئیے کچھ کریں زندگی کے لئے

جانتا ہی نہیں کوئی دل کی زباں، کیجئے کیا بیاں درد کی داستاں
اے خدائے وفا! تیری دنیا میں کیا، زندگی جرم ہے آدمی کے لئے

دل لگانا ہی ٹھیرا تو پھر آئیے، رسم تیشہ زنی سے بھی آگے بڑھیں
ہر روایت کو پامال کرتے چلیں، خوب سے خوب تر زندگی کے لئے

منزلِ دار کیا، کوہ پار کیا، رنج ادبار کیا، لطف و آزار کیا
کتنی صدیوں سے ہم کو الجھنا پڑا، اک نئے دور کی روشنی کے لئے

شوقِ منزل اثر، واقف رہگذر، آشنائے سفر، وقت سے باخبر
اس حسیں راہبر کے سوا ہم سفر، کوئی موزوں نہیں رہبری کے لئے

کتنے ناخوش ہوئے کتنے برہم ہوئے، کتنے بدظن ہوئے، کتنے ناقد ہوئے
اس خطا پر کہ ہم جستجو میں تری، کیوں رکے راہ میں دو گھڑی کے لئے

اس حسیں خوبصورت زمانے میں ہم، سہل سمجھے تھے جینا خدا کی قسم
غم میں جینا پڑا، زخم سینا پڑا، زہر پینا پڑا زندگی کے لئے

کچھ پتہ ہے تجھے کیا ہے رنگ جہاں، کچھ خبر ہے تجھے تیرے طالبؔ یہاں
مسکراتے ہوئے کتنے غم سہہ گئے، اے صنم ایک تیری خوشی کے لئے

فضیل جعفری

△

مرحلے راہِ غمِ عشق کے ویسے ہی رہے
جل بجھے کتنی تمناؤں کے موہوم دیئے
کم ہے جو کچھ بھی گذر جائے خوشی سے دل پر
مدّتوں بعد وہ محبوب ملے گا ہم سے
ہم میں کب اتنی جسارت تھی کہ اُس کو چاہیں
اُس نے خود عشق کا اظہار کیا ہے پہلے
پھول کھلتے ہیں سرِ شاخِ صنوبر جب بھی
یاد آجاتے ہیں کچھ واقعے بھولے بسرے
تیرے ہاتھوں میں رہیں یونہی وفا کی شمعیں
ہر رہِ غم سے گذر جاؤں گا ہنستے گاتے
جانے اس وقت وہ کس حال میں کیسا ہوگا!
جس کی خاطر یہ غزل لکھی یہ اشعار کہے
اجنبی لوگ، نیا شہر، مخالف حالات
دوستو! حالِ دلِ زار کہیں تو کس سے
جذب ہوجا مرے معبود کی صورت مجھ میں
صرف اپنے لب و رخسار کی سوغات نہ دے

تجھ سے پہلے بھی کسی شوخ پہ مرتے تھے فضیل
ہاں مگر اس سے مراسم نہ تھے اتنے گہرے

غزل

ندرت کانپوری

نہ وہ کیفیت ہے دل کی، نہ وہ سرخوشی کا عالم
یہ بدل دیا ہے کس نے مری زندگی کا عالم

کبھی لب تک آگیا تھا، ترا نام بے خودی میں
مگر آج تک وہی ہے، تری برہمی کا عالم

ترے عارضِ حسیں میں، ہے عجب رنگ و نکہت
نہ ہوا نصیب گل کو، یہ شگفتگی کا عالم

مری خود نمائیوں میں، مری عاجزی کے پہلو
تری خود سری میں واعظ، تری گمرہی کا عالم

کبھی پھر سے ایک جا ہوں، لبِ جوئبار ہم تم
وہی رات کا سماں ہو، وہی چاندنی کا عالم

نہ سمجھ سکے ہم اب تک، تری گردشِ نظر کو
کبھی آشنا کا عالم، کبھی اجنبی کا عالم

مری فکر کا خلاصہ، غمِ عاشقی ہے ندرتؔ
مرے شعر سے ہے ظاہر مری زندگی کا عالم

*

غزل

افسر سیمابی

منزلِ غم سے وہی زمزمہ خواں گزرا ہے
جس کی نظروں سے ترا حسنِ جواں گزرا ہے

ہائے وہ انجمنِ ناز، وہ فردوسِ خیال
ایک اک لمحہ جہاں بادہ فشاں گزرا ہے

کس کے جلووں سے ضیا بار ہے ویرانۂ دل
کیا کوئی قافلۂ زہرہ وشاں گزرا ہے

سینۂ خاک میں یہ نزہتِ مخمور کہاں!
شاید اس راہ سے وہ سروِ رواں گزرا ہے

مل گئی خاک میں کن آئینہ زاروں کی مراد
کس اندھیرے پہ اُجالے کا گماں گزرا ہے

کیوں نہ افسردہ و بے رنگ ہو گلزارِ وطن
موسمِ گل بھی یہاں برق فشاں گزرا ہے

آنکھ اُٹھانا بھی محبت میں خطا ہے افسرؔ
لب ہلانا بھی زمانے پہ گراں گزرا ہے

*

حامد بہاری

غزل

یہ محبت ہے محبت کا کرم عام نہیں
یہ وہ مے ہے کہ بہر شیشہ۔ بہر جام نہیں

سیکڑوں اہلِ خرد ہیں خمِ ابرو کے قتیل
اک مرے سر ہی محبت کا تو الزام نہیں

جلوۂ حسن کو پابند سمجھنے والو!
یہ کسی طرح سے پابند در و بام نہیں

مرے اشعار کے معنی نہ سمجھنے والو!
شاعری عام سہی نکتہ رسی عام نہیں

کس سے ہو شکوۂ رفتارِ زمانہ حامدؔ
ہم نہ چاہیں تو اسے جراتِ یک گام نہیں

الطاف شاہد

غزل

ہر نفس بر سرِ پیکار ہے کیا عرض کریں
سانس لینا ہمیں دشوار ہے کیا عرض کریں

سامنے حسنِ طرحدار ہے کیا عرض کریں
اب کسے جراتِ گفتار ہے کیا عرض کریں

کون ہوتا ہے زمانے میں کسی کا مخلص
خود فریبئ دلِ زار ہے کیا عرض کریں

آ تو سکتے ہیں تری بزم میں اے پیکرِ ناز
پر طبیعت بڑی خوددار ہے کیا عرض کریں

پھر وہی ہم ہیں وہی مہر و وفا کی گلیاں
پھر وہی کوچہ و بازار ہے کیا عرض کریں

○

جانتے بوجھتے انجان بنے جاتے ہو
ہم سے کہتے ہو کہ کیا نام ہے کیا عرض کریں

غیر سے ملنا بُرا بات نہیں ہے لیکن
آدمی بندۂ اوہام ہے کیا عرض کریں

اپنی قسمت میں مئے ناب نہیں ہے لیکن
ہاں مگر دُردِ تہِ جام ہے کیا عرض کریں

○

محمد علوی

غزل

رات کا پہلا پہر ہے سو رہو
دُور ابھی وقتِ سحر ہے سو رہو

اِس سے تو چاند آیا ہے اِدھر
شمس تو کوسوں اُدھر ہے سو رہو

ایک اک کوچے نے آنکھیں مُوند لیں
نیند میں ایک ایک گھر ہے سو رہو

گھر کا دروازہ نہیں تو کیا ہُوا
تم کو کیا چوروں کا ڈر ہے سو رہو

رات لمبی ہے اگر جاگا کئے!
سو گئے تو مختصر ہے سو رہو!

چوم لو آنکھیں ملو، بستر کرو
یہ اُنہیں کا سنگِ در ہے سو رہو

دو گھڑی یارو کمر سیدھی کرو
صبح پھر لمبا سفر ہے سو رہو

جاگتے ہی جاگ اُٹھتے ہیں گناہ
یہ مؤذن بے خبر ہے سو رہو

رات اب علوی ذرا سی دیر ہے
دُور خوابوں کا نگر ہے سو رہو

ہوشیار بلند شہری

دوہے

بھول ہوئی جو پیار کیا بھی ایشور کی سوگند
گاؤں کے لوگو کیوں کرتے ہو حقہ پانی بند

اپنے گاؤں میں سب سے اونچی مُکھیا کی چوپال
پگ رکھنے کو ترسیں جس پر ہم ایسے کنگال

ہاتھ میں لگ جائے نہ گھنڈا سنبھل کے چار کھاٹ
نہیں تو گوری جیون بھر تُو پھرے گی بارہ باٹ

جیوں جیوں ڈوری ڈھیلی چھوڑ دیوں تیوں تیوں بڑھے ترنگ
جیون ہے اِک نیل گگن پہ اُڑتا ہوا پتنگ

ہنستے ہنستے جو سن لی ہوتی باپ کی کڑوی بات
روز روز نا کھانی پڑتیں گھر والے کی لات

اظہر افسر

ڈرامہ :

آخری خط

افراد :۔ ونے ۔ نریندر ۔ نلنی ۔ بڑھیا ۔ گاڑی بان

(بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز ...... جیسے بیل گاڑی دوڑ رہی ہو۔)

گاڑی بان ۔ بابو — بابو —

ونے ۔ مجھ سے کچھ کہا تم نے۔

گاڑی بان ۔ ہاں بابو! کہاں جانا ہے۔

ونے ۔ ہری پور جانا ہے بھائی —

گاڑی بان ۔ ہری پور تو یہاں سے پکا چھ میل ہے، آؤ — پیچھے بیٹھ جاؤ۔

ونے ۔ تم بھی ہری پور جا رہے ہو کیا؟

گاڑی بان ۔ نہیں، میں تو رادھا نگر جا رہا ہوں۔ ہری پور بیچ میں پڑتا ہے۔ تمہیں چھوڑ دوں گا — آؤ — ایک سے دو بھلے۔ میرا بھی راستہ کٹ جائے گا۔

ونے ۔ (ٹھنڈا سانس لیتا ہے) ہاں بھائی ایک سے دو بھلے۔

گاڑی بان ۔ بیٹھو بیٹھو۔ اچھی طرح بیٹھو۔ کہاں سے آ رہے ہو۔ شہر سے۔

ونے ۔ ہاں شہر سے —

گاڑی بان ۔ کیا کرتے ہو شہر میں؟

ونے ۔ کچھ نہیں —

گاڑی بان ۔ کچھ نہیں؟

ونے ۔ ہاں! بالکل نہیں۔ بے کاری سے تنگ آ کر ہی ہری پور جا رہا ہوں۔

گاڑی بان ۔ ہری پور — کس کے پاس جاؤ گے۔ کوئی رشتہ دار؟

ونے ۔ نہیں۔ بھائی میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ نہ شہر میں نہ کسی گاؤں میں۔

گاڑی بان ۔ (کھانستا ہے) تو پھر یہاں کس کے پاس جا رہے ہو۔

ونے ۔ ایک دوست کے پاس۔ بچپن کا ساتھی ہے۔ آج سے سات سال پہلے الہ آباد یونیورسٹی سے ہم دونوں نے ایک ساتھ بی۔ اے کیا۔ پھر وہ اپنے وطن بنگلور چلا گیا اور میں پونہ۔

گاڑی بان ۔ بنگلور! نریندر بابو کو تو نہیں کہتے —

ونے ۔ ہاں۔ اس کا نام نریندر ہی ہے۔ لکھ پتی باپ کا بیٹا ہے۔ مگر میں بنگلور پہنچا تو معلوم ہوا کہ مہاشے کپڑے کی ملوں اور باپ کے وسیع کاروبار کو چھوڑ کر گاؤں گاؤں مارے مارے پھر رہے ہیں اور جنتا کی سیوا کر رہے ہیں۔ گاؤں سدھار میں لگے ہوئے ہیں۔ ہونہہ —

گاڑی بان ۔ بابو کوئی اور بات کرو۔ رہنے دو اس ذکر کو۔

ونے ۔ کیوں بھائی تم کیوں برا مان گئے۔

گاڑی بان ۔ نریندر بابو کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ سچ پوچھو تو میری زمینیں، کھیت، یہ بیل گاڑی۔ سب کچھ ان ہی کی بدولت ہے۔ آج پچاس برس بعد میں نے لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ بیل گاڑی چلاتا ہوں۔ یہ سب ان کا [illegible]

ونے ۔ نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔

گاڑی بان ۔ [illegible]

دیکھ رہے ہو۔ یہاں بنجر اور پیاس سے تڑپتی ہوئی زمینوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کھیتی باڑی تو کھیتی باڑی ہے۔ گرمیوں میں جب پاس کی ندی سوکھ جاتی تھی تو چار چار میل دور جا کر عورتیں پینے کے لئے پانی لاتی تھیں۔

(بادلوں کی گرج ـــ بارش کا شور)

گاڑی بان۔ اور کبھی جو بارش ہوتی تھی تو اتنی کہ ندی کا پانی آس پاس کے گاؤں میں گھس آتا تھا۔

(بچوں کے رونے کی آوازیں)

لوگ بچوں کو بغلوں میں دبائے سروں پر گھروں کا سامان لئے اپنی جانیں بچانے کے لئے اونچی زمینوں یا پہاڑوں کی طرف دوڑتے تھے ـــ اور طوفان کے بعد جب وہ واپس ہوتے تھے تو واپسی پر گاؤں والوں کو دراڑیں پڑی ہوئی زمینیں، آدھی آدھی گری ہوئی دیواریں اور ڈھے ہوئے گھر ملتے تھے۔

(گھنٹہ بجنے کی آواز)

گاڑی بان۔ یہ نریندر بابو تھے جنھوں نے رتن گڑھ، جام نگر اور ہری پور کے نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور سمجھایا کہ وہ کس طرح گاؤں پر ہر سال اور ہر موسم میں آنے والی آفتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کس طرح وہ ایک ہو کر اپنے گاؤں کو ایک خوشحال اور مثالی گاؤں بنا سکتے ہیں ـــ نئے کنویں کھودے گئے۔ گاؤں کے جو کنویں کم گہرے تھے انھیں اور گہرا کیا گیا۔ جب ہر موسم کے پانی کا بندوبست ہو گیا تو پھر انھوں نے کھیتی باڑی کے ماہر عہدہ داروں کو یہاں کی زمینیں دکھائیں۔ بڑھیا بیج منگوائے اور غریب کسانوں کو قرض پر جانور دلوائے ـــ

(ٹریکٹروں کی آواز)

گاڑی بان۔ جہاں جہاں ہو سکا نئی کلوں سے ہل چلوایا اور اچھی سے اچھی کھاد مہیا کی۔ یہ ہرے بھرے کھیت، یہ لہلہاتی فصلیں اور کسانوں کے مسکراتے چہرے سب انہی کے بدولت ہیں۔ اناج کو ترسنے والے لوگ اب ہزاروں من اناج کا ڈھیر لگا رہے ہیں۔

ونے۔ نریندر نے تو تمہارے اس علاقے میں آکر جادو جگا دیا ہے۔ میں تو اسے بس اپنا ساتھی اور ایک کھلنڈرا نوجوان سمجھتا تھا۔

گاڑی بان۔ یہ راگھو دادا کے کھیت ہیں۔ یہاں سے ہری پور کی بستی شروع ہو رہی ہے۔

ونے۔ تو پھر بھائی بہت بہت شکریہ۔ میں اُترتا ہوں۔

گاڑی بان۔ (ہنسی کے ساتھ) اچھا اچھا۔ پکی سڑک تو آگے سے مڑتی ہے۔ اسی پگڈنڈی سے چلے جاؤ۔ چوپال کے پاس نکلو گے۔ چوپال سے سیدھی سڑک نئی بستی تک جاتی ہے۔ نریندر بابو تمہیں وہیں ملیں گے۔

ونے۔ اچھا ـــ نمستے ـــ

گاڑی بان۔ نمستے۔ نمستے بابو۔

(بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز دور ہوتی ہوئی ختم ہو جاتی ہے)

بڑھیا۔ شہر سے آرہے ہو بیٹا۔

ونے۔ (تھکی ہوئی آواز میں) ہاں ـــ

بڑھیا۔ بہت تھکے ہوئے جان پڑتے ہو ـــ

ونے۔ (لمبا سا سانس لیتا ہے) ہاں۔ بہت تھک گیا ہوں۔

بڑھیا۔ میری ایک بات مانو گے بیٹا۔ میرے گھر چلو۔ پاس ہی ہے۔

ونے۔ (بیزارگی سے) کیا کروں گا ماں تمہارے گھر میں جا کر۔ ابھی مجھے نئی بستی تک جانا ہے۔

بڑھیا۔ چلے جانا۔ ہر سال آج کے دن میں صبح سویرے یہاں آکھڑی ہوتی ہوں اور جو اجنبی سب سے پہلے ہمارے گاؤں میں آتا ہے میں اسے اپنے گھر لے جاتی ہوں ـــ چلو میرے ساتھ کچھ کھا لو ـــ

ونے۔ کچھ کھا لوں ـــ

بڑھیا۔ ہاں جو بھی روکھا سوکھا میرے پاس ہے ۔۔۔ آؤ ۔۔۔
ونے ۔ (قہقہہ لگاتا ہے) پہلے کیوں نہ بتایا ماں ۔۔۔ چلو ۔۔۔ چلو
میں تمہارے حصے کی روٹی بھی کھا جاؤں گا۔ آج بہت بھوکا ہوں۔
بڑھیا۔ (ہنستی ہے) کھا لینا، کھا لینا ۔۔۔ چلو ۔۔۔ (ساز)
نلنی ۔ ماں ۔۔۔ کہاں ہو تم!
بڑھیا۔ یہاں آجا۔ اس طرف ہوں۔ (پھر جیسے ونے سے کہہ رہی ہو) ۔ میری بیٹی نلنی ہے۔
نلنی ۔ اوہ! تو تمہیں آج کا مہمان مل گیا۔
بڑھیا۔ ارے یہ مہمان کہاں۔ یہ تو اپنے ہی گھر والا ہے۔ میں ہونے والی راو دھادیوی کا اکثر ذکر کیا کرتی تھی نا ۔۔۔
نلنی ۔ ہاں ۔۔۔
بڑھیا ۔ یہ انھیں کا لڑکا ہے ونے ۔ خیر تو بتاؤ وجے پور کی کیا خبر ہے۔
نلنی ۔ بہت بری حالت ہے ماں۔ ہیضے سے لوگ دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔ نریندر بابو نے ڈاکٹر کو تو وہاں بھیج دیا۔ شام میں سیوادل کے کچھ لوگ جا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی ۔۔۔

ونے ۔ نریندر کہاں ہے اس وقت۔
بڑھیا۔ تمہیں لالہ دلیپو داس نے تو نہیں بھیجا۔
ونے ۔ نہیں ماں گھبرائیے نہیں۔ میں نریندر کے پتا کا آدمی نہیں ہوں۔ میں تو اس کے کالج کے زمانے کا دوست ہوں۔ روزگار کی تلاش میں ادھر آگیا ہوں۔ کہاں ملے گا نریندر۔
نلنی ۔ ابھی تو وہ یہیں ہیں نئی لبستی میں۔ گھنٹہ دو گھنٹے بعد وجے پور کے لئے روانہ ہو جائیں گے ۔۔۔
ونے ۔ اچھا ماں، میں چلوں ۔۔۔ نمسکار ۔۔۔
بڑھیا۔ جیتے رہو بیٹا ۔۔۔ سکھی رہو ۔۔۔
(ساز ۔۔۔ کھٹا کھٹ کسی مشین کا شور)
ونے ۔ میں نے کہا ۔۔۔ نمستے
نریندر۔ (خوشی میں امڈ آئے ہوئے لہجہ میں) ونے ۔۔۔
ارے تم کہاں؟
(لمبے سانسوں اور پیٹھ پر ہاتھ تھپکنے کی آواز)
او فوہ! کتنے برسوں بعد ملے ہو۔ یہاں کا پتہ کیسے چلا۔
ونے ۔ مل گیا بس ۔۔۔
نریندر ۔ آؤ اس طرف چلیں ورانڈے میں۔ یہاں بڑا شور ہو رہا ہے۔
(ذرا سا وقفہ)
نریندر ۔ ہاں اب بتاؤ ۔۔۔
ونے ۔ میں بنگلور گیا تھا تمہاری تلاش میں۔ تمہارے پتا سیٹھ دلیپو داس سے بھی ملا ۔۔۔
نریندر۔ کیا کہا انھوں نے؟ ۔۔۔
ونے ۔ صرف سیٹھ جی ہی نے کہا۔ تمہارے بھائی نے۔ ماں نے سبھی نے کچھ نہ کچھ کہا ۔۔۔ میں خود بھی بڑی شکایتیں لے کر آیا تھا، مگر یہاں آکر ۔۔۔
نریندر۔ یہاں آکر ۔۔۔!
ونے ۔ سب بھول گیا (دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)
نریندر۔ اور سناؤ کیا کر رہے ہو۔
ونے ۔ (لمبا سانس لیتا ہے) کچھ نہیں۔ اب تم سے کیا چھپاؤں۔ بیکار ہوں اور بیکاری سے تنگ آکر ہی یہاں آگیا ہوں۔
نریندر ۔ پھر تو بہت اچھا کیا جو یہاں چلے آئے۔ میں نے یہاں ۔۔۔
ونے ۔ میں جانتا ہوں۔ یہاں کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔ سچ نریندر میں تو یہاں آکر حیران رہ گیا۔ بچے بچے کی زبان پر تمہارا نام ہے۔ دیوتا کی طرح تمہیں پوجا جاتا ہے۔ تم نے تو ....
نریندر ۔ خیر اب اس ذکر کو رہنے دو ۔۔۔
ونے ۔ زرخیز زمینیں۔ ہرے بھرے کھیت۔ لہلہاتی فصلیں۔ چھوٹے چھوٹے لیکن خوبصورت گھر۔ صاف ستھرے راستے۔ اسکول کھیل کے میدان ..... میرا اپنا سارا بچپن دیہاتوں میں گزرا ہے لیکن یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ گاؤں نہیں ہیں یا ہیں تو پھر کسی خوابوں کی دنیا کے ہیں۔

نریندر — تو پھر کیا ارادہ ہے۔ رہ جاؤ اس فرالبول کی دنیا میں۔ قدم قدم پر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی سچے اور اچھے دوست کی سخت ضرورت ہے۔ پہلے اور دوسرے پانچسالہ پلان کے تحت حکومت کی امداد کے باوجود مجھے یہاں اس علاقے میں بڑی آفتیں جھیلنی پڑیں۔ قسم قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے کوئی تالابوں کی مرمت کو روکتا تھا تو کوئی نئے اسکول کھولنے کا مخالف تھا۔

ونے — لیکن یہ تو خود ان کے فائدے کی چیزیں تھیں۔

نریندر — زمینوں اور سینچائی تک تو بات ٹھیک تھی۔ مگر دواخانوں اور متعدی امراض کے خلاف مہم چلانے کے سب مخالف تھے کیا بچے، کیا بوڑھے، کوئی ٹیکہ نہ لگواتا تھا۔ دھڑا دھڑ لوگ مرتے تھے مگر احتیاط اور انجکشن کے نام سے دور بھاگتے تھے۔ سب سے زیادہ دقت تو مجھے بالغوں کے اسکول کے قیام میں آئی۔ بیشتر بوڑھے پڑھنے کو تیار نہ تھے اور جو تیار تھے ان کا بچے اور نوجوان مذاق اڑاتے تھے۔ پھر بھی میں خوش ہوں کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ لیکن ونے ——

ونے — ہاں ——

نریندر — میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے میرے اپنے سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق بالکل آدھا کام ہے اور باقی آدھے کام کا بار تمہیں سنبھالنا ہوگا۔

ونے — تم نے اس علاقے میں معجزہ ہی کیا ہے۔ ہر گاؤں کو ایک مثالی گاؤں تو بنا ہی دیا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا دیس پھر نئے سرے سے کہیں جنم لے رہا ہے تو وہ ان ہی دیہاتوں میں ہے۔ سچ تم نے ان دیہاتوں کو سورگ کا نمونہ بنا دیا ہے۔

نریندر — ابھی بہت کام باقی ہیں میرے بھائی۔ ابھی ابھی میں نے آس پاس کے گیارہ دیہاتوں کے نوجوان کاریگروں کو فرنیچر بنانے، کپڑا بننے اور چٹائی بنانے کی تربیت دینے ٹریننگ سنٹر کھولا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد یہاں سے جو کاریگر نکلے گا حکومت کی تھوڑی سی مدد کے بعد اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہو سکے گا اور خود کاروبار کر سکے گا۔

(بچھڑے کے ڈکارنے کی آواز)

نریندر — یہاں جانوروں کی حالت بے حد خراب ہے۔ اب بھی ایسے گھر ہیں جہاں جانور اور آدمی ایک ساتھ سوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان جانوروں کے رہنے کے لئے الگ الگ مقام بن جائیں۔ افزائش نسل کے جدید مرکز قائم ہوں۔ ہر سال سینکڑوں جانور وبائی بیماریوں کے شکار ہو جاتے ہیں ان کیلئے کوئی ویٹرنری ہسپتال چاہیئے۔

ونے — ہاں یہ تو ہے۔

نریندر — تم نے دیکھا ہوگا اس علاقے میں بانس کے بید خوب ہیں۔ ٹوکریاں، چٹائی اور کاغذ بنانے کے کئی گھریلو کارخانے کھولے جا سکتے ہیں اور دیہاتیوں کے لئے نئے روزگار فراہم ہو سکتے ہیں۔ میٹرنٹی ہوم اور ایک بڑے ہسپتال کی بھی ضرورت ہے جہاں مریضوں کو نہ صرف دوائیں ملیں بلکہ انھیں رکھ کر بھی علاج کیا جا سکے —— یہ سب تمہیں کرنا ہوگا۔

ونے — مجھے! ——

نریندر — اور کیا۔ بس اب تم یہیں رہوگے اور خود اپنے قول کے مطابق ایک نئے ہندوستان کو جنم دو گے۔

ونے — معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ شادی بیاہ کر کے مجھے یہیں بس جانا ہوگا۔

نریندر — اچھا یہ بات ہے۔ کیا آتے آتے ہی کسی سے ملاقات ہو گئی —— بس ——

ونے — ہوں —— کچھ ایسی ہی بات ہے ——

نریندر — یار بڑے خوش قسمت ہو —— کون ہے وہ ——

ونے — ہے ایک —— تم تو سبھی کو جانتے ہوگے۔

نریندر — اوہو! یہ سسپنس؟ —— کیا نام بھی نہیں پوچھ سکتے!

ونے — اس کا نام ہے ملتی ——

نریندر۔ نلنی ـــ وہ ـــ وہ جو چوپال کے پاس رہتی ہے۔
وِنے۔ ہاں ـــ ارر ـــ وہ ـــ مگر تمہیں کیا ہو گیا۔
نریندر۔ کچھ نہیں ویسے ہی ذرا ـــ کچھ سر میں درد محسوس ہوتا ہے۔
وِنے۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے تمہاری؟
نریندر۔ نہیں نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں ـــ چلو میں تمہیں نلنی کے گھر پہنچا دوں۔
وِنے۔ پہنچا دوں ـــ کیا مطلب؟ ـــ
نریندر۔ میں ایک ضروری کام سے وجے پور جا رہا ہوں۔ اس وقت میں وہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وین یا چلتے ہیں۔ میں تمہیں راستے میں چوپال کے پاس چھوڑ دوں گا۔
وِنے۔ پھر لوٹو گے کب؟
نریندر۔ شاید مجھے دیر ہو جائے۔ اس منڈو کے پیچھے جو چھوٹا سا گھر ہے میں ابھی تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ سمجھو وہ آج سے تمہارا ہے۔
وِنے۔ کیسی باتیں کر رہے ہو ـــ
نریندر۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے ـــ آؤ جلدی کرو ـــ وقت بہت کم ہے۔

(موٹر اسٹارٹ کی جاتی ہے)

(ـــ ساز ـــ)

(موٹر رکتی ہے اور ذرا سی دیر بعد پھر اسٹارٹ کی جاتی ہے ـــ موٹر کی آواز ختم ہونے کے بعد)

نلنی ـــ نریندر بابو تھے۔
وِنے ـــ ہاں وہی مجھے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔
نلنی ـــ ہاں ـــ
بڑھیا۔ کیا بات ہے نلنی ـــ
نلنی ـــ (آواز بھرائی ہوئی ہے) ماں نریندر بابو نے گاڑی گھر کے آگے ٹھہرائی مگر ـــ مگر وہ ـــ وہ اندر نہیں آئے۔
بڑھیا۔ یہ کیسے بیٹا ـــ
وِنے۔ میں بھی نہیں جانتا ـــ شاید خط ہے۔ نریندر نے دیا ہے کہ آپ کو دے دوں ـــ

(کاغذ کی آواز)

نریندر کی آواز ـــ ماتا جی! آپ نے مجھے ہمیشہ اپنے بیٹے کی طرح چاہا ہے۔ ابھی ابھی مجھے تار ملا ہے کہ پتا جی کی حالت بے حد خراب ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہی کہ میں ان کی زندگی ہی میں ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سریتا سے شادی کر لوں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ بڑے بوڑھوں کے حکم ماننے کا اُپدیش دیا ہے۔ شاید بھگوان کو یہی منظور ہے۔ میں بنگلور پتا جی کے پاس جا رہا ہوں۔ نلنی سے کہئے کہ وہ اپنے مقصد کو نہ بھولے۔ جس محنت، ایثار اور تندہی سے اب تک اس نے کام کیا ہے اسی طرح جاری رکھے اور نئے ہندوستان کی تعمیر میں ونے کا پورا پورا ساتھ دے۔ ونے میرا عزیز دوست ہے ـــ ایک بار میں آپ کے چرنوں کو چھونے کے لئے ضرور آؤں گا ـــ مگر ساتھ ـــ ساتھ آپ کی بہو بھی ہو گی سریتا ـــ آپ کا بیٹا نریندر۔

(شہنائی گونج اٹھتی ہے)

(ساز)

(فیڈ آؤٹ)

موپاساں

ترجمہ:۔ سید شبیر حسین

گہنے

موسیو لانتین کی ملاقات ایک چائے کی دعوت میں اس سے ہوئی اور پہلی ہی نظر میں وہ اس کا دیوانہ ہو گیا۔ دیہاتی علاقوں کے ایک ٹیکس کلکٹر کی وہ لڑکی تھی۔ باپ کو مرے چند ہی دن گذرے تھے اور اس حادثے کے بعد ہی ماں نے اس کو شہر لالیا تھا۔ اطراف کے چند گنے چنے گھرانوں ہی تک ان کی رسائی تھی اور یہ تعارف بھی اس امید پر ماں نے پیدا کر لیا تھا کہ بیٹی کے لئے بر ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔ یہ ماں، بیٹی بڑے ہی شریف اور خاموش لوگ تھے۔

لڑکی حسن و حیا کا مجسمہ تھی۔ معمولی سوجھ بوجھ والا بھی جب اس سے شادی کی سوچتا تو ایک حسرت آگیں اطمینان سا اسے محسوس ہوتا۔ اس کے سادہ و پُرکار حسن میں حوروں کی معصومیت پنہاں تھی۔ ایک غیر محسوس اور چھپی چھپی سی مسکراہٹ ہر وقت اس کے لبوں پر کھیلتی رہتی جو اس کی پاکیزگیٔ روح کی آئینہ داری کرتی جو شخص بھی اسے ایک بار دیکھ لیتا بس اسی کے گُن گانے لگتا۔ "خوش نصیب ہے وہ جسے اس جیسی بیوی نصیب ہو جائے"۔

لانتین اس وقت محکمۂ داخلہ میں ہیڈ کلرک تھا۔ تنخواہ کوئی تین سو فرانک ماہوار ہوگی۔ اس نے شادی کا پیش کش کیا۔ شادی ہو گئی۔ زندگی اطمینان و آسودگی سے گزرنے لگی۔ موسیو لانتین کی حسرتوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ بیوی بڑے سلیقہ اور کفایت شعاری سے گھر چلا رہی تھی۔ چاروں طرف بس عیش ہی عیش تھا۔ ساتھ ہی اپنے شوہر پر وہ ہر لمحہ نچھاور بھی رہتی۔ اس کی بانہوں میں مچل مچل جاتی اور اس کے لبوں پر بوسوں کی بوچھار کر دیتی۔ لانتین محسوس کرتا کہ چھ سال پہلے کے مقابل جب اس نے اپنی بیوی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ آج اس کی محبت میں زیادہ خلوص اور گہرائی ہے۔ لیکن بیوی کی دو کمزوریوں سے وہ کچھ بیزار سا تھا۔ تھیئٹر اور گہنے۔ بار بار اس کی سہیلیاں سیٹ محفوظ کرواتیں اور بار بار یہ اپنے خاوند کے سر ہو جاتی کہ اس کے ساتھ چلے۔ چند گنے چنے عہدہ داروں کی بیویوں سے اب اس کی خاصی شناسائی ہو چلی تھی۔ موسیو لانتین کو سیر و تفریح یا تھیئٹر سے یوں ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ دن بھر کی دفتری مشقت کے بعد اسے آرام کی حقیقتاً ضرورت بھی تھی۔ یہ اپنی جان چھڑاتا، التجائیں کرتا کہ کسی ایسی سہیلی کے ساتھ چلی جائے جو واپسی پر اس کو گھر بھی چھوڑتی جائے۔ وہ مچل جاتی اور کہتی آخر کیوں مجھے کوئی گھر پہنچائے۔ اس میں میری بڑی سبکی ہے۔ تمام تو اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ گھر جاتے ہیں اور مجھے کوئی پہنچانے کے لئے آئے یہ مجھے پسند نہیں"۔ وہ طرح طرح سے منتیں کرتا آخر کار کئی دن کی بحث و قدح کے محض لانتین کے آرام کی خاطر وہ راضی ہو گئی۔ لانتین نے اپنی گلو خلاصی دیکھی۔ اس کا شکریہ ادا کیا۔

تھیئٹر کے جنون نے بننے سنورنے کے شوق کو ابھارا۔ شک نہیں کہ اس کا لباس پہلے کی طرح سادا اور بے نمود رہا جس سے اس کے مذاق کی نفاست کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کے حسن کی لطیف رعنائی اور اس کے لبوں میں چھپی ہوئی بے پناہ مسکراہٹوں نے لباس کے حسن سادہ کو اور بھی دوبالا کر دیا۔ تاہم بلور کے بڑے بڑے آویزے اب وہ اپنے کانوں میں لٹکانے لگی تھی جن کی چمک دمک

آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیتی۔ اس کے گلے میں اب بڑے بڑے نقلی موتیوں کی دو تین لڑیاں بھی دکھائی دینے لگیں۔ کلائیوں پر پیلے پیلے چمکتے ہوئے سونے جیسے کنگن بھی اور چوڑیوں میں مختلف وضع کے پھول پتوں والے ہیرے بھی۔ یہ تمام گہنے کچھ اتنے خوبصورت ہوتے کہ اصلی ہیرے بھی ان کے آگے مات کھا جائیں۔

لاتین آرائش و زیبائش کا کبھی دلدادہ نہ تھا۔ بیوی کو اس بناؤ سنگھار میں کبھی دیکھ لیتا تو کہہ اٹھتا "اصلی گہنے جب ہم خرید نہیں سکتے تو ڈارلنگ تمہارا فطری حسن اور نسوانی حجاب و حیا ہی ہمارے لئے سب سے بڑھیا گہنے ہیں اور پھر تمہاری عصمت کے لئے قرآن صفات سے اعلیٰ تر کوئی شئے نہیں۔ یہ خوبیاں بہت کم عورتوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے تمہیں نوازا ہے۔ لاکھوں بناؤ خود ایک تمہاری ذات ہے"۔

ایک میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ جواب دیتی۔ "اس کو میری کمزوری سمجھئے۔ ایک ہی تو شوق ہے۔ تم سے اختلاف مجھے قطعی نہیں لیکن عورت اپنی فطرت کو کیسے بدل دے۔ زیور ہر عورت چاہتی ہے۔ یہ مجھے بہت عزیز ہیں"۔ ساتھ ہی نکلس کی لڑیوں کو انگلیوں پر لے کر وہ کچھ اس طرح گھماتی کہ دیواروں پر ستارے چمک جاتے۔ پھر کہتی ۔ "دیکھو تو ڈارلنگ کتنا پیارا ہے یہ۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے نقلی قسم کھا کر بھی کہیے تو یقین نہ آئے"۔

وہ ہنس پڑتا اور کہتا ۔ "اپنے مذاق میں تم ابھی تک دیہاتی ہو ڈارلنگ بالکل بنجارن"۔

عموماً شام کی چائے کے بعد بقول لاتین اس کی ایک آدھ نکلس ڈبہ کو وہ کھول لیتی اور ان نقلی ہیروں کو اس گہری توجہ سے دیکھتی جیسے سراپا ڈوب کر کسی گہری مسرت کو پی رہی ہے۔ پھر کوئی ایک نکلس یا ایک آدھ مالا کو اپنے شوہر کے گلے میں ڈال دیتی۔ کھلکھلا کر ہنستی پھر ہنستی اور کہتی ۔ "کتنے عجیب لگ رہے ہو۔ بالکل تماشہ!" اس کے بعد اس کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیتی اور سینہ سے پیوست کر دیتی۔

ایک سرد رات آپیرا سے وہ بہت دیر میں لوٹی۔ تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ دوسری صبح سے سخت کھانسی لے دوڑی۔ پڑ گئی اور آٹھ دن بعد نمونیا کے عارضہ سے چل بسی۔

لاتین نے اپنے ہاتھوں سے اسے قبر میں اتارا۔ حادثہ نہایت سخت تھا۔ اس پر غموں کا پہاڑ جیسے ٹوٹ پڑا۔ ایک ہی مہینے میں اس کے بال سفید ہو گئے۔ وہ دن دن بھر روتا۔ بیوی کی موت سے دل پر بڑے گہرے گھاؤ ڈالے تھے۔ ہر نظر اٹھتی اسی کی مسکراہٹ دکھائی دیتی۔ آنکھ بند کرتا تو اس کی مدھر آواز کانوں میں گونجنے لگتی۔ وہ جیتے جی ادھ مرا سا ہو کر رہ گیا۔

وقت گزرتا گیا لیکن اس کے ناسور کا مرہم نہ بن سکا۔ دفتر میں کسی وقت جب اس کے ساتھ کسی مسئلہ پر بحث میں مصروف ہوتے تو کسی گوشہ میں تنہا بیٹھ جاتا۔ اس کے چہرے پر عجیب و غریب خطوط ابھرتے۔ آنکھیں بھر آتیں۔ فوراً یہ خطوط چند نقوش بناتے اور آنکھیں امنڈ پڑتیں۔ اس کی ہچکی بندھ جاتی۔ پھر بھی وہ بالکل اکیلا ہوتا۔

مرحوم بیوی کا کمرہ بالکل مقفل کر دیا تھا۔ کوئی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ خود کبھی کبھی اس کمرے میں تنہا بیٹھے گھنٹوں کسی خیال میں مستغرق رہتا۔ کمرے کی ہر چیز جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ کپڑوں کا وہ جوڑا بھی اسٹانڈ پر اسی حالت میں پڑا ہوا تھا جیسا کہ اس کی بیوی نے اس بدنصیب رات کو اتار کر پھینکا تھا۔

لاتین نے محسوس کیا کہ اس کی تنخواہ مہینہ بھر کے اخراجات کے لئے ناکافی ہو رہی ہے۔ اخراجات کی تنگی سے اسے وحشت سی رہنے لگی۔ اسے حیرت بھی ہوئی کہ وہی آمدنی جس سے پورا مہینہ گزر جاتا تھا اب ضروری اور اہم ضروریات کے لئے ناکافی ہو رہی تھی۔ بیوی کی

سلیقہ شعاری کو یاد کر کے ایک بار پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اتنی قیمتی شرابیں اور ایسی عمدہ غذائیں وہ کیسے مہیا کر سکتی تھی۔

وہ مقروض بھی رہنے لگا۔ ایسے ہی جیسے ہر اوسط آمدنی والا اپنی موقتی ضروریات کی تکمیل کی خاطر تھوڑا بہت ہر مہینہ مقروض ہو جاتا ہے۔ ایک صبح دفتر جانے سے قبل اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک تنکہ بھی نہ نکلا اور تنخواہ کے لئے ابھی ایک ہفتہ پورا باقی تھا۔ سوچا کہ کوئی چیز کیوں نہ نکال دی جائے۔ ساتھ ہی بیوی کے جھوٹے نگینوں والے گہنوں کا خیال آیا۔ یہ گہنے ہمیشہ ہی اسے کانٹوں کی طرح کھٹکا کئے اور اس وقت بھی مرحومہ کی میٹھی یاد میں ان کے خیال نے تھوڑی سی تلخی پیدا کر دی۔

میز پر بکھرے ایک بڑے سے ڈھیر ہی میں دیر تک وہ ٹٹولتا رہا۔ آخری دنوں میں خریداریاں بہت بڑھ گئیں تھیں اور ہر روز کسی نہ کسی نئی چیز کا اضافہ ہوتا ہی جا رہا تھا۔ بالآخر ایک وزن دار نکلس کو اس نے چن لیا۔ یہ اس کی مرحوم بیوی کو بہت عزیز تھا۔ اس کی قیمت لانتین کی رائے میں پانچ یا چھ فرانک سے زیادہ نہ تھی اور یہ قیمت بھی اس نے نکلس کی صناعی اور محنت کے پیش نظر متشخص کی تھی ورنہ نکلس تھا تو نقلی ہی۔

جیب میں نکلس ڈال کر وہ دفتر کی سمت چل پڑا۔ تھوڑے فاصلوں کے سامنے سامنے کسی سستے جوہری کی تلاش میں جا رہا تھا۔ ایک دکان پر نظر پڑی وہ گھس گیا۔ کچھ ٹھنڈک سی اس نے اپنے جسم پر محسوس کی۔ خلاکت کے تلخ احساس نے چٹکی لی۔ ایک نقلی اور گھٹیا سی چیز پیش کرتے ہوئے اسے شرم سی محسوس ہوئی ـــ "کیا آپ اس کی قیمت بتلا سکیں گے؟ دیکھئے تو "ـــ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

دکاندار نے نکلس اٹھا لیا اور آنکھ کے انداز میں اس پر غور کرنا شروع کیا۔ نکلس کو گھمایا، پھرایا، ہاتھ پر وزن کا اندازہ کیا اور اسے ایک عدسہ کے نیچے سے گذارتے ہوئے اپنے ملازم کو آواز بھی دی۔ مخصوص الفاظ میں دونوں کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی۔ پھر نکلس کاؤنٹر پر ڈال کر دونوں نے نگینوں کی تراش خراش پر ماہرانہ انداز میں نظر ڈالنی شروع کی۔ یہ ساری طوالت عمل لانتین کے لئے ایک مسخرے پن سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے چڑ کر جان چھڑانے کے لئے کہا ـــ "میں جانتا ہوں یہ کس مالیت کا ہے اب آپ......" ـــ "بارہ سے پندرہ ہزار فرانک تک اس کے آپ لے سکتے ہیں" ـــ دوکاندار نے گہری آواز میں جواب دیا اور ساتھ ہی کہا ـــ "لیکن خیال رکھئے بغیر رسید خریداری میں اس کو قبول نہیں کروں گا"۔

لانتین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جوہری کا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سنبھل کر اس نے پھر پوچھا ـــ "آپ نے جو قیمت بتلائی ہے وہ واقعی......"

جوہری نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ـــ "کہیں اور بھی آپ دریافت کر لیجئے، ممکن ہے کچھ زیادہ مل جائے۔ میرا اندازہ پندرہ ہزار کا ہے۔ پھر بھی دیکھ لیجئے" ـــ جوہری کا لہجہ خشک تھا۔

لانتین کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ اس کی آنکھیں ہنوز پھٹی ہوئی تھیں۔ کاؤنٹر سے نکلس اٹھا لیا اور باہر نکل گیا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ سڑک پر اترتے ہی اسے ہنسی آگئی۔ اپنے آپ بڑبڑانے لگا ـــ "پاگل معلوم ہوتا ہے گلے مار دیتا تو پتہ چلتا۔ بے وقوف کو اصلی اور نقلی کی تمیز بھی نہیں۔ بڑا جوہری بنتا ہے" ـــ تھوڑی ہی دور چلنے پر ایک اور دوکان پر نظر پڑی۔ وہ داخل ہو گیا۔ اس نے اپنی جیب سے نکلس نکالا ہی تھا کہ دوکاندار خود بول اٹھا ـــ "اوہ یہ تو ہماری ہی چیز ہے۔ ہم نے ہی سپلائی کی تھی"۔

"مجھے اس کی قیمت معلوم کرنی ہے۔ بتلا سکیں گے آپ؟" ـــ لانتین نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ ضرور۔ بیچا تو اس کو ہم نے پچیس ہزار میں تھا" ـــ دوکاندار نے جواب دیا۔ اور ساتھ ہی کہا ـــ "اگر آپ نکالنا چاہیں تو ہم سے ضرور مشورہ کر لیجئے۔ اٹھارہ ہزار فرانک تو اب بھی آپ کو مل سکتے ہیں۔ اور یہ ہمارے قاعدوں کے عین مطابق ہے۔ اس سے بڑھ کر تو کوئی بھی آپ کو نہیں دے سکے گا۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ یہ آپ کے ہاتھ کیسے لگا؟"

لانتین کو اس سوال پر ایک دھکا سا لگا۔ وہ فوراً کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیسے اس کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا — "مگر اس کو آپ اچھی طرح سے دیکھ تو لیجئے۔ یہ نقلی ہے۔ مسالے کا بنا ہوا۔"

"آپ کا نام؟" — جوہری نے لانتین کو نظروں سے تولتے ہوئے پوچھا۔

"لانتین — میں کلرک ہوں محکمہ داخلہ میں اور پتہ نمبر سولہ اودی مارتر۔"

جوہری کچھ دیر اپنے کھاتے الٹنے پلٹنے کے بعد کہا — "یہ نیکلس مادام لانتین کے نام روانہ کیا گیا تھا۔ پتہ نمبر سولہ اودی مارتر اور تاریخ ۲۰ جولائی ۱۸۷۶ء۔"

دونوں کی آنکھیں ملیں۔ جوہری کو نہ جانے کیا کچھ لانتین کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں نظر آیا۔ کلرک کی زبان مفلوج ہو گئی۔ جوہری نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا — "کل تک کے لئے آپ اسے یہاں چھوڑ سکیں گے۔ رسید دئیے دیتا ہوں۔"

"ہاں ہاں" — لانتین نے تیزی سے کہا اور رسید کو جیب میں ٹھونستے ہوئے دوکان سے باہر نکل گیا۔ سڑک کو پار کر کے کسی سمت میں وہ بہت دور تک نکل گیا۔ لوٹ پڑا۔ غلط راستہ پر چل نکلا تھا۔ دوسری سمت میں بہت دور چلنے کے بعد محسوس کیا کہ پھر راستہ بھول گیا ہے۔ پھر پلٹ گیا۔ اس کا دماغ غیر محدود خلاؤں میں اُڑا جا رہا تھا۔ وہ ایک راز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا — اتنے قیمتی گہنے — میڈم لانتین — کلرک کی بیوی۔ سوال یہ تھا کہ یہ گہنے آئے کہاں سے تھے۔ کسی نے تحفہ میں دیا تھا — تحفہ — کس نے؟ اور کیوں؟ وہ اس وقت سڑک کے بالکل بیچوں بیچ تھا۔ اس کے پاؤں جیسے گڑ گئے۔ ایک بھیانک شبہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اور ایک مہیب شکل میں اپنی بیوی اس کے تصورات میں ابھرنے لگی۔ "عورت" "اف" — ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ پیروں تلے زمین دوڑ رہی ہے۔ کانوں میں ایک بے ہنگم شور کی گونج ہے۔ چاروں طرف درخت دھڑام دھڑام گر رہے ہیں۔ اس نے فضا میں دونوں ہاتھ پھیلا دئیے اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کیمسٹ کی ایک دوکان پر اس سڑک کے کنارے اس نے آنکھ کھولی جہاں سے اسے گھر منتقل کر دیا گیا۔

گھر آکر اس نے لنگا لئے اور دن بھر روتا رہا۔ تولیہ سے منہ کو ڈھک لیا تھا کہ سسکیوں کی آواز باہر نہ جانے پائے۔ وہ دن بھر روتا رہا۔ دن گزر گیا۔ رات آئی، رات بھی گزر گئی۔ دوسری صبح وہ نہایت ناتواں اور نزار تھا۔ پچھلے دن کے واقعات و خیالات نے جیسے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کسی کام کے قابل نہیں تھا۔ اس نے دفتر کے منتظم کو چٹھی لکھی۔ پچھلی غیر حاضری پر اظہار معذرت کیا۔ گذشتہ روز اور آج کے لئے رخصت کی درخواست کر دی۔ جوہری کا خیال آیا۔ بڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ لیکن نیکلس کو وہ اس کے پاس چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ کپڑے پہن لئے اور باہر نکل گیا۔ صبح نہایت سہانی تھی۔ خوش پوش بے فکرے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑی سبک اور نرم رفتار سے گذرے چلے جا رہے تھے۔

لانتین پر آج فاقہ کا دوسرا دن تھا۔ اس نے دل ہی دل سوچا یہ بے فکری اور چہل۔ تمام کچھ پیسے سے ہے۔ پیسہ ہو تو سب کچھ ہے اور نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ بڑے گہرے گھاؤ پیسے سے بھر جاتے ہیں۔ پیسہ ہو تو انسان جہاں چاہے چلا جائے۔ چلا جائے بس چلا جائے۔ یوں ہی ہلکی اور سبک رفتار سے۔ کاش اس کی جیب میں بھی پیسہ ہوتا۔ اسے بھوک سی محسوس ہوئی۔ جیبیں خالی تھیں۔ جوہری کا خیال آیا۔ اٹھارہ ہزار فرانک کتنی بڑی دولت۔ تیز تیز قدم ڈالتے ہوئے وہ اس سڑک پر نکل آیا جہاں دوکان واقع تھی۔

کوئی جس۔ فوراً اس نے دوکان میں داخل ہونے کی کوشش کی اور ہر دفعہ کسی پر اسرار قوت نے اس کے قدم روک لئے۔ وہ دو دن سے کچھ کھایا نہ تھا۔ آخری بار لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ دوکان میں داخل ہو ہی گیا۔ دماغ کو سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ دوکاندار نے نظر پڑتے ہی بڑے تپاک سے اس کے آگے کرسی بچھا دی۔ دوکان کے دو اور ملازمین جو کہیں مصروف تھے آگے بڑھ آئے۔ ان کی نظریں

اس کے چہرے پر تھیں۔ لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ۔

"نکلس کے تعلق سے میں نے اپنا اطمینان کر لیا ہے"۔ جوہری نے کہا ـــــ "آپ اسے نکالنا ہی چاہتے ہیں تو قیمت حاضر کردوں وہی جو کل میں نے بتلائی تھی ـــــ"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ ضرور ـــــ!" لانتین نے رک رک کے کہا۔

کاؤنٹر کے خانے سے جوہری نے اٹھارہ نوٹ ہزار کے نکالے۔ گنے اور اس کے آگے بکھیر دئیے۔ لانتین نے رسید پر دستخط کئے اور نوٹ جیب میں رکھ لئے۔ لانتین کے ہاتھ میں قلم کی نوک تھرتھرا رہی تھی۔

وہ دوکان سے نکلنے ہی کو تھا کہ اسے کچھ خیال آیا۔ پلٹ کر اس نے جوہری کو مخاطب کرنا چاہا۔ جوہری کے لبوں پر ابھی تک وہی مسکراہٹ تھی۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ تاہم اس نے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میرے پاس کچھ اور بھی چیزیں ہیں۔ اسی خاتون کی۔ ان کا بھی سودا آپ کروادیں گے ـــــ؟"

"یقیناً محترم! ہم ہر وقت آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں"۔ جوہری نے تعظیماً جھکتے ہوئے جواب دیا۔

ایک ملازم جس کو اپنی ہنسی پر قابو نہ رہا تیزی سے دوکان کے آخری سرے تک کھسک گیا۔ دوسرے نے اپنے چہرے پر ہتھا ڈالی لی اور زور زور سے اپنی ناک جھاڑنے لگا۔ لانتین نے مردہ اور بے جان آواز میں کہا۔ "میں ابھی تھوڑی دیر میں حاضر ہوتا ہوں۔ آپ ذرا ان اشیاء کو بھی دیکھ لیں"۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ رہی تھی اور پیشانی پر باریک باریک بوندیں بھی اُبھر آئی تھیں۔ وہ دوکان سے نکل آیا۔

ایک ٹیکسی لی اور سیدھے گھر کا رخ کیا۔ گھنٹہ بھر میں وہ دوکان پر موجود تھا۔ ابھی تک اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ جوہری نے ہر ایک چیز کو الگ الگ آنکنا شروع کیا اور قیمتیں بھی علیحدہ علیحدہ لکھوانی شروع کیں۔ لانتین نے قیمتوں کے تعین پر حجت شروع کی اور ہر دفعہ اڑ جاتا کہ اصلی قیمت دیکھ لی جائے۔ جیسے جیسے رقم کا ہندسہ اونچا ہوتا جا رہا تھا جوہری کے مقابل لانتین کی آواز بھی اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ قیمتوں کو قطعیت دیدی گئی اور فہرست مرتب ہونے لگی۔

ہیرے کے بُندے	ـــــ ۲۰	ہزار فرانک
جڑاؤ کنگن	ـــــ ۳۵	"
انگوٹھیاں۔ چوڑیاں، ہیرن پن وغیرہ	ـــــ ۱۶	"
نیلم اور زمرد کا مکمل سٹ	ـــــ ۱۴	"
آویزوں دار سونے کا نکلس	ـــــ ۴۰	"

فہرست بڑی طویل تھی اور جملہ رقم ایک لاکھ چھیانوے ہزار قرار پائی۔ دوکاندار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ متروکہ کسی ایسی دولت مند ہستی کا معلوم ہوتا ہے جس نے اپنی ساری پونجی گھتول اور جواہرات میں لگادی ہو"۔

لانتین نے نہایت سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ "متروکہ چھوڑنے والے کی حیثیت کچھ ہی ہو اس سے غرض نہیں۔ سرمایہ لگانے کا یہ ڈھنگ البتہ ضرور قابل غور ہے"۔ کسی اور جوہری سے مشورے کے بعد دوسرے دن آنے کا وعدہ کرتے ہوئے وہ دوکان سے نکل آیا۔

جب وہ سڑک پر پہنچ گیا تو سامنے ایک بہت اونچا مینار دکھائی دیا۔ جی میں آیا کہ مینار کی آخری بلندی تک چڑھ جائے۔ کچھ اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ ہرکیولیس کا مجسمہ کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ مینڈک کی طرح پھدکتے پھدکتے ہرکیولیس کے سر پر

جا بیٹھے۔ ایک عالیشان ہوٹل میں پیٹ بھر کے اس نے کھانا کھایا اور جی بھر کر شراب پی۔ ایک ٹیکسی لی اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں اس کو گھمائے۔ ہر موڑ پر اسے چند بے فکرے نظر آتے جو بڑے اطمینان سے گپ لڑا رہے ہوتے۔ یہ نہایت حقارت سے ان کی طرف دیکھتا اور کہتا ــــ "آسائش و بے فکری میں ابھی خرید سکتا ہوں۔ تمہاری بساط ہی کیا ہے ــــ دو لاکھ کا مالک ہوں۔ دو لاکھ!"

یکایک اسے دفتر کا خیال آیا۔ ڈرائیور نے اسٹرنگ گھما دیا۔ دفتر پر وہ سیدھے سکریٹری کے پاس پہنچا۔ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنا شروع کیا ــــ "استعفاء پیش کرنے کے لئے حاضر ہو گیا ہوں، ... لاکھ کی دولت میرے ہاتھ لگی ہے۔"

اپنے تمام ساتھیوں سے ملاقات کی۔ ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ مصافحہ کیا ... ن سے چند منصوبے سمجھائے اور نکل پڑا۔ شام ہو گئی تھی ایک اعلیٰ درجہ کے ہوٹل میں پھر داخل ہو گیا۔

اپنے سے متصل میز پر ایک بڑے رئیس کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ فوراً اسی سے مخاطب ہو گیا اور بتلایا کہ چار لاکھ کی ایک خطیر رقم کا وہ آج ہی مالک بنا ہے۔

آج پہلا ہی موقع تھا کہ وہ تھیٹر سے بیزار نہیں تھا۔ رات کا باقی حصہ چند عورتوں کی سنگت میں گذار دیا۔

چھ مہینے بعد موسیو لانتیں نے دوسری شادی کر لی۔ بیوی نہایت ہی پاکباز تھی۔ لیکن ساتھ ہی بڑی لڑاکو بھی ــــ پر وہ پہلی سی بات پھر نہ آ سکی ــــ

بقیہ "فلمی گیت" صفحہ ۱۵

الغرض ہر جگہ فلمی گیتوں کا طوطی بولتا ہے اور تو اور بوڑھے مردوں کی ارتھی کے ساتھ ــــ

چل چل رے نوجوان
رکنا تیرا کام نہیں ہے   چلنا تیرا کام

عرس کے موقع پر ــــ   جاناں تمہارے پیار میں شیطاں بن گیا ہوں
کیا کیا بننا چاہا تھا بے ایمان بن گیا ہوں

اور شادی کے موقع پر ــــ   دیکھ ترے سنسار کی حالت کیا ہو گئی بھگوان   کتنا بدل گیا انسان

جیسے ریکارڈ یا بول اور دھنیں بجائی جاتی ہیں۔ دراصل بینڈ والے چند دھنیں یاد کر لیتے ہیں اور انھیں کو ہر موقع بجاتے ہیں۔

عموماً فلمی گیت نہ تو کلاسیکی موسیقی میں بار پاتے ہیں اور نہ ہی ادبی شاعری میں ان کے لئے کوئی مقام ہوتا ہے۔ ان کی حالت چمگادڑوں کی سی ہوتی ہے جنھیں نہ تو ہوا میں اڑنے والے ہی قبول کرتے ہیں اور نہ ہی زمین پر چلنے والے جانور منہ لگاتے ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ فلمی گانوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ عام طور پر مقبول عام گیت برس دو برس عوام کی زبان پر رہتے ہیں۔ پھر وہ ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ ــــ

یَمُوْتُ رَدِیُّ الشِّعْرِ مِنْ قَبْلِ اَهْلِهٖ   وَجَیِّدُهٗ یَبْقٰی وَاِنْ مَاتَ قَائِلُهٗ

(گھٹیا شعر خود بخود مر جاتے ہیں، چاہے ان کا کہنے والا زندہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بڑھیا شعر زندہ رہتے ہیں خواہ ان کا کہنے والا مر چکا ہو)

نقد و نظر

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ــــ ادارہ)

سیرتِ پاک

مرتبہ بشیر محمد شارق دہلوی۔ ناشر نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ سائز ۱/۱۶ روبکار صفحات ۱۹۲ مجلد خوبصورت گردپوش۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر مختصر سی کتاب ہے جو نہایت آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ سیرت پاک پر اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اختصار اور جامعیت میں یہ کتاب منفرد ہے۔ قیمت کے لحاظ سے بھی نہایت مناسب ہے۔ ہر گھر میں اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

(اکبرالدین صدیقی)

امام حسینؑ

مرتبہ شمیم انہونوی۔ ناشر مکتبہ کلیاں لکھنؤ قیمت ۸۰/۔ سائز ۱/۱۶ کراؤن صفحات ۸۰۔

مولف نے حضرت امام حسینؑ کی زندگی کے واقعات ابتدا سے آخر تک تفصیل سے بیان کئے ہیں لیکن کہیں بھی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے یا یہ تاریخی مواد کہاں سے حاصل کیا گیا ــــ ویسے یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے شاید اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ زبان و بیان اور قیمت کے اعتبار سے کتاب ہر گھر میں پڑھے جانے کے قابل ہے۔

(اکبرالدین صدیقی)

دربارِ اکبری

محمد حسین آزاد دہلوی۔ ناشر مکتبہ کلیاں لکھنؤ قیمت بارہ روپے۔ سائز ۱/۱۶ کراؤن۔ صفحات ۹۱۲ مجلد مع گردپوش رنگین جس پر اکبر کے نو رتن براجمان ہیں۔

عرصہ دراز سے "دربارِ اکبری" نایاب ہو گئی تھی۔ ادبی دنیا کو مکتبہ کلیاں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ دربار اکبری شائع کر کے تشنگان علم کی پیاس بجھائی۔ محمد حسین آزاد کی تصنیفات آمیختہ تحریری کتب خانے کی الماریوں میں بند ہو گئی تھیں اور بازار میں کوئی کتاب ملتی نہ تھی۔ بہتر ہوگا اسی طرح مکتبہ کلیاں یکساں سائز کی تمام کتابیں شائع کر دے۔

(اکبرالدین صدیقی)

مثنوی سراپا سوز

تالیف محمد صادق اختر۔ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ناشر مکتبہ کلیاں لکھنؤ۔ سائز ۱/۱۶ کراؤن۔ صفحات ۵۶۔ قیمت ۷۵ نئے پیسے۔

اختر غازی الدین حیدر کے دور کے ملک الشعراء تھے۔ یہ ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ مرزا محمد حسن قتیل کے آگے زانوئے ادب طے کیا۔ جب غازی الدین حیدر بادشاہ ہوئے تو انھیں عہدہ تصنیف و تالیف پر بمشاہرہ ایک ہزار روپے مامور کیا۔ جب غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا تو یہ بے سہارا ہو گئے اور روزی کے لئے ادھر ادھر جدوجہد کی۔ آخر واجد علی شاہ کے دربار میں نوکر ہو گئے اور ۱۸۵۵ء میں وفات پائی۔

یہ کثیر التصانیف ہیں جن میں بعض کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن دیوان اور تذکرہ آفتاب عالمتاب جس میں ۲۶۲ شعرا کا تذکرہ ہے شائع نہیں ہوا۔ یہ دونوں شائع ہوں تو بڑا کام ہوگا اور بہت سی نئی چیزیں منظر عام پر آسکیں گی۔ مثنوی سراپا سوز پہلے دو بار چھپ چکی ہے۔ اب تیسری دفعہ منظر عام پر آ رہی ہے۔ اس مثنوی کا موضوع عشق صادق ہے۔ مثنوی کو جن فنی امور کا حامل ہونا چاہئے وہ اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مقیمی، محمد باقر آگاہ، اور میر تقی میر نے جس انداز میں واقعات کو بیان کیا ہے۔ ایسے ہی واقعات اس مثنوی میں بھی ملتے ہیں۔ بلحاظ زبان و بیان مثنوی قابل مطالعہ ہے۔

(اکبرالدین صدیقی)

طوطی نامہ

حسرت دہلوی ثم لکھنوی مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ناشر مکتبہ کلیاں لکھنؤ۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت دو روپے۔

یہ جعفر علی حسرت کی مثنوی ہے۔ سودا اور میر کی طرح حسرت بھی دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں آ بسے اور اپنی شاعری سے عوام کو ایسا گرویدہ کر لیا کہ شیخ قلندر بخش جرأت اور سودا کے ممدوح نواب محبت خاں بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ اس طرح حسرت استاذ الاساتذہ سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ دنوں حسن علی خاں کے پاس پھر مرزا جہاندار شاہ کی سرکار میں ملازم رہے۔ اپنا آبائی پیشہ عطاری بھی اختیار کیا لیکن آخر عمر میں ترک دنیا کر کے گوشہ نشین ہو گئے اور ۱۷۹۱ء میں رحلت کی۔

طوطی نامہ بہت عام مثنوی ہے۔ ضیاء الدین نخشبی نے فارسی میں باون کہانیاں ۷۳۰ھ میں لکھیں۔ ابوالفضل نے خلاصہ کیا۔ غواصی نے ۱۰۴۹ھ میں دکھنی میں لکھا۔ ۱۰۹۳ھ میں ملا سید محمد قادری نے ۳۵ کہانیوں کا خلاصہ فارسی میں کیا جس کا ترجمہ حیدر بخش حیدری نے گلکرسٹ کی فرمائش پر فورٹ ولیم کالج کے لئے کیا لیکن یہ طوطی نامہ طوطے کی کہانیوں سے مختلف ہے اور طوطی کہانی کے ہیرو کا نام ہے جو راجہ انند کا لڑکا ہے اور جو دکن کی ایک شہزادی شکر پارا کے عشق میں دیوانہ ہوتا ہے اور بہ ہزار خرابی دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس طرح اس کا طربیہ انداز میں اختتام ہوتا ہے۔ قصہ در قصہ بھی اس میں موجود ہے۔

مثنوی گراں پایہ نہیں۔ اس میں سلاست ہے نہ روانی نہ روزمرہ۔ زبان و بیان بھی واجبی واجبی ہے اور مبتدی شاعر کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کی نظر رسا نہیں۔ یہ "سراپا سوز" جیسی مختصر مثنوی کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔　　(اکبر الدین صدیقی)

انشائے ماجد حصہ دوم

مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر صدق لکھنؤ۔ ناشر نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ صفحات ۲۵۰۔ مجلد مع گرد پوش قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

یہ مولانا کے ان مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو صدق میں وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں۔ اس میں ویسے تو ہر مضمون اہم ہے لیکن مرزا رسوا کے قصے، اردو کا اعظ شاعر، پریم چند، مرزا ثاقب، سید جالب اور اکبر الہ آبادی کے علاوہ مرثیہ کے زیر عنوان محمد علی، شوکت علی، قائدِ ملت وغیرہ قابل مطالعہ بلکہ حرزِ جاں بنانے کے لائق ہیں۔ مولانا کی شاعرانہ زبان کا کون معترف نہیں، ان کے تبحر علمی سے کس کو انکار ہے۔ ان کے اسلوب کی کون تقلید کر سکتا ہے۔ جہاں سے پڑھئے وہی دلکشی اور دل بستگی موجود ہے۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔ نسیم بک ڈپو نے مولانا کے اس مجموعہ کو شائع کر کے ادب کی قابل تعریف خدمت انجام دی ہے۔　　(اکبر الدین صدیقی)

جامِ صہبا

ابوالخیر سید ابراہیم حسینی صہبا۔ نشتی پریس حیدرآباد۔ صفحات ۱۹۲۔ سائز ۱/۱۶ کراؤن۔ کاغذ معمولی۔ ٹائٹل دیدہ زیب قیمت دو روپے۔

کتاب جب سامنے آئی تو تیس سال پہلے کا زمانہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ جامعہ عثمانیہ کے درخشاں ستارے۔ موزوم، میر حسن، اشفاق اکبر و فاقانی، مکیش، جی۔ ایم۔ خاں، عباس علی خاں اور محمد بن عمر مرحوم سب ہی تھے۔ صہبا بھی اسی کہکشاں کا ایک ستارہ تھے۔ شعر و شاعری، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور قہقہوں سے اقامت خانوں کے در و دیوار گونج اٹھتے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد　　کہ بہار لیش ندیدیم و بہار آخر شد

یا صہبا کی زبان میں کیوں نہ کہوں کہ ؎　　ہمارے ساتھ بھی دنیا تھی اک زمانہ تھا

ان تیس برسوں میں غم روزگار نے سب کو الگ الگ کر دیا۔ کوئی شمال میں اور کوئی جنوب میں اور صہبا وہاں ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر نے "جائے بودن نیست" کہا تھا۔ ایسی جگہ رہ کر صہبا شعر و شاعری سے دل نہ لگاتے تو کیا کرتے اور یہ سے "وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے" وہ لکھتے رہے اور ڈالتے رہے لیکن شاید اب خیال آیا تو ان گلہائے پریشاں کو جمع کیا اور مجموعے کو صف خوانندوں کے سامنے پیش کر دیا۔

صہبا لکھتے ہیں، مگر اسی وقت جب دل پر کوئی واردات ہوتی ہے۔ رگ جاں کو کوئی مضراب سے چھیڑتا ہے اسی اشعار میں دردِ الم کی تصویریں زیادہ ہیں۔ انھوں نے صرف عشق و عاشقی کی باتیں ہی نہیں کی ہیں بلکہ زندگی کے تجربات کو بھی برتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں گل و گلزار کھلائے ہیں اور سلیس اور رواں بحروں میں اپنے ذوق آگہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک غزل کے تین شعر ہیں ؎

جل نہ جائے آشیاں خود میری آہوں سے کہیں　　　برقِ مضطر آ کبھی جا تجھکو صدا دیتا ہوں میں
اقتضائے بندگی کہئے کہ شانِ عاشقی　　　آپ کی مرضی کے آگے سر جھکا دیتا ہوں میں
کس قدر ہے اس میں لذت کوئی کیا سمجھے اسے　　　اپنے بدخواہوں کے حق میں بھی دعا دیتا ہوں میں

محبوب کی تکمیل تمنا پر کس خوشی کا اظہار ہو رہا ہے ملاحظہ ہو ؎

قریبِ منزل وہ دے رہے ہیں میں ان کے دھوکے میں آ رہا ہوں
خوشی نہ کیوں کر ہو اس کی مجھ کو کہ ان کی حسرت نکل رہی ہے

دو تین شعر اور سنیئے :-

اک آپ کی دنیا ہے بدلتی ہے ہر اک آن　　　اک اپنا جہاں ہے کہ وہی صبح وہی شام
چلو صہبا دہ دیکھو ابر بھی کہسار سے اٹھا　　　سبو کے ختم کرنے کے جام و پیمانے کے دن آئے
غم واندوہ دردِ دیاس و حرماں رنج و غم صہبا　　　چلا ہوں شہر خوباں میں یہ اپنا کارواں لے کر
میکدہ بردوش آنکھیں کہہ رہی ہیں آپ کی　　　مے بھی ہم، مستی بھی ہم، مینا بھی ہم، پیمانہ ہم

صہبا نے چھوٹی بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے، یہاں بھی تیغ بُرّاں اور گوہر آبدار موجود ہیں۔ جام صہبا مطالعے سے تعلق رکھتا ہے اور توقع ہے کہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔　　　(اکبرالدین صدیقی)

خدا اور آدم کے گیت

اثر عبارتی۔ ناشر اردو اکیڈمی لبالہ چھاونی۔ ½ کراؤن۔ صفحات ۴۸۔ مجلد قیمت دو روپے۔

اثر عبارتی نے ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا راز یہ ہے کہ وہ بلند و برتر کارنامے انجام دے اور خدا اور تخلیق کائنات کو سمجھے۔ من و تو کے جھگڑوں سے اٹھ کر وحدانیت کی فضاؤں میں پرواز کرے۔ تنگ نظری، انسان دشمنی اور تنفر سے گریز اختیار کرے اور کسی نے اگر اس پر عمل کیا تو وہ یقیناً بلند مقام کا حامل ہوگا۔ یہ تعلیم کسی ایک مذہب کی نہیں بلکہ ہر مذہب نے یہی تعلیم دی ہے اور اس تعلیم کو جس نے قبول کیا اور اس پر عمل کیا اس نے عظمت انسانی کو بلند سے بلند تر کر دیا۔ اثر کی یہ مساعی مستحسن نظروں سے دیکھی جائیں گی۔　　　(اکبرالدین صدیقی)

اردو انشائیہ

سید صفی مرتضیٰ۔ ایم۔ اے، ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ سائز ½ کراؤن۔ صفحات ۲۰۱۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت تین روپے۔

"ایسے" اردو کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ جب نثر نگاری کو ترقی ہونے لگی تو انشاء پردازی کو بھی زور ہوا۔ محمد حسین آزاد اور ان کے ساتھیوں نے انشائیے لکھے اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کتاب میں مرتب کا مقدمہ ہے جس میں انگریزی "ایسے" کی تاریخ پیش کی گئی ہے اور پھر اردو کے متعدد انشاء پردازوں کے مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ ہر مضمون کے شروع میں مضمون نگار کے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر مختصر ہیں کہ ایک مبتدی کی سیری نہیں ہو سکتی۔ دو صفحے کی گنجائش موجود تھی تو کم سے کم دو صفحے کا مواد بھی دیا جا سکتا تھا۔ مصنفین کی زندگی کے حالات اور ان کی تصانیف کا پیش کرنا ضروری تھا۔ صرف مختصر سی آراء پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اچھے مضامین ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کوشش مستحسن ہے۔　　　(اکبرالدین صدیقی)

اُردو نامہ

(حیدرآباد کی تہذیبی اور ادبی خبریں)

ایڈیٹر: وقار خلیل

(نومبر ۱۹۶۱ء)

یکم نومبر ۔ کتب خانہ اور دارالمطالعہ ادارۂ ادبیات اردو سے ماہ اکتوبر کے ختم تک (۳۲۵) افراد نے استفادہ کیا۔

● مدرسہ دینیہ انیسہ کی جانب سے "یوم انیس" منایا گیا۔

● بزم اردو سیف آباد سائنس کالج کے سالانہ انتخابات میں محی الدین حسن صدر اور مجید اللہ احسن معتمد منتخب ہوئے۔

۲ر نومبر ۔ ادارہ کی کتاب تماشائے اہل ہنر (رشید الحسن) پر کتابی دنیا کراچی (اکتوبر) میں تبصرہ شائع ہوا۔

۳ر نومبر ۔ عزیز احمد بی۔ اے (عثمانیہ یونیورسٹی) کو ادارہ کے مخطوطہ "تذکرہ عطائے تمکین" سے شہزادہ مبارز الدولہ آصف کے حالات اور کلام کی نقل بھجوائی گئی۔

● دفتر روزنامہ ملاپ میں آندھرا اسمبلی کے سلسلے میں آئے ہوئے اردو، ہندی اور تلگو کے شعراء صاحبان کے خیر مقدم میں پر تکلف ضیافت ترتیب دی گئی۔

۴ر نومبر ۔ تلامذہ علامہ نجم آفندی کے زیر اہتمام ماہانہ طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔

● اسٹوڈنٹس مرکزی مجلس تعمیرات کی طرف سے منعقدہ جلسہ میں "اردو غزل کا ارتقاء غالب کے بعد" کے زیر عنوان اختر حسن نے تقریر کی۔ پروفیسر عالم خوندمیری اس جلسے کے صدر تھے۔

● آرٹس اینڈ سائنس کالج سکندرآباد میں پروفیسر فراق گورکھپوری کا خیر مقدم کیا گیا۔

۶ر نومبر ۔ ادارہ کی طرف سے ایوان اردو میں ۶½ بجے شب مہمان شعراء صاحبان کے خیر مقدم میں نمائندہ محفل شعر و سخن صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر سید محمد نے ادارہ کا تعارف کرایا اور وقار خلیل نے شعراء کا خیر مقدم کیا۔ فراق، قتیل شفائی، نشور واحدی، روش صدیقی، غنا کانپوری، رام کشن مضطر، اندر دیو (ہندی) نے پروفیسر اکبر الدین صدیقی کی معیت میں ایوان اردو کے مختلف شعبہ جات کا معائنہ کیا اور محفل شعر و سخن میں اپنا کلام سنایا۔

● اردو مجلس کے زیر اہتمام بمقام "اردو ہال" رائے جانکی پرشاد کی صدارت میں اردو کے مہمان شعراء صاحبان کا خیر مقدم کیا گیا۔ حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اردو نے اردو مجلس کا تعارف کرایا۔ اور شعراء صاحبان نے کلام سنایا۔ محمد منظور احمد معتمد اعزازی اردو مجلس کے شکریہ پر جلسہ برخاست ہوا۔

● ہندی پرچار سبھا کی طرف سے اردو، ہندی اور تلگو کے مہمان شعراء کا خیر مقدم کیا گیا۔ پنڈت ونایک راؤ ودیالنکار نے اس تقریب کی صدارت کی۔

۷ر نومبر ۔ اردو دوستوں کے اجتماع میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے ابوالخیر صہبا کا مجموعۂ کلام "جام صہبا" کی رسم اجرا انجام دی۔ مخدوم محی الدین اور مغنی تبسم نے تقریریں کیں اور شعراء صاحبان نے کلام سنایا۔

● دفتر روزنامہ ملاپ میں دیوالی کی رات محفل شعر و سخن مخدوم محی الدین کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مقامی شعراء کے علاوہ فراق گورکھپوری اور رام کشن مضطر نے کلام سنایا۔ علاء الدین حبیب ایڈیٹر ادبی سیکشن ملاپ نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔

۸ر نومبر ۔ ماہنامہ صبح امید بمبئی (نومبر) میں ادارہ کی کتاب "دکھنی ہندو اور اردو" مرتبہ نصیر الدین ہاشمی پر تبصرہ شائع ہوا۔

۱۱ر نومبر ۔ مجلس رفیقان ادب کا افتتاحی ماہانہ اجلاس اور طرحی مشاعرہ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر موصوف نے اردو غزل پر مقالہ اور مقامی شاعروں نے کلام سنایا۔

● انجمن ارتقائے ادب کے پہلے ادبی اجلاس میں صادق نوید، یار جانی اور یوسف انصاری نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

۱۲ر نومبر ۔ ادارہ کے کتب خانے سے پروفیسر حسینی شاہد اور محمد منظور احمد (اردو مجلس) نے علی الترتیب مخطوطات اور اصغر گونڈوی کی شاعری پر استفادہ کیا۔

● مشہور مزاح نگار مرزا عصمت اللہ بیگ کی یاد منائی گئی۔ کے۔ ردی رنگا ریڈی ڈپٹی چیف منسٹر نے اس تقریب کا افتتاح کیا۔ ...نرسنگ راؤ

وزیر حکومت مقامی کی صدارت میں پروفیسر سروری، عالم خوندمیری، جانکی پرشاد، شاہد صدیقی اور نصیر الدین ہاشمی صاحبان نے عصمت پر مضامین سنائے۔ رحمت علی مدیر ترجمان وقت کے شکریہ پر یہ اجلاس برخاست ہوا۔

۱۸ نومبر ــــ شہر ادب کا ماہانہ طرحی مشاعرہ ڈاکٹر اسد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مقامی شعراء نے کلام سنایا۔

● اردو ہال میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے فلم مغل اعظم کے فنکاروں کا خیر مقدم کیا گیا۔ کے آصف اور ساحر لدھیانوی نے بھی اردو دوستوں سے خطاب کیا اور اردو ہال کا معائنہ کیا۔ شاہد صدیقی نے فلمی فنکاروں کا تعارف کرایا اور پروفیسر حبیب الرحمٰن نے انجمن کی کارکردگی سے واقف کرادیا۔

● بزم ملاپ اوپل کلاں کی طرف سے محفل شعر و سخن کے بلکشمی نارائن رکن ملدیہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

۲۰ نومبر ــــ ادبی سماج کا پندرہ روزہ اجلاس طالب رزاقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جاوید حیدرآبادی اور وقار فاروق نے طنزیئے، برق یوسفی اور یوسف نظر نے نظم اور غزل تنقید کے لئے پیش کئے۔

● ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ہر سال منائے جانے والے یوم محمد قلی قطب شاہ کی ابتدائی تیاریوں کے آغاز کی تفصیلات برائے اشاعت جاری کی گئیں۔

۲۱ نومبر ــــ عبدالقدوس قصید نظامی رکن ملدیہ حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال کر گئے۔ مرحوم سخنستان کے رکن شاعر تھے۔

۲۳ نومبر ــــ نیو سائنس کالج میں "اردو کے موجودہ مسائل" کے زیر عنوان مخدوم محی الدین نے طلباء سے خطاب کیا۔ امین احمد لکچرار اردو نے مخدوم کا خیر مقدم کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

۲۴ نومبر ــــ ابن فرید ایڈیٹر ماہنامہ ادیب علی گڈھ نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

● پروفیسر سروری نے ریڈی ویمنس کالج میں بزم اردو کا افتتاح کیا۔

۲۵ نومبر ــــ بزم جیون کا ادبی اجلاس پروفیسر سید محمد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ آمنہ ابوالحسن نے افسانہ اور شعراء نے طرحی کلام پیش کیا۔

۲۶ نومبر ــــ ادارہ کی کتاب کلمۃ الحقائق مرتبہ پروفیسر اکبر الدین صدیقی پر روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد میں تبصرہ شائع ہوا۔

● بزم ادب کی ماہانہ ادبی محفل پروفیسر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

● اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس رائے جانکی پرشاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سہیل اس لاہوری نے سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کی شاعری اور شخصیت اور بانو طاہرہ سعید نے اردو کی شاعر خواتین کے زیر عنوان مضامین اور شعراء صاحبان نے کلام سنایا۔ محمد منظور احمد (معتمد اردو مجلس) کے شکریہ پر یہ جلسہ برخاست ہوا۔

۲۸ نومبر ــــ اسحاق الیوبی (پرلیس انفارمیشن بیورو۔ حیدرآباد) نے اردو اخبارات و کتب کی حیدرآباد میں ہونے والی نمائش کے سلسلہ میں ادارہ کی کتب [illegible] کے بارے میں ضروری تفصیلات حاصل کئے۔

● نکلیہ لسانیات اور سکندرآباد کالج کے طلباء کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ ہوا۔ پروفیسر سروری اور حمید شطاری نے حکم کے فرائض انجام دیئے۔

۲۹ نومبر ــــ بزم سعدی کے ماہانہ ادبی اجلاس اور طرحی مشاعرہ میں عیاذ انصاری نے پرمغز مقالہ اور شعراء صاحبان نے طرحی کلام سنایا۔ قمر ساحری معتمد بزم سعدی نے شکریہ ادا کیا۔

● دسواں بین کلیاتی ادبی اجتماع مخدوم محی الدین کی صدارت میں بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ طلباء نے مضامین اور کلام سنائے۔

۳۰ نومبر ــــ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے رانا بھگوان داس پرنسپل عبدالحق اورینٹل کالج نصیرآباد (پاک) اور پرنسپل سید محمد فضل اللہ (وینکٹیشورا یونیورسٹی۔ تروپتی) کو علی الترتیب ادارۂ کے اردو امتحانات اور محمد حسین آزاد کی شخصیت اور فن کے تعلق سے استفسارات پر مواد بھیجا گیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

جاری شدہ ۱۹۳۸ء ——— فون نمبر ۳۵۲۰۹

ماہنامہ

سب رس

ادارہ سن ۱۹۶۱ء نمبر

جلد نمبر (۲۵) شمارہ نمبر (۳) — مارچ ۱۹۶۲ عیسوی

زر سالانہ ہندوپاک سے : چھ روپے
ششماہی " " : تین روپے
سالانہ بیرون ہند سے : دس روپے

قیمت فی پرچہ: (۵۰) نئے پیسے

ادارہ نمبر: (۷۵) نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپ کر "ایوان اردو" خیریت آباد حیدرآباد سے شایع ہوا۔

فہرست

وقار خلیل

ادارۂ ادبیاتِ اُردو

ایک سرسری جائزہ

ہندوستان میں اُردو کی ترویج و بقا کے لئے گزشتہ نصف صدی سے جس قدر سرگرم کام ہو رہا ہے۔ اس سے اُردو جاننے بولنے اور سمجھنے والے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں۔ ندوۃ المصنفین، انجمن ترقی اُردو ہند کے دوش بدوش حیدرآباد میں جنوبی ہند کی مسلمہ مرکزیت کی صورت میں ادارۂ ادبیات اُردو نے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے ٹھیک پندرہ سال بعد ۱۹۳۱ء کی مبارک و مسعود گھڑیوں میں آج سے اکتیس سال قبل جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل، روشن دماغ، جیالوں نے ایک ایسے عہد میں اس ادارے کی بنا ڈالی جبکہ ہر کام سرکاری امداد اور تائید ہی سے چلتا تھا لیکن یہی ادارہ ایسا نظر آتا ہے جس کے قیام میں کسی سرکاری یا درباری اعانت یا سرپرستی کو دخل نہیں رہا ہے۔ محدود سرمایہ کے ساتھ اس ادارے کی تشکیل کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر زور صاحب کے دل میں پیدا ہوا۔ انھوں نے یورپ سے واپسی کے بعد محسوس کیا کہ حیدرآباد کے مصنفین، مؤلفین اور جامعہ کے فارغ التحصیل طلباء کے لئے ایک ایسے علمی مرکز کے قیام کی ضرورت ہے جو صحت مند بنیادوں پر اُردو کی ترویج و اشاعت میں حصہ لے سکے۔ ان حالات و عوامل میں ادارہ نے جنم لیا۔ اولاً تو اس کی سرگرمیاں محدود رہیں۔ جب جامعہ کے نوجوان مصنفوں میر حسن، مخدوم محی الدین، سعادت علی رضوی، ابوالفضل، محسن بن شبیر وغیرہ کا تعاون حاصل ہوا تو رفتہ رفتہ یہ ادبی ادارہ، علمی، تعلیمی، ثقافتی، تہذیبی اور تخلیقی سرگرمیوں کے لئے روشنی کا مینار بن گیا دکنی ادب کے قدیم مخطوطوں کو جمع کیا جانے لگا۔ کتب خانہ کے قیام، اردو تعلیم بالغان کی وسیع و مہتم بالشان مہم کی تسخیر ہوئی ریاست حیدرآباد کے مختلف اضلاع میں اپنے امتحانات کے ذریعہ سے اُردو کا ذوق بڑھانے اور ملک کی جہالت کو دور کرنے میں ادارہ نے بڑا حصہ لیا اردو امتحانات کے ذریعہ ادارہ نے مناسب اور مفید نصاب تیار کروائے اور ان کی سندیں بڑے پیمانے پر جلسے منعقد کر کے تقسیم کراتا رہا اور خوشی کی بات ہے کہ ان امتحانوں میں شہر حیدرآباد کے علاوہ اضلاع سے بھی لوگ شریک ہو رہے ہیں۔ اگرچہ پہلے جیسی تعداد باقی نہیں رہی جو ہزاروں سے گزر چکی ہے، تاہم موجودہ دور میں یہ بھی غنیمت ہے۔

اس طرح ادارہ نے اپنی مطبوعات، رسالہ سب رس (مجریہ ۱۹۳۷ء) اور تعلیم بالغان کے ذریعہ ریاست حیدرآباد کے اُردو بولنے والے ہزاروں انسانوں کے ادبی اور تعلیمی ذوق کی تسکین کے سامان مہیا کئے۔

ملک کی تقسیم اور حیدرآباد پر پولیس ایکشن (۱۹۴۸ء) کے بعد کے انتشاری دور میں جب کہ طوفان خیز سیاست کے سبب اردو زبان اور اس کا کلچر متاثر ہو رہا تھا تو ایسے ناسازگار حالات میں بھی ادارہ نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس ادارہ نے اپنا دامن سیاست سے ہمیشہ بچائے رکھا۔

۱۹۵۵ء میں ادارہ کی سلور جوبلی منائی گئی اور ۱۹۵۸ء میں ریاست حیدرآباد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے ادارہ کی اپنی عمارت "ایوان اردو" کا سنگ بنیاد رکھا۔ معتمد عمومی ادارہ جناب ڈاکٹر زور صاحب کی رفیقۂ حیات محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ نے ادارہ کے لئے زمین کے فیاضانہ عطیہ سے طوفان میں گھری ہوئی اس ناؤ کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ حیدرآباد جو اپنی علم دوستی، علم پروری اور فیاضی کے لئے ضرب المثل رہا ہے۔ اس ادارہ کے لئے تھوڑی سی زمین تک دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ نوابوں اور رئیسوں نے سبز باغ دکھائے۔ جب حکومت نے دھمکا یا کہ اگر ادارہ فوراً اپنی عمارت کی تعمیر کے لئے زمین نہ خریدے تو پھر اکاؤنٹنٹ جنرل کے کھاتے میں اس کی جمع کرائی ہوئی رقم بیک جنبش قلم ضبط ہو جا سکتی ہے ایسے میں بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور کا سہارا اردو دنیا کی سربلندی کا موجب ثابت ہوا۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں کشمیر کے وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد صاحب نے اس ادارہ کی عمارت "ایوان اردو" کا افتتاح فرمایا۔ اور جب سے ادارہ اپنی عمارت میں کام کر رہا ہے حکومتی امداد اور اردو کی ترقی و ترویج سے عملی محبت رکھنے والے افراد کی سرپرستی اور ڈاکٹر زور صاحب کی سچی لگن اور جنون تک پہنچی ہوئی جد وجہد نے آج اس ادارہ کو صاحب عمارت بنا دیا ہے، اردو جو شکروں، قبیلوں، جھونپڑوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی آج کے اس جمہوری اور ترقی پذیر سائنسی دور میں صاحب ایوان ہی فخر سے کہہ رہی ہے۔

ع:— کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

ادارہ کی تعمیر شدہ دو منزلہ عمارت "ایوان اردو" کا نقشہ ملک کے ممتاز آرکیٹکٹ جناب فیاض الدین صاحب، ٹاؤن پلانر کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ ایوان اردو کی تعمیر میں اردو زبان کے مزاج اور اس کے کلچر کو پیش نظر رکھا گیا۔ ایلورہ قطب شاہی، بہمنی اور مشرقی طرز تعمیر کی جھلکیاں اس کے در و بام سے نمایاں ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو نے اپنی سرگرمیوں کو ۵ مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر شعبہ کو اوج کمال تک پہنچانے میں قابل و ذہین دماغوں نے اپنا خون جگر دیا۔ آج یہ ادارہ شعبۂ زبان، شعبۂ تنقید و تحقیق، شعبۂ تالیف و ترجمہ، شعبۂ تاریخ و تمدن دکن، شعبۂ شعر و ادب، شعبۂ سائنس، شعبۂ ادب نسواں، شعبۂ ادب اطفال، شعبۂ امتحانات (تعلیم بالغان) شعبۂ کتب خانہ، شعبۂ انسائیکلو پیڈیا کے ساتھ اپنے رسالہ سب رس اور کلچرل تقریبات کے علاوہ سنہ ۱۹۶۱ء سے شعبۂ نشر و اشاعت و مطبوعات کے تحت کشمیر میں بھی اپنے کام کو پھیلا رہا ہے۔ جناب ادارہ کے بانی و معتمد ڈاکٹر زور صاحب بہ حیثیت صدر شعبۂ اردو جامعہ کشمیر متمکن ہیں اور ان کاموں کی بھی بنفس نفیس نگرانی فرماتے ہیں۔

ادارہ نے اب تک چھوٹی بڑی جملہ (۲۸۵) کتابیں شائع کی ہیں۔ جن میں بلند پایہ تحقیقی، علمی و ادبی، تاریخی، سائنسی و تفریحی، بچوں، خواتین اور تعلیم بالغان کے مطبوعہ سبھی تصانیف و تالیف شامل ہیں جن میں قلمی کتابوں کا تعارفی، تحقیقی اور بے مثل تذکرہ مخطوطات ادارہ کی پانچ جلدیں، اور ایوان اردو کے نوادر کا مبسوط تذکرہ بھی شامل ہے، جسے ڈاکٹر زور صاحب نے مرتب فرمایا ہے یہ ادارہ اگر کچھ نہ کرتا اور صرف مخطوطات کا تذکرہ ہی ترتیب دے دیتا تو بھی اس کی بقا اور سربلندی کے لئے کافی تھا۔ ڈاکٹر زور نے دو ہزار کے قریب قلمی کتابوں کو اپنی عالمانہ اور ناقدانہ انداز تحریر سے حیات جاوید بخشی ہے جو اس سے پہلے بے اعتنائی و کرم خوردگی کے باعث تلف ہو رہی تھیں یا پڑی سڑ رہی تھیں! دیمک کی غذا بن رہی تھیں، اردو کے اس عظیم ذخیرے کو چھپے منظر پر لا کر یہ کہ اردو کی تاریخ میں پہلی مرتبہ روشنی میں آنے کے بعد آج ہم دیکھتے ہیں کہ ان کتابوں کی افادیت سے پورا ملک استفادہ کر رہا ہے اور آئے دن دور دور سے ریسرچ اسکالر یہاں آ کر اپنے علم و آگہی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ کیا دکنی، کیا فارسی، کیا عربی، کیا اردو، کیا پنجابی، کیا ہندی غرض قدیم و جدید ہی اہم کتابیں ایک بار پھر اس مسیحا نفس فرد فرید کی مسیحائی کے سبب زندہ ہو گیا۔

ادارہ کے تاریخی اور جنوبی ہند کے اس سب سے بڑے کتب خانہ میں، اردو، فارسی اور عربی کی پچیس ہزار مطبوعہ اور پانچ ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں بھی ہیں جن میں صدیوں پرانے مخطوطات اور ایک صدی سے زیادہ قدیم مطبوعہ کتابیں اور رسالے ہیں۔ جن کی فہرستیں چھپ چکی ہیں۔ دارالمطالعہ ایوان اردو میں سب اس کے تبادلے میں آنے والے دو سو کے قریب رسائل و جرائد سے ہر روز کئی ادب دوست استفادہ کرتے ہیں۔

تاریخی آثار کی حفاظت اور قطب شاہی تہذیب و تمدن کے باب میں بھی ادارہ تیزی سے سرگرم عمل ہے ہر سال یوم قلی قطب شاہ کا انعقاد کئی علمی کاموں کا باعث ہوتا ہے۔ ادارہ کے اردو میوزیم میں کئی نادر چیزیں محفوظ ہیں جن سے اردو زبان و ادب اور اس کے کلچر کا تدریجی ارتقا ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جہاں ادارہ نے اردو کے مرحوم ادیبوں۔ شاعروں اور تاجداروں کے مقابر و اندوختہ کی حفاظت کا انتظام کیا ہے وہیں اس کی طرف سے موجودہ دور کے ادیبوں شاعروں کی ہر ممکنہ معاونت و امداد کے لئے سرکاری و غیر سرکاری ہر سطح پر بھرپور اور کامیاب نمائندگیاں بھی کی گئیں اور کی جاتی رہیں گی۔ کئی فن کاروں کو مرنے سے بچایا گیا اور سرکاری وظائف دلائے گئے۔

قیام آندھرا پردیش کے بعد ادارہ کی طرف سے تلگو دان حضرات کو مفت اردو سکھانے کیلئے اپنے خدمات پیش کرنی پڑیں۔ اور اردو کے قابل حضرات کو معاوضہ دے کر پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ "اردو پڑھائی گھر" اسکیم کے تحت شہر حیدرآباد میں ادارہ کی امداد پر کئی مراکز کام کر رہے ہیں۔

غرض اس ادارہ کے خدمات کے بارے میں ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کیلئے!

صٓ سے آگے (تبصرہ کلمۃ الحقائق)

کئی محاسن کے سبب ادبیات سے شغف رکھنے والوں کے لئے مفید قرار پاتی ہے ایک سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس کتاب سے اردو زبان کی قدامت اور ابتداء کا پتہ چلتا ہے اور پھر خواجہ بندہ نواز کے رسالہ "معراج العاشقین" کی طرح اس کتاب کی بھی مسلمہ افادیت ہے۔ اسی افادیت کے مدنظر اس بات کی ضرورت ہے کہ ادبیات کے طالب علموں کے لئے یہ کتاب نصاب میں شامل کی جائے۔

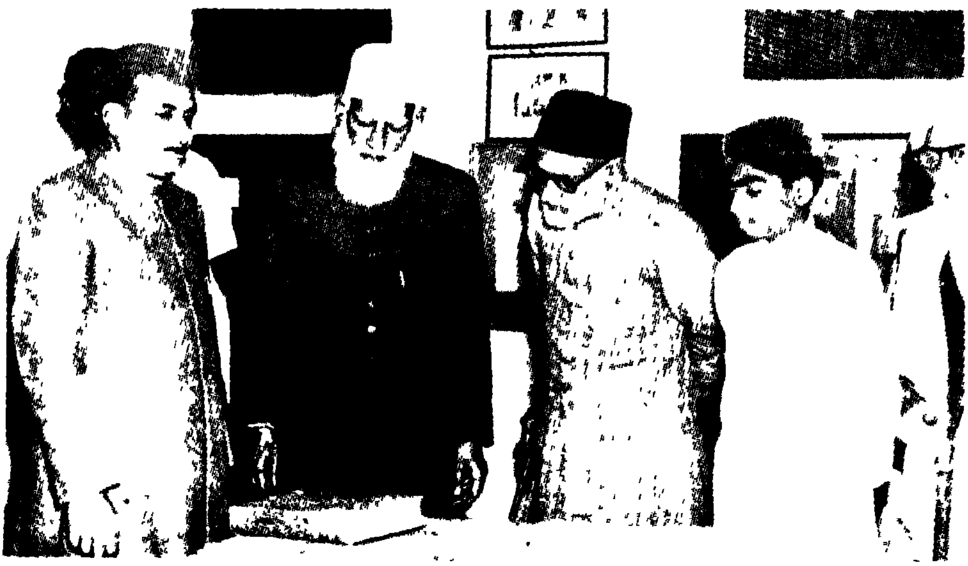
مرتب نے سلیقے اور ذہانت کے ساتھ فاضلانہ و لمبا مقدمہ سپرد قلم فرمایا ہے اور ہر لحاظ سے مکمل و دیدہ زیب بھی بنایا ہے، بظاہر یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے خشک اور خالص علمی و مذہبی ہے مگر بین السطور حسن تہذیب، کلچر اور زبان کی روح پوشیدہ ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے فی زمانہ ہم اس کی افادیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کی کوششوں کی قدر و منزلت کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارا وہ ادبی سرمایہ جو آج مخطوطات کی شکل میں دیمکوں کی غذا بنا ہوا ہے آنے والی نسلوں کے لئے کارآمد اور نشان راہ ثابت ہو اور اسلاف کے عہد ساز فکر و فن سے آج کا دور بھی روشنی اور حرکت حاصل کرے۔

راہ بھارت حیدرآباد ۱۷ ستمبر ۱۹۷۱ء

سردار کے ۔ یم ۔ پانیکر وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی «ایوان اُردو میں»



باقر فریدی ، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ، پروفیسر ہارون خاں شروانی ، پروفیسر سید علی اکبر
سردار پانیکر، ڈاکٹر ڈی ۔ یس ۔ ریڈی ۔ ڈاکٹر زور



مولانا حفظ الرحمان صدر جمعیتہ العلماء ہند (دہلی) ایوان اُردو میں ۔ ڈاکٹر زور معتمد ادارہ موصوف کو
اردو میوزیم کا معائنہ کرا رہے ہیں ۔ قمر فاروقی صاحب صدر ریاستی جمعیتہ العلماء بھی ہمراہ ہیں ۔



ات کے گورنر نواب مہدی نوار جنگ ایوان اُردو میں۔ ڈاکٹر زور، نواب صاحب، زین یار جنگ بہادر،
بیگم مہدی نواز جنگ اور ڈاکٹر غلام یزدانی (کرسیوں پر)



ممتاز مورخ ڈاکٹر تارا چند (یم۔ پی)
ڈاکٹر زور اور پی، ہنمنت راؤ (یم، پی)
کے ہمراہ ادارے میں

سردار کے۔ یم۔ پانیکر ایوان اُردو کے میوزیم میں
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، ڈاکٹر ڈی۔ یس۔ ریڈی
اور ڈاکٹر زور نظر آرہے ہیں۔

تاثرات

[دورانِ سال ۱۹۶۱ء میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے بارے میں جن اصحاب نے اپنے تاثرات تقریریا تحریر میں ظاہر کئے یا شائع فرمائے، ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں!]

جناب ریورنڈ جان، اے۔ سبحان

بشپ میتھوڈسٹ چرچ شمالی ایشیا، حیدرآباد

ادارہ ادبیات اردو کی معرفت آپ کی زیرقیادت جو خدمات قوم کے بزرگوں کی بالعموم ہورہی ہے اور جس حسن وخوبی کے ساتھ ایام ماضی کی یاد تازہ کرکے لوگوں کے دلوں میں قوم کے بزرگوں کے نیک کارناموں اور ان کے اخلاق و تہذیب کا احیا۔ آپ اور آپ کے معاونین کر رہے ہیں، تاریخ حاضرہ کا ایک عدیم المثال کارنامہ ہے۔

جزاکم اللہ فی الدارین خیرا۔ (۱۱۔ جنوری ۱۹۶۱ء)

○

حضرت جوشؔ ملیح آبادی (کراچی)

آج جبکہ اُردو کا بیڑا غرق کر دینے کی خاطر، دنیا کے ساتوں سمندر حملہ آور ہو چکے ہیں، "ادارۂ ادبیات اُردو" ایک سنگین بند کی حیثیت سے اُن کا مقابلہ کر رہا ہے اور زورؔ صاحب کی قوتِ بازو نا خدائی کر رہی ہے۔

(۱۴۔ جنوری ۱۹۶۱ء)

○

حضرت تلوک چند محرومؔ (دہلی)

مجھے کامل یقین ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو، زورؔ صاحب کی قیادت میں اُردو کو اپنا مقام دلانے میں کامیاب ہوگا، خدا کرے ایسا ہی ہو۔

بنا کر زورؔ نے "ایوان اُردو"
بڑھا دی ملک بھر میں شان اُردو

(۱۵۔ جنوری ۱۹۶۱ء)

جناب شان الحق حقی
معتمد ترقی اردو بورڈ (کراچی)

ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے بانی جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے غائبانہ تعارف کی بنا پر ان کی جو قدر و منزلت میرے دل میں تھی وہ اب گہری ارادت اور ایک ایسے تعلق میں متبدل ہو گئی ہے جس میں عشق کے آثار محسوس ہوتے ہیں۔ میں ان کی عظمت کا ہمیشہ سے معترف تھا، لیکن ان کے خلوص اور حسن عمل کے ان کرشمات کو آنکھ سے دیکھا تو ان کی شخصیت کی زیارہ مکمل تصویر نظر کے سامنے آئی۔ جو میری نظر میں بڑی محبوب، بڑی حسین اور قابل پرستش ہے۔

میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں، دکن میں ایوان اردو کا وجود اور خدمت اردو کی وہ روایت جو اس ادارے کے ساتھ مخصوص ہو گئی ہے، اردو کی بقا کی ضامن ہے۔

(۱۹ - جنوری ۱۹۶۲ء)

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

مجھے آج پہلی بار ادارۂ ادبیات اردو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ خدا کرے کہ یہ آخری بار نہ ہو۔ فدایان اردو کے لئے یہ ادارہ گوشۂ جنت سے کم نہیں، یہاں سیکڑوں حوریں کاغذی پیرہن زیب تن کئے آپ کی تفریح اور دلجوئی کی خاطر موجود ہیں۔ اور منتظر ہیں کہ آپ ان سے ہمکلام ہوں۔ اس جنت کے دربان ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہیں جن کا خدائے تعالیٰ نے نگاہ خاص سے انتخاب کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس دربان کا شیوہ تخصیص و امتیاز نہیں، بلکہ جو راہ پر کھڑے ہو کر یاران نکتہ داں کو صلائے عام کی صدا دیتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کی جو خاموش مگر ٹھوس خدمت کی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں، سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر زور کی درازیٔ عمر کی دعا مانگوں یا کہ "ادارۂ ادبیات اردو" کی۔ جب ذرا اور غور سے سوچتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، ایک زندہ رہا تو دوسرا بھی دائم و قائم رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود میں تو ڈاکٹر زور ہی کے حق میں دست بدعا ہوں گا۔ اس لئے کہ اگر ڈاکٹر زور سلامت رہے تو ایک کیا ایسے کئی اداروں کی تخلیق ممکن ہو گی۔

(راج بھون، حیدرآباد - یکم فروری ۱۹۶۱ء)

جناب نواب محمد ماندور خاں (جاگیردار)

ادارۂ ادبیات اردو قائم کر کے محترمی ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے حیدرآباد میں زبان اردو کے محافظوں کی صف اول میں شامل کر لیا ہے۔ اس دنیائے فانی میں کون ہمیشہ رہا۔ البتہ اس کی یادگار ہمیشہ اس کے نام سے باقی رہتی ہے، چنانچہ ایوان اردو جب تک قائم رہے گا بانیٔ ادارہ زور صاحب کو لوگ یاد کرتے رہیں گے۔ نواب سالار جنگ مرحوم نے قدیم کلکشن کو یکجا محفوظ کر کے جیسا حیدرآباد کے نام کو تمام دنیا میں اُجاگر کیا ہے۔ اسی طرح زور صاحب نے اردو دوستی کے جذبہ کا عملی اظہار ایوان اردو میں قدیم مخطوطات اور مختلف قسم کے نوادرات جمع و محفوظ کر کے کیا ہے۔ میں جناب زور صاحب کو اس

مستحسن اقدام اور اس کی تکمیل پر مبارک دیتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت سے بہ دیر سلامت رکھکر زیادہ سے اردو کی اور ملک کی خدمت کرائے۔

(۲۴-فروری ۱۹۶۱ء)

جناب نواب نصرت محمد خاں (سابق جاگیردار)

آج بفضلہ ادارۂ ادبیات اردو کو ڈاکٹر زور صاحب کی معیت میں دیکھنے کا اتفاق ہوا اگرچہ میری صحت اس قابل نہ تھی لیکن ڈاکٹر زور کے پُر زور خلوص نے کھینچا اور "ایوان اردو" کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا عظیم الشان کارنامہ ہے جس محنت اور جستجو سے اس ایوان کے ہر گوشہ کو سنوارا گیا ہے اس کی داد دینا آسان نہیں ہے زبان اردو اور اردو والوں کی خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر زور جیسی شخصیت ہم میں موجود ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر زور عرصہ تک زندہ اور سلامت رہیں اور اس عظیم کام کی تکمیل ہو (آمین)

مجھے یاد ہے کہ میں اس کے ابتدائی دور میں نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ آتا رہا ہوں جن کی یاد دکن کے ذرہ ذرہ پر ثبت ہے اور رہے گی۔

(۱۵ فروری ۱۹۶۱ء)

جناب سید ہادی حسین بلگرامی

ناظم سنٹرل ریکارڈ آفس (حیدر آباد)

آج میں نے ڈاکٹر زور صاحب کی دعوت پر "ایوان اردو" کا اور ان تمام کتابوں، مخطوطات اور دیگر نوادرات وغیرہ کا معائنہ کیا۔ جو دکن اور اردو کے تعلق سے اس میں جمع کئے گئے ہیں میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے کسی اور حصہ میں کسی زبان یا کسی خطہ کی نسبت ایسا کوئی نایاب ذخیرہ کسی ایک شخص نے یا کسی ادارہ نے اکٹھا کیا ہوگا یہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اپنے وطن اور اپنی زبان سے انتہائی اُنس اور محبت ہو اور جو جنون کی حد تک پہنچ جائے۔ ڈاکٹر زور صاحب اور ان کے ساتھیوں نے گذشتہ تیس برس میں اردو زبان کی مختلف طریقوں سے جو خدمت کی ہے اسکی نظیر ملنا مشکل ہے اور اس کے لئے وہ ہر طرح قابل مبارکباد ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان مہلک اثرات کے باوجود جو ملک کے حالیہ سیاسی و معاشی انقلاب کی وجہ سے اردو زبان پر اثر انداز ہو رہے تھے دکن میں اردو کی بقا بڑی حد تک انہی حضرات کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ایوان اردو دکن کی تاریخ اور اس کی تہذیب و تمدن کا ایک سرسبز اور بے مثل گلدستہ ہے جس میں اس کے ہر گوشہ کے پھول اس کی زبان، اس کی عمارتوں اور اسکی نامور ہستیوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اگر اس کو "ایوان دکن" کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

(۲۳ مارچ ۱۹۶۱ء)

شری ریوتی سرن شرما

(آل انڈیا ریڈیو دہلی)

حیدر آباد کے مختصر قیام کے دوران عیاز انصاری صاحب کی بدولت مجھے یہ ادارہ دیکھنے کا شرف حاصل ہ

اردو کا ارتقاء کیسے ہوا اس کے متعلق قابل قدر ذخیرہ یہاں محفوظ ہے۔ جس طرح دیکھا سے یہ ذخیرہ جمع کیا گیا ہے اس کاوش انتہائی قابل داد ہے۔ ہم اردو کو ایک زندہ زبان کے طور پر برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ اردو کے لئے ایک نیک شگون نہیں ہے کہ ہم اسے آثار قدیمہ کی چیز کے طور پر پیش کریں۔ ہماری کاوش ہونی چاہئے کہ اردو آثار قدیمہ کی ایک چیز بن جانے کے بجائے ایک زندہ زبان کے طور پر خیالات اور جذبات کے اظہار کا آلہ بنی رہے۔ (۲ مئی ۱۹۶۱ء)

حضرت مولانا محمد جمال میاں فرنگی محلی (ڈھاکہ)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مدظلہ العالی کو جو صلاحیت قدرت سے ودیعت ہوئی ہے۔ اسکی بنا پر مجھے ایوان اردو کی پرشکوہ عمارت اور اس ادارے کے متعدد وقیع موثر اور مفید شعبے دیکھ کر کچھ تعجب نہیں ہوا ہے خدا ان کو سلامت رکھے اور یہ ادارہ ان کی توجہ اور محنت سے بہت ترقی کرے۔ (۲۵ مئی ۱۹۶۱ء)

جناب پروفیسر آل احمد سرور

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند (علی گڈھ)

ادارۂ ادبیات اردو کو اس کی پرانی عمارت میں دیکھ چکا تھا۔ اب خوش قسمتی سے اس کی نئی اور اپنی عمارت میں اسے دیکھنے کا موقع ملا آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی عمارت میں حسن نظر اور ذوق سلیم کی کارفرمائی ہے اسکی آرائش میں سلیقہ اور نفاست سے، اس کے کتبوں، خطوط، فرامین، مخطوطات، مطبوعات اور زبان و ادب سے متعلق نوادر میں ڈاکٹر زور اور ان کے رفیقوں کے خون جگر کی آب و تاب جھلکتی ہے یہ ادارہ اردو زبان و ادب کی صدیوں کی چمن بندی کا بڑا اچھا عکس پیش کرتا ہے یہاں تحقیقی اور علمی کام کرنے والوں کے لئے بڑا خزانہ موجود ہے۔ اس ادارے کی ترقی اور توسیع کیلئے کوشش اردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والوں اور ہماری مشترک تہذیب کے علمبرداروں کا فرض ہے مجھے امید ہے کہ یہ ادارہ اور بڑھے گا اور ترقی کرے گا۔

(۴ جولائی ۱۹۶۱ء)

پنڈت گوپی ناتھ امن لکھنوی

سابق وزیر حکومت (دہلی)

مجھے ادارۂ ادبیات اردو میں دوبارہ حاضر ہونے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے جب بیگم مہدی نواز جنگ نے ۱۹۵۷ء میں ریڈکراس سوسائٹی کے زیر اہتمام مشاعرہ میں مجھے صدارت کے لئے طلب فرمایا تھا، تب حاضر ہوا تھا۔ اور پروفیسر زور صاحب کی مہربانی سے اس ادارہ کو دیکھا تھا اس بار جناب وقار خلیل کے ذریعہ سکینہ صاحب کا دعوت نامہ ملا میں ڈولپمنٹ منسٹرس کانفرنس کے سلسلے میں حیدرآباد آیا ہوا تھا۔ کانفرنس پرسوں ختم ہوئی۔ آج اس ادارہ میں حاضر ہوا اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس مدت میں ادارہ نے بہت ترقی کی ہے اہل ادارہ اس کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میری دعا ہے کہ یہ ادارہ یونہی تعمیری کام کرتا رہے اور اس کی مساعی مشکور رہیں۔ (۲۰ جولائی ۱۹۶۱ء)

○

جناب علمدار حسین (لکھنؤ)

ادارۂ ادبیات اُردو، ایک ایسا مرقع ہے جس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ہمیشہ زندہ رہے گی، اس کی عمارت میں نہ صرف قدیم و جدید فنِ تعمیر کا حسین امتزاج ہے اس میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ اور انکے رفقاءِ کار کی بے لاگ، قومی خدمات اور اُردو دوستی کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ (۱۶ اگست ۱۹۶۱ء)

○

شری ایس، رامیا، سابق اکاؤنٹنٹ جنرل حیدرآباد

ومشیر فینانس ناگ ارجن ساگر پراجکٹ آندھرا پردیش

آج شام میں نے "ایوان اردو" کا معائنہ کیا، میرے لئے یہ خوشگوار تجربہ تھا۔ یہ ادارہ نہ صرف جدید اُردو ادب کے لئے بیش بہا کام کر رہا ہے بلکہ قدیم اُردو ادب اور اشاعت مطبوعات کا بھی عمدہ کام یہاں ہو رہا ہے اس کے میوزیم میں دکن کی نہایت نفیس قدیم تصویریں ہیں، جو مجھے یقین ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اپنے اضافوں کے باعث دکنی اسکول کی پینٹنگ کا بہت بڑا خزانہ بن جائے گا۔

یہ ادارہ ہر طرح کی امداد کا مستحق ہے اس لئے کہ یہ ہندوستانی کلچر کی اتنی عمدہ خدمت کر رہا ہے۔ (۹ ستمبر ۱۹۶۱ء)

○

حضرت روشؔ صدیقی (دہلی)

ارضِ دکن اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو "اُردو" سے جو تعلق رہا ہے، اس کی وسعت نے صدیوں کی تعمیری خدمات کو اپنے آغوش میں لے لیا ہے، اولیا، مشائخ، سلاطین، امراء کی خانقاہوں اور بارگاہوں سے نکل کر یہاں اُردو عوام کے جھونپڑیوں تک پہونچی ہے۔ دورِ حاضر میں ادارۂ ادبیات اُردو کی مساعیٔ جمیلہ جس "ایوان اُردو" کی تعمیر و تشکیل کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، وہ اُردو سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک بڑا تہذیبی و علمی سرمایہ ہے۔ پانچ صدیوں میں اُردو کے قافلہ نے کن کن مرحلوں سے گذر کر اپنی منزل کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ اس کا اندازہ "ایوان اُردو" کی بیش بہا قلمی کتابوں، مطبوعات، تصاویر و نقوش سے ہو سکتا ہے۔

اراکین ادارہ جس خلوص و انہماک کے ساتھ اُردو کی خدمت و اشاعت میں مشغول ہیں وہ بہترین کامیابی کا ضامن ہے خدا کرے یہ مساعیٔ حسنہ مشکور ہوں۔ (۵ نومبر ۱۹۶۱ء)

○

حضرت رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

(پروفیسر انگریزی، الہ آباد یونیورسٹی)

"ادارۂ ادبیات اُردو" میں جہاں تک میں ایک مختصر وقفہ میں

دیکھ سکا نہایت اہم اور کار آمد کام ہو رہا ہے۔ (۵- نومبر ۱۹۶۱ء)

○

جناب رام کرشن مضطر

اڈیٹر "ملاپ" (دہلی)

میں ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات کا تہہ دل سے معترف ہوں۔

(۵- نومبر ۱۹۶۱ء)

○

جناب ابن فرید ایڈیٹر ماہنامہ "ادیب"

جامعہ اردو - علی گڈھ

"ادارۂ ادبیات اردو" کی زیارت کا شرف مجھے بھی حاصل ہوا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ ہندوستان کی سرزمین کی ممتاز ترین عمارت اور اس میں قائم شدہ ایک تاریخ ساز ادارہ کو دیکھنے اور استفادہ کرنے کا موقع میسر آگیا۔ ادارہ کے مخطوطات کا حصہ اور خاص طور سے فرامین کے مخطوطات انتہائی اہم ہیں۔ حیدرآباد کا دو سو سالہ قدیم نقشہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ایسا نادرہ ہے جس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ مختصراً علوم و فنون ایک اور اہم کام تھا جو ادارۂ ادبیات اردو کر رہا تھا خدا کرے یہ کام مستقبل میں جاری رکھا جاسکے تا کہ اس ادارہ کا اردو پر ایک بڑا احسان ہو بہرحال ادارہ کے ذریعہ جو خدمات اردو کی انجام پا رہی ہیں وہ لائق تحسین ہی نہیں لائق اجر ہیں۔ (۲۲- نومبر ۱۹۶۱ء)

○

ڈاکٹر ٹھیکر، معتمد وزارت ثقافتی امور و سائنسی تحقیقات

حکومت ہند - نئی دہلی

میرا یہ معائنہ بہت ہی دلچسپ اور متاثر کن ثابت ہوا ہے۔ (۲۶- دسمبر ۱۹۶۱ء)

○

حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب صدر کل ہند جمعیت علماء ہند

(ایم - پی - دہلی)

محترم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زورؔ کی کرم فرمائی سے ادارۂ ادبیات اردو کے معائنہ کا موقع ملا اس ادارہ کی عظمت پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے مگر مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ادارۂ ثقافت اردو کی بہترین انسائیکلو پیڈیا ہے اور اردو کی عظمت کی زندہ یادگار اور اس کی یادگار کے لئے بہترین شاہکار۔

(۲۶ دسمبر ۱۹۶۱ء)

جناب قتیل شفائی (لاہور)

"ادارۂ ادبیات اردو" ایک ایسا پیڑ ہے جس کی چھاؤں میں اردو کا ہر مسافر آرام محسوس کرتا ہے۔
خدا اس پیڑ کے نگہبان ڈاکٹر زور صاحب کو سلامت رکھے۔ "آمین" (۲۰ - ڈسمبر ۱۹۶۱ء)

جناب انور مرزا پوری (لکھنؤ)

"ادارۂ ادبیات اردو" کو جو کچھ بھی دیکھا بس یہ معلوم ہوا کہ اسے دیکھنے کے لئے وقت چاہیئے،
میں نے اس کا یہ اثر لیا کہ حیدرآباد میں یہ ادارہ صرف حیدرآباد کے لئے ہی نہیں بلکہ جہاں جہاں بھی ادب اور زبان کا
چرچا ہے یہ اس کی پوری پوری نمایندگی کرتا ہے۔ (۲۶ - ڈسمبر ۱۹۶۱ء)

جناب حبیب جالب (لاہور پاکستان)

اراکین ادارۂ ادبیات اردو کی خوش سلیقگی قدم قدم پر محسوس ہوئی۔ (۵ - ڈسمبر ۱۹۶۱ء)

جناب راہی معصوم رضا (علی گڈھ)

میں اس قابل نہیں کہ میں اس ادارہ کے بارے میں کچھ لکھوں، جس کی رہنمائی میرے بزرگ
کر رہے ہیں۔ (۲۵ - ڈسمبر ۱۹۶۱ء)

جناب سہیل بخاری

ادارۂ کامران" سرگودھا پاکستان)

"ادارۂ ادبیات اردو" کے دیرینہ کارنامے تعریف و توصیف کے لائق ہیں۔ اس ادارہ میں ڈاکٹر زور
کا جو بے لوث جذبۂ خدمت اردو رچا بسا ہوا کام کر رہا ہے اس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے ہماری طرف سے ڈاکٹر زور
کی واحد شخصیت اس ادارہ کے تمام اکتسابات کے لئے مستحق مبارک باد ہے۔ اردو زبان و ادب پر ان کا یہ احسان عظیم
(ادارۂ ادبیات اردو کی صورت میں) کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ (۱ اپریل ۱۹۶۱ء)

ہفتہ وار "ایشیا" دہلی

ہم ادارۂ ادبیات اردو کو اس کی خاموش تعمیری ادبی سرگرمیوں پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

آج ملک کو اس تعمیری کام کی سخت ضرورت ہے۔ (۲۸-اپریل ۱۹۶۱ء)

O

جناب عظیم الدین محبت (ایم اے)
ایڈیٹر۔ ہفتہ وار "سب رنگ" حیدرآباد (سندھ)

محترمی ڈاکٹر زور صاحب کی ذات گرامی وہ روشن مینارہ ہے جس سے راہ نمائی کی کرنیں پھوٹ کر نکل رہی ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ ادارہ کا ہر کارکن ڈاکٹر زور بن جائے (اقتباس مکتوب مورخہ ۲۳-اپریل-۱۹۶۱ء)

O

ماہنامہ "انشا" کراچی:

ادارۂ ادبیات اردو، ۱۹۳۱ء سے ہندوستان میں اُردو کی ترقی و توسیع کے لئے جو خدمات انجام دے رہا ہے۔ وہ قابل ستائش ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں گنتی کے ایسے ادارے ہیں جو عظیم اردو کی بقاء کے لئے قابل تقلید علمی کام کر رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف کے وقت طلب سلسلے میں ادارے نے تقریباً ڈھائی سو کتب میں مختلف موضوعات پر شائع کی ہیں۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے علاوہ ادارہ نے اردو امتحانات کے ذریعہ اُردو کے فروغ کے لئے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ "ایوان اُردو" جیسی خوبصورت عمارت میں ادارہ ڈاکٹر زور اور اُن کے رفقائے کار کی نگرانی میں خوبصورتی کے ساتھ اردو کا دامن وسیع کر رہا ہے قابل فخر ہیں وہ لوگ جو اُردو کے اس ناگفتہ بہ دور میں خالص علمی، ادبی و لسانی موضوعات پر کام کر رہے ہیں (بابتہ جون ۱۹۶۱ء)

O

سہ ماہی "العلم" کراچی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، ادارۂ ادبیات اُردو کے حقیقی بانی اور نگرانکار ہیں۔ موصوف برصغیر ہند و پاکستان میں علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے بڑی اونچی حیثیت کے مالک ہیں۔ سیاسی انقلاب کے بعد بھارت کی دیس میں اُردو کے ساتھ شدید ناانصافی عمل میں آئی۔ حیدرآباد کی مشہور زمانہ "عثمانیہ یونیورسٹی" جس میں ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔ دوسری زبان میں تبدیل کر دی گئی۔ ایسے سخت حالات میں بھی ڈاکٹر زورؔ نے سپر نہیں ڈالی اور اپنے مشن کی تکمیل میں سرگرم عمل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی نشاۃ ثانیہ ایسے ہی مردان آزمودہ کار کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور ایسی شخصیتیں تاریخ ساز کہلاتی ہیں۔ (بابتہ اپریل تا جون ۱۹۶۱ء)

O

روزنامہ "امر بھارت" حیدرآباد

"ادارۂ ادبیات اردو" اپنے وقیع اور بے مثل ادبی کارناموں کے سبب اردو دنیا میں عزت و احترام

کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اس ادارہ نے کئی ادبی قدیم تہذیب و تمدن کو حیات جاوید بخشنے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ تاابد زندہ و پائندہ رہیں گے اور جب تک سرزمین دکن پر چارمینار اپنی عظمت اور شکوہ کے ساتھ قائم ہے اس وقت تک یہ دیار امن و اماں اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ درخشاں و تابندہ رہے گا۔ (۱۰ ستمبر ۱۹۶۱ء)

○

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی)

خلیق انجم صاحب سے "ایوان اردو" ادارۂ ادبیات اردو اور مہمان خانے کی تعریف سنی، جی خوش ہوا۔ اللہ، اللہ کیا زندگی ہے، دن رات ادارہ سے متعلق سوچتا ہوں ادارہ کے متوسلین میں سے ہوں اور سب اس سے تعلق کی بنا پر "حیدرآبادی" کہلاتا ہوں۔ (اقتباس مکتوب جنوری ۱۹۶۱ء)

○

پروفیسر حامدی کاشمیری (سری نگر)

میرا دل احساس مسرت سے جھوم اٹھتا ہے، یہ سوچ کر کہ سرزمین ہند میں حیدرآباد ایک ایسی جگہ ہے جہاں اردو زبان و ادب کے محافظ اور قدرداں موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور جیسے عظیم المرتبت ادیب اور ادب پرور نے ادارۂ ادبیات اردو کو اپنے خون جگر سے تابناک بنایا ہے۔ (اقتباس مکتوب جنوری ۱۹۶۱ء)

○

فی البدیہہ قطعہ

سمایا تھا دل میں جو ارمان اردو
بہار دل پہ آیا گلستان اردو
یہ سب حضرت زورؔ کی ہے عنایت
ہے مرکز ادب کا یہ ایوان اردو

نواب تراب یار جنگ سعیدؔ

○

قطعہ دعائیہ

چہ خوش تعمیر کرد ایوان اردو
دوبالا گشت از وے شان اردو
ز چشم بد خدا محفوظ دارد
جناب زورؔ ہمہ ارکان اردو

عرشی حیدرآبادی

سیّد احمد حسن نقوی راشد

ایوانِ اُردو

کھڑی ہے عمارت جو ایوان اُردو ٭ بڑھی اس سے ہے ملک میں شان اُردو

یہ مینار ہے روشنی ادب کا ٭ یہ ہے ایک شمع شبستان اُردو

یہ ہے ڈاکٹر زورؔ کی کوششوں کا ٭ نتیجہ جو ہیں ملک میں جان اُردو

ہے سکینہؓ صاحب کی یاں سخت محنت ٭ کہ وہ جو ہیں شیدائے جانان اُردو

ہوں ہندو و مسلم کہ سکھ یا مسیحی ٭ ہے سب پر مساوی ہی فیضان اُردو

تواضع پہ تم اس کے حیراں رہو گے ٭ بنو کچھ دنوں تم جو مہمان اُردو

وہ اقبالؔ و غالبؔ کے جیسے جواہر ٭ ہیں نکلے جہاں سے وہ ہے کان اُردو

بڑی دور دور اس کی شہرت سنو گے ٭ کہاں تک ہے پھیلا یہ فیضان اُردو

ہے امریکہ و روس تک اس کی شہرت ٭ بڑی قدر رکھتا ہے سامان اُردو

نہ ہوگا کبھی سرد بازار اس کا ٭ چلیگی ہمیشہ یہ دوکان اُردو

یہ راشدؔ بھی جس کا کہ ہے ایک بلبل

وہ ہیں غنچہائے گلستان اُردو

مظہر جذبات سکینہ

مصروفیاتِ ادارہ

علمی و ادبی و کلچرل

سنہ ۱۹۶۱ء

ادارہ کی ڈائری سے

جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

اتوار - یکم۔ جشن انتظامی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس ایوان اردو میں بصدارت ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ منعقد ہوا۔ جس میں افتتاحی اجلاس کی تفصیلات کے علاوہ ایک عظیم الشان ہند و پاک مشاعرہ کے انعقاد کے بارے میں قطعی امور طے کیے گئے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اشرف النساء انصاری محترمہ [illegible]، مولوی تمکین کاظمی، علامہ حیرت بدایونی، جناب امین راج سکسینہ ایڈوکیٹ، جناب سراج الدین علی خاں، جناب ابن احمد تاب اور جناب [illegible] نے شرکت کی۔

● ادارہ کی تعمیر شدہ عمارت "ایوان اردو" کے تعارف کے سلسلے میں ایک با تصویر انگریزی کتابچہ شائع ہوا۔

پیر ۲ = یوم حالی (منعقدہ اردو کالج حیدرآباد) کی آخری سہ روزہ علمی اجلاس کی معتمد ادارہ جناب ڈاکٹر زور نے صدارت فرمائی۔ ادارہ کی طرف سے اس تقریب میں نمائندگی کی گئی۔

منگل - ۳ - جنوبی ہند کے مشہور شاعر اور ادیب جناب سلیم تمنائی (میسور) نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادیبوں کے مسائل پر ڈاکٹر زور صاحب سے گفتگو کی۔

● ۱۱ بجے ڈاکٹر ہاشم امیر علی سابق پرنسپل زرعی کالج اور ۴ بجے نواب عنایت جنگ بہادر نے ایوان اردو کے مختلف شعبہ جات کا بہ تفصیل معائنہ لیا اور مشورے دیے۔

جمعہ - ۶ - جناب ڈاکٹر علیم پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۵ بجے شام ایوان اردو میں تشریف لائے۔

ہفتہ - ۷ - چیف سکریٹری حکومت آندھرا پردیش جناب ایم۔ پی۔ پائی نے ڈپٹی چیف سکریٹری جناب بھارت چند کھنہ (مصنف ٹھنڈی بجلیاں) کے ہمراہ "ایوان اردو" کا تفصیلی معائنہ کیا۔ بانی شہر حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ اور یوم محمد قلی کے موقع پر نصف یوم کی خصوصی تعطیل عام کی اجرائی کے بارے میں ڈاکٹر زور صاحب سے مشورہ کیا گیا۔

● صبح ۸½ بجے کراچی سے [illegible] یوم محمد قلی قطب شاہ [illegible] ٹرنک کال پر ڈاکٹر زور [illegible] سے ربط [illegible]

اتوار ۸ - محمد قلی قطب شاہ کی [illegible] کے موقع پر ادارہ کی طرف سے [illegible] قطب شاہ شائع ہوئے۔

● روزنامہ [illegible] کو "محمد قلی قطب شاہ نمبر" کی صورت میں شائع کر کے اردو کے اس پہلے صاحب دیوان شاعر کے تئیں خراج عقیدت ادا کیا۔

منگل ۱۰ - ڈاکٹر زور صاحب کی مرتبہ کتاب "تذکرہ ایوان اردو" ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی۔ جس میں ان تمام ادبی نادر ذخیروں کی با تصویر تفصیلات ہیں جو ادارہ کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔

● ۱۰ بجے صبح ڈاکٹر زور معتمد ادارہ [illegible] نے انتظامات یوم محمد قلی کے سلسلے [illegible] قطب شاہی گنبدوں کا معائنہ کیا۔

● جناب میر سعادت علی خاں (ایم۔اے) پی ایچ ڈی پروفیسر ڈاکٹر یوسف کوکن عمری (ریڈر شعبہ اردو فارسی و عربی، مدراس یونیورسٹی) اردو کے جواں سال شاعر جناب حمید الماس (گلبرگہ) اور پنجابی کے ناول نگار جناب ہرنام داس صحرائی نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

● ۷ بجے۔ مشاعرہ کمیٹی یوم محمد قلی کی مجلس انتظامی کا اجلاس محترمہ ارشاد صاحبہ کے مکان پر منعقد ہوا۔

چہارشنبہ ۱۱ مارچ حسب روایات گذشتہ ادارہ کے زیر اہتمام سہ روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کا آغاز ۶ بجے شام بمقام گنبد محمد قلی قطب شاہ زیر صدارت شہزادہ مکرم جاہ بہادر ہوا۔ سب سے پہلے جناب قمر ساحری کا ترانہ دکن ہائی اسکول اکیڈیمی کے فنکاروں نے پیش کیا اور پھر ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ نے خیر مقدمی تقریر اور رپورٹ سنائی۔ شہزادہ مکرم جاہ کی افتتاحی تقریر کے بعد حسب پروگرام مس منیشا چکرورتی نے محمد قلی کی اردو غزل اپنے پر اثر ترنم میں سنائی۔ عظیم تر حیدرآباد کے پہلے میئر جناب وید پرکاش وساج نے اپنی تقریر کے ذریعہ بانی شہر حیدرآباد کو خراج عقیدت پیش کیا۔ محترمہ مرزوجی علی اصغر نے محمد قلی پر ایک دلکش نظم سنائی۔ مولوی خواجہ محمد احمد سابق ناظم آثار قدیمہ نے محمد قلی کی ادبی اور تاریخی خدمات پر مدلل تقریر کی۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید نے محمد قلی کی فارسی نظم پڑھی اور پھر آقائی منصور خراسانی نے فارسی میں تقریر کرتے ہوئے قطب شاہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

دفعۃً نماز مغرب کے بعد گنبد محمد قلی کے وسیع احاطہ میں انفنٹ عابدی نے محمد قلی کا مرثیہ سنایا اور قاری عبد الباری صاحب نے قرآن خوانی کی پھر شہزادہ مکرم جاہ بہادر کے ہاتھوں محمد قلی کے مزار پر چادر گل چڑھائی گئی۔ رنگا رنگ آتش بازی چھوڑی گئی اور اردو کے ممتاز شعراء صاحبان نے مختصر سی محفل شعر و سخن میں جو نواب ناظر یار جنگ بہادر کی صدارت میں جاری رہی اپنا کلام سنایا۔

تقریباً ساڑھے سات بجے شام یہ افتتاحی اجلاس شان و شوکت کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ شہر اور گولکنڈہ کے رہنے بسنے والوں کی کثیر تعداد نے اس تقریب کو کامیاب بنایا جن میں ادیب، شاعر، صحافی، پروفیسرس اور اردو دوست شامل تھے۔

● یوم محمد قلی شاہ کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کیلئے حکومت آندھرا پردیش نے خصوصی اعلان نامہ کے ذریعہ دفاتر اور مدراس شہر حیدرآباد کو ۳ بجے کے بعد برخواست کئے جانے کے احکام جاری کئے۔

● روزنامہ ملاپ نے یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر اپنی رنگین ادبی اشاعت کو محمد قلی نمبر کی صورت میں شائع کیا۔ اسی طرح دیگر مقامی اخبارات نے محمد قلی کی حیات اور شاعری پر اپنی اشاعتوں میں مختلف مضامین نظم و نثر شائع کئے۔

جمعرات ۱۲ مارچ صبح ۱۰ بجے جوش ملیح آبادی بذریعہ طیارہ انڈو پاک مشاعرہ میں شرکت کیلئے کراچی سے حیدرآباد پہنچے اور ایوان اردو کے مہمان خانہ میں مقیم ہوئے۔

● ۵ بجے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے کا دوسرا علمی اجلاس ایوان اردو میں بصدارت شری جے۔ وی۔ نرسنگ راؤ سابق وزیر حکومت آندھرا پردیش منعقد ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ اور سلطنت قطب شاہیہ سے متعلق مسرز جناب خواجہ حمید الدین شاہد، علامہ سید علی اصغر بلگرامی، مولوی سید محمد مورخ حیدری، ادیس لیاقت بیگم (ایم اے) نے تقریریں کیں اور شعراء صاحبان نے کلام سنایا۔ حضرت جوش ملیح آبادی کے علاوہ کئی ادیب دوستوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ ڈاکٹر زور معتمد ادارہ کے شکریہ پر اجلاس برخاست ہوا۔

جمعہ ۱۳ مارچ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلہ میں منعقدہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے مسرز شان الحق حقی (کراچی) حضرت تلوک چند محروم (دہلی) جناب جگن ناتھ آزاد (دہلی) جناب قریشی شیار پوری (دہلی)، جناب قاضی سلیم اور بشر نواز صاحب (اورنگ آباد) جناب نظر بارہ بنکوی (لکھنؤ) حیدرآباد پہنچے اور جناب محروم و ساحر صاحبان نے ایوان اردو کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔

● ۵ بجے شام۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے تیسرے تلنگی اجلاس کا آغاز بمقام ریڈی کالج بصدارت پنڈت ایم نرسنگ راؤ وزیر صنعت ریاستی حکومت منعقد ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ اور سلطنت قطب شاہیہ سے متعلق مسرز پروفیسر وینکٹ رامنیا، ڈاکٹر وسا ریڈی، ڈاکٹر راجدھانی مس واسوفتی (ایم اے) ریسرچ اسکالر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور پروفیسر

ویریندر راؤ نے مضامین سنائے اور تقریریں کیں۔ کئی تلگو دان احباب نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ معتمد تلگو اجلاس شری ڈی رام انجا راؤ رکن راجیہ سبھا و سکریٹری آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈیمی نے شکریہ ادا کیا۔

● ۹½ بجے شب۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سہ روزہ تقاریب کی آخری تقریب انڈو پاک مشاعرہ کی صورت میں گاندھی بھون آڈیٹوریم میں بصدارت جناب میر سعادت علی خاں (ایم پی) پارلیمنٹری سکریٹری وزارت خارجہ حکومت ہند منعقد ہوا۔

اس مشاعرہ میں مہمان شعراء صاحبان کے علاوہ ممتاز مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ محترمہ عائشہ رشاد معتمد مشاعرہ کے شکریہ پر یہ مشاعرہ انتہائی کامیابی کے ساتھ رات کے ۱۲½ بجے اختتام کو پہنچا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے اس مشاعرہ کی کارروائی ریکارڈ کی۔

اتوار۔ ۱۵ار: کل سندھ ادارۂ ادبیات اردو نصیر آباد ضلع لاڑکانہ مغربی پاکستان کی طرف سے ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد عمومی، ممتاز محقق، نقاد اور ماہر لسانیات ڈاکٹر زور صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں "یوم زور" منایا گیا۔

منگل۔ ۱۷ار۔ جناب صدیق الرحمٰن قدوائی ایم اے ولد شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم (وزیر تعلیم حکومت دہلی) جو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں اور اسٹرا چندر پر تحقیقاتی کام کر رہے ہیں بہ سلسلہ ریسرچ کلکتہ سے حیدرآباد پہنچے اور ایوان اردو کے مہمان خانہ میں مقیم ہو گئے۔

چہارشنبہ ۱۸ار: جناب صدیق الرحمٰن قدوائی (دہلی) نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

چہارشنبہ۔ ۲۰ار آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے یوم محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی اجلاس کی ریڈیائی رپورٹ نشر ہوئی۔

ہفتہ۔ ۲۱ار۔ ادارہ کے ترجمان ماہنامہ سب رس کا محمد قلی قطب شاہ نمبر (ماہ جنوری ۶۱ء) شائع ہوا جس میں یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۶۰ء کے مضامین کے علاوہ دیگر کئی مقالات اور طرحی کلام شامل ہے۔

اتوار ۲۲ار ۴ بجے شام ایوان اردو میں ترقی اردو بورڈ پاکستان (کراچی) کے سکریٹری اردو کے ممتاز شاعر و ادیب جناب شان الحق حقی نے ادارہ کی طرف سے دئے گئے عصرانے میں شرکت کی اور حیدرآباد کے ادیبوں سے اردو رسم الخط کا مسئلہ اور ہند کے موجودہ نیز پاکستانی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ ڈاکٹر زور، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر اکبر الدین صدیقی، پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد، پروفیسر حسینی شاہد، مولوی نصیر الدین ہاشمی، مولوی غلام رسول، پروفیسر عالم خوندمیری، محترمہ زینت ساجدہ، مولوی ذاکر حسین، انجینئر احمد محی الدین، عائشہ رشاد وغیرہ نے بحث میں حصہ لیا۔

چہارشنبہ ۲۵ار بلا ٹسٹ حیدرآباد کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن میں حیدرآباد میں ادبی اشخاص اور ادارے کے زیر عنوان جناب نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) نے ایک مضمون میں ادارے کا قابل قدر ادبی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔

اتوار ۲۹ار: ادارہ کی طرف سے پروفیسر مبارز الدین رفعت (گلبرگہ) کی مرتبہ کتاب "مقام غالب" شائع ہوئی اور تبصروں کے لئے اخبارات و رسائل کو بھیجی گئی۔

پیر ۳۰ار: ممتاز شاعر جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (دہلی) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا اور مختلف علمی و ادبی مسائل پر معتمد ادارہ ڈاکٹر زور سے تبادلۂ خیال کیا۔

فروری سنہ ۱۹۶۱ء

چہارشنبہ، یکم: جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے ایوان اردو میں مختلف ادبی مسائل پر بات چیت کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر زور، علامہ حیرت بدایونی، اوج یعقوبی اور وقار خلیل صاحبان موجود تھے۔

جمعرات، ۲ار: ۵½ بجے ایوان اردو میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے اعزاز میں ایک نمائندہ محفل شعر و سخن منعقد ہوئی، ادب دوستوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ سحر صاحب کے علاوہ مقامی شعراء میں علامہ حیرت بدایونی، پنڈت راگھویندر راؤ جذب، پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد، ڈاکٹر اسعد انصاری، منوہر لال شارب، خیرات ندیم، اوج یعقوبی، وقار، صلاح الدین نیر، فیض الحسن خیال اور نذیر نیر نے اپنا کلام سنایا۔ ڈاکٹر زور صاحب کے شکریہ اور خیر مقدمی کلمات کے بعد یہ خوشگوار محفل اختتام کو پہنچی۔

جمعرات، ۹، معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب نے چادر گھاٹ کالج کے جلسہ تقسیم

صدارت کرتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کو اردو ذریعہ
کی جامعہ بنانے پر زور دیا۔
۱۰ ۱ بجے، جناب سلیمان خطیب جو
زبان کے مشہور شاعر ہیں، گلبرگہ سے
آباد پہنچے اور ایوان اردو کا معائنہ کیا
موقع پر تاج رجاد بیہ صاحب بھی موجود تھے
۱۴ جناب فضل الرحمن شعلہ (شاہ پور ضلع گلبرگہ)
ایوان اردو کا معائنہ کیا اور ریاست میں اردو کی
سے واقف کراتے ہوئے ذاکرہ زور اور دنا رکی
خیال کیا۔
شنبہ ۱۵ کو نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار
حبیب یاس اور جناب خواجہ شوق نے ایوان
کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر مولوی اکبر الدین صدیقی
مرزا علی طالع، نواب سراج الدین علیخاں اور
عثمان بیگ صاحب بھی موجود تھے۔
شنبہ ۱۷ جناب پروفیسر خواجہ حمید الدین
(انجمن ترقی اردو بورڈ کراچی) جو یوم محمد علی
شاہ کی تقریبوں میں شرکت کے لئے حیدرآباد
کراچی روانہ ہوئے۔
۲۳ نواب مانڈور خاں صاحب
(نائب ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے
نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ اس موقع
اکثر زور میر سراج الدین علی خاں اور
منوہر پرشاد ماتھر (بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)
تھے۔
۲۵ جناب پروفیسر ہارون خاں شروانی
(بسلسلہ کونسل آندھرا پردیش) کی ہمراہی
غلام اکبر خاں (حیدرآباد سندھ پاک)
خانم شروانی اور سلطانہ شروانی صاحبہ
ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ حیدرآباد میں

کے تجربوں کو ان حضرات نے خصوصی
دلچسپی سے ملاحظہ کیا۔
اتوار ۲۶ مولانا ابو الکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے
سلسلے میں آئے ہوئے گرایجویٹ طلبا
نے جن میں گریالا سے آنے والے بھی شامل
ہیں ایوان اردو کا معائنہ کیا۔
منگل ۲۸ علامہ سید علی اصغر بلگرامی
جناب محمد رشید الدین خاں صاحب
ریٹائرڈ کلکٹر اور تاج ادب پاکٹ
بک سیریز کے ناشر و مالک جناب میر اعظم
علی صاحب نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

مارچ سنہ ۱۹۶۱ء

چہارشنبہ یکم، مسٹر عبد المجید خلش ایڈیٹر
ماہنامہ "گلرنگ" نے ایوان اردو کا
معائنہ کیا۔
ہفتہ ۴ ڈاکٹر سید مہدی علی اور
ڈاکٹر سید جعفر (لکچرار اردو نظام کالج)
نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔
پیر ۶ پروفیسر ہمایوں کبیر مرکزی وزیر
سائنٹفک ریسرچ و کلچرل امور نے
ایوان اردو کا ادب دوستوں کے
کثیر اجتماع میں معائنہ کیا اور ابو الکلام
آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کی مطبوعہ کتابوں کی رسم اجرائی کی
تقریب کی صدارت کی۔ ایوان اردو
میں پروفیسر کبیر کا شری بی۔ این گپتا نے
ادارہ اور انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے
خیر مقدم کیا۔ اور ڈاکٹر زور صاحب
معتمد ادارہ و ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ کے
شکریہ پر یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔
● ادارہ کی کتاب "مقام غالب"
مرتبہ پروفیسر مبارز الدین رفعت (گلبرگہ)
پر روزنامہ "سیاست" میں تبصرہ
شائع ہوا۔
اتوار ۱۲ جناب حسن الدین احمد
ڈپٹی کلکٹر اسٹنگار یڈی نے ایوان اردو
کا معائنہ کیا۔
پیر ۲۰ حکومتی کمیٹی برائے ترویج و
اشاعت زبان اردو آندھرا پردیش کی
مجلس انتظامی کے فیصلے کے بموجب ادارہ
کی مطبوعہ دو کتابیں (۱) اردو املا
مولوی غلام رسول اور (۲) مولانا ابو الکلام
آزاد (جناب دتا ذمیل) کو علی الترتیب
ایک سو اور ایک سو پچاس روپیوں کے
انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔
چہارشنبہ ۲۲ سنٹرل ریکارڈ آفس کے
ناظم جناب ہادی حسن بلگرامی نبیرہ نواب
عماد الملک مرحوم اور جناب دھرمیندر
پرشاد لکچرار جغرافیہ عثمانیہ یونیورسٹی
نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔
جمعرات ۲۳ ادارہ کی طرف سے
جناب مرزا احمد علی بیگ چغتائی جرنلسٹ
کی مؤلفہ کتاب "تاریخ ناندیڑ دکن" کی
اشاعت عمل میں آئی
● ۶ بجے۔ ادارہ کی مجلس انتظامی کا
اجلاس نواب زین یار جنگ بہادر کی صدارت
میں منعقد ہوا۔ مختلف امور متعلق
فیصلے لئے گئے۔

• جناب مبشر احمد صاحب نبیرہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے پروفیسر سید محمد اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کی ہمراہی میں ادارہ کا معائنہ کیا اور ڈپٹی صاحب کی تحریر بوسومہ سر سید احمد خاں ادارہ کو تحفۃً دینے کا وعدہ فرمایا۔

جمعہ ۲۴ر۔ ادارے کے معتمد عمومی جناب ڈاکٹر زور صاحب، آل انڈیا ترقی اتحاد کانفرنس انڈو پاک کلچرل کانفرنس اور ساہتیہ اکیڈیمی کی جنرل کونسل کے اجلاس میں ادارہ کی نمائندگی کرنے کے لیے گرانڈ ٹرنک اکسپرس سے دہلی روانہ ہوئے۔

ہفتہ ۲۵ر شعبہ امتحانات ادارہ کی طرف سے ایک اعلان نامہ جاری کیا گیا کہ اردو پڑھائی گھروں کے تمام مراکز سال ۶۱-۱۹۶۲ء کیلئے حصول امداد کے سلسلے میں اپنی درخواستیں بھیجیں۔

منگل ۲۸ر پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نائب صدر ادارہ نے ڈاکٹر زور معتمد ادارہ کے دہلی تشریف لے جانے پر ادارہ کے انتظامی امور کی نگرانی کے فرائض انجام دے۔

جمعرات ۳۰ر اردو کے ممتاز صوفی منش رباعی گو شاعر حضرت امجد حیدرآبادی (متوفی ۲۹ مارچ ۱۰ بجے شب) کی وفات کے سلسلہ میں دفتر ادارہ ادبیات اردو احتراماً بند کر دیا گیا اور اسٹاف نے تدفین میں شرکت کی۔

جمعہ ۳۱ر حضرت امجد حیدرآبادی کے سانحہ ارتحال پر ادارہ کی طرف سے ایوان اردو میں ½ ۵ بجے جلسہ تعزیت پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نائب صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ (تفصیلی رپورٹ آگے کے صفحات میں درج ہے)

اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

ہفتہ یکم انڈو پاک کلچرل کانفرنس دہلی (منعقدہ ۳۰ مارچ تا ۲ اپریل سنہ ۶۱ء) کی طرف سے اردو کتابوں کی ہند و پاک نمائش کیلئے ادارہ کی طرف سے مطبوعات بھیجی گئی تھیں......

اس کانفرنس سے ادارہ کے معتمد عمومی ڈاکٹر زور صاحب نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جنوبی ہند میں اردو کا مستقبل روشن ہے، ادارہ اور جنوبی ہند کے ادیبوں کی طرف سے اس کانفرنس میں ڈاکٹر زور صاحب نے نمایندگی فرمائی تھی۔

جمعہ ۷ر ادارہ کی سالانہ رپورٹ دربارہ ادارہ سنہ ۱۹۶۰ء میں شایع ہوئی۔

• ۱۱ر بجے۔ حیدرآباد کے بزرگ شاعر حضرت تاج قریشی نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ اور مختلف ادبی مسائل پر معتمد ادارہ سے بات چیت کی۔

ہفتہ ۸ر ادارہ کی مطبوعہ کتاب "مقام غالب" پر ماہنامہ جامعہ دہلی بابتہ ماہ اپریل میں تبصرہ شایع ہوا۔

پیر ۱۰ر ادارہ کا ترجمان ماہنامہ سب رس (ادارہ نمبر بابتہ ماہ اپریل شایع ہوا۔

جمعرات ۱۳ر سب رس کے امجد نمبر کی اشاعت کے بارے میں پریس نوٹ جاری کیا گیا۔

ہفتہ ۱۵ر۔ ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ کی اشاعت بابتہ اپریل ۶۱ء میں ادارہ کی کتاب مقام غالب پر تبصرہ شایع ہوا

جمعرات ۲۰ر۔ انجمن ترقی اردو نانڈیڑ کے زیر اہتمام منعقدہ جلسہ عام میں ادارہ کی طرف سے شایع شدہ کتاب "تاریخ نانڈیڑ دکن" مرتبہ مرزا احمد علی بیگ چغتائی کی رسم اجرائی عمل میں آئی۔

جمعہ ۲۱ر۔ جناب ہیرالعل موریا صدر رائٹرس اسوسی ایشن ضلع کھمم نے ادارہ کا معائنہ کیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی تلگو زبان میں ایک AN THOL ... کی اشاعت کے بارے میں معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب سے مشورہ کیا۔

• ادارہ کی مطبوعہ کتاب "مقام غالب" پر ماہنامہ ساقی (بابتہ اپریل) کراچی میں تبصرہ شایع ہوا۔

ہفتہ ۲۲ر جناب حکیم ولیسرائے دہلی نے معتمد ادارہ سے ملاقات کی اور وزارت ثقافتی امور کی طرف سے علمی وظیفہ کی اجرائی کے بارے میں ادارہ کی کامیاب مساعی کا شکریہ ادا کیا۔

چہارشنبہ ۲۶ر۔ سب رس کے ادارہ نمبر پر ہفتہ وار اشارہ دہلی بابتہ ۲۰ر اپریل میں تبصرہ شایع ہوا۔

اتوار ۳۰ر ڈاکٹر محمد عبدالغفور (لندن) اور فری آرگینٹ ماؤ ایڈیٹر ماڈرن نیوز نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

مئی ۱۹۶۱ء

منگل ۲ر: پنڈت ریوتی شرن شرما (ممبر مرکزی وزارت تعلیم حکومت ہند دہلی) نے جناب حیات اللہ انصاری صاحب (آل انڈیا ریڈیو) حیدرآباد کے ساتھ ایوان اردو کا معائنہ کیا
● سب رس کے "ادارہ نمبر" پر ماہنامہ "ارشاد" حیدرآباد (۱۱ مئی) میں تبصرہ شائع ہوا۔
چہارشنبہ ۳ر - حضرت امجد حیدرآبادی کی فاتحہ چہلم کے موقع پر ادارہ کی طرف سے آنکے مزار پر ایک کتبہ نصب کیا گیا جسکے ایک رخ پر امجد کی رباعیات اور دوسرے رخ پر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب کا قطعۂ تاریخ کندہ کیا گیا ہے۔
جمعرات ۴ر جناب مبارز الدین رفعت لکچرار گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج گلبرگہ نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ اور "دیوان صفی" کی اشاعت کے بارے میں معتمد صاحب ادارہ سے بات چیت کی۔
جمعہ ۵ر - سب رس کے ادارہ نمبر پر ماہنامہ سوراجیہ دہلی (مئی ۱۹۶۱ء) میں تبصرہ شائع ہوا۔
منگل ۹ر - سوویت روس کے جواں سال ادیب جناب ولادی میر پی لیبیدوکی نے (جنہوں نے اورینٹل انسٹیٹیوٹ ماسکو سے اردو اور ہندی میں ایم اے کیا ہے اور ان دنوں ہندوستان میں اردو و ہندی قواعد پر ریسرچ کر رہے ہیں) مسٹر امجد یوسف زئی کے ہمراہ ایوان اردو کے تمام شعبہ جات کا معائنہ کیا اور اردو و تلنگانہ زبان و لغت کے تعلق سے ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ سے مشورہ کیا
چہارشنبہ ۱۰ر ادارہ کی کتاب "تماشائے اہل ہنر" مصنفہ رشید الحسن صاحب پر ماہنامہ انشاء کراچی بابتہ ماہ مئی میں تبصرہ شائع ہوا۔
جمعہ ۱۲ر - سب رس ماہ مئی ۱۹۶۱ء شائع ہوا۔
ہفتہ ۱۳ر جناب زبیر رضوی (دہلی) اور علامہ حیرت بدایونی ادارہ تشریف لائے اور مختلف علمی و ادبی موضوعوں پر معتمد ادارہ سے گفتگو فرمائی۔
اتوار ۱۴ر - اردو کی ممتاز شاعرہ محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ (اورنگ آباد)، عبد الباری لکچرار تاریخ و سیاسیات اورنگ آباد کالج، چراغ علی حقیر صاحب لکچرار ایکسام مجگواند اس کالج حیدرآباد، ڈاکٹر ما لکھا لزو احمد علی قدردانی صاحب اور عزیز الرحمٰن سائل صاحب (ابن حضرت ناطق گرسواری شاہ پوری) نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔
منگل ۱۶ر ادارہ کے صدر پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر کا انتقال ہوا۔
چہارشنبہ ۱۷ر - صدر ادارہ کے انتقال کے سبب ایوان اردو احتراماً ایک دن کیلئے بند کر دیا گیا
جمعرات ۱۸ر نواب زین یار جنگ مرحوم کی تعزیت میں ایک جلسہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نائب صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا (تفصیلات اگلے صفحات پر مندرج ہیں)۔
منگل ۲۳ر - حضرت مولانا محمد جمال میاں صاحب فرنگی محل (حال مقیم ڈھاکہ پاکستان) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔
چہارشنبہ ۲۴ر جناب قاضی سلیم صاحب ایڈیٹر و معتمد انجمن ترقی اردو مہاراشٹرا (اورنگ آباد) ادارہ تشریف لائے اور اپنے مجموعہ کلام "پرتو" کی اشاعت کے سلسلے میں ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ سے مشاورت کی اس موقع پر شمس الدین تاباں صاحب اور وقار خلیل صاحب بھی موجود تھے۔
جمعہ ۲۶ر - معتمد عمومی ادارہ ڈاکٹر زور کشمیر کے لئے روانہ ہوئے جہاں وہ صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی مقرر ہوئے۔
ہفتہ ۲۷ر - ادارہ کے ریسرچ اسکالر اور مشہور ادیب مولوی تمکین کاظمی انتقال کر گئے۔
منگل ۳۰ر - ماہنامہ "شہناز" کراچی بابتہ ماہ مئی میں سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔
● جناب میکش صدیقی نائب صدر ادارہ ادبیات اردو نصیرآباد ضلع لاڑکانہ پاکستان نے ادارہ کے صدر نواب زین یار جنگ کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی پیام ارسال کیا۔
چہارشنبہ ۳۱ر - ماہنامہ صبح امید بمبئی بابتہ ماہ جون ۶۱ میں سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

جون ۱۹۶۱ء

جمعہ ۲ر - ۵½ بجے - ایوان اردو میں ممتاز انشاء پرداز اور ادیب جناب مولوی سید مصباح الدین تمکین کاظمی کے سانحۂ ارتحال پر جلسۂ تعزیت منعقد ہوا (تفصیلات اگلے صفحات پر درج ہیں)

اتوار، ۴ر، معتمد ادارہ جناب ڈاکٹر زور صاحب نے سری نگر (کشمیر) سے ادارہ کے ریسرچ اسکالر اور ممتاز ادیب تمکین کاظمی کی رحلت پر برائے اشاعت تعزیتی پیام بھجوایا۔

منگل، ۶ر۔ ماہنامہ انشاء کراچی بابتہ ماہ جون میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب "مقام غالب" اور سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرے شائع ہوئے۔

ہفتہ، ۱۰ر۔ یوم محمود گاواں منعقدہ بیدر میں ادارہ کی طرف سے پروفیسر مجید صدیقی صاحب نائب صدر ادارہ، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب معتمد کتب خانہ اور جناب وقار خلیل صاحب ایڈیٹر سب رس نے نمائندگی کی اور ادارے کی طرف سے تاریخی کتابوں اور نوادرات کی نمائش میں حصہ لیا گیا۔

جمعہ، ۱۶ر۔ ادارہ کی کتاب "مقام غالب" پر لاہور کے ماہنامہ نیرنگ خیال۔ بابتہ ماہ جون میں تبصرہ شائع ہوا۔

ہفتہ، ۱۷ر۔ جناب عزیز احمد (بی۔اے) نظام آباد نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

● شری دائی، اے بخیا گو ڈ اسسٹنٹ سیکریٹری بھاشا سمیتی حیدرآباد) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

چہارشنبہ، ۲۱ر۔ محمد عزیز اللہ صاحب صدر انسٹی ٹیوٹ آف اردو لٹریچر کراچی برق یوسفی صاحب اور رگھوبنسی نرل صاحب نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور اردو ادبیات کے تعلق سے وقار خلیل صاحب سے تبادلۂ خیال ہوا۔

ہفتہ، ۲۴ر۔ ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ کشمیر سے براہ بمبئی حیدرآباد پہنچے

اتوار، ۲۵ر۔ ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ نے اردو مجلس کے زیر اہتمام منعقدہ جلسہ تعزیت میں تمکین کاظمی صاحب مرحوم کی شخصیت اور ادبی خدمات کے تعلق سے تقریر فرمائی۔

● سہ ماہی العلم کراچی (بابتہ اپریل تا جون ۱۹۶۱ء) میں سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

● مولانا الحاج سید محمد شاکر صاحب ضیار (بڑودہ) نے تصدق حسین تاج صاحب کے ہمراہ ایوان اردو کا معائنہ کیا

منگل، ۲۷ر۔ جناب ابو النعیم وحید حیدرآبادی ایڈیٹر اردو ڈائرکٹری الرآباد نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا

چہارشنبہ، ۲۸ر۔ بشیر النور صاحب ہادی رحمن صاحب اور مجیب الرحمن صاحب شاہ پوری نے ایوان اردو کے میوزیم کا معائنہ کیا آخر الذکر نے عہد قطب شاہی کے نقشوں اور تصویروں سے اہم اوس تحلیل لیے

● معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب اپنے سہ روزہ قیام حیدرآباد کے بعد براہ بمبئی بذریعہ طیارہ سری نگر (کشمیر) روانہ ہوگئے۔

جمعرات، ۲۹ر۔ سب رس بابتہ ماہ جون ٹیگور نمبر کی صورت میں شائع ہوا۔ جس میں ٹیگور کی حیات، شاعری اور شخصیت کے تعلق سے گرانقدر مضامین نثر و نظم شامل ہیں

جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

منگل، ۴ر۔ جناب پروفیسر آل احمد سرور صاحب معتمد کل ہند انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے ۳ بجے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ شریک معتمد نے ادارہ نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر پروفیسر سروری بھی موجود تھے۔

جمعرات، ۶ر۔ ہفتہ وار ایشیا دہلی۔ مورخہ ۲ر جولائی میں ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کتاب "مقام غالب" مرتبہ پروفیسر مبارز الدین رفعت پر تبصرہ شائع ہوا۔

منگل، ۱۱ر۔ جناب رشید الدین صاحب (جواں سال مزاح نگار) اور حامی حیدرآبادی معتمد بزم نو آندھرا پردیش نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

جمعرات، ۱۳ر۔ حکومت جموں و کشمیر نے ادارہ کو پانچ ہزار کی امداد منظور کی۔

● ماہنامہ آجکل دہلی بابتہ ماہ جولائی میں ادارہ کی کتاب "مقام غالب" پر تبصرہ شائع ہوا۔

جمعہ، ۱۴ر۔ جناب مدن گوپال صاحب انفارمیشن آفیسر منسٹری آف کمیونٹی ڈیولپمنٹ حکومت ہند دہلی نے شری ڈی، یل، بھاٹیہ (انفارمیشن آفیسر دہلی) اور جناب اسحاق ابولی انفارمیشن آفیسر حیدرآباد) کے ہمراہ ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

جمعرات، ۲۰ر۔ ۷ بجے پنڈت گوپی ناتھ امن لکھنوی سابق وزیر حکومت دہلی کے خیر مقدم میں ایک محفل شعر و سخن ایوان اردو میں

ترتیب دی گئی تھی جس میں ممتاز مقامی شعراء کے علاوہ امتن صاحب نے بھی کلام سنایا۔ ڈاکٹر مہندراج سکسینہ شریک معتمد ادارہ نے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا اور انہیں ایوان اردو کی سیر کرائی۔

۲۰ - جناب سعید الدین احمد (شریک معتمد بہادر یار جنگ میموریل سوسائٹی، ۲۰۹ حیدرآباد کالونی۔ کراچی ۵) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

ہفتہ، ۲۲ر جناب مولوی سجادت مرزا صاحب (4-2-9-4-2-A کاچی گوڑہ بلدہ) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

اتوار، ۲۳ر مولوی سید نور اللہ حسینی صاحب ابن حضرت صدیق دیندار نے تبلیغی جماعت کے اراکین کے ساتھ ایوان اردو کا تفصیلی طور پر معائنہ کیا۔

منگل، ۲۵ر - سب رس ماہ جولائی ۱۹۶۱ء شائع ہوا۔

چہارشنبہ ۲۶ر - روزنامہ ملاپ حیدرآباد کے ادبی ایڈیشن میں ادارہ کی کتب مقام غالب اور اردو املا پر تبصرے شائع ہوئے۔

ہفتہ، ۲۹ر انشورنس کمپنی بمبئی کے جنرل مینیجر نے پرتھوی راج صاحب انشورنس ایجنٹ بلدہ کے ہمراہ ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر مہندراج سکسینہ شریک معتمد ادارہ سے مختلف امور پر تبادلہ خیال ہوا۔

● ہفتہ وار سرکار مدراس کی اشاعت مورخہ ۲ر جولائی میں سب رس کے ٹیگور نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

اگست ۱۹۶۱ء

منگل یکم۔ روزنامہ گجرا لاہور (۵ جولائی) اور ماہنامہ تحریک دہلی (اگسٹ) میں علی الترتیب سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرے شائع ہوئے۔

چہارشنبہ ۲ر جناب فیض احمد ایم اے (ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی) براہ کرنول حیدرآباد پہنچے اور بسلسلہ ریسرچ ایوان اردو کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔

جمعرات، ۳ر - ½۱۱ بجے گجرات کے گورنر نواب مہدی نواز جنگ بہادر، جناب تقی بلگرامی کے ہمراہ ایوان اردو میں تشریف لائے، ادارہ میں ..... شریک معتمد ڈاکٹر مہندراج سکسینہ صاحب نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ نواب صاحب نے اردو کے تعلق سے مفید مشورے دیتے ہوئے کہا کہ مشاہیر کی آوازوں کے ٹیپ ریکارڈس ادارہ میں محفوظ کیے جائیں۔

اتوار، ۶ر - ادارہ کے اردو امتحانات کے تعلق سے مقامی اخبارات کو پریس نوٹ جاری کیا گیا۔

چہارشنبہ ۹ر ۱۱ بجے جناب فضیل جعفری الہ آبادی اور جناب جوشش محمد آبادی جرنلسٹ (دیگلور) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

جمعہ ۱۱ر - ماہنامہ فاران کراچی (ستمبر) میں ادارہ کی کتاب "مقام غالب" پر تبصرہ شائع ہوا۔

ہفتہ، ۱۲ر - ادارہ کے معتمد عمومی جناب ڈاکٹر زور صاحب براہ دہلی کشمیر سے حیدرآباد پہنچے۔

● ہفتہ وار ہماری زبان علی گڑھ (بابتہ ۸۔ اگسٹ) میں ادارہ کی کتاب مقام غالب پر تبصرہ شائع ہوا۔

اتوار، ۱۳ - جناب سری کشن سنہا (مصنف رم جھم) حال مقیم دہلی نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

● لائبریری آف کانگریس واشنگٹن (امریکہ) کو ادارہ کی آٹھ مطبوعات تبادلہ میں ارسال کی گئیں۔

● سوویت سوشلسٹ ری پبلک کلچرل ایسا ماسکو کو ادارہ کی دس تازہ مطبوعات تبادلہ میں بھیجی گئیں۔

چہارشنبہ ۱۶ر - ایوان اردو میں ۶ بجے شام مجلس انتظامی ادارہ کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انتظامی اور دیگر اشاعتی امور زیر بحث رہے۔ مولوی دلدار حسین صاحب کو نائب صدر، مولوی حامد علی عباسی اور پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی کو مجلس انتظامی کے ارکان منتخب کیا گیا۔

● نواب عالم یار جنگ نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

جمعرات، ۱۷ر - بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (صدر انجمن ترقی اردو کراچی) کے انتقال پر ملال پر ایوان اردو احتراماً بند رہا اور معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب نے ایک تعزیتی پیام کے ذریعہ مولوی صاحب کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔

● جنابہ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر صاحبہ اور مرزا فاروق علی صاحب صفوی نے ایوان اردو

معائنہ کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وہیندر راج سکسینہ اور مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحبان بھی موجود تھے۔

ہفتہ، ۱۹ر ڈاکٹر زور صاحب براہ الہ آباد کشمیر روانہ ہوگئے۔

● سہ ماہی کامران سرگودھا (اپریل جون ۱۹۶۱ء) میں سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

اتوار، ۲۰ر اردو ہال میں ڈاکٹر غلام یزدانی کی زیر صدارت مولوی ڈاکٹر عبدالحق کی رحلت پر ادارہ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو اور اردو مجلس کی طرف سے جلسہ تعزیت منعقد ہوا۔ ادارہ کی طرف سے پروفیسر سید محمد صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ نے مولوی صاحب کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔

چہارشنبہ، ۲۳ر جناب مولوی محمد ضامن صاحب (بمبئی) اور محترمہ صولت جہاں بیگم صاحبہ (بھوپال) اور عطیہ فاطمہ صاحبہ نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

● جناب فیض احمد ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی بائیس روزہ قیام مہمان خانہ ایوان اردو کے بعد میسور روانہ ہوگئے۔

ہفتہ، ۲۶ر حسب تصفیہ مجلس انتظامی ادارہ جناب زاہد علی خاں صاحب کا تقرر صیغہ مطبوعات میں عمل میں آیا۔

اتوار، ۲۷ر جناب سید انور حسین زیدی (نفیس رقم، لاہور) حیدرآباد پہنچے اور ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

جمعرات، ۳۱ر سب رس ماہ اگست شائع ہوا۔

ستمبر ۱۹۶۱ء

اتوار، ۳ر- پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند کی درخواست پر اردو اخبارات و رسائل کی کل ہند نمائش کے لئے ادارہ کی ۱۹۴۷ء کے بعد کی (۴۳) مطبوعہ کتابوں کو جناب اسحاق ایوبی انفارمیشن آفیسر حیدرآباد کے حوالے کیا گیا۔

پیر، ۴ر- ادارہ کی نئی کتاب کلمۃ الحقائق مرتبہ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی شائع ہوئی۔

● ادارہ ادبیات اردو کی شاخ ناندیڑ کے زیر اہتمام یوم مولوی عبدالحق منایا گیا۔ صدر ادارہ شاخ عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ نے جلسہ کی صدارت کی اور مقررین نے مولوی صاحب کی حیات اور شخصیت کے تعلق سے تقریریں کیں۔

چہارشنبہ ۶ر- جناب سلیمان خطیب (گلبرگہ) ایوان اردو میں تشریف لائے۔ اس موقع پر جناب راجندر ریڈی (ریسرچ اسکالر ادارہ) اور کیف رضوانی بھی موجود تھے۔ موصوف نے دکنی لوک گیت کے تعلق سے وقار خلیل صاحب سے تبادلۂ خیال کیا۔

● ادارہ کے اردو امتحانات میں کامیاب شدہ سنٹرل جیل حیدرآباد کے بیس قیدیوں کو ایک جلسۂ عام میں جو شری ٹی آر کیوائی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل کی صدارت میں منعقد ہوا معتمد اردو امتحانات جناب مولانا عارف الدین حسن صاحب (سابق کلکٹر) نے اسنادات تقسیم کئے۔ مولوی عارف الدین صاحب نے قیدیوں کے مدرسہ کے صدر مدرس جناب گنیش پرشاد کو ان کی اردو تدریسی خدمات کے اعتراف میں ادارہ کی طرف سے کتابیں بھی تحفتہً پیش کیں۔

جمعہ، ۸ر- ادارہ کی سفارش پر حیدرآباد کے مشہور ادیب مولوی تمکین کاظمی صاحب مرحوم کی بیوہ کو وزارت ثقافتی امور و سائنسی تحقیقات حکومت ہند کی طرف سے ماہانہ پچاس روپے وظیفہ منظور ہوا۔

ہفتہ، ۹ر- جناب ایس رامیا صاحب فینانشیل ایڈوائیزر ناگر جنا ساگر پراجکٹ نے جلال الدین سجن لال صاحب کے ہمراہ ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

اتوار، ۱۷ر- جناب مولوی ضیاء الحسن جعفری صاحب استاد سٹی کالج اور میر طاہر علی خاں پرویز (کراچی) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

● ادارہ کی مطبوعہ کتاب کلمۃ الحقائق پر روزنامہ امر بھارت میں تبصرہ شائع ہوا۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء

چہارشنبہ ۴ر ادارہ کی کتاب کلمۃ الحقائق (برہان الدین جانم) پر روزنامہ ملاپ حیدرآباد کی ادبی اشاعت میں تبصرہ شائع ہوا۔

جمعہ، ۶ر- جناب خلیق انجم صاحب لکچرار کروڑی مل کالج دہلی بسلسلہ ریسرچ حیدرآباد پہنچے اور ایوان اردو کے مہمان خانہ میں مقیم ہوئے۔

● [illegible] سٹی کالج (شعبہ ہائی اسکول) کے ۲۵ طلباء نے جناب محمد منظور احمد، ضیاء الحسن جعفری صاحب اور محمد اسحاق صاحب اساتذہ کی سرکردگی میں ایوان اردو کے تمام شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا۔ وقار خلیل صاحب نے

ادارہ اور میوزیم کے تمام شعبہ جات
سے طلباء کو واقف کرایا۔
منگل ۸ر۔ سب رس ماہ ستمبر اکتوبر
شائع ہوا۔
ہفتہ ۱۴ر۔ ادارہ کی دو تازہ مطبوعات
دیوانِ ہاشمی بیجاپوری اور تحفۃ الشعراء
(تذکرہ مرزا افضل بیگ خان قاقشال)
مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل شائع ہوئیں
پیر ۱۶ر۔ روزنامہ خدمت سری نگر میں
ادارہ کی مجریہ ماہانہ رپورٹ شائع ہوئی
● جناب خلیق انجم صاحب لکچرار کروڑی مل
کالج دہلی ایوان اردو کے مہمان خانہ میں
ایک ہفتہ قیام کے بعد دہلی روانہ ہوئے
ادارہ کی طرف سے وقار خلیل صاحب نے
موصوف کو خدا حافظ کہا۔
ہفتہ ۲۱ر آزاد میموریل لائبریری کے
معتمد اور خازن میر کمال الدین علی خان صاحب
اور سید مرتضیٰ خان صاحب اور عبد القادر صاحب
معتمد یونائیٹیڈ لائبریری بیگم بازار نے
ایوان اردو کا معائنہ کیا اور اردو پڑھائی
گھروں کے قیام اور کتب خانوں کی تنظیم کے
تعلق سے وقار خلیل صاحب سے گفتگو کی۔
منگل ۲۴ر۔ جناب سید شمس الدین صاحب
رکن بلدیہ گولکنڈہ نے ـــــ اردو پڑھاؤ
گھروں کے قیام اور کتب خانوں کی تنظیم
کے تعلق سے وقار خلیل صاحب سے گفتگو کی۔
منگل ۲۴ر۔ جناب سید شمس الدین صاحب
رکن بلدیہ گولکنڈہ نے ایوان اردو کا
معائنہ کیا اور دار المطالعہ کے قیام کے تعلق
سے کئی امور پر بات چیت کی۔
چہارشنبہ ۲۵ر ادارہ کی مجلس تاریخ
و تمدن دکن کے رکن مولوی سید علی اصغر
بلگرامی (سابق صوبہ دار) [illegible]
انتقال کر گئے۔ مرحوم کی مرتبہ کتاب
حدیقۃ السلاطین عنقریب ادارہ کی
طرف سے شائع ہونے والی ہے آخری
دنوں میں وہ اسی کے طباعتی انتظامات
کی دیکھ بھال میں لگے تھے۔
ہفتہ ۲۸ر۔ ۵½، ایوان اردو میں
پروفیسر ہارون خاں شروانی (ایم ایل سی)
کی صدارت میں علامہ سید علی اصغر بلگرامی
کی وفات پر جلسہ تعزیت منعقد ہوا۔
(تفصیلات اگلے صفحات پر درج ہیں)

نومبر ۱۹۶۱ء

جمعرات ۲ر ادارہ کی کتاب تماشائے
اہل ہنر پر ماہنامہ کتابی دنیا کراچی بابتہ
ماہ اکتوبر میں تبصرہ شائع ہوا۔
اتوار ۵ر۔ ۶ بجے ایوان اردو کے
ایک کثیر اجتماع میں آندھرا جنتی مشاعرے
کے سلسلے میں آئے ہوئے مہمان شعراء
صاحبان کا خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر سید علی
اکبر صاحب نے اس اجلاس کی صدارت
کی۔ پروفیسر سید محمد صاحب نے ادارہ کا
تعارف کراتے ہوئے شعراء صاحبان کا
خیر مقدم کیا۔ پروفیسر اکبر صدیقی اور
محمد جلال الدین صاحب مہتمم ادارہ نے
شعراء صاحبان کو ایوان اردو کا معائنہ
کرایا۔ حضرت فراق گورکھپوری، جناب
قتیل شفائی، جناب مخمور واحدی، جناب
روش صدیقی، جناب فنا نظامی کانپوری
جناب رام کشن مضطر اور جناب [illegible]
(ہندی) کے علاوہ عابد بن شبیر اور
محترمہ روحی علی اصغر نے اپنا کلام سنایا
جناب صدر نے شکریہ ادا کیا اور وقار خلیل صاحب
نے اس مشاعرہ کو کنوین کیا۔
چہارشنبہ ۸ر ماہنامہ صبح امید بمبئی
(بابتہ نومبر) میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب
دکھنی ہندو اور اردو پر تبصرہ شائع ہوا
چہارشنبہ ۱۵ر۔ پاکستان رائٹرس گلڈ کے
ترجمان ماہنامہ ہم قلم کراچی بابتہ نومبر میں
ادارہ کی ماہانہ رپورٹ شائع ہوئی۔
ہفتہ ۱۸ر ہفتہ وار ہماری زبان علی گڑھ
(۱۵ر نومبر) اور ہفتہ وار سرکار مدارس
(۱۰ر نومبر) میں ادارے کی مجریہ خیر مقدمی
و تعزیتی تقریبات کی تفصیلات شائع ہوئیں۔
پیر۔ ۲۰ر نومبر۔ یوم محمد قلی قطب شاہ
کی ابتدائی تیاریوں کے آغاز کی تفصیلات
ادارہ کے مجریہ پریس نوٹ کے تحت
مقامی اخبارات میں شائع ہوئیں۔
چہارشنبہ ۲۲ر۔ سب رس ماہ نومبر
شائع ہوا۔
جمعہ ۲۴ر۔ ۱۲ بجے۔ جامعہ اردو علی گڑھ
کے ترجمان ماہنامہ ادیب کے ایڈیٹر جناب
ابن فرید صاحب نے ایوان اردو کے
شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس
موقع پر قمر ساحری، عزیز اقبال، ماہر
کرنولی اور رضا کی حیدرآبادی صاحبان
موجود تھے۔ فرید صاحب نے وقار خلیل صاحب
سے مختلف ادبی مسائل پر بات چیت کی
اتوار ۲۶ر۔ ادارہ کی مطبوعہ کتاب
کلمۃ الحقائق (شاہ برہان الدین جانم)
پر روزنامہ [illegible] میں تبصرہ شائع ہوا

● منگل ۲۸ = جناب اسحاق ایلی صاحب، افارمیشن آفیسر پریس بیورو حیدرآباد نے اُردو اخبارات و رسائل کی حیدرآباد میں منعقد ہونے والی نمائش کے سلسلہ میں ادارہ سے تعاون کی درخواست کی اور پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی اور وقار خلیل صاحب سے اس سلسلہ میں بات چیت کی۔

ماہ دسمبر ۱۹۶۱ء

● چہارشنبہ = ۶ر۔ شری ین ایاور سندرم (ایم۔ اے، بی ایڈ) پرچارک گاندھی سمارک ندھی (رام کوٹ، شاخ حیدرآباد) نے ایوان اُردو کا معائنہ کیا اور اپنا تعارفی لٹریچر ادارہ کی نذر کیا۔

● جمعہ ۸ر ہفتہ وار ایشیا دہلی بابتہ ۸ر دسمبر میں حیدرآباد کے ادبی ادارہ کے تعلق سے ملک محمد علی خاں صاحب جرنلسٹ کا مضمون شائع ہوا جس میں ادارہ کے مختلف ادبی کارناموں کا ذکر کیا گیا تھا۔

● منگل ۱۲ر معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب کشمیر سے بذریعہ طیارہ حیدرآباد پہنچے۔

● ہفتہ ۱۶ر ساڑھے ۱۲ بجے ڈاکٹر ایم، ایس، ٹھیکر سکریٹری منسٹری آف سائنٹفک ریسرچ اینڈ کلچرل افیئرس حکومت ہند ڈائرکٹر جنرل سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ نے جو نل سرمبرالڈ ہسینہ ڈائرکٹر سنٹرل ریسرچ لیباریٹری کے ہمراہ ایوان اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب نے ان حضرات کا خیر مقدم کیا اور گلپوشی فرمائی جناب سید دلاور حسین صاحب چیف انجینیرو مشیر حکومت ہند بھی اس موقع پر موجود تھے۔

پیر ۱۸ر ادارہ کی کتاب دیوان ہاشمی پر روزنامہ سیاست میں تبصرہ شائع ہوا۔

● منگل ۱۹ر ۵ بجے۔ ادارہ کی مجلس انتظامی کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یوم محمد قلی قطب شاہ اور دیگر انتظامی و اشاعتی امور شریک ایجنڈا رہے۔

● ۵ بجے۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (پروفیسر جامعہ عثمانیہ) اور جناب محمد حسینی سابق ایڈیٹر سب رس ادارہ تشریف لائے اور معتمد صاحب سے مختلف امور پر بات چیت کی۔

● ۶ بجے۔ مسٹر جبین کیرہ من پریس انفارمیشن بیورو دہلی نے ایوان اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

چہارشنبہ ۲۰ر محترمہ شاکرہ فضل اللہ احمد صاحبہ شریک معتمد حیدری گشتی کتب خانہ نے ایوان اُردو کا معائنہ کیا۔

جمعرات ۲۱ر ساڑھے ۱۱ بجے۔ سردار کے ایم پانیکر وائس چانسلر جموں اینڈ کشمیر یونیورسٹی نے ڈاکٹر زور صاحب کی سرگردگی میں ایوان اُردو کا معائنہ کیا۔ ممتاز ادبی وعلمی افراد کے اجتماع میں صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نے جناب سردار پانیکر صاحب کی ادارے کی طرف سے گلپوشی فرمائی اور انھیں خوش آمدید کہا۔ اس موقع پر جناب ڈی، ایس، ریڈی، وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ، پروفیسر ہارون خاں شیروانی (ایم، ایل، سی) پروفیسر سید محمد پرنسپل، اُردو کالج، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ پنڈت دتّاتری دیوسو بانکار کے علاوہ ادارہ کی مجلس انتظامی کے اراکین اور دیگر اصحاب موجود تھے۔

● جمعہ ۲۲ر جناب سید محمد فضل اللہ صاحب صدر شعبہ ہائے اُردو، فارسی اور عربی، شری وینکٹیشورا یونیورسٹی ترپتی (آندھرا) نے ایوان اُردو کا معائنہ کیا اور مختلف علمی و ادبی مسائل اور آندھرا میں اُردو کے موقف پر ڈاکٹر زور صاحب اور وقار خلیل صاحب سے تبادلہ خیال کیا۔

● منگل ۲۶ر ۵ بجے ایوان اُردو میں ادارہ کی طرف سے آندھرا پردیش اُردو کانفرنس میں آئے ہوئے معزز مندوبین اور مہمان شعرا و عمائدین کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا خیر مقدم کیا گیا اور مسٹر عابد علی خاں مدیر سیاست و معتمد استقبالیہ اُردو کانفرنس اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ادارے کی طرف سے گلپوشی کی گئی نیز عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔

● جمعہ ۲۹ر دسمبر۔ ڈاکٹر حبیب النساء بیگم (میسور یونیورسٹی) جناب فقیر بادشاہ قادری لکچرار دکن کالج، جناب سلیم تمنائی لکچرار (میسور) نے ایوان اُردو کا معائنہ کیا۔

● ہفتہ ۳۰ر ادارہ کے سہ روزہ اردو امتحانات مرکز بلدہ و اضلاع پر شروع ہوئے۔

● سب رس ماہ دسمبر شائع ہوا۔

● جناب وقار خلیل صاحب ادارے کے امتحانات کے سلسلہ میں صدر نگران کی حیثیت سے نرمل روانہ ہوئے۔

● جمعرات ۲۸ر۔ ۱۰ بجے صبح۔ مولوی محمد سلطان صاحب مدرس وظیفہ یاب نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

● اتوار ۳۱ر۔ ۱۱ بجے۔ ممتاز ادیب و شاعر جناب شباب الدین صدیقی (دیال سنگھ کالج دہلی) نے ایوان اردو کا معاینہ کیا۔

چند اہم تقریریں

یوم محمد قلی قطب شاہؒ

(ادارہ کی طرف سے ۱۱ تا ۱۴ جنوری ۱۹۶۱ء کو یوم محمد قلیؒ عالی شان پیمانے پر منایا گیا)

خیر مقدمی تقریر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

شہزادہ گرامی قدر نواب مکرم جاہ بہادر اور خواتین و حضرات!

شہر حیدرآباد کے بانی اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد منانے کیلئے آج ہم پھر اس عظیم الشان بادشاہ کی گنبد کے اس عظیم اور وسیع چبوترے پر جمع ہوئے ہیں۔ یوں تو سلسلۂ قطب شاہیہ کے اس پانچویں ہر دل عزیز حکمران کی یاد اہل حیدرآباد کے دلوں میں گذشتہ ۳۰۰ سالوں سے برابر موجزن رہی ہے لیکن تقسیم ریاست حیدرآباد اور آندھرا پردیش کی تاسیس کے بعد جب نئی ریاست آندھرا کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آیا تو محسوس ہوا کہ یہ تو وہی آندھرا پردیش ہے جو محمد قلی قطب شاہ نے بسایا تھا اسکی وسعت عہد قطب شاہی میں موجودہ آندھرا سے بھی بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ اس کے بعد ہی سے ادارہ ادبیات اُردو نے اپنے صدر عالی قدر نواب زین یار جنگ کی رہنمائی میں محبوب بادشاہ اور محبوب تر انسان کی یاد منانے کا سلسلہ شروع کیا اور اس کا افتتاح آندھرا کے گورنر جناب بھیم سین سچر صاحب کے ہاتھوں آج سے چار سال پہلے اس چبوترے پر عمل میں آیا تھا۔ نہ معلوم وہ کیا مبارک گھڑی تھی کہ اس روز سے یہ تقریب دکن کی ایک قومی عید بن گئی ہے اور جوق درجوق لوگ اس بادشاہ کی یاد منانے کیلئے ہزاروں کی تعداد میں اس کی آخری آرام گاہ پر آتے ہیں اور گورنر اور چیف منسٹر سے لیکر ایک معمولی غریب ان پڑھ آدمی بھی اس علم دوست بادشاہ کی بڑائی اور خوبی کا اعتراف کرتا ہے۔

آج ہم بڑے خوش ہیں کہ اس چوتھے سال کی تقریبات جشن کا آغاز قطب شاہی بادشاہوں کے جانشین آصفجاہی سلاطین کے گل نوبہار شہزادہ مکرم جاہ فرما رہے ہیں۔ دکن کی تاریخ کو اس واقع پر ہمیشہ فخر رہے گا یہ ملک مسلسل کئی صدیوں سے امن و عافیت اور تہذیب و شائستگی کا مرکز رہا ہے اور یہاں کے حکمرانوں نے اس سرزمین کی ان دیرینہ روایات کو برقرار رکھا۔ جو محمد قلی قطب شاہ نے رائج کی تھیں۔ خاص طور پر حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس کے دور میں

«یوم محمد قلی قطب شاہ» منعقدہ ۱۱ - جنوری ۱۹۶۱ء



ڈاکٹر زور (معتمد ادارہ) خیر مقدمی خطبہ سنا رہے ہیں - صدر جلسہ پرنس مکرم جاہ بہادر کے بازو شہزادی اسریٰ برجس تشریف فرما ہیں -

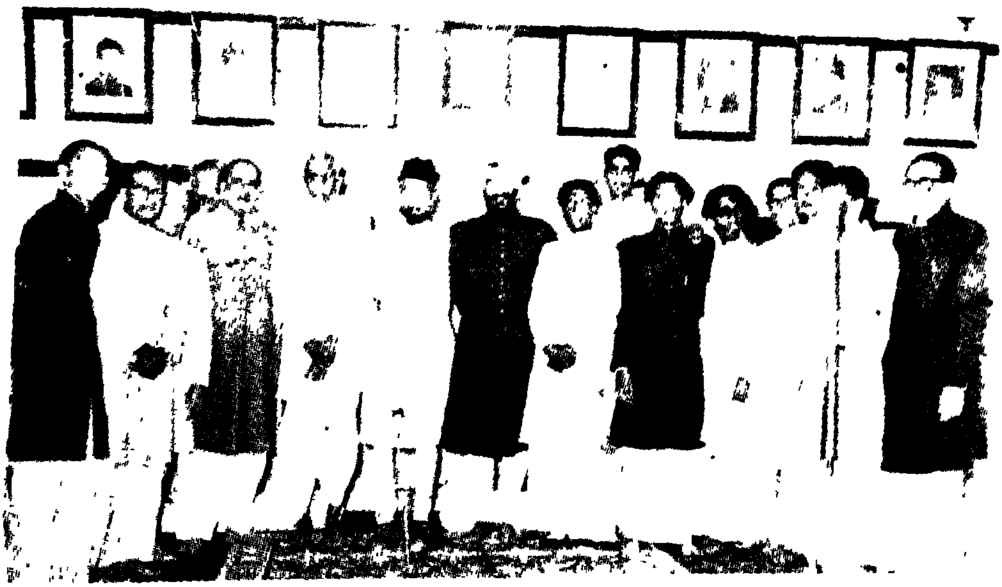


«یوم محمد قلی قطب شاہ» کے موقع پر منعقدہ ہند پاک مشاعرہ میں جگن ناتھ آزاد کلام سنا رہے ہیں اور ڈاکٹر زور، جوش ملیح آبادی، شاہد صدیقی -

ممتاز مہمان شعراء صاحبان کا «ایوان اُردو» میں خیر مقدم



روحی علی اصغر، غزل سنا رہی ہیں، پروفیسر سید محمد، فراق گورکھپوری، پروفیسر سید علی اکبر
اور قتیل شفائی شہ نشیں پر نظر آرہے ہیں۔



کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ایوان اُردو میں حیدر آباد کے شاعروں کے درمیان۔
اختر حسن، اوج یعقوبی، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، فیض الحسن خیال، سحر، [illegible]
[illegible]

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا محمد قلی قطب شاہ کا عہد دوبارہ عود کر آیا ہے اور حضور میر عثمان علی خاں آصف سابع نے جامعہ عثمانیہ قائم کر کے محمد قلی قطب شاہ کی اُردو سے دلچسپی اور اُردو کی سرپرستی کی یاد از سر نو تازہ کر دی۔ ایک ایسے اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ کا اس تقریب کی صدارت فرمانا نہ صرف حیدرآباد کیلئے باعث طمانیت و امتنان ہے بلکہ ہم سب کارکنوں کیلئے باعث فخر و مباہات۔ اسی لئے ہم آپ کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ حیدرآباد کی اس قومی عید کے ساتھ شہزادۂ معظم کی دلچسپیاں ہمیشہ باقی رہیں گی۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی عام مقبولیت کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ اہل ملک کی جملہ تقریبات میں دل کھول کر حصہ لیا کرتا تھا۔ اس کے دیوان میں عیدوں اور تہواروں جیسے ہولی، دیوالی، بسنت، شب برات، نوروز، محرم، عید بقرعید وغیرہ پر سیکڑوں نظمیں موجود ہیں۔ شادی بیاہ کی اکثر تقریبوں جلوہ، مہندی، شب گشت سے متعلق بھی اس نے پتہ پتہ کی باتیں لکھی ہیں۔ دکن کی برسات کی بہاروں پر اس نے جس شرح و بسط کے ساتھ مزے لے لے کر نظمیں لکھیں ہیں وہ اُردو کے ادب عالیہ میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ عوام کے میلے ٹھیلے اور کھیل کود بھی اس کی شاعری کا ایک دلچسپ موضوع ہیں۔ غرض ایسے ہی ان کا رنگ کے مضامین تھے جن کی بناء پر اس بادشاہ شاعر کا دیوان پچاس ہزار اشعار کی گنجینہ بنا ہوا ہے۔ اور اسے پڑھتے وقت ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا ہم خود ان تقریبوں میں حصہ لے رہے ہیں اور اس انعام و اکرام اور لطف و مروت سے مستفید ہو رہے ہیں جن سے یہ عوام دوست بادشاہ ان مواقع پر اپنے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں، امیروں اور غریبوں، عورتوں اور مردوں غرض ہر ایک کو بلا لحاظ مذہب و ملت وطبقہ و مرتبت سرفراز کیا کرتا تھا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس کے دسترخوان پر ہر وقت ایک ہزار آدمی کھانا کھایا کرتے تھے، اس کے محل کے دروازے خواص و عوام ہر ایک کے لئے کھلے رہتے تھے اور خاص طور پر کھانے کے اوقات میں تو روک ٹوک کی سخت ممانعت تھی۔ شہر کے ہر غریب و مفلس اور مسافر و بیکس کو بادشاہ کے ساتھ ہم طعامی کا شرف ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کی مروت اور مہمان نوازی چار دانگ عالم میں مشہور ہو گئی تھی اور شاید اب بھی کچھ کچھ مشہور ہے۔ خدا کرے کہ اس جدید آندھرا پردیش میں قدیم آندھرا کے اس عظیم ترین حکمران کی فراخ دلانہ روایات پھر سے عود کر آئیں اور محمد قلی قطب شاہ نے رواداری، محبت اور خلوص کے جو بیج کوہستان دکن کے سبزہ زاروں میں بوئے تھے وہ اب بھی برگ و بار لانے لگیں اور ہماری ان تقریبات کا مقصد پورا ہو سکے جو ہم اس شاعر بادشاہ اور انسان کی یاد میں مناتے آئے ہیں اور انشاء اللہ مناتے رہیں گے۔

"یوم محمد قلی قطب شاہ" کی تقریبات کے پروگراموں میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ تقریب صرف موقتی طور پر ہی نہیں منائی جاتی ہے بلکہ اسکے اثرات سال بھر باقی رہتے ہیں اور اس سلسلے میں متعدد ٹھوس اور مفید کام انجام پاتے رہتے ہیں۔ قطب شاہی عہد کی تاریخیں مرتب کرائی جا رہی ہیں جو توقع ہے اگلے یوم قلی تک چھپ بھی جائیں گی۔ اس کے علاوہ نواب عنایت جنگ بہادر کی تحریک پر ایک مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن بھی قائم کی جا چکی ہے۔ ادارہ کی طرف سے قطب شاہی ادب و تہذیب کے لئے ماہانہ سو روپیہ کے ریسرچ فیلو شپ بھی جاری کئے گئے ہیں۔

(اقتباس)

یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۱ء

صدارتی تقریر شہزادہ مکرم جاہ بہادر

نواب زین یار جنگ بہادر۔ ڈاکٹر زور صاحب اور خواتین و حضرات!

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے ہمارے ملک کے ایک قدیم نیک نام اور مقبول عوام بادشاہ کی یاد ہر سال اعلیٰ پیمانہ پر منائی جاتی ہے۔ اور یہ کام صرف جلسوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کے سلسلہ میں مفید علمی و ادبی کتابیں اور یادگاری رسالے بھی چھاپے جاتے ہیں۔

ہمارے وطن کی تاریخ بہت دلچسپ اور بہت بڑی ہے۔ مجھے یہ سنکر تعجب ہوا کہ قطب شاہی دور کی تاریخیں ابتک چھپ کر منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ یہ بہت ضروری کام تھا اور اس کو چھپوانا پورے ہندوستان کی تاریخ نگاری کی تکمیل کے لئے ضروری تھا۔ میں ادارہ کو اور ان اصحاب کو مبارکباد دیتا ہوں جو ان تاریخی کتابوں کی اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

خاندان آصفی کی جن خصوصیات کی طرف ڈاکٹر زور صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ مجھے بھی بہت عزیز ہیں اور مجھے اس کا فخر ہے کہ میں ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جس نے اس ملک کی علمی ادبی زندگی اور تمدنی ترقی کے لئے اس طرح سے ذاتی دلچسپی لی جس طرح سے کہ قطب شاہی بادشاہ اور خاص کر محمد قلی قطب شاہ لیا کرتے تھے۔

میں بچپن ہی سے گولکنڈہ اور قطب شاہی گنبدوں میں دلچسپی لیا کرتا تھا اور جب کبھی میرا گذر ادھر ہوتا میں شوق سے ان قدیم بادشاہوں کے تاریخی آثار اور ان کی تعمیری خصوصیات کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ حیدرآباد کے اس ہردلعزیز بادشاہ کی ۳۵۰ ویں یادگاری تقریب کی صدارت کے لئے آج آپ حضرات نے مجھے دعوت دی ہے میں نے ایوان اردو کے معائنہ کے وقت بھی قطب شاہی تصویروں۔ فرامین۔ کاغذات اور دیگر اشیاء کو دلچسپی سے دیکھا تھا اور انکو ایک جگہ جمع کرنے اور حفاظت اور شائستگی کے ساتھ ایک میوزم میں رکھنے پر آپ کو مبارکباد دی تھی اور آج بھی آپ کے اس جلسہ کے اہتمام اور خوش سلیقگی پر آپ کو مبارکباد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کی ان کوششوں سے حیدرآباد کی دیرینہ روایات کے زندہ و پائندہ رہنے میں مدد ملے گی اور مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر میں بھی آپ کے ان کاموں میں آپ کی مدد کرسکوں۔ اور اپنے اسلاف کے قدم بقدم چل کر حیدرآباد کی نیک نامی اور اہل حیدرآباد کی خوشحالی کے لئے جو کچھ مجھ سے ممکن ہو کر سکوں۔

میں بڑی خوشی سے یوم محمد قلی قطب شاہ کی ان تقریبات کا افتتاح کرتا ہوں۔

جناب شان الحق حقی کے ساتھ ایک شام

اتوار، ۲۲/جنوری ۱۹۶۱ء کو ایوانِ اُردو میں ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے پاکستان کے ممتاز شاعر اور ادیب جناب شان الحق حقی (ترقی اردو بورڈ کراچی) کے ساتھ ایک یادگار شام گزاری گئی۔ جناب حقی یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں منعقدہ ہند و پاکستان مشاعرہ میں شرکت کیلئے حیدرآباد آئے تھے۔ ادارہ کی طرف سے آپ کے اعزاز میں پرتکلف عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ حیدرآباد کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، پروفیسروں اور ادب دوستوں کے اس مخصوص اجتماع کو جو ایوانِ اُردو کی بالائی منزل اُردو میوزیم کے ایک حصے میں منعقد ہوا۔ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے علاوہ ہند و پاک میں اردو ادیبوں کے مسائل، کتابوں کی اشاعت و نکاسی اور رفتارِ ادب کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال ہوا۔

جناب حقی نے اردو رسم الخط اور ٹائپ کے استعمال کے بارے میں ترقی اُردو بورڈ کے معتمد کی حیثیت سے کئی اہم اور قابلِ عمل مسائل پر روشنی ڈالی۔ موصوف نے جو کی جسکی لیتے اور سگریٹ کے مرغولے بناتے مختلف طریقوں سے حیدرآباد کے ادیبوں اور دانشوروں کی اس محفل میں محوِ تکلم رہے۔ ڈاکٹر زور، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر حسینی شاہد، پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی، خواجہ حمید الدین شاہد، زینت ساجدہ، غلام رسول، دلدار حسین، اور عائشہ رشاد وغیرہ نے قریب دو گھنٹے تک جناب حقی سے تبادلۂ خیال کیا۔ معتمد عمومی ادارہ ڈاکٹر زور صاحب کے رسمی شکریہ پر یہ خوشگوار تقریب ختم ہوئی۔

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا خیر مقدم

جمعرات، ۲/فروری ۱۹۶۱ء کو ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے ایوانِ اُردو کے سجے سجائے آڈیٹوریم میں اُردو کے ممتاز و مقبول شاعر جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا محفلِ شعر و سخن میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اس خوبصورت تقریب کا آغاز ڈاکٹر زور صاحب کی خیر مقدمی تقریر سے ہوا۔ اُنھوں نے کہا کہ سحر صاحب کی متنوع اور رنگا رنگ شخصیت زندہ دلانِ پنجاب کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی ذات میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ کلام میں تاثر اور لہجے کے دھیمے پن کے ساتھ ساتھ ترنم اور نشاط جھلکتا ہے۔ سحر صاحب اُردو کے ممتاز اور قادر الکلام شعراء کی صف میں اپنے منفرد اور تیکھے لب و لہجہ کی بنا پر مدتوں زندہ رہیں گے۔ ڈاکٹر زور کے ان کلمات خیر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جناب سحر نے اس خیر مقدم پر ادارہ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور بانی ادارہ ڈاکٹر زور کے علمی و ادبی خدمات کے تئیں عقیدت و احترام کا اظہار کیا اور ادارے کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے شہر حیدرآباد کی علمی و ادبی سرپرستی اور اس کی گنگا جمنی تہذیبی روایات کو پُرزور الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ حیدرآباد حقیقی معنوں میں علم و ادب کا گہوارا ہے

اس سرزمین کو سحر صاحب نے ایک ایسے گلدستہ سے تعبیر کیا کہ جس کی مہک سے سارا ملک معطر ہوتا رہا ہے۔ اردو والوں کی ذمہ داریوں اور اردو مشاعروں کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے سحر صاحب نے کئی دلچسپ واقعات مزے لے لے کر سنائے اور حاضرین محفل کو اپنی تازہ نظم "حیدرآباد" کے علاوہ دیگر کلام سے گرمایا۔

اس محفل شعر سخن میں پنڈت راگھویندر راؤ جذب عالمپوری، خیرات ندیم، اوج یعقوبی، سرور ڈنڈا، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، خواجہ حمید الدین شاہد (کراچی) خواجہ شوق، فیض الحسن خیال، منوہر لعل شارب، ڈاکٹر اسعد انصاری اور نذیر نیر نے اپنا کلام سنایا۔ حاضرین کی چائے اور کیک پیسٹری سے تواضع کی گئی۔

جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحر نے ایک خوبصورت فی البدیہہ نظم دکن میں اپنے تاثرات اس طرح ظاہر فرمائے۔

جہاں فرد اپنی جگہ انجمن ہے — جہاں ہر کلی اک مہکتا چمن ہے
جہاں شعریت ہو جہاں قدر فن ہے — جہاں علم و فن کیلئے اک لگن ہے
جہاں حیرت و آور کا بھی وطن ہے — جہاں انجمن واقعی انجمن ہے

جو سچ پوچھتے ہو سحر تو وہ خطہ
دکن ہے دکن ہے دکن ہے دکن ہے

ادارہ "ادبیات اردو" میں پنڈت گوپی ناتھ امن کا

خیر مقدم

"اردو کو آندھرا پردیش میں علاقائی اور ثانوی حیثیت حاصل ہے اور اردو کے تعلق سے راجدھانی دہلی کے مقابل حیدرآباد میں حالات سازگار ہیں۔ دہلی میں ابھی تک اردو کو علاقائی زبان کا حق نہیں ملا ہے"۔ پنڈت گوپی ناتھ امن سابق وزیر حکومت دہلی نے ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے ۲۰/ جولائی شام کے سات بجے ایوان اردو میں منعقدہ خیر مقدمی تقریب میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ جناب امن نے کہا کہ جہاں تک اردو کے مزاج کا تعلق ہے ہم اردو والوں نے ابتک آئینی طریقوں پر اپنی جد و جہد کو جاری رکھا ہے۔ اردو طریقہ تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں حالات کی پروا کئے بغیر اردو مدارس کے قیام کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اور اردو تعلیم کے مدارس زیادہ سے زیادہ قائم ہوں۔ اردو کی ہمہ گیری اور آفاقیت کے تعلق سے پنڈت امن نے کہا کہ اردو نے ہر زبان کے الفاظ کو اپنایا ہے۔ اس میں وسعت اور ہمہ گیری ہے نیز اردو زبان کے ضمیر میں زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے عناصر شامل ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے علمی، ادبی اور تحقیقاتی کاموں کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے آپ نے اسے ملک کے لئے قابل فخر سرمایہ سے تعبیر کیا۔ اور اس ادارے کے معتمد ڈاکٹر زور صاحب کے مخلصانہ خدمات کی ستائش کی۔

ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ نائب معتمد ادارہ نے اردو کے مشہور شاعر اور ادیب جناب امن اور ہندی و انگریزی کے ممتاز مصنف جناب مدن گوپال انفارمیشن افیسر کمیونٹی ڈیولپمنٹ حکومت ہند کا خیر مقدم کیا۔

اس خیر مقدمی تقریب کا اہم جز محفل شعر و سخن تھی جسے وقار خلیل نے آرگنائز کیا۔ حضرت امن کے

قمر ساحری، کنول پرشاد کنولؔ، رودحی، علی اصغر، بانو طاہرہ سعید، حمید شمسی، سرور ڈنڈا، اسد انصاری، کرن پرشاد کرنؔ، رگھو بنسی نرمل، برق یوسفی، صلاح الدین نیرؔ، فیض الحسن، ودلیف رضوانی نے اپنا کلام سنایا۔ ساڑھے بجے شام یہ محفل خوشگوار فضا میں اختتام کو پہنچی۔

اردو کے ممتاز شعراء صاحبان کا ایوان اردو میں خیر مقدم

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ۱۵ نومبر کو اتوار شام کے ۵ ½ بجے "ایوان اردو" میں آندھرا جینتی تقاریب کے سلسلہ میں منعقدہ ہند و پاک مشاعرہ میں شرکت کیلئے آئے ہوئے شعرا صاحبان کا ممتاز اجتماع میں پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ ایوان اردو کا آڈیٹوریم اور بالائی گیلری حاضرین سے پر ہوگئی تھی۔ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی اور محمد جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ نے مہمان شعراء صاحبان کو ایوان اردو کے تمام شعبہ جات کی سیر کرائی۔

اس خیر مقدمی تقریب کی صدارت ادارہ کے صدر پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے فرمائی۔ پروفیسر سید محمد صاحب پرنسپل اردو کالج نے مہمان شعرا صاحبان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں ادارہ کا تعارف کرایا ازاں بعد حضرت فراق گورکھپوری (الہ آباد) حضرت قتیل شفائی (لاہور) حضرت روش صدیقی (دہلی) حضرت نشور واحدی (کانپور) حضرت فنا نظامی (کانپور) جناب رام کرشن مضطر (دہلی) اور شری اندی ور (الہ آباد) نے اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ مقامی شعراء میں جناب عابدین قیصر اور محترمہ روحی علی اصغر نے داد پائی۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر کے شکریہ پر یہ خیر مقدمی تقریب اختتام کو پہنچی جسے وقار خلیل نے کنوین کیا۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن اور اردو کانفرنس کے مندوبین مہمان شعراء ایوان اردو میں

۲۴ دسمبر کی شام ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ایوان اردو میں آندھرا پردیش اردو کانفرنس کے موقع پر آئے ہوئے مندوبین مہمان شعراء صاحبان اور جمعیۃ العلمائے ہند کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن (ممبر پارلیمنٹ) کا کثیر اجتماع میں خیر مقدم کیا گیا۔

عصرانہ سے قبل مدعوین نے معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب کی رہنمائی میں ایوان اردو کے مختلف شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر زور نے خیر مقدمی تقریر کی اور مسٹر عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست معتمد استقبالیہ اردو کانفرنس کی خدمات کو سراہتے ہوئے کانفرنس کی کامیابی پر ادارہ کی طرف سے ان کی گلپوشی کے لئے مولانا حفظ الرحمٰن سے استدعا کی۔ ڈاکٹر زور نے مولانا صاحب کے ادبی اور ملکی خدمات کے اعتراف میں ادارہ کی طرف سے انکی گلپوشی فرمائی۔ نیز پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب معتمد ریاستی انجمن کو بھی پھول پہنائے گئے۔ مسٹر عابد علی خاں نے اس قدر افزائی پر ادارہ کا شکریہ ادا کیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے ادارہ کے ٹھوس اور خاموش ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "یہ ادارہ گذشتہ تیس سال سے زبان و ادب کا گراں مایہ خدمت سرانجام دے رہا ہے اور اردو زبان و ادب کے تحفظ و اشاعت میں "ایوان اردو" مینارۂ نور کا مقام رکھتا ہے" مولانا صاحب نے ہندوستان میں اردو زبان کے مستقبل اور اس کی ہمہ گیری پر بھی روشنی ڈالی۔

حضرت شاہد صدیقی کی صدارت میں محفل شعر و سخن منعقد ہوئی جس میں پاکستان کے ممتاز شعراء حضرت حبیب جالبؔ اور حضرت قتیل شفائی کے علاوہ علی گڈھ کے جناب بیکل محسوس، دہلی کے جناب زبیر رضوی اور لکھنؤ کے جناب انور مرزاپوری نے اپنا کلام سنایا۔

ممتاز ادیبوں، شاعروں، پروفیسروں اور اردو دوستوں کے اس اجتماع میں مسز ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (ایم پی) رائے جانکی پرشاد، پروفیسر سید محمد اردو کالج، ڈاکٹر حبیب النساء بیگم (میسور یونیورسٹی) ڈاکٹر وحید اختر (علی گڈھ) سلیم تمنائی (میسور) مولانا ابو یوسف (ایم۔ ایل۔ سی) نواب میر احمد علی

حضرت امجد

کا

ایوانِ اُردو میں تعزیتی جلسہ

اُردو کے صوفی منش شاعر، سرمدِ دکن حضرت سید احمد حسین امجد حیدرآبادی کے انتقال پُر ملال کی خبر ملتے ہی ۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء کو ادارۂ ادبیات اردو بعد دوپہر احتراماً بند کر دیا گیا۔ اسٹاف نے نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔

۳۱/ مارچ کو شام کے ۵ بجے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے "ایوانِ اردو" میں جلسۂ تعزیت جناب پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نائب صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حافظ قاری نذیر الدین احمد صاحب نے قراءت سنائی۔ ڈاکٹر مہندر راج صاحب سکسینہ نائب معتمد ادارہ نے حضرت امجد کو خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا کہ حضرت امجد کے انتقال سے حیدرآباد نے ایسا صدمہ محسوس کیا ہے کہ شاید سیاسی بحران کے بعد بھی محسوس نہ کیا ہو۔ اس خلا کے صدیوں بعد بھی پُر ہونے کی توقع نہیں ہے۔ دکن کی سرزمین بے اعتنائی کیلئے مشہور ہے مگر حیدرآباد والوں نے امجد صاحب کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ ہمارے ادارہ نے جنوری ۱۹۵۵ء میں حضرت امجد کے شعری خدمات کے اعتراف میں شاندار جشنِ الماسی منایا تھا اور انھیں کیسۂ زر بھی پیش کیا تھا۔

جناب اوج یعقوبی صاحب نے مختصراً مضمون سنایا اور حضرت امجد کی شخصیت اور شاعری کے تعلق سے کہا کہ ان کی شخصیت دکن کا ثقافتی، تہذیبی، علمی، ادبی اور اخلاقی ورثہ اور ادب کی قابلِ قدر متاع تھی۔ ان کی شخصیت کا قد ان کی شاعری سے بھی اونچا تھا۔ توقع نہیں کہ صدیوں بعد ان کی جگہ پُر ہو"

جناب وقار خلیل صاحب نے "نذرِ امجد" کے عنوان سے رباعیاں پیش کیں ایک رباعی یہ ہے ؎

اقلیمِ رباعی کے سخنور امجد — اے مردِ حق آگاہ قلندر امجد
رو نہیں گے جہاں تجھکو ہم اہلِ اردو — گمراہ تجھے ڈھونڈیں گے رہبر امجد

جنابِ صدر نے قرارداد کی پیشکشی سے قبل تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ "حضرت امجد میرے شفیق اُستاد اور قابلِ قدر بزرگ تھے۔ وہ جید عالم، بڑے صوفی اور معلمِ اخلاق ہی نہیں بلکہ منفرد شخصیت کے حامل اور پہلودار مردِ حق آگاہ تھے۔ حضرت امجد کی رحلت اس عہد کا بہت بڑا سانحہ ہے اور ان کی جگہ ہمیشہ ہمیشہ خالی رہے گی۔" حاضرین نے مندرجہ ذیل قرارداد کو ایستادہ ہو کر منظور فرمایا۔

"ادارۂ ادبیات اُردو کا یہ تعزیتی جلسہ اُردو کے سربلند، منفرد اور برگزیدہ رباعی گو شاعر حضرت سید احمد حسین امجد حیدرآبادی کی وفاتِ حسرت آیات پر گہرے حزن و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ اردو زبان کے اس نازک دور میں حضرت امجد کی

ملت سے اردو رباعی کا ایک عظیم ستون اور تصوف کا ایک بیکراں سرچشمۂ قوت اور اردو و ادب کا بے غرض محسن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا۔ مرحوم انسان اور شاعر کی حیثیت میں بھی ہر لحاظ سے بزرگ، برتر اور قوم و ملک کا قابل فخر سرمایہ تھے گو آج حضرت امجد ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی ادبی کارنامے زندہ جاوید رہیں گے ۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے ۔ جلسہ کا اختتام قاری صاحب کی دعائے مغفرت پر ہوا ۔ اس موقع پر حضرت امجد کے عقیدت مند ادیب، شاعر، اور پروفیسر صاحبان کے علاوہ کئی اردو دوست بھی شریک تھے ۔

حضرت امجدؔ کی فاتحہ چہلم کے موقع پر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے مندرجۂ ذیل کتبہ ان کی مزار پر نصب کیا گیا قطعہ تاریخ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی کا تحریر کردہ ہے ۔

کتبہ

اندرونی رخ

بسم اللہ توکلت علیہ

حکیم الشعراء سید احمد حسین امجدؔ

ولادت ۔ دوشنبہ ۶/ رجب ۱۳۰۳ھ

وفات ۔ پنجشنبہ ۱۲/ شوال ۱۳۸۰ھ

بندہ پہنچا ہے اپنے مولا کے حضور
اغفر لہ وارحمہٗ یارب غفور
تاریخ کی جو کی فکر ہاتف نے کہا
کہہ دے سنِ ہجری میں " آہ امجد مغفور "
۱۳۸۰ھ

منجانب

ادارۂ ادبیات اردو

بیرونی رخ

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

[illegible]
[illegible] " انشاء اللہ "

[illegible]
[illegible]

سید احمد حسین امجد ہوں میں
امجد ہوں مگر جواب سرمد ہوں میں
گوندھی ہوئی ہے نور سے مٹی میری
خاکِ قدمِ پاکِ محمدؐ ہوں میں

منجانب

ادارۂ ادبیات اردو

نوابِ زین یار جنگ کو خراج عقیدت

ایوانِ اردو میں جلسۂ تعزیت

حیدرآباد ۱۸ مئی۔ پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر، صدر ادارۂ ادبیات اردو کے سانحۂ ارتحال کے سلسلہ میں منعقدہ جلسۂ تعزیت کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر سید علی اکبر نے کہا کہ نواب صاحب میں انتظامی صلاحیتیں طالب علمی کے زمانہ سے ہی موجود تھیں۔ نواب صاحب ہاکی کے بعد شوقین ہی نہیں تھے بلکہ اس کھیل کو حیدرآباد میں متعارف کرانے کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ آپ نے ابتدائی زمانے میں ہاکی کا شوق عثمان ساگر کی تعمیر کرنے والے مزدوروں میں پیدا کیا اور انکی باضابطہ ٹیم بھی تیار کی۔ نواب صاحب نے حیدرآباد اور حیدرآباد والوں کی فلاح و بہبود کیلئے پولیس ایکشن کے بعد جو خدمات انجام دیں انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ مرحوم مروّت کا پیکر اور اخلاق و اخلاص کا مجسمہ تھے۔ جن اداروں سے وہ منسلک رہے ان کو بام ترقی پر پہنچا دیا۔

جلسۂ تعزیت کا آغاز حافظ نذیر الدین صاحب کی قراءت سے ہوا۔ مسرز نصیر الدین ہاشمی، احمد جلیس اور ڈاکٹر زور معتمد عمومی ادارہ نے نواب صاحب کی شخصیت، ادبی اور سماجی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ حیدرآباد کے اُن باکمال افراد میں سے تھے، جن کی وضعداری، مہارتِ فن اور تہذیب و شائستگی عرصے تک ضرب المثل سمجھی جائے گی۔ اِن میں وسعت نظری اور فراخ دلی بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ نواب صاحب کا نام سلطان قلی قطب شاہ کی طرح صدیوں دکن کی تعمیر کاری کی تاریخ میں زندہ و پائندہ رہے گا۔ ادارہ ادبیات اردو کیلئے تو وہ شروع ہی سے روشنی اور طاقت کے ستون تھے۔ وہ ایک ایسا ستون تھے جو بڑی بڑی پریشانیوں اور الجھنوں کے وقت ہمارا سہارا تھا۔ افسوس ہے وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا طریقہ کار اور انکی وسیع القلبی اور مشفقانہ ہدایتیں ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہیں گی۔ آخر میں کرسی صدارت سے قرار داد تعزیت پیش کی گئی جو مندرجہ ذیل ہے۔

قرار داد تعزیت

"ادارۂ ادبیات اردو کا یہ جلسہ عام پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر کے انتقالِ پُر ملال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

نواب صاحب اپنی فنی مہارت اور سیاسی خدمات کے علاوہ حیدرآباد کی ادبی اور کلچرل دنیا میں ایک سرِ آمدہ شخصیت کے مالک تھے وہ ادارۂ ادبیات اردو کے موجودہ صدر ہونے کے علاوہ گذشتہ تین سال =

اس کے معاون اور مددگار بھی رہے۔ ان کی وفات سے قدیم تہذیب و شائستگی اور تدبر و فراست کے ایک ایسے علمبردار کی کمی ہوگئی ہے۔ جس کی نظیر اب ہندوستان کے کسی علاقہ میں شاید ہی پیدا ہو سکے۔ ادارۂ ادبیات اردو کو تو ان کی وفات سے نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے، اور انکے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ اس قرارداد تعزیت کی ایک ایک کاپی ان کے صاحبزادوں جناب سعادت علی خاں صاحب، سلامت علی خاں صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھیج دی جائے۔

علامہ حیرت بدایونی کی دعائے مغفرت کے بعد ایوان اردو میں منعقدہ یہ جلسہ تعزیت اختتام کو پہنچا۔

قطعہ تاریخ وفات نواب زین یار جنگ بہادر

(نتیجۂ فکر: عبد الغنی خاکی حیدرآبادی)

تھے عاشق نبی و علی زین یار جنگ — سوئے عدم گئے ہیں وہی زین یار جنگ

منظر عجیب مجھ کو نظر آرہا ہے آج — جیسا کہ سامنے ہیں ابھی زین یار جنگ

خاکی ملا ہے مصرعۂ تاریخ غیب سے

ہر غم سے زاہدا ہیں بری زین یار جنگ

۱۹۷۱ء

از ڈاکٹر زور

روشنی کا ستون

مرحوم نواب زین یار جنگ بہادر

(ڈاکٹر زور صاحب نے جلسۂ تعزیت میں یہ مضمون سنایا تھا)

پدما بھوشن، نواب زین یار جنگ بہادر حیدرآباد کے ان باکمال افراد میں سے تھے جن کی وضعداری، مہارت فن اور تہذیب و شائستگی عرصے تک ضرب المثل سمجھی جائے گی۔ ان میں وسعت نظر اور فراخ دلی بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ہندو مسلم اور شیعہ و سنی کا فرق انھوں نے کبھی پیش نظر نہیں رکھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور ہر چھوٹے بڑے کی شادی و غمی کی تقریبوں میں التزام کے ساتھ شریک رہتے تھے۔

حیدرآباد کی سماجی زندگی اور علمی و ادبی ماحول بڑی حد تک ان کی سرگرمئ عمل اور اعلیٰ ذوق سے متاثر ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں، باغ عامہ کے ہال اور ایوان و مسجد، حیدرآباد کے اکثر و بیشتر عاشور خانے انھی کی تعمیر کاری اور

فنی قابلیتوں کے شاہد ہیں۔ گذشتہ تیس پینتیس سال کی عمارتیں اپنی لمبوتری کمانوں اور دوسری فنی خصوصیتوں کی وجہ سے حیدرآباد کی دوسری عمارتوں میں فوراً پہچان لی جا سکتی ہیں۔ اور یہی وہ اسلوب تعمیر ہے جو نواب زین یار جنگ کے نام اور کام کو اس طرح دکن کی ثقافتی تاریخ میں زندہ رکھے گا جس طرح سلطان محمد قلی قطب شاہ کی مصفی پتھر یعنی ڈریسڈ اسٹون میں بنوائی ہوئی عمارتیں آج تک اپنے بانی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اپنی عمارتوں کو چونے کی استرکاری اور نقش ونگار سے مزین کیا کرتا تھا۔ لیکن سلطان محمد قطب شاہ نے مکہ مسجد اور دوسری تمام عمارتیں سنگ خارا کو مصفی کرا کے اس سے تیار کرائی تھیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت اور اس کے زیر تجویز گولکنڈہ میوزیم کے لئے بھی نواب صاحب نے ایسے ہی نقشے تیار کئے تھے اگرچہ ایوان اردو ان کے نقشے کے مطابق نہیں بنا لیکن اس کی تعمیر میں بھی قدم قدم پر ان کی رائے اور منظوری کو دخل رہا ہے۔ وہ ایک عرصے تک اس کے نائب صدر رہے اور چند ہی سال قبل سے اس کی صدارت فرما رہے تھے لیکن ہر حیثیت میں وہ ایسا اور اتنا کام کرتے تھے جو ادارے کا کوئی کارکن بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جب سنہ ۱۹۴۳ء میں ادارے نے ایک کل ہند اردو کانگریس منعقد کی تو نواب صاحب ہی اس کے صدر استقبالیہ تھے اور مہمانوں کے قیام وطعام اور جلسے کے انتظامات سے لیکر بیت الخلاء کی چوکیوں اور واپس جانے والے مہمانوں کیا تھ توشے کی ٹوکریوں تک کا اہتمام نواب صاحب نے بنفس نفیس فرمایا تھا

سنہ ۱۹۵۸ء میں جب یوم محمد قلی قطب شاہ منانے کا تہیہ کیا تو جلسہ اور جلوس سے قبل کئی بار ان مقامات کا خود معائنہ کیا جہاں سے یہ جلوس گذرنے والا تھا۔ جلسہ گاہ پر بھی کئی بار تشریف لے گئے اور دھوپ، روشنی، فرش اور سواریوں کے ٹھہرنے کے مقامات کے لئے بنفس نفیس ہدایتیں دیں

سنہ ۱۹۵۹ء کے یوم محمد قلی قطب شاہ کے لئے بھی ایسا ہی اہتمام کیا اور چونکہ ہر وقت مجھے ساتھ لے جاتے تھے اس سال کے معائنہ کے دوران مجھ سے مو ٹر میں فرمایا کہ میں اپنی صحت اور اندرونی کیفیت کی بنا پر ایسا محسوس کرتا ہوں کہ شائد صرف ایک آدھ سال اور آپ کا ساتھ دے سکوں گا۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ کو سمجھا دوں کہ تقریبیں کس طرح منائی جائیں اور ان کے انعقاد سے پہلے کن کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

جب سنہ ۱۹۶۰ء کے یوم محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ آیا تو نواب صاحب کی صحت خراب ہو چکی تھی اور ڈر تھا کہ شائد اس بار وہ انتظامات میں شریک نہ ہو سکیں گے مگر خرابی صحت اور کمزوری کے عالم میں بھی انھوں نے شرکت فرمائی۔

سنہ ۱۹۶۱ء کے یوم محمد قلی کے انتظامات میں بھی اپنی بیگم صاحبہ کی شدید علالت کے باوجود حصہ لیا اور ۲۶ دسمبر کی پریس کانفرنس کی خود ہی ایوان اردو میں صدارت فرمائی۔ یہ غالباً ان کی آخری پبلک تقریب تھی اس کے بعد وہ خود لیٹ گئے اور ایسے لیٹے کہ ۱۱ جنوری کے یوم محمد قلی میں بھی شریک نہ ہو سکے اور آخرکار ۱۶ مئی کو امن واطمینان کیساتھ دنیا ہی کو چھوڑ گئے اور انوار العلوم کالج، اسلامک کلچر انسٹی ٹیوٹ، روٹری کلب اور ایسی ہی بیسیوں انجمنوں کے کارکنوں کو اپنا سوگوار بنا گئے۔

ادارہ ادبیات اردو کیلئے تو وہ شروع ہی سے روشنی اور طاقت کے ستون تھے۔ ایک ایسے ستون جو بڑی بڑی پریشانیوں اور الجھنوں کے وقت ہمارا سہارا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا طریقہ کار اور ان کی وسیع القلبی اور مشفقانہ ہدایتیں ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہیں گے خدا ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے اور ہم ادارہ کو ان کی خواہشات اور توقعات کے مطابق چلا سکیں۔

جلسۂ تعزیت مولوی تمکین کاظمی مرحوم

اردو کے ممتاز ادیب مولوی سید تمکین کاظمی صاحب کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار اور مرحوم کے بیش بہا ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کیلئے ادارہ ادبیات اُردو کی طرف سے ایوانِ اردو میں ۲۰/ جون بروز جمعہ شام کے ۶ بجے ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جناب پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نائب صدر ادارہ نے جلسہ کی صدارت کی۔ قاری نذیرالدین صاحب کی قراءت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ جناب نواب میر لئیق علیخاں صاحب نے "تمکین کاظمی کی شخصیت اور فن" کے زیرِ عنوان اپنا پُرمغز مقالہ سنایا آپ نے اُردو دنیا کے آگے مرحوم کے تعلق سے تین تجاویز پیش کیں جس میں مرحوم کے غیر مطبوعہ و مرتب تصانیف و تالیف کی اشاعت اور مرحوم کے کمسن بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے مرکزی وزارتِ تعلیم سے ملنے والے وظیفہ کو قابل لحاظ عرصہ تک جاری رکھے جانے اور پھر مرحوم کی قبر کو پختہ بنا کر اس پر کتبہ نصب کیا جانا شامل تھا۔

مولوی حبیب الرحمٰن صاحب معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے اِن تجاویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ تمکین صاحب کی رحلت اردو دنیا کیلئے ناقابلِ تلافی صدمہ ہے اور اس غم میں انجمن ترقی اردو بھی برابر کی شریک ہے۔ آپ نے اعلان کیا کہ مرحوم کے لڑکے کی اعلیٰ ثانوی تک تعلیم کے سب اخراجات انجمن برداشت کرے گی اور آئندہ کیلئے بھی انجمن مددگار ہوگی۔

وقار خلیل صاحب مدیر سب رس نے مرحوم کے ادبی خدمات کے اعتراف میں قطعات سنائے کرسیِ صدارت سے قراردادِ تعزیت پیش کرنے سے قبل پروفیسر صدیقی نے اپنی تقریر میں کہا کہ "مرحوم نے سینکڑوں علمی و ادبی مضامین لکھے، ان کی ادبی اہمیت کو سارا ملک تسلیم کر چکا تھا اور وہ "علامہ" کے نام سے بھی یاد کئے جاتے تھے۔ بلاشبہ تمکین کاظمی مرحوم حیدرآباد کی تہذیب و تاریخ کے اہم ستون تھے۔ آخری دنوں وہ ادارہ کیطرف تذکرہ نوادرِ اردو دکن پر ریسرچ کا کام کر رہے تھے۔

ایوان نے دو منٹ کی خاموشی اور علامہ حیرت بدایونی کی دعائے مغفرت کے ساتھ مندرجہ ذیل قراردادِ تعزیت کو منظور کیا۔ "ادارہ ادبیات اردو کا یہ تعزیتی جلسۂ عام ممتاز ادیب اور انشا پرداز مولوی سید تمکین کاظمی صاحب کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم کے انتقال سے اردو زبان کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔ مرحوم اردو زبان کے ایک قدیم خدمت گزار کی حیثیت سے ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ادبی اور تاریخی مضامین و تصانیف کے ذریعہ مرحوم نے تقریباً تیس سال اُردو زبان و ادب کی جو بے لوث خدمت انجام دی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ گو مرحوم اب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے زندہ جاوید ہیں یہ جلسہ مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی رکھتے ہوئے خدا سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

اس تعزیتی جلسہ میں دفتر دیوانی و مالی و ملکی کے کئی حضرات نے شرکت کی مرحوم نے اسی دفتر سے وظیفہ حسن خدمت لیا تھا نیز حیدرآباد کے ادیبوں، شاعروں اور پروفیسر صاحبان کی کثیر تعداد بھی موجود تھی۔

ایوانِ اردو میں بابائے اردو کا سوگ

جونہی اخبارات کے ذریعہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ملی، ادارۂ ادبیات اردو اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مولوی صاحب کے غم میں جمعرات ۱۷ / اگست ۱۹۶۱ء کو بند کر دیئے گئے۔ اور معتمد ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ کا تعزیتی بیان برائے اشاعت اخبارات کو جاری کیا گیا۔ ڈاکٹر زورؔ نے مولوی عبدالحق کے انتقال پرملال پر اپنے بیان میں کہا کہ "مولوی صاحب اردو کی نہ صرف ایک زندہ تاریخ تھے، بلکہ تاریخ بنانے میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اس زبان کیلئے جو خدمات انجام دی ہیں اتنی خدمت کسی ایک شخص نے اس زبان کی تاریخ میں کبھی نہیں انجام دیں۔ انکی وفات سے اس زبان کو ایک ایسے وقت ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے جبکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں یہ ایک نازک دور سے گزر رہی ہے۔

سر سید احمد خاں کی آنکھیں دیکھنے والوں اور انکی طرح قوم کی خدمت کی تڑپ رکھنے والوں میں وہ شاید آخری شخص تھے، وہ کیا اُٹھے قدیم تہذیب و سیاست کی بساط ہی الٹ گئی۔ دبستانِ حالیؔ ان ہی کی بنائی ہوئی تھی اور وہ ہی اس آخری رکن تھے۔ افسوس ہے کہ جسطرح دبستانِ شبلی کے قیام و دوام کے آثار نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہ دبستانِ حالیؔ، مولوی عبدالحق کی وفات پر ختم ہوگیا۔

مولوی صاحب کی یاد میں ۱۰ / اگست کی شام اردو ہال میں ادارۂ ادبیات اردو اور حیدرآباد کی دوسری انجمنوں کی طرف سے ایک مشترکہ جلسۂ تعزیت منایا گیا۔ ادارہ کی طرف سے پروفیسر سید محمد رشید جامعہ عثمانیہ نے مولوی صاحب کے ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور قرار دادِ تعزیت بھی منظور کی گئی۔

علامہ علی اصغر بلگرامی کی یاد میں جلسۂ تعزیت

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ملک کے ممتاز مورخ اور ماہر آثار قدیمہ علامہ سید علی اصغر بلگرامی کے سانحۂ انتقال پر ۳۰ / اکتوبر کو شام کے ۵½ بجے "ایوان اردو" واقع پنجہ گٹہ روڈ پر ایک جلسۂ تعزیت پروفیسر ہارون خاں شروانی (ایم ایل سی) کی صدارت میں منعقد ہوا۔

قاری نذیر الدین صاحب کی قرأت کے بعد پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ — مولانا بلگرامی تعلقداری اور صوبیداری کے دور میں بھی ادبیات اور آثارِ قدیمہ کے فن سے دلچسپی رکھتے تھے، تاریخی آثار کے مطالعہ اور معائنہ کا انھیں بیحد شوق تھا۔ پروفیسر اکبر صدیقی نے مولانا علی اصغر بلگرامی کی ادارۂ ادبیات اردو سے دیرینہ وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے ادارہ کیلئے کئی نادر قلمی اور مطبوعہ کتابیں تحفۃً مرحمت فرمائیں

نیز مولانا بلگرامی "یوم محمد قلی قطب شاہ" کے موقع پر تاریخی کتابوں کی اشاعت کے نہ صرف محرک بلکہ ادارہ کے شعبۂ تاریخ تمدن کے رکن بھی تھے۔ مولانا بلگرامی آخری دنوں میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے کی مکمل تاریخ حدیقۃ السلاطین (حصہ دوم) کی اشاعت میں مصروف تھے۔ یہ تاریخ جسے مرحوم نے مرتب کیا تھا بہت جلد ادارہ کی طرف سے شائع ہوگی۔

جناب قمر ساحری معتمد بزم سعدی نے اپنی تقریر میں مولانا بلگرامی کی فارسی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ "وہ بزم سعدی کے کاموں سے بیحد خوش ہوتے تھے۔"

نواب ساندار خاں ساندوزئی نے بھی مرحوم کی خدمات کو سراہا۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مولانا علی اصغر بلگرامی نہ صرف فارسی اور اردو کے عالم اور مورخ تھے بلکہ وہ سنسکرت اور پالی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ پروفیسر شروانی نے مرحوم کی اردو سے بے پناہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سن ۱۹۲۲ء میں جبکہ بلگرامی مرحوم ناظم آثار قدیمہ تھے اس محکمہ کی تاریخ میں بالکل پہلی اور آخری بار اس کی اردو رپورٹ شائع کرائی تھی۔ پروفیسر خیر دانتے کہا کہ مولانا بلگرامی کا ایک اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایلورا اور اجنتا کے غاروں میں جو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں اور مجسمے ہیں ان کی ایک مکمل لغت تیار کی تھی اس میں سنسکرت اور پالی کے تمام الفاظ کی فرہنگ بھی دی گئی تھی جسکو پروفیسر ہیمنت راؤ نے بھی ایک بڑا کارنامہ قرار دیا تھا۔ فرہنگ اور مآثر دکن جو اب نایاب ہو چکی ہے اشاعت پذیر ہوں تو بڑا کام ہوگا۔

کرسی صدارت سے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کیگئی جسے حاضرین نے ایستادہ ہوکر منظور کیا "ادارہ ادبیات اردو کا یہ جلسہ عام مولانا سید علی اصغر بلگرامی مرحوم کے سانحہ ارتحال پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

مولانا مرحوم ادیب، مورخ اور ممتاز ماہر آثار قدیمہ تھے اور وہ ادارہ کے ایک قدیم اور سرگرم کارکن تھے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔" اور دو منٹ کی خاموشی کے بعد مرحوم کی تعزیت میں جمع ہونے والے علم دوستوں کا یہ اجتماع برخاست ہوا۔

نواب زین یار جنگ کی رحلت پر پیام تعزیت

پاکستانی اخبارات میں نواب زین یار جنگ بہادر مرحوم صدر نشین ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی رحلت کی خبریں پڑھکر انتہائی صدمہ ہوا۔

علاقائی۔ لسانی۔ فرقہ واری۔ اور معتقداتی تعصبات کے گھناؤنے ماحول میں نواب زین یار جنگ مرحوم کی ذات گرامی انسانی برادری اور مشرق کی ہمہ گیر محبوب زبان اردو کی ترویج کیلئے امید کی شمع فروزاں تھی۔ آہ! کہ اپنی بساط کا آخری مہرہ بھی لڑھک گیا۔ نواب زین یار جنگ کی موت سے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن اپنے مشفق ہمدرد سے اور زبان اردو اپنے ایک دردمند غمگسار سے محروم ہوگئی۔ اس سانحۂ ارتحال پر میں آپ سب کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

مبلکش صدیقی

(نائب معتمد ادارۂ ادبیات اردو۔ لاڑکانہ (پاکستان)

مجلسِ اشاعت تاریخ و تمدنِ دکن

ادارۂ ادبیات اردو کے تحت ۱۹۶۱ء میں مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن کا قیام اس مقصد کے تحت عمل میں آیا تھا کہ تاریخ دکن اور بالخصوص قطب شاہی عہد سے متعلق اہم نادر مخطوطات کے علاوہ تاریخی اور تحقیقی مواد بھی شائع کیا جائے تاکہ علمی طبقہ دکن کے اس دقیع تاریخی، تمدنی اور ثقافتی سرمایہ سے روشناس ہو۔ اس سلسلے میں مجلس نے سال گزشتہ دو کتابیں شائع کی ہیں جن میں ایک تو فارسی تاریخ "حدیقۃ السلاطین" مولفہ نظام الدین احمد شیرازی ہے جسے مولوی سید علی بلگرامی مرحوم نے مرتب کیا تھا اور دوسری کتاب "قطب شاہیوں کی خدمات اور آندھرا تمدن" مرتبہ ڈاکٹر رام راجو صدر شعبہ 'تلگو' جامعہ عثمانیہ ہے جو تلگو زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ آندھرا پردیش کے عوام کو جنکی مادری زبان تلگو ہے قطب شاہی سلاطین کی علمی و ثقافتی خدمات سے واقف کرایا جائے دونوں کتابوں کی اجرائی ۱۱/جنوری ۱۹۶۲ء کو یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر شری سنجیویا چیف منسٹر آندھرا پردیش کے ہاتھوں عمل میں آئے گی۔

مجلس کے لائحۂ عمل میں مزید دو مخطوطات یعنی "مکتوبات شاہان قطب شاہیہ بنام شاہان مغلیہ و ایران" و "تاریخ قطب شاہی" کی اشاعت شامل ہے۔ نواب عنایت جنگ بہادر رکن مجلس اشاعت کی تحریک پر حیدرآباد کے عمائدین کے تذکرے کی اشاعت کے بارے میں بھی طے کیا گیا ہے جو امراء، جاگیرداروں، منصبداروں اور دیگر معاش داروں کے خاندانی حالات پر مشتمل ہو گا۔ اس کی اشاعت سے حیدرآباد کے شرفا اور عمائدین کے خاندانی حالات کتابی صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گے اور اس تذکرے کو آیندہ زمانہ میں تاریخی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔

مجلس علمی جلسوں کے انعقاد کا بھی انتظام کرتی ہے تاکہ تحقیقی مقالوں اور تقاریر کے ذریعہ عوام کو تاریخ تمدن دکن اور بالخصوص قطب شاہی عہد کے حالات کما حقہٗ واقفیت حاصل ہو سکے۔

میر سراج الدین علی خاں
معتمد مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن

علمی و ادبی و کلچرل تعاون

۱۹۶۱ء

(ادارے کی ڈائری سے)

ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب سابق پرنسپل زرعی کالج (حال مقیم جامعہ ملیہ دہلی) کو ادارے کے مطبوعہ کتابچۂ ایوان قرآن کے چند نسخے تحفتہً دئے گئے۔

جناب مشفق خواجہ صاحب (انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی) کو افضل بیگ قاقشال کے تذکرہ تحفتہ الشعراء (مخطوطہ) کے بارے میں استفسارات کے جواب بھیجے گئے۔

مہاراشٹر کے مشہور شاعر جناب آفسر سیما بی (مقابل سیول ہاسپٹل۔ احمد نگر) کو ان کی درخواست پر حکومت مہاراشٹر کی طرف سے علمی وظیفہ اور امداد کی اجرائی کے بارے میں ادارہ سے سفارش کی گئی۔

جناب ابن فرید ایڈیٹر ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ کو ان کی تحریک پر ادیب کے حاصل مطالعہ نمبر کے سلسلہ میں مفید مشورے دے گئے۔

جناب انوار ظہوری (۸۔ ہری داس لالجی روڈ کراچی) کو "مجلس" کے زور نمبر کے بارے میں استفسارات کا جواب بھیجوا دیا گیا اور ماہنامہ راہی کراچی کے سلیمان ندوی نمبر کے باب میں محولہ جوابات اور مواد بھجوا دیا۔

حضرت صفی اورنگ آبادی کے تلامذہ جناب خواجہ شوق اور مولوی حبیب یاس صاحب نے صفی کے دیوان کی ترتیب و اشاعت کے بارے میں معتمد ادارہ سے مشورہ کیا۔

جناب علی رضا حسینی یم، اے (اینگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں) کو اکبر الہ آبادی بہ حیثیت طنز و مزاح نگار کے موضوع پر بسلسلۂ ریسرچ معلومات بھجوائی گئیں۔

جناب کمال الدین حسین طبیہ کالج یونیورسٹی علی گڑھ کو ادارہ کے مخطوطہ "دہ مجلس (محتشم کاشی)" کے بارے میں تفصیلات بھیجی گئیں۔

جناب عظیم الدین محبت (ایم، اے عثمانیہ) حیدرآباد، سندھ، کو حضرت امجد کے تعلق سے پی، ایچ، ڈی کرنے کے سلسلے میں استفسارات کا جواب دیا گیا اور رہبری کی گئی۔

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد (ترقی اردو بورڈ کراچی) کو ادارہ کے مخطوطات کی مائکرو فلمس نقولات کے بارے میں معلومات بھیجی گئیں۔

جناب خلیق انجم دہلوی (لکچرار کروڑی مل کالج دہلی) کو مکتوب اولاد محمد خاں ذکا بلگرامی کی نقل بھجوائی گئی جس میں مرزا مظہر کا ذکر مرقوم ہے۔

حیدرآباد کے ممتاز اور بزرگ شاعر حضرت تاج قریشی کی درخواست پر ادارہ کی طرف سے ادبی وظیفہ کی اجرائی کے سلسلے میں وزارت سائینٹفک ریسرچ و کلچرل افیرس دہلی کو توجہ دلائی گئی۔

جناب حکیم والیسرے وتیہی کو ادارہ کی سفارش پر مرکزی وزارت ثقافتی امور کی طرف سے ماہانہ پچاس روپئے ادبی وظیفے کی اجرائی کے احکام ملے۔

حضرت تاج قریشی کی امداد کیلئے ادارہ کی طرف سے شری تارا پوروالا سکریٹری نظام چیارٹی ٹرسٹ فنڈ کو توجہ دلائی گئی۔

جناب محمد عزیز اللہ صاحب صدر انسٹی ٹیوٹ آف اردو لٹریچر (۱۰ وتی لال نہرو روڈ کراچی) کو اردو ڈرامے کے ارتقاء اور اس کی تاریخ کے بارے میں رہنمائی کی گئی۔

جناب سید انیس الدین یم، اے محمد علی روڈ اکولہ (برار) کو پی، ایچ، ڈی میں داخلے کے سلسلے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

ناظم صاحب تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کو سداشیو پیٹھ (میدک) میں ثانوی جماعتوں میں اردو تعلیم کی جماعتوں کے قیام کے سلسلے میں توجہ دلائی گئی۔

جناب اختر بھارتی "اردو اکاڈمی" اسپاد ھپادنی کو حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے پتے بھجوائے گئے۔

جناب رائے انیل پرشاد (نظام آباد) اور جناب اسد اللہ (بلیماران دہلی) کو علی الترتیب پنج تنتر کی کہانیوں کلیلہ و دمنہ اور انوار سہیلی نیز ہندی کے مسلمان شاعر و ادیب کے بارے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

جناب قمر خلیل نائطی سکریٹری نشر و اشاعت مدرسہ اسلامیہ سنگاریڈی کو "تذکرۂ مشاہیر نوائط" کے سلسلے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

جناب عظیم الدین محبت ایم، اے۔ حیدرآباد (سندھ) پاک کو حضرت امجد سے متعلق مزید معلومات بھیجی گئیں۔

تلگو بھاشا سمیتی حیدرآباد کی طرف سے ترتیب دی جانے والی "تلگو انسائکلوپیڈیا" کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے مفید معلومات دی گئیں اور چند ادیبوں کی تصویروں کی عکسی نقلیں حاصل کرنے میں مدد دی گئی۔

جناب عبدالباری (صبح ایشیا لائبریری، بمبی) کو میر شیر علی افسوس کے ترجمہ مخطوطہ "باغ اردو" کے بارے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

جناب غلام حسین یم، اے (فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور (پاکستان)) کے پی، ایچ، ڈی کے مقالہ "اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر" کو معتمد ادارہ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے ضروری ہدایت کے ساتھ ارسال کیا۔

ادارہ کی طرف سے جناب مولوی تمکین کاظمی مرحوم کے پسماندگان کیلئے اجرائی وظیفہ کے بارے میں مرکزی وزارت ثقافتی امور و سائنسی تحقیقات کو توجہ دلائی گئی۔

جناب جگن ناتھ آزاد صاحب، انفارمیشن افسر پریس انفارمیشن بیورو (دہلی) کو اردو اخبارات و رسائل کی ہونے والی نمائش کے لئے اردو صحافیوں اور ادیبوں کی تصویروں اور سنین ولادت و وفات کے بارے میں معلومات بھیجی گئیں۔

جناب اسحاق ایوبی صاحب (پریس انفارمیشن بیورو حیدرآباد) کو حیدرآباد کے اخبارات و رسائل اور مصنفین سے متعلق استفسارات کا جواب دیا گیا۔ اور حضرت امجد کی حیات اور شاعری کے تعلق سے رہنمائی کی گئی۔

جناب محمد عبدالواحد (سابق ناظم جنگلات حیدرآباد) ۱۰ - کچہری روڈ - کراچی کو علامہ اقبال کے انگریزی مضامین کے بارے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

جناب وزیر حسن دہلوی صاحب کو ادارہ کی تحریک پر مرکزی وزارت ثقافتی امور و سائنسی تحقیقات دہلی نے ماہانہ پچاس روپے انکے ادبی خدمات کے اعتراف میں وظیفہ جاری کیا۔

جناب زہیر کنجاہی (راول پنڈی) کو حضرت اختر مرحوم کے بارے میں استفسارات کا جواب بھیجا گیا۔

جناب اثر بھارتی (معتمد اردو اکاڈمی اسلامیہ پنجاب) کو حیدرآباد کے قلمکاروں کے بارے میں معلومات بھیجوائی گئیں۔

حیدرآباد کے گزشتہ نصف صدی قبل کے اردو اخبارات، رسائل کے بارے میں پریس انفارمیشن بیورو دہلی کو ادارہ کی طرف سے پروفیسر اکبر حمد نقی معتمد کتب خانہ نے مختلف معلومات بھیجیں۔

جناب مسٹر دہلوی ایڈیٹر ماہنامہ "پھلجھڑی" (کراچی) کو دکن کے مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں تفصیلات بھیجی گئیں۔

جناب عزیز احمد صاحب (جامعہ عثمانیہ) کو مخطوطہ "تذکرہ عطائے تمکین" سے شہزادہ مبارز الدولہ آصف کے حالات اور کلام کی نقلیں بھجوائی گئیں۔

جناب پروفیسر ہارون خاں شروانی صدر مرحوم شہدی کمیٹی آندھرا پردیش کو کمیٹی کی استدعا پر ادارہ کی طرف سے مبلغ پانچ سو روپے اس مہم کو کامیاب بنانے کیلئے دیئے گئے۔

سکریٹری تلگو بھاشا سمیتی حیدرآباد کو تلگو انسائیکلوپیڈیا کے لئے ادارہ کی طرف سے اردو کے چند ادیبوں اور شاعروں کی تصاویروں کے عکسی فوٹو مہیا کئے گئے۔

مسٹر ایم، این، ستیارتھی، ایم، اے (کیرالا) کی درخواست پر ادارہ کی طرف سے اردو لٹریچر اور سب رس تحفتہً بھجوایا گیا۔

پریس انفارمیشن بیورو نئی دہلی کی درخواست پر اردو کے ممتاز ادیب پروفیسر وحیدالدین سلیم کی تصویر اخبارات و رسائل کی نمائش کیلئے بھیجی گئی۔

جناب رانا بھگوان [illegible] پرنسپل عبدالحق اورینٹل کالج مطالعہ ادبیات اردو نصیرآباد (لاڑکانہ) پاکستان کو [illegible]

اُردو امتحانات

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ اردو امتحانات، تعلیم بالغان کے تحت شہر حیدرآباد میں ۵ مرکزوں پر اردو پڑھائی گھر قائم ہیں جنکے معلمین کو ادارہ کی طرف سے مناسب امداد بھی دی جاتی ہے۔ ان مرکزوں کے علاوہ شہر میں سنٹرل جیل کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد سال میں دو بار ادارہ کے امتحانات اردو دانی و زباندانی میں شریک ہوتی ہے۔ معتمد اردو امتحانات مولوی عارف الدین حسن صاحب وقتاً فوقتاً امدادی اردو پڑھائی گھروں کا معائنہ کرتے رہتے ہیں اور کارکردگی سے واقفیت کے بعد مختلف ہدایات جاری کرتے رہتے ہیں۔

چہارشنبہ ۲۰ دسمبر ۱۹۶۱ء کو اردو پڑھائی گھروں کے معلمین کا ایک مشاورتی جلسہ ایوان اردو میں جناب ڈاکٹر زور صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تمام معلمین اور پڑھائی گھروں کے صدور و معتمد صاحبان نے شرکت کی۔

معتمد امتحانات مولوی عارف الدین حسن صاحب نے سالانہ رپورٹ سناتے ہوئے ادارہ کے ان تعلیمی مرکزوں کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اور ۱۹۶۱ء کی دوسری میقات کے تحت لئے جانیوالے امتحانات کی تاریخوں سے واقف کرتے ہوئے معلمین مراکز سے خواہش کی کہ وہ ادارہ کے اردو امتحانات میں اپنے مرکزوں سے زیادہ سے زیادہ بالغ حضرات کو شریک کرائیں۔

معتمد امتحانات کی رپورٹ کے بعد مختلف مرکزوں کے مندرجہ ذیل صدور و معتمدین اور معلمین نے اپنی اپنی رپورٹ سنائی۔ شری گنیش پرشاد (سنٹرل جیل اسکول) شری وینکٹیشم صاحب (میا پیٹھ جونیر سرٹیفائڈ اسکول) مسٹر میر اسد علی خاں (عزیز پڑھائی گھر) مسٹر محمد فیض الرحمن (صنعت نگر) مسٹر سید کریم الدین (خانقاہ عنایت الٰہی) مسٹر مظفر حسین، مسٹر غلام اکبر ایڈوکیٹ (ابراہیم پٹن) وغیرہ

مسٹر محمد منظور احمد معتمد اردو مجلس نے اس موقع پر معلمین سے خطاب کرتے ہوئے اردو امتحانات اور تعلیم بالغان کی اہمیت پر زور دیا۔ ازاں بعد صدر جلسہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے فرمایا کہ "مجھے بڑی خوشی ہے کہ ادارہ کی طرف سے قائم کردہ اردو امتحانات کی مشعل بدستور فروزاں ہے۔ ہم اردو والوں کو چاہئے کہ وہ ملک سے ناخواندگی کو دور کرنے اور خاص کر عوام الناس کو اردو زبان و ادب سے نزدیک لانے میں سرگرمی سے عمل پیرا ہوں۔ ادارہ کے امتحانات سابق میں بڑے زور شور سے منعقد ہوتے تھے اور ریاست حیدرآباد کے ہر ضلع، تعلقہ اور صوبہ میں اسکی شاخوں کا جال سا پھیلا تھا۔ آندھرا پردیش کے قیام کے بعد یہ سرگرمیاں محدود ہوگئی ہیں اور شہر کے مختلف مراکز کے علاوہ تعلقہ نرمل ضلع عادل آباد میں جناب ابوسعد سید اسماعیل صاحب سید کی شخصی دلچسپی کے سبب امتحانات منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے معلمین اردو پڑھائی گھر مل سے خواہش کی کہ وہ اپنے مراکز میں بالغوں کو اردو پڑھانے کے ادارہ کے کاز کو بے لوث تعاون دیں اور انعام و ستائش سے بے پرواہ ہوکر آگے بڑھائیں۔ ہمیں آندھرا پردیش کو ترقی دینا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم لوگ اردو کے ساتھ علاقائی زبان تلگو بھی سیکھیں۔ ڈاکٹر زور نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ گذشتہ دو سال پہلے آندھرا کے تلگو داں حضرات کو اردو سکھانے کیلئے گریجوٹ اور قابل اساتذہ صاحبان کے تعاون سے ادارہ کی طرف سے تعلیمی مہم چلائی گئی تھی۔ ڈاکٹر زور نے اردو معلمین سے خطاب کرتے ہوئے اسی بات کا انکشاف کیا کہ " ادارہ کے اردو امتحانات سے صدر ریاست جموں و کشمیر جناب مہاراجہ کرن سنگھ کو

ادارے کا ترجمان ماہنامہ سب رس

سب رس ۱۹۳۸ء سے جاری ہے اور خدا کے فضل سے اب تک پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر زور صاحب حسب سابق اس کے نگران رہے۔ ڈاکٹر صاحب جب ماہ مئی میں صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے عہدہ پر فائز ہو کر سری نگر تشریف لے گئے تو اس باب میں پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے وقار خلیل صاحب کی معاونت فرمائی۔

مجلس مشاورت میں جناب جانکی پرشاد، جناب رمن راج سکسینہ، جناب نصیر الدین ہاشمی اور جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اسماء شریک تھے۔ ادارت کے فرائض جناب وقار خلیل صاحب گزشتہ تین سالوں سے بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

سن ۱۹۶۱ء میں سب رس کے گیارہ شمارے شائع ہوئے جن میں محمد قلی قطب شاہ نمبر (جنوری) ادارہ نمبر (اپریل) اور ٹیگور نمبر (جون) کے علاوہ ستمبر و اکتوبر کا وہ مشترکہ شمارہ بھی شامل ہے جس کا ایک حصہ "بابائے اردو مولوی عبدالحق" کی یاد کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ سال بھر میں سب رس کے مطبوعہ صفحات کی تعداد (۵۰۴) رہی اس حجم میں مضامین، نظمیں، غزلیں، فارسی میں کہنے والے شعرا کی طرحی غزلیں، افسانے، ڈرامے، مشاہیر کے خطوط، ادبی تاثر، فکاہیات، سمپوزیم، سب رنگ کے صفحات اردو نامہ اور تبصرے بھی شامل ہیں۔

مضامین: سب رس میں علمی و ادبی اور تہذیبی موضوعات پر محیط جملہ (۴۳) مضامین شائع ہوئے۔ ذیل مضامین کے عنوان مع مضمون نگاروں کے ناموں کے مندرج ہیں۔

قطب شاہی تہذیب و تمدن (آغا سید حسین مرزا)۔ آندھرا پردیش کا کلچر (پروفیسر مجید صدیقی) محمد قلی اور اس کی شاعری (زینت ساجدہ) یوم محمد قلی کا آنکھوں دیکھا حال (وقار خلیل) خیر مقدمی تقریر یوم محمد قلی (ڈاکٹر زور) خراج عقیدت (روشن علی خاں میر ملک) شہر حیدرآباد کی بنا اور ترقی قطب شاہی دور میں (لیاقت بیگم)۔ عہد قطب شاہی میں آبرسانی اور آبپاشی کا انتظام (محمد حسن الدین)۔ داغ اور حجاب (ڈاکٹر گیان چند)۔ کلام قطب شاہ پر سرسری نظر (محمد اکبر الدین صدیقی)۔ دکنی میں اسم کی فاعلی حالت (حبیب ضیاء)۔ شیر محمد خاں ایمان (مراد علی طالع)۔ محمد مرتضیٰ مرحوم (ڈاکٹر زور)۔ موجودہ اردو تنقید (نثار احمد فاروقی)۔ داغ اور حجاب (فاضل زیدی)۔ ٹیگور بیک نظر (وقار خلیل) رابندر ناتھ ٹیگور (راماننداچٹرجی، ترجمہ مہدی حسین) ٹیگور ایک شاعر ایک مفکر (پروفیسر ایم۔ ضیاء الدین) ٹیگور کا اثر اردو ادب پر (پروفیسر سید احتشام حسین) ٹیگور کی روحانی تعلیمات (میر یسین علی خاں) ٹیگور کی عظمت (پروفیسر ہمایوں کبیر) وشوا بھارتی (پروفیسر سید محمد)۔ ٹیگور اور حیدرآباد (نصیر الدین ہاشمی) اقبال اور تصوف (نذیر محمد خاں) ٹیگور کا آرٹ (علاء الدین حبیب) بیجاپور (مبارز الدین رفعت) اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ (اعزاز نقوی) ایران کی جدید شاعری (بشیر النساء بیگم) تین مکاتیب (احسن مارہروی بنام نفیس بنگلوری)۔ البرٹ کامیو اور اُس کی ناول نگاری (نصرت صدیقی)۔

اور اس کا عہد (شریف احمد) بابائے اردو (رائے جانکی پرشاد) مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں (محی الدین احمد) مکاتیب ڈاکٹر عبدالحق۔ پریم چند کا ایک افسانہ (ڈاکٹر شکیل الرحمٰن) ہندی اردو کی ماہیت و حقیقت (اور نامانوس بہاری (ترجمہ غلام رسول) رومن اور عربی خط کا تجزیہ (شفیع منصور) ایا بخش رسا (دیویندر پرشاد سکسینہ) فلسفت الٰہی (اسحاق ایوبی)

نظمیں: (۴۷) شائع ہوئیں جن میں منظوم افسانہ لا (عبدالعزیز خالد) کے علاوہ مندرجہ ذیل شعرائے کرام کی تخلیقات شامل ہیں۔

خورشید احمد جامی۔ قمر ساحری، سعادت نظیر، خیرات ندیم۔ وحید مرزا، احمد علی امکان۔ قاضی سلیم۔ جگن ناتھ آزاد۔ جگر بریلوی۔ عبدالعزیز خالد۔ محمد علوی۔ عزیز تمنائی۔ اشرف رفیع۔ تمکین کاظمی۔ روش صدیقی حیرت بدایونی۔ ریورنڈ ہینسن ریحانی۔ کنول پرشاد کنول، حیدر شمسی، بانو طاہرہ سعید۔ روحی علی اصغر، طالب رزاقی خلیل رامپوری، تحسین سروری۔ تجربیاورا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ مثال رضوی۔ شمیم کرہانی۔ سرشار بلند شہری۔ حسن کمال، سلیمان خطیب۔

غزلیں: اس سال جملہ (۸۰) غزلیں شائع ہوئیں جنہیں مندرجہ ذیل شعرائے کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید اختر احمد۔ اشرف رفیع۔ عزیز جہاں بلقیس۔ منوہر لال بہار۔ مقبول احمد جامعی۔ سیدہ حفیظ۔ ریورنڈ ہینسن ریحانی۔ محمد علی زیرک۔ ابوالخیر ضیاء۔ عباس عابدی۔ جمیل صالحہ قدسیہ۔ اسد انصاری۔ روحی علی اصغر۔ حسین علی افسر۔ بانو طاہرہ سعید۔ احسان علی عرشی۔ مظہر کامل۔ فرید متین۔ مہر النساء مہر۔ یوسف ناظر۔ صلاح الدین نیر۔ ظہیر جعفری۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ خورشید احمد جامی، معین احسن۔ جذبی۔ اوج یعقوبی۔ محسن زیدی۔ کیلاشس ماہر۔ علی جواد زیدی۔ ایم اسلم۔ طالب رزاقی۔ قدرت کانپوری۔ شاغل قادری۔ سیدہ مجیدہ۔ اختر رضوانی۔ عرش ملسیانی۔ نور محمد نور۔ خلیل رامپوری۔ احسان دانش۔ بشیر نواز۔ خواجہ شوق۔ تابش دہلوی۔ بمل کرشن اشک۔ وحید مرزا۔ نجیب راشد۔ جمیل کلیمی۔ اسد احسن جعفری۔ نجم آفندی۔ روش صدیقی۔ منظر ایوبی۔ رگھو بنسی تریل۔ ڈاکٹر زور۔ اعجاز حسین۔ اختر لکھنوی۔ خاور نوری۔ زبیر رضوی۔ فضیل جعفری۔ افسر سیمابی۔ حامد ہیکاوی۔ الطاف شاہد۔

فارسی غزلیں: جناب قمر ساحری نے بزم سعدی کے نام سے فارسی گو شاعروں اور ادیبوں کی ایک تنظیم قائم کی ہے جس کی طرف سے ماہانہ ادبی اجلاس اور طرحی مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ فارسی طرحی کلام سب رس میں گذشتہ سال سے چھپ رہا ہے۔ اب تک سب رس میں (۴۴) ایسی فارسی طرحی غزلیں چھپ چکی ہیں۔ شعرا کے نام مندرج ہیں۔

عبدالحق جیتا ب۔ خسرو قادری۔ ناصح رضوی۔ بانو طاہرہ سعید۔ ڈاکٹر طاہر مسلم۔ ڈاکٹر گل محمد ملوچ۔ نور محمد نور۔ برق موسوی۔ شفیق سنجر، حضور نظام میر عثمان علی خاں۔ تلوک چند محروم۔ حیرت بدایونی۔ حیدر شمسی رئیس امروہوی۔ پروفیسر سید۔ احمد وحشی، شرر آستانی۔ اکبر حیدرآبادی۔ میر تسیین علی خاں۔ پروفیسر شرر۔ عبدالرحمٰن ذکائی۔ حسنین کاظمی شاد۔

افسانے: (۸) افسانے شائع ہوئے جن میں وزیر حسن دہلوی۔ محسن شمسی۔ عاتق شاہ۔ علی بن ایاز۔ حسن عسکری۔ نرنجن تسنیم اور موپاساں کے افسانے کے مترجم شبیر حسین صاحب کی تخلیقات شامل ہیں

ڈرامے: تین عمدہ ڈرامے سب رس میں شائع ہوئے۔ جن میں اظہر افسر کے لکھے دو ڈرامے جو نشر بھی ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور ٹیگور کا ڈرامہ "ڈاک گھر" شامل ہے۔ موخر الذکر ڈرامہ کے مترجم جی، یم، شاہ ہیں۔

فکاہیات: اس موضوع پر ملک کے تین ممتاز مزاح نگار فنکاروں احمد جمال پاشا، بھارت چند کھنہ اور رشید الدین کی شگفتہ تحریریں شائع ہوئیں۔

اُردونامہ: اس عنوان کے تحت فروری، مارچ، ستمبر، اکتوبر۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۶۱ء کے سب رس میں حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کی باضابطہ ڈائری مرتبہ وقار خلیل شائع ہوئی۔

سب رنگ: یہ عنوان ہند و پاکستان کے ممتاز رسائل سے نقل اور تلخیص کئے جانے والے اردو کی معیاری تخلیقات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عنوان کے تحت ۱۹۶۱ء کے سب رس میں ۱۴ مضامین، ۹ نظمیں اور ۵ غزلیں ڈائجسٹ کی گئیں جن کے لکھنے والوں میں بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق۔ احمد ندیم قاسمی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ عارف عبدالمتین فراق گورکھپوری۔ ڈاکٹر بی، گوپال ریڈی۔ ڈاکٹر زور۔ جوش ملیح آبادی۔ غلام عباس۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ رئیس صدیقی ٹیگور۔ ابوالکلام۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ الطاف حسین قریشی۔ امتیاز علی عرشی۔ جگن ناتھ آزاد۔ شاہد صدیقی۔ خورشید احمد جامی ناصر کاظمی اور عابد علی عابد شامل ہیں۔

تبصرے: سب رس سیر حاصل اور معیاری۔ تبصروں کے لئے مشہور رہا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جملہ (۵۲) تبصرے شائع ہوئے جن میں کتابوں کے علاوہ رسائل و جرائد کے علم اور خاص نمبرات شامل ہیں۔ ان کے مبصرین میں پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر سیدہ جعفر، وقار خلیل، اکرام جاوید، غلام رسول۔ رشید الدین اور ابو محمد عبدالحق شامل ہیں۔

کتابیں: فخر کی بات (گجندر سنگھ) راہ کا کانٹا (شانتی رنجن بھٹاچاریہ) مجربات فخر الاطباء (فقیر محمد چشتی) ریاست میسور میں اردو (ڈاکٹر حسنہ خاتون ومحمد خان) سلوشی اور عزل الغزلات (عبدالعزیز خالد) غالب کی نادر تحریریں (خلیق انجم) اردو غزل ولی تک (ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی) ۱۹۶۰ء کے منتخب افسانے (یم حبیب خاں) تلبیس ابلیس (ابو محمد عبدالحق) خلائی دمدمہ (ڈاکٹر طہ حسین) احوال جنگ احمد شاہ درانی (کاظمی راج) عالمی خانہ جنگی (عبدالسلام ذکی) چین کے مسلمان (گوپال متل) فکر و نظر اور خدا اور آدم کے گیت (اثر بھارتی) شام و شفق (ڈاکٹر سلام سندیلوی) رنگ شباب (ایم، اسلم) مجلس اقوام متحدہ اور اس کے رکن ممالک (حبیب زین العابدین) ہزار آہنگ (خاور قریشی) جام نو (صفوی بارہ بنکوائی) اردو شاعری کا انتخاب (ڈاکٹر زور) مولانا ابوالکلام آزاد کتاب التذکرہ (پروفیسر ہمایوں کبیر) نمونہ اردو لغت (ترقی اردو بورڈ کراچی) تیسری آنکھ (موہن یاور) بہار طفلی (تلوک چند محروم) ماسٹر رامچندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ (ڈاکٹر سیدہ جعفر) نیرنگ نظر (روحی علی اصغر) کیف و عرفان (یوسف اجمیری) سیرت پاک (شارق دہلوی) امام حسین (شمیم انہونوی) دربار اکبری (محمد حسین آزاد) مثنوی ہلر پانسو (محمد صادق اختر) طوطی نامہ (حسرت دہلوی) انشائے ماجد حصہ دوم (عبدالماجد دریابادی) جام صہبا (ابوالخیر صہبا) اردو انشائیہ (صفی مرتضیٰ)

رسائل و جرائد: نگارش (امرت سر) فنکار (ڈھاکہ) کتاب نما (دہلی) ارشاد (حیدرآباد) جامعہ (دہلی) مجلہ عبدالحق نمبر (حیدرآباد) مجلہ عثمانیہ جامعہ عثمانیہ نمبر (حیدرآباد) حریم افسانہ نمبر (لکھنؤ)

سنگم (جموں) صبح امید گجرات نمبر (بمبئی) اردو نامہ (کراچی) یگ نندنی سبھا حیدرآباد نمبر (امرت سر) ادبی دنیا (لاہور) مجلہ نیا نقوش (سری نگر) فروغ اردو جگر نمبر (لکھنؤ) قند (ناصر نمبر (مردان) اردو صحیح، کنھیا لال کپور نمبر (لکھنؤ) اشاعت نمبر (دہلی) ماہنامہ جمال (مالیگاؤں)

سب رس کے بارے میں ۱۹۶۱ء میں مختلف رسائل و جرائد میں تبصرے شائع ہوئے انکے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

سب رس اور اسکے خاص نمبر

● ——— ماہنامہ سب رس کا اپریل کا شمارہ ادارہ کی کارگزاریوں کی روداد ہے جس کا مطالعہ کرنیکے بعد ان بلند ہمت شخصیات کو مبارک باد دینے کو دل چاہتا ہے جنکی ہمتوں نے ادارے کو ایک زندہ علمی ادبی تحریک بنا دیا ہے۔ تم سلامت رہو ہزار برس۔

(ماہنامہ انشاء کراچی بابتہ جون ۱۹۶۱ء)

● ——— پیش نظر ماہنامہ مرحوم حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا ہے۔ مجلس ادارت میں جو بلند پایہ شخصیتیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر زور کے علاوہ نصیر الدین ہاشمی، راسخ بلگرامی، برشاد و قار خلیل صاحب، ڈاکٹر زلنگ اور مس ایچ کیو ہیں قابل ذکر ہیں۔

شمارہ پیش نظر میں ادارہ ادبیات اردو کے کارناموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تصاویر نے حسین اضافے نے رسالہ کی شان کو دوبالا کر دیا ہے صد ۲۳ پر شہزادہ مکرم جاہ کی آمد کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ امر موجب حیرت و تعجب ہے کہ شہزادہ موصوف اردو میں تقریر نہیں کر سکے کیونکہ وہ اس زبان سے کما حقہ واقف نہیں ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو نے ادبی تاریخ، فن تنقید، تعلیم بالغان و سائنس، ادب غرض ہر شعبۂ علم و ادب پر بڑی نفیس کتابیں شائع کی ہیں۔ ان بلند پایہ کتابوں اور انجمن کے آرگن سب رس کا ہر گھر اور لائبریری میں رہنا ضروری ہے۔

سہ ماہی العلم کراچی بابتہ اپریل تا جون ۱۹۶۱ء

● ——— ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان "سب رس" ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اپنے اعلیٰ معیار کے باعث اس برصغیر کے چوٹی کے ادبی رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا ادارہ نمبر ہمارے سامنے موجود ہے جس میں ادارہ کی ادبی سرگرمیوں کا تفصیل کے ساتھ حال درج ہے۔

مجلس اشاعت، اردو امتحانات، ادارہ کی مطبوعات اور ادارہ کا کتب خانہ اس کے چند خاص عنوانات ہیں جنہیں دیکھ کر ادارہ ادبیات اردو کی ٹھوس ادبی و علمی کارگزاریوں کا علم ہوتا ہے۔

مجلس اشاعت کے ساتھ عہد قطب شاہی سے متعلق بہت سے مضامین اور تقریروں کی تیاری کے علاوہ دو تاریخوں کی ترتیب و تدوین بھی ہو رہی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں ادارہ نے اردو کے چار امتحانات اردو دانی، زبان دانی

اردو عالم اور اردو فاضل شروع کئے گئے تھے جو اب تک جاری ہیں اور روز بروز مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ ادارے کے مطبوعات کی تعداد ڈھائی سو سے اوپر پہنچ گئی ہے۔ اس کے کتب خانہ میں تقریباً پچیس ہزار مطبوعات اور پانچ ہزار مخطوطات جمع ہیں جنکی توضیحی فہرستیں بھی چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ادارہ کی جانب سے تحقیقی کام کرنے والوں کو وظائف دیے جاتے ہیں اور دوسری یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالروں نیز نجی طور پر تحقیقاتی کام کرنے والوں کو بھی معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ حال ہی میں ادارہ نے اپنی ایک عمارت ایوان اردو بھی تعمیر کرائی ہے۔

اقتباس سہ ماہی کامران سرگودھا (پاک) بابتہ اپریل و جون ۱۹۶۱ء

● ــــــ ماہنامہ سب رس بابتہ اپریل ۱۹۶۱ء کا "ادارہ نمبر" ہمارے سامنے ہے جس میں حلقۂ ادارت نے "ادارہ ادبیات اردو" سے متعلق اتنی معلومات جمع کردی ہیں کہ اِسے بجا طور پر ادارے "کا انسائیکلو پیڈیا" کہا جا سکتا ہے پرچے کے مطالعہ سے "ادارۂ ادبیات اُردو" کی تمام سرگرمیاں ہی واضح نہیں ہوتی بلکہ ہند و پاکستان میں اردو زبان کی ٹھوس علمی اور ادبی ترقی کی رفتار کا بھرپور جائزہ بھی سامنے آجاتا ہے۔

دو ماہی گجر لاہور (جولائی ۱۹۶۱ء)

● ــــــ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے ترجمان ماہنامہ سب رس نے اپریل ۱۹۶۱ء کے شمارہ کو "ادارہ نمبر" کی حیثیت سے شائع کیا ہے جس میں ۱۹۶۰ء کے دوران ادارہ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادارہ کی مختلف سرگرمیوں کے متعلق وقتاً فوقتاً خبریں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن ایک مبسوط رسالہ کی شکل میں ان سرگرمیوں کی تفصیل سے ادارہ کی کارکردگی اور کارگزاری کا صحیح صحیح اندازہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ صرف مدد ہی نہیں ملتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ دامے' درمے' سخنے یا قدمے اردو کی خدمت کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے ادارہ کی سرگرمیوں کا یہ جائزہ تاثر کا ایک سرچشمہ ثابت ہو سکتا ہے اور ان کے تعمیری جذبات کو جنجھوڑ کر عملی اقدامات کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ جائزہ کسی کاروباری ادارے کی سالانہ رپورٹ کے خشک اور ٹھیٹ کاروباری انداز میں پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی تحریر اور ترتیب میں ایک ادبی ادارے کے شایانِ شان شگفتہ ادبی انداز اختیار کر گیا ہے۔ اس نمبر کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہم سب رس کے نگران ڈاکٹر زورؔ صاحب اور اس کے جواں سال ایڈیٹر جناب وقار خلیل کی سلیقہ مند کاوشوں پر مبارک باد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ساتھ ہی ساتھ تمام اردو نواز حضرات سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس اہم ادارہ کی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرنے اور پھر اردو کی اشاعت و ترویج کے سلسلہ میں ادارہ کا ہاتھ بٹانے کی خاطر اس نمبر کا ضرور مطالعہ کریں۔ کتابت اور طباعت سے ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جس میں مختلف تقاریب کے فوٹو بلاکس کے علاوہ سلطان محمد قلی قطب شاہ سے متعلق دو تاریخی بلاکس بھی شامل ہیں۔

اقتباس "ماہنامہ صبح امید" بمبئی بابتہ ماہ جون ۱۹۶۱ء

● ــــــ ہند و پاک میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے عصر حاضرہ کے جن لوگوں نے کام کیا۔ اُن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ کے نام آنے والی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کریں گے۔

ان دونوں ہستیوں نے اپنی زندگیاں اُردو زبان کی خدمت اور اشاعت کیلئے وقف کر رکھی ہیں اور ان کی شبانہ روز مساعی کے نتیجے میں اردو ادب کے سرمایہ میں گراں بہا اضافہ ہو رہا ہے ۔ اس وقت سب رس کا ادارہ نمبر ہمارے پیش نظر ہے ۔ جس میں ادارہ ادبیات اردو کی شاندار خدمات کی روئیداد درج ہے ۔ اسے دیکھکر ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر زور اور انکے رفقاء کی جد وجہد اور مساعی انجمن ترقی اردو پاکستان سے بھی زیادہ ارفع مدارج پر پہنچ گئی ہے ۔ ہندوستان میں اردو زبان جس دور سے گزر رہی ہے اس کے پیش نظر ادارہ ادبیات اردو کے اس عظیم کام کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر ناسازگار حالات میں بھی ڈاکٹر زور نے اردو ادب کے سرمایہ میں گراں بہا اضافہ کیا ہے ۔ ایوان اردو کی تعمیر کے سلسلے میں ادارہ ادبیات اردو دیگر اداروں سے گوئے سبقت لے گیا ہے اور ان امدادی اداروں کیلئے یقیناً یہ باعث شرم ہے کہ انھیں ابھی تک یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ اپنا ایک کمرے کا دفتر تک تعمیر کر سکیں لیکن اس کے برعکس ادارہ ادبیات اردو بہت بعد میں آکر بہت آگے نکل گیا ۔ اور یہ سب کچھ ڈاکٹر زور اور آپ کے رفقائے کار کے پرخلوص جوش عمل کا مظہر ہے ہم یہ لکھتے ہوئے مسرت محسوس کرتے ہیں کہ ڈاکٹر زور اور ان کے رفقائے کار نے اردو زبان کیلئے جو کچھ کیا ہے اور جو کر رہے ہیں اس پر دکن ہی نہیں بلکہ پورا عالم اردو بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ۔ وہ لوگ جو ادارہ ادبیات اردو کے شاندار کارناموں سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں وہ سب رس کے خریدار بنکر نہ صرف ادارہ کی خدمات سے روشناس ہوں گے بلکہ اردو ادب کی ترقی و ترویج میں ادارہ کا ہاتھ بٹانے کا باعث ہوں گے ۔ ہم ادارہ کی ان شاندار کامیابیوں اور کامرانیوں پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں مزید شاندار خدمات کی توفیق عطا فرمائے ۔ اور ہر قسم کی مشکلات و مصائب سے محفوظ رکھکر پرچم اردو کو بلند تر کرنے میں ان کا حامی و ناصر ہو ۔ (خالد عرفانی)

(اقتباس ماہنامہ شہناز کراچی بابتہ مئی ۱۹۶۱ء)

● ——— سب رس حیدرآباد کا ایک معیاری ماہنامہ ہے جو ۱۹۳۸ء سے ڈاکٹر زور جیسی شخصیت کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے ۔ اپریل ۱۹۶۱ء کا شمارہ جو ادارہ نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا تعارف اور اس کے علمی و ادبی کارناموں کا ایک مکمل تاریخ ہے حیدرآباد میں اُردو کی ترقی کے ذمہ دار صرف دو ادارے ہیں ۔ جامعہ عثمانیہ اور ادارہ ادبیات اردو ۔ اس طرح ادارہ کی تاریخ اور اس کی ٹھوس خدمات کا مطالعہ دراصل دکن میں اُردو کی موجودہ ترقی کا مطالعہ ہے ۔

اقتباس ماہنامہ ارشاد حیدرآباد ۔ بابتہ مئی ۱۹۶۱ء

● ——— سب رس کے پیش نظر ادارہ نمبر میں ادارہ کی ہر دلچسپی کی توضیحات و تشریحات بدرجہ اتم دیکھی ہیں ادارہ ۱۹۳۱ء سے اور رسالہ سب رس ۱۹۳۸ء سے جاری ہے ۔ اس نمبر میں مشاہیر کے معاینہ کے تاثرات اور تصاویر کے ساتھ ساتھ ادارہ کی ڈائری بھی خوب ہے جس سے سال بھر کی مشغولیات پیش نظر آجاتی ہیں دیگر مضامین بھی پُراز معلومات و ضروری ہیں اور یہ تمام ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور ان کے سنگی ساتھیوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔

اقتباس سہ روزہ دعوت دہلی بابتہ ماہ مئی ۱۹۶۱ء

● —— ہمارے سامنے سب رس کا ادارہ نمبر ہے جو ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ہے یہ علمی، فنی اور ادبی ادارہ ادب کی شاندار خدمات انجام دے رہا ہے، ادارہ کی اپنی عمارت ہے۔ اس میں تقریباً تین ہزار کتب مختلف موضوعات پر ہیں۔ ادارہ کا اپنا مہمان خانہ ہے اسکی عمارت کا نام ایوان اردو ہے۔ ادارہ کی اپنی مطبوعات ہیں جن میں ادبی تاریخ، تذکرے اور تنقید۔ عام معلومات اور تعلیم بالغان تاریخ و سیاست پر کتب ہیں۔

ہفتہ وار۔ ایشیاء دہلی مورخہ ۲۸/اپریل ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر عزیز تمنائی ۔(مدراس)

● —— سب رس کا ادارہ نمبر بڑی محنت اور بڑے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ادارہ کے اغراض و مقاصد اس کے بتدریج ارتقاء اور اس کی گذشتہ کارگزاریوں کے علاوہ سال رواں کی تمام کارروائی کو زیر تحریر میں لایا گیا ہے۔ ادارہ کے متعلق ملک کے ممتاز مصنفوں کے مقتدر خیالات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ ادارہ میں آنے والوں کا ذکر ہے وہ بجائے خود ایک رسالہ نما ہے۔ م ۱۷/اپریل ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر عبادت ۔ بریلوی (لاہور)

● —— سب رس، پابندی سے ملتا ہے، بہت شکرگزار ہوں، میرے لئے یہ رسالہ ایک بیش بہا نعمت ہے کیونکہ اس سے حیدرآباد کی تہذیبی اور ادبی زندگی کا مجھے علم ہوتا رہتا ہے۔ آپ حضرات خوب کام کر رہے ہیں یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ حیدرآباد اب بھی اردو والوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب واقعی بہت بڑا کام کر رہے ہیں
(اقتباس مکتوب ۱۲/مارچ ۱۹۶۱ء)

جناب دانش فرازی (مدراس)

● —— ڈاکٹر زور جیسی عظیم شخصیت کے زیر نگرانی اور آپ کی دوقار مخلص مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ سب رس کا ہر شمارہ نظر افروز ہونے کے ساتھ ادبی ذوق کی تسکین کا وافر سامان بہم پہنچاتا ہے۔
(۲۳/ اپریل ۱۹۶۱ء)

جناب حمید عظیم آبادی ایڈیٹر ماہی جام جم سکھر پاکستان

● —— سب رس کا ادارہ نمبر وصول ہوا۔ ڈاکٹر زور صاحب کی تعریف کیا کی جائے آپ لوگ طوفانِ حوادث کے سامنے بھی اردو کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔ ادارہ اور ڈاکٹر زور کی خدمت اردو ادب کے ایک ناقابل فراموش احسان ہے۔ (مورخہ ۱۹۶۱/۴/۳۱ء)

● ـــــــ پچھلے دنوں مہاکوی رابندر ناتھ ٹیگور کا صد سالہ جنم دن ملک گیر پیمانے پر بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اس موقع پر اردو کے کئی ادبی رسالوں نے بھی اپنے خاص نمبر شائع کئے۔ ان میں "سب رس" کا زیر نظر نمبر اپنی جامعیت کے پیش نظر خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں ان کی زندگی کی اور فن کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تمام ضروری معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ بشمولہ سبھی مضامین سنجیدہ غور و فکر کے مظہر ہیں۔

(مخمور سعیدی)

ماہنامہ تحریک دہلی بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۶۱ء

● ـــــــ سب رس، ادارۂ ادبیات اردو کا ماہنامہ ہے جس کے نگران ڈاکٹر زور ہیں اور مجلس ادارت میں قابل قدر نامور ادیب شامل ہیں اردو ادبی ماہناموں میں "سب رس" کا جو مقام ہے وہ اہل ادب پر روشن ہے اور اس کے متعلق کچھ لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

زیر تبصرہ شمارہ میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور پر بہت اچھے اور ٹھوس مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ ٹیگور ہندوستان کے ایسے بلند پایہ شاعر ہیں جنکی شہرت کو عالمگیریت کا تمغہ حاصل ہے ابھی حال میں ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں ان کی پیدائش کا صد سالہ جشن پورے جوش اور اہتمام کے ساتھ منایا گیا اور منایا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے بعض معتدد ادبی رسالوں نے ٹیگور نمبر نکالے ہیں۔ "سب رس" کا یہ ٹیگور نمبر بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مرتب کا بیان ہے کہ بہت کم وقت میں اس نمبر کو ترتیب دیا گیا ہے لیکن باوجود اس کے یہ نمبر بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے جن کے مطالعہ سے ٹیگور اور انکی تعلیمات پر ہم کافی معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ مضمون نگاروں میں جناب وقار خلیل، سید مہدی حسین، پروفیسر یم، ضیاء الدین، پروفیسر احتشام حسین، میر یٰسین علی خاں، پروفیسر ہمایوں کبیر اور نصیر الدین ہاشمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس نمبر کا منظوم حصہ بھی کافی بلند اور دلکش ہے ٹیگور پر بہت اچھی نظمیں جمع کی گئی ہیں اور ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں نے اس میں حصہ لیا ہے۔ روشن صدیقی، حیرت بدایونی، قمر ساحری، ریحانی، کنول پرشاد کنول، اور حید رشمسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(عارف مدراسی) منقول ہفتہ وار "سرکار" مدراس مورخہ ۲۱ / جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

● ـــــــ ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ماہنامہ سب رس سرزمین حیدرآباد سے سنہ ۱۹۳۸ء سے جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے اس وقت ماہ اگست سنہ ۱۹۶۱ء کا شمارہ زیر تبصرہ ہے شعراء وادباء کی فہرست دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "سب رس" کو ملک کے مشاہیر شعراء و ادباء حضرات کا تعاون حاصل ہے۔ عمدہ کاغذ پر خوبصورت کتابت وطباعت سے مزین یہ ماہنامہ اعلیٰ پیمانے پر اردو ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے تحقیقی مضامین، معیاری غزلیں، انتخاب مشاعرہ، زبان، فارسی، فکاہیہ کا باب اور نقد و نظر رسالہ کی خصوصیات ہیں، ایک افسانہ بھی اس شمارہ میں شامل ہے۔

اقتباس ماہنامہ "جمال" مالیگاؤں، اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء

سب رس کے تبادلے میں آنیوالے رسائل و جرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل و جرائد ایوانِ اردو کے دارالمطالعہ میں قارئین کے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک
رسائل کو چھوڑ کر باقی سب جرائد "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں ہم ان تمام ہند و پاک اور بیرونِ ہند کے مدیران جرائد کے ممنون
ہیں جو پابندی کے ساتھ سب رس کے تبادلے میں اپنے رسائل و جرائد ارسال فرماتے ہیں۔ امید ہے وہ ایسا تعاون مستقل کرتے رہیں گے
اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ سال ختم ہونے کے بعد ایسے تمام رسائل و جرائد کی عمدہ جلدیں بنوائی جاتی ہیں اور انھیں ادارہ کے کتب خانے
میں درج رجسٹر کیا جاتا ہے۔ جن سے آیندہ کئی ادب دوست استفادہ کرتے ہیں۔ اس افادی پس منظر کے کتب خانے و دارالمطالعہ
کے لئے توقع ہے کہ معاصرین ہم سے مکمل تعاون فرمائیں گے۔ (ادارہ)

روزنامے:

۱۔ امرِ تجارت۔ بشیر باغ روڈ۔ حیدرآباد دکن۔ ایڈیٹر: پورن چند تشاکر صفحات ا وسطاً ہر روز ۴۔ قیمت: ۱۰ نئے پیسے
۲۔ اسٹیٹس من (انگریزی) اسٹیٹس من ہاؤس کناٹ سرکس نئی دہلی ایڈیٹر جارج آرتھر جانسن " " " ۱۲ " ۱۴ " "
۳ خدمت دی ہند سری نگر (کشمیر) ایڈیٹر: ایل: ین، دائل " " " " ۴ " ۱۰ " "
۴۔ رہنمائے دکن۔ افضل گنج حیدرآباد دکن ایڈیٹر محمد منظور حسن " " " " ۴ " ۱۳ " "
۵۔ سنڈیش، ریذیڈنسی روڈ۔ جموں (کشمیر) " سید نذیر حسین سمنانی " " " ۴ " ۱۰ " "
۶۔ سیاست، جواہرلال نہرو روڈ۔ حیدرآباد " میر عابد علی خان " " " ۶ ۸ " ۱۳ " "
۷۔ ملاپ، مکرم جاہی روڈ حیدرآباد " یدھ ویر " " "

دوروزہ:

۱۔ آج کا امریکہ (اردو) یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس۔ بہاولپور ہاؤس سکندرہ روڈ نئی دہلی (صرف اخبارات کو ارسال کیا جاتا ہے)
۲۔ پریس انفارمیشن بیورو کا خبرنامہ (اردو) پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند اولڈ سکریٹریٹ دہلی " " " " ")
۳۔ سائنس (سائنس امن کے میدان میں (خاص ضمیمہ اردو) یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرہ روڈ نئی دہلی (" " " ")
۴۔ سوویت یونین کی خبریں اور ادبی اسفار (اردو) روسی سفارت خانہ۔ پوسٹ بکس ۲۴۱ نئی دہلی سالانہ چندہ ۴ روپیہ
۵ مرکز دیوبند ایڈیٹر جمیل مہدی صفحات ۱ فی پرچہ ۱۳ نئے پیسے سالانہ چندہ بارہ روپئے

ہفتہ وار:

۱۔ امریکن رپورٹر (انگریزی) بہاولپور ہاؤس۔ سکندرہ روڈ نئی دہلی۔ ۸ صفحات۔ سالانہ قیمت: ایک روپیہ۔
۲۔ " " (تلگو) یونائیٹڈ اسٹیٹس سروس سکندرہ روڈ نئی دہلی " " " " " "

۳۔ الشیاء، اردو بازار دہلی: ایڈیٹر: میر مشتاق احمد ۔ صفحات ۱۲ ۔ فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے سالانہ ۹/ روپئے

۴۔ بدر، دفتر صدر انجمن احمدیہ ۔ قادیان (پنجاب) ایڈیٹر محمد حفیظ بقاپوری صفحات ۱۲ ۔ فی پرچہ ۱۳ نئے پیسے سالانہ ۹/ روپئے

۵۔ بھوپال پنچ ۔ پل بوگدہ، احاطہ بون گل بھوپال ایڈیٹر: عبدالصمد خان مخلص صفحات ۴ ۔ 〃 ۱۳ نئے پیسے 〃 〃 〃

۶۔ پرچا ۔ نظام آباد (آندھرا پردیش) 〃 عابد انصاری 〃 ۸ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۷۔ پیام اسلام فیض آباد (لکھنؤ) 〃 مرزا حمید حسین جیدر 〃 ۸ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۸۔ ترجمان سرحد پشاور (پاکستان) 〃 امیر عالم اعوان 〃 ۸ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۹۔ ترجمان وقت ۔ ۱۰۹ ۔ مراد نگر حیدرآباد دکن 〃 سید رحمت علی 〃 ۸ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۱۰۔ تنقید ۔ ۳ ۔ بی، جوبلی بلڈنگ سائکل اسٹریٹ بمبئی ایڈیٹر: وسیم انصاری 〃 ۱۲ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۱۱۔ خبرنامہ یونائیٹڈ عرب ری پبلک پریس بیورو (اردو) عرب ری پبلک ایمبیسی نئی دہلی صفحات ۸ (مفت اخبارات کو ارسال کیا جاتا ہے)

۱۲۔ دور حیات ۔ مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ ۹ ۔ سلطان مینشن کناٹ روڈ بمبئی، ایڈیٹر مظہر حسین تیصر صفحات ۲۰ فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے سالانہ ۱۲ روپئے

۱۳۔ دھنک ۔ ۲۵۹، وہن روڈ بمبئی ۸ ایڈیٹر ۔ جوہر امروہوی صفحات ۱۲ فی پرچہ ۱۳ نئے پیسے ۔۔۔

۱۴۔ ذوالقرنین ۔ نظامی پریس بدایوں (یوپی) 〃 ۔ ا ۔ حمیدالدین نظامی 〃 ۸ 〃 ۱۳ 〃 سالانہ ۹ روپئے

۱۵۔ سب رنگ ۔ سٹ ملک الیکٹرک نزد فرنٹیئر ہوٹل حیدرآباد سندھ (پاکستان) ایڈیٹر عظیم الدین محبت صفحات ۱۲ فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے سالانہ ۱۲ روپئے

۱۶۔ سرکار ۔ ۳۴ ۔ حاجی شیخ حسین اسٹریٹ ۔ رائی پیٹھ ۔ مدراس ۱۴ ۔ ایڈیٹر بیگم خورشید حسین صفحات ۸ 〃 ۱۳ 〃 ۶ 〃

۱۷۔ شیراز ۔ چادر گھاٹ گیٹ ۔ حیدرآباد دکن ۔ ایڈیٹر صمصام شیرازی 〃 ۵۲ 〃 ۲۵ 〃 ۱۲ 〃

۱۸۔ عوامی اقتدار ملک پیٹھ 〃 ایم، اے کبیل 〃 ۱۲ 〃 ۱۳ 〃 ۶ 〃

۱۹۔ ملاپ (سنڈے ایڈیشن) آصف علی روڈ ۔ نئی دہلی، ایڈیٹر: رنبیر 〃 ۱۲ 〃 〃 〃 〃 〃

۲۰۔ نیا آدم ۔ کمان انصاری ۔ مرلی باولی حیدرآباد ۔ ۲ 〃 امجد باغی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۱ نیا یگ ۔ قرول باغ ۔ نئی دہلی 〃 سودیش کمار 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۲۔ نئی جمہوریت ۔ پوسٹ بکس ۵۔۳۳ سپرٹ روڈ کراچی 〃 سحر انصاری 〃 ۲۸ 〃 ۲۵ 〃 ۱۲ 〃 〃

۲۳۔ سیوک ۔ موہن پریس جالندھر 〃 ڈاکٹر لاجپت رائے 〃 ۴ 〃 ۶ 〃 ۳ 〃

۲۴۔ ہماری زبان ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ (یوپی) 〃 آل احمد سرور 〃 ۱۴ 〃 ۱۰ 〃 ۳ 〃

پندرہ روزہ

۱۔ سویت دیس ۲۵ ۔ باراکھمبا روڈ دہلی ایڈیٹر ۔ ڈی سوروف صفحات ۴۸ فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے سالانہ ۳ روپئے

۲۔ ہمدرد صحت لال کنواں دہلی 〃 حکیم عبدالحمید دہلوی 〃 ۸ 〃 ۱۴ 〃 ۲/۵۰ 〃

ماہنامہ

۱۔ آجکل پبلی کیشنز ڈویژن ۔ پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی ایڈیٹر عرش ملسیانی صفحات ۵۰ فی پرچہ ۶۰ نئے پیسے سالانہ ۷ روپئے

۲۔ آندھرا پردیش ۔ محکمہ اطلاعات آندھرا پردیش کرم جاہی روڈ حیدرآباد ایڈیٹر نریندر لوتھر صفحات ۵۲ فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے سالانہ ۳ روپئے

۳۔ اتحاد دنیا ۔ ساؤتھ ایونیو ۱۰۳ نئی دہلی ۔ ایڈیٹر ۔ رام چندر پرتاب صفحات ۴ ۔ فی پرچہ ۶ نئے پیسے سالانہ ایک روپئے

۴ - ادب لطیف - نیا ادارہ، ۱۵ - سرکلر روڈ - لاہور ایڈیٹر میرزا ادیب صفحات ۸۰ - فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے سالانہ ۱۰ روپے

۵ - ادبیت جامعۂ اردو - علی گڑھ (یو۔ پی)، ایڈیٹر: ابن فرید 〃 ۴۸ 〃 〃 ۵۰ 〃 ۵۰-۵-۵۰

۶ اردو ڈائجسٹ ۵ - مین روڈ سمن آباد - لاہور - ایڈیٹر الطاف حسین 〃 ۱۶۰ 〃 ۱/۵۰ 〃 ۱۴ روپیہ

۷ - ارشاد - دارالارشاد مغلپورہ حیدرآباد ۲ (اے۔ پی) 〃 پیرزادہ جاوید 〃 ۴۸ 〃 ۵۰ 〃 ۵ 〃 〃

۸ - استقلال - ۲۵۱، ۵۳ نمبر ۳۹ - رنگون (برما) 〃 ابراہیم احمد مظاہری 〃 ۹۴۰ 〃 ۶۰ پیاسہ ۸ 〃 〃

۹ - اسرار حکمت - ۱۰/۱ پیر مکی شریف لاہور 〃 حکیم نور محمد چوہان 〃 ۹۶ 〃 ۳۷ پیسے ۴/۵۰ 〃

۱۰ - اسلامی دنیا - دیوبند (یو۔ پی) 〃 امتیاز نسیمی 〃 ۵۸ 〃 ۵۰ 〃 ۵ 〃

۱۱ - اطلاعات پاکستان - پاکستانی سفارت خانہ شیر شاہ سوری روڈ - نئی دہلی (اخبارات کو جاری کیا جاتا ہے)

۱۲ - افکار بالمس روڈ - کراچی - ایڈیٹر - صہبا لکھنوی - صفحات ۱۰۰ - فی پرچہ ایک روپیہ - سالانہ ۱۲ روپے

۱۳ - الشجاع - ٹائمز پریس - صدر - کراچی - ایڈیٹر - سلمان الارشد صفحات ۴۷، فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے - سالانہ ۵ روپے

۱۴ - العرب (انگریزی) - دہلی - - - - - - 〃 ۶۱ 〃 ۲۵ 〃 〃 ——

۱۵ - القدیر - چھاونی ناظر علی بیگ - حیدرآباد دکن - ایڈیٹر احمد اللہ احمد قدیری صفحات ۴۴ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے سالانہ ۶ 〃

۱۶ - انڈو جرمن ریویو (انگریزی) ۱۶ - یوسف بلڈنگ، وزیر نریمان روڈ بمبئی ایڈیٹر - یم۔ آر، ویاسس صفحات ۴۰ -
فی پرچہ ایک روپیہ - سالانہ ۲ روپے

۱۷ الشاہ بنگ سینڈ روڈ کھارادر - کراچی ۲ - ایڈیٹر - جول الیاس صفحات ۴۸، فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے - سالانہ ۷ روپے

۱۸ - اودھ پنچ امین آباد لکھنؤ - ایڈیٹر احمد جمال پاشا 〃 ۴۰ 〃 ۵۰ 〃 ۶ 〃

۱۹ - برہان - جامع مسجد دہلی 〃 سعید احمد اکبرآبادی 〃 ۶۴ 〃 ۵۰ 〃 〃 〃

۲۰ - بیسویں صدی - انصاری مارکٹ، دریا گنج دہلی ایڈیٹر خوشتر گرامی 〃 ۱۱۰ 〃 ۷۵ 〃 ۸ روپے -

۲۱ - بھائی جان - برنس روڈ - کراچی، 〃 شفیع عقیلی 〃 ۵۸ 〃 ۵۰ 〃 〃 ۶ 〃

۲۲ - پگڈنڈی - ادبستان اردو ہال بازار امرتسر 〃 امریک آنند 〃 ۴۲ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۳ - پیکر ۱۹۲ ریڈ ہلز - حیدرآباد دکن ۴ - 〃 اعظم راہی 〃 ۶۴ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۴ - پھلجھڑی - بندر روڈ - کراچی ۲ - 〃 مسٹر دہلوی 〃 ۱۲۶ 〃 ۷۵ 〃 〃 ۱۰ 〃

۲۵ - تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔ پی) - 〃 عامر عثمانی 〃 ۴۴ 〃 ۵۰ 〃 〃 ۶ 〃

۲۶ - تحریک - انصاری مارکٹ دریا گنج دہلی - 〃 گوپال متل 〃 ۴۰ 〃 ۳۷ 〃 〃 ۴ 〃

۲۷ - تعمیر - لال چوک پبلسٹی محکمہ اطلاعات سرینگر کشمیر 〃 محمد یوسف ٹینگ 〃 ۷۲ 〃 ۵۰ 〃 〃 ۵ 〃

۲۸ - تعمیر انسانیت موچی دروازہ لاہور 〃 عبدالحمید شیخ 〃 ۵۶ 〃 〃 〃 〃 〃

۲۹ ثقافت - ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور 〃 پروفیسر ایم ایم شریف 〃 ۴۲ 〃 ۵ 〃 ۸ 〃

۳۰ جام نو جیکب لائن صدر کراچی 〃 اقبال حیدری 〃 ۶۶ 〃 ۵۰ 〃 ۵ 〃

۳۱ جامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی 〃 عبداللطیف اعظمی 〃 ۵۶ 〃 〃 〃 ۶ 〃

۳۲ - جائزہ - ۳۴ - امریکن لائف بلڈنگ - میکلوڈ روڈ کراچی 〃 محمد یعقوب خاں 〃 ۱۴۴ ایک روپیہ 〃 ۱۲ 〃

۳۳ - جمال - ۵۳۳ قصر الادب - نیا پورہ مالیگاؤں (بمبئی) ایڈیٹر رئیس مالیگانوی 〃 ۸۰ 〃 ۵۰ نئے پیسے ۵ 〃

۳۴۔ جوار بھانا۔ ۳۴/E کملانگر۔ دہلی ۶، ۔ ایڈیٹر تاجور ساحری صفحات ۴۸ فی پرچہ ۳۰ نئے پیسے سالانہ ۱۴ روپئے

۳۵۔ چینی تعمیر کانسٹرکٹ۔ وائی ان بلڈنگ۔ پیکنگ ۳۷ (چین) ایڈیٹر چینگ تنگ ہوا ۔ 〃 ۴۸ ۔ ۳۰ 〃〃 ۳ 〃

۳۶۔ حریم۔ نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ ایڈیٹر نسیم انہونوی 〃 ۶۴ 〃 ۵۰ 〃〃 ۶ 〃

۳۷۔ خاتون پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۱۹۹ صدر کراچی 〃 تنظیم بریلوی 〃 ۹۶ 〃 ۷۵ 〃 〃 ۶ 〃

۳۸۔ خیال۔ نعیم الدین اسٹریٹ۔ کامٹی (ناگپور) 〃 فیض انصاری 〃 ۵۶ 〃 ۵۰ 〃 〃 ۶ 〃

۳۹ درس القرآن دکن نیوز سرکلر بازار حیدرآباد 〃 مرزا ذبیح اللہ بیگ 〃 ۳۰ — 〃 〃 ۴ 〃

۴۰۔ دیدار۔ پونن پلی حیدرآباد دکن 〃 محمد افضل شریف 〃 ۱۶ 〃 ۳۱ 〃〃 ۴ 〃

۴۱۔ ڈنمارک ریویو (انگریزی) وزارت خارجہ حکومت ڈنمارک کوپن ہیگن 〃 ۱۲ (صرف اخبارات کو بھیجا جاتا ہے)

۴۲۔ زعیم۔ مسٹر جان روڈ۔ اندرون دودھ باولی حیدرآباد ۲۔ ایڈیٹر شمس الدین 〃 ۳۳ فی پرچہ ۳۰ نئے پیسے سالانہ ۸ روپئے

۴۳۔ سات رنگ۔ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵۰ ایڈیٹر۔ اطہر صدیقی صفحات ۶۴ 〃 ۶۲ 〃 ۸ 〃

۴۴۔ ساقی۔ پی آئی بی کالونی۔ کراچی ۵ 〃 شاہد احمد دہلوی 〃 ۸۰ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۰ 〃

۴۵۔ سنگم۔ رزیڈنسی روڈ۔ جموں کشمیر 〃 موہن یاور 〃 ۶۴ 〃〃 ۵۰ 〃 ۶ 〃

۴۶۔ سورج بیبی۔ چاوڑی بازار۔ دہلی 〃 شمبھوناتھ 〃 ۴۸ — ۲۵ 〃 ۱۰ 〃

۴۷۔ سوویت لٹریچر (انگریزی) ۱۱/۹ ووبرولایوبو اسٹریٹ۔ ماسکو، ایڈیٹر نینا ستر یوا 〃 ۱۷۰ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۴۸۔ سہیل۔ پاری روڈ۔ گیا (بہار) ایڈیٹر۔ ادریس سنہاروی صفحات ۴۴ قیمت فی پرچہ ۳۷ نئے پیسے سالانہ ۴ روپئے

۴۹۔ شاعر۔ پاپٹی روڈ۔ بمبئی 〃 اعجاز صدیقی 〃 ۷۴ 〃 ۶۲ 〃 ۷ 〃

۵۰ شان ہند۔ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ دہلی۔ دہلی۔ ایڈیٹر۔ بدیکاش سرور صفحات ۴۰۔ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے ۵ روپئے

۵۱۔ شمع۔ آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ایڈیٹر۔ یونس دہلوی صفحات ۱۲۲ فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے سالانہ ۸ روپئے

۵۲۔ شہباز۔ روضہ بندہ نواز۔ گلبرگہ (میسور اسٹیٹ) نگران۔ مبارز الدین رفعت صفحات ۲۴۔ ۵۰ 〃 ۵ 〃

۵۳۔ شہناز عیدگاہ روڈ۔ کراچی۔ ا ایڈیٹر۔ خالد عرفانی 〃 ۴۳ 〃 〃 〃 〃 ۶ 〃

۵۴۔ صبا ۱۷۔ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن ایڈیٹر سلیمان اریب 〃 ۸۰ 〃 ۸۸ 〃 ۱۰ 〃

۵۵۔ صبح امید۔ بلاسیس روڈ بمبئی ۸ ۔ 〃 محمد عبدالحمید بوہیرے 〃 ۵۰ 〃 ۴۰ 〃 ۶ 〃

۵۶ عارف۔ مل روڈ۔ لاہور 〃 عبدالرحمن شوق 〃 ۴۸ 〃 ۲۵ 〃 ۳ 〃

۵۷۔ عصمت۔ بندر روڈ۔ کراچی ۳۰ 〃 رزاق الخیری 〃 ۶۴ 〃 ۵۰ 〃 ۶/۴۲ 〃

۵۸۔ فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ا 〃 ماہر القادری 〃 ۶۴ 〃 〃 ۶ 〃

۵۹۔ فروغ اردو ۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ 〃 ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی 〃 ۸۰ 〃 ۴۵ ۲ 〃

۶۰۔ کتاب۔ نما۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ جامعہ نگر دہلی 〃 ریحان احمد عباسی 〃 ۳۲ 〃 ۱۰ 〃 ۱ 〃

۶۱۔ کتابی دنیا۔ گیہ ویل لیکھراج روڈ کرلج 〃 ضیاء الدین احمد برنی 〃 ۳۰ 〃 ۱۴ 〃 ۳ 〃

۶۲ لٹریچی طبش (انگریزی) ۳۰/۸ رام نگر نئی دہلی ا ۔ ایڈیٹر لکشمن شاستری 〃 ۲۴ 〃 ۳۰ ۲ 〃

۶۳ ماڈرن ریویو (انگریزی) اچاریہ پرفلا چندر روڈ۔ کلکتہ ۹ 〃 کیدار ناتھ چیٹرجی 〃 ۱۶۳ 〃 ۵۱/۲۵ ۱۵ 〃

۶۴۔ ماہ نو۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی 〃 ظفر قریشی 〃 ۶۴ 〃 ۴۰ 〃 ۸ 〃

۶۵ - معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ (یو.پی) ایڈیٹر: معین الدین احمد ندوی صفحات ۸۰ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے، سالانہ ۵ روپیہ
۶۶ منادی - درگاہ نظام الدین اولیاء - نئی دہلی ۱۳ - ایڈیٹر حسن ثانی نظامی " ۴۰ " ۳۵ " " ۳/۱۲ "
۶۷ - مہر نیمروز - صدر کراچی - ۳ ایڈیٹر حسن غنی ندوی " ۶۴ " ۵۰ " " ۶ "
۶۸ نقش - کاشانہ اردو پوسٹ بکس ۲۰۲، کراچی ۳ " شمس زبیری " ۱۲۲ " ایک روپیہ " ۱۲ "
۶۹ - نقوش - ادارہ فروغ اردو انارکلی لاہور " محمد طفیل (دو ماہی خاص نمبر) " ۳۰۴ " ۳ روپیہ " ۲۰ "
۷۰ - نگارش - پوسٹ بکس ۲۶۰۱ کراچی ۱۹ " ناصر محمود " ۶۴ " ۵۰ نئے پیسے " ۶ "
۷۱ - نوری کرن - بازار صندل خاں - بریلی " اقبال احمد نوری " ۵۶ " ۳۷ " " ۴ "
۷۲ نیا دور محکمہ اطلاعات اتر پردیش لکھنؤ " صباح الدین عمر " ۲۵۶ " ۲۵ " " ۳ "
۷۳ - نیشنر (انگریزی) کتاب پیلس - ڈیرہ دون (یو.پی) " کے، پی ورما " ۱۲ " ۳۵ " " ۲ "
۷۴ - نئے چراغ - گھاسپورہ، کھنڈوا (ایم، پی) " حسن بشیر " ۶۴ " ۵۰ " " ۶ "
۷۵ نیرنگ خیال - ۶۰ نلٹنگ روڈ - لاہور " حکیم محمد یوسف حسین " " " " " "
۷۶ - نئی قدریں - حیدرآباد (سندھ) پاکستان " اختر انصاری اکبرآبادی سالنامہ ۱۷۲ " ۱۰۷۵ - ۱ روپیہ " ۱۰ "
۷۷ - ہمدرد صحت - ہمدرد منزل لال کنواں، دہلی " حکیم محمد عبد الحمید صفحات ۴۸ فی پرچہ ۳۷ نئے پیسے سالانہ ۴ روپے
۷۸ ہم قلم - پاکستان وائرس گارڈ - اسٹریچن روڈ کراچی ۳ ایڈیٹر طفیل احمد جمالی " ۶۰ " ۶۲ " ۶ "
۷۹ - ہندوستانی ادب - اعظم پورہ حیدرآباد ۲۴ - " جی، ایم، خاں " ۶۴ " ۱ روپیہ " ۸ "

سہ ماہی -

۱ - ادبی دنیا - مال روڈ، لاہور ایڈیٹر: صلاح الدین احمد صفحات ۳۰۸ فی پرچہ ایک روپیہ سالانہ ۴ روپیہ
۲ - اردو نامہ - ترقی اردو بورڈ - ڈنشا روڈ کراچی ۵ " شان الحق حقی " ۸۴ " ۷۵ نئے پیسے " ۳ "
۳ اسلامک کلچر (انگریزی) پوسٹ بکس ۱۷۱ حیدرآباد دکن " ڈاکٹر عبد المعید خاں " ۶۸ " (علیہ ڈاکٹر زور مرحوم)
۴ - العلم - دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد، کراچی ایڈیٹر - الطاف بریلوی " ۱۲۰ سالانہ ۴ روپے
۵ - اورینٹل کالج میگزین - اورینٹل کالج لاہور " ڈاکٹر سید عبد اللہ " ۲۱۶ " " ۴ "
۶ - سوغات - کلائن روڈ بنگلور " محمود ایاز صفحات ۲۱۶ فی پرچہ ۲ روپئے سالانہ ۸ "
۷ - صحیفہ - مجلس ترقی ادب - کلب روڈ لاہور " سید عابد علی عابد " ۱۳۶ " ۲ " ۸ "
۸ فکر و نظر - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ " ڈاکٹر یوسف حسین خاں " ۱۵۸ " " ۷ "
۹ - صبح - انجمن ترقی اردو، علمی منزل کوچہ پنڈت دہلی " محمد عتیق صدیقی " ۱۲۸ "
۱۰ - کامران - کچہری بازار سرگودھا (پاک) " انور گوئندی " ۱۲۸ " ۵۰/۱ روپیہ ۶ "
۱۱ - مجلس - اردو مجلس اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد " محمد منظور احمد " ۱۱۲ " ۱ سالانہ ۳٫۵۰ "
۱۲ - نوائے ادب - ابلاغ پبلیشرس - انجمن اسلام بمبئی ۸ " نجیب اشرف ندوی " ۸۲ " ایک روپیہ ۳/۰ "

سالنامے -

۱ - انوار (انوار العلوم کالج میگزین) ملے پلی، حیدرآباد " طیب انصاری " ۶۴ ——— —

۲۔ اردوئے معلی (غالب نمبر) شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی ایڈیٹر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صفحات ۳۲۴ غالب نمبر (جلد دوم) ...

۳۔ علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایڈیٹر سید امین اشرف صفحات ۲۸۰ . . . . .

۴۔ نیا شعور (شعبہ اردو) جموں وکشمیر یونیورسٹی سری نگر ایڈیٹر۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن " ۹۴ (ٹیگور نمبر مئی ۱۹۶۱ء)

۵ الاشعہ (شعبہ عربی) نظام کالج حیدرآباد " عبدالعزیز قادری " ۶۴ . . . .

ادارے کا مہمان خانہ

ادارے کی اپنی تعمیر شدہ عمارت "ایوان اردو" میں دو کمروں اور ایک وارنڈے پر مشتمل مہمان خانہ بھی ہے۔ جس میں دستور کی مسلمہ چودہ زبانوں میں تحقیقاتی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر، ادیب، شاعر اور صحافی ایک ہفتہ قبل معتمد ادارہ کو مطلع کر کے اور اجازت ملنے پر اپنے آمد کی صحیح تاریخ اور وقت سے مطلع کر کے قیام کر سکتے ہیں ریسرچ اسکالروں کیلئے یہ شرط ضروری ہے کہ وہ اپنے شعبہ کے صدر کی توثیقی تحریر کے ساتھ قیام کیلئے درخواست بھجوائیں۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے لئے تعارفی مکتوب کا درخواست کے ساتھ ملنا ضروری ہے۔ مہمان خانے میں صرف چار روز قیام کیا جا سکتا ہے اور اگر مزید ضرورت ہو تو صرف تین روز کی اجازت دی جا سکے گی۔ ہر حالت میں مہمانوں سے کوئی فیس یا معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

ایوانِ اردو کا مہمان خانہ ہند و پاک کی ادبی اور تہذیبی اداروں کی تاریخ میں اپنے وجود کے مستند پس منظر کے تعلق سے اولیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں ادارہ کے مہمان خانے کو تو اولین اہمیت حاصل ہے۔ مہمان خانہ میں صرف قیام کی تمام سہولتیں مہیا کیگئیں ہیں۔ یہ مقام ادارہ کے پرسکون عقبی حصہ میں واقع ہے۔

۱۹۶۱ء میں حسب ذیل شاعروں، ادیبوں اور ریسرچ اسکالروں نے "ایوان اردو" کے مہمان خانے میں قیام کیا۔

۱۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی (کراچی پاکستان) ۱۲/جنوری تا ۱۶/جنوری ۱۹۶۱ء

۲۔ حضرت تلوک چند محروم (دہلی) ۱۳/جنوری تا ۲۰/جنوری ۱۹۶۱ء

۳۔ جناب ساحر ہوشیارپوری (دہلی) ۱۳/جنوری تا ۱۶/جنوری ۱۹۶۱ء

۴۔ جناب صدیق الرحمن قدوائی (ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی) ۱۷/جنوری تا ۲۰/جنوری ۱۹۶۱ء

۵۔ جناب فیض احمد (ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی) ۲/اگست تا ۲۳/اگست ۱۹۶۱ء

۶ جناب ڈاکٹر خلیق انجم (کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی) ۱۰/اکتوبر تا ۱۶/اکتوبر ۱۹۶۱ء

اُردو میوزیم

ہر سال یومِ محمد قلی قطب شاہ پر ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے عہدِ قطب شاہیہ سے تعلق رکھنے والی کتابوں، دستاویزوں اور ایسی ہی نادر چیزوں کی بڑے یا چھوٹے پیمانے پر نمائش منعقد کی جاتی رہی ہے۔ ایسی نمائشیں محض "دیدن و رفتن" ہی نہیں ہوتیں بلکہ ان کی ہر چیز اپنے میں ایک دور، ایک زمانے اور ایک ملک کی تاریخ رکھتی ہیں، جن سے دورِ حاضر کی باشعور اور قدر دوں پبلک آگاہ ہوتی ہے۔ اسلاف کے وہ کام جو دقیع اور قابلِ قدر ہوتے ہیں، ان کی مرورِ زمانہ کے ساتھ قدر و منزلت میں بے پایاں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ان کارناموں کو آنے والی نسلوں سے روشناس کرانے والے عیسیٰ نفس اور مسیحا صفت افرادِ ملک و قوم کے لئے سرمایۂ فخر و نازش ہوتے ہیں۔

ادارہ ادبیاتِ اردو کی طرف سے آج سے پانچ سال قبل ۱۹۵۸ء میں جب اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد کے بانی، محمد قلی قطب شاہ معانی کی عظیم پیمانے پر یاد منائی گئی تھی تو ایک اہم اور یادگار نمائش نوادر عہدِ قطب شاہی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سالار جنگ میوزیم کے اشتراک اور عبدالوہاب صاحب کی معتمدی میں اس نمائش کا افتتاح ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے فرمایا تھا۔

ویسے دیکھا جائے تو ایوانِ اردو بجائے خود ایک میوزیم ہے، ادب کا، تہذیب کا، تمدن کا اور ثقافتی قدروں کا۔ اُن سے متعلق جس قدر نوادرات اس خوبصورت عمارت میں ہیں اور جس سلیقے سے ہیں، سالار جنگ میوزیم کو چھوڑ کر شاید ہی آندھرا پردیش میں کہیں اور اس قرینے اور اس تعداد میں ہوں۔

ایوانِ اردو میں جو عہد کے نوادر محفوظ ہیں، جن سے متعلق گزشتہ سال یعنی ۱۹۶۲ء میں ایک مبسوط توضیحی فہرست "تذکرہ نوادرِ ایوانِ اردو" کے نام سے ڈاکٹر زور صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ جو تین سو سولہ صفحات کا احاطہ کرتی ہے اور بہ اعتبارِ کیفیت و کمیت کوزہ میں سمندر بند ہے۔ اس تذکرہ میں ان تمام نوادرات کے بارے میں مفید، واضح اور مکمل تفصیلات درج کی گئی ہیں جن سے دکن کی تاریخ، تمدن، ثقافت اور اردو بولنے والوں کی سماجی و معاشی زندگی سے متعلق اور خصوصاً عہدِ قطب شاہیہ کے تعلق سے کئی امور روشن ہو جاتے ہیں۔

جنوری ۱۹۳۱ء قیامِ ادارہ کا سن ہے، جب سے اب تک شعبہ تاریخ و تمدن ترقی کی منزلیں مسلسل طے کر رہا ہے۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد کی تاریخ اور کلچر سے متعلق اس شعبے نے اپنی گراں بہا تالیفات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کی مقبولیت اور افادیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کی بعض کتابوں اور مضامین کے ترجمے انگریزی، ہندی، تلگو اور مراٹھی میں شائع ہوئے، اور لوگ ادارے میں اپنے پاس کی تاریخی کتابیں، نادر چیزیں، کاغذات اور دستاویزات خود ہی شوق سے محفوظ کروانے لگے۔ چنانچہ ایوانِ اردو کا کتب خانہ اور میوزیم ایسے ہی نادر اور اہم عطیوں کا مجموعہ ہے۔

ادارے میں گزشتہ تیس سال سے اردو زبان اور تاریخِ دکن سے متعلق مختلف قسم کے جو نوادر جمع ہوتے رہے ہیں، موقع بموقع قدردانوں کو ان کا معاینہ کرایا جاتا رہا۔ جب اس کی اپنی عمارت "ایوانِ اردو" تیار ہونے لگی تو ادارے کا

قدیم سرپرست نواب عنایت جنگ بہادر ابن نواب رکن الملک خان دوراں نے کی کہ اس ایوان کا ایک حصہ دکن کے تاریخی نوادر کے لئے مختص کیا جائے۔ صاحب موصوف نے یہ بھی وعدہ فرمایا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ ادارے میں موجودہ نوادر میں اپنی طرف سے معتد بہ اضافہ فرمائیں گے اور حسب ضرورت نوادر مرحمت فرماکر اس میوزیم کو مکمل کردیں گے۔

چنانچہ ایوان اردو کی افتتاحی تقریب سے قبل ہی نواب عنایت جنگ بہادر نے متعدد قدیم، تاریخی اشیاء، کاغذات، فرامین، قطعات، مخطوطات اور تصویریں نمائش کی شکل میں مرتب کرنے کی خاطر عطا فرمائیں، ادارے کے دوسرے بہی خواہوں اور اس کے معتمد عمومی و بانی جناب ڈاکٹر زور صاحب وغیرہ نے بھی اس میں روز بروز اضافہ کیا اور یہ اردو میوزیم ترتیب پایا۔

ایوان اردو کی تعمیر میں بھی آثار قطب شاہیہ اور ہندوستانی کلچر کو پیش نظر رکھا گیا ہے، عمارت کے اوپری حصے میں نصب شدہ کئی قطب شاہی عہد کے تاریخی پتھر اور کتبے اس بات کے شاہد ہیں، یہ نمونے نستعلیق، ثلث اور طغرہ خطوں کو ظاہر کرتے ہیں جو ہندوستان میں گزشتہ پانچ سو سال سے رائج اور مستعمل ہیں۔

ایوان اردو کے نوادر میں فن خطاطی اور خوشنویسی کے سینکڑوں ایسے شاہکار محفوظ اور موجود ہیں جنہیں مخطوطات، قطعات، وصلیاں، پروانے، فرامین، دستاویز اور احکام، پتھر کے اصلی کتبے قدیم تاریخی کتابوں اور تصویروں کے چربے، دیواری نقشے اور مختلف تقریبات کے رقعات شامل ہیں۔

جہاں تک مشاہیر دکن اور مشاہیر اردو کی اصلی تحریروں اور خطوں کا تعلق ہے ادارہ میں کئی ہزار کی تعداد میں یہ ذخیرہ مجلد حالت میں موجود ہے اور کئی خطوط ایوان اردو کے میوزیم میں شیشوں کے فریم کے درمیان ریکارڈ کئے گئے ہیں

مخطوطات کا جہاں تک تعلق ہے یہ عربی، فارسی، پنجابی، سندھی، ہندی اور تلگو زبانوں پر مشتمل ہیں جن میں عہد قطب شاہی کے مخطوطات بہت اہمیت رکھتے ہیں اور جنکی توضیحی فہرستیں اردو ادب کی تاریخ میں قلمی پہلی بار منظم اور مکمل شکل میں پانچ جلدوں میں شائع ہوئی ہیں جسے ملک کے ممتاز محقق ڈاکٹر زور نے مرتب کیا ہے

جہاں تک قطعات کا تعلق ہے یہ سب دکن کے مشہور خطاطوں کے محررہ و نوشتہ ہیں؛ اس طرح اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ دکن کے خوشنویسوں کے جتنے شاہکار ادارہ میں یکجا ہیں اتنے شاہد ہی کسی اور ایک ہی کتب خانے اور میوزیم میں نہیں ہیں۔

عکسی مرقعے اور قدیم تاریخی کاغذات میں بیشتر سرمایہ شاہان عالمگیر ثانی؛ محمد شاہ، محمد عادل شاہ؛ ابوالحسن تاناشاہ اور سلاطین آصفجاہی کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ان میں بھی قطب شاہی عہد کے اصلی کاغذات وفرامین کی تعداد زیادہ ہے۔

قدیم فرامین، اسناد کے اور بجنسہٖ حصے اور اُن کے عکس بھی لاتعداد ہیں جن میں سے اس موقع پر صرف ایک سند کے بارے میں وضاحت کی جاتی ہے۔

نقل سند علم سرطوق مکتوبہ ۱۱۰۱ھ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب عالمگیر نے حیدرآباد فتح کیا تھا تو اس نے ایسے عاشور خانوں کی مسدودی کے احکام بھی جاری کئے تھے جن کی کوئی کرامت نظر نہ آئے۔ اس وقت مرزا حشمت علی بیگ، بادشاہ کی خدمت میں علم سرطوق کا متبرک لیکر حاضر ہوئے اور کہا کہ عہد عبداللہ قطب شاہ میں

آغا محسن خراسانی شام سے یہ متبرک لائے تھے۔ بادشاہ کے حکم سے اس متبرک کا علم تیار کیا گیا۔ دوبار کوشش کی گئی کہ ہاتھی پر علم سرطوق کا جلوس نکالا جائے مگر دونوں وقت ہاتھیوں کی کمر شق ہوگئی۔ تب اورنگ زیب نے حکم دیا کہ اس تبرک کو دار الشفا میں رکھا جائے تاکہ یہ تبرک دار الشفا کے بیمار کو شفا بخشے۔

غرض اس طرح کے کئی اسناد جن میں محضر نامہ عہد عبد اللہ قطب شاہ، فرمان عبد اللہ قطب شاہ، مکاتیب اور فرامین ابو الحسن قطب شاہ، فرمان ابراہیم قطب شاہ اور تلگو و فارسی فرامین ابو الحسن قطب شاہ کے ساتھ ساتھ عہد آصف جاہ ثانی کا وہ دیواری نقشہ بھی ایوان اردو میں موجود ہے جس میں قطب شاہی دور کے شہر حیدرآباد کو محلوں، سڑکوں، گلیوں اور مختلف سواریوں اور لوگوں کے لباسوں کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

عہد قطب شاہیہ کے عاشور خانوں، تحریروں اور آثار کی کئی ایک رنگین تصویروں کے ساتھ ساتھ سلاطین قطب شاہیہ کے رنگین مرقعے بھی جو ہاتھی دانت پر تیار کئے گئے ہیں۔ جن میں قطب شاہی فن کاروں کی صنعت کاری کے نمونے جھلکتے ہیں۔

غرض نوادرات کا بیش بہا اور وقیع ذخیرہ ایوان اردو میں موجود ہے، جو زبان حال سے ماضی کی روایات، تہذیب اور فن کی کہانی سناتا ہے۔ حال اور مستقبل اپنے اس ورثے سے روشنی اور حرارت حاصل کر سکتے ہیں اور انشاء اللہ اسلاف کے ان کارناموں کی آیندہ اور قدر و منزلت کی جائے گی۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں قارئین سے اس قدر استدعا کروں گا کہ آپ حضرات کے پاس ایسا ذخیرہ ہوگا، بے توجہی یا عدم نگرانی کے باعث مستقل ترتیب میں محفوظ نہ رہ سکے۔ براہ کرم انھیں اس قومی ادارہ کے لئے مرحمت فرمائے تاکہ یہاں ایسے نوادرات محفوظ ہو جائیں اور اپنی کھوئی ہوئی زندگی اور مقام کو دوبارہ حاصل کر لیں۔ زمانہ کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا، زندگی ہر دم جواں اور رواں رہتی ہے کیا عجب کب کوئی ایسی بات ہو کہ اسلاف کا یہ ورثہ دست برد زمانہ سے تباہ ہو جائے۔ تاریخ کے ریکارڈ میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ مملکتیں بدلیں، نظم و نسق درہم برہم ہوئے، حالات پلٹا کھائے اور ایسی کئی بیش بہا اور نادر و نایاب چیزیں تلف ہو گئیں۔ نوادر جو اپنا ثانی نہیں رکھتیں اگر تباہ و تلف ہو جائیں تو ان کے ساتھ ایک عہد، ایک دور، ایک تہذیب، ایک تجربہ اور ایک کائنات بھی دفن ہو جاتی ہے۔ ایوان اردو میں جو اشیا محفوظ ہیں ان کی توضیحی یا تصویری فہرستیں ساتھ کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں جن میں عطیوں کے نام بھی درج رہ کر بقائے دوام حاصل کرتے ہیں۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ ہماری سرزمین میں ایک شخصیت نے، ایک ادارہ اور ایک جامعہ کے روپ میں ڈاکٹر زور صاحب نے اس کام کو محفوظ کرنے کا تن تنہا بیڑا اٹھایا ہے تو ہم سبھوں کو چاہیئے کہ اس کام میں انکی معاونت کریں اور اردو کے اس ایوان کو مینارۂ نور بنائیں تاکہ آنے والی نسلیں ماضی کے درخشاں و تابندہ روایات کو مستقبل کیلئے نشان راہ بنائیں۔

(وقار خلیل)

اردو میوزیم ادارہ کا معائنہ

اگر آپ حیدرآباد میں رہتے ہیں اور اب تک ایوان اردو کا میوزیم نہ دیکھ سکے ہیں تو پھر کسی روز (بجز دوشنبہ) تین بجے سے ۶ بجے تک زحمت فرمائے۔ ہندوپاک کے کونے کونے سے علم دوست حضرات جب جب حیدرآباد آتے ہیں ادارہ کے اردو میوزیم کا معاینہ کرتے ہیں

امداد و اعانت

(ادارے کو ۱۹۶۲ء میں حسب ذیل اصحاب نے مختلف قسم کی امداد فرمائی جس کیلئے ادارہ ان کا شکر گزار ہے)
نواب عنایت جنگ بہادر نے ادارہ کیلئے عہد قطب شاہیہ کی نادر اشیا تحفۃً مرحمت فرمائیں

محترمہ رابعہ بیگم انوار مصطفیٰ صاحبہ ادارہ کے کتب خانہ کو ۲۹۶ انگریزی اور ۸ اردو کتابیں تحفۃً مرحمت فرمائیں۔

جناب ہادی بلگرامی صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی حیدرآباد نے مجلہ اسلامک کلچر (دو جلدیں) ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۰ء کے فائیل اور ظفر نامہ تیموریہ مخطوطہ ایک جلد ادارہ کے کتب خانہ کیلئے تحفۃً مرحمت فرمائیں۔

جناب محمد افضل شریف صاحب مبلغ اسلام) مدیر ماہنامہ "دینار" (یوٹی بی سکندرآباد) نے ادارے کے کتب خانہ کو چار کتابیں اور رسالہ دینار کے .... " چار سالہ مجلد فائیل عطا فرمائے۔

جناب اقبال کرشن (معتمد انجمن توسیع اردو کلکتہ) نے ۱۸۲۲ء کے مطبوعہ چند قدیم کتابچے جن میں گلدستہ تعلیم، حجۃ الاسلام، روایت بسم اللہ اور کریما شامل ہیں ادارہ کے کتب خانہ کیلئے تحفۃً ارسال کئے۔

جناب حبیب علی حبیب صاحب نے اپنی منظوم کتاب "شیوۂ حبیب" ادارہ کے کتب خانہ کیلئے تحفۃً مرحمت فرمائی۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے ۲۴ قلمی کتابیں اد
کتب خانہ کیلئے تحفۃً مرحمت فرمائیں جن میں جنیں ارد
بائیس (۲۲) فارسی مخطوطات شامل ہیں۔

مولوی محب حسین مرحوم ایڈیٹر معلم نسوا
ایک تصویر ان کے صاحبزادے صادق حسین صاح
میر سراج الدین علی خاں صاحب کے ذریعہ ادارہ
تحفۃً مرحمت فرمائی۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے ۸۴ تا
کاغذات سراج الدین علی خاں صاحب کے ذر
ادارے کو تحفۃً مرحمت فرمائے۔

جناب اسرائیل خاں صاحب لائیکی ٹریننگ ک
اور جناب بشیر احمد خاں صاحب گتہ دار نے علی الت
دو کتابیں سیلاب عبرت (۱۳۲۷ھ) اور آب حی
ادارے کے کتب خانہ کیلئے تحفۃً مرحمت فرما

نواب احمد جنگ بہادر نے اپنی کتاب
"جامع العقائد" ادارے کے کتب خانہ کے
تحفۃً مرحمت فرمائی۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے ادارہ کیلئے ۱۶ قدیم ہتھیار عطا فرمائے۔

محترمہ رابعہ بیگم انوار اللہ صاحبہ نے ۲۷۴ انگریزی ۸ اردو کتابیں ادارہ کیلئے تحفتہً مرحمت فرمائیں۔

نواب سعادت علیخاں رضوی صاحب نے لارڈ کچنر کا خط اور تلوار ادارہ کو مرحمت فرمائی جو انکے والد نواب تاج جنگ کو لارڈ موصوف نے بھیجی تھی۔

جناب مولوی غوث محی الدین صاحب کن مجلس مال نے سات مطبوعہ کتابیں اور ایک قلمی کتاب ادارے کو عطا کی۔

نواب دوست محمد خاں جاگیردار نے نوابانِ کرنول کی تین قدیم قلمی تصویریں اور مہاراجہ کشن پرشاد کی آئیل پینٹنگ ادارہ کو بطور عطیہ دی۔

جناب تمکین کاظمی صاحب نے م ۱۹/ مئی ۱۹۶۱ء کو مشاہیر اردو اور مشاہیر دکن کے متعدد خطوط اور تاریخی کاغذات بطور تحفہ ادارے میں داخل کئے۔

(اردو امتحانات کا بقیہ صفحہ سے آگے)

——— بھی دلچسپی ہے اور وہ بھی ان دونوں اُردو سیکھ رہے ہیں لہ ادارہ کی کتاب اردو دانی کا ابتدائی سبق میں نے اپنے قیام سری نگر کے دوران مہاراجہ صاحب کو پڑھایا ہے۔

اس تقریب کے بعد جناب محمد جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ نے ماہ دسمبر ۱۹۶۰ء میں ادارہ کی طرف سے لئے جانے والے اردو امتحانات کی رپورٹ سنائی اور کہا کہ اس سال ادارہ کے امتحانات حسب سابق شہر حیدرآباد کے مختلف مراکز کے علاوہ نرمل میں بھی منعقد ہوں گے۔

اردو امتحانات کے صدر نگراں کاروں کی حیثیت سے اس اجلاس میں میرز عارف الدین حسن (سنٹرل انکا جیل) وقار خلیل (نرمل) محمد منظور احمد (چیپا پیٹ) مراد علی طالع (ابراہیم پٹن) حبیب ابراہیم (صنعت نگر) کے علاوہ معتمد امتحانات و منتظم ادارہ کو انوار العلوم ہائی اسکول پر واقع مرکز مذکور وانات سے پر بھیجا گیا۔ ان حضرات کے تعاون اور نگرانی میں سنہ ۶۱ء کے امتحانات بحسن و خوبی لئے گئے اور امتحانات اردو داں، زباندانی، اردو عالم (۱۹۰) طالب علموں نے حصہ لیا جن میں اردو دانی (۱۳۳) زباندانی (۲۱) اردو عالم (۱۹) طلبا و طالبات نے حصہ لیا۔

ممتحن صاحبان نے چونکہ امتحانات کے پرچے جانچنے میں دیری کی ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ اس بار شائع نہ کیا جا سکا۔

سنہ ۱۹۶۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

نام کتاب	مرتب یا مصنف	موضوع	صفحات	سائز	قیمت
۱۔ ادارہ سنہ ۱۹۶۱ء میں	مرتبہ کارکنان ادارہ	تذکرہ	۷۲	۱/۸ کراؤن	۵۰ نئے پیسے
۲۔ گلشن الحقائق (شاہ برہان الدین جانم)	مرتبہ پروفیسر اکبر صدیقی	قدیم اردو نثر	۱۲۰	۱/۱۶ کراؤن	۲ روپئے
۳۔ تحفۃ الشعراء (افضل بیگ قاقشال)	مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل	تذکرہ	۱۷۸	۱/۱۶ کراؤن	۳ "
۴۔ دیوان ہاشمی بیجاپوری (ریختی)	مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل	کلام	۳۹۴	۱/۱۶ کراؤن	۶ "
۵۔ تاریخ نانڈیڑ دکن	مرتبہ مرزا احمد علی بیگ چغتائی	تاریخ	۹۶	۱/۸ کراؤن	۲ "
۶۔ حدیقۃ السلاطین (فارسی) (مرزا نظام الدین احمد)	مرتبہ سید علی اصغر بلگرامی	تاریخ	۳۵۰	ٹائپ ۱/۸ رائل	۱۰ "
۷۔ ٹھنڈی بجلیاں	از بھارت چند کھنہ	افسانے	۱۲۸	۱/۱۶ کراؤن	۲ "
۸۔ سلاطین قطب شاہیہ اور آندھرا کلچر (تلگو، انگریزی)	مرتبہ ڈاکٹر رام راجو	تاریخ	۱۷۸	۱/۱۶ کراؤن	۲ "
۹۔ نیل کنول مہکائے	از منصور حسین بدخشی	افسانے	۱۴۳	۱/۱۶ کراؤن	۲ روپئے پچاس نئے پیسے

۱۰۔ سیل تصویر محمد قلی قطب شاہ فی تصویر ۶ نئے پیسے اور ۲۰ تصاویر کا مکمل سٹ ایک روپیہ

زیر طبع کتب

۱۔ تذکرہ نوادر ایوان اردو (جلد دوم)	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور سراج الدین علی خان	تذکرہ	کراؤن		
۲۔ تذکرہ مخطوطات جلد اول طبع ثانی	ڈاکٹر زور	"	"		
۳۔ تذکرہ مخطوطات (جلد ششم)	"	"	"		
۴۔ فہرست مطبوعات جلد سوم	پروفیسر اکبر الدین صدیقی	"	"		—
۵۔ ٹیگور اور ان کی شاعری (طبع دوم)	مخدوم محی الدین	ادب	"	۱/۱۲	—
۶۔ مہینوں کی کہانیاں	حبیب ابراہیم	ادب اطفال	"	"	۵۰ نئے پیسے
۷۔ قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی (انگریزی)	ڈاکٹر زور	تذکرہ	"	"	۱=۲۵
۸۔ تاریخ ادبیات عربی (طبع ثانی)	سید ابو الفضل	تاریخ	"	"	۴=۰۰

ملنے کے پتے:۔

۱۔ سب رس کتاب گھر "ایوان اردو" خیریت آباد۔ حیدرآباد (اے۔پی)
۲۔ میسرز ناشرس امپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ فیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی۔
۳۔ دہلی ــ لکھنو ــ الہ آباد ــ اور حیدرآباد و دیگر تاجران کتب۔

ادارے کی مطبوعات

(معاصرین کی نظر میں)

...ئہ میں ادارہ کی مختلف مطبوعات پر ہندوستان اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے ہیں اُن کے اقتباسات ذیل ہیں۔ جن کے مطالعہ سے پتہ چلیگا کہ ادارے کی مطبوعات اردو دنیا میں کس زاویہ نظر سے دیکھی جارہی ہیں۔

مقامِ غالب

ہماری زبان، علیگڈھ
... اگست ١٩٦١ء

غالب تنقید اور تحقیق کرنے والوں کے لئے پچھلی ایک صدی سے پسندیدہ ...دے رہے ہیں۔ اور پچھلے چند برسوں میں محققین نے غالب کی زندگی ...و شعر پر مختلف پہلوؤں سے بڑا کام کیا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف ...رفعت کی ہے جو اردو کے ان چند خاموش خدمت گذاروں ...نمود و نمائش سے بے نیاز علمی کام کرتے رہتے ہیں۔

...ب پر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود اس لحاظ سے بہت ...جہاں تنقید ہے وہاں محققانہ شان نہیں اور جہاں تحقیق کا رکھ ...تنقید شعر کے آداب نظر میں نہیں۔ مقامِ غالب کے مصنف ...کوشش کی ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو ایک ہی کتاب میں ...پیش کیا جائے۔ مقامِ غالب نہ تو محققانہ تصنیف ہے نہ ...ان دونوں کے امتزاج سے ایسی کتاب لکھی گئی ہے جو طلبہ ...ل کو غالب کے مطالعے میں ابتدائی معلومات بہم پہنچا سکتی ہے ...جو غالب پر لکھا گیا ہے وہ سارا سرمایہ نظر کے سامنے آجاتا ...پنج ابواب پر مشتمل ہے۔ سوانح حیات فارسی نظم و نثر، اردو ...غالب کا اردو نثر، غالب پر لکھی ہوئی کتابیں، اس طرح ...میں وہ سارا مستند مواد یکجا کر دیا گیا ہے جو اب تک غالب ...فراہم ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں طلباء کو بڑی ضخیم اور قیمتی ...سے بھی ملجائیگا اور ان کا اجمالی خاکہ بھی

(وحید اختر)

آجکل دہلی
بابتہ جولائی ١٩٦١

زیرِ نظر کتاب غالب کے سوانح حیات اور اُن کی اردو نظم و نثر کے انتخاب پر مشتمل ہے اور آخر میں غالب پر لکھی ہوئی کتابوں کی تفصیلی فہرست درج ہے۔ اس میں غالب کی فارسی نظم و نثر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بلاشبہ غالبیات میں اچھا اضافہ ہے۔ (عرش ملسیانی)

اقتباس ماہنامہ انشا کراچی
بابتہ جون ١٩٦١ء

مرزا اسد اللہ خاں غالب پر مسلسل ایک صدی سے لکھا جارہا ہے اور نہ جانے کب تک لکھا جائیگا۔ غالب کے صدہا اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار آج کے صنعتی و سائنسی دور میں نئے نئے معنی بکھرا بکھر رہے ہیں۔ مقامِ غالب میں مبارز الدین رفعت صاحب نے غالب کی شخصیت کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے انھوں نے غالب کے نثر و نظم کا ایک اور ستھرا انتخاب شائع کیا ہے۔ ١٦٠ صفحات پر مشتمل "مقامِ غالب" غالب کی عظیم شخصیت اور فن کا ایک کامیاب جائزہ ہے۔

ماہنامہ نیرنگِ خیال
جون ١٩٦١ء لاہور

غالب سے متعلق اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اردو ادب میں غالبیات کے نام سے ایک مستقل صنف قائم ہو چکی ہے۔ "مقامِ غالب" غالبیات میں ایک اور اضافہ ہے جس میں غالب سے متعلق تمام موجودہ کتب سے استفادہ کرکے غالب کی شخصیت اور شاعری پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے۔ ادب کے مبتدیوں اور خصوصاً طالب علموں کے لئے یہ کتاب گہری افادیت کی حامل ہے کیونکہ اس کا اندازِ بیان

صاف اور واضح ہے۔ کتاب کے آخر میں غالب کا ایک مختصر انتخاب بھی شامل ہے۔

جامعہ دہلی
اپریل ۱۹۶۱ء

اس مختصر کتاب میں غالب کے سوانح حیات اور ان کی نظم و نثر کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ کوئی تحقیقی کتاب نہیں ہے مگر غالب کے متعلق اس میں تمام معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب طالب علموں کے لئے لکھی گئی ہے اور اس لحاظ سے اپنے مقصد میں کامیاب ہے

ماہنامہ ادیب علیگڑھ
اپریل ۱۹۶۱ء

کتاب انتہائی صاف، سادہ اور اصولی انداز میں لکھی گئی ہے اس سے غالب کے بارے میں واضح تصور ذہن پر ضرور مرتسم ہو جائے گا یہ اس کتاب کا خاص وصف ہے۔ مصنف خود مستند ادیب ہیں اس لئے شعر و ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں آخر میں غالب کی اردو فارسی نظم و نثر کے انتخابات اس کے بہترین شاہد ہیں، غالب کے سلسلے میں نوخیز ذہنوں کے لئے اس مفید اور اساسی کتاب کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ مختلف تعلیمی ادارے اسے اپنے نصاب میں شامل کر کے اس کی افادیت کی تصدیق کریں گے۔ ( )

ماہنامہ ساقی کراچی
اپریل ۱۹۶۱ء

غالب کے شائقین اور احباب کے لئے یہ چھوٹی سی کتاب ایک اچھا تحفہ ہے، جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ غالب نے جو پیشنگوئی کی تھی کہ میرے اشعار کی شہرت میرے مرنے کے بعد ہوگی، پوری ہو رہی ہے۔ ان کے کلام کے جتنے نسخے اب تک شائع ہو چکے ہیں اردو کے کسی شاعر کے نہیں ہوئے اس سے بڑھ کر کسی شاعر کی مقبولیت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے غالب کی عظمت اس سے بھی زیادہ قدر دانی کی مستحق ہے

اقتباس "فاران" کراچی
بابتہ اگست ۱۹۶۱ء

جناب مبارز الدین رفعت کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ موصوف زبان و ادب کی خدمت کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، غالب کے سوانح حیات اور ان کی اردو نظم و نثر پر یہ ایک اچھی کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے پڑھنے سے غالب کی شخصیت اور اس کا فن ایک نظر میں سامنے آ جاتا ہے۔

سیاست حیدرآباد
۶ر مارچ ۱۹۶۱ء

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی جانب سے شائع کردہ کتاب "مقام غالب" کے مصنف مبارز الدین رفعت نے بالکل سچ لکھا ہے کہ غالب اور اقبال پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ "غالبیات" اور "اقبالیات" اردو ادب کے مستقل موضوع بن گئے ہیں اور پھر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔

۱۶۰ صفحے کی چھوٹی تختی والی مختصر سی کتاب میں غالب کی پیدائش سے اس کی وفات تک کی طویل سوانح حیات کو مصنف نے یکجا کرنے میں بڑی ماہرانہ کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ غالب پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں لیکن ایسی ساری کتابیں غالب کے کسی خاص پہلو کو یا صرف ان کی شاعری کو پیش نظر رکھ کر تحریر کی گئیں۔ لیکن مقام غالب ان ساری کتابوں میں بھی ایک منفرد مقام رکھتی ہے یہی کتاب اگر شاندار ٹائیٹل اور خوبصورت طباعت و کتابت کے ساتھ کسی بیرونی ادارہ سے شائع کی جاتی تو یقیناً اس کی مانگ کئی گنا زیادہ ہوتی۔ بیک نظر کہ رسالے کسی اختیاری مضمون کی کتاب نظر آنے والی مقام غالب اپنے سینے میں معلومات کا بے بہا خزانہ چھپائے ہوئے ہے، غالب کی زندگی کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب کی زندگی خود ایک مجسم غزل ہے جس میں شیرینی اور تلخی ایک دوسرے میں مدغم ہیں، اور "مقام غالب" اس حزنیے اور طربیے کی مکمل تفسیر ہے، بلاشبہ مبارز الدین رفعت قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے غالب پر لکھنے کے لئے ایک نیا زاویہ اختیار کیا۔

اردو کے ممتاز شاعر غالب کی زندگی پر محیط یہ کتاب بہر حال ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے کتاب کی قیمت دو روپے ہے۔

منقول از اخبار طلاپ ادبی ایڈیشن
۲۶/جولائی ۱۹۶۱ء

اردو کے شاعروں میں غالب اور اقبال اس لحاظ سے بھی ممتاز ہیں کہ ان کے بارے میں اتنا زیادہ کچھ لکھا گیا ہے کہ غالبیات اور اقبالیات اردو ادب کے دو منتخب موضوع بن گئے ہیں۔ ان موضوعات پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں، مختلف ادیبوں، شاعروں، تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے ان موضوعات پر اپنی بصیرت اور علمی استعداد و قابلیت کے مطابق خامہ فرسائی کی ہے لیکن ان موضوعات پر لکھی ہوئی کتابوں کے انبوہ کثیر میں چند کتابیں ایسی ہیں جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔ اور قدر شناس نظروں میں کھپ جاتی ہیں مبارز الدین رفعت صاحب کی نئی کتاب مقام غالب ایسی ہی معدودے چند کتابوں میں سے ایک ہے ایک مخصوص کتاب ہے انہوں نے غالب کی سوانح حیات فارسی نظم و نثر اردو کے منتخب کلام اور اردو نثر پر مختصر مگر جامع انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ اور آخر میں غالب پر لکھی ہوئی مختلف کتابوں اور ان کے کلام کی شرحوں کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ کتاب معنوی حیثیت سے کافی اچھی ہے۔ (علاء الدین حبیب (ایم اے))

تماشائے اہل ہنر

ماہنامہ انشاء کراچی
مئی ۱۹۶۱ء

زیر تبصرہ ادارہ کی مطبوعہ کتاب "تماشائے اہل ہنر" ہے جس میں غالب، اقبال اور مومن کی شخصیت پر تین ڈرامے پیش کئے گیا۔ استاد غالب کو انوار العلوم کالج حیدرآباد میں اسٹیج کیا گیا ہے جسے پیش لفظ میں سید علی اکبر پرنسپل انوار العلوم نے ایک کامیاب ڈرامہ قرار دیا ہے۔ بالا شبہ مصنف نے قلم جاں دل سے ان ڈراموں میں غالب اور مومن اور اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ ہر نوع ادبی حیثیت سے ان ڈراموں کی تصنیف پر ہم رشید الحسن صاحب کو مبارکباد پیش کریں گے۔

ماہنامہ کتابی دنیا کراچی
بابتہ اکتوبر ۱۹۶۱ء

اس میں فاضل مولف نے غالب، مومن اور اقبال کے بارے میں انہی کے الفاظ میں تین ڈرامے پیش کئے ہیں، شروع میں استاد غالب کا ڈرامہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کی کامیابی کی بعد حکیم مومن اور اقبال تحریر کئے گئے۔ بہرحال یہ ایک دلچسپ چیز ہے اور پڑھنے کے قابل ہے مولف نے بہت محنت سے موزوں شعروں کو مختلف واقعات کے ساتھ اس طرح سے ایک لڑی میں پرو دیا ہے کہ لطف آجاتا ہے۔ ان کے پڑھنے سے تینوں شاعروں کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویر سامنے آجاتی ہے، غالب والا ڈرامہ عبد غلیہ کے اصلی لباس میں دکھایا بھی گیا تھا۔ اور اس کا فوٹو بھی کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے

(ضیاء احمد بدایونی)

اردو املا

نوائے ادب بمبئی
اکتوبر ۱۹۶۱ء

غلام رسول صاحب نے اردو میں اعراب اور علامتوں پر بحث کرتے ہوئے ۲۴ اصول مرتب کئے ہیں جن کی مدد سے اُن کے خیال کے مطابق تلفظ کی صحت کا مسئلہ حل ہو سکیگا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بعض آوازوں کے لئے نئی علامتیں بھی تجویز کی ہیں، جن کے بغیر بالخصوص غیر زبانوں کے لفظوں کو اردو میں ادا کرنے میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

انہوں نے لفظوں کے نمونے جمع کرنے میں محنت کی ہے پھر بھی ممکن ہے کہ ان کا خیال اور ان کی تجویزیں بہت سے لوگوں کے لئے قابل قبول نہ ہوں، رسالہ کے شروع میں ڈاکٹر زور مقتدا ادارہ کا پیش لفظ ہے

روزنامہ طلاپ (ادبی ایڈیشن)
۲۶ جولائی ۱۹۶۱ء

اردو املا کی اصلاح اور ترقی کا مسئلہ علم و ادب

کے بھی خواہوں کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے روزنامہ ملاپ کی ادبی اشاعتوں میں بھی اس موضوع پر متین دلچسپ اور خیال انگیز مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ غلام رسول صاحب نے اردو املا۔ اعراب اور رموز و اوقات سے متعلق ریسرچ میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا ہے۔ اردو املا کے متعلق ان کا جو مضمون حالیہ ملاپ کی ایک ادبی اشاعت میں شائع ہوا تھا اسے ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ غلام رسول صاحب کی زیر نظر کتاب قابل ہے کہ اردو املا سے دلچسپی رکھنے والا ہر فرد اسے پڑھے۔ اس کتاب میں اردو اعراب املا کے قاعدے۔ رموز اوقاف کے قاعدوں کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

دیوان عشق

سیاست حیدرآباد
۲۰ جون ۱۹۶۱ء

مرزا جمال اللہ عشق اورنگ آبادی کے اس دیوان کو جناب محمد اکبرالدین صدیقی لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ نے مرتب کیا ہے۔

اورنگ آباد صرف تاریخی مقامات کے لئے ہی بہترین مثالیں نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کی خاک میں بڑے بڑے صوفیائے کرام اور نامور شعرائے عظام بھی دفن ہیں۔ اردو کے ہر شعری تذکرے میں جہاں دلی، لکھنو، حیدرآباد کے شعرا کا جدا جدا ذکر ملتا ہے وہاں اورنگ آباد کے شعرا کے بیان کے لئے بھی ایک جداگانہ باب وقف کیا جاتا ہے۔ پتہ نہیں دکن کے ایسے کتنے ایسے شعرا ہیں جو اپنے زمانے میں بڑے اساتذہ شمار کئے جاتے تھے لیکن ان کے دیوان منظر عام پر نہیں آسکے۔ یہی حال مرزا جمال اللہ عشق اورنگ آبادی کا بھی ہے جن کا "آب حیات" اور "تاریخ ادب اردو" وغیرہ میں ذکر نہیں ملتا۔ جناب اکبرالدین صدیقی نے تلاش کے بعد یہ دیوان حاصل کیا اور اسے ترتیب دیا ہے۔

اس قسم کے تحقیقی کاموں سے جہاں ہمارا پرانا ادب عوام کی نظروں کے سامنے آتا ہے دکنی زبان کی مختلف ادواری جو ساخت رہی ہے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آٹھویں صدی ہجری سے گیارھویں صدی ہجری تک دکنی اردو کا ایک خاص مزاج رہا ہے اور اس طویل دور کی تصانیف میں ایک لسانی تسلسل رہتا ہے

دکن کے قدیم شاعروں کے کلام کی تلاش کا کام مسلسل جاری ہے اور اس سلسلہ میں ادارۂ ادبیات اردو نے جو خدمات انجام دی ہیں ان سے ہر شخص واقف ہے۔

دیوان ہاشمی بیجاپوری

سیاست ۸ ردسمبر ۱۹۶۱ء

ہاشمی بیجاپوری (متوفی ۱۱۰۹ھ) عادل شاہی عہد کا قادر الکلام اور اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گذرا ہے۔ علی عادل شاہ ثانی کے دربار و محلات سے یہ متوسل تھا اور سلطان کی حرم سرائیں اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی تھیں۔

زیر تبصرہ دیوان ہاشمی جسے ڈاکٹر حفیظ قتیل نے کتب خانہ سالار جنگ کے واحد قلمی نسخے سے مرتب کیا ہے۔ (۳۶۲) صفحات پر محیط ہے۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے تیس صفحات پر مشتمل عالمانہ مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔ جس میں ہاشمی کے فن کے علاوہ اس کے نام، وطن، ولادت، وفات، مدفن اور مذہب جیسے مختلف اختلافی مسائل پر ناقدانہ بحث کی ہے اور بڑی اعتماد کے ساتھ فیصلے دیے ہیں۔ دیوان ہاشمی میں صرف متن ایک سو غزلیں معہ فرہنگ الفاظ کے ساتھ مرتب نے شامل کی ہیں۔

دیوان کے مطالعہ سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ ہاشمی ایک پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ڈھائی سو سال گذرنے بعد آج اس کا جس قدر کلام دستبرد زمانہ سے بچ کر ہم تک پہنچا ہے وہ خود اتنا وافر ہے کہ اس قدر سرمایہ بھی اس کی پرگوئی کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ہاشمی نے مثنوی بھی لکھی جس میں یوسف زلیخا کی شہرت ہے۔ اس کی ریختی دکن کی نسوانی زندگی کا ایسا مرقع ہے جس میں دکن کی عورتوں کی زبان، ان کی پوری تہذیب، طرز فکر، جنسی زندگی کی نفسیات اس عہد کے سماجی اور معاشی حالات غرض سبھی تفصیلات ملتی ہیں۔

ہاشمی نے جہاں جہاں جنسی معاملات پر روشنی ڈالی ہے کسی خاص نفسی کیفیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور کہیں بھی عریانی کا پہلو اسقدر واضح نہیں ملتا۔ جہاں رنگین اور جان صاحب کھل کھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاشمی کی زبان دکن کی عورتوں کی قدیم زبان ہی نہیں ہے بلکہ یہ زبان وہ ہے کہ جو آج بھی کم و بیش دکن دیہاتی عورتیں بولتی ہیں۔

ہاشمی کے دیوان میں تکیہ کلام، محاورے، ضرب الامثال، مخاطبت اور حسن کے شگفتہ نمونے ملتے ہیں جس سے دکن کی عورتوں کی قدیم تہذیب آشکارا ہو جاتی ہے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اسقدر ذہین اور باشعور شاعر مادر زاد اندھا تھا یا بعد کو اس کی بصارت زائل ہو گئی۔ بقول مرتب اسکی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی بلیقین یہی کر سکتا تھا کہ وہ نابینا تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ اندھا ہوتے ہوئے بھی زندگی کے خارجی آب و رنگ اور اس کے تغیرات کا ایسا ہی علم رکھتا تھا جیسے کوئی آنکھوں والا۔ خصوصاً ہاشمی کو مختلف رنگوں اور ان کے جمالیاتی پہلو کا جو شعور تھا وہ یہ سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ مادر زاد اندھا نہیں تھا۔

دیوان ہاشمی کو ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے اور اس کی قیمت، چھ روپے متعین کی ہے۔ صرف سرورق کی دلکشی کے طباعتی اعتبار سے اندرونی صفحات کو روشن، جاذب نظر اور دیدہ زیب ہونا ضروری تھا۔ کتابت میں احتیاط برتی جاتی تو اس کی افادیت اور اہمیت بڑھ جاتی۔ ہاشمی کے اس دیوان سے . . . . .
. . . . . انتخاب کیوں دیں خود ہی پڑھئے اور سرزمین دکن کے اس عظیم شاعر کے کلام سے لطف اٹھایئے اور ایسے کلاسیکل اور نادر کتابوں کی اشاعت میں معروف رہنے والے اداروں کو مستحکم بنایئے تاکہ وہ زیادہ توجہ سے اسلاف کے زریں کارناموں کو دور جدید کے باشعور افراد کے مطالعہ کے لئے پیش کر سکیں۔

(و، خ)

تحفۃ الشعراء

ریاست حیدرآباد
۳۱ دسمبر ۱۹۶۱ء

تحفۃ الشعراء کا شمار قدیم تذکروں میں ہوتا ہے جسے مرزا افضل بیگ خاں قاقشال نے ۱۱۶۵ھ یعنی اب سے دو سو سولہ سال قبل عہد آصف جاہ اول اور ناصر جنگ فارسی میں اس زمانے کے دستور کے مطابق تالیف کیا گیا تھا۔ اس تذکرے میں اردو اور فارسی ہر دو زبانوں میں طبع آزمائی کرنے والے جملہ (۶۲) شعراء کا حال مع نمونہ کلام مندرج ہے۔ اردو کی خدمت تذکرہ نویسی کی صورت میں بھی سو دو سو برس سے ہو رہی ہے۔

قاقشال کا مرتبہ یہ تذکرہ اپنی قدامت اور افادیت کے لحاظ سے قابل قدر اس لئے ہے کہ اس میں بعض شاعروں کے متعلق ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو دیگر تذکروں میں نہیں ملتیں نیز اس تذکرہ سے آصف جاہی عہد اور اورنگ آباد کے اردو فارسی شعراء کا حال احوال جو اس میں درج ہے، اس دور کی ادبی زندگی کا ایک سدا بہار مرقع ہے۔

مرتب نے اپنے مختصر سے مقدمہ میں لکھ دیا ہے کہ اس مصنف (قاقشال) کے حالات ہی کسی تذکرے میں نہیں ملتے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ صاحب تذکرہ خود ہی اپنے حالات سے اردو والوں کو بے بہرہ رکھے ہوئے ہے۔ ضمناً دیگر شعراء کے حالات میں کہیں کہیں قاقشال نے اپنے بارے میں چند اشارے کئے ہیں اور بس۔ جن سے علم ہوتا ہے کہ وہ آصف جاہ اول اور ناصر جنگ کے متوسل و ملازم تھے اور فوج میں رسالدار تھے۔ افضل بیگ شاعر نہیں تھے مگر صاحب ذوق اور سخن شناس ضرور تھے۔ ان کا یہ تذکرہ قراردادی اعلیٰ ادبی ذوق کی یادگار ہے۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے مقدمہ میں ابتداً مؤلف کے بارے میں معلومات رقم کرتے ہوئے اس تذکرہ کا تعارف کرایا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ اس تذکرے کے کل تین نسخے (کتب خانہ آصفیہ میں دو اور کتب خانہ سالار جنگ میں ایک) ہیں۔ انہی تینوں نسخوں سے باہمی مقابلے کے بعد یہ ایڈیشن مرتب کیا گیا ہے اور جہاں ان نسخوں میں نمایاں اختلاف پایا گیا وہ حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے۔

اس تذکرہ کی تہذیب و ترتیب پر ڈاکٹر قتیل اور ادارہ ادبیات اردو دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایک اہم تذکرہ مخطوطوں کی شکل میں ... تک سی تلف ہونے سے بچ گیا اور

صاف ستھرا چھپ کر بزم ادب میں آگیا۔ (۱۷۶) صفحات پر محیط تحفۃ الشعراء خوبصورت کارڈ بورڈ کی جلد میں ملبوس ہے اور قیمت تین روپے رکھی گئی ہے جو کسی قدر زیادہ ہے۔

(د، غ)

دکھنی ہندو اور اردو

منقول از صبح امید بمبئی
ماہ نومبر ۱۹۶۱ء

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کا نام ادبی دنیا میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ہاشمی صاحب اردو کے ان گنے چنے ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ادبی سوعالیہ کو ایک شعار بنا لیا ہے۔ ہاشمی صاحب کی زیر تبصرہ کتاب "دکھنی ہندو اور اردو" تحقیق کا ایک لا جواب نمونہ ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے دکن کے ان ہندو شاعروں، نثر نگاروں، ایڈیٹروں۔ اور ادیبوں کے مختصر حالات اور نمونہ کلام درج کیا ہے۔ جنھوں نے اردو زبان اور ادب کی خدمت کی ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ (حال گورنر یوپی) نے لکھا ہے۔ اپنے پیش لفظ میں مولوی صاحب کے اسلوب بیان کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا اسلوب ہمیشہ عام فہم اور سلیس رہا ہے جس کی بڑی ضرورت ہے۔ ان کی محنت قابل داد اور لایق ستائش ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے۔ اور کہا ہے کہ دکن میں اردو کے ہندو ادیبوں اور شاعروں کی اس طویل فہرست اور ان کے مختلف النوع کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے ہمکو اس کا اچھا احساس ہو جاتا ہے کہ اردو زبان درحقیقت کسی طبقے اور فرقے یا مذہبی گروہ کی مخصوص زبان نہیں ہے۔

کتاب کے تین ادوار پر تقسیم کی گئی ہے پہلا دور بہمنی عہد کے اردو ادب سے شروع ہوتا ہے لیکن اس دور کا کوئی ہندو ادیب یا شاعر موصوف کو دستیاب نہ ہو سکا۔ دوسرا دور دیگر ادوار عادل شاہی، قطب شاہی اور مغل (۱۹۵۵ء) تک سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دور سے کر موجودہ

بقیہ صفحہ (۶) پر

زمانے تک سینکڑوں ہندو ادیب اور شاعر ہوئے جنھوں نے علم و ادب کے ہر شعبہ میں اپنے افکار چھوڑے ہیں ان کا تفصیلی تذکرہ قارئین کو اس کتاب کے صفحات پر ملیگا۔ ہاشمی صاحب نے اس کتاب میں شعراء کے علاوہ خواتین شعراء، اخبارات و رسائل اور ان کے مدیران۔ وکلا اور ایجوکیشن صاحبان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ فرزندان جامعہ عثمانیہ کے لئے ایک مخصوص باب رکھا گیا ہے۔ غرض کہ اس کتاب میں دکن کے ہندو شاعروں۔ نثر نگاروں اور ایڈیٹروں وغیرہ کے مختصر حالات زندگی اور نمونہ نظم و نثر درج ہیں۔ مولوی ہاشمی صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے مواد فراہم کیا ہے۔ اور اس مختصر سی کتاب میں ۲۳۲ ہندو ادیبوں اور شاعروں کے کارنامے یکجا کئے ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کو اردو کی ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہوگی

کلمۃ الحقائق

روزنامہ بھارت حیدرآباد

اردو زبان کی نشو و نما میں صوفیوں کے قابل قدر خدمات تاریخ ادب کا ایک روشن باب بن گئے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے سلسلے کے خلیفہ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند حضرت شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری کی تصنیف ہے یہ کتاب جسے پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے چند مخطوطات کے تقابلی مطالعہ کے بعد مرتب کی ہے۔ اپنے دامن میں زبانوں کے تدریجی ارتقا اور ان پر دیگر زبانوں کے اثرات واضح کرتی ہے۔ ظاہر میں تو "کلمۃ الحقائق" عرفانیات اور روحانیت کا مرقع ہے جس میں خدا کے وجود اور اس کی برتری و بزرگی کو واضح کیا گیا ہے مگر باطن میں ہمیں اس کتاب سے نہ صرف انسانیت کی آفاقی قدروں کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے بلکہ زندگی کو بسر کرنے کے صحیح قرینوں کے اسرار بھی منکشف ہوتے ہیں۔ (بقیہ ص۸ پر دیکھئے)

ادارے کا کتب خانہ

سال ۱۹۶۱ء میں ادارہ کے کتب خانہ میں کتابوں کا کافی اضافہ ہوا۔ مطبعین حضرات نے اپنی علم دوستی اور علم نوازی کا ثبوت دیا اور بڑی تعداد میں کتب خانہ ادارہ کو قلمی و مطبوعہ کتابیں عنایت فرمائیں۔ دار المطالعہ میں سب سے بڑے تبادلہ میں تقریباً (۱۷۰) اخبار اور رسائل روزانہ، ہفتہ وار، ماہنامے، دو ماہی، سہ ماہی اور سالانے آتے رہے۔ مطبوعہ کتابوں کی تعداد میں (۱۵۵۵) اور مخطوطات میں (۷۶) کتابوں کا اضافہ ہوا۔ عطیہ دینے والوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ۲۔ محترمہ رابعہ بیگم (مسز انوار اللہ) ۳۔ نواب میر حسین علی خان
۴۔ کانگریس لائبریری واشنگٹن ۵۔ اقبال کرشن صاحب (کلکتہ) ۶۔ سنٹرل ریکارڈ آفس (حیدر آباد)
(۷) علامہ حیرت بدایونی (۸) غوث محی الدین صاحب (سابق رکن مجلس مال) (۹) ترقی اردو بورڈ آندھرا پردیش
(۱۰) جناب ہادی بلگرامی صاحب (۱۱) جناب مہدی رضا حسین صاحب رکن ادارہ (۱۲) عبدالنافع صاحب کراچی (۱۳) بشیر احمد خاں صاحب
(۱۴) اسمٰعیل خاں صاحب (۱۵) ہنر ایکسلنسی سفیر روس (۱۶) افضل شریف صاحب (۱۷) نواب غنیمت جنگ بہادر (۱۸) محمد اکبر الدین صدیقی

اضافہ کتب کے سلسلے میں ایک اور قدم یہ اٹھایا گیا کہ مطبوعات ادارہ کا بیرونی پبلیشروں کی کتابوں سے تبادلہ کیا گیا جس میں مکتبہ دانش لاہور، مکتبہ کاروان الٰہ آباد کے علاوہ دیگر اداروں نے ہمارے ساتھ کافی تعاون کیا اور ہماری کتابوں کے معاوضے میں اپنی مطبوعات کے نسخے ہماری منتخبہ فہرست کے مطابق ارسال کر دیئے۔

ادارے کی اپنی عمارت، ایوان اردو، میں منتقلی کے بعد قارئین کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ مطبوعات کے علاوہ مخطوطات کا بھی مطالعہ ہوتا ہے۔ اور کتب خانہ کا عملہ قارئین کی فرمائش کی تکمیل میں کوشاں رہتا ہے۔ دار المطالعہ میں بھی روزانہ مطالعہ کنندگان کی تعداد اوسطاً (۲۵) رہتی ہے۔ دار المطالعہ میں ادارے کے ترجمان "سب رس" کے تبادلے میں جو رسائل آتے ہیں اُن کی تعداد اس فہرست سے واضح ہو گی جو علیحدہ عنوان کے تحت درج ہے۔

جنوری ۱۹۶۱ء تا ختم دسمبر تک ادارہ کی (۲۳۶۵) مطبوعات سے (۱۳۱۴) افراد نے استفادہ کیا۔ اسی طرح (۵۱) اشخاص نے (۱۴) مخطوطات کا مطالعہ کیا اور حسب ضرورت نقولات حاصل کئے۔

سال ۱۹۶۱ء سے تمام رسائل و اخبارات کی حسب ِسابق جلدیں بنا کر انھیں درج رجسٹر کر کے محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس سال تقریباً تین سو کتابوں کی جلدیں بنائی گئیں۔ رسائل کے لئے ریاکس خریدے گئے اور کتابیں نکالنے کے لئے ایک متحرک آہنی سیڑھی بھی خریدی گئی۔

محمد اکبر الدین صدیقی (ایم۔ اے)
معتمد اعزازی کتب خانہ ادارہ

استفادہ کتب خانہ

(ادارہ کے وسیع کتب خانہ (مطبوعات ومخطوطات) کے علاوہ دارالمطالعہ سے آئے دن کئی افراد استفادہ کرتے ہیں۔ ذیل میں ایسی تفصیلات مندرج ہیں جن کا تعلق خالص علمی وادبی تحقیقات کے استفادہ سے ہے۔ جن کی مدد سے بڑی حد تک شہر حیدرآباد میں ادبیات سے دلچسپی اور تعلق کے سمت کی طرف نشاندہی بھی ہوتی ہے (ادارہ)

محترمہ حبیب ضیاء (ایم اے) ریسرچ اسکالر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے رکنی گرامر کے سلسلے میں اپنے مقالے کے لئے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

جناب صدیق الرحمٰن قدوائی (ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی) نے ماسٹر رامچندر کے تعلق سے ادارے کے کتب خانہ سے اخبار فوائد الناظرین کے فائیل اور اُن کی تصانیف سے استفادہ کیا اور نقولات حاصل کئے۔

اوج یعقوبی صاحب نے صفی اورنگ آبادی کی شاعری اور شخصیت کے تعلق سے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب مولوی غلام رسول اور پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

ادارہ کے کتب خانہ اور دارالمطالعہ سے ماہ جنوری میں ۳۰۴ افراد نے استفادہ کیا۔

جناب صدیق الرحمٰن قدوائی (دہلی یونیورسٹی) نے فوائد الناظرین

اور ماسٹر رامچندر کی تصانیف سے اہم نوٹس لئے۔

جناب نصیر اختر صدیقی، بشیر النور صاحب اور ہادی رحیل صاحب نے اردو افسانوں کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ سے متواتر استفادہ کیا۔

پروفیسر خواجہ حمید الدین صاحب شاہد (کراچی) جناب تحسین سروری (کراچی) اور امیر عارفی صاحب (علیگ) نے مختلف ادبی موضوعات پر ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب تحسین سروری صاحب اور نذیر نیئر صاحب نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد اردو مجلس اور جناب قمر ساحری معتمد بزم سعدی نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

مولوی غلام رسول، جناب خضر حسن سابق ایڈیٹر "پیام" جناب امین احمد بکھراؤ، مذاق فاروقی صاحب (ایم ایے) ناظم گڑولی اور سعادت نظیر صاحبان نے ادارہ کے کتب خانہ اور رسائل کے خاص نمبرات سے استفادہ کیا۔

ادارہ کے کتب خانہ اور دارالمطالعہ سے ماہ فروری میں ٣٢٩ افراد نے استفادہ کیا۔

جناب حسن الدین احمد ڈپٹی کلکٹر سکریٹری نے، لقطہ ثانی

کے موضوع پر ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا

جناب اختر حسن ایم اے، جناب تحسین سروری اور جناب قمر ساحری نے ادارہ کے کتب خانہ سے مختلف ادبی موضوعوں پر استفادہ کیا

پروفیسر دھرمیندر پرشاد (شعبہ جغرافیہ عثمانیہ یونیورسٹی) اور مولوی سید تمکین کاظمی صاحب ریسرچ اسکالر ادارہ نے ادارہ کے کتب خانہ سے علی الترتیب حیدرآباد کا جغرافیہ اور عہد آصف جاہی کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں استفادہ کیا۔

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، قمر ساحری، جاوید حیدرآبادی، اور صلاح الدین صاحب تیر نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب مولوی سید تمکین کاظمی صاحب، مراد علی طالع صاحب اور نسری ادی، راجندر ریڈی صاحبان نے اپنے ریسرچ ورک کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب سعادت نظیر صاحب (ایم اے) نے فراق کی غزل کے زیر عنوان ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب ہیرالال موریا صدر رائیٹرس ایسوسی ایشن ضلع کھم نے محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی پر انگریزی میں لکھی جانے والی کتابچے بارے میں ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

حضرت صفی اورنگ آبادی کے دیوان کی ترتیب کے سلسلے میں خواجہ شوق اور حبیب یاس صاحبان نے ادارہ کے کتب خانہ و مخطوطات سے استفادہ کیا اور صفی کے کلام کی نقولات حاصل کیں۔ ادارہ کی طرف سے وقار خلیل صاحب نے معاونت کی۔

ڈاکٹر شریف النساء انصاری لکچرار کلیہ اناث نے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

محمد جمال شریف صاحب ایم اے ریسرچ اسکالر علیگڈھ۔ امجد کی شاعری اور حیات کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب مولوی تمکین کاظمی صاحب ریسرچ اسکالر ادارہ نے مقالہ "تذکرہ شعرائے دکن" کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ سے مختلف تذکروں اور تاریخوں سے استفادہ کیا۔

کتب خانہ اور دار المطالعہ ایوان اردو سے ماہ اپریل میں [illegible] افراد نے استفادہ کیا۔

جناب پروفیسر مبارز الدین رفعت آرٹس اینڈ سائنس کا گلبرگہ نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

روسی ادیب جناب ولادی میر پی لیبرودسکی نے ادا کے کتب خانہ "اردو قواعد" کے موضوع پر استفادہ کیا۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر (لکچرار اردو نظام کالج) نے ادارہ مخطوطہ من سمجھاون سے استفادہ کیا۔

علامہ حیرت بدایونی اور جناب زبیر رضوی (دہلی) نے ادا کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب محمد عبد السمیع صدیقی (ایڈووکیٹ) نے اساتذہ سخن اردو دواوین سے ادارہ کے کتب خانہ میں استفادہ کیا۔

جناب نواب میر حسین علیخان نے گرودیو ٹیگور کے بارے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب مولوی غلام رسول (مصنف اردو ڈراما) نے کتب خ اور دار المطالعہ سے استفادہ کیا۔

کتب خانہ و دارالمطالعہ ایوان اردو سے ماہ مئی میں (۱۰۰) افراد نے دارالمطالعہ سے استفادہ کیا۔

پروفیسر عبدالقادر سروری (صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور جناب عزیز احمد (بی۔ اے۔ نظام آباد) نے علی الترتیب ادارہ کے مخطوطات اور اردو کے کلاسیکل افسانوی ادب سے استفادہ کیا

جناب پروفیسر عبدالقادر سروری نے ادارہ کے مخطوطات کلیات محمد قلی قطب شاہ سے استفادہ کیا

کتب خانہ اور دارالمطالعہ ایوان اردو سے ماہ جون میں (۳۲۳) افراد نے استفادہ کیا۔

مس فاطمہ محمود (ایم اے) نے اپنے مقالہ گولکنڈے کے ہیرے کے تعلق سے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب رشیدالدین (بی۔ اے) خاکی حیدرآبادی معتمد بزم نو آندھرا پردیش نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب احمد معظم (ادارہ ہیا سند برقی موسوی صاحب اور رگھو سی زرل صاحب نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔ احمد معظم صاحب نے مجلہ عثمانیہ اور ماہنامہ سویرا سے جناب مخدوم محی الدین کے زیر ترتیب مجموعہ گل تر کے لئے ان کی مطبوعہ نظمیں نقل کیں۔

جناب مدن گوپال صاحب انفارمیشن آفیسر منسٹری آف کمیونٹی ڈیولپمنٹ گورنمنٹ ہند دہلی نے پریم چند کے مضامین کے سالنامہ اور دیگر کتابوں سے استفادہ کیا۔

صلاح الدین نیر صاحب نے اردو رباعیات کے ارتقاء اور دیگر مباحث سخن کے سلسلہ میں ادارہ کے کتب سے استفادہ کیا۔

جناب مولوی سخاوت مرزا صاحب نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

ادارہ کے کتب خانہ اور دارالمطالعہ سے ماہ جولائی میں (۳۹۳) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب فیض احمد (ریسرچ اسکالر تیمور یونیورسٹی) اور صلاح الدین نیر صاحب نے علی الترتیب میر حسیات اور اون کے علمی کارنامے اور سراج اورنگ آبادی پر ادارہ کے کتب خانہ اور مخطوطات سے استفادہ کیا

پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے ادارہ کے مخطوطہ کلمۃ الحقائق کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس سے اہم نوٹس لئے۔

جناب محمد منظور احمد (معتمد اردو مجلس) نے خلیق انجم صاحب (دہلی یونیورسٹی) کے لئے مرزا بادی رسوا کے تعلق سے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب فیض احمد اور جناب محمد جمال شریف نے اپنے تحقیقاتی مقالوں کے لئے ادارہ کے مخطوطات و مطبوعات سے استفادہ کیا

جناب ظہیر الحق (ادارہ رہنمائے دکن) نے ادارہ کے کتب خانہ سے اودھ پنچ، پیام اور سب رس دکن کے فائل سے استفادہ کیا

جناب اسحاق ایوبی صاحب، مولوی محمد مظہر صاحب، مولوی غلام رسول صاحب اور مولوی عارف الرحمن صاحب نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب ڈاکٹر خالدہ یوسف لکچرار اردو انوار العلوم کالج نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر، پروفیسر کبیر الدین صدیقی اور جناب سید انور حسین زبیری (نفیس رقم۔ لاہور) نے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ

کیا۔ نذیری صاحب نے حضرت خواجہ بندہ نواز پر ادارہ کے مملوکہ شجروں اور مخطوطات سے مختلف واقعات نقل کئے۔

ادارہ کے کتب خانہ اور دارالمطالعہ سے ماہ اگست میں (۴۵۰) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب محمد منظور احمد (معتمد اردو مجلس) اور جناب اسحاق ایوبی صاحب نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب سلیمان خطیب (دکنی زبان کے مشہور شاعر) نے دکنی لوک گیت کے تعلق سے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

ڈاکٹر سید جعفر، جناب نور حسین زیدی (لاہور) پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی اور محمد جمال شریف صاحبان نے ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا

کتب خانہ اور دارالمطالعہ ادارہ سے ماہ ستمبر میں (۲۷۶) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب پروفیسر سید محمد صاحب پرنسپل اردو کالج اور جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی نے ادارہ کے کتب خانہ مطبوعات و مخطوطات سے استفادہ کیا۔

جناب نور حسین زیدی (لاہور) نے ادارہ کے مخطوطہ شجرہ خواجہ بندہ نوازؒ سے استفادہ کیا۔

جناب فاضل خلیل صاحب نے اردو مثنویات کے سلسلہ میں ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔

کتب خانہ و دارالمطالعہ ادارہ سے ماہ اکتوبر میں (۲۲۵) افراد نے استفادہ کیا۔

جناب پروفیسر حسینی شاہد اور جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد اردو مجلس نے علی الترتیب ادارہ کے مخطوطات اور کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

جناب اسحاق ایوبی (انفارمیشن آفیسر پریس انفارمیشن بیورو حیدرآباد) نے اردو اخبارات و رسائل کی نمائش کے سلسلہ میں ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا اور ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی ولادت و وفات اور دیگر تفصیلات کے نوٹس لئے۔

جناب رشید الدین، نصیر اختر صدیقی صاحب اور فیض الحسن خیال صاحب نے ادارہ کے کتب خانہ سے علی الترتیب مزاحیہ ادب، افسانوں اور دکن کے شعراء پر استفادہ کیا۔

جناب محمد ظہیر الحق (ایم اے)، محمد جمال شریف صاحب (ریسرچ اسکالر علی گڑھ یونیورسٹی) رشید الدین صاحب، مولوی غلام رسول اور پروفیسر اکبرالدین صدیقی صاحبان نے ادارہ کے مطبوعات و مخطوطات سے استفادہ کیا۔

پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند کے کیمرہ مین مسٹر جین دہلی سے حیدرآباد پہنچے اور ادارہ کے کتب خانہ سے ۵۰ سے زیادہ قدیم اردو اخبارات و رسائل کے علاوہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی ادارے کے کیمرہ سے فوٹو لئے۔ اس موقع پر مسٹر اسحاق ایوبی اور پروفیسر اکبرالدین صدیقی بھی موجود تھے۔

محترمہ شاکرہ فضل اللہ احمد صاحبہ شریک مشورہ حبیب گنج کتب خانہ نے فن اشاریہ سازی اور مائیکرو فلمنگ کیمرہ کے بارے میں ادارہ سے مشاورت کی۔

ڈاکٹر حبیب النساء بیگم (میسور یونیورسٹی) پروفیسر مبارز الدین رفعت (گلبرگہ) جناب بشیر اختر شاہ (انجینئر، کرنول) جناب سلیم تمنائی اور محمد الیاس صاحب نے ادارہ کے مخطوطات و مطبوعات سے استفادہ کیا۔ ماہ دسمبر میں (۳۰۴) افراد نے مطالعہ سے استفادہ کیا۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے صدر، نائب صدر، کارکن مجلس اور شعبے

ایوانِ اردو بیک نظر

۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء = ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم ہوا۔
۸- جنوری ۱۹۴۱ء = فراہمی زمین عمارت کے لئے جد و جہد شروع کی گئی۔
۳۰ر جنوری ۱۹۴۲ء = حضرت خواجہ حسن نظامی نے عمارت کا نام "ایوانِ اردو" تجویز فرمایا۔
۲۷ر جنوری ۱۹۵۵ء = ادارہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔
۱۵ر اپریل ۱۹۵۵ء = مجلس انتظامی نے محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور سے عمارت کیلئے زمین عطا کرنے کی خواہش کی۔
۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء = بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور نے اس قطعۂ زمین کی ادارہ کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرا دی۔
۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۵ء = بہزاد دکن فیاض الدین نظامی چیف ٹاؤن پلانر نے نقشہ مکمل کیا۔

۷ر نومبر ۱۹۵۵ء = حیدرآباد کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے سنگ بنیاد رکھا۔
حکومت ہائے ہند، کشمیر، آندھرا پردیش کے علاوہ حضور نظام کے چیریٹی ٹرسٹ، سالار جنگ اسٹیٹ، نظام شوگر فیکٹری، سنگارینی کالریز اور عوامی عطیوں اور چندوں سے تقریباً پانچ سال کی مدت میں سوا لاکھ روپیوں کے صرفہ سے اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔
۱۲ر مارچ ۱۹۶۱ء = جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے اس ایوان کا افتتاح فرمایا اور جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش نے افتتاحی جلسہ کی صدارت فرمائی۔

۱- ادارے کے صدر

نواب سر مہدی یار جنگ بہادر
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۰ء

نواب لیاقت جنگ بہادر
۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء

نواب زین یار جنگ بہادر
۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء

پروفیسر سید علی اکبر صاحب
۱۹۶۱ء

۲- نائب صدر

نواب لیاقت جنگ بہادر
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء

نواب زین یار جنگ بہادر
۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۸ء

پروفیسر سید علی اکبر صاحب
۱۹۴۶ء تا ۱۹۶۱ء

پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب
۱۹۵۸ء

مولوی دلاور حسین صاحب
۱۹۶۱ء

۳- مجلس انتظامی

صدر: پروفیسر سید علی اکبر صاحب
نائب صدر: پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب
مولوی دلاور حسین صاحب انجنیئر
شری ایل این گپتا (آئی اے ایس) نمائندہ حکومت
مولوی حامد علی عباسی صاحب (آئی اے ایس)
مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب
راجہ جانکی پرشاد صاحب
شری پی ہنمنت راؤ صاحب (ایم ایل سی)
مولوی محمد اکبر الدین صاحب صدیقی
شریک معتمد: ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
معتمد عمومی: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۴- مجلس اشاعت تاریخ و تمدنِ دکن

صدر: پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب
معتمد: نواب میر سراج الدین علی خاں
نواب عنایت جنگ بہادر
آقائی صمصام شیرازی
آقائی حسین ضابط
مولوی نصیر الدین ہاشمی
نواب عباس حسین صاحب
مولوی چراغ علی صاحب
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۵ - مجلس تعلیم بالغان اردو و امتحانات	۶ - مجلس انتظامی سب رس	۷ - مجلس نشر و اشاعت
صدر: پروفیسر سید علی اکبر صاحب معتمد: مولوی عارف الدین حسن صاحب پروفیسر سید محمد صاحب مولوی غلام رسول صاحب جناب سری نواس لاہوٹی صاحب مولوی مظہر حسین صاحب مولوی خلیل اللہ حسینی صاحب مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ	نگران: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ معتمد: مولوی محمد اکبر الدین صاحب صدیقی مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب جناب من راج سکسینہ صاحب جناب رائے جانکی پرشاد صاحب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی) جناب وقار خلیل صاحب مدیر	صدر: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ معتمد: پروفیسر محمد محمود حسین صاحب مولوی دلدار حسین صاحب انجینیر پروفیسر ایم اے رحمٰن صاحب مولوی میر عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر سیاست مولوی عبد المجید صدیقی صاحب نواب میر سراج الدین علی خاں صاحب جناب وقار خلیل صاحب جناب محمد منظور احمد صاحب ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ

۸ - مجلس انتظامی کتب خانہ	۹ - مجلس ادب اطفال	۱۰ - مجلس انتظامی اردو انسائکلوپیڈیا
معتمد: مولوی محمد اکبر الدین صدیقی صاحب مولوی غلام رسول صاحب نواب عنایت جنگ بہادر مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب پروفیسر عبد المجید صدیقی صاحب مولوی میر سراج الدین علی خاں صاحب ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ	صدر: شری پی ہنمنت راؤ صاحب (ایم پی) معتمد: پروفیسر مصلح الدین صدیقی جناب دھرمیندر پرشاد صاحب جناب مرزا سرفراز علی بیگ صاحب جناب سید مراد علی صاحب طالع جناب وقار خلیل صاحب جناب اکبر الدین صدیقی صاحب جناب محمد منظور احمد صاحب ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ	صدر: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ معتمد: ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ڈاکٹر محمد محسن محشر عابدی پروفیسر عبد المجید صدیقی مولوی خواجہ یوسف الدین صاحب جناب رائے جانکی پرشاد صاحب مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب مولوی محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ڈاکٹر محمد عبد الحفیظ قتیل صاحب

عملہ دفتر ادارۂ ادبیات اردو

جناب محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ
جناب ترصیص الدین انصاری صاحب لائبریرین
جناب وقار خلیل صاحب مدیر سب رس

جناب میرزا ہد علی خاں صاحب مہتمم گودام
جناب سردار احمد علی صاحب ٹائپسٹ انگریزی
محمد نذیر الدین صاحب چوکیدار

تختۂ آمد و خرچ سالانہ تا ختم مارچ سنہ ۱۹۶۱ء

آمد

	پیسے	روپئے
سلک افتتاحی اور بنک کی رقمیں		
۱۔ نقد	۱۴	۵۱۲
۲۔ اسپیشل سیونگس بنک اکونٹ دارہ رگھوناتھ مل بنک لمیٹڈ حیدرآباد	۲۴	۱۳۴
۳۔ " " " سب رس " " "	۶۲	۱۵۶
۴۔ کرنٹ اکونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد	۹۰	۳،۳۲۳
مطبوعات	۳۵	۱،۸۱۴
سب رس	۲۵	۱،۵۵۳
کارب باغ	۱۴	۱۰۷
امداد سرکاری		
۱۔ حکومت آندھرا پردیش	--	۶،۰۰۰
۲۔ " ہند برائے ۵۹–۶۰	--	۱۰،۰۰۰
۳ " ہند برائے انسائیکلوپیڈیا	--	۳،۰۰۰
عطیات و چندے		
۱۔ از نظام ٹرسٹ فنڈ (برائے کارہائے تحقیق)	--	۱۰،۰۰۰
۲۔ چندے اور عطیے	۷۶	۲،۷۰۹
۳۔ آمدنی برائے یوم قلی قطب شاہ	۶۱	۹۳۴
تعلیم بالغان و اردو امتحانات	۳۱	۲۵۹
سود بابتہ کھاتہ جات بنک	۴۱	۸
آمدنی متفرق	..	۷۰
صدر میزان آمد	۰۳	۴۰،۳۲
		۶

خرچ

	پیسے	روپئے
مطبوعات (کتابت، طباعت وغیرہ) ۔	۷۵	۴،۱۹۷
معاوضۂ مصنفین ۔	--	۳۲۰
کتب خانہ، خرید کتب و مخطوطات، جلدبندی، خریدی فرنیچر وصادر، تنخواہ عملۂ کتب خانہ وغیرہ ۔	۷۰	۴،۷۵۱
حفاظت آثار ۔	۷۵	۵۳
سب رس ماہنامہ ۔	۱۹	۱،۱۷۵
کلچرل مصروفیات بشمول یوم محمد قلی قطب شاہ ۔	۸۳	۲،۷۹
کارب باغ ۔	۵۴	۴
اخراجات دفتر، اسٹیشنری، اسٹامپ، کرایہ وغیرہ ٹرنک		
بجلی پانی ۔	۸۱	۸۶۵
تنخواہ عملہ و ملازمین دفتر	۵۱	۲،۸۵۶
اردو امتحانات و تعلیم بالغان	۵۱	۷۱۱
تعمیر عمارت ادارہ	۱۰	۱۰،۳۰۹
معاوضہ تنقیح حسابات	..	۱۰۰
ڈاک اور وی پی کمیشن	۹۲	۲۲۶
بنک کمیشن	۲۰	۵
اخراجات متفرق	۲۷	۹
فیلوشپ	..	۱،۹۰۰
اخراجات انسائیکلوپیڈیا	..	۳،۰۰۰
قرض برائے " "	۸۵	۳۴
فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد	..	۵،۰۰۰
سلک اختتامی	۴۴	۵۰۳
۱۔ نقد	۹۱	۱۳۶
۲۔ اسپیشل سیونگس بنک اکونٹ ادارہ رگھوناتھ مل بنک	۸۴	۱۰۲۷۸
۳۔ " " " سب رس " "	۶۲	۶۱۴
۴۔ کرنٹ اکونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد	۰	
صدر میزان خرچ	۴۳	۴۰،۴۳۲

تنقیح کی گئی اور حسابات صحیح پائے گئے۔

دستخط ایس جی دستگیر اینڈ کمپنی چارٹرڈ اکونٹنٹس

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

جاری شدہ ۱۹۳۸ء　　　فون نمبر ۳۵۲۰۹

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

اپریل سنہ ۱۹۶۲ء

جلد نمبر ۲۵　　　شمارہ ۴

نگراں:-
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

معتمد:- پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی

مجلس ادارت:-
رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
رائے جانکی پرشاد
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
وقار خلیل

زر سالانہ: ہندوستان، چھ روپے　　ششماہی: تین روپے
بیرون ہند: دس روپے

[illegible] ــــــ کا [illegible]

[illegible]

ترتیب

مضامین

حصۂ نظم

افسانے

[illegible]

تمنا آفندی

جب آتش جوان تھا

میری جوانی کی شاعرانہ سرگرمیاں بہت کچھ ہیں مگر میں اس وقت صرف تین مشاعروں کی روداد بیان کر سکوں گا۔ پہلے مشاعرے میں میری کارگزاری کو شاعرانہ جسارت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مشاعرے میں میں نے جو اقدام کیا ہے وہ شاعرانہ حمیت سے موسوم ہونا چاہیے۔ تیسرے مشاعرے کے ہنگامہ کو شاعرانہ شرارت کہا جائے تو بالکل حق بجانب ہوگا۔

ابتدائے شباب اور مشغلہ شعر و سخن کے آغاز میں چھوٹے چھوٹے مشاعرے اپنے ہم عمر شعراء کے ساتھ کتنے ہی پڑھ چکا لیکن پہلا بڑا مشاعرہ میں نے جس میں شرکت کی ہے اس کی یاد کے ساتھ ہی مجھے ایک فخر کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ مشاعرہ میں نے مرحوم منشی امیراللہ تسلیم کے ساتھ پڑھا ہے جو یادگار مومن و تسلیم کہلاتے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت سو برس کے قریب پہنچ چکی تھی اور وہ اپنے دو شاگردوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تشریف لائے تھے۔ اس ضعیفی میں جب بصارت تقریباً ختم ہو چکی تھی بغیر دو آدمیوں کا سہارا لئے ہوئے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ اردو کی خدمت کے اس جذبے اور مشاعرہ کی سرپرستی کے اس کارنامے نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر آداب عرض کر کے ان کے پاس جا بیٹھا۔

اس مشاعرے میں میرے والد مرحوم حضرت میرزا تبرم(?) آفندی، منشی حیات بخش رسا، جادو رامپوری، طلبش(?) مارہروی، حکیم ظہیر ظہری وغیرہ اس دور کے اساتذہ کرام بھی تشریف رکھتے تھے۔ جب سب شعراء پڑھ چکے تو حضرت تسلیم کی غزل ان کے ایک شاگرد نے پڑھ کر سنائی۔ اس غزل کے بعد مشاعرہ برخاست نہیں ہوا بلکہ بعض شعراء اور سامعین چاہتے تھے کہ خود حضرت تسلیم بھی اپنی زبان سے کچھ کلام سنائیں لیکن ان سے عرض کرنے میں ہر شخص کو تامل تھا اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے بغیر کسی کے مشورے اور اشارے کے اس خدمت کو اپنے ذمے لیا اور موصوف سے بلا تکلف عرض کر دیا کہ میں نے کبھی آپ کا کلام آپ کی زبان سے نہیں سنا ہے اور میرے ساتھ پورا مجمع آپ سے اس بزرگانہ شفقت کی توقع کر رہا ہے۔ ان بزرگوار نے حیران ہو کر پوچھا عزیز من آپ کہاں سے آئے ہیں اور آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے عرض کیا" میں منشی تمیز(?) لکھنؤ آبادی کا بیٹا تمنا آفندی ہوں۔" ـــــ تمیز لکھنؤ آبادی کے فضل و کمال، شاعرانہ قوتوں اور صلاحیتوں کا حضرت تسلیم سے زیادہ کون معترف ہو سکتا تھا جنہوں نے تمیز کو شاعر ... اور بہت دن ان کے ساتھ نشست و برخاست کا اتفاق ہوا تھا۔ تمیز میرے والد مرحوم کے استاد ... [illegible] ... سے ... تھے۔ یہ اپنے دور کے ... زبردست ... والد ... [illegible]

تمیز کا نام ... [illegible]

[illegible]

[illegible] آنکھیں نظر نہیں آتا

[illegible] بات ہے اب شاید ہی کہیں نظر آئیں گے [illegible] اور کسی کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دیں گے۔

دوسرا مشاعرہ حضرت کے دارالسلطنت دہلی کا ہے جو کبھی اردو ادب کا مرکز سمجھی جاتی تھی۔ اس مشاعرے میں قریب قریب تمام شعرائے دہلی شریک تھے جن میں نمایاں شخصیت اس دور کے مسلم الثبوت استاد نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی تھی جو حضرت داغ مرحوم کے شاگرد بھی تھے اور داماد بھی۔ حضرت سائل میرے والد کے ہم عمر اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے اور بہت کم ہی چاہتا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس مشاعرے میں ایسے صحافت حضرت جالب دہلوی بھی شریک تھے جن کی بدولت آج ہندوستان میں بہت سے اردو زبان کے صحیفہ نگار نظر آتے ہیں۔ انھیں صدر محفل بھی جگہ دی گئی تھی۔ باہر کے شعراء میں میرے والد مرحوم حضرت مخمور آفندی، جناب گشتہ اکبرآبادی، میرے رشتے کے ایک بڑے بھائی شوق مرحوم، میرے چچا زاد بھائی حضرت تیر اکبرآبادی بھی موجود تھے۔ یہ سب ارض تاج آگرہ کے رہنے والے تھے۔ میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ آگرہ تاریخی اعتبار سے اردو ادب کا پہلا گہوارہ ہے۔ اردو یہیں پلی بڑھی اور پھولی پھلی ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو، شیخ شرف الدین مضمون، خواجہ بقا اللہ خاں بقا، میر تقی میر اور مرزا غالب جیسے معمار اردو آگرہ ہی کی سرزمین سے اٹھے تھے

میں دہلی میں بہت مشاعرے پڑھ چکا تھا اور غلط انکسار کو ناپسند کرتے ہوئے بلا تکلف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا کلام بہت پسند کیا جاتا تھا۔ مشاعروں میں میری غزل خوب چلتی تھی اور سامعین میری غزل سرائی کے منتظر رہتے تھے۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا اور یہاں کامیابی کے ساتھ ہی رہا [illegible] دہلی کے ایک شاعر مفتون کے سامنے آئی اور انھوں نے آخر میں ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرعہ یہ تھا۔ زبان اٹھ گئی ہے دہلی اور لکھنؤ کے لئے ___ گشتہ صاحب اور بھائی تیر چونکے۔ بھائی شوق نے جو میرے برابر ہی بیٹھے ہوئے تھے میری طرف دیکھ کر پوچھا تم نے سنا ___ میں نے کہا جی ہاں سنا اور سناؤں گا بھی۔ جب شمع میرے سامنے آئی میں نے دو غزلہ کہا تھا۔ ایک غزل طرحی، تر کے قافیے میں اور ایک مختلف قوافی میں، ہمیشہ سے زیادہ داد ملی۔ سامعین میں سے بعض آدمیوں نے کہا کہ مشاعرہ لوٹ لیا۔ مقطع میں یہ دو شعر پڑھے جو مفتون کا شعر سن کر کہے گئے تھے ___

یہ اس سے کہہ دو ہے دعویٰ زبان کا جس کو ہمارے آگے زبان کھولے گفتگو کے لئے
زبان میر کی ہے اخگر آگرہ کے لئے مقام فخر ہے دہلی نہ لکھنؤ کے لئے

[illegible] سناٹا طاری ہو گیا اور محفل کی اس حیرت و سکوت کو حضرت جالب کی اس آواز نے توڑا "یہ کیا ہے؟" ___ حضرت سائل دہلوی نے فرمایا "واقعہ ہے" ___ جالب صاحب نے بہت بگڑ کر جواب دیا "یہ آپ ان لڑکوں کی تعریفیں کر کے ان کے دماغ خراب کرتے ہیں" ___ جواب الجواب میں سائل صاحب نے کہا "شعر تعریف کے قابل ہو تو تعریف کی ہی جاتی ہے خواہ کسی کا ہو۔ اس معاملے میں ابتدا مفتون نے کی ہے۔ انھیں یہ نہیں چاہئے تھا۔ ساری ذمہ داری مفتون پر ہے" ___ غرض بڑا [illegible] حضرت سائل دہلوی نے حق بات کہی۔ میرے والد مرحوم نے جو ایک صلح کل آدمی تھے بہت [illegible] مشاعرہ پھر شروع کیا گیا۔ صرف اساتذہ پڑھ سکے [illegible] آپ کہاں تھی۔ [illegible] مجھے [illegible] دہلی کے مشاعرہ [illegible]

میرے والد کے ایک اور دوست غالب کے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے شاگرد پنڈت امرناتھ ساحر دہلی کے رہنے والے تھے۔ جب تحصیلداری سے وظیفہ پر سبکدوش ہو کر پنجاب سے دہلی آئے ہیں تو موصوف نے اپنے مشاعرہ کی دعوت دی اور پھر دہلی کے مشاعروں میں میری شرکت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پنڈت جی بڑے خوبیوں کے انسان تھے۔ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے میں انھیں بھی چچا کہتا تھا۔ تیسرے مشاعرہ کا تعلق انھیں بزرگوار سے ہے۔ پنڈت جی کانگریسی جدوجہد کے بہت خلاف تھے اور کانگریسی جلسوں کے قریب جانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ میرے ایک دوست سوتی برہم سروپ بہار میرٹھی میری طرح پکے کانگریسی اور برٹش حکومت کے مخالف تھے۔ ہم دونوں اور دوسرے ہمارے ہم مشرب شعراء غزلوں کے اشعار میں حکومت پر کھلی چوٹیں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہم نے ایسے مشاعرے بھی کئے ہیں جن کا مقصد برطانوی حکومت کے خلاف پروپگنڈہ تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعرے کا نام دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مشاعرہ کی مصرع طرح کی ردیف "کھدر" رکھی گئی تھی۔ مجھے اپنے اس زمانے کے کلام کا خیال آتا ہے تو اس کے ضائع ہو جانے کا بڑا رنج ہوتا ہے جو اس انقلاب ہی کی نذر ہو گیا۔

خیر ایک دن سوتی برہم سروپ میرے پاس غازی آباد آئے اور کہنے لگے "بھئی ہم بڑے پیمانے پر ایک کانگریسی مشاعرہ کر رہے ہیں۔ اس کے لئے کوئی صدر تجویز کر دو"۔ مجھے اس وقت کچھ ایسی شرارت سوجھی کہ میں نے پنڈت امرناتھ ساحر کا نام تجویز کر دیا اور بہار صاحب مجھ سے ان کے نام کا سفارشی خط لے کر گئے اور ان کو صدارت کے لئے راضی کر لیا۔

پنڈت جی مشاعرے کی نوعیت سے بے خبر اور بہار پنڈت جی کی ذہنیت سے ناواقف۔ غرض کہ مشاعرہ کا دن آ گیا۔ میں عین مشاعرے کے وقت پہنچا اور بہار کو الگ لے جا کر چپکے سے کہا کہ دوران مشاعرہ میں پنڈت جی کے سامنے نہ جانا۔ وہ اس پر حیران ہوئے تو میں نے انھیں یہ راز بتایا۔ وہ بھی بہت محظوظ ہوئے اور ہم دونوں پنڈت جی سے دور سامعین کی آڑ میں ایک طرف بیٹھ رہے۔ مشاعرہ شروع ہوا اور پنڈت جی کی اضطرابی کیفیت، چہرے کا اتار چڑھاؤ، بار بار ان کا فرمانا "یہ کیا ہے" "یہ کیسی غزل ہے" "ختم کیجئے ختم کیجئے" "یہ مشاعرہ ہے" "آخر نجم کہاں ہیں، بہار صاحب کہاں ہیں" "یہ کیا ہو رہا ہے"۔ غرض کہ موصوف نے اتنے پہلو بدلے ہیں اور اس قدر حیز بجز، غضبناک اور بے بس دکھائی دینے لگے کہ مجھے خود ان پر ترس آ گیا اور ساتھ ہی میں اس قدر خوف زدہ بھی ہوا کہ مشاعرے سے اٹھ کر ریلوے اسٹیشن اور وہاں سے غازی آباد اپنے مستقر پر پہنچ گیا۔ کئی روز کے بعد بہار سے مشاعرہ کی پوری کیفیت معلوم ہوئی جس کے سنانے کے لئے نہ وقت ہے اور نہ گنجائش۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ پھر ایک طویل عرصہ کے لئے دہلی کے مشاعرے مجھ سے چھوٹ گئے اور جب ایک زمانے کے بعد پنڈت جی سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تو میں نے بہت جھک کر معصومیت کے ساتھ آداب عرض کیا اور مشاعرہ کا مسئلہ چھڑتے ہی سارا الزام سوتی برہم سروپ بہار پر رکھ دیا اور اپنے آپ کو بالکل بے گناہ ثابت کر کے پھر ان کا نہایت ہی سعید و رشید بھتیجا بن گیا۔

نتائج اردو امتحانات ادارہ ـــــ اُردو عالم (مرکز بلدہ) (دسمبر ۱۹۴۴ء)

(بلحاظ رول نمبر)

۱۔ سید علاء الدین اشرف اول ۴۔ مرزا غفار بیگ دوم ۱۱۔ سیدہ قادر دوم ۱۴۔ امت المالک رحمت افشاں دوم
۲۔ سید محبوب علی دوم ۵۔ محمد یوسف 〃 ۱۲۔ رشید کاولی 〃 ۱۵۔ سید محی الدین سوم
۳۔ غلام دستگیر 〃 ۱۰۔ محمد محمود الحق سوم ۱۳۔ زہرہ جبیں سوم

پروفیسر مبارز الدین رفعت

عطائی

عہد سلطان محمد قلی قطب شاہ کا ایک گمنام شاعر

اردو ادب کے دکنی دور سے ہماری دلچسپی ابھی بہت حال کی بات ہے اور اس دور کی پوری تاریخ ہمارے سامنے نہیں آئی ہے۔ نہ معلوم دکنی دور کے ابھی اور کتنے شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے گمنامی کے کن کن گوشوں میں دبے پڑے ہیں۔ کہیں بالکل ہی اتفاق سے کسی کے خانگی کتب خانے سے اس دور کے کسی شاعر کا کوئی دیوان، کوئی مثنوی، کوئی مرثیہ، کوئی قصیدہ یا کسی نثر نگار کا کوئی نثری کارنامہ برابر ہاتھ آتا جا رہا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا عہد گولکنڈے میں اردو ادب کا سنہری دور ہے۔ شاعر بادشاہ کی شعر و سخن سے دلچسپی اور علم و ادب کی سرپرستی نے اس مملکت کو شعر و سخن کے دل آویز نغموں سے معمور کر دیا۔ پتہ نہیں اس دور میں واقعی کتنے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے اور کتنوں کے ادبی کارنامے ہم تک پہنچنے سے رہ گئے ہیں۔ کتنے شہ کار امتداد زمانہ سے ضائع ہو گئے اور کتنے گم نام گوشوں میں ہنوز دبے پڑے رہے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دور کے جن شاعروں کے نام اب تک دریافت ہو سکے ہیں وہ ہیں فیروز، محمود، وجہی، سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی و قطب شاہ اور غواصی۔ حسن اتفاق سے اس دور کے ایک اور شاعر عطائی کا نام اور اس کی ایک غزل میرے ہاتھ لگی ہے۔ یہ غزل میرے کرم فرما جناب قاضی حمایت المقیت صاحب کے خاندانی کتب خانے کی ایک بیاض میں مجھے ملی۔ حمایت صاحب کا خاندان گلبرگہ میں عہد عالمگیری سے اب تک قضائت کے عہدے پر فائز چلا آ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ خاندان اپنے زمانے میں علم و ادب کا بڑا شیفتہ و شیدائی خاندان رہا ہے اور بڑا قیمتی کتب خانہ اس خاندان کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ افسوس ہے اس سرمائے کی طرف سے برسوں کی غفلت نے اس نادر کتب خانے کو کیڑوں کے نذر کر دیا۔ اب اس کے آثار میں جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ قلمی کتابوں کے کچھ ناقص الطرفین حصے اور بیاضیں ہیں۔ ان بیاضوں کے مرتب کون ہیں، اس کا اتا پتہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ان بیاضوں میں فارسی کلام کے ساتھ ساتھ بعض دکنی شعراء جیسے نصرتی، ہاشمی اور ولی کا کلام بکثرت نقل ہوا ہے۔ ایک بیاض میں ہاشمی بیجاپوری کا اتنا زیادہ کلام نقل ہوا ہے کہ یہ ہاشمی کا ایک مختصر سا دیوان ہی معلوم ہوتا ہے۔ حال ہی میں جناب ڈاکٹر حفیظ قتیل نے کتب خانۂ سالار جنگ میں موجود جس دیوان ہاشمی کو مرتب کر کے شائع کیا ہے، یہ کلام اس کے سوا ہے۔

اسی کتب خانے کی ایسی ہی ایک بیاض میں عطائی کی ایک غزل مجھے مل گئی۔ عطائی کے حالات زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ بیاض میں درج غزل کے مقطع سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قطب شاہی دور کا شاعر ہے اور قطب شاہ کا غلام ہے ؎

قطب شاہ کے غلاماں میں عطائی سب کاں کمتر ہے   برہے کا بینت سے بھاری یہ کہتے ہوں نرالا ہے

گولکنڈے کی قطب شاہی مملکت کے سب ہی فرمانروا قطب شاہ کہلاتے تھے۔ "قطب شاہ کے غلاماں میں عطائی سب کاں کمتر ہے" سے کون قطب شاہ مراد ہے؟ اس کی تشریح ہمیں اسی غزل کے مقطع سے پہلے کے شعر میں مل جاتی ہے۔ کہتا ہے ؎

قیامت میں سجن سوں مل محمد کو پچھانو گے عجب درپن پچھانت کا صورت پر تل سو کالا ہے

یہاں محمد سے مراد سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے کیونکہ آگے دوسرے مصرعے میں "صورت پر تل سو کالا ہے" کی تشریح موجود ہے جہاں تک ہمیں علم ہے آقائے دو جہاں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل مبارک کے بیان میں صورت پر کالے تل کا ذکر نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں سلطان محمد قلی قطب شاہ "قطب شاہ" تخلص کرتا تھا۔

اس مقطع کے تیور بتا رہے ہیں کہ عطائی، سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملازم تھا۔ اس کا پورا نام کیا تھا، کیا خدمت تھی، کیا عہدہ تھا، کیا اس نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا یا بس یوں ہی گنتی کی کچھ غزلیں لکھ لی تھیں، یہ سب باتیں پردۂ خفا ہی میں ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر اس شاعر کے حالات پر مزید روشنی پڑ جائے۔

اب عطائی کی غزل ملاحظہ فرمائیے۔ اس غزل کی بحر ہزج مثمن ہے اور وزن مَفَاعِیلُنْ، مَفَاعِیلُنْ، مَفَاعِیلُنْ مَفَاعِیلُنْ۔

محسن[1] کے باغ میں دلبر تیرا[2] قد سرو بالا ہے نہیں مجھ باغ سیں[3] مطلب ترا مکھ پھول والا ہے
سجن[4] کے یاد کرنے کو ہر یک دم[5] ہے سو منکا ہے یہ تسبیح ہے یہ سمرن[6] ہے، یہ کنٹھی ہے یہ مالا ہے
سجن سے باغ مکھ تیرا کھلے ہیں دو نین[8] پھولاں عجب دونا[9] ہے یہ مرجا[10] یہ نرگس ہے یہ لالہ ہے
سجن کے مکھ کی پوجا کو نین اشنان کرتے ہیں انجو[11] گنگا یہ جمنا، یہی کاشی کا نالا ہے
سجن مجھ دل میں[12] یوں آتا تجو[13] تن من بدن اپنا شرم پکڑے ہے دامن کی[14] یہ دنیا ہے سو جالا ہے
سجن کے دو نین بانکے گلا میرا کٹاتے ہیں بھواں خنجر، نظر جمدھر[16]، پلک برچھی یہ بھالا ہے
تیرے تیروں کی نوکوں سے[17] ہوا دل عشق میں گھائل اوسے لالن[18] بتلاؤ[19] کی جس کے ہات پیالہ ہے
قیامت میں سجن سوں مل محمد[21] کو پچھانو گے عجب درپن[22] پچھانت[23] کا صورت پر تل سو کالا ہے
قطب شاہ کے غلاماں میں عطائی سب سوں[25] کمتر ہے برہ[26] کا نیت[27] شک ہے بھاری یہ کہتے سوں نرالا ہے

---

[1] محسن میں "س" متحرک مفتوح پڑھا جائے۔ دکنی دور کی اردو شاعری میں حرکات کی ایسی تبدیلی جائز رکھی گئی تھی۔ [2] "تیرا" کی "یائے" ساقط۔ [3] سے۔ [4] محبوب، معشوق۔ [5] بمعنی سانس۔ [6] جاپ مالا۔ [7] مونہہ۔ [8] "نین" کی "یائے" متحرک مفتوح۔ [9] ایک خوشبودار پودا۔ [10] ایک خوشبودار پودا۔ [11] آنسو۔ [12] مجھ دل میں، میرے دل میں۔ [13] تجنا، ترک کرنا چھوڑ دینا۔ [14] "کی" بمعنی "کو"۔ [15] بھوں کی دکنی جمع۔ [16] ایک طرح کا چھوٹا خنجر، کٹاری۔ [17] اصل میں "تیرے نوکوں کی تیروں" لکھا ہے جو خطائے کتابت ہے۔ [18] محبوب۔ [19] بتشدید ل، بتلاؤ۔ [20] بمعنی "کہ"۔ [21] سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ [22] آئینہ [23] پہچان۔ [24] "صورت" میں "و" ساقط۔ [25] سے [26] فراق۔ [27] کام

ڈاکٹر شریف النساء انصاری

برگِ سبز کی شاعرہ

"برگ سبز" کے سرورق پر نظر پڑتے ہی میری آنکھوں میں ایک درخشاں رات گھوم گئی جب کہ شعر و سخن سے معمور "اردو ہال" کی فضا میں ایک شاعرہ اپنی نظم ہدیۂ سامعین کر رہی تھیں۔ حافظہ کے کسی گوشہ سے ابھرتی ہوئی پرچھائی نے ایک خاتون کا روپ دھار لیا۔ بھاری بھرکم جسم، چست فراک زیب تن، طباق چہرہ، سرخی مائل سفید رنگت، پیشانی پر بکھری ہوئی سنہری زلفیں، نہایت ہی گرجدار آواز۔ یہ انھوں نے نظم کا آغاز کیا اور چند لمحوں میں اردو ہال کے بزرگ، متین و پُر وقار سامعین تک بے ساختہ داد دے رہے تھے۔ دو چار بار انھیں دور ہی سے دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ کچھ تو ان کا غیر مانوس طرزِ لباس مانعِ ملاقات ہوتا تھا اور کچھ ان کا پہلی صف میں بیٹھے بیٹھے اختتامِ جلسہ پر ہجوم میں گم ہو جانا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ "بزم سعدی" کی ایک محفل میں قمر ساحری صاحب معتمد بزم نے ان سے تعارف کرا دیا اور دوران گفتگو میں پتہ چلا کہ موصوفہ نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور انگریزی کی بھی پختہ مشق شاعرہ ہیں۔ ایرانی نژاد ہیں۔ لکھنؤ اور طہران میں تحصیل علوم کیا۔ وہیں ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوئیں اور اب عرصہ سے حیدرآباد میں قیام پذیر ہیں۔

"برگِ سبز" نیچرل، روانی، واقعیاتی، مثالی شاعری سے بھرپور ہے۔ شگفتہ، سنجیدہ، رچے ہوئے مضامین کی اس میں فراوانی ہے۔ بکھرے سپنے، آوازیں وغیرہ اتنی شاندار نہیں ہیں جتنی "مہتاب میں ڈوبا ہوا صحرا"، "ڈلہوزی" وغیرہ۔ منظر نگاری اور حسنِ فطرت کی عکاسی میں جو گہرائی اور دل آویزی کی کیفیت ہے وہ نازک مشاہدہ کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ حواسِ خمسہ کے تجربات کو بالغ نظری نے اعلیٰ ترین فکریات کا مرتبہ دیا ہے ؎

لے رہا ہے یہاں حسن انگڑائیاں   ہیں کھنڈروں میں محبت کی گہرائیاں
نیچے بہتے ہیں دریا مچلتے ہوئے   پیچ کھاتے ہوئے رخ بدلتے ہوئے
روحِ انساں کو ملتی ہے بالیدگی   خامشی ہی نہیں لذتِ زندگی

شاعرہ ایرانی نژاد ہے "کشمش ایران" اور "کوہ دماوند" ان کی ایران دوستی کی مظہر ہیں لیکن جس وفاداری سے انھوں نے دکن کو اپنایا ہے اور جس خلوص سے اس کا تذکرہ کرتی ہیں اس پر غالب کا ؎ "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے" یاد آجاتا ہے۔ شاعرہ کو "فضائے لکھنؤ میں" "فردوسِ گم گشتہ" تو مل گئی مگر اس جنتِ جاوداں میں بھی "یادِ دکن" نے ان کا دامن نہیں چھوڑا ؎

دلی بہت حسین ہے دلکش ہے لکھنؤ   لیکن کچھ اور ہی ہے ہمارے دکن کی بات

آندھرا پردیش کی خوبیوں کو ہر حب الوطن شاعر نے اجاگر کیا ہے لیکن شاعرہ کے کلام میں انسان دوستی اور حب الوطنی کا عنصر بہت زیادہ غالب ہے ؎

یہ سرزمین آندھرا حسین و پُر وقار ہے   یہاں ہے میل جول اور یہاں دلوں میں پیار ہے
عوام راگ و رنگ، شعر و نقش کے ہیں قدرداں   کلا سے پیار زندگی کی اک امنگ ہے یہاں

ہے اہل دل کی انجمن یہ آندھرا کی سرزمیں
بہشت چشم و گوش و دل صدا آفریں صدا آفریں

انسانی عظمت کو بلند مدارج پر پہنچانا ہر بڑے شاعر نے فرض منصبی خیال کیا ہے۔ چنانچہ باثر طاہرہ بھی انسان کی عظمتوں کا اعتراف کر رہی ہیں ؎

جب ضد پہ آئے چاند ستاروں کو توڑ لے
کیوں اعتراف عظمت انساں نہ کیجئے

حیات انسانی میں فتح و شکست لازم و ملزوم ہیں۔ شکست کھا کر آنسو بہانا توہین انسانیت ہے ؎

ہرگز شکست کھا کے نہ آنسو بہائیے
ان موتیوں کو اتنا بھی ارزاں نہ کیجئے

جہاں انھیں وطن سے پیار ہے وہیں انھوں نے اردو زبان کی مدح سرائی اور اس کی خدمت کو اپنا نصب العین قرار دے رکھا ہے اور اردو کی حمایت میں ایک پُر زور نظم لکھی ہے جس میں اس کا سراپا، اس کی ہر دلعزیزی، اس کے حدود اربعہ، اس کے ذرہ ذرہ اور ہر نکتہ کو تفصیل سے نظمایا ہے ؎

بولی جاتی ہے کشمیر سے راس تک
سمجھی جاتی ہے گجرات مدراس تک
غیریت کی نہیں اس میں بو باس تک
نفرتوں کا نہیں اس کو احساس تک
خاص ہندوستانی ہے اردو زباں
میری اردو زبان فخر ہندوستاں

نظریۂ عشق کے متعلق بھی لوگ مختلف الخیال ہیں۔ ایک مکتب خیال کے پاس عشق میں شرط اول پاکیزگی ہے۔ چنانچہ حافظ نے اس کو "فن شریف" کہا ہے ؎

عشق می ورزم و امید کہ این فن شریف
چون ہنرہائے دگر موجب حرمان نشود

ابوطالب کلیم کہتا ہے ہوس کا جب تک عشق میں دخل نہ ہو اس میں لطافت باقی رہتی ہے ؎

عشق از ہوس جدا کن و زاری شناس باش
در گریۂ فسردہ دلاں آب و آخلست

مگر ایک مکتب خیال وصال کو عشق کا حاصل قرار دیتا ہے کیونکہ اس کے بغیر عشق نہیں ذہنی ریاکاری ہو جاتا ہے۔ محبت وہیں استوار ہوتی ہے جہاں رفاقت ہو، محنت ہو۔ چنانچہ شاعر نے تیر و کمان کے اتصال کی تمثیل دے کر اس خیال کی تائید کی ہے ؎

عاشق و معشوق بے آمیزش ہم ناقص اند
شاہد این مدعی بہ از کمان و تیر نیست

چتوڑ کی رانی "پدمنی" نے سلطان خلجی کی ہوس کا نشانہ بننے سے قبل اپنے آپ کو نذر آتش کر کے "حفظ عصمت زن" کے سلسلہ میں قابل پرستش کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس واقعہ کو باثر طاہرہ سعید نے اپنے سحرکارانہ انداز بیان سے پرعظمت بنا دیا ہے اور نظم محاکات کے درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ انھوں نے جس نظریۂ عشق کو پیش کیا ہے اسے ناقدین "افلاطونی نظریۂ عشق" سے تعبیر کریں گے لیکن پیش کش وہاں کی نازک معنویت، کیف، شعور کی پرچھائیاں، واقعیات کی صداقت کی ایک کل دنیا اپنے اندر لئے ہوئے ہے ؎

پدمنی، ماہ جبیں، ماہ فلک سے بھی حسیں
بدنصیبی پہ تری روتی ہے بھارت کی زمیں
بھول سکتی نہیں تاریخ تجھے اے رانی
ہے ابھی زندۂ جاوید تری قربانی
کود کر آگ کے دریا میں بچالی عزت
شان سے تو گئی دنیا کو دکھا کر غیرت
آسمانوں پہ تری اب بھی چتا روشن ہے
[illegible] شعلوں میں ترا مدفن ہے
گر میں خلجی کے بھی سینے میں کہیں دل ہوتا
[illegible] جلنے کے قابل ہوتا

پیار کا اس کو بہانہ تھا مگر پیار نہ تھا　　　حسن کا صرف وہ بھوکا تھا پرستار نہ تھا
دیکھ کر تجھ کو ترے قدموں پہ سر رکھ دیتا　　　آنکھیں نیچی کئے اشکوں کے گہر رکھ دیتا
عشق بے لوث جو ہوتا کوئی بات نہ تھی　　　پیار کچھ جرم نہ تھا کچھ بھی مکافات نہ تھی
ہاں محبت کا تقاضا تھا پرستش کرتا　　　تیری پرچھائیں بھی چھونے کی نہ خواہش کرتا

ایک پتی ورتا دیوی کے جذبۂ عشق کو جس حسین پیرایہ میں نظم "سیتا" میں سمویا ہے وہ ہر ہندوستانی عورت کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہو سکتا ہے ؎

جنت کی حور تھی کہ کرن آفتاب کی　　　دنیا تھی نور و رنگ و جمال و شباب کی
آنکھوں میں جیسے عصمت مریم کی تھی جھلک　　　زلفوں میں جیسے گیسوئے بلقیس کی چمک
اپنے پتی سے سیتا کو حد درجہ پیار تھا　　　سیوا پتی کی کرنا ہی اس کا شعار تھا
لنکا کی قید میں بھی تھی دھن رام نام کی　　　دل میں تھی یاد لب پہ تھی رٹ رام رام کی
راون کی زشت آرزوئیں کھا کے رہ گئیں　　　سیتا کے ست کے سامنے تھرا کے رہ گئیں
عورت کی پاکبازی میں شکتی بلا کی ہے　　　عورت کی شخصیت میں تو عظمت خدا کی ہے

عشق، حسن، حبیب و محبوب میں جس پُرکیف ہم آہنگی کا کامیاب اظہار بانو طاہرہ سعید نے کیا ہے اس میں دھیماپن، گھلاوٹ، نرمی، تہہ داری پائی جاتی ہے۔ نظم "برسوں کے بعد" "ملاقات" اور ایک نظر ماضی کی حسین و تلخ یادوں کا صداقت بار اظہار ہے جس میں پاکیزہ رومان مضمر ہے۔ سوز، تاثیر، جذبات کی آنچ، واقعات کا حسن بیان جس موثر انداز میں کیا گیا ہے وہ قابل صد ستائش ہے انھیں پڑھ کر میرے حافظہ میں کسی شاعر کا یہ شعر گونج اٹھا تھا ؎

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو　　　مزار ہیں میرے سینے میں آرزوؤں کے

اشعار کے بہاؤ میں قاری بہہ نہیں جاتا ہے بلکہ تصور میں ایک مرقع کھنچ آتا ہے۔ سانولے دمکنے والے حبیب کا سراپا "نہ تم قریب آؤ" میں اس جاندار طریقہ سے پیش کیا ہے کہ اس کی روشنی میں مصور کا موقلم ایک ایسی تصویر بنا سکتا ہے جس کے بیاض رخ سے قلبی تاثرات پڑھ لئے جا سکتے ہیں ؎

تمہاری سانولی صورت میں شام ہجراں ہے　　　اداس آنکھوں میں کچھ وحشت غزالاں ہے
لبوں پہ شکوۂ خاموش رنج دوراں ہے　　　قریب دل میرے جیسے کوئی غزل خواں ہے
خدا کے واسطے اتنا نہ تم قریب آؤ

نو بہاروں میں، شگوفوں میں گلوں میں ڈھونڈا　　　تیری نظروں کی کہیں بھی تو لطافت نہ ملی

ب کی سہمی سہمی نگاہیں رخ محبوب کا طواف کر رہی ہیں۔ آواز ہے کہ حلق میں ہی جا رہی ہے۔ آنکھوں سے اشک رواں، معاملہ بندی کی ایسی مکمل تصویر شاید ہی ہو ؎

دل مرا وقت ملاقات تھا سہما سہما　　　میں نے چاہا کہ بڑھوں، بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی
میں نے سوچا کہ پکاروں اسے با جوش و خروش　　　جم گئی حلق میں آواز زباں کھل نہ سکی
[illegible] رواں تھے میرے آنسو پیہم　　　اس نے گھورا مجھے پھر آ گیا نزدیک میرے

وہ سامنے جو آئے تو نظریں نہ اٹھ سکیں　　　　اب مجھ میں جیسے طاقتِ دیدار بھی نہیں

کائناتِ حسن کی تخلیق میں شاعرہ نے خارجی خط و خال کی جادو بھری مصوری تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا ہے ساتھ ہی ساتھ معاملہ بندی اور محبوب کے داخلی کردار کو اس نزاکت سے پیش کیا ہے۔ محبوب کی شخصیت کو اتنا جیتا جاگتا بنایا ہے کہ انسان حقیقت بن کر سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔

نظم "ایک نظر" میں کسی معصوم، پاک اور تلخ نظر کا سماں کھینچا ہے جس نے کسی "یگ" میں دیوی کی پوجا کی تھی اور دیوی نے منہ پھیر لیا تھا لیکن ان نظروں میں خلوص کی وہ اَن مٹ جھلک ہے جو شاعرہ کے دل کو ہر وقت برمانی گزرتی ہے اور قاری اس سوزِ خلش سے تڑپ اٹھتا ہے کیونکہ ان نگاہوں نے کسی کو دیکھنا عبادت سمجھا ہے ؎

کسی کو دیکھنا جیسے عبادت ہی نگاہوں کی　　　　نگاہِ شوق تیرا ہو گیا چہرہ جانو کیا ہو

یادِ ماضی کے وہ نقوش جو حافظہ کے کسی گوشہ میں محفوظ ہوں اور حال کی کسی تحریک سے پردۂ دماغ پر ابھر آئیں۔ یادیں کبھی مسرت زا اور کبھی روح فرسا ہوتی ہیں۔ شاعرہ ایسی ہی کسی یاد سے لرزہ براندام ہے ؎

پھر آ رہی ہے آہ اسی بے وفا کی یاد　　　　پھر لذتِ تصورِ جاناں ہے آج کل
پھر اس کی آرزو ہے دل چاک چاک میں　　　　سینے میں آہ پھر وہی طوفاں ہے آج کل

لیکن ان طوفانوں کے بعد بھی غمِ محبوب کی عظمت سے سینۂ حبیب میں جاگزیں ہے ؎

غمِ محبوب کی عظمت کوئی پوچھے میرے دل سے　　　　یہ مشعل منزلِ مقصود کا رستہ دکھائے گی

اور شانِ غم کا یہ عالم کہ آنسو کے بدلے ہر وقت قہقہے بلند ہو رہے ہیں ؎

شانِ غم اس میں نہیں آنسو نہیں　　　　قہقہے بھی آنسوؤں سے کم نہیں
ہاں یہ سچ ہے میرے چہرے پہ نہیں غم کی نقاب　　　　خون میں ڈوبی یہ ہنسی ہے تجھے معلوم نہیں

"برگِ سبز" بانو طاہرہ سعید کا وہ پہلا اردو مجموعہ ہے جو انھیں صاحبِ دیوان کی صف میں لا کھڑا کرنے کے لئے کافی ہے اور ہم فخر سے سر بلند کر سکتے ہیں کہ بزمِ سعدی کی سعی نوخیز مجلس کے سر اس کی اشاعت کا سہرا باندھا جا رہا ہے اور معتمد بزم باعثِ صد افتخار ہیں کہ ان کی تنہا مساعی نے بزم کے استحکام کا سنگِ بنیاد رکھ دیا جس پر مستقبل کے معمار انشاء اللہ ایک تا قیامت پائیدار عمارت تعمیر کریں گے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ دسمبر ۱۹۶۱ء ــــ نتیجہ زبان دانی (بلحاظ رول نمبر)

مرکز انیس الغربا نامپلی

۱- فاطمہ بی　اول
۲- خیر النساء　سوم
۳- طاہرہ سلطانہ　"
۴- انیسہ بی　"

مرکز سنٹرل جیل

۶- احمد خاں　سوم
۷- ایشور بھگت　دوم
۸- شیخ احمد　سوم
۱۰- شیخ امام　سوم

۱۱- [illegible]　سوم
[illegible]　[illegible]
۱۸- نظام الدین　[illegible]

مرکز نرمل

۱۹- رحیم النساء بیگم　اول
۲۰- زیب سلطانہ　دوم
۲۱- رضیہ سلطانہ　اول

شفیق النساء (علیگ)

محمد قلی قطب شاہ — شخصیت اور فن کے چند پہلو

رام بابو سکسینہ نے امیر خسرو کے زمانے کو اردو زبان کی نشو و نما کے لئے "صبح کاذب" سے تعبیر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس کی "صبح کاذب" ملک دکن کے مسلمان شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے عہد میں ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ نہ صرف شعراء پرور سلاطین تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے۔ دکن میں شاعری کی داغ بیل گولکنڈہ اور بیجاپور میں پڑی۔ اس اردو کے خصائص اس اردو سے بہت زیادہ مختلف تھے جو عہد مغلیہ کے اواخر میں شمالی ہند میں پھلی پھولی۔ اس میں شک نہیں کہ دکنی اردو کا آفتاب اسی زمانے میں نصف النہار پر آ چکا تھا جب عہد مغلیہ کی دوپہر تھی لیکن دکن میں اردو کا جو ڈائیلکٹ (Dialect) تھا وہ شمالی ہند کے ریختہ گویوں کے لئے ہمیشہ غیر مانوس رہا اسی لئے دکھنی شاعری کو —

اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی ؏

کہنے میں تامل نہیں کیا گیا۔ حالانکہ دکنی ادب کی ابتدائی شکل کھڑی بولی میں ہے۔

دکنی ادب میں شعرائے گولکنڈہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہئیت اور مواد دونوں لحاظوں سے دکنی ادب کی تنقیح اور اس کا تجزیہ ضروری ہے۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے دکنی ادب، اردو اور فارسی ادب کی روایت سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ دکنی ادبیات کی ہئیت پر کھڑی بولی اور دکنی لغات کے دبیز پردے پڑے ہونے سے اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا۔ محض لسانی غرابت اور لفظی اجنبیت کے باعث کسی ادب کو ازکار رفتہ نہیں کہا جا سکتا۔ ورنہ انگریزی ادب میں چاسر اور اس کے معاصرین اور اس کے پیش روؤں کے یہاں لغات، املا اور لب و لہجہ کی جو اجنبیت و غرابت ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں ہے جو ہمیں شعرائے گولکنڈہ کے یہاں ملتی ہے۔ اس کے باوجود انگریز مورخین ادب اور ناقدین نے ان شعراء کے ادبی مقام و منزلت کو متعین کرنے میں انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت نہایت متنوع تھی۔ وہ اردو، فارسی، عربی، سنسکرت اور تلنگی کا نہ صرف زبردست عالم تھا بلکہ اس نے ان میں سے بیشتر زبانوں میں شاعری بھی کی ہے۔ فارسی اور دکنی زبان میں محمد قلی قطب شاہ کے دواوین موجود ہیں۔ اس نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس کے بارے میں رام بابو سکسینہ یوں رقمطراز ہیں :—

"مختصراً یہ کہ محمد قلی قطب شاہ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی"۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کئی لحاظ سے قابل توجہ ہے جن میں سے چند وجوہ درج ذیل کی جاتی ہیں :—

۱۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک مکمل دیوان مدون کیا۔

۲۔ قلی قطب شاہ [illegible] اصناف سخن یعنی مثنویاں، قصیدے، مراثی، غزلیات، رباعیات، ترجیع بند وغیرہ میں

طبع آزمائی کی ہے۔

۴۔ ان کی توجہ جس قدر داخلیت کی طرف مرکوز ہے اسی قدر وہ اپنے خارج سے بھی باخبر اور واقف ہیں۔ رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ مرقع نگاری اور مناظرِ قدرت کی بنیاد ان ہی کی رکھی ہوئی ہے جو سودا اور نظیر اکبرآبادی کے زمانے میں تکمیل کو پہنچی۔ اکثر مثنویاں ہندوستانی کھیلوں، سرکاریوں، پرندوں، رسم و رواج، تہوار، موسم وغیرہ کے عنوان پر لکھی گئی ہیں۔ رسم و رواج اور تہوار کے بارے میں محمد قلی نے ہندو اور مسلمان دونوں کی مسرتوں کو ملحوظ رکھا ہے جس سے ان کی وسیع المشربی اور ان کے مزاج کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔

محمد قلی کے شاعرانہ مسلک کے ڈانڈے ہندی اور فارسی زبان اور شعر سے ملتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا ادبی مسلک بڑی حد تک روایتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہئیت اور مواد اور کئی لحاظوں سے وہ آزاد منش بھی ہیں، روایت شکن بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک خاص مسلک کے موجد بھی ہیں۔ ان کے یہاں مقامی دلچسپیوں کے آثار بہت زیادہ نمایاں ہیں جو سوائے نظیر اکبرآبادی کے ہمیں اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ انھوں نے معاملاتِ عشق میں ہندی اور فارسی دونوں طریقوں کو رائج رکھا مگر عموماً ان کے یہاں اظہارِ عشق عورت کی جانب سے مرد کے واسطے ہوتا ہے۔

لفظوں کی ساخت پرداخت میں انھوں نے آزادانہ جدت سے کام لیا ہے۔ ہندی الفاظ اور ترکیبیں، ہندی استعارے اور تشبیہیں، ہند فارسی اور معرب ہندی کے علاوہ ٹھیٹ ہندی اور فارسی کے الفاظ کو وہ اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے روزمرہ میں وہ مشہور رہیں۔ عام اس سے کہ وہ لغوی طریقہ پر صحیح ہوں یا غلط۔ اسی لئے رام بابو سکسینہ کا خیال ہے:۔

"چونکہ وہ قدیم زبان متروک ہو گئی ہے اور لوگوں کو ان کے کلام میں لطف نہیں آتا اس لئے ان کا کلام دلچسپی سے نہیں پڑھا جاتا۔ مگر جب نظرِ تحقیق وسیع ہو گی تو ان کے کلام کی قدر کی جائے گی"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق فرماتے ہیں:۔

"چار سو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کے شعراء کے عشقیہ کلام کے سامنے رکھ دیا جائے تو سوائے زبان کے تغیر اور شستگی کے کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔ وہی باتیں ہیں وہی مضمون ہے۔ وہی طرزِ ادا اور وہی بحریں ہیں۔ اس لحاظ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام اردو کے کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں ہے"

ان سب باتوں کے باوجود محمد قلی اپنے شاعرانہ مسلک میں بہت وسیع النظر، آزاد خیال اور جمال پرست ہیں۔

بہ حیثیت غزل گو محمد قلی قطب شاہ کے شاعرانہ مرتبہ کے تعین میں جو چیز اختلاف آرا کا سبب بن سکتی ہے وہ ان کی زبان ہے جس کے بارے میں سطورِ ماسبق میں ہم نے تبصرہ کیا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم ان کی غزلوں کی لسانی خصوصیات سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کی قدر و قیمت سے بحث کریں گے۔

غزل زیادہ تر داخلیت کی شاعری ہے اور اس لحاظ سے شاعر کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ غزل کے سمجھنے سے پہلے شاعر کی شخصیت کا سمجھنا حد درجہ ضروری ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک ہی عمر وہ مختلف غزل گو شعرا کہیں۔ لیکن دونوں شعرا کی شخصیتوں کے حسب مراتب ان مختلف اشعار کے مقام و منزلت کا تعین کرنا پڑے گا۔ قلی قطب شاہ کی شخصیت حد درجہ متنوع ہے۔ وہ ایک صوفی صافی، ایک حسن پرست عاشق ہرجائی، ایک دلدادۂ فنونِ لطیفہ، ایک [illegible] معاملاتِ تہذیبی، ایک انسانیت دوست اور فنونِ لطیفہ کے نہ صرف دلدادہ تھے بلکہ ان کے ماہر بھی تھے۔ ان کی [illegible] شخصیت کا یہ تنوع اور ان کی طبیعت [illegible]

کہ یہ پہلو ان کی غزل میں نہایت نمایاں ہیں۔ محمد قلی کی غزلیں رمزیت اور اشاریت سے آراستہ ہیں۔ ان کی علامتیں کچھ تو فارسی روایت سے مستعار ہیں اور بہت کچھ ایسی ہیں جو ہندوستانی ماحول سے خود انھوں نے تلاش کر لی ہیں۔ مثلاً گھونگھٹ، دھن، پیو، پیالہ، سوم روم، چھند وغیرہ۔ اس کے باوجود فارسی شاعری کی علامتیں اور اشارے ان کے یہاں بہت زیادہ برتے گئے ہیں۔ وہ بحیثیت دکنی بولی میں ان علامتوں کو نگینوں کے طور پر جڑ دیتے ہیں۔ زکوٰۃ عشق، اعجاز مسیحا، مجلس شاہاں، موسیٰ محرم، خورشید خاور، خطاب بکرم، مئے خانہ، نغمۂ داؤد اور ساقی کے سے اشارات تلمیحات اور تراکیب ان کے دیوان میں بکھرے پڑے ہیں۔

محمد قلی قطب کی غزلوں میں جو چیز سب سے زیادہ چونکانے والی ہے وہ ان کی زبان یا صناعی نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں جذبے کی اٹھان، تخیل کی اپج اور موسیقی کا رچاؤ ہے۔ اسی اعتبار سے ان کی غزل نفسیاتی تجزیہ چاہتی ہے۔

محمد قلی کی غزل کا سب سے اہم پہلو اس کی غنائیت ہے۔ وہ خود بھی موسیقی کے ماہر تھے اگرچہ ان کا فن عربی و فارسی عروض کا پابند ہے لیکن ان کی غزلوں کا آہنگ بحروں کے پیمانوں سے چھلکا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ موسیقی سے ان کا جذباتی لگاؤ ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے ان اشعار سے جذبے کے آہنگ اور نغمہ کے آہنگ کا تال میل ظاہر ہوتا ہے۔ ان اشعار کو پڑھتے وقت سامع کے لئے یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا شاعر کا مقصد کسی نغمے کو پیش کرنا ہے یا کسی جذب کو؟ ساتھ ہی ساتھ نغمہ کی وجہ سے جذبے کے اظہار میں اور جذبے کی وجہ سے نغمہ کے اظہار میں ارتکاز پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پیا باج پیالہ پیا جائے نا　　پیا باج اک تل جیا جائے نا
کہتے تھے پیا بن صبوری کروں　　کہیا جائے اما کیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند　　دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

اس غزل میں پ، ل اور ش کے حرفوں سے آہنگ میں مخصوص لچک پیدا کی گئی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا ردیف "نا" نہ صرف موسیقی سے لبریز ہے بلکہ جذبے کی شدت کا بھی اظہار کرتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں کہ "غزل میں قافیہ اور ردیف کے اعادہ اور ترتیب سے وہی کام لیا جاتا ہے جو موسیقی میں سُر اور راگوں کے اعادہ سے لیا جاتا ہے"۔ قلی قطب شاہ کی غزلوں کا لہجہ ایک خاص آہنگ سے عبارت ہے۔ یہ لہجہ اردو کے بیشتر شعراء کی طرح تفہیم اور استفہام کا لہجہ نہیں ہے بلکہ یہ احساسات اور جذبے کی لہروں کے تابع ہے۔ محمد قلی قطب شاہ جب یہ کہتے ہیں

ع۔ خبر لیا و دہ میرے تئیں سو اُس سبحا رحم عالم کا　　جیا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

تو اول الذکر مصرع کے فقرے "خبر لیاو" میں جو تڑپ اور اضطراب ہے وہ اظہار کی حدود سے باہر ہے۔ موخر الذکر مصرع کا لہجہ جذباتی کیفیات کی جیسی ترجمانی کر رہا ہے ویسی ترجمانی لفظوں سے نہیں بلکہ صرف لہجہ سے ممکن ہے۔ محمد قلی کے لہجہ میں غنائیت کے علاوہ ایک تڑپ، اضطراب، وارفتگی اور دیوانہ پن ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے بادۂ حقیقت اور مئے مجاز دونوں کے گھونٹ چڑھائے تھے اور ان کی غزل میں دونوں کا نشہ ملتا ہے۔ نیز اکثر و بیشتر ان دونوں کے امتزاج سے ان کے یہاں ایک ایسی دو آتشہ تیار ہو جاتی ہے جس کی نظیر ہمیں حافظ شیرازی کے یہاں ملتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محمد قلی، حافظ سے کافی متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے حافظ کی اتباع میں باقاعدہ غزلیں کہیں تھیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:—

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

معتمد امین اندرابی

نیل کنول مسکائے ـــــ ایک جائزہ

سری نگر کے ادبی حلقوں میں ۱۹۶۲ء کا آغاز بہت ہی پرامید اور حوصلہ افزا دکھائی دیتا ہے۔ آج کل جب کہ لوگ "آٹھ ستاروں" کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور ۶۲ء کو ایک "منحوس سال" سے تعبیر کرتے ہیں، میرے خیال میں یہ سال کم از کم ادب کیلئے اچھا ہی ثابت ہوگا۔ اس کے جواز میں میں محمود حسین بدخشی کے افسانوی مجموعے "نیل کنول مسکائے" کو پیش کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ یہ کنول سال بھر مسکراتے ہی رہیں گے۔

ادارۂ ادبیات اردو کسی خاص تعارف کا محتاج نہیں۔ تقریباً ایک ربع صدی سے یہ ادارہ اردو زبان و ادب کی جو گرانقدر خدمت انجام دے رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور اس کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنا بھی یہاں ممکن نہیں۔ ادارہ کے روح رواں محترمی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی زبردست شخصیت، ان کی پرخلوص اور بے لوث کوششوں اور ان کی رات دن کی محنت نے ادارہ کو ہند و پاکستان کے تمام اردو اداروں کے لئے قابل رشک بنادیا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر اس لحاظ سے بڑی خوش قسمت ہے کہ پچھلے سال کے وسط سے کشمیر یونیورسٹی نے محترم زور صاحب کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ یہاں بھی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے اسی طرح سرگرم عمل ہیں جس طرح وہ حیدرآباد میں تھے۔ انہی کی کوششوں سے یہاں بھی ادارۂ ادبیات اردو کا ایک شعبہ "اشاعت ادبیات کشمیر" قائم ہوا ہے اور اس سلسلے کی پہلی کڑی محمود حسین بدخشی کے افسانوں کا مجموعہ "نیل کنول مسکائے" ہے۔ ہمیں امید کرنی چاہئے کہ اس شعبہ کی اشاعتی سرگرمیاں روز بروز تیز تر ہوجائیں گی اور ساتھ ہی یہ شعبہ عوام اور حکومت کی فوری توجہ اور تعاون کا مستحق ہے۔

"نیل کنول مسکائے" نو افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ محمود حسین کا یہ اس قسم کا پہلا مجموعہ ہے۔ لہٰذا یہ بات صاف ظاہر ہے کہ محمود نے اب تک کی لکھی ہوئی تمام کہانیوں کا انتخاب پیش کیا ہوگا۔ آغاز میں محترم زور صاحب کا وقیع پیش لفظ ہے جس نے کتاب کی قدر و قیمت میں زبردست اضافہ کیا ہے۔ محترم زور صاحب نے اپنے پیش لفظ میں کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی تاریخ کا اجمالی خاکہ کھینچا ہے اور مختصر مگر بہت ہی جامع الفاظ میں چند نامور افسانہ نگاروں سے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ محترم زور صاحب کی رائے یقیناً ان افسانہ نگاروں اور ان کی تخلیقات سے متعلق حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے بے شک کشمیر کے چند اچھے اردو افسانہ نگاروں مثلاً علی محمد لون، دیپک کول، حامد [illegible] وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ اس لئے [illegible] صرف ایسے ہی کشمیری افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جن کا کوئی مجموعہ کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ تعجب کے طور پر ان نے [illegible] قسم کا خاکہ [illegible]

[illegible] جذبات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے

[illegible]

موضوع اگرچہ اچھوتا نہیں ہے لیکن جہاں تک اس کی پیش کش کا تعلق ہے اس میں نیا پن ضرور ہے۔ افسانہ کی تیکنک تہور کے فن کی پختگی کا پتہ دیتی ہے۔ ایک پختہ کار افسانہ نگار ہی اس قسم کی تکنک کو کامیابی کے ساتھ برت سکتا ہے۔

کہانی کی ہیروین سرتاپا مشرقی ہے۔ وہ ان تمام اصولوں اور قاعدوں کا احترام کرتی ہے جو روز ازل سے ہی سماج نے اس کے لئے مقرر اور معین کر رکھے ہیں۔ وہ اس سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کو توڑنے یا اس کی عائد کردہ بندشوں سے نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس کا انجام سوائے بدنامی اور ناکامی کے کچھ نہ ہوگا۔ وہ جب یہ کہتی ہے

"میں اپنے ابا اور امی سے کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ مجھے معلوم ہے "اس وقت میرے ہونٹ آگ میں تپی ہوئی سلاخوں سے داغ دئیے جائیں گے، کیونکہ جب ایک عورت سماج کے بنائے ہوئے قوانین کو ٹھکرا دیتی ہے تو سماج کی نظروں میں وہ ہیچ تصور کی جاتی ہے۔ جب وہ اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف آواز اٹھاتی ہے" اس وقت وہ بے شرم قرار دی جاتی ہے۔"

تو میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کردار کی زبان سے خود تہور بول رہا ہے۔ یہاں اس نے اپنی ذات کو کردار کی شخصیت میں مدغم کر دیا ہے — میں نے اوپر بھی لکھا ہے کہ یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ اس موضوع پر اردو ادب میں ہمیں بہت سی کہانیاں ملیں گی لیکن جب تک ہمارے سماج میں اس قسم کے واقعات ہوتے رہیں گے جب تک دو دلوں کے بیچ میں سماج ایک دیوار بنا رہے گا اور جب تک بے زبان لڑکیوں کے ارمانوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا گلا گھونٹا جائے گا اس قسم کی کہانیاں لکھی جائیں گی اور اس موضوع کی اہمیت میں نہ تو تب تک کوئی کمی واقع ہوگی اور نہ ہی اسے پامال اور فرسودہ سمجھا جائے گا۔

فنی نقطۂ نظر سے "انتظار" ایک بے عیب کہانی ہے۔ زبان میں حیرت انگیز روانی پائی جاتی ہے۔ لہجہ شروع سے آخر تک pathetic ہے۔ کہیں کہیں اس میں شدید قسم کی جذباتیت بھی ملتی ہے اور دو ایک جگہ تو لہجہ طنزیہ بھی ہو گیا ہے۔

"مریم" مجموعے کی دوسری کہانی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں بھی کوئی نیا اور اچھوتا پلاٹ نہیں ملتا۔ مرد کی بے وفائی کے ہم نے اب تک بہت سے قصے سنے ہیں۔ اس کہانی کی ہیروئن مریم، پہلی کہانی کی ہیروئن کے مقابلہ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کی شادی اس کے من پسند لڑکے ہی سے ہو جاتی ہے لیکن حالات اچانک پلٹا کھا جاتے ہیں اور مریم کا خاوند اسے چھوڑ جاتا ہے۔ مریم ہجر اور فرقت کی دھیمی دھیمی آگ میں لمحہ بہ لمحہ جلتی رہتی ہے اور ایک دن وہ سینے کی قبر میں ہی اپنی آرزوؤں اور اپنے ارمانوں کو دل سے لگائے مر جاتی ہے۔

اس کہانی کی زبان بڑی پیاری اور بہت ہی میٹھی ہے۔ بعض جگہ مکالموں کی تکرار سے تاثر کی گہرائی میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ خصوصاً کہانی کے آخری جملے کی تکرار نے تو کہانی کے pathos میں finishing touches کا کام دیا ہے اور مریم ایک کامیاب المیہ بن گئی ہے۔

کہانی کا پلاٹ عام قسم کا ہے۔ کئی جگہ تو اس میں ڈھیلا پن بھی پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مہمل نگاری سے کام لیا ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کمزور پلاٹ کو الفاظ کے حسین و جمیل پردے میں چھپانے کی کوشش کی گئی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کوشش میں تہور بہت حد تک کامیاب رہا ہے۔

اس کہانی میں اسلوب انتہائی جاذب اور پرکشش ہے۔ کئی جگہ تو ڈرامائی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔

"حالانکہ [illegible] آپ مصنف کے پیش کردہ فلسفے پر ایمان نہ لائیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس فلسفے کو

قابلِ قبول (Convincing) بنانے کے لئے مصنف نے واقعات اور دیگر جزئیات کا اچھا انتخاب کیا ہے۔ اس کہانی میں کیپٹن شاہ نواز اور پروفیسر مجید دو اہم لیکن متضاد ذہنیتوں کے کردار ہیں۔ کیپٹن کے سوچنے کا ڈھنگ مختلف چیزوں کے بارے میں اس کے نظریئے اور اس کے تجربے پروفیسر کے تجربوں اور نظریوں سے قطعی مختلف ہیں۔ کیپٹن محبت میں مادیت کا قائل ہے اور پروفیسر "افلاطونی محبت" پر یقین رکھتا ہے۔ مخمور نے کیپٹن کے دلائل کی پیش کش میں اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے لیکن پروفیسر کے دلائل پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ پروفیسر کے عقاید کے جواز میں اس نے جو دلائل اور واقعات پیش کئے ہیں وہ میرے خیال میں کسی ذہین قاری کو مشکل ہی سے مطمئن کر سکتے ہیں۔ کہانی کا عنوان "ہار جیت" کہانی کے آخری جملے سے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جیت اس کی ہوتی ہے جسے ہم پسند نہیں کرتے۔ لیکن مصنف اگر اس کے برعکس دکھانے کی کوشش کرتا تو یہ ایک تیسرے درجے کی کہانی بن جاتی۔ سومرسٹ ماہم ایک جگہ لکھتا ہے کہ "زندگی یہی ہے۔ اس میں اکثر حق کی فتح نہیں ہوتی، ناحق کی بھی ہوتی ہے"۔

"نور اور سائے" ایک پیاری سی کہانی ہے۔ یہ کہانی کشمیر سے متعلق ہے لیکن اس میں کشمیر کو محض پس منظر کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ صحیح معنوں میں ہمیں اس میں بھرپور اور مکمل کشمیریت ملتی ہے۔ اس کہانی میں مقامی رنگ انتہائی صاف، نمایاں اور گہرا ہے۔ کشمیری میں اختر محی الدین اور اردو میں پریمی کے بعد مشکل ہی سے اس قسم کی صحیح کشمیریت کہیں اور ملتی ہے۔

کہانی میں ہوس کاروں اور مکاروں کو ننگا کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ایسے سیاحوں کو یقیناً ایک کبھی نہ بھولنے والا سبق دیا گیا ہے جن کے خیال میں کشمیر کی حسین لڑکیاں سیاحوں کی ظاہری امارت اور چمک دمک سے مرعوب ہو کر اپنا سب کچھ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان کے آگے پیش کرتی ہیں۔ اس قسم کے افسانے، بے شک، کئی افسانہ نگاروں نے لکھے ہیں اور ایسا کر کے انھوں نے کشمیر کو ایک خیالی اور غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے افسانے لکھتے وقت ادیبوں نے اپنے آپ کو کمرے کی چار دیواری میں محبوس کر کے زیادہ تر اپنے تخیل سے ہی کام لیا ہے اور اپنے اس محدود کمرے کے "دریچے" کو کھولنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ ان کی تخلیقات میں نہ تو کسی تجربے کی جھلک ملتی ہے اور نہ ہی کسی ذاتی مشاہدے کا عکس — اوروں کا تو ذکر ہی کیا خود یہاں کے کئی افسانہ نگاروں نے بھی اسی روایتی انداز میں کئی کہانیاں لکھی ہیں جو کہانیاں کم اور "افسانہ" زیادہ ہیں۔

"نور اور سائے" کے تمام کردار اپنی اپنی انفرادیت کے باوجود بھی ایک type کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "ساجی" اور "رحیا" کشمیر میں ہر جگہ آپ کو ملیں گے۔ کہانی پڑھتے وقت آپ انھیں یقیناً پہچان لیں گے۔

کہانی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مخمور نے چند مختصر سے لمحوں کو اس طرح روشن کیا ہے کہ ان میں ہمیں ایک پوری اور جامع زندگی کی جھلک ملتی ہے۔

"اندھیرا اُجالا" میں ابتداء سے ہی تذبذب (suspense) ہے جو اپنی پوری شدت سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ کلائمکس اور انجام قریب قریب ایک ہی جگہ پر واقع ہیں جس سے کہانی کے مجموعی تاثر میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ لشکر کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ وہ ایک ایسا نوجوان ہے جسے یقیناً ایسے خواب دیکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے وہ ایسے خواب نہ دیکھنے کی چاہے لاکھ کوشش کرے لیکن یہ اس کے اختیار کی بات نہیں۔ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے کہ جن خواہشات

اور آرزوؤں کو انسان شعوری طور پر دبانے کی کوشش کرتا ہے وہ غیر شعوری طور پر خواب کی حالت میں تسکین پا لیتے ہیں۔

کہانی میں واقعات کی بذات خود کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ اہم ضرور ہیں۔ تیشکر کے علاوہ کہانی میں اور بھی کئی کردار ہیں لیکن سب [illegible] ہیں۔ اگرچہ ان سب کی صرف ہلکی ہلکی جھلکیں ہی دکھائی گئی ہیں لیکن پھر بھی ان کے خد و خال نمایاں ہو گئے ہیں۔

"یہ خلش کہاں سے ہوتی ہے؟" پڑھ کر میں حیران ہوا کہ مخمور نے اسے اپنے مجموعے میں کیونکر جگہ دی ہے۔ اس افسانے کا نام جتنا حسین ہے، کہانی اتنی اچھی نہیں۔ ایک سستا سا پلاٹ ہے اور ڈرامائی قسم کا واقعہ جس میں suspense کا عنصر بھر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نتیجہ کے طور پر کہانی ایک اوسط درجے کی سسپنس اسٹوری (suspense story) بننے سے بھی رہ گئی ہے۔ فنی لحاظ سے بھی کہانی میں کوئی خاص بات نہیں۔

"وادی کی رانی" ایک کیریکٹر اسٹوری ہے۔ اکبر خاں کا کردار شروع سے آخر تک کہانی کے سارے ماحول پر چھایا ہوا ہے۔ اس کا کردار بعض حیثیتوں سے منفرد قسم کا ہے۔

یہ کہانی جاگیردارانہ دور کی عکاسی کرتی ہے جو صرف چند سال پیشتر اپنی تمام تر غلاظتوں اور گھناؤنیوں کے ساتھ کشمیر پر مسلط تھا۔ یہ دور اگرچہ اب گذر چکا ہے لیکن اس عہد سے وابستہ تلخ یادیں اب بھی ہمارے ذہنوں سے مکمل طور پر مٹ نہیں سکی ہیں۔ یہ وہ عہد تھا جب جاگیرداروں اور ان کے اہلکاروں کے ہاتھوں میں عوام کی زندگی ہوتی تھی۔ وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ کسی کو لب کشائی کی جرات نہ ہو سکتی تھی۔ اس قسم کے واقعات سے کشمیر کی عوامی زندگی کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ لیکن چونکہ "وادی کی رانی" ایک کرداری افسانہ ہے لہٰذا اس میں واقعات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا تذکرہ کردار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ اکبر خاں کی شخصیت کے مختلف گوشے اس قدر صاف، واضح اور روشن ہیں کہ اس کردار کو ہم آسانی سے نہیں بھلا سکتے۔

"کاغذ کے پھول" مجموعے کی ایک بہترین کہانی ہے۔ ساڑھے گیارہ صفحوں کے ایک خط پر مشتمل اس افسانے میں مصنف نے بڑی چابکدستی اور فنکاری سے ہماری "ترقی یافتہ" معاشرت کی صحیح اور واضح تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کر دی ہے۔ گاؤں کی ایک لڑکی "نرگس" جب شہر کو پڑھنے آتی ہے تو اس وقت اس کے ذہن میں شہر کی تہذیب و تمدن اور یہاں کی معاشرت کا ایک خوبصورت اور حسین سا نقشہ ہوتا ہے، جو شہر آ کر اور شہر میں کچھ دن رہنے کے بعد مکمل طور پر اس کے ذہن سے اتر جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا ہی نقشہ اس کے ذہن کے پردے پر ابھرتا ہے —— "کاغذ کے پھول" اسی نقشے کو کاغذ پر اتارنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

"کاغذ کے پھول" میں یقیناً کئی کردار ایسے بھی ہیں جن کا تعلق محض افسانہ کی دنیا سے ہی نہیں بلکہ ہماری اس حقیقی زندگی سے بھی ہے۔ اس کہانی کا موضوع مصنف سے فنی پختگی کے علاوہ ذہنی اور شعوری پختگی کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور اس کے treatment میں ذرا سا بھی ڈھیلا پن کہانی کے توازن کو بگاڑ کر اس کے حسن کو غارت کر سکتا تھا لیکن مخمور نے اسے جس طریقے پر نبھایا ہے، میرے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔

کہانی کے تمام کردار اپنی جگہ پر خوب ہیں البتہ کستوری کے کردار کو مصنف نے محض توازن برقرار رکھنے کے لئے کہانی میں لایا ہے۔ کہانی میں اس کا داخلہ فطری دکھائی نہیں دیتا —— "کاغذ کے پھول" ایک فکر انگیز کہانی ہے۔

آخر میں قاری کو ایک صدمہ سا پہنچتا ہے۔ جب انتہائی شوق کے عالم میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ "نیل کنول مسکائے" والی کہانی مجموعے میں شامل نہیں ہے تو لازمی طور پر قاری کے تجسس کی حس بھڑک اٹھتی ہے اور وہ اس کے متعلق قسم قسم کی قیاس آرائیاں کرنے لگتا ہے ــــ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے یہ کہانی غالباً ۱۹۵۶ء میں رسالہ "بیسویں صدی" میں پڑھی ہے۔ اس وقت اگرچہ وہ پرچہ میرے پاس نہیں ہے لیکن کہانی کا مجموعی تاثر ابھی تک مکمل طور پر میرے ذہن سے زائل نہیں ہو سکا ہے ــــ اتنا مجھے یاد ہے کہ اس کہانی کا ماحول کشمیری تھا اور غالباً پہلی بار بانجیوں کے طبقے کی صحیح عکاسی کی گئی تھی ــــ اس کے علاوہ "نیل کنول مسکائے" پہلی کہانی تھی جس نے مخمور کو باقاعدہ طور پر ادبی حلقوں میں متعارف کرایا ــــ میں اب بھی نہیں سمجھ سکا ہوں کہ مخمور نے اسے کس وجہ کی بناء پر اپنے مجموعے میں شامل نہیں کیا ہے جب کہ بقول مصنف "نہ صرف ترتیب میں اس کا نام آیا بلکہ اس کہانی کا عنوان تک کتاب کا نام قرار پایا" ــــ مجموعے میں شامل چند کہانیوں کے مقابلے میں "نیل کنول مسکائے" کئی حیثیتوں سے ایک بہترین کہانی تھی اور اسے شامل نہ کر کے مصنف نے قارئین کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی طور پر "نیل کنول مسکائے" مخمور کے افسانوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں کچھ شوخ پھول بھی ہیں اور کچھ پھیکے بھی ــــ محترم زور صاحب نے اپنے پیش لفظ میں مخمور کے افسانوں کے متعلق چند بلیغ جملے لکھے ہیں جن پر اضافہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ نے لکھا ہے ــــ

"ان کے یہ افسانے کسی نہ کسی حقیقت اور کسی نہ کسی راز کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ٹکنیک کے لحاظ سے بھی یہ دلفریب ہیں اور چونکہ ایک ابھرتے ہوئے فن کار کے موئے قلم کا نتیجہ ہیں اس لئے ان میں وہ گدرا پن ہے جو نئی نئی جوانی میں حسن بھر کر ابھرتا ہے۔ وہ پختہ پن نہیں ہے جو عنفوان شباب کے بعد کسی ایسی حسینہ میں جھلکنے لگتا ہے۔ جس نے یہ محسوس کر لیا ہو کہ اس کے چاہنے والے اور اس کے حسن کے قدردان پیدا ہو گئے ہیں۔"

آخر میں محترم زور صاحب کے ہی اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں ــــ

"مجھے یقین ہے کہ کشمیر کا یہ ابھرتا ہوا فنکار اگر اسی طرح مصروف تخلیق رہے تو اردو کے افسانوی ادب میں اپنا نام پیدا کر سکے گا اور اپنے وطن کو تمام اردو دنیا میں باعزت طریقے پر روشناس کرانے کا باعث بن سکے گا۔"

بقیہ بسلسلہ ص ۱۳ "محمد قلی قطب شاہ ــــ شخصیت اور فن کے چند پہلو"

"بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے فیض نے شاعر کی طبیعت کو گرما دیا ہے۔"

الغرض ان خصوصیات کے ساتھ قلی قطب شاہ نے اردو کو نوازا اور اردو شاعری کی ایک ایسی بنیاد قائم کی جس کے بارے میں رام بابو سکسینہ یوں رقمطراز ہیں ــــ

"مختصراً یہ کہ محمد قلی قطب شاہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ انھوں نے ایک ایسے شعری ادب کی بنیاد رکھی جس کے پیرو اور مختتم میر، سودا، انیس و دبیر، ذوق و غالب وغیرہ ہوئے۔"

ڈاکٹر زور کا یہ ادبی احسان اردو والے [illegible] قطب شاہ سے روشناس کروایا۔

دانش فرازی

رسمِ چمن

میری زباں پہ حکایت تھی موسمِ گل کی
کہ درمیاں میں خدا جانے بات کیا نکلی
محافظِ گل و لالہ کا دل دھڑکنے لگا
اُبل رہا تھا نگاہوں سے آتشیں لاوا
لبوں پہ مُہرِ خموشی، جبیں پہ گہری شکن
ہزار پیچ میں اُلجھا ہوا وہ تارِ نفس
گرج کے اس نے وہیں دفعتاً کہا مجھ سے

زبان روک لے اے محرمِ رموزِ چمن
کہ ورنہ نظمِ گلستاں پہ آنچ آئے گی
یہ پھول جن میں شعورِ قبائے چاک نہیں
کہیں یہ مجھ سے سوالِ رفو نہ کر بیٹھیں
چھپے ہوئے ہیں جو نظارے پردۂ شب میں
فضائے صبح کی وہ آرزو نہ کر بیٹھیں
جنھیں ہنوز اجازت نہیں سسکنے کی
خلافِ رسمِ چمن گفتگو نہ کر بیٹھیں
فضا اداس تھی، میں چپ تھا، ہر کلی چپ تھی
مگر گدازِ دلِ کائنات کیا کہیے
کہ پھول پھول کی آنکھوں سے رو پڑی شبنم

خاور نوری

حرفِ آخر

میں چمن ہی میں سہی پھول نہ مانگو مجھ سے
منہ چھپائے ہوئے دامن میں مرے کانٹے ہیں
ایسے ماحول سے آیا ہوں میں تحفے لے کر
غم و آلام مقدر نے جہاں بانٹے ہیں

مسکراتے ہوئے یہ سوچ کے جی ڈرتا ہے
مسکراہٹ مرے ہونٹوں سے کوئی چھین نہ لے
اور تو کچھ بھی نہیں اک یہی سرمایہ ہے
دل کے دھوکے میں کوئی زندہ دلی چھین نہ لے

گفتگو کے لئے مجبور نہ کرنا مجھ کو
دل سے بے ساختہ اک آہ نکل جائے گی
میرے سر آنکھوں پہ فرمائش نغمات مگر
لب ہلاؤں گا تو آواز بدل جائے گی

درد دل رکھ کے بھی ہمدرد نہیں بن سکتا
اشک پونچھوں گا کسی کے تو جھلس جائیں گے ہاتھ
دفعتاً کانپتی آہوں سے بدل جائیں گے
قہقہے جب بھی لگاؤں گا کسی دوست کے ساتھ

مجھ سے پوچھو نہ کوئی بات کسی عنواں سے
میں حقیقت بھی سناؤں تو کہانی ہو جائے
مئے میں کچھ جان ہے جب تک ہے حدِ ساغر میں
حلق سے میرے اتر جائے تو پانی ہو جائے

پھول کمھلا کے نگاہوں میں اگر بھولے سے
حسن سے اڑ جائے گی بو موجِ ہوا کے مانند
زہر پی لوں گا اگر موت کی فرمائش پر
زہر ہوگا اثر انداز دوا کے مانند

میرے الفاظ کو دہرانے کی کوشش نہ کرو
شہد کھچ جائے گا ہونٹوں سے لہو ٹپکے گا
ہار پہنانے پہ مجبور نہ کرنا مجھ کو
سرخ پھولوں سے ابھی خونِ گلو ٹپکے گا

ساز چھیڑو گے تو جاگ اٹھوں گا کروٹ لے کر
نیند آئے گی دہکتے ہوئے انگاروں پہ
روشِ گل پہ نہ سنبھلیں گے کسی طرح قدم
تا بہ منزل میں چلا جاؤں گا تلواروں پہ

کچھ بھی ہم ہاتھ میں لیں ہاتھ نہیں دے سکتے
تم کسی طرح مرا ساتھ نہیں دے سکتے

محمد علوی

گڑیوں کا بیاہ

اب گڑیوں کا بیاہ رچا لے
منی رانی جی بہلا لے!
کل کو اٹھ کر جب تو اپنی
ماں سے اونچی ہو جائے گی
پھر نہ یہ مہندی ہاتھ لگے گی
پھر نہ یہ چُنری لہرائے گی
پھر نہ یہ گھونگھٹ منہ چومے گا
پھر نہ کبھی یوں شرمائے گی
پھر نہ بجے گی یہ شہنائی
پھر نہ سکھی بابل گائے گی
پھر نہ کوئی گھوڑا آئے گا
پھر نہ کوئی ڈولی جائے گی
بچپن کی یہ یاد تجھے پھر
خون کے آنسو رلوائے گی
پھر تو اپنے آپ کو منی
گڑیوں سے کمتر پائے گی
اب گڑیوں کا بیاہ رچا لے
منی رانی جی بہلا لے!!

خلیل رامپوری

فکرِ فروزاں

کمرے میں تنہا بیٹھا سوچ رہا ہوں!
اور آنکھوں میں کیسے کیسے روپ ہیں رقصاں
چڑھتا سورج، ڈوبتے تارے، بہتا دریا
اونچے پربت، ٹھنڈے چشمے، تپتا صحرا
جلتے جنگل، گونجتی بستی، سرد خیاباں

کتنے سائے دیواروں پر رینگ رہے ہیں
پردہ سیمیں پر تصویریں جیسے خنداں
کرنوں کے اک جال میں نظریں گڈمڈ گڈمڈ
جھلمل جھلمل پار اُفق کے جیسے میلہ
دیکھ رہا ہو کوئی بالک جیسے سپنا

کتنے سوچ کے آئینے ہیں میرے مقابل
زخمِ تمنا۔ دردِ زمانہ۔ فکرِ گلستاں
اک اک شعلہ پھونک رہا ہے لحظ لحظ
میری دنیا۔ میری تمنا۔ میرا سراپا
کتنے طوفانوں میں ہے قندیل فروزاں

کمرے میں، میں تنہا بیٹھا سوچ رہا ہوں

نظرؔ حیدرآبادی

دلوں کے راز نگاہوں میں پائے جاتے ہیں کہاں کے تیر کہاں آزمائے جاتے ہیں
جفا کہوں کہ اسے وعدۂ وفا کی ادا نظر ملاتے نہیں، مسکرائے جاتے ہیں
اسی خیال میں ہر شام انتظار کٹی وہ آرہے ہیں، وہ آئے، وہ آئے جاتے ہیں
بھریں گے خونِ تمنا سے ان میں رنگِ دوام ابھی تو شوق کے خاکے بنائے جاتے ہیں
بتا دیا ہے یہ اربابِ گلستاں نے ہمیں بہار آئے تو کیا گل کھلائے جاتے ہیں
یہی ہے وادیٔ عزیمت تو اے ہجومِ بلا سنبھال لینا کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
مثالِ شمع شبِ زندگی میں اہلِ ہنر جلا جلا کے سحر تک جلائے جاتے ہیں
مسافرانِ شبِ تار کچھ بتاتے چلو کہیں سحر کے بھی آثار پائے جاتے ہیں

نظرؔ یہیں کہیں انوارِ صبح بھی ہوں گے
چراغِ آخرِ شب جھلملائے جاتے ہیں

ڈاکٹر وحید اختر

ہنستی ہوئی محفل میں کل دل امڈ آیا تھا
کیا جانئے آنکھوں میں کس راز کا سایا تھا

تم آئے تو دنیا بھی ہمساز تھے دشمن تھے
پھر کوئی زمانے میں اپنا نہ پرایا تھا

یادوں کے چراغوں میں کل تم ہی نہ تھے شامل
آئینۂ دل پر شب ہر نقش ابھر آیا تھا

گم کردۂ خوشبو ہیں سرشارِ صبا اب تک
یوں بیٹھے ہیں جیسے کچھ کھویا ہے نہ پایا تھا

اب سوچ رہے ہیں تو آتا نہیں یاد اتنا
کیا سوچ کے رو رو کر کل ان کو بھلایا تھا

اے بادِ صبا ہم سے اتنا نہ گریزاں ہو
ان ہاتھوں کو ہم نے بھی آنکھوں سے لگایا تھا

سید حرمت الاکرام

وہ دل جو تھا کسی کے غم کا محرم ہو گیا رسوا
جہانِ بیش و کم میں خوابِ آدم ہو گیا رسوا

دکھائی اہلِ دل کو منزلِ دار و رسن جس نے
تمہاری کج کلاہی کا وہ عالم ہو گیا رسوا

جگاؤ اور پھر اک بار عزمِ تیشہ ساماں کو
کہ یارو! کوہکن کا عزمِ محکم ہو گیا رسوا

تعجب ہے، نہ آئی خندۂ گل پر کوئی تہمت
ستم یہ ہے چمن میں اشکِ شبنم ہو گیا رسوا

ہے آئینہ کی حیرانی بھی افسانہ در افسانہ
ترے اسرارِ محجوبی کا محرم ہو گیا رسوا

ہماری تلخ گفتاری بھی زیرِ تبصرہ آئی
جہانِ فکر و فن میں شیوۂ غم ہو گیا رسوا

مرے اشکوں پہ تہمت آئے تو آئے، غم مگر یہ ہے
مروّت میں کسی کا دامنِ نم ہو گیا رسوا

بسانا تھا کسی حیلہ سے دنیا کے خرابے کو
یہ ایسی مصلحت تھی جس پہ آدم ہو گیا رسوا

خوشی ہے کچھ تو اتنی ہے کہ یہ ان کی خوشی ٹھہری
میں ورنہ کیسے یہ بھولوں مرا غم ہو گیا رسوا

مری آشفتہ سامانی ہوئی رسوا تو کیا حیرت
یہ بتلا! کیوں ترا گیسوئے برہم ہو گیا رسوا

عجب طرزِ مداوا تھا ہمارے چارہ سازوں کا
کہ حرمتؔ ارتباطِ زخم و مرہم ہو گیا رسوا

فارغ بخاری

اونچے نیچے پیڑوں کے خاموش فسانے سنتا ہوں
دن ڈھلتے ہی باغوں کے ویرانوں میں سر دھنتا ہوں

ایک ہوا کے سے ذہنوں کے آئینہ خانے لوٹ گئے
چار قدم چلنے کے لئے برسوں تک کرچیں چنتا ہوں

اس دنیا میں پیار کا سودا کتنا مہنگا پڑتا ہے
تیری خاطر اپنوں بیگانوں کے طعنے سنتا ہوں

اپنے آپ کو دھوکا دے کر دوپہر ہی میں جینا پڑتا ہے
جی بہلانے کو خوابوں کے تانے بانے بنتا ہوں

اندھیاروں نے لوٹ لیا ہے جیون کی رعنائی کو
شب بھر اپنی پلکوں سے اشکوں کے تارے چنتا ہوں

اب تو شاید فارغ سچ مچ دیوانہ ہو جاؤں گا
آخر ان کے شہر میں کیسی کیسی باتیں سنتا ہوں

ضیاء الدین احمد شکیب

ہائے وہ خواب جمال عشق کی تقصیر سہی
محشر ناز مرے خواب کی تعبیر سہی

عشق کی حوصلہ مندی کو سند تھی درکار
صفحۂ دل پہ نگاہوں کی یہ تحریر سہی

اتنا دلکش تو نہیں ہے یہ جہاں خیر چلو
دل کے خوش رکھنے کو رنگین سی تصویر سہی

دل کی بے راہ روی محرم تادیب نہیں
چند روز آپ کی زلفوں کی بھی زنجیر سہی

بے حجابی کا حجابوں کو جنوں رہتا ہے
آپ کی تمکنتِ ناز عناں گیر سہی

کچھ تو احباب کے اخلاص کا احساں ہے شکیب
لاکھ یہ معجزۂ خوبیٔ تقدیر سہی

نصیر پرواز

اے دل زار بتا تیرا ارادہ کیا ہے
آج پھر اس نے محبت سے مجھے دیکھا ہے
یہ سلگتے ہوئے لمحے یہ دہکتی گھڑیاں
دل ترے پیار کی ٹھنڈک کو ترس اٹھا ہے
طنز فرما کے مری چاک گریبانی پر
پوچھتا ہے یہ زمانہ کہ محبت کیا ہے
تیرگی خواب کی مانند بڑھی آتی ہے
آج خورشید تمنا بھی نہیں نکلا ہے
یاد کی شمعیں فروزاں نہ کر اے شام الم
کتنی مشکل سے دل زار ابھی سویا ہے
پوچھتے پھرتے ہیں ہم داغ تمنا لے کر
دوستو خیمۂ انجم بھی کہیں دیکھا ہے
سیل نغمات مرے لب سے رواں ہے پرواز
اور جہنم ہے کہ سینے میں سلگ اٹھا ہے

شاہد منصور

جو لوگ سایۂ زلف رواں سے گذرے ہیں
حقیقتاً وہ بڑے امتحاں سے گذرے ہیں
امین عظمت منصور و قیس ہیں ہم بھی
ہزار حشر اٹھے ہم جہاں سے گذرے ہیں
ابھی کہاں سے طے دل کی منزل مہتاب
ابھی تو کارگہ رائیگاں سے گذرے ہیں
وہ لوگ ہم سے دوانوں کا حال کیا جانیں
جو لوگ منزل شرح و بیاں سے گذرے ہیں
گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے
یہ قافلے بھی کبھی شہر جاں سے گذرے ہیں
حریف داغ جگر کون ہو سکے شاہد
ہزار مہر اسی آسماں سے گذرے ہیں

صباجائسی

اٹھو کہ رازِ سکوتِ جہاں تلاش کریں
نگاہِ یار میں دردِ جواں تلاش کریں

جو رنگ بھر دے محبت کا ہر تغافل میں
چلو چلیں وہی حسنِ گماں تلاش کریں

غمِ زمانہ ہے گرمِ سفر تو اب یارو
کہیں پہ سایۂ سروِ رواں تلاش کریں

نجانے گزرا کدھر سے ہجو کارواں غم کا
کہاں غبارِ رہِ کارواں تلاش کریں؟

غمِ حیات سے گیسو سنوارنے والے
کہاں پہ تیرا غمِ رائیگاں تلاش کریں؟

سکوتِ شامِ الم کو بھی جس پہ رشک آئے
وہ زندگی کا تبسم کہاں تلاش کریں؟

صبا کے دم سے کبھی نازشِ چمن جو تھیں
قفس کی ٹوٹی ہوئی تیلیاں تلاش کریں

محمود عشقی

سوئے صحرا چند دیوانے چلے
دل کسی عنواں سے بہلانے چلے

خود جگا کر ہم کو گہری نیند سے
تم کہاں چپکے سے سستانے چلے

وہ اٹھے محفل سے شمعیں بجھ گئیں
دل شکستہ ہو کے پروانے چلے

ترکِ مے کا عزم ہی تو کر چکا
ابر پارے کس کو بہکانے چلے

آئے ہیں سائے میں سستانے کو ہم
تم کہاں زلفوں کو سلجھانے چلے

اپنا غم بھی جو اٹھا سکتے نہیں
وہ شہِ دنیا کو اپنانے چلے

اکرام جاوید

ایک مختصر افسانہ

پس پردہ

براؤن کیفے کے لان پر مرکیوری ٹیوب لائٹ اور چاندنی کی ٹھنڈی خوشگوار روشنی میں میز کے اطراف وہ تینوں ایک مثلث کی شکل میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور پامسٹری پر بحث کر رہے تھے۔ ان تینوں میں ایک بھاری بھرکم سیاہ فام پامسٹ شمیم تھا جو گہرے سرمئی رنگ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا اور ہر بات کا مسکراتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔ دوسرا پستہ قد زرد رو ڈاکٹر آنند تھا جو ہلکے گلابی رنگ کا بش شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا اور تیسرا پروفیسر فائق تھا۔ فلسفہ اور منطق کا مشہور پروفیسر۔ سیاہ اونی شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس ایک انتہائی سنجیدہ اور پر وقار شخصیت۔

وہ تینوں بڑی دیر سے پامسٹری پر گفتگو کر رہے تھے۔ پامسٹ شمیم اپنے ذہن میں بے شمار یادوں اور تجربات کو چھپائے ہوئے تھا صرف ہاتھ دیکھ کر وہ آدمی کی زندگی سے موت تک کے سارے واقعات بیان کر سکتا تھا۔ سینکڑوں ہزاروں ہاتھ اس نے دیکھے تھے اور اس کی کہی ہوئی ہر بات پتھر کی لکیر ثابت ہوئی تھی۔ اس نے دل کے ایک مریض کے بارے میں کہا تھا کہ وہ تین روز میں صحت مند ہو جائے گا جب کہ ڈاکٹر آنند اس مریض کی زندگی ہی سے مایوس ہو گیا تھا اور تین روز بعد وہ دل کا مریض حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہو گیا تھا۔ اور اس دن سے ڈاکٹر آنند پامسٹری کی سچائی کا قائل ہو گیا تھا۔

مگر پروفیسر فائق پامسٹری کی سچائی پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے طویل بحث سے بالآخر ثابت کر دیا کہ پامسٹری ایک فراڈ ہے۔ جاہل اور توہم پرست لوگوں کو بہلانے کا ذریعہ ۔ ایک افیون ۔ ایک زہر جو انسان کو عملی اور نظری دونوں حیثیتوں سے مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے ۔ "یہ کس قدر پاگل پن ہے کہ آدمی اپنا ہاتھ ایک پامسٹ کے آگے پھیلا دے اور پوچھے کہ بتا میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟ میں اس جنون کی کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا ۔ آہ ۔ ہماری قوم کے جاہل، غیر مہذب اور بے وقوف افراد ۔" پروفیسر فائق نے سرد آہ بھر کر کہا اور خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے پستہ قد زرد رو ڈاکٹر آنند چلا گیا۔ اب میز پر پروفیسر فائق اور پامسٹ شمیم دونوں رہ گئے۔ اور کچھ دیر بعد پامسٹ شمیم بھی چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو ایک دم پروفیسر فائق نے اسے روک دیا اور قدرے تذبذب کے بعد اپنا دایاں ہاتھ پامسٹ شمیم کی طرف بڑھاتے ہوئے پر اشتیاق لہجے میں بولا ۔

"سنو ۔ مجھے علم پامسٹری کی سچائی پر یقین نہیں ہے۔ پھر بھی تم میرا ہاتھ دیکھو اور بتاؤ کہ مجھے زندگی میں مزید شہرت، ترقی اور حصول دولت کے مواقع ہیں کہ نہیں ۔!"

بھاری بھرکم سیاہ فام پامسٹ شمیم چکرا گیا اور پروفیسر فائق کا ہاتھ دیکھنے کی بجائے حیرت سے اس کی صورت کو دیکھتا رہ گیا۔!

حسن عسکری کاظمی

صندلی آگ

آج سردی کی آخر کمر ٹوٹ ہی گئی۔ ہمالیہ کی منجمد برفیلی چوٹیوں کے ساتھ آخر اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں اور زندگی کے جمود میں کینچلی چڑھے سانپ کی سی حرکت آہی گئی۔

گلیارے کی شان میں پھر سے توانائی آگئی۔ اودھم چوکڑی، ننگ دھڑنگ، کالے مٹیالے بچے۔ اسکول، کالج، دفتر، کچہری، سارا روزگار پھر سے جاگ گیا۔ نرگسی آنکھیں، بھیگی زلفیں، سینے کے ابھاروں پر ٹکی سہمی ہوئی کتابیں، تنگ قمیصیں، تنگ شلواریں اور تنگ اور محدود زندگیاں۔ سب اپنی اپنی راہ لگ گئے۔

لوہارو نے ایک کنارے پر پڑی ہوئی ٹوٹی ہوئی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ خالی تھی مگر جسم کی گرمی اور پسینے کی ملگجی بدبو باندھوں سے حنا کی طرح پھوٹ رہی تھی۔

شاید کوئی زندگی اپنی راہ لگ گئی تھی اور صندل کی لکڑی چنگ اٹھی تھی تپ کر نکھر گئی تھی۔

"کاش آج اور سردی پڑتی۔ کاش سردی یوں ہی بڑھتی جاتی۔ کاش یہ آسمانی چوٹیاں سرک کر میدانوں کو گھیر لیتیں۔ دھندلا اندھیرا چھا جاتا۔ پھر سے ساری فضا کمھلا جاتی اور برف کی سلیں پہاڑوں سے اتر کر میدانوں میں ہواؤں کے دوش پر تیرنے لگتیں۔ کاش! کاش!! یہ مسلسل جاڑے کی زنجیر آج کے بجائے کل ہی ٹوٹ گئی ہوتی۔

مگر لوہارو کیا ہوتا۔ کچھ بھی نہیں۔ سردی پڑتی یا نہ پڑتی۔ تری ماں کو مرنا تھا۔ وہ ضرور مرتی۔ وہ مر گئی...... اور اب سردی کو مت کوس۔ اپنی تقدیر کو مت کوس۔ چپ ہو جا نہیں تو دنیا بلبلا اٹھے گی۔

لوہارو نے ٹیڑھی میڑھی چارپائی کو ٹھیک کیا۔ مسلسل پانی میں بھیگتے رہنے سے چارپائی اکڑ گئی تھی۔ اس نے چارپائی کے ایک سرے پر بیٹھ کر اسے دبایا تو دوسرا سرا اکڑ کر اٹھ گیا۔ دوسرے کو دبایا تو پہلا سرا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یادوں کی چارپائی کے کونے بھی وہ اسی طرح کل سے بٹھا رہا ہے۔ مگر نہ جانے کیسی یادیں ہیں جو جتنی دبائی جاتی ہیں اتنا ہی سر اٹھاتی جاتی ہیں۔ ایک یاد کا دوسری سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ ایک سرا دوسرے سے گتھا ضرور ہے۔ اس نے پھر چارپائی پر ہاتھ رکھا۔ سرہانا کھڑا ہو گیا۔ سرہانے ہاتھ رکھا پینتانا کھڑا ہو گیا۔

کل ماں کا جسم بھی تو اسی طرح اکڑ گیا تھا۔ چارپائی کے ننگے باندھوں کی طرح اس کے جسم کی ہڈیاں بھی تو بے شمار ٹیڑھے میڑھے پھول بنا رہی تھیں۔ مرے ہوئے جسم پر یہ پھول کتنے کربناک تھے۔ کتنی دہشت ٹپک رہی تھی۔ مگر ہڈیوں کے ان دائیں بائیں موڑوں میں کتنے ممتا کے مجسمے، ایثار اور قربانی کے مقبرے اور وفا شعاری کے کتنے دفینے دفن تھے اور اب سب راکھ کا ڈھیر ہے۔ سب کچھ انجام کی سرحدوں کو چھو کر ایک ہو گیا ہے۔ راکھ اور صرف راکھ۔

لوہارو نے الجھی ہوئی گتھی کو اپنے بکھرے ہوئے خیالوں کی طرح سلجھانا شروع کیا۔ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے ہوئے

سوراخوں سے گلیارے میں کھیلتے ہوئے بچوں نے کمرے کے اندر جھانکا۔ دھندلا اندھیرا۔ بکھری ہوئی محدود حاصل زیست جیسے اپنے مستقبل کو اپنے امروز کے پھٹے ہوئے پردے سے جھانک رہے ہوں۔ یہ چولہا خاموش ہے۔ وہ کڑھائی اپنی خشک زبان نکالے ہانپ رہی ہے۔ توا دنیا کی کالک کو لپیٹے اوندھے منہ سو رہا ہے اور یہ کرچھیں، یہ کفگیر فرہاد کا تیشہ ہیں۔ ماں کی کلائیوں کی لاج ہیں اور یہ سب کی ماں کی یاد سے وابستہ محض یادیں ہیں۔ اسی لئے سب خاموش ہیں اور لوہارو کی طرح خاموشی سے سب سلگ رہے ہیں۔

کھڑے کھڑے اس کے پیر دکھنے لگے۔ اس نے چارپائی ایک طرف گھسیٹی اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ بڑی کریہہ آواز چارپائی کے ریشوں سے ابل پڑی جیسے ماں کے مرتے سمے سردی سے اینٹھی ہوئی ہڈیاں کڑکڑا اٹھی ہیں اور اس نے نحیف آواز میں پکار کر کہا تھا۔ "لوہارو..... میں چلی — میں چلی لوہارو — میرے لعل! ذرا کہیں سے چند انگارے لے آ۔ اگنی کے پوتر آنچوں کے سامنے اپنے بتھائے ہوئے وعدے کو دہرا دوں — بیٹا! جلدی کر۔ میرا وقت قریب ہے۔"

اور لوہارو کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ سارا جسم پھر سے لرزا تھا۔ اس نے چارپائی پر جگہ بدل دی۔ آگے ذرا سا کھسک آیا کہ شاید یادیں بھی اپنی جگہ بدل دیں۔ ایک بھیگا ہوا باندھ ٹوٹ گیا۔ وہ اور آگے کھسک آیا۔ کئی باندھ ایک جگہ پر گڈمڈ ہو گئے تھے۔ اس نے ایک کو کھولنا شروع کیا۔ ایک پھانس گڑ گئی۔ ماں کی الجھی ہوئی آخری خواہشوں اور سسکیوں کی گوندھی ہوئی گتھیوں کو سلجھاتے وقت بھی ایک پھانس گڑ گئی تھی۔

"ابھی لایا ماں۔ یہ لے تو میری قمیص۔ اسے بھی تو اپنے اوپر ڈال لے میں ابھی انگارے لایا۔"

اور اس نے سیٹھ لالہ جی کی کوٹھی میں سردی سے گڑگڑاتے، کپکپاتے ہونٹوں سے نکلتی ہوئی اکھڑی اکھڑی آواز میں پکارا تھا — "سیٹھ جی، سیٹھ جی" — اور بند دروازوں کے بیچ کچھ دیر بعد ایک آواز کھنکتی ہوئی سنائی دی تھی — "کون؟" — لوہارو نے جلدی جلدی کہنا شروع کر دیا تھا — "میں — لوہارو — محلے کی کاکائی کا لڑکا — سیٹھ جی آپ کی ہرامن کا لڑکا۔"

دروازے کی دراز نے قدم نکالے تو سلگتے ہوئے انگاروں کی سوندھی سوندھی خوشبو اور گرمی بھی باہر نکل آئی تھی — "کیا ہے؟" —

"سیٹھ جی ہیں —"

اور دروازے سے جھانکتی ہوئی ان سرد آنکھوں نے کہہ دیا تھا — "ہاں ہیں کیوں نہیں۔ اس سردی میں کس کی موت آئی ہے جو نکلے گا۔"

لوہاروں نے بدشگونی کر دی — "بڑی ماں کی۔"

سیٹھ جی لحاف کی گرمی میں سردی سے شاید کپکپی محسوس کرنے لگے تھے۔

"مالتی بند کر دو دروازہ۔ دیکھتی نہیں ہو اندر سردی گھسی آ رہی ہے۔"

مالتی نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

اندر کی گرمی اندر اور باہر کی سردی باہر رہ گئی تھی۔

لوہارو لوٹ آیا — کہاں جائے؟ — کس دروازے کو کھٹکھٹائے؟ — جسم کے کس حصے کو کاٹ کر آگ

لگادے اور انگارے سلگ اٹھیں۔ ماں بچ جائے۔

سامنے بانس منڈی میں پیڑ کے سہارے بانس کھڑے تھے۔ کاش یہی ایک بانس مل جاتا۔

ایک بانس ـــــ

اور اس نے بڑھ کر حاجی صاحب کے قدموں پر چھپر چھپر کرتے اپنے بدن کو بچھا دیا۔ "حاجی صاب ـــــ مجھے اپنی ماں کے لئے ایک بانس چاہیئے ـــــ حاجی صاب وہ مر رہی ہے ـــــ" حاجی صاحب نے سامنے تپائی پر سلگتی ہوئی انگیٹھی میں سرخ انگاروں کی اہمیت کو پرکھا

"کیوں لوہارو! شام کے اس وقت بانس لے کر کیا کرے گا۔ اب تو کافی شام ہو گئی ہے۔ سب آدمی بھی چلے گئے ہوں گے اور چتا تو صبح ہی تیار ہو پائے گی"۔

لوہارو کو ایسے لگا جیسے بانس پر کسی نے ٹھوکر دیا ہو اور دھیرے سے پیروں کے نیچے سے بانس کھسکا لئے ہوں اور ہوا میں معلق ہو گیا ہو۔

جس جگہ لوہارو چارپائی پر بیٹھا تھا اچانک بانس کڑکڑائے اور ٹوٹ گئے اور لوہارو چارپائی میں دھنس گیا۔ کیسے نکلے؟ کون نکالے اس جنجال سے؟ اس کی آنکھوں کے سامنے ساری دنیا ناچ گئی۔ مندروں کے کلس ناچ گئے مسجدوں کے گنبد اور مینار سے چوکور اور چھوٹے ہو گئے۔

ایلورا کے غاروں میں دبی ہوئی کوئی مجبور چیخ جیسے پھوٹ پڑی ہو۔

ماں ـــــ

بیٹا ......آ ......گ

ہاں ماں ـــــ آگ ـــــ صرف آگ ـــــ آگ ہی آگ ـــــ سب کچھ آگ۔

بیٹا ...... آ ـــــ گ ـــــ

اردو امتحانات۔ ادارۂ ادبیات اردو۔ ڈسمبر ۱۹۶۱ء

اردو دانی

(بلحاظ اول نمبر)

مرکز صنعت نگر

(کامیاب بہ امتیاز)

۱۔ حبیب خاں
۲۔ احمد معین الدین
۳۔ محمد ضیاء الرحمن
۴۔ قادر حسن
۹۔ محمد یعقوب

(کامیاب)

۵۔ محمد عبد الجبار
۶۔ محمد یوسف علی
۷۔ سید یونس
۱۰۔ محمد غلام رسول
۱۴۔ غوثیہ بیگم
۱۵۔ غوثیہ بیگم
۱۹۔ حلیمہ بیگم
۲۰۔ امیرہ خانم
۱۲۔ محمد عبد الغفور
۱۳۔ خورشید النساء بیگم
۱۷۔ نور النساء بیگم

مرکز ابراہیم پٹن

(کامیاب بہ امتیاز)

۲۱۔ محمد اکبر علی
۲۳۔ محمد شکور
۲۶۔ غلام غوث
۲۷۔ سید اسد اللہ حسینی
۲۹۔ محمد شبیر
۳۱۔ جمال الدین
۳۲۔ محمد علی
۳۴۔ غلام احمد
۳۵۔ محمد عثمان
۳۶۔ غلام احمد
۳۷۔ محمد معین الدین
۳۸۔ محمد قاسم
۱۲۵۔ سید ظہیر حسین

(کامیاب)

۲۳۔ کے پربھاکر راؤ
۲۴۔ محمد یوسف
۲۵۔ محمد یوسف لال محمد
۳۰۔ محمد قاسم
۱۲۴۔ محمد جہانگیر علی

(بقیہ نتیجہ صفحہ ۳۶ پر)

طنز و مزاح

رشید الدین

مشاعرہ

یوں تو حماقتوں کی کئی قسمیں ہیں لیکن دو قسمیں ان میں بہت عام ہیں۔ ایک تو وہ حماقت ہے جو انسان سے لاعلمی میں سرزد ہو جائے اور دوسری وہ حماقت جو جان بوجھ کر کی جائے۔ جہاں تک حماقت کی اس پہلی قسم کا تعلق ہے آپ ایک شخص کو معاف کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے لاعلمی کا کیا علاج ہو سکتا ہے اور ویسے بھی حضرت انسان غلطیوں کے مجسمے ہیں۔ آدم سے لے کر آج تک غلطی ان کی سرشت میں داخل رہی ہے اور یہ غلطی ہی کی وجہ ہے کہ حضرت انسان دنیا میں آئے اور بڑے چاپنے پر اپنا کاروبار شروع کر سکے۔ ورنہ کون جانے کہ جنت کے کسی گوشے میں بیٹھے وہ دودھ کی نہروں میں ہاتھ دھوتے، حوض کوثر میں غسل کرتے اور انگور و ناشپاتیاں نوش فرماتے اور ـــــ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

گنگناتے رہتے۔ لیکن ـــــ ذرا ٹھہرئیے میں نے غلط کہا۔ وہاں شاعر کہاں ہوتے ہیں؟ یہ تو دنیا کی دین ہے جو اس نے اچھے خاصے ابن آدموں کو شاعر بنا دیا۔ خیر ـــ تو وہ حماقت جو انسان سے لاعلمی میں سرزد ہو جائے قابل معافی ہے۔ لیکن اس حماقت کو آپ کیا کہیں گے جو جان بوجھ کر مول لی گئی ہو۔ لیکن اتفاق سے ہمارے معاشرے میں حماقتوں کی یہ دوسری قسم بہت عام ہے۔ جسے پڑھے لکھے، غیر پڑھے لکھے، جاہل، سمجھدار اور بڑے چھوٹے سب یکساں انجام دیتے ہیں اور خصوصاً بڑے لوگ تو اس کے بہت زیادہ مرتکب ہوتے ہیں۔ مثلاً حماقتوں کی دوسری قسم کے سلسلے میں شادی بڑی عمدہ مثال ہے۔ ہر شخص اسے ایک حماقت تصور کرتا ہے پھر جان بوجھ کر اس حماقت کو سرانجام دیا جاتا ہے اور زندگی بھر کف افسوس ملا جاتا ہے۔

یہی حال مشاعروں میں جانے کا بھی ہے۔ ہر بار ہم یہ مقصد کرتے ہیں کہ اب ہرگز ہرگز مشاعرہ سننے نہیں جائیں گے مگر پھر دیکھئے تو صف اول میں موجود۔ شاعر صاحب کلام سنا رہے ہیں یا تضیع اوقات کر رہے ہیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ سامعین ہیں کہ داد دئیے جا رہے ہیں۔ شعر میں کوئی انوکھی بات کہی گئی ہے یا محض لفاظی کی گئی ہے۔ اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ بس جھوٹ بار رہے ہیں۔ مصرعہ اٹھا رہے ہیں اور پھر چیخ رہے ہیں۔ مگر یہ کم بخت شعر بھی ایسے سخت جان ہوتے ہیں کہ اس اٹھا پٹخ سے بھی ان میں کچھ نہیں ہوتا۔ شاعر صاحب رو رہے ہیں، گا رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کیونکہ ہم تو آنکھیں بند کئے جھومنے میں لگے رہتے ہیں اور جب آواز آنی بند ہو جاتی ہے اس وقت آنکھیں کھلتی ہیں تب تک تو شاعر صاحب ڈائس سے جا بھی چکتے ہیں پھر ہمیں کیسے پتہ چل سکتا کہ وہ رو رہے تھے، گا رہے تھے یا پڑھ رہے تھے۔ بہرحال آواز ضرور نکال رہے تھے کس قسم کی آواز؟ مدہوشی میں اس کا کیا علم ـــ!

کسی بزرگ نے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ جب انسان ایک حماقت کرتا ہے تو اسے نبھانے دس حماقتیں کرنی پڑتی ہیں اور اس قول کا اطلاق پہلی قسم سے زیادہ دوسری قسم کی حماقتوں پر ہوتا ہے جو کہ انسان کی اپنی مول لی ہوئی ہوتی ہیں۔ خاکسار کو بھی اسی قسم کی حماقتوں کا خاصہ تجربہ ہے (اور ہر معقول شخص کو ہونا چاہیئے) جس میں سے ایک حماقت ہے جب نا چیز نے اپنے ایک کرم فرما دوست کو

ایک مشاعرے میں لے جا کر کی تھی اور جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہے یا جسے نبھائے جا رہا ہے۔ غالب نے ایک بار کہا تھا ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہو سکتا ہے غالب مرحوم کے دلِ داغدار میں ایسی ہزاروں خواہشیں ہوں کہ ہر خواہش کی تکمیل پر دم نکلتا ہی ہے۔ کیونکہ وہ بڑے آدمی تھے اور ہر بڑے آدمی کا دل بھی بڑا ہوتا ہے (یا ہوتا نہیں تو ہونا چاہیے)۔ اس طرح اس میں خواہشوں کی تعداد بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ حصہ بقدرِ جثہ مشہور بات ہے۔ لیکن کیونکہ راقم السطور ایک چھوٹا آدمی ہے اس لئے ظاہر ہے میرا دل بھی چھوٹا ہی ہوگا۔ اس لئے اس میں اس کی سائز کی بناء پر دو تین خواہشیں ضرور ایسی ہیں جن کے پورا ہو جانے پر دم تو خیر کیا نکلتا (اتنا آسان نہیں دم نکلنا) مگر خوشی ضرور ہوتی۔ ان ہی میں سے ایک خواہش ہمارے دلِ ناہنجار میں یہ تھی کہ مشاعروں سے لاکھ منحرف ہونے کے باوجود کسی دن اپنے کسی ایسے دوست کو جس کی مادری زبان اردو نہ ہو اپنے ساتھ مشاعرے میں لے جایا جائے اور اس طرح اپنی زبان کی شیرینی اور تہذیب سے واقف کرایا جائے اور مشاعرے میں پڑھے گئے حسین اشعار کی حسین تشریح کی جائے اور اس طرح اپنی زبان کا لوہا منوایا جائے۔

عام طور پر ایسی خواہشیں جلد پوری نہیں ہوتیں کیونکہ اگر وہ جلد پوری ہو جائیں تو پھر ان کی اہمیت ہی کیا باقی رہے لیکن حسنِ اتفاق سے ہماری یہ خواہش جلد ہی پوری بھی ہو گئی۔ ہوا یوں کہ ہمارے شہر میں اردو کے ایک بہت بڑے شاعر آئے ہوئے تھے۔ ان کی تشریف آوری اس سلسلے میں ہوئی تھی کہ ان کی داڑھی مونچھیں اور زلفیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ کیونکہ وہ وضع قطع کے بہت پابند تھے اس لئے کسی دوسرے شہر میں انہیں ایسا حجام نہیں ملا جو شاعرانہ وضع قطع برقرار رکھتے ہوئے بالوں کی تراش خراش کر سکے۔ چنانچہ وہ ہمارے شہر میں آ گئے جو قدیم تہذیب کا گہوارہ ہے اور جہاں قدیم دور کے ایک سے ایک حجام موجود ہیں۔ یعنی ایک کام دو کاج کے مصداق انہوں نے یہاں ایک مشاعرہ پڑھ لینے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں شہر کی "انجمن تحفظ شاعری" کی سرکردگی میں بڑے پیمانے پر مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ جب مجھے اس مہتم بالشان مشاعرے کی اطلاع ملی تو مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ کیونکہ میری یہ خواہش اتنی جلد پوری ہو سکتی تھی اس کا مجھے سان و گمان بھی نہیں تھا۔ بہرحال مشاعرے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ رقعے تقسیم ہوئے اور شہر بھر میں لاؤڈ اسپیکر (بہ الفاظ دیگر آلۂ مکبر الصوت) کے ذریعہ اعلان کیا گیا۔

مشاعرہ رات میں ۹ بجے سے تھا چنانچہ میں اپنے ایک [illegible] دوست کو لے کر ٹھیک پونے نو بجے ہی مشاعرہ گاہ پہنچ گیا۔ لیکن وہاں جانے پر ہُو کا عالم نظر آیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا [illegible] اسٹینڈرڈ ٹائم ہے۔ [illegible] بہرحال [illegible] پیمانے پر ہوگا۔ تب ہماری جان میں جان آئی، ورنہ ہم تو مایوس ہی ہو گئے تھے۔ اپنے دوست سے باتیں کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ آہستہ آہستہ لوگ آنے شروع ہوئے۔ نشست عام مشاعروں کی طرح ہی فرشی ہی تھی۔ ہر شخص آتا اپنے جوتے اپنے ہاتھ میں لئے آتا اور [illegible] سامنے جوتے رکھ کر بیٹھ جاتا۔ میرے کرسچین دوست نے اس طرح جوتے ساتھ لانے کی وجہ [illegible] یہ تو سراسر اپنے ہی لوگوں [illegible] بدنامی کی بات تھی [illegible] ہمارا اپنی تہذیب کی اچھائیاں بتاتے بتاتے ان کی برائیاں بتانے کی نوبت آ جاتی ہے۔ [illegible] بگڑا ہوا [illegible] کیا جا سکتا تھا جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ [illegible] سامنے رکھے ہوئے ایک جوتے میں گل [illegible] دیا۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا اور ہماری بھی جان چھوٹی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک صاحب ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے چبر چبر پان چباتے ہوئے آئے [illegible] تھے اور گال پھول [illegible] پچکے ہوئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں قلم تھا اور دوسرے ہاتھ میں نوٹ بک۔ انہوں نے بڑے فخر [illegible]

میں یہ التماس کی کہ جو صاحب پڑھنا چاہتے ہیں یعنی اپنے کلام بلاغت سے حاضرین کو محظوظ کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے نام لکھوائیں۔ ورنہ بعد میں شکایت کا موقع نہیں رہنا چاہیئے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے کئی نام جمع کر لئے۔ پھر ہمارے پاس بھی آئے اور اسی فنکارانہ لہجے میں گفتگو شروع کی۔ ہم لوگوں نے معذرت چاہی کہ ہم صرف سخن فہم ہیں سخن ور نہیں۔ اس پر وہ صاحب چلے گئے اور واپس پر جا کر مشاعرے کی کارروائی سے حاضرین کو واقف کروایا۔ جس میں ہمارے کام کی بات یہ تھی کہ بیچ میں آدھے گھنٹے کا وقفہ ہوگا اور حاضرین کی تواضع چائے اور پان سے کی جائے گی۔ مشاعرہ گاہ میں سگریٹ پینا معیوب تھا۔ یہ انھوں نے اس وقت بتایا جب حاضرین میں سے بعض لوگوں نے چیخ کر پوچھا کہ کیا سگریٹ نہیں دئیے جائیں گے۔ اس کارروائی کے بعد ایک لمبا عرصہ یونہی گزر گیا۔ ایسا عرصہ جس میں اپنے دوست سے بات کرنے پر بھی طبیعت نہیں چاہتی اور دنیا و مافیہا کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے آپ سے بھی بیزاری محسوس ہوتی ہے۔

خدا خدا کر کے مہمان شاعر صاحب تشریف لائے اور دس بجے سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے ان شاعر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں (جو در اصل بعد میں کرنی چاہئے تھی) اپنے اس شہر میں آنے کی غرض و غایت اور ہندوستان میں اچھے حجاموں کی قلت کا رونا رویا اور اسے ایک اہم سماجی اور تہذیبی مسئلہ بتایا۔ ان کے آبائی شہر کا حجام پچھلے دنوں انتقال کر گیا تھا اور اس کا نعم البدل ان کے شہر میں کوئی نہیں تھا۔ آپ نے اس حجام پر ایک مرثیہ بھی لکھا تھا جو آخر میں سنانے والے تھے۔ موصوف کا یہ لکچر چونکہ بالکل فصیح اردو میں تھا اس لئے میرے دوست کی بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لئے میں نے اس سے ایک انگریزی فلم پر گفتگو شروع کر دی۔ اور میں یہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ شاعر صاحب کی اس قسم کی تقریر غور سے سنے۔ ورنہ وہ کیا سمجھتا کہ ہمارے شاعر ایسے بھی ہیں جو حجاموں اور دھوبیوں پر نظمیں لکھتے ہیں۔ جب صدر صاحب کی طویل بے مغز تقریر ختم ہوئی تو مشاعرے کا آغاز ہوا اور ایک نئے شاعر صاحب کا نام پکارا گیا جنھوں نے اتنے بڑے مشاعرے میں پڑھنے سے معذرت چاہی۔ واقعی یہ مجھے پہلے منکسر المزاج شخص نظر آئے جنھوں نے اپنی حیثیت کو خود تسلیم کر لیا۔ بعد میں ایک دوسرے شاعر صاحب کا نام پکارا گیا جو معلوم ہوا ابھی ابھی مونگ پھلی خریدنے باہر گئے ہیں اور بس اب آتے ہی ہوں گے۔ ان کا مزید انتظار نہ کرتے ہوئے معتمد مشاعرہ نے ایک تیسرے صاحب کا نام پکارا جو کا قد کا ایک برنہ ہوا میں لہراتے ہوئے ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، کرتا اور جاکیٹ اور ایک انگوٹھے کی چپل پہنے جھومتے جھامتے وارد ہوئے۔

"ان کی شیروانی کہاں ہے؟" — میرے دوست نے پوچھا۔

"وہ انھوں نے اتار کر رکھ دی ہوگی" — میں اور کیا جواب دے سکتا تھا

اتنے میں شاعر موصوف نے مائیک جا تھام لیا اور ترنم سے ایک غزل پڑھی اور کیا پڑھی سماں باندھ دیا۔ لوگ اپنی مسند ہو کر بیٹھے۔ اتنی ولولوں کی کرسی کچھ زیر پیچھے۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا گیا۔ اس ایک شعر پر تو صحبت اڑنی باقی رہ گئی ہے

اتنے مغرور صنم تم تو نا تھے پہلے کبھی

مرنے کو تو ہائے مرا ہی یا مرا دم ہی گیا

میرے کرسچین دوست کو معمولی اردو آتی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا — "کس کا دم نہیں گیا؟"

شاعر کا — میں نے جواب دیا

اس پر اس نے مجھ سے پوچھا — "کیوں نہیں گیا؟"

"اس کو سمجھ [illegible] کا کام" — میں نے کہا۔

"کیوں نہیں آئی تھی؟" ــــ اس نے پھر پوچھا۔

"منور جو تھی" ــــ میں نے آہستہ سے کہا۔

"مگر پہلے تو شاعر نے کہا وہ مر گیا؟" ــــ اس نے پھر پوچھا۔

"ہاں پہلے یہی کہا مگر وہ پھر مرا نہیں" ــــ میں نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا بے چارہ مرا نہیں۔ ورنہ پھر وہ یہ شعر کیسے کہہ سکتا تھا" ــــ اس نے معصومیت سے کہا۔

اور میں کھسیانہ ہو کر دور خلاء میں گھورنے لگا۔

پھر دو چار شاعر اور پڑھ کر چلے گئے مگر انھوں نے ترنم سے نہیں پڑھا تھا اس لئے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ جب زیادہ بدمزگی پیدا ہو گئی اور جمائیاں یکے بعد دیگرے آتی ہی رہیں تو لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے اور مشاعرہ گاہ خالی ہونی شروع ہوئی۔ جب سکریٹری صاحب نے یہ حال دیکھا تو فوراً مائیک کے پاس جا کر اعلان کیا کہ "حضرات اب چائے کا دور چلے گا۔ کوئی صاحب جانے کی تکلیف گوارہ نہ فرمائیں" ــــ یہ سن کر بہت سارے لوگ جو باہر چلے گئے تھے پھر آ کر بیٹھ گئے اور جانے کی تیاریوں میں تھے انھوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ ایک گھنٹہ تک چائے کا دور چلتا رہا۔ خوب خوب چیخ و پکار ہوئی۔ ایک دوسرے پر پھبتیاں کسی گئیں اور پان کی پچکاریوں سے مشاعرہ گاہ لال کر دی گئی اور مشاعرہ پھر شروع ہوا۔ اب کی بار ایک ترقی پسند شاعر نے بہت ہی طویل نظم پڑھنی شروع کی۔ صدر صاحب اونگھنے لگے۔ ان کا دیکھا دیکھی اکثر حاضرین کا یہی حال ہوا۔ میں نے وقت کاٹنے کے لئے اپنے دوست سے باتیں کرنی شروع کیں۔ مگر یہ کیا ــــ! وہ تو سو چکا تھا۔ بڑی دیر بعد ترقی پسند شاعر صاحب نے نظم ختم کی اور جاگنے والے حاضرین نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب پھر ایک غزل گو شاعر صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ مائیک پر آئے۔ اسے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ پھر اپنا گلا کھنکار کر صاف کیا۔ منہ ہی منہ میں کچھ گنگنایا اور دیکھتے ہی دیکھتے تان اڑائی۔ میں نے اپنے دوست کو جگایا جو تان کی آواز سے اٹھنے ہی کو تھا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے کہنے لگا ــــ "ارے یہ صاحب ابھی پڑھ رہے ہیں"

"نہیں بھائی! یہ دوسرے صاحب ہیں۔ دیکھتے نہیں ترنم سے پڑھ رہے ہیں" ــــ میں نے اسے سمجھایا۔ وہ جھینپ گیا۔

شاعر صاحب کے ایک شعر پر بڑی لے دے رہی۔ آپ بھی سنئے ــــ

آتے ہیں تو روز ہی آتے ورنہ پھر آتے ہی نہیں

"کون نہیں آتے؟" ــــ میرے دوست نے پوچھا۔

"شاعر کی محبوبہ" ــــ میں نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ شاعر کی محبوبہ ہی نہیں آتی۔ اس میں تو اس بات کی صراحت ہی نہیں" ــــ اس نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں یہ غزل ہے غزل میں ایسا ہی ہوتا ہے" ــــ میں نے اسے سمجھایا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ میرا منہ تکنے لگا۔ اب صدر مشاعرہ پڑھنے والے تھے۔ بڑے رعب دار انداز میں گلا صاف کرتے ہوئے انھوں نے اپنا تازہ مرثیہ سنایا اور اس کے بعد اس مرثیہ کے لکھے جانے کا پس منظر اور مرحوم حجام کی صفات بیان کرنی شروع کیں۔ مگر شومئی قسمت سے اچانک ہی لائٹ آف ہو گئی اور پھر جو بھگدڑ مچی کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔

"ارے میری ٹوپی [illegible]

"ہائے میری چھڑی"

"ارے میرا جوتا"

"ہائے میرا سونٹا"

اور ایسی ہی آوازوں سے مشاعرہ گاہ گونج اٹھی۔ کوئی دس منٹ بعد جو لائٹ آئی تو مشاعرہ گاہ میں سوائے لیٹے ہوئے لوگوں کے اور کوئی باقی نہیں تھا جن میں میں اور میرا دوست بھی تھے۔ میرے دوست کی امریکن ہیٹ کوئی پار کر گیا۔ خود میری چپل کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ صدر مشاعرہ اور مہمان شاعر صاحب کی بید جیسے سونے کی مٹھی لگی ہوئی تھی کوئی لے کر چمپت ہوگیا۔ سکریٹری صاحب رپورٹ لکھوانے پولس تھانہ گئے اور صدر مشاعرہ منہ لٹکائے اپنی قیام گاہ کی طرف۔ رہ گئے ہم دونوں سو ہم بھی ایک ننگے پیر اور ایک ننگے سر۔ اندھیرے میں سے کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہیں نکل کھڑے ہوئے۔ گھر جاکر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ گھاٹے میں صدر صاحب ہی رہے۔ جن کا مرثیہ بھی کوئی نہیں سن سکا اور سونے کی مٹھی لگی چھڑی الگ چلی گئی ـــــ یہ سب تو خیر ہوگیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان ہر چیز بھول جاتا ہے اس لئے یہ چیز بھی اتنے سارے لوگوں میں سے کسے یاد رہی ہوگی۔ مگر مجھے اب بھی کبھی کبھی ایک ٹیس سی لگتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب میرا کرسچن دوست نئی انڈین ہیٹ پہن کر خاص انداز میں ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھتا ہے ـــ "کیوں؟ اب کہیں مشاعرہ نہیں ہے؟" ـــــ اب آپ ہی کہیئے میں اسے کیا جواب دے سکتا ہوں ـــــ

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

نتیجۂ اردو دانی سلسلہ ۲۱

مرکز بلدہ (ذکور و اناث)

(کامیاب امتیاز)

۴۹۔ محمد نظام الدین فاروقی
۵۰۔ محمد مصلح الدین انصاری
۵۱۔ وارث فاروقی
۵۲۔ زاہدہ بی
۶۱۔ محمودہ بی
۶۵۔ فاطمی بی

(کامیاب)

۴۱۔ محمد عبد النبی
۴۴۔ سلیمان خاں
۴۵۔ معین اللہ خاں
۴۶۔ لطیف حسین
۴۷۔ جہانگیر بی
۵۳۔ ذاکرہ بی
۵۴۔ طفیہ بی
۵۵۔ یعقوب بی
۵۶۔ زلیخا بی
۵۸۔ محبوب بی
۵۹۔ حسینہ بی
۶۰۔ دولت بی
۶۲۔ رحیم النسا
۶۳۔ رابعہ بی
۶۴۔ خورشید بی

مرکز سنٹرل جیل

(کامیاب بہ امتیاز)

۶۷۔ شنکر سنگھ
۶۸۔ منشورایا
۷۱۔ وینکٹ نرسا ریڈی
۷۴۔ بی تیا ریڈی
۷۶۔ شیخ سعید
۸۲۔ وٹھل راؤ

(کامیاب)

۶۶۔ محمد یوسف
۷۰۔ سایہ گوڑ
۷۲۔ گنگا دھر
۷۳۔ محمد قمر الدین
۷۵۔ جوزف
۷۷۔ محمد یونس
۷۸۔ وی نرسا ریڈی
۸۰۔ ہنمنتو
۸۳۔ ویریا
۸۴۔ نرسنگ راؤ
۸۵۔ راؤ صاحب پٹیل
۸۶۔ کے نرسواں ریڈی
۸۷۔ شیخ امام
۸۸۔ سید ہاشم علی
۹۰۔ بھیملہ

مرکز جونیر سرٹیفائیڈ اسکول

(کامیاب بہ امتیاز)

۹۳۔ سید غوث
۱۰۹۔ سردار

(کامیاب)

۹۲۔ محمد معین الدین
۹۴۔ غوث محی الدین
۹۵۔ محمد صالح
۹۷۔ محمد لطیف
۹۸۔ معین بیگ
۹۹۔ محمد حسین خاں
۱۰۱۔ ممتاز علی
۱۰۲۔ شفیق حسین
۱۰۴۔ سید سرور الدین
۱۰۵۔ عبد الغنی
۱۰۸۔ وارث علی

مرکز نرمل

(کامیاب)

۱۱۲۔ ابو النصر سید نقی اسعد
۱۱۳۔ محمد فصیح الدین
۱۱۵۔ سید خلیل احمد
۱۱۷۔ یوسف خاں
۱۱۸۔ نذیر احمد خاں
۱۱۹۔ زبیدہ بیگم
۱۲۰۔ خورشید شہزادی
۱۲۱۔ ساجدہ سلطانہ
۱۲۲۔ عصمت بانو
۱۲۳۔ صفیہ سلطانہ

محمد اکبر الدین صدیقی
سعادت نظیر
وقار خلیل

نقد و نظر

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں ۔۔ ادارہ)

گلمپسز آف اردو لٹریچر

نظام الدین ایس گوریکر پروفیسر سینٹ زیویرس کالج بمبئی۔ صفحات (۷۳)
ناشر: ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، دہلی، کلکتہ، مدراس۔

یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو پروفیسر صاحب کے چار لکچروں کا مجموعہ ہے۔ نہایت نفیس اور دبیز کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ ان لکچروں کے عنوانات ہیں ۔۔

۱۔ اردو کا آغاز اور ارتقاء　۲۔ اردو ادب غدر کے بعد　۳۔ ادب مابعد جنگ　اور ۴۔ ادب آزادی کے بعد

ان عنوانات کے تحت مختصراً ادب کی رفتار بیان کی گئی ہے۔ آغاز و ارتقاء میں میرانجی شمس العشاق کی کتابوں کے نام "جلترنگ" اور "گل باس" دئیے گئے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شمس اللہ قادری کی کتاب اردوئے قدیم سے یا پھر اسی حوالے سے رام بابو سکسینہ نے اسی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اگر اس کی بجائے تاج الحقائق (سب رس) کا ذکر کیا جاتا تو بہتر تھا کہ یہ کافی ضخیم ہے اور اپنے دور کی صحیح نمائندگی کرتی ہے اس لئے کہ جلترنگ اور گلباس کا اب تک کسی کتب خانے میں پتہ نہ چل سکا۔ برہان الدین جانم کی کتاب "کلمۃ الحقائق" راقم الحروف نے مرتب کی ہے اور ادارۂ ادبیات اردو سے شائع ہو چکی ہے۔ مرتب نے نہایت ہی مختصر اور جامع و مانع انداز میں اردو کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی ہے اور انگریزی داں طبقہ کیلئے جو اردو ادب سے ناآشنا ہے نہایت ہی کارآمد اور مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

(ا۔ص)

۲۔ پاکستان کی بساط سیاست

خواجہ غلام محمد۔ دہلی۔ صفحات (۱۹۱)۔

مصنف کا کہنا ہے کہ ہندوستانیوں کو پاکستان کے صحیح خدوخال معلوم نہیں ہوتے اور اخبارات جو کچھ ظاہر کرتے ہیں ان میں تسلسل قائم نہیں رہتا۔ (۲) لئے مصنف نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ پاکستان اپنے قیام کے بعد کن حالات سے دوچار ہو رہا ہے اس کا صحیح منظر سامنے آجائے۔ کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں سیاست کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اخبارات کے اقتباسات بطور ضمیمہ دئیے گئے ہیں۔ پاکستانی سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

(ا۔ص)

جذبات نادر معہ مثنوی لالہ رخ

مرتبہ، ممتاز حسن۔ ناشر: اردو اکیڈیمی سندھ۔ کراچی۔ ... صفحات (۳۴۹) مجلد مع گردپوش۔ کاغذ نفیس۔ ٹائپ کی طباعت۔ قیمت ... روپے۔

نادر کاکوروی اردو شاعری میں نئے تجربات کرنے کی بناء پر بیسویں صدی کی ابتدائی ربع صدی میں بہت مقبول شاعر رہے تھے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی طرح نادر کی موت بھی عین عنفوان شباب میں واقع ہوئی اور ان دونوں شعرائے اردو کے

دامن کو بہت کم وقت میں نئی نئی بحروں اور نئے افکار و تصورات سے روشناس کیا۔ ترجمہ کرنے میں انھیں بڑی مہارت تھی۔ ابتدائی ربع صدی کی درسی کتابوں میں ان کی اکثر و بیشتر نظمیں شریک نصاب رہی ہیں۔ ان کا کلام شائع بھی ہوا ہے مگر اب نایاب ہو چکا ہے۔ اردو دنیا کو ترقی اردو بورڈ کا ممنون ہونا چاہئیے کہ اس نے ممتاز حسن صاحب سے ان کا جملہ کلام مرتب کروا کر شائع کیا ہے۔ مثنوی لالہ رخ بھی شامل ہے جو تھامس مور کی نظم "لائٹ آف دی حرم" کا کامیاب ترجمہ ہے اور یہ مثنوی بھی نایاب ہو چکی تھی۔ شائقین ادب کے لئے یہ ایک گرانقدر تحفہ ہے۔

(ا۔ ص)

۴۔ عظمتِ رفتہ

مولفہ ضیاء الدین احمد برنی۔ ناشر تعلیمی مرکز کراچی ۱۔ دیدہ زیب ٹائپ کی طباعت۔ سائز ۱/۱۶ کراؤن۔ صفحات (۵۱۲)۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دس روپے۔

ضیاء الدین احمد برنی ملک کے ان مشہور صحافی اور ادیبوں میں ہیں جنہوں نے جنگ آزادی میں گرانقدر حصہ لیا۔ مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" میں کام لیا۔ کچھ دنوں تعلیمات میں ملازم رہے اور پھر دارالترجمہ حکومت بمبئی میں سینیر اردو مترجم رہے اور وہیں سے وظیفہ حسن خدمت پر علحدہ ہوئے۔ دکن کرانیکل میں کتابوں پر تبصرہ کرتے رہے اور آجکل کراچی سے کتابی دنیا نکالتے ہیں۔

برنی صاحب جہاں دیدہ اور جہاں گرد ہیں۔ ان سے جن عظیم المرتبت شخصیتوں سے سابقہ رہا ان کی زندگی کے اہم نقوش کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس میں ترانوے شخصیتوں کے حالات ہیں۔ ان میں ادب اور سیاست کی معروف ہستیاں بھی ہیں اور وہ قدرے غیر اہم لیکن بلند کردار شخصیتیں بھی ہیں۔ اول الذکر میں علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، میر باقر علی داستاں گو، جالب دہلوی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، سراج الدین سائل، ذکاء اللہ، حالی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، نذیر احمد، سید احمد دہلوی، آصف علی، بیخود دہلوی، اجمل خاں، وقار الملک، حسرت موہانی، پریم چند، جگر، ظفر علی خاں، سالک، شبلی، اقبال، عبداللہ بریلوی، مولانا آزاد، مہاتما گاندھی، قائد اعظم جناح وغیرہ ہیں۔ ان کی زندگی کے اکثر خدو خال کو برنی صاحب نے نہایت فنکارانہ طریقہ پر اجاگر کیا ہے اور چونکہ ایک دیرینہ اور تجربہ صحافی اور ادیب کے تجربات ہیں اس لئے نہایت دلکش اور دلفریب اور معلومات آفریں ہیں۔ کوئی کتب خانہ اس سے خالی نہ ہونا چاہئیے اور ادب سے ذوق رکھنے والے ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔

(ا۔ ص)

۵۔ اسرارِ کائنات

مصنف: ڈاکٹر سید اختر احمد۔ قیمت ۱۲/۔ ناشر: شعبۂ ادب پالی اسٹڈی سرکل حیدرآباد۔ ملنے کا پتہ: مصنف، منڈی میر عالم روڈ، حیدرآباد ۲۔

آج کی دنیا بڑی ہی مصروف دنیا ہے۔ کسی کو اتنی فرصت ہے نہ دلچسپی کہ وہ بالاستیعاب اور بہ امعان نظر ضخیم ضخیم کتابوں کا مطالعہ کر سکے اور زندگی کی ہماہمی سے جو کچھ بھی وقت مل سکے اس کو خشک اور مسائلی موضوعات کی نذر کر دے۔ البتہ دلکش پیرایے میں لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے مضامین ناگوار خاطر نہیں ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے انھیں امور کا لحاظ ملحوظ رکھتے ہوئے "اسرار کائنات" کو خوبی اور سلیقہ سے تصنیف کیا ہے جو نہ صرف مختصر بلکہ مفید بھی ہے۔ اس میں یہ واضح کیا ہے کہ دنیا جس راہ پر گامزن ہے وہ امن سوز "مہذب بربریت" اور انسانیت فروشی جیسے بھیانک عناصر سے بنی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک پروگرام بھی پیش کیا ہے جس کو اگر عملی جامہ پہنا دیا جائے تو کیا عجب ہے کہ ہر شعبۂ حیات منور ہو جائے۔ اس کتاب کی افادیت کے پیش نظر "ترقی اردو بورڈ حکومت آندھرا پردیش" نے مصنف کو ۱۹۶۱ء کی اپنے موضوع کی بہترین کتاب قرار دے کر انعام سے نوازا ہے۔

(س۔ ح)

اعجاز القرآن محمد افضل شریف ایڈیٹر "دیدار" یوسف پل سکندرآباد دکن۔

یہ ایک مختصر سا سو صفحات کا رسالہ ہے جس میں فاضل مولف نے قرآن کی مختلف خصوصیتوں کا اظہار کیا ہے۔ عیسائیوں اور ہنود کی مقدس کتابوں میں قرآن کے نزول کے بیانات کا اظہار ہے اور وہ تمام علوم جنھیں آج سائنسی علمی اور ادبی سمجھا جاتا ہے ان کے قرآن میں موجود ہونے کا ذکر ہے۔ عربی حروف کا شکلی یا صورتی تجزیہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دوسری زبانوں کے حروف اسی کی متبدلہ شکلیں ہیں اور اس طرح قرآن کے اعجاز کو ثابت کیا ہے۔ زبان نہایت عام فہم اور سلیس ہے اور چونکہ فاضل مولف کی ساری زندگی تبلیغ دین میں بسر ہوئی ہے اس لئے انداز تفہیم پُر اثر ہے۔ کتاب لائق مطالعہ اور قابل داد ہے (ا۔ ص)

ثریٰ و ثریا نواز جعفری۔ ناشر: ادارۂ ادب و دانش بمبئی۔ سائز ڈمی۔ صفحات (۱۹۶) مجلد مع گرد پوش۔ قیمت: للعہ

یہ نواز صاحب کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ غزلیں اکثر طویل ہیں اس لئے آمد سے زیادہ آورد اور قافیہ پیمائی کی کوشش نظر آتی ہیں۔ غالب کی غزلوں پر غزلیں کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اسی زمین میں ایسی غزلیں پڑھنا قلب و نظر کے لئے بار گراں معلوم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں زبان کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً تیسرے صفحہ پر ایک مصرعہ ہے ؎ تمہارا سا چالاک و عیار ہوتا۔ تم سا کی جگہ تمہارا سا استعمال کرنا زیادتی ہو جیسے صفحے پر بچپن کی جگہ بچپنا استعمال کیا گیا ہے۔ فصحا کے نزدیک یہ غیر مستعمل ہے۔ اس غزل میں پایاب کو پائیاب باندھا ہے اور اس کا ہم قافیہ حق آب استعمال کیا ہے۔ ایک مصرعہ ہے ؎ باغبان گلشن ہے بلبل نے ترا کیا لے لیا۔ آپ کا کیا گیا اور تمہارا کیا لیا۔ محاورہ ہے "لے لیا" غیر مستعمل ہے۔ اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو اور بھی مثالیں مل سکیں گی۔ فاضل شاعر اگر اپنے شعر کو پوری جانچ پڑتال کے بعد مجموعہ میں شریک فرماتے تو بہتر ہوتا۔

فغان اردو ایک مسدس کا عنوان ہے اس میں شاعر نے جس جوش اور جذبہ سے اظہار خیال کیا ہے قابل تعریف ہے۔ اور بھی نظمیں ایں جن میں جوش ہے ولولہ ہے۔ پند و نصیحت ہے لیکن زبان پر قدرت کہیں کہیں کھٹک جاتی ہے۔ (ا۔ ص)

بہار غزل عابد مناوری۔ ناشر مکتبہ اردو ادب جموں۔ صفحات (۹۶)۔ مجلد معہ گرد پوش۔ قیمت ۲ روپے

عابد صاحب حضرت جوش ملسیانی کے شاگرد رہے ہیں اور حضرت مخدوم کی عنایتوں سے بھی سرفراز۔ قدرت نے شعر گوئی کا ذوق بھی عطا کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں دلدوز اور اثر انگیز اشعار کہہ گزرتے ہیں۔ سادگی و پرکاری کی جگہ جگہ مثالیں ملیں گی اور زبان پر عبور اور دسترس کے نمونے ہر غزل میں نظر آئیں گے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چلو، چھوڑو، نہ کھاؤ اور قسمیں — یقیں لائے تمہاری بات پر ہم
قدم چومے ہیں آکر منزلوں نے — رہے کچھ اس طرح گرم سفر ہم
آپ ناراض کس لئے ہیں — ہم سے کیا بھول ہو گئی ہے
ذکر تو آپ کا نہیں تھا — بات میں بات آ گئی ہے
جلوہ فرما ہے بام پر کوئی — چاند تاروں میں روشنی کم ہے
جس طرف بھی نگاہ اٹھی ہے — تیری صورت مجھے نظر آئی
لذت انتظار کیا شے ہے — یہ کسی بے قرار سے پوچھو
جو کسی کی برائی کرتا ہے — کبھی اس کا بھلا نہیں ہوتا
سارے عالم کو بیوفا نہ کہو — ہر کوئی بے وفا نہیں ہوتا

ایسے کئی اشعار اس چھوٹے سے حسین مجموعہ میں ملیں گے۔

ہم بھی حضرت جوش ملسیانی کے ہمنوا ہو کر کہتے ہیں کہ ـــــ " یہ مجموعہ دنیائے ادب اردو میں حسن قبول کی دولت سے مالا مال رہے" (ا۔ص)

تقویۃ الایمان مع تذکیر الاخوان

مولفہ علامہ شاہ محمد اسمٰعیل شہید۔ ناشر: نور محمد کارخانہ تجارت کتب۔ آرام باغ کراچی
صفحات ۵۲۰۔ مجلد مع گرد پوش قیمت: آٹھ روپے۔

یہ کتاب اصل میں کئی کتابوں کا مجموعہ ہے۔ تقویۃ الایمان کے علاوہ اس میں نصیحۃ المسلمین مولفہ خرم علی بلہوری۔ عقاید نامہ حضرت شیخ عبدالحق محدث۔ فتاویٰ در مسئلہ علم غیب۔ صارق الاشرار مولفہ شیخ نعم اللہ۔ رسالہ سعادت دارین در رد شرک و بدعت مولفہ محمد سعید اللہ عثمانی بدایونی۔ نظم گناہ کبیرہ از مولانا رفیع الدین شامل ہیں۔ یہ کتاب اسلامی غوامض و نکات کو سمجھنے کے لئے مفید ہوگی۔ اس میں ان تمام مشرکانہ خیالات اور رسوم و بدعات کو ظاہر کیا گیا ہے جس سے ایمان کی بنیادیں متزلزل ہوتی ہیں۔ اس کے مصنفین علمائے وقت رہے ہیں۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگیاں خدمت اسلام کے لئے وقف کی ہیں۔ (ا۔ص)

انتقاد

پروفیسر سید عابد علی عابد۔ ناشر: ادارۂ فروغ اردو لاہور۔ مجلد مع گرد پوش۔ صفحات ۲۴۸۔ قیمت ستے

یہ پروفیسر صاحب کے دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں چار مضامین علامہ اقبال سے متعلق ہیں۔ ایک میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کی غایت بتلائی ہے لیکن " ارباب نثر اردو" میں کوئی خاص اضافہ نہیں۔ دبیر کی حیات کے تعلق سے ایک مضمون ہے اور انتقاد منصب اور سخن فہمی دو اور مضامین ہیں۔ فن تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کتاب مفید ہو گی۔ (ا۔ص)

ادبی اشارے

ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ ناشر: نسیم بک ڈپو، لکھنو۔ مجلد مع گرد پوش۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت

یہ ڈاکٹر صاحب کے علمی اور ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مختلف شاعروں اور ادیبوں اور موضوع پر بارہ مضامین ہیں۔ حالی، مولوی عبدالحق، آزاد، پریم چند، فراق، شبلی، سودا اور ذوق بہ حیثیت قصیدہ گو اور جوش پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اعلیٰ جماعتوں کے طلباء کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ (ا۔ص)

آغوش گل (تذکرۂ شعرائے شملہ)

مرتبہ: راجندر ناتھ رہبر (ایم۔ اے)۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔
ناشر: بزم ادب شملہ۔ بالتصویر خوبصورت کارڈ بورڈ سرورق۔ ملنے کا پتہ: انڈین بک ڈپو۔ دی مال۔ شملہ ۱ (پنجاب)

" بزم ادب شملہ" گذشتہ تین چار سال سے سرگرم عمل رہی ہے۔ اس بزم کے بائیس شعرا کا منتخب کلام، مختصر حالات زندگی اور ہلکے پھلکے تبصرے کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اردو میں شعر کہنے والے یہ سب کے سب ہندو شعراء صاحبان ہیں اور بقول مرتب ان میں سے اکثر شعراء ملازمتوں سے وابستہ رہ کر بھی شعر و سخن کی شمعیں جلائے ہوئے ہیں۔ شملہ کے مشہور اور ابھرتے ہوئے شعراء میں کل کرشن اشک، تیر، رہبر، ترخین سنگھ تسنیم وغیرہ کے نام آتے ہیں جن سے اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ " آغوش گل" ایسا گلدستہ ہے جس میں اردو شاعری کے سرسبد نمونے ملتے ہیں۔ راجندر ناتھ رہبر نے اس انتخاب کلام کو سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ (و۔ح)

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

سنہ اجرا:- ۱۹۳۸ء   فون نمبر:- ۵۲۰۹

جلد ۲۵- شمارہ ۵ و ۶   مئی و جون ۱۹۶۲

ماہنامہ

سب رس

امجد نمبر

نگران

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

قیمت سالانہ ہند و پاک سے چھ روپے   ششماہی تین روپے   غیر ممالک سے دس روپے   خاص نمبر دو روپے

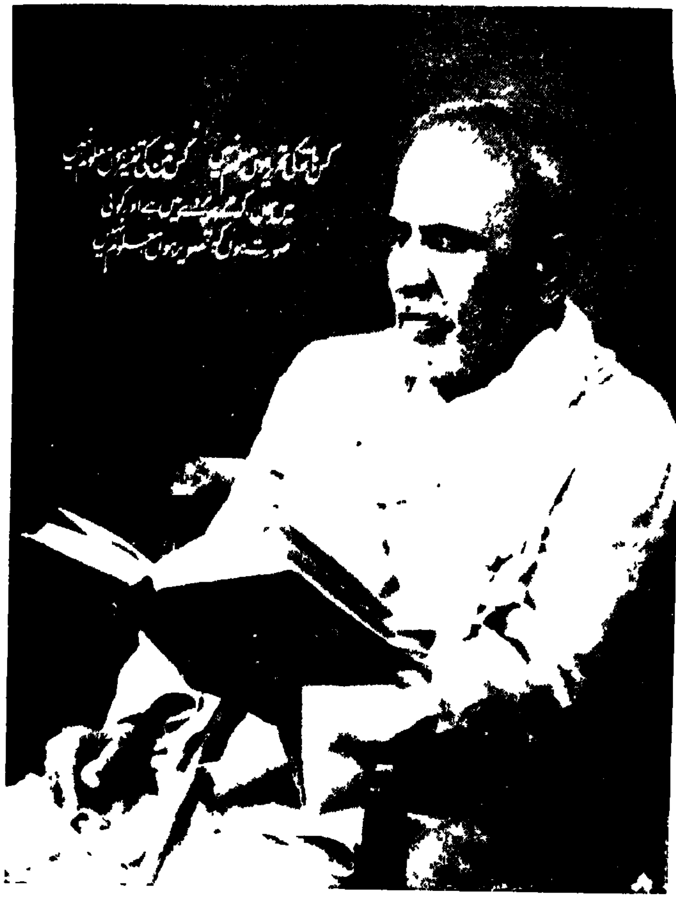
اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار میں چھپا اور دفتر سب رس ایوان اردو، خیریت آباد
حیدرآباد دکن ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

مضامین

نظمیں

مادہائے وفات



امجد مطالعۂ حیات
(۱۹۵۸ء)

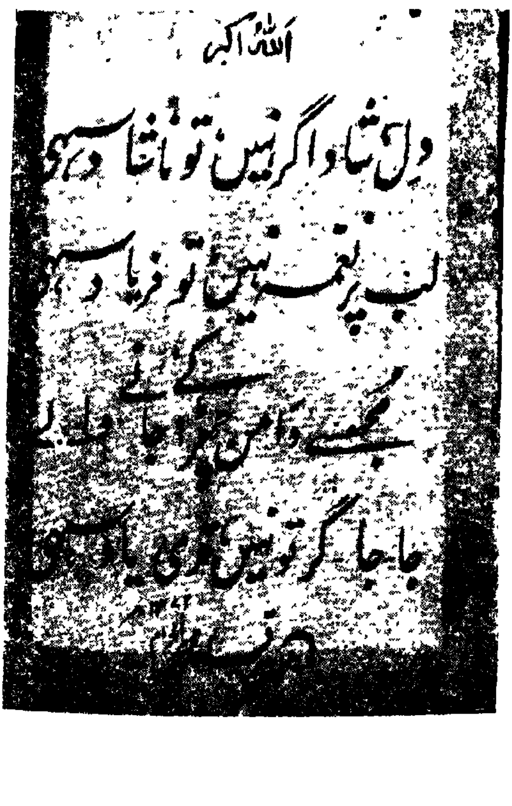


خواجہ حمید الدین شاہد، امجد، جگر



حضرت امجد، ایوان اُردو کا سنگ بنیاد رکھے جانے کی تقریب میں (۱۹۵۵ء)

عکس تحریر حضرت امجد



اللہ اکبر

دل شاد اگر نہیں تو ناشاد سہی
لب پر نغمہ نہیں تو فریاد سہی
مجھ سے دامن چھڑا کے جانے والے
جا جا اگر تو نہیں تری یاد سہی



تہدیہ

حکیم الشعراء حضرت سید احمد حسین امجدؔ حیدر آبادی رحمتہ اللہ علیہ اُردو دُنیا میں صاحبِ رباعیات اور سرمدِ ثانی کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے اعتراف خدمات میں ادارۂ ادبیات اُردو نے آج سے سات سال پیشتر ۳۱ جنوری ۱۹۵۵ء کو جشن الماسی منایا۔ اور اُن کے حضور میں سپاس نامہ اور کیسۂ زر پیش کیا تھا۔ اس تقریب کی تفصیلات سب رس کے امجد نمبر اور پھر کتاب " ارمغانِ امجد " میں شایع کی گئی تھیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو نے جہاں حضرت امجدؔ کو زندگی ہی میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، وہیں اب جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں ادارہ کی طرف سے ایک بار پھر ہم ان کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ اُن کی زندگی مسلسل جد و جہد سے عبارت رہی، دمِ آخر تک انھوں نے نثر نظم کے ذریعے اُردو کے گیسو سنوارے اور اُردو کی صوفیانہ شاعری کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

ایک آفتابی کرن جو زندگی کی گوناگوں مشکلات میں خواہ وہ ادب کی ہوں یا اخلاق و کردار کی ہوں یا مذہب کی گم راہوں کے لئے چراغِ راہ تھی آج روشن نہیں ہے اور اب ان کی نثری تصانیف اور کلام کے مجموعے ہمارے لئے مشعلِ راہ بن گئے ہیں بقول امجدؔ ؎

ہم سے دامن چھڑا کے جانے والے ؛ جا، جا گر تو نہیں، تیری یاد سہی

صاحبِ رباعیات کے حضور میں یہ چند مضامین اور شعراء کے افکار کا کشکول پیش ہے۔ ہم نے اس امر کی امکانی کوشش کی ہے کہ حضرت امجدؔ کی زندگی اور ان کے فن کی تہہ در تہہ قدریں مختلف مضامین، نظموں اور تصویروں کے ذریعہ پڑھنے والوں پر آشکار ہو جائیں۔

ہمارے مضمون نگاروں میں حضرت امجدؔ سے قریبی ربط رکھنے والے اور عقیدتمند بھی ہیں۔ دُور سے دیکھنے والے بھی اور بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے انھیں صرف کلام کے آئینہ میں دیکھا ہے۔ اس طرح مختلف نقاط نظر رکھنے والے حضرات کے مضامین کا مطالعہ ہمیں امجدؔ کی صحیح قدر و قیمت کی تعین میں مدد دے گا۔

(ادارہ)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

حضرت امجد علیہ الرحمہ

حکیم الشعراء حضرت امجد علیہ الرحمہ کی وفات کی خبر یوں تو اردو دنیا میں غم و الم کی لہر دوڑا دیگی ۔ لیکن حیدرآباد سب سے زیادہ اس صدمہ سے متاثر ہوا ہے اور اس کو ہونا بھی چاہیے ۔ حضرت امجد اسی شہر کی خاک سے اٹھے تھے ۔ موسی ندی کے کنارے محلہ چھپا دروازہ کی ایک گلی میں چار محل کے نشیب کے قریب وہ ایک غریب ماں کے بطن سے پیدا ہوئے اور وہیں کے شریف خاندان بچوں میں پرورش پائی اور انہی کے ساتھ مدرسہ دار نظامیہ میں تعلیم کے لیئے داخل ہوئے ۔ یہ مدرسہ بھی اس زمانے میں چھپا دروازے کے راستے سے شہر میں داخل ہونے والی گذرگاہ کے قریب ایک مسجد سے متصل واقع تھا ۔ یہ چھوٹی سی مسجد تو اب بھی موجود ہے ۔ مگر وہ گھر جس میں حضرت امجد پیدا ہوئے تھے اور وہ گلیاں جن میں ان کی ابتدائی زندگی گذری ۔ وہ موسی کی مشہور طغیانی کے نذر ہو گئیں اور ان کی جگہ اب سٹی کالج کی عمارت بن گئی ہے

مدرسہ نظامیہ کے بعد حیدرآباد کی مشہور و فاق درس گاہ دارالعلوم میں شرکت کی اور وہیں سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کر کے فارغ التحصیل ہوئے ۔ اور پھر وہیں استاد بھی بن گئے ۔ ان کے تحصیل علم کا شوق اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سالار الملک آغا شوستری کے گھر جو ان کے مکان سے آٹھ میل دور کوہ مولی کے دامن میں واقع تھا ۔ روزانہ پیدل جاتے تھے ۔ اس زمانہ میں حیدرآباد مشرقی علم و فضل کا حقیقی مرکز اور تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ تھا اس کا ہماری نئی نسل تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں ۔ سالار الملک آغا شوستری مولوی الہی بخش علامہ حبیب ابوبکر بن شہاب علامہ نادر الدین مولانا سید اشرف شمسی غرض بیسوں ایسے حضرات حیدرآباد کے گلی کوچوں میں موجود تھے ۔ جن کے علم و فضل کے تذکرے کتابوں میں تو موجود ہیں مگر ہم ان سب کو بھول چکے ہیں اور موجودہ تعلیم یافتہ احباب تو ان کے تبحر علمی اور اخلاق کی پاکیزگی کا اندازہ بھی نہیں کر سکیں گے ۔ اس لیئے صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ حضرت امجد کی نشو و نما جس ماحول میں ہوئی تھی وہ نمائش و آرائش دولت و ثروت اور جاہ و جلال سے کوسوں دور تھا ۔ وہ نہ حیدرآباد کے پشتینی جاگیردار و منصبدار تھے ۔ اور نہ کسی خاندان رشد و ہدایات کے چشم و چراغ ۔ اس طرح کی سرمایہ داری سے عاری اور آجکل کی اصطلاح میں صحیح معنوں میں ایک پرولتاری تھے ۔ مزدوروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے ۔ چنانچہ جب تک قوی ساتھ دیئے بازار سے خود ہی گوشت اور بھاجی ترکاری تک خرید کر لاتے ہے ۔

دارالعلوم کی مدرسی کے زمانہ میں حضرت امجد حیدرآباد کے ایک مشہور مشائخ خاندان کے چشم و چراغ حضرت حسینی علیہ الرحمہ کی تعلیم اور اتالیقی کی خدمت پر مامور ہوئے اور مدرسہ کے قریب انہیں کے مکان کے ایک کمرے

میں فروکش تھے۔ اس لیے کہ اس سے قبل چھپا دروازہ کی تیاریگاہ کے ساتھ ان کے اہل خاندان بھی دریا برد ہو چکے تھے۔ اور خود وہ تنہا زندہ بچ گئے تھے۔ اسی سانحے نے ان کو زندگی کی ایسی منزل پر لا کھڑا کیا جہاں سے خیراتی اور خیرات علی کی بجائے احمد حسین امجد بن گئے اور وہ مجد و شرف ان کو نصیب ہوا جو اللہ تعالیٰ جن کو چاہتے ہیں اسی کو عطا فرماتے ہیں۔

مجد و کمال کی اس معراج پر پہونچنے کے لیے حضرت امجد کو جن منزلوں سے گذرنا پڑا ان میں علامہ نادرالدین کی دختر نیک اختر بی بی جمال النساء سلمیٰ کی مناکحت اور فیض صحبت بھی شامل ہیں چنانچہ اس موضوع پر خود انہوں نے ایک دلچسپ کتاب "جمال امجد" لکھی ہے اور اسی سے دنیا کو معلوم ہو سکا کہ امجد کو حکیم الشعرائی کے رتبے پر فائز کرنے والی دراصل وہی لایق و فاضل اور صاحب تصوف و عرفان خاتون تھیں۔ انہی کے ساتھ انہوں نے سفر حج بھی کیا تھا جس کی پُر اثر داستان انہوں نے اپنی کتاب "حج امجد" میں بیان کی ہے۔ مگر افسوس امجد کے دل کو ایسا لگا کہ وہ سوز و گداز کا ایک سراپا ہو کر بیکل بن کر رہ گئے اور اپنے قلب و دماغ کی تسلی و تسکین کے لیے خوش بختی سے انہی راستوں میں گامزن ہو گئے جن کی طرف علامہ نادرالدین کی اس صاحب بصیرت دختر خوش سیرت سے ان کی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ وہی راستے تھے جن پر کسی نہ کسی طرح حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ بھی گامزن ہو گئے تھے اور جنہوں نے کلام اقبال کو شہرت دوام سے سرفراز کیا تھا۔

سعدی کی نظم و نثر مولانائے روم کی مثنوی، احادیث نبوی اور کلام الٰہی وہ ماخذ ہیں جو کائنات کی دوامی اقدار سے متعلق رکھتے ہیں اور دنیا کا کوئی انقلاب ان کی قدر و قیمت کو مٹا نہیں سکتا۔ درویشی اور قلندری کی دولت میں نہ کسی پنج سالہ و دہ سالہ منصوبے کے ذریعے سے اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو صرف کرنے والا کبھی مفلس ہو سکتا ہے یہ روح اور دل کی دولت ہے اور خدا کرے کہ آج کل کی دنیا کی ترقی یافتہ حکومتیں جو بڑے بڑے پروجکٹ اور کروڑوں روپے کے پلان بنا رہی ہیں کم از کم ان کی تکمیل کے بعد تو یہ دولت اطمینان خاطر اہل عالم کو حاصل ہو سکے۔

حضرت امجد کو ایک وقت حکومت آصفی کے سپہ سالار افسر الملک نے یاد فرمایا۔ ان کی کوٹھی راحت منزل جو کہنگی اور شکستگی کے عالم میں اب بھی سیف آباد میں اپنی عظمت رفتہ کا ماتم کر رہی ہے اس وقت سامان عیش و عشرت کی افراط اور نت نئے اسباب زندگی کی دلآویزی اور بہتات کے باعث ایک عصری نمائش گاہ سے کم نہ تھی۔ جب حضرت امجد نے دیکھی اور سراپا شرف و کمال امیر افسر الملک سے تبادلۂ خیال کیا تو اس رباعی میں اپنا تاثر ظاہر کیا تھا۔

دیوڑھی نہیں در نہیں کہ دربان نہیں ؎ بلبل نہیں گل نہیں کہ بستان نہیں
ہے جمع جہاں بھر کا ساماں گھر میں ؎ خاطر جمعی کا کوئی ساماں نہیں

اس طرح ارباب شعر و سخن کے لیے بھی ایک پتے کی بات لکھی ہے۔ بہت سے شاعر اور ادیب ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں اور دوسرے کی عزت اور شہرت اور مقبولیت کا راز معلوم کرتے اس میدان میں اس سے بڑھنے کی صالح کوشش کرنے کی جگہ غیبت، بدگوئی، منافقت، سازش اور طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہو کر آخر کار ہم چشموں میں ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ اگر حضرت امجد کی یہ رباعی سمجھنے کی کوشش کریں تو بہت سی ذہنی اور اخلاقی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے ۔ مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر باعتبار فن خوب کہا ۔ لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

حافظ نے "قبول خاطر و لطف سخن خداداد است" کو ندان تو جملۂ دا مند کی طرح ظاہر کیا تھا مگر امجد نے سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دی ہے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ محض اعتبارات فن کی تکمیل اور چالاکی و چابکدستی اور سازشیں کافی نہیں ہیں سوز و گداز، خلوص اور نیک نیتی ہی وہ اجزا ہیں جن سے بقول حالی شعر و ادب میں تاثیر پیدا ہو سکتی ہے۔

اس قسم کی غلط کوششوں کو امجد اور طرح سے بھی واضح کرتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں ۔ پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز ۔ کرتے ہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

گویا اعتبارات فن کی تکمیل نماز پڑھ لینا ہے جو دوا کھانے کے برابر ہے مگر بد نیتی اور جھوٹے اقتدار و شہرت کی خاطر سازشیں اپنے حرام لقمے ہیں اور بد پرہیزی ہیں جو دوا کا سارا اثر زائل کر دیتے ہیں اور ادیب و شاعر کی کاوشوں کو اثر اور دوامی مقبولیت سے محروم کر دیتے ہیں۔

یوں تو حضرت امجد کی اکثر رباعیات نثر و نظم قرآن و حدیث کی شرح ہے مگر بعض جگہ ان کی شرح اس خوبی اور ندرت کے ساتھ اصل کی وضاحت کرتی ہے کہ وہ مشہور فارسی مقولہ یاد آتا ہے۔

شاعری جزویست از پیغمبری

قرآن شریف میں ایک جگہ درج ہے کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں زمین اور پہاڑوں کے آگے پیش کی۔ اس کو اٹھانے سے انہوں سے انکار کیا مگر انسان نے اٹھا لیا۔ تحقیق کہ وہ جاہل تھا اور اپنے آپ پر اس نے ظلم کیا۔

اس خیال کو حضرت امجد نے اپنی ایک رباعی میں اس طرح آگے بڑھایا ہے کہ ؎

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے ۔ کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی جاہل سہی نادان سہی ۔ سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

سچ تو یہ ہے کہ جیسا میں نے ان کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقعہ پر کہا تھا حضرت امجد کے کلام میں انسانی فطرت کی بوقلمونیاں جبر و اقتدار کی چیرہ دستیاں اور حقائق و معارف کی مؤثر گلکاریاں اس لطافت سے جھلکتی رہتی ہیں کہ پڑھنے والا زندگی سے گریز کرنے کی جگہ ایک ایسی اونچی سطح پر پہونچ کر اس سے نبرد ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ جس کے بعد زندگی کے نشیب و فراز ہی باقی نہیں رہتے اور پھر خوبی یہ ہے کہ ان کے کلام کے مطالعہ سے یک گونہ خود اعتمادی تو پیدا ہوتی ہے مگر وہ جارحانہ تیور نہیں ابھرتے پاتے جن کو بعض جدید شعرا کا کلام ابھارتا ہے۔

حضرت امجد کے کلام سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کی ہم پلہ بن گئی بلکہ حیدرآباد کی عزت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا جس پر یہاں کے سہنے بسنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ گذشتہ دو صدیوں میں وہی ایک ایسے منفرد شاعر دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ جن کا احترام پوری اردو دنیا میں کیا گیا اور جن کی ہندوستان گیر شہرت ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ثابت ہوئی۔

حمید عظیم آبادی

حضرت امجدؔ میری نظر میں

مقیم حلقۂ ذکر است دل بدان امید ؏ کہ حلقۂ ز سرِ زلفِ یار بکشاید

شاعر ہو یا ادیب اس کی ذمہ داریاں گوناں گوں اور اس کے فرائض بہت ہی اہم اور نازک ہوتے ہیں۔ اہم اس لیے کہ اسے دل و دماغ کی الجھی گتھیوں کی گرہ کشائیاں کرنی پڑتی ہیں۔ یعنی وہ دل و دماغ کی جذباتی اور ذہنی فضاؤں کو ہموار کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور نازک اس لیے کہ ذرا سی قلم کی لغزش اور کجروی کتنے رہروانِ راہِ سخن کو منزل سے بھٹکا کر گمراہ کر دیتی ہے اور فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ میں وہ ٹھوکریں کھاتے اور وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر معاشرے کا مجلّیٰ آئینہ ہوتا ہے جس میں معاشرے کے خدوخال بہ طریقِ احسن دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک حد تک معاشرے کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اسی کے احساس کی یگونہ نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اس کی یہ نمائندگی نہ دنیائے مسرت تک محدود ہوتی ہے اور نہ غمکدۂ حرماں تک۔ وہ صرف کیفیاتِ جمود و قنوطیت کا ترجمان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی قلمرو میں طوفانِ انقلاب بھی شامل ہوتا ہے۔ اس کی نگاہِ بصیرت ہر نشیب و فراز پر ہوتی ہے۔ ہر مرحلے کو وہ پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اور پھر اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر، غور و فکر کی ترازو میں تول کر بازارِ سخن میں پیش کرتا ہے، لہٰذا اس کی تحریر اور اس کے اشعار میں اس کے ماحول کی آواز گونجتی ہوتی ہے۔ لیکن جہاں اس کا موقلم ماحول کی فضاؤں کی مرقع کشی کرتا ہے، وہاں وہ اپنے مخصوص نظریات اور اپنے خاص نقطۂ نگاہ کی بھی تصویر کشی کرتا نظر آتا ہے۔ اگر وہ پروردۂ ماحول ہوتا ہے تو خالقِ ماحول بھی اور یہی شاعر کا سب سے بڑا کارنامہ ہے

شاعر اور ادیب کا فرض جہاں تجزیہ ہے وہاں ترکیہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی قلمرو کے حدود بہت [illegible] ہیں اور اسی لیے معاشرے میں اس کا مقام بہت ہی بلند اور ارفع ہے۔ اس کا شعور بہت ہی بیدار اور حساس ہوتا ہے۔ [illegible] سامعین اور معاشرے کا لحاظ بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے تاکہ وہ ہمدردی اور دل نوازی کے پردے میں اپنا خیال [illegible] دنیا کے اور اپنے درس کو تلخ کام نہ ہونے دے۔ یہ احساس اسے نبض شناسی کے ساتھ ساتھ شیریں گفتار [illegible] بنا دیتا ہے۔ یہ چیز اس کے ذہن کو اور بھی نازک تر بنا دیتی ہے اور وہ زہر کا کام شہد سے لیتا ہے۔ شاعر [illegible] سے راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔ شاعر سب کچھ تشبیہات و استعارات کے پردہ میں کہہ جاتا ہے۔ اور سامعین و قارئین کے دل و دماغ پر رفتہ رفتہ اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور انہیں خبر تک نہیں ہوتی کہ کون سی بات ان سے کس طرح منوائی جا رہی ہے اور کون سا نیا خیال ان کے دل و دماغ پر مستولی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ جذبۂ مدافعت کے بیدار ہونے کا احساس بھی پیدا ہونے نہیں دیتا اور نہ دلائل کے رد کرنے کی طرف ذہن کو متوجہ ہونے کا موقع دیتا ہے۔ وہ کسی کے رونے پر ہنستا نہیں،

بلکہ اس کا شریک غم ہوکر اس کے زخمہائے دل پر سکون کا مرہم رکھتا ہے اور اس طرح وہ اپنا مدعائے دلی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے ؎

مرے رونے پہ تو ہنستا ہے ناصح ٭٭ ترے پہلو میں شاید دل نہیں ہے
(حمید عظیم آبادی)

یہ ہے شاعر اور ناصح کا امتیازی فرق!

زندگی کا کوئی شعبہ اور گلزار حیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ادب و شعر پرتو فگن اور اثر انداز نہ ہوتے ہوں انشراح کے ساتھ ساتھ اصلاح کا خیال بھی لگا رہتا ہے اور یہی شاعری کا مقصد بھی ہے۔ چنانچہ عزیز احمد بی اے آنرز (لندن) "بوطیقا" poetics از ارسطو کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہورس نے جابجا ارسطو کے خیالات سے خوشہ چینی کی ہے ...... شاعری کا مقصد اس نے لطف پہونچانا اور اصلاح کرنا قرار دیا ہے اتفاقی غلطیاں اس کے نزدیک بھی قابل معافی ہیں"

پھر لکھتے ہیں کہ "محض مطالعہ کسی صناع کو صناع نہیں بنا سکتا بلکہ خداداد ذہانت بھی اس کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہی خداداد ذہانت کے مالک ہمارے امجد مرحوم بھی تھے جن کی صرف چند رباعیاں پیش کرکے ان پر کچھ سرسری روشنی ڈالوں گا تاکہ یہ امر واضح ہوجائے کہ امجد مرحوم کتنے بلند پایہ شاعر تھے۔ اور جو ان کے دل میں تھا۔ وہی زبان قلم پر بھی ان کے ہاں عام شاعروں کی طرح دل اور زبان میں تضاد نہ تھا اور یہ ان کی سب سے بڑی صفت اور صداقت کردار کی جلوہ نمائی تھی۔ نہ ان کی ہاں رسمیہ تصنع تھا۔ اور نہ ظاہری نمائش خلوص کے جذبات صداقت کا رنگ لیے ہوئے صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوتے تھے اور اسی لیے وہ سامعین کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ خود بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہم توڑ کے تارے آسمان سے لائے ٭ مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر پہ اعتبار فن خوب کہا ٭ لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

یہی تاثیر شعر کی جان ہے۔ اُن کے ہم مسلک تو درکنار، اس کے مسلک سے اتفاق نہ رکھنے والے بھی ان کے خلوص اور اُن کی صداقت کے معترف تھے اور یہ ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی

اقسام نظم میں رباعی سب سے مختصر بھی ہے اور مشکل ترین بھی۔ ان کے اوزان بھی مخصوص ہیں اور انداز بیان بھی۔ خیالات کی ندرت، بیان کا زور، طرز ادا کی دل کشی، مضمون کی دل آویزی خصوصیات رباعی نگاری میں شامل ہیں۔ جہاں خیالات کا ... اس کی جان ہے، وہاں طرز ادا اور زبان کی سلاست بھی اس کی روح رواں۔ فلسفہ و تصوف، حکمت و اخلاق کے مسائل، دل کش اور دل آویز پیرائے میں بیان کرنا اس کے لوازم میں شامل ہے۔ عشقیہ مضامین بھی اگر ہوں تو خاص انداز میں بیان کیے جائیں۔ جس کی زندہ مثال فارسی میں سرمد کی رباعیاں ہیں اور اردو میں ثانیِ سرمد امجد کی رباعیاں۔ ان تمام لوازم کے ساتھ ساتھ چاروں مصرعے اس طرح دست و گریباں ہوں کہ ایک خوشنما گلدستے کے چار ہر رنگ پھول معلوم ہوں جن کی خوشبو مشام جان کو معطر کرنے والی ہو اور دل و دماغ کو فرحت بخشنے والی، بالخصوص چوتھا مصرع تو کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے جو دلوں پر جاکر بیٹھے اور سامعین کو تڑپا دے۔

تمام اصناف سخن کی جان رباعی ہے۔ قصیدے کی متانت، مثنوی کا تسلسل، غزل کا سوز و کیف، ان سب کا التزام

رباعی میں ضروری ہے۔ وزن عروضی کی قید بند کے ساتھ اختصار اس صنف کا خاص جوہر ہے۔ مختصر یہ کہ رباعی عطر سخن ہے جس میں تمام اصناف سخن کی خوبیاں نچوڑ کر بھر دی جاتی ہیں۔

تواریخ نظم اردو کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اور اصناف شاعری کے ساتھ ساتھ یہ بھی صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوئی اور اردو شعراء نے ہر دور میں کم وبیش رباعیاں کہیں حکیم عمر خیام اور سرمد نے جس طرح فارسی شاعری کے دامن کو اپنی جواہر نگار رباعیوں سے مزین کیا، اردو میں امجد مرحوم سے پہلے کسی شاعر نے اس طرح ہماری اُردو شاعری کی اس صنف خاص کو نہیں نوازا۔

بقول ڈاکٹر اختر اورینوی کہ "اب تک دکن کا قدیم ادبی سرمایہ سب پر بھاری ہے اور اغلب یہی ہے کہ اس کی اہمیت غیر متزلزل ہے" اسی طرح یہ فخر امتیاز بھی حیدرآباد، دکن ہی کے لیے مشیت نے مخصوص کر رکھا تھا کہ اسی سرزمین سے ایک حکیم اور صوفی شاعر پیدا ہوگا۔ جو حکیم خیام اور سرمد شہید دونوں کی ترجمانی اردو میں کرے گا اور اس خاص صنف میں بھی اُردو کو اپنی تہی دامنی کا شکوہ سنج نہ ہونے دے گا۔

آیئے اب ہم امجد مرحوم کی رباعیوں سے لطف اندوز ہوں اور بیان کا حسن کی روشنی میں دیکھیں کہ امجد مرحوم نے گلزار اردو کے دامن میں کیسے کیسے گلہائے سدا بہار کھلائے ہیں کہ جن کی خوشبو تا بقائے عالم مشام جاں کو معطر کرتی رہے گی حکیم خیام کہتا ہے۔

از رفتہ قلم ہیچ دگرگوں نہ شود ٭ وز خوردن غم بجز جگر خوں نہ شود

گر در ہمہ عمر خویش خونابہ خوری ٭ یک قطرہ ازاں کہ ہست افزوں نہ شود

خیام کا یہ جبر اس کے مذہبی اعتقاد پر مبنی نہ تھا بلکہ فلسفیانہ دلائل و براہین پر۔ اس کا یہ عقیدہ اس کی فلسفیانہ تحریر سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ فَلَعَلَّ جَبْرِی اَقْرَبُ اِلَی الْحَقِّ فِی بَادِی الرَّایِ وَظَاهِرِ النَّظْرِ۔

(شاید یہ جبر یہ فرقہ حقانیت سے زیادہ قریب ہو یعنی اُن کی رائے باصواب معلوم ہوتی ہے)

یہ مسئلہ ہمیشہ سے نزاع مذہبی کا سبب بنا رہا۔ کوئی اختیار کا قائل رہا تو کوئی جبر کا۔ میرے استاد مرحوم حضرت شاد اعلی اللہ مقامہ فرماتے ہیں۔

یہ سچ کہ ہجوم کار میں رکھا ہے ٭ یہ جھوٹ کہ اضطرار میں رکھا ہے

قانون میں فطرت کے نہیں جبر روا ٭ سب کچھ تیرے اختیار میں رکھا ہے

اس مابہ النزاع مسئلے پر دیکھئے امجد مرحوم کس طرح روشنی ڈالتے ہیں اور تیسرے مصرع میں کس حکیمانہ اور صوفیانہ انداز میں ترازوں کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھ کر حقیقت حال کا اظہار فرماتے ہیں۔

بے کار ہوں، باکار ہوں معلوم نہیں ٭ نادان ہوں، ہشیار ہوں معلوم نہیں

تقدیر بھی حق، جزائے اعمال بھی حق ٭ مجبور ہوں، مختار ہوں، معلوم نہیں

غزل کا ایک شعر بھی سن لیجئے ؎

ہے حاکم مطلق عقل ایسا پہلو میں دل بیمار بھی ہے ٭ عاشق کی کشاکش کیا کہئے مجبور بھی ہے مختار بھی ہے

(حمید عظیم آبادی)

حضرت امجد کی یوں تو اکثر و بیشتر رباعیاں محاسن رباعی نگاری کی حامل ہیں اور چوتھا مصرع واقعی کڑی کمان کے تیر کی طرح نکلتا ہے اور دلوں میں جا کر پیوست ہو جاتا ہے لیکن کچھ رباعیاں تو ایسی ہیں کہ پڑھئے اور جھومئے اور دیر تک لطف اندوز ہوتے رہئے۔ حکیم خیام کہتا ہے۔

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا است ⁂ تاریک دلم نور صفائے تو کجا است
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی ⁂ این مزد بود لطف و عطائے تو کجا است

اب آپ دیکھئے کہ امجد مرحوم نے اس خیال کو کس کس نیازمندانہ پیرایے میں بیان کیا ہے کہ پڑھ کر دل بے چین ہو جاتا ہے اور آنکھیں پرنم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ یہ کیفیت کسی صاحب دل شاعر ہی کے ہاں پائی جا سکتی ہے۔
فرماتے ہیں سے

مفلس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے ⁂ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
اے تیری رحمت کے بھروسے امجد ⁂ خود آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے — سبحان اللہ!

میدان قیامت میں تماشا نہ بنا ⁂ یا رب مجھے مضحکہ ہر اک کا نہ بنا
جنت کا تری بیاں کیا ہے سب نے ⁂ کل سامنے سب کے مجھے جھوٹا نہ بنا

ناحق پھر پھر کے سر پھیرا یا میں نے ⁂ اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا میں نے
طوفاں میں ہے کشتیٔ امید مری ⁂ لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

ہاتھ اٹھایا میں نے کیا ہی حسین ٹکڑا ہے اور دو دو معنی کا حامل۔ ایک تو یہ کہ دست دعا بلند کیا ہے، تو ہی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ میں اپنی کوشش سے دست کش ہو گیا ہوں، اب تیری مرضی سنبھال یا نہ سنبھال

اس وقت تک کتنے اشعار اثبات خداوندی کے سلسلے میں لکھے جا چکے ہیں لیکن امجد مرحوم کی ذیل کی رباعی کا جواب ہی کچھ عجیب کیفیت کا حامل ہے۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے ⁂ کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم ہی، جاہل ہی، نادان سہی ⁂ سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

یوں تو سارے رباعیاں تو حضرت امجد کے ہاں آپ کو متعدد ملیں گی ایسی شاعری، شاعری نہیں بلکہ عبادت ہے۔ ایسے ہی وزیاض شعراء "تلامیذ الرحمن" کی صف میں آتے ہیں۔
ذیل میں چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں:

تکبیر در عرش ہلاتا ہوں میں ⁂ اللہ غنی کیسے بلاتا ہوں میں
سجدے کے بہانے دل کی بیتابی سے ⁂ قدموں پہ کسی کے لوٹ جاتا ہوں میں — سبحانہ اللہ! کیا کیف وجد ہے!

یہ فکر کسی دماغ سے نکلی ہے ؛ یہ مئی بھی کسی ایاغ سے نکلی ہے
تو نور ہی نور، میں سراپا ظلمت ؛ کالک بھی مگر چراغ سے نکلی ہے

نادانی سے پہلے تو خطا کرتے ہیں ؛ ہٹ کر کے پھر اور بھی برا کرتے ہیں
جب تم سے کوئی گناہ ہو توبہ کر لو ؛ میلے کپڑے کو دھو لیا کرتے ہیں

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے ؛ مانندِ حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس ؛ تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

اسی مضمون کی ایک فارسی رباعی بھی سن لیجئے۔

از دستِ بخیل زر فتادن معلوم ؛ از بطنِ عقیمہ طفل زادن معلوم
از دردِ دل منشاں کام روائی مشکل ؛ از ناخنِ پا گرہ کشادن معلوم

مشدار کہ مرغِ وحشی اندر قفس است ؛ ایں روح بہ جسم چوں صدا در جرس است
اے نفس! نفس مکش بہ ناندیشی ؛ پیراہنِ جاں زتار و پودِ نفس است

کیا ہی درس آموز رباعی ہے۔ ہر ایک سانس ایک بڑا سرمایۂ حیات ہے۔ اس کو ناحق سے ضائع کرنا ہرگز روا نہیں۔ کیا ہی بے پناہ مصرع کہہ دیا ہے کہ ع

وہ پیراہنِ جاں زتار و پودِ نفس است ٭ یہ بیش بہا زندگی اسی سانس کا کرشمہ ہے۔ لہذا ایک ایک سانس کی قدر کرنی چاہیے۔ اور اس کو یادِ الٰہی اور کارِ نیک میں صرف کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو سانس ضائع ہو گئی وہ لوٹ کر نہیں آ سکتی اور اس کی تلافی بھی ناممکن ہے۔

نفس کی آمد و شد پر ہے زندگی کی بنا ؛ سہارے اسی چلتی ہوا کے بیٹھے ہیں

حمید عظیم آبادی

تلوک چند محروم

وہ شاعرِ یادگارِ تہذیبِ کہن ؛ امجد بھی ہوا مقیمِ کنجِ مدفن
امجد کے نام پر رہے گا نازاں ؛ تا روزِ شمار حیدرآباد دکن

پروفیسر سید محمد

امجد جوابِ سرمد

حکیم الشعراء حضرت امجد اُردو کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر ہیں۔ اس صنفِ سخن میں کوئی ان کا حریف اور مدمقابل نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ان کا وہی مقام ہے جو فارسی شاعری کی تاریخ میں حضرت ابوسعید ابوالخیر اور صوفی سرمد کا ہے۔ ان کے ہمعصر تمام بڑے شاعروں اور نقادوں نے ان کے اس بلند مقام کو تسلیم کیا ہے گرامی نے تو اپنی ایک رباعی میں ان کو صاف صاف جوابِ سرمد کہا ہے۔ علامہ اقبال و علامہ علی حیدر طباطبائی علامہ عبداللہ عمادی، پروفیسر وحیدالدین سلیم، اور مولانا سلیمان ندوی جیسی عظیم المرتبت شخصیتوں نے ان کے کمالِ سخن کا اعتراف کیا ہے۔

اردو کا یہ سرمد فطرتاً دلِ درد آشنا اور دیدۂ بینا کا حامل تھا۔ اس پر قدرت نے خوش نوائی کی نعمت عطا کر کے اس کو بلند مقام پر پہونچا دیا جہاں دوسروں کی رسائی ممکن نہیں۔

شاعری کے بارے میں امجد کے جو تصورات تھے وہ خود ان کی شاعری پر صادق آتے ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

شاعری، موسیقی اور مصوری، فنونِ لطیفہ ضرور ہیں۔ مگر نااہلوں نے انہیں کثیف تر بنا دیا ہے۔ مجھ سا بے شعور شعر کہتا ہے۔ ہر فرد گلیوں میں گاتا پھرتا ہے۔ مکتب کے بچے بھی تصویر بناتے ہیں۔ وزن کے اعتبار سے شعر، لحن کے اعتبار سے راگ، آنکھ، ناک کے اعتبار سے تصویر تو ضرور ہے لیکن کوئی صاحبِ فن کیا ان کو فنِ لطیفہ میں شمار کر سکتا ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ؏ نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست ؏ کلاہ داری و آئینِ سروری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست ؏ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند — حافظ

شعر ہو یا راگ جب تک سننے والے کو بے خود نہ کر دے۔ یا روحِ فطرت میں حرارت نہ پیدا کر دے۔ کثیف مادے میں لطیف روح نہ پھونک دے۔ فنونِ لطیفہ میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔

ہر شعر ایک مکمل راگ یا تصویر ہوتا ہے جس طرح تصویر میں مصور کو ہر عضو اپنی اپنی جگہ خوبی اور موزونیت کے ساتھ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعر کو بھی ہر لفظ اپنے اپنے مقام پر بغیر کسی تعقید کے رکھنا پڑتا ہے۔ اس ترتیب سے قطع نظر تناسب اور تعاون بھی ضروری



حضرت احمد (۱۹۵۸ء)



حضرت احمد (۱۹۲۷ء)



حضرت احمد ۱۹۳۰ ء میں

اور لازمی ہے۔
اگر ناک کی جگہ ناک تو بنائی جائے۔ مگر اصل صورت کے اعتبار سے بڑی یا چھوٹی کر دی جائے تو تعداد اجزا، کے اعتبار سے تصویر مکمل تو ہوگی مگر مضحکہ خیز، اس طرح موزوں نظم بھی اپنی بدنظمی، غیر مناسب وثقیل الفاظ اور دور از فہم استعارات وتلمیحات کی وجہ سے شعر گفتن چہ ضرور بود کا مصداق ہو جاتی ہے۔

جب تک اصل فطرت (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا) اظہار مافی الضمیر پر مجبور نہ کرے اور ذوق طبیعت متقاضی نہ ہو، قافیہ ردیف کے بل پر شعر کہنا تقالی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

امجد کا فن خیال اور بیان کی تمام خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور بقول پروفیسر سلیم "امجد شعر گوئی کے .... وقت خیال کو پیش نظر رکھتے ہیں یہ اُن شاعروں میں نہیں جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہل بصیرت کے لیے ہوش ربا ہے۔ وہ شعر اس وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال اپنے اظہار پر ان کو مجبور کرتا ہے۔ پھر وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں۔ خود خیال اپنے لیے لباس تیار کر لیتا ہے۔ اور اس کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے"

امجد کو جہاں اعلیٰ تخیلات کی دولت قدرت سے عطا ہوئی، وہیں ان تخیلات کے اظہار کے لیے ان کو بیان کا بھی وہ اندازہ ملا ہے کہ جو شعر ان کی زبان سے نکلا وہ موزوں سانچے میں ڈھلا ہوا نکلا۔ جس کان میں اس کی رکعت پڑی وہ اپنی جگہ متکیف ہوئے بغیر نہ رہا۔

امجد نے یوں تو پندرہ سولہ برس کی عمر میں شاعری شروع کردی تھی اور پانچ چھ سال میں زیادہ تر غزلیں اور رباعیاں کہیں جو ۱۹۰۸ء کی طغیانی رود موسیٰ کی نذر ہوگئیں۔ مگر ابتدائی مشق سخن کے زمانے میں انھوں نے جو رباعیاں کہیں ان کا پہلا مجموعہ ۱۳۲۳ھ م ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تو ارباب نظر نے جان لیا کہ دکن کے افق سے رباعی گوئی کا ایک ایسا روشن ستارہ ابھرنے والا ہے جس کے آگے دوسرے تمام رباعی گو شعراء کی چمک ماند پڑ جائے گی۔

ریاض امجد کی نظموں میں لطیف احساسات، سوز و گداز، انسانی ہمدردی کے وہ نمونے ملتے ہیں جو امجد کے دل کی تڑپ اور روحانی بلندی کا پتہ دیتی ہیں۔

"دعائے یتیم" میں ایک کمسن بچی اپنے ماں باپ کو کس درد بھرے انداز میں یاد کرتی، اور ان سے ملنے کے لیے کس طرح خدا سے دعا کرتی ہے۔

دونوں جہاں کے مالک ہے لطف عام تیرا ؛ تسکیں وہ جہاں ہے مشکل میں نام تیرا
فضل و کرم جہاں پر ہے صبح و شام تیرا ؛ بچھڑوں سے بھی ملانا یارب ہے کام تیرا
ماں باپ سے ملادے او آسمان والے

اپنا وسیلہ یارب گردانتی ہوں تجھ کو ؛ حاجت روائے عالم میں جانتی ہوں تجھ کو
ہوں بے شعور لیکن پہچانتی ہوں تجھ کو ؛ ماں باپ سے زیادہ میں جانتی ہوں تجھ کو
ماں باپ سے ملادے او آسمان والے

ماتم میں ہمدموں کے دم اپنا توڑتی ہوں ؎ دنیا نے مجھکو چھوڑا میں اسکو چھوڑتی ہوں
بابِ کرم پہ تیرے سر اپنا پھوڑتی ہوں ؎ منت سے تیرے آگے اب ہاتھ جوڑتی ہوں
ماں باپ سے ملا دے او آسماں والے

قیامت صغریٰ کے عنوان سے ۱۹۰۸ء کے حادثہ طغیانی پر جو نظم کہی ہے اس کا درد اور سوز ملاحظہ ہو۔

میں موردِ حرمان و گرفتارِ بلا ہوں ؎ ماں باپ سے بچھڑا ہوں میں کیوں کے جدا ہوں
گہہ محوِ فغاں ہوں کبھی مصروفِ بکا ہوں ؎ معلوم نہیں خود مجھے میں کون ہوں کیا ہوں
بے ہوش کبھی ہوں کبھی ہو جاتا ہے سکتا
وہ عالم حیرت ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں ؎ بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں ؎ وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

مادر کہیں اور میں کہیں با دیدۂ پرنم ؎ بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم ؎ کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیرِ اعظم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے!

کس واسطے خاموش تو اے برقِ تپاں ہے ؎ آخر ترے منہ میں بھی تو اے رعد زباں ہے
اے مہرِ جہاں تاب مرا چاند کہاں ہے ؎ کس چاہ میں وہ یوسفِ گم گشتہ نہاں ہے
اے قافلۂ ریگِ رواں تو ہی بتا دے
کس جا ہے مری مادرِ مرحومہ بتا دے

مناجات بہ درگاہِ قاضی الحاجات کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ کس خلوص اور درد سے شاعر محوِ دعا ہے اور کن جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔

او میرے مالک! او عرش والے ؎ جلوے ہیں تیرے سب سے نرالے
ہم غمزدوں کا غمخوار ہے تو ؎ ستار ہے تو غفار ہے تو
تعریف تیری میری زباں پر ؎ اللہ اکبر! اللہ اکبر!
ہوں سر سے پا تک تصویرِ عصیاں ؎ اعمالِ بد سے اپنے پشیماں
ہر دم ہے لب پر با نالہ و آہ ؎ من کل ذنب استغفر اللہ
نخلِ معاصی دل سے قلم کر ؎ ہم بیکسوں پر یارب کرم کر
کب تک پکاروں شام و سحر گاہ ؎ اللہ اللہ اللہ اللہ

کیوں زندگی ہے برباد میری ؛ کیوں بے اثر ہے فریاد میری
گر تو کہے گا بدکار ہے تو ؛ میں بھی کہوں گا غفار ہے تو
ہے بیکسوں کو تیرا سہارا ؛ بندہ نوازا! پروردگارا
سب نے کیا اب ہم سے کنارا ؛ لے دے کے ہے اک تیرا سہارا
مقصد جب اپنا تجھ سے نہ پائیں ؛ کس کو پکاریں کس در پہ جائیں
تیرے سوا اب ہے کون میرا
بیچارہ امجد بندہ ہے تیرا

امجد کی شاعری کا سرچشمہ قرآن پاک ہے۔ قرآن نے جو تعلیم دی ہے، وہی امجد اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کے ہر جگہ موجود رہنے کو کس خوبی سے بیان کرتے ہیں۔

خالق ہے کوئی ارض و سما شاہد ہے ؛ انت کے لیے اپنا انا شاہد ہے
اس پر بھی اگر کوئی نہ مانے، نہ سہی ؛ خود اپنے وجود پہ خدا شاہد ہے

ذرے ذرے میں ہے خدائی دیکھو ؛ ہر بت میں ہے شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم ؛ ہر ایک میں ہے۔ مگر اکائی دیکھو

حسن مطلق مقید طور نہیں ؛ خورشید سے عالم میں کہاں نور نہیں
مخلوق سے کچھ الگ نہیں ہے خالق ؛ معنی کا وجود لفظ سے دور نہیں

ایمان خوف و رجا کے درمیان ہے۔ خدا سے ڈرو اور اسی سے امید بھی رکھو۔

شکوہ اس کے غضب کا کرتا بھی ہوں ؛ ہر سانس میں پھر دم اس کا بھرتا بھی ہوں
مالک ہی مرے مہر بھی ہے قہر بھی ہے ؛ مرتا بھی ہوں اس پہ اس سے ڈرتا بھی ہوں

ان کی شاعری معرفت و حقیقت کے مضامین کا گنجینہ ہے فرماتے ہیں۔

ہر مرتبہ آئینۂ دل دھلتا ہے ؛ کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں ؛ ہر فکر میں باب معرفت کھلتا ہے

بقا و فنا کے مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

واجب ہی کو ہے قیام باقی فانی ؛ قیوم کو ہے قیام باقی فانی
کہنے کو زمین و آسماں سب کچھ ہے ؛ باقی ہے اسی کا نام باقی فانی

مغفرت کی دعا کا نرالا انداز ملاحظہ فرمائیے۔

ضائع نہ فرمانہ گرم جوشی کو مری ؛ مٹی میں ملا نہ سرفروشی کو مری
آیا ہوں کفن پہن کے اے رب غفور ؛ دھبہ نہ لگے سپید پوشی کو مری

پائیں گے نئی حیات مرنے والے ؛ ہو جائیں گے مطمئن یہ ڈرنے والے
امید ہے تو پھر بخش دے گا ہر جرم ؛ اوماں سے زیادہ پیار کرنے والے

اخلاق حسنہ کی تعلیم صوفیائے کرام کا مسلک خاص ہے وہ عیب بینی اور سرزنش کے بجائے اخلاق کی خوبیاں اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اُن کو قبول کرنے پر خود بخود مجبور ہو جاتا ہے، اس موضوع پر چند رباعیاں ملاحظہ ہوں

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے ؛ بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی ؛ دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا ؛ نا فہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی ؛ نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

ان کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔ وہ جیسے پاکیزہ صفت انسان تھے، اسی طرح ان کا کلام بھی ہے۔ اخلاق وموعظت، تعلیم روحانی اور محبت الہی کا ایک دل پذیر پیام ہے۔ جو نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی شمع ہدایت کا کام دے گا اور اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اردو زبان زندہ اور اس کے بولنے والے باقی ہیں۔

لو ختم ہوا آج کلام امجد ؛ امجد کی جگہ رہ گیا نام امجد
اب آپ اس پر عمل کریں یا نہ کریں ؛ پہنچا دیا امجد نے پیام امجد

—— امیر مینائی، داغ دہلوی، جلیل مانکپوری اور فانی بدایونی کے بعد اُردو زبان کا ایک اور ممتاز اور قابل احترام شاعر زمین حیدرآباد کا پیوند بن گیا۔ امجد حیدرآباد ہی کے ممتاز شاعر نہیں تھے اور نہ انہیں صرف اس عہد کے چوٹی کے شاعروں میں شمار کیا جائے گا۔ وہ توان بزرگ فنکاروں میں تھے جنھوں نے اردو رباعی کو رتبہ، مقام حسن اور نکہتیں عطا کیں۔ ربع صدی پہلے جب امجد نے شاعری شروع کی وہ قدیم دور ہماری مشترکہ تہذیب اور روحانی اقدار کا تھا۔ امجد نے انسانیت اور الوہیت کا نغمہ چھیڑا اور ان کی شاعری میں تصوف نے اپنا رنگ پیدا کیا۔

حضرت امجد نے محبوب علی خاں مرحوم کا دور بھی دیکھا، وہ بجائے خود حیدرآباد کی ایک تاریخ تھے اور ان کی شاعری اس دور کے گذرتے عہد کے خیالات کا ایک جاندار مرقع تھی۔ ایسا مرقع جو ادب کے آئینہ خانے میں ہمیشہ عزت وقدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

حضرت امجد اب نہیں رہے، ان کی رباعی اور رباعی کا سوز وگداز البتہ ہمیشہ رہیگا۔ وہ بہت دنوں سے خانہ نشین تھے لیکن اس ممتاز شخصیت کے اٹھ جانے سے ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ اقلیم سخن کے اس تاجدار کی یادگار میں آخری اہم خراج تحسین پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر بی گوپال ریڈی تھے۔ جو ڈیڑھ دو سال قبل حضرت امجد کے گھر پر گئے تھے اور اس صوفی منش شاعر کو آندھرا اور تلنگانہ کے ملاپ کے نئے دور کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ اس کے بعد اہل بنگلور نے حضرت امجد کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی، اب ان کے انتقال کی خبر نے خیال وفکر کو متاثر کر دیا۔ غم یہی نہیں ہے کہ امجد ہم میں نہیں ہیں بلکہ بڑے دکھ کے ساتھ یہ خیال ابھرتا ہے کہ رباعی کی کاکلیں کا سنوارنے والا آیا کوئی پیدا بھی ہوگا۔ —————— (اداریہ سیاست حیدرآباد)

سیّد مبارز الدین رفعت

حضرت امجد بحیثیت نثر نگار

حضرت امجد ان باکمال ہستیوں میں سے تھے جنہیں چرخ ظفر ہزار ہا ہزار چکر کاٹنے کے بعد ہی پیدا کرتا ہے۔ اردو ادب کی دنیا کے وہ ایک "ہرفن مولا" نابغہ (جینیس) تھے۔ انہوں نے اردو ادب کو کیا نہیں دیا۔ اردو ادب کے قریب قریب سب ہی اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی اور سب ہی میں اپنا کمال دکھایا۔ ریاض امجد کی دو جلدیں، خرقۂ امجد اور نذر امجد شاہد ہیں کہ انہوں نے اونچے درجے کی غزلیں لکھیں، دل نشین گیت لکھے، اعلیٰ پایہ کی نظمیں ان کے قلم سے نکلیں، حمد و نعت میں دلکش قصیدے انہوں نے تصنیف کئے۔ رباعی گوئی تو ان کا اپنا میدان تھا۔ ان کی رباعیات کے ایک نہیں، دو نہیں، تین مجموعے نکلے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس صنف سخن کی حد تک ان کا ہم پلہ اور ہم سر ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ اسی بناء پر وہ "سرمد ثانی" کے لقب سے مفتخر ہوئے۔

حضرت امجد جس طرح نظم کی تمام اصناف پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ویسے ہی وہ اعلیٰ درجے کی نثر لکھنے پر قادر تھے یہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی ادیب کو نثر اور نظم کی تمام اصناف پر یکساں عبور حاصل ہو۔ کسی کی نظم لاجواب ہوتی ہے تو نثر پھسپھسی۔ کسی کی نثر بے نظیر ہوتی ہے تو نظم بے جان۔ اور یہ بھی کچھ ضروری نہیں کہ ہر شاعر شاعری کی تمام اصناف پر یکساں عبور رکھتا ہو۔ لیکن حضرت امجد نے نثر بھی لکھی اور بہت اونچے درجہ کی نثر لکھی۔ انہوں نے نثر میں ایک دو نہیں، اچھی چھوٹی بڑی سات کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ رباعی گوئی کی خصوصی شہرت نے ان کے نثری کمالات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ایسے ہی جیسے عمر خیام بنیادی طور پر بہت بڑے عالم ریاضی اور ہیئت داں ہیں، لیکن آج صرف رباعی گو شاعر کی حیثیت ہی سے وہ جانے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن حضرت امجد کے نثری کارنامے ان کی رباعی گوئی کے کمال سے درجہ میں گھٹے نہیں ہمارے ادب کے تاریخ نگار حضرت امجد کا ذکر تو کرنے لگے ہیں لیکن صرف رباعی گو کی حیثیت سے۔ یہ حضرات ان کے نثر کے کارناموں کو نظر انداز ہی کر دیتے ہیں۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت کے لحاظ سے وہ اردو کے دوسرے حالی ہیں اور جس طرح مولانا حالی کی نظم اور نثر دونوں کے کارناموں کے تذکرے کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی، اسی طرح حضرت امجد کے نثری کارناموں کی اہمیت اور ان کے مرتبہ کو تسلیم کئے بغیر ان کا تذکرہ اور اس طرح اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہیگی۔

نثر اور مختلف اصناف سخن پر یکساں قدرت کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ طرز نگارش اور مطالب کے لحاظ سے بھی حضرت امجد فارسی کے باکمال شاعر اور بے مثال ادیب حضرت سعدیؒ سے کافی مشابہ ہیں۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات "جمال امجد" میں حضرت امجد نے کہیں لکھا ہے کہ افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے انہیں مطالعہ کے لیے کتابیں نہ ملتی تھیں، اس تنگ دستی کے عالم میں فارسی کی جو کتاب ان کے ہاتھ لگی وہ اتفاق سے گلستان تھی۔ اپنے مطالعہ کے شوق کی تکمیل کے لیے اسی کتاب کو

انہوں نے بارہا پڑھا۔ "گلستاں" کے بار بار کے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعدیؒ کی دلربا طرزِ نگارش ان کے ذہن میں مرتسم ہوگئی اور جب وہ خود نثر لکھنے بیٹھے تو غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر سعدی کی فارسی کا اسلوب نئے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ خود بخود اردو نثر کے قالب میں ڈھل گیا۔ سعدی کی نثر کی خصوصیات ہیں۔ مسجع اور مقفیٰ لیکن نہایت درجہ بے تکلف اور رواں دواں عبارت آرائی۔ جملے مختصر اور چھوٹے۔ لیکن مطالب بڑے اور دل نشین۔ حکمتیں، کہانیاں، چھوٹے چھوٹے قصے اور لطیفے۔ ان سے نتائج کا استنباط، پند، موعظت، حکمت اور عبرت۔ نثر کے ساتھ نظم کا دلربا جوڑ اور پیوند۔ آپس میں ایسا مربوط اور ایسا جڑا ہوا جیسے جسم و جان، روح و قالب، گوشت اور ناخن۔ نثر بھی اپنی، نظم بھی اپنی، جتنی شاندار نثر اتنی ہی جاندار نظم۔

مسجع اور مقفیٰ عبارت آرائی کے سوا سعدی کی نثر کی یہ تمام خصوصیات حضرت امجد کی نثر میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں اردو میں مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی پر حضرت امجد بھی قادر تھے، لیکن اب اردو نثر کا مزاج وہ نہیں رہا جو ان سے نصف صدی پہلے تک تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کے عہد کے لکھنؤ میں ہوتے تو شاید اسی عبارت آرائی کا کمال بھی دکھا جاتے اور جس طرح حضرت سعدی کی نثر مسجع اور مقفیٰ ہوتے ہوئے بھی بے تکلف اور رواں دواں ہوتی ہے، ویسی ہی بے نظیر اردو نثر لکھ جاتے۔ سجع اور قافیہ کو چھوڑ حضرت امجد کی نثر ویسی ہی صاف، ستھری اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ جیسی کہ سعدی کی۔ جملے چھوٹے چھوٹے لیکن شیریں، مطالب بڑے بڑے اور دل نشین۔ موضوعات سعدی ہی کی طرح چھوٹے چھوٹے قصے، کہانیاں لطائف اور حکمتیں۔ اور ان سے سعدی ہی کے انداز فکر میں نتائج کا استنباط، عرفان سلوک، پند، موعظت، حکمت اور عبرت۔ حضرت سعدی کے بعد نظم اور نثر کو آپس میں جوڑنے کا ڈھنگ لوگوں کو بہت بھایا۔ لیکن اپنی ہی نثر کے ساتھ اپنی ہی نظم کو جوڑنے کا وہ خداداد سلیقہ سب کچھ کہاں سے لاتے۔ ناچار اپنی نثر کے ساتھ دوسروں کی منظومات کو جوڑا۔ لیکن حضرت امجد نے اپنی نثر کے ساتھ سعدی کی طرح اپنی ہی نظم جوڑی۔ جتنی صاف اور سہل نثر لکھ گئے اس کے ساتھ اپنی ہی ستھری ستھری نظم کا جوڑ بھی لگاتے گئے۔ حضرت سعدی کے بے مثال اسلوب کی تقلید فارسی اور اردو میں کتنوں ہی نے کی۔ کامیابی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ فارسی کی بات تو خیر فارسی والے جانیں، اردو میں سعدی کی طرزِ نگارش کو کامیابی کے ساتھ اپنانا حضرت امجد کے سوا کسی اور کے حصہ میں نہ آیا۔ نثر کے لحاظ سے انہیں اردو کا سعدی کہا جائے تو اس میں اصلا مبالغہ نہ ہوگا

حضرت امجد نے اردو نثر میں چھوٹی بڑی سات کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں (۱) گلستانِ امجد (۲) حکایات امجد (۳) جمال امجد (۴) حج امجد اور (۵) پیام امجد۔ ضخیم کتابیں ہیں اور (۶) ایوب کی کہانی اور (۷) میاں بیوی کی کہانی چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ ذیل میں ان ہی سات کتابوں کا ایک سرسری تعارف اور ان کے محاسن کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) گلستانِ امجد، فارسی کے شیخ سعدی کی گلستان کا اردو ترجمہ ہے اوپر بیان ہو چکا کہ اپنی نوعمری میں حضرت امجد نے گلستانِ سعدی کا بکثرت مطالعہ کیا تھا، اور اس کی طرزِ نگارش سے حد درجہ متاثر ہوئے تھے۔ پڑھنے کی عمر گزر گئی اور آپ خود لکھنے کے قابل ہوئے تو عہد کیا کہ فارسی ادب کے وسیع ذخیرے سے گلستاں کا اردو ترجمہ، مثنوی مولوی اور کلیات بیدل کا انتخاب معہ ترجمہ پیش کریں گے۔ مثنوی کا کچھ انتخاب کیا تھا، لیکن ترجمہ نہ کر سکے، اور کلیات بیدل کے انتخاب مع ترجمہ کی نوبت کبھی نہ آئی۔ البتہ گلستان کی مہک دماغ میں ایسی بسی کہ اس کو اردو کے قالب میں ڈھالے بغیر چین سے نہ بیٹھ سکے۔

یوں تو اردو میں گلستان کے ترجمے بہت ہوئے ہیں۔ لیکن گلستانِ امجد چیزے دیگر است۔ اس کے دیباچے میں حضرت امجد نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ:-

"اب تک گلستان کے جتنے بھی اردو ترجمے دیکھے گئے، علی العموم مترجموں نے نثر کا ترجمہ (اصل فارسی کی طرح) نثر مسجع میں اور نظم کا نظم میں کیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بڑی محنت کی ہے اور بہت زحمت اٹھائی ہے۔ نثر تو خیر، نظم میں شعری بندشوں کی وجہ سے مصنف کے اصل خیال پر روشنی نہ پڑ سکی۔ بلکہ کسی قدر اندھیرا چھا گیا۔ اسی لیئے ہم نے "شعر گفتن چہ ضرور بود" سمجھنے سے پہلے تمام نثر و نظم کا ترجمہ غیر مانوس اور فرہنگ طلب محاورات کو چھوڑ کر بغیر سجع اور رنگین بیانی کے محض سادہ اور اپنی اردو نثر میں کر کے کمی کو خود اپنے مناسب حال رباعیات و قطعات وغیرہ سے پورا کر دیا"

بے شبہ اردو میں یہ گلستاں کا سب سے اچھا ترجمہ ہے۔ ایسا اچھا اور بامحاورہ ترجمہ ہے کہ ترجمہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا، اصل کا گمان ہوتا ہے۔ مال تو ہے سعدی کا لیکن حضرت امجد نے اس سلیقے سے اردو میں اس کو ایسا باٹ کہ یہ ان کا مال ہو گیا ہے۔ شیخ سعدی اگر ہمارے دور میں ہوتے اور اردو میں گلستان لکھنا چاہتے تو شاید اس سے بہتر نہ لکھ پاتے۔

گلستان سعدی کی ہزار ہا ہزار خوبیوں کے باوجود اس میں ایک عیب یہ ہے کہ پند و موعظت اور عرفان و حکمت کی بات ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے بیان کے لیے کہیں کہیں حضرت سعدی نے زی شوخ گفتاری اور بڑے بے تکلفی سے کام لیا ہے۔ اور ایسے الفاظ لکھ گئے ہیں کہ پڑھتے اور پڑھاتے وقت شرم سے آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ ابتدا ہی سے شیخ کی یہ کتاب مدرسوں کے نصاب میں شامل رہی۔ لیکن یہ الفاظ اور بعض مطالب پڑھنے کے سلسلہ میں لوگوں کو کھٹکتے ہی رہے۔ اس لیے گلستان کے قلمی نسخے جو بچوں اور بچیوں کے نصاب میں رہے ہیں، ایسے بھی ملتے ہیں جن میں کہیں الفاظ اور کہیں پورے جملے یا کہیں پورے باب پر سیاہی پھیر دی گئی ہے۔ ہمارے بعض قدیم خیال ناقد ہمارے ترقی پسند مصنفوں کی عریاں نگاری پر بہت برہم ہیں لیکن وہ گلستان سعدی اور اس سے بڑھ کر مثنوی شریف (جس کی مدح میں "ہست قرآن در زبان پہلوی" تک کہا گیا ہے) کی بعض صاف بیانیوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ جن کے آگے ہمارے عہد کے ترقی پسندوں کی صاف بیانیاں ہیچ نظر آتی ہیں ـــ اسے عیب کہیئے یا ہنر بہر حال ادب میں ایسی باتیں موجود ہیں، اور جب تک ادب کا وجود ہے عالم وجود میں آتی رہیں گی۔ حضرت امجد کی شرافت نفس کا کمال ہے کہ گلستان کے ایسے تمام مطالب اور ایسے تمام مقامات کو انہوں نے اپنے ترجمہ میں بڑے سلیقے سے نباہا ہے اور کوئی ایسا لفظ یا کلمہ اپنے قلم سے نکلنے نہیں دیا ہے جسے شوخ نگاری یا بے تکلفی بیانی سے تعبیر کیا جا سکے آپ نہایت اطمینان کے ساتھ نوعمر لڑکا ہو کہ لڑکی، مہذب خاتون ہو کہ معمر بزرگ، سب کے آگے کہیں بھی شرم سے آنکھیں نیچی کئے بغیر یہ کتاب پڑھ سکتے ہیں، پڑھا سکتے ہیں۔

نمونے کے طور پر ترجمہ کا بس ایک ٹکڑا دیکھتے چلیے:-

"ایک دفعہ دمشق کے بے وفا دوستوں سے تنگ آ کر جنگل میں نکل گیا۔ انسانوں سے ٹوٹ کر حیوانوں سے جا ملا۔ آخر پھرتے پھرتے قید فرنگ میں جا پھنسا۔ جہاں چند یہودی مزدوروں کے ساتھ طرابلس کی خندق کھودنے پر مجھے بھی لگا دیا گیا۔ اتفاقاً ایک رئیسِ حلب جو مجھے پہچانتا تھا، ادھر آ نکلا، مجھ سے پوچھا، کیوں دوست، کیا کر رہے ہو۔ جی رہے ہو کہ مر رہے ہو۔ میں نے کہا، کیا بتاؤں، غیر اللہ سے گھبرا کر جنگل میں بھاگ نکلا۔

مگر یہاں اس سے زیادہ مصیبتوں میں آپڑا ہے

چڑیا پنجرے سے ہو کے بے پر نکلی ؛ آزادی تو یہ قید سے بدتر نکلی
نکلے تو تھے ماں کے پیٹ سے تنگ آکر ؛ تنگی دنیا کی اس سے بڑھ کر نکلی

غیروں کے ساتھ باغ میں تفریح کرنے سے دوستوں کے ساتھ قید خانہ میں رہنا ہزار درجہ اچھا ہے۔

حاصل یہ کہ اس رئیس حلب نے کچھ روپیہ دیکر قید فرنگ سے مجھے چھڑا لیا۔ اور اپنے ساتھ حلب لیجاکر اپنی لڑکی سے میرا عقد کر دیا۔ چند دن کے بعد بیوی نے پیٹ سے پاؤں باہر نکالے اور مجھ سے گالی گلوچ پر اتر آئی۔ جس کی وجہ سے میری زندگی تلخ ہو گئی، سچ ہے۔ نیک آدمی کے گھر میں یہ عورت جیتے جی اس کے لیئے جہنم ہے۔

اے خدا ہم کو بری صحبت سے بچا جو جہنم کی آگ سے زیادہ جلانے والی ہے۔

ہوتے ہوتے ایک دفعہ تو یہاں تک کہہ بیٹھی، ارے موئے، تو تو وہی ہے جس کو میرے باپ نے قید فرنگ سے آزاد کرایا۔ میں نے کہا بالکل صحیح، میں وہی ہوں کہ تیرے باپ نے دس دینار دیکر مجھے قید فرنگ سے چھڑایا، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس قید فرنگ سے چھڑا کر سو دینار مہر کے عوض تیرے ہاتھ بیچ ڈالا۔"

۲۔ **حکایات امجد** ۔ گلستان سعدی کے بکثرت مطالعہ کا نتیجہ نہ صرف گلستان امجد کی صورت میں ظاہر ہوا [illegible] حضرت امجد نے اپنی گلستان بھی لکھ ڈالی۔ گلستان سعدی لاکھ اپنا یا مال ہی پھر بھی سعدی کا مال تھا۔ لیکن حکایات امجد صرف امجد کا مال ہے بلا شرکت غیرے۔ طرز وہی سعدی کی، دل فریب و دل نشین۔ مطالب وہی تزکیہ اخلاق و طہارت [illegible] وعبرت۔ موضوعات میں رویا، مشاہدات، واقعات، اور مراقبات، جملہ (۴۵) مختصر حکایتیں، سب کی سب دلچسپ اور عبرت آفریں۔ صد ایک عنوان ہیں۔ عجیب لڑکی، جلوے کا گیت، دیہاتی لڑکی، مست ربود، گستاخ فقیر، حاضر غایب، ننھی نادان، مینا اندھے، خیال باطل وغیرہ وغیرہ۔

[illegible] امجد حضرت امجد کی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ حضرت امجد کی تصانیف نثر میں جمال امجد کے بعد سب سے [illegible] سب سے زیادہ عجیب کتاب نظم و نثر کا پیارا پیارا امتزاج حقایق و معارف کے موتی، قرآن و سنت کی تفسیر [illegible] کا ایک ذرا طویل اقتباس عنوان سے "میں اور مٹے"

[illegible] رات ہم سارے سہر کا گشت لگاتے ہوئے گیارہ بجے گھر پہونچے۔ گھر پہونچ کر معلوم ہوا کہ آج گھر میں کسی [illegible] ہے جس میں مولود خواں جماعت کی ضرورت ہے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی حکم ہوا کہ جاؤ مولود خوانوں کو [illegible] ہم یہ حکم سن کر الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ سوچتے رہے کہ گیارہ بجے رات کو مولود خواں کہاں ملیں گے۔

سوچتے سوچتے ایک دوست کا خیال آگیا، ان کے گھر پہونچتے پہونچتے بارہ بج گئے۔ گھر [illegible] آواز دی

[illegible] کون ہے؟

ہم نے کہا۔ امجد

آواز آئی، ذرا ٹھہر جائیے، ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

ہم باہر انتظار کرتے ٹھہرے رہے۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ، آخر ایک گھنٹے کے بعد ہمارے دوست کپڑے پہنے، کھانستے، کھنکارتے، سیکل ہاتھ میں لیے برآمد ہوئے۔ باہر آتے ہی ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ایسے محترم بزرگ کو اتنی دیر انتظار کرانے کی معافی چاہتا ہوں۔

اس قدر دیر حاضری کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج میں نے کسی قدر زیادہ پی لی تھی۔ آپ کی آواز پہ نشے کے اتار کے لیے بہت سی تند و ترش چیزیں استعمال کیں۔ تب کہیں جا کر حواس ٹھکانے ہوئے۔ ایسی بدمستی کی حالت میں آپ کے سامنے آنا میں نے پسند نہیں کیا

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ میں نے خیال کیا کہ اتنی رات گئے آپ آئے ہیں، نہیں معلوم کیا ضرورت ہے۔ چالیس پچاس روپے صندوق سے نکال کر جیب میں رکھ لیے ہیں۔ اور مزید کی ضرورت کے لیے دوکان کی کنجیاں بھی ساتھ لے لی ہیں۔

یا شاید کسی کام کے لیے چلنا ہو اس لیے کپڑے پہن اور سیکل لے کر نکلا ہوں۔ اب فرمائیے کیا حکم ہے؟

"ایک شرابی دوست کی یہ جاں نثاری دیکھ کر جواب دینے سے پہلے ہم مبہوت اور بےخود ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔ ان کے اثر سے ہوئے نشے کا اثر ہم پر چڑھ گیا۔ شرابی کی کیف افزا، سرور بخش، والہانہ محبت اور صداقت کے آگے ہماری ساری نمازیں شدت انفعال سے آب آب ہو گئیں"

۳۔ **جمالِ امجد**: حضرت امجد کی نثری تصانیف میں اس کتاب کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ یہ نہ صرف ان کی بہترین تصنیف ہے بلکہ بے شائبۂ مبالغہ اردو ادب کی بہترین کتابوں میں اس کا شمار ہونا چاہیے۔ وقت واحد میں یہ کتاب اردو کے ایک بہت بڑے صوفی شاعر کی خود نوشت سوانح حیات بھی ہے اور اس کی نصف بہتر، ایک جان دو قالب، پاک باطن، رموز آشنائے حال و قال، مادرزاد صوفیہ، رابعہ ثانی جمال النساء بیگم بنت علامہ نادرالدین کا تذکرہ بھی اور حقائق و معارف کا گنجینہ بھی۔ علامہ نادرالدین حیدرآباد کے ایک بہت بڑے عالم اور حضرت امجد کے استاد تھے۔ جمال النساء انہی علامہ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت امجد کی پہلی بیوی، بچی اور والدہ رود موسیٰ کی شہرۂ آفاق طغیانی میں غرق ہو گئیں اور حضرت امجد کسی نہ کسی طرح بچ نکلے۔ دوسرا نکاح جمال النساء بیگم سے ہوا، جنہیں وہ جمال سلمیٰ کے پیارے نام سے یاد کرتے تھے۔ تیرہ سال کی کم سنی میں بیاہ کر حضرت امجد کے گھر آئیں۔ قدرت نے جس طرح انہیں حسن ظاہر میں اپنا آپ نظیر بنایا تھا، اس سے کچھ زیادہ ہی انہیں حسن باطن سے نوازا تھا۔ بیاہ کے چھ سال تک تو ایسی کوئی خاص بات نہ ہوئی لیکن ساتویں سال جب کہ جمال سلمیٰ ابھی صرف انیس سال کی تھیں کہ ان پر عجیب وجدانی کیفیت طاری ہوئی اور پھر حقائق و معارف کا ایک دریا ان کی زبانِ فیض ترجمان سے اُبل پڑا۔ حضرت امجد کو حضرت امجد بنانے میں ان

پاک باطن بی بی کا بڑا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ افسوس کہ یہ پاک نہاد بی بی (۳۳) سال کی مختصر سی عمر پاکر حضرت امجد کو محزون و مغموم اور اپنے فیض سے ایک عالم کو محروم چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوگئیں۔

اس کتاب پر مقدمہ "دو نصف، ایک" کے عنوان سے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے لکھا ہے۔ مقدمہ کا یہ عنوان خود ہی قابل داد ہے۔ اس مقدمہ میں مولانا فرماتے ہیں:

"جمال امجد کیا ہے، جمال اور امجد دو مختلف القوالب، متحد الروح یا نصف مساوی ایک ہستیوں یا ہستی کی حیات بخش زندگی کا کارنامہ ہے"

آگے حضرت امجد کی شاعرانہ سحر کاریوں کے اعتراف کے بعد ان کی نثر نگاری کے کمال کا اعتراف ان الفاظ میں ملتا ہے۔

"اب ان کی دلکش نثر کے متعلق اپنی آزادانہ رائے کو پابند کر کے صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ۔

مولانا عبدالباری ندوی لکھنوی جیسے نقاد اور نکتہ چیں بزرگ بھی حضرت امجد کی شاعریت پر دیر تک جھومتے رہے۔ میں نے تو شاید دو ایک مرتبہ پہلو بدلے بھی ہونگے مولانا ممدوح الصدر نے دو سو صفحے کی کتاب ایک ہی بیٹھک میں ختم کر دی۔ کتاب ختم کرنے سے پیشتر اس کا مطالعہ ختم نہ ہو سکا۔ وہ امجد جواب تک شاعر مشہور تھا، دیکھو کہ اب انشاء کے ایک جدید اسلوب اور قالب میں کس طرح کامیاب ہو کر نمایاں ہوتا ہے"

اس کتاب میں گیارہ "نوشتے" ہیں۔ اور ہر نوشتے میں گلستان کی طرز نگارش کے مطابق ذیلی عنوان، گلستاں ہی کی طرح نظم و نثر کا بے مثل جوڑ اور برمحل پیوند۔ کتاب کی ابتداء ہوتی ہے۔ حضرت امجد کے والدین کے متعلق معلومات سے آگے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے بچپن کے واقعات، تعلیم کے زمانے کے قصے، جوانی کے تماشے، پھر شادی، اور رود موسیٰ کی طغیانی میں خانہ بربادی، چھ نوشتے جو (۹۶) صفحات پر آئے ہیں۔ سب ان ہی واقعات کے بیان کے لیے وقف ہیں۔ یہ سب باتیں اتنے دلکش پیرائے میں بیان ہوئی ہیں کہ پڑھتے پڑھتے کہیں بے ساختہ واہ اور کہیں بے ارادہ آہ نکل جاتی ہے۔ کہیں ہنسی روکے نہیں رکتی اور کہیں آنسو تھامے نہیں تھمتے۔ ساتویں نوشتے سے کتاب کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ جمال سلمیٰ سے حضرت امجد کی شادی ہوئی۔ تاہل زندگی کے چھ سال کسی خاص واقعہ کے بغیر گذر گئے اور چھ سال بعد یکایک

"نہ کہیں جانے کی ضرورت ہوئی نہ آنے کی، وقت آگیا، رحمت الہیٰ کے دروازے آہستہ آہستہ کھلتے گئے۔ مولانا مرحوم [illegible] سرار کی محبت کے آثار سلمیٰ کے اوضاع و اطوار سے ظاہر ہونے لگے، ہر دو سینے میں دل و دماغ کے دبے ہوئے جیسے ایک طاقت ور پودے کی طرح جھکنے لگے۔ غیر معمولی ذہنی دقیقہ رسی، ذہانت، ادراک اور غور و فکر کا ملکہ ترقی کرتا چلا۔ دماغ کی مخفی لہروں میں بڑھتے بڑھتے سمندر کی سی طوفان خیزی، حیرت انگیز طاقت پیدا ہوتی چلی۔ منہ سے جو

بات نکلتی، عجیب ہوتی، جو گفتگو ہوتی حیرت خیز ہوتی، وہ کہنے کے لیے نہیں۔ ہم سمجھنے کے لیے تھے!"

اب آگے کتاب کے باقی (۲۰۲) صفحات تک جو کچھ ہے، اسی کہنے اور سمجھنے کی تفصیل ہے۔ حقایق و معارف، شریعت، وطریقت، حال وقال، عشقِ الٰہی اور حبِّ رسولؐ کے کیسے کیسے دلفریب ودل آویز نکتے ہیں جو بیاں ہوئے ہیں۔ تصوف اور عرفان کے کیسے کیسے موتی ہیں جو لٹائے گئے ہیں۔ ان علوم سے ذرا بھی مس رکھنے والا کوئی ہو تو ایک ایک نکتہ پر پھڑکے، وجد کرے، جھوم جھوم اٹھے!

یوں تو کتاب کی ابتداء ہوتی ہے حضرت امجد کے حالات زندگی سے اور آگے جمال سلمیٰ نمودار ہوتی ہیں۔ لیکن قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری کتاب پر وہی چھائی ہوئی ہیں اور ہر طرف انہیں کے جمال ایماں افروز کا ظہور ہے۔ اس کتاب کی خوبیاں گنانے سے کم از کم اس کے مجھ بیان کا قلم تو عاجز ہی ہے۔ کتاب ایسی ہے کہ ایک نہیں کئی بار پڑھی جائے تب ہی اس کی خوبیوں کا، اس کی نزاکتوں کا اور اس کی برکتوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے گا۔

یہاں نمونے کے طور پر اس کتاب کے ابتدائی حصہ کا ایک اور آخری حصے کا ایک انتخاب پیش ہے۔ پہلے کا عنوان ہے "شدت احتیاج" اور دوسرے کا ہے "وجہ تعذیب"۔

۱۔ ہم سے فقیر کا گھر ایک بڑے امیر کے جوار میں واقع تھا۔ امیر صاحب نے حق ہمسایگی کے تحت اپنے مکان کی توسیع میں ہمارا جھونپڑا بھی لے لیا تھا۔ جس کے معاوضے میں دو روپے مہینہ خیرات کی طرح دیا کرتے تھے۔ ہر ختم ماہ کے بعد دس پانچ مرتبہ در دولت پر حاضر ہو کر دس پانچ سلام جھک جھک کر بجا لانے پر دو روپے ملا کرتے۔ ہم کو اپنی اس ذلت اور ان کی بیجا تمکنت پر سخت رنج ہوتا تھا۔

کئی دفعہ ماں سے کہا بھی کہ ماں! دو روپے کے لیے اس قدر ذلت اور بے شرمی تو گوارا نہیں کی جا سکتی۔ ماں کہتیں، بیٹا، تم کیا جانو، اس تنگ دستی میں یہ دو روپے ہمارے لیے دو اشرفیاں ہیں، جب خدا تم کو کمانے کے قابل بنائے، چھوڑ دینا۔

ماں کہو، تم جب کسی کو دینے کے قابل ہو جاؤ تو اس طرح پھرا پھرا کر نہ دینا۔ کسی نے لقمان سے پوچھا، تم نے ادب کس سے سیکھا۔ کہا، بے ادبوں سے، یعنی ان کی جو بات مجھے ناپسند معلوم ہوئی، میں نے اسے ترک کر دیا!"

۲۔ ایک دفعہ ہم نے کہا کہ جب سب کچھ خدا ہی کرتا ہے تو پھر ہم کیوں پکڑے جاتے ہیں؟ سلمیٰ نے کہا: (۱) اگر آپ وجود واحد کے قائل ہیں تو من حیث الوجود ہم اور تم میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا۔

۲۔ کیوں؟ وہی شخص پوچھ سکتا ہے جو مسئول عنہ سے اعلیٰ ہو۔ یا کم از کم ہم سر ہو۔ یہاں دونوں صورتیں مفقود ہیں۔

۳۔ سپید لباس کو آپ پہن کر میلا کرتے ہیں۔ اور آپ ہی کے ہاتھوں صاف پاک

بس کا ستیاناس ہوتا ہے۔ باوجود اس کے غریب کپڑا ہی دھوبی کی بھٹی کے حوالے ہوتا ہے،
وہی کھولتے پانی میں جلتا ہے، وہی پتھر پر پٹکا جاتا ہے اور آپ دور سے کھڑے تماشا دیکھتے ہیں
اگر میلا کپڑا آپ سے سوال کرے کہ اے میرے میلا کرنے والے! ایسا کیوں؟ تو کہیے
آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید
اچھی طرح یاد رکھیے، قدرت پر اعتراض کرے، منہ بنا بنا کر یہ کیوں، وہ کیوں کہنے سے
تکلیف میں تخفیف نہیں ہوتی، بلکہ میرے خیال میں ترقی کا اندیشہ ہے۔ اس کا آخری اور
واحد علاج رضینا بقضاء اللہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

اک روز بہت الجھ کے میں نے یہ کہا ؛ یہ کیوں ہوتا ہے اور وہ کیوں ہوتا ہے
سرتن سے مرا اڑا کے ارشاد ہوا ؛ اس کیوں کا جواب، دیکھ یوں ہوتا ہے!

۱۷۔ **حج امجد**۔ یہ حضرت امجد کی چوتھی اہم نثری تصنیف ہے۔ ہماری زبان میں حج و زیارت کے سفرناموں کی کمی نہیں، جس کسی کو بھی تھوڑا بہت لکھنا آتا تھا حصول برکت کے لیے وہ اس مقدس سفر کی یادگار کے طور پر اپنے تاثرات لکھتا گیا ہے۔ اس طرح اس صنف ادب میں سینکڑوں کتابیں تیار ہوگئی ہیں۔ دیارِ حبیب کے ذکر کے لحاظ سے یہ سب ہی کتابیں آنکھوں سے لگانے کے قابل ہیں۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر سے تین ہی سفرنامے ہماری زبان میں ایسے ہیں۔ جن کی شان ہی سب سے نرالی ہے۔ ایک تو ہے مولانا الیاس برنی مرحوم کا سفرنامہ حرمین، دوسرا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفر حجاز اور تیسرا ہے حضرت امجد کا حج امجد۔ اس مقدس سفرنامے کے واقعات اور تاثرات بیان کرنے کے لیے بھی حضرت امجد نے وہی گلستان کا دلفریب و دل آویز اسلوب نگارش اختیار کیا ہے۔ مربوط و مسلسل ہونے ہوئے بھی اس کے ذیلی عنوانات اپنی جگہ منفرد و مستقل ہیں۔ جذبات عقیدت کی سحر کارانہ عکاسی کے ساتھ ساتھ سفر کے معمولی اور پیش پا افتادہ واقعات سے عبرت و نصیحت کا انوکھا اور دل میں کھب جانے والا انداز۔ وہی نظم و نثر کا بے مثل امتزاج و پیوند۔

حج امجد کی عبارت کا ایک نمونہ دیکھتے چلیے۔

"آنے والوں کا جوش دیکھو، ہمت دیکھو، ذوق دیکھو۔ کھانے کو نہ ہو، پہننے کو نہ ہو، افلاس ہو، ادبار ہو، کسی حال میں ہوں آئیں گے، اور ضرور آئیں گے، احرام کی وجہ سے سر برہنہ تو سب ہی ہیں، مگر افلاس کی وجہ سے ہزاروں پا برہنہ ہیں۔

پاؤں میں جوتی نہیں، سر پر سایہ نہیں۔ بھوکے پیاسے، سر و پا سے بے خبر، جذبۂ مذہبی میں چور، ہزاروں، لاکھوں کوس سے کھنچے ہوئے، ننگے زیر، ننگے بالا، ایک کپڑا بادبان سر تا پا کفن پوش، موتوا قبل ان تموتوا کی تصویر بنے ہوئے، ایک صدا پر کھنچے ہوئے کسی کے جواب میں مستانہ وار۔

لبیک اللھم لبیک

پکارتے چلے آ رہے ہیں۔

اک بے خودی سی چھائی ہوئی ہے ÷ کہتے چلے ہیں لبیک لبیک
وہ یا عبادی فرما رہا ہے ÷ ہم کہہ رہے ہیں لبیک لبیک

۵۔ **پیام امجد۔** یوں تو یہ کتاب حضرت امجد کے نثری کارناموں میں گنی جاتی ہے۔ لیکن اس کا غالب حصہ منظوم ہے اور اسے ان کی منظوم تصانیف ہی میں شمار کرنا چاہیے۔ اس کتاب میں بعض آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی منظوم تفسیر و تشریح درج کی گئی ہے۔ اور کہیں کہیں نوٹ کے طور پر نثر بھی لکھی ہے۔ اس میں منظومات جس اونچے درجے کی ہیں۔ اتنے اونچے درجے کی نثر نہیں ملتی۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس نثر میں وہ گھلاوٹ اور وہ دل آویزی دکھائی نہیں دیتی جو جمال امجد، حکایات امجد یا حج امجد کی جان ہے۔

نثر کا نمونہ ہے۔

"فرعون نے ساری عمر خدائی کا دعویٰ کیا۔ آخر وقت جب جان پر آبنی اور پانی سر سے اونچا ہوگیا، اس وقت اد بدا کر چلا اٹھا کہ اے خدا! میں اپنی خدائی سے توبہ کر کے اب تجھ کو اپنا خدا مانتا ہوں۔

جب آگئی پیری تو عصا یاد آیا ÷ رستہ بھٹکے تو رہنما یاد آیا
فرعون بھی وقت غرق لا یا ایمان ÷ جب چل نہ سکی خودی خدا یاد آیا

۶۔ **میاں بیوی کی کہانی۔** یہ (۳۲) صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ آدھے کے قریب منثور، اور آدھے کے قریب منظوم۔ ایک جاہل مرد کی علامہ، ادیبہ، عاقلہ، ہوش مند اور صاحب دل بیوی کا تمثیلی قصہ لکھا ہے۔ اور ان کے آپسی مکالمے درج کئے ہیں۔ شبہ ہوتا ہے اس کے یہ دونوں کردار خیالی نہیں، میاں خود حضرت امجد اور بیوی، ان کی ہادی، رہنما اور رفیق حیات جمال سلمیٰ ہیں۔ مطالب کے لحاظ سے گویا یہ کتاب جمال امجد کے ساتویں، آٹھویں اور نویں نوشتے کا تتمّہ ہے۔ نام جمال سلمیٰ کا کہیں نہیں لیا ہے۔ لیکن جس کسی نے جمال امجد میں اس مرحومہ کی ذکاوت و ذہانت اور نکتہ رسی کی ایک جھلک دیکھ لی۔ وہ یہاں پردہ میں انہیں کو بولتا پاتا ہے۔ پتہ نہیں حضرت امجد نے کس مصلحت کی بنا پر ان کا نام چھپایا ہے۔ ہائے ایک جگہ بیوی کیا خوب فرماتی ہیں۔

"پیارے شوہر، خفا نہ ہونا۔ جب سے مجھے میرے ماں باپ نے آپ کے دامن سے باندھ دیا ہے۔ میری ساری التجائیں، ساری درخواستیں، ساری حکایتیں، ساری شکایتیں آپ ہی تک محدود رہتی ہیں۔ کسی کے آگے عرض حاجت تو بڑی بات ہے، میری آواز بھی آپ کے سوا کسی کے کانوں تک نہیں پہونچتی۔ دُکھ ہو تو آپ سے کہتی ہوں، سکھ ہو تو آپ سے کہتی ہوں۔ ننگی ہوتی ہوں تو آپ سے کپڑا مانگتی ہوں۔ بھوکی ہوں تو آپ ہی سے عرض کرتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ آپ حکیم نہیں، ڈاکٹر نہیں، پھر بھی بیمار ہوتی ہوں تو اپنا دکھ درد آپ کے سوا کسی حکیم سے کہنے کے لیے نہیں جاتی۔ لیکن ۔ ...... آپ کو دیکھتی ہوں کہ ذرا ذرا سی بات میں ساری دنیا کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، ہر ایک کے آگے سر نیاز جھکاتے ہیں

غریب عورت تو ایک مرد کے سوا دوسرے کی صورت نہیں دیکھ سکتی۔ تعجب ہے کہ ایک غلام کئی آقاؤں میں کس طرح مشترک ہے۔

ایک شخص کئی لوگوں کا غلام ہے اور ایک شخص ایک ہی کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں غلاموں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟

پردہ پوشی کو ایک چادر بس ہے ÷ دن رات بسر کرنے کو اک گھر بس ہے
کیا مرد کو اک خدا نہیں کافی؟ ÷ عورت کے لیے تو ایک شوہر بس ہے

۷۔ **ایوب کی کہانی** ۔ یہ (۳۳) صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ کسی پادری کی زبانی قصص ایوب سن سن کر حضرت امجد اپنی نوجوانی میں بہت متاثر ہوئے تھے۔ روز موسیٰ کی طغیانی کے حادثے میں، ماں، بیوی، بچی اور دوسرے افراد خاندان ڈوبے تو حضرت امجد کی درمند طبیعت نے قصص ایوب کو بار بار یاد کیا اور انہیں" اپنے ہم مذاق اور ہم درد دوستوں کے سامنے ضروری ترمیم اور کسی قدر اضافے کے ساتھ، مناسب حال اپنے ہی قطعات، رباعیات اور اشعار کے ساتھ، پیش کیا، انداز نگارش پر مطالعہ گلستان کی گہری چھاپ یہاں بھی لگی ہوئی ہے۔ بلکہ کہنا چاہئیے کہ حضرت امجد کا اسلوب نگارش ہی یہی ہے۔ ایک حکایت اس طرح بیان فرمائی ہے۔

"سنتے ہیں کہ حضرت لقمان ابتداء میں کسی کے غلام تھے۔ ایک دفعہ ان کے آقا نے خربزہ کاٹ کر اس کی ایک قاش لقمان کو دی۔ لقمان نے قاش لی۔ اور سلام کر کے کھا گئے۔ پھر دوسری قاش دی، وہ بھی بے تکلف اڑا گئے۔ پھر تیسری قاش دی، وہ بھی خوشی خوشی پیٹ میں اتار گئے۔ چوتھی قاش خود مالک نے منہ میں رکھی۔ اور زبان پر رکھنے کے ساتھ ہی منہ بنا کر فوراً تھوک دیا۔ اور بہت دیر تک زبان صاف کرتا اور تھوکتا رہا۔ کیوں کہ وہ خربزہ نہایت کڑوا اور تلخ تر تھا۔ پھر بگڑ کر لقمان سے پوچھا۔ تم نے کڑوے خربوزہ کی تین قاشیں پے در پے بلا تکلف کھالیں اور ذرا بھی منہ نہیں بنایا۔ اور ینے سے انکار بھی نہیں کیا۔ لقمان نے کہا، اپنے آقا کی عطا سے کس طرح انکار کر سکتا جب آقا سے حلاوتیں نصیب ہوئی ہوں کیا اس کی ایک کڑوی چیز پر صبر نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ مالک کی دی ہوئی کڑوی چیز بھی غلام کے لیئے شہد و شکر سے کم نہیں ہوتی ؂
کیا کرے کوئی فرق مغز و پوست ÷ ہرچہ از دوست می رسد نیکوست!"

جذب عالمپوری

ہو فضل خدا تو عرش تک پہنچیں گے ÷ ہرگز نہ مضامیں کے لیے ترسیں گے
ہے سر پہ ہمارے دستِ فیضِ امجدؔ ÷ ہم صنفِ رباعی کو نہ مرنے دیں گے

خواجہ حمید الدین شاہد

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی سرمد ثانی ۲۹ مارچ ۱۹۶۱ء کو انتقال فرما گئے۔ اردو کے اس صاحبِ عرفان اور صوفی منش شاعر کی رحلت پر حیدرآباد دکن کی ساری فضا پر رنج و غم کے بادل چھا گئے، صبح ہوتے ہوتے حضرت امجد کی قیام گاہ پر عقیدت مندوں کا تانتا بندھ گیا۔ جنازہ کے جلوس میں ہزاروں پرستاروں اور بے شمار ادیبوں، شاعروں، عالموں اور معزز شہریوں نے شرکت کی۔ حیدرآباد کے ایک صاحبِ دل بزرگ حضرت عبداللہ شاہ صاحب قبلہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ درگاہ حضرت شاہ خاموش رح کے شہر خموشاں میں اپنی اہلیہ جمال سلمیٰ مرحومہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

اردو کے ممتاز اور منفرد رباعی گو شاعر حضرت امجد کی وفات پر پاکستان و ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا، بالخصوص حیدرآباد کی مختلف ادبی اور تہذیبی اداروں کی طرف سے تعزیتی جلسے منعقد ہوئے اور ان کی زندگی اور شاعری پر وہاں کے مشہور اہل قلم اصحاب نے مقالے پڑھے اور شاعروں نے ان کی روح کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ اس کے علاوہ شہر حیدرآباد کی سماجی اور سیاسی تنظیموں نے بھی حضرت امجد کی وفات کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ کیونکہ حضرت امجد نے اپنی لافانی شاعری کے ذریعے حیدرآباد کا نام اونچا کیا، اور اردو دنیا میں اپنا مقام حاصل کیا۔

آپ کی وفات پر ارکانِ حکومت، اہل علم اصحاب اور معززین شہر کے تعزیتی پیامات سے حضرت امجد کی شخصیت اور عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان پیامات میں سے چند کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

"محترمہ بیگم صاحبہ۔ آپ کے مایۂ ناز شوہر کی وفات کی خبر سن کر مجھے دلی رنج ہوا۔ ان سے مل کر خوشی ہوتی تھی اور میرے دل میں ان کے لیے بہت عزت اور پیار تھا۔ حیدرآباد بالخصوص اور ہمارا ملک عام طور ان کی گرامی قدر خدمات کو نہیں بھول سکتا۔ خدائے تعالیٰ ان کی روح کو شانتی اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے کہ آپ اس بھاری صدمے کو برداشت کر سکیں۔"

(بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش)

(اس تعزیت نامے کے ساتھ گورنر صاحب نے (۵۰۰) روپے بھی ارسال فرمائے)

"حضرت امجد کے انتقال کی خبر میں نے بڑے افسوس کے ساتھ اخبارات میں پڑھی۔ مجھے ان کی ذات سے ایک خاص عقیدت تھی۔ قیام حیدرآباد میں مجھے دو بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک صوفی منش

اور نیک انسان تھے۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند تھا۔ انہوں نے اپنی تمام تصانیف اور ایک تصویر مجھے عنایت کی تھی۔ یہ تصویر میرے بیڈ روم میں آویزاں ہے اور ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ ان کا جسم ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ہے۔ لیکن ان کی تصانیف اور ان کا کلام کبھی نہیں مر سکتا۔ حیدرآباد کے لیئے حضرت امجد کی موت ایک عظیم سانحہ ہے اور مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے۔"

(ڈاکٹر بی گوپال ریڈی وزیر حکومت ہند)

"مرحوم رباعی گوئی میں اپنی مثال آپ تھے اور عبرت و فنا و عبدیت و توحید کے مضمون اپنی نظموں میں اس خوبی، خوش اسلوبی اور دلآویزی سے ادا کرتے تھے کہ اہل غفلت بھی ہنگامی طور پر تو ضرور متاثر ہوکر رہتے تھے۔ ان کی حکیمانہ، عارفانہ شاعری نصف صدی سے دلوں کو گرمائے رکھے ہوئے تھی اور ان کی ذات فارسی کے پرانے صوفی شاعروں کی زندہ یادگار کا کام دے رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں برتر سے برتر مرتبہ لطف فرمائے۔"

(عبدالماجد دریابادی)

"حضرت امجد حیدرآبادی تنہا شاعر ہی نہ تھے بلکہ اس سے زیادہ حکیم و عارف اور صحیح معنوں میں اس دور میں سرمد اور ابوالخیر تھے۔ شاعری کو تو انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنالیا تھا۔ رباعی گوئی میں اس دور میں یگانہ تھے اکبر اور اقبال کے بعد حکیمانہ شاعری انہیں کے دم سے زندہ تھی۔ ان کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس لیے ان کی وفات تنہا دنیائے ادب و شاعری کا نہیں بلکہ حقیقتاً دنیائے دل کا حادثہ ہے۔"

(معین الدین احمد ندوی مدیر معارف)

"حکیم الشعراء حضرت امجد علیہ الرحمہ کی وفات کی خبر نے یوں تو تمام اردو دنیا میں غم و الم کی لہر دوڑا دی۔ لیکن حیدرآباد سب سے زیادہ اس صدمے سے متاثر ہوا ہے۔ حضرت امجد کے کلام سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کی ہم پلہ بن گئی بلکہ حیدرآباد کی عزت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا جس پر یہاں کے رہنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ گذشتہ دو صدیوں میں وہی ایک ایسے منفرد شاعر دکن میں پیدا ہوئے تھے جن کا احترام پوری اردو دنیا میں کیا گیا۔"

(ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

حضرت امجد جتنے بڑے شاعر تھے، اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے اور یہی وہ خصوصیت تھی جس کی وجہ سے ان کا ہر ملنے والا، ان کی شاعرانہ عظمت اور بزرگانہ شفقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی شخصیت اور انداز گفتگو میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ جو بھی ایک آدھ دفعہ ان سے مل لیتا، وہ ہمیشہ کے لیے ان کا ہو جاتا تھا۔ میں صحیح طور پر تو یہ نہیں بتا سکتا کہ حضرت امجد سے پہلی بار کب ملا تھا۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ وہ شروع ہی سے مجھ پر بہت مہربان تھے اور ایسی شفقت و عنایت کی نظر فرماتے تھے کہ میں روز بروز ان سے قریب ہوتا گیا۔ زندگی کے مختلف مسائل پر مجھے ان سے گفتگو کرنے کے مواقع ملے۔ وہ زندگی کے مشکل سے مشکل مسئلہ کو بڑی آسانی سے سمجھا دیتے تھے۔ اور ان کا انداز تفہیم اتنا معقول ہوتا تھا کہ ان کا مخالف بھی ان کی بات کا قائل ہو جاتا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں ایسی بات کہہ جاتے تھے جو کانوں کی

راہ سے دل میں اتر جاتی تھی۔

مجھے حضرت امجد کے ساتھ سفر کرنے کے بھی مواقع ملے۔ بہت دنوں کی بات ہے اورنگ آباد کالج (حیدرآباد دکن) کی طرف سے حالی کا صد سالہ جشن منایا گیا تھا، جس میں حضرت امجد بطور خاص مدعو کئے گئے تھے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ اس جشن میں شرکت کی تھی۔ ریل گاڑی کے تیسرے درجہ میں ہم دونوں سفر کر رہے تھے۔ اس درجہ میں سفر کرنے والے تقریباً سب کے سب غریب لوگ تھے۔ ہر اسٹیشن پر مسافروں کو چڑھنے اترنے میں بڑی زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ غریبوں کی زندگی کے مختلف مناظر کو دیکھ کر حضرت امجد بہت متاثر ہو گئے اور مجھ سے فرمایا "سوا ابھی میں نے دو رباعیاں کہیں ہیں۔ ایک غریب کی زبانی اور دوسری امیر کی زبانی۔ امیر غریب کو اس طرح بڑی حقارت سے مخاطب کرتا ہے۔"

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں ؛ مردود درِ حبیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا ؛ معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

غریب کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور وہ امیر سے مخاطب ہو کر جواب دیتا ہے کہ آپ کو ہمارے جینے پر تعجب ہوتا ہے۔ اور وہ امیر سے مخاطب ہو کر جواب دیتا ہے کہ

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں ؛ سر چڑھ کے زمین میں اترتے کیوں ہیں
رکھ کر بھی تمام زندگی کے ساماں ؛ معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

حضرت امجد اردو کے ان چند باکمال اور صاحب دل شاعروں میں سے تھے۔ جنہیں زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے۔ دکن کی سرزمین شروع ہی سے اردو شاعری کا گہوارہ رہی ہے۔ جس میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ولی، سراج، فیض، کیفی، علی اختر، توفیق، علی منظور اور صفی جیسے باکمال شاعروں نے نشوونما پائی جنکی شاعری کی آب و تاب نے آسمان شاعری میں چار چاند لگائے۔ موجودہ دور کے شاعروں میں حضرت امجد کی ایک نمایاں حیثیت ہے اور وہ ہے ان کی حقیقت نگاری، بالخصوص آج کی مادہ پرست دنیا میں جہاں روحانیت اور خدا پرستی کا مفہوم محض خیالی بن کر رہ گیا ہے، ان کے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات نے اردو شاعری کے اخلاقی اور روحانی اقدار کو باقی رکھنے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ ان کا متصوفانہ اور روحانی کلام مشعل ہدایت بن کر بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ ان کی شاعری کا محور اخلاقیات، انسانیت کا احترام اور روحانی تعلیم ہے۔ یہی ایک ایسی انفرادی خصوصیت ہے جو اردو دنیا میں حضرت امجد کی شہرت اور مقبولیت کا باعث بنی۔ اگرچہ کہ ان کا کلام مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ لیکن رباعی گو شاعر کی حیثیت سے انہیں لازوال شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ان کی رباعیات اتنی بلند پایہ ہیں کہ اردو ادب میں شاید ہی ان کا جواب مل سکے۔ امجد ہی سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اُردو دنیا میں نام پیدا کیا۔ ان کی رباعیوں میں سلطان ابوسعید ابوالخیر اور سرمد کا رنگ جھلکتا ہے، اس لیے ان کو "زندۂ سرمد" بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ غلام قادر گرامی مرحوم نے اپنی ایک رباعی میں ان کو "جواب سرمد" کہا ہے،

امجد بہ رباعی است فرد امجد ؛ کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز ؛ روح سرمد بگفت امجد امجد

حضرت امجد کے کلام کی انفرادیت سے متاثر ہو کر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے رسالہ "معارف" بابت فروری ۱۹۳۲ء کے شذرات میں اس طرح اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا تھا۔

"معارف کا یہ شیوہ نہیں کہ شاعروں کو خطابات بانٹے لیکن حضرت امجد کی توبہ نو حکمت آموز شاعری نے اس کو اعتراف فضل پر مجبور کیا اور لفظ حکیم الشعراء سے واقعہ کا اظہار کیا۔"

اردو کے پہلے پروفیسر مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے اپنے مضمون "دکن میں ایک رباعی گو شاعر" میں حضرت امجد کے علم و فضل اور کمال شاعری کا اس طرح اعتراف کیا ہے۔

"یہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہل بصیرت کے لیے ہوش ربا ہے۔ وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی پروا نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں۔ خود خیال ہی اپنے لیے لباس تیار کر لیتا ہے۔ اور اس کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ قدرتی شاعری کی یہ پہچان ہے۔ ان کی رباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی اور اردو ادب کا اہم عنصر خیال کی جائیں گی۔"

غرض حضرت امجد کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک باکمال شاعر کے لیے ضروری ہیں۔ قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ شاعرانہ جذبات ان کی فطرت میں ودیعت کئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام حقیقت اور فطرت سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک شعر نہیں کہتے تھے، جب تک ان کے دل پر کوئی کیفیت طاری نہیں ہو جاتی تھی اور اسی کیف و مستی کے عالم میں ان کے دلی جذبات اشعار کی صورت میں جلوہ گر ہوتے تھے۔

شعر کی تاثیر کے بارے میں وہ اپنی ایک رباعی اور ایک قطعہ میں اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں۔

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے ۔ مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر با اعتبار فن خوب کہا ۔ لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

....

کلام ایسا اکثر سنا ہوگا تم نے ۔ سنا آج اور کل اتر دل میں اترا
کہو شعر ایسا کہ ہو تیر خنجر ۔ ادھر منہ سے نکلا ادھر دل میں اترا

"خرقۂ امجد" کے دیباچہ میں انہوں نے شاعری کے بارے میں اپنے تصورات پیش کئے ہیں۔ جو حرف بہ حرف خود ان کی اپنی شاعری پر صادق آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"شاعری، موسیقی، مصوری۔ فنون لطیفہ ضرور ہیں مگر نااہلوں نے کثیف تر بنا دیا ہے۔ مچھ سا بلبلے شعور بھی شعر کہتا ہے، ہر لڑکا گلیوں میں گاتا پھرتا ہے، مکتب کے بچے بھی تصویر بناتے ہیں، وزن کے اعتبار سے شعر، لحن کے اعتبار سے راگ۔ آنکھ ناک کے اعتبار سے تصویر تو ضرور ہے لیکن کوئی صاحب فن کیا ان کو فنون لطیفہ میں شمار کر سکتا ہے؟"

"شعر ہو یا راگ جب تک سامع کو بے خود نہ کر دے، بارد فطرت میں حرارت نہ پیدا کر دے، قدیم کافر کو مسلمان نہ بنا دے، کثیف مادے میں لطیف روح نہ پھونک دے، فنون لطیفہ میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔

ہر شعر ایک مکمل راگ یا تصویر ہوتی ہے۔ جس طرح تصویر میں مصور کو ہر عضو اپنی اپنی جگہ اور خوبی اور موزونیت کے ساتھ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعر کو بھی ہر لفظ اپنے اپنے مقام پر بغیر کسی تعقید کے رکھنا پڑتا ہے۔ اس ترتیب کے قطع نظر تناسب اور توازن بھی ضروری اور لازمی چیز ہے اگر ناک کی جگہ کان تو بنائی جائے مگر اصل صورت کے اعتبار سے بڑی یا چھوٹی کر دی جائے تو تعداد اجزا کے اعتبار سے تصویر تو مکمل ہوگی مگر مضحکہ خیز اسی طرح موزوں نظم بھی اپنی بدنظمی اور غیر مناسب اور ثقیل الفاظ اور دور از فہم استعارات اور تلمیحات کی وجہ سے "شعر گفتن چہ ضرور بود" کا مصداق ہوجاتی ہے نظم ہو یا نثر، تقریر ہو یا تحریر اس کا کچھ نہ کچھ حاصل ہونا چاہیے۔ دینی یا دنیوی، خود اپنے لیے یا غیر کے لیے۔ جس نظم و نثر میں اس امر کا لحاظ نہ ہو اور محض قافیہ پیمائی اور خامہ فرسائی کی جائے بازیچۂ اطفال ہے، حقیقت نگار شاعر کو سطحیات کی طرف کم توجہ ہوتی ہے اور صنائع و بدائع ظاہری اور لفظی نمائش کے حدود سے اس کا خیال ارفع، اعلیٰ ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنے کامل جذبات کے اظہار کے لئے بعض اوقات قدیم قیود رسمی اور فرضی کو توڑ دینا پڑتا ہے۔

رباعیات امجد حصہ اول کے دیباچے میں خود اپنی شاعری کے متعلق رقم طراز ہیں کہ "لطف زبان اور لطافت شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ زبان گیر دل شکن حرف گیروں کی خاطر سے میں نے اپنے مذاق میں کوئی تبدیلی نہیں کی، محض ضمیر کی اس آواز کو (جو مبدء فیاض کا فیضان خاص ہے،) اپنی زبان اور سادہ لفظوں میں فرض کے طور پر ادا کر دیا ہے۔

مذکورہ بالا تحریروں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نظریۂ شعر اور تصور شاعری کے بارے میں حضرت امجد کا کیا معیار تھا۔ انہوں نے اس معیار سے اپنے کلام کو کبھی گرنے نہیں دیا اور ان کی شاعری کی ساحری نے دلدادگان شعر و ادب کو کلام امجد کا گرویدہ بنا دیا۔ حقیقت نگاری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ محاسن لفظی ندرت بیان اور طرز ادا کے بانکپن نے ان کی شاعری میں انفرادیت کی شان پیدا کر دی۔

امجد کا کلام پُر تاثیر ہونے کے علاوہ نہایت سلیس عام فہم اور وجد آفریں ہوتا ہے۔ اور لطف تو یہ ہے کہ لفظی اور معنوی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود رہتی ہیں۔ سادگی اور روانی کا یہ عالم کہ نظم نثر معلوم ہوتی ہے تشبیہات اور استعاروں کو بڑی چابکدستی اور سلیقے سے اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں لیکن یہ بوجھل اور قوانین فطرت سے متجاوز نہیں ہونے پائے اور نہ مذاق سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں فلسفہ کی جھلک ہے تو کہیں تصوف کی چاشنی، کہیں درد و غم کا بیان ہے تو کہیں اخلاق و انسانیت کا درس۔ عام شاعروں کی طرح وہ صرف قافیہ پیمائی نہیں کرتے بلکہ ان کے ہر شعر میں اہل دنیا کے لیے ایک پیغام اور درس عمل ہوتا ہے۔ ان کے حسب ذیل قطعات اور رباعیوں میں اہل دانش و بینش کے لیے بہت کچھ ہے۔

جہاں کو ناز ہے ہستی پہ اپنی ؎ میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطف خاکساری ؎ تنزل میں ترقی کر رہا ہوں

ہے اور یقینی ہے یہی سب کی صدا ہے ⁂ لیکن نہیں معلوم کہ وہ کون ہے کیا ہے
کیا کوئی کہے اس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے ⁂ ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

کچھ عجب ہے یہ مادی دنیا ⁂ دور تک اس کا دور جاتا ہے
شمع پروانے کو جلاتی ہے ⁂ شمع کو بھی کوئی جلاتا ہے

یہ خورشید و قمر کیا دیکھتے ہو ⁂ فضائے بحر و بر کیا دیکھتے ہو
کسی کے حکم سے سب ہو رہا ہے ⁂ اُدھر دیکھو، اِدھر کیا دیکھتے ہو

کیا جانئے وہ نور تھا یا سایہ تھا ⁂ شعلہ سا کسی نے دل میں بھڑکایا تھا
آیا کس وقت یہ تو معلوم نہیں ⁂ جاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں آیا تھا

چھپنے کا عجب ڈھنگ نکالا اس نے ⁂ کیا کام کیا ہے بالا بالا اس نے
اپنی بے پردگی چھپانے کے لیئے ⁂ میری آنکھوں پہ پردہ ڈالا اس نے

عارض ہو کہ خط و خال میرا کب ہے ⁂ نقصان ہو یا کمال میرا کب ہے
مانا کہ مرا خیال ہی ہے سب کچھ ⁂ لیکن میرا خیال میرا کب ہے

حضرت امجد ایک خدا رس اور صاحب باطن صوفی تھے۔ سلوک و معرفت پر ان کی گہری نظر تھی۔ تصوف کے مشکل سے مشکل مسئلے کو چار مصرعوں میں اس طرح آسان بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہر آدمی کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث سے ہٹ کر انہوں نے کبھی کوئی بات نہیں کہی۔ ان کی ہر رباعی کسی نہ کسی آیت قرآنی کی تفسیر یا حدیث کی تشریح ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

ادعونی استجب لکم

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے ⁂ اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ ⁂ یہ دست دعا خدا کا دروازہ ہے

لاموجود الا اللہ

[illegible]

رہنا سہنا جس طرح امجد صاحب کا لباس اور غذا معمولی اور سادہ ہوتی تھی اسی طرح آپ کی بود و باش بھی سادہ تھی۔ تصنع تکلف سے ہمیشہ دور رہے۔ مگر صفائی پاکیزگی کو محبوب رکھا آپ کے گھر میں ہمیشہ مہمان رہا کئے۔ مہمان نوازی آپ کی زندگی کا جز بنی رہی مہمانوں میں عورت، مرد، بچے سب ہی شامل ہوتے بعض مہمان ہفتہ دو ہفتہ مہینہ دو مہینہ نہیں بلکہ چھ چھ آٹھ آٹھ ماہ بھی مہمان بنے رہے مگر ذات امجد کی مہمان نوازی میں کبھی فرق نہیں آتا تھا۔ اور نہ مہمان سے تنگ آتے تھے۔

اگرچہ امجد صاحب کے یہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مہمان رہتا تھا مگر آپ کو کسی کے یہاں مہمان رہنا پسند نہیں آتا تھا۔ صرف ایسے دو چار ہی اصحاب تھے جن کے پاس امجد صاحب مہمان رہتے تھے، وہ ہفتہ عشرہ قیام کرتے تھے خود حتی الامکان مدد دیتے تھے۔

امجد صاحب کے دوستوں کا دایرہ نہایت وسیع تھا اور ملنے والوں کی تعداد تو سینکڑوں سے بڑھی ہوئی تھی ہر شخص یہ تصور کرتا تھا کہ امجد صاحب اسی کو زیادہ محبت کرتے ہیں۔ سب دوستوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ، اخلاص و محبت کا رہا کرتا۔ آپ کبھی اپنے دوستوں، مہمانوں اور ملنے والوں میں اعلیٰ اوسط، اور ادنیٰ کی کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ سر اکبر حیدری ہوں یا سر امین جنگ، نواب مہدی یار جنگ ہوں یا نواب مہدی نواز جنگ ہوں یوسف علی صاحب ہوں یا محمد احمد صاحب انصاری، محبوب علی صاحب ہوں یا اسد اللہ صاحب، حکیم خسرو شاہ صاحب ہوں یا حکیم عبدالصمد صاحب، ڈاکٹر زور صاحب ہوں یا سروری صاحب، سید محمد صاحب ہوں یا اکبر الدین صدیقی، خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ہوں یا ہاشمی سب سے ایک ساتھ خلوص و یگانگت سے ملتے تھے۔

امجد صاحب کے معتقدین میں ایک بڑا حصہ خواتین کا بھی تھا اور آپ کے مریدوں میں چند خواتین بھی شامل تھیں۔ اکثر عورتوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ تعویذ فلیتے صدقے، نذر و نیاز کی بڑی معتقد ہوتی ہیں مگر امجد صاحب کبھی کسی کو تعویذ دیا کرتے اور نہ فلیتے، نہ صدقہ بتاتے نہ نذر و نیاز کی ترغیب دیتے۔ امجد صاحب کے پاس صرف دعائیں یا دم کیا ہوا پانی تھا جو مریضوں کو دیا کرتے۔

اخلاق و عادات امجد صاحب ایک شاعر تھے اس کے ساتھ ایک صوفی بھی شاعر اور صوفی کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہر صوفی شاعر نہیں ہوتا اور نہ شاعر صوفی ہوتا ہے۔ شاعر تخیل کی نگرانی میں رہنے والا افکار کی بوقلمونی میں حیران شعر کی دھن میں۔ نیز والا مبالغہ کی دنیا میں بسنے والا ہوتا ہے۔ اور صوفی اللہ سے دل لگاتا ہے۔ ذات وحدہٗ لاشریک کی یاد میں منہمک رہنے والا، حق پر عمل کرنے والا ہوتا ہے امجد صاحب دونوں تھے۔ شاعر بھی اور صوفی بھی۔ اس لئے آپ کی شاعری کا خاص رنگ رہا۔ نظمیں ہوں یا تضمین غزلیات ہوں یا رباعی ہر ایک میں قرآن کی تفسیر، قرآن کی تشریحیں۔ قرآن کی باتیں ملتی ہیں۔ آپ کی شاعری سے بخوبی واضح ہوتا ہے ان کا خالق شاعری کے ساتھ بڑا صوفی۔ بڑا سالک ہے۔

امجد صاحب کو صوفی تصور کر کے دنیا کی دلچسپیوں سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا آپ سینما دیکھا کرتے تھے۔ قوالی کے ساتھ طوائفین کا کہیں گانا ہو تو اس کے سننے سے اجتناب نہیں تھا۔

مجلس سماع سے خاص لگاؤ تھا، مجلس میں آپ تڑپتے اور لوٹتے نہیں البتہ رو لیا کرتے تھے۔

امجد صاحب کو نام و نمود کی خواہش نہیں تھی۔ شیخی نہیں کرتے تھے۔ دنیاوی جاہ و جلال، مال و دولت کی کبھی ہوس نہیں کی۔ ملنساری اور مروت آپ کے خاص کردار تھے۔

بچوں سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ آپ کی اولاد زندہ نہیں رہی۔ اپنی سالی کی ایک دختر کی پرورش کی اور اس کی شادی کر دی۔ ایک اور بچہ کی پرورش کرتے تھے۔ اس کی ناز برداری حقیقی بچہ کی طرح کرتے رہے۔ امجد صاحب کی خانگی زندگی میں جب تک آپ کا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ ظاہر نہ کیا جائے، مضمون مکمل نہیں ہو سکتا۔

جمال النساء بیگم مرحوم کی زندگی اور ان کے ساتھ امجد صاحب کا جو سلوک رہا اس کی وضاحت جمالِ امجد اور حجِ امجد سے ہوتی ہے۔ البتہ جمال النساء بیگم کے بعد جس محترمہ سے آپ کا عقد ہوا میں ان کے متعلق مختصر صراحت کر سکتا ہوں۔

امجد صاحب کی بی بی تعلیم یافتہ نہیں مگر بڑی باسلیقہ، تدبیر منزل سے واقف تھیں۔ اس لیے امجد صاحب کی خانگی زندگی بڑی خوش گوار ثابت ہوئی۔ چونکہ امجد صاحب کی بی بی مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے سنی ہوئی باتیں نہیں بلکہ دیکھی ہوئی باتوں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ میاں بی بی کی زندگی بڑی خوشگوار، خوش و خرم بسر ہوتی رہی۔ سلیقہ شعاری اور شوہر کی طبیعت سے واقف ہونے کے باعث، دونوں میں انس و محبت خلوص تھا۔ شوہر کو بی بی کا خیال تھا۔ ان کو اسلامی قانون کے مطابق آزادی دے رکھی تھی۔ ان کی ناز برداری کرتے تھے۔ ان کے فرمائش کی تعمیل کرتے تھے۔ بی بی شوہر کی اطاعت گزار تھی۔ فرمان برداری کو مقدم سمجھتی تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے کبھی دونوں میں لڑائی نہیں ہوئی۔ اگر کوئی نامناسب بات ہو جائے تو دونوں چشم پوشی کرتے تھے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ امجد صاحب نے بی بی کو اسلامی قانون کے مطابق آزادی دے رکھی تھی۔ امجد صاحب کے بعض خاص دوستوں سے وہ پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ان سے بات چیت کی ممانعت نہیں تھی۔ ان کو پہننے اوڑھنے آرائش کی پوری آزادی تھی۔ کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔ حسب استطاعت ان کی فرمائش کی تکمیل کرتے تھے۔ نرمی و ملائمت سے گفتگو کرتے، خوش مذاق، خوش طبعی بھی ہوتی تھی۔ کبھی امجد صاحب امور خانہ داری میں بی بی کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ گھر کی ضروریات آپ خود عرصہ تک لاتے رہے اسی طرح بیوی بھی میاں کی راحت و آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتی تھی۔ بے جا فرمائش نہیں کرتی۔ شوہر کی فرمان برداری کو مقدم سمجھتی تھی۔ دونوں سکھ چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔

جب تک میرے پاس موٹر تھی امجد صاحب کو کہیں جانا ہوتا تو میرے ساتھ چلتے تھے۔ اور اپنے ملنے والوں سے میرا تعارف شاگرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت سے کراتے تھے۔ میں نے ۱۹۳۴ء میں ایک کتاب حضرت امجد کی شاعری کے نام سے اور ۱۹۳۵ء میں مکتوبات امجد شایع کیا۔

گل گلشن، جنگل بیاباں، تالاب، نہر خوش نما قدرتی مناظر سے امجد صاحب کو دلچسپی تھی اور پکنک کے طور پر اپنی بی بی کے ہمراہ ایسے مقامات کو جاتے تھے۔

امجد صاحب کے احسانات بہت سارے اصحاب پر ہیں۔ خود مجھ پر آپ کے جو احسانات تھے اور جس طرح آپ میری رہنمائی فرماتے تھے اس کا اظہار دشوار ہے۔

امجد صاحب کا گھر میرا گھر تھا۔ امجد صاحب کا توشہ خانہ ہمیشہ میرے شکم سیری کا سامان کرتا تھا۔ میرے درد، دکھ، پریشانی، خصوصاً دفتری زندگی کی سوہان روحی کے لیے امجد صاحب کی حکیمانہ پُر خلوص نصیحت اور محبت آمیز ہمدردی اور صحیح راہنمائی اور رہبری قدم قدم پر مجھے مدد دیتی رہی۔

میں امجد صاحب کی شاگردی میں ۱۹۱۱ء میں داخل ہوا۔ چار سال تک روز مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی اس کے بعد تقریباً ۱۰ سال تک دو دو، تین تین ہفتہ یا مہینہ میں ایک بار ملتا رہا۔ پھر وہ زمانہ آیا جب کہ ایک دن آڑ امجد صاحب سے ملاقات ہوتی رہی۔ یہ دور تقریباً دس سال کا طویل زمانہ ہے۔ جب میری مصروفیت زیادہ ہوگئی اور موٹر میں نے نکال دی تو ایک دن آڑ آنے سے آپ نے منع کر دیا لیکن ہفتہ یا دو ہفتہ کی ملاقات آخر تک باقی رہی۔ گذشتہ عید الفطر میں حسب عادت ملاقات کے لیے گیا۔ مزاج صاف نہیں تھا۔ لیٹے ہوئے تھے۔ دعا دی۔ آنے سے خوش ہوئے اس کے بعد مرنے سے تین دن پہلے پھر حاضری دی گئی آپ کی زبان پر غالب کا یہ شعر جاری تھا۔

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے ۞ آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

شعر پڑھتے رہے اور سر دھنتے رہے۔ امجد صاحب کے مکان سے واپس آیا تو رات میں بخار اور درد گردہ میں مبتلا ہوگیا۔ جس دن انتقال ہوا میں (۱۰۳) درجے بخار میں مبتلا تھا۔

پچاس سال کی ملاقات کے باوجود بدقسمتی سے نہ تو آخری دیدار کر سکا نہ دفن میں شریک رہا اور نہ سیوم کی فاتحہ میں۔

میری اہلیہ امجد صاحب کی مرید تھی۔ جب وہ وسط رمضان ملاقات کے لیئے گئی تھی تو ان کو اپنے عنقریب مرنے کی اطلاع دیدی تھی۔ مجھے امجد صاحب نے اپنا مرید نہیں کیا۔ ہر مرتبہ میری خواہش کو آئندہ پر ٹالتے رہے۔ مرید نہ کرنا تھا نہ کیا۔ باوجود، محبت، شفقت خلوص مرید نہ کرنا میرے لیئے موجب حیرت اور افسوس کا باعث بنا ہوا ہے۔

امجد صاحب نے عظمت اللہ خان صاحب مرحوم کے مرثیہ میں ایک شعر لکھا ہے جو مجھ پر بھی صادق آتا ہے ؎

محروم رہے آخری دیدار سے بھی ہم

گویا گئے گذرے ہوئے اغیار سے بھی ہم

العظمت اللہ

عظیم الدین محبت (ایم، اے)

امجد بہ حیثیت غزل گو

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ چونکہ فارسی کا اثر اردو شاعری پر پڑا، اس لئے غزل کا سانچہ بھی فارسی زبان سے مستعار لیا گیا۔ اردو غزل میں وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جو فارسی غزلیات کا طرۂ امتیاز ہیں۔ گل و بلبل، فراق و وصال، دشنہ و خنجر، زلف و گیسو وغیرہ ہی غزل کے اہم موضوع رہے ہیں، تیر، ترکش، خنجر، فتراک، بخیہ اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ کے استعمال اور روایتی عشق کے فراق و وصال کے موضوعات اور جذبات پوری شدت کے ساتھ پیش کرنے کا نام شاعری کہلاتا تھا۔ مقررہ موضوعات پر ہی خامہ فرسائی ہوتی تھی، بقول مولانا حالی چبائے ہوئے نوالوں کو ہی مکرر چبایا جاتا تھا" موضوع ایک ہی ہوتا تھا، بات ایک ہی ہوتی تھی لیکن بات کرنے کا ڈھنگ جدا ہوتا تھا۔ اردو شعرا کے دواوین پر نظر ڈالی جائے تو مستقل موضوعات کی تکرار ہی تکرار نظر آئے گی، اس قسم کی اندھی تقلید ہر شاعر نے کی ہے۔ مشاعرہ میں سفلی اور شہوانی جذبات کو الفاظ کے جامہ میں پیش کر کے سامعین سے داد حاصل کر لینا ہی کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ کچھ تو عوام ذہنی طور پر گندگی کا شکار تھے۔ اس پر شاعر کی ذہنی عیاشی توسن پر تازیانہ کا کام دے گئی۔

یہ اردو ادب کی بے مائیگی ہے کہ اکثر شاعروں کی شاعری حسن و شباب سے شروع ہوئی اور عشق و محبت پر ختم ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تخلیقات۔ تفریحی اور سطحی بن کر رہ گئیں اور یہ سلسلہ برسوں سے چلا آرہا ہے امجد نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت سرزمین دکن میں شمالی ہند کے دو ممتاز اساتذہ امیر مینائی اور فصیح الملک داغ کی نواسنجیوں سے فضا گونج رہی تھی، شعراء کی تعداد بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں تھی۔ ردیف قافیہ اور بحر کی تبدیلی کے ساتھ الفاظ کی الٹ پھیر سے پٹے ہوئے مضامین پر ملمع سازی عام ہو چکی تھی جس کی وجہ سے ان کی قوتِ فکر ختم ہو گئی تو لازماً فکری بے مائیگی کا شکار ہو گئے، شراب خانہ سے کوچۂ یار تک کا فاصلہ پیمائی کرتے کرتے جب تھک جاتے تو گھر آکر رات بھر آہ و زاری کرتے تھے، جس سے ہمسایوں کی نیند اچاٹ ہو جاتی تھی۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

معاشرہ اور ماحول کی پستی شاعروں کی اخلاقی پستی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کے باعث شعراء نے قدما کی کورانہ تقلید کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ داغ کے چند اشعار سے اس زمانہ کے ماحول کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے

وصل میں تنگ آ کے وہ کہنے لگے ٭ کیا یہ جوبن تھا اسی دن کے لیئے

مزاج ہے کہ اس انداز سے ہوں پیار کی باتیں ٭ ہمارا ہاتھ سینہ پر تمہارا ہاتھ گردن میں

جو مرے دل میں ہے کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے ٭ گدگداؤں تو کہوں پاؤں دبالوں تو کہوں

تمہاری طرح بھی ہوگا نہ کوئی ہرجائی ٭ تمام رات کہیں ہو کہیں ہو سارا دن

جو یوں ہو وصل تو مٹ جائے سب رنج ومحن اپنا ٭ زبان اپنی دہن ان کا زبان ان کی دہن اپنا

ہم بوسہ لیکے ان سے عجب چال چل گئے ٭ یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا

دی موذن نے اذاں وصل کی شب پچھلی رات ٭ ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

لے لیئے ہم نے لپٹ کر بوسے ٭ وہ تو کہتے رہے ہر بار یہ کیا

سبک الفاظ، سادگی بیان کے اعتبار سے شعر اچھے کہلائے جا سکتے ہیں مگر مذکورہ بالا اشعار پر اخلاقی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو یہ کس قدر گھناونے ماحول اور گندے معاشرہ کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب کہ روایتی معشوق بالکل بازاری بن چکا تھا بازاری محبوب میں شرم وحیا اور حجاب کہاں ہوتا ہے اس سے وفا کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ بے وفا ہوتا ہے، ظالم ہوتا ہے، جلاد ہوتا ہے اس کے چاہنے والوں، حالت فارسی کے اس مشہور شعر کی تفسیر ہوتی ہے۔

بیا جاناں تماشہ کن کہ در انبوہ جانبازاں
بصد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

غزل میں ابتذال اس حد تک پیدا ہوگیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کچھ توجہ رکھنے والے شعرا بھی آلودگی سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ علامہ حیدر علی نظم طباطبائی جنھوں نے انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ کرکے اردو ادب میں گرانقدر اضافہ کیا۔ جب غزل گوئی پر اتر آئے تو ماحول سے متاثر ہوکر اسی انداز کے شعر لکھنے پر مجبور ہوگئے طباطبائی جیسے جید عالم کی شخصیت پر غور کرتے ہوئے جب ہم دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ بڑھاپا سالی کے باوجود بھرے مشاعرہ میں بڑی ہی بے تکلفی سے فرماتے ہیں کہ: ؎

چلے ہیں غیر کیا کیا جب مری محفل سے وہ نکلے ٭ پریشاں باندھ کر جوڑا دوپٹہ اوڑھ کر الٹا

پامال مضامین کی تکرار کی وجہ سے عجز و شاعری ناپید ہونے لگی تو ذہنی تنزل نے نئی راہوں کی تلاش شروع کی۔
اس طرح ہزل اور ریختی کو فروغ ہونے لگا۔ چنانچہ اس دور میں مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں جہاں نظم طباطبائی، فانی بدایونی، نظام شاہ لبیب، صفی اورنگ آبادی اور یگانہ جیسے اساتذہ اپنے کلام کی داد حاصل کرتے تھے۔ وہاں ریختی کے شاعر بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان ریختی گو شعراء میں ایک حضرت کا تخلص بیگم تھا۔ ان کا شعر سنئے۔

اری ماما پانی سے بھر دے لگن کو
ذرا میں بھی دیکھوں گی سورج گہن کو

اس قسم کی شاعری عوام کے انحطاط پذیر مذاق سخن کی روشن دلیل ہے۔ ایسے ہی شاعروں کے متعلق اقبال نے کہا ہے ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

امجد کی شاعری نے ایسے ہی ماحول میں جنم لیا۔ لیکن اس گندہ ماحول کے سفلی جذبات و خیالات کے ساتھ کبھی ذہنی سمجھوتہ نہیں کیا، انہوں نے قدیم دبستان کے بازاری محبوب سے نظر بازی نہیں کی انہوں یہ نہیں کہا کہ ان کے معشوق کا قد بوٹا سا ہے۔ جسم سڈول ہے، بازو بھرے ہوئے ہیں، شانے مدور ہیں اور گردن صراحی دار ہے۔
اس کے برخلاف ان کا "نگارِ غزل" باوقار اور شائستہ ہے جو چوپال کی بجائے حریمِ ناز ہی میں جلوہ افروز رہتا ہے جیسے اپنی عزت و آبرو کا بھی پاس ہے۔
امجد کو شاعری کا چسکا ناسخ کے دیوان کے مطالعہ سے ہوا چنانچہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں انہوں نے پہلا شعر جو موزوں کیا وہ یہ ہے۔ ؎

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسمان اپنا
مگر یارب نہ ہوتا مہرباں وہ مہرباں اپنا

انہوں نے غزل سے زیادہ رباعیات کی طرف توجہ دی۔ امجد افکار کی بلندیوں کے باعث میدان شاعری میں نقارے بجاتے ہوئے داخل ہوئے۔ ان کی اس طرح پُرشکوہ آمد پر ادیب اور شاعر حیران تھے۔ تو نقاد اور مورخ مبہوت، امجد نے دیکھتے ہی دیکھتے میدان شاعری میں اپنے نام کا جھنڈا گاڑھ دیا۔ کلام کی گراں مایگی کے باعث "مخزن اور زمانہ" جیسے معیاری رسائل ان کا کلام شائع کرنے کو فخر سمجھتے تھے۔
امجد نے صاف ستھری اور پاکیزہ خیالات سے بھرپور جو غزلیں پیش کی ہیں وہ یقیناً اردو ادبِ عالیہ میں شاہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ غزلوں میں فلسفیانہ رنگ دے کر صوفیانہ خیالات کی تبلیغ جس انداز میں کی وہ انہیں کا حصہ ہے ان کی غزلیات کی اہم خصوصیت ان کا مذہبی رنگ ہے۔ جس میں ان کے قلب و ذہن پوری شدت کے ساتھ کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان کے دماغ میں کوئی مذہبی نکتہ آتا ہے تو ان کا دل پوری شدت کے ساتھ آواز دیتا ہے اور یہی آواز دوسروں کے نزدیک شعر کہلاتی ہے۔ قرآنی آیات و احادیث کو سیدھے سادے الفاظ میں اشعار کا جامہ پہنا کر ان میں وہ تاثیر پیدا کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کے دل بے اختیار پھڑک اٹھتے ہیں۔

اور ایک باکمال شاعر ہی ایسا کرسکتا ہے۔

امجدؔ کی بیشتر غزلیں تصوف کا دریا ہیں۔ انہوں نے غزلوں کے ذریعہ بھی معرفت کے خم کے خم لنڈھائے ہیں۔ ان کی غزلیں لفظی گورکھ دھندا نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی قلبی واردات کا آئینہ ہیں۔ وہ اپنی غزلوں کے ذریعہ تصوف اور فلسفہ کے مسائل سے روشناس کراتے ہیں۔ غزل میں عموماً غیر مربوط خیالات ہوتے ہیں مگر امجدؔ کی غزلیں منتشر خیالات کے باوجود نظم معلوم ہوتی ہیں۔ امجدؔ کی غزلوں میں روایتی عشق اور معشوق کی مبالغہ آمیز طرح طرلی نظر نہیں آتی۔ انہوں نے ابونواس کے اس قول کو جھٹلا دیا ہے کہ سب سے زیادہ مبالغہ سے کام لینے والا ہی سب سے بڑا شاعر ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں مصنوعی عشق اور ارضی محبوب کا ہجر بہت کم پایا جاتا ہے۔ اور جمالیات کا نہایت ہی پاکیزہ احساس جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک عشق ایک مقدس امانت ہے جسے نہاں خانۂ دل ہی میں محفوظ رہنا چاہیئے۔

جس طرح امجدؔ کی رباعیات میں روانی اور زور ہے اسی طرح ان کی غزلوں میں سلاست اور گھلاوٹ کے ساتھ ساتھ روانی بھی ہے۔ امجدؔ بلاشبہ اقلیم رباعی کے شہنشاہ ہیں۔ مگر ان کا یہ شاہانہ شکوہ غزلوں میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ جس طرح ان کی رباعیات اپنی گھن گرج کے باعث دلوں میں تیر کی طرح اتر جاتی ہیں۔ اسی طرح ان کی غزلوں کے بولتے ہوئے اشعار بھی نشتر کی طرح دل میں پیوست ہوجاتے ہیں۔

ہر نومشق شاعر ابتداء میں قدماء کے دواوین سے یا ہمعصر شعراء کے کلام سے خوشہ چینی کرتا ہے اور انہیں کا تتبع کرتا ہے۔ ذوقؔ جیسا استاد بھی میرؔ کے تتبع کی کوشش کرتا ہے لیکن کامیابی نہ ہوسکی تو اعتراف کرتے ہی بنی کہ

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

امجدؔ نے نہ تو کسی کا تتبع کیا اور نہ کسی شاعر کے رنگ کو اپنانے کی سعی کی بلکہ ان کی شاعری انفرادی شان کے ساتھ پروان چڑھتی گئی۔ اردو کے شاعروں میں بہت کم غزل گو ایسے گذرے ہیں جنہوں نے غزل کو ذہنی شعور کی نشو و نما کے لیئے استعمال کیا ہے۔

دردؔ کے بعد ہمیں صرف نظام شاہ لبیبؔ، عبدالقدیر حسرتؔ اور توفیق حیدرآبادی کے علاوہ کوئی اور شاعر ایسا نظر نہیں آتا جس نے غزلوں میں صوفیانہ خیالات کثرت سے پیش کئے ہوں۔ امجدؔ نے جو راہ اختیار کی وہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ ماحول کی اصلاح کی خاطر ماحول سے انحراف کرکے جو چیزیں پیش کرنے میں ناکامی ضرور ہوتی ہے۔ مگر امجدؔ نے ناکامی کا منہ کبھی نہیں دیکھا بلکہ خلاف توقع انہیں قبولیت عامہ کا شرف حاصل ہوتا رہا۔

رباعیات کی طرح ان کی انفرادیت غزلوں میں بھی برقرار ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے بھی وہ ایک نمایاں مقام کے مالک ہیں۔ ہمارے شاعروں کو چاہیئے کہ وہ امجدؔ کی غزلوں کا مطالعہ کریں۔ وہ اپنی فکری صلاحیتوں کو صحیح طریقہ سے استعمال کریں تو امجدؔ کی طرح ترقی کرنے کا وسیع میدان ہاتھ آجائے گا۔ کلیوں کی چٹک

پھولوں کی مہک اور ساغروں کی کھنک سے دل بہلانے کی بجائے وہ خمخانۂ امجد سے اپنی تشنگی بجھانے کی کوشش کریں ایسی مے خانہ میں ان کے بھٹکے ہوئے اور ہاں کو سکون ملے گا بلکہ ان کی دلوں کی تشنگی کے لیے آب حیات کے جام میسر آسکیں گے ان کا کلام ایسا نہیں ہے کہ پڑھنے والا افکار کی گتھیوں میں الجھ کر رہ جائے ان کی غزل کے ایک ایک شعر سے جو کیف و تاثر پیدا ہوجاتا ہے وہ دوسرے شعراء کی طویل نظموں سے بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

فلسفۂ خود ایک خشک مضمون ہے۔ اس لیے اس کے الفاظ بھی خشک ہوتے ہیں۔ مگر امجد نے فلسفیانہ مضامین کو اس خوبی سے اشعار میں پیش کیا ہے کہ حسن بیان، لطافت اور شیفتگی کے علاوہ شعروں میں موسیقیت بھری ہے۔ چست بندش، خوب صورت تراکیب کے ساتھ فن کارانہ نزاکتوں کو لیے ہوئے وہ مذہبی مسائل کو جب شعر کی صورت دیتے ہیں تو قافیہ ردیف اور بحر کے موزوں تناسب کی وجہ سے غزلوں میں غیر معمولی طور پر غنائی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

امجد نے پامال مضامین کی تکرار سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ ہمارے اکثر شعراء جوش جنوں میں دشت نوردی کرتے ہوئے تھک جاتے ہیں تو ببول کے درخت کی چھاؤں تلاش کرتے ہیں۔ میر پر جب ایسا ہی عالم طاری ہوتا ہے اور انہیں کہیں سایہ نظر آجاتا ہے تو وہ فوراً منہ پر لیکے دامن کو" دراز ہوجاتے ہیں۔

انشاء اللہ خاں انشاؔ پر ناتوانی غلبہ پاتی ہے تو وہ کہتے ہیں

یہ حالت ہوگئی ہے ناتوانی سے کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں بھی سایہ دیوار بیٹھے ہیں۔

کسی شاعر کا مشہور شعر ہے۔

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

بعض شعراء میں جب تن آسانی پیدا ہوئی تو درخت یا دیوار کے سایہ کی بجائے وہ محبوب کی گھنیری زلفوں کے سائے میں میٹھی نیند سونے کی تمنا کرنے لگے۔ نواب مرزا خان داغ دہلوی کا شعر سنئے۔

ذرا ڈال دو اپنی زلفوں کا سایہ
مقدر بہت نارسا ہے کسی کا

منشاء سب شعراء کا ٹھنڈی چھاؤں یا سائے کی تلاش ہے خواہ وہ ببول کی چھاؤں ہو یا زلفوں کا سایہ مشترک منشا تو تلاش سکون ہی ہے۔ امجد نے بھی سایہ حاصل کیا ہے، دیکھئے تو خیال آفرینی عرش کے کنگوروں سے کھیل رہی ہے۔

زیر سایہ ہوں اس کے اے امجد
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

شاعروں نے نا امیدوں کو اجڑی ہوئی بستی اور دیوانہ کہا ہے اور ٹوٹے ہوئے دل کو شکستہ جام سے

تشبیہہ دیکر نامرادی وبیکسی کی تصویر کھینچی ہے۔ مگر امجد کے پاس جام شکستہ ہی جام جم سے بڑھ کر اہمیت کا حامل ہے۔ ٹوٹا ہوا دل ہی ان کی متاع عزیز ہے۔ امجد کا شعر پیش کرنے سے قبل ہم اسی موضوع پر اردو ادب کے دو بہترین شعر پیش کرتے ہیں امیر مینائی کا شعر ہے

بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

جگر کا شعر ہے ؎

دل مرا توڑ کر کہا اس نے زبان راز میں
ساز میں نغمے وہ کہاں ہیں جو شکستِ ساز میں

امجد کا شعر سنئے!

رہتے ہیں اجڑے ہوئے دل میں حضور
ٹوٹ کر بھرتا ہے یہ وہ جام ہے

صاحبانِ بصیرت تاریکی میں حسن دیکھ لیتے ہیں۔ حسن کے متعلق اقبال کا نظریہ ہے کہ ؎

حسن کو منان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضوگستری شب کی سیہ پوشی میں ہے

ہم نے اوپر کہا ہے کہ امجد کے پاس جمالیات کا نہایت ہی پاکیزہ احساس جھلکتا ہے۔ ایک شعر سنئے

رنگ جلال میں اک صاحب جمال بھی ہے
ڈالا ہے تیرگی نے پردہ ترنگی گلی میں

لیلیٰ کا لفظ شاعری میں بہت ہی گھسا پٹا ہے۔ امجد نے بھی اس کو استعمال کیا ہے پڑھئے اور سر دھنئے

ہوش و حواس گم ہیں عقل فلک رسا کے
مجنوں بنی ہوئی ہے لیلیٰ تری گلی میں

امجد کے تغزل کی معراج وہاں نظر آتی ہے جہاں عشق، عشق کی حد سے گذر کر حسن مجسم بن جاتا ہے جہاں عاشق کی خدمت حسن کی خدمت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ دوسرے معنوں میں عشق اپنے تار وپود بکھیر کر حسن سے جا ملتا ہے۔ جہاں مستی ہی مستی اور جمال ہی جمال ہے۔ جب عاشق کو یہ دولت مل جاتی ہے تو اس پر سرمستی و بےخودی کا وہ عالم طاری ہو جاتا ہے، جس کے مقابلہ میں دولت کونین بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی، ماورائے عشق کی ایسی ہی منزل پر پہونچ کر امجد نے والہانہ انداز میں کہا ہے۔

وہ کبھی ہوش میں نہیں آتا
کس قدر ہوشیار ہے امجد

فانی کا مشہور شعر نہیں بلکہ مطلع یا مقطع ہے ؎

فانیؔ کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی
نے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی

ان کا ایک اور شعر ہے

ادھر منہ پھیر کر کیوں ذبح کرتے ہو ادھر دیکھو
مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

امجد بے وفا محبوب کو گلا کاٹنے کی اجازت نہیں دیتے، دیکھئے کتنا اچھا شعر کہا ہے۔

شہ رگ کے قریں وہ رہتا تھا کس طرح گلا کاٹ سکتا تھا
نازک سی رگِ گردن نے مری شمشیر کے ٹکڑے کر ڈالے

اکثر شاعر اس لئے روتے ہیں کہ ان کا محبوب نہ تو ملنے ہی آتا ہے نہ تصور میں قدم رنجہ فرماتا ہے نہ ہی خواب میں صورت دکھا کر تسلی فرماتا ہے۔ امجد کا نظریہ بالکل علیحدہ ہے۔

خواب میں ان کو جا کے دیکھ لیا
ان کو ان سے چھپا کے دیکھ لیا

مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ایک شعر ہے

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ دے لے اسدؔ
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

غالبؔ خود میں جرأتِ رندانہ پیدا ہونے کی تمنا ہی کا شکار ہیں، لیکن امجدؔ کے نزدیک جرأتِ رندانہ کا انتظار بھی فضول ہے وہ کہتے ہیں!

مری دیوانگی کا کیا کہنا
رخ سے پردہ ہٹا کے دیکھ لیا

غالبؔ کا ایک اور شعر جو بہت مشہور ہے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غالبؔ کو دریا کی تہ میں سلامتی نظر آتی ہے، امجد مرنے کے بعد نہ زمین میں دفن ہونے کے قائل ہیں نہ ہی دریا کی بے پایاں تہ میں پہونچنے کے، غالبؔ اور امجدؔ کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق نہیں ہے بلکہ زیر زمین اور عرش کا فرق ہے کیا اچھا شعر کہا ہے۔

عالمِ پاک ہے مقام اپنا
خاک میں ہم کو اے زمیں نہ ملا

اردو اور فارسی شاعری میں "مجنوں" ہمیشہ چاک بداماں، نیم عریاں اور کبھی برہنہ ہی نظر آیا اور وہ بھی ویرانوں اور بیابانوں کی خاک اڑاتا ہوا، لیکن امجد نے دیکھئے اس کو کہاں پہونچا دیا۔

کعبہ کے سیہ پردے کو مجنوں نے جو دیکھ
بولا یہ کہیں محمل لیلیٰ تو نہیں ہے

محبوب کے در پہ جبہ سائی کرنا عاشقوں کا خاص پیشہ رہا ہے در یا تک رسائی نہ ہو تو "نقش پا" پر ہی پیشانی رکھ دینے کو عاشقی کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ سجدہ پر امجد کا تخیل ملاحظہ ہو۔

معبود اگر مشہود نہیں، پھر طاعت میں کچھ سود نہیں
مسجود کی جب تک دید نہ ہو، موہوم کو سجدہ کون کرے

امجد کے مسلک میں انتظار گناہ ہے وہ کہتے ہیں ؎

تم آؤ نہ آؤ وعدے پر ہر حال میں راضی ہے امجدؔ
تم جان اور دل کے مالک ہو مالک سے تقاضہ کون کرے

ڈاکٹر عبدالوحید نے اپنی تالیف "جدید شعرائے اُردو" میں امجد کی شاعری کے متعلق لکھا ہے۔

"حضرت امجدؔ عاضر کے ان بزرگ شعراء میں سے ہیں جو ایک پختہ ادبی شعور اور رچی ہوئی شعریت کے مالک ہیں۔ ان کا کلام تصوف و فلسفہ کا معدن اور حقیقت و اصلیت کا مخزن ہے۔ جس میں سادگی، تاثیر اور گداز جیسے اعلیٰ محاسن شعری بڑی فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔"

پروفیسر مناظر احسن گیلانی نے کتنی صحیح تنقید کی ہے

"ان کا قلم ادائے خیالات کے لیئے ایک قدسی قوت سے وابستہ نظر آتا ہے"

اس مختصر مضمون کے لکھنے کا مقصد محض امجد کو اس محفل سے متعارف کرانا تھا اور ان کی شاعری سے روشناس کروانا سو وہ حاصل ہو گیا۔

آیئے اب ہم امجد کے لیے دعائے مغفرت کریں ؎

امجدؔ کے پیام کا یہی مقصد ہے
امجدؔ کو دعائے خیر سے یاد کرو

(حیدرآباد سندھ کی ایک ادبی نشست میں پڑھا گیا)

محمد اسحٰق ایوبی

امجدؔ کی رباعیات

بعض بعض مقامات پر امجدؔ سپردگی کی بجائے انسان کو بگولا اور طوفان بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

اے قطرۂ آب بہیل دریا ہو جا ٭ اے طائر روح مرغ سدرہ ہو جا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر ٭ اے تودۂ خاک اٹھ بگولا ہو جا

امجدؔ کا سرمایۂ سخن بیش بہا ادبی ورثہ ہے، جس پر اردو زبان ہمیشہ فخر کرے گی، خصوصاً ان کی رباعیاں، جو سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہیں۔ اردو شاعری کا طرۂ امتیاز گردانی جائیں گی۔

کسی شخص نے پرانے دور کے ایک عرب نقاد سے دریافت کیا کہ اس کی نظر میں وہ کونسا خوش نصیب شاعر ہے جسے عربی شعراء میں سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ اس نے جو رائے ظاہر کی اس سے اختلاف تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کے جواب کی فصاحت و بلاغت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا جملہ یہ تھا اَلنَّابِغَۃُ اِذَا وُهِبَ وَذُهَیْرٌ اِذَا رَغِبَ وَجَرِیْرٌ اِذَا غَضِبَ وَعَنْتَرَۃُ اِذَا رَکِبَ ۔۔۔۔۔ (زہد و تقویٰ اور اخلاقیات کا سب سے بڑا شاعر نابغہ ہے۔ عشق و حسن کی چھیڑ چھاڑ میں زہیر کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ غیض و غضب کے اظہار میں جریر کی ہم سری کا کوئی دعوے دار نہیں۔ سواریوں کے دلکش وصف و بیان میں عنترہ سب کو اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

اردو ادب میں بھی اکثریت ایسے شعراء کی ہے، جنہوں نے کئی موضوعات پر اور کئی اصناف سخن میں خامہ فرسائی کی ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر حضرات کو صرف ایک یا دو موضوع یا صنف شاعری میں نمایاں مقام حاصل ہو سکا۔ پھر جن شعراء نے کسی مخصوص موضوع پر یا صنف میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں، ان کے رجحان، شخصیت اور صلاحیت کے مطابق ان کی چند امتیازی خصوصیتیں بھی الگ الگ ابھرتی ہیں جن سے وہ اوروں میں منفرد گردانے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے کچھ اردو شاعروں نے معاملہ بندی اور عشقیہ شاعری میں کمال پیدا کیا، تو کچھ شعراء نے خمریات میں رندی و بے باکی کی حد کر دی۔ بعضوں نے حب الوطنی کے راگ الاپے تو بعضوں نے فلسفہ و حکمت کے موتی رولے۔ اسی طرح اصناف سخن کے لحاظ سے بھی جہاں شاعروں نے مثنوی میں ناموری پیدا کی، وہیں چند شعراء نے مرثیہ گوئی کے میدان میں شہرت کے جھنڈے گاڑ دیے، گنے چنے اساتذہ سخن نے فن قصیدہ کو بھی چار چاند لگانے کی سعی کوشش کی، لیکن

زیادہ تر شاعروں نے شاید غزل کی دلفریبی، رعنائی و برنائی پر جان دی ہے۔ ان میں سے بعض استادانِ فن غالباً منہ کا مزہ بدلنے، پختگی دکھانے یا عمر کا تقاضا پورا کرنے کے لیے رباعیاں کبھی کہہ لیتے تھے۔ سچ پوچھیے تو رباعی کہنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ صنفِ سخن انتہائی پختگی، سنجیدگی اور متانت کی متقاضی ہے۔ چونکہ رباعی میں غزل کی زبان و بیان کا چٹخارا نہیں ہوتا، اس لیے اردو ادب کے ایسے شعرا جنہوں نے رباعی کے میدان میں پاپڑ بیلے ہوں، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

امجد حیدرآبادی کا شمار چوٹی کے رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی رباعیاں سادگی اور سلاست و روانی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان کا ہر شعر کم و بیش نثر کی عبارت سے لگا کھاتا ہے۔ ان کے کلام میں لفظی و معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ "ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم" شعریت موجود ہے۔ ان کا پیرایۂ بیان انتہائی دلکش، سحر انگیز اور جاذبِ نظر ہے۔ ان کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بڑا معصومانہ، والہانہ اور پیارا ہے۔ ان کی فہمائش کا طریقہ نہایت پُر اثر اور پیارا ہے، الغرض ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ، کشش انگیز، انفرادیت کا حامل اور "ہرگز نہ میرد" نوعیت کا ہے۔

زندگی کے چھوٹے بڑے سانحات انسان کی فکر و نظر کے زاویے کو متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پھر شاعر چونکہ نہایت درجہ حساس بھی ہوتے ہیں، اس لیے وہ اوروں کی بہ نسبت بھی زندگی کے حادثات و واقعات سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

امجد کی شاعری دراصل ان کی زندگی، شخصیت اور افتادِ طبع کا سچا پرتو ہے۔ ان کے بچپن کی داستاں دکھ بھری کہانی ہے، ان کی جوانی کا قصہ ناگفتہ بہ حقیقت ہے۔ ابھی انہیں اس دارِ فانی میں قدم رکھے مشکل سے چالیس دن ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد بزرگوار عالمِ جاودانی کو سدھار گئے پھر ان کی والدہ محترمہ نے بے سر و سامانی کے عالم میں ان کی پرورش کی۔ ۱۹۰۸ء کی طغیانی میں موسیٰ ندی نے ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ حضرت موسیٰ کے عین برخلاف سلوک کیا۔ امجد کی والدہ، بیوی اور بچی سبھی دریائے موسیٰ کی غضب ناک لہروں کی بھینٹ چڑھ گئے، یہ تھا تو جان کا حادثہ، لیکن چونکہ ان کی طبیعت میں شرافت بہت زیادہ تھی، اس لیے اس المیہ نے ان کے خانۂ دل میں معرفتِ الٰہی کا نور بھر دیا اور ساتھ ہی ساتھ انہیں سوز و سازِ غم کی دولت سے مالا مال بھی کر دیا۔ جب چھ سال بعد انہوں نے دوسرا نکاح کیا تو خوش قسمتی سے جمال سلطانی کے روپ میں انہیں ایسی رفیقۂ حیات ملیں جو علم و فضل کے زیور سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ تھیں چنانچہ انہوں نے حضرت امجد کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان کی شاعری وفن میں اور چمک دمک آ گئی ہے۔ جمال ہمنشیں درمن اثر کرد، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ زندگی کی یہ ساتھی بھی انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گئیں۔

مذکورہ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس "قطرے پہ گہر ہونے تک" بڑی بپتا پڑی۔ جس کی نہ پھٹی ہو بوائی وہ کیا جانے پیر پرائی۔ امجد نے جو مصیبتیں جھیلیں، جتنے صدمے اٹھائے اور جن مشکلوں سے وہ دوچار ہوئے اس کا صحیح احساس درد مند دل ہی کر سکتا ہے۔

امجد کے مسلک تصوف سے بعض لوگوں کو اختلاف تو ہو سکتا ہے، لیکن ان کی شاعری کی ساحری سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ ان کا کلام بلاغت نظام سپردگی، روحانیت اور اخلاقیات کا دوسرا نام ہے۔ وہ جا بجا قناعت، افلاس اور توکل کے گن گاتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہی چیزیں خاطر جمعی کا سامان ہیں۔ تاہم ان کے اسلوبِ بیان میں جو جاذبیت ہے، وہ غیروں سے بھی اپنا لوہا منوا کر رہتی ہے۔ ان کا ایک قطعہ ہے ؎

کلام اکثر ایسا سنا ہوگا تم نے ؛ سنا آج اور کل اثر دل میں اترا
کہو شعر ایسا جو ہو تیز خنجر ؛ اِدھر منہ سے نکلا، اُدھر دل میں اترا

زیادہ تر لوگ ترقی حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن امجد ان لوگوں سے بالکل الگ جذبات رکھتے ہیں۔ ذیل کے قطعہ میں ان کا شاعرانہ انداز قابلِ غور ہے ؎

دستِ صبا و پنجۂ گلچیں سے بچ گیا ؛ اچھا ہوا کہ غنچۂ دل گل نہیں ہوا
اوروں کو رنج ہے کہ ترقی نہیں ملی ؛ میں خوش اسی میں ہوں کہ تنزل نہیں ہوا

انسان نام و نمود کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ ہر شخص کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ اس کی خوبیوں کو جی بھر کر سراہیں۔ امجد نے ذیل کی رباعی میں اس قسم کے گھٹیا جذبے پر طنز کیا ہے ؎

گیسو میں ہے بل کہ مرے خم دیکھو ؛ رخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہارِ کمال میں ہر اک کامل ہے ؛ سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

مصرعہ "اظہارِ کمال میں ہر اک کامل ہے" پر ہر سخن فہم سر دھنے گا

ایک اور رباعی میں ریاکاروں کو بُری طرح آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ لیکن شعریت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ؎

لے لے کے خدا کا نام چلّاتے ہیں ؛ پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز ؛ کرتے نہیں پرہیز، دوا کھاتے ہیں

کمینہ خصلت اہلِ دول کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے ؛ مانندِ حباب ابھر کر اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس ؛ تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

امرا کے گھروں میں "جہاں بھر کا سامان" جمع ہوتا ہے لیکن اطمینانِ قلب کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ چنانچہ امجد فرماتے ہیں ؎

ڈیوڑھی نہیں، در نہیں کہ دربان نہیں ؛ بلبل نہیں، گل نہیں کہ بستان نہیں
ہے جمع جہاں بھر کا ساماں گھر میں ؛ خاطر جمعی کا کوئی سامان نہیں

القصۂ مختصری سے ملتے جلتے مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

هر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے ٭ بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آسان کر دی ٭ دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

"چشم بصیرت" سے ہر چیز اچھی دکھائی دیتی ہے اور ہر قطرے میں معرفت کا سمندر نظر آتا ہے اور اگر انسان "آنکھ" سے محروم ہو تو اس کے لیے لعل اور پتھر دونوں برابر ہیں ؎

ہر قطرہ میں بحر معرفت مضمر ہے ٭ ہر اک ذرہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشم بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی ٭ گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

کسی ایک کے ہو جانے میں جو انوکھی لذت پوشیدہ ہے اس کا ذکر ایک دل کش رباعی میں کرتے ہیں ؎

کیا پھل ملتا ہے بیج بو کر دیکھو ٭ پانے کی گر ہوس ہے، کھو کر دیکھو
کیا عرض کروں کہ اس میں کیا لذت ہے ٭ اک مرتبہ تم ایک کے ہو کر دیکھو

"ہوس خام" دین و دنیا دونوں کی لٹیا ڈبو دیتی ہے ؎

دین و دنیا سے کھو دیا مجھ کو ٭ ہوس خام تو کہیں گر جا بھی
نام نے کام ہی تمام کیا ٭ شاخ کے ساتھ کھینچ گئی جڑ بھی

حریص اور لالچی آدمی کو چھوٹے بچوں سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

چیز اپنی ہو یا پرائی، منہ میں رکھ لی ٭ افیون ہو یا مٹھائی، منہ میں رکھ لی
چھوٹے بچوں سے کم نہیں ہم اب بھی ٭ جو چیز ملی اٹھا لی، منہ میں رکھ لی

امجد کے کلام میں تصوف کے نکات جا بجا ملتے ہیں۔ ذیل کی رباعی میں شاہد حسن کے پردے کی بات کس قدر لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہے ؎

ہے شاہد حسن ہر جگہ پردے میں ٭ ملتی ہی نہیں کسی کو راہ پردے میں
اس کا راز، راز کعبہ کی طرح ٭ بے پردے ہیں اور وہ بھی سیہ پردے میں

کائنات کے خالق و حاکم کا وجود ثابت کرنے کے لیے کہتے ہیں ؎

یہ خورشید و قمر کیا دیکھتے ہو ٭ فضائے بحر و بر کیا دیکھتے ہو
کسی کے حکم سے سب ہو رہا ہے ٭ اُدھر دیکھو اِدھر کیا دیکھتے ہو

شاہد صدیقی

اجل تبدیل کر دیتی ہے ہستی کے نظاروں کو
جو کل پیش نظر تھے آج ان کی یاد آتی ہے
جنازہ حضرت امجد کا ہے میت محبت کی
تصوف نوحہ گر ہے، شاعری آنسو بہاتی ہے

ڈاکٹر سلام سندیلوی۔

خضرِ وادئ تصوف

حضرت امجد حیدرآبادی ہندوستان کے ان مشہور شعراء میں سے تھے جنہوں نے صرف رباعی گوئی کی وجہ سے ممتاز ادبی حیثیت حاصل کی۔ ان کی رباعیات کا خاص موضوع تصوف و معرفت ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک صوفی صافی اور صدا سجدہ بزرگ تھے یعنی عالم باعمل تھے۔ اسی لیے ان کی رباعیات میں سچی لگن، خالص روحانی جذبات اور پُرخلوص صداقت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ رباعیات روحانی صداقت اور عارفانہ حقیقت کی بنا پر دوسروں کی رباعیات سے ٹکر لیتی ہیں۔

امجد کی رباعیات کا پہلا مجموعہ رود موسیٰ کی طغیانی میں غرق ہوگیا تھا۔ اب جو کچھ کلام ملتا ہے وہ اس سانحہ کے بعد کا ملتا ہے۔ ان کی رباعیات کے کئی مجموعے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ حضرت امجد کو رباعی سے اس قدر شغف ہے کہ جب وہ نثر لکھتے ہیں تو اس میں بھی غزل کے اشعار کا حوالہ دینے کے بجائے اپنی رباعیات کا حوالہ دیتے ہیں، گویا رباعیات ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی ہیں۔

قبل اس کے کہ امجد کی رباعیات سے بحث کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کے مقصد کا علم حاصل کر لیا جائے۔ حضرت امجد نے خط و کتابت کے درمیان میں مجھے ایک ایسا خط لکھا ہے کہ جس میں ضمناً انہوں نے اپنی زبان اور اپنی شاعری کے نصب العین کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی عبارت حسب ذیل ہے۔

> "میری رباعیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان ایسی ہوتی ہے جس کو ہر خُرد و کلاں بغیر کسی دقت کے سمجھ سکتا ہے اور میرا نصب العین یہ ہے کہ ناظرین کو سکون قلب حاصل ہو اور توفیق الہیٰ تائید کرے تو قوتِ عمل پیدا ہو۔ واہ واہ میرا مقصد نہیں ہے نہیں تو صرف آہ چاہیئے"[1]

ایک رباعی میں حضرت امجد نے شاعری کے متعلق اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے جس سے ان کی شاعری کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] مکتوب گرامی حضرت امجد حیدرآبادی۔ محررہ ۲۴ نومبر ۱۹۵۴ء۔

ہر مرتبہ آئینہ دل ڈھلتا ہے ؎ کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیونکر نہ کہوں ؎ ہر فکر میں باب معرفت کھلتا ہے

اگرچہ ان کی ہر فکر میں باب معرفت کھلتا ہے تاہم ان کو یہ شکایت ہے کہ ان کا کلام عام پسند نہیں ہے کیونکہ ہر ایک کے مذاق کو سمجھنا اور پھر اس کے مطابق شعر کہنا بہت مشکل ہے۔

تعریف شب فراق معلوم نہیں ؎ کیفیت اشتیاق معلوم نہیں
کس طرح پسند عام ہو میرا کلام ؎ ہر اک کا مجھے مذاق معلوم نہیں

حضرت امجد کی رباعیات کا خاص موضوع تصوف و معرفت ہے۔ ان کے یہاں ایسی رباعیات کافی تعداد میں پائی جاتی ہیں جن میں وجود باری تعالیٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خدا کے وجود کی بحث ایک قدیم مسئلہ ہے اور مختلف رباعی گو شعراء نے مختلف دلائل سے خدا کی ہستی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ امجد کے یہاں یہ کوشش اور زیادہ کامیاب نظر آتی ہے۔ وہ اس قدر پرزور دلائل کے ساتھ خدا کے وجود کو ثابت کرتے ہیں کہ ان کی رباعیات منکر کے دل کو بھی ایمان سے بھر دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی رباعیات حال ہیں قال نہیں۔ دراصل ان کی رباعیات ان کے اندرونی تجربہ کا نتیجہ اور ان کے شدت احساس کا آئینہ ہیں۔ انہوں نے خدا کے وجود کو قرآن شریف کی آیات کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے رباعیات امجد حصہ دوم میں ہر رباعی کے اوپر عربی کا کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور تحریر ہے جس کی تشریح میں وہ رباعی کہی گئی ہے گویا امجد کی آواز خدا کی آواز ہے اور ان کی شاعری اصل معنوں میں پیغمبری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال ان کی رباعیات کے خاص طور سے مداح تھے کیونکہ علامہ اقبال نے بھی اسلام و قرآن کی ترجمانی اپنے کلام میں کی ہے حضرت امجد کے قول کے مطابق [1] ایک بار علامہ اقبال کو ان کی مندرجہ ذیل رباعی پر وجدانی کیفیت طاری ہوئی تھی۔

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی ؎ ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں ؎ ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

خدا کا وجود آج تک عقل و خرد کے ذریعہ سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔ جہاں ہماری دانائی کام آسکتی ہے اور نہ بینائی مدد کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اس معاملہ میں حضرت امجد کی بینائی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

تن میں جاں کا نمود کیوں کر دیکھوں ؎ اس جامہ کا تار و پود کیوں کر دیکھوں
روئی نظر آتی نہیں پیراہن میں ؎ مجھ میں تیرا وجود کیوں کر دیکھوں

جب آنکھوں نے جواب دے دیا تو قوت احساس نے ان کا ساتھ دیا اور اب وہ یہ محسوس کرنے لگے ؎

مجھ میں ہے چھپی ہوئی کوئی شئے تیری ؎ نغموں میں مرے ضرور ہے لے تیری
صورت سے تو آشنا نہیں ہیں آنکھیں ؎ آواز کہیں سنی ہوئی ہے تیری

---

[1] مکتوب گرامی حضرت امجد حیدرآبادی محررہ ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء

اس کے بعد ہی اچانک "صوت سرمد" ان کے کان میں آئی اور اس نے بھی یہی کہا کہ خدا دیکھا نہیں جا سکتا ہے بلکہ سنا جا سکتا ہے ؎

نغمہ کی ہر ایک شر پہ سر دھنتا ہوں ؛ سن ہو کے گل گلشن ہو چنتا ہوں
آ آ آ آ کی آرہی ہے آواز ؛ دیکھا نہیں آنکھ سے مگر سنتا ہوں

اب شاعر کو یقین ہوا کہ "انت" کے لئے انسان کا "انا" خود شاہد ہے ؎

غائب ہے کوئی ارض و سما شاہد ہے ؛ انتَ کے لیے اپنا انا شاہد ہے
اس پر بھی اگر کوئی نہ مانے نہ سہی ؛ خود اپنے وجود پر خدا شاہد ہے

"انتَ" اور "انا" کا تعلق ایک رباعی میں اور ظاہر کیا ہے ؎

بجتا ہو ستار اور مضراب نہ ہو ؛ پھیلی ہوئی چاندنی ہو مہتاب نہ ہو
میں میں نہیں ہو سکتا نہ ہو تو جب تک ؛ ممکن ہی نہیں حباب ہو آب نہ ہو

حضرت امجد کی ایک رباعی بہت دلچسپ ہے جس کے ذریعہ انہوں نے وحدت الوجود کو ثابت کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح ہر عدد میں اکائی ضرور ہوتی ہے اسی طرح دنیا کی ہر شئے میں خدا ضرور موجود رہتا ہے ان کی یہ رباعی معرکتہ الآرا ہے ؎

ذرے ذرے میں ہے خدائی دیکھو ؛ ہر بات میں ہے شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم ؛ ہر ایک میں ہے اکائی دیکھو

ان کی دلیل کو خود انہیں کے الفاظ میں سنیئے۔

مثلاً ۲ مجموعہ ہے ۱ + ۱ کا اور ۳ مجموعہ ہے ۱ + ۱ + ۱ کا۔ قس علیٰ ہذا اکائی ہر عدد میں موجود ہے اور (۱) خود عدد نہیں ہے کیونکہ عدد حاشیتین کے مجموعہ کو کہتے ہیں جیسے (۲) اس کا ایک حاشیہ (۱) ہے اور دوسرا حاشیہ (۳)۔ (۱) اور (۳) کا مجموعہ (۴) اور (۴) کا نصف (۲) ہوتا ہے تا فہم"

اسی طرح سے انہوں نے ایک رباعی کے ذریعہ توحید فی الذات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ اگرچہ ہزاروں انسان ہیں مگر انسان کی ذات ایک ہی ہے ؎

انسان ہزار ہیں مگر قسم ہے ایک ؛ گو حروف کثیر ہیں مگر اسم ہے ایک
اس عالم کثرت کا ہے منشا واحد ؛ اعضا ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

صوفیوں کا ایک مشہور مسئلہ "ہمہ اوست" کا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ ثابت کرتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے خدا ہے۔ جس طرح گرداب، حباب اور موج کی شکلیں مختلف ہیں مگر دراصل ہیں سب پانی۔ اس طرح دنیا میں مختلف اشکال کی چیزیں موجود ہیں مگر وہ سب خدا کی ذات کا مظہر ہیں ؎

واجب سے ظہور شکل امکانی ہے ؛ وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکا ہے نظر کا ورنہ ہر شئے ہمہ اوست ؛ گرداب، حباب، موج سب پانی ہے

ہمہ اوست کی ایک اور رباعی بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

صفت تیری ہر خار دکھا دیتا ہے ؛ ہر غنچہ و گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل اصول معرفت ہے یارب ؛ پتہ پتہ تیرا پتہ دیتا ہے

لیکن ہر خار میں اس کی صفت کو دیکھنے کے لیے چشم بصیرت کی ضرورت ہے ؎

ہر قطرہ میں بحر معرفت مضمر ہے ؛ ہر اک ذرہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشم بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی ؛ گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

حضرت امجد کا قول ہے کہ خدا کی تلاش کے لیے صرف فطرت کا مطالعہ اور کائنات کا مشاہدہ ہی ضروری نہیں ہے بلکہ مخلوق میں بھی وہ تلاش کرنے سے مل سکتا ہے۔ اس لیئے وہ مخلوق کے مطالعہ کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں ملاحظہ فرمائیے ؎

ہر وقت فضائے دلکشا دیکھتے ہو ؛ صحرا و چمن ارض و سما دیکھتے ہو
مخلوق میں نیرنگیٔ خالق دیکھو ؛ قرآن پڑھو جلد کو کیا دیکھتے ہو

آخر میں ان کی چند اور مختلف رنگ کی عارفانہ اور صوفیانہ رباعیاں ملاحظہ فرمائیے ؎

لہریں کیا گن رہے ہو دریا دیکھو ؛ آئینہ دل میں روئے مولا دیکھو
اللہ اللہ کرتے ہو کیا دن رات ؛ آنکھیں ہوں تو اسم میں مسمیٰ دیکھو

حضرت امجد نے کچھ عاشقانہ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ مگر حضرت امجد کا عشق مجازی عشق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق عشق حقیقی سے ہے اور عشق حقیقی بھی اس درجہ کا جہاں "من دیگرم تو دیگری" کا سوال ختم ہو جاتا ہے اور جہاں شاہد و مشہود ایک ہو جاتے ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان کوئی حجاب نہیں حائل ہوتا۔ اس لیئے "وہ پردہ نشین" بلا کسی جھجک کے ان کے پاس آجاتا ہے۔ ان کا محبوب اتنا بے تکلف ہے کہ وہ ناگہاں "تاریکی" میں آجاتا ہے اور اس عالم میں عاشق اتنا بے تاب ہو جاتا ہے کہ اس کے قدموں پر لوٹنے لگتا ہے۔ دراصل حضرت امجد عشق حقیقی کی آخری منزل پر پہونچ چکے ہیں اور ہمہ وقت جلوۂ باری کے مشاہدات میں مستغرق رہتے ہیں۔ ان کی مشاہدات کی جھلک ان کی چند رباعیوں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے ؛ پردہ ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے، میں نہیں رہتا ہوں ؛ میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

ہر رات مرا ماہ جبیں آتا ہے ؛ گھر میں وہ مرے عرش نشیں آتا ہے
وہ راحت جاں اگرچہ میری خاطر ؛ آتا ہے گرفت میں نہیں آتا ہے

کچھ اپنا پتہ اس نے بتایا تو نہیں ؛ اب تک اس کا سراغ پایا تو نہیں
ملتی ہوئی ہے دل کی کھٹک سے آہٹ ؛ دیکھو دیکھو کہیں وہ آیا تو نہیں

حضرت امجد نے چشم بینا پائی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز ہے اور وہ اس مشاہدے سے نادر تصورات کی تخلیق کرتے ہیں اور حسین نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح بجلی کے دو تاروں کے ملنے سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح دو دلوں کے تاروں کے ملنے سے عشق کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ کس قدر نیا اور حسین تخیل ہے۔ اور عشق و معرفت کے ایک عمیق خیال کو کس قدر دل کش انداز میں نظم کر دیا ہے ؎

دو دل اک ہوں تو نخل جاں پھلتا ہے ÷ دل گود میں حسن و عشق کی پلتا ہے
سچ یہ ہے کہ برقی روشنی کی مانند ÷ دو تار سے زیست کا دیا جلتا ہے

حضرت امجد کا تعلق اس خاندان سے ہے جس میں مذہب اخلاق، تصوف اور معرفت کے چراغ ابتدا ہی سے روشن رہے ہیں۔ اسی لیے ان کی رگ رگ میں مذہبی خلوص اور دینی صداقت کا لہو دوڑ رہا ہے۔ ان کی مختلف رباعیات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں خدا اور رسول کی کتنی عظمت ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان کی خود مذہبی رباعیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

امجد نے ایک رباعی میں خدا کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ رباعی در اصل قرآن مجید کی آیت "تعز من تشاء و تذل من تشاء کی تفسیر ہے"

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے ÷ اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں ÷ وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

حضرت امجد کو خدا کی رحمت پر مکمل اعتماد ہے۔ اسی لیے وہ اس کے حضور میں دعا کرتے ہیں ؎

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے ÷ اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹاتے جاؤ ÷ یہ دست دعا خدا کا دروازہ ہے

اسی اعتماد کی بنا پر حضرت امجد کا قول ہے کہ غیر کے آگے ہاتھ پھیلانے کی کیا ضرورت ہے ؎

ہر چیز مسبّب سبب سے مانگو ÷ منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو ÷ بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

حمد کے علاوہ حضرت امجد نے مغفرت کی بھی رباعیاں کہی ہیں اور اپنے خدا سے اپنی بخشش کے لئے دعا مانگی ہے۔ ان رباعیوں میں خلوص اور صداقت کی بھی پرچھائیاں موجود ہیں دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیے ؎

عنایت فرمانہ سرفروشی کو مری ÷ مٹی میں ملا نہ گرم جوشی کو مری
آیا ہوں کفن پہن کے اے رب غفور ÷ دھبا نہ لگے سفید پوشی کو مری

بے کس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے ÷ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ کیا لایا ہے
یا رب تیری رحمت کے بھروسے امجد ÷ بند آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے

حضرت امجد نے قرآن شریف کی تعریف میں بھی کچھ رباعیاں کہی ہیں جن سے ان کی قوت ایمانی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک رباعی یہاں پیش کی جاتی ہے ؎

قرآن کریم میں کرامت دیکھی ÷ ہر جزو کے ساتھ کل کی شرکت دیکھی
ہر منزل کو اسی کی منزل پایا ÷ ہر سورۃ میں اس کی صورت دیکھی

حضرت امجد ابھی بہ حیثیت صوفی کے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اب ان کو بہ حیثیت فلسفی کے بھی پرکھئے تصوف اور فلسفہ کا اس قدر حسین امتزاج رباعیات امجد کے علاوہ کسی دوسرے اردو رباعی گو شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ انہوں نے دقیق فلسفیانہ مسائل کو صوفیانہ انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ فلسفۂ حیات پر انہوں نے متعدد رباعیاں کہی ہیں جو عمر خیام کی رباعیات کی سرحد کو چھو لیتی ہیں۔

ایک جگہ عمر خیام نے کہا ہے ؎

قومے زگزاف وغرور افتادند ÷ قومے زپے حور وقصور افتادند
معلوم شود چو پردہا بردارند ÷ کز کوئے تو دور دور افتادند

حضرت امجد نے بھی تحقیق وتدقیق کے بعد یہی اخذ کیا ہے۔ اور اسی ایک مرکز سے مختلف دائروں کی تشکیل کی ہے۔۔۔ .... رباعیات امجد حصہ دوم کے آخر میں "معلومات" کے موضوع سے اس مضمون کی بہت سی رباعیاں درج ہیں۔ ان رباعیات کے بارے میں وحیدالدین سلیم نے "افادات سلیم" میں نہایت پرلطف بات کہی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے ؎

"اس کا نام تو معلومات ہے مگر ہر رباعی کی ردیف ہے "معلوم نہیں""

واقعی انسان کی معلومات کا عالم یہی ہے کہ اس کو کچھ نہیں معلوم ہے۔ حضرت امجد نے انسان کی کوتاہ عقل پر کس قدر بھرپور وار کیا ہے۔ معلوم نہیں کی چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیے ؎

کیفیت روح پاک معلوم نہیں ÷ حال دل دردناک معلوم نہیں
جھوٹی ہے تمام علم کی لاف زنی ÷ خاکی انسان کو خاک معلوم نہیں

کیوں گرم ہے آفتاب معلوم نہیں ÷ کیوں ہے یہ انقلاب معلوم نہیں
جی بھر کے سوال کر لو جتنے چاہو ÷ سب کا ہے یہی جواب معلوم نہیں

کیا ہے تعبیر خواب معلوم نہیں ÷ ناقص ہوں کہ کامیاب معلوم نہیں
کچھ دور سے لہریں تو نظر آتی ہیں ÷ یہ آب ہے یا سراب معلوم نہیں

امجد نے اپنی لاعلمی کا اعتراف اسی انداز سے کیا ہے جس طرح سے ایک ماہر اور دور رس فلسفی کر سکتا ہے ہربرٹ اسپنسر جیسے مفکر اور شوپن ہار جیسے فلسفی نے بھی عاجز آکر کہہ دیا کہ دنیا کی کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایک راز معلوم کر لینے کے بعد وہیں سے دوسرے راز کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔
اس مضمون کے علاوہ حضرت امجد نے حیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ زندگی کی ماہیت کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ زندگی مختلف اضداد کے اتحاد کا نتیجہ ہے۔ جب تک ان متضاد اشیا میں اتحاد قائم رہتا ہے انسان زندہ رہتا ہے، لیکن جب ان اشیا میں اتحاد ختم ہو جاتا ہے تو انسان کا جسم فنا ہو جاتا ہے۔ امجد نے بہ حیثیت فلسفی کے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ انسانی جسم اضداد کا مجموعہ ہے لیکن بہ حیثیت صوفی بھی کہہ دیا ہے کہ اضداد میں اتحاد زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتا ہے ؎

گردش میں یہ گرد و باد آخر کب تک ؛ طرح کون و فساد، آخر کب تک
ٹوٹے گا طلسم مادیت اک دن ؛ اضداد میں اتحاد آخر کب تک

امجد دنیا کے وجود کو محض وجودِ حسی سمجھتے ہیں۔ وجودِ حسی سے مراد یہ ہے کہ وہ وجود جو صرف نظر آئے اور حقیقت میں موجود نہ ہو۔ امجد نے ایک رباعی میں اس عمیق فلسفہ کو ایک انداز میں نظم کر دیا ہے۔

آغشتہ بخوں پیالۂ لالہ ہے ؛ ہر گوہر آبدار تپ خالہ ہے
دنیا کا وجود ہے وجودِ حسی ؛ یہ دائرہ شعلہ جوالہ ہے

ایک فلسفی اور ایک سائنسداں یہ جانتا ہے کہ زمین حرکت کرتی ہے اور یہاں کی جتنی اشیا ہیں سب متحرک ہیں۔ اس فلسفیانہ صداقت کی روشنی میں امجد نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر انسان کی حالت بدلتی رہتی ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے یہ تو عین فطرت کے مطابق ہے ؎

فطرت کا تقاضا ہے کہ کوشش میں رہے ؛ دلچسپیٔ عقل ہے کہ کاوش میں رہے
جب تو وہ خاک پھر رہا ہے دن رات ؛ خاکی انسان کیوں نہ گردش میں رہے

خاکی انسان جب گردش میں آتا ہے تو صرف اسی کی حالت نہیں بدل جاتی ہے بلکہ دنیا کی ہر شے تغیر پذیر ہونے پر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ مثلاً

گس لہرا کے ناگ ہو جاتا ہے ؛ نوحہ آخر میں راگ ہو جاتا ہے
ہر چند دیا سلائی اک تنکا ہے ؛ صرف ایک رگڑ سے آگ ہو جاتا ہے

امجد کے یہاں ایک اور فلسفیانہ نکتہ ملاحظہ فرمائیے۔ یوں تو کسی مادہ کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ لیکن اس سے جب کسی چیز کی تعمیر ہوتی ہے تو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لوہا جب تک زمین میں پڑا رہتا ہے ایک بے کار شے ہے لیکن جب اس سے مفید اور کار آمد چیزیں بنتی ہیں تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح پتھر کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن جب اس سے بت تراشے جاتے ہیں تو اس کا حسن نکھر آتا ہے ؎

ساغر کے صفات جام جم میں دیکھو ؛ آہن کا ہنر تیغ دو دم میں دیکھو
تقئیدہے جامع کمال اطلاق ؛ کیا حسن ہے سنگ میں صنم میں دیکھو

حضرت امجد کا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا کی کوئی شئے بے کار نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنی کوتاہ بینی سے اس کے فوائد پرکھ نہ سکیں۔

اس جسم کی کیچلی میں اک ناگ بھی ہے ؛ آواز شکستہ دل میں اک راگ بھی ہے
بے کار نہیں بنا ہے اک تنکا بھی ؛ خاموش دیا سلائی میں اک آگ بھی ہے

پانی جم کر برف ہو جاتا ہے اور برف پگھل کر پانی ہو جاتی ہے۔ حضرت امجد کی باریک نظر نے اس حقیقت پر غور کیا اور نتیجہ نکالا کہ جسم اور روح کا بھی یہی تعلق ہے۔ یہ دونوں اشیا ایک ہیں۔ صرف موت سے صورت بدل جاتی ہے۔ جس طرح پانی یا برف کی صورت بدل جاتی ہے مگر مادہ ایک ہی رہتا ہے۔

بچپن ہی کے پہلو میں جوانی بھی تو ہے ؛ باقی ہی کے آغوش میں فانی بھی تو ہے
سمجھے ہو غلط روح جدا جسم جدا ؛ جو برف کی شکل ہے وہ پانی بھی تو ہے

فلسفۂ حیات کے علاوہ حضرت امجد نے فلسفۂ جبر و اختیار کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے دیگر شعرا کی طرح انہوں نے بھی انسان کو مجبور و معذور قرار دیا ہے اور اس طرح خدا کی بے پناہ قوت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل دو رباعیاں ان کے نقطۂ نظر کو واضح کرتی ہیں ۔

پابند خیال مری تقریر رہی ؛ آزادی پہ بھی پاؤں میں زنجیر رہی
تھا جتنا خدا کا حکم کوشش کرلی ؛ تدبیر بھی وابستۂ تقدیر رہی

تقدیر سے کیا گلہ خدا کی مرضی ؛ جو کچھ بھی ہوا ہوا خدا کی مرضی
امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں ؛ ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

حضرت امجد نے ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے دنیائے فانی کا بھی مطالعہ نہایت غور سے کیا ہے اور دیگر مفکرین کی طرح یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دنیا نہایت ناپائیدار ہے اور انسان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی کا انحصار محض سانس کی آمد و رفت پر ہے۔ اس قسم کی رباعیات میں بہت سوز و گداز اور بے پناہ جذب و تاثیر پایا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی تاثیر اور تڑپ میں آپ اپنی مثال ہے ۔

کب تک ہے بقائے تن فنا کو معلوم ؛ کب تک ہے یہ زندگی قضا کو معلوم
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے جاتے جاتے ؛ جاتی تو ہوں واپسی خدا کو معلوم

اسی انداز کی ایک اور رباعی پیش ہے ۔

اچھا نہیں یہ غرور جلدی کیجئے ؛ حتی الامکان ضرور جلدی کیجئے
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے آتے آتے ؛ چلنے کے لیے حضور جلدی کیجئے

غرض کہ حضرت امجد نے مختلف انداز سے فلسفیانہ خیالات کو اپنی رباعیات میں جگہ دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے قبل بھی اس قسم کے خیالات رباعیوں میں ملتے ہیں۔ مگر حضرت امجد کی کہنہ مشقی اور ان کے ذاتی تجربات نے ان کی رباعیوں میں حقیقت کی جھلک پیدا کر دی ہے جب کہ بہت سے رباعی گو شعرا کے یہاں ان کے فلسفیانہ خیالات میں حقیقی رنگ کے بجائے رسمی انداز ملتا ہے۔ اسی لئے حضرت امجد کی یہ رباعیاں اردو ادب میں بیش بہا سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

دیگر صوفیائے کرام کی طرح حضرت امجد نے اخلاقی رباعیات سے بھی انسان کو بلند کردار بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان رباعیات میں خود حضرت امجد کی پاکیزہ اور مقدس شخصیت کی چھاپ ہے۔ ان

رباعیات کو ان کی شخصیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت امجد کو علم باعمل حاصل ہے۔ وہ جو علم رکھتے ہیں اس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔ قول و فعل ان کے یہاں مترادف چیزیں ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہے۔ اس لیے ان کی اخلاقی رباعیات دل پر اثر کرتی ہیں اور ہمارے لیئے اپنے کردار کو سنوارنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

حضرت امجد نے کبھی اپنے عمل میں خودنمائی کو جگہ نہیں دی بلکہ اصل عبادت پر زور دیا۔ اس لیئے وہ فرماتے ہیں ؎

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی ؏ طاعت میں نہیں ہے خودنمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو ؏ حضرت اتم سے تو دیا سلائی اچھی

اس رباعی میں جس نادر تشبیہ کا استعمال حضرت امجد نے کیا ہے وہ ان کی دقیق نظری اور ندرت بیانی پر دلالت کرتی ہے۔ دیا سلائی کا لفظ بالکل غیر شاعرانہ ہے مگر انہوں نے جبہ سائی اور خودنمائی کے ساتھ دیا سلائی کا قافیہ اس انداز سے نظم کیا ہے کہ رباعی میں جان پڑ گئی ہے۔

ایک اور رباعی میں امجد نے نام و نمود کی مذمت کی ہے اور انسان کو نمائش کے لیے مٹی کے پتلے کہہ کر خودنمائی پر بھرپور وار کیا ہے ؎

مرتے ہیں ذلیل خواہش کے لیے ؏ بالیدہ ہوتی ہے روح کاہش کے لیے
ہر حال میں ہے مفاخرت مدنظر ؏ پتلے مٹی کے ہیں نمائش کے لیئے

ایک رباعی میں جھوٹی عبادت اور ریاکاری کی طرف ایک نئے انداز سے اشارہ کیا ہے "پرہیز نہ کرنا اور دوا کیے جانا" ایک مشہور بات ہے، امجد نے اپنے خیالات کی عمارت اسی بنیاد پر قائم کی ہے اور یہ بنیاد کس قدر مستحکم ہے ؎

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں ؏ پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز ؏ کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

امجد انسانی فطرت کے گہرے نباض ہیں۔ انہوں نے ایک رباعی میں یہ بتایا ہے کہ پست اور کم ظرف آدمی ذرا سی عزت اور دولت پا کر اترانے لگتے ہیں۔ اس دوامی حقیقت کو بھی اہل خرد نے تسلیم کیا ہے۔ میر انیس نے ایک رباعی میں اسی خیال کو نظم کیا ہے۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے ؏ وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا اپنی آپ ؏ جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

امجد نے بھی ایک رباعی میں کم ظرفی کی مذمت کی ہے مگر ان کا انداز بیان بالکل نیا ہے "خالی ظرف کا صدا دینا" ایک پرانی بات ہو چکی ہے" امجد نے اسی بات کو "تنکے کا تھوڑی سی ہوا سے اڑ جانا" کہہ کر ہمارے سامنے ایک نیا اور تازہ مضمون پیش کیا ہے ؎

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے ؏ مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر خسیس ؏ تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

ندامت اور انفعال انسانی سیرت کے زیور ہیں جو شخص ان سے آراستہ ہوتا ہے وہ دنیا و عقبیٰ دونوں جگہ سرفراز ہوتا ہے۔ امجد نے انہیں اخلاقیات کی ہم کو تلقین کی ہے۔ ان کی دو رباعیوں پر نظر دوڑا یئے اور ان کی صداقت اور خلوص کی داد دیجئے ؎

پیاسوں پہ کرے گا مہربانی پانی ؛ آتش پہ کرے گا حکمرانی پانی
کیا نار سقر جلا سکے گی مجھ کو ؛ خود شرم سے ہو رہا ہوں پانی پانی

اس باغ سے مثل بو اڑا جاتا ہوں ؛ جان اپنی مصیبت سے چھڑا جاتا ہوں
احباب مرے دفن کی کیوں فکر کریں ؛ میں شرم گنہ سے خود گڑا جاتا ہوں

حضرت امجد موجودہ دور کے خوں چکاں ماحول پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں غرق رہنے کے باوجود کائنات سے غافل نہیں ہیں۔ آج کل کی مہذب دنیا میں جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کے لہو کا پیاسا ہے۔ حضرت امجد اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ ان کا قول ہے کہ ایسے انسانوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے ؎

اک ایک کی تاک میں لگا رہتا ہے ؛ خون ایک کا اک کے ہاتھ سے بہتا ہے
انسان کے خبث باطنی کے آگے ؛ شیطان بھی لاحول ولا کہتا ہے

اسی لیئے انہوں نے ہم کو انسان بننے کی صلاح دی ہے۔

اس نام کی زندگی میں کچھ جان تو ہو ؛ گر بن نہ سکے فرشتہ انسان تو ہو
نیکی نہ ہوئی ہو بدی بھی تو نہ کر ؛ صوفی نہ ہوا نہ ہو مسلمان تو ہو

حضرت امجد کی ان رباعیات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کی اخلاقی رباعیات میں خلوص و صداقت بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی خلوص و صداقت ان کی زندگی ہے اور اسی لیئے ان رباعیوں میں انسانی حالت کو سدھارنے کی صلاحیت موجود ہے

موجودہ دور میں اگر رباعی کی کوئی تاریخ مرتب کی جائے تو مؤرخ امجد حیدرآبادی کے نام کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا بلکہ وہ ان کو ایک نمایاں مقام دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ اردو شاعری میں صرف امجد حیدرآبادی کی ذات ایسی ہے۔ جنہوں نے خاص طور سے رباعیاں کہی ہیں۔ جس طرح سے دیگر شعراء نے خاص طور سے غزل یا قصیدہ یا مرثیہ یا مثنوی پر طبع آزمائی کی ہے اور رباعی کو ضمناً کہا ہے۔ اسی طرح امجد نے رباعی کو اپنا لیا ہے اور اگر انہوں نے کچھ نظمیں کہی ہیں وہ ضمناً کہی ہیں ان کی یہ نظمیں بھی زیادہ تر رباعی کی بحر میں ہیں۔ جس طرح جوش ملیح آبادی انقلاب و شباب کے پیغمبر ہیں اور فراق گورکھپوری سنگار رس کے میر سکیدہ ہیں۔ اسی طرح امجد حیدرآبادی تصوف کی وادی کے خضر ہیں۔

حضرت امجد کے یہاں عارفانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی رباعیات کی کمی نہیں ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں عشق مجازی کی رباعیاں بہت کم ملتی ہیں۔ ساتھ ہی فخریہ رباعیوں کا بھی ان کے یہاں فقدان ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق اس مادی دنیا سے نہیں ہے۔ دراصل وہ ایک روحانی دنیا کے متنفس ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے

یہاں موجودہ پُرآشوب دور کی عکاسی زیادہ واضح الفاظ میں نہیں ملتی ہے۔ دراصل ان کی اپنی دنیا ہی الگ ہے جو ہنگامۂ ہستی سے کافی دور پر بسی ہوئی ہے۔ لیکن ان موضوعات کی کمی کی وجہ سے ان کی رباعیات کی وقعت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ حضرت امجد کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اس دور میں نغمۂ سرمدی الاپا۔ جب کہ ساری دنیا مادہ پرستی کی طرف مائل ہے اور لطف یہ ہے کہ ان کے اس نغمہ میں اس قدر دلکشی اور جاذبیت ہے کہ مادہ پرست بھی اس کے سننے کے لیئے گوش برآواز ہو جاتے ہیں۔ یہ فخر حضرت امجد کے لیئے کم نہیں ہے اور یہی نغمۂ سرمدی ان کی حیاتِ ابدی کا ضامن ہے۔

حضرت امجد حیدرآبادی

جنوبی ہندوستان میں اُن صوفیانہ قدروں کے واحد امین تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں باطنیت کے مشترک رجحانات کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ انسان دوستی، رواداری، بلند نظری اور وسیع مشربی ایسی قدریں ہیں جنھیں گردش دوراں کبھی اپنا اسیر نہیں بنا سکی، انہیں اپنانے والے ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن جس طرح امجد حیدرآبادی نے مادہ پرستی کے [illegible] حد سے اپنی شخصیت کی تکمیل کی تھی اور جس انداز سے انہیں اپنی [illegible] انداز تھا، وہ انہیں سے مخصوص تھا۔ ان کی رباعیوں میں [illegible] ایسی وسعت اور ماورائیت ہے جو محدودیت کا خول توڑ دینے اور شخصی انا کو مٹا دینے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کے خیالات کی بے نیازی اور بے تکلفی سے معلوم ہوتا ہے، گویا تعینات ان کی راہ میں حائل نہیں رہے۔ وہ اپنی رباعیوں میں اس سطح سے بات کرتے ہیں۔ جہاں دنیا کے رنج و غم، گناہ و ثواب اور سود و زیاں سب ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو ذہنی تجرید نہیں ہونے دیا اور اپنے افکار کو احساسات کی راہ سے الفاظ تک پہنچایا ہے۔ امجد حیدرآبادی کی رباعیاں اُردو میں اپنی معنوی لطافت اور پُرکیف باطنیت کے لیے ہمیشہ پڑھی جاتی رہیں گی۔ چاہیئے کہ انجمن ترقی اردو یا کوئی اور اہم ادارہ امجد حیدرآبادی کے کلیات کو پوری صحت سے نہایت حسین و جمیل شائع کرے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

صفی الدین صدیقی

حضرت امجد سے ملاقات

حضرت امجد مرحوم اُردو داں حلقوں میں ایک عظیم رباعی گو شاعر کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ لیکن میرے خیال میں مرحوم کی شخصیت کے ایک خاص پہلو کا مطالعہ بھی ان کی شاعری کے مقابلے میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اور وہ ایک صوفی کی شخصیت ہے۔ لہٰذا ایک صاحب حال بزرگ کا اس جہاں [illegible] نہیں ہو سکتا ہے۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات [illegible] تا ز بزم عشق یک [illegible] راز دروں

اردو زبان ایک عظیم رباعی گو شاعر کی سرپرستی سے محروم رہ جاتی اگر حضرت امجد [illegible] سیلاب رودِ موسیٰ کی طغیانی کی نذر ہو جاتے، اس قیامتِ صغریٰ کے دلدوز سانحات کا تذکرہ حضرت امجد کی [illegible] سوانح عمری میں ملتا ہے۔ رودِ موسیٰ کے اس تاریخی سیلاب کی تباہ کاریوں کا آنکھوں دیکھا حال راقم الحروف نے [illegible] حضرت کی زبانی سنا ہے۔ حضرت امجد مرحوم [illegible] بزرگوں کے قدموں [illegible] میں [illegible] ننھیال کی طرف سے حضرت امجد کے ساتھ مجھے ایک طرح کی نسبت حاصل ہے۔ ویسے ذاتی طور پر مجھے ان کی قربت و معیت کے مواقع بالکل میسر نہیں آ سکے لیکن حضرت امجد سے میری پہلی ملاقات بڑے ہی دلچسپ انداز میں ہوئی۔

۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ خصوصی مضامین میں میرا ایک مضمون تصوف بھی تھا۔ جس کی تحصیل میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اور ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی نگرانی میں کر رہا تھا۔ اس وقت کے ماحول میں تصوف سے میری رغبت کو بعض احباب نے بالکل ناپسند کیا تھا اور اسی بنا پر وہ مجھے اکثر ولی کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں علم تصوف کا ایک تحریک کی حیثیت سے مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ اور میرا یہ مدعا تھا کہ میں اردو شاعری پر تصوف کے اثرات اور عمل دخل کا پتہ چلاؤں۔ خیال ہے اس دیرینہ رغبت اور شوق کا یہ نتیجہ نکلا کہ آج عمر کی اس منزل پر بھی میں نے [illegible] کو اپنی ریسرچ کا موضوع بنایا ہے اور اس کا مطالعہ نفسیاتی اور عمرانی عوامل کے تحت کرنا چاہتا ہوں۔

اسی زمانے میں بعض نادر مخطوطات اور تصنیفات کی چھان بین کے سلسلے میں [illegible] کے مقابل موقوعہ ایک کتب خانہ میں جایا کرتا تھا جس کے مالک [illegible] صاحب سے [illegible] مراسم تھے اور اسی بنا پر مجھے [illegible] بعض نادر نسخے [illegible] مجھے

بازصاحب کی زبانی یہ معلوم ہوا تھا کہ حضرت امجد ان کے ہاں اکثر آیا کرتے ہیں۔ لیکن کافی دنوں تک مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

ایک مرتبہ بازصاحب کے ہاں میں اپنے مقررہ وقت پر پہونچا۔ وہاں ایک بزرگ پہلے ہی سے تشریف فرما تھے اور نہایت خاموشی و انہماک کیساتھ کسی کتاب کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ ان کا حلیہ یہ تھا کہ مولویوں کی سی مخصوص سفید کلاہ پہنے ہوئے تھے اور انہوں نے رومال اپنے زانوؤں کے اطراف کچھ اس طرح لپیٹ لیا تھا کہ وہ ایک مخصوص نشست میں نظر آتے تھے۔ میں نے ان حضرت کو بازصاحب کا کوئی گاہک یا ملاقاتی تصور کر لیا تھا۔ یہاں پر صاحب کتب خانہ بازصاحب کے بارے میں بھی کچھ عرض کردینا چاہتا ہوں۔ موصوف مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ باتوں میں شوخی۔ گو کتب فروشی کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ لیکن فلسفہ و تصوف سے لیکر الٰہیات تک گویا ہر موضوع پر گفتگو فرمانے کا شوق تھا۔ باتوں باتوں میں ایک مرتبہ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ انہیں تصوف کے عملی پہلو سے بھی رغبت ہے۔ ابھی میں نے بازصاحب کے جن ملاقاتی بزرگ کا ذکر کیا ہے۔ ان کی موجودگی میں مجھ سے انہوں نے ایک عجیب استفسار کیا۔

"صاحبزادے آپ تصوف کا مطالعہ تو کرتے ہیں لیکن کبھی عبادت کی طرف بھی دھیان دیا ہے"

شاید وہ میری توجہ تصوف کے ضروری لوازمے عبادت و ریاضت کی طرف مبذول کروانا چاہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس سوال کے جواب میں بے اختیار علامہ اقبالؒ کا ایک مصرع میری زبان سے ادا ہوا تھا ؎

شوق اگر ترا نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب

یہ سننا تھا کہ ان بزرگ کی زبان سے بے اختیار واہ، نکل گئی۔

انہوں نے بازصاحب سے دریافت کیا۔

یہ لڑکا کون ہے؟

بازصاحب نے میرا حسب نسب اور شجرہ بیان کر دیا۔ اور مجھے پہلی بار یہ پتہ چلا کہ میں دکن کے ایک مایۂ ناز صوفی شاعر حضرت امجد حیدرآبادی کے مقابل ہوں۔ اس انکشاف کے بعد مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس کا باعث غالباً یہ ہو کہ کچھ دیر پہلے میں نے حضرت امجد کو ایک معمولی انسان سمجھ لیا تھا۔ بس پھر کیا تھا حضرت امجد کی بخشش کی گوہرافشانی میں ڈھل گئی۔ اسرار و رموز کا ایک دفتر کھل گیا، اور مجھے ان کے پاس سے وہ سب کچھ [illegible] سنتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت امجد پر ایک جذب کا سا عالم طاری ہو گیا ہے۔ وہ بازصاحب سے [illegible]۔

"جانتے ہو [illegible] کی کیا شان ہوتی ہے۔ اسی کا پرتو میں اس لڑکے میں دیکھ رہا ہوں۔ اس خاندان کو خدائے تعالیٰ نے علم کی دولت سے نوازا ہے"

اس تذکرہ کے بعد حضرت امجد نے میرے عم محترم عالی جناب ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کا ذکر چھیڑ دیا۔ موصوف حضرت امجد کے معتقدوں میں سے ہیں۔ اور جب تک حیدرآباد میں رہے حضرت امجد

سے کسب فیض کرتے رہے۔

یہ میں کہہ چکا ہوں کہ باز صاحب بڑی دلچسپ شخصیت کے حامل تھے، وہ مسجد چوک کے تہہ خانے میں واقع ایک بھٹیارہ خانہ کے کباب اور شیرمال کھانے کے بے حد شوقین تھے۔ ان کے ذریعہ وہ بعض اوقات اپنے مخلص احباب کی تواضع بھی کیا کرتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، باز صاحب کہنے لگے۔

"حضرت کباب اور شیرمال کا شغل کیسا رہے گا؟ ہم کو تو بھوک محسوس ہورہی ہے"

حضرت امجد مسکرا کر بولے۔

"باز! بھوک ہی تو اصل لذت ہے، کبھی زندگی میں اس کا لطف اٹھایا ہے تم نے،"

یہ کچھ درویشی کی باتیں تھیں جو اشاروں کنایوں میں کہی جارہی تھیں۔ آج جب کہ باطنی پہلوؤں کے نکات و رموز کی تشریح کے سلسلے میں مجھے ایک رہنما کی ضرورت ہے میں حضرت امجد کی کمی کو اور زیادہ محسوس کرنے لگا ہوں علم تصوف کے محققین کا کہنا ہے کہ بہت عرصہ ہوا یہ باطنی علم اسلامی دنیا سے رخصت ہوچکا۔ اب تو صوفیا، موجود ہیں اور نہ اصحاب کشف و کرامات، دوسرے معنوں میں تصوف کے تمام ہی صحت مند اجزا زوال آمادہ ہوچکے ہیں۔ گویا ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

لیکن اس روحانیت کش زمانے میں بھی حضرت امجد کی ذات غنیمت تھی۔ وہ عصر حاضر کے اکثر نام نہاد خرقہ پوش علماء اور مرشدین کی طرح خود نمائش کے قابل نہیں تھے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ حیدرآباد کے ہر طبقے کے عوام حضرت امجد کا احترام کرتے تھے۔ ان کی شخصیت اور شاعری شاید ہی کسی نقاد کیلئے وجہ بنی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ حضرت امجد پر اردو کی متصوفانہ شاعری کا خاتمہ ہوتا ہے۔

افسوس ہے کہ حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد حیدرآبادی نے بھی اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔ ان کی وفات محض دنیائے شاعری کا نہیں بلکہ دنیائے دل کا حادثہ ہے۔ وہ تنہا شاعر ہی نہیں اس سے زیادہ حکیم و عارف اور صاحب دل صوفی تھے، اردو کے نامور شاعروں سے آج بھی ہندوستان خالی نہیں مگر امجد اپنے رنگ میں یگانہ تھے، ان کے کلام میں طور کی تجلی وادیٔ ایمن کے شراروں کا عکس ہے خصوصاً رباعی گوئی میں اس زمانے میں اُن کا جواب نہ تھا۔ ان کی رباعیات حکمت و بصیرت کا دفتر ہیں، وہ صحیح معنوں میں اس دور کے سرمد اور ابوسعید ابوالخیر تھے، ان کی ذات پر بظاہر عارفانہ شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے فطرتاً بھی حکیمانہ نظر اور درد آشنا دل پایا تھا، اور ان کو حوادث بھی ایسے پیش آئے جنہوں نے ان کو سراپا سوز اور حقیقت نگر بنا دیا۔ وہ نثر بھی بڑی سادہ سلیس، بے تکلف اور موثر و دلنشین لکھتے تھے، چھوٹے چھوٹے سادہ بلیغ فقروں میں بڑی حکیمانہ اور سبق آموز باتیں کہہ جاتے تھے، دارالمصنفین سے انکے دیرینہ تعلقات تھے۔ افسوس ہے کہ شاخِ طوبیٰ کا یہ بلبلِ خوشنوا ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔ (معارف، اعظم گڑھ)

محمد اکبر الدین صدیقی

حضرت امجد کے احباب

ان کے کلام میں

یہاں ہم حضرت امجد کے ایسے دوست احباب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کے نام یا جن کی صفات ان کے کلام میں موجود ہیں۔ حضرت امجد شہنشاہ رباعیات تھے اس لئے بڑے بڑے رؤسا و امراء بھی ان سے ملاقات کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے اس لئے کسی چھوٹے آدمی سے ملنے میں بھی انہیں عار نہ تھا۔ ان کے دوست احباب میں ہر دو قسم کے اصحاب شامل ہیں۔ انہوں نے جس کام کو اچھا سمجھا اس کو سراہا اور جو ان کی نظر میں جچا نہیں اس کا کہیں کوئی ذکر نہ کیا۔

ان کے کلام میں ہمیں سب سے پہلے بلحاظ سنہ عماد الملک سید حسین بلگرامی کا قطعہ تاریخ ملتا ہے۔ عماد الملک کی ہستی محتاج تعارف نہیں، حیدرآباد کی سیاست ہی میں انھوں نے بلند مقام نہیں پایا بلکہ اہل علم کے قلوب کو بھی مسخر کر لیا۔ اسی لیے حضرت امجد ان سے متاثر تھے اور ان کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ لکھا۔

اللہ اکبر

بلگرامی مولوی سید حسین ٭ رفت بر ظلِ حسین ابن علی

گفت امجد از زبان کردگار ٭ بعماد الملک ادخل جنتی

۱۳۴۴ھ

اسی دور کے ایک رئیس ممتاز یار الدولہ نے توسیع تعلیم کی خاطر مدرسہ آصفیہ قائم کیا اس پر ایک رباعی لکھی۔

ہر وقت جو بج رہا ہے وہ ساز ہے تو ٭ گھر کرتی ہے جو دل میں وہ آواز ہے تو

اے مدرسہ آصفیہ کے بانی ٭ ہمدردیٔ اسلام میں ممتاز ہے تو

عظمت اللہ خاں مرحوم تھے تو مددگار ناظم تعلیمات، لیکن ہماری شاعری میں انہوں نے نئے نئے تجربے کئے۔ نئی بحریں اور نئے تصورات عطا کئے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ سریلے بول اور مضامین عظمت یادگار ہیں۔ حضرت امجد سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے قدردان تھے۔ اتفاقاً عظمت اللہ خان صاحب کا ایکا ایک عنفوان شباب میں انتقال ہوا جس کی وجہ سب ہی ادب دوست اور اہل علم اشکبار ہو گئے۔ حضرت امجد نے بھی اپنا رنج و غم ایک مرثیہ اور قطعۂ تاریخ لکھ کر ظاہر کیا۔ مرثیہ شائع ہو چکا ہے اس کا مطلع ہے۔

تقدیر نے دکھلایا عجب واقعہ جاں کاہ — العظمت للہ
بجلی سی گری خرمن امید پہ ناگاہ — العظمت للہ

اور قطعہ تاریخ ہے۔

هو الغفور الرحیم

عظمت اللہ خاں ز عالم رفت ٭ حالیا در جناں سکونت اوست
نیست در مغفرت کلام امجد ٭ "غفر اللہ" سال رحلت اوست

۱۳۴۶ھ

حضرت امجد کی دوسری اہلیہ جمال سلمی علامہ نادر الدین کی صاحبزادی تھی جو حضرت مولانا عبد القدیر حسرت اور حضرت امجد دونوں کے استاد تھے۔ یہ بڑی عالمہ و فاضلہ تھیں اور حضرت امجد کی زندگی ان کی وجہ باغ و بہار تھی ان کے انتقال کے بعد حضرت امجد نے مشترکہ زندگی کی آپ بیتی لکھی جو جمال امجد کے نام سے موسوم ہے اور اردو ادب کا ایک عظیم شاہکار ایسی آپ بیتی نہ تو لکھی گئی اور نہ لکھے جانے کا کوئی امکان ہے۔ اسی میں جمال سلمی کا قطعہ تاریخ وفات بھی درج ہے۔

عبد العزیز صاحب حیدر آباد کے مشہور وکلا میں تھے۔ انہوں نے ایک نہایت عالی شان سہ منزلہ مکان پنجہ گٹہ سے قریب پہاڑی پر تعمیر کیا۔ یہ بھی حضرت امجد کے ملنے والوں میں تھے۔ انھوں نے اپنے دوست کی خوشنودی کی خاطر یہ قطعہ لکھا ہے

اللہ اکبر

برداشت امانتے بہ ہمہ ہمت بلند ٭ انساں اگرچہ قابل بارگراں نہ بود
عبد العزیز قصر چو جنت بنا کند ٭ ما را ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود

اس قطعہ پہ دوم مصرعہ سے ۱۳۴۶ف کی تاریخ لکھی ہے۔

حیدر آباد کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بہادر خان (نواب بہادر یار جنگ) کی کوششوں کو بڑا دخل رہا ہے انھوں نے تربیت جاگیردارانہ ماحول میں پائی۔ کسی یونیورسٹی سے ڈگری نہیں لی۔ لیکن مطالعہ نے انہیں علامہ بنا دیا تھا۔ ہندوستان کے مقررین کی صف اول میں تھے۔ ان کی تقریر نہیں اعجاز تھی۔ بڑے بڑے سحر کار خطیبوں نے بھی ان کا لوہا مانا ہے۔ حضرت امجد سے ان کی گہری دوستی تھی۔ نواب صاحب نے جب اپنے دولت کدہ بیت الامت میں اپنے کتب خانہ کو عام کر دیا تو حضرت امجد نے لکھا۔

قال اللہ تبارک و تعالیٰ
قل رب زدنی علماً

سرمایۂ علم وقف جو ملت ہے ÷ ہر طالب علم کے لیے نعمت ہے
یہ مخزن علم قائد ملت ہے ÷ بیت الامت میں علم کی دولت ہے

اس قطعہ پر ...... ۹ ذوالحج ۱۳۶۳ھ تاریخ تحریر ہے۔

نواب بہادر یار جنگ کی خطابت کے ساتھ ساتھ احمد علاؤ الدین کی سخاوت سے بھی حضرت امجد متاثر تھے چنانچہ جب احمد علاؤ الدین نے سولہ سترہ لاکھ کی عمارت مدینہ بلڈنگ شہر کے قلب میں تعمیر کی اور اس کو مدینہ منورہ کے لیے وقف کر دیا تو یہ شعر کہے۔

ماعندکم ینفد وماعند اللہ باق

(جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو خدا کے پاس ہے وہ باقی رہتا ہے)

کیا بندۂ مولا طلب اللہ نے پیدا کیا ÷ جس نے خدا کی راہ میں جو کچھ تھا اپنا دیدیا
لی ہیں دعائیں کس قدر طیبہ کے ہر مسکین سے ÷ لے کوئی دنیا میں سبق احمد علاء الدین سے

اس تحریر پر ماہ ربیع المنور ۱۳۶۳ھ کی تاریخ درج ہے

نواب صاحب کی خطابت اور احمد علاؤ الدین کی سخاوت پر یہ قطعہ کہا ہے۔

دو انسان

خداوند دو عالم کے خدائی کارخانے میں ÷ بنے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں سینکڑوں انساں
مگر امجد نے دو انساں دیکھے اپنی آنکھوں سے ÷ سخاوت میں علاؤ الدین خطابت میں بہادر خاں

۲۲ دسمبر ۱۹۵۳ء تاریخ تحریر ہے

احمد علاؤ الدین نے اپنے غسل صحت پر ایک ضیافت ترتیب دی تھی۔ اس میں حضرت امجد نے یہ دو شعر کہے۔

الحمد للہ رب العلمین السخی حبیب اللہ

صد ادوست احمد الہ دین کا ÷ بہ فضل خدا غسل صحت ہوا
رہو شاد و آباد عزت کے ساتھ ÷ جیو، دین و دنیا کی صحت کیساتھ

۳۰ جنوری ۱۹۵۳ء تاریخ تحریر ہے

نواب بہادر یار جنگ کے انتقال پر ایک شعر کہا ہے۔

نواب بہادر خاں جب چھوٹ گئے ہم سے ÷ غم بیٹھ گیا دل میں، دل بیٹھ گیا غم سے

نواب یوسف یار جنگ (یوسف علی) عرصہ دراز تک حیدر آباد میں محکمہ سیاسیات کے معتمد رہے اور آخری دور میں حضور نظام کے ایجنٹ بن کر برار گئے۔

اس کے کچھ دن بعد وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ جہاز جب بغداد پر ٹھیرا تو یوسف یار جنگ درگاہ شریف پر حاضر ہوئے فاتحہ پڑھی اور لوٹتے وقت سیڑھی پر بیٹھ کر جوتے پہن رہے تھے کہ روح پرواز کر گئی۔
حضرت امجد سے انہیں بھی بہت انس تھا۔ یہ قطعہ ان کی موت پر ہے۔

زندگی سے تنگ آکر صلح کرلی موت سے ؞ نفس امارہ سے جو کرتے رہے ہر بار جنگ
محفل علم و عمل کے بجھ گئے دو شب چراغ ؞ ایک بہادر یار جنگ اور ایک یوسف یار جنگ

جو حضرات ان دونوں ہستیوں کے کارناموں سے بخوبی واقف ہیں وہ اس صنعت لف و نشر غیر مرتب سے کافی حظ حاصل کریں گے۔

غازی یار جنگ نواب عزیز جنگ کے صاحبزادے اور حیدرآباد ہائیکورٹ کے جج تھے کئی حج کئے، اہل مدرسہ کے لئے چندہ فراہم کیا اور بساط بھر غربا کی مدد کرتے رہے ان کے نام کا سجع لکھا ہے۔

نفس سے کرتے ہیں یہ ہر بار جنگ ؞ اس لیے ہے نام غازی یار جنگ

مولوی اسد اللہ صاحب حیدرآباد میں چیف انجینیری کے ممتاز عہدہ پر فائز تھے۔ حضرت امجد کے گھر تک برقی روشنی پہنچانے میں آپ کا تعاون حاصل تھا۔ اس کے لیے ایک دعا کے ساتھ دو شعر کہے ہیں۔

اللھم نور قلوبنا و بیتنا امورنا

میرے تاریک گھر کو پرنور کیا ؞ میرے دیوار و در کو پرنور کیا
دل دوں، یا جان، یا دعا دوں تم کو ؞ اے بھائی اسد بتاؤ کیا دوں تم کو

اس تحریر پر ۲۵ صفر المظفر ۱۳۷۳ھ تاریخ درج ہے

قاری حاجی شہاب الدین کا حیدرآباد کے مشہور اور مخیر تاجروں میں شمار ہے۔ وہ رمضان، ربیع الاول اور ربیع الثانی میں ہمیشہ عام دعوت کرتے ہیں، دسترخوان پر امیر و غریب سب ہی ہوتے ہیں ان کے لیے ایک رباعی ہے

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا

بیچاروں پہ رحم فضل رحمانی ہے ؞ بندوں پہ کرم عین خدادانی ہے
اطعام مساکین سے غذائے روحی ؞ اپنا کھانا غذائے جسمانی ہے

تحفۂ امجد برائے قاری حاجی شہاب الدین صاحب زاد دوام فیضہ
ماہ ربیع الاول ۱۳۷۴ھ کی عبارت تحریر ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی سے حضرت امجد کو جو تعلق رہا ہے اس کا اظہار خود مولانا کے اس مضمون سے ہوتا ہے جو انھوں نے حضرت امجد کی جوبلی کے موقع پر لکھا تھا۔ ہم ان کے دو خطوط بھی اس شمارہ میں شائع کر رہے ہیں جب اُن کا انتقال ہوا تو حضرت امجد نے قطعہ تاریخ کہا۔

جا بحق داد مرد حق آگاہ ؞ دفن شد گنج علم در مدفن
بہ سر آہ گفتم اے امجد ؞ خوابگاہ مناظر احسن

۱۹۵۶ء

محمد جمال شریف صاحب نے "حیات امجد" شائع کی ہے جس میں حضرت امجد کی زندگی کے حالات اور ان کے کلام پر تفصیلی تبصرہ ہے۔

جب محمد جمال شریف صاحب کے والد محمد بدیع الدین صاحب کا انتقال ہوا تو حضرت امجد نے دو شعر

اور ایک قطعہ تاریخ کہا۔

سوا تیرے کرم کے میرے غفار ؛ نہیں کوئی گنہ گاروں کا غمخوار
نہیں ہم عاصیوں کا توشۂ رہ ؛ بجز لاتقنطو من رحمۃ اللہ

قطعہ تاریخ

گئے دنیا سے اک شیخ کرامت ؛ عمل اعمال تھے سب جن کے اچھے
بہ "عند اللہ" لکھا سال رحلت ؛ بدیع الدین کو اللہ بخشے (۱۳۰۵ھ)

آخر میں ہم یہاں ادارہ ادبیات اردو اور آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے روح رواں اور کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر زور صاحب کے بارے میں حضرت امجد نے جو قطعات کہے ہیں انہیں پیش کرتے ہیں۔ یہ قطعات مختلف اوقات میں حضرت امجد نے ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر ہی کہے۔ اور اپنے قلم سے بشکل طغرا لکھ کر عنایت کئے ہیں۔ فریم میں جڑے ہوئے یہ قطعات ڈاکٹر صاحب کی نشست گاہ سے قریب ہی لگے ہیں۔

الحمد للہ رب العالمین

دیکھا یہ حمد الٰہی کے مناظر ؛ تا مدح کریں آپ کی ہم اور زیادہ
ہے زور کی تحریر میں کیا زور خداداد ؛ اللہ کرے زور رقم اور زیادہ (۱۳/صفر ۱۳۵۷ھ)

ای سمی زندہ ماند نیک اسم ؛ محی اردو هست محی الدین ما
دوستاں را یاد داریم از دعا ؛ هست اے امجد همیں آمین ما

رقیمہ امجد رقم ۲/ربیع الاول سنہ ۶۰ھ

ڈاکٹر صاحب کو ایک رباعی بھی اپنے قلم سے لکھ کر عنایت کی ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ربنا ارنا الاشیاء کما ہی

یا رب! مری آنکھ سے اٹھا دے پردے ؛ دامان نظر تجلیوں سے بھر دے
ہر ذرہ میں شان کبریائی دیکھوں ؛ اس چھوٹی سی آنکھ کو کلاں بیں کر دے (۱۳/صفر ۱۳۵۷ھ)

جب "سب رس" جاری ہوا اور اس کے ایڈیٹر خواجہ حمید الدین صاحب شاہد نے جو حضرت امجد کے بہت چہیتے شاگردوں میں ہیں اس کی ایک جلد پیش کی تو ایک رباعی عنایت فرمائی۔

تحفہ لاجواب

یہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو ؛ مرغوب دل ہر کس و ناکس، لے لو
سب کا لینا تو امر ناممکن ہے ؛ سب میں بہتر یہ ہے کہ سب رس لے لو

معین الدین احمد انصاری

ذکرِ امجدؔ

۳۰ مارچ کی شام جب کہ ہم دریائے سندھ کے کنارے "المنظر" میں چائے پی کر حیدرآباد واپس آرہے تھے راستے میں میرے ایک دوست نے مجھ سے فرمایش کی کہ امجدؔ کی رباعیاں سناؤں۔ حیدرآباد پہونچنے تک ۱ میل کی مسافت طے کرتے ہوئے امجدؔ کی مختلف رباعیاں جو مجھے یاد تھیں۔ سناتا گیا لیکن اتفاق اسی کو کہتے ہیں جس وقت ہم امجدؔ کو یاد کر رہے تھے اور ان کے کلام سے محظوظ ہو رہے تھے عین اسی وقت ہم سے ایک ہزار میل دور امجدؔ کسی اور دنیا کی طرف کوچ کی تیاری کر رہے تھے۔ حضرت امجدؔ سے میرے پاکستان آنے کے بعد پھر کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا اور اب تو کبھی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن امجدؔ جیسے لوگ ہماری نظروں سے غائب بھی ہو جاتے ہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ زندہ رہتے ہیں ان کا کام اور اس کا کلام ان کو زندہ رکھتا ہے ایسا شخص "آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں"

حضرت امجدؔ حیدرآبادی سے وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں جن کا تعلق اُردو دنیا سے ہے۔ ان کو عام شہرت حاصل نہ ہوئی، اس لیے کہ وہ خود شہرت کے خواہاں نہ تھے۔ گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے۔ مشاعروں میں بھی کم جاتے تھے۔ خاص تعلقات کی بنا پر اور وہ بھی اصرار کے بعد شرکت پر آمادہ ہوتے۔ دوسری وجہ یہ کہ اصنافِ شاعری میں رباعی ان کی دل پسند تھی۔ اور اس دور میں خدا جانے کیوں رباعی عام پسند نہیں اور پھر امجدؔ کی رباعیوں کی نوعیت کچھ اور ہے۔ مذہب تصوف اور اخلاقیات ان کی بنیاد ہیں۔ ان کی رباعیوں کا مضمون خاص بھی ہے اور بلند بھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ زبان میں سلاست اور سادگی ہے۔ جس نے ایک مرتبہ ان کا کلام پڑھا یا سنا ہو وہ ان کا مداح ہو جاتا ہے۔

کل ٹرین میں پاکستانی بحریہ کا ایک افسر میرا ہم سفر تھا۔ میں رباعیاتِ امجدؔ، پڑھ رہا تھا۔ بعض اشعار پر اس کی بھی نظر پڑی اور اس نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ کتاب لے کر پڑھنے لگا۔ پھر تصوف پر، مذہب پر اور کلامِ امجدؔ پر بحث ہوتی رہی۔ چند اور مسافر بھی شریکِ گفتگو ہو گئے، ایک سندھی صاحب کو امجدؔ کا کلام اتنا پسند آیا کہ انہوں نے ایک کاغذ اور قلم میرے سامنے بڑھا دیا کہ میں امجدؔ کی چند رباعیاں نوٹ کر دوں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو امجدؔ کا کلام پڑھ کر محظوظ نہ ہو۔ امجدؔ نے کم عمری سے شعر کہنے شروع کر دئے تھے، ان کا پہلا شعر یہ ہے ؎

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسمان اپنا ٭ مگر یا رب نہ ہو نامہرباں وہ مہرباں اپنا

لیکن افسوس کہ ان کا بیشتر کلام ان کے اسباب اور افرادِ خاندان کے ساتھ رودِ موسیٰ کی طغیانی میں بہہ گیا، اس حادثے سے امجدؔ پر جو گزری ہوگی وہ ظاہر ہے لیکن امجدؔ کو دنیاوی مال و متاع کی کبھی تمنا نہ رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرف لو لگائے ہوئے تھے۔ جس کے مل جانے کے بعد پھر اور چیز کی تمنا بے کار ہوتی ہے حالیؔ نے کہا تھا کہ "جس نے تجھ سے تیرے سوا آرزو کی اس نے آرزو کرنی نہ جانی" صوفیائے کرام دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا کر صرف اسی کی لو لگائے رہتے ہیں اسی میں لطف پاتے ہیں۔

امجدؔ کا شمار بھی اسی زمرے میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

ساری دنیا سے ہاتھ دھو کر دیکھو ٭ جو کچھ بھی رہا سہا ہے کھو کر دیکھو
کیا عرض کروں کہ اس میں کیا لذت ہے ٭ اک مرتبہ تم ایک کے ہو کر دیکھو

یہ حقیقت ہے کہ دنیاوی دولت نہ زندگی ہی میں مطمئن رکھتی ہے اور نہ مرتے وقت سرمایہ داروں اور دولت مندوں کو بے فکری سے مرنے دیتی ہے۔ امجدؔ ایسے صوفی شاعر کا خیال ہے ؎

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے ٭ بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آسان کر دی ٭ دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

شاعر کا کلام بڑی حد تک اس کی اپنی زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ امجد نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا حیدرآباد کے بعض وزرائے اعظم سے بھی امجدؔ کے مراسم رہے۔ اور بعض عہدہ داران سے عقیدت بھی رکھتے تھے۔ لیکن امجدؔ نے کبھی کسی کی خوشامد کی اور نہ کبھی کچھ مانگا۔

ان کی تلقین یہ بھی ؎

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو ٭ منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو ٭ بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ امجدؔ کا کلام آیاتِ قرآنی کی تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آگے دعا کرنی چاہیے صدق سے کام لینا ہے۔ پروردگار جاہتا ہے تو بے اندازہ اور بے حساب دیتا ہے۔

اسی لئے امجدؔ کہتے ہیں ؎

ہر دم اس کی یاد تازہ ہے ٭ اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہے کھٹکھٹائے جاؤ ٭ یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

پختگیٔ ایمان کی دلیل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔ اقبال نا امیدی کو "زوالِ علم و عرفان" بتاتے ہیں امجدؔ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت پر کتنا بھروسہ تھا اس رباعی سے ظاہر ہے ؎

بے کس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے ٭ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یا رب تری رحمت کے بھروسے امجدؔ ٭ بند آنکھ کئے یونہی چلا آیا ہے

اقبال کا نام آگیا تو امجد کی رباعیوں کے بارے میں ان کی رائے بھی پیش کر دوں۔

اقبال لکھتے ہیں "ہر رباعی قابلِ داد ہے ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے"

اللہ کے نیک بندوں میں کبھی احساس برتری پیدا نہیں ہوتا وہ عجز و انکساری کا نمونہ ہوتے ہیں۔ اور خود کو مجسم گناہ سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا ان کا رتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔

امجدؔ کہتے ہیں ؎

خود اپنی نگاہوں سے گرا جاتا ہوں ؛ قطرہ سا زمیں میں سما جاتا ہوں
احباب مرے دفن کی کیوں فکر میں ہیں ؛ میں شرم گنہ سے خود گڑا جاتا ہوں

تقدیر اور تدبیر کے بارے میں امجدؔ کا کیا خیال تھا اور وہ کس قدر راضی بہ رضا تھے۔ اس رباعی سے ظاہر ہے ؎

کھیتی مرے فلسفے کی پکتی ہی نہیں ؛ تدبیر سے تقدیر جھکتی ہی نہیں
کھاتی ہے ہمیشہ منہ کی لیکن پھر بھی ؛ بے کیا وہ کبوں سے عقل تھکتی ہی نہیں

امجدؔ کا اپنا ایک مشن تھا۔ انہوں نے اپنے کلام سے دلوں کو گرمانے کا کام لیا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اخلاق و کردار کی اصلاح چاہی۔ اپنے اس مقصد میں امجدؔ کس حد تک کامیاب ہیں ان کا کلام پڑھ کر ہی کوئی اندازہ لگا سکتا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے کہا ہے۔

"جس طرح سر سید علیہ الرحمۃ نے حضرت حالیؔ کے مسدس کو اپنی طرف سے بارہ گاہ قدوس میں پیش کرنے کے قابل سمجھا تھا اسی طرح میں بھی پیامِ امجدؔ کی تحریک اور اس کی تکمیل کو اپنی تمام عمر کا کارنامہ سمجھتا ہوں"
(مقدمہ پیامِ امجدؔ)

۱۹۵۵ء میں ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نے امجدؔ کی گولڈن جوبلی منا کر ان کو خراجِ تحسین پیش کیا اور اس جشن میں شرکت کر کے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم، جگر مرحوم، جوش ملیح آبادی، اور ڈاکٹر زور نے امجد کی خدمات کو سراہا تھا۔

امجدؔ کی بے شمار تصانیف ہیں۔ رباعیات بھی ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی اور نثر میں بھی ان کی کتابیں موجود ہیں۔ قابلِ ذکر رباعیاتِ امجد کے علاوہ حجِ امجد۔ جمالِ امجد، گلستانِ امجد، ریاضِ امجد، نذرِ امجد اور حکایاتِ امجد ہیں۔

اس علمی سرمائے کا مالک ہونے کے باوجود امجدؔ کو کبھی نام و نمود کی پروا نہ ہوئی۔ جس کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

امجدؔ جہاں میں نام کی پروا نہیں مجھے
تا حد سعی کام کیے جا رہا ہوں میں

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

کیا فکر ہے کوئی قدرداں ہو کہ نہ ہو ؛ جھوٹی دنیا میں عز و شاں ہو کہ نہ ہو
اللہ مسرتِ حقیقی دے دے ؛ ہم زندہ رہیں نام و نشاں ہو کہ نہ ہو

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ دوسروں سے اپنی تعریف سننے کا خواہاں رہتا ہے بلکہ بعض وقت خودستائی پر بھی اُتر آتا ہے۔ اس بات کو امجد اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

سب کا یہی دعویٰ ہے کہ میں بھی کچھ ہوں ÷ ہر ایک سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
میں آپ کو کمترین ہی کیوں نہ کہوں ÷ اس کا بھی یہ منشا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

ایک اور رباعی اسی مضمون کی ہے ؎

گیسو میں ہے بل کہ میرے خم کو دیکھو ÷ رخ ہنستا ہے کہ اس تبسم کو دیکھو
اظہار کمال میں ہر ایک کامل ہے ÷ سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

امجد کی رباعیاں بالخصوص وہ جو گلستان امجد میں ہیں ایسی ہیں کہ اس کتاب کو بچوں کے نصاب تعلیم میں شریک ہونا چاہیے۔ گلستانِ امجد دراصل گلستان سعدی کا ترجمہ ہے لیکن بقول مولانا سلیمان ندوی "امجد نے سعدی کے خزانۂ خیال پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ وہ قابض کی ملک ہوگیا ہے"

امجد کا انداز ناصحانہ تو ہوتا ہے لیکن اس میں تلخی نہیں پائی جاتی۔ کہتے ہیں ؎

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے ÷ ہر چیز کو اچھا کہو تحمید یہ ہے
مخلوق خدا ہے سب خدا کی مخلوق ÷ سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے

دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے میں کیا فائدہ ہے امجد کی زبان میں سنئے ؎

ہمراہ کرم حسن عمل تلتا ہے ÷ احسان سے باب لطف حق کھلتا ہے
ہمدردی غیر میں ہے اپنا بھی بھلا ÷ کپڑا دھونے سے ہاتھ بھی دھلتا ہے

نماز کے فلسفہ کو یوں پیش کرتے ہیں ؎

دامانِ گناہ چاک ہو جاتا ہے ÷ نفسِ سرکش ہلاک ہو جاتا ہے
مومن کے لیے عجیب نعمت ہے نماز ÷ سر خاک پر رکھ کے پاک ہو جاتا ہے

امجد بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ حج و زیارت نے ان کے دل پر بڑا اثر کیا۔ انہوں نے اپنے ان تاثرات کو اشعار میں پیش کیا جو کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

امجد کے شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص تھا۔ زبان کی لکنت کے باوجود سننے میں لطف آتا تھا۔ ان کو ایک رباعی بہت پسند تھی جو وہ اکثر سنایا کرتے تھے ؎

اسباب و علل کا دور کرتے رہیے ÷ اپنی فطرت پہ جور کرتے رہیے
جو کچھ ہونا تھا ہو چکا رک نہ سکا ÷ اب کیوں ہوا اس پہ غور کرتے رہیے

اس مضمون میں میں نے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جن سے نہ صرف حضرت امجد کی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کی شخصیت کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔

(بقیہ مضمون ص۱۵ پر ملاحظہ ہو۔)

پروفیسر امین چند شرما

عصر حاضر کا سرمد

حضرت امجد کی رباعیات میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جو ایک باکمال شاعر کے لیے ضروری ہیں۔ قدرت نے فیاضی کے ساتھ شاعرانہ احساسات ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر دئے تھے۔ ان کا کلام حقائق سے لبریز اور فطرت کے قریب ہے۔ وہ ایک حقیقی شاعر ہیں اور اس وقت تک شعر نہیں کہتے جب تک کوئی کیفیت ان کے دل و دماغ پر طاری نہ ہو۔

کیف و سرور کی سرشاری میں ان کے دلی جذبات الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر جلوہ فگن ہو جاتے ہیں۔ ان کے اشعار پر "از دل می خیزد بر دل می ریزد" والی مثال صادق آتی ہے۔ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے اشعار پڑھنے والے کے دل کو متاثر کرتے ہیں۔ سچ ہے۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

جس خصوصیت نے امجد کو انفرادیت بخشی ہے۔ وہ ان کی دقت نظر اور خیال کی رفعت ہے۔ ایک بلند خیال ان کے تصور کے افق کے سامنے رہتا ہے۔ وہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو لفظی بازیگری اور محاورہ بندی کی الجھنوں میں گرفتار رہیں۔ ایسے خیالات الفاظ کے تابع ہو جاتے ہیں۔ مگر امجد کے یہاں دوسری شان پائی جاتی ہے الفاظ ان کے خیالات کے تابع ہیں۔ ان کے کلام میں ایک بجلی کی چمک ہے، ایک تپاک ہے۔ جو اہل بصیرت کے قلب و نظر کو حیران بنا دیتی ہے۔

امجد کی رباعیات ان کی قادر الکلامی اور فن کے کمال اور پختگی کی شاہد ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

گیسو میں ہے بل کہ میرے خم کو دیکھو ؛ رخ کہتا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہار کمال میں ہر اک کامل ہے ۔ سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

دوسری جگہ لکھتے ہیں ؎

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے ؎ مضمون بلند لامکاں سے لائے

ذیل کی رباعیات سے امجد کے عام انداز فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ قانون قدرت ہے کہ عیش کے عالم میں انسان سرمستی و غفلت کے عالم میں رہتا ہے۔ محفل عیش برہم ہونے کے بعد کیف و سرور کی جگہ افسردگی اور حزن لے لیتے ہیں۔ آرزو کی جگہ حسرت اور آس کی جگہ یاس چھا جاتی ہے ؎

ہر محفل سے بحال خستہ نکلا ؎ ہر بزم طرب سے دل شکستہ نکلا
منزل ہی نہیں یہاں مسافر کیلئے ؎ سمجھا تھا جسے مقام رستہ نکلا

دل خدا کا گھر ہے۔ دل کا توڑنا خانۂ خدا کو مسمار کرنا ہے۔ جو گناہ کبیرہ میں منسوب کیا جاتا ہے ؎

مغموم کے قلب مضمحل کو توڑا ⁂ یا منزلِ فیضِ متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے ⁂ رونا تو یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

تعین عالم کا بیان مختلف شعرا نے مختلف پیرایہ میں کیا ہے اور اس کثرت سے بیان کیا ہے کہ اس میں جدت کی گنجائش نہیں۔ لیکن امجد کی قادر الکلامی نے اس پامال مضمون میں بھی ایک اچھوتا انداز پیدا کر لیا ہے۔ وہ کمال شوخی سے کہتے ہیں۔ ؎

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے ⁂ کیا ذکر صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی ⁂ سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

حضرت امجد کے یہاں تمثیلی انداز بھی پایا جاتا ہے ان کا حکیمانہ استدلال قابلِ داد ہے۔ وہ جس بات کو بیان کرتے ہیں اس کے ثبوت کا خوب حق ادا کرتے ہیں ؎

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے ⁂ بےفکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی ⁂ دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

ذاتِ خداوندی حیّ و قیوم ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہیگی۔ کائنات کا سارا سلسلہ فنا انجام ہے۔ صرف خدائے قدوس کی ذات کو بقائے دوام حاصل ہے ؎

واجب ہی کو ہے دوام باقی فانی ⁂ قیوم کو ہے قیام باقی فانی
کہنے کو زمین و آسمان سب کچھ ہے ⁂ باقی ہے اسی کا نام باقی فانی

روزِ جزا انسان کا دفترِ عمل خدا کے سامنے پیش ہوگا۔ غافل انسان منصفِ حقیقی کے سامنے نیک اعمال پیش کرنے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ نیک اعمال ہمارے پاس نہیں ان کی عدم موجودگی میں ہمیں شرمساری ہوگی۔ اقبال نے تو کہا ہے کہ ذاتِ باری کو بھی شرمساری ہوگی۔ امجد کہتے ہیں ؎

ضائع فرمانہ سرفروشی کو مری ⁂ مٹی میں ملانہ گرم جوشی کو مری
آیا ہوں کفن پہن کے اے ربِ غفور! ⁂ دھبہ نہ لگے سپید پوشی کو مری

مظاہرِ قدرت سے خدا کی شان کا بیان ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے۔ کسی کو برگِ درختانِ سبز میں معرفتِ حق کے دفتر نظر آئے۔ کسی کو ذرہ ذرہ میں جمالِ کبریائی کی جھلک دکھائی دی۔ امجد کہتے ہیں کہ باغ و راغ، زمین و آسمان کے مشاہدے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مخلوق کا مطالعہ خالق کی صفت کی معراج کو ثابت کریگا۔ قرآن کی گہرائیوں میں اتر کر قاری کو خالق کے وجود کا علم ہو سکے گا ؎

ہر وقت فضائے دلکشا دیکھتے ہو ⁂ صحرا و چمن، ارض و سما دیکھتے ہو
مخلوق میں نیرنگیٔ خالق دیکھو ⁂ قرآن پڑھو، جلد کو کیا دیکھتے ہو

غالب کے یہاں "اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں" شاعر حیران ہے کہ پھر مشاہدہ کس شمار میں ہے۔ زبان خاموش ہے۔ حضرت امجد کس بے باکی سے اظہار کرتے ہیں ؎

ہیں مست مئے شہود۔ تو بھی میں بھی ⁂ ہیں مدعی نمود۔ تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں ⁂ ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

وحدت شہود کا مسئلہ تصوف کا خاص مسئلہ ہے۔ امجد نے اس کی تشریح بڑی خوبی سے بیان کی ہے۔ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں

میں قلزم زخار ہوں منبع تو ہے ⁂ میں مہر جہانتاب ہوں مطلع تو ہے
ہے فرق بہت لطیف ہم دونوں میں ⁂ مانند ضمیر میں ہوں مرجع تو ہے

کائنات کی ہر شئے کا مرجع ذات الٰہی ہے، خدا کی جناب میں صرف خلوص قلب ہی قابل قدر ہے۔ زردار خدا کے نام پر زر و سیم دیتے ہیں۔ بے نوا غریب خلوص نیت سے رکوع و سجود کے ہدیے پیش کرتے ہیں۔

خالق نے جنہیں دیا ہے زر دیتے ہیں ⁂ زر کیا ہے خدا کی راہ میں سر دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجدہ ⁂ ساماں نہیں کچھ ہیں یہی سر دیتے ہیں

عشق، اردو اور فارسی ادب کا سرمایہ ہے صوفی شعرا اسے تخلیق کائنات کا باعث قرار دیتے ہیں۔ حضرت امجد نے اس کی داستان بے پایاں کو چار مصرعوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

دریائے محبت ہے سفینہ میرا ⁂ ہے حسن کی خاتم یہ نگینہ میرا
روشن ہے چراغ عشق سے کعبۂ دل ⁂ معمور ہے نور سے مدینہ میرا

جبر و قدر کا مسئلہ ہمارے شعرا کا خاص موضوع سخن رہا ہے۔ انسان پورے طور پر قدرت کے آئین و قوانین کے تحت ہے۔ امجد کا مسلک ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں کہ تقدیر کا شکوہ عبث ہے جو کچھ ہوا ہوتا ہے وہ ہوگا اس میں خدا کی رضا شامل ہے۔ ؎

تقدیر سے کیا گلا خدا کی مرضی ⁂ جو کچھ بھی ہوا ہوا خدا کی مرضی
امجد ہر بات میں کہاں تک کوئی کہے ⁂ ہر کیوں کی ہے تہ میں خدا کی مرضی

امجد کے یہاں شوخی سادگی اور ... ان خصوصیات نے کلام کو ... حضرت امجد اپنے خالق حقیقی کے حضور اعتراف گناہ بھی عجز اور شوخی سے کرتے ہیں ؎

میں گنہگار اور تو ہے کریم ⁂ گو ہے کس طرح ہو کا بڑا
گو بڑا ہی گناہ گار ہوں میں ⁂ تو بڑا یا مرا گناہ بڑا

اللہ کی ذات بزرگ و برتر ہے گنہ کی کیا بساط۔ انسان کے گناہ کتنے ہی بڑے ہوں۔ اس کی رحمت اور بخشش ان سے بہت بڑی ہے۔

امجد کا کلام تاثیر سے لبریز ہے۔ اس میں سادگی اور روانی ہے۔ نہایت سلیس۔ عام فہم اور دلچسپ ہے۔ اس میں لفظی اور معنوی خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ نہایت چابک دستی سے تشبیہات اور استعارات کو اپنے کلام میں لاتے ہیں لیکن وہ سراسر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ قوانین فطرت سے متجاوز نہیں ہونے پاتے ان کے کلام میں کہیں فلسفہ کی جھلک ہے۔ کہیں تصوف کی چاشنی، کہیں درد و غم کا سوز اور کہیں پند و نصائح کا بیان۔ ان کا

ہر شعر اہلِ دنیا کے لیے ایک درسِ ہدایت اور پیغامِ عمل ہوتا ہے۔

متوسط طبقہ کا ہر آدمی طبقاتی تفریق سے متاثر ہے۔ وہ غلام اور آقا کے دل شکن فرق کو مٹا کر محمود و ایاز کو معاشرت کی ایک صف میں جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ حضرت امجد ایک متوسط طبقہ کی پیداوار ہیں۔ اس کے پروردہ اور تربیت یافتہ ہیں۔ اس ماحول نے جو نقوش ان کے ذہن پر چھوڑے ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر لوٹنے والے طبقہ کے مظالم کے خلاف ان کے قلم سے ذیل کے مصرعے نکل جاتے ہیں۔

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں ؎ افلاس کے یہ نقیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا ؎ معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

غرض یہ کہ حضرت امجد ریاض شعر کے گل سرسبد ہیں۔ آپ کے کلام میں انسانی فطرت کی بوقلمونیاں، جبر و قدر کی چیرہ دستیاں، حقائق و معارف کی موشگافیاں نہایت لطیف انداز میں جھلکتی ہیں۔

آپ کے کلام کی صحت مند قدروں سے متاثر ہو کر قاری زندگی سے فرار اختیار کرنے کے بجائے ایک ایسی اونچی سطح پر پہونچ کر اس سے نبیڑنے کے لیے آمادہ و سرگرم نظر آتا ہے۔ جہاں اس کے لیے زندگی کے نشیب و فراز زندگی کے نشیب و فراز نہیں رہتے۔

ان کے کلام کے غائر مطالعہ اور تاثر انگیزی سے قاری کے دل میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ جذبہ جارحانہ تیور نہیں سکھاتا، وہ مصالحت اور آشتی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ دوستوں کے ساتھ تلطف اور دشمنوں کے ساتھ "مدارا" کی تعلیم دیتا ہے۔ حافظؔ نے کہا ہے ؎

آسایشِ دو گیتی تفسیرِ این دو حرف است ؎ با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

دکن کے مشہور صوفی مزاج شاعر امجد حیدرآبادی رباعی گوئی میں اپنی مثال آپ تھے اور عبرت و فنا و عبدیت و توحید کے مضمون اپنی نظموں میں اس خوبی، خوش اسلوبی اور دلآویزی سے ادا کرتے تھے کہ اہل عقل بھی ہنگامی طور پر تو ضرور متاثر ہو کر رہتے تھے۔ ان کی حکیمانہ، عارفانہ شاعری نصف صدی سے دلوں کو گرمائے رکھے ہوئے تھی اور ان کی ذات فارسی کے پرانے صوفی شاعروں کی زندہ یادگار کا کام دے رہی تھی۔ اللہ انہیں برتر سے برتر مرتبہ لطف فرمائے۔

عبدالماجد دریابادی (صدق جدید لکھنو ۱۴/ اپریل ۶۱ء)

حضرت امجد حیدرآبادی کے انتقال سے ہماری صفوں میں ایک بڑے ممتاز شاعر ایک پاکیزہ طینت شخص اور ایک صاحبِ دل انسان کی کمی ہو گئی۔ رباعی کہنے کو چار مصرعوں کی دنیا ہے مگر اس میں بات پیدا کرنے کے لیے دریا کو کوزے میں بند کرنا ہوتا ہے۔ اردو کے جن شعرا نے رباعی میں نام پیدا کیا ان میں امجد حیدرآبادی ایک بلند مقام پر ہیں۔ اُن کی رباعیوں میں زیادہ تر تصوف اور معرفت کے مضامین نظم کئے گئے ہیں۔ اور ایسی بے ساختگی سے کہ پڑھنے والا وجد کرنے لگتا ہے۔

آل احمد سرور (ہماری زبان علی گڈھ ۱۵/ اپریل ۶۱ء)

یوسف ناظم

امجدیات

اگر آئندہ چل کر، کوئی شریف آدمی، شاعروں کے ناموں کے لحاظ سے اردو کا قاعدہ مرتب کرے تو ایسا قاعدہ "الف سے انار اور ب سے بکری کی بجائے، الف سے امجد حیدرآبادی کے لفاظ سے شروع ہوگا اور اگر وہ شریف آدمی اتفاق سے میں ہی ہوا تو بلا تامل یہ قاعدہ یا قاعدہ کا پہلا سبق، ی سے یوسف ناظم پر ختم ہوگا خواہ یہ نصاب میں داخل ہو یا نہ ہو

امجد حیدرآبادی ریاست حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور بغیر کسی نقل مقام کے، آدھرا پردیش میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ یوں دیکھی جائے تو وہ اپنی زندگی ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ اللہ کو پیارا ہو جانا، بعض لوگوں کو بے حد مرغوب ہوتا ہے۔ اور اس صدی میں بھی جب کہ خود اللہ میاں نے دنیا کے مسائل، دنیا والوں کے لئے چھوڑ دیئے ہیں اور ساری دنیا میونسپلٹی کا دفتر بنی ہوئی ہے، بعض لوگ، اللہ کی باتیں کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ امجد حیدرآبادی بھی انہی چند لوگوں میں سے تھے اور انہوں نے شاعری جیسی رنگین اور شر انگیز چیز کو بھی رسالہ دینیات بنادیا تھا۔ میرا حافظہ بہت زیادہ اچھا نہیں ہے۔ لیکن آج سے کوئی بیس بائیس سال پہلے ان کی ایک رباعی جو میٹرک کے نصاب میں شریک تھی اب بھی ذہن میں موجود ہے اور اس کی دو ہی وجہ ہو سکتی ہیں یا تو میرا حافظہ بہت اچھا ہے یا رباعی بہت اچھی ہے۔

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے ؛ مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس ؛ تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے، مصرعہ نہیں، اکرم کی ڈراپ کک ہے۔ پڑی نہیں کہ کنگ کانگ جیسا گوشت و پوست کا پہاڑ بھی تودۂ خاک۔

امجد حیدرآبادی ایسا معلوم پڑتا ہے، بچپن ہی سے بزرگ تھے۔ پتہ نہیں ان کے عزیز و اقارب اور دوست احباب سے ان کی نبھتی کیسے ہوگی؟ اس قدر تلخ اور سچی باتیں کہنے اور کرنے والے شخص کو دنیا والوں نے اتنے دن سہا کیسے؟؟ امجد حیدرآبادی کی مثال سے شبہ ہوتا ہے کہ سچ بولنے والا شخص بھی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے!

سرزمین حیدرآباد، سوچ بچار اور غور و فکر جیسے لطیف اور نازک مشغلوں کے لئے کبھی بھی سازگار نہ تھی لیکن امجد حیدرآبادی بالعموم سوچا کرتے تھے اور سوچتے بھی سہل ممتنع میں تھے۔

بہت سوچا سمجھ میں کچھ نہ آیا ؛ مجھے کس نے بنایا کیوں بنایا
عدم میں کس مزے سے سو رہا تھا ؛ مجھے کس نے جگایا کیوں جگایا
بہت دور ایک کونے میں پڑا تھا ؛ یہاں کس نے بلایا کیوں بلایا
پھر آخر اس بھری محفل سے امجدؔ ؛ مجھے کس نے اٹھایا کیوں اٹھایا
اس آنے جانے کا کیا ماحصل ہے
بہت سوچا سمجھ میں کچھ نہ آیا

امجد حیدرآبادی یقیناً بہت کم سخن رہے ہوں گے۔ صرف کم سخن شخص ہی رباعی کہنا پسند کر سکتا ہے۔ زیادہ گفتگو کرنے والے غزلیں اور ان سے زیادہ گفتگو کرنے والے نظمیں کہا کرتے ہیں۔ لیکن ایسی کم سخنی میں بھی امجد حیدرآبادی نے کیا کچھ نہیں کہہ دیا ہے۔ ان کی ہر رباعی اور ہر مصرعہ وائٹ ہیپر ہے۔ چار چھوٹے چھوٹے مصرعے کہے ہیں لیکن ہر مصرعہ تھری ناٹ تھری کی گولی ہے۔ امجد حیدرآبادی نے اتنی اور ایسی رباعیاں کہی ہیں کہ ان کی منظومہ ہوتی معدوم ہوتی گئی ہے۔ نظم، مرثیہ، ہجو اور قصیدہ وغیرہ کے لیے اگر شاعروں کے درمیان موسیکل چیئر (MUSICAL chair) کا مقابلہ ہو تو بڑا شدید اور میک کے معیار کا مقابلہ ہوگا اور ... فساد کا اندیشہ رہے گا لیکن رباعی گوئی کی میوزیکل چیئر میں امجد حیدرآبادی سے کون کرسی چھین سکتا ہے۔ کرسی تو ان کے قبضہ میں اسی دن چلی گئی تھی جس دن انہوں نے پہلی رباعی کہی تھی۔

غالب اور اقبال نے سکون اور تنہائی کی بڑی تمنائیں کی تھیں۔ غالب تو ایسی جگہ جا کر رہنا چاہتے تھے جہاں ان کا کوئی ہم سخن ہو اور نہ ہم زباں۔ (غالب اگر آج زندہ رہتے تو بلا ناغہ یہ خواہش پوری ہو جاتی) اقبال کو بھی کنج عزلت کی تلاش تھی۔ نہ تو غالب کی خواہش پوری ہوئی کیونکہ ان کی تو ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے اور نہ ہی اقبال کو کنج عزلت ملا۔ امجد حیدرآبادی نے کسی جگہ اپنی کسی ایسی خواہش کا ذکر کیا ہے یا نہیں یہ پتہ نہیں لیکن حقیقت یہ کہ وہ گوشہ نشین ضرور ہو گئے تھے تاہم اس گوشہ نشینی میں بھی وہ مصروف جستجو رہتے اور مطمئن تھے کہ جس شے کی انہیں تلاش ہے وہ انہیں ملنی ہی چاہیے۔

دنیا کی ہستی ہو جیسی نہ ہر دوں تو سہی ؛ میدان ہوا کو، ہو نہ گردوں تو سہی
ملنا نہیں تو مجھ سے اگر خیر نہ مل ؛ میں بھی اس میں کوئی نہ کردوں تو سہی

امجد حیدرآبادی منصفانہ دل رکھنے والے معلم تھے۔ کبھی تو بڑے پیار اور محبت سے سمجھاتے کہ بھئی یوں کیوں ایسا کرتے ہو یوں کرو۔

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو ؛ منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو ؛ بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

یہ محبت آمیز گفتگو دیکھیے اور پھر اس لاٹھی چارج کو ملاحظہ کیجیے کہ

تو کان کا کچا ہے تو بہرا ہو جا ؛ بد بیں ہے اگر آنکھ تو اندھا ہو جا
گالی، غیبت، دروغ گوئی کب تک ؛ امجد کیوں بولتا ہے گونگا ہو جا

امجد نے اپنی زندگی میں اِدھر اُدھر بہت دیکھا لیکن آخر کار اس نوبت پر پہنچے کہ صرف ایک ہی طرف دیکھتے رہے اور دوسروں کو بھی مشورہ دیا ؎

یہ خورشید و قمر کیا دیکھتے ہو ٭ فضائے بحر و بر کیا دیکھتے ہو
کسی کے حکم سے سب ہو رہا ہے ٭ اِدھر دیکھو اُدھر کیا دیکھتے ہو

امجد ڈراما نگار نہیں تھے۔ لیکن مکالمے لکھنے میں انہیں کمال تھا۔ وہی چار سطری مکالمے، ایجاز، اختصار، ابہام اور ایقان سے ہر مصرعہ رچا ہوا۔ ہر مصرعہ سادہ و پرکار۔ ہر لفظ [illegible] تلوار یعنی کچھ اس طرح کا کہ اِدھر منہ سے نکلا اُدھر دل میں اترا۔ ایک مکالمہ سنئے۔

بدلی چھائی ہوئی ہے برسات نہیں ٭ [illegible] سے نکلے وہ مگر رات نہیں
تو مجھ سے قریب میں تجھ سے نزدیک ٭ [illegible] سے ہم دو [illegible] بات نہیں

مخاطب جواب دیتا ہے۔

دونوں یک جا مگر ملاقات نہیں ٭ [illegible] گفتگو ہے بات نہیں
کہو اس کا سبب تو یہی سمجھا امجد ٭ [illegible] ساتھ [illegible] نہیں

امجد حیدرآبادی اب مادّی طور پر اردو شاعری کے حلقے سے ہٹ گئے ہیں لیکن وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے انہوں نے اردو شاعری کی اس صنعت کو جو یہی دامن تھی اپنے کلام سے مالامال کر دیا ہے۔ [illegible] حکیم مقصود جنگ لیکن جو حکیمانہ باتیں انہوں نے اپنی شاعری [illegible] میں کسی حکیم سے [illegible]

دکن کی سرزمین نے اردو کے جو نامور شعرا پیدا کئے ان میں حضرت امجد حیدرآبادی کو [illegible] تھا۔ رباعیات اکثر شعرا کا میدان سخن رہی ہیں۔ لیکن [illegible] میدان میں [illegible] اپنی شاعری [illegible] بلند پروازی اور فکر کی رسائی کے جو کمالات دکھائے [illegible] کوئی ان کا حریف نہیں تھا [illegible] بڑے ادیب و شعرا نے ان کے کمال شاعری کو تسلیم کیا اور [illegible] کی داد دی [illegible] کوئی [illegible] نہیں کی۔ حیدرآباد کا اردو کے عروج و ترقی میں جو گرانقدر حصہ رہا ہے تو وہ حضرت امجد مرحوم کی جیسی عظیم و سہرہ آفاق شخصیتوں کی بدولت رہا ہے۔ یہ اردو کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس [illegible] جب کہ وہ اپنی بقا اور [illegible] کشمکش میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اساطین اردو یک ایک کر کے اپنی جگہ خالی کرتے جا رہے ہیں [illegible]۔ ان کی رحلت نے اردو کے ایک باکمال شاعر، تصوف کے نکتہ داں اور معلم اخلاق، ناصح قوم کو ہم سے چھین لیا [illegible] ان کا نام اور کام ہماری سوگواری کے لیے چھوڑ دیا۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء)

محمد اکبر الدین صدیقی

حضرت امجدؒ کی ظرافت

جن لوگوں کو ہم زاہد خشک کہتے ہیں ان کے متعلق ہمارا یہ تصور ہوتا ہے کہ یہ زاہد خشک ہوں گے۔ ان کی محفل میں بار پانے کے بعد سوائے اس کے کہ جبیں پر شکن ہو اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ ایک عام بات یا قاعدہ کلیہ ہے لیکن ان میں مستثنیات بھی ہیں جیسے ... ہوتی ہیں۔ حضرت امجد کو دنیا ایک صوفی جانتی ہے، زاہد سمجھتی ہے اور پہلی بار ملنے والا ہمیشہ یہ محسوس کیا ... وہ ... جلا بڑھانے والے نہیں ہیں۔ وہ عنفوان شباب بلکہ لڑکپن میں بھی صوفی تھے اور بڑھاپے میں بھی صوفی ... رہے۔ ... متعدد زمانہ نے ان کے تصوف کو بہت زیادہ گہرا کر دیا تھا اس کے باوجود ان کے ملنے جلنے والے جانتے ... ہمیشہ ... سنج اور شگفتہ مزاج رہے ہیں۔ حسرت ہے کہ ایک شخص جس نے رود موسیٰ کی طغیانی میں اپنے خاندان ... دیکھا خود کو بھی بہا اور قسمت نے اس کو زندہ رکھا وہ بزلہ سنج اور شگفتہ مزاج کیسے ہو گیا، عوام نے ان کو شہنشاہ ... سعدیؒ دکن بھی، انہوں نے اپنی نظم اور نثر دونوں اصناف میں جہاں تصوف کی خشک زمین ... ہیں ... طرافت کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کی رباعیات بھی اس کی شہادت دیں گے اور ان کے نثری کارنامے بھی۔ ہم یہاں پہلے ان کی رباعیوں سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

حشر میں ہمیں اپنے اعمال کی جواب ... ہوگی اور اپنی نیکیوں اور برائیوں کی بنا پر جزا و سزا ملے گی۔ اس مفہوم کو وہ آیت لاتقنطوا من رحمتہ اللہ یعنی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، زیر عنوان فرماتے ہیں۔

بیکس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایا ہے ٭ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے؟
یا رب تری رحمت کے بھروسے امجد ٭ بند آنکھ کیسے یوں ہی چلا آیا ہے

... اور پھر چوتھا مصرعہ اسی انداز میں پڑھیے تو تعجب ہو گا کہ خدا سے بھی ظرافت کے پیرایہ میں ... کیسے تیار ہو گیا۔

فطرت میں تبدیلی ناممکن ہے یہ ایک عام مضمون ہے اس سلسلے میں ایک رباعی ہے:

ہر صحبت بے خرد پریشان رہا ٭ نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی ٭ نادان کو لاکھ بھی تو نادان رہا

لفظ نادان کی ترتیب لفظی نے ظرافت کی کیفیت بھی پیدا کی اور دعویٰ کے لیے دلیل بھی۔

ہم عام طور پر مستقبل کی فکر ... پیچاں رہتے ہیں اور حیات بعد الموت کا تصور (اگر کبھی آئے) تو اعمال

کا جائزہ لیکر متفکر بھی ہوتے ہیں، ایسے فکرمندوں کے لیے کس انداز میں تلقین کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

میں کیا جانوں کل کے دن کیا ہوگا ؛ [illegible] جو کچھ بھی ہوگا اچھا ہوگا
کی جس نے یہاں پرورش آخر دم تک ؛ [illegible] بھی وہی کارساز اپنا ہوگا

بات عقیدہ کی ہے اور جب عقیدہ ہو تو ظاہر ہے کہ آج باوجود [illegible] بہتر زندگی گزر رہی تو کل کی فکر کی بھی چنداں ضرورت نہیں اس لیے کہ وہاں بھی وہی موجود ہوگا۔

رباعیات جلد اول میں ایک رباعی وحدۃ الوجود [illegible] الفاظ بہت معمولی ہیں اور جب بھی طلبا اور نوجوانوں نے یہ رباعی پڑھی تبسم کو ہنسی میں تبدیل کر دیا [illegible] شیخ [illegible] فرماتے ہیں۔

بے خود ہی رہوں تو وہ قریں آتا ہے ؛ [illegible] آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں ؛ [illegible] آتا ہے

آنانکہ خبر [illegible] باز نیامد [illegible] تفسیر ہے

انسان متجسس [illegible] ہوا، اور ہمیشہ کھوج میں لگا رہتا [illegible] ہوتے ہوئے بھی کہ اس راہ میں سینکڑوں کے جی چھوٹ گئے وہ اپنی دھن میں کام کیے جاتا ہے، سوچے جاتا ہے [illegible] کرتا ہے پھر بھی ہر چیز پر اس کا احاطہ نہیں اس لیئے فرماتے ہیں۔

کھینی مرے فلسفہ کی پکتی ہی نہیں ؛ تدبیر سے تقدیر جھلتی ہی نہیں
کھاتی ہے ہمیشہ منہ کی لیکن پھر بھی ؛ یہ کیا؟ وہ کیوں؟ سے عقل تھکتی ہی نہیں

یہ کیا؟ وہ کیوں؟ کو لب و لہجۂ خاص میں ادا کیجئے اور حظ حاصل فرمائیے۔

یہی مفہوم ایک اور اسلوب میں بیان ہوا ہے۔

کیفیت روح پاک معلوم نہیں ؛ حال [illegible] دردناک معلوم نہیں
جھوٹی ہے تمام علم کی لاف زنی ؛ [illegible] کو خاک معلوم نہیں

جب ہم اس مفہوم پر غور کریں تو اس میں ہمیں کتنی صداقت جھلکتی دکھائی دیتی ہے اور دوسرا شعر کس درجہ طنز کا حامل ہے ایک صوفی صافی کی زبان سے شیخ خود نما کی تعریف ملاحظہ کیجئے۔

کس شان سے شیخ خود نما بیٹھا ہے ؛ سچ مچ کوئی سمجھے کہ خدا بیٹھا ہے
صورت میں ہے بایزید سیرت میں یزید ؛ چمڑے پہ ہرن کے بھیڑیا بیٹھا ہے

اور ایک دو ورق آگے الٹ کر اس رباعی کا مطالعہ فرمائیے۔

درگاہوں پہ رکوع و سجدہ دیکھا ؛ قبروں کا نشاں عرش سے اونچا دیکھا
مردہ، در دست زندہ، سنتے تھے مگر ؛ رندوں کو بھی "بدست مردہ" دیکھا

محاورے کی نشست، مفہوم کی صداقت، مضمون کی بلاغت اور ظرافت کا پیرایہ سب کچھ چار مصرعوں میں موجود ہے دنیا کی مادہ پرستی پر اس سے زیادہ کیا لطیف اشارہ ہو سکتا ہے فرماتے ہیں۔

عاشق کی ہوس کہ دل ربا مل جائے ؛ عارف کی تمنا کہ خدا مل جائے
ہم اپنے بھی دل کی بات کہہ دیتے ہیں ؛ وہ یہ کہ کہیں سے روپیہ مل جائے

رباعیوں کے علاوہ قطعات میں بھی ظرافت ظرافت میں پتہ کی باتیں کہہ گئے ہیں۔
کل شئ یرجع الی اصلہ یعنی ہر چیز اپنی اصل کی طرف پلٹتی ہے کی تعبیر کس انداز میں بیان کی جا رہی ہے

یہ ثابت ہے کہ ہر شے اصل کی جانب پلٹتی ہے ؛ نمایاں اب ہمارے اصل جوہر ہوتے جاتے ہیں
بقول ڈارون بندر سے ہم انسان بنے پہلے ؛ بقول امجد اب انسان سے بندر ہوتے جاتے ہیں

خدا سے ایک سوال کرتے ہیں۔

کچھ ہیں منکر کچھ مذبذب کچھ منافق باخبر ؛ کوئی ہوگا جو صداقت سے ترا قائل ہوا
آفرینش سے ہماری اے خدائے کائنات! ؛ تجھ کو کیا حاصل ہوا اور ہم کو کیا حاصل ہوا

پاپ درشن کے عنوان کے تحت یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

دھرم قائم ہے پاپ درشن پر ؛ کتنے آئے یہی پتا ماتا
پاپ ہر روز دیکھتے ہیں ہم ؛ پن کسی جا نظر نہیں آتا

نئی تعلیم، نئی روشنی، نئے ماحول اور نئے انداز فکر میں پرانے دستور نہیں چل سکتے ان میں بھی جدتوں کی کارفرمائی ضروری ہے۔ اس کو یوں ادا کیا ہے۔ عنوان ہے لامذہب۔

کوئی مسلم اگر سوال کرے ؛ پڑھ کے قرآن اسے سنا دیں گے
ڈارون اور کارل مارکس کا ؛ مولوی جی جواب کیا دیں گے؟

اس نئے دور میں حضرت امجد صوفی کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

آیا ہے زمانہ پر ترقی ؛ گندہ بندہ خدا ہوا ہے
ایمان سے [illegible] صاف کرکے ؛ امجد صوفی بنا ہوا ہے

یہ چند رباعیات اور قطعات جو نمونتاً یہاں پیش کئے گئے، کلام کے تفصیلی مطالعہ سے واضح ہوگا کہ زاہد خشک کی زبان بھی گل افشانی کرتی اور محض متبسم اور محظوظ کر دیتی ہے۔

چند نثر کے نمونے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ نثری تصانیف میں ایسے فقرے بکثرت ملیں گے۔
حج امجد میں لکھتے ہیں۔

بارہ دن کے بعد ہمارا جہاز کامران پہنچا ہم ساحل پر اتر پڑے تمام کے دروازے پر سب سامان چھین لیا گیا جو بچ گئی مگر جسم سے کپڑے پاؤں سے جوتے نکال لیے گئے اور کپڑے کو کھول کھول کر بھاپ کی گرم دہکتی مشین کے حوالے کیا گیا۔ ہم بھی دھکیل دیئے جاتے تو کیا کر لیتے، ایک حمام میں سب ننگے۔ بس بارہ دن کے سلوک میں سب مجذوب بنے ہوئے کھڑے ہیں۔
تھوڑی دیر بعد ایک صاحب ... تشریف لائے حکم ہوا کہ سب اپنے اپنے ہاتھ اٹھائے رہیں تاکہ (اگر مرض ہو تو دیکھنے میں تکلیف نہ ہو) تمام غریب قدم جمائے، ہاتھ اٹھائے

کھڑے رہیں۔ ڈاکٹر صاحب منہ اٹھائے کسی کی نبض پر کسی کی ہتھیلی پر کسی کی انگلیوں پر انگلیاں رکھتے ہوئے تشریف لے گئے۔ سب کو حمام کے آخری کمرہ میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ جہاں چھتوں پر فوارے لگے ہوئے تھے۔ [illegible] فواروں کے نیچے کھڑے کئے گئے اوپر سے پانی چھوڑا گیا۔ نہ معلوم کس قسم کا پانی تھا تمام جسم میلے کپڑوں کی طرح چپ چپا ہو گیا۔ مدت کا جما ہوا میل چھوٹ چھوٹ کر جسم پر ہر جگہ جم گیا۔ [illegible] بھی مل دیا گیا۔ اسی ہیئت کذائی سے دوسرے کمرے میں دھکیلے گئے جہاں جسم سے اترے کپڑے مشینوں میں پڑے تھے۔ کپڑے ہی نہ مشین سے باہر آنے کا نام [illegible] تھے [illegible] صاحب۔ ہم کپڑوں کے انتظار میں پانی میں شرابور [illegible]

سارے کپڑے اتر گئے [illegible] [illegible]

حج سے پہلے ہی حاجی [illegible] [illegible]

مسجد قبا سے جب باہر آئے تو [illegible]

"ایک مرتبہ ہم [illegible] دیکھنے پر معلوم ہوا دو دو تین تین [illegible] نے ایک ایک جوڑ پر قبضہ جما رکھا ہے اور حفاظت کا حق [illegible] وصول کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کے بعد یوم العرب و [illegible] اور [illegible] کے زیر عنوان [illegible] ان میں کتنی ظرافت ہے کہ مطالعہ سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

جمال امجد حضرت امجد کی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہے اور آپ نے اس کو اپنی زوجہ محترمہ جمال النساء سلمیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے جس میں ان کی زندگی کے اہم واقعات بھی شامل ہیں۔ اس میں بھی کئی ایسے مقامات ملیں گے جہاں [illegible] ظرافت سے کام لیا گیا ہے باوجود ایک بلند معیار اخلاق پیش کرنے اور مسائل تصوف کے بیان کے یہ کتاب [illegible] اور بے کیف ہونے نہیں پاتی۔ صرف دو ایک مقامات سے مختصر سے تبصرے پیش ہیں۔

"قیام مدرسہ کے آخری زمانے میں ہم نے [illegible] لکھنا [illegible] مصادر خوب ازبر تھے۔ آخر مہتمم صاحب مدرسہ کو بھی ہماری بے [illegible] کی خبر ہو گئی"

بیوقوف عورت کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں۔

"ایک دفعہ کسی بات پر ہم نے (اپنی زوجہ محترمہ جمال النساء سلمیٰ کو) کہہ دیا کہ تم بڑی بیوقوف عورت ہو۔ ہنس کر کہنے لگیں اپنی عقلمندی کے اظہار کے لیے عورت کو صفت بیوقوفی سے متصف کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ عورت اور بیوقوف دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ عورت کے ساتھ صفت بیوقوفی کا اظہار اپنی بیوقوفی کا اظہار ہے"

ہماری شیخی کے تحت لکھا ہے۔

"ایک دفعہ ہم نے کہا کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم بھی مرشد بن بیٹھیں۔ سلمیٰ نے کہا خدا خیر کرے آخر اس سے آپ کی علت غائی کیا ہے؟ وہ بالکل صاف ہے۔ محنت نہ مشقت اور

دولت ہی دولت ہم کسی کے پاؤں پر لاکھ سر رکھیں ایک پیسہ نہیں ملتا اور مرشد ہیں کہ ان کے پاؤں پر سر رکھ کر نذریں پیش کی جاتی ہیں"

پیام امجد اور حکایات امجد میں متصوفانہ اور اخلاقی مضامین زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود اس میں بھی حضرت امجد کا قلم شوخیاں بکھیرتا ہے۔

گلستانِ امجد سعدی کی گلستان کا ترجمہ ہے اور اس میں بھی تحریر کا وہی انداز قائم ہے

آخر میں ایک محفل کا ذکر کروں گا جس میں برعظیم ہند و پاک کی دو بڑی ہستیاں مصروف گفتگو تھیں۔

گذشتہ جنوری ۱۹۶۱ء میں جناب جوش ملیح آبادی اور جناب تلوک چند محروم تشریف لائے تھے۔ میں ایک دن شام میں ملا تو فرمانے لگے کہ محروم صاحب تشریف لائے تھے بہت خلوص کے آدمی ہیں خدا انہیں اچھا رکھے۔ میں نے پوچھا جوش صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی، فرمانے لگے وہ میرا پرانا دوست بغیر ملے نہیں جا سکتا، چنانچہ جس دن حضرت جوش صاحب واپس ہو رہے تھے۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کے ساتھ امجد مسکن پہونچے۔ حضرت امجد نے مجھے بھی یاد فرمالیا اس وقت پستی اور نقاہت زیادہ تھی اس لیئے وہ زندگی کے تعلق سے مایوسی کی باتیں کرنے لگے۔ حضرت جوش نے اپنی پرجوش اور گرجدار آواز میں خمریات سے متعلق رباعیات سنائیں اور حضرت نے خوب جی کھول کر داد دی۔ یہ صحبت بہت مختصر رہی حضرت جوش نے اٹھتے ہوئے فرمایا۔ خدا حافظ۔ حضرت امجد نے طنزاً فرمایا۔ یہ کیا کہا؟ تو حضرت جوش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" یہ تو کہنا ہی پڑتا ہے۔ اچھا خدا نخواستہ زندہ رہیں تو پھر ملاقات ہوگی۔ اس" خدا نخواستہ" پر دونوں خوب ہنسے۔ لیکن حاضرین پر سکتہ طاری ہوگیا اور دو مہینے بعد حضرت امجد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

حکیم الشعرا امجد حیدرآبادی نہ صرف یہ کہ ایک بڑے اچھے شاعر تھے بلکہ ایک بلند پایہ نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔ شاعری میں ان کو رباعی اور نظم سے خاص دلچسپی تھی۔ موجودہ عہد کے بلند پایہ رباعی گو مانے جاتے تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات نے ان کے دل میں درد و سوز پیدا کر دیا تھا اور اس کا اثر ان کی نظم و نثر دونوں میں ہے۔ اسی چیز نے ان کو تصوف کی طرف مائل کیا۔ وہ سادہ مزاج، مخلص اور انسان دوست بزرگ تھے۔ افسوس ہے کہ بزم دیرینہ کی شمعیں ایک ایک کرکے بجھتی جاتی ہیں اور بہت جلد کوئی ایسا چراغ باقی نہیں رہے گا جو ہماری اس بزم کے کسی گوشہ کو بھی منور کر سکے۔

(نجیب اشرف ندوی (نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۶۱ء)

حضرت امجد مرحوم کے کردار کی نمایاں خصوصیت ان کی شانِ استغنا تھی۔ ہر حال میں خوش اور قانع۔ ۱۹۰۸ء میں جب حیدرآباد کی موسیٰ ندی میں قیامت کی طغیانی آئی۔ ہزاروں آدمیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ امجد مرحوم بھی اپنے گھر والوں سمیت پانی کے ریلے میں بہہ گئے مگر اس طوفانِ اجل، وآشوب زمانہ سے بچنا قسمت میں لکھا تھا۔ ایک درخت پر چڑھ کر جان بچائی، لیکن ماں، بیوی، بیٹی اور چند دوسرے افراد خاندان اس طغیانی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس صدمہ جانکاہ نے امجد مرحوم میں ربودگی، وارفتگی اور جذب کی سی کیفیت پیدا کر دی جو آخری وقت تک ان کے مزاج میں رہی۔ اس زمانہ میں بیعت کا پہلو بھی نکل آیا۔ .... ماہر القادری (فاران کراچی مئی ۱۹۶۱ء)

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم)

دو نصف = ایک

جمال امجد کیا ہے؟ جمال اور امجد دو مختلف القوالب متحد الروح یا دو نصف مساوی ایک، مثنیوں، یا ہستی کی حیات مستعار زندگی کا کارنامہ ہے۔

اس میں گیارہ نوشتے ہیں۔ ہر نوشتہ اپنی طرز میں دلکش اور ہر نوشتہ کا ذیلی مضمون حیرت انگیز و رعنی خیز ہے۔ کہیں آہ ہے، کہیں واہ۔

ہر قصہ کسی خاص لطیف اشارے اور پُر تاثیر کنارے پر ختم کیا گیا ہے۔ اس کا آٹھواں نوشتہ تو دوسرے نوشتوں کے مقابل میں نوشتۂ قدرت معلوم ہوتا ہے۔ ایک آئینہ جس میں ابتدا سے انتہا تک ایمان کی تازگی، یقین کی، یاد الٰہی، روح کی راحت، لازوال مسرت کی طلعت جہاں افروز نظر آتی ہے۔ وہ سکون ملتا ہے جو بے چینی سے قطعاً نا آشنا ہے۔ اس نوشتہ کو پڑھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ ناقص العقل عورتیں بھی کس قدر کامل الایمان و الیقین ہوتی ہیں۔ صدق اللہ مولٰنا العظیم مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَکَرٍ اَوْ اُنثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً

میں اس کتاب کے ناظرین سے نہایت پُر زور الفاظ میں کہتا ہوں کہ اس آٹھویں نوشتہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ مجھ سے امجد صاحب پوچھتے ہیں کہ مجھے اس کتاب میں کیا چیز پسند آئی؟ جس کی ہر چیز مجھے پسند ہو میں اس کی کسی ایک چیز کے متعلق کیا کہوں کہ وہی مجھے پسند ہے۔ ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم ٭ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

میں نے امجد صاحب کی شاعری کے متعلق پہلے لکھا ہے کہ "حضرت امجد ہندوستان کے اُن شعراء میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے، میری اس رائے سے مولوی وحید الدین سلیم (مرحوم) ابتدا میں اختلاف کرتے رہے۔ لیکن آخر کار حضرت امجد کی سحر کار شعریت نے سلیم صاحب کو بھی سلامت نہ چھوڑا۔ سر تسلیم خم کر کے لکھتے ہیں کہ "حضرت امجد زندۂ سرمد اور قدرتی شاعر ہیں۔ آج ہندوستان بھر میں ان کی ٹکر کا رباعی کہنے والا کوئی شاعر نہیں ہے"۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ٭ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اب ان کی دلکش نثر کے متعلق اپنی آزادانہ رائے کو پابند کر کے صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ مولانا عبد الباری ندوی لکھنوی جیسے نقاد اور نکتہ چین بزرگ بھی حضرت امجد کی شاعریت پر دیر تک جھومتے رہے۔ میں نے تو شاید دو ایک مرتبہ پہلو بدلے بھی ہوں گے، مگر مولانا سے ممدوح الصدر نے دو سو صفحے کی کتاب ایک ہی بیٹھک میں ختم کر دی۔ کتاب ختم کرنے سے پیشتر اس کا مطالعہ ختم نہ ہو سکا۔ وہ امجد جو اب تک شاعر مشہور تھا، دیکھو کہ اب انشا کے ایک جدید اسلوب اور قالب میں کس طرح کامیاب ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔ فالحمد للہ رب العالمین

(جمال امجد ۱۳۴۸ھ)

مکاتیب بنام حضرت امجد

۱۔ [illegible] مولانا مناظر احسن گیلانی

تہنیت نامہ

[illegible]

[illegible] ... لیکن ... [illegible] ... مصرعہ ... [illegible] ... چاند ... [illegible] ... پوچھتے ہیں۔

"اور جیو اور جیو"

[illegible] کے بعد [illegible] معلوم ہونے لگی، ڈاکٹر عثمان ہمارے وظیفہ پر الگ [illegible] کئے گئے، ان کو جاودہ کی راستہ میں ساڑھے تین [illegible] کی جگہ علاوہ مکان و موٹر کے ملی لیکن جی نہیں لگا، گھبرا کر بھاگ گئے، اور بھاگے گھر [illegible] پہنچے [illegible] الفاظ [illegible] وقت لکھوایا "اور جیو اور جیو" کو تڑپ اٹھے، خیر انشاء اللہ، مولانا عبدالباری کی تنقید [illegible] باتیں کھری ہو کر نکلی اور وہ بیچارے تو مدت ہوئی آپ کے نہال ہو چکے۔ اب تو ان کا کبھی اعتبار نہیں

اس وقت تو سب سے زیادہ اعتبار اسی سرفرازی کو حاصل ہے جو سب سے زیادہ ذ[illegible] سے عقدی احتراف سے حاصل ہوئی ہے۔

نیازمند
مناظر احسن گیلانی

ع۱ حضرت امجد کی اس رباعی کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا ذکر صفحہ [illegible] پر آیا ہے۔

اور جیو

ہے ہوئے ظلم و ستم وجور جیو ؛ تکلیف [illegible] ؛
جب شدت درد سے تڑپ اٹھتا ہوں ؛ کبھی [illegible] اور جیو ؛

۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرشد من
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

جب کار[illegible] آیا تھا اور سوال کرتے [illegible] [illegible]
[illegible] صرور پہونچ گئی ہوگی۔ [illegible] کی تکرار [illegible] دوسری [illegible] الحمد [illegible]
کے بعد اپنے خاص اوقات میں آپ [illegible] فرمائیں۔ [illegible]
[illegible] تکلیف اسی [illegible] [illegible]
[illegible] ملتا ہے [illegible] ہیں۔ [illegible]
[illegible] بڑھ گیا ہے۔ خدا تعالیٰ [illegible] ہے۔ والسلام۔

نیازمند ازلی
مناظر احسن گیلانی۔

ے مولانا سید سلیمان ندوی رح

۳۔ مکتوب مولانا سید سلیمان ندوی رح

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مورخہ ندارد ۱۳۵۶ ھ مطابق ۱۹۳[illegible]ء

جناب حکیم الشعرا ادام اللہ ذوقہٗ

وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ۔ رمضان کا تحفہ سحری جو ایک دردمند کا نالہ سحری ہے۔ بیلا شکریہ۔ آپ جانتے ہیں کہ معارف عطائے خطابات بلکہ اعتراف میں بھی کس درجہ بخیل واقع ہوا ہے۔ اس بنا پر آپ کی نسبت معارف میں جو خطاب لکھا گیا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے اس لذیذ درد دل کو اور بڑھائے اور دوسروں کے ذوق کا اوس کو سامان بنائے
مدت سے حیدرآباد کا ارادہ کرتا ہوں مگر پورا نہیں ہوتا۔ والسلام

سید سلیمان
۱۵ رمضان المبارک سنہ ۱۳۵۱ھ

۴

ندوۃ لکھنو

انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

"عطائے تو بہ لقائے تو"

امجد: تو امیر لطف و احسان کردی ٭ وز نور سخن دلم درخشاں کردی
منت بہ "غریب شہر" چنداں کردی ٭ کاں مور ضعیف راسلیماں کردی

سلہ تبرکی

سید سلیمان
۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۱۲ھ

محب گرامی زاد اللہ حبکم

السلام علیکم۔ الحمد للہ۔ ۸ گھنٹے جھانسی میں قرنطینہ کے بعد لکھنو پہنچا۔ آپ کی محبت کی پُر لطف یاد اپنے دل میں پاتا ہوں۔ آپ کا مصرع یہاں سے واپس جاتا ہے۔ یہی عطائے تو بہ لقائے تو ہے۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام عقیدت اور بچی کو دعائے خیر۔ والسلام۔
از طرف مولوی مسعود علی صاحب سلام مسنون۔

سید سلیمان

امجد حیدرآبادی (مرحوم)

ہمارا سفر میسور و مدراس

(حضرت امجد کی غیر مطبوعہ تحریر)

حیدرآباد میں پیر جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری سے وداعی ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے ہم کو میسور جانا پڑا۔ ریل کا سفر بغیر کسی شکوہ و شکایت کے ختم ہوا۔ بنگلور اسٹیشن پر پیر صاحب ممدوح الصدر کے ایما سے ایک بڑے تاجر محمد شریف صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ موٹر پر اپنے مکان لے گئے۔ کھانے کا اچھا انتظام کیا، فارغ ہو کر پھر اسٹیشن واپس آئے۔ ریل شروع سے آخر تک میسور جانے والے مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ گارڈ فضل الرحمن کی کوشش سے ایک چھوٹے سے حصہ میں نشست کی حد تک جگہ مل گئی۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے بہت سے مرد اور عورتیں ریل میں کھڑی ہوئی تھیں مگر بعض جوان مرد پاؤں پھیلائے آرام سے سو رہے تھے۔ یہ کون لوگ تھے؟ ؎

شکوہ از سنگ خارا چوں کنم ⁂ راز خود خود آشکارا چوں کنم

اللھم اصلح شاننا۔ تیسرے دن میسور پہونچے، یہاں بھی احمد خان صاحب تاجر ہمارے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جن کے ساتھ ہم موٹر پر سوار ہو کر پیر صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ پیر صاحب سے بہت دیر تک شفقت آمیز، محبت خیز ملاقات رہی۔ پھر ناشتہ کے بعد کچھ دیر سستا کر باہر نکلے۔ بازاروں میں چکر لگاتے ہوئے احمد صاحب تاجر کی دوکان پر پہونچے۔ وہاں سے ایک رومال وصول کر کے انہیں کو ساتھ لے چڑیا باغ گئے۔ پہلی نظر میں باغ دیکھتے ہی جی باغ باغ ہو گیا۔ مگر ساتھ ہی "بے یار بہار خوش نہ باشد" کے خیال نے بہار کے آئینے میں خزاں کا منظر پیش کر دیا۔ مگر کیا کرتے۔ دیکھیے اور پھر دیکھیے ؎

گل دیکھیے کبھی تو کبھی خار دیکھیے ⁂ تقدیر جو دکھائے وہ ناچار دیکھیے

چڑیا خانے کی رنگ برنگ چڑیاں، رنگیں مرغ، چھوٹے مور، چھوٹے بندروں کی سنہری جوڑی، نہایت عجیب ہے مگر خوبصورت، بفضل اللہ ماشاء اللہ۔ شیر اور شیر کے بچے نہایت خوش رنگ، خوش نما اور اس قدر موٹے تازے کہ شاید جنگل میں بھی نہ ہوں۔ یہاں زرافہ، شتر گاؤ، پلنگ بھی نادر اور عجیب چیز ہے۔ چڑیا باغ کا انتظام قابل ستائش ہے۔

چڑیا باغ سے فارغ ہو کر پھر شہر واپس ہوئے۔ واپسی تک کسی قدر رات ہو گئی تھی کثرت روشنی سے میسور بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ دسہرے کی تقریب میں محل شاہی کے وسیع اور پر فضا میدان میں لاکھوں آدمیوں

کا ہجوم تھا۔ دربار ہال میں تمام ارکان اپنی اپنی کرسی پر متمکن تھے۔ دونوں طرف صف بستہ فوجیں کھڑی ہوئی تھیں کہ یکایک پردہ اٹھا اور انجمن آرائے میسور جواہر نگار لباس میں بعد مورد سرور برآمد ہوا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی تمام پیالیس دمحل، لامع النور ہوگیا۔ مہاراجہ کی نشست تھی یا بجلی کا بٹن؟ ادھر کرسی پر جلوہ آرائی ہوئی ادھر چشم زدن میں سارا محل جگمگا اٹھا۔ بٹون کا سمٹا ہوا نور پھیل کر ظہور میں آگیا تھا۔ ہم کو تو جادو کا تماشا معلوم ہو رہا تھا۔ ابتک الف لیلہ کے علاؤالدین کا فرضی محل سنتے آئے تھے۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا برقی تجلی نے آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کردی۔ ایک طلسم تھا جس میں ہم پھنسے ہوئے تھے۔ ایک خواب تھا جو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ ہم پردیسی دربار ہال سے بہت دور کھڑے ہوئے تھے مگر روشنی کی دوربین نے ہر چیز کو تقریباً قریب کردیا تھا، مہاراجہ کا اجلاس، آمد کی سلامی، دنگل کی کشتی، ارکان دربار کے شاہی آداب کچھ نہ کچھ نظر آجاتے تھے، لاکھوں آدمی تھے مگر انتظام ایسا کہ کہیں شور نہیں، غل نہیں، فساد نہیں سب نظر باز اپنے آپ کو بھولے ہوئے محل اور والیٔ محل کی دید میں محو نظر آتے تھے۔ بلاتفریق مذہبی ہر مسلم و غیر مسلم کی زبان سے والیٔ ریاست کے لیے بغیر کسی رو و ریا کے صداقت کے ساتھ دعائیں نکل رہی تھیں، اپنے بھائیوں کو خوش دیکھ کر کیا وجہ تھی کہ ہم بھی خوش نہ ہوتے، اور سب کے ہم زبان ہو کر نہ کہتے ؎

در خطۂ ملک نظم دلکش کردی ؛ گوندکہ جمع آب و آتش کردی
تادیر بہ دہر زندہ باشی خوش خوش ؛ آوقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

سرنگاپٹن تیسرے دن سویرے شہر میں گشت لگا رہے تھے کہ سرنگاپٹن جانیوالی موٹریں سامنے سے گذریں آرایہ دریافت کیا، معلوم ہوا اچھے آنے۔ جھے آنے سن کر بلا کشش و پیچ موٹر میں سوار ہوگئے۔ مقام مقررہ پر پہونچکر ڈرائیور نے اتار دیا وہاں سے بغیر سواری کے دولت باغ (جس میں ٹیپو سلطان شہید رہا کرتے تھے) اور پھر دولت باغ سے ڈیڑھ دو میل سلطان شہید کے مزار پر پہونچے، زیارت سے فارغ ہو کر موٹر کے مقام تک پیدل ہی واپس ہوئے، بیسیوں موٹریں گذر رہی ہیں مگر بٹھاتا کوئی نہیں جس سے سوال کرتے ہیں یہی کہتا ہے۔ خواہرس از من خوبتر ست۔ پس پس می آید۔ دو تین گھنٹے اسی انتظار اشد من الموت میں گھڑیاں کھاتے، گنتے چباتے گزار دئے۔ آخر کہاں تک اور کب تک۔ توکلتا علی اللہ کہکر اپنے ہی قدموں پر کھڑے ہوئے اور پاؤں کی جان مارتے راستہ طے کرنے لگے۔ پاس سے گذرنے والی موٹر کو نگاہ یاس سے دیکھتے اور رہ جاتے، کجا دانند حال ما سبکساران موٹر ہا۔ سلطان شہید کی زیارت کی برکت سے ہم بھی روحانی شہادت کے قریب پہونچ چکے تھے ؎

پاؤں تھم سکتے زمین پہ کب تک ؛ ٹوٹ کر زیر زمین ہو جاتے
گر ذرا اور ترقی کرتے ؛ ہم بھی سلطان کے قریں ہوجاتے

یہ بھی شکر ہے کہ جیسا برا وقت ہر طرح گذر ہی جاتا ہے۔ ہم بھی گذرنے والے وقت کے ساتھ ساتھ رہگذر پہ گزرتے رہے۔ مغرب کے قریب اسپورٹس گراونڈ تک جہاں آج مہاراجہ بہادر کی سواری آنے والی تھی پہونچ گئے اور پہنچتے ہی تھکے ہوئے جانور کی طرح سبزہ سبزے پر لیٹ گئے۔ بلکہ لوٹ گئے، منزل پہ پہونچ کر پاؤں کی رگوں نے بے تال و سُر ستار بجانا شروع کردیا۔ ہم بھی منہ بنا بنا کر سنتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد جلوس کا تماشا شروع ہوا۔ سواروں کے گھوڑے، چمکدار ہتھیار، اونٹ، ہاتھی کی گاڑیاں قابل تعریف تھیں۔ اسی جلوس میں عوج بن عنق کے چند خاندانی افراد بھی تھے جنہوں نے اپنے جد اعلیٰ کی ہمسری کے لیئے پاؤں میں لمبی لمبی لکڑیاں باندھ رکھی تھیں۔

تمہید ختم ہونے کے بعد اصل مضمون شروع ہوا۔ یعنی روشنی کے ہزاروں قمقموں کے جھرمٹ میں سونے کی عماری میں بدخشاں میسور کا لعل رخشاں بصد آب و تاب برآمد ہوا جس کے خوبصورت اور زرین پوش ہاتھی کو عوام نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ اس جلوس کا تماشا دیکھنے کے لیے دو ایک امریکن بھی آئے تھے۔ جنہوں نے آرائش میسور اور سواری جلوس کی بہت تعریف کی۔

دسہرے کی یہ کیفیت، یہ روشنی، یہ جلوس دیکھ کر ہر شخص بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ "دسہرے کا سہرا میسور کے سر ہے"

دیوان صاحب ریاست میسور

دوسرے دن دیوان ریاست میسور نواب آغا مرزا اسمٰعیل خان امین الملک بہادر سے ملاقات ہوئی۔ خان ممدوح السعدہ نوجوان اور شریف انسان ہیں اور ان مردوں میں ہیں جن کو دولت کے نشے نے مست نہیں کیا ہے۔ ہم نے "خرقۂ امجد" کی ایک جلد پیش کی۔ نواب صاحب نے اس کے دو چار شعر پڑھے اور محظوظ ہو کر فرمایا کہ یہ کس کا کلام ہے !!! ہم نے کہا، اسی شکلم کا جو اس وقت آپ کا مخاطب ہے۔ شاید نواب صاحب نے امجد کے معمولی جسم کو مصنف خرقۂ امجد کے شایان شان نہیں پایا۔ پندرہ بیس منٹ ریاست کے انتظامات اور ترقی ملک پر گفتگو فرماتے رہے۔ ہم نے بھی موقع اور محل کے اعتبار سے دو ایک نصیحت خیز باتیں کہہ دیں۔ ایسے جلیل القدر دیوان ریاست کا ہم سے تباہ حال غریب الوطن کے ساتھ خلوص اور محبت کا برتاؤ ایک ایسا نقش ہے جو صفحۂ دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتا، اس وقت نواب صاحب اگرچہ ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن ان کی شیریں بیانی، اخلاق انسانی کا اثر اسی طرح مرتسم ہے۔ فاعتبروا یا اولی الالباب ؎

پند سعدی بہ دل و جاں بشنو اے امجد ॥ بندۂ حلقہ بگوش ار نہ نوازی برود

لطف کن لطف، کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

مدارالمہام وقت کو اپنی سی غیر اہم ہستی کی طرف متوجہ رکھنا مناسب نہ سمجھ کر ہم نے اجازت چاہی۔ نواب صاحب نے شربت پینے کے لیے فرمایا۔ ہم نے یہ کہہ کر کہ اب شربت میں آپ کی محبت خیز ملاقات سے زیادہ حلاوت نہیں مل سکتی، معافی چاہی، چلتے وقت ہم سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اپنی جیب سے سنہری تاروں کا ایک ہار نکال اور یہ کہہ کر عنایت کیا کہ "یہ میسور کی نشانی ہے" چند تاروں کا ہار اور پھر ہم فاقہ مست کی نگاہوں میں کیا سما سکتا، لیکن دینے والے کی ادائے محبت پر جی لوٹ پوٹ ہو گیا۔ آنکھ ہار کے تاروں کو دیکھ رہی تھی، دل اندر سے پکار رہا تھا، انظر الی من اعطی ولا تنظر الی ما اعطی،

(اس کو دیکھو کہ کس نے دیا، یہ مت دیکھو کہ کیا دیا) ؎

امین الملک اسمٰعیل خاں را ؎ خدا دارد ہمیشہ شاد و آباد
دلش، دلشاد و چشمش باد روشن ؎ کہ زو شد امجد دل خستہ دل شاد

نواب صاحب نے باہر تک تشریف لاکر ہم کو رخصت فرمایا۔ یہاں کئی شکستہ حال عرض حال کے لیے اپنے تباہ لباس میں کھڑے ہوئے تھے، ہر ایک سے اس کا حال دریافت کیا۔ ہر ایک کے درد دل کو توجہ سے سنا۔ ہر ایک کو تسکین بخش جواب دیا۔ آنے والے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے، جب دیوان اعظم کا یہ حال ہے تو دوسرے حکام کیا ہوں گے ؎

ببیں در آئینہ عشق من نگار مرا ؎ قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

ملک کی روز افزوں ترقی کیوں نہ ہوگی؟ شہر میسور کیوں نہ دارالسرور ہوگا۔ اللھم متع الملک بطول حکمتہ

کوہ چامانڈی اسی شام کو پیر صاحب کے ساتھ چامانڈی پہاڑ پر گئے۔ یہ پہاڑ تقریباً پانچ میل کی مسافت پر ختم ہوتا ہے۔ موٹر گذرنے کے لیے پہاڑ کی چوٹی تک پختہ سڑک بنائی گئی ہے۔ جس میں لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہے اس پہاڑ کی بلندی سے شہر کی بستی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے ؎

ویرانے میں بھی دور سے بستی نظر پڑی ؎ جتنے بلند ہم ہوئے بستی نظر پڑی

پہاڑ کی چوٹی سے شہر کے لاکھوں چراغاں کا منظر عجب دلکش اور دل فریب ہوتا ہے۔ چشم تماشا اس منظر تجلی کو بار بار دیکھتی ہے اور سیر نہیں ہوتی ؎

گرچہ کند صبح و شام سیر دو عالم تمام ؎ سیر نہ گردد مگر چشم تماشا طلب

جس رات ہم اس پہاڑ پر گئے تھے آسمان پر ایک تارا بھی نہ تھا۔ شاید آسمان کے تمام تارے شہر کے تماشا دیکھنے کے لیے زمین پر اتر گئے تھے۔ جگمگاتا آسمان تو سنا تھا مگر جگمگاتی زمین آج ہی دیکھی۔ آتش نے بھی کوئی ایسا ہی منظر دیکھ کر کہا ہوگا ؎

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے ؎ زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

نیو منشن روشن خیال حکومت کا بنایا ہوا "نیو منشن" بھی لاجواب محل ہے جس کا محل وقوع نہایت برمحل ہے اس کا نظر فریب منظر کوسوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس محل کے تین اسٹایے دیے، نہایت عجیب بنائے گئے ہیں۔ ہر زینہ ایک وسیع میدان پر ختم ہوتا ہے۔ ہر زینہ کی چمن بندی غزال دیدہ دل کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے یہ محل شاہی محل کے محاذ میں بنایا گیا ہے۔ محل شاہی کا نشان امتیاز سرخ روشنی ہے اور اس محل کے وسط کی روشنی سبز ہے۔ جب آسمان کا چاند چڑھتا ہوا اس روشنی کے قریب آتا ہے تو دور سے دیکھنے والے کو بلافصل دو چاند کا دھوکا ہوتا ہے ؛ للّٰہ در من صنع ۔ سنا گیا ہے کہ اس محل کے لیے سنگ مرمر کی سیڑھیاں اٹلی سے منگوائی گئی ہیں جن کی قیمت ایک لاکھ روپے ہے۔ اس محل کا ہر حصہ خوبصورت نہایت موزونیت کے ساتھ بنایا گیا ہے اس محل کی روشنی میں عجیب عجیب اختراعات کئے گئے ہیں ایک گلوب صدف نما ہے۔ دور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ گوہر شب چراغ صدف کے اندر سے باہر روشنی ڈال رہا ہے۔

جلسہ سرود ہماری روانگی سے ایک دن پہلے علی جان صاحب شاہی قوال کے ہاں جلسۂ سرود منعقد ہوا۔

بہت دیر تک نغمہ و سرود کی محفل گرم رہی علی جان صاحب کے بعد ان کے دو ایک شاگردوں نے بھی گانا سنایا۔ ایک شاگرد نے تو ہماری ہی غزل گائی جس کا مطلع ہے ؂

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا ٭ کوئی تجھ سا نظر نہیں آتا

استاد تو استاد ہی ہیں شاگرد بھی غنیمت ہیں۔ آخر میں علی جان صاحب نے "امد پیا مورے گھر آئے" پر جلسے کو ختم کیا۔ علی جان صاحب نہایت سمجھ دار، باتمیز اور سن رسیدہ انسان ہیں، ان کی زبان نہایت صاف، مخرج نہایت صحیح، ح، ق کے تلفظ میں کبھی غلطی نہیں کرتے، شعر بھی اچھے کہتے ہیں، اسی جلسے میں خان بہادر مولوی عباس علیخان بہادر سے بھی ملاقات ہوئی، خان موصوف نہایت اعلیٰ خیال اور روشن دماغ ہیں۔ تحریر و تقریر دونوں میں خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ مدتوں مینو سپالٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ تمام ریاست میسور میں "خان بہادر" کے معزز خطاب سے ان کے سوا اور کوئی ممتاز نہیں ہے۔ اسلامی امور سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ ترقی تعلیم میں ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں، شاہ و وزیر کے بیحد مدح خواں ہیں، مگر درباری شاعروں کی طرح مدح خوانی ان کا پیشہ نہیں ہے۔ ان کا پیشہ لکڑی کی تجارت ہے۔ ہم ملازم پیشہ کو آج معلوم ہوا کہ تجارت میں کوئی ذلت نہیں ہے۔ وہ تاجر ہی تھے جن کی تعریف میں ارشاد ہوتا ہے۔

رجالٌ لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله ۔ لنتر الله امنا الحمد

خان بہادر کے خاص دوست محمد سیٹھ صاحب جو ابھی ولایت سے تشریف لائے ہیں، اعلیٰ خیال، پر لطف، زندہ دل انسان، خوبصورت اور نوعمر جوان ہیں۔ شعر و سخن سے بھی مذاق رکھتے ہیں ان کے ولایتی شعر قابل تعریف ہیں۔ نواب کریم الدین میسوری، زندہ دل اور بذلہ سنج خاندانی بزرگ ہیں، اگرچہ بوڑھے ہو گئے ہیں مگر پیر جماعت علی شاہ صاحب کے فیض صحبت سے جوان معلوم ہوتے ہیں شاید حافظ شیرازی نے اسی نواب میسوری کے لئے کہا ہے ؂

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتوان شدم ٭ ہر گہہ کہ یاد روے تو کردم جوان شدم

حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری ہیں۔ پیر موصوف المعارف تعریف اور توصیف سے مستغنی ہیں لاکھوں مرید والے پیر کے تعارف کے لئے یہی معرف اور قول شہادت کی ضرورت نہیں۔ جدھر نکل جاتے ہیں ہر گلی کوچے "کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست" کی آواز آتی ہے۔ جہاں کہیں ... سوال کے حلقے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہم نے میسور جو دیکھا پیر صاحب کو بھی اپنی طرح مسافر ... معلوم ہوا ؂

مرشد کوہ و دشت و بیابان غریب نیست ٭ ہر جا کہ رفت خیمہ زد و خوابگاہ ساخت

ان بزرگوں کے لئے زندگی ہی میں جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

پیر صاحب کی ظاہری صحبت میں بغیر کسی سوال کے سینکڑوں لاینحل مسئلے حل ہو جاتے ہیں معمولی افسانوں میں صاحب ذوق مرید کو احسن القصص کا لطف آ جاتا ہے۔ نہیں معلوم صحبت خاص میں کیا خواص ظاہر ہوتے ہونگے لا يعلم الغيب الا هو ...... پیر صاحب ہم سے مبتذل الحال و الفعال پر بہت مہربانی فرماتے ہیں۔ بہت برس پہلے ایک بہت قدیم بردیانی عنایت فرمائی تھی، مگر ہم سے نااہل کے پاس ایسی دو ہی متبرک چیز کس طرح

رہ سکتی۔ مدراس میں ایک دوست نے چھین لی اگرچہ اس خبر سے پیر صاحب ہم سے ناراض ہو گئے مگر ہم نے "ما قدرو الرحمن قدرہ" کہہ کر ٹھنڈا کر دیا۔ پیر صاحب اکثر یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے کہ (صوفیائے کرام) رنج سہتے ہیں، مگر وہ رنج پہنچاتے نہیں۔ ہم نے اس کو اس طرح مکمل کر دیا ؎

کاظمین الغیظ غصے میں کبھی آتے نہیں ❊ رنج سہتے ہیں مگر وہ رنج پہنچاتے نہیں

جس کے انعام میں پیر صاحب نے نہایت خوش ہو کر ایک روپیہ سکہ عثمانیہ عنایت فرمایا۔ اس کے سوا ایک مصرعہ اور بھی فرمایا کرتے تھے "تم ہمارے ہو نہ ہو، پر ہم تمہارے ہو گئے" ایک روپے کی چاٹ پڑی ہوئی تھی، اس مصرعہ کو بھی مکمل کر کے دوسرے دن خدمت میں جا پہونچے اور حسب ذیل ؎

(ہم یہ کہہ کر سارے جھگڑوں سے کنارے ہو چکے ❊ تم ہمارے ہو نہ ہو پر ہم تمہارے ہو چکے)

شعر سنا کر انعام کے طالب ہوئے۔ اگرچہ اس مصرعہ کو بھی بہت پسند فرمایا مگر حصول انعام میں ناکام رہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ ہماری اپنی خواہش تھی۔ اور وہ، ان کی مشیت تھی، بہرحال، تم ست چاہو۔ میسور سے چلتے وقت بھی اس ننگ وجود کو (بتجربہ سابقہ کے باوجود) کپڑوں کا ایک جوڑا، اور ہم سے بے نمازی کو ایک مخملی جانماز اور ہم سے گلیم پوش کو ایک شال اور دوازدہ امام کی ضمانت میں دے کر ٹکٹ کے لیے بارہ روپے عنایت فرمائے، ہمارے خیال میں اگرچہ ان چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ مگر جوش رحمت کو کون روک سکتا ہے۔ "ورنہ ستانی بستم می رسد" کھیت پوری طرح تیار ہو جانے پر بھی بعض وقت اعتراض کا کوئی محل نہیں ؎

آنچہ خوبان کنند خوب آید ❊ در ہنر کار کے عیوب آید

اسٹیشن تک احمد خاں صاحب تاجر، حیدر علی خاں صاحب سپرنٹنڈنٹ پولس پہنچا گئے۔ پیر صاحب نے بھی ساتھ چلنے کا قصد کیا تھا، مگر ہم نے روک دیا۔ حیدر علی خان صاحب نے تھرڈ کلاس میں فسٹ کلاس کی راحت پیدا کر دی خدا ان کو دین و دنیا کی راحت عطا کرے۔

میسور سے براہ راست مدراس آئے۔ یہاں آکر اپنے عزیز دوست یم، عبدالعزیز کے مکان میں اتر پڑے اور بواسیر کے استعداد سے نہ معلوم کب تک پڑے رہیں۔ اگرچہ جسمانی مرض اور روحانی غم ہر وقت ترقی پذیر ہے۔ مگر عزیز دوست کی مہمان نوازیوں نے ہمارے دل کے ضدی بچے کو بہت کچھ بہلا رکھا ہے۔ اللھم اطعم من الجوع وامنی من سفاکی

شہر مدراس یہ شہر اپنی وسعت اور صفائی کے اعتبار سے مشہور ترین شہر ہے۔ یہاں کا میوزیم نہایت عجیب اور حیرت خیز ہے۔ اس کو تفصیل سے دیکھنے کے لیے کئی دن اور ہر چیز کی کیفیت لکھنے کے لیے کئی مہینوں کی ضرورت ہے۔ ان نادرات سے جو چیز ہم نے عجیب تر دیکھی ایک نعلین تھی جو تقریباً دو فٹ لمبی اور ایک فٹ چوڑی ہوگی۔

تھیاسوفیکل سوسائٹی مدراس اس سوسائٹی کا مکان اور محل وقوع لب ساحل قابل دید ہے۔ یہاں کے ایک ممبر کی زبانی معلوم ہوا کہ اس سوسائٹی کا مقصد مختلف مذاہب میں اتفاق پیدا کرنا ہے۔ اس سوسائٹی کا ممبر وہی شخص ہو سکتا ہے جو کسی مذہب سے برسرِ پرخاش نہ ہو۔ اس ممبر

کی گفتگو کی تصدیق سوسائٹی کے ہال سے بھی ہو سکتی ہے جہاں سب سے پہلے دیوار پر (لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تنزیل من رب العالمین لا یمسّہٗ الا المطہرون) لکھا ہے۔ اسی کے قریب حضرت مسیح کی تصویر بنی ہے اس کے نزدیک کرشن جی بانسری بجا رہے ہیں۔ پھر گوتم بدھ کا مجسمہ بنا ہے۔ غرض ہال کیا ہے؛ ہر قسم کی عبادت کا محل ہے۔

عیسیٰ بہ دین خود، موسیٰ بہ دین خود، کام تو عجیب اور بالکل عجیب ہے، لیکن ہم کو معلوم نہیں کہ اس سوسائٹی کو مختلف مذاہب کے امتزاج میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ ہمارے خیال میں اس نادرہ کار ہال میں سوسائٹی کے اظہار مقصود کے لیے عرفی کا یہ شعر ؎

عاشق، ہم از اسلام خراب است وہم از کفر ⁂ پروانہ چراغ حرم و دیر ندارد

اور ہماری یہ رباعی ؎

ہر ذرے پہ فضل کبریا ہوتا ہے ⁂ اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام اسی زباں سے یہ کہتے ہیں ⁂ وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

لکھ دی جائے تو بہت مناسب ہوگا۔

یہاں کی چیزوں میں ایک اسٹیچو دیکھنے بلکہ دل میں رکھ لینے کے قابل ہے۔ یہ اسٹیچو دو بہنوں کے مجسمے پر مشتمل ہے۔ بڑی بہن نے اپنی چھوٹی بہن کو گود میں اٹھا رکھا ہے۔

حسن و عشق ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ دونوں بہنوں کی بھولی بھالی مورتوں کی متانت، ہر ایک کا ناک نقشہ دیکھنے والے کے دل پر کالنقش فی الحجر ہو جاتا ہے۔

اپنی جمال سلمیٰ کے بعد دنیاوی چیزوں میں اگر کوئی چیز پسند آئی تو یہی سنگی مورت، کسی کے جسم پہ مٹی پڑی، اور کسی کے آنکھوں پر پتھر، بازار میں بکنے والی چیز ہوتی تو دس پانچ روپے میں ضرور خرید لیتے ؎

سخت پتھر سے دل پسیج گیا ⁂ مر مٹے ہم تو سنگ مرمر پہ
نظر انتخاب کے قرباں ⁂ دل بھی آیا تو سخت پتھر پہ

ہم اس مجسمے کو مجسم چشم ہو کر بہت دیر تک دیکھتے رہے۔ کسی ادا میں تغیر نہیں، تبدیلی نہیں، قدم ساکن ہیں کوئی جدید آن نہیں، خیر و شر سے پاک، مدح و ذم سے مستغنی، قدموں پر گرو تو کوئی ناز نہیں، منہ چوم لو تو کوئی احتراز نہیں، عورت، مرد، بوڑھے، بچے، حسین، بدصورت، سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ کسی سے خاص نفرت، نہ کسی سے خاص محبت، سراپا جمال، دل کا نام نہیں، بیہودہ گوئی، بیجا تعلّی سے کوسوں دور۔ سب کے جواب میں ایک خاموشی، جب چاہو مل لو، جب چاہو دیکھ لو۔ وقت کا تعین نہیں، دن کی پابندی نہیں، ناز نہیں، انداز نہیں، ظہور میں پتھر، بطون میں لعل ؎

کیا کوئی کہے اس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے ⁂ ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

عقیدت مند، المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کہہ کر بت پرستی (شیخ پرستی) کو خدا رسی کا ذریعہ سمجھتے ہیں مولانا روم ..... فرماتے ہیں ؎

چوں خلیل آمد خیال یار من ✽ صورتش بت معنی او بت شکن

ساغر کے صفات جامِ جم میں دیکھو ✽ آہن کا ہنر تیغِ دو دم میں دیکھو
تقیید ہے جامع کمالِ اطلاق ✽ کیا حسن سے شانِ رب صنم میں دیکھو

الحاصل دید صنم سے فارغ ہو کر مولوی عبدالحق صاحب افضل العلما سے ملنے کے لیے محمڈن کالج آئے۔ کالج [illegible] مولوی صاحب موصوف الصدر کرسی صدارت پر تشریف فرما تھے۔ پردے کے عنوان پر تقریریں ہو رہی [illegible]ہیں۔ بعض پردہ دری پر تلے ہوئے تھے۔ بعض پردے کے پردہ دار تھے۔ [illegible] بمبئی صاحب کی تقریر [illegible]ہی تھی۔ مدراس جیسے شہر میں اتنی اردو بھی غنیمت ہے اور یہ بھی دونوں صاحب موصوف کی حسن سعی کا نتیجہ ہے۔ [illegible]قریروں کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے ایک مختصری تقریر میں طلباء مدرسہ سے بہت بڑھ چڑھے الفاظ [illegible] ہمارا تعارف کروایا اور ہم سے بھی کچھ کہنے اور پڑھنے کی استدعا کی

ہم حیدرآبادی، لکھنوی انداز کے بغیر کہنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ وجود اور ذات کی تعریف اور اس [مس]ئلے کی توضیح کے بعد ہم نے یہ رباعی پڑھی ؎

دل میں اب غیر کا خیال آیا ہے ✽ وحدت کے کمال میں زوال آیا ہے
دو ذات اور اک وجود کا قایل ہوں ✽ آئینۂ توحید میں بال آیا ہے

ہم نے دوران تقریر میں کہہ دیا کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے دریافت کر سکتے ہیں مگر کسی نے کچھ پوچھا نہیں [اس] لیے ہم سمجھتے ہیں کہ سب سمجھ گئے ہوں گے، وقت کی تنگی کی وجہ سے ہم نے دو ایک ٹکڑوں پر اپنی نظم و [نث]ر ختم کر دی مگر طلبا کی بڑھتی ہوئی خواہش کو محسوس کرتے، پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب نے پھر [دو]سرے دن آنے والے طلبہ کی بڑھتی ہوئی پیاس کو بجھانے کے لیے اصرار کیا۔ طلبہ کی محبت میں ہم نے بھی [ہا]ں کہہ دیا۔ دوسرے دن مولوی عبدالجبار صاحب کے پاس دعوت تھی۔ دعوت کے بعد رسالہ "سفینہ" کے پانچ پرچے [بھ]ی ہم کو دئے گئے۔ یہ رسالہ سفینہ محمڈن کالج کے اردو سوسائٹی سے ہر تین مہینے کے بعد جاری ہوتا ہے۔ جس کا [ن]ام شاید مقامی سمندر کے اعتبار سے سفینہ رکھا گیا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ظاہری لکھائی چھپائی، کاغذی اعتبار [س]ے بہت غنیمت ہے۔ ہر رسالے میں مشاہیر کی دو ایک تصویریں بھی ہوا کرتی ہیں۔ وہ اسی اردو دانوں [illegible] مضامین اور زبان کے اعتبار سے قابل تعریف ہے۔

دوسرے دن چار بجے ہم پھر کالج پہونچے، آج، کل کی نسبت مجمع تھا، طلبہ کے سوا تمام مدرسین بھی موجود تھے۔ اگرچہ آج طلبہ کے اسپورٹس کا دن تھا مگر سب اسپورٹس چھوڑ کر لکچر ہال میں جمع تھے۔ ہم نے کثیر التعداد طلبہ کے لیے مدرسی طور پر تقریر کی تشریح کے ساتھ چند رباعیاں سنائیں، منجملہ ان کے دو رباعیاں یہ ہیں ؎

من لہ المولیٰ فلہ الکل

ساری دنیا سے ہاتھ دھو کر دیکھو ؛ جو کچھ بھی رہا سہا ہے کھو کر دیکھو
سب کچھ نہ سہی اگر تو تیرا ذمہ ؛ اک مرتبہ، تم، ایک کے ہو کر دیکھو

کان عرشہ علی الماء

اے عمر دوروزہ، جاودانی ہو جا ؛ باقی کی اگر ہوس ہے، فانی ہو جا
سنتے ہیں کہ ہے عرش خدا پانی پر ؛ اے دل کچھ اگر شرم ہے پانی ہو جا

آخر میں ہم نے اپنی مشہور نظم "میگذرد"، اور گذارد سے (مطبوعہ ریاض امجد حصہ دوم) اور ایک دعائے خاتمہ (مطبوعہ خرقہ امجد) پر جلسے کو ختم کیا۔

تمام مدرسین اور طلبا بے حد محظوظ ہوئے۔ پروفیسر افضل العلما مولوی عبدالحق صاحب نے ہمارا شکریہ ادا کیا جس کا ہم بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مولوی جمال محمد صاحب :- یہاں کی مخیر ہستیوں میں مولوی جمال محمد صاحب بہت مشہور ہیں۔ مدرسہ جمالیہ واقع مدراس (جس کا ماہانہ خرچ تین ہزار ہے) ان کی فیاضی اور علم دوستی کا شستہ نمونہ از خروارے ہے۔ اسلامی کاموں میں مدراس کے عام مسلمانوں کی نظر انہیں پر لگی رہتی ہے۔ کیوں نہ ہو کہ جمال محمدؐ ہے۔

مولوی سی عبدالحکیم صاحب :- ایک اور بزرگ ہستی عبدالحکیم تاجر چرم کا بھی نام سنا ہے جن کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے صاحبزادے کی شادی کے لیئے دو لاکھ روپے کا موازنہ قرار دیا ہے۔ جس میں ۲ نے دو لاکھ روپے قومی اور تعلیمی کاموں میں اور بقیہ پچیس ہزار شادی میں صرف کریں گے۔ کثیر اللہ امثالہم۔ فاعتبروا یا اولی الاموال

جناب موصوف الصدر اس رقم سے چند روپیہ مدرسہ فخریہ عثمانیہ واقع مکہ مکرمہ (جس میں قرآن اور حفظ کی تعلیم ہوتی ہے) کو بھی روانہ فرمادیں تو بے حد مناسب اور شرف رقم کا صحیح مصرف ہوگا۔ اللھم وفقہ للخیر

شب جمعہ مدراس سے بعزم حیدرآباد ریل پر سوار ہوئے۔ راستے میں مسافروں کی کھچا کھچ اور بارش کا پانی ریل میں اترنے سے، لیٹنے اور سونے کا موقع نہ ملا، البتہ صبح تک جگہ کسی قدر خالی ہو گئی اور ہم ایک بنچ پر لیٹتے لیٹتے لیٹ گئے۔ لیٹے ہی تھے کہ ایک مسافر ہمارے سر پر آکر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ ہم مجبوراً اٹھ بیٹھے، نووارد بنچ پر بیٹھ گیا، اور بیٹھ کر ہمارا سر لے کر اپنے زانو پر رکھ لیا، اس کو بیٹھنے کے لیے جگہ مل گئی ہم کو سرہانے کے لیئے تکیہ مل گیا۔ صدق اللہ مولٰنا العظیم ان احسنتم احسنتم لانفسکم

یہ آنے والا مسافر کون تھا۔ ایک معمولی غیر مہذب انسان۔ کون انسان؟ ایک غیر مسلم۔ فاعتبروا یا اولی الاسلام

دانائی کے وہم میں نہ نادان بنو ؛ انسان اگر ہیں تو انسان بنو
اسلام کی تبلیغ پہ کافر نے کہا ؛ حضرت! تم آپ تو مسلمان بنو

بشیر النساء بیگم بشیر

یادِ امجد

آہ اے امجدؔ! تجھے دنیا بھلا سکتی نہیں ⁂ بات جو تھی تجھ میں وہ اوروں میں آسکتی نہیں!

اک قلندر آہ! اقلیمِ دکن سے اُٹھ گیا ⁂ تاجدارِ علم و فن، بزمِ سخن سے اٹھ گیا

تو نے صبر و شکر سے کیسے مراحل طے کئے ⁂ دل کی کشتی غرق تھی، سانسوں سے ساحل طے کئے

رودِ موسیٰ کا وہ طوفاں! اور تنہا تیری جاں ⁂ پانی ہی پانی نظر آتا تھا زیرِ آسماں!

یادِ دیرینہ بہر منزل شریکِ غم بنی ⁂ اور تری حساس فطرت، گردشِ پیہم بنی

حق پرستی میں لباسِ فقر زیبِ تن کیا ⁂ من کی دنیا جاگ اٹھی، ایسا دیا روشن کیا!

ہر رباعی سے تری پیدا انوکھی شان ہے ⁂ یا حدیثِ مصطفےٰ، یا آیۂ قرآن ہے!

تو فقط شاعر نہ تھا، اے سالکِ ذی احترام ⁂ زندۂ جاوید و عالم گیر ہے تیرا کلام

تیرے سوزِ قلب سے، شمعِ سخن روشن ہوئی ⁂ تیری آہِ سرد فصلِ گل بنی، گلشن ہوئی

نام ہے روشن ترا، اے شاعرِ روشن ضمیر ⁂ رہتی دنیا تک تری ہر بات ہے پتھر کی لکیر!

تیری عرفانی نوا میں زندگی کا راز ہے!
شاعری کو تجھ پہ تھا، اب زندگی کو ناز ہے!

عزیز تمنائی

..... دیدۂ بینا چپ ہے

ترجمانِ نظرِ عارفِ سینا چپ ہے
شجرِ طور کے دامن میں ہزاروں جلوے
منتظر ہیں کہ کوئی جرأتِ نظارہ کرے
پردۂ خاک میں اک دیدۂ بینا چپ ہے

★

اک حریفِ لبِ جاں بخش مسیحا چپ ہے
روح اظہار سے محروم ہیں احساس و شعور
ناشناسِ تپشِ زیست ہیں وجدان کے طیور
کاشفِ رازِ درونِ دمِ عیسیٰ چپ ہے

★

محرمِ آبروئے چشمِ زلیخا چپ ہے
ابھی محفل میں ضیا بار ہے یوسف کا جمال
ابھی باقی ہے نگاہوں میں تمنائے وصال
حاملِ جرأتِ اظہارِ تمنا چپ ہے

★

خاکِ ہم پایۂ پروینِ و ثریا چپ ہے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہر سمت اجالے جسکو
اپنے سینے سے ہر ایک راہ لگالے جس کو
جادۂ نور کا رہ گردِ خود آرا چپ ہے

★

مطربِ رمز شناسِ نے و نغمہ چپ ہے
گونجتا ہے ابھی آفاق میں لحنِ داؤد
بطنِ ایام میں پنہاں ہیں قرونِ موعود
دورِ آئندہ کی آہٹ کا شناسا چپ ہے

★

زخم ہائے جگر و دل کا مداوا چپ ہے
ابھی غم خانۂ ہستی میں ہیں چیخیں آہیں
ڈھونڈھتی ہیں کسی دشوار طلب کو راہیں
وادیٔ خوف کی وہ راہیِ تنہا چپ ہے

★

پیرِ خم خانۂ صہبائے تمنا چپ ہے
ابھی ناواقفِ آدابِ خرابات ہیں رند
ابھی نا اہلِ حکایات و روایات ہیں رند
مردِ آگاہِ رموزِ مے و مینا چپ ہے

★

راز سربستہ ہیں اور امجدِ دانا چپ ہے
دمِ تجدید آج تمنائی ہے بزمِ امکان
سازِ خاموش ہے مضراب ہے حیراں حیراں
ہاتفِ غیب کے نغموں کا گویا چپ ہے

★

رشید احمد رشید

غمِ امجد

ہر قلب بیقرار ہے ہر چشم اشک بار ؛ صبر و شکیب و ضبط کا دامن ہے تار تار
رحلت پہ تیری ایک زمانہ ہے سوگوار ؛ افسوس اے جہاں تخیل کے شہ سوار
اردو کے دل پہ تیری جدائی کا داغ ہے
تیرے بغیر بزم ادب بے چراغ ہے

خاموش ساز جذبۂ بیباک ہوگیا ؛ طاری فضا پہ منظر غم ناک ہوگیا
تیغ الم سے قلب دکن چاک ہوگیا ؛ آج ایک سربلند تہ خاک ہوگیا
اڑتی بساط گلشن ہستی پہ دھول ہے
"امجد" کے غم میں ساری خدائی ملول ہے

محروم شمع یوں تو کوئی انجمن نہیں ؛ بلبل جہاں نہ ہو کوئی ایسا چمن نہیں
افراد باکمال سے خالی دکن نہیں ؛ ہیں سینکڑوں مگر کوئی استاد فن نہیں
چمکا دیا ادب میں رباعی کی شان کو
یا چار چاند لگ گئے حسن بیان کو

تیری رباعیات میں حق کا پیام تھا ؛ تو خوش مزاج و خوش دل و شیریں کلام تھا
کیا دوستوں کا ذکر کہ دشمن بھی رام تھا ؛ بخشے خدا کہ شاعر عالی مقام تھا
ہاں تک قضا حیات کی تجدید کر گئی
ہاں موت تجھ کو زندۂ جاوید کر گئی

تعارف

دانش فرازی

اک رات کہ دنیا تھی فسردہ و حزیں
آلودۂ وحشت تھی جبیں پروین
روپوش پسِ کنگرۂ عرش کوئی
سنتا رہا سرگوشیٔ جبریلِ امیں

جبریل یہ کہتا تھا خداوندِ جہاں
ہے محرمِ ہستی، تیری چشمِ نگراں
کیا مجھ کو خبر جوہرِ تخلیق ہے کیا
نازک ہے مگر کارگہِ شیشہ گراں

مانا سرِ انساں ہے بہر طور بلند
پھینک بھی سکتا ہے ستاروں پہ کمند
چھو لے گا گریبانِ مہ و پروین کو
زندانِ تخیل میں رہے گا تا چند

اک بات مرے دل میں کھٹکتی ہے ابھی
یہ عرصہ گہِ زیست ہے کتنی اچھی
لیکن نفسِ سازِ سخنور کیا ہے
کھلتی ہی نہیں جس سے گرہ فطرت کی

سرمایہ ہے اس کا وہی ساغر وہی مے
ذکرِ لب و رخسار، وہی نالۂ نے
ہر چیز کا معرفت تو سمجھ میں آیا
لیکن یہ بتا ہستیٔ شاعر کیا ہے

یہ بات ابھی ختم نہ ہونے پائی
جنبش سی پسِ کنگرۂ عرش ہوئی
آہستہ سے ابھرا وہیں اک پیکرِ نور
آنکھوں میں لیے صبحِ ازل کی مستی

آئی یہ صدا، نغمۂ سرمد ہوں میں
تعبیرِ روایات مجدد ہوں میں
واقف ہے سرا پردۂ ہستی مجھ سے
اک شاعرِ خوش ذوق ہوں امجد ہوں میں

رکتی ہے جہاں ابلقِ ایام کی رو
تھی اس سے پرے میرے خیالات کی ضو
باوصفِ سوادِ غم و اندوہِ حیات
اونچی ہے ابھی تک مری قندیل کی لو

میں صید زبونِ غمِ ایام رہا
آشفتہ سر و گشتۂ آلام رہا
پھیلائے نہیں میں نے کبھی دستِ سوال
گو کشمکشِ زیست سے ناکام رہا

زندانیٔ حالات تھی تقدیر مری
تھی برق صفت حسرتِ تعمیر مری
ہر رنگ خیاباں چمن دیکھا ہے
ہر برگِ گلِ تر پہ ہے تحریر مری

سرِ سنگِ دریا پہ یہ چھوڑا میں نے
افسونِ غمِ دہر کو توڑا میں نے
سورج کی تجلی سے زمانہ جاگا
نغموں سے مگر دل کو جھنجھوڑا میں نے

محجوب رہا عالمِ آفاق میں تو
پہنچا ہی نہیں ترے قریں فن کا سبو
اعجازِ سخنور تھے معلوم ہی کیا
پتھر کو نچوڑے سے تو ٹپک جائے لہو

یہ برگِ گلِ تر کو کرے روکشِ سنگ
ہے ربطِ فطرت ہی آدی کا آہنگ
ہر بات میں پوشیدہ اشاراتِ لطیف
ہر رنگ میں رکھتا ہے جمال ...

امجد کو کبھی عضوِ معطل نہ سمجھ
یہ صوت ابد ہے اسے اک پل نہ سمجھ

غلام علی حاوی

پیمبرِ رباعی

تھے یوں تو سب اصنافِ سخن تابعِ قال
لیکن تھا رباعی میں خداداد کمال
پایا ہے اسی صنف کو موزوں میں نے
آیا ہے جو امجد کی ستائش کا خیال

شیریں ہے زباں اور بیاں ہے رنگیں
ہر لفظ ہے یوں جیسے انگوٹھی میں نگیں
امجد کی رباعی ہے، رباعی حاوی
اٹھتا ہے چو طرف سے شورِ تحسیں

سرمد کا ہم نوا سخن ور کہئے
یا صوفیٔ باصفا قلندر کہئے
اعجازِ سخن کا ہے تقاضہ حاوی
امجد کو رباعی کا پیمبر کہئے

اسرار و معارف کا خزینہ ہے کلام
پاکیزہ مضامین ہیں گویا الہام
امجد کی ضرورت تھی دکن کو لیکن
دنیا سے چل بسا سخن کا خیام

اظہارِ حقیقت ہے بہ عنوانِ مجاز
تا عرش ہے امجد کے سخن کی پرواز
الفاظ ہیں کوزہ تو معانی دریا
ایجاز کی صنعت میں ہے شانِ اعجاز

تحریر میں واردات آجاتی ہے
سنیئے تو سمجھ میں بات آجاتی ہے
امجد کی رباعی کی یہی ہے تعریف
دو بیت میں کائنات آجاتی ہے

یہ جدتِ سخن اور یہ تاثیرِ مقال
امجد کی نہیں ملتی زمانے میں مثال
وہ تیغِ بہا دیے جواہر پارے
اردو کی رباعی ہوگئی مالا مال

قاصر ہے ترے وصف میں حاوی کی زباں
ہے تیرا کلام ترجمانِ قرآں
دنیا کو دیا ہے درسِ حکمت تو نے
اے سعدیٔ وقت و بوسعیدِ دوراں

غریب سانکی

مقامِ امجدؔ

ترا ہر ایک شعر زندگی کا اک پیام ہے ∴ تری نظر کے میکدے میں معرفت کا جام ہے
ترا کلام عظمتِ قلندری کا آئینہ ∴ ترے مزاج کا جہانِ برتری کا آئینہ
نہاں تری صدائے شوق میں ازل کا ساز ہے ∴ حیات تیری آج تک جہاں میں ایک راز ہے
ترا ہر ایک لفظ شمعِ محفلِ رسولؐ ہے ∴ تری ہر ایک بات گلشنِ نبیؐ کا پھول ہے
عیاں ترے بیاں سے نکتہ ہائے خیر و شر ہوئے ∴ جو تیری راہ پہ چلے وہ آدمی بشر ہوئے
دکن کی سرزمیں کو ناز ہے ترے کلام پر ∴ سحرؔ فریفتہ ہے تیری زندگی کی شام پر
زمیں ترا مقام تھا نہ سدرہ راہِ آسماں ∴ رہی ہے تا حیات تجھ کو جستجوئے آسماں
سحرؔ کو تیری فکر سے نئی تجلیاں ملیں ∴ دلِ حزیں کو تیرے نام سے تسلیاں ملیں
نظر نظر، نفس نفس، حیات ہی حیات تھی ∴ ترے جہانِ زیست میں نہ شام تھی نہ رات تھی
بشر پہ تجھ سے آشکار ہو گئیں حقیقتیں ∴ جو تو اٹھا تو [illegible] افق پہ رحمتوں نے کروٹیں
ملا جو درسِ آگہی وہ دن بھی مجھ کو یاد ہیں ∴ قریب تھا جو میں کبھی وہ دن بھی مجھ کو یاد ہیں

مرے وطن کے ساتھیوں نے گو مجھے بھلا دیا
مگر کشش تھی یہ تری کہ میں نے کچھ سنا دیا

("یومِ امجد" منعقدہ کراچی میں پڑھی گئی)

اختر سہوانی

تصوف کی زباں تھا امجد

۱

اعجاز رقم جادو بیاں تھا امجد
ہر گام پہ منزل کا نشاں تھا امجد
شیراز کا سنگیت، دکن کا نغمہ
توحید و تصوف کی زباں تھا امجد

۲

ایثار و محبت کا امیں کہتے تھے
کہتے تھے بصد صدق و یقیں کہتے تھے
رتبہ تھا ترا عرش نشینوں سے سوا
کہنے کو تجھے خاک نشیں کہتے تھے

۳

مٹی بھی تری رنگِ عمل پر بھاری
تصویر تری حسنِ ازل پر بھاری
حاوی تھا تری عظمتِ فن کا سکہ
ایک ایک رباعی تھی غزل پہ بھاری

۴

ذروں پہ رقم تیرا فسانہ پایا
قائل تری عظمت کا زمانہ پایا
ہر صنف میں تھی تجھ کو مہارت لیکن
ترکیبِ رباعی میں یگانہ پایا

۵

تو فرد تھا یکتا تھا سخندانوں میں
تو کام کا انسان تھا انسانوں میں
تھا دیر نشینوں میں جو تیرا چرچا
مقبول تھا کعبہ کے ثناخوانوں میں

۶

یکساں تھا زمانے کے لیے جام ترا
واسب پہ تھا میخانۂ الہام ترا
پنجاب میں ہم بھی ہیں ترے مدح سرا
لیتی ہے اگر ارضِ دکن نام ترا

نظر حیدرآبادی

نذر عقیدت

توقیر عطا کرتی ہے شہرت کے نگیں ؛ اس فن سے بھی بیگانہ ہے امجد کی زمیں
کہنے کو ہیں غالب کے طرفدار بہت ؛ بس اتنی کمی ہے کہ سخن فہم نہیں!

تسلیم کا شہکار سلام امجد ؛ تکمیل کا اظہار پیام امجد
اے لطفِ زباں، زورِ بیاں کے قائل ؛ اعجازِ تکلم ہے کلامِ امجد!

سررشتۂ صد دولت و میری مل جائے ؛ خوش فکری و آئینہ ضمیری مل جائے
دنیا کو نہ پیری ہے نہ شاہی درکار ؛ یارب! اسے امجد کی فقیری مل جائے!

وقار خلیل

نذر امجد

آیات گہربار کلامِ امجد ؛ گنجینۂ اسرار کلامِ امجد
روشن نظر آتا ہے جہانِ اُردو ؛ ہے مہر ضیا بار کلامِ امجد

تارِ نفسِ مردِ قلندر ٹوٹا ؛ امجد سا جگر گوشۂ عرفاں چھوٹا
گلزارِ تصوف ہوا ویران وقار ؛ ماتم ہیں گلستاں کا ہے بوٹا بوٹا

یہ نیند ہے اللہ کہ ہشیاری ہے ؛ خواب ابدی ہے کہ یہ بیداری ہے
اندازۂ زندگی امجد کیا ہو ؛ مرنے پہ بھی چہرہ پہ سکوں طاری ہے

قطعہ

واقفِ رمزِ تصوف متقی و پارسا ؛ سرمدِ ثانی، حکیمِ شعر، نطقِ کبریا
امجد صاحب نظر ساحرِ نگوشیکو سیر ؛ کھو چکی ہے آج اردو ایک موتی بے بہا

سید محی علی اصغر

مردِ بزرگ

مقصودِ سخن ادب کا مقصد نہ رہا
افسوس کہ اب دکن کا سرمد نہ رہا
اک مردِ بزرگ اٹھ گیا دنیا سے
کہتی ہیں بزرگیاں کہ امجد نہ رہا

جتنے تھے تقاضے حق کی دھن میں غمگین
جو منزلِ آرزو تھی پہونچے یہ وہیں
آیا نہ کبھی زبان پہ کوئی سوال!
مانگیں بھی تو موت کی دعائیں مانگیں

قطعہ

ابتر ہے نظم، روحِ سخن بے قرار ہے
اہلِ قلم حزیں ہیں قلم اشک بار ہے
خالی زمانہ ہو گیا "خیام" ہند سے
امجد کے غم میں سارا وطن سوگوار ہے

بانو طاہرہ سعید

"نذرِ امجد"

نوحہ گر اشک فشاں مضطر و نالاں اردو
غمِ امجد میں ہے با حالِ پریشاں اردو
داغِ دل اور ملا داغِ جگر سے بھی سوا
کیوں نہ ہو خاک بسر چاک گریباں اردو

ایک ہمدرد و مہرباں نہ رہا
مشفق و دوست درمیاں نہ رہا
کسقدر ہے اداس بزمِ دکن
جب سے امجد سا نکتہ داں نہ رہا

رہیگی سونی سونی محفلِ شعر و سخن برسوں
نہ پائیں گے سکونِ دل ابھی اہلِ دکن برسوں
کمی محسوس ہوگی اور بھی کچھ دن گذرنے پر
رہیگا سوگ میں امجد کے امجد کا وطن برسوں

صلاح الدین نیّر

سرمدِ وقت نازِ دکن

پھول کے ساتھ تھی آبروئے چمن
صاحبِ بزم کے دم سے تھی انجمن
جانِ محفل سے تھی بزمِ شعر و سخن
دفعتاً وقت کی نبض کیوں رک گئی
کیا درِ موت پر زندگی جھک گئی

۲

آج الٹی ہوئی ہے بساطِ سخن
آج تیرہ ہوئی علم کی انجمن
آج ماتم میں ہے سرزمینِ دکن
آج امجدؔ سا استادِ فن چل بسا
سرمدِ وقت ، نازِ دکن چل بسا

۳

روشنی اس قدر آج مدھم ہے کیوں
ہر طرف ایک سکتے کا عالم ہے کیوں
آنکھ ماحول کی اس قدر نم ہے کیوں
خطِ ظلمت بنی سوگ میں ہر کرن
گہن میں آگیا آفتابِ سخن

مہر النساء مہرؔ

امجد کی یاد میں

یہ روحِ تصوف ہے یہ جانِ رباعی ہے
یہ سرمدِ ثانی ہے توحید کا داعی ہے
جو شعر کہا اس نے وہ شعر ہے لافانی
دنیا نے مگر اس کی کچھ قدر نہیں جانی

اب موت پہ امجدؔ کی کرتے ہیں سبھی ماتم

یہ شکر کا پیکر ہے یہ صبر کا سانچا ہے
دنیا میں ہم نے ہر طرح سے جانچا ہے
طغیانی میں راحت کا ہر نقش بہا بیٹھے
دولت ہی نہیں بیوی اور ماں بھی گنوا بیٹھا

پھر بھی نہ کیا شکوہ آلام سہے پیہم

امجد جہاں پہونچے ہیں جو ان کا ٹھکانا ہے
سب کو وہیں رہنا ہے سب کو وہیں جانا ہے
اے مہرؔ نہ کھو جانا دنیا کی محبت میں
امجد کے قدم تم کو لے جائیں گے جنت میں

ایمان ہو جس دل میں دوزخ کا اسے کیا غم

ضیاء احمد ضیائی

نذرِ روحِ امجد

گلشن رباعی کا سخنور تو تھا
خورشید فلک ماہ منور تو تھا
اوصاف ترے پیش کروں میں کیا کیا
درویش تھا، سالک تھا، قلندر تو تھا

پیغامِ محبت ہے پیامِ امجد
ملا "مئے عرفاں" سے ہے جامِ امجد
سمجھانے کس انداز سے اسرارِ حیات
الہام ہے، واللہ، کلامِ امجد

تو نے بزمِ اردو کے سنوارے گیسو
زندہ کی ہے رباعی کے ہیں چرچے ہر سو
تو مر کے بھی اے حضرتِ امجد تجھ پر
نازاں رہے گی زندہ زبانِ اردو

رئیس اختر

آہِ امجد!

سوگ میں ڈوبا ہوا سا ہے رباعی کا جمال
سوچ میں کھوئی ہوئی ہے محفلِ فکر و خیال

ہر خموشی بن گئی خود آپ ہی اپنی زباں
آج تیری یاد میں مغموم ہے سارا جہاں

دست بر سینہ جنوں ہے صاحبِ عرفاں گیا
ذرہ ذرہ کی صدا ہے ذاکرِ ایماں گیا

مردِ حق آگاہ و مردِ باصفا جاتا رہا
اک اُجالا کھو گیا، اک پارسا جاتا رہا

پُرسشِ غم سے کسی کا غم کبھی مٹتا نہیں
زخمِ لالہ نور سے خورشید کے بھرتا نہیں

جانے والے موت کی وادی سے لوٹ آتے نہیں
جس طرح تارے فلک کو ٹوٹ کر جاتے نہیں

احمد اللہ احمد قدیری

موت العالم موت العالم

آہ احمد حسین خوش گفتار
شاعر قوم حضرت امجد
عالم و فاضل و صوفی درویش
صوفی پاکباز اور ارشد
زندگی کی ہر ایک منزل کو
طے کیا ہے بخندہ رو امجد
تھے معلم بھی، منتظم بھی رہے
جمع اوصاف اِن میں تھے بے حد
شاعری میں تھے آپ اپنی نظیر
تھے "رباعی" کے وہ خدائے احد
ان کا ہر شعر وارداتِ قلب
جس سے پڑتی ہے راست دل پہ زد
ٹھمریاں بھی بطرزِ نو لکھیں
اور غزل کے بھی بدلے خال و خد
یوں تو دنیا سرائے فانی ہے
موت سے ہے کسے مفر احمد
موت عالم کی موتِ عالم ہے
ہے یہ ارشاد باعثِ ارشد
سال رحلت بہ احمد محزوں
لکھو۔ "داخل بخلد ہوں امجد"
۱۴ ھ ۰

رائے مہر العلی مودودیا

نذرِ عقیدت

تیرا پیغام ہے رازِ بقائے زندگی
تیرے نغموں سے ملی ہے روح کو تابندگی
محفلِ ہستی میں امجد تو جو فانی ہو گیا
ہاں! مگر پیغام تیرا جاودانی ہو گیا
جسمِ خاکی کا فنا ہونا یہاں کی سنت ہے
تو نہیں ہم میں مگر تیرا امر ثابت ہے
اہلِ دل، اہلِ تصوف، اہلِ عرفاں سادات
قابلِ صد رشک کیا، صد مرحبا ہے تیری بات
تیرے اک اک قول میں مضمر ہے نغمہ حیات
تیرا اک اک فعل گویا نقشِ تصویرِ حیات
زندگی کے سوز سے لبریز تیری ذات تھی
درحقیقت تو شہنشاہِ رباعیات تھا
تو نے کھایا نہ ہستی سے فریبِ رنگ و بو
عہدِ پیری میں بھی چھوڑا نہ [illegible]
فقر کا دامن نہ چھوٹا عمر بھر تجھ سے کبھی
کر دیا تو نے ادا اس طرح حقِ بندگی
آنکھ میں ہیں اشک، لب پہ ہے فغاں، دل ہے اداس
تیرے اُٹھ جانے کے غم میں ساری محفل ہے اداس
تو فقیرِ بے نوا تھا ہمسرِ سرمد بھی تھا
امجد مرحوم شاعر ہی نہیں امجد بھی تھا

مادّہ ہائے وفات

محمد عبدالکریم ماہرؔ

زبانِ مرثیہ خواں ہے تو سوگوار اب ✽ رباعی آج سے بےکس ہے بے ٹھکانہ ہے
ملا ہے داغ وہ احمد حسین امجدؔ کا ✽ کہ قلبِ اہلِ نظر حزن کا نشانہ ہے
وصال سنہ ہجری کہا یہ ماہرؔ نے ✽ دیارِ خلد میں امجدؔ کا آشیانہ ہے

۱۳۸۰ھ

ہیں اہلِ نظر ملول و محزوں ✽ امجدؔ کی یہ قدر و منزلت ہے
اس شاعرِ بےدل کا ہر لفظ ✽ گنجینۂ رازِ معرفت ہے
ماہرؔ سنہ عیسوی میں تاریخ ✽ امجدؔ کو نصیبِ مغفرت ہے

۱۹۶۱ء

انتقالِ جنابِ امجدؔ پر ✽ اہلِ دل کو قلق ہوا بےحد
آہ بھر کر کہا یہ ماہرؔ نے ✽ چل بسا ہائے ثانیِ سرمدؔ
سنہ فصلی وفات کا نکلا ✽ دامنِ فضلِ رب میں ہے امجدؔ

۱۳۷۰ف

عبدالسلام ذکیؔ

امجدِ حق شناس خندہ جبیں ✽ علم رخشاں او چو ماہِ مبیں
سال، منقوط گفت ہاتفِ غیب ✽ "شدہ احمد حسین خلد نشین"

۱۳۸۰ھ

دامودر ذکیؔ ٹھاکور

مئے بہہ گئی، خالی ہے رباعی کا خم ✽ ہیں ہوش رباعی کی زمین کے اب گم
ہجری میں یہ تاریخ کہی میں نے ذکیؔ ✽ امجدؔ ہوئے راہیٔ فردوس ہشتم

۱۳۸۰ ہجری

محمد یعقوب علی مبارک رقم

واصلِ حق ہیں ہو کے ہم سے دور ؛ کیوں نہ جنت میں پائیں حور و قصور
کہہ مبارک رقم یہ رحلت کا ؛ سال ہے "آہ امجد مغفور"

۱۳۸۰ھ

سعادت اللہ اطہر

یادگارِ خیام و سرمد تھے ؛ آشکارا ہے عظمت امجد
نکلی تاریخ عیسوی اطہر ؛ نیک کردار حضرت امجد

۱۹۶۱ء

محمد جہانگیر حافظ

حسرتا امجد اجل کے کارواں سے جا ملے ؛ ہم کو چھوڑا خالق کون و مکاں سے جا ملے
مل گیا اک مصرعۂ تاریخ رحلت لاجواب ؛ کہہ دو حافظ، امجد اب اہلِ جناں سے جا ملے

۱۳۷۰ف

امجدِ حق آگاہ

تاج قریشی

دنیائے سخن آج نہ کیوں ہو مغموم ؛ اک شاعر یکتا سے ہوئی ہے محروم
وہ کون؟ بزرگ، صوفی، عالم ؛ سید احمد حسین امجد، مرحوم

اُردو کے دل و جاں سے بہی خواہ تھے وہ ؛ تھے سچے پرستار، حق آگاہ تھے وہ
اس دور کے تھے صاحبِ طرز اک ادیب ؛ دنیائے رباعی کے شہنشاہ تھے وہ

شاہِ رباعی امجد

ابوسعد محمد اسماعیل سید

بندے کے لیے جیسے خدائی مشکل ؛ اصنافِ سخن میں ہے رباعی مشکل
امجد کا ہی حصہ ہے رباعی، سید ؛ دو بیت میں ہے مدح سرائی مشکل

طغیانیٔ موسیٰ میں بہا کر نکلا ٭ آلام کا طوفان اٹھا کر نکلا
وہ کون؟ وہی شاہِ رباعی امجدؔ ٭ توحید کی اک راہ دکھا کر نکلا

ناصرؔ کرنولی

اقلیم رباعی کا وہ سلطاں نہ رہا ٭ گلزار و تصوف کا نگہباں نہ رہا
یوں کہنے کو شاعر تو بہت ہیں ناصرؔ ٭ امجدؔ سا مگر شاعرِ عرفاں نہ رہا

حکیم انجمؔ حیدرآبادی

غمِ امجدؔ میں آنکھ پُرنم ہے ٭ درد ہے دل میں اور پیہم ہے
بجھ گئی شمعِ سرمدؔ و خیامؔ ٭ بزمِ شعراء میں آج ماتم ہے

بشیر الدین احمد بشیرؔ

حیف صد حیف حضرتِ امجدؔ ٭ خندہ رو رفت سوئے دارِ جناں
در جوابِ رباعیاتِ بشیرؔ ٭ نالہ و زاری ہست شور و فغاں

دانائے رموز

وحید مرزا

باتوں باتوں میں رموزِ زندگی سمجھا گیا ٭ آدمیت کو مقامِ بندگی سمجھا گیا
ایسی درویشی کہ جس پہ بادشاہی بھی نثار ٭ کج کلاہی ایسی جس پہ تاجِ شاہی بھی نثار
اب تصوف رو رہا ہے شاعری ماتم میں ہے ٭ دل کو یہ احساس ہوتا ہے کہ لذت غم میں ہے
مردِ مومن اک دکن کی خاک میں خوابیدہ ہے ٭ ہمنوائے سعدیٔ شیراز آرامیدہ ہے
اے دکن کی سرزمیں تو باعثِ صد ناز ہے ٭ دفن تیرے دل میں دانائے رموز و راز ہے

"آسماں" اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے"
"سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

محمد اکبر الدین صدیقی

منتخب رباعیات امجد

(انتخاب از "رباعیات امجد" مطبوعہ شمسی پریس آگرہ ۱۹۰۶ء)

حضرت امجد کی رباعیات اب اس وقت تین جلدوں میں ہیں۔ پہلی جلد کے چار چار اور پانچ پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ تینوں جلدیں ۱۹۶۲ء کے بعد چھپیں اور کافی طویل وقفے سے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ حضرت امجد کی رباعیات کا سب سے پہلا مجموعہ ظفر ... خاں صاحب کے اہتمام سے شمسی پریس (آگرہ) میں ۱۹۰۶ء میں چھپا۔ اس کے کچھ نسخے تقسیم ہو گئے اور کچھ فروخت ہوئے اور بہت زیادہ رود موسیٰ کی طغیانی میں بہہ گئے۔ اس نسخے سے بیس رباعیوں کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ایک اور نسخہ جلد دوم کی شکل میں ۱۳۲۶ھ کو شائع ہوا۔ یہ بھی اب بالکل نایاب ہے۔ اس سے بھی بیس رباعیاں منتخب کر کے پیش کی جا رہی ہیں۔ بعد کی تین جلدیں عام طور پر ملتی ہیں اس لیے ان سے کوئی رباعی منتخب نہیں کی گئی۔ (و۔ ص)

حمد باری تعالیٰ

ہے کعبہ و بت خانہ میں جلوا تیرا ÷ ہر کافر و دیندار ہے شیدا تیرا
بیمار ترا ہے رشک ابن مریم ÷ سودائی ہے جس کو نہیں سودا تیرا

شکوۂ احبا

ہر وقت رواں ہے چشم تر سے دریا ÷ سنتا نہیں بیکس کی کوئی آہ و بکا
بیگانہ روش بن گئے سارے احباب ÷ ہمسایہ نہیں ہے کوئی سایہ کے سوا

بے قدریٔ زمانہ

ایک شخص کو حالِ زار کچھ لکھ کے دیا ٭ عرضی پہ نگاہ کی نہ کچھ اس نے ذرا
امجد نے جہاں کی کتابیں پڑھ لیں ٭ اس کا لکھا مگر کسی نے نہ پڑھا

قوم کے کرتوت

دنیا کو عجب رنگ بدلتے دیکھا ٭ ہے شام کبھی، کبھی سحر جلوہ نما
اسلام تھا خورشیدِ درخشاں کی طرح ٭ اب قوم کے ہاتھوں ہوگیا ہے تارا

تقدیر پر زور نہیں چلتا

دل میں مرے نقشِ آرزو کیا ہوگا ٭ جز جس کی کٹے اس میں نمو کیا ہوگا
مقراضِ قضا نے جب کیا چاک اسے ٭ پیراہنِ ہستی کا رفو کیا ہوگا

افلاس کا غم نہیں

دل تنگی کا ہرگز میں نہیں ہوں پابند ٭ ہے میرے خیال میں بلا بھی قند
شکوہ نہیں بے زری کا کچھ بھی امجدؔ ٭ خنداں ہوں پھٹے کپڑوں میں گل کی مانند

نمازِ جنازہ کی حسنِ تعلیل

اس عالمِ ہستی سے گذر جاتے ہیں ٭ یہ کہنہ رباط چھوڑ کر جاتے ہیں
ہے ایک بہانہ نمازِ میّت ٭ دم لینے کو حمّال ٹھہر جاتے ہیں

ناپائداریٔ دنیا

دو روز کے واسطے یہاں آتے ہیں ٭ اس پر بھی ہمیشہ رنج و غم کھاتے ہیں
دم بھر کے لیے بساطِ دنیا پر لوگ ٭ مہرے کی طرح بیٹھ کے اٹھ جاتے ہیں

فقیر اپنی کملی ہی میں مست ہیں

ہر وقت خدا پہ جو نظر رکھتے ہیں ٭ کب دل میں خیالِ سیم و زر رکھتے ہیں
شاہوں کو ہو بحر و بر مبارک امجدؔ ٭ عاشق لبِ خشک و چشمِ تر رکھتے ہیں

ہمہ اوست

ہر شے میں تجلیات حق ساری ہیں ✽ جن، انس، ملک سی کے شیدائی ہیں
ہے فرق ذرا سا ورنہ ہر شے ہمہ اوست ✽ گرداب و حباب و موج سب پانی ہیں

وجودِ اعزا کالعدم ہے

بے مہریٔ احباب سے ہے حال تباہ ✽ اشک آنکھوں میں، دل میں درد، لب پر آہ
کہنے کو تو اقربا ہیں زندہ لیکن ✽ سب مر گئے حق میں میرے اِنّا لِلّٰہ

گم شدہ یار کی ملاقات

اللہ غنی! میرا بھی کیا پایا ہے ✽ آج اس صنم گم شدہ کو پایا ہے
ہے جلوۂ برق حسن چشمِ تر میں ✽ برج آبی میں آفتاب آیا ہے

پشیمانی

پیشانی پہ گو نقش گنہ کندہ ہے ✽ لیکن دل و جاں سے تو تائندہ ہے
شرم بے طاعتی سے یارب امجدؔ ✽ محراب گریباں میں سرافگندہ ہے

بڑھاپے میں سیاہ کاری

امجد ہے گنہ گاروں میں اول نمبر ✽ گو، لوگ سمجھتے ہیں بڑا نیک سیر
پیری آئی، سیاہ کاری نہ گئی ✽ اندر تو اندھیرا ہے اجالا باہر

جاہل کی عزت اور اہل کمال کی بے قدری

ہے چرخ ستم گار عجب دوں پرور ✽ ہیں اہل کمال، ناقصوں سے بدتر
ہے رویت ماہِ نو کا مشتاق جہاں ✽ ماہ کامل پہ کون کرتا ہے نظر

پیری

اس عالم فانی کا نظارہ کب تک ✽ دل تیغ ستم سے پارہ پارہ کب تک
اے روح! بڑھاپے میں حذر کر تن سے ✽ گرتی دیوار کا سہارا کب تک

ترقی کی اشتعالک

افسوس صد افسوس! یہ غفلت کب تک ؛ اے قوم تری خراب حالت کب تک
خورشید کے مانند ضیا پیدا کر ؛ یہ شمع کی طرح روتی صورت کب تک

اسلام کی موجودہ حالت

اس دین کے آگے سر جھکاتے تھے تمام ؛ کرتا نہیں اب کوئی مسلماں کو سلام
پستی نے بنا دیا ہے پائے طاؤس ؛ نقشِ پرِ طاؤس تھا پہلے اسلام

پیری میں کوئی نزدیک نہیں آتا

اس عالم ہستی سے سفر کرتے ہیں ؛ ہر چیز پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
پیری میں پھٹکتا نہیں پاس اپنے کوئی ؛ گرتی دیوار سے حذر کرتے ہیں

زمانہ کی حالت

سنتا نہیں بے کس کی کوئی آہ و فغاں ؛ ہر شخص ہے اپنی فکر میں سرگرداں
کالجزو ہیں بغض و حسد و کبر و ریا ؛ شاید ہے انہی چار عناصر سے جہاں

محمد عبد السلام ذکی

حضرت امجد کی یاد

امجد کا کلام ہے افضل و عالی وقار
جاوید ہر اک لفظ کا ہے نقش و نگار
مرجھائے ہوئے چمن ہیں اردو کے ذکی
زندہ ہے ترے دم سے رباعی کی بہار

ہر اک رباعی روح رواں کا پیام ہے
آب حیات تازہ سے بھرپور جام ہے
ہر لفظ میں سموئی ہوئی ہے بہار زیست
منقوش دل کی لوح پہ نقش دوام ہے

امجد کو کیوں نہ صوفی اعظم کہیئے
بے خوف تردد یہی ہر دم کہیئے
اے بحر تصوف کے نمایاں غواص
کیوں تجھ کو نہ جبریل کا ہمدم کہیئے

حمد

ہر غنچۂ گُل، تیری صدا دیتا ہے : صنعت تری، ہر خار دکھا دیتا ہے
پتہ پتہ ترا پتا دیتا ہے : ہر اصل، اصولِ معرفت ہے یا رب

نیچرل تھیٹر

ہیں اس کے عجیب سین، دو شام و سحر : اسٹیج ہے عالم کا عجب خوش منظر
دنیا تھیٹر ہے اور نیچر ایکٹر : ہوتے ہیں نئے نئے تماشے امجدؔ

دنیا

ہر نغمہ خوب، صورتِ گوسالہ ہے : مانندِ سراب، ساغرِ لالہ ہے
یہ دائرۂ شعلۂ جوالہ ہے : دنیا کا وجود ہے، وجودِ ہستی

بابا جی

اس حیلہ و فن سے کچھ تو شرمائے گا : کب تک ہر اک کو آپ بہکائے گا
پھر چاہے جتنا پاؤں پھیلائے جا : دنیا سے تو ہاتھ کھینچ لو، بابا جی

لکھے پڑھے جاہل

سب بھول گئے، جو کچھ پڑھے تھے شُد بُد : صہبائے غرور سے پڑے ہیں بےخود
گوسالۂ ما پیر شد و گاؤ نہ شد : بی اے ہوکر بھی بیل کے بیل رہے

اجداد پر فخر

مغرورِ شکوہ و شان سے خوش ہوتے ہیں : کوتاہ نظر، جہان سے خوش ہوتے ہیں
کہتے ہیں جو استخوان سے خوش ہوتے ہیں : اجداد پہ جن کو فخر ہے اے امجدؔ

انقلاب

چمکے فلک جاہ پہ تارے کی طرح ؎ ہر ایک کے سر پہ چلے آرے کی طرح
آخر کو زمانے نے گرا کر چھوڑا ؎ ہر چند بہت اڑے غبارے کی طرح

زاہد ریاکار

پرواخت نہ کی تو نے کماہی دل کی ؎ دیکھی نہ کبھی حیف، تباہی دل کی
اے زاہد خود بیں یہ نہیں داغ سجود ؎ پیشانی سے ظاہر ہے سیاہی دل کی

پیری

گذری شب عیش، شیب آیا بارے ؎ بیگانہ روش ہو گئے ہمدم سارے
گرنے لگے دانت عہد پیری میں تمام ؎ حیرت ہے کہ دن کو ٹوٹتے ہیں تارے

اچھی صورت

الفت میں غضب دردسری ہوتی ہے ؎ دل جلتا ہے آنکھوں میں تری ہوتی ہے
فولاد سے سخت دل پگھل جاتے ہیں ؎ اچھی صورت بھی، کیا بری ہوتی ہے

ترک محبت

کچھ لطف نہیں شراب غم پینے میں ؎ کیا رکھا ہے اس حسن کے گنجینے میں
کیوں کر نگہ یار کو دوں دل میں جگہ ؎ رکھتے نہیں سونے کی چھری سینے میں

سایہ کا ڈر

اک دن میں انہیں دیکھ رہا تھا چھپ کر ؎ قسمت سے پڑا عکس مرا آئنہ پر
دیکھا مرا یہ تو، تو کہا چور ہے چور ؎ سچ کہتے ہیں لوگ اپنے سایہ سے بھی ڈر

فائدہ خاموشی

ہر چند مصیبتیں زمانے کی سہے ؎ انسانوں کو چاہیے کہ خاموش رہے
ہوتی ہے اسی لیے بتوں کی پوجا ؎ کہتے نہیں کچھ، کوئی انہیں لاکھ کہے

دوست قابلِ اعتبار نہیں

الفت اک روز، روز بدلاتی ہے ٭ گلزارِ محبت میں، خزاں آتی ہے
ہو جاتے ہیں ہم نشیں، دشمن آخر ٭ دانتوں سے کبھی زبان کٹ جاتی ہے

مدحِ شمس الدین فیض رح

کیا تاب! کوئی تجھ کو دکھائے آنکھیں ٭ شمعِ سرِ طور، تو ملائے آنکھیں
اے شمس! جو تری مہربانی ہو جائے ٭ خورشید سے ذرہ بھی لڑائے آنکھیں

غربت میں لطفِ وطن

کہتے تھے نکل کے گھر سے ملتے ہوئے ہات ٭ اب لطفِ وطن کہاں ملے گا ہیہات!
اللہ کا شکر حیدر آباد میں بھی ٭ ہے شامِ اودھ، صبحِ بنارس، دن رات

مال اور جان کا تقابل

بیمار بخیل سے کسی نے یہ کہا ٭ کر جان کے واسطے نہ زر کی پروا
کہنے لگا، واہ، واہ! کچھ عقل بھی ہے! ٭ جاں مفت میں پائی، مال محنت سے ملا

خطِ تقدیر

پیراہنِ تن، جامۂ عریانی ہے ٭ دل کے ٹکڑے، غذا، لہو، پانی ہے
معدومیِ رزق سے ہوں سر بہ جبیں ٭ خطِ تقدیر، چینِ پیشانی ہے

وجودِ اقربا کالعدم ہے

بے مہریِ احباب سے ہے حال تباہ ٭ اشک آنکھوں میں، دل میں درد، لب پہ آہ
کہنے کو تو اقربا ہیں زندہ، لیکن ٭ سب مر گئے حق میں مرے، انا للہ!

عزت کے بعد ذلت

میں ہر کس و ناکس کی نظر میں کانٹا ٭ دستِ ستمِ چرخ نے پامال کیا
دنیا میں ہوئے ذلیل، عزت پا کر ٭ قطرے سے گہر بنے، گہر سے قطرا

(انتخاب از رباعیاتِ امجد۔ ۱۰ صفر ۱۳۲۶ھ)

قصیدہ در مدح اعلیحضرت محبوب علیخاں

(حضرت امجد نے یہ قصیدہ سترہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ یہ گلدستہ ضیغم میں شائع ہوا ہے۔ ضیغم کے متعلق ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے دسمبر ۱۹۵۴ء میں اور ڈاکٹر زور صاحب نے اکتوبر ۱۹۵۸ء کے "آجکل" میں تفصیلی مضامین شائع کیے ہیں لیکن ان دونوں میں گلدستہ ضیغم کا حوالہ موجود نہیں۔ یہ قصیدہ گلدستہ کے صفحہ ۷۶ و ۷۷ سے نقل کیا گیا ہے)

امجد۔ جناب سید احمد حسین صاحب تلمیذ امیر الشعراء حضرت ترکی یادگار خاندان فردوسی

مئے دو آتشہ اے ساقی خجستہ بیار ❊ کہ رفت فصل خزاں و رسید روز بہار
مئے کہ دیدہ نہ باشد کسے بہ خواب خیال ❊ مئے کہ مست شود از سرور او ہشیار
رجوع ہست طبیعت بہ عالم بالا ❊ ز طاق چرخ بریں جام آفتاب بیار
بنہ بزخم دلم پارہ ہائے شیشۂ مئے ❊ کہ ہست سبزیٔ او ہمچو مرہم زنگار
پیالہ پاک کن از آب کوثر و تسنیم ❊ برائے بادہ کشاں بادۂ طہور بیار
کہ آمدہ ست بہ عالم بہار سال گرہ ❊ گریخت باد خزان از چمن سوئے کہسار
ازیں نوید بہاراں ولا تعجب نیست ❊ بشفا شود بہ چمن گر بہ نرگس بیمار
گرفتہ در کف خود چنگ لوئی گردوں ❊ بہ من اشارہ نماید ز آسمان ہر بار

کہ ایں غزل بہ شوق امجد ابر خواں
کہ ہست ہر در نظمت چو گوہر شہوار

غزل

رقم چو وصف کنم از جمال عارض یار ﴿ ز اشک خشک شود گل بہ بوستان چون خار
فشان بہ زخم دلم قطرہ ہائے آتش تر ﴿ کہ دل بہ یاد تو سوزد بسان شاخ چنار
میان نازک او در وجود ہست کہ نیست ﴿ بہ چشم غور بہ بینید یا اولی الابصار
شمیم گیسوئے مشکین یار می آید ﴿ بسان نافہ غزال ست روزن دیوار
سواد نیست بچشم سیاہ تو اے یار ﴿ نہادہ است بہ نافہ غزال مشک تتار
رواں بدار روانی طبع خود امجد ﴿ کز آب بستہ نہ خیزد ہوائے خوش آیار
کنوں بہ مدحت شہ گویم آن چنان مطلع ﴿ کہ ہست افضل و برتر ز مطلع الانوار

مطلع ثالث

خدیو ملک دکن آصف بلند تبار ﴿ ملک بہ صورت و سیرت فلک بہ عز و وقار
کمان خمیدہ شود از برائے تعظیمش ﴿ کند دعا پے اقبال او لب سوفار
مقر بہ جائے ضرر نفع می دہد شاہا ﴿ شدست زہر بہ عہد تو مرہم زنگار
محیط بحر سخا گوہر جہاں بانی ﴿ مہہ سپہر کرم آسمان عز و وقار
ہمیشہ بحر عطا ہست در دکن جاری ﴿ کہ شاد ابر مطیرست و شاہ دریا بار
کجا ثنائے نظام امجدا، کجا طبعت ﴿ ولے نمودہ مشتی نمونہ از خروار
قصیدہ ختم کن و این دعا گو از دل ﴿ کہ تا بہ چرخ بماند ثوابت و سیار
نہال عمر تو شاہا بواد تازہ بہ دہر ﴿ دل حسود تو سوزد بسان شاخ چنار

شود مبارک و مسعود جشن سال گرہ
بفضل احمد مکہ و آلہ الاطہار
۱۳۲۰ ہجری

ادارہ ادبیات اردو

...السلاطین	مرزا نظام الدین احمد۔ مرتبہ و مصحح علی اصغر بلگرامی ۔ ٹائپ کی طباعت صفحات (۳۱۸)	قیمت دس روپے
محمد مومن	پیشوائے سلطنت محمد قلی قطب شاہ اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر کے تفصیلی و تحقیقی حالات زندگی باتصویر۔ مرتبہ ڈاکٹر زور	قیمت ۳ روپے
...ات بخشی بیگم	محمد قلی قطب شاہ کی دختر اور گولکنڈہ کی مشہور ملکہ کے حالات زندگی جسے جناب نصیر الدین ہاشمی نے مرتب کیا ہے۔	قیمت ۷۵ نئے پیسے
...درآباد کے بڑے لوگ	مرتبہ غلام پنجتن شمشاد ربع صدی کے ان مشاہیر حیدرآباد کا تذکرہ جنہوں نے حیدرآباد کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور دکن کے کلچر اور اس کی روایات کو اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا۔	قیمت دو روپے
محمد قلی قطب شاہ	اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کے حالات و خدمات اور اس کے خاندان و سلطنت کے بارے میں وقیع باتصویر انسائیکلوپیڈیا۔ مرتبہ ڈاکٹر زور	قیمت سات روپے
...روجنی نائیڈو	بلبل ہند سروجنی نائیڈو (دیوی) کی باتصویر جیون کہانی، جسے وزیر حسن صاحب نے اپنے اسلوب میں مرتب کیا ہے۔	قیمت ۲ روپے
...گزشت غالب	مرزا غالب کی حیات کارناموں اور اعزہ و احباب کا مجمل تذکرہ مرتبہ ڈاکٹر زور	قیمت ایک روپے
...رساں دتاسی	اردو کے پہلے فرانسیسی مستشرق و پروفیسر گارساں دتاسی کے علمی و ادبی کارناموں کا اجمالی تذکرہ ڈاکٹر زور صاحب نے مرتب فرمایا ہے۔	قیمت ۱ روپیہ پچاس نئے پیسے
...حسین آزاد	آزاد ایک انشاء پرداز اور تذکرہ نگار کے حالات، شاعری اور تصانیف مرتبہ جہاں بانو نقوی	قیمت ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
...رِ ولی	بابائے ریختہ ولی اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر جامعہ عثمانیہ کی خواتین کا مرتبہ دلچسپ اور وقیع مجموعہ	قیمت ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے
...گار صفی	دکن کے مشہور استاد سخن صفی اورنگ آبادی کے حالات و خصوصیات کلام کا دلکش اور خوبصورت گلدستہ مرتبہ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد	قیمت ایک روپیہ
...مغان امجد	حضرت امجد کی زندگی میں ادارہ کی طرف سے منعقدہ جشن الماسی کا مجمل تذکرہ حسین علمی ادبی مقالات اور بلند پایہ کلام تصویروں کے ساتھ خواجہ حمید الدین شاہد نے یکجا کیا ہے	قیمت ۱ روپیہ ۵۰ نئے پیسے
...س کا ٹیگور نمبر	گرو دیو ٹیگور کی صد سالہ برسی کے موقع پر ادارہ کا نذرانۂ عقیدت۔ اہم مضامین نظم و نثر کے علاوہ ببلیوگرافی مرتبہ وقار خلیل	قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: ... کتاب گھر ... ایوان اردو ... آباد

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء   فون نمبر ۳۵۲۰۹

جلد ۲۵   شمارہ ۸   اگست ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

سب رس

نگران: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت:

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
نصیر الدین ہاشمی
رمن راج سکسینہ
محمد منظور احمد
وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

قیمت سالانہ ہند و پاک ۔ چھ روپے   ششماہی تین روپیہ
غیر ممالک ۔ ۱۰ روپے
فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو نے زیر اہتمام اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ایوان اردو خیریت آباد حیدر آباد دکن سے شائع ہوا

ترتیب

★

اپنی بات

”ولانمبر کے بعد عام شمارہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس میں ڈاکٹر حبیب النساء پروفیسر اردو میسور یونیورسٹی، بانو صغیرہ نسیم لکھنؤ یونیورسٹی اور پروفیسر امیر چند بہار کے مقالے شریک ہیں۔ یہ سب مقالے نہایت پُرمغز اور تحقیقی ہیں۔ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیئے اہم ثابت ہوں گے۔

اظہر افسر صاحب نشریاتی ڈراما نگاری میں آہستہ آہستہ اپنے لیئے جگہ بنا رہے ہیں۔ ان کا ایک ڈرامہ ”سنگھار میز“ شریک ہے۔ یہ ڈرامہ ایک سے زیادہ دفعہ نشر ہوا ہے لیکن پہلی دفعہ شائع ہورہا ہے۔

حصہ نظم میں بھی حضرت مجذوب عالپوری، حضرت امتیاز علی عرشی، جناب خورشید احمد جامی کے علاوہ ابھرتے ہوئے فنکار شریک ہیں اور فکر کے ساتھ ساتھ نشاط کا سامان لیئے ہوئے ہیں۔

پروفیسر عبدالرحمٰن خان مرحوم حیدرآباد کی بہت بڑی شخصیت تھے، وہ مغربی دنیا میں سائنس داں اور ماہر فلکیات کی حیثیت سے مشہور تھے۔ سائنس سے متعلقہ مغربی رسائل میں خان صاحب کے مضامین شائع ہوتے اور بڑے بڑے سائنس داں خان صاحب سے خط و کتابت کرتے تھے۔ حیدرآباد میں وہ سائنس داں کے علاوہ اردو کے ادیب بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی۔

انہیں نئے حیدرآباد کا معمار کہا جائے تو بیجا نہیں، عثمانیہ یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالنے سے لیکر اسے بام ثریا تک پہنچانے کا سارا کام خان صاحب نے انجام دیا۔ وہ اس وقت بھی یونیورسٹی کے پرنسپل رہے جب یونیورسٹی کو کوئی تسلیم کرنے تیار نہ تھا اور اس وقت بھی پرنسپل ہی تھے جب اس کو مغربی جامعات نے تک تسلیم کرلیا۔ یہ خان صاحب ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ خان صاحب اس وقت بھی پرنسپل تھے جبکہ یونیورسٹی کی جماعتیں شہر کے مختلف عمارتوں میں ہوتی تھیں، اور اس وقت بھی جبکہ یونیورسٹی اڈکیٹ کے وسیع وعریض نہایت بلند اور پرفضا مقام پر منتقل ہوگئی۔ جناب ڈاکٹر زور نے اپنے مضمون میں بہت صحیح فرمایا ہے کہ خان صاحب ایک ایسے معمار تھے جو عمارت کے آغاز تعمیر سے اختتام تک مزدور کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور تعمیر کا کام مکمل ہونے پر انہیں خدا حافظ کہدیا گیا۔ لیکن وہ نہ صرف جامعۂ عثمانیہ بلکہ حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں ایک درخشاں ستارہ کی طرح روشن رہیں گے۔

”چراغ منزل“ کا شاعر اور ”بساط سیاست“ کا اہم مہرہ یعنی شاہد صدیقی یکم اگست کی رات کو ہم سے جدا ہوگیا۔ شاہد صرف شاعر ہی نہیں بلکہ نثر نگار بھی تھے اور مزاح نگار بھی۔ ان کے مزاج میں کبھی تو تبسم زیرلبی کی کیفیت ہوتی اور کبھی طنز کے ایسے نشتر ہوتے جو حساس دلوں میں کاری زخم لگادیتے۔ شاہد صدیقی کے اٹھ جانے سے شعراء کی محفل میں ایک خلا محسوس ہورہا ہے۔

اردو کو ایک اور صدمہ مولانا حفظ الرحمٰن کی موت سے پہنچا۔ وہ جنگ آزادی کی صف اول کے مجاہدین میں تھے۔ اردو کے لیئے وہ ہمیشہ سپر بنے رہے اور حتی الوسع اس پر آنچ نہ آنے دی۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام کو جب بھی اپنے ذمہ لیا پورا کرکے دکھایا۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والوں میں“ (ادارہ)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں مرحوم

حیدرآباد کے اردو دوستوں کی کوششوں سے اس سرزمین میں پھر سے اردو کو ذریعہ تعلیم بناکر جامعہ عثمانیہ سے ملحق ایک کالج قائم کرنے کی خبر کے ساتھ مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں مرحوم کی رحلت کی اطلاع اہل بصیرت کے لیئے ایک تازیانۂ عبرت ہے۔ یہ دونوں واقعات گزشتہ نصف صدی کی حیدرآباد کی تاریخ اور اس شہر میں اردو کے عروج و زوال کی داستان پھر سے ایک بار نگاہوں کے سامنے لے آتے ہیں جو کام آج سے تقریباً پچاس سال قبل شروع کیا گیا تھا، جس نے عالی شان نتائج پیدا کئے تھے اور بعد کو زمانے کے انقلاب نے جسکو نیست و نابود کردیا تھا پھر اس کو شروع کرنے میں وہی دشواریاں پیش آرہی ہیں جو نصف صدی قبل مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں اور ان کے ہم خیالوں اور ہم کاروں کو پیش آئی تھیں۔

حیدرآباد کا علمی طبقہ شائد اس واقعہ کو ابھی بھولا نہیں ہے کہ مرحوم خان صاحب مرحوم کلیۂ جامعہ عثمانیہ کے پہلے صدر تھے۔ اور اس جامعہ کے قیام کا جو خواب اہل حیدرآباد اس صدی کے شروع ہی سے دیکھ رہے تھے اور جو بعد کو اس عہد کے ارباب اقتدار سر اکبر حیدری، سر راس مسعود، حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولوی عبدالحق وغیرہ کی تائید سے ۱۹۱۸ء میں شرمندۂ تعبیر ہو سکا تھا اس کو عملی جامہ پہنانے میں جتنا عبدالرحمٰن خاں صاحب نے حصہ لیا تھا کوئی اور نہ لے سکا۔ چنانچہ ان سے قبل ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو بھی اس کا موقع ملا تھا مگر وہ اس قدر جلد الہ آباد واپس ہو گئے کہ اس جامعہ کی تعمیر میں نمایاں حصہ نہ لے سکے۔

مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں تقریباً ربع صدی تک کلیہ جامعہ عثمانیہ کے صدر کیا رہے گویا اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور مختلف شعبہ جات یعنی فیکلیٹوں کے قیام، ان میں بزبان اردو تعلیم کے انتظام، سائنسی مضامین کے لیئے اردو اصطلاحوں کی تجویز و ترویج اور اُستادوں اور طالب علموں کے ذوق علم و عمل کے انصرام میں ہمہ تن جد و جہد کی۔ اسوقت حیدرآباد جاگیر دارانہ نظام کی خرابیوں اور خوبیوں دونوں کا مجموعہ تھا۔ اور اس مجموعۂ اضداد میں خلوص، دیانت اور قوت سے کام کرنا آسان بات نہ تھی۔

خاں صاحب نے اس طرح بر سر عمل رہنے کی کوشش کی جس طرح بتّیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔ لیکن سرکاری اور درباری سازشوں سے ان کو کبھی امان نہ ملی۔ سر اکبر حیدری جیسے روشن خیال وزیر اعظم بھی ان کے خلوص، ہمہ جہتی مساعی، بے لاگ گفتگو اور اہل ملک میں ان کی غیر معمولی مقبولیت کے باعث ان سے حسد کرنے لگے۔ وہ غالباً چاہتے تھے کہ جامعہ عثمانیہ بلا شرکت غیرے ان ہی کا کارنامہ اور انہی کی یادگار ثابت ہو۔ چونکہ اس وقت حیدرآباد کی سیاست میں اُن کا نیرّ اقبال عروجِ کمال پر تھا اس لیئے ان کے حکم کی کرشمہ سازیاں جو چاہے کر سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی عبدالرحمٰن خاں کے تمام کارناموں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کی گئی۔

ان کی اپنی محنت اور غیر معمولی کد و کاوش کا کوئی شایان شان صلہ نہیں ملا۔ اور جامعہ عثمانیہ کی مستقل عمارتوں کی تعمیر کے سپاہی ان کی خدمات کسی سرکاری یا درباری قدر دانی یا اعتراف کے بغیر ختم کردی گئیں۔ وہ جامعہ کے ایک ایسے مزدور ثابت ہوئے جس کو عمارت کی

تکمیل کے بعد ہی برخواست کر دیا جاتا ہے۔ مگر اس مزدور نے جس تن دہی، خلوص اور سچی لگن کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کی تعمیر میں حصہ لیا اس کی نظیر اگر کہیں اور مل سکتی ہے تو شاید مدرستہ العلوم علی گڑھ کی تعمیر میں سرسید احمد خاں اور نواب محسن الملک کے کام میں مل سکے گی۔ مگر وہاں کی عمارتوں اور تاریخ میں ان دونوں بزرگوں کے نام بار بار نظر سے گذرتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں محمد عبدالرحمٰن خاں مرحوم نے بقول سکندر علی وجد ؎

کام چھوڑا ہے مگر نام نہیں چھوڑا ہے

جامعہ عثمانیہ کے اردو ذریعہ تعلیم کی کامیابی کے بارے میں اس دور میں اسی طرح کے شکوک و شبہات اور مخالفتیں تھیں جس طرح اردو ذریعہ تعلیم کا ایک کالج قائم کرنے کے سلسلے میں بعض گوشوں میں نمودار ہیں۔ مگر خاں صاحب نے اپنے علم و عمل سے ہمہ جہتی طور پر ان تمام شکوک و شبہات کو دور کیا اور کام کی دھن میں مخالفتوں کی پرواہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اردو میں پڑھانے اور پڑھنے والوں دونوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور عثمانیہ کے فارغ التحصیل جب یورپ کی جامعات میں اعلیٰ تعلیم کے لیئے جانے لگے اور وہاں اچھا نام پیدا کرنے لگے تو مخالفین نہ صرف خاموش ہو گئے بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تائید اور تعریف پر بھی مجبور ہو گئے۔ دیسی زبان میں تعلیم دینے کا پہلا ادارہ ہونے کے باعث اس جامعہ کو ہند و بیرون ہند کے مشاہیر نے خراج تحسین بھی پیش کیا۔

جامعہ عثمانیہ کی عالیشان عمارتیں اپنی خوبصورتی اور شان و شکوہ میں تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ مگر ان عمارتوں سے زیادہ شاندار وہ کام ہے جو مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے اس جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کی ذہنی و علمی تعمیر کے سلسلے میں انجام دیا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ جامعہ نہ صرف اقصائے یورپ میں بہت جلد مشہور و معروف ہو گئی بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے آج تک حیدرآباد میں اور بیرون حیدرآباد بھی علمی و ادبی اور سیاسی دنیا میں سرخرو ہیں اور ریاست کے سیاسی انقلاب کے بعد بھی اپنے اور اہل ملک کے ذہنی و اخلاقی معیار کو برقرار رکھنے میں سرگرم کار ہیں۔ گزشتہ ربع صدی میں خان صاحب کے فیض یافتہ اور دست گرفتہ ارباب فضل و کمال ہی حیدرآباد کی علمی و ذہنی کائنات پر چھائے رہے ہیں اور نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ ان سبھوں نے اردو ذریعہ تعلیم کے طفیل ہی میں ہمہ جہتی سربلندی اور سرخ روی حاصل کی تھی۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ ان کے مساعی سرزمین حیدرآباد کے اس عز و افتخار کو آج اردو کالج اور بعد کو اردو یونیورسٹی کے دوبارہ قیام کے ذریعے سے زندۂ جاوید بنا سکیں۔

ڈاکٹر حبیب النساء بیگم ولی اللہ

سید شاہ محمد قادری

اردوئے قدیم کے پہلے اڈیشن میں حکیم سید شمس اللہ قادری لکھتے ہیں "کہ رائچور میں جس کا نام عالمگیر نے فیروز نگر رکھا تھا ایک خاندان نور دریا کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ سید شاہ محمد قادری بیجاپور کے باشندے اور شیخ امین الدین اعلیٰ متوفی ۱۰۸۵ھ کے خلیفہ تھے۔ عالمگیر کے زمانے میں گزرے ہیں آپ نے دکنی زبان میں کئی رسالے لکھے ہیں جن میں تصوف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ ہم نے آپ کے دو رسالے دیکھے ہیں جن میں مسائل وحدۃ الوجود اور قضا و قدر پر بحث ہے۔"

۱۹۲۹ء میں نظر ثانی کے بعد اس کتاب کا جو اڈیشن چھپا ہے اس کے صفحہ ۹۶ پر صرف اتنا لکھا ہے۔ "۱۱۶۵ھ میں شاہ محمد قادری قاضی رام گیر نے خزانہ عبادت کے نام سے فقہ احناف کے احکام و مسائل میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اسمیں جگہ جگہ ہدایت ہندی کے حوالے درج ہیں یہ مثنوی ۱۲۸۷ھ میں مدراس میں چھپ گئی ہے۔"

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ تذکرہ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو جلد اول کے صفحہ ۳۵ پر بہ زیر عنوان مخطوطہ نمبر ۱۵ (۹۸ ب) وفات نامہ سرور کائنات یوں رقمطراز ہیں۔ "شاہ محمد قادری خلیفہ تھے شاہ امین الدین اعلیٰ کے، اور ۱۰۸۵ھ میں فوت ہوئے ایک کرامت کی وجہ سے نور دریا لقب پایا۔ رائچور میں مدفون ہیں۔ (بحوالہ واقعات مملکت بیجاپور حصہ سوم صفحہ ۳۵۴)"

رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" کے پندرھویں باب میں نثر کی ابتداء اور ترقی کے متعلق بحث کرتے ہوئے انہیں مختلف مذہبی رسالوں کا مصنف بتایا ہے۔

مصنف "مدراس میں اردو" نے لکھا ہے کہ شاہ محمد نے ایک پندرہ سو اشعار کی مثنوی "قصۂ حضرت موسےٰ" کے نام سے ۱۱۶۵ھ میں لکھی ہے جو ۱۲۸۷ھ میں مطبع نظام مدراس سے شائع ہوئی ہے۔ کلام کا نمونہ جو دیا ہے اس کے آخری اشعار یہ ہیں ؎

تو بس کر شاہ محمد قصۂ غم	کہ کرڈالیا ہے سبکے دل کوں برہم
مہینے تیں لگ[۲] میں کر کو[۳] محنت	دیا قصے کتیں ترتیب و زینت
سنہ ہجری گیارہ سو کے اوپر	برس پینتیس گئے تھے ہی گزر کر

بقول مصنف مذکور اس وقت تک شاہ محمد کے متعلق مزید معلومات فراہم نہ ہو سکے تھے۔ "داستان تاریخ اردو" کے مصنف فرماتے ہیں۔ سید شاہ محمد قادری اورنگ زیب کے زمانے میں تھے اور رائچور کے خاندان نور دریا کے بزرگ اور شیخ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ ہیں

انھوں نے چند رسائل تصوف لکھے ہیں۔"

ڈاکٹر زور صاحب نے واقعات مملکت بیجاپور حصہ سوم کے حوالے سے شاہ محمد قادری کو شاہ امین الدین اعلیٰ کا خلیفہ اور سنہ انتقال ۱۰۹۵ھ بتایا ہے۔ اور مصنف "مدراس میں اردو" نے ان کی ۱۱۳۲ھ کی لکھی ہوئی مثنوی پیش کی ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری، سید شاہ محمد قادری کو اورنگ زیب کا ہم عصر اور شیخ امین الدین اعلیٰ کا خلیفہ بتاتے ہیں۔

رفع اختلاف کے لیئے آج کل یہ نظریہ بھی ہے کہ شاہ محمد قادری نوردریا اور شہ محمد قادری "مصنف قصۂ موسیٰ" دو مختلف شخصیتیں تھیں اب دیکھنا یہ ہے کہ شہ محمد قادری کی مختلف تصانیف کی داخلی شہادتیں کہاں تک اس نظریہ کی تائید یا تردید کرتی ہیں۔

شہ محمد قادری کی ایک تصنیف "خزانۂ معرفت" کے نام سے ۱۳۱ صفحوں پر مشتمل ہے جس کے بعض اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

جمع حمد ثابت خدا پو اچھو ‏ ‏ درود و سلام مصطفیٰ پو اچھو
صحاباں پو ساری اچھو برقرار ‏ ‏ کہ یعنی سو رحمت پروردگار
یہی سارے دلیاں پو اچھو سر بسر ‏ ‏ اچھو میرے بھی پیر و استاد پر
ہیں آپیچ ہوں قبلہ گاہ کامیہ ‏ ‏ ہی نام میرا نصاحب سو روشن ندید
مراقبہ میں فرق شام و سحر ‏ ‏ ہی ایسا سو کا سب ندیکھا دیگر

بزیر عنوان "در بیان تعلیم نمودن مُرید را" فرماتے ہیں:۔

رکھا خزانۂ معرفت اس کا نام ‏ ‏ کہ یعنے خزانہ سمجھو کا تمام

دیگر ابواب اسمہای احدیت، تعین، اسماء تعین، اسمہائے صفات وغیرہ سے متعلق ہیں۔ آخری شعر ہے۔

اتاباں سوں کر شاہ محمد تمام ‏ ‏ محمد پو بیج کر درود و سلام

ایک اور رسالہ بنام رسالہ وجودیہ جو ۲۷ صفحوں پر مشتمل ہے نوردریا قادری کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ اسکی زبان اور انداز بیان کے مطالعہ کے لیئے اس کے چند سطور پیش کئے جاتے ہیں۔

"یو تینو ں ذات کے مرتبے ہیں وہانسوں چاہا کہ اپ کی مراتب کا کظہور کردن کر خود دیکھا دیکھی میں بوج پیدا ہوا کیا واحدی جہاں ایک ہی وہاں بوج ہی بغیر بوج کی دیک سوں کوں وجود میں اس دیک کوں احدیت بولی اس بوجکوں وحدت بولی جو بوجیں ہور ایک میں دیسکو یم یا سوا سے واحدیت بولتی ہیں ہور احدیت ذات واحد ہی وہاں بچ اعتبار صفت سوں احدیت مرتبی سوں پر نزول ہو ظہور کیا"۔ خاتمے میں لکھا ہے "ہٰذا کتاب وجودیہ من تصنیف حضرت نوردریا قادری رحمۃ اللہ علیہ نقل از کتاب حضرت پیر و مرشد سید شاہ عبد اللطیف قادری مدظلہ العالی علی سایر المؤمنین بندہ فدوی خاکسار فقیر حقیر از غلامان پیر و مرشد سید محب حسین ولد سید تراب۔ بتاریخ چہارم شہر جمادی الاول اختتام یافت۔"

نیز آپ نے ایک ضخیم مثنوی بنام "خزانۂ عبادت" ۱۱۶۵ھ میں لکھی ہے۔ جو ۴۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ نماز جمعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

جمعہ سکی دوسری سبزی پو اتر ‏ ‏ صفت پادشاہ کی سو کرنی گر

لہ۔ میں خود ہی۔ لمہ۔ نظر آیا یا دکھائی دیا۔

یو یعنی سو جبکی سو شاہی اچھی   ضروریکوں اتناچ پڑ نا لکھی

اللھم وفق سلطان زمامعاہدا احمد شاہ بہادر پادشاہی غازی خلداللہ ملکہ سلطانہ وعافا ذا اعلی العالمین برہ وعدہ احسانہ وترضہ واجعلہ اخرۃ خیرمن الاولی۔

زمانے میں احمد شاہ کی تمام   بنا کر تو اسمیں لکھا ان کا نام

احمد شاہ کی حکومت ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء م ۱۱۶۱ھ سے ۱۱۶۷ھ تک تھی اس زمانے میں انھوں نے یہ کتاب لکھی اور ۱۱۸۲ھ میں تصحیح فرمائی جیسا کہ خاتمہ پر لکھتے ہیں:۔

کتاب یو بنیا تو جو سو عزیز   سن ہجری ہزار ہو ایک سو پونیز
گذر جاکو بن خٹ جو برساں سگل   لکھا تسرا مہینا ربیع الاول
ہی تاریخ عدد سوں بنانیکی تئیں   فکر میں تھا یوں ے آنکی تیں
یو ہاتف نے تاریخ کے دیا خبر   خزانہ عبادت کا سبحے ہے گکر
بنیا جب تو اسکوں دیا یو خطاب   خزانہ عبادت ہزاراں کتاب
صدی بارویں بیا سے جو سال   گذر گئی پو بی اسکوں دیکھیا سنبال
غلط کین تھا سو اسے کاڑسٹ   زیادی عبادت کوں بھی پھاڑ کٹ
ضروری مسایل بھی حاصل کیا   کہ جاں جاں ضرور تھا واں داخل کیا
کیا جس جو سکی پری تو نظر   صحی بو جنا اور یو معتبر
کیا شاہ محمد نے جو یو ختم   نبی پر درود بھیج کر دمبدم

اس کتاب میں طہارت، وضو، غسل، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق، عدت، شکار، حلال و حرام مرد و عورت کے حقوق ایک دوسرے پر اور والدین کے حقوق فرزند پر، ترکہ وغیرہ مسائل بہ تفصیل تمام بیان کئے گئے ہیں۔ اپنے پیر و مرشد شاہ میراں سے دلی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور انہیں بارھویں صدی کے ولیوں میں بہترین بتاتے ہیں۔

صدی بارویں ولیاں میں سگل   ولی ہینگی یو شاہ میراں اول
مرے پیر کا طور یہ تھا تمام   کہ دریائے وحدت میں غوطہ مدام

الغرض اس سے پتہ چلتا ہے کہ خزانہ عبادت اور خزانہ معرفت کے مصنف شاہ محمد بارویں صدی میں موجود اور شاہ میران کے مرید تھے۔

میرے کتب خانے میں شاہ محمد قادری کا ایک رسالہ بنام "نو بطون" بھی ہے اس کتاب کے شروع کے ۲۰ صفحے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالہ کے آخر کے کچھ اوراق غائب ہیں۔ زبان اور اسلوب بیان کے مطالعہ کے لیئے اسس سے بھی چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

رسالہ نو بطون

بسم اللہ الرحمن الرحیم وتمم بالخیر

اے عزیز آسمان نہ تھا اور زمین نہ تھی تب اللہ تعالیٰ اپس سوں اپی خود بخود تھا کیا ہو کر تھا العین تھا العین کیول تھا (جواب)

نا معلق نا بی معلق نا صرف نہ نکات نہ تحت نہ بالا نہ دور نہ نزدیک نہ بیش نہ پست نہ راست نہ چپ نہ روشن نہ تاریک نہ رنج نہ گنج نہ یاد نہ فراموش نہ خبر نہ بے خبر نا ہوش نہ بے ہوش عین ذات واجب الوجود بی چوں بی چگوں تھا۔ دیکھ اوس میں محمد نے نور کے روشنائی اگر نہ جھلکی ہوا سمیں محمد میں ہوویں بعد از عرفاں کے ہاتھ سوں پکڑ کر میں بی گنج ہوں گر کر جانیا دہاتی منگیا جو اپس کوں دیکھوں اور جو ہو کہا تھا سو دہی صورت آنکھ میں پکڑ کر ستر ہزار برس انک کھول کر دیکتا تھا سو دو صفتاں ایک جلال دوسرا جمال۔ جلال صفت مذکر کے ہو جمال صفت مونث کی یو دونوں ملکر ایک وجود تھا۔

یہ نے دونوں بطون شاہ محمد قادری دریائی جمال اللہ تعالیٰ احوال والمقربین با نوار قرتہ العین فرمائی اول وجود واجب تن دوم وجود ممکن من سوم وجود ممتنع جاں چہارم عارف پہچان۔

پھر لکھتے ہیں :-

چوسٹ کرد یکھے یوں خبر — نو بطون کے کھول نظر
اول شرع کی بوسے راہ — باطن ہوئے یوں گواہ
شہ محمد بولیا یو کلام — نبی پہ بھجو درود و سلام
شاہ محمد قادری ارشاد بخش — نور دریائی حق کا ہے نقش

اس رسالے میں متعدد سوالوں کے جواب دیئے گئے ہیں۔ یعنی یہ کہ حق تعالیٰ واجب الوجود میں کیوں محیط ہے ممکن میں کیوں محیط ہے۔ ممتنع الوجود میں کیوں ہے عارف الوجود میں کیوں محیط، اس تن میں بات کرنے والا کون ہے۔ ہوش بردم نظر بر قدم سفر در وطن خلوت در انجمن کسے کہتے ہیں۔ نفس، دل، روح، نور امین نور کے معنیٰ کیا ہیں دل روح و نفس کے رہنے کی جگہ کونسی ہے۔ درویش کسے کہتے ہیں۔ ایمان کیا ہے؟ ایمان کی صفتیں کیا ہیں؟ وغیرہ اس قسم کے بیسیوں سوال و جواب ہیں جیساکہ عرض کیا گیا اس رسالے کے آخری اوراق غائب ہیں اس لیئے اختتام کی عبارت پیش نہیں کی جا سکی۔ لیکن اس چھوٹے سے رسالے کی اہمیت سب سے زیادہ اسوجہ سے ہے کہ اسمیں شاہ محمد قادری کے نام کے ساتھ نور دریائی بھی لکھا گیا ہے اور اس کی طرز تحریر اور زبان خزانہ عبادت اور خزانہ معرفت کی زبان اور اسلوب بیان سے ملتی جلتی ہے۔ اور یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس رسالے کے مصنف شاہ محمد قادری نور دریا "خزانہ عبادت" اور "خزانہ معرفت" کے مصنف شاہ محمد قادری سے ایک سَو سال پہلے گذر چکے ہیں۔

دوسری بات جو غور طلب ہے یہ کہ "خزانہ معرفت اور" خزانہ عبادت" میں شاہ محمد قادری اپنے پیرومرشد کا نام شاہ میراں یا میراں صاحب بتاتے ہیں۔ اور خزانہ عبادت کے دیباچہ میں لکھا ہے

دلیاں سوں ہی قائم زمانہ تمام — جگت جبتلگ ہے وہی ہی مدام
صدی بارویں کے ولیاں میں سکل[3] — ولی ہیں گے یو شاہ میراں اول
کرامات اونکی ہے لئے سربسر — ہریک ٹھور مشہور نگرے نگر
کرامات ہے کیا سو یو در اصل — کتا[1] ہوں تمہیں خوب بوجھو[2] سکل[3]

---

۱ کہتا ہوں ۲ سمجھو ۳ سب۔

ہمیشہ حضوری منے دل اچھے … اوسیکو نچہ سارا یو حاصل اچھے
کہ یعنا پچے سویں پن کوئی کار … وہی وحدت کے میداں میں پاؤں کار
میری پیر کا طور یہ تھا تمام … کہ دریا سن وحدت میں غوطہ مدام
کہ جس کام خاطر جو آیا ہے ان … جو اوس کام کوں خوب پایا ہے جن
اوسی کو نچہ کہتے کرامت تمام … یو بولیا ولیکن نہ سمجھی ہیں عام
آتا عام خاطر مرے پیر کے … بیاں کرامت سو یک دو ہیر کے
میں کرتا ہوں بوجھو گے اے خاص و عام … حضوری میں تاثیر اونکی مدام
تہجد کے وقتوں وظیفہ سنے … ادب سات آ بیٹ کر سامنے
ہمیشہ رہتی تھی اویاروں میں جاں … جنگل ہور بیاباں جہار دنیں جاں
کہ جو کروتھی لانہ کے رینچہ و باک … بھی رکھوال جحر یکا ایک ناک
کیا کوئی وہا اجنبی نے گذر … او ہسکار کر جلد دوری اپر
گھر سے گھر سو یو بات مشہور تھی … ولے نظر انکی پڑیا نہیں کبھی
کہ یو بات واں کے سو ہیکے سکل … کہ جد رام گیری میں رہتی تھی اول
پوچھنکے اگر باگ کے تم جو بات … ہمیشہ سوا آتا تھا ہر ایک رات
جو آدم کے پہار ہو بیٹھی تھی جب … تہا جت اتہا باگ یاں کی تب
ہمیشہ نہ دیا نکار سینا راد … بری کوئی جنگل کا پر ہنارا د
اسی طور سوں باگ ہر یک آئی … کیتیک دن جو رہکر نکلی پر کو جائی
جکوں بی باگ آتا تو ملتا اتہا … ہمیشہ آدمی راتوں وقت پا
کتنک لوک فجر کوں بھی دیکھے اوسے … کہ یعنے جو بیٹھا سوا اکر اپنے
حقیقت سکل او سکے کوں سر بسر … ہماری دو بکری اتی پہاری اوپر
غا سشام کے وقت چرتے تھے واں … کہ دیسے منے باگ آتا کہاں
او تھالی کیا دو میں سوں ایک کوں … کہا پیر کوں جا کو میں بیک سوں
شتابے سوں جا باگ کے کنئے اونکی … جو بکرا ہمارا ہی تو چھوڑ دی
کہتانہ ہوا سو دیا چھوڑ کر … ذبح تو کیئے لاکو بیکی اوپر
بھی چھ چھ مہنے نکھاتی اتھی … جنگل میں رہتے کر کوں آتے نتی

---

۱ حضوری میں ۲ ہے ۳ کو ۴ نکال ۵ آیا ۶ اسی کو ہیں ۷ بہت زیادہ ۸ آبیٹھ ۹ اجنبی ۱۰ گھر گھر ۱۱ پڑی نہیں کبھی ۱۲ باگھ۔
۱۳ آدم کی پہاڑی ۱۴ بھی ۱۵ رہنے والا ۱۶ جو کوئی ۱۷ آدمی رات کو ۱۸ آنے۔ وہ ۱۹ پہاڑی ۲۰ سرشام ۲۱ میں ۲۲ اٹھاکر
۲۳ شرماکر ۲۴ گودی کے پاس ۲۵ چھ چھ مہینے کھاتے نہیں تھے جنگل میں رہتے گھر کو آتے نہیں تھے۔

اس کے بعد اپنے پیر کی ایک اور کرامت کا ذکر کر کے کہتے ہیں۔

کرامات یہ بہوت ہی اس سیر ۔ ولیکن مجھے نیں ہے فرصت مگر

بیاں اوسکا میں نیں کہا یوں تمام ۔ مجھے ہے مسایل جو لکھنے کا کام

یعنی اپنے پیر کے کرامات یوں تو بہت سے ہیں لیکن اس وقت چونکہ میرا کام مسایل کا بیان ہے اس لیئے ان کا تفصیلاً ذکر نہیں کیا۔ اس کے بعد کتاب ہذا بنام "خزانۂ عبادت" لکھنے کا سبب بیان کرتے ہیں اور آیندہ اسی کتاب کی نقل لینے والوں کو تاکیداً کہتے ہیں کہ اسکو کسی قسم کے رد و بدل کے بغیر صفائی سے لکھا جائے اور اشعار کے ظاہری حسن و قبح کی بجائے اس کی معنی اور مطلب پر نظر رکھے۔

اس دیباچہ کا آخری شعر ہے۔

یو دیباچہ کر کر یہاں سے ختم ۔ اتا اپنی مطلب پورا کیا قلم

الغرض اس کتاب کے دیباچہ سے شاہ محمد قادری کے پیر و مرشد کے متعلق اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسم گرامی شاہ میراں تھا اکثر پہاڑوں کی گویوں میں خصوصاً آدم کی پہاڑیوں کے گویوں (سرا بون) میں چلہ کشی کرتے تھے۔ جس کی حفاظت پر شیر مامور تھے

میراں یعقوب نے اپنی کتاب "شمائل اتقیا" کے دیباچے میں امین الدین ثانی کے بھانجے یعنے میراں جی خدا نما کے نواسے شاہ میراں ثانی ابن سید حسین کا ذکر کیا ہے۔ کہ جب وہ اپنے ماموں کی جگہ خلیفہ ہوئے تو مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کی لہذا ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

" عارف حق رسیدے عارفاں کے نور دیدے، مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلیجے مرتضیٰ کے تین شاہ میراں ابن سید حسین سلم اللہ تعالیٰ۔"

یہی شاہ میراں صاحب ثانی ہیں جن کے متعلق "محبوب ذی المنن تذکرۂ اولیائے دکن" حصہ دوم جلد سوم کے صفحہ ۸۶۰ پر لکھا ہے آپ سید حسین عرف شاہ میراں کے صاحبزادے اور شاہ امین الدین ثانی کے ہمشیر زادے اور خلیفہ ہیں۔ پیر کی اجازت سے بیرون بلدہ حیدرآباد محلہ دھول پیٹ میں سکونت پذیر ہوئے، رات دن عبادت و ریاضت میں بسر کرتے تھے۔ بزرگی کا نور چہرے سے نمایاں رہتا تھا اور اوراد و وظائف کے علاوہ ہر روز قرآن شریف ختم کرتے تھے۔ آخر اکہتر برس کی عمر میں بوقت دو پہر روز شنبہ ۱۱۵۵ھ رحلت کی۔ مدرسہ کے متصل خانقاہ میں مدفون ہوئے۔

اسی کتاب کے صفحہ ۹۵۹ میں شاہ میراں بخاری کا ذکر بھی ہے جو بیجاپور میں عالمگیر کے عہد حکومت میں رہتے تھے۔ شاہ محمد سیرس کے مرید و خلیفہ، طریقۂ قادریہ کے پیرو صاحب تصرف و کرامات بزرگ تھے۔ بیجاپور اور نگ آباد اور حیدرآباد میں مشہور و معروف تھے مگر ان کا سنہ وصال ۱۱۱۱ھ بتایا گیا ہے اس لیئے یہی شاہ محمد کے پیر و مرشد نہیں کہے جاسکتے جو خزانۂ عبادت کے تصنیف یعنے ۱۱۶۱ھ میں بقید حیات ہوں۔ نیز مذکور بالا دو بزرگوں میں سے کسی کا بھی پہاڑوں میں قیام کا پتہ نہیں چلتا۔

بنگلور سے ۱۶ میل دور تمننگل نامی ایک گاؤں ہے وہاں کی ایک مشہور و معروف ہستی جنہیں میسور کا پہلا شاعر و ادیب مانا جاتا ہے اور جنکی متعدد تصانیف مصباح النور، مراۃ اسرار، مراۃ الاذکار وغیرہ ہیں بنام شاہ محمد صدر الدین ولد شاہ میراں، نواب حیدر علی کے زمانے میں گذرے ہیں۔ میں نے مراۃ الاذکار کے ایک مخطوطے میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی پائی۔ اس رسالہ مراۃ الاذکار تصنیف حضرت شاہ محمد صدر الدین ولد شاہ میراں حسینی ولی اللہ بنزل الجبلی قدس اللہ اسرارہم "

شاہ میراں مذکور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر پہاڑوں کی کھوں میں مصروف عبادت رہتے تھے۔ اس لیئے ان کے نام کے ساتھ بمنزل الجبلی یعنی پہاڑ کے رہنے والا لکھا جاتا ہے ان کے مندرجہ ذیل حالات سید شاہ حضرت پاشا قادری نے روانہ فرمائے تھے۔
شاہ میراں حسینی کو نواب سعادت اللہ خاں نے بمعرفت دل دلاور خاں سات قریے نلمنگل کے بطور جاگیر عنایت فرمائے تھے۔
(۱) ہگڈلول پور (۲) مت پلی (۳) واجر ہلی (۴) کاچن ہلی (۵) جگ ہلی (۶) صینپور (۷) چک سولور۔
ان کے چار فرزند حاجی فریدالدین حسینی، رہبر شاہ درویش، سید شاہ محمد حق نما اور سید شاہ محمد صدرالدین حسینی واصل حق (مصنف مراۃ الاذکار، مصباح النور وغیرہ تھے) ابھی پہلے دوسرے اور تیسرے فرزندوں کی اولاد آدم کی پہاڑی میں بسی ہوئی ہے۔ پیری مریدی ان کے بعد سے جاتی رہی ہے۔
مذکور بالا معلومات کے پیش نظر گمان اغلب یہ ہوتا ہے کہ شاہ محمد قادری مصنف "خزانۂ عبادت" اور "خزانۂ معرفت" کے پیر و مرشد شاید یہی شاہ میراں ہوں جو اکثر پہاڑوں میں اقامت فرماتے تھے خصوصاً ایک شعر میں آدم کی پہاڑی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے ؎

" جو آدم کے پہاڑ ہو بیٹھی تھی جب		نہایت اتھا باگ یاں بی تب
اونی بھی ہمیشہ سوا تا ا تھا		گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتا اتھا "

الغرض شاہ محمد قادری کے حالات ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں اگر ان کے متعلق مزید معلومات فراہم ہوسکیں تو اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

بانو صغیرہ نسیم
(لکھنو)

جوشؔ اور اُن کا فن

ہمارے جدید نظم گو شعرا میں حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کے بعد اگر کسی کی شاعری پیغام عمل دیتی ہے تو وہ جوشؔ ہیں، انکی انقلابی شاعری میں بڑا جوش و خروش اور ہمت و مردانگی ہے، اسی مردانگی نے انکی شاعری کو غیر معمولی عظمت بخشی اور انکو انقلاب کا نمائندہ شاعر بنادیا۔ موجودہ انقلابی شاعری کی روایت کی تکمیل جوشؔ ہی کے ہاتھوں ہوئی، وہ رومان سے انقلاب تک آئے لیکن ابتدا ہی سے انکی شاعری میں حصولِ آزادی کی جدوجہد کا جذبہ کارفرما تھا جو انکی رومانیت کے بعد ثانوی حیثیت رکھتا ہے، ان کا نعرۂ انقلاب رومانیت کی لے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگر جب سے انھوں نے عملی طور سے ترقی پسند مصنفین کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو انکی شاعری بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ اردو شعر و ادب میں انقلاب ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد سے آیا جبکہ پرانے عقائد کو چھوڑ کر نئے خیالات کی یورش شروع ہوگئی تھی، ہماری شعری لغت بالخصوص غزل کی زبان اور نئے خیالات کے اظہار میں شدید کشمکش ہونے لگی تھی۔ اس کا مظاہرہ سب سے پہلے حالیؔ کی شاعری میں ہوا، حالیؔ نے جس وقت شاعری کا آغاز کیا تو ان کے سامنے ایسے ہی شعرا تھے جو فرضی و تخیلی باتیں کیا کرتے تھے، ان کا عشق خواہ جھوٹا ہو یا سچا اسمیں کوئی بلندی یا تہذیب نہیں رہ گئی تھی، وہ صرف جنسی مضامین و بوالہوسی تک محدود ہوگیا تھا۔ یہ تھا وہ شاعرانہ ماحول جب حالیؔ نے نیچرل شاعری کی بنیادیں استوار کیں اور اردو شاعری کو زندگی کے نئے رشتوں اور مغرب کے نئے خیالات سے ہمنوا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے نہ صرف غزل میں نئے مضامین رائج کئے، شاعری کے دامن کو غیر معمولی وسعت بخش دی اور اپنی اصلاحی و قومی شاعری کے دردانگیز نالوں سے قوم کے دل میں ایک نیا احساس، نیا شعور بیدار کر دیا، حالیؔ قوم سے کہتے ہیں۔

نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک
تو واں تک اُڑیں ہو رسائی جہاں تک

حالیؔ کے اس پیغام بیداری کو اقبالؔ اور ان کے بعد جوشؔ نے اپنا سب سے قیمتی ورثہ سمجھ کر علم و فن کی اور زیادہ بلند سطح پر پہنچا دیا، جو رجحانات حالیؔ کے یہاں دبے دبے سے تھے وہ اقبالؔ کے یہاں پوری قوت سے اُبھر آئے انھوں نے فلسفہ اور سیاست جیسے سنجیدہ موضوعات کو بھی شعری پیکر میں ڈھال دیا۔ اقبالؔ نے اردو شاعری پر ایک انمٹ اثر چھوڑا ہے، انکی پوری شاعری نئے حوصلوں، نئی امنگوں اور تمناؤں سے سرشار ہے اور ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر ✽ بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

اقبال کا ساتھ چھوڑنے سے پہلے ہی جوشؔ نے بھری بزم میں نغمہ سرائی شروع کر دی، ان کے نعرۂ جہاد، رہنمائی اور پیغام بیداری نے نوجوانانِ ہندوستان کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا ہے، وہ ہر قسم کی ذہنی، جسمانی اور ارادی کمزوری بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مرد کہتے ہیں اسے اے ننگِ جوہر کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی زمانہ کی لگام
پروانہ صفت جھونک بھی دے آگ میں خود کو
آغاز میں اندیشۂ انجام کہاں تک
او رہروِ گمراہ یہ غداریاں تا چند
او ننگِ زمانہ ہوسِ نام کہاں تک

جوشؔ اردو کے ہر دلعزیز شاعر ہیں وہ بہ یک وقت رومانی و انقلابی دونوں قسم کی شاعری کرتے ہیں، حالانکہ وہ پہلے رومانی ہیں پھر انقلابی، انکا انقلاب بھی رومانیت کی تہہ میں ڈوب کر ابھرا ہے اور انقلابی شاعری سے ان کی رومانی شاعری زیادہ بامزہ ہے، انقلابی شاعری اور سیاسی انقلاب کی طرف سب سے زیادہ توجہ اقبالؔ نے کی لیکن انھوں نے براہ راست سیاست کے موضوع پر نظمیں کم کہی ہیں، جوشؔ نے براہ راست سیاسی و انقلابی نظمیں کہیں۔ ان کی جذباتیت کو چھوڑ کر اس سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے قوم کے دل میں ایک ہیجان برپا کر دیا۔ رومان کے زیر اثر وہ بہت جلد مشتعل ہو کر جذبات کے دھارے میں بہہ جاتے ہیں اور مجاہدانہ عزم و شان سے تیر و تلوار چلاتے ہوئے میدان میں آتے ہیں، وطن کی آزادی کے لئے وہ اس قدر بے قرار ہیں کہ پورے کارواں کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھ جاتے ہیں، ان کی انقلابی نظموں سے نفرت و حقارت ٹپکتی ہے لیکن دراصل ان کے پیش نظر وطن کی آزادی اور وطن سے بے انتہا محبت کا جذبہ ہوتا ہے، جوشؔ کی بعض انقلابی نظمیں اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں جوشؔ نے برطانوی جبر و استبداد پر صاف الفاظ میں حملہ کیا ہے اور تحریک آزادی کی حوصلہ افزائی بغیر کسی خوف جھجک کے کی ہے۔ اس قسم کی نظموں میں خطابت و جوش بہت ہے لیکن وہ خطابت بارِ خاطر نہیں ہوتی، ان کی نظم "شکستِ زنداں کا ایک خواب" میں بڑی پُرشوکت مجاہدانہ للکار ملتی ہے۔ یہ نظم ۲۳-۱۹۲۲ء میں کہی گئی تھی۔ اس کے زنداں اور لوہے کے پھاٹک سے جوشؔ کی مراد ہندوستان ہے۔ برطانوی جبر و ظلم اور اس زمانے کے ہیجان و تلاطم کا یہ نظم پورا عکس پیش کر دیتی ہے ؎

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیاان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
ایک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

ایسی ہی نظموں سے جوش نے قوم کے دل میں مجاہدانہ عزم و شان پیدا کر دی۔ نادر تشبیہہ و استعارات، ترتیب الفاظ، وزن اور پرشوکت روانی کو جوش نے بڑی کامیابی سے انقلاب کی خدمت کے لئے استعمال کیا ہے۔ جارج ششم کے جشن تاجپوشی کے موقع پر ایک نظم جوش نے "وفاداران ازلی کا پیغام شہنشاہ ہندوستان کے نام" سے کہی تھی، اس کے ایک ایک شعر سے انگریزی حکومت کے خلاف نفرت ٹپکتی ہے، وہ نفرت جو قریب قریب ہر ہندوستانی کے دل میں انگریزوں اور انکی حکومت کے خلاف تھی ایسے موقعوں پر جوش ایک عظمت و جلال کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی نظموں میں انھوں نے پورے ہندوستان کے ان جذبات کو سمو دیا ہے جو اس وقت سینوں میں موجزن تھے اور جن کا اظہار عوام نہیں کر سکتے تھے۔ کبھی جوش تلخی و حقارت سے ان جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی طنز و ظرافت سے اپنی نظموں کو کامیاب بناتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام بڑے بڑے سیاسی واقعات پر نظمیں کہی ہیں، ساتھ ہی ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں رومانیت اپنے شباب پر آجاتی ہے، آزادی کی اتنی جدوجہد اور یہ عزم و یقین اس سے پہلے اردو شاعری میں نہیں آیا تھا، جوش نے انقلاب کی دعوت تو دی ہے اور ان خطروں سے بھی آگاہ کیا ہے جو آزادی کا فریب دیکر غلامی پر رضامند رہ سکتے ہیں ؂

نہ ہو مغرور گر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی
کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے غافل بنانے کی
گئے وہ دن کہ جب زنداں میں تو آنسو بہاتا تھا
ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

جوش بہت پُر گو ہیں اور ہر موضوع پر کہتے ہیں، کچھ کہنے کے لئے ان کو سوچنے کی زحمت کرنی ہی نہیں پڑتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی خارجی محرک شاعر کے جذبات کو مرتعش کر رہا ہے جس سے متاثر ہو کر وہ اپنے دماغ کے غیر شعوری اجزا کو بھی الفاظ کا جامہ پہناتے چلے جاتے ہیں۔ الفاظ کے خزانہ پر ان کو پورا تصرف حاصل ہے۔ تشبیہات و استعارات کے مشاقانہ حرف سے وہ شعر کو ایک طلسمی رنگ دیدیتے ہیں۔ وہ ایک قید و بند سے آزاد شاعر ہیں، ان کی زندگی میں معین راستوں میں نئی جستجوؤں، قدامت اور جدت کی ایسی آمیزش ہے کہ وہ مجموعۂ اضداد نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی تضاد کی پرچھائیاں انکی شاعری میں بھی دکھلائی دیتی ہیں۔

جوش کی تحریروں اور کلام میں ان کے ذہنی ارتقا کی پوری داستان مضمر ہے۔ ان کا زخمی دل چیختا ہے، منہ کی کڑواہٹ تلخ و ترش اشعار کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔ دل کا غبار ایک تلخ و ناتمام حسرت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، سماج میں غریبوں کی مفلسی و بے بسی کی شاعر نے بڑی دلدوز تصویریں کھینچی ہیں۔ بھوکا پیٹ، چھوٹے بچے جو ہر ایک چیز کے لئے ترستے ہیں، مزدوری و محنت جو حسن کی ساری دلکشی چھین لیتی ہے، اس کے بعد شاعر کے سامنے وہ رئیس، بنئے اور مہاجن ہیں جن کی تجوریاں غریبوں کے خون سے بھری جاتی ہیں اس بے مائیگی اور غلامی پر انکا دل کڑھتا ہی نہیں، اسکا بھی انکو خیال ہے کہ نئی نسل بھی بڑھ کر غلام

ہو جائے گی۔ جوشؔ کی ایسی نظموں میں جذبۂ مایوسی سے زیادہ ذہن انسانی کو بیدار کرنے کی خواہش نظر آتی ہے۔

یہ ہند کے سمن بر شیریں کلام بچے ' یہ گل عذار بچے ' یہ لالہ فام بچے
رہ رہ کے یہ فلک کی جانب ابھرنے والے ' یہ شاخ عمر نو کے تازہ چھلکنے والے
امواج زندگی پر الماس کے سفینے ' شیر بینیوں سی ملوذی روح آبگینے
ایک دن ذلیل وحشی انکے بھی نام ہونگے ' اپنی ہی طرح اک دن یہ بھی غلام ہونگے

مذہب پر بھی جوشؔ نے بہت کچھ کہا ہے اور اسکی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ واعظ وزاہد کو انھوں نے خوب ہدفِ ملامت بنایا ہے، ہمارے پرانے شعراء نے بھی مولوی، محتسب اور واعظ پر پھبتیاں کسی ہیں، ان میں بھی حکمران طبقے کے خلاف احتجاج ملتا ہے لیکن زیادہ نہیں، ان کو اس کے آگے زبان ہلانے کی اجازت نہیں تھی۔ اقبالؔ نے مولوی کے خلاف جو لکھا ہے وہ بس اسلام کے ایک نئے آئین، نئے تصور کو پیدا کرنے کے لیئے ہے، مذہب کے خلاف نہیں ہے۔ جوشؔ نے پہلے سرسید کی عقل پرستی والی تحریک کو مذہبی رجعت پرستی کو ختم کرنے کے لیئے استعمال کیا' انھوں نے سماجی نقطۂ نظر' مذہبی آڑ میں ہونے والے جعل' فریب اور شعبدہ بازیوں کا پردہ چاک کیا اور فکر و خیال کی آزادی کی نئی راہیں ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی عقل پرستی باغیانہ جذبات کے لیئے استعمال ہوئی ہے کیونکہ وہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی' انقلاب کے سلسلے میں ہونے والی جدوجہد میں جوشؔ کا یہ کارنامہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ہر قسم کی آزادی کے خواہشمند ہیں اور رکے ہوئے پانی کی طرح نکلنے کی راہ ڈھونڈتے ہیں، وہ شوق، ہوس، جذبات و خواہشات کی دنیا میں پوری کامرانی چاہتے ہیں، ایسی کامرانی جس میں کوئی رکاوٹ نہ پڑسکے۔ دل کی ہر خواہش پوری ہو، دماغ کا ہر خیال منظر عام پر آجائے، ان کی شاعری میں آنے والے ہوشیار خبردار کا شور ہے۔ جوشؔ کی رومانی وانقلابی دونوں قسم کی شاعری ان سب صفحات سے بھری پڑی ہے۔ وہ اپنے لہجے سے چھا جانا چاہتے ہیں۔ یہ چیز ذرا ناگوار ہوتی ہے لہجہ کا یہ انداز جوشؔ کی افغانی شخصیت کا آئینہ دار ہے اور انکی بلند بانگ شاعری کی جان ہے۔ ان کی خطابت میں بہت سی خوبیوں کے ساتھ چند خامیاں بھی مل جاتی ہیں۔ بلند آہنگی، شکوہ الفاظ، چشمہ کی سی روانی بے پناہ طولِ کلام اور تکرار الفاظ، خطابت کا دارومدار انہی چیزوں پر ہوتا ہے جس کا مقصد وقتی تاثیر ہے۔ اس میں حسن سے زیادہ عظمت اور تاثیر سے زیادہ گھن گرج ہوتی ہے جوشؔ کے لہجہ کی خطابت اور آواز کی گرج اکثر قاری کو ان کے بلند تخیل کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ اسی لیئے ان کے کلام میں بعض ایسے مقامات بھی آجاتے ہیں جہاں دھمک زیادہ اور تاثیر کم ہے ان کے اس بلند و بپھرے ہوئے لہجہ کی تائید انکی جذباتی زندگی کی درشتی سے ہوسکتی ہے۔ جس کا ذکر خود جوشؔ نے "روح ادب" کے دیباچہ میں کیا ہے، جوشؔ رئیس زادے ہیں بڑے تندخو، پندار پرست اور خود پرست اپنی ان ذہنی کیفیات کو انھوں نے یوں بیان کیا ہے۔

"لڑکپن میں بلا کا سفلہ خو تھا، میرے ہر بُن مو سے چنگاریاں نکلتی تھیں، میرے مزاج کی یہی بنیادی سختی ہے جو میری سیاسی وخطیبانہ شاعری میں تلخ وترشی بن کر آج بھی نمودار ہوتی ہے۔ اور میری شاعری کا نقاد میرے لہجہ کی درشتی پر چیخ چیخ اٹھتا ہے"۔

مزاج کی اسی سختی نے جوشؔ کو باغی بنا دیا، انھوں نے سماج، مذہب اور خدا سب سے بغاوت کی، خدا کیلیئے وہ کہتے ہیں ؎

لیتا ہے جو بدلہ تو وہ کھوٹا ہے خدا جس میں نہیں سونا یہ وہ گوٹا ہے خدا
شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا

"روح ادب" کی ابتدائی نظمیں بھرے ہوئے جذبات اور اشتعال انگیز خیالات کے نقوش ہیں، یہ نقوش بغاوت کی غمازی کرتے ہیں، یہی بغاوت انکو فطرت سے قریب کردیتی ہے۔ اور فطرت سے قریب ہو کر وہ یہ کہنے لگتے ہیں ؎

چھوڑ کر انساں کو میں فطرت کا شیدا بن گیا
خوبیٔ قسمت کہ فوراً ربط پیدا ہوگیا
مجھ کو حلقہ میں تبسم نے لیا خورشید کے
شام غم رخصت ہوئی جلووں میں صبح عید کے

جوشؔ کی فطرت پرستی میر انیسؔ کی منظر نگاری سے متاثر ہے لیکن انکی منظر نگاری فکر و نشاط اور شعلہ و شبنم سے رفتہ رفتہ فطرت پرستی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ منظر نگاری سے اچھے فنکار پس منظر کا کام لیتے ہیں البتہ فطرت پرستی شاعری کا بہت اعلیٰ موضوع ہے، اپنے آخری دور کی شاعری میں جوشؔ نے ایسی پرستش زیادہ کی ہے، ان کی فطری منظر کشی انیسؔ و اقبالؔ سے علحدہ اور میر حسنؔ و نظیرؔ اکبرآبادی سے زیادہ قریب ہے، انکی منظر نگاری میں ہندوستان کے سین نظر آتے ہیں جسمیں دیہاتی بازار اور کسانوں کے ہل بیل ہیں، دریاؤں کے پل اور ریل کی پٹریاں ہیں، گیہوں اور دھان کے کھیت ہیں، کسانوں کی محنت و عمل کو انھوں نے خاص طور پر سراہا ہے۔ اپنی نظم کسان میں انھوں نے محنت کے عمل کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے اسمیں سرمایہ داری و جاگیرداری کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ انسانی محنت کا عمل اور اس کا حسن و عظمت "شاعر انقلاب" کے خاص موضوعات ہیں، ان کی ایک نظم البیلی صبح کا ہر ہر لفظ شاعر کے لطیف ترین ذہنی عمل اور شاعر فطرت کی ہم آہنگی کا شاہد ہے بدلی کا چاند، آبشار نغمہ اور برسات کی چاندنی وغیرہ اسکا بڑا اچھا نمونہ ہیں۔

جوشؔ کے یہاں جلال بھی ہے اور جمال بھی، انھوں نے عشقیہ ترانے بھی الاپے ہیں اور انقلابی نظمیں بھی کہی ہیں، اس انقلاب و شباب کو آمیز کرنیوالا خود جوشؔ کا وہ عجیب و غریب ذہن ہے جو بیک وقت سختی، نرمی، لطافت و کثافت اور جلال و جمال کا حامل ہے، انکی سیاسی و انقلابی شاعری میں مجاہدانہ للکار ملتی ہے۔ اور عاشقانہ و رندانہ نظموں میں نشاط آور مدہوشی و پرکیف رنگینی ہے، عاشقانہ نظموں کی یہ ایک خاص خصوصیت ہے کہ یہ نظمیں بالکل نئی اور بیحد حسین ہیں۔ ایک طرف تو جوشؔ خدا، مذہب اور تقدیر کے قائل نہیں ہیں، دوسری طرف وہ انسان کو بالکل مجبور سمجھتے ہیں۔ اپنی انقلابی شاعری سے انھوں نے قوم کو شہنشاہیت کے خلاف ابھارا اور ان تمام رجعت پرست اداروں کو صاف صاف برا کہا ہے، جنکی وجہ سے آزادی کی تحریک میں رکاوٹ پڑی، جوشؔ دراصل کاروان زندگی کے راہ نما ہیں، وہ جہالت، غلامی، وہم پرستی، مذہبی جنون اور روائتی اخلاق کی زنجیروں کو توڑ کر ترقی و کامرانی کی نئی نئی راہوں پر گامزنی کی ترغیب دیتے ہیں، ان کی شاعرانہ تبلیغ کا حاصل یہی ہے اپنی وطنی و قومی نظموں میں وہ اپنے ملک کے شام و سحر، اس کے پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں، جاڑے، گرمی اور برسات کا حسن بیان کرتے ہیں، ان نظموں کے پڑھنے سے وطن کی محبت بڑھتی ہے۔ اپنی قوم کے لیئے کس طرح جوشؔ کا دل جلتا ہے اور باہمی تفرقہ اندازی پر وہ کس طرح بے چین ہوتے ہیں۔ اسکا اندازہ مقتل کانپور، پیمان محکم، خان اور حیف اے ہندوستان وغیرہ نظموں سے کیا جاسکتا ہے۔ جہاں وہ فن کو پیچھے ڈال کر سخت و سست کہنے پر اتر آئے ہیں۔

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینہ، بدگماں
اے جبینِ ارض کے داغ، اے دنی ہندوستاں

یا جیسے ؎

بوجہل کی شراب سے چھلکا کے جام کو بٹہ لگا دیا ہے محمدؐ کے نام کو
زندہ کیا ہے راونِ دوزخ مقام کو ہاں ہم نے روسیاہ بنایا ہے رام کو
ویدوں کو ہم پہ فخر ہے قرآں کو ناز ہے
سچ ہے حرامزادے کی رسّی دراز ہے

جوشؔ انقلابی ہی نہیں باغی شاعر ہیں، وہ ابھرے بھی اسوقت جب کہ سماج ایک جمود کے دور سے گذر رہا تھا، لہٰذا بغاوت ان کا مسلک بن گئی سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۳۶ء جوشؔ کا سیاسی مسلک نہایت شدید قسم کی وطنیت تھا۔ وہ اس سیاسی تحریک کے نقیب رہے جس کا مقصد ہندوستان کو آزاد کرانا تھا۔ انھوں نے تحریک آزادی کی ہمہ تن موافقت کی، جنگ آزادی میں شریک ہوکر انھوں نے بہت کچھ کھویا بھی ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک چلی تو جوشؔ نے شد و مد کے ساتھ اس کی ہمنوائی کی اور اپنے قدیم مسلک کو چھوڑ کر اشتراکیت کا ملبوس زیب تن کرلیا۔ لیکن نئے افکار پر طبع آزمائی میں جوشؔ نے مکمل کامیابی نہیں حاصل کی، اس کا سبب شاید جوشؔ کی فطرت ہے، انکی ترجمانی کو لوگ صحیح سمجھنے میں شبہ کرتے ہیں اسکی وجہ شاید نئی فکر اور روائتی انداز بیان کا تضاد ہے جو جوشؔ کے یہاں پایا جاتا ہے، وقت کے تقاضوں سے متاثر ہوکر جوشؔ نے اپنی ذہنی سطح بلند کرنا چاہی لیکن شاعرانہ وجدان سے علیٰحدہ کرنے پر انکی شاعری میں آمد نہیں آورد کا شک ہونے لگتا ہے وہ زیادہ جاندار نہیں معلوم ہوتی ہے۔ اقبالؔ اور جوشؔ میں یہی فرق ہے، اقبالؔ کی دردمندی کے سامنے جوشؔ کی ترش کلامی ان کے عقیدے کی سچائی کو بھی بعض اوقات شک میں ڈال دیتی ہے، اقبال کی ایسی ذہنی بلندی اور فلسفیانہ قوت سے بھی جوشؔ محروم ہیں، حالانکہ دونوں نے مختلف اخلاقی قدروں کو اسی اختلاف کے ساتھ قبول کیا ہے، غصہ اور جھنجھلاہٹ کے سبب جوشؔ کے کلام میں عقیدے کی وہ بلندی نہیں آسکی جو اقبالؔ کے یہاں قدم قدم پر ملتی ہے اس لیئے ان کی بلندی میں باوجود جوش و خروش اور تمام شور و شیون کے پستی آجاتی ہے۔ اور کسی گہرائی میں جانے کے بجائے وہ سطحیت کی طرف مائل ہوجاتے ہیں شائد اسکی وجہ یہ ہو کہ ابتدا سے بعض سیاسی و سماجی حالات پر جوش کا دل بے طرح جلتا رہا۔ انکی سخت کلامی و غیض و غضب جمالیاتی معیار سے ناگوار ہوتا ہے۔ لیکن سماجی اصلاح کے واسطے بیحد کارگر ہے، اگر جوشؔ اپنے باغیانہ شعور کے ساتھ ہمارے ادب میں شعلہ افشانی نہ کرتے تو شائد ہمیشہ غزل کی دلکشی اور حسن و عشق کے روائتی مضامین ذہنوں پر سوار رہتے۔ حسرتؔ و جگرؔ کی بے پناہ مقبولیت کے سامنے جوشؔ نے نظم کو فروغ دیکر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، جسوقت لوگ حسرتؔ و جگرؔ کے دلنشیں نغموں میں محو ہو رہے تھے جوشؔ نے باغی ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور آج جو لوگ ان کی شاعری کو نہیں سراہتے جوشؔ بڑی آزادی سے ان کو بہرا، گونگا اور جاہل کہہ دیتے ہیں۔ حالات نے جوشؔ کو احساس برتری کا موقع بھی دیا اور ان کی یہ چیز بچپن سے لے کر آج تک قائم ہے، احساس برتری اور خود اعتمادی شاعری نے جوشؔ میں پیدا کردی ہے، انھوں نے مذہب، خدا، علم انسانی، عقل و عشق جنون و حکمت وغیرہ تمام مسائل کو بڑے حسین شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک طرف وہ جبر مطلق کے قائل ہیں، دوسری طرف انسان کو عمل پر اکسا کر خدا کے مقابل آنے اور کائنات

بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ خدا جانے بہ یک وقت جوشؔ بت پرست و بت شکن دونوں کیسے ہو جاتے ہیں۔ اِن کا کہنا ہے۔ ؎

اے محرمانِ کہنہ و اے دوستانِ نو — ایک وضع پر نہیں ہے مرے ولولوں کی لو
کعبے کا نور ہوں تو کبھی بتکدے کی ضو — گرتی ہے گاہ برف نکلتی ہے گاہ لو
دریا ہوں ایک مقام پہ رہتا نہیں کبھی
اک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں کبھی

خود اپنے متعلق ایک جگہ کہتے ہیں ؎

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں — پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زبان سے "میں" نکلتا ہے ندیم — اس پردے میں کائنات کہتا ہوں میں

کائناتیت اس شاعرانہ جذبے کا نام ہے جو شاعری کو حدوں سے نکال کر لامحدود بناتا ہے، جہاں انسان اپنی جگہ پر منفرد و اکیلا نہیں رہتا بلکہ اس کا غم اس کی خوشی غرضکہ اس کے تخیل و افکار تک کائناتی و آفاقی بن جاتے ہیں یہی کائناتیت جوشؔ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

دورِ جدید میں جوشؔ کی اہمیت اس لیئے اور بھی زیادہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ہر دور میں اردو ادب پر چھائے رہے اور دو متضاد چیزوں کو باہم ملاتے رہے، رومانی، قومی، اور اشتراکی شاعری سب میں ان کا باغیانہ رنگ بدستور قائم ہے، جدید اردو شاعری کے میدان میں وہ بڑی وسعت کے ساتھ پھیلے ہوے ہیں، اس عرصہ میں اکثر شاعر ابھرے اور ختم ہوگئے۔ کچھ اپنی منزل سے ہٹ کر راہ میں گم ہو گئے لیکن جوشؔ کا قدم آگے ہی بڑھتا رہا اور ہر دور میں وہ دوسروں سے آگے ہی رہے۔ سچائی کو انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا، خواہ یہ سچائی خود ان کے واسطے نقصان دہ ثابت ہوئی ہو لیکن سماج کے لیئے اچھی ثابت ہوئی، ہر ایک سے جوشؔ نے اپنی ہمنوائی کرائی ہے۔ کبھی نرمی سے زیادہ تر سختی سے، سب سے بڑی بات یہ کہ وہ فن پر ہمیشہ محنت کرتے رہے اور ترقی پسندی کو اپنے لیئے بہتر سمجھا۔ غزل کا جوشؔ کی شاعری میں ایک خاص مقام ہے اپنی غزل کے لیئے ان کا خیال ہے:-

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے

حالانکہ جوشؔ نے غزل کو اسکی روایات سے بہت علیحدہ نہیں کیا اور نہ کوئی نیا اسلوب ہی نکال سکے، ان کی رندی و سرمستی میں جاگیردارانہ شان ہے جس میں بدمستی زیادہ ہے، غزل میں جوشؔ کا وہ تخیل بھی نہیں ملتا جس نے نظموں میں ایک اچھوتی اور نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ پرانی ترکیبوں، مثلاً حسنِ مجاز، غارتگرِ ایمان، شمیمِ عنبر فشاں، گلشن بکف، ہجر و وصال، شمع پروانہ، کاکل پیچاں، قفس و صیاد وغیرہ کا استعمال انھوں نے بھی کسی نئے انداز سے نہیں کیا، اکثر تو سچے جذبات بھی ان خوبصورت تراکیب کے باوجود مصنوعی و مبالغہ آمیز معلوم ہونے لگتے ہیں۔ حالانکہ جوشؔ کی نظم کو دیکھ کر یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو الفاظ یا تراکیب پر قدرت حاصل نہیں، الفاظ کا اتنا بڑا صناع شاذ ہی کوئی دوسرا پیدا ہو مگر نظموں کی سی ندرت جوشؔ کی غزلوں میں نہیں دکھائی دیتی غزلوں میں ان کے دل کی سرشاری اور حسن کی لطافت انگیز مستیاں ملتی ہیں۔ شباب کے جذب و کیف اور مستی و بیخودی کو انھوں نے بارہا نظم کیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ انکے شباب کے ہر تقاضے شاعری میں اپنا

جواب نہیں رکھتے ؎

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی ÷ کہ بدمستی بہ از زہد ریائی

جوش کی غزل میں وہ پرکیف رنگینی و مدہوشی نہیں ہے جو ان کی رومانی نظموں کی سب سے بڑی صفت ہے ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے ؎

مکر ہی ٹھہری تو دل کو فکر توبہ کیوں نہ ہو ÷ خاک ہونا ہے تو خاک کوئے جاناں کیوں نہ ہوں
زیست ہے جب مستقل آوارہ گردی ہی کا نام ÷ عقل والو پھر طواف کوئے جاناں کیوں نہ ہوں
جب نہیں مستوریوں میں بھی گناہوں سے نجات ÷ دل کھلے بندوں غریق بحر عصیاں کیوں نہ ہوں
جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہل خرد ÷ لذت پیمان یار سست پیماں کیوں نہ ہوں

جوش کا حقیقی کمال شعر گوئی نظم کے میدان میں ظاہر ہوا ہے، نئی و دلآویز تشبیہات کا استعمال بڑے عاشقانہ انداز میں کرتے ہیں، ان کی نظم "گل بدنی" میں تشبیہات کا اظہار بڑے ہی دلآویز طریقہ سے ہوا ہے ؎

یہ سایۂ کاکل میں ہے پیشانی رخشاں
یا ظلمت الحاد میں ہے مشعل ایماں
یہ سانس ہے یا پیرہن یوسف کنعاں
ہاتھوں پہ یہ رخسار ہیں یا رحل پہ قرآں

لب ہیں کہ خم چشمۂ شیریں سخنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

عارض پہ ہے یہ حال کہ حوروں کا ہے ڈیرا
آنکھوں میں ہے یہ کفر کہ ایمان ہے میرا
پلکوں کی یہ چھاؤں ہے کہ برکھا کا اندھیرا
رخ پر یہ لٹیں ہیں کہ دھواں دھار سویرا

قامت پہ یہ مکھڑا ہے کہ نیزے کی انی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

جوش کی شاعری میں گرمی ہے ولولہ ہے، رقص حیات ہے، ان کے طنز میں بھی قدیم و جدید کا اتصال ملتا ہے، واعظ پران کو یہ اعتراض ہے کہ وہ شرابی کیوں نہیں ہے، شراب کو وہ سب کچھ سمجھتے ہیں، خمریات کا عنصر ان کے یہاں بہت ہے، بعض بعض جگہ جوش نے رندوں کی لغزشوں اور ساقی کی بے پروائیوں کے پردے میں زندگی کے رموز و حقائق بیان کر دئے ہیں اور زندگی کو سدھارنے بنانے کی کوشش کی ہے ان کی نظم "ساقی سے خطاب" میں موجودہ زمانہ پر کافی طنز کیا گیا ہے، ان کی چشم مشاہدہ نے جس چیز کو بھی دیکھا اسے اپنی زندگی کی زینت بنالیا، اپنی انفرادیت سے وہ نظموں میں شعاس و روانی کے ساتھ ہی تیکھاپن بھی پیدا کر دیتے ہیں، زبان و بیان پر جوش کو بڑی قدرت حاصل ہے ان کے بیان کی شوکت و لطافت نے اردو زبان کو آرائش و سجاوٹ کے نئے نئے سامان دیئے ہیں، ان کے ذہن میں اقبال کا فلسفۂ خودی اور پیام عمل، اشتراکیت کی مزدور دوستی، عوام پسندی اور قدیم و جدید تشکیل غرض کہ ہر چیز کا امتزاج ہے، یہی جوش کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس وقت، ہمارا یہ عظیم شاعر پردے

بقیہ صفحہ ۲۳ پر

پروفیسر امیر چند بہار

اقبال اور اس کا عہد

پر ایک نظر

جموں و کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی شاعری پر تین لکچر دئے تھے جن کا مجموعہ اس کتاب کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعروں میں اقبال ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کا دوسری زبانوں کے عظیم ترین شاعروں سے موازنہ کیا جا سکتا ہے لیکن بد قسمتی کہ مشرق کے اس عظیم ترین شاعر پر کج نظر تنقید کی گئی ہے اور اسے تنگ نظری کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ آزاد نے اقبال کی شاعری کو اس کے صحیح پس منظر میں پیش کرنے کی ایک بامقصد کوشش کی ہے۔

ناقدوں میں ایک عام رجحان یہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ کسی شاعر کی پیچ در پیچ شخصیت کے ایک پہلو کو الگ کر کے اسے ممتاز اور اہم ترین خصوصیت گردانتے ہیں۔ اس طرح اس اجزاء کی کثرت میں کھو کر وحدت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر اقبال کی رنگا رنگ شخصیت کو اس کے آئینہ میں دیکھا جاتا تو اس پر علیحدگی پسند یا تنگ نظری کا الزام ہرگز نہیں لگایا جا سکتا بلکہ انہیں بھی قومی بلکہ ٹیگور جیسے بین الاقوامی شاعر کا درجہ دیا جاتا شاید ماضی قریب کی کچھ سیاسی تبدیلیوں نے ہماری نظر کو ماند کر دیا تھا لیکن اب بھی وقت باقی ہے کہ ہم اسے قومی شاعر مان کر اس کو سر بلند کریں۔

پہلے باب میں "اقبال کی شاعری کا ہندوستانی پس منظر" کے عنوان سے اقبال پر لگائے ہوئے فرقہ پرستی کے الزام میں کی پُرزور تردید کی گئی ہے اور اسے محب وطن شاعر ثابت کیا گیا ہے۔ اسرار خودی سے ارمغان حجاز تک ایک سرسری جائزہ قاری کو اقبال کی حب الوطنی کا یقین دلا دے گا۔

یہ مفروضہ کہ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال ایک مختلف انسان تھے اور ۱۹۰۸ء کے بعد سے ان کے دل و دماغ پر صرف اسلام کی حکمرانی رہی، پائیدار نہیں، مصنف نے ان حالات کا جائزہ لیا ہے جن میں کہ شاعر نے یورپ اور اسلامی ملکوں کے اپنے دورے کے بعد ان میں تحریک پیدا کی کہ اپنے ہم مذہب لوگوں میں اتحاد اور بیداری پیدا کریں لیکن ایک شاعر کے کسی مخصوص مذہب کا پیرو ہونے اور اس کا ہم نوا ہونے کے ساتھ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس کا دائرہ محبت محدود ہو جائے۔ چنانچہ "جاوید نامہ" جو اقبال نے یورپ سے واپسی کے بعد لکھا ہے اس بات کا ثبوت ہے۔ اس میں گوتم، شیوجی، بھرتری ہری اور ہنرو خاندان کا جس احترام کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ ان کے خلاف شور مچانے والوں کو خاموش کرنے کے لیے کافی ہے۔ مثنوی "اسرار و رموز" میں بارہا گنگا، ہمالیہ اور ان سے منسوب ہندو داستانوں کا ذکر کیا گیا ہے "ضرب کلیم" میں اقبال فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کرتا نظر آتا ہے۔ "ارمغان حجاز" میں وہ غلامی سے بیزار نظر آتا ہے اور اپنے ہم وطنوں کو اس کے شکنجوں کو

توڑنے کے لئے ابھارتا ہے۔

"اقبال کی شاعری میں تصوف" کتاب کے دوسرے باب کا عنوان ہے جس میں فاضل مصنف نے نہایت متوازن اور جچے تلے انداز میں بحث کی ہے۔ اس مقالے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اقبال کوئی صوفی شاعر نہیں لیکن اس کی شاعری میں تصوف کے بنیادی نکات اور اس کی کیفیات موجود ہیں۔ ادبی دنیا میں اقبال کی ادبی فکر کی رفعت پرواز مسلمہ ہے۔ اس کا جمالیاتی انداز بھی کچھ کم نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کی شاعری کی تاریخ میں اقبال ایسے باشعور مفکر کم ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بنیادی طور پر وہ ایک شاعر ہے اس کی شاعری میں تخیل و تفکر کا جو حسین سنگم ہے وہ کسی اور کے ہاں نہیں ملتا۔

مصنف نے اقبال کے فلسفۂ خودی اور اس کی شاعری میں تصوف کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آزاد نے اقبال کے اسلامی تصور کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اقبال کی نظریاتی تنگ نظری کے شبہات کو دور کر دیتا ہے۔ اس دقیق باب کی تفہیم کے لئے تصوف کی ابتدائی باتوں سے واقفیت ضروری ہے۔

تیسرا باب ہے "اقبال اور اس کا عہد" جس میں آسمانِ شعر کی عظیم ترین شخصیتوں کے مقابلے میں اقبال کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ اقبال نے حالی کی روایت کو آگے بڑھایا اور "ادب برائے ادب" کے نظریہ کے تابوت میں آخری کیل جڑ دی۔ اس کی شاعری میں وہ لفظی تصنع نہیں جو اردو شاعری میں جذام کے مانند پھیل چکا تھا۔ اس میں زندگی کی تنقید اور اس کی شرح ہے اس کے ہاتھوں میں شاعری سماجی اصلاح اور روحانی معراج کا ایک ذریعہ بن گئی۔ ٹیگور کے مانند وہ ایک رشی تھا جس نے زندگی کی نئی قدریں پیش کیں۔

اقبال کا ہر شعر اس کی انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ جی کے چیسٹرٹن نے ایک عظیم شاعر اور ایک معمولی شاعر کے درمیان فرق کو یوں واضح کیا ہے۔ عظیم شاعر وہ ہے جو وہی کہتا ہے جس پر وہ یقین رکھتا ہے۔ معمولی شاعر ایسا نہیں کرتا۔ کسی بھی معیار سے اقبال کو جانچیں وہ ایک عظیم شاعر ہے۔ بیشتر اردو شعراء کے برعکس اور براؤننگ کے مانند وہ ایک کٹر رجائیت پسند ہے اس نے کہیں بھی مایوسی کا دامن نہیں تھاما بلکہ ہمیشہ امید، جرأت اور خوشی کا ترانہ گایا جو ہمارے ذہنوں کو بلند کرکے ہمیں اپنی پستی سے اٹھا لیتا ہے اور اسی میں اقبال کی آفاقیت پنہاں ہے۔

اس کے بعد مصنف نے موجودہ دور کے درجہ اول کے شاعروں پر اقبال کے اثر کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ نہ وہ مغرب کا اندھا مقلد تھا اور نہ تنگ نظری کا اسیر تھا۔ اس نے مغربی تمدن کی ہر اچھی چیز کو قبول کیا، اس کا تجزیہ کیا، اسے جذب کیا اور اسے اہل مشرق کے آگے پیش کیا تاکہ وہ اپنے نظریۂ زندگی کو اس سے ہم آہنگ کریں اور اس طرح وہ ٹیگور کے مانند مشرق و مغرب کا ایک نادر سنگم ہے۔

یہ کتاب جگن ناتھ آزاد کا پہلا اہم نثری کارنامہ ہے ویسے ادبی دنیا میں ان کی شہرت ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے ہے۔ عہدِ حاضر کے دوسرے اور بڑے شاعروں کے مانند آزاد کی شاعری پر بھی اقبال کا گہرا اثر پڑا ہے اور یہ کتاب اس عظیم شاعر سے فیض یابی کا ایک ہدیۂ تشکر ہے جس نے اردو ادب میں ایک نیا عہد پیدا کیا۔

یہ کتاب خلوص اور شعور کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اس سے اقبال کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ متاثر کن اور مکمل ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ اقبال کے اشعار، ان کے خطوں کے اقتباس وغیرہ پیش کئے گئے ہیں جن سے اس کی قدر و قیمت دوچند ہو گئی ہے یہ ایک ادبی شخصیت کا اپنے سرچشمہ فیض کی خدمت میں ایک خراجِ عقیدت ہے اور پھر بھی اندھی شخصیت پرستی کا اس میں

کوئی نشان نہیں ملتا۔ کتاب میں کہیں بھی اقبال کو ایک ایسا پیامبر بنا کر نہیں پیش کیا گیا جس سے کہ کوئی غلطی ممکن نہ ہو اور جس سے ہمیشہ ہم خیال ہو سکیں اس میں ایک شاعر کا غیر متعصب تجزیہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اگرچہ تعصبات جلد ختم نہیں ہوتے لیکن اس تصنیف کے بعد اقبال کی شاعری کے تعلق سے اب ایک واضح تر تصویر قائم ہونے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کتاب کی قیمت ایسی کچھ زیادہ نہیں ہے اسی لیے یقین ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہونچ سکے گی۔

بعض ناقدین جگن ناتھ آزاد کو کسی کسی مقام پر پہلو بچا کر نکلتا ہوا محسوس کریں گے اور ان کو بعض متنازعہ پہلوؤں پر خاموش پائیں گے اور بعض صورتوں میں ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج سے اتفاق کریں گے لیکن تمام کے تمام اس کتاب کو خیال آفریں اور دلچسپ ضرور پائیں گے۔

بقیہ سلسلہ صفحہ (۱۹)

اردو ادب میں منفرد و ممتاز بے مثال اور شہرت کا مالک ہے، اس کا شاعرانہ فن بھی انفرادی نمود و کمال کے ساتھ نمایاں ہوا ہے پورے ملک اور پوری نسل کے لیئے ان کے یہاں ایک پیغام ہے اور اس پیغام کے وہ علمبردار ہیں۔ اسی خصوصیت نے اس کو اپنے دور کا نمائندہ شاعر بنا دیا اور اسی نے درجہ مقبولیت و شہرت بخشی، جوش نے اُردو شاعری کو بہت کچھ دیا، حوصلہ، عزم، بلندی ترقی، یہی سب چیزیں جوش کی عظمت کی ضامن ہیں۔

بزرگ لوگ

راجندر ناتھ رہبر

اڑا دے آہنی یخ بستہ چہرے، طبعِ جہاں دیدہ
بڑی سنجیدہ و سنگین ماتھوں کی متانت ہے
نظر میں ایک پُر اسرار و ہیبت ناک خاموشی
زباں کو طنزیہ تقریر فرمانے کی عادت ہے

یہ کب فریاد سنتے ہیں کسی مجبورِ الفت کی
انہیں تو دل کے شیشے توڑنے میں لطف آتا ہے
عقابی آنکھ جب اٹھتی ہے ان کہنہ بزرگوں کی
محبت کا دلِ معصوم اکثر کانپ جاتا ہے

یہ سیم و زر کے بندے کب دلوں کی قدر کرتے ہیں
ہلا دیتے ہیں بنیادِ محبت دبدبے ان کے
دلوں کے گلستانوں پر محبت کی امیدوں پر
گرا کرتے ہیں بجلی بن کے اکثر فیصلے ان کے

عزیزوں کو رعایا جان کر کرتے ہیں سلطانی
کسے ہمت کہ ان کے سامنے اپنی زباں کھولے
لبوں کی ایک جنبش سے بدل دیتے ہیں تقدیریں
جھپٹ پڑتے ہیں ان کے سامنے کوئی اگر بولے

کوئی مجبور ہو کر جب بغاوت پر اُترتا ہے
تو کہتے ہیں وقارِ خانداں پر حرف آئے گا
کوئی اے کاش اِن ناداں بزرگوں کو یہ سمجھائے
وقارِ خانداں شیشہ نہیں جو ٹوٹ جائے گا

یہ کُہنہ مشرقی تہذیب کے خود ساختہ پُتلے
بھرے بازار میں تہذیب کو نیلام کرتے ہیں
سمجھ کر لاڈلوں کی شادیوں کو ساعتِ نادر
یہ سوداگر وصول اچھے سے اچھے دام کرتے ہیں

کوئی اے کاش اِن سفاک انسانوں کو سمجھائے
تجارت کے ترازو میں نہ تولیں جنسِ الفت کو
محبت اک مقدس جذبۂ ایثارِ انساں ہے
نہ بیچیں چند تحفوں کے عوض روحِ محبت کو

"بیادِ دکن"

الطاف شاہد

بہارِ گل و نسترن چھوڑ آئے
بیاباں کی خاطر چمن چھوڑ آئے

وہ گہوارۂ علم و فن چھوڑ آئے
وہ دیدہ ورانِ سخن چھوڑ آئے

ادیبوں کا مولد، فقیہوں کا ماویٰ
ولی کا وہ پیارا وطن چھوڑ آئے

جہاں سوز تھا ساز تھا زندگی تھی
ہم ایسی بھی اک انجمن چھوڑ آئے

مصائب کا جو آسرا بن گئی تھی
وہی زلفِ سایہ فگن چھوڑ آئے

جسے عمر بھر ہم نے سجدے کئے تھے
اسی کی جبیں پر شکن چھوڑ آئے

نہ غنچوں میں نزہت نہ پھولوں میں نکہت
رمِ آہوانِ ختن چھوڑ آئے

اک اجڑے ہوئے سے بیاباں کی خاطر
بہارِ چمن در چمن چھوڑ آئے

نہ آوا ز دے جذبۂ سر فروشی
کہ ہم تابِ دار و رسن چھوڑ آئے

وہ جس سے ہر اک اہرمن کانپتا تھا
وہی تیشۂ بت شکن چھوڑ آئے

زباں صرفِ غیبت نظر وقفِ عصیاں
طبیعت کا وہ سادہ پن چھوڑ آئے

مداوا تھی جو یورشِ رنج و غم کا
وہی ہم شرابِ کہن چھوڑ آئے

تجھے کیا خبر اے نگارِ بہاراں
کہ ہم کتنے سرو و سمن چھوڑ آئے

نفس شعلہ ساماں نگاہیں ہیں ویراں
تجھے جب سے ارضِ دکن چھوڑ آئے

حسیں گنبدوں سے جو ابھری تھی شاہد
سحر کی وہ پہلی کرن چھوڑ آئے

واہی

مشاعرہ سے پہلے اور بعد

منعقد ہونے کو ہے اک صحبتِ شعر و سخن — آج سارے شہر میں اک زندگی، اک جوش ہے
بزم میں آنے سے پہلے شاعرانِ خوش نوا — ہیں وہ مہماں جنکی خاطر، وا، ہر اک آغوش ہے
ہاتھ باندھے پھر رہے ہیں پیش و پس والنٹیر — دل میں خدمت کی لگن سے اک خروش و جوش ہے
کوئی پانی بھر رہا ہے غسل دینے کے لیئے — اور کوئی صابن بدست و تولیہ بر دوش ہے
صاحبِ خانہ بھی ملتے ہیں کچھ اس انداز سے — گویا سر آنکھوں پہ ان حضرات کی پاپوش ہے
چائے بسکٹ سے تواضع ہو رہی ہے خوب خوب — جشن کا ہنگام ہے اک شورِ نوشا نوش ہے
کوئی تاڑی باز ہے تو اسکو تاڑی بھی ملی — آ گئی ٹھرے کی بوتل گر کوئی مے نوش ہے
آتے ہی پنڈال میں پھولوں کی یوں بارش ہوئی — لوگ یہ سمجھے کہ ڈائس مرقدِ گلپوش ہے
ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں سامعین و حاضرین — رعب سے شاعر کے مجمع سر بسر خاموش ہے
شعر کی صحبت ہوئی با قاعدہ جس وقت گرم — ہے کبھی ہلڑ کبھی محفل سراپا گوش ہے

ایک ایک مصرع پہ سر دھنتی ہے ساری انجمن
داد دیتے دیتے کوئی معتقد بے ہوش ہے

بعدِ محفل آ گیا ہے انقلابِ نو مگر — شمع کی گردش رکی ہے، انجمن خاموش ہے
اب نہ وہ خاطر تواضع ہے نہ وہ آؤ بھگت — اب تو بختِ شاعراں اُتری ہوئی پاپوش ہے
حال یہ ہے، کس نمی پرسد کہ بھیّا کون ہو — آپ ہیں اور کس مپرسی کا کھلا آغوش ہے
نیند سے آنکھیں ہیں بوجھل ڈگمگاتے ہیں قدم — بھوک سے آنتوں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے
ایک کی ٹوپی ہے غائب ایک کا چشمہ ہے گم — نذرِ محفل ایک شاعر کی نئی پاپوش ہے
چل دیئے والنٹیر حضرات اپنے اپنے گھر — سرد چولھے کی طرح ٹھنڈا دلوں کا جوش ہے
کس سے مانگیں جا کے اب اپنے کرایہ کی رقم — حد تو یہ ہے بانئ محفل بھی اب روپوش ہے
سوئے اسٹیشن چلے ہیں سر جھکائے سب کے سب — ہاتھ میں بندھنا ہے اور سامان بارِ دوش ہے
راستے میں کوئی رکشا یا کوئی ٹمٹم نہیں — رات کا پچھلا پہر ہے زندگی خاموش ہے

اتنی دُرگت پر بھی شاعر کی طبیعت رات دن
شعر خوانی کے لیئے رختِ سفر بر دوش ہے

خورشید احمد جامیؔ

غزل

اب اُس جگہ ہے ایک پُراسرار سا دھواں
کل تھیں جہاں بہار کے خوابوں کی بستیاں

تخلیق کے جمال کو بڑھ کر نہ چھو سکیں
تنقید کے مزاج کی بیمار تلخیاں

محوِ خرامِ ناز ہے یادوں کی چاندنی
نکھرا ہوا ہے اور بھی گیتوں کا آسماں

لکھتا ہوں خونِ دل سے غموں کی بیاض میں
اک جانِ آرزو کے تبسم کی داستاں

تو ہی غمِ حیات ذرا سوچ کر بتا
ہم میکدے سے دور ملے تھے کہاں کہاں

گذرا ہے یادِ صحبتِ یاراں کا قافلہ
ملتے ہیں دل کی راہ میں جلتے ہوئے نشاں

آئے تھے راستوں میں فسانوں کے شہر بھی
کیا جانے کھو گیا ہے غمِ زندگی کہاں

کچھ لوگ زندگی کے تعاقب میں تھے۔ مگر
پہنچے تری پناہ میں اے دشتِ بیکراں

فن کا نیا شعور زرافشاں سہی۔ مگر
جامیؔ کھڑا ہوا ہوں مزاروں کے درمیاں

امتیاز علی عرشی

غزل

سمجھے ہوئے ہیں عشق کو ہم راز دیکھنا
نادانیٔ جنوں کا یہ انداز دیکھنا

شائد کہیں نفیرِ بہاراں ہے نغمہ سنج
مدھم سی آرہی ہے اک آواز دیکھنا

ہے جلوہ زارِ حسن میں ہلچل مچی ہوئی
اپنے جنونِ شوق کا اعجاز دیکھنا

پھر اوج پر ہے طالعِ منصور ان دنوں
پھر ہو رہا ہے عشق سرافراز دیکھنا

طبعِ جفا پسند خدا کی پناہ ہے
ہم جانتے ہیں سوز کو بھی ساز دیکھنا

چھوٹے نہ اپنی خاک سے وہ بام و در ہنوز
دل بستگیٔ انجمنِ ناز دیکھنا

جم کو بھی آج ناز ہے جامِ سفال پر
عرشی، نیازِ فقر کا اعزاز دیکھنا

راگھویندر راؤ جذب عالم پوری

غزل

وادی یہ کونسی ہے گزرا ہوں میں کہاں سے — شامل ہوں کارواں میں بچھڑا ہوں کارواں سے

دونوں کو لطف آئے سرمستیٔ بیاں سے — کچھ میں کہوں نظر سے کچھ وہ کہیں زباں سے

تھرا گئے دو عالم جس بارِ سر گراں سے — منسوب ہو چکا وہ آدم کی داستاں سے

اتنا سما رہا ہے سر میں جنونِ منزل — خود راستہ بدل کر نکلا ہوں کارواں سے

یہ اپنی خامشی کا اعجاز میں نے دیکھا — تھی بات میرے دل کی نکلی تری زباں سے

گردش میں آ چکا ہے افسوس دورِ ہستی — رفتار میں ہوں کوسوں آگے میں آسماں سے

آنکھوں میں آسماں کی شعلے مچل رہے ہیں — تنکوں کو ساتھ لے کر اڑنا ہے آشیاں سے

جلوؤں میں جذب ہو کر اب کے یہیں رہوں گا — اٹھوائے کون دیکھو مجھ کو اس آستاں سے

دل کا جو مدعا ہے دل ہی میں اس کو سمجھیں
اے جذب کیوں ادا ہو وہ غیر کی زباں سے

جوہر میر

غزل

کام پڑا تو ہم نے یہ جانا کوئی کسی کے کام نہ آئے
وقت سے پہلے جو سمجھے تھے لوگ وہی دانا کہلائے

قدم قدم پر ٹھوکر کھائی قدم قدم پر پتھر پائے
جانے ہم سے پہلے کتنے لوگ ترے کوچے میں آئے

تنہائی میں چپ چپ رہ کر ہم نے خود ہی کانٹے بوئے
جس پہلو کروٹ بدلی ہے یاد دل کے غنچے کھلائے

پھول سے چہرے افسردہ ہیں روشن آنکھیں پژمردہ ہیں
جانے کیسی نگری ہے یہ کوئی بھی اس کا بھید نہ پائے

آؤ کسی کا ہاتھ بٹائیں آؤ کسی کا بوجھ اٹھائیں
اپنے غم اپنا دیکھے ہیں اپنے غم تو راس نہ آئے

سوچ کے دریاؤں کا پانی لحظہ لحظہ بڑھنے لگا ہے
دنیا ڈوب چکی ہے لیکن کوئی بھی غم کی تھاہ نہ پائے

بھول بھی جاؤ پچھلی باتیں تم بھی مجرم ہم بھی مجرم
کانٹے بو کر تم پچھتائے پھول اُگا کر ہم پچھتائے

اب نہ کریدو دل کی باتیں یہ جنگل کی آگ ہے یارو
پھیل گئی تو جل جاؤ گے بجھ نہ سکے گی لاکھ بجھائے

عادل منصوری

ایک ایک کر کے شاخوں سے سب پھول جھڑ گئے
نم کیا گئے کہ سارے گلستاں اجڑ گئے
آنکھوں میں پھر رہے ہیں ابھی تک وہ ہمسفر
اک دو قدم جو ساتھ چلے اور بچھڑ گئے
ہم لڑکھڑا گئے ہیں ذرا سے تو کیا ہوا
وہ زلزلے اُٹھے ہیں کہ پربت اُکھڑ گئے
چرچا بہت تھا چاند ستاروں کے حُسن کا
س ماہ وش کے سامنے سب ماند پڑ گئے
عادل وہ کل ہر ایک سے ہنستے ہوئے ملے
یکن تمہارا نام لیا تو بگڑ گئے

عابد مناوری

آہ گو بامِ اثر تک پہنچی
رات پھر بھی نہ سحر تک پہنچی
زندگی بیٹھ گئی ہے تھک کر
جب تری راہ گذر تک پہنچی
جذبۂ دشت نوردی توبہ
خاک اُڑ کر مِرے گھر تک پہنچی
جھک گئیں اہلِ نظر کی نظریں
بات جب حسنِ نظر تک پہنچی
کس تکلف کو لیئے اُئے عابد
وہ نظر میری نظر تک پہنچی

رحمت امروہوی

یہ غلط ہے ایک مرکز پہ ٹھہر جائے گی رات
بس یہی ہوگا کہ آئیگی سحر جائے گی رات
آخرش ہوگی نمودِ صبح اے دل غم نہ کر
دم اندھیروں کا گھٹے گا اور مر جائیگی رات
خیر مقدم کو سحر ہر گام پر آجائے گی!
جس طرف گزریں گے ہم منھ پھیر کر جائیگی رات
آپ آجاؤ تو پھر یہ طولِ شب کچھ بھی نہیں
پَر لگیں گے وقت کے پل میں گذر جائیگی رات
رات کا اب تذکرہ چھوڑو بھی رحمت سو رہو
رات تو آوارہ ٹھیری در بدر جائیگی رات

مرزا اظہر افسر

ڈرامہ

سنگھار میز

افراد : منوہر
حامد
پریا
ا ۔ دوست

(دھیمے سروں میں دور کہیں پیانو بج رہا ہے)

منوہر ۔ حامد .. میں نے کہا .. اسنیہ .. حامد ... بیرا

ا ۔ یس سر

منوہر ۔ ذرا ان صاحب کو تو بھیجنا ۔ وہ جو ادھر کھڑے ہیں، کروٹن کے گملوں کے پاس

ا ۔ وہ جو کتھئی سوٹ میں ہیں

منوہر ۔ نہیں، نہیں، وہی طرف جو ہیں سلیٹی سوٹ میں ۔

حامد ۔ ہلو

منوہر ۔ ہلو، بات کیا ہے بڑے کھوئے کھوئے سے ہو ۔ کسے ڈھونڈ رہے ہو ۔ بیٹھو ۔

حامد ۔ ذرا دواشی کو دیکھ رہا ہوں

منوہر ۔ دواشی، دواشی کون ۔ وہ جو فوج میں بھرتی ہوگیا ۔ ؟

حامد ۔ نہیں نہیں وہ نہیں ایک اور ہے ۔

منوہر ۔ اور ہے ۔ کون ۔ کوئی دفتر کا دوست ہے ۔

حامد ۔ نہیں بھئی دفتر دفتر کا کوئی دوست نہیں

منوہر ۔ پھر کون ہے آخر !

حامد ۔ اوہو ۔ ایک آکشنر ہے ۔

منوہر ۔ آکشنر، اپنا گھر بیچ رہے ہو گیا ۔ حامد ! میں کیا پوچھ رہا ہوں تم سے ۔

حامد ۔ نہیں بھائی مجھے اپنا گھر بیچنا ہے نہ نیا گھر خریدنا ہے، یہ جو سامنے آکشن ہال دکھائی دے رہا ہے نا ۔ اس آکشن والے سے مجھے ملنا ہے ۔

منوہر ۔ اوہ

حامد ۔ وہاں کسی نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی ہوٹل کی طرف آیا ہے ۔ بس اسی کو دیکھ رہا تھا کہ تم نے بلوالیا ۔

منوہر ۔ لیکن کرنا کیا ہے اس سے مل کر ۔ بیرہ ۔

ا ۔ یس سر

منوہر ۔ کافی لاؤ ۔ کچھ کھاؤ گے ؟

حامد ۔ نہیں نہیں کچھ نہیں کھاؤں گا ۔ کافی بھی نہیں پیوں گا ۔

منوہر ۔ پھر چائے پیو گے ؟

حامد ۔ نہیں نہیں بھائی کچھ نہیں پیوں گا ۔ بس ایک گلاس پانی پی لوں گا ۔ آدھ گھنٹے سے اس شخص کو تلاش کر رہا ہوں مگر اس کا پتہ ہی نہیں اور آکشن گھنٹے سوا گھنٹے بعد شروع ہونے والا ہے

منوہر ۔ کچھ چھڑوانا ہے آکشن سے ؟

حامد ۔ ہاں

ا ۔ صاحب چائے یا کافی ۔

حامد ۔ بھئی چائے ہی کافی ہوگی تم جاؤ ۔

منوہر ۔ کیا لینا ہے آکشن سے ؟

حامد ۔ ایک سنگھار میز

منوہر ۔ سنگھار میز !

حامد ۔ ہاں بھئی ۔ اس سنگھار میز نے تھکا مارا ہے مجھے ۔ کئی مہینوں سے ٹالتا رہا لیکن معلوم ہوتا ہے اب ہوئی نہیں ٹلے گی

منوہر ۔ کیا مطلب ؟

حامد ۔ مطلب یہ کہ آج سنگھار میز خریدنا ہے اور کسی طرح

خریدنا ہے۔ دفتر کے ایک ماتحت کلرک نے اس دواشی کے نیچے کا پتہ دیا تھا کہ میں آکشن ہونے سے قبل ہی کچھ سستے داموں سنگھار میز کو خرید لوں گا۔

منوہر۔ کوئی سنگھار میز دیکھا تم نے، یعنی کوئی سنگھار میز اس سامان میں بھی جو آکشن ہونے والا ہے۔

حامد۔ ہاں ہاں ایک کیا کئی ہیں۔

منوہر۔ کوئی پسند بھی آیا؟

حامد۔ ہاں ایک سنگھار میز بہت اچھا ہے۔

منوہر۔ دام پوچھ لیئے ہوتے کسی سے وہاں۔

حامد۔ بھئی وہ ہراج ہونے والا سامان ہے۔ قطعی قیمت کون بتا سکتا ہے، ویسے میں نے ایک آدمی سے اندازہ تو معلوم کیا ہے۔

منوہر۔ کیا اندازہ ہے

حامد۔ کہتا تھا ایک سو پندرہ روپے سے کم میں نہیں جائیگا۔

منوہر۔ (رک رک کر) ایک سو پندرہ روپیہ۔

حامد۔ ہاں

منوہر۔ میری ایک بات مانوگے۔

حامد۔ ہاں ہاں کیوں نہیں بولو۔

منوہر۔ ایک سو پندرہ روپیہ کیا صرف پندرہ روپے میں بھی سنگھار میز ملے تب بھی نہ لینا۔

حامد۔ صرف پندرہ روپیہ (ہنستا ہے) تم نے دیکھا نہیں سنگھار میز تو بہت قیمتی ہے بھئی

منوہر۔ ہوگا مگر میرا تو اب یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ سنگھار میز مفت ملے تب بھی نہ لوں۔

حامد۔ بڑے دنوں بعد آج یہ چھٹی کا دن ملا ہے۔ مجھے کہ میں سنگھار میز خریدوں اور تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔

منوہر۔ تمہیں چھٹی کا دن اس لیئے ملا ہے کہ تم اپنے عزیز دوست منوہر سے اس ہوٹل میں اتفاقاً ملو اور ہم تم مل کر تفریح کا کوئی شاندار پروگرام بنائیں۔ "چلو "آشیرواد" چلتے ہیں، کچھ شغل رہے گا۔

حامد۔ نہ نہ بھئی مجھے معاف کرو۔ میں چلا۔

منوہر۔ سنو سنو، تو۔ خیر نہ چلو "آشیرواد" کافی تو پیتے جاؤ۔

حامد۔ تم کہہ رہے تھے اب میرا یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ سنگھار میز اگر مفت ملے تب بھی نہ لوں۔

منوہر۔ ہاں ہاں

حامد۔ اس اب سے کیا مطلب ہے۔

منوہر۔ اب سے؟

حامد۔ ہاں، یعنی پہلے کبھی تم نے سنگھار میز خریدنے کے حامی تھے اور اب .... (قہقہہ لگاتا ہے) بڑی دیر میں سمجھے۔ ہاں پہلے کبھی میں نے سنگھار میز خریدنے کے حق میں تھا، بڑا چاؤ تھا، ایک پیارا سا سنگھار میز ہو اس لیئے نہیں کہ تمہاری بھابی سنگھار میز خریدنے پر مصر تھیں بلکہ خود میں چاہتا تھا کہ پریا کے کمرے میں ایک حسین سنگھار میز ہو وہ اس سنگھار میز کے آگے بیٹھی اپنی آرائش کیا کرے

منوہر۔ (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) اب تم اصرار ہی کرتے ہو تو سنو، بڑے بڑے فلسفیوں نے شاید سچ ہی کہا ہے کہ عورت کے لیئے سب سے زیادہ اہم شئے ہے سنگھار۔

حامد۔ ہاں عورت کو روز ازل سے سنگھار کی خواہش مند رہی ہے۔ آدم و حوا کے زمانے میں بھی خوب خوب سنگھار ہوتا رہا ہے۔ اگر آج کی عورت بھی اپنے حسن کی زیبائش میں روز افزوں اضافہ چاہتی ہے تو کوئی نئی بات نہ ہے۔

منوہر۔ یہ تو سچ ہے بھائی، لیکن عورت کو سنگھار میز کے آگے بیٹھ کر ہمیشہ یہ گمان رہتا ہے کہ اس کا سنگھار ادھورا ہے۔ گھنٹوں گذر جائیں۔ وقت کی رفتار تھم جائے مگر آخری بار بھی اٹھتے اٹھتے وہ یہی سوچے گی کہ اب بھی کسر باقی رہ گئی ہے .... اور تمہاری بھابی۔

حامد۔ بھابی۔ ہنستا

منوہر۔ ہاں اس کا سب سے بڑا سنگھار تو میرے سنگھار میز
گھرے جانے کے کوئی ہفتہ بعد ہوگا۔ گردھر کو تو تم جانتے
ہونا، میرے کہنے پر اس نے ایک امدادی شو کے تین
ٹکٹ خرید لیے۔ میرا، تمہاری بھابی پریما کا اور خود کا۔
شاید اتوار کا دن تھا......... (جھنکار)
(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)
منوہر۔ دیکھو تو کون ہے۔ میں ذرا شیروانی پہن لوں۔
پریما۔ (ہنستی ہے) بہت اچھا (دروازہ کھولتی ہے)
ا ۔ نمستے۔ بھابی جی،
پریما۔ نمستے آئیے۔ (کسی قدر بلند آواز میں) گردھر ہیں۔
منوہر۔ اوہ، گردھر ہو۔ آؤ بھئی آؤ۔ بڑی جلدی چلے آئے۔
ا۔ جلدی نہیں کہو بہت دیر سے آیا ہوں۔ میں تو اور
جلدی آ جاتا لا سکتا وہ تو راستے میں، لیکن خیر ان باتوں
کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تیار ہونا۔
منوہر۔ تیار۔ نہیں، نہیں تیاری تو ابھی کرنی ہے۔
ا ۔ تیاری کرنی ہے۔ پھر یہ شیروانی وغیرہ۔
منوہر۔ (ہنستا ہے) اوہ۔ ہاں ویسے ہی میں نے احتیاطاً پہن
لی تھی۔
ا ۔ احتیاطاً کیا مطلب؟
پریما۔ (ہنستی ہے) مطلب میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔ یہ یہی کرتے
ہیں، کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور انہوں نے باہر جانے
کے لیے کپڑے پہنے۔
ا۔ باہر جانے کے لیے کپڑے پہنے۔ وہ کیوں۔
پریما۔ بتاتی ہوں۔ (ہنستی ہے) دروازہ کھولنے پر جب کوئی
ایسا آدمی ہوتا ہے جس سے یہ ملنا نہیں چاہتے تو کہتے
ہیں۔ بھائی بڑے بُرے وقت آئے میں تو باہر جا رہا
ہوں، پھر کسی وقت آ جانا۔
ا ۔ (ہنستا ہے) بھئی واہ خوب۔ لیکن اگر کوئی ایسا آدمی
آ جائے جس سے ملنا ضروری ہو تب!

پریما۔ تب یہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں۔ بھائی بڑے
موقع سے آئے، میں ابھی ابھی گھر لوٹا ہوں آؤ، بیٹھو،
یہ کہہ کر آہستہ آہستہ باہر کے کپڑے شیروانی وغیرہ اتارتے
جاتے ہیں (قہقہے)
ا ۔ خیر صاحب یہ تو ہوگا۔ منوہر نے آپ کو بتایا کہ نہیں۔
پریما۔ کیا
ا ۔ یہ کہ ہمیں ایک امدادی شو دیکھنے جانا ہے۔
پریما۔ ہاں، ہاں، کہا تو ہے،
ا ۔ اور پھر آپ ایسے ہی کھڑی ہیں۔ جائیے نا۔
منوہر۔ کہاں جانے کو کہہ رہے ہو بھائی۔
ا ۔ بھابی کو تیار تو ہو جانے دو۔
منوہر۔ تیار۔ تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ پریما تم اس وقت تیار نہیں ہو
پریما۔ اوہ ہوں۔ واہ کیا اس طرح چلکر مجھے اپنا شو کروانا ہے
میں ابھی آئی۔ آپ لوگ بیٹھئے نا (جھنکی بجانی ہی) ابھی۔
منوہر۔ سنو، سنو پریما میں کہہ رہا تھا۔
پریما۔ آپ میرے ساتھ کہاں چلے آ رہے ہیں جائیے گردھر سے
باتیں کیجئے۔ میں ابھی آئی ایک منٹ میں جائیے۔
منوہر۔ میں نے کہا زیادہ دیر نہ ہو۔ بس بس ہو چکے ہیں۔
پریما۔ ہاں ہاں نہیں ہوگی دیر، میں ابھی آئی ایک منٹ میں۔
ا ۔ بھئی کیا ہوا۔
منوہر۔ تم بیٹھو آرام سے ابھی آتی ہیں تمہاری بھابی۔
ا ۔ میں نے کہا ۱۰ - ۲۵ ہو چکے ہیں کئی دنوں بعد صرف
ایک شو کے لیے۔ پھر آتی ہے۔
منوہر۔ لو سگریٹ پیو۔
ا ۔ دیا سلائی جلاتا ہے۔
منوہر۔ پریما۔
پریما۔ (کسی قدر ناصلے سے) ابھی آئی
منوہر۔ کھٹی لو سنو بارہ بج چکے ہیں اب نکلو چلو۔
پریما۔ ابھی آئی ایک منٹ میں تم اتنے میں گردھر سے باتیں کرو

ا ۔ آج بھابی جی نہیں چلیں گی۔ ابھی وہ منہ ہاتھ دھوئینگی، بال بنائیں گی۔ پھر اپنے کپڑے نکالیں گی، شلوار، شرٹ، ساری۔ اس کے ساتھ یہ بلوز اور اس کے بلوز کے ساتھ یہ ساڑی، پھر کپول، نکلس اور سینڈل کے جوڑے الگ ہیں۔ ....

منوہر۔ (پکارتا ہے) پریما

پریما۔ (اسی فاصلے سے) ابھی آئی۔ ایک منٹ میں۔

ا ۔ منوہر۔

منوہر۔ ہاں

ا ۔ تم نے یہ سنگھار میز کب خریدا ہے۔

منوہر۔ بتاؤ تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ اِدھر وقت نکلا جا رہا ہے

ا ۔ صرف سات منٹ باقی ہیں۔

منوہر۔ تمہاری کار تو تین منٹ میں ہمیں تھیٹر پہنچا دیگی

ا ۔ ہاں پہونچا دیگی مگر اُس وقت جب آپ تین منٹ پہلے گھر سے نکلیں گے۔

منوہر۔ پریما

پریما۔ ابھی آئی بس ایک منٹ

منوہر۔ لو سگریٹ پیو۔

ا ۔ (لمبا سانس لیتا ہے) شاید آپ میرے اس جلتے ہوئے سگریٹ کو نہیں دیکھ رہے ہیں، بھئی اب تو میں نہیں ٹھیر سکتا۔ تم اپنے انتظار میں خود بھی شو کھوؤ گے اور مجھے بھی کہیں کا نہ رکھو گے۔ میں تو چلا۔

منوہر۔ سنو۔ سنو۔

ا ۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ آپ یہاں اطمینان سے بیٹھے گیارہ گھنٹے سنا کیجئے جو ابھی کچھ دم میں بجنے والے ہیں۔

منوہر۔ (بیزارگی کی انتہا پر پہونچکر) پریما

ا ۔ میں کہتا ہوں چلو ورنہ منٹ میں اتنی اچھی پکچر سے ہاتھ دھوو گے۔ چلو۔

منوہر۔ اور تمہاری بھابی۔

ا ۔ اونہوں، انہیں کوئی اور فلم دکھائیں گے۔ چلو۔ چلو بھی

منوہر۔ پریما

ا ۔ میں کہتا ہوں، کیوں چیخ رہے ہو۔

منوہر۔ ارے ارے چل رہا ہوں بھائی۔ میری آستین تو چھوڑ دو۔ اوہ میں گر پڑوں گا (زور سے موٹر کار کا دروازہ بند کرنے کی آواز۔ کار کی آواز قریب آکر گذر جاتی ہے۔ ساز، ناچ کا کوئی گیت)

منوہر۔ یار تم نے تو غضب کر دیا۔ پریما کیا سوچتی ہوگی۔ وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی ہوگی۔ ڈرائنگ روم تک آئی ہوں گی اور جب اور جب اس نے مجھے اِدھر اُدھر نہ پایا ہوگا تب۔ تب اس نے کیا سوچا ہوگا۔

ا ۔ سوچا ہوگا کہ میں نے بڑی دیر کی۔

منوہر۔ یار کچھ اچھا نہیں ہوا۔

ا ۔ کیا اچھا نہیں ہوا۔

منوہر۔ یہی کہ شو کے لیے تیار ہوئی پریما کو ہم وہیں چھوڑ آئے اور اکیلے اکیلے ہی ....

ا ۔ آخر میں کہتا ہوں بھائی جی کا تم کبتک انتظار کرتے۔

منوہر۔ کچھ دیر تو اور ٹھیر جاتے۔

ا ۔ جی ہاں پھر آتے ہی کیوں۔

منوہر۔ میرا دل گھر جانے کو نہیں چاہتا۔

ا ۔ یہ۔ یہ بات کی ہے تم نے کام کی، چلو پہلے کیفے "رم جھم" چلتے ہیں پھر۔ پھر اور کہیں چلیں گے۔

منوہر۔ نہ، نہ خدا کیلئے گھر چلو۔ سیدھے گھر۔ جانے پریما کیا سوچتی ہوگی۔

(موٹر روک لی جاتی ہے۔ قدموں کی آواز)

ا ۔ بھائی جی۔ کہاں ہیں۔ یہاں تو نہیں ہیں۔

منوہر۔ اپنے کمرے میں ہوگی (پکارتا ہے) پریما

پریما۔ ابھی آئی ایک منٹ میں

ا ۔ اوہ یعنی ابھی تیاری ہو رہی ہے۔

منوہر۔ اب رہنے بھی دو پریا۔

پریا۔ رہنے دوں ۔ کیا مطلب

ا ۔ بھئی میں تو چلا۔

منوہر۔ شو ختم ہوگیا۔ پریا

پریا۔ ختم ہوگیا۔ مگر تمہیں کیسے معلوم۔

منوہر۔ کیسے معلوم کیا۔ میں خود جو شو دیکھ کر آرہا ہوں۔

پریا۔ کیا ...... کیا کہا تم نے۔ تم شو دیکھ کر واپس ہوئے ہو۔

منوہر۔ ہاں

پریا۔ ہاں۔ (جیسے کچھ کہہ رہی ہو چوری اور سینہ زوری)

منوہر۔ ہاں، ہاں، ہاں! ۔ کیا کرتا۔ مجبور ہوگیا تھا۔

پریا۔ مجبور ہوگئے تھے۔ یعنی میرے بغیر تم شو دیکھ آنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اتنی ہمت۔

منوہر۔ سنو تو بھئی پریا، کیا کرتا۔ گردھر کھینچتا ہوا لیکر چلا گیا۔

(چیزیں کھینچ کھینچ کر مارنے کی آوازیں۔ چھوٹے چھوٹے پاؤڈر کے ڈبوں اور ڈھکنوں کا شور)

منوہر۔ سنو سنو۔ پریا یہ کیا کررہی ہو۔ ارے ارے کوئی چیز لگ جائیگی مجھے۔ ادھر دیکھو۔ وہ ڈبہ پھینک گیا۔ پریا۔ ٹوٹ جائیگا وہ۔ کیا کرتی ہو پریا۔ پریا۔

(شور، ہنگامہ)

فرض صاحب بڑی گھمسان کی تاریخی لڑائی ہوئی اور نتیجہ یہ کہ ...... کہ ......

حامد کہ ...... ۔

منوہر۔ کہ سنگھار میز اب کاٹھ گودام میں پڑا ہے۔

حامد۔ کاٹھ گودام میں۔

منوہر۔ ہاں اگر چاہتے ہو تو لیلو۔ بُرا نہیں ہے۔ تھوڑی سی مرمت کرواکر کام میں لاسکتے ہو۔ میں تمہیں مفت میں دیدونگا خدا کی قسم، ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ سنو سنو کہاں بھیے

حامد۔ بس اب مجھے چھٹی دو۔

منوہر۔ آکشن ہال نہیں جاؤ گے۔

حامد۔ لعنت ہے اس آدمی پر جو تمہاری زندگی سے سبق نہ لے۔

منوہر۔ سنو سنو سنو۔ حامد (قہقہہ لگاتا ہے) (ساز) فیڈ آؤٹ۔

آندھرا پردیش کا چھٹا سال

آندھرا پردیش نے پچھلے پانچ سال عملاً دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی مدت کامیابی کے ساتھ ختم کرلے ہیں۔ دوسرے منصوبے کے تحت ریاست کے ترقی خرچ کا پروگرام ابتدائی تخمینے سے لگ بھگ ۴ کروڑ روپے زیادہ رہا۔ ریاست کے چھٹے سال میں بھی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے پوری پوری توقع ہے کہ تیسرے منصوبے کا نصب العین یعنی (۳۰۵) کروڑ روپے کے خرچ کا پروگرام پورا ہو جائیگا۔ ناگرجن ساگر کے عظیم پراجکٹ پر پچھلے سال [illegible] کروڑ روپے ابتدائی تخمینے کے مقابلے میں تقریباً ۱۰ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔

● ریاست کی تیز تر صنعتی ترقی کیلئے ۳۰ کروڑ روپے کے منظورہ سرمایہ سے جو انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کیا گیا ہے اس نے مختلف پروجکٹوں سے متعلق تحقیقات کا کام شروع کردیا ہے تاکہ صنعتیں جلد از جلد [illegible] ان کا مجموعی تخمینی خرچ (۱۹۶۵ء) کروڑ روپے رہا

● چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے قیام اور ترقی کیلئے بھی ایک [illegible] کارپوریشن قائم کیا گیا ہے جس کیلئے حکومت نے (۲۰) لاکھ روپئے سرمایہ حصص کے تحت اور (۲۵) لاکھ روپئے قرض کے طور پر دئے ہیں۔ ● اسٹیٹ [illegible] کارپوریشن [illegible] کام شروع کیا ہے اب ضلع کرنول میں [illegible] کی کارروائیاں دسمبر ۱۹۶۱ء میں شروع ہوئیں اور [illegible] کارپوریشن نے [illegible] دوسری معدنی چیزوں [illegible] گرانائٹ وغیرہ کے ذخائر کی تلاش اور [illegible] ● کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کو (۴۴۴) [illegible] (۸۳۴۱۰) مربع میل کے رقبے میں واقع ہیں اور جن کی آبادی [illegible] کروڑ ہے۔ ریاست میں (۳۰۸) بلاک قائم ہوچکے ہیں۔ ● لازمی ابتدائی تعلیم [illegible] کے علاوہ اسکولوں کے بچوں کیلئے دوپہر کے کھانے کے انتظام [illegible] کی جاچکی ہیں۔ [illegible] عوام کا والہانہ تعاون [illegible] ہوگا۔

جاری کردہ۔ ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش۔

محمد اکبرالدین صدیقی

وقار خلیل

نقد و نظر

(تبصرے کے لیئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں (ادارہ)

دیمک کی کہانی ۔ عبدالبصیر خاں۔ ناشر انجمن ترقی اردو علی گڈھ ۱/۱۶ کراؤن صفحات ۱۴۴ قیمت عال ہمارے ادب میں سائنسی عام فہم کتابوں کی بے حد کمی ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو نے اس سلسلے میں چیونٹی از ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، ہمارے پھول از پروفیسر سعید الدین، پانی کی کہانی اور آبدوز اور سرنگ شائع کی ہیں۔ زیر نظر کتاب "دیمک" دیمک کی پوری زندگی کی کہانی ہی نہیں بلکہ اس میں اس کے نقصانات اور اس سے بچنے کے طریقوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ دیمک سے خطرہ ہر جگہ ہے اس لیئے ہر شخص کو جو خطرہ محسوس کرتا ہو۔ یہ کتاب پڑھنا چاہیئے۔ کتاب نہایت سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں ہے قیمت بھی زیادہ نہیں

اختر شیرانی کی نظموں سے انتخاب ناشر۔ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ۔ ۱/۱۶ کراؤن صفحات ۴۶ قیمت ۷۵/ پیسے

اختر شیرانی نے ہماری شاعری کو اپنے لطیف اور پاکیزہ خیالات سے ایک نیا حسن اور نئی آن عطا کی، رومانی اشعار کہنا آسان نہیں۔ اکثر شعرا شائستگی اور تہذیب کے کنارے پہونچ کر پھسل جاتے ہیں اور رومانوی تصورات کا اعلیٰ معیار باقی نہیں رہنے پاتا۔ اختر کے یاس ہیں یہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ وہ کہیں بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کا کلیات کافی ضخیم ہے اسی لیے انجمن کی طرف سے انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ لیکن اختر سے جو حضرات دلچسپی رکھتے ہیں ان کی سیری نہیں ہوسکتی اور انتخاب آخر انتخاب ہی ہے۔ جس کا انحصار زیادہ تر شخصی پسند پر ہے۔ تاہم انجمن کی کوشش کامیاب ہے۔

یاس یگانہ چنگیزی کی غزلوں سے انتخاب واجد حسین یاسؔ یگانہ چنگیزی ہمارے ادب کے معتوب شعرا میں ہیں جنھیں غالب سے بغض للہی رہا۔ ساری زندگی حیدرآباد کے اضلاع میں رجسٹرار کی حیثیت سے گذاری۔ مشاعرے کی محفلوں میں بھی اپنے آپ کو غالب کا چچا سمجھتے رہے۔ غزل کے قدیم اسکول سے متعلق رہے۔ کلام میں شائستگی اور تہذیب کے جوہر دمکتے ہیں۔ انہیں محاوروں کے استعمال اور بندشِ الفاظ کا خاص سلیقہ تھا۔ نمونتاً صرف ایک غزل کے چار شعر ملاحظہ ہوں۔

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا ؎ پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا ؎ مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا
دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہمان ؎ وہ آنسو کیا پیئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا
اسیرو شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے ؎ مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

سخنِ مختصر

معین احسن جذبی۔ ناشر انجمن ترقی اردو مسلم گڑھ۔ ڈیمی سائز صفحات ۵۰ ٹائپ کی طباعت قیمت عالی۔

جذبی عصر حاضر کے شعراء میں کافی بلند مقام رکھتے ہیں" سخن مختصر" ان کے چند غزلوں اور چند نظموں کا بہت مختصر مجموعہ ہے۔ وہ بہت کم کہتے ہیں لیکن جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ بہت غور و فکر کے بعد کہا ہوا ہوتا ہے اس لیئے کلام بہ ضخامت کمتر اور بہ قیمت بہتر ہوجاتا ہے "سخن مختصر" اسم بامسمیٰ ہے۔ لیکن اسی اختصار میں وہ پتے کی باتیں کہہ گذرتے ہیں۔ وہ زندگی کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں ماحول کو پرکھتے ہیں اور اپنے تجربات کو شعر کا قالب عطا کرتے ہیں۔ دل میں درد و سوز گداز بھی ہے اور اس کے اظہار کا سلیقہ بھی۔ چند اشعار پیش ہیں۔

ہر قدم آگے بڑھانے کے لیے خون کی بھینٹ ٭ ایسے بھی اے غم دل کتنے مقام آئیں گے
نہ جانے کوئی منـــزل نور بھی ہے ٭ کہاں تک چلیں ظلمتوں کے سہارے
آج بھی کلیوں کے رخسار سے اڑجاتا ہے رنگ ٭ آج بھی پھول ملول و نگراں ملتے ہیں
چمن پہ گذری سوگذری مگر یہ کیا کم ہے ٭ کہ فاش ہوگئے جھوٹی بہار کے آئین

گل نغمہ (گیتا نجلی)

مترجمہ عبدالعزیز خالد ناشر مطبوعات مشرق کراچی مجلد صفحات (۲۱۲) قیمت للعہ

خالد کی کئی تخلیقات مثلاً زرداغ دل، زنجیر رم آہو، غزل الغزلات، سرود رفتہ اور سلوی مطبوعات مشرق سے شائع ہوچکی ہیں۔ اور مطبوعات مشرق نے ان تمام کتابوں کو خوب صورت ٹائپ میں ظاہری خوبیوں کا اہتمام کرتے ہوئے شائع کیا ہے۔ گیتانجلی کا ترجمہ گل نغمہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے "گیت آنجلی" یا "سوغات نغمہ" ٹیگور کو عالمی شاعر دلانے والی بنگالی زبان کو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش کھڑا کرنے والی کتاب ہے۔ جس کا ترجمہ یورپ اور ایشیا کی اکثر زبانوں میں ہوچکا ہے۔ اردو زبان بھی محروم نہیں۔ اس میں بھی تین چار ترجمے منظر عام پر آچکے ہیں۔ گل نغمہ بھی ترجمہ ہے لیکن ساتھ ہی انہیں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اور ڈبلیو بی۔ ایلیٹس کے مضمون کا ترجمہ رامانند چٹرجی، سرکار گھوس اور ابوالکلام ...... کے مضامین اور ٹیگور کے دو خطوط شائع کئے ہیں ٹیگور پر یک نظر ۱۸۶۱ تا ۱۹۴۱ "سب رس" دیا گیا۔ جو سنی کالج کے رسالے الموسی جلد ۹ شمارہ ۱ و ۲ میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ تمام مضامین کتاب کی افادیت میں اضافہ کرتے ہیں اور گیتانجلی کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے بعد اصل ترجمہ شروع ہوتا ہے۔

ترجمہ منظوم ہے اور ہر نظم کے لیے علحدہ زمین اختیار کی گئی ہے۔ بے قافیہ نظمیں بھی ہیں اور آزاد بھی اس طرح اظہار خیال میں روانی کے لیئے شاعر نے سہولت پیدا کرلی ہے۔ لیکن زبان میں عذوبت و حلاوت کم ہے۔ البتہ گھن گرج فر ہے جو رزمیہ شاعری کا تو ساتھ دے سکتی ہے لیکن گیتوں کے لیئے موزوں نہیں ہوتی۔ گیت بہت ہی سبک سلیس اور لغز ندہ الفاظ چاہتے ہیں۔ فارسی اور عربی کے مغلق الفاظ اردو گیتوں کی روح کا جز نہیں بن سکتے۔

ان کے علاوہ بعض جگہ فارسی ترکیبیں اور روزمرہ اور محاورں کے خلاف الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو قاری کے لیئے کھٹک کا باعث ہوتے ہیں مثلاً کنج کتاب، بر بکا شکما سنگ خارا کو بنا ملبے ملیدہ فرود، اے خداوند رائق و فاتق، صبح بیدق سیمیں۔ عقل بصر پوشش چھینٹ قلمکار، دنا ماوارشعار، عیار شنگول و شنگ، انتظاری کرنا وغیرہ۔ ایسے الفاظ گیت کے بہاؤ اور تاثر میں مانع و مزاحم ہوتے ہیں ہماری ناقص رائے میں ان سے گریز مناسب ہوگا۔

بحیثیت مجموعی خالد صاحب نے ایک شاہکار کو اردو میں منتقل کرکے اور مطبوعات مشرق نے اپنی مشہور زمانہ معیاری طباعت کا ایک اور نمونہ پیش کرکے گرانقدر خدمت انجام دی ہے (ا۔ ص)

شاد کی کہانی شاد کی زبانی
خود نوشت سوانح حیات
خان بہادر مولانا سید علی محمد شاد عظیم آبادی

مرتبہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ صفحات ۲۸۱ سائز ڈیمی قیمت (ﷲ) روپے۔

حضرت شاد عظیم آبادی عصر حاضر کے شعرا میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ کو ہر صنف سخن پر پورا عبور تھا۔ وہ بہت پر گو شاعر تھے۔ سارے ہند و پاکستان میں ان کے سینکڑوں شاگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ مرتب ہندوستان میں شاد کے جانشین سمجھے جاتے ہیں تو جناب حمید عظیم آبادی پاکستان میں شاد اسکول کی نمائندگی فرماتے ہیں۔ ان حضرات نے اپنے استاد کی بجا طور پر خدمت انجام دے کر حق شاگردی ادا کر دیا۔ پروفیسر مسلم نے سوانح حیات مرتب کی اور جناب حمید عظیم آبادی نے میخانہ الہام دوسرا ایڈیشن پاکستان سے شائع کیا۔ آپ نے شاد کے قطعات کا مجموعہ سروش ہستی بھی شائع کیا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے کچھ عرصہ ہوا کہ مکتوبات شاد عظیم آبادی شائع کئے تھے۔ . . . . ایسے ہمہ صفت موصوف ادیب شاعر اور عالم کی سوانح حیات کا منظر عام پر آنا ضروری تھا۔ پروفیسر مسلم نے اس کتاب میں نہ صرف سوانح حیات ہی پیش کی ہے بلکہ جناب شاد کے نظم کی تصانیف سے بھی واقف کرا دیا ہے اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات بھی دی ہے۔ مختلف اصناف سخن کے نمونے بھی دئے اور پرکھی بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ شعر ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب نادر تحفہ ہوگی (ز۔ ص)۔

بصائر (سہ ماہی) ایڈیٹر ڈاکٹر سید معین الحق حق نشان ۔ ۳۰۔ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی (۵) یہ دائرۂ معین المعارف کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ ہے۔ اجرا کی غرض و غایت کے متعلق تحریر یہ ہے کہ

"بصائر کا مقصد اولین یہی ہوگا کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے کارناموں کو صحیح تاریخی پس منظر میں پیش کیا جائے ۔۔۔۔۔ اور ایسا لٹریچر شائع کیا جائے جو پاکستانی قومیت و یکجہتی کے جذبات کو مضبوط کرنے میں ممد ثابت ہو"

ان اغراض کی تکمیل کے لیے بصائر کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ پہلا شمارہ ہے اس میں تاریخ شیر شاہی عباس خاں شروانی کا ترجمہ جس کو فورٹ ولیم کالج کے ایک رکن مظہر علی خاں ولا نے کیا تھا اور جو اب نایاب ہو چکا تھا شامل ہے۔ یہ قدیم چیزوں کو منظر عام پر لانے کا اچھا طریقہ ہے اس سے بہت سی اہم کتابیں جو بیک وقت شائع نہیں کی جا سکتیں چھپ سکیں گی اور زمانہ کی دست برد سے بچ جائے گی۔

اس کے علاوہ غالب اور صہبائی، الزہراوی، فائز دہلوی، کتب خانہ وزیر الدولہ کے نوادر، اردو کی چند قدیم ترین مثنویاں، اور کبیر الاولیا جیسے گرانقدر مضامین شامل ہیں۔ اردو، العلم، فکر و نظر اور نوائے ادب جیسے رسائل کی صف میں بصائر ایک گرانقدر اضافہ ہے (ز۔ ص)

شکارنامہ از حضرت مخدوم ابوالفتح صدر الدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز، مرتبہ مبارز الدین رفعت۔ ناشر حیدرآباد اردو اکاڈیمی، سلطان پورہ حیدرآباد دکن صفحات ۳۶، سائز کراؤن ۱/۱۶ قیمت ایک روپیہ۔

زیر تبصرہ مختصر رسالہ شکارنامہ جو متن، مقدمہ اور حواشی پر مشتمل ہے اردو کے اولین نثر نگار حضرت خواجہ بندہ نواز کی تحریر ہے۔ یہ رسالہ حیدرآباد اردو اکاڈمی کے سلسلہ مطبوعات کی آٹھویں کتاب ہے۔ اولاً مرتب نے بائیس صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے اور آخر میں تین صفحات کی فرہنگ شامل کی ہے۔ مقدمہ میں فاضل مرتب نے شرح و بسط کے ساتھ مصنف اس کی نثر، عہد اور اختلافات تصانیف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس رسالہ شکارنامہ کو بندہ نواز کی تصنیف قرار دینے کا جواز نکالا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بندہ نواز کی کتاب "معراج العاشقین" کو سب سے پہلے حیدرآباد دکن ہی ایڈیٹ کر کے شائع کیا تھا۔ اس رسالہ کو ۱۹۶۰ء

میں دہلی یونیورسٹی کے جواں سال ادیبوں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مقدموں کے ساتھ شائع کیے۔ خواجہ صاحب کی معراج العاشقین کو محققوں نے اردو نثر کی اولین کتاب تسلیم کیا ہے۔ اس طرح یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ اردو زبان کو مستقل طور پر ادبی صورت میں پیش کرنے کی فضیلت صوفیائے کرام کی بدولت حاصل ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ایک غیر مطبوعہ مسودہ مقالہ "اردو زبان اور ادب" وہم قلم کراچی اگست ۱۹۶۲ء کے عنوان سے چھپا ہے جس میں دکنی ادب پر نظر ڈالتے ہوئے بندہ نواز گیسو دراز کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کثیرہ ہیں۔ آپ کی سب کتابیں فارسی یا عربی زبان میں ہیں۔ میں نے ان کی اکثر تصانیف اس خاص نظر سے بالاستیعاب دیکھی ہیں۔ علاوہ معراج العاشقین کے مجھے اور بھی کئی رسالے مثلاً تلاوت الوجود، دُر الاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ وغیرہ ملے جو قدیم اردو میں ہیں اور خواجہ صاحب سے منسوب ہیں ...... قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ان کے فارسی، عربی رسالوں کے ترجمے ہیں جو ان کے نام سے منسوب کر دئے گئے ہیں۔ اسی قسم کی بدعت ہماری زبانوں میں ہوتی آئی ہے"۔ بندہ نواز کے فارسی یا عربی رسائل پر محققین متحد الرائے نظر آتے ہیں۔ دکنی یا اردو ترجموں کے بارے میں مختلف رائیں ملتی ہیں۔ مرتب نے اختلاف آرا اور مخطوطات کا ایک دوسرے سے مماثلت نہ ہونے کا ذکر "مقدمہ" میں کیا ہے اور اس کے رسالہ کے متن کو کتب خانہ روضتین گلبرگہ کے قلمی نسخہ کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس نام کے دیگر مخطوطے جو کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو، کتب خانہ آصفیہ میں ہیں۔ اختلاف متن پایا جاتا ہے۔ جس کی طرف محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے کلمۃ الحقایق" کے دیباچہ میں ضمناً ذکر کر دیا ہے۔ غرض مستقبلِ قریب میں اس بات کا امکان ہے کہ حقایق و معارف آشکار ہو جائیں گے۔

جناب رفعت نے بڑی ہی محنت اور زحمت سے مختصر سے رسالہ "شکار نامہ" کو فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ ایڈیٹ کر کے اردو کشتی کے اس دور میں اولین نثر کے نمونوں سے روشناس کرانے کی صحت مند کوششیں کرنے والے قافلے سے خود کو وابستہ کر رکھا ہے ایسے ہم سفر ہماری زبان و ادب کی پاسداری میں مینارِ نور کی حیثیت رکھتے ہیں

یہ رسالہ اس لیئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کا شمار اردو کی ابتدائی تحریروں میں ہوتا ہے۔ اور زبان کی تدریجی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیئے اس کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ ویسے یہ رسالہ صرف تصوف کے نکات کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ مرتب نے حواشی اور فرہنگ میں زبان کی بہت سی دشواریوں کو آسان کر دیا ہے۔ کتابت، طباعت، دلکش ہے مگر قیمت بہت ہی زیادہ ہے۔ اس کتاب اور ایسی ہی دیگر کتابوں کی زیادہ سے زیادہ نکاسی زبان، ادب اور تہذیب کو فروغ دینے کے لیئے ارزاں ترین قیمت پر فروخت کی جائیں (ر۔ و۔ خ)

بابائے اردو عبدالحق

مرتب عبداللطیف اعظمی، صفحات: ۲۲۰ (مجلد معہ گردپوش) قیمت ۔/۵۰/۴ ناشر ادارۂ فروغ اردو۔ امین آباد لکھنؤ۔

عبداللطیف اعظمی صاحب اردو کے خاموش خدمت گذار اور باسلیقہ فرد ہیں۔ ان دنوں جامعہ ملیہ دہلی کے آرگن "جامعہ" کے مدیر ہیں۔ موصوف نے سب سے پہلے ۱۹۴۰ء میں بابائے اُردو کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر رسالہ "جوہر" کا عبدالحق نمبر شائع کیا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں اشارہ کیا ہے کہ وہ مولوی صاحب کی زندگی ہی میں یہ مجموعہ شائع کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے بعض رفیقوں سے مشاورت بھی کی تھی۔ مگر چند در چند وجوہ کے سبب وہ یہ کام نہ کر سکے اور اب مولوی صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر یہ کتاب شائع ہوئی ہے جو چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب "سیرت اور شخصیت" سے متعلق ہے۔ جس میں سید وحید حسین، اسپیٹ، شیخ چاند مرحوم، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور خود اعظمی صاحب کے مضامین شامل ہیں۔ دوسرا باب "بابائے اردو کے علمی کارناموں" سے عبارت ہے، جسے سات قلمکاروں نے مختلف عنوانوں کے تحت پھیلایا ہے۔ اس میں مولوی صاحب کی مرقع نگاری، اسلوب بیان، تنقیدی تصورات، لغویات، مقدمات، تنقیدات اور تصانیف و تالیفات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اسلوب احمد انصاری، منظور جنگ، ڈاکٹر سید جعفر، پروفیسر حمید الدین، شاہد، نصیر الدین ہاشمی، پنڈت سلطان اور پروفیسر تہور حسین نے مولوی صاحب کے تہہ در تہہ علمی کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ تیسرے باب میں بابائے اردو کے مکاتیب شامل ہیں جو مختلف

دکنوں میں، مختلف ادبی و تحقیقی موضوعات کے تعلق سے لکھے گئے۔ ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر عابد حسین، ہاشمی فرید آبادی، نصیر الدین ہاشمی، آعظمی، سخاوت مرزا اور ڈاکٹر داؤد رہبر وغیرہ کے موصوم خطوط پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ "انجمن اور بابائے اردو" کے زیر عنوان آخری باب میں فاضل مرتب نے غلام ربانی صاحب کا وہ مضمون جو ایک حد تک انجمن کی تاریخ ہو سکتا ہے، دیگر چند تاریخی ماخوذات اور قومی زبان کے تراشوں کی مدد سے مرتب کر کے شامل کیا ہے۔

بابائے اردو نے ایک عظیم ثقافتی رہنما کی مدد سے اردو زبان اور اردو تہذیب کی پاسداری اور فروغ کیلئے آج سے تقریباً نصف صدی قبل جو کام شروع کیا تھا اسے آخری وقت تک بہ ہزار دقت انجام دیا۔ ہمارے معاشرے میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ کسی فرد یا شخصیت نے زندگی کی تمام رعنائیوں اور مسرتوں کو پس پشت ڈال کر یا ٹھکرا کر کسی ایک مخصوص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے روز و شب کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا ہو۔ اردو زبان کی بقاء، اشاعت اور ترقی کے لیے بابائے اردو نے اپنی زندگی قربان کر دی اور تاریخ کے صفحات میں ایثار و قربانی کی لازوال مثال قائم کر دی، بابائے اردو کے نقش قدم پر ہندوستان میں بھی چند ایک افراد اسی لگن اور جوش و خروش کے ساتھ رواں دواں ہیں جن میں جناب ڈاکٹر زور کا نام سر فہرست ہے،

افضل صاحب کی مرتبہ اس کتاب میں چند مضامین کو چھوڑ کر تمام کے تمام مضامین سہ ماہی "مجلس" حیدرآباد کے "عبدالحق نمبر" اور "الشجاع" (کراچی) "جوہر" اور "فکر و نظر" (علیگڈھ) سے لیے گئے ہیں۔ کاش مرتب اس دستاویزی اہمیت کی حامل کتاب میں عبدالحق ببلوگرافی اور "عبدالحق نما" (جو مولوی صاحب کے مطبوعہ مضامین پر مشتمل فہرست) کا اضافہ کرتے تو اسکی افادیت اور بڑھ جاتی (ابن نامی)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء .... فون نمبر ۲۵۲۰۹

جلد ۲۵ شمارہ ۹، ۱۰ ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

سب رس

مجلس ادارت:

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
نصیر الدین ہاشمی
رمن راج سکسینہ
محمد منظور احمد
وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

قیمت سالانہ - ہندو پاک سے: چھ روپے ششماہی: تین روپے

غیر ممالک سے: ۱۰ روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

ہم ادارۂ ادبیاتِ اردو کے اہتمام سے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپا کر
دفتر ادارہ "ایوانِ اردو" خیریت آباد حیدرآباد دکن ۴ (اے-پی) سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

۲۴ اور ۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کی درمیانی رات میں ٹرنک ٹیلی فون کے ذریعے سری نگر کشمیر سے اطلاع ملی کہ ڈاکٹر زور اچانک قلب کی حرکت بند ہونے پر چل بسے
گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

۲۵ ستمبر کی صبح میں ریڈیو اور اخباروں نے اس دلدوز خبر کو آگ کی طرح پھیلا دیا لیکن شاید ہی کوئی متنفس ہوگا جس نے اس خبر پر یقین کیا ہو
نک ٹیلی فون پر بھی یقین نہ آیا۔ شبہ ہوا کہ کسی دشمن نے یہ خبر اڑائی ہے لیکن بات خود فضیلت مآب بخشی غلام محمد صاحب نے کی تھی اور اس کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب کے
صاحبزادے سید تقی الدین صاحب قادری کے ٹرنک ٹیلی فون نے اس کی توثیق کر دی تھی۔ ادارہ کا ٹیلی فون، روزنامہ سیاست کا ٹیلی فون اور ڈاکٹر زور
کے عزیز اقارب کے ٹیلی فون گلوگیر اور رقت آمیز آواز میں دن بھر اس خبر بد کی توثیق کرتے رہے۔ علی الصبح فضیلت مآب بخشی غلام محمد صاحب کی خدمت
میں ٹرنک کال کئے گئے اور تار بھیجے گئے کہ ڈاکٹر صاحب کی لاش کو حیدرآباد بھیجنے کا انتظام فرمائیے مگر شام تک صدائے برنخواست۔ آٹھ بجے شب کو ٹرنک
ٹیلی فون کے ذریعہ اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب خانیار شریف سری نگر ہی میں سپردِ خاک کر دیئے گئے ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مشیتِ ایزدی کے آگے کون دم مار سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد کا مقبرہ بنایا۔ شاندار گنبد تیار کیا۔ ایک پہلو میں اپنے لئے جگہ رکھ
اگست ۱۹۶۲ء میں والد صاحب قبلہ کے فاتحہ سالانہ کے موقع پر درگاہ میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ یہ جگہ میں نے اپنے لئے رکھی ہے
اور بخشی صاحب سے کہدیا ہے کہ میں مروں تو لاش حیدرآباد بھیج دی جائے۔ میں نے کہا کہ آپ ایسے الفاظ کیوں فرما رہے ہیں۔ تو کہا کہ ؎
موت سے کس کو رستگاری ہے ؎ ایک دن آئے گا۔ احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ میں نے کہا ابھی بہت زمانہ باقی ہے۔ فرمایا کہ کون کہہ سکتا ہے، شاید
کسی نے انھیں موت کی اطلاع دیدی تھی لیکن یہ نہیں کہا کہ ارضِ دکن اس آفتاب پُرالتہاب کو نہ سہار سکے گی۔ اور یہ کیسے کہتا جبکہ خدا نے وَ مَا تَدْرِیْ
نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْت فرما دیا ہے۔

ڈاکٹر زور ہم سے بچھڑ گئے۔ ایک عہد تھا ختم ہوگیا۔ اُردو کے لئے لڑنے والا جانباز سپاہی دنیا سے اٹھ گیا۔ ادارہ ادبیات اُردو کا بانی
جس کی روح رواں، اور اس کا محبوب موت کے آغوش میں چلا گیا۔ ایوانِ اُردو جیسی ہندوستان میں اپنی نوعیت کی واحد اور عظیم الشان عمارت
کا معمار ہمیشہ کی نیند سوگیا اور کارکنانِ ادارہ ہی کو نہیں بلکہ اُردو دنیا کو سوگوار کر گیا۔ اتنے سارے کام انجام دیتے ہوئے اس نے کتابیں لکھ
کر ڈھیر لگا دیئے۔ بچپن سے لکھتا رہا اور مرتے دم تک بھی قلم ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ جتنی کتابیں خود لکھیں اس سے کئی گنا زیادہ لکھوائیں اور ادارہ
سے شائع کیں۔ اگر ادارہ وجود میں نہ آتا تو پچاسوں کتابیں طبع ہونا تو دور کی بات ہے معرضِ وجود میں نہ آتیں۔ وہ شاعروں کے بھی وجہ تحریک
اور ادیبوں کے لئے بھی۔ وہ عالموں کے علم و عمل میں بھی گرمی پیدا کرتا اور طالب علموں کا بھی رہنما بنتا۔ اس نے ہزاروں مطبوعات جمع کیں۔ اور ہزاروں
مخطوطات۔ حیدرآباد میں اُردو مخطوطات کا اتنا ذخیرہ اور کہیں نہیں۔ اور ہندوستان بھر کے سارے مخطوطات ملائے جائیں تو حیدرآباد کے مخطوطات
کا پلہ بھاری رہے گا۔ اس سے کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو کے مخطوطات کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے گا۔ مطبوعات اور مخطوطات کے علاوہ
اور مشاہیر کے سینکڑوں خطوط جمع کئے اور انھیں ترتیب دے کر رکھا۔ یہ ساری جمع پونجی ایک شخص کی محنت کا حاصل ہے اور وہ تھے ڈاکٹر صاحب
ڈاکٹر صاحب نے مطبوعات، مخطوطات اور مکتوبات ہی جمع کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اُردو میں جتنے ہتیاروں کے نام ملتے ہیں۔ ان سب

مع کر کے میوزیم قایم کر دیا۔ سواریوں کے جتنے نام اُردو میں ملتے ہیں ان سب کی تصویریں لے کر ایک علٰحدہ البم بنادیا۔ بزرگانِ دین کے کئی شجرے از دم اس دم جو بہ شکلِ طومار لپیٹے ہوئے ہیں میوزیم کے لئے فراہم کئے۔ ادارہ میں تاریخ کا شعبہ قائم کر کے قطب شاہی یادگاروں کو محفوظ کیا، اور قطب شاہی بخیں چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ کتبوں کے چربے لئے۔ سکّے جمع کئے۔ اُردو خط میں عقیق، یشب اور یاقوت پر کندہ مواہیر جمع کئے۔ مشہور خطاطوں کے لکھے ہوئے قطعات اور طغرے حاصل کئے۔ پُرانے اور نئے ادیبوں کی تصاویر سے ایوان کو مزین کیا۔

ادارۂ ادبیات اُردو کے علاوہ آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قایم کیا۔ جہاں ماہرین اور علمائے وقت کی نگرانی میں ریسرچ کا کام انجام پا رہا ہے۔ اس عمارت بنانے کے لئے حصولِ زمین کی کاروائی چل رہی ہے۔ اس کیلئے مائیکرو فلم کیمرہ اور ریڈ جیکٹر خریدا جا چکا ہے اور اسکالرس اس سے ستفادہ کر رہے ہیں لیکن اب ان کاموں کو آگے کون بڑھائے گا۔ ایسا بے جگر اور بے لوث خدمت گزار کہاں سے آئے گا۔ ان کے کاموں میں روڑے اٹکانے والے بہت تھے لیکن یہ خار و خس اس سیلاب کی کہاں تاب لا سکتے تھے۔ وہ ایک سیلاب تھا، پہاڑی ندیوں کا جس نے مخالف ہواؤں کو ہمیشہ ہیچ سمجھا اور روڑے ہی نہیں بلکہ پتھروں اور ڈھوڈوں کو بہاتا گذر گیا۔

" آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے "

دامق بدایونی

جو جلالی زندگی تھی وہ جمالی ہوگئی

(ڈاکٹر زورؔ کی یاد میں)

عقل و دانش جسکے غم میں اختلالی ہوگئی
انجمن کی انجمن سب لاابالی ہوگئی

جنت الفردوس کے پورے دریچے کھل گئے
شکل و صورت اُسکی تصویر خیالی ہوگئی

جن حدوں پر کاہنتا رہتا ہے روحِ کمال
اک کمالی دور کی محفل زوالی ہوگئی

اک رو پہلی چاندنی ہے وادیٔ کشمیر کی!
یہ دعائے مغفرت اُنکی مثالی ہوگئی

دل کے پورے حاشیے پر وہ ہی ضربیں پڑیں
اُن حدوں میں گم تری رشکِ خیالی ہوگئی

غمزدہ اہلِ وطن کی مٹ گئیں رنگینیاں
جو جلالی زندگی تھی وہ جمالی ہوگئی

گھٹ گیا ہے اور رنجیدہ دلوں کا ارتعاش
نبضِ استقلال میں بے اعتدالی ہوگئی

دل کی بستی زندہ ارمانوں سے خالی ہوگئی
ہر رگِ عشرت سمٹ کر انفعالی ہوگئی

کسقدر دامقؔ وہ رخشِ زندگی تھا تیز گام
جس سے آسودہ دلوں کی پائمالی ہوگئی

حبیب ابراہیم بی اے (عثمانیہ)
متعلم سرینگر یونیورسٹی

ڈاکٹر زورؔ کے آخری لمحات

ڈاکٹر زور نے زندگی بھر ولولے، جوش اور عزم کا اظہار کیا اور ثبوت دیا ہے لیکن پچھلے دنوں انکی طبیعت میں وہ گرم جوشی باقی نہ رہی سکے باوجود وہ پوری طرح صحت مند تھے اور جامعۂ کشمیر کی ترقی کے منصوبوں سے کماحقہ طرح دلچسپی لے رہے تھے ۲۳ر ستمبر بروز اتوار وہ دن میں مختلف احباب سے ملاقات کرتے رہے اور اندازہ ہے کہ کوئی ایسا مکان نہ چھوڑا جن سے انکے تعلقات تھے رات میں حسب معمول کھانے بعد اپنے چھوٹے صاحبزادے کو تھوڑی دیر تک پڑھاتے رہے۔ اسکے بعد پھر ½۱۰ بجے کے بعد آرام کرنے چلے گئے۔ ۲۳ر اور ۲۴ر ستمبر یعنی اتوار و پیر کی درمیانی شب تھی رات کے کوئی ½۱۲ بجے تھے ڈاکٹر زور صاحب تکلیف سے کراہنے لگے انکی آواز سنکر بیگم صاحبہ بیدار ہوگئیں ان سے فرمایا کہ بیگم صاحبہ میری سانس رکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے شاید گیس ہوگئے ہیں ریڈ مکسچر پلادیجیے اتنی دیر میں ان کے بڑے صاحبزادہ تقی الدین بھی بیدار ہوگئے ڈاکٹر صاحب کو ریڈ مکسچر پلایا گیا لیکن دل کے عارضہ کا علاج ریڈ مکسچر سے کیا ہوتا تکلیف حد سے زیادہ ہوگئی اور دامن صبر ہاتھ سے چھوٹا تو وہ زیادہ زور سے کراہنے لگے استفسار پر بتایا کہ دل میں اور بائیں ہاتھ میں بے انتہا درد ہے تقی الدین دوڑتے ہوئے ڈاکٹر نائیڈو ڈپٹی ڈائرکٹر آف ہیلتھ، جو حیدرآبادی ہیں کے یہاں گئے انہیں بیدار کیا ڈاکٹر نائیڈو نے کشمیر کے دو اچھے ڈاکٹروں کو فوری بلایا۔ (پوتھوڈائین) کے انجکشن لگادیے گئے لیکن اس سے کوئی افاقہ نہ ہوا کوئی پانچ بجے صبح مارفیا کا انجکشن دیا گیا تکلیف کا وہی عالم تھا تھوڑی دیر میں مارفیا نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور ½۷ بجے وہ سو گئے۔ ڈاکٹر زور صاحب کا سونا تھا کہ سب کے چہرے فرطِ مسرت سے کھل گئے کیونکہ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ عارضۂ قلب کا علاج یہ ہے کہ وہ تھوڑی دیر سو جائیں کوئی دو گھنٹے مکمل آرام کیا۔ جب بیدار ہوئے تو پھر تکلیف سے کراہتے تھے شاید انہیں اپنی موت کا علم تھا وہ بار بار فرماتے تھے کہ

"اب یہاں سے مجھے لے چلو اب حیدرآباد چلے جائیں گے"

دوشنبہ یعنی ۲۴ر ستمبر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا آخری دن تھا۔ دن بھر وہ درد قلب سے تڑپتے رہے بیماری کی خبر حلقۂ احباب میں پھیل گئی پیرزادہ احمد صاحب چیف سکریٹری جموں و کشمیر فوری رہائش گاہ پر تشریف لائے اور یہاں کے صدر دواخانہ کو فون کرکے شہر کے سارے مشہور ڈاکٹروں کو معائنہ کے لیے بلایا۔ کوئی ڈھائی تین بجے کا وقت تھا ڈاکٹروں نے معائنہ کیا اور پھر متفقہ طور پر علاج تجویز کیا۔ ڈاکٹروں کے اس بورڈ میں ڈاکٹر م پرنسپل میڈیکل کالج، ڈاکٹر علی خاں، ڈاکٹر حفیظ اللہ، ڈاکٹر توفیق مرزا، ڈاکٹر کرنل کول، ڈاکٹر نائیڈو ڈائرکٹر آف ہیلتھ اور ڈاکٹر اوتار سنگھ تھے ڈاکٹروں کو چوبیس گھنٹوں کیلئے متعین کردیا گیا۔ مختلف انجکشن دیے گئے لیکن حالت مسلسل بگڑتی جارہی تھی ساڑھے سات بجے رات کا وقت تھا ڈاکٹر زور صاحب غنودگی میں تھے ڈاکٹر نے کہا کہ انہیں آواز دو، انکے صاحبزادہ سید منتی الدین نے انہیں آواز دی دو تین آوازوں پر ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں کھولدیں۔

آنکھوں کے استفسار کا انداز تھا کہ کیا دوا پلانی ہے؟ یہ کہکر ڈاکٹر صاحب نے منہ کھول دیا میں چمچے سے دوا منہ میں ڈالتا رہا شاید دو یا تین ہی چمچے پلائے تھے کہنے لگے کہ "بس اب پیا نہیں جاتا" یہ تھے ڈاکٹر صاحب کے آخری الفاظ اس کے بعد تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر صاحب گہری نیند سو چکے تھے سیدھی کروٹ لیٹے ہوئے تھے سب لڑکے اور بیگم صاحبہ انکے تخت کے اطراف جمع ہوگئے ڈاکٹر انہیں انجکشن دینا چاہتے تھے چنانچہ وہ سرینج لیکر آگے بڑھے لیکن موت نے اسکی بھی مہلت نہ دی اور اس سے پہلے ہی انکی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

ڈاکٹر زور صاحب کی وفات کی خبر رات ہی میں شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ریاست کے وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد صاحب رات ہی میں پرسہ دینے کیلئے تشریف لائے اس اثنا میں شہر کے اعلیٰ عہدہ داران اور ادیب، شاعروں کی کثیر تعداد جمع ہو گئی بخشی صاحب نے بیگم صاحبہ سے مرحوم کی تجہیز و تکفین کے بارے میں کہا۔ سب کی یہی خواہش تھی کہ دکنی تہذیب کے دلدادہ کی تدفین حیدرآباد ہی میں ہو۔ لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے سارے راستے بند ہو گئے تھے ایک صورت ہوائی جہاز کی تھی لیکن موسم کی خرابی اور دھند اور کہر کے جم جانے کی وجہ سے ہوائی جہاز کی پرواز بھی کچھ کم مشکل نہ تھی۔ رات بھر اسی کشمکش و پیچ میں رہے کہ کیا کیا جائے، صبح میں سری نگر ہی میں تدفین کا فیصلہ کر لیا گیا۔

۲۵ ستمبر کی صبح .... میں بیگم صاحبہ کے اس فیصلہ سے پیرزادہ غلام احمد صاحب چیف سکریٹری و حیدر صدیقی چیف آرکیٹکٹ نے وزیر اعظم بخشی غلام محمد صاحب کو واقف کروایا بخشی غلام محمد صاحب نے اپنے بڑے بھائی حاجی صاحب کو فوری خانیار شریف زیارت دستگیر ان پیر غوث اعظم بغدادی میں تدفین کے انتظامات کیلئے روانہ فرمایا۔ خانیار شریف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں صرف برگزیدہ ہستیوں ہی کو دفن کیا جاتا ہے یہ قبرستان کشمیر میں انتہائی متبرک تصور کیا جاتا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے یہاں تدفین بند کر دی گئی تھی۔

واضح رہے کہ اسی قبرستان میں قادری سلسلے کی دو برگزیدہ ہستیاں بھی دفن ہیں۔

دن نکلتے نکلتے اہالیان کشمیر اردو کی اس عظیم شخصیت کے آخری دیدار کیلئے جمع ہونے لگے یونیورسٹی اور کالج سوگ میں بند کر دیئے گئے بارہ یا ساڑھے بارہ بجے تک میت کو غسل دیا گیا اور تابوت میں رکھ کر خانیار کی طرف جلوس جنازہ نکل پڑا جنازہ میں شرکت کرنے والوں میں ریاستی وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد صاحب و دوسرے وزرائے حکومت بخشی رشید صدر نیشنل کانفرنس پیرزادہ غلام محمد صاحب چیف سکریٹری مسٹر والہانیکم پانیکر وائس چانسلر صدر ریاست مہاراجہ کرن سنگھ کی جانب سے سکریٹری حیدر صدیقی چیف آرکیٹکٹ اسلام ڈار صاحب رجسٹرار یونیورسٹی، خوشتر گرامی مدیر ہمیں، مہدی علی جواد زیدی انفارمیشن آفیسر دیگر لکچرار و سپر و فیسرس اور آل انڈیا ریڈیو کشمیر کے عہدہ داران اعلیٰ ضیاء الدین احمد انصاری پرنسپل انجینئرنگ کالج علیگڈھ وغیرہ قابل ذکر ہیں تقریباً دو بجے کے وقت میت کو سپرد خاک کیا گیا بخشی صاحب آخری رسومات کے ختم ہونے تک ٹھہرے ہوئے تھے۔

بخشی غلام محمد صاحب نے ڈاکٹر زور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ہم نے ایک بہترین دوست کھو دیا ہے ہمیں کشمیر میں ان سے اردو ادب کے بہت سارے کام لینے تھے"

سید مراد علی طالع

نذرِ ڈاکٹر زور

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین — بر وفاتِ ڈاکٹر سید غلام محی الدین

وقف کردی عمر خود در خدمتِ علم و عمل — ہمچناں پیدا نشود دیگر درایں سرزمیں

نامِ اُردو زندہ کردی چوں مسیحا در دکن — آفریں بر ہمت تو آفریں صد آفریں

یادگار تو ادارہ[1]، شاہکار ایوان[2] ہم — در جہاں باقیست تا دورِ نظامِ شمس ہیں

اے مصنف گر نئی تو در میان ما ولیے — نامِ تو زندہ است و باقی در میانِ خلق ہیں

السلام اے محسنِ اردو سلام و صد سلام

رحمتِ حق بر تو نازل ہست و اللہ بالیقیں

[1] ادارۂ ادبیات اُردو

[2] ایوان اُردو

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اُس کی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ بانی و معتمد ادارۂ ادبیات اُردو و ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اچانک وفات حسرت آیات (۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء م ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ ۸½ بجے شب) پر ہند و پاک کے گوشہ گوشہ سے تعزیتی تار، مکتوب شعراحباب کے منظوم خراج عقیدت اور تعزیتی جلسوں کی تفصیلات وصول ہو رہی ہیں۔ ذیل میں ہم چند چیزیں شائع کر رہے ہیں (ادارہ)

تعزیت نامے

شری لال بہادر سین سنجر سابق گورنر آندھرا پردیش (چنڈی گڑھ)۔ ڈاکٹر زور کی بے وقت اور اچانک وفات سے مجھے دلی صدمہ ہوا۔ (تار)

نواب مہدی نواز جنگ بہادر گورنر گجرات احمد آباد:۔ ڈاکٹر زور کے سانحہ ارتحال سے بیحد صدمہ پہنچا (تار)

ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ (سابق گورنر یو۔ پی) ڈاکٹر زور کی اچانک موت نے صرف حیدرآباد کی تہذیبی اور علمی زندگی ہی بلکہ اُردو دنیا میں ایسا خلا پیدا کیا ہے جو عرصہ تک پُر نہیں ہو سکے گا۔ اُنھوں نے اپنی زندگی ہی نہیں بلکہ جائیداد کا بڑا حصہ اُردو کے لئے وقف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر بی گوپال ریڈی مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات دہلی:۔ ڈاکٹر زور کا انتقال اردو زبان اور حیدرآبادی تہذیب کا ایک زبردست نقصان ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو اور ایوان اردو اُنکی پر خلوص محنت کی زندہ اور نہ مٹنے والی یادگاریں ہیں۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے منانے کی ابتدا کر کے ڈاکٹر زور نے حیدرآباد کی تہذیبی زندگی میں میل ملاپ کے جذبات کو تازہ خون پہنچایا۔

بخشی غلام محمد وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر:۔ ہم نے ایک بہترین دوست کھو دیا ہے۔ ہمیں کشمیر میں ڈاکٹر زورؔ سے اُردو ادب کے بہت سارے کام لینے تھے۔

شری ڈاکٹر این۔ سنجیوا ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش:۔ ڈاکٹر زورؔ کی اچانک وفات سے مجھے بیحد افسوس ہوا۔ انہوں نے اُردو زبان کے لئے جو اچھے کام شروع کئے تھے اُنھیں جاری رکھا جائے گا۔

نواب میر احمد علی خاں ریاستی وزیر تعمیرات و اوقاف:۔ ڈاکٹر زور کی وفات سے حیدرآباد اپنے ایک نہایت نامور اور قابل قدر فرزند سے محروم ہو گیا۔ انکی اُردو خدمات نہ صرف آندھرا پردیش بلکہ سارے ہندوستان میں قابل قدر تھیں۔ ایوان اُردو اور انکا تاریخی اثاثہ انکی زندہ یادگار رہیگا۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت کی تاریخ کے ممتاز ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڈھ) ڈاکٹر زور میں کام کرنے کی بے نظیر صلاحیتیں تھیں جس کا ثبوت ادارۂ ادبیات اُردو ہے۔ اُنھوں نے اُردو کو بڑی ترقی دی۔ اُنکی ہمت سے دوسروں کی ہمت بندھی رہتی تھی۔ اردو کی ایک وضعدار شخصیت کے اُٹھ جانے کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق جدید لکھنؤ: خدمت اردو از شغف و انہماک کے لحاظ سے بابائے اُردو مرحوم کی جانشینی کا مستحق اگر کوئی فرد ہو سکتا تھا تو وہ زورؔ مرحوم ہی تھے۔ خدا تعالیٰ اُنھیں اپنی کمال مغفرت فرمائے۔ آمین

پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈائرکٹر انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی :۔ ڈاکٹر زورؔ ایک فرد نہیں ایک ادارہ ایک انجمن اور نظام تھے، انھوں نے ادب و ثقافت کی جو پُر خلوص خدمت کی اور جس مستحکم بنیاد پر اپنے اداروں کی بنیادیں رکھیں وہ ہم سب کے لئے شمع ہدایت ہونا چاہئیے۔ میرے اُنکے تعلقات ربع صدی سے زیادہ تھے۔ انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور میں اس ناقابل تلافی غم و نقصان میں برابر کی شریک ہیں۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی (یم، یل، سی، حیدرآباد) ۔ ڈاکٹر زورؔ کا سانحۂ ارتحال اردو زبان و ادب کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اُنھوں نے ادارہ ادبیات اُردو کا پودا اس وقت لگایا جب حیدرآباد سرکاری اعتبار سے اُردو کی سرپرستی کر رہا تھی۔ زور صاحب نے کمالِ دور اندیشی کے ساتھ حیدرآباد میں اُردو کا ایک ایسا مرکز قائم کیا جس نے نہ صرف اس زبان کے قائم رہنے میں مدد دی بلکہ اسے ایک نہایت تاریک دور میں پروان بھی چڑھایا اُنھیں دوسروں سے کام لینے کا لاثانی ملکہ تھا۔ ادارہ کا کتب خانہ اسکے نایاب مخطوطات، کتبے اور رسالے، ایوان اردو کی عمارت یہ سب اسی نامور ادیب و محقق کی مرہون منت ہیں۔ ہم میں سے ایک ایسا شخص اُٹھ گیا ہے جسکا بدل ممکن نہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف صدر مسلم وقف بورڈ آندھرا پردیش :۔ اردو ادب کی ٹھوس اور تعمیری خدمت کر کے اردو کے معیار کو بلند کرنے والی ہستی ڈاکٹر زورؔ کی رحلت اردو ادب کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کرنے والوں کا فرض ہے کہ انکی اہم یادگار سے ادارۂ ادبیات اُردو کو زندہ رکھیں۔

مولانا محمد جمال میاں فرنگی محلی (ڈھاکہ) ڈاکٹر زورؔ کی وفات کی خبر سنکر بیحد صدمہ ہوا (تار)

مولانا سید شاہ محمد الحسینی سجادہ نشین روضہ بزرگ بندہ نوازؒ گلبرگہ شریف : ڈاکٹر زورؔ کی موت سے اُردو زبان و ادب، تاریخ و ثقافت دکن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی مرنجاں مرنج طبیعت نے اُردو کو پھیلنے پھولنے میں بڑی مدد دی تھی۔

مولانا سید شاہ قبول اللہ حسینی سجادہ نشین روضہ خورد گلبرگہ شریف :۔ ڈاکٹر زورؔ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی روح کو سکون پہنچانے کیلئے جہاں ہم دعائے مغفرت کریں وہاں اُردو کی بقا اور ترویج و اشاعت کے لئے بھی کام کرتے رہیں۔

بشپ جان، اے سبحان صدر میتھوڈسٹ چرچ جنوبی ہند حیدرآباد :۔ ڈاکٹر زورؔ نے اردو ادب میں اپنی انمٹ یادگاریں اور ناقابل فراموش احسانات چھوڑے ہیں۔ انکے انتقال کی اطلاع نے غمزدہ کر دیا وہ میرے بہت ہی شفیق اور عزیز دوست تھے۔ انہوں نے اُردو اور تلگو کے جذباتی اتحاد کیلئے اہم خدمات انجام دیں۔

شری باگا ریڈی (ایم، یل، اے) صدر ضلع پرشید میدک و صدر انجمن تحفظ اُردو آندھرا پردیش :۔ اردو زبان کی تاریخ میں ڈاکٹر زورؔ کو نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ منا کر ملک کہ کلچر اور لسانی خیرسگالی کی روایات کو وہ تازہ کر رہے تھے۔ قومی یکجہتی کیلئے ان روایات کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اردو کی خدمت کے ذریعہ انہیں حقیقی معنوں میں خراج عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے۔

جناب خواجہ حسن ثانی نظامی ایڈیٹر منادی دہلی ۔ ہائے زور، وائے اُردو (تار)

جناب شان الحق حقی معتمد ترقی اُردو بورڈ پاکستان (کراچی) اُردو کے ایک عظیم خادم کے ماتم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ کی وفات اردو ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے (تار)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی یونیورسٹی دہلی) ڈاکٹر زورؔ کے انتقال کے ساتھ حیدرآباد کی تہذیب اور ادبی تاریخ کا ایک باب ختم ہو گیا اردو کے سپہ سالاروں میں سے ایک اور جاتا رہا۔

جناب رانا بھگوانداس صدر ادارہ ادبیات اُردو نصیر آباد (پاکستان) اُردو زندہ باد، افسوس ڈاکٹر زورؔ (تار)

جناب خواجہ حمید الدین شاہد سب ایڈیٹر اُردو نامہ کراچی میرے محسن میرے مُربّی، مجھے اپنی اولاد سے زیادہ چاہنے والے میرے روحانی باپ

کی جدائی سے آج مجھے اپنی یتیمی کا شدید احساس ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحب ختم نہیں ہوئے بلکہ ایک عہد ختم ہو گیا۔ پاکستان میں صف ماتم بچھ گئی ہے۔ شان الحق حقی تو اتنے متاثر ہوئے کہ ہاتھ پیر سرد ہو گئے اور انکو انجکشن دینا پڑا۔

ڈاکٹر خلیق انجم (کروڑی مل کالج دہلی) ڈاکٹر زورؔ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے ہی دکنی ادب کو اُردو میں روشناس کرایا۔ ادارہ ادبیات اُردو کا جسم اور روح دونوں وہی تھے۔ تنہا اُنکی ذات تھی جس نے ہندوستان میں اتنا بڑا ادارہ قائم کیا۔

جناب شکیل بدایونی (بمبئی) ڈاکٹر زور کی ذات سے مجھے ایک خاص عقیدت تھی اور اسی بنا پر میں نے اپنا مجموعہ کلام "شبستاں" انھیں کے نام نامی سے معنون کیا تھا۔ اُنکی وفات نے مجھے ایک مخلص اور باکمال دوست سے محروم کر دیا۔

پروفیسر شیخ فرید (جبل پور) ڈاکٹر زور کی موت علم و ادب، تہذیب و تمدن، شائستگی و شرافت، حسن اخلاق و حسن سلوک کی موت ہے۔

جناب اختر رضوانی (جالندھر) زورؔ صاحب ایسا مخلص، نیک فطرت اور ہمدرد انسان ملنا محال ہے، یقین جانئے ہر طرف ایک اندھیرا سا محسوس ہو رہا ہے۔

جناب اعجاز صدیقی ایڈیٹر ماہنامہ شاعر بمبئی: یکم سے ۱۰ ستمبر تک سری نگر میں ڈاکٹر صاحب سے کئی ملاقاتیں رہیں آہ کسے خبر تھی کہ وہ اچانک ہم سے جدا ہو جائینگے، کوئی آثار نہ تھے، میں اُنھیں ہشاش بشاش چھوڑ کر آیا تھا، عجیب سانحہ ہوا ہے۔ یہ اردو زبان و ادب کا عظیم نقصان ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری: ڈاکٹر زور اسم با مسمّٰی تھے جس ہستی کے اتنے زندہ کارنامے ہوں وہ مر نہیں سکتی۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد ریاستی انجمن ترقی اُردو حیدرآباد: اُردو کی خدمت اور میدان عمل میں ڈاکٹر زور نے جو کارنامے انجام دئے ہیں اُنکی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ مرحوم کے فیض تربیت سے کئی شاعر اور ادیب اس سرزمین میں پیدا ہوئے جنھوں نے سرزمین دکن کا نام روشن کیا۔ ڈاکٹر زور نے محدود وسائل کے باوجود ادارہ ادبیات اردو کی شکل میں بے نظیر اور بے مثال ذخیرہ چھوڑا ہے۔

ڈاکٹر راج کشور پانڈے سکریٹری ہندی پرچار سبھا حیدرآباد: ڈاکٹر زور لسانی مسئلے کے تعلق سے بڑے ہی وسیع النظر تھے اُنھوں نے دکنی ادب کو فروغ دینے میں زبردست خدمت انجام دی ہے۔

مولانا سید شاہ غضنفر احمد کامل شطاری: ڈاکٹر زور کے اچانک انتقال سے اُردو زبان بے زور ہو کر رہ گئی۔

رام دیو چودھری کانگریس حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور نے اردو کو نئی قدریں دیں اور دوسری زبان والوں کو بھی اُردو سے قریب کرایا۔

جیا چاری ڈپٹی میئر مجلس بلدیہ عظیم تر حیدرآباد: ڈاکٹر زور نے دکنی ادب سے دنیا کو روشناس کرایا اور اُنکے انتقال سے حیدرآباد دکن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: ڈاکٹر زور کے انتقال سے اُردو زبان اور دکنی ادب کو ناقابل برداشت نقصان پہنچا ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو اُنکے تحقیقاتی کاموں کی یاد دلاتا ہوا ہمیشہ زندہ رہے گا۔

پروفیسر عبدالمجید صدیقی نائب صدر ادارہ ادبیات اُردو: ڈاکٹر زور، حیدرآباد کی بہت بڑی شخصیت تھی وہ علم و عمل کے سمندر تھے۔ وہ صرف عالم بلکہ بذاتِ خود ایک ادارہ تھے۔ اپنے سرمایہ علم اور تنظیمی قابلیت سے اُردو زبان میں تاریخ و ثقافت دکن میں جس قدر روح پھونکی اُسکا صحیح اندازہ لگایا نہیں جا سکتا، مرحوم نے نہ صرف دنیائے علم میں مہتم بالشان خدمات انجام دیں بلکہ اپنی تنظیمی قابلیت سے بے شمار ذہنیتوں کو اُجاگر کیا۔ آج حیدرآباد میں قیمتی شخصیتیں ہیں جو مرحوم کی دلکش صحبت اور ہم نشینی کی بدولت صاحب عمل ہو گئیں۔ زورؔ اُردو کی بقاء کے لئے مر مٹے، انکا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ شریک معتمد ادارہ ادبیات اُردو: اُردو دنیا کے لئے ... ڈاکٹر زور کا انتقال قومی المیہ ہے انکے اُٹھ جانے سے اُردو زبان اور اُنکے کلچر کو شدید ترین نقصان ہوا۔

مولانا ابو یوسف (ایم۔ ایل۔ سی) معتمد ریاستی جمعیۃ العلماء حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور بجائے خود ایک انجمن تھے، انکی علمی و ادبی خدمات کی طویل فہرست ہے۔ اردو زبان اپنے ایک عظیم محسن، زبردست انشا پرداز، اور قابل قدر محقق سے محروم ہوگئی۔

غوث خاموشی صدر مجلس تعمیر ملت حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور کی موت نے دکنی زبان سے اسکے پہلے اور سب سے بڑے حامی اور روشناس کرانے والے کو چھین لیا۔ گولکنڈہ کی سیر کرانے والا کشمیر کی وادیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گم ہوگیا۔

مولانا سید محمد بادشاہ حسینی قادری:۔ ڈاکٹر زور کی موت اس صدی کا بڑا المیہ ہے۔

خواجہ نظام الدین معتمد ریاستی مجلس اتحاد المسلمین:۔ ڈاکٹر زور کی ساری زندگی اردو کی خدمت اور قیادت سے وابستہ رہی وہ اردو زبان پر ہر مصیبت کے وقت سینہ سپر بن جاتے اور اس ناانصافی کا مقابلہ کرتے رہے۔

رائے جانکی پرشاد صدر اردو مجلس حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور کو تاریخ اردو ادب میں سرسید اور مولوی عبدالحق کے مساوی درجہ دیا جاسکتا ہے۔ انکی موت اردو والوں کے لئے اس صدی کا بہت بڑا اور المناک حادثہ ہے وہ سراپا عمل تھے اور اپنے لئے آرام حرام کرلیا تھا۔ ڈاکٹر زور زبردست شہرت اور بلند مرتبہ کے باوجود منکسر المزاج تھے۔ ان میں اور مولانا محمد علی جوہر میں بہت سی باتیں مشترک تھیں دونوں نے اپنے اپنے مقصد کیلئے اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو وقف کردیا تھا اور انھیں موت بھی ملی تو وطن سے بہت دور۔

بیرسٹر عطاء الرحمٰن (ایم۔ ایل۔ اے) حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور کی موت نہ صرف انکے عزیز دوست احباب اور ہزاروں شاگردوں کیلئے بلکہ ہندوستان کے ہر اردو پڑھنے والے کیلئے باعث رنج والم ہے انھوں نے جس انہماک کے ساتھ اردو کی خدمت کی اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے نہ صرف ادب بلکہ آندھرا پردیش کی سیاسی زندگی پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ قدیم ہندو مسلم رواداری کی یاد کو تازہ کرنے کیلئے یوم محمد قلی قطب شاہ کی بنیاد ڈالی، اس روایت کو مستقبل میں بھی جاری رکھا جانا چاہیئے۔

ایم بالا رام مدیر "راج" نائب صدر انجمن تحفظ اردو حیدرآباد۔ آندھرا پردیش اپنی ایک قابل فخر شخصیت اور ملک نے اپنے ایک نامور فرزند کو کھودیا ہے۔ جب تک گولکنڈہ، حیدرآباد اور اردو کا نام زندہ ہے ڈاکٹر زور کی یاد بھی باقی رہے گی۔

پروفیسر محمد پرنسپل اردو کالج حیدرآباد:۔ اردو کی تاریخ میں ولی کو پہلا شاعر مانا جاتا تھا۔ مغل مورخین نے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر قطب شاہی دور کے خلاف تواریخ و تذکروں میں غلط اور گمراہ کن باتیں لکھدی تھیں ڈاکٹر زور نے اردو ادب کی تاریخ میں دکن کو اسکا صحیح مقام دلایا اور دکن کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور انکی تخلیقات کو منظر عام پر لایا۔ ڈاکٹر زور کی کوششوں سے حیدرآباد میں قطب شاہی دور کی کئی یادگاریں محفوظ رہ سکیں۔ ڈاکٹر زور اور مولوی عبدالحق کی وجہ سے دکنی کو مانا جانے لگا اور شمال والے ہمارے ان لفظوں کو جنکا وہ مذاق اڑاتے تھے فخر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، انہی کوششوں کی بدولت اردو ادب کی تاریخ میں چار سو برس کا اضافہ ہوا۔ آج حیدرآباد ہندوستان میں اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اسکا اعتراف دہلی، لکھنؤ اور علی گڈھ والے بھی کرتے ہیں۔ حیدرآباد کو یہ مقام اور رتبہ عطا کرنے میں ڈاکٹر زور کا بہت بڑا حصہ ہے۔

محترمہ زینت ساجدہ لکچرار زنانہ کالج حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور نے سرزمین دکن کو اپنا وطن ہی نہیں اپنا محبوب بنالیا تھا۔ جنت ارضی کشمیر انکے لئے ابدی جنت بن گیا ہے اور انکے مزار پر ہمیشہ پھول برستے رہیں گے۔ ایوان اردو سے انکی شخصیت کی بہت سی خوبیاں جھلکتی ہیں۔

پروفیسر سید علی اکبر، صدر ادارۂ ادبیات اردو۔ ڈاکٹر زور کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ادارۂ ادبیات اردو کا قیام ہے اسکا راز یہ ہے کہ اسکے لئے انھوں نے تادم آخر محنت کی اور دوسروں سے بھی کام لیا دوسروں سے کام لینے کی بے پناہ صلاحیت ڈاکٹر زور میں تھی۔ ادارہ کو انھوں نے سیاسیات سے دور رکھا اور خالص علمی و ادبی کاموں کیلئے مختص کردیا۔ حیدرآباد میں احساس کمتری کے جذبے کو ڈاکٹر زور نے عملی کوششوں اور پے در پے محنت سے غلط ثابت کردکھایا۔ بلاشبہ انہیں کی تنہا کوششوں کا نتیجہ ہے کہ حیدرآباد اردو کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

شری پی۔ ہن گپتا معتمد تعلیمات حکومت آندھرا پردیش:۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد حیدرآباد میں ثقافتی زندگی کا جدید دور شروع ہوا، اردو کو نئی زندگی ملی ذہین و فطین نوجوانوں نے زندگی کو نئی شکل دی، اس نسل کے سربراہ ڈاکٹر زور تھے۔ اردو ادب کو انہوں نے بہت اونچا مقام دلایا۔ یوم ولی، یوم محمد قلی کا اہتمام کرکے اور ٹھوس تصانیف و تالیفات کے ذریعہ قومی یکجہتی کی عظیم روایات کو زور صاحب نے مستحکم بنایا جس سے صدیوں نئی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔ ادارۂ ادبیات اردو، ڈاکٹر زور کا واحد کارنامہ اور ان کا اپنا قائم کردہ انسٹی ٹیوشن ہے۔ دیگر موزوں ساتھیوں کے تعاون سے انہوں نے اس ادارہ کے پلیٹ فارم سے ٹھوس کام انجام دئے۔ نجی تشہیر یا شخصی ترقی کیلئے انہوں نے کبھی ادارہ کو اپنا آلۂ کار نہیں بنایا، وہ جو کام کرتے تھے دل سے کرتے تھے۔ نواب مہدی نواز جنگ کی نظر انتخاب کی داد دینی چاہیے کہ ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے معتمد کی حیثیت سے ڈاکٹر زور کا انتخاب کیا تھا۔ ڈاکٹر زور کی اچانک رحلت سے ہماری قومی اور ثقافتی زندگی کو بڑا دھکا پہنچا ہے۔ اسکا جسقدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

جناب مخدوم محی الدین (ایم، ایل، سی) حیدرآباد:۔ ڈاکٹر زور کی موت نہ صرف دکن بلکہ ساری اردو دنیا کا عظیم ترین نقصان ہے وہ میرے نہ صرف شفیق استاد تھے بلکہ بہت بڑے دوست، رفیق اور ادبی معاملات میں رہنما رہے ہیں۔ انکی شخصیت مرجھائی ہوئی زندگی میں جان ڈالنے والی تھی اور انکے وجود سے اردو والوں میں تازگی اور زندگی پیدا ہوتی تھی انہوں نے دکن کے ادبی کارناموں اور تاریخ اردو ادب میں دکن کے مقام کو تسلیم کروایا وہ ایسے زمانے میں یورپ میں رہے جبکہ عالمگیر تحریک اور فاشزم کا دور دورہ تھا، ادھر ہندوستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ڈاکٹر زور نے یورپ میں طلباء کی تحریک میں حصہ لیا جسکے سبب ان میں وسیع النظری اور روشنی پیدا ہوئی۔ منظم، باقاعدہ اور سائنٹفک طریقوں پر کام کرنے کے ڈھنگ وہ یورپ سے حیدرآباد لے آئے۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ آج کے حالات میں ڈاکٹر زور نے یوم محمد قلی قطب شاہ اور دیہی تہذیب کی عکاسی کرنے والے دکھنی ادب کی ترویج و اشاعت کے ذریعہ قومی یکجہتی کیلئے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر محمد نظام الدین سابق صدر شعبہ فارسی حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور جیسی عظیم الشان شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سے میرا تعلق چالیس سال سے رہا ہے وہ بڑے خوش نصیب ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے بلند اور مقاصد میں کامیابی حاصل کرلی۔ انکے کارنامے صدیوں زندہ و پائندہ رہیں گے

علامہ حیرت بدایونی حیدرآباد:۔ حیدرآباد کی تہنیت، کشمیر میں تعزیت بن گئی۔ دکن کا کوہ نور کشمیر کی وادی میں کھو گیا۔ جنوب کا خزانہ شمال نے لوٹ لیا، دکن کی عزت و شہرت کا زور ٹوٹ گیا۔ وضعداری کا آفتاب ڈوب گیا۔ مشرقی روایات و شرافت کا چراغ بجھ گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں ایک دولت تھی اور کوئی اچک لے گیا ہم دوستی کے نشے میں مست و بے خبر تھے، کسی نے بھرپور وار کیا اور ہم آن کی آن میں زخمی ہو گئے کسی کا دل ٹوٹا، کسی کا بازو ٹوٹا، کسی کی کمر ٹوٹی، کسی کی آس ٹوٹی میر کارواں کے جانے سے سارا کارواں مجروح و بسمل ہو گیا۔ ایک علمی و عملی صلاحیت دفن ہو گئی، ایک ہمہ گیر جامعیت کا جنازہ اٹھ گیا۔ ایک مخصوص انفرادیت نے دم توڑ دیا۔ ملک، قوم اور زبان کی تاریخ بنانے والا خود ہی ایک تاریخ بن گیا۔ دکن کو دنیا سے روشناس کرانے والا خود ہی روپوش ہو گیا اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔

جناب نصیر الدین ہاشمی حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور میرے چالیس سالہ رفیق تھے۔ انکا ظاہر و باطن ایک تھا، وہ منافق نہیں تھے اگر کسی سے کوئی مخالفت ہو جاتی تھی تو کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد انکا دل اسکی جانب سے پاک ہو جاتا۔ وہ صداقت پسند تھے۔ اردو کے اس محسن اور مربی کی اچانک وفات بہت بڑا سانحہ ہے۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور زندگی اور ادب کی کسی جہت میں بھی ہار ماننے والے انسان نہیں تھے۔ اردو ادب کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اسے شمال سے کھینچ کر دکن لا بٹھایا تھا۔ ڈاکٹر زور کا تصور وطن بہت محکم اور ہمہ گیر تھا جسکے باعث قطب شاہوں کی عظمت رفتہ سے ایک ایک اینٹ چن کر انہوں نے یادگار ایوان تعمیر کیا۔ کسی مصنف کا ایک ہی روشن کارنامہ اسکے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے یہاں تصانیف کی اتنی وسعت او [illegible] ہے کہ مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کہ ان کا نام ادب اور زبان اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ [illegible]

انکی موت ایک فرد کی موت نہیں، ایک انجمن کی موت ہے، ایک ادارے کی فنا بلکہ ایک عہد کی موت ہے۔

شہری یدھ ویر ایڈیٹر ملاپ حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور کی موت کا دکھ میرے لئے شخصی نہیں، تمام اردو کے پرستاروں کیلئے ایک صدمۂ جانکاہ ہے۔ ڈاکٹر زور کئی حیثیتوں سے ممتاز مقام کے حامل تھے۔ ہم ہندوستانیوں کیلئے بابائے اردو کے پاکستان جانے کے بعد ڈاکٹر زور ہی اردو کے بڑے رہنما تھے۔ انکے وسیع اور عظیم علمی، ادبی، ثقافتی، و قومی کاموں کو دیکھتے ہوئے میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہندوستان کے بابائے اردو تھے اور انہوں نے مولوی عبدالحق سے زیادہ ٹھوس کے کارنامے انجام دئے افسوس کہ اردو کے اس رہنما نے اردو زبان کیلئے اپنی جان دیدی۔

پروفیسر عبدالقادر پرنسپل آرٹس کالج و ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور ایک بلندپایہ ادیب عظیم انسان اور سماجی رہنما تھے۔ وہ ادارۂ ادبیات اردو کو صحت مند خطوط پر آگے بڑھا رہے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کو چاہیے کہ وہ اس ادارہ کو تحقیقاتی ادارہ کی حیثیت سے تسلیم کرلے۔ زور صاحب کی موت اردو کے لئے عظیم سانحہ ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور کی موت قطرہ کی نہیں سمندر کی موت ہے۔ علم و ادب کے میدان میں زور صاحب تنہا نہیں رہے۔ بلکہ نوجوان ادیبوں کا ایک کارواں انکے ساتھ رہا۔ اردو کی خدمت میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مولوی وحیدالدین سلیم کی روایات پر چلتے ہوئے اردو لسانیات کی طرف توجہ دی۔ ڈاکٹر زور کو سرزمین دکن سے عشق تھا اور وہ آخری قطب شاہی تھے۔ دکن کی تاریخ کے بارے میں وہ جتنا جانتے تھے شاید ہی اور کوئی جانتا ہو، اردو دنیا میں انکی ہم مرتبہ اگر کوئی شخصیت تھی تو وہ مولوی عبدالحق کی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ڈاکٹر زور دکن کے مولوی عبدالحق تھے۔

ڈاکٹر رام نرنجن پانڈے صدر شعبہ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔: ایک نیک طینت انسان جو فرض کا جیتا جاگتا نمونہ اور اخلاق و عادات کا معیارِ نور تھا، اچانک ہم سے روٹھ کر دور چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور اپنے عظیم کارناموں کے سبب صدیوں زندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر رام راجو ریڈر شعبہ تلگو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ ڈاکٹر زور میرے استاد تھے انکی مہمان نوازی، وسیع القلبی اور تلنگانہ کی تاریخ سے والہانہ محبت کا ایک ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ انکی جدائی آندھرا پردیش کی تہذیبی روایات کیلئے عظیم ترین نقصان ہے۔

میر سراج الدین علی خاں معتمد مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن (ادارہ) ایک مرد مجاہد دنیا سے اٹھ گیا۔ ڈاکٹر زور نے ایسے ناموافق ہمت شکن حالات میں پامردی سے اردو کی حمایت میں علم جہاد بلند کیا جب کہ اردو دشمن طاقتیں اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ اس کو نیست و نابود کرنے کے لئے صف آرا تھیں۔

جناب مالک رام (ہندوستانی سفارت خانہ برسلیز۔ بلجیم) ڈاکٹر زور مرحوم اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث خوش قسمتوں میں سے تھے، انکا وجود سراسر نیکی اور خیر تھا، دوستوں کے خیرخواہ، علم کے قدرداں، اور طالب علموں کے سرپرست۔ بھلا انکے ساتھ اللہ تعالیٰ کیوں عفو و کرم کا سلوک نہیں کریں گے۔

جناب جگن ناتھ آزاد (برسلیز۔ بلجیم) ڈاکٹر زور کا اسقدر جلد ہم سے رخصت ہو جانا صرف حیدرآباد کیلئے ہی نہیں سارے ہندوستان کے لئے صدمۂ عظیم ہے۔ انتقال کی خبر سنکر بیحد صدمہ ہوا گذشتہ پچیس برس سے میرے انکے ساتھ نیازمندانہ مراسم چلے آرہے تھے، اسوقت یہ تعلقات نظر کے سامنے ہیں اور دل غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے۔

جناب ضیاءالدین احمد برنی (کراچی)، ڈاکٹر زور کی موت دنیائے ادب اردو کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے مدتوں اس نقصان عظیم کی تلافی نہ ہوسکے گی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اردو کے استحکام و بقاء کیلئے اتنے کام کئے ہیں کہ ان کا نام امٹ ہوگیا ہے۔

تعزیتی جلسے

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم و مغفور کی وفات حسرت پر ہند و پاک اور دکن کے چپے چپے میں صف ماتم بچھ گئی اور ہر جگہ تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ جس میں قرار دادیں منظور کی گئیں دو منٹ کی خاموشی منائی گئی، مقررین نے تقریروں کے ذریعہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کو یاد کیا مغفرت کی دعائیں کی گئیں۔ ذیل میں چند علمی و ادبی سیاسی اور تہذیبی اداروں اور درسگاہوں کے صرف نام درج کئے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

۱۔ انجمن ترقی اردو حیدرآباد، ۲۔ اردو مجلس حیدرآباد، ۳۔ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۴۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد ۵۔ ہندی پرچار سبھا حیدرآباد، ۶۔ لائینڈ لیپر کمیٹی مجلس بلدیہ تعلیم ترحیدرآباد، ۷۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد، ۸۔ آندھرا پردیش ہندی ودیارتھی سنگھ حیدرآباد ۹۔ اردو آرٹس کالج حیدرآباد، ۱۰۔ امجد اکاڈیمی حیدرآباد، ۱۱۔ انجمن مدیران جرائد، ۱۲۔ چادر گھاٹ کالج حیدرآباد، ۱۳۔ مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم حیدرآباد ۱۴۔ مرکزی بزم نو آندھرا پردیش حیدرآباد، ۱۵، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ۱۶۔ مرکزی انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۷، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر، ۱۸، مومن کانفرنس حیدرآباد۔ ۱۹، مسلم بیاک ورڈ فیڈریشن حیدرآباد، ۲۰۔ غزلستان حیدرآباد، ۲۱۔ آندھرا پردیش میڈیکل، ایمپلائز یونین حیدرآباد، ۲۲۔ بیک ٹریننگ و لٹی پرپز اسکول حیدرآباد، ۲۳، آندھرا پردیش اردو رائٹرز پبلشنگ کوآپریٹیو سوسائٹی حیدرآباد، ۲۴۔ آزاد میموریل لائبریری حیدرآباد۔ ۲۵۔ انجمن شعرو ادب ظہیرآباد ۲۶۔ آل انڈیا یوتھ موومنٹ پارٹی حیدرآباد۔ ۲۷۔ انجمن ترقی اردو شاخ کرینگر، ۲۸۔ برایخ انجمن طلباء بنگلور، ۲۹۔ بزم جیون حیدرآباد۔ ۳۰۔ انجمن شہر ادب حیدرآباد۔ ۳۱، قلم اسٹیڈی سرکل حیدرآباد۔ ۳۲۔ بزم مکیش حیدرآباد۔ ۳۳، مرکزی انجمن کارگران کا مدانی و زردوزی حیدرآباد۔ ۳۴۔ اردو سرکیولیٹنگ لائبریری (اے، جی آفس) حیدرآباد۔ ۳۵۔ اردو پڑھائی گھر سیتا رام پیٹھ، ۳۶۔ بزم طلباء اوپلی کلاں، ۳۷۔ گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج گلبرگہ ۳۸۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ، ۳۹۔ عثمانیہ اردو سوسائٹی حیدرآباد۔ ۴۰۔ لطیفہ عربی کالج حیدرآباد ۴۱۔ اردو ادبی مجلس مرہٹواڑہ اورنگ آباد۔ ۴۲، دکنیس کالج حیدرآباد۔ ۴۳۔ اردو کالج حیدرآباد۔ ۴۴، انجمن ترقی اردو شکر نگر۔ ۴۵۔ بزم مفتاح العلوم اودگیر ۴۶۔ مجلس ارتقائے ادب ناگرجنا ساگر نلگنڈہ، ۴۷۔ انجمن ترقی اردو بودھن ۴۸۔ بزم سخن ظہیرآباد ۴۹۔ انجمن تحفظ اردو نارائن کھیڑ۔ ۵۰ ادبستان کرنول ۵۱۔ آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ ۵۲ بزم قیصر بنگلور ۵۳۔ ادارۂ ادبیات اردو ناندیڑ ۵۴۔ انجمن ترقی اردو ناندیڑ ۵۵۔ ترقی اردو بورڈ کراچی ۵۶ ادارۂ ادبیات اردو نصیرآباد پاکستان، ۵۷۔ ڈسٹرکٹ رائٹرس اسوسی ایشن کھمم ۵۸۔ جمعیۃ التریش گلبرگہ ۵۹ مجلس ترقی علم و ادب گمبھی راؤ پیٹ (آندھرا پردیش)۔ ۶۰۔ انجمن ترقی اردو نظام آباد ۶۱۔ انجمن ترقی اردو عثمان آباد۔ ۶۲۔ شعبۂ اردو، فارسی و عربی، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی ترپتی آندھرا پردیش ۶۳۔ آرٹس و کامرس ایوننگ کالج حیدرآباد۔ ۶۴۔ بایو و اچاریہ نظام آباد۔ ۶۵۔ فرینڈس کلب بیدر ۶۶۔ بزم ادب سنگاریڈی ۶۷۔ نانک رام بھگوانداس کالج حیدرآباد۔ ۶۸۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۶۹۔ اورینٹل کالج حیدرآباد ۷۰۔ اردو سوسائٹی حیدرآباد ۷۱، مدینہ پبلک لائبریری محبوب نگر ۷۲، انجمن ترقی اردو محبوب نگر ۷۳، ممتاز کالج حیدرآباد ۷۴، انوار العلوم کالج حیدرآباد ۷۵، انجمن عوامی خواتین حیدرآباد ۷۶، امرسنگھ کالج سری نگر ۷۷، جامعہ محمدیہ رائے درگ ۷۸، بزم ادب کھمم ۷۹، دکھنتنہ بھارت ہندی پرچار سبھا کھمم ۸۰۔ ضلع کانگریس کمیٹی کھمم ۸۱ بھارتیہ ساہتیہ کلا پریشد کھمم ۸۲ جرنلسٹ اسیوسی ایشن کھمم ۸۳ حق لائبریری کڑپہ ۸۴ بزم غالب حیدرآباد ۸۵ گاندھی میموریل لائبریری شمس آباد ۸۶، انجمن تحفظ اردو خانہ پور۔ ۸۷ مدرسہ تحتانیہ ہلدور ۸۸، دارالمطالعہ ترقی پسند مصنفین منچھلے گاؤں ۸۹، انجمن تعمیر اردو دہلی ۹۰۔ شعبہ اردو یونیورسٹی آف کراچی پاکستان ۹۱، شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی ۹۲، سہاور مارہرگ اکاڈمی کراچی ۹۳، بزم سعدی حیدرآباد ۹۴، ترقی پسند مصنفین دہلی ۹۵۔ انجمن تعمیر اردو دہلی ۹۶، لندن یونیورسٹی لندن

شعراء کا خراجِ عقیدت

خورشید احمد جامیؔ:

میں سمجھتا ہوں کہ ہرسوچ کے آئینے میں
مدتوں صرف تیری یاد کا چہرہ ہوگا
ضوفشاں قافلۂ فکر و نظر کے آگے ،
صرف تیرا ہی کوئی نقشِ کفِ پا ہوگا ۔
تو نے اُردو کے لئے خون دیا ہے اپنا
کوئی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا
کام زندہ ہے ترا، نام ترا زندہ ہے
تو کسی طرح بھی اے زورؔ نہیں مرسکتا

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی:

جس سے ایک ایک ذرہ بنا آفتاب
جس نے دی کالکوں کو نئی پیچ و تاب
جس نے الٹی معانی کے رخ سے نقاب
جسکی کوشش تھی تفسیرِ "ولی فتح باب"
جس کے چہرے پہ کھلتے تھے اکثر گلاب
جس پہ سایہ فگن تھا ابھی تک شباب
ایک ہلکورے سے آہ ٹوٹا حباب
"حیف ارضِ دکن، حیف ارضِ دکن "

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد:

کشمیر کی جاں افزا وادی میں، دستِ قضا نے زورؔ کو تاکا
کیسے ابھاگے بھاگ ہیں اپنے کیسا ساتھی چھوٹ گیا
مصلحت اپنی وہ ہی جانے، بے پردہ حقیقت اتنی ہے.
زورؔ کو غربت راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

منشی تلوک چند محرومؔ (دہلی):

اے موت بڑا غضب یہ ڈھایا تو نے
دیکھا بھی ہے؟ کیا سماں دکھایا تو نے
کشمیر سے تا دکن ہے ماتم کس کا
کیوں زورؔ کو دنیا سے اٹھایا تو نے

علامہ نجم آفندی:

(ڈاکٹر زورؔ کے خیال میں)

کتنے صدمے گذر چکے ہیں ابتک
کتنے آنسو بکھر چکے ہیں ابتک
کیا میں ہی گننے کیلئے جیتا ہوں
کتنے احباب مر چکے ہیں ابتک

شاذؔ تمکنت:

اک صبح اپنے کوہ دمن سے بچھڑ گئی
اک آسماں زمیں سے خفا ہو کے رہ گیا
خم ہو چکی ہے دیکھنا دیوارِ مدرسہ
الفاظ رہ رہے ہیں کہ مفہوم کھو گیا
بو دیا تھا تو نے اپنا لہو جس نہاد میں
وہ قصرِ دلپذیر بہت لالہ زار ہے

تو بنے کرن بہار رنگ تو مٹی میں بیج ہے ۔ تو اپنی ذات سے شجرِ سایہ دار ہے
عصرِ دکن کے یوسفِ گم گشتہ السلام

وقار خلیل:

ایک سازِ حیات کا نغمہ ۔ سرزمینِ دکن سے چھوٹ گیا
پھول کھلتے تھے جس کے سائے میں ۔ وہ تناور درخت ٹوٹ گیا

روحی علی اصغر:

جس نے تاریخِ دکن میں روحِ تازہ پھونک دی ۔ اسکی ہستی ایک تاریخی حقیقت بن گئی
قلعۂ فکر و نظر سیلابِ غم سے بہہ گیا ۔ یادگارِ زورؔ اک ایوانِ اُردو رہ گیا

سلیمان خطیب:

زورِ بازو تھے زورؔ اُردو کے ۔ آج اُردو کا زور ٹوٹا ہے
زورؔ صاحب کے ایک جانے سے ۔ کتنی کمزور ہو گئی اُردو

حکیم یوسف حسین خاں:

شیریں نے نگاہ پھیر لی ہے ۔ ہنروں کا بدل گیا بھاؤ!
اب زورؔ اِدھر نہیں اُدھر ہے ۔ کشمیر سے جوئے شیر لاؤ

بانو طاہرہ سعید:

جانِ بہار رنگِ بہاراں میں کھو گیا ۔ کشمیر کی فضائے گل افشاں میں کھو گیا
اہلِ دکن کی آنکھ کا تارا وطن سے دور ۔ رعنائیوں کی بزمِ غزل خواں میں کھو گیا

برق موسوی:

سپردِ خاک ہوا زورؔ جب دکن سے دور ۔ "چراغِ فن اب بجھ گیا" ندا آئی
۱۳۸۲ھ

اسد احسن جعفری:

بجھ گیا روشنی کا اک مینار ۔ ایک ظلمت شکن کا ماتم ہے
ایک تنویر ہم سے روٹھ گئی ۔ جگمگاتی کرن کا ماتم ہے۔

سید اکرم علی:

دل و جاں اپنی اُردو پر فدا کی ۔ "ابوالحسنات" پر رحمت خدا کی
ملا اکرمؔ صلہ حسنِ عمل کا ۔ فنا سے زورؔ نے حاصل بقا کی

مبشر انصاری:

اے مبشر کہو سنِ رحلت ۔ زور جنت میں سرفراز ہیں اب
۱۳۸۲ھ

مہرالنساء مہر:

لوگ دنیا بھر سے آئیں علم کی تحقیق کو ۔ اک محقق یوں کتب خانہ سجا کر چل دیا

عبدالحق برق (کشمیر)

سید آں تا دری زورؔ آدر — گل وریحاں بہ تر تنش بچمید
روح پاکش بہ رید تا قادر — آہ محی بہ اصل خویش رسید

۱۳۸۲ھ

ابو سعد سید اسمٰعیل سیدؔ (نرمل)

نا قابل اظہار زبان اُردو — ہے زورؔ کے ماتم میں.. جہاں اُردو
اے زور ترا نام رہے گا روشن — زندہ رہی جب تک بھی زبان اُردو

صلاح الدین نیرؔ:

زور وہ دیوانۂ اُردو کہ ہنگام سفر — آخری سانسوں میں تھی ایوان اُردو پر نظر
آخری آنسو گرا اُردو زبان کے نام پر — دل یہ کہتا ہے کہ روح زور اب بھی ساتھ ہے

پرچم اردو نئی نسلو تمہارے ہاتھ ہے

مغیث الدین فریدی (دہلی)

کون یہ ماجرائے درد کہے — دل زباں کا اُلٹ گیا افسوس
کیسا انسان ہو گیا رخصت — زورؔ اُردو کا گھٹ گیا افسوس

احمداللہ قدیری:

سال رحلت ہمیں بنویس احمد — ڈاکٹر زورؔ رشد و اصل حق

۱۳۸۲ھ

عبدالغفار رفیقؔ:

سال رحلت نے صدا دی یوں رفیق زار کو — خلد میں ہیں با عمل سید محی الدین زورؔ

۱۳۸۲ھ

وحیدؔ مرزا:

تری فرقت میں ہے اب ایوان اردو سوگوار — اسکے میناروں سے بھی اُٹھتا ہے آہوں کا غبار
جیسے مٹی نیند سویا ہے اُسی کا تاجدار — سرنگوں ہوتا ہے ماتم میں ترے بالاحصار
سایۂ گل میں ہمارے زورؔ کو نیند آ گئی — خاک حضرت بل دکن کے سانولے پر چھا گئی

معین الدین عارفؔ بیابانی:

دو ہی گوہ نور نکلے تھے دکن کی خاک سے — عظمتیں جنکی وراہیں وسعت ادراک سے
دور ہیں دونوں وطن سے تھا یہی تقدیر میں — ایک انگلستان میں ہو، دوسرا کشمیر میں

مظہرؔ کامل:

کردار کا تیرے یہ پہلو اربابِ نظر پہ روشن ہے — تو زیست کی ہر ایک منزل میں مسرور رہا حاسد نہ بنا
مظہرؔ نے حقیقت یہ مبنی رحلت کی تری تاریخ کہی — اُردو کے فدائی مونس کو کشمیر نے ہم سے چھین لیا (۱۳۸۲ھ)

صابرؔ رضوی:

ناز کے قابل تھی جنکی زندگی تیرے لئے — وہ سپوت اک تیرا اے ہندوستان جاتا رہا
بعد عبدالحق کے تھا اک زورؔ وہ بھی ہائے ہائے — حامیٔ اردو ادب رازدار زبان جاتا رہا

سیفی پریمی (دہلی)

اسمٰعیل میرٹھی بہ حیثیتِ غزل گو

شعاعِ ہند مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ذات میں ہمارے قدیم و جدید ادب کی بعض بہترین قدریں جمع ہو گئی تھیں۔ ان کی شخصیت بڑی رنگا رنگ تھی وہ ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے اور یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو اسی شہر میں انتقال ہوا۔

ان کی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری۔ انھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے انمول تجربوں اور اپنے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کو پوری ایمانداری سے نئی نسل اور اس کے ذہنوں کی صحت مند طور پر تربیت و تہذیب کے لئے وقف کر دیا تھا۔

گلستان و بوستان کے سعدی کی طرح اسمٰعیل میرٹھی بھی اپنی درسی کتابوں کے باعث حیاتِ جاوید پا چکے ہیں۔ لیکن فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ سعدی کی شہرت غزل گو کی حیثیت سے بھی ہے اس لئے کہ انھوں نے دوسری اصناف سخن کے ساتھ غزل کی طرف بھی پوری توجہ کی تھی۔

مولانا محمد اسمٰعیل نے بھی تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، رباعی، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، سلام ہر صنف پر وہ حاوی تھے۔

مولانا کی شاعری کا پہلا دور ۱۸۶۷ء سے ۱۸۸۰ء تک سمجھنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے کلام کی ابتدا غزل گوئی سے کی ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے۔ صنفِ غزل میر تقی میر کے عہد سے مولانا کے زمانے تک یعنی تقریباً ڈیڑھ صدی سے نہایت مقبول تھی اور بقول ڈاکٹر یوسف حسین غزل گو ہونا علم مجلسی کا جزو تصور کیا جاتا تھا۔ شروع میں مولانا کی غزل گوئی میں کچھ انکا ؤ سا تھا اور یہ ذوق ژکا ژکا سا تھا شاید کوئی نفسیاتی نکتہ اس کا باعث رہا ہو لیکن ایک تقاضا تھا جسے وہ روند کر سکے اور اس صلاحیت پر نکھار آنا شروع ہو گیا۔ شیخ قمر الدین رسالدار مولانا کے برادر نسبتی تھے ان کو مولانا کے شغلِ غزل گوئی کا کسی طرح پتہ چل گیا۔ اور انھوں نے مشاعروں کے لئے طرحی غزلیں کہنے کی فرمائش شروع کر دی۔

انجام کار مولانا طرحی غزلیں کہہ کر انھیں دیتے تھے اور وہ میرٹھ، شاہجہاں پور اور سیتاپور کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ غزلیں پسند کی جاتی تھیں اور رسالدار صاحب کو کافی داد ملتی تھی۔ کلیاتِ اسمٰعیل کے نئے اڈیشن میں دو غزلیں ہیں جن کے یہ مقطع ہیں

کچھ آج ہی نہیں میں ثنا خوانِ مصطفےٰ
ہے مجھ کو اے قمرؔ یہ وظیفہ دوام کا

اس بحرِ نور کا جو تشنہ اگر ہوا قمرؔ
سیراب جام لطف سے ہر خشک لب ہوا

رسالدار قمر الدین کے نام کی نسبت سے ان غزلوں میں "قمر" تخلص رکھا گیا ہے۔ لیکن مولانا نے خود کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی اور ان کی کسی غزل میں اسمٰعیل تخلص نہیں ملتا۔

"کلیاتِ اسمٰعیل" میں غزل کے تحت ان کی چھیاسی (۸۶) غزلیں درج ہیں حالاں کہ بعض ان میں نظمیں ہیں اور ان کی تعداد گھٹ کر تقریباً ستر (۷۰) غزلیں باقی رہ جاتی ہیں لیکن ان میں سے کسی غزل میں مقطع نہیں ہے۔

اس ذوقِ غزل گوئی کی تکمیل کے لئے وہ مرزا غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ اور اپنے استاد کی زمین میں تیرہ (۱۳) غزلیں کہی ہیں۔ بعض غزلوں میں انھوں نے غالب کا رنگ اپنانے کی کوشش بھی کی ہے

ایسا نظر آتا ہے کہ غزل کے ساتھ مولانا کی فریفتگی زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکی ۱۸۷۳ء تک ان کے اس لگاؤ کا پتہ چلتا ہے گو بعض غزلیں بعد

کی بھی ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی مخصوص توجہ اس طرف نہیں رہی بلکہ ان کا ذہن ایک دوسرے راستے کی تلاش میں تھا۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ مولانا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی پیداوار تھے۔ یہ اُردو ادب اور مغلیہ حکومت کے انحطاط کا دور تھا۔ مغربی تعلیم و تہذیب کا اثر بڑھ رہا تھا اور مشرقی قدریں مٹ رہی تھیں۔ اصلاً ایک انتشار کا عالم تھا۔ اردو شاعری اور خصوصاً غزل گوئی امیرزادوں کی دلچسپی کی چیز تھی۔ عوام بھی مشاعروں سے متاثر تھے لیکن دراصل آہ اور واہ کے ذریعہ رات کا کچھ حصہ اپنی ذہنی اذیت کو بھلانے کے لئے شاعر کی صحبت میں گزار نا ضروری ہو گیا تھا۔ داغ دہلوی، امیر مینائی اور جلال لکھنوی کا تغزل ایک طرف اُردو ادب اور دوسری طرف دہلی اور لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کی آبرو سمجھا جاتا تھا۔ اس عالم میں کچھ شاعر ادیب عالم اور مفکر ایسے بھی تھے جن کا سماجی شعور بہت بیدار تھا اور انھیں اپنے فن کے ذریعہ مردہ قوم میں نئی روح پھونکنے کی لگن تھی۔ اس صف میں مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور سید اکبر حسین الہ آبادی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ خواجہ حالی نے اپنے زمانے کی روایتی غزل سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اور یہی جذبہ مولانا اسمٰعیل کے یہاں ناخن بدل نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے ظاہر پرست علما اور شعرا پر طعن کی ہے۔ اور روایتی شاعر اور شاعری سے سخت بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً

مشاعرہ ہو تو لڑتے ہیں جیسے ٹینی مرغ　　ہو لہان ہیں پہ پنجے شکستہ ہے منقار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ　　کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشق زار
نہ جس سے طبع کو تفریح ہو نہ دل کو خوشی　　غزل ہے یا کوئی ہذیان ہے بوقت بخار

اس خیال کو زیادہ تقویت یوں ملی کہ ۱۸۸۱ء میں وہ مولانا سید غوث علی شاہ صاحب کے مریدوں میں شامل ہو گئے اور نہایت خلوص اور ریاضت کے ساتھ تربیت باطنی کی طرف مائل ہوئے۔ اور آخر کار ان کے شیخ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔

اسمٰعیل ایک فرشتہ ہے۔ جو ہر وقت عالم سکوت میں رہتا ہے۔

(ص ۔ ۵۰۔ ۴۷ ۔ تذکرۂ غوثیہ)

چناں چہ ان کی غزلیات دیکھ کر رام بابو سکسینہ مولف تاریخ ادب اردو کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے۔

غزلیات میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہیں"

(ص ۔ ۴۴۴ ۔ تاریخ ادب اُردو)

اور خان بہادر محمد اسلم سیفی جامع "حیات و کلیات اسمٰعیل" کا فرمانا بجا ہے۔

مولانا کی غزل کے غالب عناصر فلسفۂ پند و حکمت اور تصوف ہیں۔

(ص ۔ ۱۳۵ ۔ حیات اسمٰعیل)

غزل کے متعلق مولانا نے خود بھی فرمایا ہے۔

"غزل موضوع تو اسی غرض سے ہوئی تھی کہ اُس میں محض عاشقانہ مضمون ہوں مگر تصوف، پند و حکمت، ظرافت وغیرہ اور مضامین داخل ہو گئے ہیں اور ان کی غزلوں کے دائرے میں یہ تمام مضامین نظر آجاتے ہیں۔

غزل کو طلاق دینے کا بڑا سبب ۱۸۷۴ء میں پنجاب کا مشاعرہ معلوم ہوتا ہے جب نظم کا رواج ہوا تو بیانیہ شاعری شروع ہوئی۔ مناظر فطرت پر طبع آزمائی کا موقع ملا۔ قوم کے سامنے شاعر نے اپنا پیغام رکھا اور مغربی ادب کی روشنی میں آنے والی نسلوں کو نئی زندگی کی بشارت دی گئی۔ اس تبدیلی کے بعد ہی مولانا اسمٰعیل نے وہ حیثیت حاصل کی جس کی بدولت تاریخ اردو ادب انھیں فراموش نہ کر سکے گی۔

آج اردو ادب کے کسی ناقد کو انفرادیت، جدت اور عظمت کی سحر آفرینی سے انکار ممکن ہی نہیں، گزشتہ دو صدیوں میں ایسے شاعر کم

لر آتے ہیں جن کے داخلی عقائد پر خارجی حقائق نے فتح پائی ہو۔ اصغر، فانی اور جگر تک اس فہرست کو پڑھا جائے تو اس دور میں بھی غزل کے سماجی کردار کے سنگ مل جائیں گے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اسی دور میں سیاسی اور سماجی حقائق کو غزل میں سمونے والے شاعر بھی ہمارے سامنے ہیں۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ زندگی کے بہترے معمولات کی طرح شاعرانہ ماحول میں بھی شاعر کے مزاج اور ذہن کو تخلیقی عمل میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی ایک شاعر اور دوسرے شاعر کے رنگ تغزل میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

مولانا اسمٰعیل ایک نیک سیرت انسان تھے۔ علماء و فقہا کی صحبت سے انھیں بیحد شغف تھا۔ اسی لئے تصوف کا ان کی زندگی پر گہرا اثر تھا۔ ان میں غزل کہنے کی صلاحیت تھی۔ ان کی غزلوں میں غزل کی مسلمہ روایات کا ظہور ہے۔ انھیں فن سے لگاؤ تھا۔ نیا مواد، نئی ہیئت اور نئی تکنیک کا تجربہ ان کے یہاں نہیں ملتا۔ اور اس کی تلاش بھی نہیں کرنی چاہئے۔ انھوں نے ان تجربوں کے لئے نظم کو منتخب کیا تھا۔

مولانا کی غزل میں یوں تو تصوف کا عنصر غالب ہے مگر غزلوں میں مجازی عشق اور واردات قلب کے جو نقوش انھوں نے ابھارے ہیں اس سے ان کی قدرت مشاہدہ، فکر اور شدت احساس کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ جذبہ کی پختگی اور شدت احساس نے غزل کہنے کو موثر زبان بھی دی ہے۔ صرف ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہے تو اغیار سے خطاب مگر   میری ہر بات کا جواب بھی ہے

ظاہر ہے ایک شوخ شعر طرح دار محبوب کے انداز کا اثر قبول کئے بغیر یہ شعر کہنا ممکن نہیں۔

مولانا کے لب و لہجہ کی ایک سطح ہے سنجیدہ اور با وقار۔ ان کی غزل میں مشاہدے، فکر اور ذاتی تجربوں سے حاصل کی ہوئی ایک کیفیت ملتی ہے۔ اسلوب کی خوب صورتی میں گھل مل کر دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ یہاں ان کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے ان کے رنگ غزل اور غزل گوئی کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

عاشقانہ رنگ

تمہارے تیر میں انداز تھا نظر کا سا   ہر ایک دل کا ہے نقشہ مرے جگر کا سا
کسی کی برق تبسم جو دل میں کوند گئی   تو چشم تر کا ہوا حال ابر تر کا سا
نکلے تم غیر کے گھر سے کہ مری جاں نکلی   جس کو دشوار سمجھتے تھے وہ آساں نکلا
تو اور عذر طعن رقیباں غضب ہوا   دل پارہ پارہ جب نہ ہوا تھا تو اب ہوا
میرے سوا حریف ستم کوئی بھی نہ تھا۔   اب مہربان ہو گئے یہ کیا غضب ہوا

شوخ نگاری

وادیٔ عشق میں نہ ملا کوئی ہم سفر   سنتے تھے نام خضر علیہ السلام کا
اُٹھا حجاب تو بس دین و دل نے ہی بنی   جناب شیخ کو دعویٰ تھا پارسائی کا

مکر شاعرانہ

مہربانی بھی تو کچھ عیب نہیں   دشمنی شرط محبت ہی سہی

محبوب کے لب جاں نواز کا بوسہ پانے کے لئے عاشق کا فنا ہو کر جام شراب بننا پرانا مضمون ہے مولانا نے اس میں بھی نئی بات پیدا کی ہے۔

اللہ رے بوسۂ لب میگوں کی آرزو   میں خاک ہو کے دُرد تہ جام ہو گیا

ذوقِ طلب

ساقی ادھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں — کچھ مستیٔ نگہ بھی ملا دے شراب میں

طرزِ ادا

ہے تو اغیار سے خطاب مگر — میری ہر بات کا جواب بھی ہے

قدرتِ بیاں

خواہش کہ تھی آدمی کو لازم — بڑھ کر الزام ہو گئی ہے
تمہید پیام ہی ہیں اپنی — تقریر تمام ہو گئی ہے

راز و نیاز

تھی چھیڑ اسی طرف سے ورنہ — میں اور مجال آرزو کی!
گم تماشائے خویشتن بینی — کتنے بے دید ہو ادھر دیکھو

تصورِ خطا اور گم گشتگی

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں — ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں
سر ہی کے بل گئے ہیں سار رہروانِ عشق — حیرت زدہ نہ بن کر نشانِ قدم نہیں
تو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا — ورنہ دیارِ حسن میں رسمِ ستم نہیں

متفرقات

قدسیوں کے بھی ہوش اڑتے ہیں — سن کے اس مشتِ خاک کی باتیں
دل کا احوال تو خدا جانے — تھا ہی سرا ، یہی بیتاک کی باتیں

مولانا کی غزلوں میں کئی مشہور اور ممتاز شاعروں کے رنگ جھلکتے ہیں اور ہمارے نزدیک مومن کا رنگ زیادہ نمایاں ہے مولانا کی غزلوں کے بارے میں ایک مستند شاعر کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

وہ کلیات میں جتنی غزلیں درج ہیں ان سب میں متانت بیان و پختگیٔ الفاظ کی وہی شان موجود ہے۔ جو میر و مصحفی یا غالب و مومن کے کلام کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔

حسرت موہانی (اردوئے معلیٰ ــ فروری ۱۹۱۱ء)

غالب کا رنگ

ان غفلتوں سے واقف ہوں لیکن خدا کرے — تاخیر کا سبب کوئی اُس کے سوا نہ ہو
اب اور ڈھونڈے کوئی جولاں گرِ جنوں — صحرا بقدرِ وسعتِ یک گام ہو گیا۔

مومن کا رنگ

اور اپنے حق میں طعنِ تغافل غضب ہوا — غیروں سے ملتفت بتِ خودکام ہو گیا
کیا اب بھی مجھ پہ فرض نہیں دوستیٔ کفر — وہ ضد سے میری دشمنِ اسلام ہو گیا
اب حرفِ ناسزا ایسا بھی ان کو دریغ ہے — کیوں مجھ کو ذوقِ لذتِ دشنام ہو گیا۔ (مومن کے اشعار سے استفادہ بھی ہو)

احساسِ خودی

پائے غیر اور میرا سر دیکھو — ٹوٹ جائے نہ سنگ در دیکھو
ہو ادر یہ ترے ناصیہ سا ہو نہیں سکتا — دشمن کا بھی نقش کف پا ہو نہیں سکتا
باقی نہ رہی غیر کو اب جائے شکایت — شکر ستم یار ادا ہو نہیں سکتا

غالب کی زمین میں ایک غزل کہی ہے۔ ایماں، انسیاں، پریشاں وغیرہ قوافی ہیں۔ مولانا کی موجودگی میں ان کے صاحبزادے محمد اسلم سیفی صاحب نے یہ غزل خواجہ الطاف حسین حالی کو سنائی۔ اُنھوں نے بہت پسند کی۔ اس غزل میں مطلع نہیں ہوا تھا۔ حالی نے غزل میں مطلع شامل کرنے پر اصرار کیا اور مولانا محمد اسمٰعیل نے حُسن ذات سے متعلق یہ مطلع کہا۔

عارض روشن پہ جب زلفیں پریشاں ہوگئیں۔ — کفر کی گمراہیاں ہم رنگ ایماں ہوگئیں۔

مولانا کا ایک اور شعر سن کر خواجہ حالی پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ بار بار داد دیتے تھے۔ اور بار بار پڑھواتے تھے۔ نزاکتِ خیال ملاحظہ ہو ؎

بس اتنے رنگ و بو تو نہ کر ناز بے بہا — خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

اسی طرح ایک مطلع "ہمہ اوست" سے متعلق سید اکبر حسین الہ آبادی کو سنایا گیا۔ اور انھوں نے بہت داد دی۔

بزم ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں — ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں۔

اردو ادب کے ممتاز نقاد مولانا شبلی نعمانی کا قول تھا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ حالی کی طرف تو لوگوں نے خاصی توجہ کی ہے لیکن اسمٰعیل کی غزل ابھی محتاج توجہ ہے۔ مولانا کی شاعرانہ شخصیت کا ایک پہلو اُن کی غزل گوئی بھی ہے اور انھیں پوری طرح سمجھنے کے لئے ان کے رنگ تغزل پر نظر رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ حالی اور اسمٰعیل دونوں بنیادی طور پر نظم نگار تھے۔ لیکن دونوں کے حسنِ تغزل کا یہ عالم ملاحظہ کیجئے۔

خواجہ حالی ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد
بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

مولانا محمد اسمٰعیل ؎

وہ قامت دل کش ہے خوب فتنۂ عالم
چھپا ابھی نہیں پیرہن ناز دکھن میں!
اس انجمن میں جا بیٹھے اب کسی امید پہ
ہم سمجھے نہ پائے کہ وہ بدگماں اُٹھا
فسانہ ہائے شوق سناتا ہوں میں اسے
جو عالم خیال میں بھی روبرو نہ ہو۔

ہنری ولیمس ہما میرٹھی

پیارے لال شاکر کے خطوط

مکاتیب شاکر میرٹھی

منشی پیارے لال شاکر میرٹھی مرحوم کو ان کے مکاتیب کی روشنی میں پیش کرنے کا ارادہ برسوں سے کرتا رہا۔ حالانکہ حالات آج بھی اتنے سازگار نہیں ہیں لیکن اب اس کام کو کسی اور وقت کے لیئے اٹھائے رکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لہذا منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کے خطوط پیش کر رہا ہوں۔

کسی شاعر یا ادیب کے خطوط سے جہاں خود اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں ٹھوس واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہاں ان حالات پر بھی روشنی پڑجاتی ہے جن میں وہ شاعر یا ادیب اپنی زندگی کے دن گذار چکا ہو۔

منشی پیارے لال شاکر میرٹھی ۱۳ مارچ ۱۸۸۵ء کو اس عالم آب و گل میں آئے۔ تعلیم میرٹھ میں پائی ۱۹۰۲ء سے مضمون نگاری با قاعدہ شروع کی۔ شاعری کا آغاز ۱۹۰۵ء میں ہوا اگرچہ ایک دو چیزیں ۱۸۹۹ء میں شائع ہو چکی تھیں۔ شاعری اور مضمون نگاری کے نتائج پہلے پہل کوکب ہند (لکھنو) نور افشاں، طبیب عام وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ۱۹۰۵ء سے با قاعدہ طور پر ان کے مضامین کثیر التعداد اخبارات میں شائع ہونے لگے ۱۹۰۷ء میں ایک ہفتہ وار اخبار کی ادارت سنبھالی۔ یہ اخبار.... ڈاکٹر ٹی ایل پینل مرحوم بنوں (صوبہ سرحد) سے نکالتے تھے۔ اس کا نام تحفۂ سرحد تھا۔ اس زمانہ میں دیگر اخبار و رسائل میں بھی ان کے مضامین نظم و نثر شائع ہوئے۔ خصوصاً رسالہ مخزن لاہور۔ اور رسالہ زمانہ کانپور میں۔ تحفۂ سرحد کے بعد ان کا تعلق رسالہ زمانہ کانپور سے قائم ہوا۔ پھر وہ الہ آباد چلے آئے۔ ۱۹۱۱ء میں مشہور و معروف رسالہ ادیب کے ایڈیٹر ہوئے، جس نے خود ان کی زبانی گویا ان کی "شہرت کو چار چاند لگائے" ۱۹۱۲ء تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ ان کے زمانۂ ادارت میں ادیب نے بہت ترقی کی اور اردو دنیا نے جی کھول کر ان کی خدمات کو سراہا۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنو سے اپنا ذاتی رسالہ العصر کے نام سے جاری کیا جو چھ سات برس تک چلتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں مجبوراً اس کو بند کرنا پڑا۔ کیونکہ عام سیاسی بیداری کے باعث علمی پرچوں کی مانگ کم ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ زندگی اور خوش باش (ہفتہ وار) کے نام سے بھی لکھنو اور دہلی سے دو پرچے جاری کئے جو عرصہ تک زندہ رہے۔ پھر زمانہ۔ مخزن۔ ہمایوں۔ ادبی دنیا، ادب لطیف۔ تنویر الشرق، شمس بنگال۔ خیام۔ آزاد۔ کمال۔ ندیم وغیرہ رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ کم و بیش بیس مختلف اخبارات و رسائل میں کام کرتے رہے، انڈین پریس الہ آباد میں اردو کے صیغۂ تصنیف و تالیف سے منسلک رہے۔ چار پانچ برس تک بچوں کی دنیا کے فرائض ادارت بھی انجام دیئے، اور پرچہ اس قدر مقبول ہوا کہ پنجاب، حیدرآباد، بہار وغیرہ صوبوں کے مدارس کی لائبریریوں کے لیئے منظور کیا گیا۔

نواب عماد الملک، مہاراجہ کشن پرشاد۔ مولانا شبلی، مولانا حالی۔ مولانا ... مولوی نظام الدین حسن، منشی پریم چند وغیرہ

ان کے اور ان کے کام کے معترف تھے۔ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی ۱۹۵۶ء میں ۲۵ فروری کو راہیٔ ملک عدم ہوئے اس وقت وہ دہلی میں انتہائی کس مپرسی کے عالم میں تھے۔

راقم الحروف سے ان کی خط و کتابت تقریباً ۲۰ بیس برس تک رہی شخصی طور پر ان کی نیازمندی کا شرف بھی مجھے حاصل رہا ہے۔ پیارے لال شاکر میرٹھی کو بہت قریب سے دیکھا۔ باوجود اس کے کہ میں عمر اور لیاقت دونوں میں ان کے بچوں کے برابر تھا وہ خطوط میں ہمیشہ مجھے ایک دوست کی حیثیت سے مخاطب کرتے رہے۔

مکاتیب شاکر کے آئینہ میں شاکر مرحوم کی زندگی کے خد و خال واضح طور پر نمایاں ہیں، حالانکہ ملاقات کے وقت اور خطوط میں بھی وہ اپنا دکھڑا رونے سے بہت احتراز برتتے تھے پھر بھی حقیقت چھپ نہیں سکی۔

شاکر صاحب کے بچپن کے حالات ان کے ہم جماعت قبلہ پادری امید مسیح صاحب مقیم میرٹھ کی زبانی جو معلوم ہوئے وہ پیش ہیں۔ شاکر صاحب میرٹھ چھاؤنی سے متصل موضع لنگر کھیڑہ میں رہتے تھے۔ ان کے والد کا نام ماسٹر ابراہیم تھا جو چرچ مشن سوسائٹی کے سربراہ کارکن تھے۔ شاکر صاحب کی ابتدائی تعلیم میتھوڈسٹ مشن اسکول میرٹھ میں ہوئی یہ اسکول اس زمانہ میں بیگم پل کے قریب بی بی کچھی کی کوٹھی میں تھا۔ پادری امید مسیح صاحب ۱۸۹۲ء میں اس مدرسہ میں داخل ہوئے۔ اسکول کا بورڈنگ ہاؤس تھا اور اس میں صرف دس پندرہ لڑکے رہتے تھے۔ شاکر صاحب بھی بورڈنگ میں رہتے تھے۔ بعد میں شاکر صاحب نے اپنا نام تبدیل کرکے پیارے لال رکھ لیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور خیر نگر کے قریب ایک مولوی صاحب سے ابتدائی مشورہ لیتے رہے۔ مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم کہ شاکر صاحب نے دراصل مشورہ سخن کس سے کیا۔

خطوط کی تشریحات :

پہلا خط جو شاکر مرحوم نے لکھا تھا اس میں اس پنشن کا ذکر کیا گیا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کی وساطت سے مرکزی سرکار سے ملنے لگی تھی، شاید ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی پنشن ہو گئی تھی۔ منشی پیارے لال شاکر مذہباً مسیحی (عیسائی) تھے بیٹرا اور انڈین و ٹنس دو مسیحی پرچوں کے نام ہیں اول الذکر کے ایڈیٹر جیکب صاحب تھے۔ لیوائی اور مسز لیوائی میرے رشتہ دار اور ان کے ہمسایہ تھے۔ پریم لتا اس لڑکی کا نام ہے جسے شاکر صاحب نے گود لیا تھا۔ بفضل خدا وہ اب جوان ہے اور شادی شدہ ہے۔

"قلم آرٹ" اردو کا ایک فلمی پرچہ تھا۔ راقم الحروف ان دنوں اندور میں تھا اور ایک عجیب قسم کے مقدمہ میں الجھا ہوا تھا۔ اکثر خطوط میں انھوں نے مجھ سے میرے مقدمے کے بارے میں پوچھا ہے۔ مسٹر لاسن سے مراد مسٹر ای لاسن ہیں، جو ہاپوڑ کے قصبہ بابوگڈھ میں مدرس تھے۔ سینچر مشن مسیحوں کا ایک فرقہ ہے جو بجائے اتوار کے سنیچر کو سبت یعنی خدا کا دن مانتا ہے۔ جامن محلہ والا مکان سے مراد میرٹھ چھاؤنی کے حلقہ لالکرتی میں وہ مکان ہے جو ۸۹ جامن محلہ کہلاتا ہے اور جہاں میری والدہ صاحبہ مقیم ہیں۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے - ایل ایل بی نے ایک کتاب[1] انگریزی زبان میں ۱۹۴۱ء میں تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔ تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔

خوشباش صاحب فلمی جرنلسٹ ہیں۔ لائل صاحب سے مراد مسٹر برٹی لائل تسلیم بریلوی ہیں۔ میرے مشورے پر یہ شاکر صاحب سے ملتے رہتے تھے۔ بعد میں ان کے والد قبلہ پادری میتھوز لائل نے دہلی سے ایک اردو رسالہ زندگی کے نام سے نکالا جو تادم تحریر شائع ہوتا ہے۔

---

[1] یوروپین و انڈو یوروپین شعرائے اردو و فارسی

آخری خط ۳ فروری ۱۹۵۶ء کا ہے۔ شاکر صاحب ۲۵ فروری کو راہی ملک عدم ہوگئے۔
میرے پاس شاکر صاحب کے تقریباً سو خطوط ہیں بشرط حیات و مہلت انھیں پیش کرونگا۔

تصانیف :

شاکر کی تصانیف کی فہرست بھی ذیل میں دیدی جاتی ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد دستر پچھتر سے متجاوز ہے لیکن چند کا ذکر کیا جاتا ہے
۱۔ سفرنامہ ابن السبیل ۲۔ تذکرہ ولیم کیری ۳۔ سرگذشت ہلین کیلر ۔ ۴۔ برکات سلطانی ۵۔ رابندر ناتھ ٹیگور ۶۔ حدیقۃ الاخلاق ۷۔ تاج شہادت ۸۔ بلند ایجادات کی کہانی ۔ ۹۔ ایجادات و انکشافات ۔ ۱۰۔ بالشتیوں کی سرزمین ۔ ۱۱۔ دیوزادوں کا ملک ۱۲۔ ہونہار بکا ۔ ۱۳۔ حالات سرسید ۱۴۔ دفا کا پتلا ۱۵۔ سوتیلی ماں ۱۶۔ موت سے لڑنے والے ۱۷۔ چاندکی بیٹی ۱۸۔ اکسیر سخن ۱۹۔ شکنتلا ۲۰۔ میگھدوت ۲۱۔ ٹالسٹائی کے افسانے ۲۲۔ تو کھا را ۲۳۔ تذکرہ خادمان مسیح ۲۴۔ حیرت سدھار۔ ان کے علاوہ پندرہ بیس درسی کتب انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوئی ہیں۔

منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کے خطوط۔

مکرمی تسلیم ۔ یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یقین ہے کہ اس اثنا میں آپ کو میرا کارڈ مل چکا ہوگا۔ سب کام نہایت خوش اسلوبی سے ہوگیا ۔ ۱۶ کو پہلی مرتبہ روپیہ بھی مل گیا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے ۔ اگست سے پنشن مقرر ہوئی ہے ۔ چنانچہ اگست کا روپیہ مل گیا۔ اب ہر ماہ کی ۴ کو پنشن ملے گی۔ "بیڑا" ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ جیکب صاحب یہاں تشریف لائے تھے ، یہاں کے کسی پریس میں پرچہ چھپوانے کا انتظام کیا ہے ۔ ڈکلریشن داخل کردیا ہے ۔ بغیر ملاقات واپس چلے گئے ۔ فلم آرٹ سے مجھے کسی قسم کی اطلاع نہیں ملی۔ تاوقتیکہ مقدمے سے چھٹی نہ مل جائے ملازمت کی توقع کب کی جاسکتی ہے ۔
انڈین وٹنس (Indian Witness) اچھا مشہور پرچہ ہے ، گرانٹ والا مضمون اس کو بھیج دیجئے ۔ امید ہے کہ وہ شائع کردے گا۔ پہلی پنشن چٹ پٹ ختم ہوگئی ۔ کافی قرضدار تھے ۔ سب قرضوں کو بیباق کردیا۔ اب کسی کا دین دار نہیں ہوں خدا کا شکر ہے ۔ اپنے مقدمے کے بارے میں جلد اطلاع دیجئے گا۔ باقی سب خیریت ہے ۔ پریم لتا مزے میں ہے اور سلام کہتی ہے ۔

نیازمند
پیارے لال شاکر

(نوٹ : اس خط میں تاریخ اور مقام موجود نہیں ہے ۔ اور مجھے بھی آج یاد نہیں کہ خط انھوں نے کب لکھا تھا)

۱۱-۱۰-۱۹۵۴
کرسچن بستی
دریا گنج دہلی ۔

مکرمی تسلیم ۔ بہت مدت کے بعد خط ملا ۔ کوائف سے آگاہ ہوا ۔ خدا کرے کہ جلد از جلد اس قضیہ سے نجات مل جائے ۔ میرے معاملات بدستور ہیں ۔ بڑی مشکل سے وقت کٹ رہا ہے ۔ بڑا دن اور نیا سال خیریت سے گذر گیا ۔ یہی بہت ہے ۔ ورنہ مفلسوں کا بڑا دن یا کوئی اور تہوار کیا ۔ آج ہاتھ میں بہت درد ہے اس لئے لکھنے میں تکلیف ہورہی ہے ۔ رات میں بہت زیادہ تکلیف تھی ۔ چوٹ بہت تو نہیں لگی ۔ پنجہ اور کلائی بری طرح مڑ گئی تھی ۔ جس نے دونوں میں درد پیدا کردیا ہے ۔ یہی حال پاؤں کے داہنے پنجہ کا ہے ، کبھی کبھی سر میں اور پشت میں بھی درد ہوتا ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ تکلیف کو سہنے کی طاقت دے دیتا ہے ۔ عابد مسیح صاحب کے حالات پڑھ کر افسوس ہوا ۔ خداوند ان کی مدد کرے ۔

مسٹر لاسن نے ایک کارڈ میرے پاس بھی ارسال کیا تھا۔ میں نے جواب دے دیا ہے۔

مسٹر لیوائی کے یہاں بہت دن ہوئے جانا نہیں ہوا۔ ۱ر ڈسمبر کو گیا تھا راستے میں مسز لیوائی ملی تھیں۔ انھوں نے دعوت دی تھی
ں وقت ان کے یہاں ہو آیا۔ وہاں سے واپس آیا تو گھنٹے ۔۔۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اوپر جانے لگا۔ اور گر پڑا۔ مجھے کچھ ۔۔۔ ان سے
یادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میری سب سے بڑی مدد انھوں نے یہ کی کہ پریم لتا کا انتظام سینچر مشن کے اسکول میں کرا دیا۔ جانے کے لئے کرایہ
- ر۵) بھی انھوں ہی نے دیا تھا۔ ایک دفعہ وہ لڑکی گئے تھے تو پریم لتا کو -/2 Rs نقد بھی دے آئے تھے۔ ملنے جلنے میں ہمیشہ میری
انی مرتی ہے بات یہ کہ میں رسمی بات چیت کرنے کے فن سے ناواقف محض ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بھی مجھ میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے
ں خاموش طبیعت آدمی ہوں کسی وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ آپ کا پیغام پہونچا دوں گا۔ اگر اندور جاتے ہوئے ملیں گے تو مجھ
ر کرم ہوگا۔ آپ سے ایک خاص بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی "درخواست" نہیں صلاح و مشورہ مطلوب ہے۔

لکھتے لکھتے طبیعت ایکدم مکدر و مضمحل ہوگئی۔ لہذا یہیں ختم کرتا ہوں۔ اپنی والدہ اور خالہ کو سلام کہئے گا۔ خوشی ہوئی کہ خالہ کو کوئی کام
، گیا ہے کیا جامن محلہ والا مکان چھوڑا نہیں ہے ؟ فقط تسلیم

نیازمند
پیارے لال شاکر

کرسچن بستی - دریا گنج - دہلی
۴-۱۲-۱۹۴۶

مکرمی تسلیم۔ یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ شائد میرا خط آپ کو ملا نہیں گم ہوگیا۔ بلکہ ایک معنی میں اپنے دل
یں نادم تھا کہ شاید آپ کو یہ خیال ہوگا کہ میں نے عمداً جواب نہیں دیا۔

شاہدرہ میں ایک عزیزہ کی شادی ۱۱ر دسمبر کو ہے۔ اس روز میں وہاں سے غیر حاضر ہونگا اور ممکن ہے ۱۲ر کو بھی بے وقت دہلی پہنچوں
ی دنوں میں یہیں ہوں گا۔ اگر کسی خاص ضرورت سے کہیں جانا پڑ گیا تو اطلاع دیدوں گا۔ کرایہ نہیں ہے کہ کہیں جاؤں لہذا آپ شوق سے
تشریف لائیے۔ جب آئیے تو ایک کارڈ ڈال دیجئے گا تاکہ اس روز گھر میں رہوں۔

میں نے ادبی دنیا میں ایک مضمون لکھا ہے۔ جس کا عنوان تھا "خاندان گارڈنر کے اردو شعراء" یہ مضمون تین قسطوں میں شائع ہوا ایکسینہ
صاحب نے اول قسط میں سے جستہ جستہ واقعات اور باقی دو قسطیں سالم ترجمہ کر کے اپنی کتاب میں شامل کر لی ہیں۔ بی گارڈنر اور آر گارڈنر
کے سالم حالات اور دانیال گارڈنر کے بیشتر حالات میرے مضامین سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے بیکار محنت کی کہ اسبق صاحب کے حالات
ترجمہ کیا۔ اب ارادہ کر رہا ہوں کہ اس سلسلہ میں آخری قسط بھی لکھ ڈالوں مگر سامان بمبئی میں ہے اس لئے اب تک نہ لکھا۔ خصوصاً
لین گارڈنر صاحبہ کے حالات و کلام ابتک پبلک کی خدمت میں پیش نہ ہوسکے ان مضامین کی اشاعت کے بعد مجھے بہت سا کلام محو صاحبہ
دستیاب ہوا تھا جس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی پہلے صرف ایک ہی شعر دستیاب ہوا تھا جس کو میں نے اپنے مضمون میں شامل کر لیا
ہے۔ باقی خیریت ہے۔ فقط تسلیم

نیازمند
پیارے لال شاکر

کرسچن بستی - دریا گنج دہلی -
۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

مکرمی تسلیم - دفتر میں میرے قریب ایک جوان کی نشست ہے - خورشید شفق نام ہے - اور بی اے ہے - قلمی پریوں سے خط و کتابت کا
شوق جنون سے کم نہیں - ہر ہفتہ دو چار خطوط لکھنا معمول ہے - ایک کاغذ میں نے اس سے مانگ لیا ہے - میں نے اپنی تمام عمر میں کبھی فینسی کاغذ

خط و کتابت میں بہت استعمال نہیں کیا۔ یہ جسٹس کیول ہے لال صاحب کام پر واپس آگئے ہیں۔ بزرگوں کی خدمت ہر شخص کا فرض اولین ہونا چاہیے۔ اگر آپ کا یہ عزم ہے تو نہایت مناسب اور خوب۔ خدا آپ کے ارادوں کو پورا کرے اور برکت دے۔ مولانا ابوالکلام سے آج ۳۰-۳۵ برس قبل تو میرے بھی مراسم تھے، جب میں نے "ادیب" سے قطع تعلق کر کے لکھنؤ سے "العصر" جاری کیا تو ان سے بارہا مولانا شبلی کے یہاں ملاقات ہوئی۔ اس وقت یہ لیڈر نہ تھے۔ اب یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ جہاں تک میری ذات خاص کا تعلق ہے دہلی میں میرا کوئی واقف نہیں۔ میں برسوں سے گوشہ گمنامی میں پڑا اپنی زندگی کے دن گذار رہا ہوں۔

ہاں "زندگی" کے لیے سرمایہ کی ضرورت ضرور ہے۔ ابتدائی کاروائی مکمل ہو جائے تو اس کے لیے بھی کچھ نہ کچھ انتظام کی سبیل ہو سکتی۔
میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ کبھی کبھی طبیعت گر جاتی ہے۔ پھر کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ یہ بالعموم تکان سے ہوتا ہے۔ یوں بھی تقاضائے عمر ہے۔ کسی تعطیل کے دن اگر دہلی آئیے گا تو پہلے اطلاع مل جانے پر تمام دن گھر میں قید رہنے کو تیار ہوں، ہمارے یہاں تو اب دیوالی پر چھٹی ہوگی اور ویسے ہر اتوار کو چھٹی ہوتی ہے۔
میں آپ کا پوسٹ کارڈ بھی دفتر میں ساتھ لے آیا تھا۔ اس لئے کہ اس کو سامنے رکھ کر خط لکھا ہے تاکہ کوئی جواب طلب بات نہ رہ جائے

نیازمند
پیارے لال شاکر

آخری خط

مکرمی تسلیم۔ دو پوسٹ کارڈ ملے۔ میرے حالات بہت خستہ ہو گئے ہیں سالم تین ماہ ہو گئے کہ صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ خوراک کا یہ حال ہے کہ اشتہا بالکل جاتی رہی۔ بمشکل نصف چپاتی ایک وقت میں کھاتا ہوں۔ بلا سہارا چار قدم چلنا بھی دوبھر ہے۔ آج چھوٹے لڑکے کو تار دیا ہے۔ دیکھیں کیا جواب آتا ہے اندور سے جب بھوپال پہونچ جاؤ تو فوراً اطلاع دینا۔ بھوپال کے جو حالات آپ نے لکھے ہیں ان سے تو میں نے بھوپال کو ترجیح دی تھی۔ بہرحال آج کل قابل غور چیز روٹی ہے۔ میں بہت پریشان اور الجھن میں ہوں۔ دن رات نیند نہیں۔ ٹخنے متورم ہو کر پنڈلیاں بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت لکھا نہیں جاتا۔ آج بل پیش کر کے پنشن وصول کرنے کا دن تھا مگر حالات کے باعث جا نہیں سکا۔ صبح اٹھا تو طبیعت بالکل مردہ تھی۔ مقدمات کا کیا ہوا۔

نیازمند
پیارے لال شاکر ۳ر فروری ۵۵ء

ڈاکٹر زور

بہ نازِ طبع بلند و بہ زعم کم نگہی — زمانہ سازیٔ دنیائے دوں سے چیخ اٹھے
ذرا سی بات سے سارے جہاں میں دھوم ہوئی — جو کم سوادیٔ مہر و سکوں سے چیخ اٹھے
بہ پاسِ خاطرِ جاناں خموش بیٹھے تھے — مگر زبانی بازیٔ جوں سے چیخ اٹھے
کہاں ہے حوصلۂ پرویز، جادۂ شیریں — عجب نہیں جو نرالے ستوں سے چیخ اٹھے

(نقوش لاہور)

طاہرہ نقی ایم اے

مصحفی کی انفرادیت

مصحفی کی شاعری کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔ چنانچہ آزاد لکھتے ہیں "غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے ہیں کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں" اور رام بابو سکسینہ کا خیال ہے "زیادہ تر غزلیں معمولی ہیں اور کسی خاص رنگ کی نہیں ہیں۔ بعض غزلوں کی زمین سودا کے تتبع میں نہایت سخت اور ردیف و قافیہ مشکل رکھے گئے ہیں گو انہیں شاعرانہ کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا سا زور اور استادی نہیں پائی جاتی ..... کہیں میر تقی میر کا درد و گداز ہے تو کہیں سودا کی بلند پروازی، کہیں فغاں کی رنگینی تو کہیں انشا رکا رنگ۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مصحفی میر و سودا، جرأت و انشا، نصیر و ذوق کے کمالات کا جامع تھے لیکن یہ غلط ہے کہ ان کا اپنا کوئی خاص رنگ نہ تھا۔ مصحفی کے کلام میں جہاں دلی کی داخلیت جھلکتی ہے، وہاں لکھنؤ کی خارجیت بھی نمایاں ہے، اس کی وہ زبردست صلاحیت ہے جو فن کے ہر رجحان اور تصور کو اپنا لیتی ہے۔ مصحفی کی اس انتخابی صلاحیت کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہر شاعر کے رنگ کو اپنایا اور اس طرح اپنایا کہ وہ اس کا ہی رنگِ خاص معلوم ہونے لگا۔

مصحفی ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ زبان، مزاج اور فن کے اعتبار سے وہ تھا تو دلی کا شاعر لیکن جب دلی اسکول کا دیوالیہ نکل گیا اور لکھنؤ اسکول کا سکہ چلنے لگا تو مذاقِ عامہ کو خوش کرنے کے لئے اس کو مجبور ہونا پڑا کہ لکھنؤ کے رنگ کو اپنائے، لیکن اوروں کی طرح وہ بہک نہیں گیا، اسی کشمکش اور تصادم کی وجہ سے اس کا ایک انفرادی رنگ پیدا ہوا جو محض داخلی ہے نہ خارجی، نہ تصوری ہے نہ حقیقی، نہ کلاسیکی ہے اور نہ رومانی، محض دلی کا رنگ ہے اور نہ لکھنوی۔ یہ جو رنگ پیدا ہوا اس میں دونوں رنگوں کا ایک طرح کا سمجھوتہ ہے۔ یہی رنگ اس کا انفرادی رنگ ہے اور اس رنگ کو جہاں وہ پیش کرتا ہے، وہیں ایک ایسے طرزِ سخن سے روشناس کراتا ہے جو اپنے ادبی تصادم سے پیدا ہو۔ جہاں اس نے سودا، جرأت اور انشا کا رنگ قبول کیا ہے۔ وہاں یہ محسوس ہوتا ہے نہ جو عظمت و خارجیت سودا میں ہے، جو شہدپن جرأت میں ہے اور جو طراری و بے اعتدالی انشا میں ہے وہ مصحفی کے یہاں نہیں، ہر رنگ میں اس کے یہاں ٹھہراؤ، بھاؤ اور متانت ہے اور یہی اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ تھوڑی بہت مزاج کی مشابہت سودا کے کلام کے اس حصہ میں ملتی ہے جب وہ داخلیت کی طرف آتے ہیں۔

مصحفی کی شاعری کو [illegible]

اسی رنگ میں ہے جو دلی میں مقبول تھا۔ اس کے یہاں کثیر تعداد میں اشعار داخلیت لئے ہوئے ملیں گے۔ اس دور کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مزاج کے اعتبار سے مصحفی بڑی حد تک میرؔ سے مشابہ تھے۔ ان کی شاعری میں وہی سوز و گداز وہی درد و غم اور وہی پژمردگی و خستگی ملتی ہے جو میر کی غزل کی نمایاں خصوصیت ہے۔ چنانچہ میرؔ کہتے ہیں

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ

مصحفی کہتے ہیں۔

تیرے کوچے میں ہم آ کے بھی ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے
کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کے چلے گئے

یا پھر

ہم تو اس کوچہ میں گھبرا کے چلے آتے ہیں
دو قدم جاتے ہیں اور جا کے چلے آتے ہیں
وہ جو ملتا نہیں ہم اس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

مصحفی میرؔ کے انداز میں کہتے ہوئے بھی میرؔ سے الگ ہے، اس نے میر کی پیروی کی بھی ہے تو ذرا کترا کے کی ہے۔ میرؔ کا شعر شدت احساس کا معجزہ ہے لیکن مصحفی کے شعر میں فطری واقعیت اور محاکاتی خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ "مصحفی کے اکثر اشعار میں جذبات کی سیدھی سادھی عکاسی، زبان و بیان کی نرمی، خاموش سپردگی اور ایک خاص قسم کی لطافت پائی جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی
دیکھا اسکو اک آہ ہم نے کر لی

اس قدر انقلاب کس دن تھا
حادثے ہوتے ہیں زمانے میں
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا
مصحفی آج تو قیامت ہے

میرؔ کے رنگ سے متاثر ہوتے ہوئے بھی مصحفی کی شاعری میرؔ کا چربہ نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ مصحفی کی شاعری کا انحصار محض انتخابیت تقلید اور تتبع پر منحصر نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مصحفی کے مزاج میں نرمی سوز و گداز سب کچھ ہے لیکن اس کی یہ نرمی یاس و حرمان میرؔ کے سوز و گداز سے مختلف ہے۔ میرؔ کے یاس، حو خود پرستی، پنداری اور فقیرانہ انداز جھلکتا ہے وہ مصحفی کے یہاں نہیں۔

مصحفی کی شاعری کے دوسرے دور میں بھی اس کی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ یہ وہ دور ہے جہاں اس کو دلی اور لکھنؤ اسکول کے دوراہے پر کھڑا پاتے ہیں۔ اسی دور میں ایک قسم کی داخلی خارجیت پائی جاتی ہے بقول فراق گورکھپوری "جذبات کی میانہ روی تخیل وجدان کو قدم بہ قدم خارجیت کی طرف بڑھائے لئے جاتی ہے۔"

یہاں مصحفی سوداؔ کے انداز بیان سے متاثر معلوم ہوتا ہے، اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سوداؔ کے رنگ کو اگر کسی نے واقعی فروغ دیا ہے تو وہ مصحفی ہے اس میں شک نہیں کہ سوداؔ کا تخیل زیادہ زوردار ہے لیکن ان کے پاس وہ نیس وہ کسک اور ساتھ ہی وہ رنگینی نہیں جو مصحفی کے اشعار میں نمایاں ہے۔

اے مصحفی افسوس کہاں تھا تو زمانے
کل اس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

اس دل میں تیرے ملنے کا ارمان رہ گیا
یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا

مصحفی سوداؔ کے انداز بیان سے وہاں متاثر معلوم ہوتا ہے جہاں سوداؔ کے یہاں داخلیت کی نرمی اور سوز کا پرتو جھلکنے لگتا ہے خارجیت کی جو عظمت سوداؔ کے یہاں ہے، اس سے مصحفی کا کلام خالی ہے لیکن مصحفی کے پاس جو ٹھیراؤ، ٹھنڈا اور متانت ہے وہ اس کو سوداؔ سے الگ کرتی ہے۔ ہر چند مصحفی کی طبیعت میں وہ جوش و خروش، وہ تلاطم و طوفان نہیں جو سوداؔ کا حصہ ہے، پھر بھی اس رنگینی اور خارجیت نے جو مصحفی کے وجدان میں تھی اس کی زبان میں ایک خاص نکھار پیدا کر دیا اور اس کو اتنا ہموار بنا دیا کہ مشکل زمینوں کو شگفتہ کر دکھانے میں وہ سوداؔ سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ مصحفی نے ایک رباعی میں خود کو سوداؔ کے بعد آنے والا شاعر بتایا ہے اور کہتا ہے کہ میری شاعری کی شان سوداؔ سے الگ ہے۔

سوداؔ کا سرد ہو چکا ہے بازار — اب بزم سخن ہے میرے دم سے گلزار
ہے شان تری جلوہ گری میں ہر وقت — سچ ہے کہ تجلی کو نہیں ہے تکرار

مصحفی جب دلی کو خیرباد کہہ کر لکھنو پہونچا تو یہاں جرأتؔ اور انشاؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ جرأتؔ کی معاملہ بندی اردو غزل میں ایک نئی چیز تھی یہ جرأتؔ کا اپنا خاص رنگ ہے جس کو کوئی اپنا نہ سکا لیکن مصحفی نے جرأتؔ کے رنگ کو بھی اختیار کیا اور ایسی خوبصورتی کے ساتھ کہ وہ مخصوص اسی کی چیز نظر آنے لگا۔ لیکن اس کے باوجود مصحفی کے یہاں جرأتؔ کی بے باکی و بے حجابی نہیں اس نے جرأتؔ کے ابتدائی انداز سے بچنے و احتراز کرنے کی کوشش کی ہے" جرأتؔ کا چلبلا پن اس کی اپنی فطرت کا تقاضا تھا جس سے مصحفی کو کوئی مناسبت نہ تھی چنانچہ جب کبھی جرأتؔ سے بازی لے جانے کی کوشش کی ہے قدم بہک گئے ہیں اور ایسے اشعار کہہ گئے ہیں جس کا مصحفی جیسے شاعر سے متعلق کرنا گراں گزرتا ہے ؎

یہ طرفہ اختلاط نکالا ہے تم نے واہ — آتے ہی پاس چٹ سے وہیں مار بیٹھنا

لیکن بعض موقعوں پر اس رنگ میں بھی کامیاب رہے اور اپنے تخیل کی مدد سے خارجی موضوعات میں بھی جرأتؔ سے زیادہ پیاری اور مزیدار باتیں کہہ جاتے ہیں یہ ان کے معتدل اور رچے ہوئے مذاق کا نتیجہ ہے اور یہاں بھی ان کی انفرادیت نکھر جاتی ہے" ؎

انگڑائی لیکے مجھ پہ اپنا خمار ڈالا — کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا
ہے سحر تیرا سر جھکا کے چلنا — پھر شرم سے مسکرا کے چلنا
آنا گھر میں تو کھل کھلانا — اور راہ میں منہ بنا کے چلنا

مصحفی اور انشاؔ کے معرکوں میں مصحفی کا جو کلام ملتا ہے وہ انشاؔ اور جرأتؔ کے طرز میں ہے۔ ان معرکوں میں مصحفی کے یہاں بہت کچھ ابتذال اور پھکڑپن ملتا ہے انشاؔ کی گرما گرمی، چلبلے پن اور شوخی و طرفداری کے آگے وہ کچھ دب سا جاتا ہے کیونکہ یہ رنگ اس کے شایان شان بھی نہ تھا، تاہم مصحفی نے انشاؔ کے رنگ میں بھی کہا ہے ان کی طرح سنگلاخ زمینوں میں شعر کہے ہیں مشکل قوافی و ردیف کو نبھایا ہے۔ لیکن اس کے یہاں وہ جوش بیان پیدا نہیں ہوتا جو انشاؔ کے یہاں ملتا ہے۔ مصحفی کا یہ رنگ لکھنو کی خارجیت کا فیضان ہے جو سوداؔ کی خارجیت سے بالکل علحدہ چیز ہے اس سلسلہ میں مصحفی نے کئی مشکل ردیف و قوافی کو نہایت خوبی و کمال سے نبھایا ہے چنانچہ نقاب الٹا، آفتاب الٹا، چراغ ٹھنڈا والی غزلیں اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

غرض مصحفی کی ہمہ گیر طبیعت نے ان تمام شعراء کے رنگ کو اپنا یا ضرور ہے۔ اس لئے عام طور پر نقاد وں اور تذکرہ نویسوں کی متفقہ رائے

یہی ہے کہ اس کا کوئی اپنا رنگ نہیں ہے حالانکہ ایسا بالکل نہیں مصحفی کا ایک انفرادی رنگ ہے جس کا وہ تنہا مالک ہے۔ اس کے مزاج کی نرمی، شگفتگی سوز و شرافت نے اسے جرأت کی طرح کھُل کھیلنے دیا نہ انشا کی طرح گھمنڈ کرنے اور فن کے حدود سے متجاوز ہونے دیا۔ نہ وہ میر کی طرح فقیرانہ عظمت لا سکا نہ سودا کی نری خارجیت کی جھلکیں اس کے کلام میں آ سکیں مصحفی کا انفرادی رنگ اس وقت جھلکتا ہے جہاں اس کے پاس خارجیت و داخلیت کا امتزاج ملتا ہے اور جہاں وہ بیک وقت دلی اور لکھنو دونوں اسکولوں کا نمائندہ شاعر کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔

میر نے مصحفی کے جس شعر کی تعریف کی تھی وہ داخلی اور خارجی اعتبار سے نہایت مکمل شعر تھا۔

؎ یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا — دے پیچ اِدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو

یا پھر۔

اے مصحفی افسوس کہاں تھا تو دوانے — کل اس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

عجب کے اظہار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خارجی حسن کا پرتو اس کی شخصیت میں رس بس گیا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کا لازمی جز بن گیا ہے۔

شب اک جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا تھا

اب تک وہی سماں ہے غرفے کی جالیوں پر

گو حسن کا منظر عالم خارجی میں دیکھا ہے لیکن یہ خارجی منظر اس کے احساسات کی دنیا پر چھا کر داخلی رنگ بن گیا۔ مصحفی نے لکھنوی خارجیت سے حتی الامکان پرہیز کیا یعنی اس کے پاس کنگھی چوٹی، سرمہ کاجل مسی کا بیان نہیں ہوتا نہ ہی ان کے پاس نری داخلیت ہی ملتی ہے۔

مصحفی کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے کلام میں بڑے حسین مرقعے ملتے ہیں جو اس کی شاعری کو نگار خانہ یا تصویر خانہ بنا دیتے ہیں اور بقول فراق گورکھپوری "رنگ روپ، صورت و شکل سجاوٹ نکھار کا آئینہ دار جتنا مصحفی کا کلام ہے اتنا اردو کے کسی اور غزل گو کا کلام نہیں۔ یہ بات جتنے عنوانوں سے مصحفی کے یہاں ہے وہ میر، سودا، جرأت، انشا، غالب، مومن، ظفر، داغ کسی کے یہاں نہیں پائی جاتی"۔

؎ دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر — شرما کے جو چلے ہی سارا بدن چرا کر

؎ بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا — پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

آج تک اردو کے کسی شاعر کے یہاں رنگ کا لفظ اتنا استعمال نہیں ہوا جتنا مصحفی کے یہاں، مصحفی کی اس خصوصیت کی طرف مجنوں گورکھپوری نے بھی اشارہ کیا ہے "مصحفی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے اشعار میں رنگ و فضا کا احساس پیدا کیا اور یہی ان کی زبردست انفرادی خصوصیت ہے جس کا اثر اردو شاعری پر پڑا۔"

فراق نے مصحفی کے ایک اور انفرادی رنگ کو پیش کیا ہے وہ ہے ترسنا، تشنگی اور دل مار کر رہ جانے والا احساس اس رنگ میں مصحفی کا کوئی حریف نہیں ؎ حسرت پر اس مسافر بے کس کی روئیے — جو تھک کے بیٹھ جاتا ہے منزل کے سامنے

گنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر — فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

بہرحال مصحفی کا کلام چاہے وہ داخلی پہلو رکھتا ہو چاہے خارجی ایک خاص کیفیت رکھتا ہے مصحفی کے خارجیت و داخلیت کو کانٹوں پر تول دیا ہے۔

فضیل جعفری

محبوب حسین تحمّل

بات کوئی نئی نہیں لیکن بطور تذکرہ لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ دلّی، حیدرآباد اور لکھنؤ کے علاوہ الہ آباد بھی زمانۂ قدیم سے علم و ادب کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ شاہ علیم اللہ حیرتؔ، ناسخؔ، افضلؔ، شاہ محمد اجملؔ، افضل الہ آبادی، میر پرورش علی سخیؔ، غلام امام شہیدؔ، خواجہ غلام غوث بیخبرؔ اور دوسرے کئی سو شعرا و ادبا کے خمیر اسی خاک پاک کے رہینِ منت ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی اور نوحؔ ناروی کا نام ادب سے تھوڑی بہت بھی دلچسپی رکھنے والے کے لیے نیا نہیں ہے۔

ایک بہت مشہور اور زبان زدِ خاص و عام شعر جس سے ہم آپ واقف ہیں یہ ہے۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی پہنچانے کو

یہ شعر جناب وحیدؔ الہ آبادی کا ہے جن کا شمار اپنے زمانے میں نہ صرف الہ آباد بلکہ پورے ملک کے مسلّم الثبوت اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ وحیدؔ صاحب الہ آباد کے ایک دیہات "کراری" کے رہنے والے تھے۔ "کراری" کی سرزمین ہمیشہ سے علمی و ادبی اعتبار سے بڑی زرخیز رہی ہے۔ ہر زمانے میں وہاں سے اچھے اچھے شاعر اور ادیب ابھرے ہیں۔ ایسے ہی اچھے اور خوش گوار شاعروں میں ایک نمایاں نام سید محبوب حسین تحمّلؔ کا ہے۔ تحمّلؔ الہ آبادی ۸ر جولائی ۱۸۸۴ء میں بمقام "کراری" پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد جناب سید الفت حسین صاحب وہاں کے بڑے زمین دار گنے جاتے تھے۔ تایا زین العابدین متخلّص انتہائی قادر الکلام اور بسیار گو شاعر تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے تعلق سے ان کی ایک مثنوی بعنوان "دفتر ماتم" گیارہ ہزار گیارہ اشعار پر مشتمل ۱۸۷۴ء میں مطبع عظمت المطابع پٹنہ سے شائع ہوئی تھی جو اب نایاب ہے۔ تحمّلؔ کے حقیقی ماموں مولوی ابوالحسن صاحب نوفلؔ بھی ایک اچھے شاعر تھے اور فن قصیدہ گوئی میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

چار سال کی عمر میں تحمّلؔ صاحب کی رسم تسمیہ خوانی مولانا سید ظہیر الدین کے ہاتھوں ہوئی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم مولوی شیخ نعمت علی اور مولانا ظہیر الدین سے حاصل کی بعد ازیں انگریزی تعلیم کی غرض سے جمنا مشن ہائی اسکول الہ آباد میں داخلہ لیا۔ شروع سے ہی حضرت تحمّلؔ کو کھیل کود اور اسپورٹس سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ نتیجہ کے طور پر بتدریج نصابی کتب کی طرف سے توجہ کم ہونے لگی اور آخر کار میٹرک کے امتحان میں ناکام ہونے کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد گورنمنٹ پریس الہ آباد میں ملازم ہو گئے اور جلد ہی ملازمت چھوڑ دی۔ شاعری کا چسکا طالب علمی کے زمانہ ہی سے لگ گیا اس پر طرہ یہ کہ نانا اور تایا کی وجہ سے گھر میں ہر وقت شعر و شاعری کا ذکر اور شعرا کا جمگھٹ رہتا تھا۔ تحمّلؔ، حضرت نیساں

الٰہ آبادی کے شاگرد ہو گئے اور پھر جلد ہی علمی و ادبی حلقوں میں اپنا ایک علیحدہ مقام بنا لیا کچھ دنوں کے بعد خود ان کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا۔

تحملؔ الٰہ آبادی اُردو غزل کے بہت بڑے یا نمائندہ شاعر نہ تھے لیکن ان کے کلام کا غور و تامل سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے شاعر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ زیادہ آسانی سے اس فقرہ کا مطلب یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ ان کے اشعار میں زبان و بیان کا نکھرا ہوا شعور، خیالات کی شیفتگی، جذبات کی وارفتگی، انتظارِ یار کے ساز پر گاتی ہوئی دل کی دھڑکنیں، لوچ دار الفاظ کی مترنم سامعہ نوازی، جمالیاتی حسنوں کی خود سپردگی، رنگین و حسین تصورات کا بانکپن اور ایسی ہی دوسری شاعرانہ خصوصیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں جو ہمیں بے ساختہ سوداؔ، جراءتؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، مصحفیؔ اور آتشؔ جیسے گرانقدر شاعروں کی یاد دلاتی ہیں اور ہمارے شعور و جدان پر سوچ کر اداس ہو جاتے ہیں کہ حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں کے گہرے مشاہدے اور مطالعہ کے اعلیٰ معیار کے فقدان نے تحملؔ کو بڑے شاعروں کی صف سے پیچھے ڈھکیل کر اچھے شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مگر اچھا شاعر بھی ہونا کوئی کم قابل قدر چیز نہیں۔

تحملؔ ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ بہت ہی اعلیٰ ظرف اور بلند خیالات کے مالک تھے اگرچہ کہ زمینداری کے خاتمہ کے بعد ان کی معاشی زندگی بحران میں مبتلا تھی، اور مالی طور پر اکثر و بیشتر وہ پریشان رہا کرتے تھے لیکن کٹھن سے کٹھن وقتوں میں بھی وسعت قلبی اور عالی حوصلگی کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ اپنی اس کیفیت کا اظہار ایک شعر میں انھوں نے یوں کیا ہے ؎

خوب واقف ہیں تحملؔ جو ہمیں جانتے ہیں
تنگدستی ہے مگر تنگ نہیں دل اپنا

تحملؔ کی ایک دوسری غزل کے چار شعر ملاحظہ ہوں۔

تیری نظر کو سینے میں دینی پڑی جگہ — نشتر جگر میں آپ چبھونا پڑا مجھے
دعوائے خوں سے داورِ محشر کے سامنے — شرمندہ آپ حشر میں ہونا پڑا مجھے
جسکی تلاش تھی نہ ملا وہ کہیں مگر — دل سا رفیقِ راہ میں کھونا پڑا مجھے
اتنا تو میں ہنسا بھی نہیں تھا تمام عمر — جتنا شبِ فراق میں رونا پڑا مجھے

ان اشعار میں داخلیت کی چاشنی ہے، اور خارجی احساسات کا حسن بھی، فنکارانہ صناعی بھی ہے، اور خیالات کی گہرائی بھی، خاص طور پر تیسرے شعر میں مبالغے کی بھرمار کئے بغیر رہگذارِ عشق اور تلاشِ محبوب میں دل جیسے دوست سے ہاتھ دھونے کا جو صحیح نقشہ کھینچا ہے وہ کافی دلپذیر اور متاثر کرنے والا ہے اسی طرح چوتھے شعر میں ایک خاص قسم کی کیفیت ہے جو دلوں میں کھب رہ جاتی ہے۔

بُری نہیں ہے حقیقت میں حسن کی طینت — یہ اور بات ہے کوئی اگر وفا نہ کرے
نمودِ حسن سے ہے سوزِ ہستیٔ الفت — جلے نہ شمع تو پروانہ بھی جلا نہ کرے
ستم ہوں لاکھ تحملؔ مگر محبت میں — زباں کو حرفِ شکایت سے آشنا نہ کرے

یہ کبھی بادِ بہاری سے شگفتہ نہ ہوا   دل وہ غنچہ ہے کہ رونے سے ہرا ہوتا ہے
ہے یہ نیرنگیٔ بیداد کہ ہر ایک نفس   دل کی فریاد کا انداز نیا ہوتا ہے
ہم نے دیکھا ہے کہ زندانِ محبت کے اسیر   موت بھی آئے تو مشکل سے رہا ہوتا ہے

ان اشعار میں یقیناً وہ سوز و گداز اور جذبات کے باہمی ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی جھنکار ہے جو بڑی شاعری کی دلیل ہے۔ بلکہ ان میں ایک طرح کا تقلیدی اور [illegible] جذبہ کارفرما نظر آتا ہے لیکن تمام اشعار بڑے ہی متوازن ہموار اور معتدل لہجے میں کہے گئے ہیں جنھیں زبان و بیان کی نرمی نے بہت بڑی حد تک دامن کشِ ذہن و دل بنا دیا ہے ؎

جاتی ہے بار بار نظر سوئے در ہنوز   کٹتی ہے انتظار میں شام و سحر ہنوز
جوش و خروشِ موسمِ گل ختم ہو گیا   آیا نہ ہوش میں دلِ وحشی مگر ہنوز
پیشِ نگاہ جلوۂ کونین ہے مگر   رہ رہ کے ڈھونڈتی ہے کسی کو نظر ہنوز

بھولے گی حشر تک نہ وہ تیری نگاہِ مست   دونوں جہاں سے کر گئی جو بے خبر مجھے
ناکام رہ سکا نہ مرا ذوقِ آرزو   جب وہ ملے تو مل گئی دل کی خبر مجھے

یہ تمام اشعار شدید داخلیت اور اس کے ردعمل کی پُرلطف چاشنی سے بھرپور ہیں۔ ان اشعار میں ہمیں ایک سوچا سمجھا ہوا عشق اور ایک جانا پہچانا ہوا محبوب، ضو فگن نظر آتا ہے۔ یہاں نہ تو عشق کی روایتی دیوانگی ہے نہ محبوب کی کھل کھیلنے کی ادائیں بلکہ دونوں طرف سے ایک طرح کی معصومیت اور گمبھیرتا کا احساس ہوتا ہے۔ اب اسی قبیل کے کچھ اور اشعار سنئے۔

مثالِ شمع اے دل امتحاں گاہِ محبت میں   وفا کا نام روشن کر کے بے نام و نشاں ہونا
مرنا ہے ان کی یاد میں اک آہ کھینچ کر   کرنا ہے قصۂ شبِ غم مختصر مجھے
خاموشیوں سے اپنی تحمل ہوا نہ کچھ   اب دیکھنا ہے نالۂ دل کا اثر مجھے

اپنے آخری دنوں میں تحمل صاحب نے شعر کہنا بہت کم کر دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے زمانے کے تمام اساتذۂ سخن ایک ایک کر کے اپنے ابدی وطن کو واپس لوٹ چکے تھے اور علم و ادب کا رجحان اپنے تمام افادی پہلوؤں کے باوجود اس نسل کو متاثر نہیں کر سکا تھا جس کا نمائندہ تحمل صاحب تھے۔ کہیں کہیں انھوں نے اس پہلو کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

وہ محفلیں سخن کی تحمل نہیں مگر   دل ڈھونڈتا ہے محفلِ اہلِ ہنر ہنوز
خاطر سے دوستوں کی تحمل لکھے یہ شعر   فکرِ سخن بھی ورنہ مجھے ناگوار تھا

اب میں جناب محبوب حسین صاحب [illegible] آبادی کے چند [illegible] اشعار نقل کر کے مضمون ختم کرتا ہوں۔

دلوں کی آزمائش ہے مگر یاں فرق اتنا ہے   کسی کا امتحاں لینا کسی کا امتحاں ہونا
فروزاں آتشِ غم ہے تو آہیں رک نہیں سکتیں   جو دل میں آگ بھڑکی ہے تو لازم ہے دھواں ہونا

روحِ میخانۂ ہستی ہے جوانی کی شراب   بادہ کش آنکھوں ہی آنکھوں میں پئے جاتے ہیں

آتش عشق میں مٹنے کا نہیں رنگِ وفا — پھونک بھی دے تو دلِ سوزاں کو تو کیا ہوتا ہے
زندگی ہم اسی کوچہ میں بسر کرتے ہیں — دل میں سو بار جہاں حشر بپا ہوتا ہے

الفت کا ایک جذبۂ بے اختیار تھا — جس پر حیات و موت کا دار و مدار تھا
ذرہ جو خاکِ دل کا شریک غبار تھا — ہر گرد باد آئینۂ انتشار تھا

پھر آمدِ بہار کے چرچے قفس میں ہیں — پوچھے ہمارے دل سے کوئی اس خبر کی چوٹ

وہ راہِ عشق و محبت کی پہلی منزل ہے — سمجھ رہا ہوں جسے حدِ وفا پرستی کی

مشکل نظر آتا ہے پہنچنا سرِ منزل — اس سمت چلا ہوں کئی رستے ہیں جدھر اور

حضرت تحمل نے ۱۸ جنوری ۱۹۵۹ء کو انتقال کیا۔ اپنے پیچھے چار لڑکیاں اور تین لڑکے چھوڑے۔ تحمل کا غیر مطبوعہ کلام جناب موہن حسین شعلہ الہ آبادی، جناب نثار عباس اور جناب جمیل الہ آبادی کے پاس محفوظ ہے۔ ویسے تحمل صاحب کا تمام کلام تا حال غیر مطبوعہ

محمد علی زیرک

غزل

ہزار بار چمن میں بہار آتی ہے — بہارِ عمر کہاں بار بار آتی ہے
رنگی ہوئی ہے کسی بے گناہ کے خون میں آج — دلہن بنی ہوئی شمشیر یار آتی ہے
یہی جو آتشِ فرقت ہے تو خاک جئیں — کہ لب پہ آہ بھی بن کر شرار آتی ہے
مجھے ہے دوست سے بھی بڑھ کے خاطرِ دشمن — کہ اس کی بات کلیجے کے پار آتی ہے
نہ جانے سنتی ہے کیا آسمان پر شبنم — کہ روز سوئے زمیں اشک بار آتی ہے
مثالِ برق ہے دنیا میں زندگی کا قیام — ہوا کے گھوڑے پہ ہو کر سوار آتی ہے

لگے نہ داغ گریباں صبر کو زیرک
کہ خون کی میرے اشکوں سے دھار آتی ہے

محی الدین احمد

سید رضی الدین حسن کیفی

خاک دکن نے سلاطین بہمنیہ کے عہد سے لیکر اس وقت تک صدہا ایسے شاعر پیدا کئے جو آسمان شعر و سخن پر بلاشبہ چمکتے ستارے کہلائے جانے کے مستحق تھے لیکن زمانہ کی ناقدری نے انکو ایسا بھلا دیا کہ آج کوئی انکا نام بھی نہیں جانتا۔ پرانی باتیں تو خیر جانے دیجئے تقریباً چالیس سال پہلے ہی یہاں غلام دستگیر اسیر۔ قادر محی الدین سلیم حبیب الدین صغیر عبدالولی فردؔ خواجہ بدیع اللہ خاں قیس وغیرہ ایسے شاعر گذرے ہیں، جو فی الواقع اساتذہ سخن تھے لیکن آج کتنے آدمی ہیں جو انکے نام اور کلام سے واقف ہیں مجھ جیسے دس یا پانچ اشخاص جو ذاتی طور پر ان سے یا انکے شاگردوں میں غزل پڑھتے سنا ہوگا بس انہی کی یاد میں یہ لوگ باقی رہ گئے ہیں لیکن جب ہم لوگ بھی نہ رہینگے تو انکو جاننے والا بھی کوئی نہ رہیگا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ڈاکٹر زور کا کہ انہوں نے ایک مرقع سخن سجا کر اور اس میں ان متذکرہ صدر شعراء کی ایک معتدبہ تعداد کو جگہ دیکر انہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اس مرقع میں کیفی بھی شامل ہیں۔

ہمارے ملک کا یہ مایہ ناز شاعر ۱۴ شعبان ۱۲۹۶ھ ہجری جمعہ کے دن پیدا ہوا۔ انکے اجداد عادل شاہیوں کے زمانہ میں عرب سے ہند میں آئے اور قصبہ جنیر میں جو فی الوقت ضلع احمدنگر کا ایک قصبہ ہے اقامت گزین ہوئے انکے جد اعلیٰ جو اپنے وقت کے ایک عارف باللہ بزرگ تھے انکا مزار بھی وہیں قصبہ جنیر ہی میں ہے جسکے عرس وغیرہ کے اخراجات کے لیے معاش بھی سرکار سے مقرر تھی۔ حضرت کیفی کے والد حضرت سید شاہ نظام الدین احمد صاحب ایک عالم باعمل بزرگ تھے علوم متداولہ کے ماہر اور متقی و پرہیزگار تھے۔ محکمہ تعلیم جمعیت میں ناظم صاحب کی پیشی کے منتظم تھے انکے علم و تقدس کی وجہ اکثر نظما بھی انکا ادب ملحوظ رکھتے اور جب آپ مسئلہ پیش کرنے لیجاتے تو انکو اپنے پاس بٹھا کر مسئلہ ملاحظہ کرتے۔ کیفی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہوئے جو اس زمانہ میں واحد سرکاری مدرسہ تھا۔ یہاں سے کیفی نے منشی عالم کا امتحان کامیاب کیا۔

کیفی میں ذوق سخن فطری تھا انھوں نے زمانۂ طالب علمی ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اولاً حفیظ الدین یاسؔ سے اصلاح لی لیکن انکا انداز سخن ایک خاص رنگ حاصل تھا کیفی کی سیدھی سادی شاعری کے ساتھ نہ نبھ سکا اسلئے کیفی حضرت میکش کے شاگرد ہو گئے۔ حضرت میکش تھانہ بھون ضلع سہارنپور کے رہنے والے ایک صوفی منش اور فقیر دولت برہمن تھے۔ انکا نام سورج بھان تھا ایک مرتبہ ایک سفر کے دوران میں حضرت مولانا امداد علی صاحب علوی سے جو حضرت سردار بیگ صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ ملاقات ہو گئی انکے ہمراہ حیدرآباد آگئے اور انہی کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر بیعت کی انکا اسلامی نام شمس الحق رکھا گیا جو سورج بھان کا عربی ترجمہ ہے۔ حضرت علوی کی توجہ اور اپنی ذاتی جد و جہد اور ریاضت و مجاہدے سے بہت جلد اس مرتبہ پر فائز ہو گئے کہ حضرت علوی نے انکو خلافت بھی عطا فرما دی۔

حضرت علویؔ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے اور انکا یہ شعر۔ آج تک قوالی کی محفلوں میں حرف آغاز کے طور پر سنایا جاتا ہے۔

ابھی کھل جاؤں تو سب راز حقیقت کھل جائے ۔۔۔ نامۂ حب حقیقی کا لفافہ میں ہوا
کیا ملک میری حقیقت کو سمجھے علویؔ ۔۔۔ انکا استاد نہ سمجھا وہ معمہ میں ہوا

غرض حضرت علوی کی صحبت میں حضرت میکش بھی شعر و سخن سے دلچسپی لینے لگے اور بہت جلد وہ مشق بہم پہنچائی کہ استاد ہو گئے انکے تلامذہ میں عالی محمود علی وغیرہ شامل تھے لیکن کیفی انکے شاگردوں میں بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے چند ہی دن بعد حضرت میکش نے نہ صرف

انکو اصلاح سے بے نیاز قرار دیا بلکہ اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی انکے سپرد کر دی چنانچہ حضرت بیکش کے پرانے شاگرد عدیل انجم وغیرہ آخر تک اپنا کلام حضرت کیفی ہی کو دکھلا کر اصلاح حاصل کرتے رہے۔ آخر میں حضرت بیکش نے اپنا دیوان حضرت کیفی کو یہ کہکر دیا کہ میاں کیفی اسکو چھپنے سے قبل تم بھی دیکھ لو کہ ضعیفی کے سبب میں سٹھیا گیا ہوں نہ معلوم کیا کیا لکھ دیا ہے" چنانچہ لائق شاگرد نے حسب الحکم استاد شرف تکمیل حاصل کیا۔ حضرت کیفی کے کلام میں جہاں جہاں تصوف کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ حضرت بیکش ہی کی شاگردی کا اثر ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ حضرت بیکش تھانہ بھون کے رہنے والے برہمن اور ایک صوفی بزرگ تھے وہ حضرت الوی کی نسبت باطنی اور ذاتی ریاضت و مجاہدہ سے خود وادیٔ طریقت تو طے نہیں کئے۔ زبان پر عبور حاصل نہ کر سکے اس خیال کے پیش نظر اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک محفل مشاعرہ میں جہاں حضرت داغ صدر مشاعرہ تھے۔ کیفی نے غزل پڑھی جسکا مطلع یہ تھا ؎

ترک الفت کا ارادہ قصداً یونہی بھی ہے
کیا کروں دل میں تمنائے ہم آغوشی بھی ہے

استاد داغ نے مصرع اٹھاتے ہوئے مصرع ثانی کو یوں بدل دیا کیفی ع " اور پھر دل میں تمنائے ہم آغوشی بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ استاد داغ کی اصلاح نے شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ حضرت کیفی اٹھکر آداب بجا لائے اور کہا کہ "جاہم استاد شما ہست" اور اس دن سے حضرت داغ کی شاگردی اختیار کی اور شاگرد ہوئے تو بس ایسے ہوئے کہ استاد ہی کے ہوکر رہ گئے یہ کہیں ملازم تھے نہیں گھر بار سے بے فکر تھے چوبیس گھنٹے استاد کی خدمت میں حاضر رہنے لگے جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ استاد داغ بھی انکے ساتھ اپنے عزیزوں کا سلوک کرنے لگے۔ اس توجہ و تعلیم سے کیفی نے کچھ ایسا استفادہ کیا اور محاورات کے استعمال میں وہ مہارت حاصل کی کہ کیفی کے کلام میں داغ کا رنگ جھلکنے لگا خصوصاً چلبلا پن آمد لطف زبان اور روزمرہ محاورات کا استعمال جو داغ کے کلام کی خصوصیات ہیں، وہ کیفی کے کلام میں بھی نمایاں ہیں چنانچہ حسب ذیل اشعار اسکے شاہد ہیں ؎

عدو کے کہنے سے بگڑے تھے کیا ہوا کیفی
ابھی ہمارا ابھی پردہ دار تقاضا نہ تھا

سب کو اس بزم سے پیمانہ ملا جام ملا
آنکھ کیا تم سے مجھے تو اے ساقی نہ جام ملا

دل گم گشتہ کو ڈھونڈا کہیں پایا نہ گیا
وہ یہ کہتے ہیں یہاں تو کوئی آیا نہ گیا

نہ پوچھو تم ادا کیا ہے شرارت کس کو کہتے ہیں
سکھانے سے کہیں انداز معشوقانہ آتا ہے

کیفی اکثر مشکل اور اوق قوافی کا انتخاب کرتے اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور ان سنگلاخ اور بنجر زمینوں میں ایسے ایسے پھول اگاتے ہیں کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے چنانچہ یہ غزل ملاحظہ ہے ؎

کسکے دل میں کھب گئی کس کی نظر میں بچ گئی
میرے دل کی شے خدا معلوم کسکو بیچ گئی

تیز و تند و تلخ و دیرینہ شراب آتشیں
میرے ساقی نے مجھے جتنی پلائی پچ گئی

مسکرا کر ہاتھ اس نے اپنے منہ پر رکھ لیا
آج بجلی آسماں سے گرتے گرتے بچ گئی

اب تو میخانہ میں کیفی ایک سناٹا سا ہے
وہ چہل میکشوں کی اور وہ کچھ مچ گئی

بعض شعروں کا انداز بڑا انوکھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خوشامد انتہا اتنی خوشامد اس ستمگر کی
تجھے کچھ بھی خیال اے غیرت مراد نہ آتا ہے

کسی ترکیب سے اتنا تو مجھے سمجھا دے
میں ترا چاہنے والا ہوں یہ کہہ کے سمجھا

لوگ کہتے ہیں کہ شاعر جھوٹ کہتے ہیں حضرت کیفی وجہ جواز یہ پیش کرتے ہیں۔

ہوا سچ بول کر بدنام کیفی
نہ بولیں جھوٹ تو شاعر کریں کیا

انکے اشعار میں بعض جگہ مترادف الفاظ یا تکرار ایسے آتے ہیں کے ہر لفظ اپنی جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہے۔

ملاحظہ ہو

خم۔ سبو، ساغر۔ صراحی جام پیمانہ ہوا
میرے ساقی تو مرا جب ہے تو میخانہ ہوا

وہی ہم ہیں ہزاروں بار جو وابستہ آتے ہیں
تمہارے داؤں میں دھوکے میں چھل میں مکر میں دام میں

بدنام ہوں ذلیل ہوں رسوا ہوں خوار ہوں
سب کچھ سہی مگر ترا امیدوار ہوں

چمن کا پھول میخانہ کا شیشہ چرخ کا تارہ
کوئی ٹوٹی ہوئی شے ہو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

نازک خیالی و مسزادار کے ضمن میں یہ شعر قابل ملاحظہ ہیں۔

نہ زمانہ کو سلیقہ نہ فلک کو ہے شعور
مہرباں کوئی تو ہوتا ترے دیوانوں پر

میرے ہونٹوں کی جو خواہش ہے میں کیا عرض کروں
لب نازک کو کہیں زحمت دشنام نہ ہو۔

حضرت کیفی کی شہرت اور شاعرانہ عظمت بیرون حیدرآباد بھی مسلم تھی ۱۳۲۵ھ میں جب محسن الملک مرحوم کی وفات پر علی گڑھ کالج میں جلسۂ تعزیت منعقد کیا گیا۔ تو اس میں شرکت کی غرض سے حضرت کیفی علی گڑھ گئے تھے حسرت موہانی نے انکو اپنے ہاں مہمان رکھا اور انکی آمد کی تقریب میں ایک مشاعرہ منعقد کیا حضرت کیفی نے اس مشاعرہ میں جو غزل پڑھی اسکے چند شعر یہ ہیں۔

زہے قسمت کے میں ناخواستہ مہمان حسرت ہوں
الٰہی بے خطا تقصیر وار شکر نعمت ہوں

حقیقت کیا ہے میری در حقیقت بے حقیقت ہوں
اگر سمجھوں تو عزت ہوں نہ سمجھوں تو ذلت ہوں

مجھے ہر رنج میں لذت خوشی سے بڑھ کے ملتی ہے
مگر ہیں یا الٰہی عین مقصود مسرت ہوں

مرا اپنے آپ پر ہرگز تصرف کر نہیں سکتا
کسی کے سامنے رکھی ہوئی گویا امانت ہوں

نہ میں مختار در والا ہوں نہ میں مجبور ہوں کیفی
خدا رکھے مجھے میں بھی خدا کی ایک قدرت ہوں

۱۹۳۰ء جب مولانا حسرت موہانی مدراس سے بمبئی جاتے ہوئے حیدرآباد میں چند گھنٹوں کے لئے ٹھیرے تھے تو انھوں نے حضرت کیفی ہی کے پاس قیام کیا تھا حضرت کیفی نے انکو روکنا چاہا لیکن انھوں نے مصروفیت کا عذر کیا تو حضرت کیفی نے یہ رباعی کہی

فضل الحسن آئے چند ساعت نہ رہے
کیفی کی سماجت پہ بھی حضرت نہ رہے

جی کھول کے ملاقات نہ ہونے پائی
حسرت ہی رہی دکن میں حسرت نہ رہے

اسی سفر میں کیفی دہلی میں مرزا خورشید عالم بہادر گورگانی کے مہمان رہے جو حضرت داغ دہلوی کے اخیافی بھائی اور مرزا فخرو کے نواسے تھے انہوں نے بھی کیفی کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ترتیب دیا تھا جس میں کیفی نے جو غزل پڑھی تھی اسکے دو چار شعر حسب ذیل ہیں۔

نہیں ہے قطرہ مئے تک ہمارے ساغر میں
زہے نصیب کہ گردش تو ہے مقدر میں

ستم ظریف جیت نما نظر سے نہ دیکھ
نہ یہ جتا کہ ہم ہم بھی پتھر کے پیر ہیں

دعا ہو دور رہ ترازگہ حضرت خورشید
نیا سفر ہیں یہاں دہلی کے راہوں ہو کے گھر ہیں

یہاں تو پوچھنے والا نہیں کوئی کیفی
خدا ہی پوچھنے والا ہے وہ بھی محشر میں

حضرت کیفی کو مشاعرے منعقد کرنے کا بھی بڑا شوق تھا چنانچہ ۱۳۱۱ھ میں انہوں نے ایک عظیم الشان مشاعرہ ترتیب دیا تھا یہ محفل نواب صاحب کلیانی کے محل واقع کنٹہ تالاب میر جملہ میں منعقد ہوئی اس میں علاوہ دکن کے مشہور و معروف شعرا شریک تھے۔ مثلاً حضرت داغ دہلوی۔ نواب سراج الدین علی خاں سائل دہلوی لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو شاعر جناب پیارے صاحب رشید نبیرۂ میر انیس ایک مرثیہ گو شاعر رشید کی زبان سے اہل دکن کو غزل سننے کا اتفاق پہلی دفعہ ہوا اس سے قبل حضرت رشید مرحوم و مغفور مجالس عزا میں اپنے تصنیف مراثی ہی سناتے تھے انکی غزل کا ایک شعر اور یہ مقطع بہت مشہور ہوا۔

ہوا ہے سخت مشکل دفن کرنا تیرے وحشی کا — جہاں پر قبر کھودی جاتی ہے پتھر نکلتے ہیں
رشید آغاز الفت سے کہیں انجام بہتر ہے — کہ بحر عشق کے ڈوبے لب کوثر نکلتے ہیں

اس مشاعرہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اسی مشاعرہ میں نواب سراج الدین خان سائل دہلوی نے اپنی غزل ترنم سے پڑھی تھی جسکا رواج آجکل مشاعروں میں عام ہو گیا ہے۔ اس سے قبل مشاعروں میں غزلیں تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں ترنم سے نہیں ہاں اس سے شعرا کو یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اگر شاعر کو کلام کی داد نہ مل سکے تو ترنم کی داد تو بہرحال کہیں نہیں گئی۔

میں نے حضرت کیفی کو ایک مشاعرہ میں غزل پڑھتے اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں نظم پڑھتے دیکھا ہے مولوی عبدالقیوم صاحب باقی مرحوم کے والد نواب احمد نواز جنگ مرحوم ثانی حضرت علوی کے مرید اور حضرت میکش کے پیر بھائی تھے۔

وہ ان ہر دو بزرگوں کے عرس کے موقعہ پر مجلس مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے یہ مشاعرے بڑے اعلیٰ پیمانہ پر ہوتے تھے جس مشاعرہ کا ذکر رہا ہوں اسکا طرح مصرع تھا "عرس میکش آگیا ساقی نئے ساغر نکال" اس مشاعرہ میں کیفی معہ اپنے شاگرد رشید حضرت صفی کے شریک تھے مجھے صفی کا ایک اور کیفی کے دو شعر یاد رہ گئے۔ صفی نے کہا تھا۔

جرم دل کا دیکھو مجھکو دیکھو تیری شان دیکھ — جانے دے ایجان ہو جا چشم پوشی کر نکال

اور حضرت کیفی کے شعر یہ ہیں۔

"یا الٰہی تنگ ہوں، دشمن ادھر نامہ ادھر — میرے رستہ سے یہ کانٹے اور یہ پتھر نکال
پہلے مجھکو مطمئن کر دے کسی انداز سے — پھر اگر چاہے تو پہلو بات میں سو تر نکال

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس اسوقت تک کامیاب نہیں تصور ہوتے تھے جب تک اسمیں حضرت کیفی کی کوئی نظم نہ ہوتی میں نے حضرت کیفی کی زبان سے جو نظم اس کانفرنس کے اجلاس میں سنی تھی اسکے چند شعر یہ ہیں۔

ہم نے کیا ہے دائمی علم و ہنر بلند — آجائے اسکے سایہ میں ہر پست ہر بلند
پستی بھی کام کی ہے بلندی بھی کام کی — کب جبکہ پست وقت پہ ہو وقت پر بلند
ہر فرد قوم ہے کیا خرد و کیا بزرگ — اب اسمیں پست خواہ کوئی ہو کوئی سر بلند
فی الجملہ ہم سلیقہ سے جڑ جائیں ایک ساتھ — تو پست مبتدا بھی نکلے خبر بلند

فریاد میری کون سنے بے ٹھکانہ ہوں
گویا میں ایک طوطیٔ نقار خانہ ہوں

حضرت کیفی کی جو تصویر مرقع سخن میں شائع ہوئی ہے وہ غالباً اسی اجلاس کے شرکا کے گروپ فوٹو سے علیحدہ کی گئی ہے کیونکہ مجھے یاد ہے کہ اس اجلاس میں اسی لباس میں آئے تھے ورنہ وہ لباس کے معاملہ میں بہت بے پروا تھے۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا صرف کرتہ، پائجامہ اور سر پر ...

علی کے عمامہ اور سیر بن سلیم شاہی جوتا پہنے ہی دیکھا چونکہ وہ حضرت سید عمر صاحب کے مرید و خلیفہ تھے اسلئے انکے لباس میں بھی فقیرانہ شان پیدا ہو گئی تھی چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ حضرت کیفی سے مل کر دل ہمارا خوش ہوا۔ عاشقانہ ہے طبیعت شکل درویشانہ ہے لباس کی طرح وہ فکر معاش کی حد تک بھی بہت لاابالی تھے انکے والد سید نظام الدین صاحب بہت ذی اثر اور بارسوخ تھے ملک کے بڑے بڑے امراء و عہدہ داروں سے انکے مراسم و تعلقات تھے۔ انکے توسط سے انھیں بہترین ملازمت مل سکتی تھی لیکن انہوں نے کبھی بھی کوئی پابندی قبول نہیں کی اپنے والد کے اصرار پر محکمہ نظم جمعیت میں ملازم ہوئے کئی مہینوں بعد اس محکمہ سے سررشتہ تعلیمات میں منتقل ہو کر کسی مدرسہ پر مدرس ہو گئے لیکن صرف چھ ماہ بعد ہی استعفا دیکر الگ ہو گئے اسکے بعد چند احباب کے ساتھ مل کر ایک مجلس علم و عمل قائم کی جسکے سرپرست نواب اکبر جنگ مرحوم کوتوال بلدہ تھے مجلس کے تعلق سے جب نواب اکبر جنگ کو حضرت کیفی کے علم و انتظامی قابلیت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے انکا تقرر کوتوالی بلدہ کی مدد امینی پر کر دیا، لیکن آشفتہ مزاج کیفی جو مددگاری جیسی خدمت کو برداشت نہ کر سکا وہ کوتوالی کی پابند نوکری کو کیونکر برداشت کرتا چنانچہ وہ ایک دوست کے ساتھ بمبئی روانہ ہو گئے بعد وہاں سے استعفا بھیج دیا۔ انتقال سے کوئی تین سال قبل یہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں مصحح کی خدمت پر مامور کئے گئے چونکہ اس ملازمت میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ترجمہ شدہ مسودات انکے گھر پر آجاتے اور یہ بعد صحت واپس کر دیتے اسلئے یہ ملازمت آخر تک باقی رہی ورنہ زندگی بھر انکا ذریعہ معاش صرف (۲۵) روپیہ منصب اور (۵۰) روپیہ حصہ جاگیر جو انکی سسرالی جاگیر سے ملتا تھا اور کچھ نہ تھا۔

حضرت کیفی نہایت بذلہ سنج اور خوش مذاق شخص تھے ایک بار وہ اپنے کسی دوست سے ملنے انکے گھر گئے وہ شاید کسی کام میں مصروف تھے اور ٹالنا چاہا اپنے ملازم کو کہا کہ کہدو صاحب گھر پر نہیں ہیں لیکن حضرت کیفی نے انکی آواز سن لی۔ جب ملازم نے آکر کہا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں تو بغیر کسی مزید گفتگو کئے واپس ہو گئے اتفاقاً دوسرے ہی دن انہی صاحب کو حضرت کیفی سے ملنے کی ضرورت پیش آئی جب وہ آئے اسوقت یہ اپنے دیوانخانہ میں بیٹھے ہوئے تھے خود دریچہ ہی سے سر نکال کر کہا کہ کیفی گھر پر موجود نہیں ہے۔ انکے دوست نے کہا کہ کیا مذاق کر رہے ہو تم گھر پر موجود ہو اور کہتے ہو کہ گھر پر نہیں ہے اس پر کیفی نے کہا کہ میاں افسوس ہے کہ آج آپ کو خود میرا اعتبار نہیں حالانکہ کل میں نے آپکے ملازم کا اعتبار کر لیا تھا۔

حضرت کیفی کو سیر و سیاحت کا حد درجہ شوق تھا۔ ہر سال اجمیر کے عرس میں حاضری دینا انکے معمولات حیات میں شامل تھا ایک سو سال میں اکثر بار بمبئی کا سفر بھی انکا لازمۂ زندگی بن گیا تھا عروس البلاد بمبئی اپنے حسین منظر و خوش سوادی کی وجہ ہمیشہ حسن پرست نظروں کے لیے جاذب توجہ رہی ہے مولانا فضل حق نعمانی بھی باوجود اپنے زہد و تقدس کے اسی بمبئی کے قصیدہ خوان تھے۔

اسی طرح حضرت کیفی بھی شاعر ہیں اور شاعر بھی حسن پرست بمبئی کی صفت یوں بیان کی ہے۔

دید کے قابل ہے ہر نقش و نگار بمبئی
دیکھنے والوں سے ہی پوچھو بہار بمبئی

کیا کھنڈالہ کیا سمندر سب ہی حیرت کا مقام
ایک تحیر گاہ ہے قرب و جوار بمبئی

غیر آبادی بھی آبادی سے ہرگز کم نہیں
ہیں بجائے خود تماشا کوہسار بمبئی

جمع ہیں یک جا یہاں حوران و غلمان و قصور
ہند میں ہے جنت الماویٰ دیار بمبئی

گردش چشم فسوں گر کا اثر ہے خاص ہے
یا ہے یارب گردش لیل و نہار بمبئی

حضرت کیفی کی وفات بھی اسی طرح وطن سے دور سفر میں ہوئی اواخر جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ میں وہ بغرض شرکت عرس اجمیر حسب عادت تشریف لے گئے ماہ رجب کا چاند اجمیر ہی میں دیکھا اور یہ آخری غزل لکھی۔

مصرف کسی کے رخ کا دکھاتا ہے رجب کا چاند
اجمیر میں دکھا دیا ہے رجب کا چاند

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر دیکھئے)

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

انصار حسین زلالی بدایونی

مولوی انصار حسین زلالی بدایون کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد کا شمار بدایون کے ممتاز وکلاء میں تھا۔ زلالی کی پیدائش بدایون میں ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ اور خاص اس شب کو جبکہ انگریزوں کے بنگلوں میں بدایون میں آگ لگائی گئی تھی۔ زلالی نے اردو فارسی کی تعلیم بدایون میں حاصل کی۔ اس کے بعد مختار کاری کا امتحان پاس کیا۔ ۴۰ سال تک عدالت ہائے دیوانی میں وکالت کی۔ آپ کا شمار ممتاز وکلاء میں تھا۔ آپ کی وفات پر عدالت ہائے دیوانی میں تعطیل رہی۔ مولانا حالی سے پندرہ سال کی عمر میں مشورۂ سخن کیا۔ حالی کے شاگردوں میں صرف آپ ہی زیادہ مشہور ہوئے۔ اکثر مولانا حالی کے پُرخلوص خطوط آپ کے پاس آتے رہتے تھے مگر اب اُن کا پتہ نہیں یا تو کہیں محفوظ ہو گئے یا تلف ہو گئے۔ اکثر مکتوبات میں الفاظ کی تحقیقی بحث ہوتی تھی۔ بیخود دہلوی حضرت موہانی، ساحر دہلوی احسن مارہروی، بیباک شاہجہانپوری، محو بریلوی اور فانی بدایونی آپ کے ہمعصر تھے۔ فانی کے سب سے پہلے دیوان (مطبوعہ وکٹوریہ پریس بدایون) میں آپ کا قطعۂ تاریخ ہے۔ بیخود دہلوی کے آخری مطبوعہ دیوان میں آپ کی ایک غزل کی تضمین ہے۔ اُس غزل کا مقطع یہ ہے ؎

اے زلالی اسپہ کیا کرتا اثر میرا کلام — میں کوئی حالی نہ تھا غالب نہ تھا بیدل نہ تھا

بیخود کے مصرعوں کا تیسرا مصرعہ یہ ہے ؏

"ہوں تو میں بیخود مگر انصاف سے لیتا ہوں کام"

بدایون کے علاوہ دہلی میرٹھ بریلی وغیرہ کے کئی مشاعروں کی صدارت کی۔ بدایون کا یادگار مشاعرہ جو ۱۹۲۴ء میں حسب ذیل طرح پر ہوا تھا ؎

"مزارِ داغ پہ آنسو پیئے وضو آئے"

جس میں مولانا احسن مارہروی، بیخود دہلوی، ساحر دہلوی، جوش ملیح آبادی، بیباک شاہجہانپوری وغیرہ و نیز شعرائے مدراس۔ کلکتہ۔ لاہور۔ بمبئی۔ حیدرآباد دکن۔ اورنگ آباد۔ ناگپور اور ڈھاکہ نے شرکت کی تھی جس کا مطبوعہ گلدستہ صبح بدایون (مطبوعہ عثمانی پریس بدایون) ہے اس کی صدارت بھی آپ ہی نے فرمائی تھی۔ یہ آخری صدارت تھی۔ اسکے چند ماہ بعد ۱۹۲۵ء میں آپ نے وفات پائی۔

مطبوعہ تصانیف میں علاوہ دیگر متعدد قصائد، نعت و منقبت کے حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

(۱) "بابِ عشرت" یہ قصیدہ غالب کے قصیدے کی زمین میں ہے۔ اس کا مصرعِ اول ہے "بابِ عشرت اہلِ عالم پر کھلا"

(۲) "ساغرِ زلالی" یہ بھی نعتیہ قصیدہ ہے جس کی ابتدا ساقی نامہ سے کی گئی ہے اور پھر اصل موضوع کی طرف گریز کیا ہے۔

تشبیب و گریز کے چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں:-

جلوہ ریزئ مئے ناب کو مجھ سا ابتر — اللہ اللہ تیری دین خدائے اکبر
یہ نہ وہ مئے ہے جو میخانۂ جم سے آئے — نہ وہ بادہ ہے کہ تھا غازۂ روئے قیصر

نہ وہ مے جس پہ عرق ریزیٔ انگور کا بار | نہ وہ ہے جو تزیونی کشِ سعی دیگر
نہ وہ مے جس سے ہوئی زینت بزمِ بہرام | نہ وہ مے جس نے کیا تھا دلِ پرویز میں گھر
نہ وہ ہے جس کے لئے ابر و ہوا کو تاکیں | نہ وہ مے جس کے لئے موسم گل ہو بہتر
ہے وہ مے جس کے لئے خلق میں انساں آیا | ہے وہ ہے جس کا نرا وار بنا طرف بشر
جوش آیا تھا جسے شعب ابوطالب میں | جس نے دکھلائے تھے کچھ غار حرا میں جوہر
جس کا ساقی ہے کرم گستر و فیاض جواد | محسنِ خلق خدا شانِ خدا کا مظہر

(۳) "نشۂ ہشیاری" یہ ایک مخمس ہے جس میں اپنے چند مخصوص احباب کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک بند مثال کے طور پر پیش ہے:-

دیں تیجؔ و وسائلؔ بھی تحسین زباں دانی | آہنگ حزیں سمجھیں سن لیں جو کہیں فانیؔ
بیباکؔ بھی فرمائیں یہ نظم ہے لاثانی | احسنت کہیں احسنؔ دیکھیں جو فسوں خوانی

احقر کی محبت کے ہوں محو بھی اقراری

(۴) "پیغمبر کی مدح" یہ ایک مسدس ہجرت نبی کے حال میں ہے اس میں تقریباً ۱۵ بند ہیں اور کہیں عطف یا اضافت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر پہلا بند پیش ہے

اردو ہے جس کا نام وہ میری زبان ہے | اعجاز جس کو کہئے وہ میرا بیان ہے
مانا مجھے جہان نے یہ میری شان ہے | سب مہربان ہیں جو خدا مہربان ہے

یہ اوج یہ عروج بڑی بات تو نہیں
کچھ شاعری کسی کی کرامات تو نہیں

زلالیؔ کا شمار بدایوں اسکول کے ممتاز اساتذہ میں ہے۔ آپ غزل اور نظم دونوں میں استادی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ امر حقیقت ہے کہ مولانا کے شاگردوں میں آپ سے بہتر کہنے والا کوئی نہیں ہوا۔ کلام پختہ زبان شستہ ہے۔ اکثر غزلوں میں غالبؔ کی طرح بلند تخیل پایا جاتا ہے۔ سارا کلام بے ساختگی اور آمد کا آئینہ دار ہے۔ اکثر اشعار سہلِ ممتنع کی نادر مثالیں ہیں۔ اردو شاعری میں حقیقت غیر نمایاں (PARDOX) کی بہت کمی ہے۔ مگر آپ کے کلام میں یہ چیز حسن تعلیل کے ساتھ موجود ہے۔ اور استدلال نہ صرف شاعرانہ ہے بلکہ منطقی۔ قصائد نگاری میں مثل ذوقؔ و محسنؔ کا کوروی ید طولیٰ حاصل تھا۔

زلالیؔ کی غزلیات کا کچھ انتخاب ملاحظہ فرمائیے بعض اشعار بطور ضرب المثل زبان زد ہونے کے قابل ہیں۔

وہ اور ہوں گے جو مقتل سے سرخرو آئے | زلالیؔ ہم تو لئے نقشِ آرزو آئے
حیات و موت میں چوٹیں چلیں گی برابر کی | ادھر سے آئے قضا تو اُدھر سے تُو آئے

بہرہ اندوزِ خیالات پریشاں ہونا | اِس کا مفہوم ہے مخلوق میں انساں ہونا
یہ تمنا ہے کہ اب دل میں تمنا نہ رہے | قطعِ امید سے ہے چارۂ حرماں ہونا

اس خطا بخشنے والے کا بھی منہ دیکھا ہے — جاؤ اے شیخ نہیں ہیں تو گنہگار ہیں ہم
کون جانے کہ کہاں جائیں گے کب جائیں گے — یہ خبر ہے کہ سفر کے لئے تیار ہیں ہم

متاعِ زیست مجھے چاہئے کہاں کے لئے — یہ پیش کش ہے کسی اپنے مہربان کے لئے
نہ سود مند محبت ہوئی ہمیں لیکن — ہمارا حال سبق ہوگیا جہان کے لئے

رہی کسی سے توقع نہ غم بٹانے کی — نرالی دیکھ لی ہم نے روش زمانے کی
محال ہے کہ لگی آگ میں کوئی کودے — مگر کمال محبت تھی آشیانے کی

پا کر عروج آج بشر شادماں نہ ہو — کل کی کسے خبر ہے کہاں ہو کہاں نہ ہو
نکلے ہیں جستجوئے حیاتِ دوام میں — مرنے کا کشتگانِ ستم پر گماں نہ ہو

لایا انہیں جلال و غضب پیچ و تاب میں — میں کیا پڑا وہ آپ پڑے ہیں عذاب میں
میخانہ کا طواف ہے توبہ زبان پر — پرہیز ہے شراب سے نیت شراب میں

رضی الدین حسن کیفی ص ۳۸ سے آگے

اب تک ہے کیا جراحتِ دل کی شکستگی — تیغِ ادائے ناز سے زخمی ہے کب کا چاند
سب لوگ دیکھتے ہیں اُدھر اور ہیں اِدھر — یہ چاند میرا چاند ہے وہ چاند سب کا چاند
کیفی بھلا کہاں لب ساغر کہاں ہلال — کیا جانے لطف اور مزہ لب پہ لب کا چاند

اور بالآخر ہماری دکن کے شعر و سخن کا یہ چاند ۸ رجب ۱۳۳۸ھ کو افقِ اجمیر میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ عرس کی وجہ اجمیر شریف میں جملہ اقطاع ہند کے لوگ آئے ہوئے تھے نماز جنازہ میں کم و بیش ایک لاکھ آدمی [illegible] اور تابوت کو [illegible] قبرستان میں جو درگاہ خواجہ اجمیری سے متصل ہے [illegible] اتفاقاً میں [illegible] اس سال اجمیر ہی میں [illegible] حیدرآباد میں ان کی یاد میں کئی مشاعرے منعقد ہوئے ان کے شاگرد خاص متقی نے ایک دردناک مرثیہ لکھا اور ان مشاعروں میں جو غزل لکھی اس میں استاد کی وفات کا غم نمایاں رہا۔ ان کا ایک مقطع ہے۔

متقی جب باپ اور استاد کا رتبہ برابر ہے — مرے کیا حضرت کیفی کہ سایہ اٹھ گیا ہے

غرض آج حضرت کیفی باقی نہیں لیکن ان کا کلام باقی ہے ان کے تربیت یافتہ شاگرد موجود ہیں اور [illegible] نے اور ان کے بھائیوں نے حاصل کی تھی اس سے اہل دکن کو روشناس کرانے میں انہوں نے جو حصہ لیا وہ بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے جس کو اہل دکن کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

پروفیسر عبدالباری ندوی کا خط حضرت امجدؔ کے نام

(جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی کے ساتھ پروفیسر عبدالباری کا نام بھلایا نہ جاسکے گا ایک فلسفی کی حیثیت سے انھوں نے اردو ادب میں گرانقدر اضافے کئے اور فلسفی سے پیر مولوی اور مولانا بن گئے۔ حضرت امجدؔ سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ ہم یہاں ان کا ایک خط شائع کر رہے ہیں۔ "گلستان امجد" کے متعلق مولانا نے جو تنقید کی ہے اس کی جامعیت میں کلام نہیں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شبستانِ سعادت۔ بارڈنگ روڈ لکھنو

مجدی الامجاد ۱۲ رمضان المبارک ۵۵ھ

زادکم اللہ مجدا فی الدنیا والآخرہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ خفا تو کیا ہوں گے لیکن میری نالائقی کے متعلق خدا جانے کیا کیا خیال فرماتے ہوں۔ نالائق سے لیاقت کی توقع کے علاوہ باقی سارے بودہ و نبودہ گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ "بودہ" میں سب سے بڑا تو یہ ہے کہ "گلستان امجد" کی آجتک رسید نہیں لکھی۔

عذر قطعاً کوئی بہتر از گناہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ حرف بہ حرف پڑھنے کے بعد جب ختم کیا تو صرف متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب و مبہوت تھا کہ سعدیٔ ایران و سعدیٔ ہند میں کس کا مرتبہ بلند ہے۔ اس میں مبالغہ بالکل نہ خیال فرمائیے۔ باقی اپنا تو یہ حال پایا کہ بچپن میں گلستان سعدی پڑھی تھی اور بڑھاپے میں گلستان امجد سمجھی۔

البتہ ایک نکتہ حل ہوا۔ بارہا خیال آتا تھا کہ آخر "امجد" کو دنیا پہچانتی کیوں نہیں بڑی اندھی ہے۔ مگر گلستان امجد پڑھ کر سمجھ میں آیا کہ بعض لوگ اپنی "روح عصر" سے اتنا آگے ہوتے ہیں کہ ان کو اکثر دنیا مدتوں کے بعد بھی پوری طرح نہیں پہچانتی۔ مولانا روم بھی میرے نزدیک ایسے ہی لوگوں میں ہیں کہ گو دنیا نے ان کی بہت داد دی مگر مجھکو وہ آج کی دنیا سے بھی بہت آگے نظر آتے ہیں۔

غرض مجھکو تو اب آپ سے دوستانہ مراسلت بھی گستاخی محسوس ہوتی ہے۔ مگر آپ نے جب گستاخیوں کا خوگر بنا دیا ہے ان کو چھوڑنا بھی آسان نہیں اور آج کا یہ عریضہ انھیں کی یادگار رہی ہے لکھنؤ کی نمائش کا ذکر سنا ہوگا۔ حکیم الشعرا کے لئے اس کی دید میں بھی بہت کچھ شعور و حکمت و بصیرت کا سامان مل سکتا ہے۔ کاش اسی بہانے سے لکھنؤ کے ایک ویرانے کی قسمت جاگتی بلکہ تنہا نہ آپ گوارا کر سکتے ہیں اور نہ ہم لوگوں کی مسرت و سعادت کامل ہوگی۔

والدہ مدظلہا اور اہلیہ نااہل کی طرف سے دونوں کی خدمت میں درخواست ہے۔ شاید آپ کو مولانا گیلانی سے خبر ملی ہو کہ والدہ مدظلہا تو بیماری اب کی ایسی گریں کہ ابتک ۴ مہینے ہوتے ہیں پاؤں قالو میں نہیں آیا ہے۔ ڈنڈے کے سہارے کچھ چلتی ہیں۔ فالحمدللہ علی ذالک آپ جانتے ہیں وہ میری دین و دنیا کی سعادتوں کا سرمایہ ہیں۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کامل شفا عطا فرمائے۔

آپ دونوں کو دعا فرماتی ہیں۔ اہلیۂ نااہل اور بچوں کا سلام قبول ہو۔ اس زمانے میں غالباً ۱۴ ڈسمبر سے کرایہ میں بھی ایک ثلث کی تخفیف رہے گی۔ ورنہ مولانا گیلانی کے ساتھ ہی آنا خوب ہوتا۔

امید کہ اور سب خیریت ہوگی اور رمضان مبارک کی برکتوں کا ذخیرہ ہو رہا ہوگا۔

والسلام۔ دعا کا محتاج و طالب:

عبدالباری غفرلہ

حکیم یوسف حسین خان

کج کلاہ

ریگ زار میں تارے
راہ چلنے والوں کو
راستہ بتاتے ہیں
کوئی جا پہنچتا ہے
آپ اپنی منزل پر
(اپنی اپنی قسمت ہے)
کچھ بھٹک بھی جاتے ہیں
چند خوش نصیبوں کو
منزلیں بلاتی ہیں
بعض منزلیں اپنی
دور چھوڑ آتے ہیں
(اپنی اپنی منزل ہے)
ریگ زار میں تارے
یا چمکتے رہتے ہیں
یا پلک جھپکنے پر
ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں
ڈوب ڈوب جاتے ہیں

ہر مسافر صحرا
یا تو مسکراتا ہے
یا اُسی مسافر کو
رہگزار کے تارے
عمر بھر رُلاتے ہیں!

صرف ایک راہی ہے
شب کے رہگزاروں میں
ڈھونڈتا ہے جو کب سے
ایک ہی ستارے کو
سینکڑوں ہزاروں میں
اور جتنے تارے ہیں،
سب اُسے بلاتے ہیں
اس کی لوحِ قسمت پر،
دوسروں کے ستارے
جگمگا کے آتے ہیں،
جھلملا کے جاتے ہیں!

شاذ تمکنت

شجر ممنوعہ

صبح و مسا رہینِ ستم ہائے بے شمار
تارِ نفس کی خیر ہو، عمرِ رواں کی خیر
سورج کا خوف، چاند کا ڈر، چاندنی سے شرم
گلشن سے پردہ، گل سے ندامت، کلی سے شرم
لیکن بہ ایں ہمہ مرے ذوقِ جواں کی خیر

یوں ٹوٹ کر حیات سے کرتا رہا ہوں پیار
جس طرح بیاہتا سے محبت کرے کوئی

مناّن رضوی

خلا

میں نے اے دوست ترے غم کا سہارا لے کر
زندگی کاٹنی چاہی تھی مگر کٹ نہ سکی
تیری صحبت سے بھی آئی نہ خوشی کی ساعت
ظلمتِ بخت کسی طور کبھی چھٹ نہ سکی

جسم ہر چند تیری قید میں محبوس سہی
روح اب بھی مری آزاد ہے، آوارہ ہے
گھومتی رہتی ہے کھنڈرات میں ویرانوں میں
کتنی مجبور ہے، برباد ہے، آوارہ ہے

تاج سہیلہ

چندر نار

(دوہے)

لوگوں کی مُسکان بھی یارو ہم کو لگے کٹار
مَن کا مندر سُونا کر گئی اِک چنداسی نار
چندا نار کہ جس کے نیناں دو چنچل سے آہُو
چندا نار کہ جس کے تن سے نکلے ہے خُوشبو
چندا نار کہ جس کے بال گھٹاؤں کا ہیں مان
چندا نار کہ جو ہے یارو اس ہردے کی جان
چندا نار کا جسم سنہرا ساگر کی اِک سیپ
چندا نار کے رُوپ کے آگے ماند ہزاروں دیپ
چندا نار کہ جس کا مکھڑا ہے لالہ کا پھول
چندا نار کہ جس کے آگے چندا بھی ہے دھول
چندا نار نے جس دم بھینٹ کیا تھا اپنا پیار
اُس دم ملی تھی مجھ کو یارو جیون کی مہکار

چندا نار تو جیون کی انمول کہانی ہے
چندا نار جو تاجؔ پیا کے من کی رانی ہے

جگن ناتھ آزادؔ

بُرا نہ مان

لے کر مخالفت کا اثر تو بُرا نہ مان
اِس شور و شر کا نغمۂ تر تو بُرا نہ مان
ظلماتِ شب نہ ہو تو سحر کی چمک کہاں
ظلمات کا فروغِ سحر تو بُرا نہ مان
خاشاک و خس تو شاملِ ہر موجِ آب ہے
خاشاک و خس کا آب گہر تو بُرا نہ مان
تصویرِ کائنات مکمل اسی سے ہے
بد بُو کا اے نسیمِ سحر! تو بُرا نہ مان

اے دوست! اپنی شانِ کرم پر نگاہ کر
مجھ سے خطا ہوئی ہو مگر تو بُرا نہ مان

وحید مرزا

ساتھیو

تم نے دیکھا کبھی بھی جو غنچہ کھلا
کتنے بھنوروں نے اس کا لہو پی لیا
چاند کی چاندنی جب جواں ہو گئی
کتنی تاریک راتوں نے پیچھا کیا

اور پیاسی کلی کے لبوں کو یہاں
کچھ ملے بھی تو شبنم کے آنسو ملے!
ہاں چمن کی روش پر جدھر دیکھئے
داغ دل میں لئے ہی ہیں لالے کھلے

اور تمہیں منزلوں کی ہے دھن ساتھیو!
وادیاں میں نے مانا کہ پُر خار ہیں
یوں تو آنکھوں میں پھولوں کے سپنے ہی
پر سواگت کو کانٹوں ہی کے ہار ہیں

غم سے معمور آبادیاں ہیں تو کیا!
خار زاروں سے پُر وادیاں ہیں تو کیا
ہر طرف آج مایوسیاں ہیں تو کیا
ہر طرف آج تاریکیاں ہیں تو کیا
کہکشاں سے مگر روشنی چھین لو
موت کی گود سے زندگی چھین لو

سرشار بلند شہری

اُجڑے سپنے

سست ہوا کا جھونکا آیا
دو شاخوں پر دو غنچوں نے
آنکھیں کھول کے لی انگڑائی
اور آپس میں آن ملے
ہنستے ہنستے پھول بنے
تند ہوا کا جھونکا آیا
دونوں کے دم اکھڑ گئے
اک دوجے سے بچھڑ گئے
سندر سپنے اُجڑ گئے!

O

راگھویندر راؤ جذب عالم پوری

غزل

یہ جہاں جس کو سازگار نہیں — اس کے دل کو کبھی قرار نہیں
جذبۂ عشق مستعار نہیں — سوزشِ دل کو بھی قرار نہیں
مے کا باقی کوئی خمار نہیں — شانِ مستی ہوں بادہ خوار نہیں
روؤں فرقت میں زار زار نہیں — فطرتِ عشق سوگوار نہیں
جس کے دل میں ذرا غبار نہیں — اس پہ بھی تم کو اعتبار نہیں
پارسائی پہ اس کی کیا الزام — جس کو خود دل پہ اختیار نہیں
کیا چڑھاؤں مزارِ دل پہ آہ — اشک آنکھوں میں اشکبار نہیں
پیار کی رحمتوں کو کیا کہیئے — عمرِ انساں کا اعتبار نہیں
بن گئے طور آپ کیوں دل میں — دل کی دنیا تو کوہسار نہیں
عالم الغیب فطرتِ انساں — عالمِ ہوش و اختیار نہیں
زندگی ہر نفس ہے خود ایجاد — آدمی کو کبھی قرار نہیں
دیکھ کر تجھ کو میری نظروں میں — اب کوئی اور گلعذار نہیں
جس کی آرام سے گزرتی ہے — زندگی اس کو کوئی بار نہیں

تیرا جینا بھی کوئی جینا جذبؔ
کوئی ہمدرد و غمگسار نہیں

بشیر بدر

غزل

صورتِ شمع ساری رات جلو
صبح لیکن مثالِ غنچہ ہنسو
چاند کا داغ دیکھنے والو
اپنے دامن کے داغ بھی دیکھو
چاہے آنکھوں کی روشنی لے لو
آنسوؤ۔ آج رات بھر چمکو
اے شبِ غم کے جاگتے تارو
رات کافی ہے جاؤ سو جاؤ
آؤ اک دوسرے کا غم بانٹیں
کچھ ہماری سنو، کچھ اپنی کہو
کون جانے کہاں بچھڑ جائیں
راہ تاریک ہے قریب رہو
یہ زمیں مدتوں کی پیاسی ہے
آنسوؤ، دل پہ ٹوٹ کر برسو
اب زمانہ نہیں خدائی کا
آدمی بن کے اے خداؤ رہو
وقت سب منصفوں کا منصف ہے
وقت آئے گا انتظار کرو
چشم مانگے ہے آج دل کا لہو
بدر صاحب کا کوئی شعر پڑھو

سید حرمت الاکرام

غزل

غم فقط یہ ہے کہ قسمت میں ترا غم بھی نہیں ورنہ مجھ کو ہوسِ عیشِ دو عالم بھی نہیں
شمع کس طرح بنے انجمنِ دانش کی تیرے جلوؤں کا وہ عالم کہ مجسّم بھی نہیں
مدتوں سے کوئی سرمایہ نہیں عشق کے پاس دلِ سوزاں بھی نہیں دیدۂ پُرنم بھی نہیں
دل بجھا جاتا ہے لیکن تپشِ دل نہیں کم ہائے یہ شمع کہ مدھم بھی ہے مدھم بھی نہیں
جائے کس در پہ مری خواہشِ درماں طلبی لیکے وہ درد کہ جس کا کوئی محرم بھی نہیں
مجھ کو جینا ہے کہ دنیا کو ضرورت ہے مری ورنہ دنیا میں مرے زخم کا مرہم بھی نہیں
اس کی آشفتہ سری کا ہے ٹھکانہ کوئی جس کی قسمت میں ترا گیسوئے برہم بھی نہیں
غمِ دوراں بھی وہی ہے غمِ جاناں بھی وہی میری تقدیر میں کیا کوئی نیا غم بھی نہیں
میرے حسرت کدۂ دل کی ہے ہر شمع خموش اور اس بڑھتی ہوئی رات کا ماتم بھی نہیں

دل کہاں اور کہاں سود و زیاں کی میزان
مول حرمت مرے دل کا یہ دو عالم بھی نہیں

انوار ظہوری

دو غزلیں

جس وقت امنگیں اٹھتی ہیں انعام جوانی پاتی ہے
اک چوٹ زمانہ دیتا ہے سو رنگ وفا دکھلاتی ہے

ہنستے ہوئے مجھ سے کہتے ہیں "بے وجہ نہ تم سے روٹھے تھے"
"ہم تم سے جدا جب ہوتے ہیں، شہکار غزل ہو جاتی ہے"

یہ ترک محبت کی باتیں اپنی تو سمجھ سے باہر ہیں
کچھ میری سمجھ میں آئے بھی دنیا تو بہت سمجھاتی ہے

تم جور و جفا پر مائل ہو، تم ظلم و ستم کے قائل ہو
میں ضبط تو بے حد کرتا ہوں اس پر بھی ہنسی آجاتی ہے

ایسے بھی نہ ظالم ہو جاؤ، اتنے بھی نہ قاتل بن جاؤ
اس کا بھی تمہیں احساس نہیں تقدیر کھڑی شرماتی ہے

برسوں میں ریاضِ فن کے سبب تسخیر کیا ہے ملکِ ادب
یہ خاص ودیعت ہے مجھ کو، یہ جہد یہ کوشش ذاتی ہے

اتنا بھی رلانا ٹھیک نہیں، اتنا بھی ستانا ٹھیک نہیں
دلدار کو دکھ مت پہنچاؤ، انوار بڑا جذباتی ہے

جب کبھی تکمیلِ غم ہو جائے گی
آپ کی بھی یاد کم ہو جائے گی

کانپ جاتا ہوں خوشی کے نام سے
سوچتا ہوں آنکھ نم ہو جائے گی

میری حالت کا نہ اندازہ کریں
آپ کو خوئے کرم ہو جائے گی

زندگی میں عشق کو شیوہ بنا
ورنہ فکرِ بیش و کم ہو جائے گی

اب ظہوری وہ زمانہ آئے گا
دل کی اہمیت ہی کم ہو جائے گی

دو غزلیں

صحرائی

جفا کو وفا کیوں نہ سمجھیں کہ اب بھی
اسی طرح الفت میں ہیں مبتلا ہم

سمجھ میں نہیں آتا یہ رازِ الفت
اُسے چاہتے ہیں، ہیں جس سے خفا ہم

صلح کرنے آنا پر اظہارِ خفگی
یہ مطلب تھا شاید کریں ابتدا ہم

تمہاری شکایت بھی ہم کر نہ پائے
بُرا تم کو کس منہ سے کہتے بھلا ہم

ترے ہوتے کس سے کہیں دل کی باتیں
کریں کس طرح دردِ دل کی دوا ہم

عطاء الرحمن ارشاد

گر نہیں بزمِ طرب دعوتِ مژگاں ہی سہی
زندگی کے لئے اب سوزشِ پنہاں ہی سہی

میری ڈوبی ہوئی نبضوں کو روانی بخشے
صبحِ خنداں نہ سہی شامِ غریباں ہی سہی

میں وہ رہرو ہوں کہ بھٹکا ہی کیا شام و سحر
کوئی آواز تو دے شہرِ خموشاں ہی سہی

داستانِ شبِ غم میں تو سنا بیٹھا ہوں
کوئی افسردہ و رنجور و پریشاں ہی سہی

اپنے ماضی کو ذرا دیر تو رو لوں ارشاد
گلشنِ دہر میں آثارِ بہاراں ہی سہی

ابراہیم شفیق (بی ایس سی)

دودھ اور چاند

دن بھر کھیت میں کام کرنے کے بعد شانتی جب اپنی جھونپڑی میں پہنچی تو اندھیرا ہو چکا تھا اس کا بوڑھا باپ روز کی طرح کھوں کھوں کرتا پڑا تھا۔ باپ کی یہہ کھوں کھوں سن کر پہلے تو شانتی کا من شانت ہو جاتا لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ایکدم سرد سی ہو جاتی ایک نامعلوم خوف اسکے روم روم پر مسلط ہو جاتا۔ اسکے ذہن میں بیسیوں وسوسے آتے۔

میرا باپ برسوں سے یوں ہی کھانس رہا ہے۔ ماتا جی جب زندہ تھی وہ زندگی بھر پتا جی کا علاج کراتی رہی۔ لیکن یہہ کھانسی نہیں گئی یہ وہ کہتی تھی یہہ کھانسی جان لیکر ہی چھوڑے گی۔ خود شانتی نے بھی کتنی بار اسکا علاج کرایا تھا۔ لیکن بوڑھا اچھا نہ ہوا

پچاس سے اوپر عمر ہونے کے باوجود بھی وہ سخت جسمانی محنت کرتا۔ کھیت میں ہل چلاتا بیج بوتا اور ہر فصل کے زمانے میں کھیت ہی کے مچان پر سوتا پڑا رہتا۔ بارش سے بے پرواہ اور سردیوں کے موسم میں کانپتا ہوا ــــــــــــ

اب کی بار زوردار بارش میں وہ بہت بھیگ چکا تھا۔ اسلئے اسکا پرانا مرض دمہ زور کرنے لگا تھا۔ تین چار دنوں سے وہ کھیت پر بھی نہیں گیا ــــــــ بس جھونپڑی ہی میں کھانستا پڑا رہتا۔

جھونپڑی کے باہر ہی باپ کی آواز سن کر شانتی کو اطمینان ہو جاتا کہ ابھی چراغ جل رہا ہے اُسے۔ دنیا کی ترقی کو دیکھ کر یقین تھا کہ اسکے باپ کا بھی چراغ جل رہا ہے اُسے دنیا کی ترقی کو دیکھ کر یقین تھا کہ اسکے باپ کا بھی ایک نہ ایک دن علاج ہوگا۔

لیکن وہ دن کب آئے گا۔ شانتی کو معلوم نہ تھا۔

بالاپور گاؤں کی سرحد جہاں ختم ہوتی تھی بس وہیں سے شہر شروع ہو جاتا تھا شہر جانے والی بسوں اور لاریوں کو کھیت میں کام کرتے کرتے وہ حسرت سے دیکھتی وہ سوچتی تھی کہ ایکدن وہ ضرور اس راستے سے اپنے پتا کو بس میں بٹھا کر شہر لے جائے گی اس نے اپنی مزدوری میں سے بچا کر پانچ روپیے جمع کئے تھے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ کچھ روپیے اور ہو جائیں گے تو وہ پتا کو شہر کے بڑے سرکاری دوا خانے میں شریک کرا دے گی۔

چاہے وہ کھیت میں ہو یا جھونپڑی میں ـــ جاگتی ہو یا سوتی ہو ہر وقت وہ پانچ روپیے اسکے ذہن میں پانچ روشن ستاروں کی طرح چمکتے جن کو دیکھ اسے اطمینان ہو جاتا کہ وہ اپنی مرادوں کے چاند کو پا لے گی ــــــــــــ

سندری نے اس نے باپ کو کھانا کھلانے کے بعد گرم گرم چائے پلائی اور دوا کی ایک گولی کھلائی جو گذشتہ بارش میں اسکے علاج کے بعد بچ گئی تھی۔ جب خاموشی سے بستر پر لیٹ گئی بیٹی تو آج خاموش کیوں ہے؟ بوڑھے نے کھانسی کے درمیان پوچھا

”نہیں پتا جی میں خاموش کہاں“

”تھک گئی ہے شاید؟“

ہوں ،،

تھوڑے دن کی تو بات ہے بیٹی ـــ میں اچھا ہو جاؤں گا تو بس تو گھر میں بیٹھی رہنا۔ بوڑھے نے کہا۔

شانتی نے کروٹ بدلی۔ تاکہ باپ اسکے اداس چہرے کو دیکھ کر پریشان نہ ہو جائے — چراغ کی لو ہوا سے تھرتھرا رہی تھی۔ سامنے دیوار پر بوڑھے باپ کا سایہ برابر کھانس رہا تھا۔

شانتی کی آنکھیں کافی بھیگ چکی تھیں۔ اس سے باپ کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی — آنکھیں بند بھی کر لینے کے بعد نہ معلوم کب تک اسکے خیالوں میں چراغ کی لو تھرتھراتی رہی اور باپ کا سایہ کھانستا رہا۔

دوسرے دن شام کو لالہ چرن داس کے کھیت میں کام کر کے وہ بہت تیز تیز اپنی جھونپڑی کی طرف آنے لگی وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی — جھونپڑی کے قریب پہنچ کر باہر ہی سے اس نے آواز دی۔

”— پتاجی — پتاجی!“

باپ نے شانتی کی آواز سن کر پریشانی سے اُسے جواب دیا۔

”کیا ہوا!— بیٹی — کیا ہوا!؟“

”پتاجی اب تم بھلے چنگے ہو جاؤ گے — تمہاری کھانسی ختم ہو جائے گی۔

”— وہ کیسے — آخر بول تو سہی کیا بات ہے؟“

”— پتاجی! اپنے گاؤں میں۔۔ ایک بہت بڑھیا حکیم آیا ہے۔ ایک روز کیلئے بس“

ایک روز میں علاج کیسے ہوگا —“ بوڑھے نے سوال کیا۔

وہ کہتا ہے پتاجی کہ دمہ کا ایک ہی دن میں علاج کرتا ہے۔ ایک سیر اصلی دودھ میں ایک دوا ملا دیتا ہے، دن بھر دودھ پی لینے کے بعد آدمی کا دمہ ختم ہو جاتا ہے

سچ!؟! بوڑھے نے اس زور سے کہا کہ منہ سے رال کپڑوں پر ٹپک پڑی

کل ہی ہم دودھ لے جائیں گے۔ اور اس سے دوا لیں گے۔

”کہاں ٹھہرا ہے وہ“ بوڑھے نے سوال کیا۔

”گاؤں کی بڑی باؤلی کے قریب والی جھونپڑی میں“

بوڑھے کی آنکھوں میں یکبارگی حیات کی صحت مند چمک آگئی۔ رگ و ریشہ میں خون ایک نئی تیزی سے دوڑنے لگا۔ اُسے اپنے گذرے ہوئے ایام پر ہنسی آگئی۔ اور پھر اسے آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔

”آج اگر تیری ماں زندہ ہوتی!“ بوڑھے نے حسرت سے کہا۔

”— پتاجی۔ اب آپ اٹھ بیٹھیں گے۔ تو صحت اور خراب ہوگی“ شانتی نے بوڑھے کو ہمت دلائی۔ شانتی کی روح خوشیوں کے ساز پر جیسے رقص کر رہی تھی۔ اسکی زندگی میں اس سے زیادہ مسرور کن لمحہ کبھی نہ آیا تھا — کسی صبح کا انتظار اس نے اس قدر بے چینی سے نہ کیا تھا۔ اسکی زندگی میں کتنی صبحیں آئیں — کئی بار سورج اسکی نظروں کے سامنے شیو مندر والی پہاڑی کے اوپر سے ابھرا۔ لیکن کل نکلنے والے سورج کا اُسے بہت انتظار تھا۔

اور پھر وہ سورج بھی نکل گیا — جس کا انتظار تھا۔

شانتی دودھ کا لوٹا — اور پیسے لیکر رام چندر کے مکان پر پہنچی جو اسکی جھونپڑی کے قریب ہی رہتا تھا۔

* ایک سیر دودھ = دو رامو — ایڈیٹ

سب [illegible] ۱۹۶۲ [illegible]

دودھ ختم ہوگیا ہے شانتی ۔ رام چندر نے کہا۔

وہ [illegible]

ایک سیر دودھ دو گومتی کی ماں ۔

دودھ کا ایک قطرہ نہیں ہے۔ سب راتب والوں کو دے چکی ہوں۔ گومتی کی ماں نے جواب دیا ۔

پھر [illegible]

راستے میں اسکو ایک سہیلی رانی مل گئی ۔

رانی گاؤں میں دودھ کیوں نہیں مل رہا ہے ۔

اری پگلی — یہ لوگ شہر جاکر دودھ ہوٹل والوں کو دے آتے ہیں۔ اور باقی دودھ راتب کے لوگ لے لیتے ہیں اور آج تو دودھ کا کال [illegible]

کیوں رانی ؟ شانتی نے پوچھا ۔

حکیم جو آیا ہے یہاں ۔ ہر پرانی بیماری والے کو وہ دودھ میں دوا دے رہا ہے [illegible]

اب مجھے دودھ کہاں ملے گا ۔ اب کیسے ہوگا۔

کاکا کے دمہ کی دوا لینی ہے کیا؟ رانی نے پوچھا ۔

"ہاں"

[illegible]

اب شانتی کو یاد آیا ۔ کہ پٹیل کے مکان کے قریب ہی سیوک رام نامی دودھ والا رہتا ہے [illegible]

وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی سیوک رام کے پاس پہنچی — وہ ایک دو آدمیوں کو دودھ دے رہا تھا [illegible]

شانتی کو اطمینان سا ہوا —

اری شانتی کیا تو بھی دودھ لینے آئی ہے ۔ سیوک رام نے پوچھا ۔

ہاں [illegible]

اگر تھوڑی دیر بعد آتی تو دودھ ختم ہو جاتا — اچھا ہوا تو وقت پر آگئی ۔ سیوک رام نے [illegible]

شانتی نے ایک سیر دودھ لیا اور جلدی جلدی حکیم کے پاس پہنچا — اتنے عرصے میں [illegible] باپ اور

بیٹی [illegible]

حکیم نے ایک [illegible]

اب [illegible]

بوڑھا خوشی اور حیرت سے حکیم کو ہی دیکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا ۔

جاؤ جاؤ فکر نہ کرو — حکیم نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا ۔

شانتی گاؤں والوں کی بھیڑ کو چیرتی ہوئی [illegible] باپ کو تھوڑا

دودھ پلایا ۔ اس دن وہ کھیت پر بھی نہیں گئی — دوپہر میں بھی کھانے کے بعد اس نے دوبارہ دودھ پلایا [illegible] تھا

[illegible] اس رات شانتی کو زندگی میں پہلی بار سکون کی نیند آئی ۔

ہو رہا تھا جیسے اسکے گوتک میں چمکنے والے پانچ ستاروں نے چاند کی منزل بتادی ہے۔

اگلے دن وہ سویرے ہی کام پر چلی گئی۔ خوشیوں سے چُور کہ اب پتاجی کو کبھی دمہ نہ ہوگا۔ شام کو جلدی کام سے واپس آگئی۔ جھونپڑی کے قریب پہنچی تو باپ کی کھوں کھوں سنائی نہ دی خوشی سے اسکا دل جھوم اٹھا۔ مسرت سے اسکے قدم لڑکھڑانے لگے۔
جھونپڑی میں پہنچتے ہی اُس نے آواز دی۔
پتاجی!
اسکا باپ اپنے بستر سے دور اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اور آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید وہ کھانستے کھانستے بے دم ہوکر پڑا تھا
پتاجی ——؟ کیا ہوا تمہیں، شانتی نے ایک چیخ مار کر باپ کو اٹھایا۔
باپ کراہ رہا تھا۔ سانس بہت تیز چل رہی تھی —— وہ بات نہیں کرسکتا تھا۔ شانتی نے دوڑ کر پڑوس کے لالہ جی کو بلا لیا۔ انھوں نے آتے ہوئے ایک دوا ساتھ لائی۔ اور بوڑھے کے سینے پر لگائی کچھ دیر بعد بوڑھے کو ہوش آیا۔
اس حکیم نے بھگوان جانے دودھ میں کیا دوا ملا دی۔ پتاجی کا دمہ اور بڑھ گیا، شانتی نے کہا نہیں شانتی بیٹی۔ اُس حکیم کی دوا سے میرا بھائی اب اچھا ہوگیا ہے۔ اسکو بھی دمہ تھا۔
لالہ نے کہا۔
پھر بھی شانتی کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔
دودھ تو اصلی تھا نا، لالہ جی نے سوال کیا۔
یکبارگی شانتی لرز اٹھی۔ اور اُسے اب یاد آیا کہ سیوک رام پاؤڈر کے دودھ کا کاروبار کیا کرتا تھا ——

غزل

محی الدین علی ابن تصور

تم ابروئے خمدار کو دیکر کوئی خم اور
اوروں پہ کرو اور کرم ہم پہ کرم اور

بت خانے سے کعبے کی طرف جانے لگے ہیں
مطلوب ہیں شاید ہمیں دو چار صنم اور

ہم چاک گریباں کو سمجھتے ہیں گریباں
دنیا کے جدا غم ہیں محبت کے ہیں غم اور

اس وحشت دل کیلئے صحرا بھی ہوا تنگ
یارب ہمیں مشکل ہوئے دو چار قدم اور

ہر روز رلاتی ہے ہمیں یاد تمہاری
ہر صبح ہمیں دیتی ہے اک دامن نم اور

مانا یہ تمنا یہ تصور بھی ہے ان کا
لیکن انہیں راہوں میں ہیں کچھ نقش قدم اور

محمد اسحٰق ایوبی

انٹرویو

کہوں اک بات میں تجھ سے، اگر جی کی اماں پاؤں ؎ مجھے قربان ہونے دے، ترے قربان ہو جاؤں

جس طرح گدھے اور گھوڑے میں بعض چیزیں مشترک اور بعض صفتیں مختلف ہیں، مرد اور عورت میں بہت سی باتیں ملتی جلتی اور بہت خصوصیتیں الگ الگ ہیں۔ اسی طرح انسان اور جانور میں اگرچہ چند معاملوں میں بُعدُ المشرقین ہے، تو چند امور میں مماثلت، مشابہت اور ربط اتفاقی پایا جن امتیازی علامات کے بل بوتے پر ہم چرندوں، پرندوں اور درندوں سے بلند مقام حاصل کرتے ہیں، اس کے غلط، ناجائز اور قبیح استعمال نے ہم حیوان سے کمتر، شیطان سے بدتر اور اشیائے بے جان سے فروتر ثابت کر دیا ہے۔ کہاں تو علم و عقل کی یہ رفعت کہ خلائی پرواز کے ذریعے آسمان کے تارے، جنگلی بیروں کی مانند، بکے بعد دیگرے، جھوڑ جھوڑ کر اپنے قدموں پر گراتے جا رہے ہیں۔ اور کہاں دل و دماغ کی یہ دنابت کہ بے ایمانی بے انصافی اور بے شرمی کو اپنا وطیرہ بنا کر ہم دوسروں کے حقوق کو اپنے پاؤں تلے روندتے، بے بس لوگوں پر ظلم و ستم توڑتے اور مغلوب افراد کی ہڈیوں اپنا محل کھڑا کرنے سے قطعی احتراز نہیں کرتے۔ عموماً اس سلسلے میں سماجی، قانونی اور اخلاقی پابندیاں ویسے ہی ناکام رہتی ہیں جیسے شعبدہ باز کے حق میں رسی کی جکڑ بندیاں۔

ہم نے مختلف اشیاء کو پرکھنے کے مختلف طریقے وضع کر رکھے ہیں۔ جانوروں کی عمر، نجابت اور افادیت کی جانچ پڑتال کے بھی ہمارے پاس متعدد ذرائع ہیں۔ اسی طرح ہم نے انسانوں کے احوال، اقوال اور افعال کو کسوٹی پر کسنے کے بہت سارے ڈھنگ اپنا رکھے ہیں، جس طرح تھرمامیٹر سے مریضوں کے درجۂ حرارت کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح انٹرویو کے ذریعے امیدواروں کی ذہانت، کردار اور شخصیت کی بلندی و پستی کا اندازہ انتہائی خود اعتمادی، یقین اور پندار کے ساتھ پانچ دس منٹ کے مختصر سے عرصے میں لگایا جاتا ہے۔ ویسے بعض حکماء کے نزدیک انسان کو پرکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا پرانی عورت . . . کو ڈھب پر چڑھانا ؎

پرساں کب کوئی جوہرِ ذاتی کا ہے ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
جوہر کو جوہری اور صراف زر کو پرکھے ایسا کوئی نہ دیکھا جو مشیر کو پرکھے

جب امیدوار انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو عام طور پر ممتحن ایسے ویسے ہی نرحم کی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے جلاد تختہ دار پر چڑھنے والے مجرم کو۔ ادھر امیدوار کی حالت عموماً اس بکرے کی مانند ہوتی ہے جس کے سامنے قصاب کھلی چھری لئے کھڑا ہوتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ انٹرویو لینے والے مذہبی پیشواؤں کی طرح معصوم اور امیدوار جرائم پیشہ قبائلیوں کی طرح مجرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جس زمانے میں بردہ فروشی کا رواج عام تھا۔ عورت، مرد اور بچے بھیڑ بکری کی طرح منڈیوں میں فروخت ہوتے تھے۔ خریدار ان کے رنگ روپ، ناک نقشہ اور حسن و جمال کو دیکھ کر ان کے دام چکاتے تھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب سماج، قانون اور جمہوریت نے اس ننگ انسانیت کا قلع قمع کر دیا ہے۔ لیکن ملا بنہ بردہ فروشی میں ایک خاص بات نمایاں تھی۔ اگرچہ غلاموں اور لونڈیوں کی قیمتیں خالص طلب اور

رسد کے اصول پر گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھیں لیکن اس میں دھاندلی کا ذرہ برابر بھی عمل دخل نہیں تھا۔ انٹرویو کے ذریعہ ملازمت کے امیدواروں کا جو انتخاب کیا جاتا ہے اسکے بارے میں پورے اعتماد سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ تحریری امتحان اور انٹرویو لینے والے افراد اور ادارے امیدواروں کی علمی ذہنی اور بشتی کے نمونے "مشتے از خروارے" کے طور پر چھانٹ چھانٹ کر رپورٹوں کی شکل میں شائع کرتے رہتے ہیں لیکن ہماری آنکھیں آج تک بددیانت ممتحنوں کے گھپلے، دھاندلی اور شرارت کے مستند واقعات پڑھنے کو ترس رہی ہیں ؎

اگرچہ فرق زمین آسماں کا ہے تاہم — ملے ہے وضع فلک کی بہت تری خو سے

جس ملک میں رشوت خور افسر، ٹیکس چور بیوپاری اور بے ایمان ٹھیکیدار تھوڑی بہت تعداد میں بھی موجود ہوں اور جہاں خاندانی، علاقائی اور لسانی عصبیت بھی کسی نہ کسی شکل میں کارفرما ہو، وہاں انٹرویو بورڈ کے سبھی اراکین سو فیصد غیر وابستہ، آزاد رائے اور غیر جانبدار ہوں، غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ انڈوں کی ٹوکری میں سے کچھ گندے انڈے بھی نکل آتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض امیدوار تحریری امتحان اور انٹرویو کے بلاوے سے قبل، تعلیمی لیاقت، عملی تجربہ اور خفیہ رپورٹ کی بنیاد پر ابتدائی انتخاب میں رہ گئے لیکن بعد میں بیرونی دباؤ سے متاثر ہو کر انہیں تحریری امتحان اور انٹرویو میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ نتیجے کے اعلان سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ ان کا انتخاب ہو گیا ہے اور بہت شاندار طریقے پر ہوا ہے۔ دنیا میں ہر چیز کا سبب یا اسباب ہوتے ہیں، چنانچہ بعد میں پتہ چلا کہ تحریری اور زبانی امتحان لینے والوں میں ان کے "سیاں" "کوتوال" بنے بیٹھے تھے ؎

کون پوچھے گا اے زلف بتاں کے سامنے — زاہد و بالغرض داڑھی پر ان کا نور ہو

اسی طرح جو امیدوار مقابلتاً چھوٹی ملازمت کے لئے منتخب نہیں ہو سکے انہیں بڑے عہدے کے لئے موزوں قرار دیا گیا۔ یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ زیادہ تر اعلیٰ عہدیدار کلرکی، چپراسی گیری یا پٹواری کا کام کر بھی تو نہیں سکتے۔ یہ بات ایک اور مثال سے واضح کی جا سکتی ہے۔ لیڈر ملک کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتا ہے لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ وہ کسی معمولی میونسپلٹی کا چھوٹا موٹا فارم بھی بھر دے تو یہ اس کی صلاحیت کے ساتھ زیادتی ظلم اور جبر ہوگا

ہر لیڈر سے اس کی مختلف ہیں عطائیں خاص خاص — ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص

ویسے انٹرویو ہمارے ملک کے لئے نئی چیز نہیں ہے۔ یہاں "بر ڈھونڈنا" کا رواج سینکڑوں سال پہلے ہی سے موجود ہے۔ کسی وقت "سوئمبر" کی رسم بھی جاری تھی کچھ عرصہ پہلے شادی بیاہ کے معاملے میں جو کام تنہا نائی کیا کرتا تھا وہی کام ملازمتوں کے سلسلے میں انٹرویو بورڈ کے کئی اراکین مشترکہ طور پر انجام دیتے ہیں۔

امیدواروں کا تعلیمی معیار اگر پست ہے تو خودکشی کرنے والوں کی مانند ان بیچاروں کا بھی ذاتی قصور دال میں نمک کے برابر ہوتا ہے تعلیمی پستی کے کئی عناصر ذمہ دار ہیں جس طرح عوام کی راہ گیر کو بیچ بازار میں کیلے کے چھلکے پر سے پھسلتے دیکھ کر بے تحاشہ ہنسنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا سماج بھی غریب امیدواروں کی سیاسی، سماجی اور علمی معلومات کے پست معیار کا مذاق اڑاتا ہے۔ لیکن اس کے اسباب و علل، احتیاطی تدابیر اور انسدادی اقدامات پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ حسن و جمال اور عشق و محبت کی طرح ذہانت بھی کسی طبقے، قوم یا نسل کی جاگیر نہیں ہوتی۔ البتہ انفرادی توجہ، صحیح تعلیم و تربیت اور سازگار ماحول ذہانت کو جلا دینے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سرکس میں کام کرنے والے مرد، عورت اور بچے ہی نہیں بلکہ ہاتھی، اونٹ، شیر، چیتا، گھوڑا، خچر، کتا، بندر بھی صحیح تربیت اور انفرادی توجہ کی بدولت حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

خواہ انٹرویو کا طریقہ جوں کا توں برقرار رکھا جائے، خواہ اس میں رد و بدل کیا جائے، خواہ اس کا نعم البدل بھی ڈھونڈ نکالا جائے لیکن یہ بات طے ہے کہ جس دن خالص لیاقت، تجربہ اور ذہنیت کی بنیاد پر عہدوں کا انتخاب ہوگا اس دن سیاسی چناؤ کے پہلوانوں کی طرح بہت سے طاقتور صاحبِ اثر مگر نااہل امیدوار غیر متوقع طور پر بُری طرح لڑھک جائیں گے۔ اگر آج بھی پوری دیانت داری کے ساتھ تحریری امتحان اور انٹرویو لیا جائے تو بہت سے کلرک، سپرنٹنڈنٹ بن جائیں گے۔ کئی سپرنٹنڈنٹ مزید اونچی جگہ کے لئے موزوں قرار پائیں گے۔ اور ممکن ہے اعلیٰ عہدیدار اور زیادہ بلند مرتبہ کے حق دار گردانے جائیں گے۔ علاوہ بریں اگر حق و انصاف اور ایمانداری کا بھرکم رد لریوں ہی پھر تار تو یہ بھی ممکن ہے کہ بعض بڑے بڑے عہدیدار گھٹیا سے گھٹیا کام کے لئے بھی نااہل سمجھے جائیں اور اس طرح وہ "بیک بینی و دوگوش"

"بہت بے ہو کر ترے کوچے سے نکلے"

ورد کرتے ہوئے روایتی "بدھو" کی مانند اپنے اپنے گھر کی راہ لینے پر مجبور ہو جائیں ؎

می روم از درِ تو باز بہ تو روتہ کنم
گر درت قبلہ شود سجدہ بہ آں سو نہ کنم

قاضی غلام محمد

انٹرویو بورڈ کے سوالات

فلسفہ کیا ہے ہم کو سمجھاؤ — سائیکل ٹیوب کا محیط بتاؤ
عمر کیا ہے دلائی لاما کی — کتنی چوڑی تھی چھاتی گاما کی
کیا تھا شیکسپیئر کی ساس کا نام — کس محلے میں کرتی تھی وہ قیام
کتنی پائی تھی میرؔ نے تعلیم — کولرج کو پسند کیوں تھی افیم
پارے کو کیوں ہے اضطراب بتاؤ — کس کی ایجاد ہے کباب بتاؤ
اچھے کیوں ہیں کبیر کے دوہے — ساری دنیا میں کتنے ہیں چوہے
یہ ابسنا کا مسئلہ کیا ہے — قطب مینار کتنا اونچا ہے
کیوں یہ فیلسوف نیوٹن تھا — ڈل ہیں امریکا کیا ڈویژن تھا
پرچہ کس نے وہاں گرایا ہے
ہم نے مٹھی میں کیا چھپایا ہے

(ماخوذ عشرتِ میں سے)

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں (ادارہ)

کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد اول و دوم

ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد اکثر چیزوں کے ناموں میں تبدیلی کا عمل شروع ہوا جو نام نامور ... چکے تھے انھیں دبا کر نئے ناموں کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش اس نسل میں تو بار آور نہ ہو سکے گی آئندہ نسل میں چل پڑنے کا امکان ہے۔ اسی طرح کتب خانہ آصفیہ کے نام نے بھی چولا بدلا ... بوٹ اور پیشانی پہن کر اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد آندھرا پردیش بن گیا۔ یہ سیکولر گورنمنٹ کی کرامت ہے۔

پیش نظر کتاب کے ٹائیٹل کے صفحہ پر پہلی سطر یہی ہے اس کے بعد اس کا اولڈ نام کتب خانہ آصفیہ قوسین میں ہے تاکہ رجعت پسندوں کی سمجھ میں آجائے کہ یہ کوئی اور کتب خانہ نہیں بلکہ وہی کتب خانہ ہے جو عماد الملک، ملا عبدالقیوم، اعظم یار جنگ، محب حسین اور حکیم سید قاسم بیجاپوری کے لاقیمت کتب خانوں کا مجموعہ ہے اور حکومت آصفیہ نے اپنی علم دوستی اور فیاضی سے اس ذخیرہ کو ڈیڑھ لاکھ کتب تک پہنچا دیا جس میں سولہ ہزار مختلف زبانوں کی قلمی کتابیں ہیں۔ جی ہاں ۔ سولہ ہزار قلمی کتابیں جس میں معمولی قسم کی بھی ہیں اور غیر معمولی بھی تاتار کے پتوں پر لکھی ہوئی بھی ہیں اور ہرن کی جھلیوں پر بھی [illegible] جواہرات کی روشنائی سے لکھی ہوئی بھی ہیں اور ایسی سیاہی سے بھی لکھی گئی ہیں جن میں ہرن کا جل، پھول اور گوند ملا تا ہے۔ بادشاہوں کے کتب خانوں کا بھی ذخیرہ ہے اور صوفیا کی خانقاہوں کا بھی۔ ایسی کتابیں بھی ہیں جن کا دوسرا نسخہ دنیا میں کہیں نہیں اور ایسی بھی ہیں جن کے ایک ایک دو دو [illegible] نسخے مل جاتے ہیں۔

انھیں میں صرف اردو مخطوطات کے شعبہ کی یہ فہرست ہے جو دو جلدوں میں ہے اور اس کے مرتب دکنی ادب کے قدیم خدمت گزار جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب ہیں جنھوں نے یورپ میں دکنی مخطوطات سے فہرست نگاری شروع کی اور "دکن میں اردو" مدراس میں اردو، دکنی [illegible] "[illegible]" کے ہندوستانی مخطوطات اور سالار جنگ کے کتب خانہ کی وضاحتی فہرست پیش کر کے فہرست نگاروں کی صف میں سب سے آگے نکل گئے اور اب زیر نظر فہرست کی دو جلدیں مرتب کر کے پیش کی ہیں جن میں پہلی ۲۲۴ صفحات ڈبل کراؤن پر ہے اور [illegible] (۷۲) تاریخ کے (۱۴۰) سائنس کے (۴۷) علوم عمرانیات کے (۱۴۹) لسانیات کے (۱۳) اور مختلف مذاہب کے (۲۰) مخطوطات کا تذکرہ ہے۔ دوسری جلد میں جو ۲۸۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اسلامیات کے زیر عنوان تفسیر، حدیث، فقہ، مناظرہ، کلام، تصوف پند و نصائح [illegible] مخطوطات کا ذکر ہوا ہے اور جلد اول کے تکملہ کے طور پر ادب کے (۱۴) تاریخ کے (۱۹) سائنس کے (۴) عمرانیات کے (۹) [illegible] اور پھر اسلامیات کے تکملہ کے (۲۳) مخطوطات کا تفصیلی ذکر ہے جا بجا اس کا بھی اظہار کر دیا گیا ہے کہ مخطوطے کے اور نسخے کہاں کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں مثلاً کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ یا ادارہ ادبیات اردو، کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ [illegible] انجمن اسلامیہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی۔ اکثر مخطوطات کے بارے میں اگر وہ شائع ہو چکے ہوں تو اس کا بھی ذکر آگیا ہے خصوصاً قدیم مثنویاں اور تصوف کے رسائل مطبع حیدری بمبئی۔ مطبع مظہر العجائب مدراس، مطبع معسکر بنگلور وغیرہ سے شائع [illegible] ہو سکتا ہے کہ ایسی بعض چیزیں ہاشمی صاحب کی نظر سے نہ گزری ہوں اور وہ ان کی نظر میں ابھی تک قلمی حیثیت رکھتی ہوں [illegible]

[illegible]

میں رکھے گئے ہیں حالانکہ انہیں اسلامیات کے عقاید و مناقب میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہر شخص اپنا ایک زاویۂ نظر رکھتا ہے اور اسی پر عمل کرتا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ سہو نظری سے ایک کی کتاب ایک کے نام سے موسوم کردی گئی ہو خصوصاً تصوف کے رسایل میں اس کا امکان زیادہ نظر آتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ دکنی الفاظ کے لکھنے میں کسی قسم کی غلطی ہوگئی ہو لیکن یہ سب نقائص ہمیں اس وجہ سے ہیچ معلوم ہوتے ہیں کہ ہمیں کم از کم ایک ایسی کتاب کا پتہ تو چل جاتا ہے جو ہم تلاش کرنا چاہتے ہیں اور آغاز و انتہا کی دی ہوئی سطروں سے اپنا مقصد ایک حد تک معلوم کر سکتے ہیں۔ ویسے اور بھی کتب خانوں کے نام سنتے ہیں، جن کی فہرستیں شائع نہیں ہوئی ہیں تو وہ کتابیں ایسی ہی ہیں جیسے ہمارے بعض بزرگ دوست پرانے خاندانی مخطوطات کو جزدانوں میں رکھتے اور ہر جمعرات کو ان پر پھول چڑھا کر فاتحہ دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کتابوں میں چندر بدن و مہیار کا بھی نسخہ ہو سکتا ہے اور لیلیٰ مجنوں کا بھی۔ عشقیہ داستان بھی ہو سکتی ہے اور تصوف کا کوئی رسالہ از قسم وحدۃ الوجود یا تفاوت الوجود بھی۔

غرض یہ کہ ہاشمی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے حیدرآباد کے ان قدیم مخطوطات کا (خواہ وہ دیوانی و مالی کے ہوں یا سالار جنگ کے کتب کے یا کتب خانہ آصفیہ کے) جنرل آثار بھینسا اور باب حیدرآباد کے کسی بڑے اور مشہور کتب خانہ کے مخطوطات عوام کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہے الا یہ ذخیرہ آغا حیدر حسن کے کتب خانے کے جس کا ہر محقق کی کتابوں اور مضامین میں ذکر ملتا ہے جامعہ عثمانیہ کے مخطوطات کی فہرست بھی چھپی اور ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے کے مخطوطات کی پانچ جلدیں ڈاکٹر زور صاحب کی دیدہ ریزی اور دیدہ وری سے منظر عام پر آگئیں نہ صرف مخطوطات کی بلکہ مطبوعات کی بھی جس سے برصغیر ہند و پاکستان کے تمام محققین استفادہ کر رہے ہیں۔ حیدرآباد کی حکومت اداروں اور حیدرآباد کے ادیبوں کی علم دوستی نے ان تمام مخطوطات کو حیات دوام عطا کردی ہے۔

انجمن خواتین دکن اور انجمن ترقی اردو نے ان کی اشاعت میں جو حصہ لیا ہے انہیں بھی خراج تحسین ادا کئے بغیر تبصرہ نامکمل رہے گا

جوالا مکھی :- اننت گوپال شیوڈے مترجمہ محمد حسن ناشر چلی کتب منزل ڈیوبیرن دہلی صفحات ۱۵۲ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے

یہ ہندوستانی انقلاب کے پس منظر میں لکھا ہوا ناول ہے اور مصنف نے چونکہ خود قومی لڑائی میں حصہ لیا ہے اس لئے ناول میں جگہ جگہ حقیقت کی پرچھائیاں ملتی ہیں اور بظاہر یہ ناول سے زیادہ تاریخ بن گیا ہے لیکن اس کے باوجود دن ایک دلآویز داستان ہے۔ مصنف پر باباے قوم اور ونوبا بھاوے جی کی شخصیتوں کے اثرات جگہ جگہ کار فرما نظر آتے ہیں۔ ناول کے اہم کردار ایک کار کا کردار نہایت بلند ہے۔ آزادی کی تاریخ کے تانے بانے جس انداز سے اس ناول میں بنے گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ہمارے ادب میں یہ ناول ایک اچھا اضافہ ہے۔ (ا۔ص)

اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ :- ڈاکٹر احسن فاروقی (دوسرا ایڈیشن) ناشر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ صفحات ۲۹۵ قیمت ۶ روپئے

"ناول کیا ہے" کے مصنف کی یہ دوسری تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ مصنف نے شام اودھ جیسا ناول اردو ادب کو دے کر ناول نگاری کے معیار کو بلند کیا ہے اس لئے وہ ناول کے نقاد بھی ہیں اور ناول نگار بھی، عالم بھی ہیں اور عامل بھی، اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ناپ تول کر لکھا ہے۔ اسی لئے ممکن ہے کہ بعض حضرات کو ان کی تنقید گراں گذرے

کتاب تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے پہلے حصے میں اردو ناول کے نقوش اولیں اور نذیر احمد کے تمثیلی افسانوں سے بحث کی گئی ہے دوسرا حصہ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۵ء تک ہے جس میں سرشار، شرر، رسوا اور ابتدائی دور کے ناول نگاروں کا جائزہ ہے۔ تیسرا حصہ دور انحطاط یعنی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۶۲ء تک کا جائزہ ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ناول نگاری نے اردو ادب میں ابھی قدم جمائے بھی نہ

دیے تھے۔ کہ پھیل کر نیچے آرہی۔ اسمیں دو عنوانات ہیں ایک تو جدید ناول کے رجحانات پر بحث ہے اور دوسرے عزریات اور مستقبل پر۔ پہلے اور دوسرے حصے میں ناول نگاروں اور ان کے فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں راشد الخیری، سرفراز حسین درنیاز وغیرہ ہیں۔ فاضل نقاد کی رائے ہے کہ راشد الخیری کو مصورِ غم کا خطاب دیا گیا ہے۔ مگر ان کے غم کو غم زندگانی سے محض سطحی تعلق ہے وہ ایک ایسے نرے شاعر کا غم ہے جو نظم کی بجائے نثر میں شاعری کرتا ہے۔ سرفراز حسین کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کو طوائفوں کا سرسید کہنا چاہیئے۔ کشن پرشاد کول کے ناول "شاما" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کول صاحب اُردو میں سرشار اور رسوا کے بعد سب سے زیادہ فطری نقادِ حیات اور انسانی زندگی کے سچے ترجمان ہیں۔

اس کے بعد کرشن چندر، عزیز احمد، قرۃ العین، فاروقی، وغیرہ پر بھی بحث ہے نقاد کا اپنا ایک خیال ہوتا ہے جس کو وہ آزادی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ ماننے نہ ماننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا مباحث میں اختلاف آرا کی گنجائش نظر آتی ہے۔ تاہم ہماری ناول نگاری پر یہ ایک بھر پور تفصیلی تنقید ہے مطالعہ کرنے والے کچھ لے کر ہی اٹھیں گے۔ (ا۔ص)

شب چراغ

: خاور نوری۔ نیشنل پریس حیدرآباد۔ صفحات ۱۲۸، قیمت ۳؍۸

شب چراغ حیدرآباد کے ایک شاعر خاور نوری کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں سید مہدی حسین صاحب نے مقدمہ لکھا ہے اور خاور صاحب کی شاعری کی خصوصیات سے بحث کی ہے خاور صاحب حضرت نجم آفندی کے شاگردوں میں ہیں اور فنی نزاکتوں کے لئے اس تعلق کا اظہار کافی ہے شب چراغ کی پہلی غزل کا پہلا شعر کتنا زیادہ خوش آئند خود اعتمادی کا مظہر اور امیدوں اور آرزوں کا مرکز نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں ؎ خود اپنے فن کی بلندی سے کام لے لوں گا ÷ مجھے مقام نہ دے میں مقام لے لوں گا

اسی طرح وہ اپنے پورے کلام میں رجائیت کے علمبردار اور زندگی کے نقیب نظر آتے ہیں اگر مشق جاری رہے تو کوئی تعجب نہیں کہ انھیں مقام مل جائے۔ (ا۔ص)

جادہ و منزل

پرکاش ناتھ پرویز۔ ناشر مکتبہ نگارش کٹڑہ باگھ سنگھ امرتسر صفحات ۱۱۲ قیمت عه

یہ پنجاب کے ایک نوجوان شاعر کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ اردو میں دوہے بھی ہیں جن کی طرف عصرِ حاضر میں بہت کم توجہ کی گئی ہے دوہے قدیم زمانے میں دکنی زبان میں رائج رہے لیکن بہت کم شاعروں نے ان کی طرف توجہ کی اب پرویز صاحب نے اس صنف پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ فال نیک ہے۔

لیکن یہ صنف بڑا ریاض چاہتی ہے۔ غزلوں اور نظموں سے بھی زیادہ توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ پرویز صاحب کی غزلیں بہت رواں ہیں اور چھوٹی بحروں میں خوب کہتے ہیں۔ مضامین میں شوخی بھی نظر آتی ہے ندرت بھی ہے اور چونکا دینے والی کیفیت بھی، کتاب کا مطالعہ قاری کیلئے خوش وقتی کا وسیلہ ہوگا۔ (ا۔ص)

شراب

مجموعہ غزلیات نواب سید محی الدین علی خاں تصور۔ ناشر۔ ادب کراچی۔ ڈیمی سائز مجلد معہ گرد پوش۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت غیر مجلد ۸؍۳ اور مجلد ۵؍۷۵

نواب سید محی الدین علی خاں تصور کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے پولیس ایکشن کے بعد پاکستان چلے گئے شراب ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے کتاب کا ظاہر اور ایک حد تک باطن شوخیٔ طفلانہ کی غمازی کرتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ غزلوں کا انتخاب کیا جاتا اور انھیں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اشعار میں رفعتِ خیال اور گوانگی کا فقدان ہے۔ غزلیں چھوٹی بحروں میں بھی ہیں اور بڑی بحروں میں بھی روانی بھی ہے۔ اور سلامتِ زبان بھی لیکن مطالعہ کے بعد جو تاثر قایم ہونا چاہیئے نہیں ہوتا کتاب کا حسن و جمال اس بات کا متقاضی ہے کہ

کہ کتاب کتب خانے کی زینت بنے ۔ (ا ص)

حرف شیریں از قاضی غلام محمد ۔ صفحات: ۱۴۴ قیمت (۱-۵۰) ناشر ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد

عوام کے نقطۂ نظر سے ادبی محفلوں میں سب سے زیادہ کامیاب محفل "مشاعرہ" ہوا کرتی ہے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے مشاعروں میں سب سے زیادہ کامیاب وہ شاعر سمجھے جاتے ہیں جو مزاحیہ کلام پیش کرتے ہیں۔ مزاح یا تو خوشحالی سے پیدا ہوتا ہے اور یا اُس کو غم و بیچینی یا مایوسی کن حالات کو بہت بڑا دخل ہوا کرتا ہے ۔

ایسی مایوسی جس پر پہنچ کر انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز اس قابل نہیں کہ اہم سمجھی جائے ۔ کشمیر میں یہ دونوں باتیں نہیں ۔ مالی خوشحالی نہ سہی لیکن وہاں رنگ و بو، نظاروں اور عطر بیز ہواؤں کی بہتات ہے۔ انہیں چیزوں سے دلوں میں شگوفے پھوٹا کرتے ہیں۔ اب اگر ایک حساس، اور پڑھا لکھا انسان ایسے ماحول میں رہتا ہو جہاں قدرت تو سخی ہے لیکن حضرت انسان نے تنگ دلی اور کمینگی اختیار کرلی ہے تو کیا تعجب ہے کہ اس کا مذاق شعری طنز و مزاح کا رنگ اختیار کرلے؟ حرف شیریں کے مصنف جناب پروفیسر قاضی غلام محمد صاحب کے ساتھ بھی غالباً یہی ہوا ہے ۔

قاضی صاحب ریاضی کے پروفیسر ہیں۔ جن حالات سے انہیں دوچار ہونا پڑا ہوگا یا جن کو ان کا شعور روزمرہ دیکھتا رہا ہوگا یہ اس کا طفیل معلوم ہوتا ہے کہ تخیل کے پرکار نے اقلیدس کی شکلوں کو اس طرح ترتیب دیدیا ہے کہ اس سے کارٹون بن گئے ہیں اور ہندسوں سے ایسے ایسے جواب اور حاصل جواب نکال کر رکھ دیے ہیں کہ دل بے ساختہ کھل جاتا ہے۔ نمونہ حاضر ہے ؎

یہ ڈر نہیں کہ ہجر میں جینا محال ہے
ڈر یہ ہے خاکسار کثیر العیالی ہے

"امر ٹو لیو" میں بھی قاضی صاحب نے ایسا ہی کچھ بیان کیا ہے وہ پوچھتے ہیں "کس کی ایجاد ہے کیا آپ بتاؤ؟" اسی طرح کے اور بھی چٹخارے ہیں جو سنجیدہ بھی ہوسکتے تھے لیکن مصنف نے ان کو اس طرح دیکھا ہے اور اس زاویہ سے پیش کیا ہے کہ ہنسنے کے علاوہ عقل سلیم سوچنے پر بھی مجبور ہوجاتی ہے اور شاعری میں طنز کا حقیقی مقصد دراصل یہی ہوتا ہے جو قاضی صاحب نے حاصل کرلیا ہے۔ حرف شیریں پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ کاش یہ کلام ضخیم ہوتا ۔

اس کا دوسرا جزء پروفیسر صاحب کے سنجیدہ کلام کا مجموعہ ہے۔ سنجیدگی میں بھی لطافت اور شیرینی جھلکتی ہے اور پڑھنے والا بلا خوف تردید کہہ سکتا ہے کہ قاضی صاحب کا اصلی رنگ وہی ہے جو کتاب کے پہلے حصہ میں نمایاں ہے۔ اسی شعر کو لے لیجئے ؎

اب بھی کبھی آکے جھانکتا ہے
ویرانۂ دل میں یاد کا چاند

تغزلیت کے سلسلہ میں چاند اور چاند کا آکے جھانکنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ کشمیر ویران سہی مگر زعفران کا پھول اسمیں پھر بھی کھلتا ہے!

بہ حیثیت مجموعی "حرف شیریں" میں کافی شیرینیت ہے اور اس کے دونوں حصے سنجیدہ میں قدم قدم پر لالہ زار کشمیر کی جھلکیاں موجود ہیں۔ جو وہاں کے حالات سے بھی ہم آہنگ دکھائی دیتی ہیں ڈاکٹر ریوپ سومناتھ اور ڈاکٹر زور (مرحوم) کے تعارف پیش لفظ نے "حرف شیریں" کی افادیت کو اور بڑھا دیا ہے ۔

سالنامہ جامعہ دہلی (۱۹۶۱ء کے اردو ادب کا جائزہ) جامعہ کا یہ شمارہ فروری ۶۲ء کا ہے۔ اسمیں ۱۹۶۱ء کے اردو ادب کے جائزہ لیا گیا ہے۔ پاکستان کی اردو مطبوعات پر ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے راجندر ناتھ شیدا نے تنقیدی ادب کا جائزہ لیا ہے ڈاکٹر قمر رئیس نے اردو افسانے اور ناول پر نظر ڈالی ہے اور فرقت صاحب نے زاحیہ ادب پر۔ عبداللطیف اعظمی نے ترجموں پر لکھا ہے اور محمد حسین خان نے بچوں اور بالغوں کی کتابوں پر۔ رشید حسن خاں نے م کا جائزہ لیا ہے اعظمی صاحب نے مطبوعات پر اور خواجہ حافظ نبی احمد صاحب نے ۱۹۶۱ء کی وفیات پر۔

اس قسم کے جائزے سرسری معلومات کا ذریعہ ہوتے ہیں اس لئے کہ کوئی شخص بھی ایک سال کے تمام ادب پر حاوی ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ہم حیدرآباد میں اور پاکستان میں چھپنے والی کتابوں سے اکثر و بیشتر ناواقف رہتے ہیں۔ اگر اشتہارات سے واقف بھی ہوتے ہیں

تنک تنک دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق ہو جاتے ہیں اسی طرح شمالی ہند کے حضرات بہت بڑی حد تک دکن کے کاموں سے ناواقف ہوتے ہیں حالانکہ
ہیں ربط قایم کرنے کے ذرائع میسر ہیں مدراس میسور، حیدرآباد اور بمبئی میں جو کتابیں شائع ہوئیں اس کا بہت کم ذکر کیا گیا ہے حیدرآباد
کے شعرا مخدوم اور ادیب کے گل تر اور یاس گریبان کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اور بہت سے مجموعے شائع ہوئے جو مضمون نگار کی نظر سے
نہ گذر سکے۔ یہی حال تنقید و تحقیق کا بھی ہے اور افسانہ ناول کا بھی۔ یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص ان تمام مطبوعات پر نظر نہیں ڈال سکتا لیکن
بھی ضروری ہے کہ وہ کنوئیں سے نکل کر دریا میں پیراکی کی کوشش سے نکلے اور بلندی پر جا کر نظر دوڑائے۔ (ا۔ص)

ایڈیٹر احمد جلیس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔

مجلہ عثمانیہ - مجلہ عثمانیہ اس سال گٹ اپ، کتابت اور طباعت کی ساری خوبیوں کو لئے ہوئے منظر عام پر آیا ہے یہ باعتبار مضامین
بھی کم اہم نہیں۔ انور معظم صاحب کا مضمون موجودہ دور کا ادبی مزاج ایک نئے انداز فکر کو پیش کر رہا ہے اسی طرح ہاشم حسن سعید کا مضمون ترقی
پسند تحریک کا سماجیاتی جائزہ سیر حاصل ہے احمد جلیس کا مضمون اردو افسانہ کا نیا فسانہ ہماری افسانہ نگاری پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔
اس میں بلا لحاظ شمال جنوب مشرق و مغرب اردو دنیا کے افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور نہایت وسیع القلبی کے ساتھ بوڑھے اور شاطر افسانہ
نگاروں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کا بھی تعارف ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اس کے بعد نوقنا ابشر اور مرد مومن اور
لیڈا اچھے تنقیدی مضامین ہیں۔ نظم کا حصہ نثر کے معیار کا حریف نہیں افسانے بھی کافی ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ ہمارے ان نوجوانوں
کی مشق و مزاولت انھیں مستقبل میں بڑے افسانہ نگار بنا دے ایڈیٹر صاحب نے اس کو ہر لحاظ سے بہتر بنانے میں بڑی محنت اٹھائی
ہے شاید اسی لئے شائع ہونے میں دیر ہوئی۔ (ا۔ص)

ایڈیٹر: جمیل الدین عالی

ماہنامہ "ہم قلم" پاکستان رائٹرس گلڈ اسٹریچن روڈ۔ کراچی، سالانہ: چھ روپئے عبدالحق نمبر ایک روپیہ

گزشتہ ڈیڑھ سال سے پاکستان رائٹرس گلڈ جو قائم ہے یہ ادارہ پاکستان میں اردو زبان و ادب کیلئے بے مثال کام انجام دے رہا ہے
گلڈ کا ترجمان ہم قلم بھی اپنے معیار کے لحاظ سے اردو کے اہم رسالوں میں گنا جاتا ہے۔ زیر تبصرہ اگست کا شمارہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی
عبدالحق مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر ان کی یاد میں شائع ہوا ہے جو ۱۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پرچے میں جہاں مولوی صاحب کی شخصیت
اور انکے ادبی مرتبے اور فن سے متعلق معیاری اور اہم تحریریں شامل ہیں وہیں انکا ایک بہت اہم مقالہ "اردو زبان اور ادب" بھی بالکل پہلی بار
چھپا ہے۔ جسکے مطالعہ سے زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر مولوی صاحب کی بصارت و بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب کے ہر پہلو پر عبور
رکھتے تھے۔ دیگر مضامین میں انکے بھائی شیخ احمد حسین کا مضمون "ابدی بھائی"، ڈاکٹر عبداللہ، وقار عظیم اور شوکت سبزواری کے علاوہ
سید احمد خاں اور غلام مصطفےٰ خاں کے مقالے مولوی صاحب کی ادبی و علمی زندگی کی صرف جھلکیاں دکھاتے ہیں بلکہ انکی پہلو دار شخصیت کے کئی
چھپے موضوعوں کو نئی نسلوں کیلئے آئینہ دکھاتی ہیں۔ محمد اکبر الدین صدیقی نے مولوی صاحب کے رسالہ افسر کے بارے میں بہت ہی نئی باتیں
تحریر کی ہیں۔ یہ مضمون افادیت اور موضوع کے نئے پن کے سبب اخبار ہماری زبان علی گڑھ سے کئی رسالوں میں ڈائجسٹ بھی ہوا۔ تحسین
سروری نے مولوی صاحب کی طالب علمی کے زمانے کی تحریر شائع کرائی ہے جس سے طالب علم عبدالحق کی تصویر ابھرتی ہے۔
ہم قلم نے مولوی صاحب کا عکس تحریر بھی شائع کیا ہے اور آج سے پچیس سال قبل بابو راجندر پرشاد اور مولوی صاحب نے جس مشترکہ
اپیل کو اپنی اپنی دستخطوں سے جاری کیا تھا اس تاریخی دستاویز کا عکس بھی شامل ہے۔ سرورق پر مولوی عبدالحق کی سرانگی خوبصورت
تصویر بھی ہے۔
گلڈ نے مولوی صاحب کی یاد میں ہم قلم کا یہ شمارہ پیش کر کے قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ (د، خ)

صفحات ۱۴۰۔ ادارہ تحریر: رفیع الدین فاروقی، ضیاء الدین انجم، اکبر عابد، حمیدہ

شب تاب - ایوننگ کالج حیدرآباد کی بزم اردو کا ترجمان "شب تاب" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اور زیر تبصرہ اشاعت
اس کا نواں نمبر ہے۔ اس مجلہ کو "جگنو" بھی کہا جا سکتا ہے۔ جگنو نہ تو پابندی سے نظر آتا ہے نہ پابندی سے چمکتا ہے۔ شب تاب کے متعلق

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جلد یا بہ دیر چپ توجلتا ہے اور کم یا زیادہ مگر روشن جھلک دکھا تو دیتا ہے یہ اور بات ہے کہ آئندہ کے لئے ، آئند ذرا لمبا انتظار کرنا پڑے۔ کالجوں اور اردو کی دوسری بزموں کے ترجمانوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

زیر نظر نمبر بہ حیثیت مجموعی غنیمت ہے۔ حصۂ غزل کافی اچھا ہے مخدوم، اکبر صدیقی، وحید اختر اور شاذ کی نظمیں مطبوعہ ہیں۔ پرانی چیزوں ہی سے رسالہ کی ضخامت کو موثر بنایا جانا ضروری تھا تو موجودہ سے کہیں زیادہ بہتر مواد مل سکتا تھا افسانوی ادب کمزور۔ ہر داستان کے اعصاب پر حسب معمول عورت سوار ہے۔ اس جانب توجہ کی ضرورت تھی۔ انشائیے اور مقالے ذرا بہتر ہیں لیکن تحقیق اتنی سطحی کہ ان میں سے کوئی بھی با مقصد نہیں بن سکا۔ زورؔ صاحب مرحوم پر جو مضمون لکھا گیا ہے وہ تاثراتی اور جذباتی ہے۔

شب تاب نمبر ۹ کی ظاہری شکل، صورت اور طباعت عمدہ ہے اور جیسا کہ آغاز سخن میں اپنوں کی کم التفاتی کی شکایت کرتے ہوئے ہے کہ دوسرے کالجوں کے مقابلہ میں علمی اور ادبی دلچسپیاں ایوننگ کالج کے طلبا بہتر ہیں یہ ادعا بھی درست ہی معلوم ہوتا ہے تاہم کچھ تو سی مزید دلچسپی اور توجہ اردو کے اس گلدستہ کی منت پذیری کو اور بڑھا سکتی تھی۔ (رزمی بزمی)

ڈاکٹر زورؔ کی مطبوعہ تصانیف و تالیفات

داستانِ ادب حیدرآباد: حیدرآباد کی تین سو سالہ اردو، فارسی و عربی ادب و شاعری کا جائزہ، جس میں جملہ ارباب کمال کا سا حال، انکے رشحات قلم کی خصوصیات اور جملہ علمی و ادبی تحریکات کا پس منظر ـــــ قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے

تذکرۂ اردو مخطوطات (پانچ جلدیں): ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطات کی توضیحی فہرستیں جن میں ایک ہزار کے قریب قلمی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو میں تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے ان کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔ جلد اول (دوسرا ایڈیشن زیر طبع) جلد دوم تا جلد پنجم۔ ہر جلد کی قیمت: سات روپے

سرگزشت حاتم: شاہ ظہور الدین حاتم اردو کے ان قدیم شعرا میں سے ہیں۔ جنھوں نے ولی دکنی کے تتبع میں مستقلاً اردو شاعری کی اور اس کو پروان چڑھایا کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے جنھوں نے اردو شاعری کو اور آگے بڑھایا۔ اس کتاب میں ان کے حالات وسوانح خصوصیات کلام اور بعض متعلقہ مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔

سرگزشت غالب: اردو فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا غالب کی حیات، کارناموں، اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ ہے جس کو نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

گارساں دتاسی: اردو کے پہلے پروفیسر فرانس کے مستشرق اور ہندوستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں، یورپ کی درسگاہوں اور وہاں کے اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

طالب و موہنی: سید محمد والہ موسوی نے مہاراشٹرا کے ایک تاریخی شہر پرینڈہ کی پرانی داستان عشق منظوم کی ہے۔ والہ کے حالات زندگی اور تصنیفات، ان کی تحریر کے عکس اور قلمی نسخوں کی تفصیلات کے ساتھ اس اردو مثنوی کو شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔

روحِ غالب: اردو اور فارسی کے مشہور شاعر اور ادیب مرزا غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب۔ قیمت تین روپے

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

سنہ اجرا: ۱۹۳۸ء — فون نمبر: ۳۵۲۰۹

جلد ۲۵ - شمارہ: ۱۱ — نومبر ۱۹۶۲

ماہنامہ

سب رس

قیمت سالانہ: ہند و پاک سے ۶ روپے

ششماہی: ۳ روپے

غیر ممالک سے: ۱۰ روپے — فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپ کر دفتر "ایوان اردو" خیریت آباد، حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

ڈاکٹر زور صاحب کے متعلق سے مضامین اور تعزیتی پیامات کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ہمارے بزرگ اور نوجوان ادیبوں کی آنکھیں اس غم و اندوہ کے آنسوؤں سے جلد خشک نہ ہو سکیں گی۔ اور جب بھی ان کی یاد آئے گی ڈبڈبا آئیں گی۔ ہم ہند و پاک کی ایک محترم ہستی تلوک چند محروم اور نوجوان ادیب یوسف ناظم کے جذبات درد والم کو سب رس کی اس اشاعت میں شامل کر رہے ہیں۔

حضرت نجم آفندی نے کبیر داس کے دوہوں پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اور یوسف سرمست نے نذیر احمد کے ناول "ابن الوقت" کا جائزہ لیتے ہوئے مغربی تہذیب پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر خالدہ یوسف نے خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کے تذکرے پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھا ہے۔ یہ تذکرہ مولوی سید محمد صاحب نے ۱۹۲۸ء میں مرتب کر کے شائع کر دیا تھا یہ اس وقت لکھا گیا جب کہ میر تقی میر کی عمر تیس سال کی تھی اور وہ اپنا تذکرہ مرتب کر رہے تھے۔ اس کا شمار دکن کے نہایت قدیم تذکروں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر امین چند شرما نے چندر بھان برہمن لاہوری کا جائزہ لیا ہے، اور ابو محمد سید علی سرتر نے حیدرآباد کے قدیم اردو داروں کی تاریخ لکھی ہے۔ شعرائے کرام کی نظمیں اور غزلیں بھی شریک ہیں لیکن کوئی افسانہ نہیں جس کا افسوس ہے۔ اس کی تلافی کی انشاءاللہ کوشش کی جائے گی۔

ڈاکٹر زور صاحب خطوط لکھنے اور جواب دینے میں بہت پابندی برتتے تھے روزانہ کا اوسط پانچ خطوط کا تھا۔ اکثر حضرات خطوط کی حفاظت کا اہتمام نہیں کرتے۔ ان سے گذارش ہے کہ وہ اپنے خطوط کو اگر علٰحدہ کرنا پسند فرمائیں تو ادارہ کو روانہ فرمائیں اور اگر وہ انھیں اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھتے ہوں تو ان کی نقول عنایت فرمائیں ادارہ ممنون ہوگا۔ ان کے اس عطیہ کا تذکرہ نوادر ادارۂ ادبیات اردو کی تیسری جلد میں ذکر کیا جائے گا۔

مجلس ادارت نے "سب رس" کا ایک خصوصی شمارہ "ڈاکٹر زور نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر زور صاحب کے بارے میں مضامین اور نظمیں شریک ہوں گی۔ ساتھ ہی دوسرا حصہ خود ڈاکٹر صاحب کی تحریروں پر مشتمل ہوگا۔ اس میں ان کے وہ تمام مضامین ہوں گے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں لیکن کتابی شکل میں نہ آسکے۔ خطوط، خطبات، تنقیدیں، نظمیں، غزلیں سب ہی شریک ہوں گی۔ اس طرح اس شمارے کی حیثیت دستاویزی ہوگی۔ ڈاکٹر زور صاحب کے احباب اور شاگردوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضامین ارسال فرمائیں اور اس خصوصی اشاعت کو بہمہ وجوہ تاریخی اور اہمیت کا حامل بننے کا موقع دیں۔ (ادارہ)

یوسف ناظمؔ

ایک حادثہ

ڈاکٹر زورؔ کی یاد میں

بھاگ متی کو سب سے زیادہ رسوا زورؔ صاحب نے کیا۔ ورنہ محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کی داستان کب کی فنا ہو چکی ہوتی۔ ممتاز محل اور شاہ جہاں کی محبت کو نظم اور نثر، ڈراما اور فلم کا روپ دینے والے اب بھی موجود ہیں لیکن قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کی لازوال کہانی صرف زورؔ صاحب نے کہی۔ اس عشق کی یادگار بھاگ نگر جو آگے چل کر حیدرآباد کے نام سے مشتہر ہوا۔ اپنے محبت کرنے والوں سے اس قدر جلد خالی ہو جائے گا کسی کو بھی پتہ نہ تھا۔ حیدرآباد کے دیوانوں کی فہرست میں زورؔ صاحب کا نام روشن نظر آتا ہے، وہ یوں تو تھے زورؔ صاحب لیکن حیدرآباد ان کی کمزوری تھا۔ جامعہ عثمانیہ سے انھیں ایسی ہی محبت تھی جیسی کہ غالب کو کلکتہ سے یا داغ کو دلی جان سے۔ وہ اردو پر جان چھڑکتے تھے لیکن انھوں نے کبھی بھی اردو کی بارات فارسی کے گھوڑے پر نہیں نکالی۔ زورؔ صاحب سیدھی سادی اردو کے رسیا تھے اور اپنی اردو پر وہ فدا تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو اور "سب رس" تو ان کی اپنی اولاد تھے ان تمام چیزوں کی محبت میں گرفتار ہو کر زورؔ صاحب محبت کا پتلا بن گئے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ کسی کو اپنا دشمن نہیں رہنے دیتے تھے اور دوسرا اہم نقص یہ تھا کہ وہ دھن کے پکے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی حیثیت اور اہمیت کا خود حیدرآباد کے بسنے والوں کو پوری طرح اندازہ نہیں اور نہ جاننے والے تو صرف اسی قدر جان سکتے ہیں کہ زورؔ صاحب نے ایک ادارہ قائم کر دیا ہوگا جہاں کتابیں فروخت ہوتی ہوں گی، ایک آدھ پبلک لائبریری ہوگی۔ ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کے بارے میں شاید بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ جب ادارہ کے امتحانات شروع کیے گئے تو ریاست حیدرآباد کے ہزاروں افراد ان امتحانات میں شرکت کے خواہشمند تھے۔

۱۹۴۲ء میں میں زورؔ صاحب کا شاگرد بنا اور اس امر کی سب سے پہلی سزا مجھے یہ بھگتنی پڑی کہ انھوں نے مجھے ادارہ کے امتحانات کے ممتحن کی حیثیت سے مومن آباد کے کسی گاؤں میں بھیج دیا میں اس وقت تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ یقین جانیے مومن آباد کے اس گاؤں میں پہنچنا جہاں ادارہ کے امتحانات کی روشنی پہنچ چکی تھی میرے لیے خلا کے سفر سے مشکل تھا۔ بارش کی وجہ سے راستے زیر آب تھے اور مجھے گھوڑے پر اس گاؤں تک پہنچایا گیا۔ یہ گھوڑا بھی مجھے مومن آباد کے تحصیلدار صاحب محمد عمر صاحب کی بدولت دستیاب ہوا تھا۔ سفر کی ساری صعوبت اس وقت دور ہوئی جب کہ گاؤں کے طالب علموں نے میرا پرجوش استقبال کیا۔ میں وہاں مقررہ تاریخ سے صرف دو دن بعد پہنچا تھا۔۔۔ سارے طالب علم چشم براہ تھے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں اردو کا امتحان کامیاب کر لینے کی ایسی لگن دیکھ کر تو میں دنگ رہ گیا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ گاؤں کا کوئی تہوار ہے، کوئی جشن ہے۔ جی چاہا کہ بس عمر بھر ممتحن بنا رہوں اور امتحان دینے والے یوں ہی خاطر تواضع کرتے رہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کی یہ مقبولیت آسمان سے نہیں ٹپک پڑی تھی اور نہ زمین کے اندر سے ابل آئی تھی، یہ تو محنت اور محبت کا پھل تھی ادارہ ادبیات اردو کے اس پہلو سے کتنے لوگ واقف ہیں۔ ادارہ نے کتنے

ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرایا یہ الگ ہی بحث ہے میں تو صرف اتنا بتانا چاہتا تھا کہ ادارہ نے کتنوں کو اردو لکھنا اور پڑھنا سکھایا۔ اردو کے خدمت گزار کی حیثیت سے زورؔ صاحب کبھی بھلائے نہیں جا سکیں گے۔ دکنی ادب کے تو وہ مائی باپ تھے۔ قلی قطب شاہ نے بھاگ متی سے عشق کیا لیکن زور صاحب نے خود قلی قطب شاہ سے عشق کر ڈالا۔ قلی قطب شاہ کا دیوان زور صاحب نے جس چاؤ سے چھاپا ہے شاید ویسی توجہ خود ان کی اپنی کسی کتاب کو نہیں ملی۔

زورؔ صاحب نے کبھی کوئی کام ٹالا نہیں، کسی کام کے انجام دینے میں دیر نہیں کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر کام میں انھوں نے عجلت ہی کی جب وہ تھرڈ ایر کے طالب علم تھے روح تنقید لکھی۔ ظاہر ہے فن تنقید پر یوں کتاب کا لکھا جانا بہتوں کو کھلا۔ یہ عجلت ان کی طبیعت کی افتاد بن گئی اور اسی لیے انھوں نے مرنے میں بھی بڑی عجلت سے کام لیا۔ میں مجبور ہوں کہ ان سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کروں کیوں کہ ایک تو یہ ملاقات تاریخی ملاقات بن گئی دوسرے یہ کہ میرا خیال ہے کہ زورؔ صاحب مرنے سے پہلے اپنے شاگردوں میں جس سے سب سے اخیر میں ملے وہ میں ہی ہوں۔

ڈاکٹر صاحب ۱۶ ستمبر ۶۲ء کی شب میں بمبئی پہنچے۔ گو انھوں نے مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ وہ یہاں ۱۷ کو پہنچنے والے ہیں۔ ۱۷ کو میں ان کے پاس حاضر نہیں ہو سکا لیکن ۱۸ ستمبر کی شام (۵) بجے ہی میں ڈاکٹر … صاحب کے مکان پہنچ گیا، یہاں ڈاکٹر صاحب مقیم تھے۔ دو ڈاکٹروں کا یہ اجتماع میرے لیے یقیناً پریشان کن تھا۔ ڈاکٹر مدنی جلدی کالج چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے میں کئی سال بعد مل رہا تھا لیکن آپ جانتے ہیں وقت اور فاصلے دلوں کے درمیان حائل نہیں ہوتے، ہم وطن، ایک ہی یونیورسٹی کے طالب علم، ایک استاد، ایک شاگرد اتنے رشتے ہوں تو غربت شرم سے منہ چھپا لیتی ہے۔ پھر ایسی جگہ ملاقات جو ان کی نہ میری۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر قسم کی باتیں کر ڈالیں۔ ستمبر کے اس ہفتہ میں حیدرآباد میں اس شدت کی بارش ہو رہی تھی کہ بمبئی بھی بھیگ گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کتب خانے کی خیریت کے لیے بے چین تھے۔ صابو صدیق پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ میں دسنوی صاحب سے ملاقات کے وقت بھی انھوں نے خبروں کے لیے بے چینی کا اظہار کیا۔ دسنوی صاحب کے پاس سے میں مجبوراً ڈاکٹر صاحب کو انقلاب کے دفتر لے گیا "سیاست" کی تلاش میں لیکن تازہ ترین سیاست وہ نہیں دیکھ سکے۔ ڈاکٹر صاحب بمبئی سے حیدرآباد بھی جانا چاہتے تھے لیکن ہوائی جہاز میں نشست بک نہ ہو سکی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب ۴ اگست کو حیدرآباد پہنچے تھے اور مجھے بھی اس کی اطلاع دی تھی۔ بس یہی ان کا آخری سفر تھا۔ پھر وہ حیدرآباد نہیں جا سکے۔ انقلاب کے دفتر سے اٹھنے کے بعد پھر ہم وجد کے ہاں گئے وہاں زورؔ صاحب نے دفعتاً تکلف کا رہا سہا چولا اتار پھینکا اور بعد میں مجھ سے فرمایا بھی کہ ان کی طبیعت کا انقباض بھی دور ہو گیا۔ کشمیر میں ایسا معلوم ہوتا ہے وہ خوش نہیں تھے۔ کام کرنا چاہتے تھے لیکن راستے بند پاتے تھے۔ زورؔ صاحب اور کم آمیز لوگوں کا کوئی جوڑ نہیں۔ وہ تو محفل کے آدمی تھے۔ لوگ آتے رہیں۔ جلسے، نشستیں، ادبی محفلیں، مباحثے ہوں تب زور صاحب کو پان کھانے کا لطف آتا تھا ورنہ تنہا بیٹھے پان کھاتے رہتے۔ زور صاحب کو آرام نہیں کام کی خواہش تھی وہ اب بھی کام کرنا چاہتے تھے۔ مرنا تو وہ خیر چاہتے نہیں تھے لیکن زندگی کو انھوں نے کام کی چیز سمجھا تھا۔ عیش و آرام ان کا مقصود نہ تھا۔ اس دن زورؔ صاحب سے اتنی باتیں ہوئیں کہ اگر کوئی ادیب سنتا تو سمجھتا کہیں عورتیں تو نہیں جمع ہیں۔ انھیں اس دن بنک بھی جانا تھا۔ یونیورسٹی بھی جانا تھا اور بچوں کے لیے شاپنگ بھی کرنی تھی انھوں نے اس دن میری دو باتیں رد کر دیں لیکن اس رد کرنے کی نفی میں محبت اور شفقت کی کتنی ہی ان گنت علامتیں پوشیدہ تھیں۔ پہلے تو ۱۲ بجے کے قریب جب ہم وجد صاحب کے پاس سے اٹھے تو میں نے اجازت چاہی تو انھوں نے کہا خوب! کیا چند گھنٹے بھی تم ساتھ نہیں رہو گے"۔ یہ کیسے معلوم تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔ بنک اور یونیورسٹی کا کام ختم ہونے پر میں نے زور صاحب کو کھانے کی دعوت دی اور زور صاحب نے مہمانوں کی فہرست پڑھ دی پھر انھوں نے بچوں کے لیے کپڑے خریدے۔ اپنے لیے پان خریدے اور کہا کہ کشمیر میں پان بھی نہیں ملتے ہیں۔ اس کے بعد میں ان سے جدا ہوا۔ اس دن کی باتیں بجی بجی تھیں اور

کاروباری بھی، ادبی بھی تعلیمی نیم سیاسی بھی۔ شاید ہی کسی کا ذکر ہم سے چھوٹا ہو۔ مولوی عبدالحق سے لے کر محمد علی تیز تک کا ذکر ہوا۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹ کی صبح دلی چلے گئے ۲۰ کو وہ کشمیر پہنچے ہوں گے۔ صحت ان کی بالکل اچھی تھی وہ تندرست اور توانا تھے ۲۴ ستمبر کو ان کا انتقال ہو جانا اچنبھا نہیں تو کیا ہے۔ یہ بھی کوئی موت ہوئی۔ سرینگر والوں کا زور صاحب پر کوئی حق نہ تھا لیکن قبروں اور مزاروں کی تعمیر کا شوق انہوں نے اس موت سے بھی پورا کر لیا۔ سری نگر والے مزاروں کے بڑے شیدائی ہیں اور غالباً ہر کسی کی قبر بنانا اپنا اجارہ سمجھتے ہیں۔ زور صاحب نے بھی بتایا تھا کہ زیارت وہاں عام بات ہے اور جب بھی سیاح وہاں آتے ہیں زیارتیں ضرور کرتے ہیں۔ زور صاحب بھی اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کو وہاں زیارت کے مقامات پر لے جاتے رہے ہیں۔ چلیے اب ایک اور مقام کا اضافہ ہو گیا۔

زور صاحب نے اس دن اپنے اشعار بھی سنائے تھے۔ ایک شعر غالباً یوں ہے ؎

کشمیر میں کوئی ہے کراچی میں ہے کوئی
اب کس کو ہم بتائیں کہ اہل دکن ہیں کون

واقعہ یہ ہے کہ اہل دکن اب تو چار مینار سگریٹ کی طرح دیس دیس میں پھیل گئے ہیں۔ کہاں تو وہ زمانہ تھا کہ چاروں طرف سے لوگ سمٹ کر حیدرآباد میں جمع ہو گئے تھے اور پورا حیدرآباد چھتہ بازار بن گیا تھا اور اب یہاں یہ حال ہے کہ ہر شخص وطن سے دور ہے کیا خدا کے ہاں بیکسی کی شرم رکھنے کی یہی ایک تدبیر ہے۔

زور صاحب اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ بمبئی میں انجمن ترقی اردو کے تعزیتی جلسے میں وجد نے تقریر کرتے ہوئے یہی کہا کہ "زور صاحب نے حیدرآباد میں ایسے ادیب اور زبان کے خادم پیدا کر دیے جن میں تخلیق کی لگن اور کام کرنے کا جذبہ ہے اس بات کا کوئی خطرہ نہیں کہ ان کے کام ادھورے رہ جائیں"۔ مجید صدیقی صاحب اور سکینہ صاحب ادارہ کے کام کی دیکھ بھال کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ یقیناً جاری رہے گا۔ حیدرآباد سے دور رہنے والے سوائے کلمات خیر کے اور کیا بھیج سکتے ہیں

"سب رس" ان کی یادگار ہے، اور زور صاحب کے دوست احباب اسے قائم رکھیں گے۔ تند ہوائیں تو چلتی ہی رہتی ہیں لیکن کھلنے والے پھول کھل کر ہی رہتے ہیں۔ زندگی کا چراغ بجھ سکتا ہے لیکن عمل کا نہیں۔

آہ ڈاکٹر زور

تلوک چند محروم

پھر کون سرفراز سوئے گور گیا
ماتم کا جو آج عرش تک شور گیا
افسوس افسوس صد ہزاروں افسوس
بزم ہستی سے ناگہاں زور گیا

کشمیر کو جاتے ہیں سیاحت کے لیے
یا دفع مرض حصول صحت کے لیے
اے زور یہ کیا کہ لے گئی تجھ کو قضا
کشمیر میں آہ مرگ غربت کے لیے

سب اہل وطن وطن میں رونے ہیں تجھے
شہر و دشت و دمن میں روتے ہیں تجھے
تو گلشن کشمیر سے بو ہو کے اڑا
بیوی بچے دکن میں روتے ہیں تجھے

نجم آفندی

کبیر داس کے دوہے

کبیر برج بھاشا کے شاعر تھے۔ برج بھاشا کہو یا پوربی بھاکھا آگرہ اور متھرا میں (اردو کی طرح) جنم لیا اور ہندوستان میں پھیلتی چلی گئی۔ متھرا کے تقدس کی وجہ سے برج بھاشا کے نام سے سرفراز ہوئی۔ اودھ میں اور اس کے آگے بڑھکر پوربی ہندی کہلائی۔ کبیر داس اس پر فخر کرتے ہیں۔

بولی ہماری پوربی، بولی لکھے نہ کوئے
ہمری بولی وہ لکھے جو کھرا پوربیا ہوئے

سنسکرت برہمنوں اور ایسے ہی اونچی ذات والوں کے لئے مخصوص تھی۔ مگر برج کی زبان نے بھی چند ربردائی کے بعد سورداس، تلسی داس، کبیر داس، بہاری، رحیم، ملک محمد جائسی، امیر خسرو، سہجو بائی، میراں بائی جیسے مشہور و معروف شاعر پیدا کئے جن میں سورداس، تلسی داس، کبیر داس کے نام زیادہ نکلے ہوئے ہیں۔ سورداس کا مقام ان تینوں میں بہت بلند بتایا گیا ہے۔ ایک ہندی کے شاعر نے تو ہندی شعرا کے متعلق بڑا پرلطف دوہا کہا ہے۔

سور سور تلسی سسی، اڈگن کیشو داس
اب کے کوی کھدیوت سم، جہاں تہاں کرت پرکاش

تتو تو سورا کہے تلسی کہے انوٹ
بچی کچی کبیرا کہے اور کہیں سب جھوٹ

بہرحال بچی کچی کہنے والے کبیر کا کلام مجھ جیسے اَن پڑھ کی سمجھ میں زیادہ آتا ہے لہٰذا مجھے پسند ہے اور میں نے اس پر قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے۔

سکندر لودھی کا زمانہ تھا جب کبیر ۱۴۵۵ء میں بنارس جیسے مقدس مقام پر دنیا میں آئے۔ ان کے نسب کا مسئلہ پایۂ تحقیق تک نہیں پہنچ سکا۔ دو مختلف روایتیں ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک جولاہے نورا نامی کے بیٹے ہیں اور یہ روایت بھی ملتی ہے کہ پیدا ہونے کے بعد دریا کے کنارے ڈال دیئے گئے تھے اور وہاں سے اس جولاہے نے اٹھا کر بیٹوں کی طرح پرورش کیا۔ ان کی زندگی اور فکرِ سخن کا انداز یہ بتا رہا ہے کہ ہندو مسلم دونوں مذاہب سے کچھ کچھ متاثر ہیں اور نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی موت کے بعد مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے اور ہندو جلانا چاہتے تھے۔

کبیر داس جی راما نند کے چیلے تھے اور بڑی کوشش سے ان کے حلقۂ ارادت میں جگہ پائی تھی۔ راما نند چھوت چھات کے بڑے پابند تھے اور کبیر ظاہر ہے کہ جولاہے کے گھر کے ایک فرد تھے مگر ایسے چیلے بنے کہ چند ہی روز میں گرو کو بھی اپنے مسلک پر لے آئے۔ راما نند جی ذات پات کی بندشوں کو خیرباد کہکر ہر مذہب و ملت، قوم اور قبیلے کے افراد سے مل جل کر ایشور بھگتی کا درس دینے لگے۔

کبیر داس جی مورتی پوجا کے بڑے مخالف تھے۔ ایک دوہے میں کہتے ہیں ؎

پاہن پوجے ہری ملیں تو میں پوجوں پہاڑ

یعنی بت پرستی سے خدا ملے تو میں پہاڑ کی پرستش کیوں نہ کروں۔ لہٰذا ان کو ہندو نہیں کہا جا سکتا۔ روزہ نماز کا ان کی زندگی میں کہیں ذکر نہیں اس لحاظ سے مسلمان بھی نہیں تھے مگر اپنے کلام کے اعتبار سے پکّے موحّد ثابت ہوتے ہیں ایک دو ملاحظہ ہو۔

جو یہ ایک نہ جانیا تو بہو جانے کیا ہوئے　　ایکے تے سب ہوت ہیں سب سے ایک نہ ہوئے

اس میں توحید کا درس کس لطف سے دیا گیا ہے۔ عبادت کے متعلق کبیر کا نقطۂ نظر عجیب ہے۔ دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے پر زور دیتے ہیں۔ مالا جپنے، تسبیح پڑھنے پر جگہ جگہ اعتراض کیا ہے۔

مالا جپت جگ بھیا مٹا نہ من کا پھیر　　کر کا منکا ڈار دے من کا منکا پھیر

فرماتے ہیں ایک زمانہ مالا جپتے ہو گیا دل کی کجی نہیں گئی ہاتھ کا مالا پھینک دے اور دل ہی دل میں یاد کر۔

قوت شاعری اس دوہے میں بہت کچھ ہے۔ مالا جپت من کا پھیر۔ من اور منکا۔ ان لفظوں نے بڑا لطف سماعت پیدا کیا ہے۔

کبیر داس کے کلام میں اخلاقی درس بہت زیادہ ہے عاشقانہ رنگ بہت کم ہے، اور جو ہے وہ تصوف کے انداز میں ہے۔

مورتی پوجا کے ساتھ ساتھ اسلام کے طریقۂ عبادت پر بھی اعتراض کیا ہے۔ کہتے ہیں:

کنکر پتھر جوڑ کر مسجد لیا چنائے　　تا چڑھ ملا بانگ دے بہرا ہوا خدائے

اسی مضمون کو ایک اور دوہے میں بھی کہا ہے۔ یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ یہ اذاں کا مقصد نہیں سمجھتے تھے جو نمازیوں کو پکارنے اور جمع کرنے کے لیے ہے۔ پھر یہ اعتراض کہ "بہرا ہوا خدائے" کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا یہ اعتراض محض شوخیٔ طبع ہے کہ اذاں کی آواز سے ایک مضمون ذہن میں آ گیا اور دوہا کہہ دیا۔ مگر دوہے کا لحن اور کبیر کا اندازِ بیاں اس کی نفی کرتا ہے۔ اس زمانے کے ایک بزرگ شیخ تقی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کبیر داس کے خاص دوستوں میں تھے۔ اکثر دوہوں میں کبیر نے ان کا نام لے کر مخاطب کیا ہے اگر ان دونوں حضرات کے تبادلۂ خیالات اور ان کی صحبتوں کے حالات کچھ معلوم ہو سکتے تو کبیر داس کی سوانح حیات پر بہت کچھ روشنی پڑ سکتی ہے اور اس سلسلے میں ایک بڑا مفید اور دلچسپ اضافہ ہو سکتا ہے۔

عبادت کے طریقوں پر اعتراض ان کا خاص موضوع ہے۔ ان کے دوہوں کے موضوعات کی ایک نامکمل فہرست یہ ہو سکتی ہے۔ توحید کی تبلیغ۔ شرک کی مذمت۔ جھوٹے ویراگ کی مخالفت۔ سنتوش کی تعلیم۔ بھیک مانگنے کی برائی۔ علم اور تواضع کا درس۔ سچائی کی خوبیاں، غیبت، بدگوئی، عیب بینی کی مخالفت۔ زیادہ سونے، زیادہ کھانے اور شراب نوشی کی برائیاں۔ پریم اور گیان دھیان کی تعریف وغیرہ وغیرہ۔ گرو کی خدمت اس کی تقلید، خاموش عبادت اور ایشر بھگتی پر بڑا زور دیا ہے۔ قربانی کو بہت برا کہا ہے۔

ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کے سخت مخالف تھے اور زمانہ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے مرتے ہی ان کے نام سے ایک فرقہ "کبیر پنتھی" قائم ہو گیا جس کی بہت بڑی تعداد آج بھی ہے۔

کبیر داس فارسی زبان اور فارسی شعرا [illegible] بہت متاثر تھے۔ فارسی کے لفظ جو انھوں نے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں ان کی ایک بہت بڑی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔

کبیر داس کو ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی حاصل ہے جو انھیں دوسرے ہندی شعرا سے ممتاز کرتی ہے کہ غزل کی بنیاد انھیں کے ہاتھ سے رکھی گئی اور یہ اردو کے پہلے غزل گو شاعر کہے جا سکتے ہیں۔ غالباً بھنڈارولی میں ان کی ایک نظم جو سخن کے نام سے درج کی گئی ہے میری نظر سے گزری جسے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ غزل نے انھیں کے نتیجۂ فکر سے جنم لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ غزل سب سے پہلے جس زبان میں کہی گئی وہ فارسی زبان ہو یا کوئی اور زبان غزل کے نام سے نہیں کہی گئی۔ غزل اس کا نام بعد میں رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں غزل فارسی کا تتبع ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غزل فارسی کے اتباع سے پہلے اس دور کی اردو زبان میں موجود تھی اور کبیر داس کے اس بھجن کی موجودگی میں کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی تعمیر اس زمانے ہی سے شروع ہو گئی تھی۔

جس نظم کو بھجن کا نام دیا گیا ہے اس میں بھجن کی خصوصیات کے بدلے غزل کا تمام تر انداز پایا جاتا ہے اور اسے غزل مسلسل کہنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔

ہمیں ہے عشق مستانہ ہمیں کو ہوشیاری کیا — رہے آزاد یا جگ سے ہمیں دنیا سے یاری کیا
جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے — ہمارا یار ہے ہم میں ہمیں کو انتظاری کیا
خلق سب نام اپنے کو بہت کر سر پٹکتی ہے — ہمیں گر نام سانچا ہے ہمیں دنیا سے یاری کیا
نہ پل بچھڑے پیا ہم سے نہ ہم بچھڑیں پیارے سے — انھوں سے نیہہ لاگا ہے ہمیں کو بے قراری کیا

کبیرا عشق کے ناتے دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک سے ہمیں سر بوجھ بھاری کیا

کسی دور اور کسی زبان کی شاعری ایسے دیدہ دلیر شعرا سے محفوظ نہیں رہی جو اپنے یا گزشتہ کے نامور شعرا کے کلام سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوں۔ چنانچہ کبیر داس جی کو بھی ایسے قطاع الطریق سے واسطہ پڑا ہے اور انھوں نے اس سلسلہ میں دوہا کہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں کس قدر دکھ پہنچا ہو گا۔ ایک جلے بھنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

ساکھی لائے بنائے کے ات اُت اکشر کاٹ — کہیں کبیر کب لگ جیے جھوٹی پتل چاٹ

اس احتجاج میں مضمون ہی کا نہیں بلکہ الفاظ کی چوری کا بھی شکوہ کیا گیا ہے اور بڑے لطف کی بات کہی ہے کہ جھوٹی پتل چاٹ کر کب تک زندہ رہیں گے اور یہی ہوا کہ آج ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا اور کبیر اور ایسے ہی دوسرے باکمال شعرا کا ڈنکا بج رہا ہے۔ کلام پر تبصرے ہو رہے ہیں اور یاد تازہ کی جا رہی ہے۔

ہندی شاعری میں اردو فارسی کی طرح بہت سی اصناف سخن ہیں۔ بھجن، دوہے، چوپائیاں، گیت وغیرہ وغیرہ ان اصناف سخن میں دوہا سب سے زیادہ مختصر اور مفید صنف ہے۔ اردو شعر کی طرح دو مصرعوں سے مرکب ہوتا ہے اور اس کوزے میں ایک دریا سما سکتا ہے مگر یہ بات شاعر کی قادر الکلامی اور کمال فن پر موقوف ہے۔

دوہا ہر خاص و عام ہندو مسلم کی زبان پر آسانی سے آسکتا ہے اور حافظہ میں رہ جاتا ہے۔ میں نے بہت سے جاہلوں کی زبان سے بھی دوہے سنے اور پڑھے لکھے آدمیوں کی زبان سے بھی۔ دوہے میں ردیف نہیں ہوتی صرف قافیہ کی پابندی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی قافیہ ایک ہی معنی و مفہوم میں دونوں مصرعوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جو اردو اور فارسی میں جائز نہیں۔

کبیر اپنے دوہوں میں بہت ہلکے پھلکے اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں اس لیے ان کے دوہے تمام ہندی شعرا کے دوہوں سے زیادہ مقبول ہوئے اور پسند کیے گئے۔ ان کے دوہے زیادہ تر اخلاقی مسائل سے متعلق ہیں۔ موقع موقع سے جن کے استعمال نے کبیر داس کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں روشناس کرا دیا۔ عاشقانہ رنگ کے دوہے بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں مگر کمی کے ساتھ۔ اب میں کچھ دوہے سنا کر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ شیریں زبانی سے کیا کام لیا جا سکتا ہے اور ایسے الفاظ کی کیا قیمت ہے کبیر کی زبان سے سنئے۔

شبد برابر دھن نہیں جو کوئی جانے بول　　ہیرا تو داموں ملے شبد کا مول نہ تول

اثنائے گفتگو اور بحث مباحثہ میں تکرار کی نوبت آنے پر فتنہ و فساد کو روکنے اور لڑائی ٹالنے کے لیے جس انداز سے مشورہ دیا ہے وہ اس دوہے میں دیکھئے۔

آوت گالی ایک ہے الٹت ہوئے اینک　　کہیں کبیر نہ الٹئے واہی ایک کی ایک

کسی فارسی کے شاعر کا ایک قابل تعریف شعر ہے جس میں توکل کا بہترین مقام بتایا گیا ہے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را　　تو دانی حساب کم و بیش را

کبیرداس نے اس منزل میں جو دوہا کہا ہے وہ اس مقام سے بہت آگے ہے۔

تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگت ہے مور　　میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تور

کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے کے اقدام کی مخالفت میں کبیر کا جو دوہا پیش کر رہا ہوں جس میں اس نے بخیل آدمی یا مانگنے پر نہ دینے والے آدمی کے متعلق بھی رائے دی ہے اس کی مثال مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

مانگن گئے سو مر گئے مرے سو مانگن جاہیں　　تن سے پہلے وے مرے جو ہوت کرت ہیں ناہیں

غفلت اور بے عملی کے خلاف وقت اور کام کی اہمیت کے بارے میں ایک دوہا ہے۔ جس کی شان ہی نرالی ہے بے عملی کو غفلت سے تشبیہ دے کر کیا بات کہی ہے ملاحظہ ہو۔

کبیر سوتا کیا کرے جاگ جپس کرتار　　اک دن سونا ہوئے گا لمبے پاؤں پسار

وقت کی قیمت اور اہمیت کے سلسلہ میں ایک اور دوہا سنیے شاید اس سے بہتر اظہار خیال نہیں ہوسکتا۔

کہتا ہوں کہہ جات ہوں کہا بجاوں ڈھول　　سانس خالی جات ہے تین لوک کا مول

ہنر اور اس کی قدردانی کے اسباب میں فرماتے ہیں۔

جب گن کا گاہک ملے تب گن لاکھ بکائے　　جب گن کا گاہک نہیں کوڑی بدلے جائے

آخر میں عاشقانہ رنگ کے دوہے بھی سن لیجئے اور اس تھرے پاکیزہ اور سنجیدہ تغزل کی داد دیجئے۔

کبیر من پربت ہتھاب میں پایا جان　　ٹانکی لاگی پریم کی نکلی کنچن کھان

مطلب یہ کہ دل کے جذبے نے بتایا کہ دل اک پہاڑ ہے جس میں سونے کی کان چھپی ہوی ہے۔

ہاڑ جلے جس لاکڑی کیس جلے جس گھاس　　ویسے پیارے میں جلوں لگی تمہاری آس

اس سے بہتر فراق کی کیفیت کیا بیان کی جاسکتی ہے۔

جو شخص محبت سے ناآشنا ہو اس کو ایک جسد بے جان سے مثال دے کر کہتے ہیں۔

جا گھٹ پریم نہ سنچرے سو گھٹ جان مسان　　جیسے کھال لوہار کی سانس لیت بن پران

لوہار کی کھال سے مراد وہ دھونکنی ہے جس سے لوہا گرم کرنے کے لیے آگ روشن کی جاتی ہے جس طرح دھونکنی بغیر زندگی کے سانس لیتی ہے ایسی ہی بغیر محبت کے انسان کی زندگی ہے۔

محبت میں انسان موت اور زندگی سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اسے سوائے محبت کے کوئی دوسری فکر نہیں رہتی اس مضمون کو ذیل کے دوہے میں ادا کیا ہے۔

پریم پیالہ جو پیے سیس دکشنا دے لوبھی سیس نہ دے سکے نام پریم کا لے

ایک آخری دوہا اور سن لیجئے جو معرفت میں کہا گیا ہے۔ یہ محبت کا وہ مقام ہے کہ سننے سمجھنے والا بے چین ہو جاتا ہے۔ اس دوہے میں محبت کے معیار کو دیکھئے فرماتے ہیں۔

مجھ میں اتنی شکتی کہاں گاؤں گلا پسار بندے کو اتنی گھنی پڑا رہے دربار

جی تو یہ چاہتا ہے کہ سیکڑوں دوہے اٹھا کر اس مضمون میں رکھ دیئے جائیں لیکن نہ وقت ہے نہ گنجائش۔ دوہوں کی آسان زبان ان کی سلاست، روانی اور افادیت یہ سب چیزیں ایسی نمایاں ہیں جن پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ تمام اردو اور ہندی جاننے والے صاحب ذوق حضرات ان کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں اردو کے شعرا کو رائے دوں گا کہ وہ ہندی کے شعرا کے کلام کا مطالعہ کر کے استفادہ کریں۔

کبیر داس بنارس میں پیدا ہوئے تھے مگر بنارس میں مرنا پسند نہیں کیا۔ آخر عمر میں مگہر چلے گئے۔ اس سلسلے میں کبیر نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جیسا کہا جاتا ہے کہ "بنارس میں مرنے والے کے لیے نجات ہے اُسے کتنی نصیب ہوتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو بنارس میں مرنے والے پر خدا کا کرم اور احسان ہی کیا ہوا، لہٰذا میں بنارس میں مرنا نہیں چاہتا۔"

مگہر میں جہاں انھیں یا اُن کی خاک کو دفن کیا گیا ہے اس مقام پر جو عمارت بنائی ہے اس کے دو گنبد ہیں ایک مسجد نما ہے اور ایک جیسا مندر پر بنایا جاتا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے مقبرے کو بھی فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا جس کے یہ انتہائی مخالف تھے یہاں سالانہ ایک میلہ ہوتا ہے جس میں کبیر پنتھی فقرا ان کے بھجن، دوہے اور ساکھیاں گاتے اور سناتے ہیں، اور ہزار ہا آدمی جمع ہوتے ہیں ہندو بھی مسلمان بھی۔ کہا جاتا ہے کہ کبیر پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے مگر اپنی شاعری کا ایسا نقش چھوڑ گئے جو بہت سے پڑھے لکھے شاعروں کو نصیب نہیں ہوا۔ (اردو مجلس حیدرآباد میں پڑھا گیا)

یوسف سرمست (ایم۔ اے)

"ابن الوقت" اور مغربی تہذیب

"ابن الوقت" نذیر احمد نے آخری زمانے میں لکھا۔ اس وقت تک ان کے سماجی اور سیاسی تصورات پختہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے پختہ شعور کی روشنی میں اس وقت کے ہندوستانی حالات پر نظر کی اور ان پر غور کرنے کے بعد وہ جس نتیجہ پر پہنچے اس کو ابن الوقت میں پیش کر دیا۔ ابن الوقت میں مغربی تمدن اور تہذیب کی مخالفت کی گئی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مغرب کی ہر چیز کو بُرا سمجھتے تھے۔ اس کے برخلاف انھوں نے ہمیشہ مغربی تہذیب کی اچھی باتوں کا خیر مقدم کیا۔ انگریزی حکومت اور مغربی تمدن کی لائی ہوئی بہت سی برکتوں کو دل کھول کر سراہا۔ اکثر موقعوں پر تو انھوں نے انگریزی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو بھرپور طور پر واضح کرنے کی کوشش کی۔ انگریزوں اور مغربی طور طریقوں کو نفرت اور حقارت کے جذبے سے دیکھنے کی مخالفت کی اور ان کے ساتھ مفاہمت کرنے کی تلقین کی۔ لیکن وہ ان تمام باتوں کے باوجود اس بات کے بھی قائل نہیں تھے کہ ہندوستانیوں کو پورے طور پر مغربی تمدن اختیار کر لینا چاہیئے۔ ابن الوقت میں انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی نہیں بلکہ "مغرب زدگی" کی مخالفت کی ہے، اس مخالفت کی ان کے پاس معقول وجوہات تھیں انسانی زندگی میں سماج کو جو اہم ترین مقام حاصل رہتا ہے اس پر ہمیشہ نذیر احمد کی نگاہ رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ فرد کو اس کے سماجی حالات کی اضافت سے دیکھتے ہیں۔ گو وہ سماج کو ایک ارتقا پذیر چیز سمجھتے تھے لیکن سماج میں ایسی تبدیلیوں کے مخالف تھے جو بالکل اپنے قدیم رشتوں کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہیں۔ اس لیے وہ فرد کی کسی ایسی حرکت کو اچھا نہیں سمجھتے جو اسے اپنے سماج سے علیحدہ کر دے۔ ابن الوقت اپنے سماج کو بہتر بنانے کی دھن میں اپنے سماج سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ انگریزوں کی اندھی تقلید میں اپنی اور اپنے سماج کی نجات دیکھ رہا تھا نذیر احمد نے اپنے اس ناول میں اسی بات کو پیش کیا ہے کہ سماجی زندگی کے اہم اور قدیم رشتوں کو توڑ کر ترقی کی دھن میں اندھا دھند چلنے کے کتنے زبون نتائج ہو سکتے ہیں۔

ابن الوقت کو نذیر احمد نے اس وقت لکھا تھا جب کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے جیسا کہ "حیات النذیر" کے مولف افتخار عالم نے لکھا ہے:

"غرض پنشن لینے کے بعد مولانا نے سب سے اول ۱۸۸۸ء میں یہ کتاب تصنیف فرمائی۔"

وظیفہ ملتے ہی نذیر احمد کا بڑھتے ہوئے مغربی تمدن کے خلاف آواز اٹھانا ظاہر کرتا ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ سماجی زندگی اور سماجی تبدیلی پر کتنی گہری پڑتی تھی۔ انھیں اپنی ملازمت کے دوران لازمی طور پر بے شمار انگریزوں، ہندوستانی عہدیداروں سے سابقہ پڑ چکا تھا، اور ان کی باریک بیں نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ طبقہ بری طرح مغرب زدہ ہو گیا ہے اور اپنی زندہ، پائندہ اور جاندار روایات اور طریقۂ زندگی کو چھوڑ کر مغربی تمدن و تہذیب کے سیلاب میں اپنے آپ کو بہا دینے میں اپنی نجات سمجھ رہا تھا ——— نذیر احمد نے مغربی تمدن کی اندھی تقلید کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ وہ مغرب کی اچھی چیزوں کی یا ان چیزوں کی جن کے بغیر

اس زمانے میں زندگی گزارنا مشکل تھا مخالفت نہیں کرتے بلکہ ان کی تائید کرتے ہیں اور ان کی ترویج اور تشہیر کرکے حتی المقدور اسے مقبول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی حکومت نے تعلیم کی اشاعت کی کوشش کی۔ نذیر احمد نے کبھی بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور عورتوں کی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرکے انفرادی طور پر خود اس اہم ذمہ داری کو پورا کیا۔ "مراۃ العروس" اسی ذمہ داری کو پورا کرنے کی ایک مستحسن کوشش ہے جس میں انھوں نے یہ بھی بڑے موثر انداز سے دکھایا ہے کہ انگریزی تعلیم کا حاصل کرنا کس قدر ناگزیر ہے۔ اسی طرح انھوں نے مغربی تہذیب کے ساتھ جو سائنس کی برکت آئی تھی اس کا نہ صرف خیر مقدم کیا بلکہ سائنس کی ابتدائی معلومات کو "بنات النعش" لکھ کر عورتوں کے ذہن نشین کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ نذیر احمد کی اس کوشش کے بارے میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

" مختلف وجوہ سے نذیر احمد نے عورتوں کو زیادہ کمزور پایا اور مناسب سمجھا کہ ان کو پہلے مضبوط بنایا جائے۔ اسی لیے ان کے ناول مراۃ العروس اور بنات النعش وجود میں آئے۔ جن میں علاوہ اور باتوں کے ذہن کی بالیدگی کے لیے سائنس کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ مثلاً بنات النعش میں زمین، وزن مخصوص، ہوا کا دباؤ، کشش اتصال، مقناطیس، زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے اور اس قسم کے بہت سے مسائل کو اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ شعور میں عقلی عنصر غالب ہو جائے۔ زندگی کے رشتے منطقی طور پر سمجھ میں آجائیں۔ مفروضات سے ہٹ کر عورتیں حقیقت کی روشنی میں چلنے پھرنے لگیں اور نئی نسل عقل کی توانائی کے ساتھ آگے بڑھے۔"[۱]

اس بیان سے بھی صاف ظاہر ہے کہ نذیر احمد مغرب کی ان چیزوں کو جو "عقل کی توانائی" اور زندگی کے رشتے کو منطقی طور پر سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو اختیار کر لینے میں ملک و قوم کی ترقی دیکھتے ہیں۔ اس لیے علی عباس حسینی کا ابن الوقت کے متعلق یہ خیال کہ:-

" اب رہا ابن الوقت تو وہ غالباً سرسید کے مذہبی خیالات کی رو ہے۔ اس لیے وہی مسلمانوں کے ریفارمر تھے انھیں کو لوگ نیچری، لامذہب، کرسٹان، اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے اور انھیں کو اس طرح کے واقعات پیش آئے تھے جو ابن الوقت کے سوانح کے سلسلے میں بیان کیے گئے ہیں۔"[۲]

لیکن حسینی صاحب کا یہ اندیشہ صحیح نہیں ہے کہ نذیر احمد کا مقصد ابن الوقت کی تصنیف سے سرسید کی مخالفت کرنا یا ان کا خاکہ اڑانا تھا۔ نذیر احمد تو صرف اس اندھی تقلید اور مغرب زدگی کی مخالفت کر رہے تھے جو بغیر سوچے سمجھے مغربی تہذیب و تمدن میں اپنے آپ کو رنگ دینا چاہتی تھی۔ نذیر احمد دیکھ رہے تھے کہ مغرب زدگی کا یہ سیلاب اپنی رو میں مشرقی تہذیب، مشرقی تمدن اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہبی اقدار کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ انگریزی وضع کے ساتھ مذہبی احکام کی بجاآوری ممکن نہیں ہے۔ اس لیے وہ ابن الوقت کے اوقات میں انگریزی وضع اختیار کرنے کے بعد جو تبدیلیاں ہوتی ہیں اس کو...... بیان کرتے ہوے لکھتے ہیں:-

" الغرض انگریزی سوسائٹی میں داخل ہونے کے خبط نے اس کو ایسا بے چین کر رکھا تھا کہ دن رات میں دو چار منٹ کے لیے بھی شاید اس کو خوشی ہوتی ہو تو ہوتی ہو ورنہ جب دیکھو متفکر، جب سنو آزردہ، ذرا سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ جو شخص دنیا میں اس قدر منہمک ہو اس کو دین داری سے کیا سروکار، سچی دین داری کی بڑی شناخت ہے زہد۔ جتنا جس سے ہو سکے اور کجا زہد اور کجا یہ ولا۔"[۳]

۱۔ اردو ناول کی تاریخ اور تنقید ص۱۸۶ ۲۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید ص۱۷۶ ۳۔ ابن الوقت

ابن الوقت میں نذیر احمد نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ مغربی تمدن کی پیروی میں غلو کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان مذہب سے بیگانہ ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ مغربی تمدن کی تقلید سے صرف دین ہی ہاتھ سے نہیں جاتا بلکہ دنیا بھی خراب ہوتی ہے۔ کیوں کہ مغربی طرز کی زندگی بڑی مہنگی ہوتی ہے۔ ہندوستانیوں کے لیے اس مہنگی زندگی کے اخراجات برداشت کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ مقروض ہو جاتے ہیں۔ ابن الوقت بھی ایسی زندگی گزارنے کی کوشش میں مقروض ہو جاتا ہے۔ نذیر احمد نے اس ناول میں یہ بھی بتایا ہے کہ انسان جب غیر فطری زندگی گزارنے لگتا ہے تو پھر زندگی اس کے لیے مصیبت بن جاتی ہے کیوں کہ وہ اپنے سماج سے کٹ جاتا ہے۔ ابن الوقت ایسی زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا وہ فطرتاً عادی نہ تھا۔ ہندوستانی یا مشرقی طرز کی زندگی گزارنا اس کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا لیکن ابن الوقت خواہ مخواہ ایک نئی طرز زندگی کو اپنے پر لاد رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ابن الوقت اپنے پہ یہ بوجھ غیر ضروری طور پر لاد رہا تھا اس لیے وہ اس کے تلے دب کر کراہنے لگا۔ نذیر احمد نے اس بات کو موثر طریقے پر پیش کیا ہے وہ ابن الوقت کی حالت یوں بیان کرتے ہیں:

"وہ بھائی بھتیجوں اور دوسرے رشتہ داروں کی مفارقت کے خیال سے متاذی ہوتا تھا۔ رشتہ دار تو رشتہ دار اسے ہندوستانی سوسائٹی کے چھوٹ جانے کا بھی افسوس تھا اور ہم نے تحقیق سے سنا ہے کہ اس نے بارہا اپنے رازداروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاونی میں تعریف ہے مگر میرا یہ حال ہے کہ انگریزی کھانے کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی کہ ایک دن مجھے سیری نہیں ہوئی اور میں خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے دیکھتا ہوں۔"

صرف یہی نہیں بلکہ ابن الوقت جب بیمار پڑتا ہے اس وقت بحرانی کیفیت میں بھی اس کو یہی کچھ یاد آتا ہے۔

"ابن الوقت کے خاص خدمت گار کی زبانی معتبر روایت ہے کہ ایک بار اس کو سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق لگا بکنے تو وہ ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا تھا اور کھانے، پلاؤ، زردہ، متنجن، بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کا بھرتا، دھوئی ماش کی پھریری دال، قلمی بڑے کباب، امردوں کے کچالو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چٹپٹی چیزوں کو ترس گیا تھا۔"

نذیر احمد نے ایسے ہی بعض چھوٹے چھوٹے واقعات سے ابن الوقت کی شخصیت کے انتشار کو واضح کیا ہے جس نے بالآخر اس کی زندگی کو گھن لگا دیا اور باوجود ذہانت، بردباری، گورنمنٹ میں اثر و رسوخ، دیانت داری، قابلیت و لیاقت کے وہ زندگی میں زک اٹھاتا ہے اور ناکام ہوتا ہے۔ نذیر احمد ابن الوقت کے تضاد کے طور پر حجۃ الاسلام کا کردار پیش کرتے ہیں۔ جو اپنی پرانی اور قدیم وضع کو قائم رکھتا ہے اور کسی قیمت پر بھی اپنی مذہبی اور مشرقی وضع کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ وہ بھی ڈپٹی تھے اور ڈاکٹر عبداللہ کی زبان میں "انیسویں صدی کا نمائندہ مسلمان"۔ اصل میں نذیر احمد نے ان دونوں کرداروں کے ذریعہ انیسویں صدی کے مسلمانوں کی سماجی اور نفسیاتی زندگی کے تضاد کی کیفیت کو پیش کیا ہے اور اس کو پیش کرنے میں نذیر احمد کو جس قدر کامیابی ہوئی ہے وہ ڈاکٹر عبداللہ کے اس بیان سے ظاہر ہے:

"ابن الوقت راقم کی رائے میں نذیر احمد کی کہانیوں میں بہترین ہے اور مقبولیت کے لحاظ سے صرف "مراۃ العروس" اس سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ لیکن اگر ناول سے زندگی کی پیش کشی کی توقع رکھی جا سکتی ہے تو ہر شخص یہ خیال کیے بغیر رہ نہیں سکتا کہ ابن الوقت مصنف کا

وہ واحد کتاب ہے جس میں اس زمانے کی زندگی کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔"[1]

ڈاکٹر عبداللہ "ابن الوقت" کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی ان خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اس ناول کو نذیر احمد کے ناولوں میں بہت اونچا مقام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ ابن الوقت کو توبۃ النصوح سے بھی اہم مقام دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ شبہات اور بدگمانیوں کو پیش کرتا ہے جنھوں نے اس نسل کے ذہن میں انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ یہ اس زمانے کے سیاسی و سماجی حالات کی تصویر ہے اور آخر میں یہ انگریزوں کے رجحان اور ابتدائی زمانے میں محکوم ہندوستانیوں سے جو ان کا تعلق تھا اس کو پیش کرتا ہے۔ مختلف محکموں کی تفصیل اور ان کے انتظام کی تفصیلات حقیقی ہیں اس لیے ابن الوقت کسی طرح ہندوستانی معاملات پر سر جان شور کے نوٹس اور ٹریویلین کی "گورنمنٹ آف انڈیا" اور لارڈ ڈلہوزی کی "ایڈمنسٹریشن" سے کم اہم نہیں۔"[2]

نذیر احمد نے صرف اس زمانے کی عکاسی ہی نہیں کی بلکہ اس زمانے کے ایک بہت اہم مسئلے کو پیش کر کے ہندوستانیوں میں خود آگاہی اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اگر مغربی مرعوبیت سے پیدا ہونے والے خطروں کو محسوس کر کے اسے روکنے کے لیے اس قسم کی کوششیں نہیں کی جاتیں تو ہندوستانی مغربی تہذیب کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جاتے۔ لیکن اس عہد کے بعض اہل فکر جیسے نذیر احمد، شبلی اور اکبر الٰہ آبادی نے اس کی مخالفت کر کے ہندوستانیوں کے لیے مغربی تمدن کے تعلق سے "لمحۂ فکر" پیدا کر دیا، اور اسی لمحہ میں وہ خود آگاہی پیدا ہوئی جس نے انھیں شدید ذہنی غلامی سے محفوظ رکھا اور انگریزوں سے اپنے آپ کو بے تعلق رکھنے کی ایک ایسی چنگاری ان کے دلوں میں روشن کر دی جو بہت بعد کو ہوا دینے پر "ترک موالات" کے شعلہ کی صورت میں ظاہر ہوئی اور جس نے آزادی کی راہ روشن کر دی۔

---

[1] اردو پروز اٹدر، دی انفلوئنس آف سرسید [2] اردو پروز اٹدر، دی انفلوئنس آف سرسید

ڈاکٹر خالدہ یوسف

تذکرہ گلشن گفتار

خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا یہ تذکرہ سنہ ۱۱۶۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ سنہ تصنیف کی وضاحت خود مولف کے اردو قطعہ تاریخ سے ہوتی ہے جو دیباچہ کتاب میں شامل ہے۔

لکھا ہم نے جب تذکرہ کو حمید
ہوا خوش جسے فہم اشعار ہے
تلاش اس کی تاریخ کی کر کے دل
کہا "گلشن بزم گفتار" ہے
۱۱۶۵ھ

"گلشن بزم گفتار ہے" سے اس تذکرہ کا سال تصنیف برآمد ہوتا ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ آخری مصرعہ میں لفظ "ہے" چونکہ ردیف ہے اس لئے صرف "گلشن بزم گفتار" کو مادۂ تاریخ سمجھنا چاہیئے اور اس طرح اس کا سال تالیف سنہ ۱۱۵۰ھ برآمد ہوتا ہے لیکن یہ خیال تذکرہ کو غور سے پڑھنے کے بعد صحیح نہیں قرار پاتا اس لئے کہ خود تذکرہ میں عبدالرحیم کے ذکر میں صاف عبارت میں سنہ ۱۱۶۰ھ لکھا ہے۔ حمید کے الفاظ یہ ہیں ؎

"در سنہ یک ہزار و یکصد و شصت ہجری از دہلی انتقال نمود"

مولف نے تذکرے کے دیباچے میں تعریف تالیف کے ذیلی عنوان کے تحت شعر و سخن کی تعریف کرنے کے بعد اس کی وجہ تحریک کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ ان کو بچپن ہی سے شعر کا چسکا تھا اور وہ اس صنف ادب کے شیدائی تھے جب کبھی مکروہات دنیا سے تھوڑی سی فرصت مل جاتی تو شعرائے سلف کے کلام سے محظوظ ہوتے اور اکثر بیشتر اپنے دل و دماغ کو شاعرانہ ماحول میں رکھتے تھے، بالآخر اسی ذوق سخن نے ان کو تذکرہ نویسی پر ابھارا۔

اسی تذکرہ کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے جو مطلّا اور اچھی حالت میں ہے اور اس کو پروفیسر سید محمد صاحب نے مطبع مکتبہ ابراہیمیہ سے سنہ ۱۹۲۹ء میں مرتب کر کے شائع کیا ہے لیکن اب یہ تذکرہ عموماً کمیاب ہے۔ اس تذکرہ کی ترتیب کے وقت شمالی ہند میں بھی تذکرہ نویسی کا آغاز ہو چکا تھا چنانچہ اسی سال سنہ ۱۱۶۵ھ میں میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعرا" بایۂ اختتام کو پہنچا لیکن اس تذکرے میں زیادہ تر شمال کے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ میر نے دکن کے چند سربرآوردہ شعرا کا اجمالاً ذکر کیا ہے لیکن کوئی خاص مواد فراہم نہیں کیا ہے اس سلسلہ میں ان کی اطلاعات کا ماخذ عزلت کی بیاض اور چند سنی سنائی اطلاعات ہیں۔

خصوصیات تذکرہ تذکرہ "گلشن گفتار" کی حسب ذیل خصوصیات ہیں (۱) یہ اورنگ آباد ہی نہیں بلکہ دکن کے ریختہ گو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ ہے جس کے بارے میں مولف تذکرہ نے لکھا ہے "خواستم کہ تذکرۃ الشعرا نویسم لیکن چوں عبارت آرایان معنی طراز اکثر تذکرۃ الشعرائے فارسیہ بحیطۂ تحریر در آوردہ اند، تالیف آں تحصیل حاصل می انجامد بنا بر ایں تذکرۃ الشعرائے ہندیہ ترتیب دادم و نامش "گلشن گفتار" نہادم" اس زمانہ کے ماحول اور رواج کے مطابق فارسی میں شعرا کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں لیکن خاص التزام کے ساتھ ان کا صرف اردو کلام ہی پیش ہوا ہے۔ اسی شہر میں اسی سال قاقشال افضل بیگ خاں نے بھی تذکرہ "تحفۃ الشعراء" تالیف کیا لیکن یہ فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ جسے ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب اور ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔

(۲) تذکرہ گلشن گفتار کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ چھوٹی سائز کے جملہ (۶۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تیس (۳۰) شعرا کے حالات اور انتخاب کلام پیش کیا گیا ہے جن میں سے سات کا مقام سکونت اورنگ آباد ہے جن کے نام یہ ہیں (۱) ولی (۲) داؤد (۳) عزلت (۴) زانی (۵) ابدال (۶) فضلی۔ باقی تیئیس (۲۳) ہند کے مختلف مقامات مثلاً دہلی، گجرات اور برہان پور کے باشندے ہیں جن میں برار کے شاعر رسا، ابوالحسن اور وفا، آقا محمد امین کے علاوہ کشمیر کا ایک سخن گو عبدالرحیم بھی شامل ہے۔ مولف نے ابتداء میں تین صفحہ کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔

(۳) زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے بھی یہ تذکرہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کی ترتیب کا زمانہ دکن خصوصاً اورنگ آباد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا درخشاں عہد ہے جبکہ ولی کے انتقال کے بعد سراج، داؤد، عاجز اور عزلت جیسے بلند مرتبت اساتذۂ سخن کا دور دورہ تھا اور یہ اس وقت اپنے کمال کی انتہا تک پہنچ چکے تھے، سیاسی لحاظ سے بھی یہ زمانہ علم و ادب کی نشو و نما اور ارتقاء کے لئے بہت سازگار تھا۔ راجہ سے لے کر پرجا تک سخن گو نہ سہی سخن فہم ضرور تھے، ذوق شعر و ادب اس زمانہ کی تہذیب میں داخل تھا۔ حمید تذکرہ بالا سخن گو حضرات سے شخصی طور پر متعارف تھے۔ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کے کلام کو اپنے کانوں سے سنا تھا اس لئے ایک حد تک ان کی دی ہوئی اطلاعات کو صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔

(۴) اس تذکرہ میں شعرا کے حالات سے زیادہ عموماً کلام کو اہمیت دی گئی ہے۔ اکثر شعرا کی ایک یا دو غزلیں تمام و کمال پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے تذکروں کی طرح صرف متفرق اشعار نہیں لیے گئے ہیں بعض شاعروں کے ذکر میں ان کی مثنویاں وغیرہ مسلسل کلام ملتا ہے۔ دوسرے تذکروں میں مسلسل کلام کا شاذ ہی انتخاب کیا گیا ہے۔ حاتم محمد حاتم کے ذکر میں حقہ پر ان کی پوری مثنوی نقل کی گئی ہے۔ حشمت، میر محتشم علیخاں کے مخمسات، آبرو، عاجز اور عزلت کی کئی کئی غزلیں پیش کی گئی ہیں۔

(۵) تذکرہ کا اسلوب بیان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ تکلفات اور صنائع بدائع استعمال نہیں کئے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ مطالب ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انداز بیان ملاحظہ ہو۔

آبرو، میر مبارک باشندۂ شاہجہان آباد کے بارے میں۔

"بیگل و صاحب دیوان است، اشعارش در تمام ممالک محروسہ مشہور و معروف خصوص در دارالخلافہ شاہجہان آباد مستثنی وقت است۔" (گلشن گفتار ص/۲۹)

ان کی طرز تحریر کا ایک نمونہ یہ ہے "شاہ فضل اللہ درویش متوکل صاحب کمال در بلدہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد اقامت داشت شعر ذو معنی اکثر می گفت" ص۱

اس تذکرہ کی خوبیوں کے ساتھ چند خامیاں بھی کھٹکتی ہیں۔

خامیاں

(۱) شعراء نہ تو صرف حروف تہجی کے لحاظ سے بیان کئے گئے ہیں اور نہ زمانے کا لحاظ کرتے ہوئے بلکہ مولف نے اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دیا ہے

(۲) سراج اورنگ آبادی کا ذکر ہی نہیں کیا ہے حالانکہ وہ اس وقت بقید حیات، نمایاں اور چوٹی کے شاعر تھے۔

(۳) شمالی ہند کے شعراء مثلاً سودا، تاباںؔ کے حالات زیادہ سے زیادہ نہیں لکھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی اطلاعات کی عدم موجودگی میں حمید نے اختصار سے کام لیا ہو، لیکن خود اس کے ہم وطن شعراء پر جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کوئی سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا ہے۔

(۴) کسی شاعر کے بھی سنین ولادت اور وفات نہیں لکھے۔

تذکرہ نویس خواجہ خاں حمید کے حالات

ان کے جد اعلیٰ کا نام منصور حاجی تھا جو بدخشاں کے امرائے سلطنت سے تھے، نذر محمد خاں والیٔ بلخ نے انہیں شاہجہاں کے دربار میں سفیر بنا کر ہندوستان روانہ کیا تھا جہاں وہ انعام و اکرام سے سرفراز ہو کر وطن واپس ہوئے۔ اسی عہد میں شہزادہ مراد بخش نے بدخشاں پر حملہ کیا، والیٔ بلخ مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ گیا، اس وقت منصور حاجی قلعہ ترمذ پر متعین تھے موقع کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے تینوں لڑکوں کو بادشاہ کی خدمت میں دہلی روانہ کیا جس نے منصور حاجی کو بلخ کا صدر الصدور مقرر کیا اور ساتھ ہی ان کے تینوں فرزندوں کو بھی مناصب و انعامات سے ممتاز کیا۔ ان کے بڑے لڑکے محمد محسن کو "خان" کا خطاب دے کر بنگالہ کا گورنر مقرر کیا اور دوسرے لڑکے عبد اللہ بیگ کو "مخلص خاں" کا خطاب عطا ہوا جو حمید کے دادا ہوتے ہیں۔ شاہجہاں بادشاہ کی رحلت کے بعد اورنگ زیب نے ان کو اپنے ہمراہ رکھا بادشاہ کے یہ بڑے جان نثار ملازم ثابت ہوئے۔ دوران ملازمت میں مختلف جنگوں میں شجاعت و مردانگی کے صلہ میں اورنگ زیب کی جانب سے انہیں خطاب "یکہ تاز خاں" ملا۔

حمید کے والد کی پیدائش دکن میں ہوئی۔ انہیں یکے بعد دیگرے دو خطاب عطا ہوئے۔

(۱) ترکتاز خاں (۲) قوی جنگ۔ وہ اپنے نام سے زیادہ خطاب "ترکتاز خاں" ہی سے مشہور ہوئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمگیر بادشاہ نے انہیں اسلاف کے کارناموں کی بنا پر کمسنی ہی میں اس خطاب سے نوازا تھا جس کے باعث نام سے کوئی واقف نہ ہوا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد جب ترکتاز خاں دکن کے منصبداروں میں ملازم ہوئے تو آصف جاہ اوّل نے ان کی بڑی عزت و توقیر کی اور "قوی جنگ" کا خطاب عطا کیا۔ ان کا انتقال ۱۱۴۹ھ میں ہوا۔ ان کے تین لڑکے تھے (۱) خواجہ محمد (۲) خواجہ حمید خاں حمید (۳) خواجہ شریف خاں۔ ان میں سے بڑے کو آصفجاہ

ص۱ حمید، گلشن گفتار ص۵۵

اول کے عہد میں "خان" اور ناصر جنگ کے دور میں ان کے والد کا خطاب "ترکتاز خاں" ملا۔ ایک مدت تک یہ احمد نگر کے قلعہ دار رہے۔ بانیٔ دولت آصفیہ کو ان بزرگوں کے وفادارانہ کارناموں کے صلہ میں جو جاگیریں اور مناصب عطا ہوئے تھے وہ وراثتاً انھیں منتقل ہوئے جو ان کی قوت لایموت کا ذریعہ تھے۔[۱] ذیل میں حمید کا شجرۂ خاندانی درج کیا جاتا ہے تاکہ آسانی سے ان کے آباو اجداد کے نام اور ان کے خطابات واضح ہو سکیں۔

منصور حاجی بلخی

- محمد محسن — مخاطب بخطاب "خان"
- محمد منصور
- عبداللہ بیگ — مخاطب بخطاب یکہ "تاز خاں" "مخلص خان"
  - ترکتاز خاں قوی جنگ
    - خواجہ شریف
      - خواجہ محمد مخاطب بخطاب "خاں" و "ترکتاز خاں"
      - حمید - خواجہ حمید خاں
      - خواجہ شریف خاں

حمید نے ۱۱۶۵ھ میں تذکرہ "گلشن گفتار" لکھا اس وقت ان کی عمر پچیس[۲۵] یا چھبیس[۲۶] سال فرض کی جائے تو تاریخ ولادت کم و بیش ۱۱۴۰ھ کے قریب طے پاتی ہے زمانہ کے رواج کے مطابق انہوں نے اردو و فارسی میں بقدر ضرورت استعداد حاصل کی، شعر و ادب کے ساتھ انہیں فن موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔[۲] سوائے فتوحات کے اورنگ آباد کے کسی اور تذکرہ نویس نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

حمید کا ذوق شاعری

حمید اردو زبان میں شاعرانہ صلاحیت رکھتے تھے چنانچہ اپنے کلام کی اصلاح عارف الدین خاں عاجزؔ سے لی ہے[۳] اور ان کے اردو و فارسی دواوین کو انہوں نے ہی مرتب کیا ہے[۴] گلشن گفتار کا قطعہ تاریخ حمید نے اردو میں

---

[۱] شاہ نواز خاں صمصام الدولہ، مآثر الامرا جلد دوم ص۸۰۳ [۲] فتوحات، ریاض حسنی ص۹۴ [۳] (الف) حمید، گلشن گفتار ص۵۹ (ب) فتوحات، ریاض حسنی ص۹۴ [۴] حمید، گلشن گفتار ص۵۹

میں لکھا ہے جس کو اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوران تذکرہ میں انہوں نے اپنا یہ شعر از "ریختۂ احقر خواجہ خاں" کہہ کر لکھا ہے ؎

زلف خم ہو کے لٹک جان کے سب کان میں رات
مو بمو کھول کہے حال پریشاں میرا !!

فتوتؔ مولف تذکرہ ریاض حسنی نے حمید کا یہ شعر منتخب کیا ہے

مجھ کو دیتا ہے نگاہوں میں وہ بالا بالا
جس کی پلکوں نے ہر یک مو سے سنبھالا بھالا !ص۱

حمید کا انتقال عنفوان شباب میں ہوا، اس سلسلہ میں فتوت نے لکھا ہے" کار زندگی در عین عنفوان شباب از دادہ حیات گسیختہ" چونکہ فتوت کا تذکرہ ریاض حسنی ۱۱۶۸ھ میں لکھا گیا اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت حمید کی رحلت ہو چکی تھی چونکہ خود حمید نے ۱۱۶۵ھ میں اپنا مذکورہ تذکرہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا اس لئے سمجھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ۱۱۶۵ھ کے بعد اور ۱۱۶۸ھ سے قبل انتقال کیا۔

ص۱ فتوت: ریاض حسنی ص۹۴

امین چند شرما

پنڈت چندر بھان برہمن

پنڈت چندر بھان کے آبا و اجداد برہمن کشمیری تھے۔ برہمن کے والد دھرم داس۔ لاہور کے باشندے اور اکبر کے ملازم تھے۔ مارہروی کی رائے کے مطابق چندر بھان ۹۸۲ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔

چندر بھان کے مولد و منشا کے بارے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ نے ان کو اکبرآبادی لکھا ہے۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ چندر بھان لاہور کے باشندہ تھے۔

ابتدائی تعلیم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے حاصل کی۔ اس زمانہ کے حالات باوجود تلاش کے نہ مل سکے۔ چندر بھان پہلے امیر عبدالکریم (امیر عمارت لاہور) کے یہاں ملازم تھے۔ بعد میں افضل خاں کے ملازم ہوئے۔ افضل خاں کی وفات (۱۰۴۸ھ) کے بعد شاہی ملازمت میں منشی گری کی خدمت پر مامور ہوئے۔ داراشکوہ کو برہمن کی تحریر بہت پسند تھی۔ داراشکوہ کی زندگی تک وہ دارا کے منشی رہے اور اس کے ایما پر سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ بعد میں شاہ جہاں نے ان کو دارا سے واپس لے لیا۔ رائے رایاں کا خطاب اور منصب و جاگیر عطا کی۔

جب شاہ جہاں کابل گئے تو برہمن بھی ان کے ساتھ تھے۔ سرہند اور کشمیر کے سفر میں بھی برہمن کو بادشاہ کی ہم رکابی کا شرف حاصل رہا۔ شاہ جہاں کی قید اور داراشکوہ کے قتل کے بعد وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر عزلت گزیں ہو گئے۔ ۱۰۷۳ھ تاریخ وفات ہے۔ برہمن کی حسب ذیل تصانیف کا ہم کو علم ہے۔

۱۔ چہار چمن (۲) گلدستہ (۳) تحفۃ الانوار (۴) نگارنامہ (۵) تحفۃ الفصحاء (۶) مجموعۃ الفقراء (۷) منشآت (۸) دیوان۔

منشآت برہمن:۔ برہمن کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو اس نے دربار شاہ جہاں کے امراء۔ ہمسر عہدیداروں اور اپنے رشتہ داروں کے نام لکھے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے یہ خطوط زیادہ وقیع نہیں مگر فن انشاء کے لحاظ سے یہ مجموعہ قابل قدر ہے

دیوان:۔ ہندوؤں میں برہمن سب سے پہلا شاعر ہے جس نے اپنا دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ اس کے کلام کے انتخابات مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔ پنجاب پبلک لائبریری میں اس کے دیوان کا مکمل نسخہ ہے۔ اس میں غزلیات اور رباعیات ہیں۔

بھگونت رائے بہار (رشنائی) نے کلیات برہمن شائع کیا ہے۔ اس نسخہ کی مطبوعہ غزلیات میں سے چند اشعار تبصرہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

دنیا اور ترک دنیا:۔ دنیا فانی ہے۔ شوم سرا ہے۔ اس کی دلچسپیاں دل فریب اور سخت گیر ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ

ان میں پھنسنے کے بعد رہائی ناممکن ہے۔ دنیا بازیچۂ اطفال۔ عبرت کی جاہ ہے۔ تماشہ نہیں ہے۔
برہمن کی نظر میں دنیا کیا ہے؟

دنیا چہ بود کہنہ سرائے و خرابے　　خوابے و خیالے و حجابے و سرابے

دوسری جگہ کہا ہے کہ دنیا اہلِ نظر کی آنکھوں میں سراب ہے۔

دنیا بچشم اہلِ نظر جز سراب نیست　　آبادئ زمانہ بغیر از خراب نیست

نقشِ دنیا خواب ہے۔

نقشِ دنیا در نظر سر بسر خواب است لیک　　کے بناداں می نماید انچہ بر دانا نمود

دوسری جگہ کہا ہے۔ کہ

جہاں بچشم حقیقت بخواب می ماند　　بخواب رفت بسر تا کہ در خیال رسد

مگر اس کی دل فریبیوں میں مردِ ناداں پھنس ہی جاتا ہے۔

بغفلت مردِ ناداں در فریب است　　بدنیا دل نہ بندد مردِ ہشیار

اس خواب و خیال کی دنیا میں مصائب ہی مصائب ہیں۔ لہٰذا اس سے کنارہ کشی میں سکون ہے۔

آفات بروزگار بسیار　　وقت است کہ بہ کنارہ سازم

اس دنیا میں رہتے ہوئے اس سے کنارہ کشی کس طرح ممکن ہے۔ برہمن سے سنئے۔

درجہاں باش ولیکن زجہاں فارغ باش　　ہر کہ فارغ زجہان است جہانے با اوست

ترکِ علائق سے انسان آزاد ہوجاتا ہے۔ پھر اسے دنیا کی کیا ضرورت۔

مارا بکارہائے جہاں احتیاج نیست　　آزاد را بسود و زیان احتیاج نیست

اس مکر و فریب کی دنیا میں وفا نہیں ہے۔ وفا کا جز اس کتاب سے غائب ہے۔

تہی است نسخۂ عالم زحرف مہر و وفا　　زمانہ جزو محبت ازین کتاب کشید

ابنائے عالم میں وفا نہ ہونے کی شکایت برہمن نہیں کرتا۔ اس کا مقصد اظہارِ حقیقت ہے۔
اگرچہ دنیا رسم و رہِ الفت سے بیگانہ ہے۔ مگر اس کی طبیعت مہر و وفا سے باز نہیں آتی۔ کہتا ہے

اگر زمانہ دگرگوں شود زجانہ روم　　برہمن از رہ و رسم روزگار آگاہم

عزلت گزینی:۔ انسان دنیا کے آلام و مصائب سے کنجِ عزلت میں محفوظ رہ سکتا ہے۔

ع　ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را

اور انسان کی عزلت گزینی اس کی شہرت کا باعث بن جاتی ہے۔
غنی کاشمیری نے کیا خوب کہا ہے۔

اگر ترا ہوس داری اسیرِ دامِ عزلت شو　　کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نامِ عنقا را

جب انسان ایک گوشہ اختیار کرلیتا ہے۔ تو اسے زمانہ کی گردش سے سکون نصیب ہوجاتا ہے۔

ترا ز گردشِ گردوں ہرزہ گرد چہ باک　　اگر بکشور دل آرمیدہ بنشینی

گرد... جہاں گوشہ نشینوں کے دامن تک نہیں پہنچ سکتی۔

بگرد دامن شان گرد امتحاں نہ رسد — کہ صیت گوشہ نشینان گزشت از افلاک

قناعت و استغناء :- جن اخلاق کی وجہ سے انسان اس دنیا میں بہت بلند ہوجاتا ہے اور اس کے دل کا اضطراب سکون میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ان میں سے ایک قناعت ہے۔

برہمن نے قناعت کو کیمیا کہا ہے۔

کیمیائے ست قناعت کہ چو آید بہ عمل — آنچہ زین خاک توان یافت زر زنتوان یافت

قناعت سے دنیا کے کام آسان ہوجاتے ہیں۔

ز اسباب قناعت کار را برخویش آسان کن — کہ چون مشکل شود آسان ارباب یقین باشد

آرزوں کی کثرت سے دل کا مقصد حل نہیں ہوتا۔

براہ آرزو کام دلم ہرگز نہ شد حاصل — ز اسباب قناعت فکر آسانے دگر باید

انسان کو جو کچھ ملے اسی پر قناعت کرکے راضی بہ رضا رہنا چاہیئے جس کو یہ استغناء حاصل ہے وہ خوش ہے۔

برہمن از غرض خویش دارد استغناء — خوش آن کسے کہ برون آمد از غم اغراض

تنک بخشی سے دل کو رنجیدہ نہیں کرنا چاہیئے۔

زکم مرنج برہمن کہ در طریق رضا — نخست چشم دل از برگ و ساز می پوشند

صاحب استغناء اور حریص کی زندگی کیسے گزرتی ہے؟

مرد عارف خوش بہ آزادی و استغنا گزشت — زاہد از زیر بار خرقہ پشمینہ ماند

ترک مدعا :- انسان آرزؤں اور تمناؤں کا ایک ہجوم ہے یا محشر ہے۔ ایک تمنا کے بعد دوسری تمنا اس کے دل میں پرورش پاتی رہتی ہے اور بقول غالب ع ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

تمام آرزوں کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ آرزوں کی تکمیل اور عدم تکمیل دونوں رنجدہ ثابت ہوتی ہیں۔ آرزوں کی کثرت تو یقینی آلام و آفات کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

لہٰذا ترک مدعا میں آرام و سکون ہے۔ عقلمندوں کا ایک ہی مدعا ہوتا ہے۔ ترک مدعا۔

اہل دانش بر سر یک مدعا پیچیدہ اند — ہر کہ داناتر بود از مدعا خواہد گزشت

جب مدعا حاصل نہیں ہوتا تو ترک مدعا اولیٰ ہے۔

بہ مدعا نرسد ہر کہ مدعا طلب است — چہ مدعاست بہ از ترک مدعا کردن

غالب کے اس شعر کا مفہوم ۔

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دل بے مدعا دیا تو نے

برہمن کے یہاں دیکھیئے۔

دل حاصل مدعائے ما یافت — صد چیز بہ ترک مدعا یافت

ترک مدعا سے تمام مشکلات آسان ہوگئیں :-

کار مشکل می شود در آرزوئے مدعا　　ما بہ ترکِ مدعا بر خویش آسانی کنیم

مسئلہ تقدیر و تدبیر:۔ تقدیر و تدبیر کے مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اس گتھی کو سلجھانے میں بڑی بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ اس کی تکرار لاحاصل اور ہمارے موضوعِ بحث سے خارج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ برہمن کے یہاں یہ مسئلہ کس طرح حل ہوتا ہے برہمن نے تدبیر کرنے اور تقدیر پر شاکر رہنے کی تعلیم دی ہے۔ تمام کام پردۂ تقدیر میں ہیں ——

چو باشد کارہا در پردۂ تقدیر چون دانا　　پے آرایش دو کانچہ تدبیری گردد

حاصلِ تدبیر کے بارے میں برہمن کہتا ہے ۔

برہمن حاصلِ تدبیر تو باشد معلوم　　کرم اوست کہ تدبیر خطا آرد راست

خاموشی:۔ خاموشی و صد بلا دور۔ خموشی بہترین صفت ہے۔ دانا آدمی کا کام ہے اور ہزاروں صدمات سے محفوظ رکھتی ہے۔ عرب کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی زبان فصیح ہے۔ برہمن کہتا ہے خموشی افصح ہے۔

زہر چہ ہست زبانِ عرب فصیح تر است　　جز آن خموشی کہ افصح از عرب است

خموشی بہت بہتر ہے۔

باصد زبان، زبانِ خموشی نکو بود　　با پیچ و تابِ زلفِ تو چون شانہ ساختیم

شور و غوغا سے فائدہ نہیں ہوتا۔

بہ گلشنے کہ چو سوسن خموش باید بود　　ز عندلیب دعائی پُر از نوا کجاست

خموشی سے مرحلے طے ہوسکتے ہیں :۔

برہمن مرحلۂ ما بخموشی طے شد　　این ہمہ شور چیست کہ در قافلہ انداختہ اند

صفائی باطن:۔ صفائی باطن سے روح پاکیزہ و مجلّیٰ ہوتی ہے۔ برہمن کو تو صفائی باطن پر زور دینا چاہیئے۔

برہمن بے صفائے دل نگردد کامِ دل حاصل　　دعا کز صدقِ باطن نیست بے تاثیر می گردد

حسن عمل کے لیے دل کی صفائی اور یقین کی ضرورت ہے۔

حسن عمل از سینۂ دلی بانتوان یافتن　　باید دلِ صافی و صفائے و یقینے

برہمن نے ایک جگہ سینہ کو کینہ سے پاک رکھنے کی تعلیم دی ہے۔

در تنگنائے سینہ مده کینہ را　　از نقش کینہ پاک نگہدار سینہ را

سینۂ بے کینہ چون آئینہ دارم پُر زمہر　　گر رسد در دے خیال کینہ می آید بہ تنگ

حُسنِ عمل:۔ دنیا میں نیک کام کرنا چاہیئے۔ حسن عمل عاقبت کے سفر کے لیے زادِ راہ ہے۔

چو بستہ دل آزادہ را بہ کینہ باطل　　ز زادِ حسنِ عمل می رسد براہ صراط

ہر شخص کو حُسنِ عمل پر ناز ہوتا ہے کہ اس کے نیک اعمال حشر کے دن اس کی بخشش کا موجب ٹھہریں گے۔ برہمن کو تردامنی پر ناز ہے

ہر کس زند بہ حُسنِ عمل دست و برہمن　　در روزِ حشر دست بدامانِ تر زند

عمل کے بغیر علم بے کار خیال کیا جاتا ہے۔ مگر برہمن کی ندرت دیکھیئے کہ روزِ حشر جہاں وہ تردامنی سے حسن عمل کے پہلو کو ناہے۔ وہاں "علم بے عمل" سے بھی عجیب کام لیتا ہے۔

بروزِ حشر گر از برہمن سوال کنند زِ علم بے عملِ خویشتن جواب دہد

دل آزاری :۔ مردم آزاری دنیا میں بدترین گناہوں میں سے ہے۔ نظیری نے کہا ہے کہ :

ع مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کن

فردوسی نے کہا ہے کہ

میازار مورے کہ دانہ کش است کہ جان دارد و جانِ شیریں خوش است

اس نکتہ کو برہمن نے نہایت سادگی سے بیان کیا ہے۔

بہ آزار سرمورے منہ پائے کہ رایک سرموئے میازار

کارِ امروز :۔ فارسی کی مشہور مثل ہے۔ کارِ امروز بفردا مگذار۔ ہر آنے والی کل اپنے ساتھ کام کا نیا بوجھ لاتی ہے۔ اگر ایک دن کا کام ٹال دیا جائے تو بار گراں ہو جاتا ہے۔

کارِ امروز بہ فردا مفگن جام بیاد نتوان خورد غم وعدۂ فردا امروز

حال پر نظر رکھنی چاہیئے۔

نظر امروز باید داشتن بر حاصل فردا غم امروز تخم مزرع فردا سے ما باشد

شب بیداری :۔ شب بیداری زندہ دلوں کا کام ہے اور حصول مراد کا ذریعہ ہے۔

برہمن زندہ دلانِ شب لسحری آرند ہیچ کس ہیچ بجز دیدۂ بیدار نیافت

صبح کی سعادت اس کو نصیب ہوتی ہے جو شب بیداری کرتا ہے۔

فروغ صبح سعادت بود نصیب کسے کہ تار چشم بشب ہائے تار می بندد

شب گیرئے دراز تواں کرد برہمن شاید توان رسید بہ کاروان صبح

زود خیزی :۔ بیداری صبح کی بھی برہمن نے تعلیم دی ہے۔ "صبح" کی قیمت اس کی نظر میں دیکھئے۔

ما صبح راز کف بدو عالم نمی دہیم باشد جہانِ فیض دگر در جہانِ صبح

اس جہانِ فیض سے مستفید ہونے کے لیے شام ہی اس کا انتظار ہے۔

بیداری ادست زند زر کہ صبح ما دامنِ صبحے ز سر شام گرفتیم

طلوع سحر سے قبل ہی زندگی کے کاروبار شروع کر دینا بہتر ہے۔

زان پیشتر کہ صبح برآید روانہ شو اے خواجہ اعتماد صدائے جرس مکن

کلامِ برہمن :۔ برہمن کے اشعار میں اس کی طرز اور سخن گوئی کے اشارات ملتے ہیں۔ کچھ اشعار میں اپنی آپ تعریف کی ہے، اور کچھ میں انکساری سے خود کو نو آموز کہا ہے۔

شاعرانہ عجز دیکھئے :۔

ما نو رسانِ ہیچ دانیم برہمن ہر کس قلم گرفت ز ما خوب تر نوشت

بے ہنری برہمن کا ہنر ہے۔

لاف از ہنر خود بفضولے نتوان زد جز بے ہنری چیست برہمن ہنر ما

اپنی نکتہ دانی کی یوں تعریف کی ہے۔

برہمن از سخن پیداست مقدار سخن دانا　　گواہِ حالِ من کافیست طبعِ نکتہ دانِ من

دوسری جگہ نازک ادائی کا یوں ذکر ہے۔

برہمن دارد سخن نازک تراز طبع بتاں　　ایں ہمہ نازک ادائی از کجا دانستہ است

"از کجا دانستہ است" کی تشریح یوں کی ہے۔

سخن ز عالمِ بالا مگر فرود آمد　　کہ آمد ایں غزل تازہ بر زبان امروز

برہمن نے تازہ غزلیں کہی ہیں۔ اکثر غزلوں میں اشعار کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں ہے۔ ہر شعر گوہرِ آبدار کی مانند ہے۔ فارسی شعراء کے چند تذکروں "سروِ آزاد" "کلمات الشعراء" "تذکرہ حسینی" اور "مرأت الخیال" میں برہمن کی شاعری کے متعلق جو رطب و یابس لکھا ہے۔ اُسے برہمن کا ذیل کا شعر پڑھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔

برہمن لب فرو بستم و گرنہ در سخن گوئی
ادائے تازہ و طرزِ سخن از من شود پیدا

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی)

ابو محمد سید علی سریر

حیدرآباد کے چند قدیم اردو ادارے

یہاں حیدرآباد کے چند قدیم ادبی اداروں کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے جن میں کچھ باقی ہیں اور کچھ دم توڑ رہے ہیں، اور کچھ ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکے ہیں

انجمنِ ارباب اردو :

یہ انجمن (سنہ ۱۳۳۱ھ) میں قائم ہوی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان کو فروغ دینے کے ساتھ ہی ساتھ اردو ادب کے قدیم جواہر پاروں کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ اس کا دفتر حیدرآباد (محلہ سرونگر) میں قائم تھا۔

میر محبت اللہ خاں عالی رفاعی معتمد اور ابو محمد عمر یافعی شریک معتمد تھے۔

اس انجمن سے متعلق ڈاکٹر زور نے اپنی تالیف (عہد عثمانی میں اردو کی ترقی) میں لکھا ہے۔[1]

"عالی رفاعی اس کے معتمد اور ابو محمد عمر ابن صلاح یافعی صاحب شریک معتمد تھے اور اصل میں یہ دونوں ہی اس کے بانی اور روح رواں سمجھے جاتے ہیں۔ اول الذکر کے ایثار اور ذاتی توجہ کی وجہ سے یہ انجمن کئی سال تک قائم رہی ان ہی کے یہاں قدیم و جدید اہل علم و فضل جمع ہوتے اور طعام و کلام سے مستفید ہوتے تھے۔ آخر الذکر کے جوش عمل اور علمی خلوص نے انجمن کے کارکنوں میں خاص زندگی پیدا کر دی تھی اور یہ انجمن اب تک سرگرم کار رہتی تو کوئی تعجب نہیں کہ اس کے ذریعہ سے حیدرآباد کو بعض نہایت سرگرم اہل قلم حاصل ہوتے۔"

اس انجمن کا ایک آرگن ماہنامہ تحفہ (سنہ ۱۳۳۳ھ) سے شائع ہونے لگا مرحوم عالی رفاعی نے دو مختصر رسالے کتابی صورت میں شائع کیے تھے جس کو اردو دوست طبقہ نے بے حد پسند کیا۔ آداب شاعری۔ تحقیق اردو۔ یوں تو اس انجمن سے کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ روح تنقید جو ڈاکٹر زور کی تصنیف ہے اسی انجمن نے پہلی مرتبہ شائع کی تھی۔

مکتبۂ ابراہیمیہ :

امداد باہمی کے اصولوں پر (سنہ ۱۹۲۶ء) میں قائم کیا گیا۔ اس ادارہ میں چار شعبے قائم تھے۔ مجلہ مکتبہ، کتاب ڈپو، مطبع اور شعبۂ دار الاشاعت۔ اس کے کاروبار تجارت۔ اشاعت کتب۔ طباعت سے متعلق جملہ کاروبار اور اس کے معتمد مرزا مظفر بیگ مرحوم انجام دیتے رہے۔ اس ادارہ سے ایک ماہنامہ (مجلہ مکتبہ[2]) کے نام سے شائع ہوتا تھا جس کی ادارت عبدالقادر سروری لکچرار

---

[1] عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ص ۱۳۴　　[2] مجلہ مکتبہ حیدرآباد مئی (سنہ ۱۹۳۳ء) دیکھئے

شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے تفویض تھی اس ادارہ نے ملک کے نوجوانوں کی تصانیف شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

مجلس علمیہ :

(۱۹۳۹ء) جامعہ عثمانیہ کے علم دوست سپوتوں نے آپس میں ذہنی اور علمی رابطہ برقرار رکھنے اور علمی فضا کو ترقی دینے کے لیے مجلس قائم کی تھی۔ اس کے مقاصد حسب ذیل تھے۔

۱۔ طلباء قدیم اور اہل ملک سے تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرانا۔ اور ان کو منجانب مجلس شائع کرنا۔

۲۔ علمی و ادبی مباحث منعقد کرنا۔

۳۔ مجلوں کی اجرائی اور کتب خانوں کا قیام۔

اس ادارے نے کئی کتابیں شائع کیں۔

انجمن طلباء قدیم نظامیہ :

جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے فارغ التحصیل طلبا نے (۱۹۲۶ء) میں انجمن طلبا قدیم نظامیہ قائم کی جس کے مقاصد حسب ذیل تھے۔

۱۔ طلباء قدیم نظامیہ میں مرکزیت پیدا کرنا اور ان میں باہمی تعاون بڑھانا۔

۲۔ مادر علمی کی بقاء و ترقی کے لیے کوشش کرنا، اور فرزندان نظامیہ کے حقوق کی حفاظت کرنا۔

۳۔ مسلمانوں کی علمی، مذہبی، اخلاقی اور تمدنی خرابیوں کی اصلاح کرنا۔

۴۔ عربی اور اسلامی علوم و فنون کے نادر الوجود مخطوطات و مکتوبات کی اشاعت اور ان کے متعلق اردو زبان میں مفید معلومات شائع کرنا۔

(۱۳۶۱ھ) میں طلبا قدیم کی جدوجہد کے باعث ایک علمی کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی جس میں اکثر و بیشتر مفید تجاویز و قرار دادیں منظور ہوئیں۔ ان میں بعض قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے میں انجمن کامیاب رہی۔

اس ادارے سے مطلع الانوار (سوانح حیات شیخ الاسلام دکن) تاریخ دستور آصفی، ہندو مسلم اتحاد اور شعر الادب شائع ہوئی ایک مجلہ نظامیہ بھی شائع ہوتا تھا۔

انجمن اساتذۂ حیدرآباد :

(۱۸۹۲ء) کے بعد جب حیدرآباد میں ابتدائی تعلیم عام ہوئی تو تحتانی اور وسطانی مدارس کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، ان مدارس کے معلمین کو یکسانیت عمل کے پیش نظر ایسی ایک انجمن کی شدید ضرورت تھی تاکہ اپنی آواز کو عوام اور حکومت تک پہنچا سکیں اسی مقصد کے پیش نظر انجمن اساتذہ حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمن نہایت پابندی کے ساتھ ہر سال قائم منعقد کرتی اور قراردادوں کو روبہ عمل لانے میں بڑی جدوجہد کرتی تھی۔

تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ہی ساتھ ادبی سرگرمیوں کو بھی برقرار رکھنے کی غرض سے انجمن کے زیر نگرانی ابتداً ایک سہ ماہی رسالہ حیدرآباد ٹیچر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں جاری ہوا۔ اس سہ ماہی رسالے کے علاوہ ایک اور ماہنامہ المعلم بھی (۱۹۱۴ء) سے اردو زبان میں شائع ہوتا تھا جس کے اکثر و بیشتر مضامین تعلیم ہی سے متعلق ہوا کرتے تھے۔

ملک کے ہونہار طلباء کے لیے ایک ماہوار رسالہ متعلم بھی (۱۹۰۸ء) سے جاری ہوا۔ ایک اور رسالہ ادب اطفال کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اس کے علاوہ ایک اور پندرہ روزہ نونہال بھی شائع ہونے لگا۔ الغرض انجمن اساتذہ حیدرآباد نے اردو

ادب کی خدمت میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔

بزم ادب مسجد چوک :

مسجد چوک، حیدر آباد آندھرا پردیش کے عقبی حصے میں ایک وسیع ہال موجود ہے جس میں ایک کتب خانہ تھا جس کی نگرانی محکمہ امور مذہبی سے متعلق تھی اور تعلیمات سے بھی کچھ امداد مقرر تھی اسی کتب خانے کے تحت ایک شعبہ سلسلہ ناشرات کتب خانہ مسجد چوک ۔ بزم ادب غالباً (۱۳۴۵ھ) میں قائم ہوا۔ اس شعبے کے روح رواں مولوی سردار علی مرحوم اور غلام محمد معتمد کتب خانہ تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ " ملک کے مستند و باکمال شعرا کا کلام شائع کیا جائے "

چناں چہ رضی الدین حسن کیفی حیدر آبادی کی مختصر سوانح حیات، ان کے کلام کے انتخابات، نظم کیفی، کلام کیفی اور تصویر افکار کے نام سے شائع کیے۔ دو تذکرے شعرا اورنگ آباد اور تذکرہ یورپین شعرا بھی شائع کیے اس کے علاوہ پروفیسر وحید الدین سلیم کے ادبی مضامین افادات سلیم کے نام سے سب سے پہلے اسی بزم نے شائع کیے ایک ماہنامہ تجلی بھی یہاں سے پابندی کے ساتھ کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔

لٹریری اکیڈمی :

انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ نے ۱۹۳۳ء میں یہ اکیڈمی قائم کی جس کے صدر محمد عبدالرحمٰن خاں سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ اور معتمد اعزازی ڈاکٹر سید عبداللطیف تھے۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ :

۱۹۳۰ء میں قائم ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبا نے تحصیل علم سے فراغت پانے کے بعد اپنی علمی اور ادبی مصروفیات کو برقرار رکھنے کی غرض سے اس کے قیام پر زور دیا چناں چہ ہر سال ایک کانفرنس کے انعقاد کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔

اس انجمن نے رفتہ رفتہ اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کیا اور کئی ذیلی کمیٹیاں قائم کیں جس میں عثمانیہ طلبی جماعت نے ملک کی بڑی خدمت انجام دی۔ معاشی کمیٹی نے ایک ذیلی کمیٹی انعقاد نمائش مصنوعات کے لیے قائم کی جو آج بھی ملک کا ایک بہت باوقار، کارکرد اور ہمہ گیر فلاح کا حامل ادارہ ہے جس نے حال میں لڑکیوں کے لیے ایک فنی کالج گرلس پالی ٹکنک کالج کھولا جو ہندوستان کا واحد کالج ہے۔ اس طرح انجمن طیلسانین نے بھی ایک کالج ونتیا مہا ودیالہ قائم کیا ہے۔ اس کے ایک شعبۂ تصنیف و تالیف کے زیر نگرانی ایک سہ ماہی مجلہ (طیلسانین عثمانیہ) شائع ہوتا تھا جس میں اس کے متعلمین کے مقالے اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ انجمن کا اہم کارنامہ تھا کہ اس سے یونیورسٹی کے گرانقدر مقالات کو منظر عام پر لانے کا موقع ملتا تھا۔ اب بھی اگر پی ایچ ڈی کے مقالات شائع ہوں تو بڑا کارنامہ ہوگا۔

ڈرامہ نگاری :

پچاس سال پہلے منشی امیر حمزہ مرحوم اور ان کے دو ایک ساتھیوں نے ڈرامے لکھے تھے لیکن اس وقت کے ماحول نے انھیں کامیابی کا موقع نہیں دیا جامعہ کے سپوتوں نے اس طرف توجہ کی اور آئے دن اس کا ذوق بڑھتا جا رہا ہے۔ اکثر و بیشتر ڈرامے کالج کے لیے لکھے گئے اور اسٹیج کیے گئے۔ چند کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

کالج کے دن، مستقبل، خیام، ہوش کے ناخن (میر حسن و مخدوم محی الدین) پروین مترجمہ میر حسن، حسن سلوک (غلام محمد) انصاف (محمد یحیٰ) طبیب حاذق (مرزا ظفر حسن) فرود پیشیاں (سرفراز رضی حسن) فاوسٹ مترجمہ عبدالقیوم خاں باقی مرحوم۔ ظاہر و باطن کی روشنی کا کارخانہ (فضل الرحمٰن صاحب)۔

انجمن ترقی ڈرامہ :

اس انجمن کے معتمد مرزا شکور بیگ تھے۔ فضل الرحمٰن و عطاء الرحمٰن، مرزا عصمت اللہ بیگ، مرزا محی الدین بیگ جیسے صاحب ذوق اس میں حصہ لیا کرتے تھے۔ مخدوم محی الدین، جمیل احمد، شرافت اللہ بیگ۔ ظفر الحسن، عبدالرؤف، شہریار اور شکور بیگ کی اداکاری کو نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

بزم اداکاری سے بھی بعض ڈرامے نئی روشنی، ظاہر و باطن غلط در غلط حشرات الارض وغیرہ بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیے جا چکے ہیں۔

حیدرآباد ڈرامٹک اسوسی ایشن :

یہ انجمن نواب سر امین جنگ کی سرپرستی میں کام کر رہی تھی اس کی طرف سے چار ڈرامے پیش ہوئے۔

انجمن اشاعت العلوم :

اردو میں دینی علوم کی اشاعت کی غرض سے شیخ الاسلام نواب فضیلت جنگ نے یہ انجمن قائم کی اور وہی اس کے روح رواں تھے۔ اس انجمن سے جو علمی و ادبی کتابیں شائع ہوئیں ان میں عربی کی (۱۸) فارسی و اردو کی (۵۶) ہیں۔ اس انجمن نے بڑی گرانقدر خدمات انجام دیں اور اس کی شہرت تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔

مجلس احیاء المعارف :

مجلس احیاء المعارف النعمانیہ کا قیام اس غرض سے عمل میں آیا۔ حضرت امام اعظمؒ اور آپ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ۔ امام محمدؒ احناف کی گراں بہا تصانیف و تالیفات کے تراجم اردو میں شائع کیے جائیں۔ ان مطبوعات کی نگرانی ایک مجلس انتظامی کیا کرتی تھی اس مجلس کی جانب سے فقہ و حدیث کی اکثر کتابوں کے تراجم اردو زبان میں شائع ہوئے۔

انجمن صحافت حیدرآباد :

حیدرآباد کے ارباب صحافت سید احمد محی الدین مرحوم سابق ایڈیٹر رہبر دکن، محمد عبدالرحمٰن رئیس ایڈیٹر منشور روقت یم نرسنگ راؤ سابق ایڈیٹر رعیت اور دیگر ارباب صحافت نے ایک مخصوص دستور کے تحت اس انجمن کو قائم کیا تھا۔ منجملہ دیگر مقاصد کے ایک اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ معیار صحافت کو بلند کیا جائے اور ارباب صحافت کو جو مالی مشکلات سے دوچار ہیں بڑی حد تک ان کی امداد و اعانت کی جائے۔

انجمن اسلامیہ :

۱۳۳۰ھ میں قائم ہوئی اس کی غرض یہ تھی کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ علمی و ادبی جلسے منعقد کیے جائیں۔ اس انجمن نے کچھ عرصہ تک بڑی مستعدی دکھائی اور پھر سست پڑ گئی۔ اس کے معتمد ملک کے نامور ادیب نصیر الدین ہاشمی بھی رہے ہیں۔

امداد المعارف :

۱۳۲۲ھ میں شیخ الاسلام دکن فضیلت جنگ نے معلمین و متعلمین کے علمی ذوق کے مدنظر مذہبی اور ادبی نوعیت کا ایک کتب خانہ قائم کیا جو امداد المعارف سے موسوم تھا۔ شیخ الاسلام دکن کے انتقال کے بعد ان کا ذاتی کتب خانہ اور مظفر الدین معلی کا ذاتی کتب خانہ بھی اسی میں ضم ہوگیا۔ اس لیے قلمی اور مطبوعہ کتب کا کافی ذخیرہ اس کتب خانہ میں موجود ہے۔

دار الافتاء :

مدرسہ نظامیہ ایک دینی اور مذہبی درسگاہ ہونے کے لحاظ سے ملک اور بیرون ملک سے فتوے طلب کیے جاتے تھے

عوام کو وقتاً فوقتاً اس سے واقف کرانے کے لیے انھیں رسالے کی شکل میں شائع کیا جانے لگا۔

خواتین حیدرآباد کے سماجی اور ادبی ادارے :

حیدرآباد میں خواتین کی حسب ذیل انجمنیں اور کلب قائم تھے۔

حیدرآباد لیڈیز سوشل کلب :

یہ کلب ۱۹۰۱ء میں قائم ہوا۔ اس میں اکثر وبیشتر علمی و ادبی جلسے اور اٹ ہوم ہوتے تھے۔ ابتداً اس کا قیام محبوبیہ گرلز اسکول کی عمارت میں عمل میں آیا۔ اس کلب کا مقصد یہ بھی تھا کہ یورپین اور ہندوستانی خواتین کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور ان کی فلاح وبہبود سے متعلق اجتماعی حیثیت سے غور کیا جائے اور ایسے طریقے اختیار کیے جائیں جس سے آنے والی نسلیں فائدہ اٹھاسکیں اس کی صدر لیڈی سر اکبر حیدری اور معتمد مس آسٹن پوپ تھیں۔

زنانہ رکریشن کلب : یہ خواتین کا ایک کلب تھا۔ جس میں بلا امتیاز مذہب خواتین شریک تھیں۔ اس کلب میں ڈرامے بھی اسٹیج کیے جاتے تھے۔ اس کی صدر رانی راجہ شام راج راج ونت تھیں۔

انجمن خواتین دکن :

۱۳۳۶ھ، ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی اس کے متنوع مقاصد تھے اس انجمن کے تحت ہر سال دستکاری اور پکوان کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔ کامیاب طالبات کو انعامات اور تمغے دیئے جاتے تھے۔ اس انجمن میں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز اور ادیبوں کو مدعو کیا جاتا تھا مثلاً چند مشاہیر اردو کے نام حسب ذیل ہیں۔

مولانا شوکت علی، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری۔ کچھ عرصہ تک یہ انجمن قائم رہی۔ بیگم قادر نواز جنگ، بیگم غیاث الدین خاں جاگیردار، مسنر جمال الدین، بیگم فیض الدین صدر و مہتمم تعلیمات، محمدی بیگم، مسنر جمیل الدین ایچ سی ایس ج نقوی کے علاوہ اس انجمن میں جملہ مذاہب کی خواتین شامل تھیں۔ اب اس انجمن کا ایک کتب خانہ ہے جو نصیر الدین ہاشمی صاحب کی نگرانی و معتمدی میں کام کر رہا ہے۔

انجمن خواتین اورنگ آباد :

اس انجمن کا قیام ۱۹۲۲ء میں عمل میں آیا۔ یہ انجمن بھی نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے مقصد میں کامیاب رہی اس کی ایک مجلس عاملہ حسب ذیل تھی۔

بیگم محمد اللہ خاں سابق سشن جج صدر، حفیظہ جمال بیگم برہان الدین حسین۔

انجمن خواتین اسلام :

۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء میں قائم ہوئی۔ بیگم خدیو جنگ اس کی معتمد و بانی تھیں، اور بیگم صغرا ہمایوں بھی معتمد رہی ہیں اور اب بیگم حسین علی خاں ہیں۔

انجمن ترقی تعلیم وتمدن نسواں :

اس انجمن کے تحت ایک تربیت گاہ تھی جس میں نرسنگ اور کمپونڈری کی تعلیم دی جاتی تھی۔

ولایت جعفری

منزل اور سفر

یہ تیری آنکھ کا جادو، یہ تیرے لب کی شراب
یہ تیرے عارضِ رنگیں کے جاگتے سے گلاب
یہ تیری پلکوں کی جنبش کہ جیسے کھلتی کتاب
چھلک رہا ہے ترے شیشۂ بدن سے شباب
وہ پہلی رات کے تارے بھی چرخ پر شرمائیں
زمیں کا حسنِ ضیا بار دیکھ کر گر جائیں

ترے بدن کا گلستاں یہ کوئی بات نہیں
ترے جمال کی چوسر پہ مجھ کو مات نہیں
کہ میرے اپنے ارادوں میں کوئی گھات نہیں
نہیں نہیں ارے وہ عشق میری ذات نہیں
یہ میرے عشق کی خوشبو ہے اس زمیں کے لیے
مرا لہو نہیں دولت کی آستیں کے لیے

ہزار راتیں گزاری ہیں راہ میں میں نے
مگر کسی نے مرے زخمِ دل کے لب نہ سیئے
تمام یار و مددگار تھک کے بیٹھ رہے
غموں کا زہر کوئی کیوں کسی کے ساتھ پیئے

یہ زہر دیکھ کے شیخِ حرم بھی بھاگ گئے
مگر یہ رند ہیں جو زہر پی کے جاگ گئے

ثبات عشق ہے پہلی وفا میں بے معنی
کہ تیری اور مری زندگی کا جوڑ نہیں
مرے ارادوں کی راہوں میں پیچ و خم ہیں بہت
ترے ارادوں کی راہوں میں کوئی موڑ نہیں
چلا ہوں اپنے وطن سے میں زندگی کے لیے
تلاشِ حق کے لیے اور روشنی کے لیے

ابھی تو کل مجھے اس شہر سے بھی جانا ہے
جنوں کے جذبے کو دنیا میں آزمانا ہے
جو سو گئے ہیں انھیں چھیڑ کے جگانا ہے
کہ زندگی کو نئی زندگی بنانا ہے
خزانہ کوئی نہ جاگیر چاہتا ہوں میں
حسین خوابوں کی تعبیر چاہتا ہوں میں

ابھی تو چلنا ہے تپتی زمیں پہ خوابوں کو
یہ میرے پاؤں کے چھالے لہو لہو ہوں گے
جب آئے گی نئے ساغروں میں زندگی کی شراب
یہ میرے سر کو لیے ہوئے ہاتھ بھی سبو ہوں گے
یہ ہے وہ عشق جو پیغمبری سے گزرا ہے
جنوں کے جام پیے رہبری سے گزرا ہے
ابھی تو کل مجھے اس شہر سے بھی جانا ہے
کہ زندگی کو نئی

عظیم الدین محبت

قسم

پھر سے وہ کھانے لگے وعدۂ فردا کی قسم
وہ نہ آئیں گے کبھی چشم تمنّا کی قسم
دل میں گھر کرتی ہے کیفیت چشم ساقی
چشم آہو کی قسم، نرگس شہلا کی قسم
ماورا حسن کی حد سے ہے جمالِ جاناں
حُسن یوسف کی قسم، عشق زلیخا کی قسم
پھوٹتی ہیں جو شعاعیں رخِ زیبا سے ترے
چاند کے گرد ہے بالا ید بیضا کی قسم
غازۂ رخ سے ترے پی ہے شفق نے سرخی
رنگتِ قوسِ قزح، نقشِ اجنتا کی قسم
موج زن رخ پہ ترے ہے جو فروغ بادہ
بے پیے مست ہے ساغرِ خم صہبا کی قسم
تری پاکیزہ جوانی پہ ہوں نازاں بھی بھی
حور و غلماں کی قسم، مریم و حوّا کی قسم
آکے پھر بزم تصوّر میں اُجالا کر دے
تجھ کو تیری ہی ضیائے رُخِ زیبا کی قسم
اور نکھرے تری بدمست جوانی[1] ہر دم
نظم مخدوم ہے تو "زلفِ چلیپا"[2] کی قسم
کب بناؤ گے محبت کو تم اپنا اے دوست
پاس رہ کر بھی جدا ہو، دلِ تنہا کی قسم

تاج مہجور

بارِ گراں

اپنے ہی حُسن کے شعلوں میں جھلتے ہوئے پھول
اپنی ہی آنچ میں پگھلی ہوی مہتاب کی رات
اپنے ہی رنگ کے زنداں میں مقیّد کلیاں
اپنے ہی پاؤں کی آہٹ سے لرزتے لمحات

اپنے ہی نور سے جلتی ہوی صبحوں کی جبیں
اپنے ہی درد میں ڈوبی ہوی کالی راتیں
اپنے ہی بارِ نمو سے جھکی ہر شاخ شجر
اپنے ہی اشکوں سے لبریز کنول کی آنکھیں

چہرۂ کوہ پہ چھائی ہوی افکار کی دھند
ہانپتے کانپتے حیران و پریشاں بادل
لڑکھڑاتے ہوے گرتے ہوے وحشی جھرنے
غم ساحل میں بھٹکتی ہوی موجیں۔ پاگل

نفسی نفسی کے اس عالم میں کسے فرصت ہے
جوشبِ غم کو محبت کا اجالا دے دے
اشکِ آوارہ کو دامن کا سہارا دے دے

[1]، [2] مخدوم محی الدین کی مشہور نظموں کے عنوانات

عادل منصوری

دوہے

آنگن میں شہنائی باجے، بابل خوشی منائے
پردیسی کی یاد میں دلہن بیٹھی نیر بہائے

سونے گھر کی دیواروں پر کاگے شور مچائیں
ایکلتا کے گھور اندھیرے ہردے پر چھا جائیں

ہونٹ رسیلے، نین نشیلے، چال قیامت ڈھائے
مستی بھری جوانی تیری ہم سے نہ دیکھی جائے

اپنا گھر بھی ملتا جلتا ہے غالبؔ کے گھر سے
دو گھنٹے بادل برسے تو چھ گھنٹے چھت برسے

گوری تجھ بن متوالا ساون کورا جائے
رم جھم رم جھم کرتا پانی من میں آگ لگائے

بچے، بوڑھے، سنساری، سنیاسی، صوفی، جوگی
ایک یا دوجے روپ میں عادل سب مایا کے لوبھی

بھانت بھانت کے لوگ یہاں پر یہ دنیا اک میلہ
عادل کسی کا سنگ نہ کر تو سادھو رہے اکیلا

سید مراتب اختر

دُکھ کا لوبھی

رنگ کے جہانوں میں
محوِ ترنم پر
گھومتے زمانوں میں

بےکراں فضاؤں میں
کالی چمنیوں سے دور
پیپلوں کی چھاؤں میں

چاند کی نگریا میں
پھیلتی ہوئی گمبھیر
ظلمتوں کی دنیا میں

ابر کی نگاہوں میں
دھوپ کے بیاباں کی
صد ہزار راہوں میں

ملگجی بہاروں میں
دل گرفتہ و خاموش
سونی رہگزاروں میں

ڈھونڈتا پھرا دل تجھ کو
عمر بھر۔۔۔۔ مگر اے کاش
تو نہ مل سکے مجھ کو

خواجہ حمید الدین شاہد

کس مصیبت میں الٰہی یہ دلِ دیوانہ ہے
غیر کا تو ذکر کیا اپنی بھی اب بیگانہ ہے
کعبۂ دل بن گیا ہر ذرّہ کوئے دوست کا
اس لیے ہر رہ ہر قدم پر سجدۂ شکرانہ ہے
ایک مدت سے سکوں نا آشنا ہے دل مرا
زندگی میری مسلسل گردشِ پیمانہ ہے
شمعِ بزمِ زندگی ہے یادِ یارانِ وطن
اس تصوّر سے منوّر دل کا ظلمت خانہ ہے
شاہدِ مخلص پہ کیوں ہے طعنہ زن اے نکتہ چیں
تیری شمعِ بزم کا وہ بھی تو اک پروانہ ہے

بشیر بدر

پاؤں میں دم رہے دیار بہت
ہاتھ چلتے ہوں روزگار بہت
ایک دل اس کے دعویدار بہت
شہر تنہا ہے شہریار بہت
دیکھ لیں مہربانیاں تیری
زندگی بن نہ غمگسار بہت
اب تو تو بہ بھلی مرے ساقی
پی چکے تیرے بادہ خوار بہت
منھ سے کیا جانے کیا نکل جائے
چھیڑ ہم سے نہ کر بہار بہت
اب اجازت ہو کچھ ہنسیں بولیں
رو چکے تیرے سوگوار بہت
رات کہتی ہے بدر سو جاؤ
ہو چکا اس کا انتظار بہت

رشید انجمؔ

ہر غم کے مرحلے سے ذرا ہم گزر تو لیں
جامِ حیات اشکِ تمنّا سے بھر تو لیں
ہر بات پر ہے تلخیٔ کام و دہن کا غم
یہ صاحبانِ عقل ہماری خبر تو لیں
تنہا بھٹک نہ جائے کہیں کاروانِ شوق
راہِ وفا میں اہلِ الم ہمسفر تو لیں
لیتے ہیں اپنے ہاتھ میں جامِ حیات بھی
پہلے نگاہِ مست کو ہم یاد کر تو لیں
کیا جانئے ملے نہ ملے منزلِ جنوں
دیوانے اس نگاہ سے اذنِ سفر تو لیں
شاید سکونِ دل کی کوئی راہ مل سکے
اہلِ غمِ حیات پیامِ نظر تو لیں
پھر شغلِ جام و مے بھی کریں گے قریبِ صبح
انجمؔ شبِ حیات کے گیسو سنور تو لیں

نصیبؔ کوٹی

وفورِ سوزشِ پنہاں ہے دیکھئے کیا ہو
ابھی تو موت کا ساماں ہے دیکھئے کیا ہو
وہی تھی ایک سہارا الم نصیبوں کی
تری نظر بھی گریزاں ہے دیکھئے کیا ہو
بہ ہر نگاہ تجلّی بہ ہر قدم لغزش
سوادِ منزلِ جاناں ہے دیکھئے کیا ہو
سرشکِ غم سے مزیّن ہے دامنِ مژگاں
خیالِ جشنِ چراغاں ہے دیکھئے کیا ہو
یہ ساحلوں کی خموشی یہ پُر سکوت فضا
دلیلِ آمدِ طوفاں ہے دیکھئے کیا ہو
برائے سیرِ گلستاں گئے تو ہیں وحشی
کہیں قفس کہیں زنداں ہے دیکھئے کیا ہو
فروغِ ظلمتِ شب کا اثر نہیں جاتا
اداس شمعِ شبستاں ہے دیکھئے کیا ہو
انھیں فغاں سے شکایت انھیں الم کا گلہ
نصیبؔ آج غزل خواں ہے دیکھئے کیا ہو

عتیق احمد عتیق

رہِ طلب میں جو خود اپنا خضرِ راہ نہیں
مری نگاہ میں وہ صاحبِ نگاہ نہیں
ہے جن کے دم سے منوّر فضائے تیرہ و تار
مرے نقوشِ قدم ہیں وہ مہر و ماہ نہیں
مری نگاہ رخِ کائنات پر بھی ہے
ترا جمال فقط جنتِ نگاہ نہیں
تمام "عرصۂ فکر و نظر" پہ چھائے ہوئے
کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن سے رسم و راہ نہیں
اسی لیے تو ہے آباد کوئے میخانہ
کہ شہرِ دیر و حرم، منزلِ پناہ نہیں
غم و الم سے فراغت نصیب کیا ہو انھیں
غم و الم سے فراغت کی جن کو چاہ نہیں
خبر ہی کیا اُسے کیفِ حیات کیا شے ہے
وہ آدمی جسے توفیقِ یک گناہ نہیں
عتیق! عشرتِ فردا کی آرزو تو کجا
ہمیں تو عشرتِ امروز ہی کی چاہ نہیں

مظفر حنفی ہسوی

کہکشاں کیا ہے تمھاری گفتگو بکھری ہوئی
یا شکستِ شیشہ و جام و سبو بکھری ہوئی
دل اگر ویران تھا تیری محبت کے بغیر
آج کیوں ہے کائناتِ آرزو بکھری ہوئی
یہ ہمارا ہی لہو ہے لوگ سمجھے ہیں جسے
موسمِ گل کی متاعِ رنگ و بو بکھری ہوئی
جب مری چشمِ حقیقت کو بصیرت مل گئی
روشنی ہی روشنی تھی چار سو بکھری ہوئی
آپ کی خاطر نئی جنت بسانے کے لیے
ہے خلاؤں میں ہماری جستجو بکھری ہوئی
رات نے موتی لٹائے صبحدم دیکھی گئی
کاسۂ گل میں چمن کی آرزو بکھری ہوئی
اے مظفر چاند کو اودی گھٹا میں دیکھیے
یاد آجائے گی زلفِ ماہرو بکھری ہوئی

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں۔ ادارہ)

اردوئے معلیٰ لسانیات نمبر

مرتبہ:۔ خواجہ احمد فاروقی
قیمت:۔ ۵ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو

یہ رسالہ دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو کا چھ ماہی رسالہ ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے (۱) اردو زبان (۲) تعلیم زبان اردو حصۂ اول میں اردو لسانیات سے متعلق پروفیسر سید احتشام حسین کا لکھا ہوا مضمون ہند آریائی، مسلمانوں کی آمد سے پہلے اردو کی ابتدا، از ڈاکٹر زور، دکنی زبان از پروفیسر عبدالقادر سروری، اردو صوتیات کا خاکہ از ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ از ڈاکٹر گیان چند جین مضامین درج ہیں۔ اور حصۂ دوم میں اردو تعلیمات سے متعلق تعلیم زبان کے چند اصول از پروفیسر رچرڈ ایچ۔ رابنسن، اردو املا کا آسان طریقہ از عبدالغفار مدہولی۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، غیر ملکی طلبا کے لیے اردو زبان کی تعلیم از نکہت جہاں، غیر ملکی زبانوں کی تعلیم از ظ انصاری۔ تاشقند یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم اور اردو رسم خط کی علامتیں از عبدالغفار مدہولی مضامین مذکور ہیں۔

چار پانچ سال سے جب کہ لسانیاتی ادارہ پونہ نے لسانیات سے متعلق اپنا میقاتی کورس مقرر کر کے اہل ذوق کے لسانیاتی تعلیم کا انتظام کیا ہے، تب سے تعلیم یافتہ طبقہ میں لسانیات سے دلچسپی بڑھ گئی ہے اور آئے دن اس کے مختلف پہلوؤں پر مضامین رسالوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس جدید علم پر اردو کے مقابلے میں ہندی میں زیادہ کام ہو رہا ہے۔ ایک تو لسانیات کے مضمون کو یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں داخل کر دیا گیا ہے۔ دوسرے حکومت، ہندی سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے اس کی سرپرستی اور کارکنوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے اپنے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ مضمون تاریخی لسانیات کے نقطۂ نظر سے معلومات آفریں ہے۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے اپنے مضمون میں اردو کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریوں کے تحت تبصرہ کر کے یہ مشورہ دیا ہے کہ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی نسبت ایک جامع اور مستند کتاب شائع کی جائے تاکہ زبان مذکور سے متعلق غلط فہمیاں دور ہو جائیں ایک مفید اور کارآمد رائے ہے۔ پروفیسر سروری نے دکنی زبان کی تاریخ شرح و بسط سے بیان کی ہے، لیکن اس کی گرامر میں ان سے بعض تسامح ہوئے ہیں۔ مثلاً حالتِ مجروری جو اردو کی دیرینہ قواعدی اصطلاح ہے اس کے مقابلے میں حالت استخراجی جدید اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ دکنی جمع کے قاعدے کی رو سے گھوڑے کی جمع "گھوڑیاں" غلط ہے۔ جمع بنانے کا ایک استثنائی قاعدہ یہ ہے کہ ایسے جمع والے اسموں یا صفتوں کے الفاظ جن کے آخر میں یائے مجہول ہو۔ وہ حروف مغیرہ آنے کی صورت میں "یاں" سے بدل جاتے ہیں مثلاً اسموں میں بندے، بعضے اور فلانے کی جمع ترتیب وار "بندیاں"، "بعضیاں" اور "فلانیاں" آتی ہے اور صفتوں میں اچھے۔ بھلے اور

دوسری کی جمع "بریاں" "بھلیاں" اور "دوسریاں" بنتی ہے۔ دکنی میں شکیہ کی علامت "اچھیں گا" ہے۔ اس لحاظ سے مصدر لکھنا سے ماضی شکیہ واحد متکلم مذکر میں "لکھیاں اچھیں گا" ہونا چاہیئے۔ "میں لکھا ہوں گا" غیر مستعمل ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کا مضمون اردو صوتیات کا خاکہ مختصر اور مبہم ہے۔ چوں کہ اردو میں صوتیات کا علم بالکل جدید ہے اس لیے اس کی تفصیل اور توضیح کی ضرورت تھی۔ اردو کے ممے کے بارے میں بعض اصطلاحوں پر مجھے اعتراض ہے۔ جو اصطلاحیں پہلے ہی سے اردو میں رائج ہیں ان کے بدلے میں دوبارہ اپنے طور پر وضع کرنا فضول سی بات ہے۔ مثلاً: دولبی، دندانی، لہاتی کی جگہ ترتیب وار "شفوی" "سنی" "لالہوی" اور "صفیری" استعمال ہونا چاہیئے۔ CLUSTER. انگریزی اصطلاح کے بدلے اردو "خوشہ" اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی "جوڑے" یا "جگ" کہنا بہتر ہے۔ اردو ہندی کا لسانیاتی رشتہ میں ڈاکٹر گیان چند جین نے دونوں زبانوں کے باہمی تعلقات، تاریخی، لسانیاتی اور مذہبی نقاط نظر سے اچھی روشنی ڈالی ہے اور اردو والوں کو اپنی زبان میں غیر ملکی عناصر کو کم کرنے اور اردو کی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے اس کو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادبیات کے ہم آہنگ بنانے کا مفید مشورہ دیا ہے۔

رسالہ مذکور کے حصہ دوم میں تعلیم زبان کے چند اصول، اردو املا کا آسان طریقہ اور اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو قابل ذکر مضامین ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے مضمون کو خوب سلجھا کر لکھا ہے جو لائق تحسین ہے۔

بہر کیف اردوئے معلیٰ کا یہ لسانیاتی شمارہ بلحاظ علم وفن اردو جیسی کم مایہ زبان کے حق میں ایک گراں مایہ کارنامہ علمی ثابت ہوتا ہے جس سے ہماری زبان میں نئے علم کا بڑا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے لیے مرتب قابل مبارک باد ہے۔

امرجوت

مصنف:۔ بنکٹ پرشاد۔ قیمت:۔ تین روپے
ملنے کا پتہ:۔ کتاب خانۂ عابد روڈ حیدرآباد (اے پی)

آج کل اردو میں رومانی اور جاسوسی ناول ابل پڑے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اصلاحی اور سماجی ناولوں کی اشاعت معدودے چند ہے موجودہ زمانہ میں جبکہ تعلیم عام ہو چکی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اخلاقی اور سماجی گراوٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں تعلیم یافتہ سماج کی اصلاح ضروری ہے۔ اس کے لحاظ سے ہمیں اصلاحی اور سماجی ناولوں کی سخت ضرورت ہے۔ مصنف نے اس ناول میں حالات حاضرہ کے مسائل یعنی معاشی، مذہبی، سیاسی اور تعلیمی چیزوں کا خوب تجزیہ کیا ہے ان کی برائیوں اور بھلائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس ناول کے مطالعہ سے سماج کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مصنف کی محنت و کوشش مستحسن ہے۔

حقوق الاسلام

مترجم:۔ وحید الدین سلیم پانی پتی۔ قیمت:۔ دو روپے
ملنے کا پتہ:۔ پاک اکیڈمی (۱۵۲ وحید آباد) گولی مار کراچی (پاکستان)

یہ کتاب پانی پت کے نہایت فاضل، عالم، صوفی اور مشہور فقیہ کی تصنیف حقوق الاسلام اور رسالہ سماع و مزامیر پر مشتمل ہے جو فارسی زبان میں تھی۔ اس کا ترجمہ ادیب شہیر مولوی وحید الدین سلیم سابق پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ نے بامحاورہ اور عام فہم اردو میں کیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے پہلے پہل اس کتاب کو حالی پریس پانی پت سے شائع کرایا تھا۔ پھر دوبارہ اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ حال ہی میں پاکستان میں اس کی مکرر اشاعت ہوئی ہے۔ آج کل کے زمانے میں جب کہ مسلمان حقوق اللہ اور حقوق العباد سے بالکل بے بہرہ اور غافل ہو گئے ہیں ان کے لیے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

(غلام رسول)

پاندان والی خالا

عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی۔ ناشر: پنج بھون پبلیکیشنز جہانگیرآباد، بھوپال
صفحات: ۲۰۵۔ قیمت: دو روپے

تخلص بھوپالی، بھوپال پنچ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ادبی حلقہ میں غیر متعارف نہیں۔ ان کا یہ ناول "پاندان والی خالا" مختلف حیثیتوں سے ادب کا ایک شاہکار کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اندازِ بیان میں جو دلکشی ہے اس کو موجودہ دور کے بہت کم ناول پہنچتے ہیں۔ ہمارے ناولوں اور افسانوں پر ہمیشہ حسین نادو شیزاؤں کی حکومت رہی ہے اور سارا تانا بانا انھیں کے اطراف بنا جاتا رہا ہے لیکن "خالا" اس ناول کا اہم کردار ہے اور چیکر پر جھریاں لیے گھومتی اور اپنے لڑکے کیلئے بر تلاش کرتی ہے ادھر بر ملا اور ناول ختم۔ اس قسم کے ناول جن میں عشق و عاشقی اور رزنگ و بو نہ ہو شاید ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن "خالا" بلا خوف تردید ایک جاندار ناول ہے صرف اس لحاظ سے نہیں کہ وہ بھوپال کی سماجی زندگی کا آئینہ ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد کانگریس نے اپنے دورِ حکومت میں جو "شاہکار" کارنامے انجام دیے ہیں اس پر بھی کڑی تنقید ملتی ہے۔ دفتروں کا حال اور کارکنانِ کانگریس کی کیفیت خالا کی زبانی جس روانی کے ساتھ ادا ہوئی ہے اس کا کوئی جواب نہیں۔ ساتھ ہی فلاکت زدہ نوجوانوں میں آزاد منشی، لاپروائی اور بے راہ روی کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ نہایت کامیاب اور فنکارانہ ہیں، نسوانی روزمرہ اور محاورے جس بے ساختگی اور آزادی سے استعمال ہوئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ یوں تو ہمارے بعض اور ادیبوں نے بھی عورتوں کی زبان استعمال کی ہے لیکن صفحہ دو صفحوں میں کھل جاتے ہیں اور تخلص صاحب پونے تین سو صفحے بڑھیا کی زبان لکھ جاتے ہیں لیکن مغائرت نہیں معلوم ہوتی۔ اس لحاظ سے بھی یہ ناول شاہکار ہے اور تخلص صاحب اس ناول کی پیش کشی پر قابلِ مبارکباد ہیں۔

(ا۔ ص)

عروس فکر

باقر رضوی امانت خانی
مطبوعہ: اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد

یہ ایک سو پندرہ بند کا ایک مرثیہ ہے جو حضرت قاسم ابن حسن علیہ السلام کی شان میں ہے۔ ابتدا میں مصنف نے عرضِ حال کے عنوان سے وضاحت کردی ہے کہ مرثیہ کے چہرہ میں عرب اور شمال اور ہند و دکن کے ان شعراء کے نام گنائے ہیں جن کے تخلص سے شاعرانہ فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ باقر صاحب نے یہ جدت برتی ہے اور خوب کام کیا ہے۔ عرضِ حال کے بعد پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نے اپنے دو لفظوں میں بڑی پتہ کی بات فرمائی ہے: "انیس اور دبیر اور ان کے خاندان والوں کے مرثیے پڑھ لینے کے بعد انسان کو خیال ہوتا ہے کہ مرثیہ کا تمام رنگ ان بزرگوں پر ختم ہوگیا لیکن جن نفوسِ قدسیہ کا یہ ماتم ہے نہ ان کا غم ختم ہوگا اور نہ مرثیے کا رنگ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرخلوص لکھنے والے کی قلم یہ ارواحِ طیبہ اپنے اثر سے چلواتی ہیں اور وہ کچھ لکھوا جاتی ہیں کہ معمولی انسان کی عقل دنگ رہ جائے۔"

اس مرثیہ کے دو بند ملاحظہ ہوں۔ عروسِ فکر کا اثر یہ ہے کہ

جو لفظِ غم لکھا، ہنگامۂ فغاں اٹھا — قلم نے رک کے کہا: درد دل کہاں اٹھا
جو آشیانہ لکھا، شورِ الاماں اٹھا — وہ چمکی برق، وہ کاغذ جلا، دھواں اٹھا
حروفِ جام پہ مستانے آکے ٹوٹ پڑے
چراغ رکھتے ہی پروانے آکے ٹوٹ پڑے

ترے سبب سے تھی آتش کی گرمیٔ بازار
تھا سکۂ دل حالیؔ کا تجھ سے عز و وقار
ترا ہی عشق تھا محفل میں دردِ ما آزار
تجھ ہی سے میرؔ ہوے ملک شعر کے سردار

مئے سخن کو پیا رنگ بزم ہند بنے
جو میکدے میں ترے آئے رندؔ، رند بنے

باقر صاحب کی عروس فکر کی جولانیاں قابل مطالعہ ہیں۔

جہاد صبر

باقر رضوی امانت خانی۔ مطبوعہ:۔ اعجاز پریس حیدرآباد

باقر صاحب کا یہ دوسرا مرثیہ ۱۱۳ بند پر مشتمل ہے اور حضرت عقیلۂ بنی ہاشم عالمہ غیر معلمہ شریکۃ الحسین ثانیٔ زہرا عصمت صغریٰ زینب کبریٰ اعلام اللہ علیہا کی جناب میں لکھا گیا ہے۔ اس کا دیباچہ عالم خوندمیری صاحب نے لکھا ہے اور مرثیے کی خوبیوں کو پیش کیا ہے۔

باقر صاحب نے عروس فکر میں جس جدت ادا، عذوبت زبان اور رفعت خیال کا اظہار کیا ہے جہاد صبر میں بھی وہی کیفیت ہے باقر صاحب مصور ہیں اور تصویروں میں جس طرح اپنے مو قلم سے جان ڈالتے ہیں اسی طرح وہ ایک فنکار شاعر بھی ہیں اور لفظوں میں وہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ روح وجد کرنے لگتی ہے۔ فنون لطیفہ کو جس طریقہ سے پیش کیا ہے وہ داد طلب ہے۔ ایک فن کار ہی فنکاری کی داد دے سکتا ہے۔ ہمیں توقع ہے اپنی خصوصیات کی بنا پر یہ مراثی مقبول ہوں گے۔

اور یانگ سی بہتا رہا

نان کنگ پو۔ ترجمہ:۔ طلیس عابدی

ناشر:۔ نیشنل اکاڈیمی دہلی۔ صفحات:۔ ۲۰۸۔ قیمت:۔ ایک روپیہ

نان کنگ پو چین کا بہت بڑا ناول نگار ہے اس نے بیس بائیس ناول لکھے ہیں اور ہر ناول میں چین کی تاریخ، جغرافیہ ماحول، معاشرت اور تمدن کی عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں بھی اس نے دریائے یانگسی کی سیلابی کیفیات اور طغیانی کے زمانے میں چینیوں کی زندگی سے بحث کی ہے۔ مترجم صاحب نے ترجمہ انگریزی سے کیا ہے۔ ترجمہ میں کہیں الجھاؤ نہیں رواں اور سلیس ہے چین کی زندگی کی یہ ایک اچھی تصویر ہے۔ نان کنگ پو کے کئی ناول دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اردو میں یہ ناول چینی ادب کا ایک اچھا عکاس ہے۔ (ا، ص)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

سنہ اجراء:۔ ۱۹۳۸ء — فون نمبر:۔ ۳۵۲۰۹

جلد ۲۵ ـ شمارہ ۱۲ — دسمبر ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

سب رس

قیمت سالانہ ہند و پاک سے ۶ روپے
ششماہی:۔ ۴ روپے
غیر ممالک سے:۔ ۱۰ روپے۔ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے
مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپ کر دفتر "ایوان اردو" خیریت آباد حیدرآباد دکن ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

دسمبر میں ادارۂ ادبیات اردو نے دوسری انجمنوں کے تعاون سے یوم ظفر منایا۔ اس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر ہمایوں کبیر وزیر ثقافتی امور و سائنسی تحقیقات نے فرمائی۔ یہ جلسہ نہایت اہتمام سے رویندر بھارتی تھیٹر میں منعقد ہوا اور معلومات آفرین تقاریر ہوئیں۔ دوسرے دن ایوان اردو میں مشاعرہ ہوا جس کی صدارت نواب میر احمد علی خاں وزیر تعلیمات و اوقاف آندھرا پردیش نے فرمائی۔

اب ۱۱ اور ۱۲ جنوری کو حسب سابق یوم قلی قطب شاہ منایا جا رہا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نہ صرف یہ کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے بلکہ اس نے قومی یکجہتی کے سلسلے میں جو شاندار اور گراں بہا خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ بنظر استحسان دیکھی جائیں گی خود اس نے اور اس کے درباری شعراء نے دکنی ادب کے ارتقاء میں جو حصہ لیا ہے وہ آج کسی سے مخفی نہیں۔

شعبۂ تاریخ ادارۂ ادبیات اردو نے حال ہی میں حدیقۃ السلاطین (تاریخ عہد عبداللہ قطب شاہ) شائع کی اب سلاطین قطب شاہی اور سلاطین ایران کے مابین مراسلت شائع ہوگی۔ اس کو حیدرآباد کے مشہور علم دوست اور ادب نواز رئیس اور مورخ نواب عنایت جنگ بہادر نے مرتب فرمایا ہے۔ نواب صاحب معز نے مراسلت کی اشاعت کے بعد مکتوبات کے نسخے کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کو عطیہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ کتب خانہ کے بعض اہم مخطوطات نواب صاحب معز ہی کا عطیہ ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب مرحوم کے تیرہ مضامین کا ایک مجموعہ زیر طبع ہے جو عنقریب ادارہ سے شائع ہوگا۔

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کی فہرست مطبوعات کی تیسری جلد بھی زیر طبع ہے اور بہت جلد شائقین کے ہاتھوں میں ہوگی ادارہ کے اشاعتی پروگرام میں جناب یوسف ناظم کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ "کیف و کم" بھی شریک ہے۔ نظم میں ادارہ نے حال ہی میں "حرف شیریں" پیش کیا ہے جس نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔

اگلا شمارہ جنوری اور فروری کا مشترکہ ہوگا اس میں بہادر شاہ ظفر کے تعلق سے بھی کچھ مضامین پیش ہوں گے۔ اس کے بعد کوشش کی جائے گی کہ "سب رس" پابندی کے ساتھ آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے۔

نصر اللہ خاں عزیز

پچاس سال پہلے

ہندوستان میں انگریزی حکومت نے جو نظام تعلیم رائج کیا تھا اس کے حقیقی اثرات اسکولوں میں ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ اسکولوں کی تعلیم کے دوران میں طلبہ اساتذہ اور والدین کے زیر اثر ہوتے ہیں اس لیے ان میں قومی اور معاشرتی خصائص کسی نہ کسی حد تک برقرار رہتے ہیں۔ انگریزی دور کے نظام تعلیم کے حقیقی اثرات کالج کی تعلیم میں جا کر مترتب ہوتے ہیں۔ اسی لیے مغربی تہذیب کے سب سے بڑے نقاد اکبر الہ آبادی مرحوم نے اسکولوں کی تعلیم کو ہدف تنقید نہ بنایا بلکہ کالج کی تعلیم کے بارے میں فرمایا کہ یہ تعلیم ہندوستان کی نوجوان نسل کو الزام لیے بغیر قتل کر رہی ہے۔ یعنی ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

انگریزی حکومت اور بدیشی غلامی سے نفرت، آزادی سے محبت اور قومی غیرت مجھے ورثہ میں ملی تھی۔ اس لیے اسکول کی تعلیم کے زمانے میں بھی جو ۱۹۱۲ء میں ختم ہوا، میرے دل میں انگریزی راج کی برکتوں کے اعتراف کے لیے کوئی مقام نہیں تھا۔ اور بچپن سے خان بہادروں اور سرکار پرستوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ایک خان بہادر کی تقریر میں اکثر مزے لے لے کر بطور طنز بیان کیا کرتا تھا جو ہر جمعے کے روز اپنے شہر کی جامع مسجد میں التزام سے تشریف لے جاتے اور خطیب کے منبر پر چڑھنے سے پہلے وہ سوار ہو کر سرکار انگلشیہ کے احسانات اور برکات پہاڑے یاد کرنے والے لڑکے کی طرح گنانا شروع کر دیتے ان کی تقریر سوال و جواب کے پیرائے میں ہوتی۔ خود ہی سوال کرتے خود ہی جواب دیتے۔

سڑکاں کس بنائیاں ——— سرکار نے
ریلاں کس چلائیاں ——— سرکار نے
سکول کس بنائے ——— سرکار نے
کھوہ کس لوائے ——— سرکار نے

وھلم جرا۔

لیکن انگریزی نظام تعلیم کے حقیقی خدوخال میں نے کالج میں جا کر دیکھے اور یہ صحیح طور پر اندازہ ہوا کہ بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے اور غلامی کے "دلبستہ فتراک" غزالان حرم تیار کرنے کے لیے کس قدر باقاعدگی اور تنظیم اور اہتمام کے ساتھ کام ہو رہا ہے پاکستان بننے کے بعد ہمیں جو ماہر فن اور سیاست داں دستیاب ہوئے ہیں جن کے کارناموں کی صداؤں سے آج ملک کے در و دیوار گونج رہے ہیں وہ ان ہی کارخانوں میں ڈھل کر تیار ہوئے تھے۔

گورنمنٹ ہائی اسکول لائل پور سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں

داخل ہو گیا۔ وہاں ہمارے ایک نہایت شفیق استاد مولوی عبدالباری صاحب پروفیسر عربی بن کر چلے گئے تھے۔ ان کی مشفقانہ کشش ہمیں وہاں لے گئی۔ مولوی صاحب مرحوم نہایت شفیق اور خوش اخلاق وسیع العلم استاد تھے۔

وہ نومسلم تھے اور ان سعادت مند روحوں میں سے تھے جو کفر کی گود میں آنکھ کھولتی ہیں اور ان کی خوش نصیبی انہیں اسلام کے آغوش میں اپنے فیضان کرم سے ڈال دیتی ہے۔ مجھے مولانا عبیداللہ سندھی سے یہ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ جب وہ مسلمان ہونے کے لیے گھر سے نکلے تھے تو ان کے ہمراہ ایک اور نوجوان بھی تھا جو مسلمان ہونے کے بعد عبدالباری کہلایا۔ یہ عبدالباری ہی ہمارے پروفیسر مولوی عبدالباری تھے۔ مگر جموں میں ہماری مرضی کے مضامین کا انتظام نہیں تھا اس لیے ہم اسلامیہ کالج لاہور میں چلے آئے۔ جموں میں مجھے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ کس طرح تعلیم کو سیاسی اغراض کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے۔ وہاں بھی انگریز پرنسپل مسٹر جانسن کالج کا سربراہ تھا۔ مگر اس کا طریق کار زیادہ واضح نہیں تھا یا ریاستی ماحول کی وجہ سے اس کا تضاد محسوس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن لاہور کے اسلامیہ کالج میں پہنچتے ہی یہاں کے پرنسپل مسٹر ہنری مارٹن اور ان کے معتمد علیہ پروفیسروں کے طرز عمل سے معاندانہ طریق کار نمایاں ہو کر سامنے آگیا جو مسلمان طلبہ کو بدیسی راج کا مطیع فرمان کل پرزہ بنانے کے لیے باقاعدگی کے ساتھ جاری تھا اس طریق کار کی نقاب کشائی میں سب سے نمایاں کردار ہمارے سب سے زیادہ محبوب اور شفیق استاد مولانا اصغر علی روحی رحمت اللہ علیہ کا تھا جو عربی کے اسباق کے دوران کفر و باطل کی مذمت کا فریضہ بھی انجام دیتے رہتے اور ان تدبیروں کی بھی مخالفت کرتے رہتے جو مسلمان طلبہ کو ذہنی طور پر مغربیت سے مرعوب بنانے کے لیے کالج میں اختیار کی جا رہی تھیں۔ مسٹر ہنری مارٹن اسلامیہ کالج میں پرنسپل ہی نہیں تھے بلکہ وہ پنجاب کے مسلمانوں کے سب سے بڑے اور اس وقت کے واحد کالج میں برطانوی مفاد کے نگران اور نمائندے بھی تھے۔ لفٹنٹ گورنر سے تک ان کے روابط تھے اور اسلامیہ کالج کے معاملے میں ان کی رائے کو انتہائی وقعت حاصل تھی۔ ایک طرف اسلامیہ کالج کو ہر قسم کے گزند سے بچانے اور اسے ترقی دینے میں کوشاں رہتے اور دوسری طرف وہ اس کو سرکار پرستی کا ایک گڑھ بنانے کا کام بھی سرانجام دیتے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ طالب علموں میں سے وہ ایسے کردار کے طلبہ کو چھانٹ لیتے جو کمزور سیرت و کردار کے ہوں، مگر ساتھ ہی اوپر اٹھنے۔ آگے بڑھنے دنیوی ترقی کی امنگوں سے بھی معمور۔ اقوام و امم کی تاریخ میں جن لوگوں پر قومی غداری کی تہمت عائد ہے ان میں بالعموم یہ دو صفتیں ضرور پائی گئی ہیں جس شخص کے اندر یہ دو باتیں پائی جائیں وہ نہایت آسانی کے ساتھ خریدا جا سکتا ہے۔ انگریزی حکومت بھی ایسے ہی لوگوں کو مختلف طریقوں سے ابھارتی اور قوم پر مسلط کرتی تھی اور اسلامیہ کالج کے پرنسپل بھی اسی نوع کے طلبہ کو ابھار ابھار کر طلبہ کے معاملات پر مسلط کرتا تھا۔ چغلیاں کھانے والے پرنسپل کو کالج کے طلبہ کی سرگرمیوں کی رپورٹیں دینے والے، عہدوں سے رعایتوں سے نوازشوں سے نوازے جاتے اور اس طرح خان بہادروں کی ایک کھیپ تیار کی جا رہی تھی۔

یہ صورت حال میرے دل میں ایک مخفی قسم کی بے اطمینانی پیدا کر رہی تھی کہ یکایک کرشمۂ قدرت نے مجھے اس دھندلکے میں سے نکال کر ایک روشن شاہراہ پر کھڑا کر دیا۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ برطانیہ کھلم کھلا خلافت عثمانی سے برسر جنگ ہو چکا تھا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی تحریک آزادی کی "سازش" کا انکشاف ہو چکا تھا۔ ان کے ساتھیوں اور شاگردوں کو نظر بند کیا جا رہا تھا۔ مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی شوکت کی مولانا ظفر علی خاں وغیرہم کی آزادیوں پر پابندیاں لگ چکی تھیں۔ ایسے میں اس تحریک کے ایک نوجوان کارکن خواجہ عبدالحی فاروقی کو لاہور میں لا کر نظر بند کر دیا گیا۔ اسی زمانہ میں مولانا احمد علی مرحوم بھی لاہور میں پہنچا دیے گئے۔ خواجہ صاحب کو حکومت نے نظر بند تو کر دیا تھا مگر ان کے قلب و دماغ پر تو پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے تھے۔ ان کے دل میں اسلام کی جو شمع حریت روشن تھی اس نے گرد و پیش کو منور کرنا شروع کر دیا اور وہ اپنے طریق کار کے مطابق کالج کے طلبہ کو تحریک آزادی سے متاثر کرنے کا کام کرنے لگے۔ ایک دوست کی وساطت سے میں بھی ان کے یہاں پہنچ گیا اور وہاں جا کر پہلی مرتبہ میں نے اکبر مرحوم کا یہ شعر سنا کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور جب میں نے اپنے کالج کے ماحول پر نگاہ ڈالی اور یہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا اندازہ لگایا تو مسٹر ہنری مارٹن کی پوری تکنیک میری سمجھ میں آگئی اور میرے انقباض میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔

حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کی آزادی کی جو اسکیم بنائی تھی اس کا سرآغاز حقیقت میں دارالعلوم دیوبند تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اس تحریک کے رہنماؤں نے اپنا میدان کار بدل دیا تھا۔ وہ آخری معرکے کے لیے ایک طویل تیاری میں مصروف ہوگئے فوری طور پر بدیشی اقتدار سے ٹکر لینے کی بجائے انھوں نے ایک لمبا پروگرام اختیار کیا اور وہ یہ تھا کہ جس طرح انگریزی حکومت اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ نئی نسل کے قتل کرنے میں مصروف ہے اسی طرح علمبرداران حریت اس نسل کو زندہ کرنے کی جدوجہد کریں اور کفر و غلامی کے مہلک اثرات سے اس کو بچا کر غلامی اور کفر کے مقابلے میں صف آرا کر دیں۔ اس غرض کے لیے وہ کالجوں کے طلبہ میں سے کارکنوں کا انتخاب کرتے تھے۔ لاہور میں خواجہ عبدالحی صاحب کی قیام گاہ دراصل اسی قسم کی ایک درس گاہ حریت تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ لاہور کی برانڈرتھ روڈ کے جنوب میں ہنری مارٹن کی فیکٹری قائم تھی جہاں غلاموں کو تیار کیا جا رہا تھا اور اس کے شمالی علاقے میں بوٹا مل کے اکھاڑے کے پاس ایک بیٹھک میں اسلامی کارکن تیار کرنے کا "ادارہ" جاری تھا۔

یہ ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے اس وقت خلافت عثمانی برطانیہ اور عربوں کی مشترک یلغار کے سامنے شکست کھا چکی تھی اور اس کی ردائے مملکت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ اقبالؒ کے قول کے مطابق ایک ہاشمی (شاہ حسین) ناموس دین مصطفیٰ ﷺ کو بیچ کر بیسے کھرے کر چکا تھا۔ [illegible] عالم اسلام میں اس ناجائز سودے کے خلاف ایک عالمگیر احتجاج برپا تھا۔ [illegible] ہے جب کہ برطانیہ کے وزیراعظم لائڈ جارج نے بیت المقدس کے فاتح جرنیل ایلن بی کو سند افتخار دیتے ہوئے برطانوی عوام کے [illegible] سے ان الفاظ کے ساتھ [illegible] لگائی تھی کہ "حروب صلیبیہ کا فیصلہ آج ہوا ہے"۔ یعنی اس دیرینہ بغض کو آج تسکین ہوئی تھی جو عیسائی اقوام خصوصاً برطانوی قوم کے دل میں سلطان صلاح الدین رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کی شکستوں سے ملت اسلامیہ کے [illegible] چلا آ رہا تھا۔ خلافت عثمانی کے خلاف جنگ [illegible] صلیبیہ ہی کے سلسلے کا ایک معرکہ تھا جس کو خود عربوں نے اور ہندوستان کے محکوم مسلمانوں نے انگریزوں کی امداد کر کے صلیب پرست اقوام کے لیے سر کیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، شوکت علی ہندوستان میں [illegible] تھے اور حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقا [illegible] تھے اور ہندوستان کے ان مسلمانوں کے دلوں میں جن کی حمیت اسلامی [illegible] غیرت قومی بالکل ہی مر نہیں گئی تھی سخت برہمی تھی۔ اس کا اثر مسلمان طلبہ پر بھی تھا۔ لیکن اس زمانے میں کسی کو جرأت اظہار نہیں [illegible]

اس کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں میں سرکار پرستوں کا غلبہ تھا جو بالعموم تعلیمی اداروں پر چھائے ہوئے تھے۔ بلکہ جن کو [illegible] کے طور پر مسلط کر کے رکھا گیا تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور جو پنجاب کے مسلمانوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا سرکار پرستوں کی آغوش میں تھا یہاں تک کہ اس کا اہتمام کرنے والی انجمن حمایت اسلام کا جنرل سکریٹری ایک ایسا شخص تھا جو ایک طرف اخبار کا ایڈیٹر اور دوسری طرف پریس برانچ کا سپرنٹنڈنٹ بھی تھا۔ خود مسٹر ہنری مارٹن کو انگریزی حکومت میں بے حد اعتماد حاصل تھا اور اسے ایک بڑا اہم کارکن تصور کیا جاتا تھا جب کوئی مشکل مرحلہ پیش آتا تھا تو وہ فوراً لفٹنٹ گورنر کے مشکوئے معلیٰ میں پہنچ جاتا اور سرکاری امداد حاصل کرتا تھا۔

۱۹۱۸ء ہی کا واقعہ ہے کہ ایک روز بریوار ہوسٹل میں ایک محفل سماع منعقد ہوئی اس میں لاہور کا ایک مشہور قوال جس کا نام غالباً استاد روڑے تھا بلایا گیا۔ "محفل سماع" عشاء کے بعد شروع ہوئی اور غالباً تہجد کے وقت تک جاری رہی۔ مگر اس میں قوال نے اپنے

وقت کے بعض پنجابی گیت بھی گائے۔ ان میں ایک گیت "جُتّی" بھی تھا جو اس وقت کے معروف کے مطابق فحش تھا۔ ع

"جُتّی لینی اے ستاریاں والی وے ہرنام سنگھا"

اس محفل میں شریک ہونے کے باوجود مجھے اس کے فحش گیت سخت ناگوار گزرے اور میں سخت کبیدہ خاطر اٹھا۔ اگلے روز میں خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی کی خدمت میں پہنچے تو میں نے اور میرے ایک رفیق نے اس محفلِ نشاط کی تفصیلات بھی بیان کیں اور بتایا کہ کس طرح اس قسم کی محفلوں کے ذریعہ مسلمان نوجوانوں کو عیش پرستی کی چاٹ لگائی جا رہی ہے اور یہ کام اسلامیہ کالج میں ہو رہا ہے جس کے نیک دل بانیوں نے انجمن حمایت اسلام قائم ہی اس لیے کی تھی کہ مسلمان طلبہ کو مسیحی اداروں کے گمراہ کن اثرات سے بچا کر دینی تعلیم دلائی جائے۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب مولانا ظفر علی خاں کے روزنامہ اخبار "ستارۂ صبح" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے دفتر جاکر "رات کی بات" "الہٰی توبہ" کے عنوان سے ایک شذرہ قلمبند کر دیا جس میں "رودادِ شب" بیان کر کے مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی تھی کہ وہ اپنے اعلیٰ تعلیمی ادارے کی اخلاقی اور دینی حالت کے زوال کی طرف توجہ کریں۔

اس شذرے کا شائع ہونا تھا کہ سرکاری اور نیم سرکاری حلقوں میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا اور سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ اطلاع اخبار کو کس گستاخ نے دی۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی طالب علم ہی ہو سکتا تھا مگر وہ کون تھا۔ اس راز کا پتہ کیوں کر چلایا جائے۔ ہنری مارٹن لفٹنٹ گورنر کے یہاں پہنچا اس سے فریاد کی۔ اس نے ہدایت کی کہ پتہ چلاؤ اور اس قسم کی حرکت کا سدِباب کرو چنانچہ پرنسپل نے پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم کو کہ ان کے مراسم مولانا ظفر علی خاں مرحوم سے بھی تھے، دفتر ستارۂ صبح میں بھیجا انھوں نے مولانا کو معاملے کی نزاکت سے آگاہ کیا اور دریافت کیا کہ یہ اطلاع کس نے دی۔ مولانا مرحوم نے سادگی یا مصلحت کی بنا پر جواب دیا کہ وہ نوٹ خواجہ صاحب نے لکھا تھا ان ہی کو معلوم ہوگا۔ انھوں نے خواجہ صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے ٹکا سا جواب دیا کہ اس سے کیا بحث اطلاع کس نے دی یہ فرمایئے اطلاع غلط ہے یا صحیح۔ یہ جواب سن کر سید صاحب واپس آگئے اور خواجہ صاحب کا نام آتے ہی معاً میری طرف اور میرے رفیق کی طرف ذہن گیا کہ یہ لوگ خواجہ صاحب سے ربط ضبط رکھتے ہیں۔ اس ربط ضبط کی وجہ سے ہم کالج کے سرکاری حلقوں میں پہلے ہی سے مخدوش تصور کیے جا رہے تھے اور ہمیں علم تھا کہ خان بہادری کا درس لینے والے ہمیں ناپسند کرتے تھے اور کالج کے اربابِ اختیار سے چغلی کیا کرتے تھے۔ میں اس لحاظ سے کالج میں اتنا بدنام تھا کہ اگر کوئی طالب علم کالج کے کسی ضابطے یا واقعے کے خلاف نوٹس بورڈ پر کوئی پوسٹر لکھ کر لگا دیتا تھا تو شبہ مجھ پر کیا جاتا تھا کہ یہ اسی کی حرکت ہوگی۔

مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اگلے روز کے ستارۂ صبح میں ایک شذرہ تو سید صاحب مرحوم کی تشریف آوری اور تفتیش و تحقیق پر ہوا اور اس کے آخر میں یہ شعر درج کیا کہ:

چمک دانتوں کی دکھلاتے ہیں اور بجلی گراتے ہیں ۔۔۔ قیامت بن کے وہ مرقد مری ٹھکرانے آتے ہیں

اس شعر کا لطف خود سید صاحب مرحوم نے بھی اٹھایا۔ کلاس روم میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے ہنس کر اپنے دانتوں پر جو قدرے لمبے اور ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے ہاتھ رکھا اور ساتھ ہی کہا ظالم نے میرے دانتوں پر بھی چوٹ کر دی ہے۔ اور اس شذرے کے علاوہ ایک نظم صفحۂ اول پر شائع کی جس کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس نظم کی نقل حاصل کرنے میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ مولانا ظفر علی خاں کی قدرتِ کلام کا یہ نظم بہترین نمونہ ہے۔ مولانا قوافی کے بادشاہ تھے اور مشکل سے مشکل زمین میں شگفتہ سے شگفتہ شعر برجستہ کہنے میں بے نظیر تھے۔ ایک مرتبہ میرے نہایت عزیز اور فاضل دوست مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم نے مجھ سے راز دارانہ طور پر مجھ سے دریافت کیا تھا کہ اس وقت اردو کا سب سے بڑا شاعر تمھارے نزدیک کون ہے۔ میں نے اقبال، حسرت وغیرہ کے

نام لینے لگے ہیں ظفر علی خاں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں لکھ سکتے ہیں۔ اور یہ بالکل حقیقت تھی۔ بہر حال مولانا مرحوم نے یہ نظم شائع کی ؎

دانۂ بارود میری نکتہ چینی ہو گئی ۔۔۔ اور مری تحریر ہنری مارٹینی ہو گئی
لوگ کہتے ہیں کہ کالج ہو گیا برطانیہ نواز ۔۔۔ بات جو ظنی تھی پہلے اب یقینی ہو گئی

اس میں "ہنری مارٹینی" کی تلمیح ایک رائفل کی طرف تھی جو اس نام سے معروف تھی۔ اس نظم کی اشاعت نے آگ پر تیل کا کام دیا اور ہنری مارٹن صاحب نے ہمیں طلب کر کے دریافت کیا یہ اطلاع تم نے دی ہے؟ ہمارے ساتھ اور طالب علم شجاعت اللہ صاحب بھی دھر لیے گئے کیوں کہ وہ بھی حریت پسندوں میں سمجھے جاتے تھے، اور سرکاری حلقوں میں معتوب تھے۔ مگر ہم نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس جرم کے ارتکاب سے انکار کر دیں لیکن انکار مسموع نہ ہوا، اور ہمیں دس روز کے لیے کالج بدر کر دیا گیا۔ ہم نے بورڈنگ میں رہنے کی اجازت مانگی تو مارٹن صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ فرمایا یہی تو وہ جگہ ہے جہاں تمہیں نہیں ہونا چاہیے۔ (THAT IS THE PLACE WHERE YOU SHOULD NOT-BE).

اور ہم بستر اٹھا کر خواجہ صاحب کی قیام گاہ پر آ گئے۔ ہمیں از راہ عنایت بورڈنگ ہاؤس میں کھانا کھانے کی اجازت دے دی گئی تھی مگر سخت قدغن تھی کہ چپکے سے آؤ خاموشی سے کھانا کھاؤ اور باہر نکل جاؤ۔ کسی طالب علم سے بات کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ اور بات کرنے کا موقع بھی کہاں تھا۔ خود طلبہ ہنری مارٹن کے جاسوسی نظام سے اس قدر خائف تھے کہ ہم سے بات کرنے کی کسی میں جرات نہیں تھی۔ ان کے "خان بہادر" ہر جگہ موجود سمجھے جاتے تھے وہ ہر وقت ہنری مارٹن سے ملاقات کر سکتے تھے۔ ان کی کوٹھی پر بھی اور دفتر کالج میں بھی وہ چق اٹھاتے اور اندر داخل ہو جاتے۔ ان کی خدمات کے عوض ان کو فیسوں میں رعایت دی جاتی غیر مستحق ہونے کے باوجود بورڈنگ ہاؤس میں الگ کمرے الاٹ کر دیے جاتے۔ مخصوص سوسائٹیوں کا عہدیدار بنایا جاتا اور مراسم و تقاریب میں انتظام و اہتمام کا اعزاز عطا کیا جاتا ان میں سے بعض غریب ہونے کے باوجود بڑے ٹھاٹ سے رہتے۔ یہی لوگ آگے چل کر جب ملازمت یا کسی دوسرے کاروبار میں جاتے تو شاہ سے زیادہ شاہ پرست ثابت ہوتے۔

مسٹر ہنری مارٹن روزانہ ہمیں طلب فرماتے اور پوچھتے کہ ملزم کا سراغ ملا یا؟ ہم نفی میں جواب دیتے اور ہمیں پھر کالج سے باہر آوارہ پھرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ ہمارے اس حال سے بعض دوست عبرت پکڑتے۔ اگر ان کے اندر اگر غیرت قومی کی شمع روشن ہونے کی کوشش کرتی تو وہ اسے پھونک مار کر بجھا دیتے اور ہماری آزاد منشی کو دیوانگی یا کم از کم حماقت سے تعبیر کرتے۔ بالآخر اس قضیئے کا کسی طرح خاتمہ ہوتا نظر نہ آیا تو قدرت نے ایک تدبیر سجھا دی۔

مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے ایک بھتیجے محمد جنید اسلامیہ کالج سے [illegible] پاس کر کے میڈیکل کالج میں جا چکے تھے وہ بھی خواجہ عبدالحی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے کیوں کہ ان کے خاندان کے [illegible] صاحب سے تھے۔ مجھے ایک روز یکایک خیال آیا کہ اس طویلے کی بلا ان پر ڈالی جائے۔ وہ اسلامیہ کالج کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں اگر وہ اعتراف کر لیں کہ یہ نظم انھوں نے خواجہ صاحب سے بیان کیا تھا تو ہماری گلو خلاصی ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر ہم نے پہلے جنید صاحب سے مشورہ کیا وہ تیار ہو گئے۔ اس کے بعد ہم پرنسپل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو یہ مسرت انگیز خبر سنائی کہ حضور ہم نے "چور" کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ یہ سن کر بھڑک اٹھے اور بڑی بے تابی سے پوچھا جلدی کہو وہ کون ہے؟ ہم نے کہا میڈیکل کالج کے ایک طالب علم محمد جنید جو پہلے اسلامیہ کالج میں تھا۔ مسٹر ہنری مارٹن نے اسی وقت میڈیکل کالج کے پرنسپل کو چپراسی کے ہاتھ رقعہ بھیجا کہ محمد جنید کو تھوڑی دیر کے لیے بھیج دو۔ یہاں سے نکل کر ہم ریلوے روڈ پر برف خانے کے چوک کے آس پاس ٹہلنے لگے

اور جب جنید صاحب کو آتے ہوئے دیکھ لیا تو ان سے اشاروں میں بتا دیا کہ تمھیں اسی غرض سے بلایا گیا ہے۔ جنید سے مسٹر ہنری مارٹن نے پوچھا کہ ستارۂ صبح کو تم نے یہ خبر سنائی؟ انھوں نے کہا میں نے کسی کو کوئی خبر نہیں سنائی۔ البتہ میں بھی اس روز کی محفل قوالی میں شریک رہا تھا۔ خواجہ صاحب سے اگلے روز ملا تو انھوں نے کہا تم کل شام نہیں آئے۔ میں نے کہا میں اسلامیہ کالج کی محفل موسیقی میں شریک ہوا اور نہ آسکا۔ انھوں نے اس کی روداد پوچھی۔ میں نے بتایا کہ اس میں فلاں فلاں گیت گائے گئے اور بس۔ مسٹر مارٹن مطمئن ہوگئے۔ اسی وقت گھنٹہ بجایا۔ سارے کالج کو حبیبیہ ہال میں جمع کیا گیا اور پرنسپل صاحب نے بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کیا کہ مسٹر نصر اللہ اور ریاض حسین بے قصور ثابت ہوئے ہیں البتہ شفاعت اللہ کا معاملہ مشکوک ہے ان کو دس روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ شفاعت صاحب نے مولانا اصغر علی روحی رحمۃ اللہ علیہ کی وساطت سے جرمانہ معاف کرالیا۔ اور ہم پھر کالج اور بورڈنگ ہاؤس میں آگئے۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

یہ ہے ہلکا سا خاکہ اس دور کا جس میں مسلمان طلبہ کو درس غلامی دینے کے لیے تعلیم کے اسلامی اداروں کو استعمال کیا جا رہا تھا اور گرانٹ کے لالچ اور انگریز پرنسپلوں اور پروفیسروں کے ذریعہ ہماری نوجوان نسل کو "قتل" کیا جا رہا تھا۔ اگر ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے اندر قومی اور سیاسی شعور پیدا ہونے میں دیر بھی لگی تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی اور پاکستان بننے کے بعد بھی سیاستدانوں اور بیوروکریسی کے ذریعہ یہ مملکت خداداد مشکلات و مصائب میں مبتلا ہوئی تو اس کی تہ میں بھی اس قسم کی سیاسی تربیت کارفرما تھی۔

مجھے یہاں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مسلمان قومی رہنماؤں کے برعکس ہندو رہنماؤں نے شروع ہی میں اس صورت حال کو بھانپ لیا تھا اور انھوں نے ابتدا ہی سے اپنے تعلیمی اداروں کو سرکاری اور انگریزی اثرات سے محفوظ کرنے کا اہتمام کرلیا تھا۔ ان کے کسی کالج کا پرنسپل تو درکنار کوئی پروفیسر اور لیکچرر بھی غیر ہندو نہیں ہوتا تھا اور وہ منظوری تو محکمۂ تعلیم سے لے لیتے تھے مگر اس سے گرانٹ قبول نہیں کرتے تھے اس طرح ان کے تعلیمی ادارے سیاسی اور قومی عزائم کی تربیت گاہیں بن گئے تھے جہاں ان کو ایثار پیشہ اساتذہ قربانی و خدمت کا درس دیتے تھے ان میں قومی روح بھرتے تھے۔ لاہور ڈی اے وی کالج کے پرنسپل ہنس راج چوٹی کے ماہر تعلیم تھے مگر زندگی بھر ۵، روپے تنخواہ لے کر اپنے طلبہ کے اندر خدمت کا جذبہ پھونکتے رہے ان کا کالج سیاسی تحریکات کا مرکز ہوتا تھا اور بعد میں اس کی آغوش سے سینکڑوں سیاسی کارکن اور انارکسٹ پیدا ہوئے اور ایسے سرکاری ملازم جو ملازمت میں بھی کانگریس کی تحریک آزادی کی خفیہ امداد کرتے تھے۔ انگریزی حکومت کے مقابلے میں کانگریس کو جو کامیابیاں ہوئیں اس میں ان لوگوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو گھر کے بھیدی تھے جو کانگریس رہنماؤں کو سرکار انگریزی کے اندرونی راز بتاتے رہتے تھے اور بساط سیاست کی ان چالوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے جو حکومت چلنے والی ہوتی تھی۔ افسوس کہ مسلمانوں کا حال اس کے برعکس رہا۔ ان کے اپنے کالج بھی انگریزوں کی تحویل میں رہے اور طلبہ انگریزوں کے ممنون کرم اور انگریزیت سے مرعوب ہو کر پروان چڑھے۔ ان کے سیرت و کردار خوشامد اور خود غرضی کا شکار ہوئے اور اپنی ذات کی محبت کے سوا ان کے اندر کوئی بلند جذبہ پیدا نہ ہوسکا۔

افسوس ہے کہ اب تک ہماری تعلیم گاہیں اعلیٰ اور بلند اسلامی اور قومی جذبے کی تربیت گاہ نہیں بنیں۔ ان کی "قتل گاہی" میں نمایاں فرق واقع نہیں ہوا شاید اس لیے کہ ہمارا انحصار اب تک غیر ملکی اساتذہ اور ان کے شاگردان رشید پر ہے! بقول اقبال ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

ڈاکٹر سیدہ جعفر

فراقؔ ـــــ بحیثیت نقّاد

فراقؔ جس طرح اردو غزل میں ایک منفرد آواز، ایک مخصوص لب و لہجہ اور ایک نئی اٹھان اور زبان لیکر آئے ہیں، اس طرح اردو تنقید میں بھی ان کا انداز دوسرے نقادوں سے مختلف ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۳۵ء ہی میں اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ غزل میں ایک "لب و لہجہ، آہنگ عشق" پیدا ہو رہا ہے جو اردو شاعری کے بانکپن اور ہندی شاعری کے رس اور اس کی نرم آنچ کے امتزاج سے ایک ایسے ادبی پیکر کی تخلیق کر رہا ہے جو اپنا مذاق خود پیدا کرے گا۔ چنانچہ آٹھ دس برس کے عرصے میں فراقؔ کی غزل اور ان کی تنقید نے اردو دان طبقے میں ایک نیا طرز احساس اور ایک جدید ذوق ادب پیدا کر دیا۔ فراقؔ کے ادبی مزاج میں جو داخلیت، سوز و ساز، نغمگی اور لطافت ہے، اس کا ان کے تنقیدی اسلوب کی تعمیر و تشکیل میں بڑا حصہ ہے۔ ان خصوصیات کی حامل شخصیت فطری طور پر تنقید کے اس شعبے میں رومانی اور تاثراتی تنقید سے متاثر ہونا ایک نفسیاتی اور فطری امر تھا۔ تاثراتی تنقید ایک ایسا نقطہ ہے۔ جہاں شعر کی نزاکت اور تنقید کے ٹھوس حقائق کی سطحیں قریب نظر آتی ہیں۔ فراقؔ نے اردو ادب میں پہلی بار تاثراتی تنقید کو ایک فن کے طور پر برتا اور اس کے خدوخال متعین کئے اور اس کے مطالبات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ فراقؔ کے یہاں سائنٹیفک تنقید کی پرچھائیں بھی دکھائی دیتی ہیں لیکن تاثراتی انداز ان کے تنقیدی نظریہ کا غالب عنصر نظر آتا ہے۔ "اندازے" کے دیباچے میں فراقؔ اپنے تنقیدی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"میری غرض و غایت اس کتاب کی تصنیف میں یہ رہی ہے کہ جمالیاتی، وجدانی، اضطراری اور مجمل اثرات جو قدماء کے کلام کے میرے کان، دماغ، دل اور شعور کی تہوں پر پڑے ہیں، انہیں دوسروں تک اس صورت میں پہنچا دوں کہ ان اثرات میں حیات کی حرارت و تازگی قائم رہے۔ میں اسی کو خلاقانہ تنقید یا زندہ تنقید کہتا ہوں، اسی کو تاثراتی تنقید بھی کہتے ہیں۔"

تاثراتی تنقید نگاروں یا امپرشنسٹک تحریک کے حامیوں نے تنقید کا یہ مقصد قرار دیا ہے کہ کسی ادب پارے کے مطالعے سے نقاد کے دل و دماغ اور اس کے شعور پر جو تاثرات مرتب ہوں انہیں جوں کا توں بیان کر دیا جائے۔ اس تحریک کو جے۔ ای۔ اسپنگرن کے تنقیدی نظریات کی حمایت حاصل تھی۔ اس کی دانست میں تنقید کی ساری اہمیت اسی میں تھی کہ داخلیت اور جذباتی اور تاثراتی سطح کو تنقید کی کسوٹی قرار دیا جائے۔ کسی فنی تخلیق کے مطالعے سے جو جذبات اور احساسات نقاد پر طاری ہوں، ان کا من و عن اظہار تاثراتی دبستان سے تعلق رکھنے والے نقاد کے لئے "تنقید نگاری" کا فرض ہے۔ تنقید کے اس دبستان کی بنیاد انیسویں صدی کے رومانی اسکول کے تنقیدی نظریات پر رکھی گئی تھی جس کا علمبردار والٹر پیٹر سمجھا جاتا ہے۔ آرتھر سائمنس بھی اسی اسکول کا خوشہ چین ہے۔ اس تنقیدی دبستان کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ کسی ادبی اکتساب کو پرکھتے ہوئے، صرف شخصی معیاروں اور جذبات کی رہنمائی پر اکتفا کرتا ہے اور اس طرح تاثراتی تنقید میں عقلیت، افادیت، اور ادب کی حرکی خصوصیات اور سماجی کردار کی دقعت گھائل ہو جاتی ہے

تاثراتی تنقید عموماً اپنے موضوع کی خارجی کیفیت ہی کا پرتو پیش کر سکتی ہے۔ جیسا کہ فراق کے حسب ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے :۔

"آواز کی یہ تیاری، یہ ابلتی ہوئی جوانی، یہ بے کیف و بے لاگ رچاؤ اور نکھار، یہ شوخ چٹیلی رنگینی، یہ دھن، یہ سرِیلا پن، یہ رنگ، یہ رس، یہ کسک اور انگڑائیاں ہم کو آج کسی اور شاعر میں کہیں اور نہیں ملتیں ۔"

تاثراتی تنقید کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس انداز میں قطعیت، وزن اور حقیقت پسندی نہیں ہوتی اور یہ محض سطحیت اور جذباتی رنگ آمیزی کی آفریدہ ہوتی ہے درست نہیں۔ تاثراتی تنقید میں بھی ادبی صداقت اور واقفیت کارفرما رہتی ہے اور کہیں تاثراتی تنقید کسی حسن کار، کسی فنی تخلیق کے متعلق بڑے پتے کی بات بھی کہہ جاتی ہے۔ فراق کی تاثراتی تنقیدوں میں بھی انہی خصوصیت کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ا[نھوں] نے اپنے مخصوص انداز میں شعراء پر تنقید کرتے ہوئے ان کے شعری مزاج اور ادبی آدرش کے متعلق بعض آتنی جچی تلی اور تیر بہ ہدف رائیں دی ہیں کہ ان کی مثال ہمارے تنقیدی سرمائے میں شاذ ہی مل سکے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا احساس، فن کار کے شعو[ر] نہوں میں نفوذ کر کے اس کے صوتی ذوق، تخلیقی جوہر اور اس کی اصل شخصیت کو چھو لیتا ہے۔ فراق کا حسب ذیل بیان ملاحظہ ہو :

"مصحفی کے کلام میں بے پناہ اشعار نہ سہی، نرم نشتر نہ سہی لیکن شبنم کی نرمی اور شعلۂ گل کی گرمی کا ایسا امتزاج ہے جو اس کی خاص اپنی چیز ہے۔ اس کے یہاں تنقید حیات نہ سہی لیکن ایک مزاج حیات ہے اور یہ مزاج جاذب توجہ ہے ...... مصحفی محض ایک کمتر میر یا ایک کمتر سودا نہیں ہے وہ ہے مصحفی، اس کی شاعری ایک سچی شخصیت ہے۔ اس کی عروس سخن کے خدوخال جدا ہیں جس کے کول اور رسمسے گات میں نئی جاذبیت، نئی دلکشی، نیا سہاگ، اور نیا جوبن ہے ۔"

فراق نے اپنے ایک مضمون " غزل کی ماہیت اور ہئیت " میں وجدان کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ وہ شاعری میں وجدا[ن] کے مقام کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"غزل کا ہر اچھا شعر ایک مکمل وجدانیاتی اکائی ہوتا ہے اور ہر ایسی اکائی بیکران اور لامحدود ہوتی ہے۔ زندگی کے ایک غیبی نظام کی خبر دیتی ہے۔ غزل کے اشعار کی گہرائی یا ان کا وزن، یا ان کی اہمیت، علم و فلسفہ اور سائنس کے دلائل، نتائج یا دریافتوں یا اصولوں کی گہرائی، وزن، اہمیت سے زیادہ گہری، باوزن اور اہم ہوتی ہے۔ شاعری فلسفے سے زیادہ با اخلاق ہوتی ہے ...... جو اشعار غزل میں وہ اشعار زیادہ گہرے اور بامعنی ہوتے ہیں جن میں منطق، فلسفہ، علم اور استدلال وغیرہ کم ہوں اور وجدان محض یا خالص کیفیت زیادہ ہو ۔"

حاشیے میں فراق نے " عشقیہ شاعری کی پرکھ " کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اور سوقیت و روحانیت کا جو فرق نما[یاں] کرنے کی کوشش کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تنقیدی تصورات، وجدان اور جذبات کی رہنمائی میں آگے بڑھتے ہیں لیکن ان میں عقل کا ایک ہلکا سا عکس بھی نمایاں ہوتا ہے۔ فراق نے ایک مضمون میں خود اپنے ادبی مزاج کا اس طرح تجزیہ کیا ہے :۔

"میرے اندر غالباً جنم جنم کی روحانیت تھی جو بعد کو میری شاعری میں نمایاں ہوئی ....
میرے مزاج میں وجدانی اور جمالیاتی احساس کا عنصر غالب ہے لیکن عقلیت کا عنصر بھی اس عنصر کے ساتھ بہت زندہ شکل میں موجود ہے ۔"

کہیں کہیں "عقلی حسن" جسے فراق کے یہاں "دوئیت" حاصل ہے وجدانی اور جمالیاتی ذوق کے دوش بدوش نظر آتی ہے حالی کے تصورِ شعر کا تجزیہ کرتے ہوئے فراق نے اُن معاشرتی اور مادی عوامل کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے جو حالی کے شعور اور ان کے ادبی نظریات کی تشکیل میں اثر انداز ہوئے تھے۔ اپنی تنقیدوں میں فراق کہیں کہیں سوانحی، نفسیاتی، اور نسلی اثرات پر زیادہ زور دیتے ہیں ٹیگور کی نظموں میں "ہمہ اوست" اور "وحدت" کے تصورات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس طرح تجزیہ کیا ہے :-

"رابندرناتھ کی رگوں میں ہندو رشیوں کا خون موجزن ہے اور وحدت کی بلندی پر ان کے سر میں چکر نہیں آتا۔ کلام ٹیگور کا فلسفہ جاننے کے لئے رابندرناتھ کی ہندو نسلیت مد نظر رکھنی چاہیئے ان کی ہندو نسلیت کا اثر ان کے کلام پر ہونا ضروری ہے ۔"

فراق کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یورپین نقادوں سے کافی قریب ہیں۔ رومانی تنقید نے فراق کے ادبی مذاق کو بہت سے زاویوں سے متاثر کیا ہے۔ ان کے مضامین میں جو شعریت، جو جمالیاتی احساس کی بیداری، اور وجدان کی حسین اور البیلی فضاؤں میں کھو جانے کا رجحان ملتا ہے وہ اسی حقیقت کا غماز ہے۔ انگریزی نقادوں میں رومانی تحریک کے علمبرداروں نے فنِ تنقید اور وجدان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فراق کی تنقیدوں میں بھی یہی میلان دوسرے رجحانات سے زیادہ جاندار اور متحرک نظر آتا ہے خود فراق نے "اندازے" کے دیباچے میں لکھا ہے :-

"میرے مذاق پر دو چیزوں کا بہت اثر رہا ہے ایک تو خود میرے وجدانِ شعری کا، دوسرے یورپین ادب اور تنقید کے مطالعے کا۔ مجھے اردو شعراء کو اس طرح سمجھنے اور سمجھانے میں بڑا لطف آتا ہے، جس طرح یورپین نقاد یورپین شعراء کو سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اسی طرح ہمارے ادب کی مشرقیت اجاگر ہوسکتی ہے ۔"

کیٹس اور ورڈزورتھ سے اثر پذیری کا انہوں نے اکثر جگہ اعتراف کیا ہے ۔

فراق کی تنقیدیں نہ صرف زیرِ بحث شاعر کے فنی خدوخال کو نمایاں کر دیتی ہیں بلکہ شاعر کے ادبی شعور اور اس کی شخصیت اور مزاج کے بہت سے بھیدوں کو بھی کھولنے کی کوشش کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں بغیر کسی سوجھ بوجھ اور مطالعے کے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے اور نہ میکانکی طور پر وہ زبان اور فن سے متعلق خارجی انداز کی تنقید کرتے ہیں فراق کے سامنے بیک وقت شاعر کی ادبی بصیرت، اس کی انفرادی خصوصیات اس کا ذوقِ نغمہ اور اس کی تعمیری اور فنی ذکاوت اور گرد و پیش کے وہ سارے مادی اور سماجی حالات ہوتے ہیں جو فن کار کے نظریہ فن اور نظریہ حیات کو مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

فراق کی تنقیدوں کا ایک ذرا مدھم پہلو یہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی شاعرانہ حیثیت، ان کی تنقیدوں پر غالب آجاتی ہے۔ فراق کا تنقیدی اسلوب بڑا جاندار، رسیلا اور سبک رو ہے۔ ان کے اسلوب پر کسی اور کا گمان نہیں ہوسکتا۔ یہ طرزِ تحریر اپنی شعری نغمگیت اور بانکپن کے اعتبار سے ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ ان کی عبارتیں شعریت، کیف، شادابی اور ترنم سے لبریز ہوتی ہیں۔ فراق کے اندازِ نگارش میں جو رنگینی، بانکپن، نکھار اور جاذبیت ہے اس نے اردو تنقید نگاری کو ایک نیا انداز بخشا، اور ایک نئی لے عطا کی۔ فراق نے بہت سے ہندی الفاظ ہمارے تنقیدی سرمایے میں داخل کئے، اور اظہار کے بہت سے نئے پیکروں کو روشناس کرانے کی کوشش بھی کی ہے ۔ "کومل اور رسیلے گات" "نیا سہاگ" "جیتلی مسکراہٹ" "مزاج کی لچک جھک" "سج سبھاؤ" "تیور کا تیکھا پن" "ایک نرم اچانک پن" "نرم چنچلا پن" اور "دبی ہوئی تملاہٹ" فراق ہی کے ذریعے اردو ادب میں داخل ہوئے

اس قسم کے نئے نئے الفاظ اور مرکبات فعالانہ اور طرزِ ادا کی یہ جدت طرازی فراق ہی کا حصہ ہے اور اس سے ان کے ذوقِ تعمیر اور تخلیقی بصیرت کی غمازی ہوتی ہے۔ اظہار کے یہ سانچے اکثر جگہ فراق کی تنقیدوں کو زیادہ مکمل، بھرپور اور معنی آفریں بنادیتے ہیں لیکن نئے سانچوں کو برتتے اور نئے نئے الفاظ گھڑنے کا یہ طرز کہیں کہیں ان کے جملوں میں زیادہ خوشگوار اثر نہیں پیدا کرتا۔ مثال کے لئے یہ عبارت ملاحظہ ہو :—

"ان میں تحت نغمگی کی صنعت، ان کی متین و مہذب، بنرلہ سنجی ..... عشق کا پاکیزہ معیار جذبات کا انضباط، حسین سے حسین جھوٹ سے ان کا احتراز، رال ٹپکانے والی محبت .... غیر خود ارادہ لیلپاہٹ، آلودگی اور گلگلے پن سے اس جنسیت زدگی سے، جسے خدیو شعریت سچ اور استوار مزدوری ہے، لیکن جو رہتی ہے کبھی بھی فسانہ اعصاب کی حال ...."

اردو نثر کو فراق کی ایک دین یہ بھی ہے کہ انہوں نے انگریزی کے بہت سے ایسے الفاظ، اور مرکبات کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی جو انگریزی تنقید میں ایک خاص اصلاحی معنویت اور ایک مخصوص فضا کی ترجمانی کرتے ہیں۔ "کشفی پیکر"، "آہنگ یاسر"، "امید تا افزائی روح کی معنوم تابندگی و شفافی"، "... گزار فریب"، "سماجی مانسیہ"، "رومانی ناکامیاں" اور "نفوذ پذیری" ایسے مرکبات ہیں جو فراق ہی کے ذریعے اردو ادب میں منتقل ہوئے ہیں۔

فراق نے تشبیہوں کے استعمال سے عبارت کو دلکش اور شگفتہ بنانے کا ایک نیا انداز اردو نثر کو دیا ہے۔ فراق کی تشبیہیں نہ صرف ان کی تحریروں کو سنوارا اور نکھار دیتی ہیں بلکہ ان میں معنی اور بیان کی بعض وسعتیں بھی سمٹ آتی ہیں۔ ان استعاروں اور تشبیہات سے فراق کے فن میں ایک ... زینت پیدا ہو جاتی ہے، اور انھیں کے سہارے وہ اپنے خیالات کو زیادہ واضح اور موثر بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ ایک عبارت ملاحظہ ہو

"پانی میں مل کر جس طرح کنول کا پتہ یا روشنی کی چھوٹ آلودہ نہیں ہونے پاتی اسی طرح صوفی کی خلوت یا دل میں اگر نور صفا ہو تو وہ سب سے ملا بھی رہتا ...... اور سب سے جدا بھی رہتا ہے .."

فراق کے تنقیدی مضامین کا اسلوب بہت شگفتہ اور کومل ہے ان کے یہاں بجلیوں سے بھرے ہوئے ابر کی سی چکاچوند کر دینے والی کم برستے، اور زیادہ گرجنے کی کیفیت نہیں ملتی۔ فراق کے مضامین آہستہ آہستہ امرت کی پھوار برساتے اور چپکے چپکے دلوں کو کھلتے جاتے ہیں۔

انیل پرشاد جلیل

سکندر جاہ اور فضیلت النساء بیگم کی آل اولاد کا شجرہ

شہزادہ مبارز الدولہ کا تعارف

حیدرآباد دکن کے آصف جاہ ثالث میر اکبر علی خاں سکندر جاہ متوفی (۱۸۲۹ء) کے تیسرے فرزند اور آصف جاہ رابع میر فرخندہ علیخاں المعروف بہ ناصر الدولہ (متوفی ۱۸۵۷ء) کے سب میں چھوٹے برادر حقیقی کا نام شہزادہ میر گوہر علیخاں مبارز الملک تھا جو دکن کی تاریخوں میں مبارز الدولہ کے نام سے معروف ہوئے اور آج بھی اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہی ہے کہ انگریزوں کے عہد میں ہمارے ہاں جو تعلیمی نظام رائج ہوا وہ آج قومی نقطہ نظر سے متعدد اسقام و نقائص کا حامل اور اصلاح طلب ہے۔ برصغیر ہند و پاک کی سیاسی تاریخ کی مروجہ درسیات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ آزادی کے پندرہ برس بعد بھی وطن عزیز کی تاریخ کے طالب علم کے کان ان لوگوں کے ناموں سے قطعی ناآشنا ہوتے ہیں جنھوں نے انگریز دشمنی کی ایک مستقل تاریخ اپنے پیچھے چھوڑی ہے۔ اور چند اکابر معاندین کے سوا وہ بالکلیہ پردہ گمنامی میں ہیں۔ ان ہی ناموں میں ایک نام حیدرآباد دکن کے آصف جاہی شہزادے نواب مبارز الدولہ کا ہے۔

یہ ایک مسلّم الثبوت حقیقت ہے کہ شہزادہ مبارز الدولہ نے اپنی زندگی میں دو مرتبہ ۱۸۱۵ء اور ۱۸۳۹ء میں فرنگی اقتدار کی بنیادیں ہلا دینے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اور اگر حالات وقت ناساعد نہ ہوتے تو ان کی انقلاب آفریں جد و جہد سیلاب دکن میں انگریزی استبداد کے تنکے بس تم کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا۔

اس اجمال کی تفصیل سے یہاں غرض نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ مبارز الدولہ کے والدین سکندر جاہ اور فضیلت النساء بیگم[۱] کا شجرہ مرتب کر کے نذر ناظرین کیا جائے۔ راقم سطور شہزادہ موصوف کے حالات زندگی کا تحقیقی مطالعہ کر رہا ہے۔ زیر مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں ہی ان کی آل اولاد کے علاوہ ان کے والدین کی بھی اولاد کا یہ شجرہ مرتب کیا ہے۔ یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شجرہ کی ترتیب اور زیر نظر مضمون میں پیش کردہ مختصر احوال کے لئے تاریخ دکن کے نہایت معتبر و مستند ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

شہزادہ کی والدہ اور بھائی بہن

مبارز الدولہ کی والدہ کا نام فضیلت النساء بیگم[۲] عرف چاند بیگم[۳] اور بی بی صاحبہ[۴] خورشید تھا۔

۲۶۔ [illegible] مرتبہ شائع کردہ حیدرآباد ریکارڈ آفس ۱۹۵۲ ملاحظہ ہو۔ سکندر جاہ کا شجرہ ، ۳ تا ۵ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے

سکندر جاہ کثیر العیال تھے اور اس طرح شہزادے کے بھائی بہنوں کی تعداد خاصی تھی لیکن ان کے حقیقی بھائی دو[۲] تھے اور بہنیں بھی دو[۲] ہی تھیں چنانچہ "از جملہ ذکور و اناث صاحبزادہ بلند اقبال نواب مستطاب نواب ناصر الدولہ بہادر و جمال النساء بیگم صاحبہ و کمال النساء بیگم صاحبہ از بطن عطر و فضیلت النساء بیگم صاحبہ بوجود آمدند"[۵]

ناصر الدولہ سکندر جاہ کے سب میں بڑے فرزند تھے (تخصیص از صاحبزادگان میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ[۶]) اور وہی ان کے جانشین ہوئے صمصام الدولہ چاندنی بیگم کے منجھلے صاحبزادے تھے اور مبارز الدولہ تیسرے اور آخری شہزادے۔ جمال النساء بیگم نظام کی اولاد میں سب سے بڑی اور کمال النساء بیگم چاندنی بیگم کی سب میں چھوٹی صاحبزادی تھیں۔

افسوس کہ کسی بھی معاصر تاریخ میں ان پانچوں بہن بھائیوں کی صحیح ترتیبِ ولادت کا پتہ نہ چل سکا اور متضاد معلومات حاصل ہوئیں۔ چونکہ ہم نے اپنی زیر مطالعہ شخصیت مبارز الدولہ کا سنِ تولد تحقیق سے متعین کیا ہے اس لئے اولاً اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے اور اسی کی روشنی میں دیگر ارکان خانوادہ کے سنین پیدائش کا تعین کیا جاتا ہے

مبارز الدولہ کا سالِ ولادت

ان کی معاصر اور بعد کی وحالیہ تاریخوں میں ان کی پیدائش کے جو سال لکھے گئے ہیں وہ باہم دیگر قابلِ لحاظ تفاوت کے حامل ہیں اور ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء[۹] (۲) ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۰ء[۱۰] (۳) ۱۲۱۴ھ م ۱۷۹۹ء[۱۱] (۴) ۱۲۱۰ھ م ۱۷۹۵ء[۱۲] (۵) ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۰ء[۱۳] (۶) ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۰ء[۱۴] (۷) ۱۲۱۰ھ م ۱۷۹۵ء[۱۵]

۴۔ حیدرآباد کرانالاجی ص ۱۹۶۔ نیز معظم الدولہ بدرالدین خاں شجرۂ آصفیہ۔ مرتبہ ماہ ربیع الاول ۱۲۵۲ھ م مارچ ۱۸۳۶ء۔ تکملہ و تحقیقہ از نواب منظور جنگ بہ سن ۱۳۰۱ھ م ۱۸۸۴ء اشاعت کردہ حکیم سید شمس اللہ قادری حیدرآباد ۱۹۲۸ ص ۵۵

۵ شجرۂ آصفیہ ص ۵۵ ۶ شجرہ اور کرانالاجی میں مطبوعہ سکندر جاہ کی آل و اولاد کے شجرے ملاحظہ ہوں ۷، ۸ خواجہ غلام حسین الملقب بہ خانی زمان خاں۔ تاریخ گلزار آصفیہ مؤلفہ بہ سن ۱۲۵۸ھ م ۱۸۴۲ء مطبوعہ حیدرآباد ۱۸۹۳ ملاحظہ ہو ص ۱۳۳

۹ سید التفات حسین خاں، نگارستان آصفی مصنفہ ۱۸۱۶ء۔ عزیز جنگ ولا کے اہتمام میں ان کے رسالہ کے ساتھ شائع ہوئی محبوب السیر بانگارستانِ آصفی۔ اس تاریخ کے ص ۲۲۱ پر "بہ عمر بست سال" لکھا ہے۔ چنانچہ سن تصنیف ۱۸۱۶ء کے لحاظ سے اس کے نزدیک مبارز الدولہ کے تولد کا سال ۱۷۹۶ء معلوم ہوتا ہے۔

۱۰ نگارستانِ آصفی۔ اسی صفحہ ۲۲ پر یہ سن بھی لکھا گیا ہے۔

۱۱ شجرۂ آصفیہ ص ۶۴

۱۲ وہابی تحریک ۱۸۳۹ء کے سرکاری تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ PROCEEDNES سکشن ۱۷۴
بحوالہ فریڈم سٹرگل ان حیدرآباد ج ۱ ص ۱۶۳

۱۳ کرانالاجی، شجرہ سکندر جاہ

۱۴ فریڈم سٹرگل ان حیدرآباد ج ۱۔ مرتبہ و شائع کردہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد ۱۹۵۶ ص ۱۲

۱۵ [illegible]

ان حوالوں سے یہ ظاہر ہے کہ شہزادے کی ولادت (ا) ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں یا (ب) ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۰ء میں ہوئی تھی، کیونکہ اکثر ماخذ میں یہی تاریخیں لکھی گئی ہیں اور باقی میں کسی ایک کا یہی سال لکھا گیا ہے۔

وثوق و قطعیت کے ساتھ کسی ایک سن میں ان کی پیدائش قرار دینے سے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا پڑتا ہے کہ دکن کی تاریخوں میں نمایاں طور پر مبارز الدولہ کا نام پہلی دفعہ ۱۸۱۵ء م ۱۲۳۰ھ کے ایک محاربہ کے سلسلہ میں لیا جاتا ہے جس میں انہوں نے انگریز رزیڈنٹ کی ایک ہزار سپاہ کے مسلح دستہ کو اپنی کوٹھی کے قریب شکست فاش دی تھی۔ اگر ۱۸۰۰ھ م ۱۲۱۵ کو شہزادے کا سال تولد قرار دیا جائے تو یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ ایک پندرہ سالہ کم عمر شہزادے نے دفاع و محاربہ کا ایسا زبردست انتظام کیا ہوگا، جبکہ ایک بیس سالہ شہزادے سے یہ کچھ غیر متوقع نہیں۔ اس لئے ہماری رائے میں ۱۲۱۰ھ م ۱۷۹۵ء ہی مبارز الدولہ کا سن تولد قرار پاتا ہے۔

اولاً مبارز الدولہ کے سن ولادت پر ہم نے اپنی تحقیق اس لئے پیش کی کہ اس جدید تعین کے بعد ان کے بہن بھائیوں اور خود والد سکندر جاہ کی عمروں اور سالہائے پیدائش میں تبدیلی ناگزیر ہوگئی ہے۔ اب ہم سلف سے خلف کی طرف آنے کی بجائے نیچے کی پیڑی سے اوپر کی پشت تک چلیں گے اور اسی ترتیب سے سن پیدائش کی تفصیل پیش کریں گے۔

نواب صمصام الدولہ کا سن ولادت

(۱) ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۵ء[17] (۲) ۱۲۱۱ھ م ۱۷۹۶ء[16] (۳) ۱۲۱۱ھ م ۱۷۹۰ء[15] ان کا سال تولد خواہ ۱۷۹۵ء قرار دیا جائے یا ۱۷۹۶ء سے مبارز الدولہ کے سال پیدائش کے مطابق کرنا ہوگا۔ یہ واقعہ ہے کہ منقولہ بالا سنین کا اختلاف زیادہ اہم نہیں اور ہماری رائے میں ۱۷۹۶ء کو ان کی ولادت کا سال قرار دینا قرائن سے بھی درست معلوم ہوتا ہے چونکہ :۔

(ا) صمصام الدولہ کا یہ سن پیدائش مبارز الدولہ کے متعین شدہ سال تولد سے بعد کا ہے اور تمام تاریخیں اس پر متفق ہیں کہ یہ مبارز سے بڑے تھے۔ اس لئے ان کی پیدائش کے اس سال کو بدلنا ہوگا۔ (ب) ۱۷۹۷ء اور ۱۸۰۰ء سنین تولد کی صورت میں بالترتیب صمصام و مبارز الدولہ کی عمروں میں تین برس کا فرق تھا اس لئے تبدیل شدہ صورت میں یہ تفاوت برقرار رہنا چاہیئے۔ (۳) مبارز الدولہ کا متعینہ سن تولد ۱۸۰۰ء سے پانچ سال کم ہے۔ اس لئے سکندر جاہ کی ولادت کے سن کو بھی بقدر پانچ برس پیچھے ہٹانا ہوگا اور اس طرح دونوں کی عمروں کا فرق باقی رہے گا لہٰذا صمصام الدولہ کا سال ولادت ۱۷۹۲ھ م ۱۲۰۶ھ قرار پاتا ہے۔

ناصر الدولہ کا سن پیدائش

تاریخیں متفق ہیں کہ یہ ۱۲۰۸ھ م ۱۷۹۳ء میں پیدا ہوئے[19]۔ اس سال کو صمصام الدولہ کے سال تولد ۱۷۹۲ء م ۱۲۰۶ھ سے تین برس پیچھے کرنا ہوگا کیونکہ دونوں کی عمروں میں یہی فرق تھا۔ اس طرح ناصر الدولہ کا سن تولد ۱۷۸۹ء ہوگیا۔

کمال النساء بیگم کا سال ولادت

(۱) ۱۲۰۲ھ م ۱۷۸۸ء[20] (۲) ۱۳۰۲ھ م ۱۷۸۸ء[21]۔ چونکہ اس سن اور ناصر الدولہ کے متعینہ پیدائش ۱۲۰۸ھ میں چھ سال کا تفاوت ہے۔ اس لئے ناصر الدولہ کے جدید متعینہ

---

[15] نگارستان ص ۲۲ [16] شجرۂ آصفیہ ص ۹۱ [17] کرانا لاجی صاحب شجرۂ سکندر جاہ
[18] نگارستان ص ۲۱ شجرۂ آصفیہ ص کرانا لاجی کا شجرہ۔ نیز ملاحظہ ہو :- لچھمن لال شاہ جہاں پوری۔ تاریخ یادگار لچھمن لال مصنفہ سن ۱۲۱۱ھ م ۳۲ء شائع کردہ مطبع ... حیدرآباد صفحات ۱۷ و ۱۸
[19] شجرۂ آصفیہ ص [20] ... صاحب شجرہ

سال پیدائش ۱۷۹۹ء سے چھ برس ہٹا کر ۱۷۹۳ء م ۱۲۰۹ کیا جاتا ہے۔

سکندر جاہ کا سن پیدائش

ہمارے زیر استفادہ دونوں شجروں میں ان کی ولادت ۱۱۸۲ھ م ۱۷۶۸ء کی بتائی گئی ہے اس میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں مگر چونکہ شہزادی جمال النساء بیگم کے سابقہ سال پیدائش ۱۲۰۳ / ۱۷۸۸ء کو تبدیل کر کے ۱۱۹۷ھ م ۱۷۸۳ء قرار دینے کے سبب سکندر جاہ اور ان کی ان بڑی صاحبزادی کی عمر کا پچھلا فرق باقی نہ رہا بلکہ پندرہ سال ہو گیا اس لئے خود سکندر جاہ کے سال ولادت کو پیچھے ہٹا کر ۱۷۶۳ء مطابق ۱۱۷۷ھ کر دیا جاتا ہے۔ سکندر جاہ اور ان کی مذکورہ اولاد کی پیدائش کے سنین میں جو تغیر و تبدیل کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ان سب کی عمروں کے باہمی فصل اور تفاوت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ سکندر جاہ کے ذکر کے ضمن میں راقم افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ باوجود تلاش و تحقیق کے ان کی محل اور ان کی زیر تذکرہ اولاد کی والدہ حقیقی چاندنی بیگم کی ولادت و رحلت وغیرہ کے سن معلوم ہو سکے (اور نہ ہی ان کے احوال زندگی کا پتہ چل سکا)

شہزادی کمال النساء بیگم کا سن تولد

۱۸۲۹ کی شورش عرب و افاغنہ کے عینی شاہد و تذکرہ نگار کرنل ٹیلر نے کلیانی ضلع بیدر شریف پر اپنی تعیناتی کے زمانہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ناصر الدولہ کی تخت نشینی (۱۸۲۹) کے زمانے میں وہ قلعہ کلیانی پر متعین تھے۔ ٹیلر نے لکھا ہے کہ ایک شام ان کے خیمہ پر پالکی میں سوار ایک جوان العمر معزز خاتون اپنے خدام کے ہمراہ اچانک وارد ہوئیں۔ اور اپنے شوہر کے سب و شتم کا شکوہ کرتے ہوئے خواہش کی کہ ٹیلر ان کی حیدرآباد کو روانگی کا بحفاظت انتظام کریں جس کی ٹیلر نے فی الفور تعمیل کی۔ یہ جوان العمر خاتون کون تھیں؟ یہ تھیں ناصر الدولہ کی سب میں چھوٹی ہمشیرہ اور نواب کلیانی کی محل۔

یعنی کلیانی کے نواب چیناصاحب کی محل اور فضیلت النساء بیگم کی سب میں چھوٹی صاحبزادی کمال النساء بیگم۔ خود ان کے بیان منقولہ ٹیلر سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنے حقیقی بھائی بہنوں میں سب میں چھوٹی تھیں۔ اس واقعہ کے وقت وہ تیس برس سے زائد عمر کی نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ ٹیلر کے انداز تحریر و بیان سے یہی مترشح ہے۔ اس طرح ممکن ہے وہ ۱۸۰۰ کے قریب اور اغلباً اس کے بعد کسی قریبی سال میں پیدا ہوئی ہوں۔ ۱۸۰۰ م ۱۲۱۵ کے بعد ان کی پیدائش پر شجرہ آصفیہ ان الفاظ میں صاد کرتا ہے کہ "صبیۂ دوم سکندر جاہ مرحوم موسومہ کمال النساء بیگم از بطن چاندنی بیگم در سنہ ۱۲۰۵ یک ہزار و دو صد و پنج ہجری تولد شد" ۲۴

معظم الدولہ بدر الدین خاں کے مرتبہ اس شجرۂ آصفیہ کا منصور جنگ نے ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴-۸۵ء میں جو تکملہ و تتمہ لکھا اس میں منقولہ بالا فقرے پر موخر الذکر نے یوں اضافہ کیا ہے۔ "در ۱۲۰۰ یک ہزار و دو صد انتقال نمود"۔ ظاہر ہے کہ یہ کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ شجرہ آصفیہ کے فاضل مرتب حکیم سید شمس اللہ قادری جیسے دقیق النظر مورخ اور اہل بصیرت محقق نے شجرہ آصفیہ کی اس اہم فرد گزاشت کی اصلاح پر کوئی توجہ نہیں کی۔

بہ نظر سہولت شجرے ایک جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

---

۲۲ شجرہ آصفیہ ص ۵۲ نیز گرانا بی کا شجرہ ۲۳ کرنل میڈوز ٹیلر۔ انگریزی آپ بیتی موسومہ سٹوری آف مائی لائف مسعود یونیورسٹی پریس ۱۹۲۰ ص ۵۱-۵۲ ۲۴ شجرہ آصفیہ ص ۸۔

سکندر جاہ

ولادت : ١٧٦٣ء م ١١٧٦ھ

انتقال شانزدہم ذی القعدہ ١٢٤٤ھ م[1]

بدھ ٢٠ مئی ١٨٢٩ء

عمر : ٦٦ سال

تخت نشینی : ٢٠ ربیع الثانی ١٢١٨ھ م

منگل ٨ اگست ١٨٠٣ء

جمال النساء بیگم

ولادت : ١٨٠٣ء

انتقال : سوم رجب المرجب ١٢٧١ھ م[3]

جمعرات ٢٢ - مارچ ١٨٥٥ء

عمر : ٥٢ برس

محل : رفیع الملک رفیع الدولہ محمد تاج الدین خاں بہادر نصیح جنگ[4]

ناصر الدولہ

ولادت : ١٧٨٩ء

انتقال : ٢٢ رمضان ١٢٧٣ھ م[5]

اتوار ١٠ - مئی ١٨٥٧ء

عمر : ٦٨ سال

تخت نشینی : ١٩ - ذی قعدہ ١٢٤٤ھ م[6]

شنبہ ٢٣ - مئی ١٨٢٩ء

صمصام الدولہ

ولادت : ١٧٩٢ء

انتقال : ٩ - جمادی الاول ١٢٩٣ھ م[7]

اتوار ٢ جولائی ١٨٧٦ء

عمر : ٨٤ سال

شہزادہ مبارز الدولہ

ولادت : ١٧٩٥ء

انتقال کی تاریخیں

١ - ٢٥، ٢٦ - جون ١٨٥٤ء کی درمیانی شب[8]

٢ - ٢٥ - رمضان، ١٢٧٠ھ م[9]

٣ - ٢٧ - رمضان، ١٢٧٠ھ م[10]

٤ - ٢٤ - جون، ١٨٥٤ء[11]

گویا ان کا انتقال رمضان ١٢٧٠ھ م جون ١٨٥٤ء کے اواخر میں ہی ہوا

عمر : ٥٩ سال

کمال النساء بیگم

ولادت : ١٨٠٥ء

انتقال اور عمر کا تاریخوں پر کوئی اندراج نہیں ملا۔

محل : ممتاز الامراء معین الدین حسین خاں المعروف ضیا صاحب پسر دوم ممتاز الامراء امتیاز الدولہ[12]

---

١ شجرۂ آصفیہ ص٥٥ ٢ ایضاً ص٥٥ ٣ شجرۂ آصفیہ ص٥٨ ٤ ایضاً

٥ شجرۂ آصفیہ ص٥٥ ٦ ایضاً ٧ شجرۂ آصفیہ ص٥٩

٨ مراسلہ ریذیڈنٹ بنامی موسومہ معتمد گورنر جنرل برائے امور خارجہ مورخہ ٢٦ جون ١٨٥٤ء۔ ماخوذ از ریذیڈنسی ریکارڈس ج ٩٣ ١٨٥٤ء و ٥٥ء

٩ محمد امام خاں۔ تاریخ خورشید جاہی فلسفہ بہ سن ١٢٦٨ مطبوعہ حیدرآباد ١٨٧٠ ص٢٥٢

١٠ شجرۂ آصفیہ ص٦٣

١١ گرانا جی ٢٧٤

١٢ شجرۂ آصفیہ ص٦٠

ہما میرٹھی

مکاتیب شاکر میرٹھی

قارئین سب رس نے مکاتیب شاکر کے سلسلہ کو پسند کیا لہٰذا منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کے کچھ مزید خطوط پیش کر رہا ہوں۔

کاشانۂ ادب لکھنؤ۔ ۱۶ر فروری سنہ ۱۹۴۲ء

مکرمی تسلیم، آپ کا خط مل گیا تھا مگر مجھ کو دوسرے ہی دن ایک ضروری کام سے بریلی جانا پڑ گیا۔ کل واپس آیا ہوں۔ میرا سامان ابھی تک بمبئی سے نہیں آیا ہے۔ اس لیے بے سروسامانی کا سامنا ہے۔

عابد صاحب نے میری عمر جو بتائی ہے اس کو قریب قریب ٹھیک ہی کہا جا سکتا ہے۔ ۲۰ر مارچ کو میں ۶۴ برس کا ہو جاؤں گا۔

آپ کے خاندانی کوائف پڑھ کر خوشی ہوئی لیکن افسوس ہے کہ مجھے اپنی عمر میں آپ کے نانا اور نانی نیز والدہ صاحبہ کا کلام دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ کیا آپ تھوڑا بہت کلام ارسال فرما سکتے ہیں مسیحی شعرا کا ایک تذکرہ زیر ترتیب ہے۔ اس کے لیے اگر ہر سہ حضرات کا کلام و حالات مرحمت فرمائیں گے تو باعث شکریہ ہوگا۔

میری تصنیف و تالیف کی ۲۵ سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ وقت فرصت میں ان کے نام اور ملنے کا پتہ لکھ بھیجوں گا۔ ان میں سے بیشتر کتب صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ باقی خیریت ہے۔ فقط تسلیم

نیازمند۔ پیارے لال شاکر

کاشانۂ ادب لکھنؤ: ۲۳ر فروری سنہ ۱۹۴۲ء

مکرمی تسلیم: لفافہ مل گیا۔ شکریہ۔ امید ہے کہ آپ بہت جلد اپنے بزرگوں کے حالات سے مستفیض فرمائیں گے

اسبق صاحب کو میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ بہت اچھے اور مشاق شاعر ہیں پتہ یہ ہے پادری رابرٹ گارڈنر اسبق۔ کاسگنج ضلع ایٹہ۔ یو۔ پی۔

آج کل میں لکھنؤ کے محلہ آبنوں رخانہ میں مقیم ہوں۔ مسیحی شعرا میں مسٹر جے آر پال نادر اور میرا الیاس داس رسا ممتاز شخصیتیں ہیں۔ نادر صاحب کا قیام کانپور میں ہے اور رسا صاحب امرتسر میں ہیں۔ میرا تعلق کسی اخبار یا رسالے سے نہیں۔ اپنا پرچہ "زندگی" کے نام سے نکالتا تھا جو کاغذ کی کم یابی کے باعث بند ہے۔ تصنیف اور تالیف میرا مشغلہ ہے۔ بمبئی سے کچھ کام لیا ہوں اسی میں لگا ہوا۔

فقط۔ تسلیم

نیازمند

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

لکھنؤ۔ ۱۱ر مارچ ۴۴ء

مکرمی تسلیم، برتھ ڈے کارڈ کا دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۳ر کو ۳ ر پڑھ لیا۔ میری تاریخ پیدائش ۱۳ر مارچ ہے۔ آپ نے اپنے بزرگوں کا کلام بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ امید ہے کہ اس کو بھولے نہ ہوں گے۔ اس کے لیے میں بیتابی سے منتظر ہوں۔ باقی سب خیریت ہے۔ فقط تسلیم۔

نیازمند۔ پیارے لال شاکر

لکھنؤ: ۲۷ر مئی ۴۴ء

مکرمی تسلیم، نوازش نامہ موصول ہوا شکریہ۔

عابد صاحب سے میرے بہت دیرینہ مراسم ہیں۔ اگرچہ ہم دونوں میں بہت کم خط و کتابت ہوئی ہے۔ لیکن روحانی رشتہ بدستور قائم ہے۔ مسیحی پرچوں میں کوئی ایسا پرچہ نہیں ہے جس کو معیاری کہا جاسکے۔ زبان کے نقطہ نگاہ سے اخوت کا دم غنیمت ہے جن پرچوں کے نام آپ نے لکھے ہیں بعض کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں ایک ترجمہ میں مصروف ہوں۔ ۱۵ر جون کے بعد اس سے فراغت ہوگی۔ تب کچھ لکھ سکوں گا۔ آج کل معذور ہوں۔

تصویر ڈھونڈھنے پر ایک کاپی نکل آئی وہ ارسال خدمت ہے۔ یہ تصویر یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو اتاری گئی تھی۔

باقی خیریت۔ فقط تسلیم۔　　　　نیازمند۔ پیارے لال شاکر

مکرمی تسلیم: خط مل گیا۔ شکریہ۔ ابھی تک تو مسٹر ای ایم لال یہاں تشریف لائے نہیں۔ میری حالت بدستور ہے۔ یوں کوئی شکایت بھی نہیں۔ وہی پرانے روگ بدستور قائم ہیں۔ کبھی کبھار زور بڑھ جاتا ہے۔ چلتا پھرتا ہوں مگر تکلیف کے ساتھ ویسے "تیمور لنگ" ہو چکا ہوں۔ باقی امور کے متعلق جب آیئے گا زبانی بات چیت ہوگی۔ کانپور میں بہت زوردار مشاعرہ ہوا۔ زیبا، احمق، عابد اور شارق باہر کے شعرا میں ممتاز تھے۔ نادر صاحب مشاعرے کے صدر تھے۔ انتظام انھیں کی امت کے ہاتھوں میں تھا مجھے عمداً بائیکاٹ کیا گیا۔ عام دعوت نامہ بھی میرے نام نہیں۔ بہرحال آج کل یہیں مقیم ہیں دو ایک دن میں واپس امرتسر جائیں گے

باقی خیریت ہے۔ فقط تسلیم　　　　نیازمند۔ پیارے لال شاکر

کرسچن بستی۔ دریا گنج۔ دہلی۔ ۱۸-۶-۴۶

مکرمی تسلیم، یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمایئے۔

نور افشاں میرے پاس تو آتا نہیں۔ ایک مہربان نے میرے دیکھنے کو بھیجا۔ میں آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آپ کا خط مل گیا مسیحی شعرا کے تذکرہ کا تمام مواد میرے پاس محفوظ ہے۔ کاغذ کی کمیابی کے باعث اس کی تکمیل کھٹائی میں پڑ گئی۔ تاہم میں اس کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ بدستور شعرا کے حالات و کلام کی تلاش و فراہمی جاری ہے۔ اس سلسلہ میں جو بھی امداد آپ فرمائیں گے موجب شکریہ ہوگا۔ تائب اور اختر صاحبان کا کلام میرے پاس نہیں ہے۔ تائب کے فرزند کو ایک بار لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔

میں پھر کو یہاں سے آگرہ جارہا ہوں اور شاید ۲۵ر یا ۲۶ر کو واپس ہوں گا۔ اس کے بعد آپ شوق سے دہلی تشریف لایئے۔ آج کل

چھٹی کے دن ہیں۔ کیوں نہ آگرہ تشریف لائیے۔ ایک ہفتہ دو کا ج۔ آگرہ کی بھی سیر کیجیے اور مجھ پر بھی احسان فرمائیے گا۔

ڈاکٹر صادق کا موجودہ پتہ تو مجھے معلوم نہیں اور نہ مجھے اس کی اطلاع ہے کہ وہ دھنباد سے چلے گئے ہیں۔ میں نے انھیں انویٹیشن اس پتہ پر بھیجا ہے۔ ڈاکٹر ایل صادق گورنمنٹ اسکول آف مائینز۔ دھن باد (ایسٹ انڈیا ریلوے)

ابھی تو بمبئی جانے کا قصد نہیں ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جانے کا ارادہ ضرور ہے۔ باقی خیریت۔ فقط تسلیم

نیازمند۔ پیارے لال شاکر

(نوٹ۔ اس خط کے ہمراہ ایک دعوت نامہ تھا جس میں ان کے بیٹے مہندر کمار کی شادی کرشچینا جوائس فرانسس سے سی ایم ایس چرچ کنڑو آگرہ میں بتاریخ ۲۴ جون ۱۹۴۶ء شام کے ۵ بجے منعقد ہونے کا ذکر تحریر تھا۔)

۹-۷-۱۹۴۶

مکرمی تسلیم۔ آگرہ سے واپسی پر آپ کا خط موصول ہوا۔ شادی ۲۴ جون کی بجائے ۲۸ کو ہوئی اور ہم لوگ ۳۰ کو دہلی واپس پہنچے۔ میں صرف چند گھنٹے ایک ہفتہ وار اخبار میں کام کرتا ہوں۔ آپ شوق سے تشریف لائیں۔ دریا گنج میں عیسائی بستی دریافت کر لیجیے۔ اگر میں اتفاق سے اس وقت موجود نہ ہوا تو آپ کچھ دیر انتظار کر سکتے ہیں۔

ترجمہ سے اصل کتاب کی فروخت پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑتا۔ اگر کتاب کا کاپی رائیٹ مصنف کے پاس ہے تو مصنف سے ورنہ ناشر سے اجازت لیا جانا از بس ضروری ہے۔ لیکن ہندوستان میں بہت کم اجازت حاصل کی جاتی ہے۔ ابھی تک اس سلسلے میں کسی نے کسی ہندوستانی پر نالش وغیرہ نہیں کی لیکن احتیاط ضروری ہے۔ باقی خیریت۔ فقط تسلیم

نیازمند۔ پیارے لال شاکر

کرشچن بستی۔ دریا گنج۔ ۱۶-۱۰-۴۶

مکرمی تسلیم: یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمائیے۔ اس سے قبل آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ میری غیر حاضری میں آیا ہو، اور کسی بچے کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ شوق سے دیوالی کے ایام میں تشریف لائیے۔ مگر ایک کارڈ کے ذریعہ مطلع فرما دیجیے گا تاکہ میں اس روز موجود رہوں۔ رام بابو سکسینہ صاحب کی کتاب میرے پاس موجود ہے جو انھوں نے تحفۃً ارسال کی تھی۔ اس کتاب کی تیاری میں مجھ سے کافی مواد انھیں ملا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے شکریہ ادا کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ عابد صاحب جہاں تک مجھے علم ہے آنریری طور پر بشارت کی مدد کرتے ہیں۔ انھوں نے صادق اور ذاکر سے منظومات کی استدعا کی تھی۔ فقط تسلیم

نیازمند۔ پیارے لال شاکر

کرشچن بستی۔ دریا گنج دہلی۔ ۴-۱۰-۴۶

مکرمی تسلیم۔ یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ شاید میرا خط آپ کو ملا نہیں۔ گم ہو گیا۔ بلکہ ایک معنی میں اپنے دل میں نادم تھا کہ شاید آپ کا یہ خیال ہو گا کہ میں نے عمداً جواب نہیں دیا۔

میں نے ادبی دنیا میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا خاندان گارڈنر کے اردو شعراء۔ یہ مضمون تین قسطوں میں شائع ہوا۔ سکسینہ صاحب

اول قسط میں سے جستہ جستہ واقعات اور باقی دو قسطیں سالم ترجمہ کر کے اپنی کتاب میں شامل کر لی ہیں۔ بی گارڈنر اور آر گارڈنر کے سالم حالات اور دانیال گارڈنر کے بیشتر حالات میرے مضامین سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے بیکار محنت کی کہ اسپتی سبق کے حالات کو ترجمہ کیا۔ اب ارادہ کر رہا ہوں کہ اس سلسلہ کی آخری قسط بھی لکھ ڈالوں مگر سامان بمبئی میں ہے اس لیے اب تک نہ لکھ سکا۔ خصوصاً ایلن گارڈنر صاحب محو کے حالات و کلام اب تک پبلک کی خدمت میں پیش نہ ہو سکے۔ ان مضامین کی اشاعت کے بعد مجھے بہت سا کلام محو صاحب کا دستیاب ہوا تھا جس کو میں نے اپنے مضمون میں شامل کر لیا تھا۔ سکینہ صاحبہ نے بھی اس کو اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔

باقی خیریت ہے۔ فقط تسلیم

نیازمند۔ پیارے لال شاکر

کرشن بستی۔ دریا گنج۔ دہلی۔ ۱۷-۵-۴۸

مکرمی تسلیم۔ یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمایئے۔ بفضلہ اچھا ہوں۔ اور زندہ ہوں۔ پاکستان کے حالات درست ہونے دیجئے۔ ہندوستان میں بھی مسیحی پریشان ہیں۔ سکون و اطمینان ہو جائے تو کسی نئی تحریک کو پیش کرنا زیادہ مناسب ہوگا میں خدمت کے لیے تیار ہوں۔

اگر رلجیس بک سوسائٹی میں مجھے کوئی جگہ مل سکے تو اس سے بہتر صورت میرے لیے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ مگر میری سفارش کرنے والا کون ہے اور ویسے بھی ۶۰ برس کے بڈھے کو کون گھاس ڈالتا ہے؟

امسال بھی دہلی میں رہوں گا۔ گرمیوں میں باہر جانا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مگر کوشش میں ہوں کہ ایک ہفتہ کے لیے بمبئی جا سکوں تاکہ وہاں سے ضروری کتب و کاغذات وغیرہ لے آؤں۔ جن کے بغیر بہت کچھ نقصان ہو رہا ہے۔

تسلیم صاحب سے دوسرے ہی دن ملاقات ہوئی تھی۔ کہتے تھے کہ بھابی صاحبہ علیل ہیں اس لیے مجھے جانا پڑ گیا۔ اس کے بعد پھر نہیں آئے۔

ہوے وید صاحب کو پہنچا دیئے ہیں۔ امید ہے کہ دوا جلد تیار ہو جائے گی۔ وظیفہ کی کوشش کروں گا۔ مطمئن رہیں۔ تین غیر مطبوعہ غزلیں ارسال خدمت ہیں۔ آج میں نے ایک ایک غزل اخوت اور صلیب کو بھی بھیجی ہے۔

المائدہ کو میری کوئی غزل نہ بھیجئے گا۔ یہ میرا عہد ہے۔ ہاں ایک بات اور بتا دوں۔ میں شہرت پسند نہیں ہوں اس لیے میں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی وہ لقب نہیں لکھے جو مجھے اساتذہ لکھنؤ اور احباب لاہور کی طرف سے عنایت ہوئے تھے یعنی "ادیب العصر" اور "لسان الہند" مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ نام کے ساتھ انھیں بھی لکھنا چاہیئے۔

باقی خیریت ہے۔ فقط تسلیم

نیازمند

پیارے لال شاکر

ڈاکٹر شیو نارائن کھنہ

قومی یک جہتی

یہ مضمون اصل میں "ریویو آف ریویوز" لندن میں ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا اور مضمون نگار کو اس پر طلائی تمغہ بھی ملا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت ایم اے میں زیر تعلیم تھے۔ وہ اب بھی بقید حیات ہیں۔ نیشنل انٹی گریشن کانفرنس کے موقع پر انھوں نے پھر اس کو تازہ کیا۔ ایک نقل مجھے بھی مرحمت کی جو مع ترجمہ سب رس کے لیے ملفوف ہے۔　　دلدار حسین

۱۔ میں ایک واحد سالم غیر منقسم ہندوستان پر فخر کرتا ہوں۔
۲۔ میں مادر ہند کے سامنے سربسجود ہوں کہ جس کے کروڑوں بچے اس میں عقیدت کلی رکھتے ہیں۔
۳۔ میں مادر ہند کے مقدس روحانی مشن مقصد اعلیٰ و افضل پر ایمان رکھتا ہوں۔
۴۔ مجھے ہندوستان کی فنافی القوم جانبازوں اور روحانی ہستیوں پر بجا فخر ہے۔
۵۔ میں ناقابل تسخیر مادر ہند پر سر افتخار بلند کرتا ہوں کہ جس کی دنیا بھر میں سب سے اونچا مقدس پہاڑ حفاظت کرتا ہے (جسے آج چینی اپنا بتاتے ہیں۔ ایڈیٹر)
۶۔ تقدس مآب بحر ہند کو میں سلام کرتا ہوں کہ جس کی گود میں میری مادر وطن پل اور پھل پھول رہی ہے۔
۷۔ مجھے مادر ہند کے قدرتی مناظر پیارے پیارے پھولوں اور ندیوں سے عقیدت ہے کہ جو یہاں بہشت بریں کا سماں باندھ رہی ہیں۔
۸۔ مجھے مادر ہند کے تقدس عظمیٰ پر فخر ہے کہ جس کا ہر ذرہ نورانیت میں ذات حق کا مظہر ہے۔
۹۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس سرزمین مقدس پر ہو گزرنے والے تمام فرزندان ہند کی خاک پاک الواع اقسام کے اجناس و پھلوں میں ہوا پانی و مٹی بن کر سب کے خون میں بشکل زندگی دوڑ رہی ہے۔
۱۰۔ میں تمام پیشرو ہستیوں کا گوشت پوست ہوں۔ میری ہڈیوں میں ان سے ہاڑ اور گوشت میں ان کا گوشت شامل ہے۔
۱۱۔ تمام دور سلف کے ہندوستانیوں کی جسم و جان کا میں مجسمہ ہوں اور تمام جاتیاں میری ذات خاص سے وابستہ ہیں۔
۱۲۔ بلا خیال مذہب و ملت ذات پات برادری مادر وطن کے تمام فرزند میرے اپنے بھائی برادر ہیں۔
۱۳۔ میں جیتی جاگتی ہندوستانی قوم کو جو اپنے بچوں کو عزیز رکھتی ہے تمام دوسری تعلق داریوں سے بالا و برتر سمجھتا ہوں۔
۱۴۔ مجھے ہندوستان کے سنہرے ماضی اور شاندار مستقبل پر یقین ہے۔

۱۵۔ میں ہندوستان کی حق پسندی اس کی جاں بازی اور وفاداری کو ہی مردانگی سمجھتا ہوں۔

۱۶۔ نیکی نیک نیتی رحم دلی پاکیزگی قربانی ایثار کو میں نسوانیت وطنی کا زیور سمجھتا ہوں۔

۱۷۔ میں اس ہندوستان کا پرستار ہوں کہ جو فرزندانِ ہند کا محبوب ہو جس کے لیے ہندوستانی زندہ رہیں اور بوقت ضرورت جان دینے سے بھی گریز نہ کریں۔

۱۸۔ میں ہندوستان کو ایک ملک و ایک قوم دیکھنا چاہتا ہوں جو ایک مقصد کی حامل ہو۔

۱۹۔ ہندوستانیوں کی خدمت زندگی کے آخری سانس تک میرا مقصد حیات ہے ان ہی کے لیے جیوں گا۔ اور ان ہی کے لیے مروں گا

۲۰۔ بھارت میری مدد کر۔ بندے ماترم۔

پروفیسر شیو نرائن نورمن کرسچین کالج کے گریجویٹ کیسٹر اسٹنٹ کے اسکالر رہ اے امریکہ یو نا کالج احمد گڑھ کے بعد رونا کی علیگڈھ میں پروفیسر رہے۔ آج کل نائیواڑہ چاوڑی بازار دہلی میں قیام فرما ہیں۔

حدیقۃ السلاطین (فارسی)

(جلد اول دوم)

مولفہ

مرزا نظام الدین احمد ابن عبداللہ صاعدی شیرازی

بہ تصحیح و تحشی

سیّد علی اصغر بلگرامی (سابق صوبہ دار اورنگ آباد)

عبداللہ قطب شاہ کے عہد کی مستند تاریخ ہے اور بہ نہایت اہتمام کے ساتھ شعبہ تاریخ دکن ادارہ ادبیات اردو نے ٹائپ میں شائع کی ہے۔ مورخین اور محققین کے لیے ایک نادر قیمتی تحفہ ہے۔ سہولت کے لیے اشاریہ وغیرہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات:۔ ۳۵۰ ——— قیمت:۔ دس روپے

سب رس کتاب گھر۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

ڈاکٹر سلام سندیلوی

فتح کا پرچم

چاؤ ہنرو کی عداوت پہ کمر بستہ ہے
چینی بھائی ہوئے ثابت پسران یعقوب
اہرمن بڑھتا چلا آتا ہے یزداں کی طرف
غیظ سے دیکھتے ہیں یوسف کنعاں کی طرف

چین تہذیب و تمدن کا کبھی مرکز تھا
آج خونخوار درندے نظر آتے ہیں وہاں
یہ تھے نقش گل و شبنم کے بنانے والے
بم بنانے لگے ریشم کے بنانے والے

امن کا درس پڑھایا تھا جو کنفوشس نے
آج ہیں یاد انھیں جنگ و جدل کی باتیں
چین کے لوگ وہ پیغام بھلا بیٹھے ہیں
اس پیمبر کا مگر نام بھلا بیٹھے ہیں

ہم کو اس دور میں بھی یاد ہے گوتم کا سبق
آج بھی خار ستم سے نہیں واقف ہم لوگ
ہے اہنسا کے اصولوں سے محبت ہم کو
اب بھی ہے امن کے پھولوں سے محبت ہم کو

لیکن آج اپنی حفاظت کے لیے مجبوراً
مادر ہند کی عظمت کو بچانا ہے ہمیں
مورچے کوہ ہمالہ پہ لگائے ہم نے
اس لیے آتشیں ہتیار اٹھائے ہم نے

کار تخریب میں ہر ایک جگہ ہے مصروف
امن عالم کے لیے آج وہ اک خطرہ ہے
ایک ہرجائی ہے تہذیب کے دامن پر داغ
چاؤ این لائی ہے تہذیب کے دامن پہ داغ

حملہ آور ہوئے اس ملک پہ چینی غدار
راجپوتوں کے قبیلوں نے جہاں جنم لیا
رام و لچھمن کی حسیں یاد جہاں بستی ہے
سورج اور چاند کی اولاد جہاں بستی ہے

چین والے ہوئے اس ملک کے کیسے دشمن
شیر شاہ اور ہمایوں نے جسے عظمت دی
قطب و چشتی کی اذاں نے جسے تعمیر کیا
اکبر و شاہجہاں نے جسے تعمیر کیا

برف پر لالۂ خونیں کے کھلے ہیں گلشن
ساری سرحد پہ ہے اک سلسلۂ خوف و ہراس
سرخی رنگ شفق کوہ سے دریا تک ہے
موت کی خامشی لداخ سے نیفا تک ہے

ہم مگر آج کے حالات سے مایوس نہ ہوں
گولیاں اس طرح ہنس ہنس کے عدو کی کھائیں
چھین لیں اپنی زمیں دشمن خودبیں سے ہم
جس طرح کھیلتے ہوں لالہ و نسریں سے ہم

خیر نے شر کو ہر اک دور میں پامال کیا
حق کے آگے نہ جلے گا کبھی باطل کا چراغ
صاف تاریخ کے اوراق پہ یہ کندہ ہے
کاخ گیتی کے ہر اک طاق پہ یہ کندہ ہے

چین کے لوگ ہی ہاریں گے کسی روز سلام
ہند والے ہی ظفریاب کسی دن ہوں گے
چینیوں کا سر مغرور کبھی خم ہوگا
ہند کے ہاتھ ہی میں فتح کا پرچم ہوگا

اویس احمد دوراں

نیند آئے تو کیوں آئے

اُف بھیگی ہوئی شب کا یہ پچھلا پہر دوراں
خوابیدہ فضاؤں سے نغمات برستے ہیں
کلیاں جو چٹکتی ہیں اک ساز بج اٹھتا ہے
شبنم کے خنک قطرے جذبات کو ڈستے ہیں

یوں تازہ ہواؤں کے کچھ قافلے آتے ہیں
خوشبو کی لپٹ لے کر اطراف گلستاں سے
جس طرح شمیم آئے زلفوں کی قباؤں کی
عذرا کے نشیمن سے سلمیٰ کے شبستاں سے

اس رات کی ظلمت میں انسانوں کی آبادی
ہو کر غم فردا سے غافل پڑی سوتی ہے
اک میرا ہی پاگل جی ہے جاگا ہوا ورنہ
ہر چیز زمانے کی ساکت بنی سوتی ہے

کس طرح میں سو جاؤں کیسے مجھے نیند آئے
جب رنج و مصیبت کا طوفان ہمکتا ہو
آغوش میں مادر کی ننھا سا کوئی بچہ
جب بھوک کی شدت سے روتا ہو بلکتا ہو

نیند آئے تو کیوں آئے ہر لمحہ رلاتی ہے
پھیلے ہوئے ہاتھوں کی بکتی ہوئی خودداری
دل درد کی شدت سے بے چین نہ ہو کیسے
مظلوم پہ نیچی ہے ظالم کی ستمگاری

نیند آئے تو کیوں آئے نادار کی بیٹی کو
خاوند نہیں ملتا ڈھل جاتی ہے عمر اس کی
بیچاری کے ارماں کے شاداب گلستاں میں
اک پھول نہیں کھلتا ڈھل جاتی ہے عمر اس کی

نیند آئے تو کیوں آئے فنکار کے فن پارے
اس ملک کی گلیوں کے کوڑوں سے بھی سستے ہیں
شاعر ہوں مصور ہوں عالم ہوں کہ صوفی ہوں
لوگوں کی نگاہوں میں کوڑی میں بھی مہنگے ہیں

نیند آئے تو کیوں آئے منزل نہ ملی اب تک
گمرہ مسافر کو بھٹکے ہوئے انساں کو
ـــ کے صحرا سے اٹھتے ہوئے دیکھا ہے
آندھی کو بگولوں کو، تیز آگ کے طوفاں کو

نیند آئے تو کیوں آئے ملبوس ہے ہر کوئی
بے روح صداقت کی چمکیلی عباؤں میں
پہچاننا مشکل ہے اس عہد کے انساں کو
تخیل کے لباسوں میں ریشم کی قباؤں میں

آئے تو کیوں آئے فلموں نے ڈراموں نے
وار کو انساں کے مٹی میں ملایا ہے
حجروں میں بزرگوں کے حلقوں میں جوانوں کے
یا عشق کی باتیں ہیں یا جنس کا چرچا ہے

نیند آئے تو کیوں آئے رخصت ہوئی دنیا سے
نیکی وہ طبیعت کی وہ سادگی فطرت کی
لاؤں میں کہاں سے اب ان نبیوں کو ولیوں کو
جو راہ دکھاتے تھے لوگوں کو ہدایت کی

نیند آئے تو کیوں آئے انسان کے سینوں میں
نفرت کی تعصب کی اک آگ دہکتی ہے
اب راہ چلوں کیسے خطرات ہیں راہوں میں
ہر گام پہ دوزخ کی چنگاری بھڑکتی ہے

نیند آئے تو کیوں آئے اس آگ کی بھٹی میں
اخلاق و محبت کا سرمایہ جھلستا ہے
جاؤں تو کہاں جاؤں ہر ذرۂ عالم سے
وحشت سی ٹپکتی ہے اک خوف ہویدا ہے

اس کھولتی دنیا پر رحمت کی گھٹا بن کر
برسے نہ کوئی جب تک میں چین نہ پاؤں گا
جب تک ہے یہ محکومی جب تک ہے یہ مظلومی
میں یوں ہی زمانے میں کہرام مچاؤں گا

حامد بہکاری

کچھ نہیں

یاد آتا ہے پھر آج وہ
جس کی خاطر
امیدوں کی مشعل لیے
تیرگیٔ شبِ غم میں بھٹکا کیا
سالہا سال تک
جس کو پا کر یہ احساس ہونے لگا تھا مجھے
زندگی ایک خوابِ حسیں ہے
مگر
جس کو کھوتے ہی اس کا یقیں ہو گیا
زندگی۔ ایک خوابِ گراں کے سوا
کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں

مثال رضوی

آشا

ایک کرن چنچل اور نو دسر
سورج کی گودی سے اتر کر
بیٹھ گئی ہے میرے من میں
سورج اس کی ٹوہ سے بیاکل
پورب پچھم گھوم رہا ہے
اس چنچل کو ڈھونڈ رہا ہے۔

نمو

دانہ مٹی
مٹی دانہ
دانے سے پھر مٹی
مٹی سے پھر دانہ
جیون جس کا اور نہیں ہے
اس کا یہ افسانہ!

عادل منصوری

میں اور تو

تو ہے اک آزاد منوہر، سندر، چنچل آہو
تیری آنکھ میں جاگ رہا ہے کام دیو کا جادو
تیری آنکھ میں جیون کے سندر سپنوں کی خوشبو
میری آنکھ میں آنسو

تو ہے اک البیلی، میٹھی، شرمیلی، گلنار
تیرا دامن رنگ برنگے پھولوں کا گلزار
تیرے دامن کے پھولوں پر جھومے سدا بہار
میرا حصہ خار

تو ہے اک شہزادی تیرا محلوں میں ہے باس
بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہکے ہے ہر سانس
تیرے لبوں پر ناچ رہی ہے جیون رس کی مٹھاس
میرے لبوں پر پیاس

تمنا یوسفی

رباعیات

شاعر اور محبوبہ

تسکین دل و جاں مرا فن کیا بنتا
لفظوں میں ترا عکس بدن کیا بنتا
چھلکائے بہت رنگ لب و عارض پر
ان کاغذی پھولوں سے چمن کیا بنتا

مصور اور رقاصہ

سرمستیٔ گفتار کہاں سے لاؤں
گلکاریٔ رفتار کہاں سے لاؤں
پازیب تو پہنا دی تجھے کاغذ پر
پازیب کی جھنکار کہاں سے لاؤں

پیارے لال شاکر

کس طرح عرض حالت درد جگر کریں
ممکن نہیں فسانۂ غم مختصر کریں
رازِ جنونِ غم کا نہیں رازداں کوئی
ظالم کو اپنے حال کی کیوں کر خبر کریں
اب تک وہ منکرِ اثرِ جذبِ عشق ہیں
شاید وہ اعتراف ہمیں دیکھ کر کریں
آنکھیں ہیں جن کے جلوۂ رعنا کی منتظر
آنکھوں کو میرے واسطے ہرگز نہ تر کریں
وہ باخبر نہیں غمِ فرقت کے راز سے
جو لوگ شامِ غم میں امیدِ سحر کریں
اب بے خودیٔ عشق نے سب کچھ بھلا دیا
ممکن کہاں کہ آپ کو اپنی خبر کریں
ہے آشیاں کو وہ تباہی، نگاہِ برق
بہتر یہی ہے اب نہ وہ مجھ پر نظر کریں
تڑپا گئے ہیں صدمۂ فرقت میں رات بھر
کس آرزو کو وقفِ دعائے سحر کریں
دشوار ہے کہ ہم سے ادا فرضِ عشق ہو
شاکر کسی کا شکر اگر عمر بھر کریں

امیدِ سحر شامِ فرقت میں ہے
الٰہی یہ کیا میری قسمت میں ہے
کہیں وہ نہ ہوں منکرِ جوشِ غم
یہی غم ہجومِ صداقت میں ہے
کروں کیا شکایت ستم کی ترے
سنا ہے ستم تیری عادت میں ہے
ہے عرضِ محبت بھی دشوار تر
یہ احساس بھی اب محبت میں ہے
جو ہے حسن خود فطرتِ عشق میں
نہ وہ حسنِ سیرت نہ صورت میں ہے
بتاتے ہیں کیوں وہ محبت کو جرم
محبت تو انساں کی فطرت میں ہے
جہاں میں رہی زندگی حسن بیں
مجاز آج رنگِ حقیقت میں ہے
نہ تسکیں نہ صبر اے دلِ مضطرب
عجب حال کچھ دردِ فرقت میں ہے
کہوں کس سے شاکر میں اسرارِ غم
مجھے شک خود ان کی صداقت میں ہے

جگیش مست

مری حسرتوں کا نہ ذکر کر کہ بہائے عشق حرام ہے
صلۂ وفا سے غرض نہیں مجھے اپنے کام سے کام ہے

مری زیست کا ہے گماں تجھے تو مرے وجود کو ڈھونڈ لے
میں ثبوتِ عالمِ عشق ہوں مجھے اپنی دید حرام ہے

ادھر آرزو کی بنا پڑی کہ نظامِ دہر بدل گیا
نہ وہ آسماں ہے نہ وہ زمیں نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

تو نظر نظر میں ہے جلوہ گر نفس نفس میں بھی تو۔ مگر
مری شرحِ آرزو مختصر ابھی شوق نیم تمام ہے

تجھے کیا بتاؤں کہ وصلِ دوست کی کیا لطیف ہیں لذتیں
وہی میں ہوں اور وہی بے خودی وہی حسرتوں کا نظام ہے

مجھے اپنی نسبتِ بندگی سے مجالِ حرف زدن نہیں
ترے عفو اور مرے گناہ کا ورنہ ایک مقام ہے

محمد منشاء الرحمن خاں منشاء

تزئینِ مقدر کو ہیں دنیا میں ہنر اور
تاثیر مگر رکھتی ہے کچھ وحشتِ سر اور

اک آفتِ جاں اس کو سمجھتا ہے زمانہ
سوزِ غمِ الفت کی حقیقت ہے مگر اور

وہ اور ہیں ہوتے ہیں جو منت کشِ درماں
درماں سے تو بڑھتا ہے یہاں دردِ جگر اور

ان کے رخِ روشن کی ہو تمثیل مکمل
اے کاش نکھر جائے ذرا رنگِ سحر اور

بے برگ و ثمر آج ہے کیوں نخلِ تمنا
شاید اسے درکار ہے کچھ خونِ جگر اور

گر جلوہ دکھانا ہو تو اے حسن خبردار
موسیٰ کی نظر اور ہے منشاء کی نظر اور

امین مدراسی

حریم دل میں ہے حسنِ ازل کا جب سے وجود
اسی سے جانِ حزیں میں ہے شانِ عشق نمود

کسی کا حسن تصور رہی اک عبادت ہے
نمازِ عشق میں جائز نہیں رکوع و سجود

ہیں تلخ تلخ سے نغمے حیاتِ شیریں کے
اٹھا کے طاق پہ رکھ دو یہ سازِ کیف و سرود

مٹا دو دہر سے نقشِ غرور و نخوت کو
کچل کے رکھ دو سرِ کبر زیرِ چرخِ کبود

اٹھا رہے ہیں اسیری میں لطف ہائے بہار
نظر ہے قیدِ قفس میں بھی اپنی لامحدود

فسانۂ ظلم و ستم کا سنائیں اب کس کو
خلوصِ دہر میں عنقا ہے اور کرم مفقود

اسی کا جلوہ ہے کعبہ میں اور مندر میں
برائے نام ہیں دیر و حرم کی رسم و قیود

بلند عزم ہے اپنا تو مشکل آساں ہے
وہ عقدہ کیا کہ جو ہے بے نیاز بابِ کسود

نہ چھیڑو بزم میں فرزانگی کے افسانے
جنوں کے سامنے عقل و خرد ہیں سر بسجود

کرے نہ حشر بپا اپنی موت آہ و فغاں
الٹ کے رکھ دے نہ یہ تختۂ سکوت و جمود

تلاشِ یار میں حالِ زبوں کہیں کیوں کر
ہے لب پہ مہرِ خموشی جبین عرق آلود

نگاہِ غور سے دیکھا جو اپنی ہستی کو
رموزِ حق ہے سراپا امین اپنا وجود

کاوش بدری

مراد رد کیا پھیلتا جائے ہے　　کہ بادل امڈتا چلا جائے ہے
کوئی ہو نہ ہو مر گیا ہے کہیں　　چراغوں کی لو کپکپا جائے ہے
اس انداز سے ہم نے ڈالی نظر　　نقابِ دو عالم اٹھا جائے ہے
ہیں کچھ منزلیں منزلوں سے پرے　　کہاں تک ترا نقشِ پا جائے ہے
ہے بوسیدہ قرطاسِ دنیا مگر　　کوئی نقش کھنچتا چلا جائے ہے
ذرا سانس لے لوں تو میں بھی چلوں　　میاں تو مرا دم گھٹا جائے ہے
نہ جی بھر کے دیکھا تمھیں دو گھڑی　　ابھی سے ہمیں موت آ جائے ہے
سنبھل کر نہ بیٹھے تھے ہم دو نفس　　لو اتنے میں طوفاں اٹھا جائے ہے
ہے سنسان کب کوچۂ دل براں　　کوئی ہو کے بیمار آ جائے ہے
یہ کس نے سرِ کوہ آواز دی　　کوئی ساز بجتا چلا جائے ہے

دمِ فکر مجھ سے غزل نے کہا
یہ کاوش کہ جادو جگا جائے ہے

انوار ظہوری

جنوں بڑھ کر فسانہ ہوگیا ہے
مرا دشمن زمانہ ہوگیا ہے
جو دل پہلو میں ٹھہرا بھی تو حاصل
ترے غم کا ٹھکانہ ہوگیا ہے
مٹی رسمِ تکلف رفتہ رفتہ
تعلق دوستانہ ہوگیا ہے
نظر ایسا ندارانہ اٹھی تھی
تصور کافرانہ ہوگیا ہے
توجہ کی نظر اور وہ بھی مجھ پر
خطا شاید نشانہ ہوگیا ہے
کہاں کھولی تھیں آنکھیں اے مشیت
کہاں کا آب و دانہ ہوگیا ہے
بہر صورت اجل آتی مگر اب
ترا جانا بہانہ ہوگیا ہے
غزل میں ان دنوں رنگ ظہوری
نہایت عاشقانہ ہوگیا ہے

سیدہ مجیدہ

دلوں میں درد نہیں روح میں گداز نہیں
فغاں کہ کوئی یہاں وقفِ سوز و ساز نہیں
الم پرست طبیعت، فنا پذیر حیات
ستم کہ سلسلۂ درد و غم دراز نہیں
نوائے بربط و چنگ و رباب خوب مگر
شکستہ دل کے مقابل تو کوئی ساز نہیں
مرا سکوتِ مسلسل ہے پردہ دارِ الم
غلط یہ ہے کہ خموشی میں کوئی راز نہیں
تمام خواب اندھیروں میں ہو گئے تبدیل
بہت دنوں سے تصور سحر نواز نہیں
فغانِ نیم شبی، گریۂ سحر گاہی"
مری نماز سے بڑھ کر کوئی نماز نہیں
کسی کو دردِ مسلسل کسی کو عیش و طرب
ترے کرم سے کوئی فرد بے نیاز نہیں

جاوید لطیفی

کابلی پٹانے

مجھے نائن ڈاؤن مدراس میل سے سفر کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ بمبئی سے یہ میل کھچا کھچ بھرا ہوا آتا تھا اور اس میں تیسرے کلاس کے ڈبوں میں گھسنا اور وہ بھی رات کے ۲½ کے قریب نہایت تکلیف دہ کام ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو کسی ڈبے میں کوئی گھسنے ہی نہیں دیتا اور گاڑی چھوٹ جاتی، ایسا اتفاق میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینا بھی اس لئے لاحاصل رہتا کہ اس کلاس کے بمبئی سے تھرو سکندرآباد کے ڈبے میں جگہ ملنے کی کوئی گیارنٹی نہیں تھی۔ اگر تھرو کمپارٹمنٹ میں جگہ نہیں ملتی تو بعض اوقات مدراس کے دوسرے سکنڈ کلاس کے ڈبوں میں بھی کوئی سیٹ نہیں ہوتی تھی۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسی بھی ڈبے میں لوگوں سے لڑ بھڑ کر یا خوشامد کر کے گھسا جا سکتا ہے چاہے ڈبہ پچیس آدمیوں کی مقررہ نشستوں کی بجائے پچاس آدمیوں سے ہی کیوں نہ بھرا ہو — لیکن سکنڈ کے ٹکٹ میں یہ سہولت ہرگز نہیں۔ مقررہ نشستوں کے بعد ڈبے میں کوئی زائد نشست کے لئے کبھی بھی دوسرے پاسنجر تیار نہیں ہوتے، اور چونکہ اس کلاس کا ماحول اونچا اور تہذیبی ہوتا ہے۔ اس لئے بغیر چوں چرا کئے اس ڈبے سے خارج ہو جانا پڑتا ہے۔ اور اگر سکنڈ کے کسی بھی کمپارٹمنٹ میں جگہ نصیب نہیں ہوتی تو سکنڈ کلاس کے ٹکٹ کو جیب میں سینکتے ہوئے اگر سفر کرنا ہی منظور ہے تو کسی تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں ہی گھسنا پڑتا ہے، ایسے وقت ریلوے گارڈ یا اسٹیشن ماسٹر سے شکایتیں کر کے اپنا وقت کھونا بے وقوفی کی بات ہوتی ہے۔

احمد نگر سے حیدرآباد جانے کے لئے میں ہمیشہ ۱۲ بارہ اپ مدراس اکسپریس ہی پسند کرتا تھا۔ احمد نگر سے مناڈ لو بابے پاسنجر میں جو دھایا دہونڈ اور پونہ چلتی تھی چار بجے سہ پہر کے قریب سوار ہو کر چھ بجے شام دونڈ جنکشن پہنچ جاتا اور ساڑھے آٹھ بجے پہنچنے والی بارہ اپ مدراس اکسپریس کے سب سے پیچھے کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں گھس جاتا جو پونہ پر ہی نیا لگایا جاتا تھا اور جس میں قدرے بھیڑ کم ہوتی تھی۔ صبح چار بجے واڑی جنکشن پر اتر کر حیدرآباد جانے والی تیار کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر صبح نو بجے حیدرآباد کے نامپلی اسٹیشن پر پہنچ جاتا تھا۔ اس گاڑی میں جگہ بھی کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتی تھی۔ رات بھر کا سفر بھی نیند کی دھنکی میں کٹ جاتا ہے اور صبح کے وقت حیدرآباد آ جاتا ہے — لیکن نائن ڈاؤن مدراس میل کے لئے بڑی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ رات میں بارہ بجے احمد نگر سے چل کر دو بجے دونڈ آنا اور پھر ساڑھے تین بجے مدراس میل کے کسی ڈبے میں داخل ہو کر کھڑے رہنا — کھڑے رہنا اس لئے کہ ڈبے میں لوگ سو کے پڑے رہتے ہیں اور بیٹھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، پھر ایک بجے دوپہر میں واڑی پہنچ کر حیدرآباد والی گاڑی میں سوار ہونا اور شام کے چھ بجے کے قریب حیدرآباد پہنچنا۔ بال بال جان بچ جاتا ہے۔

اچانک حیدرآباد سے تار آ جانے پر مجھے اپنی مرضی کے خلاف اسی نائن ڈاؤن مدراس میل سے سفر کرنے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ رات کا کھانا میں آٹھ بجے ہی کھا چکا تھا۔ اپنے چھوٹے سے سوٹ کیس میں چند کپڑے رکھ کر میں نے سفر کی تیاری کر لی اور منماڑ لوٹ بابے والی گاڑی میں سوار ہو کر دو بجے رات کو دونڈ جنکشن پہنچ گیا اور پلیٹ فارم پر رکھی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ کر میل کا انتظار کرنے لگا۔

میری ایک عادت یہ ہے کہ اپنے ٹکٹ کا نمبر میں کہیں نہ کہیں نوٹ ضرور کر لیا کرتا ہوں مبادا ٹکٹ کھو جائے حالانکہ آج تک ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا، اسی عادت کے تحت میں نے کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے تار کے لفافے پر اپنا ٹکٹ نمبر نوٹ کر لیا اور ٹکٹ کو دوبارہ پیچھے کی رکھ کر اندر کی جیب میں پھر ڈال دیا اور بنچ پر بیٹھا تھا کہیں ہاتھ بیٹھا ہوا — وہ لی پیہ پے پیچھی تھی

اسٹیشن کا ہجوم دیکھ کر رہ رہ کر یہی خیال آرہا تھا کہ مجھے جگہ ملے گی یا نہیں اگر نہیں ملی ..... اور گاڑی جلدی تو بہت برا ہوگا۔ میرا حیدرآباد فوراً پہنچنا بہت ضروری ہے ـــ جگہ ملے گی یا نہیں ..... جگہ .... جگہ ... میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اسی بے چینی کے تحت میں نے ایک قلی کو پکارا۔

جگہ تو مل جائیگی نا ـــ صرف یہ چھوٹا سا سوٹ کیس ہے ـــــ

اور قلی نے مرہٹی زبان میں انکار کر دیا۔ "ساب ملا دوسرا کام آہے دوسریا لا بولوؤن گھیا ـــ" یعنی مجھے دوسرا کام ہے کسی اور کو بلا لیجئے۔

اور میں نے بعد میں محسوس کیا کہ شائد قلی نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ میرے پاس صرف ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا اور وہ سمجھ رہا ہوگا کہ مجھے اس کی مزدوری دو آنے سے زیادہ کیا مل سکتی ہے۔ اس لئے کوئی دوسرا کام کیوں نہ تلاش کروں ـــ مجھے دراصل قلی کی حاجت نہیں تھی لیکن جگہ کی دبدھا نے کسی قلی کا سہارا لینے کیلئے سوچ پیدا کر دی تھی، جب قلی آگے بڑھ چکا تو میں نے کسی دوسرے قلی کو بلانا مناسب نہیں سمجھا۔ جگہ ملنے کے لالچ میں میں قلی کو آٹھ آنے بھی دے سکتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ قلی بھی آخر کرے گا کیا کسی نہ کسی ڈبے میں جگہ کے لئے مجھے ہی تو کوشش کرنی ہوگی اور اس کام میں یہ سوٹ کیس کسی الجھن کا باعث نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اپنے ہی ہاتھ میں ہونے سے یہ فائدہ ہے کہ کسی بھی ڈبے میں فوراً موسوٹ کیس داخل ہو کر اطمینان کا سانس لیا جا سکتا ہے۔

پلاٹ فارم کے کسی کونے میں ریل کے آنے کی اطلاع کے طور پر گھنٹہ ٹن ٹنانے لگا اور میں نے پنج پر سے اٹھ کر دیکھا کہ دور آگ میں لپٹے ماتھے پر زرد روشنی کی تیز آنکھ لگائے چلا آرہا ہے ـــ میرا دل دھڑکنے لگا جگہ ..... جگہ ..... جگہ .....

اور میل گرجتا دندناتا پلاٹ فارم پر آکر رک گیا، مسافروں کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ ایک ڈبے میں سے چند مسافروں نے اترنے کیلئے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں اور دوسرے کئی لوگ دوڑ کر دروازے پر پہنچ گئے، ڈبے میں گھسنے کے لئے سب سے پہلی اور اہم شرط دروازہ کھلا ہی ہے، اگر دروازہ بند ہو تو دروازے یا کھڑکی کے راستے اندر بیٹھے ہوئے لوگ داخل ہی نہیں ہونے دیتے زبردستی کرکے اگر آپ نے اپنا بستر اندر گھسیڑ دیا اور سوٹ کیس اٹھانے کو لپکے تو دوسری کھڑکی سے آپ کا بستر پھر پلاٹ فارم پر آجاتا ہے ـــــ نہ جانے کتنے لوگ ڈبے میں گھسنے کے لئے آ جمع ہوئے تھے۔ میرا سوٹ کیس ہاتھ میں تو تھا لیکن لوگوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ کوئی آگے بڑھنے کی خاطر میرے کوٹ کو کھینچ رہا تھا تو کوئی سوٹ کیس دبا رہا تھا۔ بڑی دقتوں کے بعد میں ڈبے کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ سوٹ کیس میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کے اوپر اٹھایا ہوا تھا آخر گھس گھسا کر ایک کونے میں اپنے ہی سوٹ کیس کو کھڑا کر کے اسی پر بیٹھ گیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ نیند کے جھونکوں میں رات کٹ گئی اور صبح ہو گئی۔ شولاپور اسٹیشن پر کئی لوگ گاڑی سے اترے اور مجھے بیٹھنے کیلئے اچھی جگہ مل گئی

میں سفر میں کبھی اپنے ساتھ کھانا نہیں رکھتا، اسٹیشن پر کسی بھی ریفرشمنٹ روم میں یا پھر ڈائننگ کار ہی میں کچھ کھا پی لیا کرتا ہوں اور یوں بے سے اپنا سفر جاری رکھتا ہوں ـــ میں نے سوچا کہ ڈائننگ کار میں جا کر ناشتہ کر لوں گا اور واپس آکر اوپر کی برتھ پر جگہ نکال کر وہاڑی تک سوتا چلا جاؤں گا تاکہ کچھ نیند مل جائے۔

جب گاڑی چلی تو ٹکٹ چیکر ڈبے میں چڑھ آیا اور ٹکٹ دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ چیکر لوگ ہمیشہ اچانک ہی ڈبے میں گھس آتے ہیں، ویسے تو گاڑی کے کھڑے رہنے تک ڈبوں کے سامنے ہی گھومتے رہتے ہیں لیکن جب گاڑی چل چکتی ہے تو اچانک کسی بھی ڈبے میں گھس جاتے ہیں ان کے اس عمل سے بلاٹکٹ مسافر جو اس باختہ ہو جاتے ہیں نہ وہ دوسری سمت

کود سکتے ہیں اور نہ ہی چھپ سکتے ہیں ٹکٹ ..... اور میں نے پرس نکالنے کیلئے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ارے .....

اور ...... پرس ......

اچانک میرے منہ سے نکلا اور میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں —— زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میرا بٹوہ غائب ہوا تھا اس لئے شاید میں ضرورت سے زیادہ ہی پریشان ہوگیا۔ ایک دم اٹھ کے کھڑا ہوگیا اور کپڑوں کی تمام جیبیں ٹٹولنے لگا، حالانکہ پرس میں ہمیشہ کوٹ کی اندر کی جیب ہی میں رکھتا تھا۔ ٹکٹ چیکر اور تمام مسافر میری طرف متوجہ ہوگئے۔

کہیں جیب تو نہیں کٹ گئی —— کسی نے پوچھا!

نہیں نہیں جیب کہیں نہیں کٹی —— میں نے اندر کی جیب کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا

تو بھائی پھر چور نے اوپر کے اوپر تمہارا بٹوہ اڑا لیا ہوگا ——

روپے کتنے تھے .....؟

اور کیا تھا ......

وغیرہ کی آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں، اور شاید بعض نے مجھے مشکوک نظروں سے بھی دیکھا۔ لیکن ٹکٹ چیکر مطمئن تھا، اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اگلے اسٹیشن پر تم چوری کی رپورٹ کردو —— وہ اس لئے مطمئن تھا کہ اس نے میرا حلیہ اور پھر میری پریشانی دیکھکر اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ حرکت میں نے خواہ مخواہ نہیں کی ہے —— ایک خوشی اس غم کے ساتھ یہ تھی کہ میرا پارکر ففٹی ون پن جو مجھے بہت عزیز تھا حیرت انگیز طریقے پر بچ گیا تھا، وہ ایسے کہ جب میں نے دوندڈ جنکشن پر تار کے لفافے پر ٹکٹ کا نمبر نوٹ کرلیا تھا تو لفافہ کے ساتھ ہی کوٹ کے سائڈ پاکٹ میں بے خیالی میں قلم بھی ڈال دیا تھا اور پھر بھول گیا تھا اب جس وقت جیبیں ٹٹولیں تو قلم بھی ہاتھ میں آگیا۔ میں نے ٹی ٹی سے اپنا ٹکٹ نمبر لکھوا دیا۔ اس نے میری انگلیوں میں پڑی ہوئی قیمتی انگوٹھیوں، پارکر پن بہترین سوٹ، قیمتی رسٹ واچ اور عمدہ عینک سے متاثر ہوکر مجھے مشورہ دیا کہ حیدرآباد کے اسٹیشن ماسٹر کو مل کر سب حقیقت کہہ دیجئے وہی چاہے تو آپ کو دوسرا ٹکٹ بنوا کر دیئے بنا چھوڑ سکتا ہے ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ کو ٹکٹ کے پیسے پھر ادا کرنے ہوں گے اور اگر آپ کا کھویا ہوا ٹکٹ مل گیا تو آپ کو بعد میں ادا کئے ہوئے روپے واپس لینے کا اختیار رہے گا —— اسٹیشن ماسٹر مطمئن ہو یا نہ ہو، میں نے سوچا، لیکن یہ بات سچ تھی کہ میرا بٹوہ مع ریزگاری مع ٹکٹ، مع نوٹس اور چند ضروری چٹھیوں کے غائب ہوچکا تھا۔

پرس چوری ہوجانے سے میرا نقصان ضرور ہوا تھا لیکن یہ بات میرے لئے موجب پریشانی نہیں تھی، بدحواسی صرف اسی لئے پیدا ہوئی تھی کہ پہلی بار مجھ پر یہ واقعہ گزرا تھا اور ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیئے اس کا علم نہ ہونے کی وجہ سے میں بدحواس ہوگیا تھا —— جب طبیعت میں سکون ہوا تو مجھے اپنی اس بدحواسی پر ہنسی آنے لگی، پھر یہ خیال آیا کہ پیسے تو سب چوری ہوگئے اب کھانا پینا کیسے ہوگا ——؟ ابھی تو صبح ہی ہوئی ہے اور پورا پہاڑ سا دن گزارنا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی جسم میں ایک ہلکی سنسناہٹ سی دوڑ گئی اور خواہ مخواہ بھوک بھی محسوس ہونے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ کھانا میں نے گزشتہ شب آٹھ بجے کھایا تھا اور اس کے بعد سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے، اب ناشتہ کی باری تھی لیکن پیسے ہی پاس نہیں .... مجھے ایسا تو نہیں سوچنا چاہیئے تھا۔ لیکن خیالات کی رو تھی کہ اوٹ پٹانگ بہے چلی جا رہی تھی۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ تب تک سفر جاری رکھکر اور گھر پہنچکر ہی کھانا کھاؤں گا پھر اپنے ارادہ پر ہنسی بھی آئی اور سوچا کہ اگر میں ارادہ بھی نہ کروں تو

سیا ہوتا ہے۔ پیسے کہاں ہیں جیب میں۔ دن بھر بھوکا ہی رہنا پڑے گا۔ پھر خیال آیا کہ اگر دو وقت کھانا نہ ملے گا تو دم تھوڑا ہی نکل جائے گا۔ آخر لوگ بھوکے بھی رہتے ہیں۔ روزہ بھی تو رکھتے ہیں ...... ٹکٹ کی پریشانی ٹی ٹی کی تسلی سے دور ہو چکی تھی۔ اب صرف کھانے پینے کا سوال رہ گیا تھا تو وہ بھی میں نے اپنے آپ کو دلاسہ دیکر ہلکا کر لیا تھا۔

جیسے جیسے دن چڑھتا گیا ویسے ویسے میری بھوک بھی بڑھتی گئی۔ میں بھوک کو جتنا دباتا وہ اتنی ہی ابھرتی۔ اپنے آپ کو ادھر ادھر کے خیالات میں لاکر بہلاتا لیکن پھر پھر کر ایسا محسوس ہوتا کہ پیٹ بہت خالی ہو گیا ہے۔ پتلون کے بیلٹ کو مزید کس لینا چاہیئے۔ بہت بھوک لگ رہی ہے ....

دو بجے واڑی جنکشن آ گیا اور میں مدراس میل سے اتر کر پلاٹ فارم کی دوسری سمت حیدرآباد جانے والی تیار کھڑی گاڑی میں جا بیٹھا۔ دن آدھا گزر چکا تھا اور بھوک خوب چمک اٹھی تھی۔ اپنی نیت پر لعنت بھیجنے کے باوجود نظریں بار بار پھلوں، مٹھائیوں اور پوری ساگ لئے ہوئے ٹھیلوں کی طرف ہی اٹھ جاتی تھیں۔ کان اسٹیشن کی گہما گہمی، انجنوں کی گڑگڑاہٹ اور شائیں شائیں میں صرف یہ آوازیں سن رہے تھے۔

گرما گرم پوری — ساگ پوری گرم — لڈو جلیبی گلاب جامن — گرما گرم میٹھا دودھ — قیمہ پراٹھے بریانی — چائے کافی گرم —
ڈبے میں سوار بعض مسافر اپنا دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ ایک صاحب الگ کونے میں بیٹھے اپنے توشہ دان کے ڈبوں میں سے نہ جانے کیا کیا نکال کر کھا رہے تھے۔ انہوں نے میری سمت پیٹھ کر کے اپنا سارا کھانا چھپا لیا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کھا رہے ہیں — میں نے سوچا پھر فوراً ہی اپنے آپ کو برا بھلا کہا کہ — تجھے اس سے کیا واسطہ کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔ کچھ بھی کھا رہے ہوں گے .... کچھ بھی .... بریانی، کباب، قیمہ، آملیٹ، پراٹھے ..... کچھ بھی کھا رہے ہوں گے ..... تجھے کیا کرنا ہے .....
اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک دیہاتی میاں بیوی جوار کی موٹی موٹی روٹیاں پیاز اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مزے لے لے کر کھا رہے ہیں اور ان کے ساتھ لوٹے میں ٹھنڈا پانی رکھا ہے ————

افسوس بھوک نے بھی مجھے کیسا ندیدہ بنا دیا ہے — میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ گاڑی کچھ دیر بعد چل پڑی اور میں اس خیال سے مطمئن ہونے لگا کہ منزل ہر اسٹیشن کے بعد قریب آ جائے گی اور پھر اپنا گھر ہوگا اور پھر گرما گرم کھانا...
سہ پہر کے چار بجے گئے اور میرے لئے دن کافی بڑا سا ہو گیا۔ نہ جانے چھ کب بجیں گے، بجیں گے بھی یا نہیں، نہ جانے حیدرآباد کب آئے گا۔ آخر ہر اسٹیشن پہ گاڑی اتنی دیر کیوں کھڑی رہتی ہے۔ جلدی کیوں نہیں چل پڑتی۔ یہ ڈرائیور کا بچہ گاڑی چلا رہا ہے یا تفریح کر رہا ہے۔ اتنی دھیمی رفتار جیسے بیل گاڑیاں چلتی ہوں۔ افسوس افسوس ریل کا سارا کاروبار آزادی کے بعد گڑبڑا سا گیا ہے۔ میں ضرور اخباروں میں شکایت چھپواؤں گا۔ بڑا اندھیر مچا رکھا ہے ریلوے نے اتنی دیر، اتنی دیر، اتنی بھوک ..... لاحول ولا ......
اور پھر مجھے نظم النفر نو نہ جانے کیوں یاد آ گئی۔ بھوکا پیاسا اور لنگڑا رابرٹ ریان بے آب و گیاہ پہاڑوں پہ پھسلتا اور آب و دانہ کیلئے بے چین آنکھوں میں پھرنے لگا — توبہ توبہ اس کی مثال مجھ پہ کہاں صادق آ سکتی ہے۔ میں کون ایسا کئی دن کا بھوکا پیاسا ہوں۔ دو وقت کھانا نہیں ملا تو ایسی کیا آفت آ گئی، اور میری مثال ایسی ہرگز نہیں ہے کہ تم نے روزہ رکھا تو دل بڑا ہو گیا۔ ہرگز نہیں ..... چار تو بج ہی گئے ہیں چھ بھی بج جائیں گے۔ وقار آباد جنکشن آ چکا ہے۔ نامپلی بھی آ ہی جائے گا۔
اچانک سوندھی سوندھی خوشبو سے ناک مہک اٹھی۔ سب کی ناکوں کا تو حال نہیں معلوم لیکن یہ بات یقینی تھی کہ میری ہی ناک نے سب سے پہلے اس خوشبو کو پکڑا تھا اسی لئے کہ خوشبو کی لپیٹ آنے کے کچھ دیر بعد آنکھوں نے ایک لڑکے کو کابلی چنا نے گرما گرم کابلی چنا لے — کی آوازیں لگاتے ہوئے ڈبے کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

بٹانے واقعی گرما گرم ہی ہو رہے تھے۔ تبھی تو ان کی سوندھی سوندھی اور خستہ خستہ مہک ڈبے میں پھیل گئی تھی۔ اسکی بٹانوں کی ٹوکری کو میں نے دیکھا، اچھے خاصے بڑے بڑے اور پھولے ہوئے بٹانے تھے، رنگ بھی بڑا ہی پیارا تھا ان کا، بٹانوں کو مسلسل گھورنے سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ بٹانے بھی مجھے دیکھ رہے ہیں مسکرا رہے ہیں ہنس رہے ہیں اور ہنستے ہنستے ان کے پیٹ پھول گئے ہیں اور بعض کے پھٹ گئے ہیں ـــــ توبہ توبہ میں نے دل ہی دل میں کہا اور ان پر سے اپنی نگاہیں ہٹالیں ـــــ

سابلی بٹانے ـــــ گرما گرم بٹانے۔

کھا کے دیکھو بابو جی ـــــ گرم مال کھا کے دیکھو جی۔

بٹانے ......

لڑکا مسافروں کو تھوڑے تھوڑے بٹانے تقسیم کر رہا تھا تاکہ وہ انہیں چکھیں اور پھر ذائقہ چکھتے ہی آنے دو آنے کے خرید لیں، بٹانا منہ کو لگا کہ پھر چھٹتا ہی نہیں جو مسافر مفت کا نمونہ نہیں لے رہے تھے وہ لڑکا انہیں زبردستی نمونہ دے رہا تھا۔

کھا کے دیکھو بابو جی گرما گرم سابلی بٹانے ......

مفت نمونہ تقسیم کرتا اور بعض کو آنے دو آنے کے بٹانے فروخت کرتا جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا جہاں صرف آدھا آنہ جیب کے ایک کونے میں چھپا پڑا تھا، مجھ سے پہلے ہی ایک دیہاتی نے جب لڑکے سے دو پیسے کے بٹانے مانگے تو انکار کر دیا۔

کم سے کم ایک آنہ کلدار کے لو بھائی، میرے پاس دو پیسے کا ناپ نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے اپنی انگلیوں سے آتے ہوئے آدھے آنے کی گردن دبا دی اور وہ بے جان ہو کر ایک کونے میں گر گیا ـــــ

گرما گرم بٹانے ...... سابلی بٹانے ......

لڑکے نے نمونے کے بٹانے میرے آس پاس کے لوگوں کو دیے، سب ہی کو وہ بٹانے دیتا چلا آرہا تھا، اب میری باری آئی ـــــ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ قیمتی سوٹ، لاجواب گھڑی، خوبصورت عینک، پاؤں میں موزے اور چمکدار جوتے اور ...... اور اس کا نمونے کے بٹانے لئے اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں لہراتا میرے منہ کے پاس سے گزر کر پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص کی طرف چلا گیا اور اس کی بٹانوں بھری ٹوکری جس میں ہنستے ہنستے بٹانوں کے پیٹ پھوٹ گئے تھے اپنی خستہ مہک کی لہریں میری ناک کے پاس چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے دو جلدیں ضروری ہیں۔ ادارہ)

سالنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور (۱۹۶۲ء)

اردو ڈائجسٹ کا سالنامہ $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز پر نہایت خوبصورت ٹائیٹل کے ساتھ شائع ہوا ہے کئی عنوانات کے تحت مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ پہلا عنوان شخصیات ہے جس کے تحت دو مضامین مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (ایک انٹرویو) اور رنا اور رس کا خالق ہیں۔ دوسرا عنوان زندگی کے ناقابل فراموش لمحات میں ہمارے ادیبوں نے اپنے تاثرات ظاہر کیے ہیں۔ شعر و ادب کے تحت کرشن چندر کا ایک افسانہ دنیا کا بادشاہ ہے اور دو افسانے ایک عربی اور ایک روسی سے ترجمہ ہیں۔ طنز و مزاح میں آپ نے کچھ سنا بھی ہے کے عنوان کے تحت شفیق الرحمٰن نے لکھا ہے۔ ایک عنوان پاکستان کی بازگشت ڈاکٹر سید عبداللہ، حمید احمد خاں اور نصر اللہ خاں عزیز کے مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پاکستانی کلچر پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پاکستان میں ایک ہوا چلی ہے کہ پاکستانی ادب، پاکستانی تمدن، پاکستانی کلچر جیسے الفاظ تراشے جا رہے ہیں حالانکہ بنگلہ ادب کی ترقی میں ہندوستان و پاکستان دونوں کی کوششوں کو دخل ہے یہی حال اردو اور دوسری بہت سی باتیں قدر مشترک بن جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف صحیح اشارہ کیا ہے۔ نصر اللہ خاں عزیز کا "پچاس سال پہلے" اس امر کا اظہار ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے ذہن کو کس طرح متاثر اور مفلوج کیا۔ یہ مضمون اسی اشاعت میں درج ہے۔ دلچسپ سچے واقعات کے تحت تین ترجمے ہیں اور نفسیات کے زیر عنوان دو۔ سائنسی مضامین میں سائنس کے کمالات، زحل اور سینے راما انتہائی دلچسپ مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ اور چار پانچ عنوانات کے تحت رسائل سے منتخبہ مضامین میں جو اپنی افادیت اور دلچسپی کا لحاظ کرتے کسی سے کم نہیں۔ ڈائجسٹ میں دوسرے رسائل کا انتخاب ہوتا ہے لیکن اس میں غیر مطبوعہ مضامین بھی موجود ہیں جس سے افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے اور یہ بطور خاص ڈائجسٹ ہی کے لیے لکھوائے گئے ہیں۔ اس طرح یہ خاص شمارہ اردو ادب میں ایک گراں قیمت اضافہ ہے۔

نگارش امرتسر

نگارش امرتسر کا نہ خاص نمبر ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ عام نمبر۔ دونوں کے بین بین ہی سمجھیے۔ اس میں خواجہ احمد عباس کا طویل مختصر افسانہ قیصر ادریا ہے جو ہمارے سماج کے ایک خاص پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ پانچ افسانے ہیں جن میں "دعا نامہ" جاگیرداری نظام پر ایک طنز ہے اور سفارش ہمارے سماج خصوصاً حکومت کے عہدیداروں کی ایک گھناؤنی تصویر۔ ایک اور افسانہ "وصیت" ہے جس کا پس منظر سماج میں ملتا ہے۔ آخری افسانہ "مکر جیسا" مختصر ہے لیکن ایک اچھا خاکہ۔ تین مختصر ناول ہیں ایک پر وفیسر وحید نسیم کا "ڈھلتی چھاؤں" ایک تاریکی نیر کا "گلیاں اور بازار" اور ایک پروفیسر احمد نسیم کا "دھرتی اور آکاش"۔ ان میں ناول نگاروں نے سماج کے مختلف گوشوں کو منظر عام پر لانے اور اس کے شعور کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ حصہ نظم حصہ نثر سے کچھ پیچھے ہے لیکن غیر دلچسپ نہیں۔ ایڈیٹر صاحبان کی کوششیں کامیاب ہیں۔

اردو کے کلاسیکی شعرا
(جلد اول)

ایم حبیب خاں۔ ناشر انجمن بک ہاؤس علیگڈھ۔ مجلد مع گرد پوش صفحات ۲۱۲ قیمت ۳/۰

یہ کتاب اصل میں کلاسیکی شعرا پر اہل قلم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ فاضل مرتب نے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ پیش نظر ہے میر سے آتش تک شعرا پر تنقیدی مضامین جمع کیے ہیں۔ ان میں میر پر انتخاب میر سے بابائے اردو کا مقدمہ شامل ہے، سودا کی قصیدہ نگاری پر ضیا احمد بدایونی کا مضمون ہے درد کی صوفیانہ شاعری ڈاکٹر سید عبداللہ اور "سحرالبیان" پر سید احتشام حسین کا۔ کے بعد مصحفی، انشاء، جرأت، ناسخ و آتش پر مجنوں، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، شبیہ الحسن، خلیل الرحمٰن اعظمی کے تنقیدی مضامین ہیں۔ انتخاب ہمیشہ اپنی پسند پر ہوتا ہے اور خاں صاحب نے ایک اچھا انتخاب پیش کیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کو علی گڑھ کے اردو امتحانات نصاب میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اور اس طرح فاضل مرتب کی محنت چیز ہو گئی ہے۔

انتخاب کے آخر میں دلی و لکھنؤ کے دبستان شاعری پر ایک نظر کے عنوان سے جو جائزہ لیا گیا ہے اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع اور مفید ہے۔ کتابت و طباعت کا معیار کافی اچھا ہے ممکن ہے کہ کتاب جلد عوام کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی ہر کتب خانہ میں اس کی شرکت قابل قدر اضافہ ہو گی

آفاق

نسیم انہونوی۔ ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ صفحات ۱۴۱۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت : دو روپے آٹھ آنے۔

یہ ایک مختصر ناول ہے جس کا اصل کردار آفاق ہے جس نے لکھنؤ کے ایک خوش حال گھرانے میں تعلیم پائی لیکن شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک شریف الخاندان لیکن دیہاتی لڑکی سے ہوئی جو اس کو ایک آنکھ محض اس لیے نہ بھائی کہ وہ "کالج تتلی" اور "سبھا کی پری" نہ تھی لیکن جب اس نے اپنی حسب خواہش لڑکیوں کا انتخاب کیا تو وہ شادی سے پہلے ہی سپردگی کے لیے تیار ہو گئیں یہ خصوصیت اس کے لیے روح فرسا ثابت ہوئی آخرکار اس نے پھر اپنی بیوی ہی کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ لی۔ اس طرح نسیم صاحب نے فیشن پرست لڑکیوں کی اخلاقی گراوٹ اور دیہاتی لڑکیوں کی بلندی سے ایک مختصر سا جائزہ لیا۔ کتاب بے حد دلچسپ ہے نہ تسلسل ٹوٹتا ہے اور نہ زور بیان میں کمی آتی ہے۔

رحمت

نسیم انہونوی۔ ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ صفحات ۲۰۷۔ مع گرد پوش۔ قیمت : ۲ روپے آٹھ آنے

یہ نسیم صاحب کا دوسرا ناول ہے جس میں ہندو مسلم اتحاد کی ایک دلکش تصویر پیش کی گئی ہے۔ ایسی مثالیں کہ مسلم بیوہ ایک ہندو کی بھابی بنے اور اپنی بیوگی کا دور شوہر کی یاد میں بتا دے اور ہندو بھائی اس کی ضروریات کا کفیل بنا رہے انوکھی اور عجیب تو نہیں شاذ و نادر مل جاتی ہیں۔ اس کے بعد اس کے چند اور شریر النفس کرداروں کا جو ہر سماج میں بے شمار ہیں خاکہ کھینچا ہے اس سے مسلم معاشرے کے معائب کی نقاب کشائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اصلاحی رجحان پیدا ہوتا ہے۔ یہ ناول پلاٹ کی پیچیدگی اور الجھنوں کے باوجود کامیاب ہے۔

حسین قافلے

مجاہد لکھنوی۔ ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ صفحات ۱۷۲۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت۔ چار روپے

مجاہد لکھنوی نے اس دور میں ناول نگاری میں کافی شہرت حاصل کی ہے "حسین قافلے" ان کا تازہ ناول ہے جو آزادی ہند کے دس بارہ سال بعد لکھنؤ کی معاشرتی اور سیاسی حالت کا خاکہ پیش کرتا ہے کہ آزادی سے کچھ پہلے لکھنؤ کیا تھا اور بعد میں اخلاقی اعتبار سے کتنا گر چکا ہے اس میں معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی بجائے صرف دو تین پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سینماؤں کی کثرت نے سماج میں جو تخریبی کیفیتیں پیدا کی ہیں ان کا خاکہ کھینچا ہے۔ کرداروں کی اوباش زندگی سے گھن آنے لگتی ہے اور ابتدا سے آخر تک ناول ایک خیال کے گرد گھومتا ہے۔